تفسیر ترجمان القرآن

بلطائف البیان

تالیف

نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ

(۱۸۳۲-۱۸۹۰ء)

تصحیح و تنقیح و نظر ثانی

فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف

حافظ شاہد رفیق

تسہیل: محمد یحییٰ قریشی تخریج: حافظ حمید مشتاق

مکتبہ قدوسیہ



نام کتاب: ______________ تفسیر ترجمان القرآن

تالیف : ______________ نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ

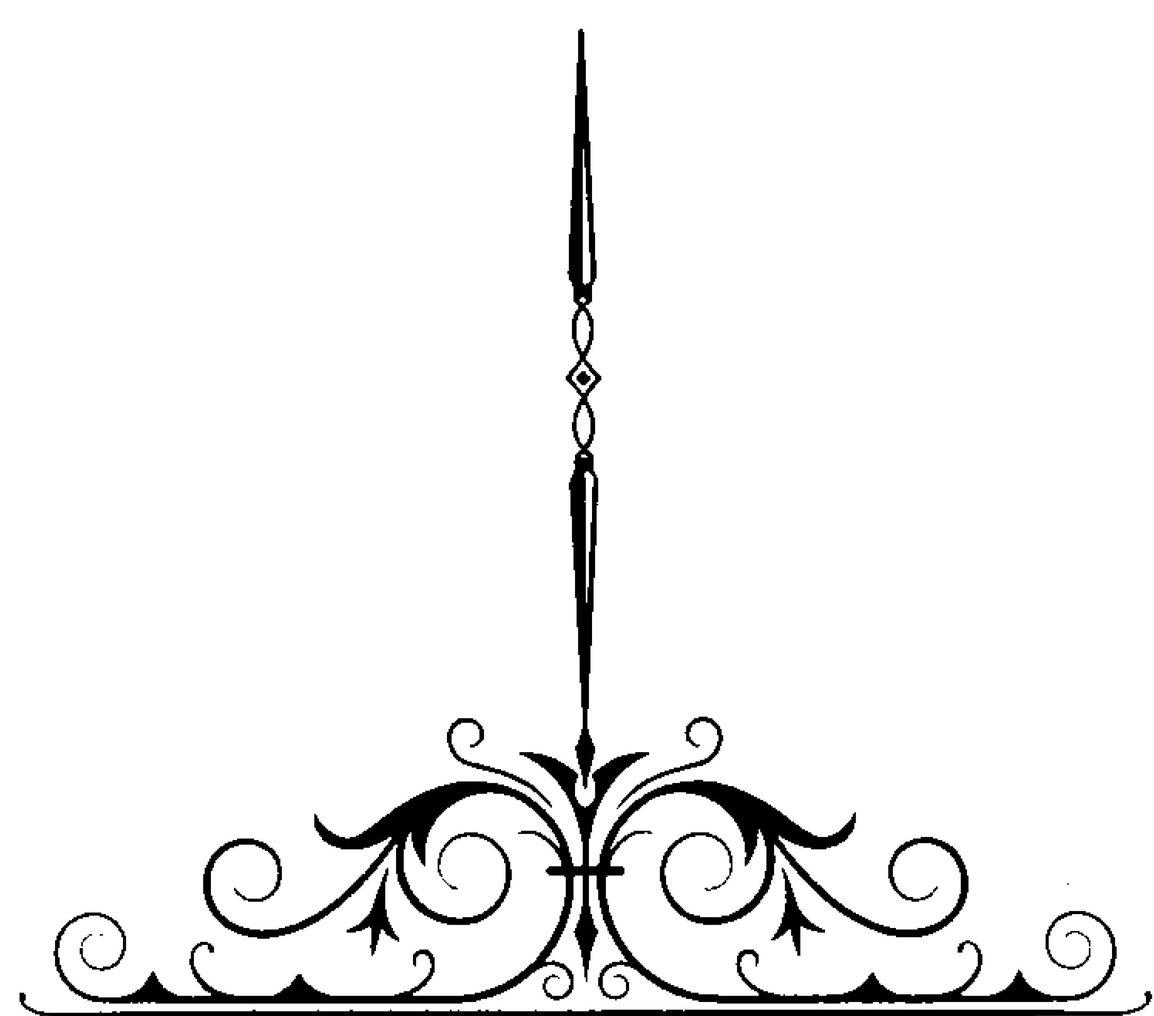
قیمت: ______________

طبع اول: ______________ مارچ 2017ء



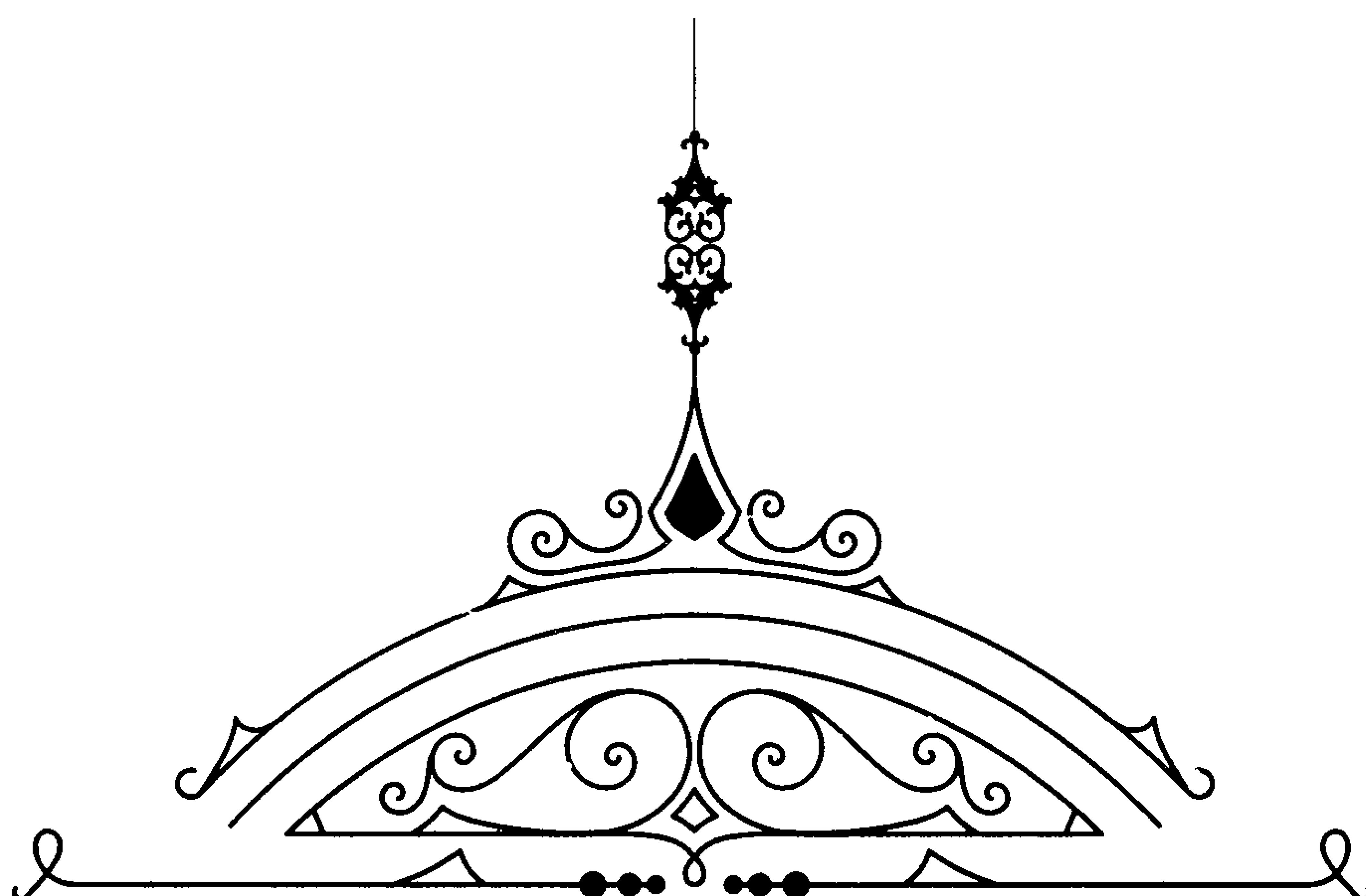
دار ابی الطیب
للنشر والتوزیع

گل روڈ، حمید کالونی گلی نمبر 5 گوجرانوالہ
055-3823990

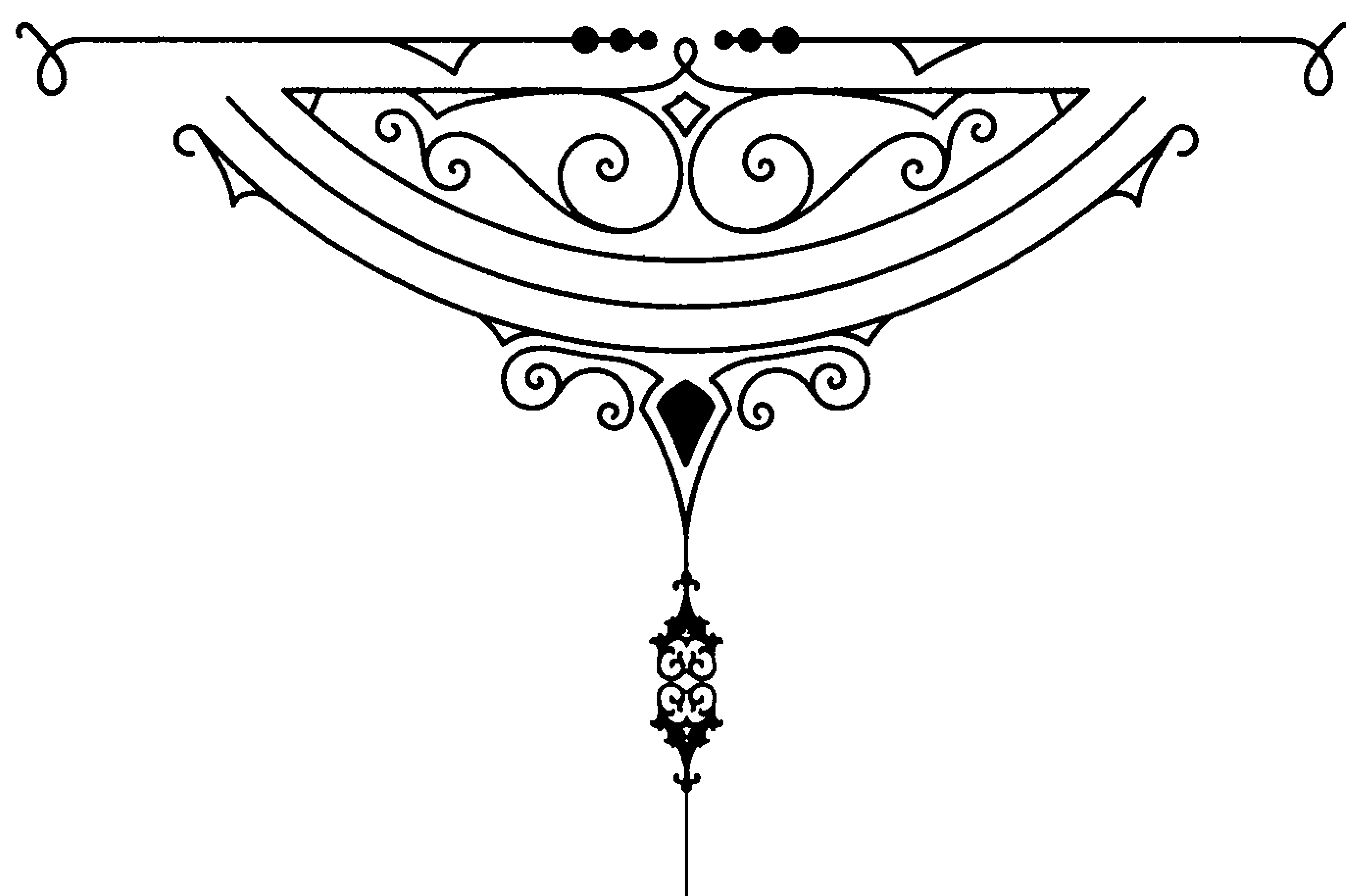


تفسیر ترجمان القرآن

بلطائف البیان



بسم الله الرحمن الرحيم



[illegible] الرحمن الرحيم

نحمدك يا من إذا وقف ببابه رفعه، وإذا انقطع إليه وصله وجمعه، وأصلي وأسلم على نبيك محمد القائل بلغوا عني، وعلى آله وصحبه حملة العلم ونقلة الرواية.

أما بعد: فإنه قد قرأ علي الأخ الإمام الأكمل والفهامة المبجل صاحب الفضائل المشهورة، ومحط السيادة المأثورة، روح جثمان الأدب [illegible] شريف الحسب والنسب، الجامع الشرفين، السامي على الفرقدين، السيد الأجل والشريف المبجل، المتفرع من دوحة الفضل، والعلوم المترعرع من [illegible] صاحب السر المكتوم، الجامع لأصناف العلوم منطوقها والمفهوم، صديق حسن بن السيد أولاد حسن بن علي بن لطف الله الحسيني القنوجي البخاري [illegible] [illegible] الإمام مالك [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] من [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] أرجو الشفاعة للذين أجاروا

[illegible] يسبقوا إلى غرف الجنان تغاروا

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] عليهم رحمة العزيز العلام [illegible] السيد العلامة [illegible] الأمجد الحسن بن عبد الباري الأهدل [illegible] العلامة المحدث محمد بن ناصر الحازمي [illegible] شيخ الإسلام [illegible] [illegible] العلامة [illegible] [illegible] المعروف [illegible] المشهور [illegible] الشريف محمد بن ناصر المذكور بالقراءة والسماع والإجازة عن شيخه [illegible] خاتمة المحدثين بصنعاء اليمن محمد بن علي الشوكاني [illegible] المشهور [illegible] [illegible] أسانيد السادة الأكابر، وشيخه العلامة المحدث بصنعاء اليمن أيضاً محمد بن علي العمراني عن شيخه العلامة المحدث أحمد بن محمد [illegible]

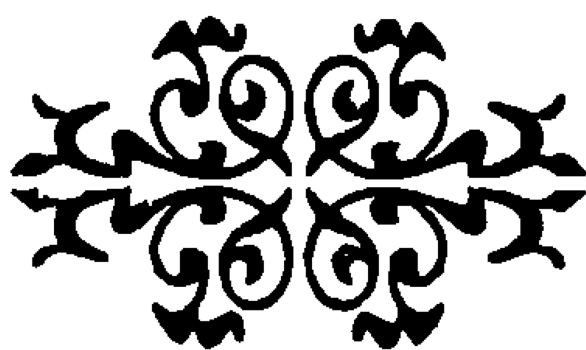
بصنعاء [illegible]

تفسیر فتح البیان کے قلمی نسخے کا ایک ورق مؤلف کے خط میں

قال يا رسول الله الرجل يجاهد في سبيل الله وهو يبتغي عرضا من الدنيا فقال لا أجر له فأعظم الناس ذلك فعاد
الرجل فقال لا أجر له وعن شداد بن أوس قال كنا نعد الرياء على عهد رسول الله صلعم الشرك الأصغر وعنه قال
سمعت رسول الله صلعم يقول من صلى يرائي فقد أشرك ومن صام يرائي فقد أشرك ومن تصدق يرائي فقد
أشرك ثم قرأ فمن كان يرجو لقاء ربه الآية أخرجه أحمد والطبراني والحاكم وصححه والبيهقي وغيرهم وعن شداد أيضا
قال سمعت رسول الله صلعم يقول إن الله يقول أنا خير قسيم لمن أشرك بي من أشرك بي شيئا فإن عمله
قليله وكثيره لشريكه الذي أشرك به أنا عنه غني أخرجه أحمد وأبو نعيم والطيالسي وأخرج أحمد والحاكم وصححه والبيهقي
وغيرهم عن أبي سعيد قال قال رسول الله صلعم ألا أخبركم بما هو أخوف عليكم عندي من المسيح الشرك الخفي
أن يقوم الرجل يصلي لمكان رجل وأخرج أحمد وابن أبي حاتم والطبراني والحاكم وصححه والبيهقي عن شداد بن
أوس سمعت رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم يقول أتخوف على أمتي الشرك والشهوة الخفية قلت أتشرك
أمتك بعدك قال نعم أما إنهم لا يعبدون شمسا ولا قمرا ولا حجرا ولا وثنا ولكن يراؤون الناس بأعمالهم قلت
يا رسول الله ما الشهوة الخفية قال يصبح أحدهم صائما فيعرض له شهوة من شهواته فيترك صومه ويواقع شهوته
وأخرج أحمد ومسلم وابن جرير وابن أبي حاتم وابن مردويه والبيهقي عن أبي هريرة عن النبي صلعم عن ربه أنه قال
أنا خير الشركاء فمن عمل عملا أشرك فيه غيري فأنا بريء منه وهو للذي أشرك وفي لفظ فمن أشرك بي أحدا
فهو له كله وفي الباب أحاديث كثيرة في التحذير من الرياء وأنه الشرك الأصغر وأن الله لا يقبله وقد استوفاها
صاحب الدر المنثور في هذا الموضع فليرجع إليه ولكنها لا تدل على أنه المراد بالآية بل الشرك الجلي يدخل تحتها
دخولا أوليا وعلى فرض أن سبب النزول هو الرياء كما تشير إلى ذلك ما قدمنا فالاعتبار بعموم اللفظ
لا بخصوص السبب كما هو مقرر في علم الأصول وقد ورد في فضائل هذه الآية بخصوصها ما أخرجه الطبراني و
ابن مردويه عن أبي حكيم قال قال رسول الله صلعم لو لم ينزل على أمتي إلا خاتمة سورة الكهف لكفتهم وأخرج ابن
راهويه والبزار والحاكم وصححه والشيرازي في الألقاب وابن مردويه عن عمر بن الخطاب قال قال رسول الله
صلعم من قرأ في ليلة فمن كان يرجو لقاء ربه الآية كان له نور من عدن أبين إلى مكة حشوه الملائكة قال ابن
كثير بعد إخراجه غريب جدا وعن معاوية بن أبي سفيان أنه تلا هذه الآية فمن كان يرجو لقاء ربه وقال إنها
آخر آية نزلت من القرآن قال ابن كثير وهذا أثر مشكل فإن هذه الآية هي آخر سورة الكهف والكهف
كلها مكية ولعل معاوية أراد أنه لم ينزل بعدها ما ينسخها ولا يغير حكمها بل هي مثبتة محكمة فاشتبه ذلك على بعض
الرواة فروى بالمعنى على ما فهمه وإلى هنا انتهى النصف الأول من تفسير الكتاب العزيز ويتلوه النصف الآخر
إن شاء الله تعالى وكان الفراغ من زبره بخط يد مؤلفه الفقير إلى الله الغني به عمن سواه صديق بن حسن بن
علي الحسيني القنوجي ختم الله له بالحسنى وأذاقه حلاوة رضوانه الأسنى في صبح الأربعاء تاسع شهر جمادى الأخرى
من شهور سنة تسع وتسعين ومائتين وألف الهجرية على صاحبها أفضل الصلوة والتحية في بلدة بهوپال صانها
الله عن الفتوق والزوال

اجازہ روایت شیخ حسین بن محسن یمانی برائے مؤلف

فہرست



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

مجدد العلوم الاسلامیہ والا جاہ نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ (۱۸۳۲۔۱۸۹۰ء) فکرِ سلف کے احیا اور اسلامی علوم وفنون کی تحقیق و اشاعت کے اعتبار سے علمائے برصغیر میں ایک یگانہ روزگار شخصیت اور امتیازی مقام کے حامل تھے۔ انھوں نے ایک طرف تو علومِ اسلامیہ کی بیشتر اقسام تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، تاریخ، عقائد، ادب وغیرہ ۴۳ انواع میں تین صد سے زائد کتب تصنیف کیں اور دوسری طرف اپنی مذکورہ بالا کتب کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم کے کئی اہم مصادر کو ازسرنو طبع کروانے کے بعد اہلِ علم کے مابین تقسیم وتوزیع کا وسیع اہتمام کیا، جو اپنے وقت میں علمائے کرام اور طلبائے دین کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ اور اس کے علاوہ مختلف مساجد و مدارس کی تعمیر اور ان سے تعاون، علما وطلبا کے وظائف، حفظِ حدیث اور منہجی کتب کی تالیف میں مصنفین کو ہدایا و جوائز جیسی متنوع خدمات سرانجام دیں، جن کی تفصیل کا یہ مقام نہیں، شائقین اس بارے میں نواب صاحب مرحوم کی خدماتِ جلیلہ کی تفصیل ان کی سوانح حیات ''سیرت والا جاہی'' (مآثر صدیقی) میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

جناب نواب صاحب مرحوم نے اپنی تصنیفی مساعی میں جن علوم کو ہدفِ تحریر ٹھہرایا، ان میں علومِ قرآن اور قرآنِ مجید کی تفسیر وتوضیح بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس فن میں نواب صاحب کی تینوں زبانوں عربی، فارسی اور اردو میں لکھی ہوئی تصنیفات کی تعداد سات ہے، جن میں ''فتح البیان فی مقاصد القرآن'' (عربی)، ''ترجمان القرآن بلطائف البیان'' (اردو)، ''نیل المرام من تفسیر آیات الاحکام'' (عربی)، ''فصل الخطاب فی فضل الکتاب'' (اردو)، ''اکسیر فی اصول التفسیر'' (فارسی) اور ''افادۃ الشیوخ بمقدار الناسخ والمنسوخ'' (فارسی) شامل ہیں۔ یہ تمام کتب پندرہ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل کئی جلدوں کو محیط ہیں۔

نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ کی تحریر کردہ بیشتر کتب ان کی زندگی میں تو اشاعت پذیر ہوئیں، لیکن بعد میں دوبارہ ان کی اشاعت و طباعت کا کوئی معقول بندوبست نہ ہوسکا اور یہ علمی جواہر پارے نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ چناں چہ نواب صاحب مرحوم کی ان علمی خدمات اور علوم و معارف کے احیا کی اہمیت وضرورت کو محسوس کرتے ہوئے جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی۔ کویت کے ذمے داران محترم جناب فضیلۃ الشیخ ابو خالد فلاح المطیری حفظہ اللہ اور محترم المقام مولانا عارف جاوید محمدی حفظہ اللہ کی زیرِ سرپرستی ایک تحقیقی ادارہ بنام ''مولانا محمد اسحاق بھٹی ریسرچ سینٹر'' اور اشاعتی ادارہ ''دار ابی الطیب'' کے نام سے (نواب صاحب مرحوم، علامہ شمس الحق عظیم آبادی اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہم اللہ

کی مشترکہ کنیت ''ابو الطیب'' کی مناسبت سے) قائم کیا گیا ہے، جس کا مقصدِ اولین نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ کی جملہ تالیفات کی از سرِ نو اشاعت و تحقیق اور دیگر اکابر علمائے اہلِ حدیث کی نایاب کتب کی طباعت ہے۔ یہ ادارہ دسمبر ۲۰۱۱ء میں معرضِ وجود میں آیا تھا اور اب تک بحمد اللہ تعالیٰ نواب صاحب مرحوم کی عقائد و علومِ قرآن سے متعلق ۱۹ کتب کے علاوہ دیگر اصحابِ علم: استاذ الاساتذہ حافظ محمد عبداللہ محدث غازی پوری، علامہ شمس الحق عظیم آبادی، علامہ محمد عبدالرحمٰن مبارک پوری، مولانا احمد دین گکھڑوی اور مولانا محمد اسحاق بھٹی وغیرہم کی تقریباً ۲ درجن کے قریب کتب کو تحقیق، تخریج، ترجمہ و تسہیل اور تصحیح و تنقیح کے مختلف مراحل کے بعد شائع کرنے کا اعزاز حاصل کر چکا ہے اور نواب صاحب مرحوم سمیت دیگر اکابر علمائے اہلِ حدیث کی متعدد کتب تحقیق و طباعت کے مختلف مراحل میں ہیں، جو تکمیل و طباعت کے بعد جلد ہی قارئین کی دسترس میں ہوں گی۔ إن شاء الله العزيز.

زیرِ نظر تفسیر ''ترجمان القرآن بلطائف البیان'' کی اشاعت بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے، جسے تحقیق و تخریج اور تسہیل کے بعد قارئین کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کتاب کی تسہیل کا بنیادی کام محترم جناب محمد یحییٰ قریشی رحمہ اللہ نے کیا ہے، جبکہ تخریج اور تصحیح کی ذمے داری برادرِ مکرم حافظ حامد مشتاق (فاضل مدینہ یونیورسٹی)، جناب پروفیسر عبدالجبار (فاضل ریاض یونیورسٹی) اور استادِ محترم حافظ عبداللہ سلیم حفظہ اللہ نے ادا کی ہے۔ اسی طرح مفسرِ قرآن فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے اس کی مراجعت کی ہے اور بعض مقامات پر انتہائی مفید حواشی بھی رقم کیے ہیں، جس پر وہ ہمارے خصوصی شکریے کے سزاوار ہیں۔ جزاه الله خيراً.

ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر اس اہم کتاب کی اشاعت کے اولین محرک جناب حکیم عبدالمجید وزیر آبادی اور ان کے فرزندانِ گرامی جناب حکیم عتیق الرحمان اور جناب ڈاکٹر یوسف فاروق، اور مکتبہ قدوسیہ لاہور کے ذمے داران محترم جناب ابوبکر قدوسی اور جناب عمر فاروق قدوسی صاحبان کا تذکرہ نہ کیا جائے، جنھوں نے اس عظیم علمی مشروع کی تیاری میں بنیادی کردار ادا کیا اور اس کے لیے اَن تھک محنت کی، جس کی مکمل تفصیل جناب حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے اپنے مقدمے میں بیان کر دی ہے۔ جزاهم الله خيراً وبارك فيهم.

ہم اللہ رب العزت کے شکر گزار ہیں، جس کے فضل و احسان کی بدولت اس علمی خزینے کی خدمت و اشاعت کی توفیق میسر آئی، پھر ہم ان تمام احباب و اخوان کے ممنون ہیں، جنھوں نے اس مرحلے میں کسی بھی قدم پر ہماری معاونت اور حوصلہ افزائی کی ہے۔ خصوصاً فضیلۃ الشیخ فلاح خالد المطیری حفظہ اللہ (رئیس لجنۃ القارۃ الھندیہ) اور محترم المقام مولانا عارف جاوید محمدی حفظہ اللہ ہمارے خصوصی شکریے کے حق دار ہیں، جن کے تعاون اور سرپرستی کی وجہ سے اس علمی تراث کا احیا عمل میں آیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں اور دیگر تمام معاونین کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اس عمل کو قبولیت سے سرفراز فرما کر ہمارے لیے توشۂ آخرت بنائے۔ آمین یا رب العالمین

والسلام

حافظ شاهد رفیق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گزارشِ احوالِ واقعی

فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

نواب صدیق حسن خان والا جاہ، والیِ بھوپال ایک یگانۂ روزگار شخصیت تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی تو عسرت اور مختلف ابتلاؤں میں گزری،[1] تاہم بعد میں جس طرح نواب صاحب کو اللہ تعالیٰ نے علم و فضل سے نوازا، اسی طرح ان پر دنیوی نعمتوں کے وسیع دروازے بھی کھول دیے۔ تیسرا خصوصی فضل اللہ نے ان پر یہ فرمایا کہ ان دونوں نعمتوں کو اللہ ہی کی رضا کے لیے استعمال کرنے اور ان سے بھرپور کام لینے کی توفیقِ فراواں سے بھی ان کو نواز دیا۔ رحمه الله رحمة واسعة.

چنانچہ نواب صاحب رحمہ اللہ نے قرآن و حدیث اور ان سے متعلقہ علوم میں اتنا کام کیا کہ پوری تاریخِ اسلام میں ان چند ممتاز شخصیات میں سے ایک شمار ہوئے، جن کو انگلیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے، علاوہ ازیں ان ممتاز شخصیتوں کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ تفسیرِ قرآن، شروحِ حدیث، اصولِ تفسیر، عقائد و ارکانِ اسلام سے لے کر ہر فن اور زندگی کے ہر اہم معاملے پر انھوں نے دادِ تحقیق ہی نہیں دی، بلکہ تالیفات کا ڈھیر لگا دیا۔ نواب صاحب کی تالیفات کی تعداد بھی تین سو سے زائد ہی ہے اور یوں وہ بلاشبہہ اور بجا طور پر ''مجدد العلوم'' کے لقب سے ملقب ہوئے۔ رحمه الله رحمة واسعة.

ان کی عظیم اور کثیر تصانیف میں ایک ''تفسیر ترجمان القرآن'' اردو بھی ہے، جو انھوں نے اپنی عربی تفسیر ''فتح البیان'' کے بعد تحریر اور شائع فرمائی۔

یہ تفسیر کافی ضخیم ہے، جو ۱۵ جلدوں اور دس ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور اسے برصغیر پاک و ہند کی اولین اردو تفسیر کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اس کے بعد اردو میں متعدد تفاسیر لکھی گئیں، لیکن اس ''ترجمان القرآن'' سے پہلے کسی مفصل تفسیر کا اردو زبان میں سراغ نہیں ملتا۔

نواب صاحب کی یہ اردو تفسیر آج سے ایک صدی سے زیادہ عرصہ قبل کی ہے، جو اب نایاب بھی ہے اور ایک

---

[1] اس کی تفصیل انھوں نے اپنی کتاب "إبقاء المنن بإلقاء المحن" میں بیان کی ہے، جسے مخدومی المحترم حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ کے حکم پر آج سے تیس بتیس سال قبل انھی کے قائم کردہ ادارہ ''دار الدعوۃ السلفیۃ'' لاہور نے، قاری نعیم الحق نعیم رحمہ اللہ (وفات: جنوری ۱۹۹۹ء) کی تسہیل کے ساتھ شائع کیا تھا۔

صدی قبل کی اردو زبان میں ہے۔ اس عرصے میں اردو زبان کے اسلوب میں کافی فرق اور نمایاں تبدیلی رونما ہو چکی ہے، اس لیے جب اس کی دوبارہ اشاعت کا خیال بعض بزرگوں کے ذہنوں میں آیا تو یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ پرانی زبان اور اس کا اسلوب موجودہ لوگوں کے لیے نامانوس ہوگا، جس سے اس عظیم تفسیر کی افادیت کم ہو جائے گی، جب کہ اشاعتِ ثانیہ کا تو مقصد ہی اس کی افادیت کو عام اور وسیع کرنا ہے۔

اس تفسیر کی دوبارہ اشاعت کا خیال تو کئی لوگوں کے ذہنوں میں آیا، لیکن اس کی عملی صورت گری کی توفیق الٰہ آباد (وزیر آباد) کے حکیم عبدالمجید (متوفی ۳۱ جنوری ۱۹۹۰ء) اور ان کے سعادت مند بیٹوں کو حاصل ہوئی۔ تقبل اللّٰه جهودهم وشكر اللّٰه مساعيهم.

اس کی مختصر تفصیل حسبِ ذیل ہے:

حکیم صاحب مرحوم شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کے چچا زاد اور برادرِ نسبتی تھے۔ حکیم صاحب اگرچہ ساری عمر پیشۂ طبابت سے وابستہ رہے، لیکن علم میں بھی ان کو بڑا رسوخ تھا اور ذوقِ مطالعہ سے بھی خوب خوب بہرہ ور تھے، یہی وجہ ہے کہ علومِ تفسیر و حدیث و متعلقہ علوم پر ان کے پاس کافی وسیع لائبریری تھی، جو ان کی وفات کے بعد ان کی تعمیر کردہ مسجد (الٰہ آباد) میں بطور وقف منتقل کر دی گئی۔ علاوہ ازیں حکیم صاحب رحمہ اللہ اور ان کے صاحبزادگان والا تبار تبلیغی و دعوتی جذبہ بھی خوب رکھتے ہیں۔ اسی جذبے کے تحت حکیم صاحب نے حافظ ثناء اللہ زاہدی (حال صادق آباد) اور پروفیسر محمد اقبال کیلانی (الریاض) حفظہما اللہ کے مشورے سے ایک ادارہ بہ نام ''احیاء تراث اہل السنۃ'' الٰہ آباد وزیر آباد بنایا، جس کے زیرِ اہتمام سید بدیع الدین شاہ الراشدی رحمہ اللہ (سندھ) کی تالیف ''تنقیدِ سدید بر رسالہ اجتہاد و تقلید'' اور دیگر کئی تبلیغی رسالے شائع کیے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے گرامی قدر بیٹے ڈاکٹر محمد یوسف فاروق اور حکیم عتیق الرحمٰن صاحبان چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کرتے رہتے ہیں۔ تقبل اللّٰه جهودهم وأجزل جزاء هم.

عمر کے آخری مرحلے میں حکیم صاحب کے ذہن میں ''ترجمان القرآن'' کی اشاعت کا خیال آیا، اور وہ اسے اسی ادارے کے تحت شائع کرنا چاہتے تھے۔ مذکورہ دونوں بزرگوں کے مشورے سے مصادر کے لیے ایک لائبریری کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ اس میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کا مشورہ بھی شامل تھا۔ یہ کافی بڑی لائبریری تھی، جو حکیم صاحب مرحوم کی وفات کے بعد الٰہ آباد کی مسجد اہلِ حدیث کی بالائی منزل میں استفادۂ عام کے لیے وقف کر دی گئی، بعد میں اسے جامعہ سلفیہ (فیصل آباد) کی لائبریری میں منتقل کر دیا گیا۔ تفسیر ''ترجمان القرآن'' کی اشاعت کے پروگرام کے وقت حکیم صاحب رحمہ اللہ کے پاس اس کا مکمل نسخہ بھی نہیں تھا اور اس کی اشاعت کے پورے وسائل بھی نہیں تھے، نیز اس کی اشاعت سے قبل اردو زبان کے موجودہ اسلوب میں اس کی تسہیل و تنقیح بھی ضروری تھی۔

حکیم صاحب رحمہ اللہ نے اس کے لیے چھتیس ہزار روپے جمع اور مختص کیے ہوئے تھے، لیکن اس دور کے حساب سے یہ اگرچہ خطیر رقم تھی، لیکن مذکورہ سارے کاموں کے لیے بہرحال ناکافی تھی۔

حکیم صاحب چونکہ اپنے عزم میں پختہ تھے، اخلاص اور جذبۂ خدمتِ دین وعلم سے بہرہ ور تھے، نیز اپنے بیٹوں پر بھی اعتماد رکھتے تھے کہ وہ ان کی اس خواہش کو پورا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے، چنانچہ وہ وصیت کر گئے کہ یہ ۳۶ ہزار کی رقم ''ترجمان'' کی اشاعت ہی پر خرچ کی جائے۔

حکیم صاحب کے چار بیٹے تھے، ان کے دو بیٹے ڈاکٹر محمد یوسف فاروق اور حکیم عتیق الرحمان صاحب ان کے قریب ہی رہتے تھے، اس وقت حکیم عتیق الرحمان صاحب تو ایک سرکاری ملازم تھے اور بچے سب چھوٹے یا زیرِ تعلیم تھے، اس لیے زیادہ وسائل کے حامل نہیں تھے، تاہم اس کے لیے وہ جو تگ و دو کر سکتے تھے، وہ انھوں نے کی اور خوب کی (اس کی تفصیل آگے آئے گی)۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کو اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹری کے شعبے میں نہایت اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا ہے، وہ ایک ایسے نہایت ماہر اور کامیاب سرجن ہیں کہ ہر طرح کا آپریشن کرنے میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں اور اپنے گھر کے نچلے حصے میں انھوں نے اپنا ہسپتال بھی قائم کیا ہوا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس اعتبار سے وہ وسائلِ فراواں کے حامل ہیں، لیکن ان پر اللہ تعالیٰ کا مزید فضل یہ بھی ہے کہ وہ اس کے باوجود خاندان کی علمی و دینی روایات و اقدار کے نہ صرف حامل ہیں، بلکہ دین وعلم کی راہ میں اللہ کے دیے ہوئے مال کو خرچ کرنے میں کوئی دریغ نہیں کرتے۔

ان دونوں سعادت مند بیٹوں نے اپنے صاحبِ علم باپ کے جذبۂ خدمتِ علمی کی اس طرح قدر کی کہ انھوں نے متعدد مشکلات کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور اس سلسلے میں کوششیں جاری رکھیں۔ یہ ساری جہد و کاوش سنی سنائی باتوں پر مبنی نہیں، راقم کے ذاتی علم و مشاہدے کا حصہ ہے۔

یہ تاریخ کی امانت ہے، جس کو راقم سپردِ قلم کر رہا ہے، اس سے کوئی اور غرض یا مفاد وابستہ نہیں ہے، نہ ان بھائیوں کی چاپلوسی یا ان کی بے جا مدح و تعریف ہی مقصود ہے۔ أعاذنا اللہ منهما.

حکیم عتیق الرحمان صاحب حفظہ اللہ نے پہلی کوشش تو یہ کی کہ ''ترجمان القرآن'' کا نسخہ مکمل کیا، اس کے لیے ان کو کافی دوڑ دھوپ کرنی پڑی، بہرحال وہ اس میں کامیاب ہو گئے۔

دوسری کوشش وہ تھی جو اس کی تسہیل و تنقیح کے لیے انھوں نے کی اور اس کی صورت یہ تھی کہ انھوں نے راقم سے رابطہ کیا۔ راقم نے ''ترجمان القرآن'' کے چند صفحات کی بطورِ نمونہ تسہیل کی اور وہ ان کے سپرد کر دیے اور کہا کہ آپ علما سے رابطہ کریں اور جو اس کام کے لیے تیار ہو، اس کو آپ اصل صفحات اور تسہیل شدہ صفحات دکھائیں کہ اس

طرح تسہیل کرنی ہے۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے کئی اصحابِ علم سے رابطہ کیا، انھوں نے ہامی بھری، لیکن کوئی بھی راقم کے بتلائے ہوئے نمونے کے مطابق تسہیل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ کئی سال تک یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ حکیم عتیق الرحمان صاحب لاکر مجھے دکھاتے رہے اور میں ناپسند کرتا رہا۔ حکیم صاحب کو راقم سے حسنِ ظن تھا، جو الحمد للہ اب تک قائم ہے، وہ یقیناً ایک معیاری کام کرانا چاہتے تھے اور سمجھتے تھے کہ مطلوبہ معیار وہی ہے جس کا نمونہ راقم نے تیار کر کے ان کو دیا تھا۔ بالآخر راقم نے خود ایک صاحبِ علم پروفیسر سے، جو قدیم و جدید دونوں تعلیم کا حسین امتزاج تھے، رابطہ کیا، انھوں نے آمادگی کا اظہار تو کر دیا کہ وہ خود بھی سلفی تھے اور نواب صاحب کی علمی خدمات سے بھی آشنا اور اس کام کی اہمیت کے بھی معترف تھے، لیکن غالباً پروفیسری کی سرکاری آسایشیں اس کام میں مخل رہیں یا عزم و ہمت کی کمی حائل رہی یا دونوں ہی باتیں کارفرما رہیں، اللہ ہی بہتر جانتا ہے، ان سے امید تھی کہ وہ شاید مطلوبہ معیار پر یہ کام کرلیں گے، لیکن وہ بھی یہ کام نہ کر سکے۔ غفر اللہ له.

بالآخر وزیر آباد ہی کے ایک بزرگ محمد یحییٰ قریشی تھے، یہ عالمِ دین تو نہیں تھے، ان کے والدِ محترم محمد امین البتہ استاذِ پنجاب حافظ عبدالمنان وزیر آبادی رحمہ اللہ کے شاگردوں اور فیض یافتگان کے صحبت یافتہ تھے، جس کی وجہ سے ان کے اندر بھی دینی کتب کے مطالعے کا شوق اور دین سے وابستگی تھی۔ یہ سرکاری ملازم تھے اور کراچی میں متعین تھے۔ دارالخلافہ کراچی سے جب اسلام آباد منتقل ہوا تو یہ بھی اسلام آباد آ گئے اور ریٹائر ہونے کے بعد وہیں رہایش پذیر رہے۔ انھیں وہاں جمعیت اہلِ حدیث اسلام آباد کا پہلا امیر ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد تو ان کا سارا وقت کتبِ احادیث اور تفاسیر وغیرہ کے مطالعے ہی میں گزرتا تھا۔

حکیم عبدالمجید رحمہ اللہ کے ایک تیسرے اور سب سے بڑے بیٹے اور ڈاکٹر محمد یوسف فاروق اور حکیم عتیق الرحمان کے برادرِ گرامی محمد ادریس صاحب بھی بسلسلۂ ملازمت راولپنڈی ہی میں رہایش پذیر ہیں۔ یحییٰ قریشی صاحب سے وزیر آباد کے ناتے آبائی رفاقت اور دوستی تھی، ادریس صاحب کو بھی اس منصوبے کا علم اور اس کی مشکلات کا احساس تھا، انھوں نے قریشی صاحب سے اس کا ذکر کیا اور اس کی تسہیل کی پیش کش کی اور اس پر اصرار کیا، بالآخر ان کی ترغیب پر قریشی صاحب آمادہ ہو گئے، نواب صاحب کی تفسیر کے مطالعے کا شدید شوق بھی اس کٹھن کام کو انجام دینے کا سبب بنا اور شب و روز کی شدید محنت اور لگن سے چھٹے سال میں انھوں نے یہ کام اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مکمل کرلیا۔ یوں ریٹائرمنٹ کی زندگی کا ایک بہترین مصرف بھی ان کو مل گیا اور ایسے کام کی سعادت بھی حاصل ہوگئی جو امید ہے کہ ان کے لیے إن شاء الله صدقۂ جاریہ ثابت ہوگا۔ نیز قریشی صاحب نے عمر کے آخری مرحلے میں ایک لاکھ روپے اشاعت فنڈ میں بھی عنایت فرمائے۔ جزاه الله أحسن الجزاء.

قریشی صاحب ۲۷ اگست ۲۰۱۴ء کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ رحمه الله رحمة واسعة.

اس تفصیل سے یہ پہلو مزید واضح ہوا کہ ہمارے علما میں ذوقِ مطالعہ کا فقدان، بالخصوص اردو ادب سے لاتعلقی عام ہے۔ یہ کمی بھی اس تفسیر کی تسہیل میں ناکامی کا سبب رہی، اس کے برعکس قریشی صاحب غالباً ذوقِ مطالعہ سے بہرہ ور رہے ہوں گے، اس لیے وہ اس کٹھن کام پر آمادہ بھی ہو گئے اور اس سے عہدہ برآ بھی ہو گئے، بہرحال یہ قرعۂ سعادت اللہ نے ان کے نام لکھا ہوا تھا، جس سے وہ بہرہ مند ہو کر بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہو گئے۔ امید ہے وہاں وہ حکیم صاحب مرحوم اور ان کے ابنائے گرامی کے ساتھ اجرِ جزیل اور شکرِ عظیم کے مستحق ہوں گے۔ جعلنا الله منهم ع

ایں سعادت بہ زورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس تسہیل کے بعد اس کی اشاعت بھی کوئی آسان کام نہیں تھا، بالخصوص حکیم صاحب کے صاحب زادگانِ والا تبار کے لیے یہ تقریباً ناممکن تھا، کیوں کہ نشر و اشاعت کے کوچے سے وہ ناآشنا اور اس کی کٹھنائیوں سے بھی بے خبر تھے، چنانچہ حکیم عتیق الرحمان صاحب نے اس کی اشاعت کے لیے قدوسی برادران (مالکانِ مکتبہ قدوسیہ) سے رابطہ کیا، ان عزیزانِ گرامی نے اثبات میں جواب دیا تو یہ مسودہ ان کے سپرد کر دیا گیا۔ حکیم عتیق الرحمان صاحب نے جب راقم کو بتلایا کہ انھوں نے یہ تسہیل شدہ مسودہ مکتبہ قدوسیہ کو دے دیا تو راقم نے اس کی تحسین کی کہ یہ برادران مسلکی خدمت کے جذبے سے بھی سرشار ہیں اور وسائل کے علاوہ راہ و رسمِ اشاعت سے بھی آشنا ہیں۔

عزیزانِ گرامی نے ذوق و شوق میں یہ پتھر اٹھا تو لیا، لیکن شاید وہ اس کی گراں باریوں کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے اور خاطر خواہ سرگرمی سے اس پر کام جاری نہ رکھ سکے، تاہم ان برادرانِ گرامیِ قدر کو اس اعزاز (کریڈٹ) سے محروم نہیں قرار دیا جا سکتا کہ انھوں نے اس عظیم ذمے داری کا بارِ گراں اٹھانے کا عزم کیا اور اپنی سی کوشش بھی انھوں نے جاری رکھیں۔ انھوں نے اس کی کمپوزنگ بھی تقریباً کرا لی تھی، کچھ جلدوں کی پروف ریڈنگ بھی کرا لی تھی اور سست رفتاری سے کام ہو رہا تھا، جس کی وجہ غالباً یہی ہو گی کہ یہ کام بہت لمبا اور بڑا تھا۔ یہ تو ان عزیزانِ گرامی کا اخلاص اور جذبۂ خدمتِ دین و علم تھا کہ وہ اپنے محدود وسائل کے ساتھ اس کو جاری رکھے ہوئے تھے، جس میں دیر، سویر وہ کامیاب ہو ہی جاتے، کیوں کہ وہ نعمتِ اخلاص سے بھی بہرہ ور تھے اور عزم سے بھی سرشار۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی اشاعت کا مکمل سروسامان اس طرح مہیا فرما دیا کہ کویت کا عظیم سلفی ادارہ ''جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی'' کی لجنۃ القارۃ الہندیہ نے نواب صدیق حسن خان کی گراں قدر تالیفات کو اردو میں، اگر وہ پہلے ہی اردو میں ہیں تو ان کی تسہیل کر کے، شائع کرنے کا پروگرام بنایا، کیوں کہ وہ بہت بڑا علمی ذخیرہ اور نہایت قابلِ قدر سلفی ورثہ ہے، لیکن اس کی طباعت پر صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے اور خطرہ ہے کہ لیل و نہار کی

گردشوں اور بے مہریٔ ایام سے یا دست بردِ زمانہ سے وہ یکسر زاویۂ خمول میں چلا جائے اور اس سے استفادہ ناممکن ہو جائے یا وہ دیمک کی نذر ہو جائے۔

چنانچہ اس پروگرام کے تحت گوجرانوالہ پاکستان میں اس ادارے کے تحت قائم ''جمعیة المناهل الخیریة'' نے محترم جناب مولانا عارف جاوید محمدی اور حافظ شاہد محمود (فاضل مدینہ یونیورسٹی) کی سرپرستی اور نگرانی میں نواب صاحب کی درج ذیل کتابیں نئے انداز سے شائع کی ہیں:

① مجموعہ رسائل عقیدہ۔ اس میں عقیدے سے متعلق نواب صاحب کی پندرہ کتب و رسائل شامل ہیں۔

② مجموعہ علومِ قرآن۔ اس میں علومِ قرآن سے متعلق نواب صاحب کی چار کتب شامل ہیں۔

علاوہ ازیں دیگر نامور علمائے اہلِ حدیث کی مندرجہ ذیل کتب بھی اشاعت پذیر ہو چکی ہیں:

③ مجموعہ مقالات و فتاویٰ علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ۔

④ مجموعہ فتاویٰ استاذ الاساتذہ حافظ محمد عبداللہ غازی پوری رحمہ اللہ۔

⑤ مجموعہ فتاویٰ علامہ محمد عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ۔

⑥ مجموعہ رسائل استاذ الاساتذہ حافظ محمد عبداللہ غازی پوری رحمہ اللہ۔

⑦ مجموعہ رسائل مولانا احمد دین گکھڑوی رحمہ اللہ۔

⑧ تذکرہ مولانا احمد دین گکھڑوی رحمہ اللہ بقلم مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ۔

⑨ تذکرہ محدث العصر علامہ محمد عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ بقلم ملک عبدالرشید عراقی حفظہ اللہ۔

⑩ دارالحدیث رحمانیہ دہلی، تاریخ و تعارف بقلم مولانا محمد اسعد اعظمی حفظہ اللہ۔

⑪ اہلِ حدیث کی اولیات بقلم مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ۔

⑫ فتنۂ غامدیت بقلم راقم الحروف۔

اس کے علاوہ کچھ کتابیں ترجمہ و طباعت یا نظر ثانی کے مراحل میں ہیں، جن پر الحمد للہ کام جاری ہے۔

لجنۃ القارۃ الہندیہ کے رئیس فضیلۃ الشیخ فلاح خالد المطیری حفظہ اللہ نواب صاحب مرحوم کے ساتھ دلی محبت رکھتے ہیں اور اُن کی کتب کی اشاعت کے لیے نہایت محبت کے ساتھ کوشاں ہیں۔ اس سلسلے میں محترم المقام مولانا عارف جاوید محمدی حفظہ اللہ نے اُن سے تفسیر ترجمان القرآن کی تحقیق و طباعت کے سلسلے میں مشورہ لیا تو انھوں نے بہ خوشی اس عظیم منصوبے کی منظوری دے دی۔ پھر حافظ شاہد محمود حفظہ اللہ نے مکتبہ قدوسیہ کے برادرانِ گرامی سے عرض کیا کہ گوجرانوالہ میں یہ ادارہ بطورِ خاص نواب صاحب رحمہ اللہ کی تالیفات از سرِنو شائع کر رہا ہے۔ نواب صاحب کی یہ تفسیر

بھی جو آپ کے اشاعتی پروگرام میں اگرچہ شامل ہے، لیکن اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود شائع نہیں کی جا سکی تو یہ منصوبہ (پروجیکٹ) بھی ہمارے سپرد کر دیں، جسے انھوں نے بخوشی منظور کر لیا اور اصل اور کمپوز شدہ مسودہ دار ابی الطیب گوجرانوالہ کے سپرد کر دیا۔ جزاهم الله أحسن الجزاء.

① حافظ شاہد محمود صاحب نے اپنے رفقا سمیت اس پر کام شروع کر دیا، ابتدائی مرحلے میں انھوں نے مسودے کا جائزہ لیا اور جہاں ضرورت محسوس ہوئی، اصل مسودے کے ساتھ تسہیل شدہ یا کمپوز شدہ مسودے پر نظر ثانی کر کے اس میں اصلاح و ترمیم اور حک و اضافہ کیا۔ عربی عبارات کا اصل مصادر سے موازنہ کیا، اشعار کے ترجمے کا اہتمام کیا اور اصل کتاب سے مقارنہ کر کے اس کتاب میں تمام مباحث کو علی حالہا باقی رکھا۔

② کمپوزنگ کے بعد اس کی تصحیح کر کے راقم کے پاس بھیجا، جس پر راقم نے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نظرِ ثانی کی اور کہیں کہیں توضیحی حواشی بھی تحریر کیے۔

③ سب سے بڑا کام جو اس نئے اِڈیشن میں کیا گیا ہے، وہ احادیث کی تحقیق و تخریج کے بعد احادیث کی صحت و ضعف کی صراحت ہے۔

یہ تفسیر چونکہ قدیم طرز ہی پر لکھی ہوئی ہے، جس میں احادیث کی صحت و ضعف کا خصوصی اہتمام نہیں ہوتا تھا، لیکن اب تحقیقِ حدیث کا ذوق الحمد للہ عام ہو گیا ہے، لیکن یہ ذوق اب بھی اہلِ حدیث تک ہی محدود ہے، کیوں کہ اہلِ حدیث کا تو سارا مسلک ہی قرآن کے ساتھ صرف حدیث سے تمسک ہے اور حدیث سے مراد، صرف مرفوع متصل صحیح حدیث ہے نہ کہ ضعیف، موضوع یا مرسل روایت، جب کہ غیر اہلِ حدیث کے ہاں حدیث کی حیثیت ثانوی ہے اور اولیت فقہا کے اقوال و آرا کو حاصل ہے، لیکن یہ تاثر دینے کے لیے کہ وہ بھی حدیث کی اہمیت کے قائل ہیں، اقوالِ فقہا کو ضعیف و مرسل، حتی کہ موضوع روایات کے ذریعے سے ثابت کرنے میں کوئی تأمل نہیں کرتے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر انھوں نے محدثین کے نقد و تحقیقِ حدیث کے مسلمہ اور فطری اصولوں کے مقابلے میں ایسے اصول وضع کر لیے ہیں، جن کی رو سے ضعیف و مرسل روایات کو صحیح باور کرایا جا سکے۔ نیز صحیح احادیث کو بہ لطائف الحیل، یعنی خوش نما عنوانات کے ذریعے سے رد کیا جا سکے، تاکہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یعنی احادیثِ صحیحہ سے جان بھی چھوٹ جائے اور ردِ احادیث کا الزام بھی نہ آئے۔ ع

دراز دستی ایں کوتاہ آستیناں بیں

بہر حال اہلِ حدیث صرف صحیح حدیث کے قائل اور اسی کے عامل ہیں (حسن بھی صحیح ہی کی قسم ہے) اس لیے حدیث کے معاملے میں قطعاً ان کے کوئی ذہنی تحفظات نہیں ہیں، اس لیے وہ پورے شرح صدر کے ساتھ محدثین کے

مسلمہ اصول وضوابط کی روشنی میں حدیث کی تحقیق کرتے اور اُسی کو مدارِ استدلال بناتے ہیں۔

بنا بریں اس تفسیر کے اس خلا کو پر کرنے یا اس کمی کا ازالہ کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے اور تحقیق وتخریج کے بعد احادیث کی صحت وضعف کی صراحت کر دی گئی ہے۔

یہ کام بلاشبہہ نہایت عرق ریزی اور جان کاہی کا ہے، لیکن چونکہ یہ نہایت ضروری تھا، اس لیے جمعیت احیاء التراث الاسلامی کی خواہش پر اس کی ذمے داری حافظ شاہد محمود ﷾ اور حافظ حامد مشتاق صاحب نے اٹھائی ہے اور وہ اسے اپنے رفقا کی معاونت سے بخوبی سرانجام دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے اور اس کی تکمیل کی توفیق سے نوازے۔

اس گراں قدر اور تاریخی تفسیر کی اشاعت میں، جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے، کویت کے ادارہ ''جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی'' میں ''لجنۃ القارۃ الہندیۃ'' کے مدیر اور روحِ رواں فضیلۃ الشیخ فلاح خالد المطیری اور ان کے مشیر و معاونِ خصوصی جناب عارف جاوید محمدی ﷾ کا شکریہ بھی ادا کرنا نہایت ضروری ہے کہ ﴿ من لم يشكر الناس لم يشكر الله ﴾ (جامع ترمذی) واقعہ یہ ہے کہ انھی کی توجہِ گرامی اور حسنِ مساعی سے اس عظیم تفسیر کی اشاعت کا یہ ہفت اقلیم طے ہوا ہے، اور اس کے ساتھ اس کتاب کی طباعت و اشاعت میں مکتبہ قدوسیہ کے مالکان عزیزانِ گرامی جناب ابو بکر قدوسی اور عمر فاروق قدوسی سلمہما اللہ تعالیٰ بھی شریک و سہیم ہیں، جن کے اشتراک سے یہ کتاب قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کے کام ہیں، وہ جس کو چاہے اپنے دین کی خدمت سے نوازے اور توفیقِ مرضیات سے بہرہ ور فرما دے۔ شكر الله مساعيهما وجزاهما الله عن الإسلام والمسلمين خير الجزاء وبارك في عمرها وجهودهما. آمين ويرحم الله عبداً قال آمينا.

ابھی پانچ پاروں پر مشتمل یہ پہلی جلد ہے، ظاہر بات ہے اس انداز سے مکمل تفسیر کی اشاعت بہت عظیم منصوبہ ہے، قارئین کرام، بالخصوص اہلِ علم وتحقیق نہ صرف دعا فرمائیں، بلکہ تسلسل کے ساتھ دعائیں جاری رکھیں کہ حکیم عبدالمجید ﷫ سے لے کر درجہ بدرجہ جو حضرات بھی اس کارِ خیر میں شریک رہے ہیں اور شریک ہیں، اور ابھی جو شریک ہوں گے، اللہ تعالیٰ ان سب کی کوششوں کو قبول فرمائے اور سب کو اجرِ جزیل سے نوازے اور جلد از جلد اس کی تکمیل فرما دے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!

حافظ صلاح الدین یوسف

40 / 124 شاداب کالونی علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو، لاہور

رمضان المبارک ۱۴۳۷ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تفسیر ترجمان القرآن...تعارف اور اسلوب

قرآنِ مجید کے معانی اور مطالب کی توضیح کے لیے ہر دور میں علمائے اسلام نے گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں اور تمام امکانی وسائل کو بروئے کار لا کر قرآنی پیغام کو عوام تک پہنچانے کی ذمے داری ایک شرعی فریضہ سمجھ کر نبھائی ہے۔ اس سلسلے میں ایک طرف تو تدریسی حلقوں اور تعلیمی مجالس کے انعقاد کے ساتھ یہ مقصد حاصل کیا گیا اور دوسری طرف تحریری کاوشوں کے ذریعے سے قرآنِ مجید کی تشریح اور مختلف زبانوں میں تراجم و تفاسیر لکھ کر قرآنی دعوت تک عام لوگوں کی رسائی کو ممکن بنایا گیا۔

برصغیر پاک و ہند میں اسلام کے آغاز ہی کے ساتھ اہلِ علم نے قرآنِ مجید کے ایضاح و بیان کی ذمے داریوں کو محسوس کیا اور یہاں کی مختلف زبانوں میں قرآنی تراجم و تفاسیر کی طرح ڈالی، جس کے نتیجے میں قرآنِ کریم کے متعدد تراجم اور تفاسیر منظرِ عام پر آئیں، جن سے قرآن فہمی میں مدد ملی۔ اس ابتدائی دور میں جن تراجم کو سب سے زیادہ شہرت ملی اور قبولِ عام حاصل ہوا، وہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (وفات: ۱۱۷۶ھ) کا فارسی ترجمہ قرآن ''فتح الرحمٰن'' اور ان کے صاحب زادگان شاہ رفیع الدین (وفات: ۱۲۴۹ھ) اور شاہ عبدالقادر (وفات: ۱۲۴۲ھ) کے اردو تراجم ہیں۔ اگرچہ ان تراجم سے قبل بھی کچھ مکمل اور نامکمل ترجمے ہو چکے تھے، لیکن انھیں وہ شہرت نہ مل سکی جو ولی اللہی خاندان کے ان تراجم کے حصے میں آئی۔[1]

اسی ولی اللہی تحریک کے ایک اہم رکن اور علمبردار مجدد العلوم الاسلامیہ والا جاہ نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ بھی ہیں، جو اپنے والدِ گرامی مولانا اولاد حسن قنوجی (وفات: ۱۲۵۳ھ) اور اپنے استاد مفتی صدر الدین آزردہ (وفات: ۱۲۸۵ھ) کے توسط سے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (وفات: ۱۲۳۹ھ) کے شاگرد ہیں۔ نواب صاحب مرحوم نے قرآنی پیغام کو آسان تر بنانے کے سلسلے میں ان اردو تراجم کے بعد قرآنِ مجید کی ایک مفصل تفسیر کی ضرورت کے پیشِ نظر تفسیر بالماثور کے طریقے پر ائمہ اسلام کی معتبر تفاسیر سے خوشہ چینی کرتے ہوئے یہ عظیم الشان اردو تفسیر لکھی۔

چناں چہ نواب صاحب مرحوم دیباچہ تفسیر میں لکھتے ہیں:

''چونکہ اللہ کا کلام عربی میں ہے اور ہندوستان وغیرہ کے لوگوں کے لیے اس کا سمجھنا محال تھا، اس لیے پہلے ہندوستان میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے فارسی زبان میں ''فتح الرحمٰن'' کے نام سے قرآنِ مجید کا ترجمہ

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: قرآنِ حکیم کے اردو تراجم از ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم (ص: ۷۹)

کیا، پھر ان کے فرزندِ بزرگوار شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے ''موضح قرآن'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔ جس طرح فارسی ترجمے سے اہلِ علم نے خوب فائدہ اٹھایا، اسی طرح اس اردو ترجمے سے بھی اہلِ ہند کو بڑا نفع ہوا۔

''دنیا میں قرآنِ کریم کی بے شمار تفسیریں لکھی گئی ہیں۔ یہ تفسیریں سب سے زیادہ عربی میں ہیں۔ کچھ فارسی میں اور چند ایک اردو میں بھی ہیں۔ اس لیے اہلِ دین کی ایک جماعت مدت سے مجھے یہ بات کہہ رہی تھی کہ تم اُردو زبان میں ایک ایسی تفسیر لکھو، جو نہ زیادہ لمبی چوڑی ہو نہ مختصر، بلکہ متوسط (درمیانی) ہو، جس سے قرآن کا مطلب سمجھنا آسان اور کم علم لوگوں کے لیے ہدایت کا راستہ واضح ہو جائے۔ مجھے اتنی فرصت کہاں تھی کہ میں اس کام کا ارادہ کرتا، لیکن جب تقاضا زیادہ ہوا تو چار و ناچار رمضان المبارک ۱۳۰۲ھ دوشنبہ (سوموار) سے میں نے اس تفسیر کو لکھنا شروع کر دیا۔''[1]

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب کا مقصود اردو زبان میں ایک درمیانے درجے کی تفسیر لکھنا تھا، جو قرآنِ مجید کے معانی کی وضاحت کے لیے کافی ہو اور عوام کے سامنے قرآن فہمی کا دروازہ کھول دے، اسی لیے تفسیر میں صَرف ونحو اور معانی وقراءات کے زیادہ ادق مسائل سے احتراز کیا ہے۔ چناں چہ موصوف دیباچے میں لکھتے ہیں:

''اس تفسیر سے غرض یہ ہے کہ عام اہلِ اسلام اپنی زبان میں اللہ کا کلام سمجھ لیں اور قرآن شریف کا مطلب معلوم کر لیں۔ اسی لیے جو باتیں زیادہ علمی تھیں اور ان کا سمجھنا عام لوگوں کے لیے مشکل تھا، جیسے صَرف ونحو، معانی و بیان اور اختلافِ قراءات وغیرہ کے مسائل، ان کو اس تفسیر میں بیان کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ صرف کتاب اللہ کے مقاصد کی وضاحت کو پیشِ نظر رکھا ہے۔''

چوں کہ نواب صاحب مرحوم کے پیشِ نظر قرآنی مقاصد کی وضاحت اور مطالب کی عام فہم توضیح تھی، اس لیے انھوں نے اپنی تفسیر میں ہر طرح کے رطب و یابس، اسرائیلی روایات اور پیچیدہ باتوں سے احتراز کرتے ہوئے تفسیر بالماثور کا منہج اختیار کیا ہے اور عموماً صرف وہی معلومات درج کی ہیں، جو احادیثِ نبویہ اور آثارِ سلف میں منقول ہیں۔ نواب صاحب فرماتے ہیں:

''قرآن شریف کی جو تفسیر رسول اللہ ﷺ کی حدیث یا صحابہ وتابعین یا تبع تابعین یا لغتِ عرب سے ثابت ہے، صرف وہی تفسیر اس میں لکھی گئی ہے، کیوں کہ اللہ کے پاک کلام کا جیسا مطلب رسول اللہ ﷺ اور خیر القرون یعنی صحابہ وتابعین و تبع تابعین کے ادوارِ ثلاثہ کے لوگوں نے سمجھا ہے، ویسا مطلب کوئی عالم بیان نہیں کر سکتا۔ نیز اپنی یا غیر کی رائے سے قرآن کے معانی بیان کرنا یا اس میں معقولات کی آمیزش کرنا ممنوع اور گناہ ہے۔ قابلِ اعتماد تفسیر صرف وہ ہے، جو سلف سے نقل ہو کر ہم تک پہنچی ہے۔''

---

[1] یہ ایک صدی پیشتر کی بات ہے، جب اردو کی بیشتر تفاسیر، جو اِس وقت موجود ہیں، ان میں سے کوئی بھی نہ تھی۔ اس اعتبار سے ترجمان القرآن کو اردو کی پہلی مفصل تفسیر قرار دینا شاید غلط نہ ہو۔

نواب صاحب مرحوم نے اگرچہ تمام اہم تفاسیر اور تفسیری مآخذ سے استفادہ کیا ہے اور ان کی عبارات جا بہ جا درج کی ہیں، لیکن اپنی تفسیر میں زیادہ اعتماد امام ابن کثیر اور امام شوکانی کی تفاسیر پر کیا ہے، جو سلفی تفاسیر کی نمائندہ کتب ہیں۔

تفسیر ترجمان القرآن کی نمایاں خصوصیات:

ذیل میں اس تفسیر کی چند اہم اور نمایاں خصوصیات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے، تاکہ مطالعے سے قبل اس کی افادیت ہمارے سامنے آسکے۔ آیندہ سطور میں محترم جناب عبدالرزاق گوندل کے پی ایچ ڈی کے مقالے ''نواب صدیق حسن خان کا تفسیری منہج اور تفسیر ترجمان القرآن کا تفسیری ادب میں مقام'' سے استفادہ کیا گیا ہے۔

① تفسیر ترجمان القرآن اردو زبان میں تفسیر بالماثور کی نمایندہ تفسیر ہے، جو سلفِ امت کے طریقۂ تفسیر کی مکمل ترجمانی کرتی ہے۔ اس میں عمومی طور پر آیات کی تفسیر میں قرآنی آیات، احادیثِ نبویہ اور آثارِ سلف کو پیش کیا جاتا ہے اور حسبِ ضرورت لغتِ عرب سے استشہاد بھی کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں نواب صاحب مرحوم کی عبارت سے ایک اقتباس اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔ ایسے ہی اپنی تفسیر کے مقدمے میں نواب صاحب تفسیرِ قرآن کا صحیح طریقہ تفصیلاً لکھنے کے بعد فرماتے ہیں:

> ''معلوم ہوا جب قرآن کی تفسیر کرے تو حتی الامکان پہلے قرآن پاک ہی سے کرے، پھر سنتِ مطہرہ سے، پھر اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے، پھر اجماعِ تابعین رحمہم اللہ سے اور پھر لغتِ عرب سے۔ یہ پانچ مرتبے ہوئے۔ اپنی طرف سے ہرگز کوئی بات نہ کہے، اگرچہ اچھی ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ رائے سے تفسیر کرنے والے کو جہنمی فرمایا گیا ہے۔''

② نواب صاحب مرحوم نے اپنی تفسیر میں نہ صرف قرآنِ مجید کے مطالب و مقاصد کی طرف توجہ کی ہے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ عقائد و ایمانیات سے متعلقہ مسائل کی طرف بھی بھرپور عنانِ توجہ مبذول کی ہے، چناں چہ کم ہی کوئی سورت اور ضروری مقام ہوگا، جس میں عوام الناس کے عقائد کی خرابیوں کا تذکرہ اور ان کی اصلاح پر زور نہ دیا گیا ہو۔

نواب صاحب مرحوم نے جا بہ جا توحید اور اس کی انواع اور شرک اور اس کی اقسام پر مفصل روشنی ڈالی ہے اور ہمارے معاشرے کے شرکیہ عقائد اور بدعی نظریات پر کھل کر نقد کیا ہے، اس سلسلے میں علمِ غیب، مختارِ کل، مشکل کشا، وسیلہ و شفاعت، غیر اللہ کے لیے سجدہ اور نذر و نیاز جیسے غلط افکار کو بالخصوص ہدفِ تنقید ٹھہرایا گیا ہے، مثلاً ایک جگہ غیر اللہ کے لیے علمِ غیب کے شرکیہ عقیدے پر نقد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ بات کسی صریح آیت سے ثابت ہے نہ کسی صحیح حدیث سے کہ نبی اکرم ﷺ کو سارے مرقومات و مکتوبات لوح وقلم کا علم حاصل تھا، بلکہ خود آپ ﷺ نے اپنے نفس مبارک سے علم غیب کی نفی کی ہے، جس کو عموماً وشمولاً ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ﴾ [الأعراف: ۱۸۸] ''اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کر لیتا اور مجھ کو کوئی نقصان نہ پہنچتا۔'' بلکہ اس بات کا اظہار امت کی آگاہی کے لیے اللہ علام الغیوب کے حکم سے کیا، تاکہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ پیغمبر کو علم غیب نہیں ہوتا۔ پھر صحیح حدیث میں ایک جزوی معاملے کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا: « لَوِ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ أَمْرِيْ مَا اسْتَدْبَرْتُ مَا سُقْتُ الْهَدْيَ » معلوم ہوا کہ آپ کو امور کے انجام سے بالکل بے خبری رہتی تھی۔ جتنی بات اللہ پاک کی طرف سے بتا دی جاتی تھی، اسی کا علم ہوتا تھا نہ کہ سارے ذاتی اور مخلوق کے معاملات کا۔ یہی عقیدہ رکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے، اور جو کوئی یہ سمجھے کہ رسول اللہ ﷺ یا پہلے انبیا یا ملائکہ مقربین یا اولیائے متقین یا صلحائے متبعین یا ائمۂ دین یا مجتہدین شرع مبین عالم الغیب ہیں تو وہ بالیقین مشرک ہے نہ کہ زمرۂ مومنین مسلمین میں۔''[1]

ایسے ہی ایک مقام پر ہمارے ہاں پائے جانے والے شفاعت کے غلط نظریے پر یوں تنقید کرتے ہیں:

''اہل بدعت جن کو یہ گھمنڈ ہے کہ ہم جو پیروں اور بزرگوں کے نام پر نذر و نیاز دیتے ہیں، کسی کا عرس اور کسی کی قبر پر طواف بجا لاتے ہیں، کسی کے نام پر جانور ذبح کرتے ہیں، کسی سے مدد مانگتے ہیں اور فریاد کرتے ہیں، ان سے مریض کے لیے شفا طلب کرتے ہیں، عطائے ولد کر کے قبور پر پیش کش لاتے ہیں، وہ اولیا، علما، مشائخ، صوفیہ قیامت کے روز ہماری شفاعت کر کے ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا کر بہشت میں لے جائیں گے، یہ محض ان کا خیال باطل، جھوٹا گمان اور بے کار وہم ہے۔ بلاشبہہ انبیا علیہم السلام کے علاوہ دیگر صلحا، شہدا، علما، اطفال اور ملائکہ گناہگاروں کے سفارشی ہوں گے، لیکن شفاعت اسی کے واسطے ہوگی جس نے کسی کو اللہ کی عبادت اور ربوبیت میں کھلے چھپے شریک نہ کیا ہوگا۔ اگر باوجود ایمان و اسلام کے اقرار، نماز، روزہ، حج، زکات اور جہاد کے وہ عقیدہ یا عمل میں مشرک تھا، خواہ ذرہ برابر شرک کیوں نہ ہو تو اس کی شفاعت نامعلوم ہے۔ یہ تو شیطان کا ایک دھوکا ہے، جو اس نے ان لوگوں کو دے رکھا ہے۔''[2]

ایسے ہی اپنے اپنے اماموں اور مذاہب کی تقلید میں گرفتار ہو کر جو لوگ قرآن و سنت کے چشمۂ صافی سے اپنے عقائد و اعمال کو منور نہیں کرتے، ان پر بھی نواب صاحب مرحوم نے نقد کیا اور انھیں تقلید سے ہٹ کر اتباع سنت کا

---

(1) ترجمان القرآن بلطائف البیان (سورۃ الاعراف، آیت نمبر ۱۵۸)

(2) مصدر سابق.

راستہ اختیار کرنے کی دعوت دی ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت (۱۷۰) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یہ آیت اس بات پر ایک مضبوط دلیل ہے کہ جو بات دلیل کے بغیر پیش کی جائے، اس پر غور وفکر کرنا اور دلیل طلب کرنا واجب ہے۔ یا کوئی غیر اگر کوئی بات کہے تو اس پر بغیر دلیل کے اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔

''امام بیضاوی رحمہ اللہ نے آیت زیرِ تفسیر کے تحت لکھا ہے کہ یہ آیت تقلید کی ممانعت پر اس شخص کے لیے دلیل ہے، جو نظر و اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ کی یہ بات کچھ ٹھیک نہیں، کیوں کہ ہر شخص نظر و اجتہاد کی قدرت نہیں رکھتا، جب نہیں رکھتا تو کیا اب اس کو تقلید کرنا چاہیے؟! حالاں کہ اہلِ اسلام کا، خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، کسی حالت میں بھی فروع و احکام میں تقلید کرنا صحیح نہیں۔ یہ تو عالم کی شان ہی کے لائق نہیں کہ وہ علم حاصل کر کے جاہلوں میں (بذریعہ تقلید) جا ملے۔

''اور جو جاہل ہے، اس کو اتنا کافی ہے کہ کتاب وسنت کے عالم سے ہر مسئلہ وحکم کا حال اس طرح دریافت کر لیا کرے کہ اس مسئلے میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا ارشاد اور حکم ہے؟ اس آیتِ شریفہ کے یہی معنی ہیں: ﴿ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [النحل: ۴۳] ''لہٰذا تم اہلِ ذکر (اہلِ کتاب) سے پوچھ لو، اگر تم علم نہیں رکھتے۔'' ذکر قرآن کا نام ہے۔ اہلِ ذکر سے علمائے کتاب اللہ مراد ہیں۔ کتاب کا عالم وہی ہوتا ہے جو علومِ سنتِ مطہرہ پر عبور رکھتا ہے۔ ایسا شخص قیامت تک ہر مسئلے کا جواب قرآن و حدیث کی نصِ صریح یا کلیات یا عمومی احکامات سے دے سکتا ہے، وہ نہ تو کسی کی فقہ اور رائے کا محتاج ہے اور نہ قیاس کا آرزومند۔

بقول مصطفیٰ زائر ز رائے دیگران ماندم　　شہود یار مانع گردد از اغیار عاشق را

''محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی وجہ سے میں دوسروں کی رائے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، کیوں کہ یار کا وصل و ملاقات عاشق کو غیروں کی جانب دیکھنے سے بے نیاز کرتا اور روک دیتا ہے۔''

۳ صفاتِ الٰہیہ کے بیان میں نواب صاحب نے ائمہ سلف کی راہ اختیار کی ہے اور انھیں کسی تاویل، تشبیہ اور تعطیل کے بغیر ویسے ہی ذکر کیا ہے، جیسے صحابہ و تابعین اور ائمہ سنت نے بیان کیا ہے۔ نواب صاحب مرحوم سورۃ البقرہ کی آیت (۲۱۰) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یہ آیتِ شریفہ آیاتِ صفات میں سے ہے۔ اس بارے میں علما کے دو مذہب ہیں: ایک ایمان، تسلیم اور ظاہر صورت کے مطابق اعتقاد کا واجب ہونا اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو تشبیہ، تمثیل، تحریف اور تعطیل سے پاک سمجھنا۔ سلفِ امت اور ائمہ ملت اسی طرف گئے ہیں۔ امام ابن عیینہ، زہری، اوزاعی، مالک،

ابن مبارک، لیث، امام احمد اور ابن راہویہ رحمہم اللہ کا یہ قول ہے کہ آیاتِ صفات کو جس طرح آئی ہیں، اسی طرح بغیر کسی کیفیت، تشبیہ اور تاویل و تعطیل کے جاری کرنا چاہیے۔ اہلِ سنت کے تمام اَعلام (بڑے بڑے علمائے کرام) اسی کے معتقد ہیں۔

''دوسرا مذہب یہ ہے کہ ہر مقام کی مناسبت سے ایسی تاویل کرنی چاہیے، جس سے باری تعالیٰ کی پاکیزگی ثابت ہو۔ جمہور علمائے متکلمین اور اَصحابِ نظر کا یہی مسلک ہے۔ مثلاً آیت زیرِ تفسیر کے بارے میں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے آنے سے اللہ کی آیات یا امر یا عذاب کا آنا مراد ہے۔ لیکن یہ مذہب سلفِ امت اور ائمۂ ملت کے مذہب کے خلاف ہے، اس کی وضاحت ہمارے رسالہ ''انتقادِ رجیح'' اور رسالہ ''فتح الباب'' میں کی گئی ہے۔ جب ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ﴾ [الشوریٰ: ۱۱] صحیح اعتقاد ٹھہرا تو اب کسی تشبیہ اور تمثیل کا لازم آنا ظاہر عبارت میں کوئی نقصان نہیں کر سکتا۔ یہ اجمالی کلمہ، تشبیہ و تمثیل کے توڑ کے لیے کافی اور شافی ہے۔ اس عقیدے کی نفی میں یہ کلمہ: ﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝۵ ﴾ [طٰہٰ: ۵] ''وہ رحمن ہے، عرش پر مستوی ہے۔'' ہی کافی ہے۔''

نیز ایک مقام پر رقم طراز ہیں:

''میں کہتا ہوں کہ سلف نے آیات و احادیث کو، جو صفاتِ الٰہی کو بیان کرتی ہیں، ظاہر ہی پر جاری کیا تھا، بغیر غور و خوض کیے کہ وہ کیسی اور کتنی ہیں۔ اور ان کا عقیدہ تھا کہ ذاتِ الٰہی کسی قسم کی تشبیہ اور تجسیم سے پاک اور منزہ ہے۔ وہ تشبیہ اور تمثیل کا علاج ایک کلمہ اجمالیہ سے کرتے تھے کہ ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ﴾ ''اس جیسی کوئی چیز نہیں۔'' یا ﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴾ ''اس کا کوئی ہم سر نہیں۔'' خلف کی سعادت مندی اور نجاتِ اخروی اسی میں ہے کہ وہ سلف کی راہ پر چلیں، ہر قسم کی تاویل اور غلط عقیدہ وغیرہ کی آفت سے اپنے آپ کو بچا کر رکھیں۔ جس معاملے میں ہم کو غور و خوض کرنے کا حکم نہیں، نہ ہی کوئی دلیل تاویل کے واجب ہونے پر موجود ہے، لیکن تینوں زمانے جن کی خیر کی شہادت دی گئی تھی اور چاروں ائمہ مجتہدین اور سارے محدثین کرام اس معاملے میں کسی تاویل و توجیہ کے بغیر ظاہری احکام اور سنن پر گزر گئے ہیں، تو اب پچھلے لوگ ان سے کیا خاک بہتر طریقہ، جو زیادہ علم اور سلامتی والا ہو، نکال سکتے ہیں، جب کہ امتِ اسلام نے اللہ پاک کی ان صفتوں کو من و عن تسلیم کر لیا ہے، جو کتاب اللہ اور سنتِ مطہرہ میں وارد ہوئی ہیں، اور اللہ پاک کو مخلوقات و کائنات کی ہر قسم کی تشبیہ سے پاک اور منزہ یقین کر لیا تو اب اعتقادِ تجسیم کہاں باقی رہا؟ ہزار بار کوئی ظاہر صیغہائے مذکورہ سے اللہ کی جسمیت ثابت کرے یا سمجھا کرے، مگر ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ﴾ کی نفی اس کے لیے سیف قاطع ہے، جس طرح کہ ﴿ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴾

عدمِ تمثیل پر ایک روشن حجت ہے۔ وباللہ التوفیق.

''یہ ایک بڑا معرکہ آرا مسئلہ ہے جس کی وجہ سے قدیماً و حدیثاً دنیا میں بڑے بڑے طوفان اور زلزلے واقع ہو چکے ہیں۔ جاہل متکلمین نے، جو فلسفیوں کا سا مزاج رکھتے تھے، سلف پر کفر و ضلالت کے فتوے لگائے اور لوگوں کے بنائے ہوئے مذاہب کے مقلدین نے بڑے بڑے ائمہ دین کے حق میں بے ادبی ظاہر فرمائی، حالانکہ یہ کچھ ایسی مشکل بات نہیں تھی، جس پر یہ ہنگامہ قائم ہوا۔''

(تفسیر ترجمان القرآن: ۳/ ۶۷۔ سورۃ الأعراف: آیت: ۵۴)

مسئلہ استوا کے متعلق عقیدہ اہلِ سنت و اصحاب الحدیث کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''استوا علی العرش کے مسئلے میں چودہ اقوال ہیں، سب سے زیادہ حق پر اور بہتر وہی سلف صالح کا مذہب ہے کہ اللہ عرش پر مستوی ہے بغیر کیفیت معلوم ہونے کے، جس طرح اس کی شانِ عظیم کے لائق ہے اور وہ ان تمام چیزوں سے پاک ہے جو اس کے لیے جائز نہیں۔ لغتِ عرب میں استوا بمعنی بلندی اور قرار پانے کے ہے۔ معتزلہ نے کہا: یعنی استیلا وظہور ہے۔ متکلمین کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔ ابو عبیدہ نے کہا کہ اس جگہ استوا کے معنی علو اور ارتفاع کے ہیں۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے ایک رسالہ مستقلہ لکھا ہے، جس میں جملہ صفاتِ ربانی کو ظاہر طور پر قبول کرنے کو ثابت کیا ہے، ان صفات میں سے ایک صفتِ استوا بھی ہے۔ اس رسالے میں تفویض کو مختار اور تاویل کو غیر مختار ٹھہرایا ہے، حتی کہ معیت اور قرب وغیرہ کی تاویل سے بھی منع کیا ہے۔ ظاہر طور پر تمام صفات پر ایمان لانے کو واجب لکھا ہے۔ مسئلہ استوا میں بڑی تالیف اور کمال کی تصنیف جس میں بہت تحقیق اور تدقیق اس مسئلے کی دی گئی ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے شاگردِ رشید حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بلند اور اوپر ہونے کے بارے میں مستقل کتابیں اور رسالے لکھے ہیں، ان کو صفاتِ الٰہی کے ثابت کرنے میں ایک عجیب طرح کی دلچسپی تھی۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ توحید اور اتباع کے جو مباحث اور مسائل ان حضرات نے ہم جیسے غریبوں کو اپنے سچے بیانوں اور تحریروں میں بتائے ہیں، وہ دوسرے اہلِ علم حضرات کی تالیفات میں اس تفصیل اور وضاحت کے ساتھ میسر نہیں آتے۔ جزاھم اللہ عنا خیراً۔

''حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی ایک کتاب ''العلو'' اور دوسری کتاب ''العرش'' اس بارے میں لکھی ہے، آیات واحادیثِ واردہ کو تتبع کر کے یکجا جمع کیا ہے۔ متکلمینِ مذاہب کا یہ کہنا کہ محدثین اس مسئلے میں مجسمہ ہیں، افترائے مذہبِ جدید اور ناروا زیادتی ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: ''استوا کچھ مجہول نہیں ہے، کیفیت

معلوم نہیں ہے، استوا کا اقرار ایمان ہے اور اس کا انکار کفر ہے۔'' (أخرجه ابن مردويه) مالک بن انس سے بھی اسی طرح مروی ہے۔ اتنا زیادہ کہا ہے کہ استوا کی حالت کے متعلق سوال کرنا بدعت ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا قول اور امام مالک کا قول سب سے زیادہ مضبوط قول اور سب سے صحیح مذہب ہے۔ سارے سلف اسی عقیدے پر گزرے ہیں، اس سے زیادہ کچھ پوچھنا یا کہنا بدعت ہے۔''

(ترجمان القرآن: ۳/ ۶۹۔ سورۃ الاعراف: ۵۴)

نواب صاحب مرحوم نے اپنی تفسیر میں ہر جگہ اسما و صفات کے باب میں فرق ضالہ جہمیہ، معتزلہ، اشاعرہ اور مرجیہ کے گمراہ کن افکار کی تردید کی ہے اور اس ضمن میں صفاتِ باری تعالیٰ: کلامِ الٰہی، علم و قدرت، رؤیتِ باری تعالیٰ اور ایمان میں کمی اور زیادتی وغیرہ مسائل کے بیان میں ائمہ سلف کی راہ اختیار کی ہے۔ یہ خوبی عموماً ہمارے ہاں کی اردو تفاسیر میں ناپید ہے۔ برصغیر میں شاید نواب صاحب مرحوم واحد مصنف ہوں گے، جنھوں نے عقائد و ایمانیات کے متعلق اردو، عربی اور فارسی میں پچاس کے قریب کتب تصنیف کی ہیں، جن میں ایمانیات سے متعلق تمام مسائل کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ اپنی تفسیر میں بھی نواب صاحب حسبِ موقع تفصیلی راہنمائی کے لیے اپنی دیگر کتب کی طرف احالہ کرتے ہیں، تاکہ شائقین تفصیل کے لیے ان کتب کی طرف رجوع کریں۔

④ زیرِ نظر تفسیر کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں عام تفاسیر کے برعکس اسرائیلی روایات پر اعتماد نہیں کیا گیا، بلکہ ان کے متعلق صحیح منہج اختیار کرتے ہوئے ان کی درجہ بندی کی گئی ہے اور اسی کے مطابق انھیں تفسیر میں جگہ دی گئی ہے۔ نواب صاحب مرحوم نے اپنے پیشرو ائمہ دین امام ابن تیمیہ، ابن کثیر اور شوکانی رحمہم اللہ کی طرح اسرائیلی روایات کو تین حصوں میں تقسیم کر کے تینوں کا الگ الگ حکم بیان کیا ہے۔ چناں چہ اپنی تفسیر کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''اسرائیلی روایات تین قسم کی ہیں: ایک وہ جن کی صحت کا ہمیں علم ہے، سو وہ روایات صحیح ہیں۔ دوسری وہ جن کا جھوٹ ہونا ہمیں معلوم ہے اور وہ ہماری ملت و شریعت کے خلاف ہیں۔ تیسری وہ جن کے متعلق ہمارا دین خاموش ہے۔ ان کا بیان کرنا، اگرچہ جائز ہے، لیکن ہمیں ان کی تصدیق کرنی چاہیے نہ تکذیب، لیکن ان کے ذکر کرنے میں اکثر دین کا کوئی فائدہ بھی نہیں، مثلاً: اصحابِ کہف کے نام کیا تھے؟ کتے کا رنگ کیا تھا؟ ان کی تعداد کتنی ہے؟ موسیٰ علیہ السلام کا عصا (لاٹھی) کس درخت کی لکڑی کا تھا؟ ان پرندوں کے نام کیا تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے لیے زندہ کر دیا تھا؟ گائے کا وہ کون سا حصہ تھا، جس کے لگانے سے بنی اسرائیل کا مقتول شخص زندہ ہو گیا تھا؟ جس درخت کے پاس اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے بات چیت کی تھی، وہ کون سا درخت تھا؟

''ان چیزوں کو جب اللہ پاک نے قرآن شریف میں مبہم رکھا ہے تو ان کی تعیین یا وضاحت میں دین کا کوئی فائدہ ہے نہ دنیا کا کوئی نفع، البتہ اختلافی بات نقل کرنا ممنوع نہیں ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے بھی اختلافی بات نقل کی ہے: ﴿ سَيَقُولُونَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴾ [الکھف: ٢٢] ''عن قریب (کچھ لوگ) کہیں گے: وہ تین ہیں ان کا چوتھا ان کا کتا ہے۔ اور (کچھ دوسرے) کہیں گے: وہ پانچ ہیں، ان کا چھٹا ان کا کتا ہے، بن دیکھے پتھر مارتے ہوئے، اور (کچھ لوگ یہ بھی) کہیں گے: وہ سات ہیں، ان کا آٹھواں ان کا کتا ہے۔ آپ کہہ دیجیے: میرا رب ہی ان کی گنتی سے خوب واقف ہے، بہت تھوڑے لوگ ہی ان (کے حال) کو جانتے ہیں، لہٰذا آپ ان کی بابت بحث نہ کریں، سوائے سرسری بحث کے۔ اور آپ ان کی بابت ان میں سے کسی سے بھی نہ پوچھیں۔''

''اس آیت میں اللہ نے تین قول نقل فرمائے ہیں۔ دو کو ضعیف ٹھہرایا ہے، جبکہ تیسرے قول پر سکوت اختیار کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے شاید یہی قول صحیح ہو، کیوں کہ اگر یہ بھی صحیح نہ ہوتا تو پہلے دو قولوں کی طرح اس کا بھی رد فرما دیتا۔ پھر فرمایا کہ ان کی گنتی پر مطلع ہونے میں کچھ فائدہ نہیں۔ اللہ ہی کو معلوم ہے یا جس کو اللہ نے آگاہ کر دیا ہو۔ آخر میں فرمایا کہ تو اپنی جان کو ایسے کام کے پیچھے مشقت میں مت ڈال، جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ نہ ان سے اس گنتی کے بارے میں کچھ پوچھ، کیوں کہ گپ لگانے اور بڑ مارنے کے سوا ان کو کچھ بھی معلوم نہیں ہے، وہ جو کچھ کہتے ہیں ﴿ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ﴾ ''بن دیکھے پتھر مارتے ہوئے'' کہتے ہیں۔ اس سے اختلافی بات نقل کرنے کے متعلق یہ ادب یا قاعدہ معلوم ہوا کہ مختلف اقوال جمع کر کے صحیح قول بتلا دیا جائے اور باطل قول کی وضاحت کر دی جائے، جیسے امام شوکانی رحمہ اللہ کی تفسیر ''فتح القدیر'' اور راقم کی عربی تفسیر ''فتح البیان'' میں کیا گیا ہے۔''

اسرائیلی روایات کے متعلق نواب صاحب کا عمومی منہج یہ ہے کہ کبھی تو وہ اسرائیلی روایات درج کر کے اس کی تردید کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ یہ باطل اور جھوٹی روایت ہے اور کبھی صرف اسرائیلی روایت کی طرف محض اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس بارے میں اپنی رائے کا بھی اظہار کر دیتے ہیں۔ مثلاً بنی اسرائیل کی گائے کے بارے میں وارد اسرائیلی روایات کے متعلق فرماتے ہیں:

''حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ قصہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابو العالیہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم سے مختلف

الفاظ کے ساتھ نقل کر کے یہ بات لکھی ہے کہ ان کی ترتیب میں کسی قدر اختلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بنی اسرائیل کی کتابوں سے ماخوذ ہے، اگرچہ ان کو نقل کرنا جائز ہے، مگر ان کی تصدیق ہو سکتی ہے نہ تکذیب۔ یہ اتنی ہی قابل اعتماد ہے جتنی حق کے مطابق ہو۔'' (ترجمان القرآن: ۱/ ۱۰۶)

نیز ایک مقام پر لکھتے ہیں:

''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے آسمان کے بیان میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔ ہر آسمان کی موٹائی پانچ سو برس کی مسافت ہے اور ایک آسمان کا دوسرے آسمان کے درمیان فاصلہ بھی پانچ سو سال کی مسافت کے برابر ہے۔ آسمان اور زمین دونوں کی تعداد سات سات ہے، لیکن کسی بھی صحیح حدیث میں یہ صراحت نہیں ہے کہ زمین کے ہر طبقے میں اس بالائی زمین کی طرح عوالم (عالم کی جمع) اور اوادم (آدم کی جمع) انبیا اور علما و جہلا ہیں۔ صحابہ و تابعین کے آثار چاہے سنداً صحیح ہی ہوں، لیکن اس معاملے میں وہ قابلِ حجت نہیں، کیوں کہ یہ آثار (اقوالِ صحابہ) غالباً اسرائیلیات سے لیے گئے ہیں اور اسرائیلیات کا حکم یہ ہے کہ ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب، اس لیے اس جگہ توقف کرنا ضروری ہے۔'' (ترجمان القرآن: ۱/ ۶۵)

البتہ کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ نواب صاحب مرحوم اسرائیلی روایت کو تردید و تنقید کے بغیر ذکر کر دیتے ہیں، جو کسی تفسیری ماخذ سے نقل ہوتی ہے۔ ایسے مقام پر مذکور روایت کے متعلق ہمیں ان کا وہی نقطۂ نگاہ سامنے رکھنا چاہیے، جو مؤلف نے مقدمۂ تفسیر میں بیان کیا ہے۔

⑤ چونکہ نواب صاحب مرحوم کی یہ تفسیر، تفسیر بالماثور کی آئینہ دار ہے اور مؤلف خود بھی ایک اعلیٰ پائے کے محدث ہیں، اس لیے انھوں نے اپنی اس تفسیر کو محدثانہ طریق پر مرتب کیا ہے اور آیات کی تفسیر میں احادیثِ نبویہ کے اندراج کا خاص اہتمام کیا ہے۔ کسی آیت کے شانِ نزول یا اس میں موجود کسی شرعی حکم سے متعلق تمام احادیث کو کتاب میں جمع کیا ہے اور ان روایات کی روشنی میں قرآن کے معانی اور ان میں موجود مسائل کی خوب تشریح کی ہے۔

پھر نواب صاحب مرحوم صرف مرفوع روایات لکھنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ حدیث کے راوی، مصدر اور بسا اوقات اس کی استنادی حیثیت کے بیان کا بھی التزام کرتے ہیں، جس میں حدیث پر صحت و ضعف کے اعتبار سے حکم بھی بیان کرتے ہیں، بلکہ عموماً ان کی اسانید میں موجود راویوں تک کو زیرِ بحث لاتے اور ائمہ ناقدین کے اقوال بھی لکھتے ہیں، اس سلسلے میں کبھی تو حدیث پر ائمہ حدیث کی تصحیح و تضعیف نقل کرتے ہیں اور کبھی خود ہی روایت پر حکم لگاتے ہیں، جو علمِ حدیث کے اصول و قواعد کے مطابق ہوتا ہے۔ ان تمام جزئیات کی متعدد مثالیں یہاں پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن طوالت کے پیشِ نظر صرف ان اشارات ہی پر اکتفا کیا جا رہا ہے، کیوں کہ دورانِ مطالعہ بہ آسانی ان امور کو دیکھا جا سکتا ہے۔

مزید براں نواب صاحب مرحوم صرف احادیثِ مرفوعہ ہی کی صحت وضعف کے بیان پر اکتفانہیں کرتے، بلکہ بسا اوقات تفسیری اقوال اور آثار کی استنادی حیثیت بھی لکھتے ہیں، جس میں کسی قول کے معتبر، ضعیف اور غریب ہونے کا اشارہ کر دیتے ہیں۔

٦ تفسیر ترجمان القرآن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آیاتِ احکام کی تفسیر میں فقہی مسائل اور شرعی احکام کا بھی اہتمام کیا گیا ہے، لیکن اس میں زیادہ طوالت نہیں ہوتی، بلکہ صرف ائمہ فقہا کے مختلف مذاہب اور ان کے دلائل کا بالاختصار تذکرہ ہوتا ہے اور عموماً راجح مسلک کی نشان دہی کی جاتی ہے، جس میں کسی مذہب یا امام کی تقلید کے بجائے اقرب الی النصوص نظریے کی ترجیح مدِنظر ہوتی ہے، اس کی تفصیل سورۃ البقرہ کی آیت (۱۵۸) کی تفسیر میں سفر میں روزہ افطار کرنے کی بابت شرعی حکم اور سورۃ البقرہ ہی کی آیت (۲۲۹) میں خلع کے مسائل کے بیان میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اس سلسلے میں ایک مثال ملاحظہ کریں کہ نواب صاحب مرحوم بسم اللہ کی تفسیر میں اس کے سراً اور جہراً پڑھنے کا مسئلہ بیان کرتے ہوئے اس بارے میں مختلف روایات اور مذاہب نقل کرنے کے بعد ترجیح دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''بسم اللہ کے ترک کی حدیثیں اگرچہ زیادہ صحیح ہیں، لیکن بسم اللہ کا اِثبات زیادہ راجح ہے، کیوں کہ ان کا مخرج بھی صحیح ہے۔ اس لیے اسی کو اختیار کرنا اولیٰ ہے، بالخصوص جب ترک کی تاویل ممکن ہے۔ یہ تاویل اس بات کی مقتضی ہے کہ بسم اللہ ذاتاً بھی ثابت ہے، یعنی قرآن ہونے میں اور وصفاً بھی ثابت ہے، یعنی جس سورت کے شروع میں آئی ہے، اس کے ساتھ اس کو بھی اونچی آواز سے پڑھا جائے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ بسم اللہ سورۃ الفاتحہ اور قرآنِ کریم کی ہر سورت کی ایک آیت ہے۔ اس کے آہستہ یا اونچی آواز سے پڑھنے کا وہی حکم ہے جو سورۃ الفاتحہ کا ہے۔ جہاں کہیں سورۃ الفاتحہ اونچی آواز سے پڑھے، وہاں بسم اللہ بھی اونچی آواز سے پڑھے اور جہاں فاتحہ آہستہ پڑھے، وہاں اسے بھی آہستہ پڑھے۔ اس ترکیب سے سب روایتیں جمع ہو جاتی ہیں اور اختلاف مٹ جاتا ہے۔''[1]

اس ضمن میں ایک یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ دورانِ تفسیر نواب صاحب مرحوم آیات سے کئی ایک مسائل کا استخراج کرتے ہیں، جس کی مثال سورۃ البقرہ کی آیات (۶۸۔۷۱) کی تفسیر میں ملتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آیت کی تفسیر میں احادیث اور تفسیری آثار و اقوال ذکر کر کے کئی احکام کا استنباط کرتے ہیں، جس سے مؤلف کی اجتہادی بصیرت نمایاں ہوتی ہے۔

---

[1] ترجمان القرآن بلطائف البیان (۱/ ۱۲۷)

⑦ زیرِ نظر تفسیر میں اعتقادی مسائل کی طرح ہی فقہی مسائل میں بھی ائمہ سلف اور محدثین کے مسلک کو ترجیح دی جاتی ہے اور کسی ایک امام یا مذہب کی تقلید پر انحصار کے بجائے جو مفہوم نصوصِ شرعیہ کے قریب ترین ہو، مؤلف اسی کو ترجیح دیتے ہیں، جس کی مثال مختلف مسائل: تارکِ نماز کا حکم، فاتحہ خلف الامام، ولایتِ نکاح، مسئلہ طلاق اور حلالہ وغیرہ میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ چونکہ نواب صاحب خود بھی سلفی المشرب اور اجتہادی بصیرت کے مالک تھے، اس لیے وہ مختلف ائمہ دین کے اقوال و اجتہادات سے استفادہ تو کرتے ہیں، لیکن کسی تقلیدی دائرے میں رہنے کے بجائے جو موقف اقرب الی النصوص ہو، اسے ہی ترجیح دیتے ہیں، خواہ کسی امام کے موافق ہو یا مخالف، اس بارے میں ان کا مطمحِ نظر صرف حدیثِ رسول کی اتباع اور ترجیح ہوتا ہے، جس کی مثالیں سورۃ البقرۃ کی آیات (۱۹۶، ۲۳۳، ۲۳۷) کی تفسیر میں دیکھی جا سکتی ہے۔

اسی لیے نواب صاحب مرحوم کہیں تو اہلِ حدیث کی تعریف کرتے ہیں، جیسے ایک جگہ ایمان بالغیب کی فضیلت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عوف بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کاش! میں اپنے بھائیوں کو دیکھتا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں؟ فرمایا: ہاں ہو، لیکن تمھارے بعد ایسے لوگ آئیں گے، جو مجھ پر تمھاری طرح ایمان لائیں گے، تمھاری طرح میری تصدیق کریں گے اور تمھارے مدد کرنے کی طرح میری مدد کریں گے۔ کاش! میں اپنے ان بھائیوں سے ملاقات کرتا۔[1] (ابن أبي شيبة)

''اس حدیث کا مصداقِ کامل اہلِ حدیث ہیں۔ اُن کو رسول اللہ ﷺ نے اپنا بھائی کہا ہے اور ان کی یہ پہچان بتائی ہے کہ وہ ایمان و تصدیق اور نصرتِ نبوی میں صحابہ کی مثل ہوں گے، سو یہ وصف سوائے اہلِ حدیث کے کسی اور کے اندر نظر نہیں آتا، کیوں کہ صرف اہلِ حدیث ہی اس طریقے پر قائم ہیں جس پر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ قائم تھے۔ یہ سنتوں کو زندہ کر کے ہمیشہ دینِ اسلام کی مدد کرتے اور بدعات کا قلع قمع کر کے رسول اللہ ﷺ کے مددگار رہتے ہیں۔''

اور کہیں مسلکِ اہلِ حدیث کے شعائر کو ترجیح دیتے ہیں، جیسا کہ لکھتے ہیں:

''بہر حال ان تمام اقوال کا حاصل یہ ہے کہ نماز ایسے پڑھی جائے، جیسے رسول اللہ ﷺ پڑھتے تھے۔ آپ ﷺ کا فرمان بھی ہے: «صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي» ''تم اس طرح نماز پڑھو، جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔'' اس نماز میں رفع الیدین، آمین بالجہر، ہاتھوں کا سینے پر باندھنا، استراحت کے لیے بیٹھنا، رکوع کے بعد اعتدال کرنا وغیرہ سب سنتوں کا اہتمام ہے۔ اس نماز کی ترکیب

[1] اس کی سند میں موسیٰ بن عبیدہ ربذی ضعیف ہے۔ دیکھیں: إتحاف الخيرة للبوصيري (٧/ ٣٤٢)

"مسك الختام شرح بلوغ المرام" (فارسی میں نواب صاحب کی بلوغ المرام کی شرح) میں لکھی گئی ہے اور رسالہ "حقيقة الصلاة" میں بھی کسی نے نماز کا طریقہ خوب بیان کیا ہے۔"

⑧ نواب صاحب مرحوم کی اس تفسیر میں دیگر خصوصیات میں مفسرین کے مختلف اقوال میں ترجیح، آراء الرجال سے اعراض، شرعی معنی کی لغوی معنی پر تقدیم، مشکل مقامات کی توضیح، آیات کی تفسیر میں شرعی حکمتوں کا بیان، سیاق و سباق سے متعلق تفسیری فوائد و لطائف کا تذکرہ اور اقوالِ مفسرین کی تلخیص و ترجیح نمایاں ہیں، جن کی مثالیں جا بہ جا نظر آتی ہیں۔

اسلوبِ تفسیر:

تفسیر ترجمان القرآن کے منہج اور اس کی نمایاں خصوصیات کے بعد ذیل میں اسلوبِ تفسیر اور طریقۂ تشریح کی چند نکات میں وضاحت کی جاتی ہے:

1. نواب صاحب مرحوم کسی بھی سورت کی تفسیر شروع کرنے سے پہلے یہ بتاتے ہیں کہ یہ سورت مکی ہے یا مدنی۔ اگر سورت کے محلِ نزول میں مفسرین کا اختلاف ہو تو اسے بھی بیان کرتے ہیں اور اگر سورت مکی ہو، لیکن اس کی کچھ آیات مدنی ہوں یا معاملہ اس کے برعکس ہو تو اس پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔
2. سورت کے مختلف اسما اور اس بارے میں مفسرین کا اختلاف ہو تو اسے بھی دلائل سے بیان کرتے ہیں۔
3. سورت کی آیات اور کلمات کی تعداد بھی لکھتے ہیں۔
4. سورت کے فضائل میں اگر احادیث مروی ہوں تو انھیں بھی بیان کرتے ہیں، اسی طرح اگر کسی آیت کی فضیلت میں کوئی حدیث مروی ہو تو اس کا بھی تذکرہ کرتے ہیں اور اس کے ساتھ عموماً روایت کا استنادی مرتبہ بھی لکھتے ہیں۔
5. آیت کی تفسیر میں سب سے پہلے نواب صاحب مرحوم اس کا مختصر مفہوم بیان کرتے ہیں، جس میں عموماً شاہ عبدالقادر مرحوم کے "موضح قرآن" کے فوائد کو ذکر کرتے ہیں۔
6. اگر آیت کے شانِ نزول کے بارے میں کوئی حدیث اور اثر مروی ہو تو اس کو بھی لکھتے ہیں۔
7. کسی آیت میں کوئی مشکل لفظ ہو تو اس کا معنی بھی بیان کرتے ہیں، بالخصوص جب کسی لفظ کی معنوی توجیہ میں افادیت ہو تو اس پر تفصیلاً روشنی ڈالتے ہیں۔
8. نواب صاحب مرحوم کا تفسیر میں عمومی طریقہ یہ ہے کہ وہ آیت کی تفسیر میں کئی دیگر قرآنی آیات کی مدد سے زیرِ تفسیر آیت کی توضیح کرتے ہیں اور کسی جگہ اجمال، عموم اور اطلاق ہو تو دیگر آیات کی روشنی میں تفصیل، تخصیص اور تقیید بیان کرتے ہیں۔ اگر کسی جگہ بہ ظاہر آیات کے معانی میں تعارض ہو تو اس کی بھی وضاحت کرتے ہیں

اور جمع و تطبیق دیتے ہیں۔ اگر کسی آیت میں نسخ کا مسئلہ درپیش ہو تو اس کی بھی وضاحت کرتے ہیں اور اگر واقعتاً نسخ کی دلیل قوی ہو تو اس کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن اگر یہ نسخ کا موقف کمزور ہو تو اس کی تردید کر دیتے ہیں، جیسا کہ مؤلف نے سورۃ البقرہ کی آیت (۱۲۴) کی تفسیر میں لکھا ہے۔

9 نواب صاحب اپنی تفسیر میں عموماً عربی گرامر اور صَرف و نحو کی بحثوں سے پہلو تہی کرتے ہیں، لیکن حسبِ ضرورت بالخصوص آیاتِ احکام میں کسی معنی و مفہوم کی ترجیح میں گرامر کا سہارا بھی لیتے ہیں، جس میں صَرف و نحو کے اصول و قواعد کا تذکرہ کرتے ہیں اور بسا اوقات اس کے لیے ائمۂ عربیت کے حوالے بھی دیتے ہیں، جس کی مثال سورۃ البقرہ کی آیات (۷۳، ۱۹۶، ۲۳۳) کی تفسیر میں دیکھی جا سکتی ہے۔

10 نواب صاحب مرحوم کی یہ تفسیر چونکہ تفسیر بالماثور کی نمایندہ تفسیر ہے، جس میں قرآنی آیات کے ساتھ احادیثِ نبویہ کی روشنی میں بھی آیات کی تفسیر لازمی ہے، اس لیے زیرِ نظر تفسیر میں ہمیں احادیثِ مرفوعہ کا تذکرہ بھی جا بہ جا ملتا ہے اور انھیں ایک بنیادی تفسیری ماخذ کی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مؤلف کا اسلوب یہ ہے کہ اگر آیت کی تفسیر میں زیرِ بحث مسئلے کے متعلق متعدد احادیث ہوں تو کبھی تو اُن کا خلاصہ درج کر دیتے ہیں اور کبھی موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر تمام روایات کو درج کر دیتے ہیں، جس کی مثال سورۃ النساء کی آیت (۸۴) سورۃ البقرہ کی آیت (۱۰۸) اور سورت بنی اسرائیل کی آیت (۲۳) کی تفسیر میں ملتی ہے۔ اگر موضوع زیادہ تفصیل کا متقاضی ہو تو اہمیت و افادیت کے نقطۂ نظر سے مؤلف اپنی دیگر تالیفات یا دیگر ائمہ دین بالخصوص امام ابن قیم اور امام شوکانی کی تصنیفات کی طرف رجوع کا مشورہ دیتے ہیں۔

11 تفسیر بالماثور میں چونکہ اقوالِ صحابہ کو بھی قرار واقعی اہمیت حاصل ہے، جیسا کہ مؤلف نے مقدمۂ تفسیر میں لکھا ہے:

> ''جب قرآن و حدیث سے کچھ نہ ملے تو پھر تفسیرِ قرآن میں اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مدد لینی چاہیے، اس لیے کہ انھوں نے اس وقت کے احوال و قرائن کا مشاہدہ کیا ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت وہ حاضر و موجود رہتے تھے۔ فہم کامل، علم صحیح اور عملِ صالح سے بھی وہ بہرہ ور تھے۔ یہ بات بہت بعید ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر کریں اور اسے انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنا ہو۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انھوں نے نہیں سنا، تب بھی وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اہلِ لغت ہیں۔ عربی زبان کے اسرار و رموز، اس کے اسلوب اور محاوروں سے وہ خوب واقف تھے۔''

اس لیے اپنے منہج کی رعایت میں نواب صاحب مرحوم آیت کی تفسیر میں آثارِ صحابہ کا بھی بالتفصیل ذکر کرتے ہیں اور اگر ان اقوال میں تعارض ہو تو وہاں تطبیق و ترجیح سے کام لیتے ہیں۔

نواب صاحب مرحوم نے فقہی وعقدی مسائل کی تشریح، لغوی معانی کی تعیین، مبہم الفاظ کی توضیح، آیات وسور کے شانِ نزول اور مختلف قراءات کی معرفت میں آثارِ صحابہ کو ذکر کیا ہے اور اس طرح یہ اقوال و آثارِ صحابہ کی ایک جامع تفسیر بن گئی ہے۔

12 تفسیرِ قرآن میں اگرچہ اقوالِ تابعین کو آثارِ صحابہ کے برابر حیثیت حاصل نہیں، لیکن ائمہ تفسیر نے تابعین کے آثار سے استشہاد کیا ہے اور انھیں لائقِ اعتنا سمجھا ہے، اسی لیے نواب صاحب مرحوم نے بھی اپنی تفسیر میں تابعین کے اقوال کا اہتمام کیا ہے اور جا بہ جا ان سے بھی استشہاد کیا ہے۔ اس بارے میں مؤلف اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب قرآن شریف کی تفسیر قرآن پاک یا سنتِ صحیحہ یا اقوالِ صحابہ میں نہ ملے تو اکثر علما اس بات کے قائل ہیں کہ پھر اقوالِ تابعین کو اختیار کیا جائے، مگر جس شخص کو علم نہیں ہوتا، وہ عباراتِ تابعین کو ایک دوسرے کے مخالف سمجھ کر انھیں چند اقوالِ مختلفہ قرار دے دیتا ہے (اور یوں انھیں نظر انداز کر دیتا ہے) حالانکہ بات اس طرح نہیں ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کوئی ان میں سے لازم شے سے تفسیر کرتا ہے۔ کوئی کسی شے کی نظیر سے اور کوئی بعینہٖ کسی چیز پر نص بیان کرتا ہے۔ ان سب کے معنی اکثر ایک ہی ہوتے ہیں، اکثر و بیشتر عقل مند اس کو معلوم کر سکتا ہے۔ اہلِ علم کی ایک دوسری جماعت نے کہا ہے کہ جب فروعی مسائل میں تابعین کے اقوال حجت نہیں ہیں تو تفسیر میں کیوں حجت ہیں؟ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات ٹھیک ہے، لیکن جب یہ سب کے سب کسی بات پر اجماع کر لیں گے تو پھر اس کے حجت ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اگر اختلاف کریں گے تو ایک کا قول دوسرے پر حجت ہوگا نہ کہ بعد میں آنے والوں پر، بلکہ اس وقت لغتِ قرآن یا سنتِ مطہرہ یا اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم یا عمومِ لغتِ عرب کی طرف رجوع کیا جائے گا۔''

13 نواب صاحب نے آیات کی تفسیر میں لغت اور کلامِ عرب سے استشہاد کا اہتمام کیا ہے اور اس میں ائمہ تفسیر کے منہج کی پیروی کی ہے۔ چناں چہ وہ مقدمۂ تفسیر میں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب یہ سب کے سب کسی بات پر اجماع کر لیں گے تو پھر اس کے حجت ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اگر اختلاف کریں گے تو ایک کا قول دوسرے پر حجت ہوگا نہ کہ بعد میں آنے والوں پر، بلکہ اس وقت لغتِ قرآن یا سنتِ مطہرہ یا اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم یا عمومِ لغتِ عرب کی طرف رجوع کیا جائے گا۔''

چناں چہ نواب صاحب مرحوم نے زیرِ نظر تفسیر میں جا بہ جا لغتِ عرب سے استشہاد کیا ہے اور حسبِ ضرورت

کبھی اختصار اور کبھی تفصیل سے قرآن کے مشکل مقامات کے حل کے لیے لغوی مباحث رقم کیے ہیں، جیسا کہ سورۃ البقرہ کی آیت (۱۶) کی تفسیر میں متعدد ائمہ لغت کا کلام نقل کیا ہے۔

14 نواب صاحب مرحوم نے اگرچہ اپنی اس تفسیر میں زیادہ اعتماد حافظ ابن کثیر اور امام شوکانی کی تفاسیر پر کیا ہے، لیکن انھوں نے دوسری کئی تفسیروں سے بھی استفادہ کیا ہے، جن میں تفسیر ابن جریر، تفسیر ابن ابی حاتم، تفسیر کبیر اور تفسیر کشاف قابلِ ذکر ہیں۔ مؤلف نے ان تفاسیر سے محض نقل ہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ وہ تفسیری اقوال نقل کر کے ان پر محاکمہ اور نقد بھی کرتے ہیں اور اختلاف کی صورت میں ان میں ترجیح و تطبیق سے بھی کام لیتے ہیں۔ نواب صاحب مرحوم زیرِ نظر تفسیر میں آیت یا سورت کی تفسیر کے آخر میں اپنی عربی تفسیر ''فتح البیان'' سے بھی بہ کثرت مباحث نقل کرتے ہیں اور شروع میں صراحت کرتے ہیں کہ فتح البیان میں یوں مرقوم ہے۔

نواب صاحب کی ہمہ جہتی قرآنی خدمات کا عمومی تعارف:

نواب صاحب مرحوم نے مجموعی طور پر تفسیر وعلومِ قرآن کے متعلق سات کتب تصنیف کی ہیں، جن میں دو عربی میں، دو فارسی میں اور تین کتب اُردو میں ہیں۔ تفسیر ترجمان القرآن کے تعارف سے پہلے ذیل کی سطور میں دیگر کتب کا مختصر تذکرہ پیشِ خدمت ہے:

1 فتح البيان في مقاصد القرآن:

یہ مکمل قرآنِ مجید کی تفسیر ہے، جو عربی زبان میں ہے۔ اس تفسیر میں الفاظِ قرآن کی لغوی تشریح، نحوی وصرفی تحقیق، اعجازِ قرآن اور فصاحت و بلاغت کے ہر پہلو کو نمایاں کرتے ہوئے اسمائے سور کی تشریح، وجہ تسمیہ اور اسبابِ نزول انتہائی بسط کے ساتھ تحریر کیے گئے ہیں اور صحیح احادیث کو مدِنظر رکھ کر قرآنی معانی و مطالب کی توضیح کی گئی ہے۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ مؤلف رحمہ اللہ کی نگرانی میں بھوپال سے چار جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ پھر مؤلف رحمہ اللہ نے اس میں مزید اضافے کیے اور اسے مصر سے دس جلدوں میں مطبع منیریہ (بولاق مصر) سے ۱۳۰۰ھ میں طبع کروایا۔ بعد ازاں اسے مکتبہ عصریہ (بیروت، لبنان) نے ادارہ احیاء التراث الاسلامی، قطر اور ادارہ شؤون اسلامیہ (وزارتِ اوقاف) قطر کے تعاون سے پندرہ جلدوں میں شائع کیا۔

2 نيل المرام من تفسير آيات الأحكام:

یہ کتاب بھی عربی زبان میں ہے اور اس میں قرآن مجید کی ۲۳۶ آیات کی تفسیر و توضیح کی گئی ہے، جو احکام سے متعلق ہیں۔ یہ کتاب بڑے سائز میں ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں مطبع علوی لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی اور دوسری مرتبہ ۱۳۸۲ھ (۱۹۶۲ء) میں مصر سے طبع ہوئی۔ بعد ازاں اسے متعدد مکتبات نے نشر کیا اور اب اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

3 فصل الخطاب في فضل الكتاب:

مؤلف رحمہ اللہ نے اس کتاب میں اولاً قرآنِ مجید کے متعلق بعض معلومات، مثلاً: سورتوں اور آیات کی تعداد، اسمائے قرآن، نزولِ وحی کی مختلف صورتیں، رسم الخط، نقطے اور اعراب کی تاریخ وغیرہ امور ذکر کیے ہیں اور اس کے ضمن میں آدابِ دعا و ذکر اور خلوصِ نیت کے التزام اور اس کی برکات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ پھر قرآن مجید اور اس کی تلاوت وقراءت کے ثواب کا اجمالی ذکر کیا ہے اور بعد ازاں ترتیب کے ساتھ قرآنِ کریم کی مختلف سورتوں اور آیات کی فضیلت بیان کی ہے۔ کتاب کے آخر میں مؤلف رحمہ اللہ نے درود وسلام کے فضائل ومنافع کا بھی مفصل تذکرہ کیا ہے۔

4 تذكير الكل بتفسير الفاتحة وأربع قل:

اس کتاب میں پانچ سورتوں: ① فاتحہ ② کافرون ③ اخلاص ④ فلق ⑤ ناس کی تفسیر وتشریح کی گئی ہے۔ بعض لوگوں نے مختلف اوقات میں ''پنج سورہ'' کے نام سے مختلف پانچ سورتوں کو یکجا کر کے شائع کیا ہے، جن میں عوام الناس کے لیے پانچ سورتوں کو ترجمہ وتفسیر کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، چناں چہ مؤلف رحمہ اللہ نے بھی انتہائی آسان پیرائے میں مذکورہ بالا پانچ سورتوں کو ترجمہ وتفسیر کے ساتھ جمع کیا ہے۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ مؤلف رحمہ اللہ کی زندگی ہی میں مطبع مفیدِ عام آگرہ سے ۶۲ صفحات میں شائع ہوئی تھی۔

5 إفادة الشيوخ بمقدار الناسخ والمنسوخ:

یہ کتاب ایک مقدمہ، دو ابواب اور خاتمے پر مشتمل ہے۔ مقدمہ کتاب میں ناسخ ومنسوخ کے معانی کا بیان ہے۔ بابِ اول میں قرآنِ مجید کی ترتیب کے مطابق منسوخ آیات کا ذکر ہے اور بابِ دوم میں منسوخ احادیث کا تذکرہ ہے، جن کی تعداد پچیس ہے۔ خاتمہ کتاب میں اصولِ شریعت: کتاب اللہ، سنت، اجماع، قیاس اور بعض دیگر امور: استحسان، مصالح مرسلہ اور اجتہاد وتقلید کا مختصر بیان ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں مؤلف رحمہ اللہ کا اسلوب یہ ہے کہ پہلے وہ منسوخ آیت کو ذکر کرتے ہیں اور پھر اس کا ناسخ بیان کرتے ہیں، ضمناً علما کا اختلاف اور آیات کی توضیح وتفسیر بھی بیان کر دیتے ہیں اور مختلف آرا میں ترجیح بھی دیتے ہیں۔ باب دوم میں احادیث کے سلسلے میں یہی منہج اختیار کیا ہے۔ اس باب میں پہلے وہ اکیس احادیث ذکر کی گئی ہیں، جو امام ابن جوزی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "إخبار أهل الرسوخ في الفقه والتحديث بمقدار الناسخ والمنسوخ" میں بیان کی ہیں اور بعد ازاں ان پر مزید چار احادیث کا اضافہ کیا گیا ہے۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ مطبع نظامی کان پور سے ۱۲۹۷ھ کو ۱۳۲ صفحات میں شائع ہوئی تھی۔

6 إكسير في أصول التفسير:

یہ کتاب ایک مقدمہ، دو مقاصد اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ مقدمۂ کتاب میں قرآن مجید کی تعریف اور

فضیلت وعظمت کا بیان ہے۔ مقصدِ اول سات ابواب پر مشتمل ہے۔ بابِ اول میں قرآنِ کریم کے وجوہِ مبانی کا بیان ہے۔ بابِ دوم میں قرآن مجید کے وجوہِ معانی، بابِ سوم میں نظم قرآن کے معانی مخفی ہونے کی وجوہات، بابِ چہارم میں فنونِ تفسیر میں صحابہ وتابعین کا اختلاف اور اس کا حل، بابِ پنجم میں ترتیبِ نزول، تدوینِ قرآن اور سات قراءتوں کا تذکرہ، بابِ ششم میں بعض مقاصدِ قرآن کا بیان اور بابِ ہفتم میں قرآنِ مجید کی تلاوت وتعلیم کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

مقصدِ دوم میں علمِ تفسیر پر لکھی جانے والی تقریباً تیرہ سو کتابوں کا ان کے مؤلفین اور سنینِ وفات کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔ خاتمۂ کتاب میں طبقاتِ مفسرین کا ذکر ہے اور ذیل الخاتمہ میں تفسیر فتح البیان کا مختصر تعارف ہے۔ یہ کتاب دراصل مؤلف رحمہ اللہ کی عربی تفسیر ''فتح البیان في مقاصد القرآن'' کا مقدمہ ہے۔

یہ کتاب فارسی زبان میں ہے جو پہلی مرتبہ مطبع نظامی کان پور سے ۱۲۹۱ھ میں بڑے سائز میں ۱۲۶ صفحات میں شائع ہوئی تھی۔

تفسیر ترجمان القرآن بلطائف البیان:

- یہ تفسیر حضرت نواب صاحب رحمہ اللہ نے ۱۳۰۲ھ میں لکھنی شروع کی تھی۔ چنانچہ دیباچۂ تفسیر میں فرماتے ہیں:

''رمضان المبارک ۱۳۰۲ھ دوشنبہ (سوموار) سے میں نے اس تفسیر کو لکھنا شروع کر دیا۔ شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کی ''موضح قرآن'' ۱۲۰۵ھ میں لکھی گئی تھی، جس کو ستانوے برس ہو چکے ہیں، علاوہ ازیں وہ صرف ترجمہ تھا اور یہ تفسیر ہے۔ میں نے رمضان المبارک کے مہینے میں اس لیے اس کا آغاز کیا ہے کہ سب سے پہلے قرآنِ پاک کا نزول آسمانِ دنیا سے بیت العزت پر اس مبارک مہینے میں ہوا تھا۔''

- اس تفسیر کا سببِ تالیف لکھتے ہوئے نواب صاحب مرحوم رقم طراز ہیں:

''دنیا میں قرآنِ کریم کی بے شمار تفسیریں لکھی گئی ہیں۔ یہ تفسیریں سب سے زیادہ عربی میں ہیں، کچھ فارسی میں اور چند ایک اردو میں ہیں۔ اس لیے اہلِ دین کی ایک جماعت مدت سے مجھے یہ بات کہہ رہی تھی کہ تم اُردو زبان میں ایک ایسی تفسیر لکھو، جو نہ زیادہ لمبی چوڑی ہو نہ مختصر، بلکہ متوسط (درمیانی) ہو، جس سے قرآن کا مطلب سمجھنا آسان اور کم علم لوگوں کے لیے ہدایت کا راستہ واضح ہو جائے۔ مجھے اتنی فرصت کہاں تھی کہ میں اس کام کا ارادہ کرتا، لیکن جب تقاضا زیادہ ہوا تو چار و ناچار رمضان المبارک ۱۳۰۲ھ دوشنبہ (سوموار) سے میں نے اس تفسیر کو لکھنا شروع کر دیا۔'' (ترجمان القرآن: ۱/ ۸۹)

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے نواب صاحب کے شاگرد مولانا ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی فرماتے ہیں:

''ترجمان القرآن کی تالیف کا یہ سبب ہوا کہ مولوی رفیع الدین بن شیخ امام الدین برادر عم زاد مولوی نوازش علی مرحوم (واعظ و مہاجر مکہ مکرمہ) کو اکثر وعظ گوئی کا اتفاق ہوتا ہے، انھوں نے شیخنا المرحوم سے درخواست کی کہ ایک تفسیر اُردو میں تالیف ہو، جس سے وعظ میں سہولت ہو جائے۔ اس کے بعد اور لوگوں نے بھی درخواست کی تو اس پر ترجمان القرآن کا لکھنا شروع کیا گیا۔'' (ترجمان القرآن: ۱۴/۳۸۲)

- نواب صاحب مرحوم عموماً پارے اور سورت کی تفسیر کے آخر میں تاریخ بھی لکھ دیتے ہیں کہ یہ سورت یا پارہ فلاں تاریخ کو مکمل ہوا تھا۔ چناں چہ زیرِ نظر جلد میں پہلے پارے کے آخر میں لکھتے ہیں:

''اس آیتِ شریفہ پر قرآنِ مجید کا ایک پارہ آج ۲۲ رمضان شریف ۱۳۰۲ھ کو ختم ہوا۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔''

ایسے ہی سورۃ البقرہ کی تفسیر کے آخر میں تکمیل کی تاریخ ۲۰/ شوال ۱۳۰۲ھ اور سورت آلِ عمران کے خاتمے پر ۷/ ذوالحجہ ۱۳۰۲ھ کی تاریخ مرقوم ہے۔

- نواب صاحب مرحوم نے پہلے ایک جلد میں انتیسویں اور تیسویں پارے کی تفسیر لکھی، پھر سورۃ الفاتحہ سے سورۃ الکہف تک چھے جلدوں میں یہ تفسیر لکھی۔ یوں نواب صاحب مرحوم نے اس تفسیر کی صرف سات جلدیں ہی لکھی ہیں اور اس کا تکملہ (سورت مریم تا سورت تحریم) آپ کے شاگرد مولانا ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی نے لکھا ہے۔

- آپ نے رمضان المبارک ۱۳۰۲ھ میں اس تفسیر کا آغاز کیا تھا اور اس کی چھٹی جلد میں سورۃ الکہف کی تفسیر ۲/ رمضان ۱۳۰۶ھ کو مکمل کی۔ یوں آپ نے چار سال کے عرصے میں اس تفسیر کی سات جلدیں لکھیں۔ آپ کے بعد سورت تحریم تک اس کا تکملہ ان کے تلمیذِ رشید مولانا ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی رحمہ اللہ نے اسی انداز سے تالیف فرمایا، جس کی کیفیت خود موصوف نے ۲۸ ویں پارے کے آخر میں تفصیل سے لکھ دی ہے۔ انھوں نے ۲۳/ صفر ۱۳۰۸ھ (۸/ اکتوبر ۱۸۹۰ء) کو چہار شنبہ اور پنج شنبہ کی درمیانی رات کو اس کارِ خیر کا آغاز کیا اور ۱۵/ ذوالقعدہ ۱۳۱۵ھ (اپریل ۱۸۹۸ء) کو آٹھ جلدیں لکھ ڈالیں۔ یہ مکمل تفصیل خود مولانا ذوالفقار بھوپالی نے اپنی تحریر کردہ تفسیر کی آخری جلد میں سورۃ التحریم کے آخر میں یوں لکھی ہے:

''الحمد لله والمنة کہ تفسیر سورۃ التحریم بروز جمعرات ۱۵/ ذوالقعد ۱۳۱۵ھ کو محلّہ امیر گنج میں تمام ہوئی، اللہ سبحانہ قبول فرمائے۔ اس کے تمام ہونے سے ترجمان القرآن کی چودھویں جلد مکمل ہوئی۔

اب ترجمان کی پندرہ جلدیں ہوگئی ہیں۔ حضرت نواب سید محمد صدیق حسن خان صاحب رحمہ اللہ نے ۱۳۰۲ ہجری سے ترجمان کا لکھنا شروع کیا تھا۔ فاتحہ سے لے کر سورۃ الکہف تک چھے جلدیں اور ایک جلد پارہ ''تبارک'' و پارہ ''عم'' کی لکھیں تو یہ سات جلدیں ہوئیں۔ سورت مریم سے سورت تبارک تک تیرہ پارے کی تفسیر باقی تھی۔ پس خاکسار ذوالفقار احمد۔ عفا اللہ عنہ۔ نے بروز بدھ ۲۳/ صفر ۱۳۰۸ھ

سے تفسیر سورت مریم کا لکھنا شروع کیا تھا۔ اللہ پاک کے بے حساب احسان ہیں کہ اس نے محض اپنی حول وقوت سے آٹھ جلدیں لکھوا دیں۔‘‘

اس سلسلے میں مولانا نقوی نواب صاحب مرحوم کی ترغیب وتحریض کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’شیخنا المرحوم صاحبِ ترجمان القرآن اکثر فرماتے تھے کہ اب میرے قویٰ ضعیف ہو گئے ہیں، تفسیر کا لکھنا مجھ پر شاق گزرتا ہے۔ ذرا ذرا سے رسالے لکھنے میں جی لگتا ہے، اس لیے کہ وہ جلد تمام ہو جاتے ہیں۔ خاکسار سے فرماتے کہ تم لکھو۔ میں عرض کرتا کہ اللہ آپ کی عمر میں برکت دے، آپ ہی لکھیں گے تو فرماتے: بھائی ضعفِ قویٰ کے سبب اب ہم سے کچھ نہیں بنتا۔ جب مجھ پر زیادہ اصرار فرمایا تو میں نے عرض کیا کہ مجھے آپ کے کام سے فرصت نہیں ہے۔ ادھر ’’مرآۃ النسوان‘‘ لکھ رہا ہوں، آپ فلاں صاحب کو حکم دیں، وہ لکھیں گے۔ فرمایا: نہیں تم ہی لکھو۔

’’جب میں نے سچے عذر پیش کیے تو میرے کہنے سے ان صاحب کو حکم دیا، انھوں نے بھی اپنے کاروبار کے سبب کچھ نہ لکھا۔ جب ’’مرآۃ النسوان‘‘ کے پچیس تیس اجزا تیار ہوئے تو ملاحظہ کے واسطے ان کی خدمت میں پیش کیے، انھوں نے دو دن میں سارے اجزا پڑھ لیے۔ پچھلے دن میں حاضر ہوا تو میاں عبدالحی صاحب مرحوم ان کے داماد بھی موجود تھے، فرمایا: میں نے ’’مرآۃ النسوان‘‘ کے سارے اجزا دیکھ ڈالے ہیں۔ بھائی! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترجمان القرآن کو تمھی پورا کرو گے۔ میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو قوت دے، آپ ہی اسے پورا فرمائیں۔ فرمایا: بھائی! اب ہمارے قویٰ ساتھ نہیں دیتے۔ اس کے بعد بیمار ہوئے، پھر ایک مدت بیمار رہے اور وفات پا گئے۔‘‘

مولانا نقوی مزید لکھتے ہیں:

’’پانچ چھے ماہ کے بعد کسی صاحب نے تکمیلِ ترجمان کے واسطے سرکار عالیہ ۔دام اقبالھا۔ (ملکہ بھوپال) سے عرض کیا تو انہی کو لکھنے کا حکم ہوا۔ پھر سرکارِ عالیہ نے صاحبِ ترجمان کے فرزند جناب میر سید علی حسن خان صاحب (زاد قدرہ) سے ذکر فرمایا تو انھوں نے میری اطلاع کے بغیر میرا نام تجویز کر دیا، پھر میرے نام یہ قرعہ نکل آیا تو مَیں سمجھا کہ یہ شیخنا المرحوم کی پیشین گوئی کا ظہور ہے، پھر میں نے اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے ۲۳ رصفر ۱۳۰۸ھ سے لکھنا شروع کیا۔ اللہ پاک نے محض اپنی حول وقوت اور فضل وکرم سے ۱۵ ر ذوالقعدہ ۱۳۱۵ھ کو یہ تکملہ آٹھ جلد میں تمام کر دیا۔‘‘ (ترجمان القرآن: ۱۴/ ۳۶۸)

مولانا ذوالفقار احمد بھوپالی نے اپنے تکملے میں جن سورتوں کی تفسیر لکھی ہے، ہر سورت کی تفسیر کا الگ نام رکھا ہے، جیسا کہ تفسیر سورۃ التحریم کے آخر میں مذکور ہے۔ ان سورتوں کی تعداد ۴۸ ہے۔

یہاں یہ بھی بات قابلِ ذکر ہے کہ نواب صاحب مرحوم کی اس تفسیر کو مکمل کرنے کی غرض سے موضع کھڈیاں (ضلع قصور) کے ایک عالم مولانا محمد مرحوم نے بھی سورت مریم سے لے کر سورت تحریم تک "ترجمان القرآن بلطائف البیان" کے نام سے تفسیر لکھی تھی، لیکن یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ مولانا محمد مرحوم کی تحریر فرمودہ تفسیر چھپی یا نہیں اور نہیں چھپی تو اس کا مسودہ محفوظ ہے یا نہیں؟[1]

طباعت:

یہ تفسیر نواب صاحب مرحوم کی زندگی ہی میں سات جلدوں (ابتدائی چھے جلدیں اور ایک آخری جلد) تک شائع ہوئی تھی۔ تکملہ سمیت پندرہ جلدوں میں اس کا پہلا اِڈیشن ۱۳۰۲ تا ۱۳۱۴ھ مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوتا رہا، جب کہ سولہ جلدوں میں اس کا دوسرا اِڈیشن ۱۳۰۶ تا ۱۳۲۳ھ مطبع صدیقی لاہور سے طباعت پذیر ہوا۔

اس کے بعد یہ تفسیر پردۂ خمول ہی میں رہی، تا آنکہ بعض اہلِ علم کو اس کی از سرِ نو اشاعت کا خیال آیا تو افادیت کے پیشِ نظر اس کے لیے قدیم اردو زبان کی تسہیل اور جدید طرزِ املا کی رعایت کو ضروری سمجھا گیا، چناں چہ اس کی تسہیل کے لیے ۱۹۹۲۔۱۹۹۳ء میں انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور کے شعبہ علومِ اسلامیہ کے پروفیسر اسرائیل فاروقی، حافظ محمد ایوب اور پروفیسر عبدالحفیظ صاحبان نے ماہنامہ "محدث" لاہور میں اس کی تسہیل کا کام شروع کیا، جو صرف نصف سورۃ البقرہ تک مکمل ہو پایا۔ اس کی طباعت کی ایک کوشش مکتبہ "اصحاب الحدیث" لاہور کے مالک جناب عبداللطیف ربانی رحمہ اللہ نے بھی کی، لیکن انھوں نے صرف اس کی جلد اول (تین پارے) ہی شائع کی اور پھر طباعت کا یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

بعد ازیں اس کی تسہیل و طباعت کا بیڑا حکیم عبدالمجید وزیر آبادی اور ان کے بیٹوں حکیم عتیق الرحمٰن اور ڈاکٹر یوسف فاروق صاحبان نے اُٹھایا، جو جناب یحییٰ قریشی صاحب کی مدد سے مکمل ہوا اور اب آپ کے سامنے ہے۔ اس سلسلے کی ضروری تفصیل شیخ محترم حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ بیان کر چکے ہیں، اس لیے اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہمارا اسلوبِ تحقیق و تسہیل:

① اس تفسیر کی تسہیل کا بنیادی کام جناب محمد یحییٰ قریشی صاحب وزیر آبادی رحمہ اللہ نے کیا ہے۔ ہم نے اسی تسہیل شدہ

[1] دیکھیں: اہلِ حدیث خدامِ قرآن (ص: ۱۹۹، ۲۰۰) از مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ۔

مسودے کی مراجعت کے دوران میں تسہیلِ مزید کا اہتمام کیا ہے، جس میں قدیم اردو زبان اور اندازِ بیان کو حتیٰ المقدور سہل اور آسان بنانے کی سعی کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے بنیادی طور پر یہ کوشش کی ہے کہ مؤلف رحمہ اللہ کے کلام کے مفہوم و معنی میں کسی قسم کا تغیر نہ کیا جائے اور الفاظ کی صرف اسی قدر تسہیل و تیسیر کی جائے کہ قارئین کرام مؤلف رحمہ اللہ کے مقصود و مدعا کو بہ آسانی سمجھ جائیں۔ تاہم ناظرین کرام دورانِ مطالعہ قدیم زبان کی حلاوت وطراوت کو بھی ضرور محسوس کریں گے، کیوں کہ ہم نے ہر ہر لفظ کو بدلنے اور اس کا ترجمہ کرنے کے بجائے صرف مشکل و نامانوس الفاظ کی تسہیل اور اسلوبِ بیان کو آسان بنانے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔

تسہیل کے سلسلے میں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ نواب صاحب مرحوم نے اپنی تفسیر کے لیے شاہ عبدالقادر مرحوم کے ترجمۂ قرآن کا انتخاب کیا تھا۔ چوں کہ اس ترجمے کی زبان قدیم تھی اور بعض الفاظ بھی مشکل تھے، اس لیے نواب صاحب نے اس میں مناسب ترمیم اور بعض الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ اسے درج کیا تھا۔ لیکن چوں کہ اب یہ ترمیم شدہ ترجمہ بھی قدامت کے پیشِ نظر اس قدر سہل نہیں، جتنی سلاست اردو زبان میں ترقی کے سبب موجودہ تراجمِ قرآن میں پائی جاتی ہے اور لوگ ان سے زیادہ مستفید ہو سکتے ہیں، اس لیے ہم نے بھی افادیت اور سہولت کے پیشِ نظر اس قدیم ترجمے کے بجائے عصرِ حاضر کے معروف مفسرِ قرآن جناب حافظ صلاح الدین یوسف اور مولانا عبدالجبار حفظہما اللہ کا تحریر کردہ ترجمہ شامل کیا ہے، جو دارالسلام، لاہور کا شائع کردہ ہے۔

- ② زیرِ نظر تفسیر میں مذکور تمام احادیث و آثار کی مقدور بھر تحقیق و تخریج کی گئی ہے۔ اگر کسی حدیث میں ضعف ثابت ہوا تو اس کی علت و سبب بھی اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح تفسیر میں مذکور صحابہ و تابعین کے آثار و اقوال کی بھی بنیادی مصادر سے تخریج کا اہتمام کیا گیا ہے۔
- ③ عربی و فارسی عبارات اور اشعار کا ترجمہ کر دیا گیا ہے اور عربی عبارات پر حسبِ ضرورت اعراب بھی لگا دیے گئے ہیں۔
- ④ تفسیری مباحث میں مذکور مختلف اقتباسات اور منقولہ عبارات کا اصل مصادر سے مقارنہ بھی کیا گیا ہے۔
- ⑤ تفسیر میں مناسب عناوین اور ذیلی سرخیوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔
- ⑥ بعض مقامات پر حسبِ ضرورت تعلیقات و حواشی کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔
- ⑦ ہم نے عبارات کے دوران میں علاماتِ ترقیم اور الفاظ کی کتابت میں حتی الوسع قواعدِ املا کی رعایت ملحوظ رکھی ہے۔

اظہارِ تشکر:

سب سے پہلے ہم اللہ رب العزت کے شکر گزار ہیں، جس کے فضل و احسان کی بنا پر ایک صدی سے زیادہ

عرصہ گزرنے کے بعد اس علمی خزینے کی خدمت و اشاعت کی توفیق میسر آئی، پھر ہم ان تمام احباب و اخوان کے ممنون ہیں، جنھوں نے اس مرحلے میں کسی بھی قدم پر ہماری معاونت اور حوصلہ افزائی کی ہے، بالخصوص ادارے کے وہ رفقاء جو ہر مرحلے میں ہمارے شریکِ کار اور رفیقِ عمل رہے، ہمارے زیادہ سے زیادہ شکریے کے حق دار ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے تعاون اور رفاقت کے بغیر موجودہ انداز سے طباعت کا یہ ہفت خواں طے ہونا بہت مشکل تھا۔ اللہ تعالیٰ تمام معاونین کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اس عمل کو قبولیت سے سرفراز فرما کر ہمارے لیے توشۂ آخرت بنائے۔ آمین یا رب العالمین

والسلام

حافظ شاهد رفیق

۲۰/۲/ ۱۴۳۸ھ = ۲۱/ ۱۱/ ۲۰۱۶ء

hasanshahid85@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نواب سید محمد صدیق حسن خاں رحمہ اللہ

(۱۲۴۸۔۱۳۰۷ھ)

مولانا محمد اسحاق بھٹی رحمہ اللہ

ریاستِ بھوپال کا پسِ منظر:

ریاستِ بھوپال کا بانی سردار دوست محمد خاں تھا، جو ۱۶۹۶ء میں افغانستان سے ہندوستان آیا۔ ابتدا میں وہ اورنگ زیب عالم گیر کی فوج میں ملازم ہوا، لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد فوج سے علاحدگی اختیار کر کے ۱۷۰۸ء میں مالوہ آیا اور ایک جاگیر اجارے پر حاصل کی۔ پھر اپنی بہادری اور فراست سے اس کے آس پاس کے علاقے پر قابض ہوگیا۔ اس نے ایک جنگ میں دشمن کے خلاف رانی کملاپتی کی مدد کی تھی، جس کے صلے میں رانی نے اسے بھوجپال (بھوپال) کا علاقہ عطا کیا۔ اس طرح ۱۷۲۲ء میں وسطِ ہند میں ایک مسلم ریاست کا قیام عمل میں آیا اور اس کے بعد اسے نواب دوست محمد خاں کہا جانے لگا۔

دوست محمد خاں اہلِ علم کا قدر دان تھا۔ وہ خود بھی انشا پرداز اور فارسی ادب میں دست گاہ رکھتا تھا اور بہت سے اصحابِ علم اس نے اپنے دربار میں جمع کر لیے تھے، جن میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔ افغانستان سے بھی اس نے اپنے اعزہ و اقارب اور علما و فضلا کو بلا لیا تھا، جنھیں بھوپال میں آباد کیا، انھیں جاگیریں دیں اور درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا۔

۱۷۲۶ء میں نواب دوست محمد خاں کا انتقال ہوگیا تو ریاستِ بھوپال کی عنانِ حکومت اس کے بیٹے نواب یار محمد خاں نے سنبھالی۔ یار محمد خاں اس سے قبل چار سال حیدر آباد (دکن) رہا تھا، جہاں اس نے بہتر طریقے سے علمی اور انتظامی تربیت حاصل کی تھی اور حیدر آباد سے متعدد اہلِ علم کو اپنے ساتھ بھوپال لے گیا تھا۔ اس کا دورِ حکمرانی قابلِ تعریف تھا۔ اس نے ۱۷۴۲ء میں وفات پائی۔

اب بھوپال کا تیسرا حکمران یار محمد خاں کے بیٹے نواب فیض محمد خاں کو بنایا گیا۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ ریاست میں ایسی خانہ جنگی شروع ہوئی کہ ریاست کا بچنا مشکل ہوگیا۔ فیض محمد خاں کی سوتیلی ماں ماجی ممولا بڑی عقل مند اور مردم شناس عورت تھی۔ ایک برہمن زادہ اس کا پروردہ تھا، جو مسلمان ہوگیا تھا۔

ریاست کا قلم دانِ وزارت اس کے سپرد کیا گیا اور اسے ''دیوان چھوٹے خاں'' کہا جانے لگا۔اس نے بڑے تدبر کے ساتھ حکومت کے نظم ونسق کو چلایا اور ریاست افراتفری سے محفوظ ہوگئی۔ ۱۷۷۷ء میں فیض محمد خاں انتقال کر گیا۔ وہ بذاتِ خود بہتر کردار کا حامل تھا، لیکن وہ ایسی پریشانیوں میں گھرا کہ کوئی قابلِ ذکر کام نہ کر سکا۔

فیض محمد خاں کی وفات کے بعد اس کے بیٹے نواب حیات محمد خاں کو تختِ حکومت پر بٹھایا گیا۔ اس کے وزیر دیوان چھوٹے خاں نے بڑی خوش اسلوبی سے حکومت کے نظام کو آگے بڑھایا۔ مختلف مقامات میں مسجدیں تعمیر کرائیں۔ مدارس قائم کیے اور علما کو ان کے مقام و مرتبے کے مطابق اعزازات سے نوازا۔

سید ذوالفقار احمد نقوی اپنی کتاب ''تذکرۂ قضاۃِ بھوپال'' میں لکھتے ہیں:

''چھوٹے خاں نے شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں بایں مضمون عریضہ لکھا کہ آپ بھوپال تشریف لائیں۔ بارہ ہزار کی جاگیر حاضر ہے۔ چند معتبر ادیبوں کو یہ خط اور پانچ صد روپیہ دے کر دہلی بھیجا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ بڑھاپے میں دہلی چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔''[1]

شاہ صاحب خود تو بھوپال نہیں گئے، البتہ بعض علما کو اپنی سفارش کے ساتھ بھوپال بھیج دیا، جنھوں نے دینی و دنیوی علوم کی نشر و اشاعت میں بڑی جاں فشانی سے کام لیا۔ اس کے نتیجے میں شمالی ہندوستان کی تہذیب و تمدن میں بڑا نکھار پیدا ہوا اور بھوپال، دہلی کا ایک حصہ معلوم ہونے لگا۔[2]

۱۷۹۲ء میں ماجی ممولا اور ۱۷۹۴ء میں دیوان چھوٹے خاں وفات پا گئے تو ریاست بھوپال میں پھر خانہ جنگیوں اور سازشوں کا بازار گرم ہوگیا۔ نواب حیات محمد خاں کم زور حکمران تھا، جو حالات کا مقابلہ نہ کر سکا اور حکومت سے علاحدہ ہو کر خانہ نشینی اختیار کر لی۔ چناں چہ ۱۷۹۵ء میں ایک جلاوطن شہزادے وزیر محمد خاں نے ریاست کو بچانے کے لیے بھوپال کا عزم کیا۔ وزیر محمد خاں ریاست کے بانی سردار دوست محمد خاں کا پڑپوتا تھا، جسے کسی وجہ سے ریاست بدر کر دیا گیا تھا۔ اس نے ایسی حکمت عملی سے کام لیا کہ تھوڑے عرصے میں نہ صرف تمام اندرونی اور بیرونی سازشوں کا خاتمہ کر دیا، بلکہ ریاست میں نئی فتوحات کا آغاز ہوگیا اور اس کی حدود بڑھنے لگیں۔

نواب حیات محمد خاں کا بیٹا غوث محمد خاں ولی عہد تھا۔ اس نے وزیر محمد خاں کے خلاف سازشیں شروع کر دیں، لیکن وزیر محمد خاں نے تدبر اور صبر سے کام لیا اور ریاست کی ترقی میں مصروف رہا۔ اس کے عہد میں ریاست نے واقعی ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کیں۔ وزیر محمد خاں دراصل والیِ ریاست نہ تھا، لیکن ریاست کی طرف سے اسے وزیر الدولہ کا خطاب ملا تھا اور اس نے اپنی کوششوں سے ریاست کو اِدھر اُدھر کی سازشوں کا شکار ہونے سے بچایا تھا۔

---

[1] نواب صدیق حسن خاں، از ڈاکٹر رضیہ حامد (ص: ۱۳۷)

[2] ایضاً

حیات محمد خاں جو گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا تھا، ۱۸۰۸ء میں وفات پا گیا اور اس کے بیٹے غوث محمد خاں نے وزیر محمد خاں کو معزول کر کے ریاست کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ وزیر محمد خاں کے اختیارات کلی طور سے ختم کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے اس نے مرہٹوں کی مدد حاصل کی۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر وزیر محمد خاں گنور کے قلعے میں چھپ گیا۔ کچھ عرصے کے بعد مرہٹہ فوج واپس چلی گئی تو وزیر محمد خاں پھر بھوپال آ گیا اور مرہٹوں کی جو تھوڑی بہت فوج بھوپال کی حدود میں موجود تھی، اسے بھگا دیا اور غوث محمد خاں کو گرفتار کر لیا۔ مرہٹے غوث محمد خاں کی حمایت میں دوبارہ میدان میں آئے تو وزیر محمد خاں نے مقابلہ کر کے انھیں شکست دی اور ریاست پر مکمل طور پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۱۵ء میں نواب وزیر محمد خاں کا انتقال ہو گیا۔

اب بھوپال کے عوام کی مرضی اور حمایت سے وزیر محمد خاں کے بیٹے نظر محمد خاں کو بھوپال کا نواب بنایا گیا۔ نظر محمد خاں اپنے باپ کی رفاقت وتربیت میں ریاستی حالات کے مختلف مراحل سے گزر چکا تھا اور بڑا زیرک اور مدبر شخص تھا۔ اس نے اپنے اور اپنے باپ کے حریف نواب غوث محمد خاں کی بیٹی گوہر بیگم قدسیہ سے شادی کر لی، جس کی وجہ سے تمام باہمی جھگڑے ختم ہو گئے۔ اس کے بعد ۱۸۱۸ء میں نواب نظر محمد خاں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمایندے یعنی گورنر جنرل سے دوستانہ طرز کا معاہدہ کر لیا، جس کی رو سے ریاست بھوپال کی حفاظت کی ذمے داری کمپنی نے لے لی اور امن وامان کی فضا پیدا ہو گئی۔

یہ سات نواب ریاست بھوپال کے ابتدائی دور کے حکمران تھے: ① دوست محمد خاں، ② یار محمد خاں، ③ فیض محمد خاں، ④ حیات محمد خاں، ⑤ غوث محمد خاں، ⑥ وزیر محمد خاں اور ⑦ نظر محمد خاں۔ ان ساتوں حکمرانوں کے عہد میں بھوپال کو مجمع العلما کی حیثیت حاصل رہی اور علم وادب نے فروغ پایا۔

نواب قدسیہ بیگم کی حکومت:

نواب نظر محمد خاں نے ساڑھے تین سال حکومت کی۔ لوگ اس کے طریقِ حکومت سے بہت خوش تھے۔ لیکن اچانک طپنچہ (پستول) چلنے سے ۱۱ر نومبر ۱۸۱۹ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے صرف ۲۸ سال عمر پائی۔ اس کا کوئی بیٹا نہ تھا، صرف ایک بیٹی تھی، جس کا نام سکندر بیگم تھا۔ باپ کی وفات کے وقت اس کی عمر ایک سال تین مہینے تھی، اسے اپنے باپ کا جانشین مقرر کیا گیا، لیکن چوں کہ وہ حکومتی کاروبار نہیں چلا سکتی تھی، اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجازت سے نواب نظر محمد خاں کی بیوہ قدسیہ بیگم ریاست کی مختار مقرر ہوئیں اور تمام امورِ حکومت انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ ان کے عہدِ حکومت میں رعایا کو بڑی سہولتیں حاصل ہوئیں۔ بہت سے اہلِ علم اور اصحابِ فضیلت کو مختلف مقامات سے بلا کر بھوپال میں آباد کیا گیا اور جگہ جگہ مدارس قائم کیے گئے اور تعلیم عام ہوئی۔

نواب قدسیہ بیگم کا زمانہ ریاستِ بھوپال کے لیے رحمتِ خداوندی کا زمانہ تھا۔ یہ ایک محبّ وطن اور دین دار حکمران تھیں۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں انھوں نے رباطیں تعمیر کرائیں۔[1] یعنی حاجیوں اور مسافروں کی رہایش کے لیے مسافر خانے بنوائے۔

نواب سکندر بیگم کی حکومت:

۱۸/ اپریل ۱۸۳۵ء (۱۸/ ذوالحجہ ۱۲۵۰ھ) کو نواب جہاں گیر محمد خاں سے سکندر بیگم کی شادی ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی ازروے وصیت جہاں گیر محمد خاں کو ریاستِ بھوپال کا نواب مقرر کیا گیا۔ لیکن ۹/ دسمبر ۱۸۴۴ء (۲۸/ ذوالقعدہ ۱۲۶۰ھ) کو عین عالمِ شباب میں جہاں گیر محمد خاں کا انتقال ہوگیا۔ اس کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی، صرف ایک لڑکی تھی، جس کا نام شاہ جہاں بیگم تھا اور اس کی عمر اس وقت سات سال تھی اور وہ حکومت کا نظام چلانے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے اس کی والدہ سکندر بیگم کو ریاست کی مختار مقرر کیا گیا، لیکن سکندر بیگم نے صرف مختاری پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ریاست کی مستقل فرماں روائی کے لیے کوشش کی اور اس کوشش میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔ انھوں نے ریاست پر اپنا دعواے فرماں روائی پُرزور اور مضبوط دلائل کے ساتھ پیش کیا، جسے انگریزی حکومت صحیح ماننے پر مجبور ہوگئی اور وہ نواب سکندر بیگم کہلائیں۔

اصلاحات اور سلسلۂ تعلیم:

نواب سکندر بیگم بڑی منتظم اور سمجھ دار حکمران تھیں۔ انھوں نے ریاست میں بہت سی اصلاحات جاری کیں۔ ڈاک رسانی کا بہترین نظام قائم کیا، مختلف حکومتی دفاتر جدید طریقے سے قائم کیے، ریاست کے بلاد وقصبات کے نقشے بنائے، دفتری احکام میں مختصر نویسی کا حکم دیا، طویل اور مسجع و مقفع عبارتوں سے بچنے کی تاکید کی۔ رعایا کی سہولت کے لیے بعض نئے محکمے قائم کیے، ایک محکمہ احتساب قائم کیا۔ وہ علم و علما کی بہت قدر دان تھیں۔ بہت سے علما و شعرا ان کی دعوت پر بھوپال آئے اور انھوں نے اس شہر اور ریاست میں مستقل طور سے سکونت اختیار کی۔

نواب سکندر بیگم کو مطالعہ کتب کا بہت شوق تھا اور تصنیف و تالیف سے انھیں بڑی دلچسپی تھی۔ ریاست میں تعلیم عام کرنے کے لیے انھوں نے ہر گاؤں اور قصبے میں مدارس جاری کیے۔ ان مدارس میں عربی، فارسی، اردو، ہندی اور انگریزی تمام زبانوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ انھوں نے ۱۸۵۱ء میں بھوپال میں مطبع سکندری کے نام سے ایک پریس قائم کیا۔

ان کے داماد اور ان کی بیٹی نواب شاہ جہاں بیگم کے شوہر باقی محمد خاں نے (جنھیں نواب امراؤ دولہ کہا جاتا

[1] نواب صدیق حسن خاں از ڈاکٹر رضیہ حامد (ص: ۱۴۲)

تھا) اپنے مصارف سے ایک بہت بڑا مدرسہ جاری کیا اور کتب خانہ قائم کیا، جو بعد میں ضائع ہوگیا۔

نواب سکندر بیگم مذہبی اعتبار سے بہت مضبوط عقائد کی مالک تھیں اور احکامِ اسلام پر پابندی سے عمل کرتی تھیں۔ اسلام کے اصولی اور فروعی مسائل پر انھیں عبور حاصل تھا۔ مسلمانوں کے عام معاملات میں بے حد دلچسپی رکھتی تھیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد دہلی کی جامع مسجد انگریزوں نے نمازیوں کے لیے بند کر دی تھی۔ یہ مسجد پانچ سال بند رہی۔ نواب سکندر بیگم دہلی گئیں تو ان کی کوشش سے مسجد واگزار کی گئی اور لوگ اس میں نماز پڑھنے لگے۔

حضرت نواب محمد صدیق حسن خاں ۱۸۵۶ء میں نواب سکندر بیگم کے عہد ہی میں بھوپال آئے اور دربارِ سکندری سے منسلک ہوئے۔ ان کی آمد پر ایک ''دفتر تاریخ'' قائم کیا گیا، جس کے وہ منتظم اعلیٰ ہوئے۔ نواب سکندر بیگم کی بیٹی نواب شاہ جہاں بیگم کا شوہر فوت ہوگیا تھا، پھر نواب صاحب کا اس سے عقد ثانی ہوا۔

نواب صاحب کے بارے میں ضروری باتیں:

ریاست بھوپال کی اس مختصر تاریخ کے تذکرے کے بعد اب آیئے نواب سید محمد صدیق حسن خان کی طرف...!

نواب صاحب دنیائے اسلام کے کثیر التصانیف مصنف ہیں۔ ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی کل تعداد ۲۳۰ کے لگ بھگ ہے۔ ان میں سے سات قرآنِ مجید کے متعلق، تینتیس حدیث شریف کے بارے میں، تیس عقائد کے سلسلے میں، بائیس عام فقہی مسائل کے موضوع پر، گیارہ ردتقلید کے متعلق، بائیس تاریخ وسیر کے متعلق، تیرہ مناقب وفضائل کے سلسلے میں، بائیس علوم وادب کے بارے میں، اڑتیس اخلاقیات کے موضوع پر، چھے سیاست کے موضوع پر، ایک شیعیت کے سلسلے میں اور سترہ کتابیں تصوف کے موضوع پر ہیں۔ ان کے علاوہ بعض چھوٹے چھوٹے رسائل بھی مختلف عنوانات سے متعلق تصنیف فرمائے۔

نواب صاحب کا سلسلۂ نسب تینتیس واسطوں سے نبی اکرم ﷺ تک پہنچتا ہے۔ نواب صاحب کے والد مکرم کا اسم گرامی سید اولاد حسن تھا، جو ۱۲۱۰ھ (۹۶-۱۷۹۵ء) میں ہندوستان کے شہر قنوج میں پیدا ہوئے۔ قنوج اور لکھنؤ کے بعض معروف اساتذہ سے حصولِ علم کے بعد سید اولاد حسن ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۸ء) میں دہلی گئے۔ وہاں حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی اور شاہ رفیع الدین رحمہما اللہ سے استفادہ کیا اور شاہ عبد القادر دہلوی رحمہ اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ امیر المجاہدین سید احمد شہید رحمہ اللہ کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی۔ ۱۷ر جمادی الاخریٰ ۱۲۴۱ھ (۱۷ر جنوری ۱۸۲۶ء) کو مجاہدین کا جو پہلا قافلہ سید احمد شہید رحمہ اللہ کی قیادت میں جہاد کے لیے آزاد قبائل کی طرف روانہ ہوا تھا، سید اولاد حسن رحمہ اللہ اس میں شامل تھے۔ انھوں نے کتاب وسنت کی تبلیغ واشاعت کے سلسلے میں سترہ کتابیں تصنیف کیں۔ ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۸ء) میں قنوج میں فوت ہوئے۔ صرف ۴۳ سال عمر پائی۔

سید اولاد حسن کی نرینہ اولاد دو بیٹے تھے۔ بڑے سید احمد حسن عرشی اور چھوٹے سید محمد صدیق حسن، باپ کی وفات کے وقت احمد حسن سات برس کے اور صدیق حسن پانچ برس کے تھے۔

نواب محمد صدیق حسن کے ننھیال کا تعلق بانس بریلی سے تھا۔ ان کے نانا مفتی محمد عوض عثمانی اپنے علاقے اور عہد کے ممتاز عالم تھے۔ دنیوی اعتبار سے بھی اونچی حیثیت کے مالک تھے۔ نواب صاحب کی ولادت انھی کے گھر بانس بریلی میں ۱۹؍ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۸ھ (۱۴؍ اکتوبر ۱۸۳۲ء) کو ہوئی۔

سید اولاد حسن کی وفات کے بعد یہ کم سن بچے انتہائی غربت کی زد میں آ گئے تھے۔ گھر میں اپنے اسلاف کی صرف کتابیں رہ گئی تھیں، جنھیں وہ دیکھتے رہتے تھے اور وہ کتابیں ان کے دل میں تحصیلِ علم کا جذبہ پیدا کرتی تھیں۔

طلبِ علم کی راہ پر:

نواب محمد صدیق حسن کچھ بڑے ہوئے تو اپنے محلے کے مدرسے میں حصولِ علم کا آغاز کیا۔ بڑے بھائی سید احمد حسن عرشی سے بھی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ پھر ان کے والد (سید اولاد حسن) کے ایک عقیدت مند سید احمد علی رحمہ اللہ انھیں اپنے وطن فرخ آباد لے گئے۔ وہاں کے بعض اساتذہ سے مختلف علوم کی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں سید احمد شہید رحمہ اللہ کے ایک ارادت کیش ان کو کان پور لے گئے، وہاں کے چند اساتذہ سے استفادہ کیا۔

۱۲۶۹ھ (۱۸۵۳ء) میں سید محمد صدیق حسن عازم دہلی ہوئے، جسے اس زمانے میں علم کے گہوارے اور علما کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں مفتی صدر الدین آزردہ رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضری دی اور ایک سال آٹھ مہینے ان سے تحصیلِ علم میں مصروف رہے۔ اس اثنا میں ان سے تفسیر و حدیث کی بعض کتابوں کے علاوہ منطق و فلسفہ، صرف ونحو، معانی و بیان، فقہ و کلام اور عربی ادبیات کی متعدد کتابوں کی تکمیل کی اور سند لی۔

مفتی صدر الدین آزردہ رحمہ اللہ کے علاوہ جن حضراتِ عالی مقام سے علومِ تفسیر و حدیث کا اجازہ حاصل ہوا، ان میں سے بعض رفیع الدرجات علما کے اسمائے گرامی حسبِ ذیل ہیں:

① شیخ زین العابدین بن محسن بن محمد انصاری رحمہ اللہ۔

② قاضی محمد بن علی شوکانی یمنی کے شاگردِ رشید شیخ عبدالحق محدث نیوتنی بنارسی رحمہ اللہ۔

③ شیخ حسین عرب یمنی رحمہ اللہ۔

④ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ کے نواسے اور حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی رحمہ اللہ کے بھائی مولانا شاہ محمد یعقوب مہاجر مکی رحمہ اللہ، ان سے بذریعہ خط اجازۂ حدیث حاصل کیا۔

نواب صاحب رحمہ اللہ نہایت ذہین تھے اور حصولِ علم کا بے حد شوق رکھتے تھے۔ قوتِ اخذ بہت تیز تھی اور حافظہ مضبوط تھا۔ اکیس برس کی عمر میں تمام مروجہ علوم پڑھ لیے تھے اور فارغ التحصیل ہو گئے تھے۔

بھوپال میں ملازمت اور اس کا اختتام:

حصولِ علم سے فراغت کے بعد نواب صاحب رحمہ اللہ اپنے وطن قنوج چلے گئے تھے، لیکن گھر کی مالی حالت نہایت اذیت رساں تھی۔ اس لیے تھوڑا عرصہ وہاں رہے۔ پھر تلاشِ ملازمت کے لیے بھوپال آ گئے۔ اس وقت ریاستِ بھوپال کے مدار المہام مولانا جمال الدین صدیقی دہلوی رحمہ اللہ تھے (جو بعد میں نواب صاحب کے سسر ہوئے) بھوپال کی سرکار میں نواب صاحب نے ملازمت کی درخواست دی اور صفر ۱۲۷۲ھ (اکتوبر ۱۸۵۵ء) میں ان کو تیس روپے ماہانہ کی ملازمت مل گئی۔ کچھ مدت بعد حسنِ کارکردگی کی بنا پر عہدۂ میر دبیر پر فائز کیے گئے اور خلعت عطا ہوا، لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ۱۶/محرم ۱۲۷۳ھ (۱۶/ستمبر ۱۸۵۶ء) کو ایک سال بعد ملازمت ختم ہوگئی اور واپس گھر چلے گئے۔

اس زمانے میں ریاستِ بھوپال کی حکمران نواب سکندر بیگم تھیں۔ انھوں نے سید محمد صدیق حسن رحمہ اللہ کو قنوج سے دوبارہ طلب کیا۔ گھر سے چل پڑے، لیکن راستے میں ایسی رکاوٹیں پیش آئیں کہ بروقت بھوپال نہ پہنچ سکے اور بعض حاسدوں کے کہنے سے ملازمت کا حکم منسوخ کر دیا گیا۔ ۱۹/ربیع الاول ۱۲۷۵ھ (۱۸/نومبر ۱۸۵۸ء) کو بھوپال سے نکلے اور ٹونک آ گئے۔ ریاستِ ٹونک کا حکمران اس وقت نواب محمد وزیر خاں تھا۔ اس نے پچاس روپے ماہانہ تنخواہ پر انھیں ملازم رکھا اور ٹونک میں سکونت اختیار کرنے پر اصرار کیا، لیکن سید محمد صدیق حسن رحمہ اللہ کا دل اس ماحول سے مانوس نہ ہوا اور تھوڑے عرصے بعد چار ماہ کی رخصت کے لیے درخواست دی۔ اتفاق ملاحظہ ہو کہ اسی اثنا میں ریاست بھوپال کی والیہ نواب سکندر بیگم کی طرف سے پھر فرمانِ طلبی صادر ہوا۔

دورِ عروج:

یکم صفر ۱۲۷۶ھ (۲۷/اگست ۱۸۵۹ء) کو نواب محمد صدیق حسن رحمہ اللہ بھوپال پہنچے۔ بھوپال میں ان کا یہ تیسرا ورود تھا، جسے آخری اور فاتحانہ ورود کہنا چاہیے۔ ۷۵ روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی اور ریاستِ بھوپال کی تاریخ نگاری کا فریضہ ان کے سپرد کیا گیا۔ اب روز بہ روز ترقی کے دروازے ان کے لیے کھلنے لگے اور عروج نے دل کھول کر ان کا استقبال کیا۔ ۲۵/شعبان ۱۲۷۷ھ (۸/مارچ ۱۸۶۱ء) کو ریاست کے مدار المہام مولانا جمال الدین صدیقی دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی بڑی بیٹی ان کے عقد میں دے دی۔ نکاح مولانا عبد القیوم بن مولانا عبد الحی بڈھانوی رحمہما اللہ نے پڑھایا۔ نواب صاحب نے اب اپنی والدہ مکرمہ اور بہنوں کو بھی قنوج سے بھوپال بلا لیا تھا اور اس خاندان نے مستقل طور پر بھوپال میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

نواب شاہ جہاں سے شادی:

والیہ بھوپال نواب سکندر بیگم کے انتقال کے بعد ان کی بیٹی نواب شاہ جہاں بیگم نے ریاست کی زمامِ حکومت

ہاتھ میں لی۔ ان کا شوہر وفات پا گیا تھا۔ نواب شاہ جہاں بیگم صاحبہ نواب محمد صدیق حسن کی قابلیت، دیانت اور شرافت سے نہایت متاثر ہوئیں۔ اس تاثر کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے نواب صاحب کو امورِ سلطنت میں شریک کرنے کا فیصلہ کیا اور ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) میں نواب صاحب سے نکاح کر لیا۔ پھر ۲۱ر ربیع الثانی ۱۲۸۸ھ (۱۰ر جولائی ۱۸۷۲ء) کو انھیں ''معتمد المہام'' کا عہدہ ملا اور ۱۰ر شعبان ۱۲۸۸ھ (۱۳ر اکتوبر ۱۸۷۲ء) کو ''نواب والا جاہ امیر الملک سید محمد صدیق حسن خاں'' کے خطاب سے مفتخر ہوئے۔ اس کے ساتھ اور بھی بہت سے اعزازات کے مستحق قرار پائے۔

علم اور اہلِ علم کی قدر دانی:

اب نواب صاحب رحمہ اللہ نے ریاست کے طول وعرض میں مدرسے قائم کیے، یتیم خانے بنوائے، مسجدیں تعمیر کرائیں، لائبریریوں کے قیام کا سلسلہ شروع کیا، سرکاری طور پر ریاست کے مختلف مقامات میں جاروب کشوں کا تقرر کیا گیا، مسجدوں میں باقاعدہ موذن، امام اور خطیب مقرر کیے گئے اور سرکاری خزانے سے ان کو ماہانہ تنخواہیں ملنے لگیں۔ دیگر علومِ متداولہ کے علاوہ طلبا کے لیے خوش خطی، انشا پردازی، قانون دانی اور حساب و ریاضی کی تعلیم لازمی قرار دی گئی۔ علما وطلبا کے لیے تصنیف و تالیف اور مختلف علمی موضوعات پر تحقیق کے شعبے قائم کیے گئے۔ مدرسین کے لیے ان کی ضرورت اور قابلیت کے مطابق معقول مشاہرات کا اہتمام کیا گیا، طلبا کو ماہانہ وظائف دینے کا فیصلہ ہوا۔ ہندی زبان کی تعلیم کا انتظام بھی کیا گیا۔ باشندگانِ ریاست کے لیے اخلاقی تربیت کا بالخصوص بندوبست کیا گیا اور اصلاحی کمیٹیاں بنائی گئیں۔ چوری، ڈاکا، راہ زنی اور ہر قسم کی برائی کے سدباب کے لیے بھرپور کوششیں کی گئیں۔ ریاست کو دار الامن بنانے کی سعی کی گئی۔ ہندو مسلم اتحاد کو ضروری قرار دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام اعمالِ خیر میں نواب صاحب رحمہ اللہ کو کامیابی عطا فرمائی۔

علما وطلبا میں حفظِ حدیث کا جذبہ اور شوق پیدا کرنے کی غرض سے یہ بہت بڑا اقدام کیا گیا کہ جو شخص صحیح بخاری حفظ کرے گا، اسے ایک ہزار روپے انعام دیا جائے گا اور جو صاحب بلوغ المرام یاد کریں گے، ان کی خدمت میں ایک سو روپیہ بہ صورتِ انعام پیش کیا جائے گا۔ چناں چہ بعض حضرات نے یہ انعامات حاصل کیے۔ ایک طالب علم عبد التواب غزنوی علی گڑھی رحمہ اللہ نے صحیح بخاری کے حفظ کا سلسلہ شروع کیا تو نواب صاحب رحمہ اللہ نے ان کا تیس روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ بعد میں مولانا عبد التواب غزنوی علی گڑھی رحمہ اللہ نے جلیل القدر عالم کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ان سطور کے راقم کو ان کی زیارت کا شرف حاصل ہے۔ اس بے حد سستے زمانے میں ہزار روپے بہت بڑی رقم تھی۔ آج کل کے لاکھ روپے سے بھی شاید زیادہ ہوگی۔

نواب صاحب نے مختلف اسلامی ممالک سے کثیر رقم خرچ کر کے تفسیر ابن کثیر، صحیح بخاری کی شرح فتح الباری،

امام شوکانی کی تصنیف نیل الاوطار کے قلمی نسخے حاصل کیے اور پھر ان ضخیم کتابوں کو اپنے خرچ سے طبع کرایا اور اہلِ علم اور مختلف مدارس میں انھیں مفت تقسیم کیا۔ اس سے قبل یہ کتابیں برصغیر میں دست یاب نہ تھیں۔ نواب صاحب رحمہ اللہ کی کوشش اور زرِ کثیر کے صرف سے یہ عظیم الشان کتابیں اس خطۂ ارض میں پہنچیں اور عام ہوئیں۔

تصانیف:

خود نواب صاحب رحمہ اللہ نے نہایت اہم کتابیں تصنیف کیں۔ انھوں نے عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں لکھا اور بہت لکھا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد ۲۳۰ کے قریب ہے، جن میں ایک سو سے زیادہ کتابیں بڑی ضخیم ہیں اور کئی کئی جلدوں پر محیط ہیں۔

نواب صاحب نے قرآنِ مجید سے متعلق جو کتابیں تصنیف کیں، ان کا تذکرہ ہماری کتاب ''برصغیر کے اہلِ حدیث خدامِ قرآن'' میں ہو چکا ہے۔ یہاں ان کی ان تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے، جن کا تعلق حدیث شریف سے ہے۔ لیکن اس موقع پر یہ عرض کرنا شاید مناسب ہوگا کہ چند ایک کے سوا نواب صاحب کی تمام تصانیف کے نام عربی تراکیب پر مشتمل ہیں اور ان کی سب تصانیف میرا خیال ہے کسی کے پاس بھی نہیں ہوں گی اور نہ غالباً اس دور کے کسی شخص نے ان کی سب تصانیف دیکھی ہوں گی۔ ہر شخص اپنے مطلب اور ذوق کی کتابوں سے تعلق رکھتا ہے، نواب صاحب کی کتابیں بھی اپنے اپنے ذوق کے مطابق اہلِ علم نے حاصل کی ہوں گی۔ ان کی کسی کتاب کو دیکھے بغیر صرف نام سے کچھ پتا نہیں چلتا کہ یہ عربی زبان میں ہے یا فارسی زبان میں یا اردو زبان میں۔ بعض حضرات نے ان کی اردو اور فارسی کتابوں کو فقط نام کی وجہ سے عربی کتابوں میں شامل کر دیا ہے۔ میں نے ان کی تمام تصانیف دیکھنے کی بہت کوشش کی، لیکن کامیاب نہیں ہوسکا۔ ان کی تصانیف حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ کے قائم کردہ ادارہ الدعوۃ السّلفیہ کی لائبریری میں موجود ہیں، لیکن سب تصانیف اس میں بھی نہیں ہیں۔ البتہ (جہاں تک میرا خیال ہے) دیگر کتب خانوں سے بہر حال زیادہ ہیں۔ اس ضمن میں جو کچھ معلوم ہوسکا، وہ درجِ ذیل ہے۔

ان کی تصانیف کی موضوعاتی ترتیب کو قائم رکھنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن سے متعلق بھی ان کی تصانیف کا ذکر کر دیا جائے۔ یہ سات کتابیں ہیں، جو دس ہزار صفحات پر محیط ہیں۔ یہاں ان کے صرف نام لکھے جائیں گے۔ ان کی تفصیل ہماری کتاب ''برصغیر کے اہلِ حدیث خدامِ قرآن'' میں ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ فتح البیان في مقاصد القرآن: عربی زبان میں۔ دس جلدیں۔ چار ہزار سے زائد صفحات۔

۲۔ ترجمان القرآن بلطائف البیان: اردو زبان میں۔ پندرہ جلدوں پر مشتمل۔ کم وبیش پانچ ہزار صفحات۔

۳۔ تذکیر الکل بتفسیر الفاتحة وأربع قل: سورۃ الفاتحہ، سورۃ الاخلاص، سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کی تفسیر

اردو زبان میں۔ صفحات ستر۔

۴۔ نيل المرام من تفسير آيات الأحكام: قرآن کی ۲۳۶ آیاتِ احکام کی تفسیر عربی زبان میں۔ چار سو صفحات۔

۵۔ إكسير في أصول التفسير: بہ زبان فارسی۔ دو حصوں پر مشتمل۔ صفحات ایک سو تین۔

۶۔ إفادة الشيوخ بمقدار الناسخ والمنسوخ: دو حصوں میں۔ صفحات ایک سو چوبیں۔

۷۔ فصل الخطاب في فضل الكتاب: اردو زبان میں۔ صفحات بتیس۔

یہ تمام تفسیریں بڑے سائز کی ہیں۔ تفسیر ''ترجمان القرآن'' مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور کی طرف سے شائع کی جا رہی ہے۔ یہ نواب صاحب رحمہ اللہ کی سب سے ضخیم کتاب ہے۔

اب ملاحظہ فرمایئے پہلے حدیث سے متعلق حضرت نواب صاحب رحمہ اللہ کی عربی کتابیں:

۱۔ غون الباري لحل أدلة البخاري.

۲۔ السراج الوهاج في كشف مطالب مسلم بن الحجاج.

۳۔ فتح العلام شرح بلوغ المرام.

٤۔ الحطة في ذكر الصحاح الستة.

٥۔ الروض البسام من ترجمة بلوغ المرام و مؤلفه الإمام.

٦۔ نزل الأبرار بالعلم المأثور في الأدعية والأذكار.

٧۔ الرحمة المهداة إلى من يريد زيادة العلم على أحاديث المشكاة.

٨۔ العبرة بما جاء في الغزو والشهادة والهجرة.

٩۔ حسن الأسوة بما ثبت عن الله ورسوله في النسوة.

١٠۔ الإدراك بتخريج أحاديث رد الإشراك.

١١۔ الإذاعة لما كان وما يكون بين يدي الساعة.

١٢۔ الحرز المكنون من لفظ المعصوم المكنون.

١٣۔ إكليل الكرامة في تبيان مقاصد الإمامة.

١٤۔ بلوغ السول من أقضية الرسول.

اب ملاحظہ کریں حضرت نواب صاحب کی فارسی کتبِ حدیث:

۱۔ سلسلة العسجد في مشائخ السند.

۲۔ مسك الختام شرح بلوغ المرام.

۳۔ منهج الوصول إلى اصطلاح أحاديث الرسول.

٤۔ موائد العوائد من عيون الأخبار والفوائد.

مندرجہ ذیل سطور میں حدیثِ رسول ﷺ کے متعلق نواب صاحب کی اردو کتابوں کی تفصیل ملاحظہ ہو:

۱۔ اتباع الحسنة في جملة أيام السنة.

۲۔ بغية القاري في ثلاثيات البخاري.

۳۔ تقوية الإيقان شرح حديث حلاوة الإيمان.

٤۔ تميمة الصبي في ترجمة أحاديث النبي.

٥۔ توفيق الباري لترجمة الأدب المفرد للبخاري.

٦۔ جامع السعادات ترجمة المنبهات (لابن حجر).

۷۔ ضوء الشمس من حديث بني الإسلام على خمس.

۸۔ غنية القاري في ترجمة ثلاثيات البخاري.

۹۔ كشف اللثام عن غربة الإسلام.

۱۰۔ محاسن الأعمال.

۱۱۔ محو الحوبة بالاستغفار والتوبة.

۱۲۔ الداء والدواء.

۱۳۔ هادي القلب السليم إلى درجات جنات النعيم.

١٤۔ غراس الجنة.

کتبِ حدیث بہ سلسلہ لغت:

۱۔ خير القرين ترجمة الأربعين.

۲۔ عين اليقين ترجمة الأربعين للغزالي.

۳۔ النهج المقبول من شرائع الرسول.

٤۔ نيل الأماني.

نواب صاحب نے فقہی مسائل پر بھی کتابیں لکھیں۔ یہ کتابیں بھی اگرچہ تینوں زبانوں میں ہیں، لیکن اردو میں زیادہ ہیں، جن کی تعداد تیرہ ہے، فارسی میں سات اور عربی زبان میں تین کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کے نام "تعليم الصلاة، تعليم الصوم، تعليم الزكاة، تعليم الحج، تعليم الذكر والدعاء، فضائل الحج

والعمرة، روز مرۂ اسلام، حل الأسئلة المشكلة، سبيل الرشاد لما يحتاج إليه العباد وغیرہ ہیں۔ یہ کل بائیس کتابیں ہیں اور ان میں جو مسائل درج کیے گئے ہیں، وہ قرآن و حدیث سے ماخوذ ہیں۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتابیں بھی قرآن اور حدیث کے موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔

اسی طرح نواب صاحب رحمہ اللہ کی عقائد سے متعلق تیس کتابوں کا ماخذ بھی قرآن و حدیث ہے۔ ان میں بھی عربی، فارسی اور اردو کی تصانیف شامل ہیں۔ اردو کی اٹھارہ، عربی کی نو اور فارسی کی تین، ان کتابوں کے مشمولات بھی قرآن اور حدیث سے تعلق رکھتے ہیں۔

نواب صاحب رحمہ اللہ نے تاریخ و سیر کے موضوع پر بائیس کتابیں تصنیف فرمائیں۔ ان تصانیف میں بھی عربی، فارسی، اردو، کتابیں شامل ہیں۔ عربی کتابوں میں ”أبجد العلوم“ کو بڑی اہمیت حاصل ہے، جو بڑے سائز کے تقریباً ایک ہزار صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کتاب کو مختلف تاریخی معلومات کے اعتبار سے ہم دائرۃ المعارف سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ عربی کی ”التاج المكلل“ اور ”رياض الجنة في تراجم أهل السنة“ خزینۂ علم کی حیثیت رکھتی ہیں۔

پھر فارسی کی ”اتحاف النبلا“ حروف تہجی کی ترتیب سے رجال و کتب سے متعلق معلومات کا ایک وسیع ذخیرہ اپنے دامنِ صفحات میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ”تقصار جيود الأحرار من تذكار جيود الأبرار“ بھی بہت سے عظیم لوگوں کے حالات کا معلومات افزا مجموعہ ہے۔ فارسی ہی میں ”سلسلة العسجد في ذكر مشائخ السند“ اپنی نوعیت کی بہترین کتاب ہے۔

تاریخ و سیر کے سلسلے کی فارسی کتابوں میں تذکرۂ شمع انجمن، تذکرۂ صبح گلشن اور نگارستانِ سخن اپنی نوعیت کی پُر بہار کتابیں ہیں۔ یہ کتابیں جہاں تاریخ و واقعات کے ایک خاص عہد کی صراحت کرتی ہیں، وہاں زبان و طرزِ ادا کی صفائی کا بھی نہایت عمدہ نمونہ ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ مصنف کا ذہن کس قدر وسیع ہے اور ان کا قلم علم و ادراک کی کن کن وادیوں کو طے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اردو میں نواب صاحب کی خود اپنی سرگزشت حیات ”إبقاء المنن بإلقاء المحن“ ترتیب و اسلوب اور زبان و بیان کے لحاظ سے بہ درجہ غایت اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں نواب صاحب رحمہ اللہ نے اپنی زندگی کے واقعات خوب صورت انداز میں قلم بند کر دیے ہیں۔

اردو ہی میں نواب صاحب کا سفر نامہ حج ”رحلة الصديق إلى بيت العتيق“ لائقِ مطالعہ ہے اور مختلف مراحلِ حج کا دل نواز مرقع ہے۔

بوقلموں علوم پر ان کی گرفت کا یہ عالم ہے کہ خالص درسی کتابوں پر بھی انھوں نے حواشی لکھے یا ان کی شرح قلم بند کی، مثلاً ''تصريف الرياح'' کے نام سے ''مراح الأرواح'' کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ کافیہ کی شرح ''صافیہ'' کے نام سے فارسی میں لکھی۔ منطق کی کتاب شرح تہذیب کی شرح عربی میں ''تہذیب'' کے نام سے لکھی۔ میزان کی شرح ''قسطاس الأذعان'' لکھی۔

عربی ادبیات میں انشائے عربی، البلغة إلى أصول اللغة، تكميل العيون بتعارف العلوم والفنون، العلم الخفاف من علم الاشتقاق، ربيع الأدب، السحاب المركوم في بيان أنواع الفنون والعلوم'' ان کی معروف تصانیف ہیں۔

اردو اور فارسی غزلیات کا مجموعہ ''دیوان گل رعنا'' ان کے ذوق شعری کا بین ثبوت ہے۔ اسی قسم کا ایک اور مجموعہ ''نفح الطيب من المنزل والحبيب'' بھی ان سے یادگار ہے۔

اخلاقیات کے موضوع پر بھی ان کا قلم عربی، فارسی، اور اردو میں رواں دواں ہے۔ اس ضمن میں ان کی تصانیف میں إيقاظ النيام لصلة الأرحام، إسعاد العباد بحقوق الوالدين والأولاد، إدامة السكر بإقامة الصبر والشكر، محاسن الأعمال، مكارم الأخلاق شامل ہیں۔

فضائل ومناقب کے باب میں بھی نواب صاحب نے خوب دادِ تحقیق دی۔ اس سلسلے میں عربی، فارسی، اردو میں ان کی تیرہ کتابوں کی نشان دہی ہوتی ہے، جن میں عربی زبان میں الشمامة العنبرية في مولد خير البرية، كلمة العنبرية في مدح خير البرية، فارسی میں ''جلب المنفعة في الذب عن الأئمة الأربعة'' اور اردو میں ''السيف المسلول على من سب الرسول، تكريم المؤمنين بتقديم الخلفاء الراشدين، فصل الخطاب في فضل الكتاب'' شامل ہیں۔

سیاسیات کے متعلق اردو میں ''حسن المساعي إلى إصلاح الرعية والراعي، فلاح البرايا في إصلاح الراعي والرعايا'' عربی میں ''العبرة بما جاء في الغزو والشهادة والهجرة، إكليل الكرامة في تبيان مقاصد الإمامة'' اور فارسی میں ''برگ سبز'' یعنی دربیان بیعت شامل ہیں۔ سیاسیات کے موضوع کی یہ کتابیں قرآن وحدیث کی روشنی میں لکھی گئی ہیں، اس لیے ہم نے ان میں سے بعض کتابوں کو نواب صاحب رحمہ اللہ کی حدیث سے متعلق کتابوں کی فہرست میں بھی شامل کیا ہے۔

ردِ تقلید میں نواب صاحب رحمہ اللہ نے عربی، فارسی، اردو میں گیارہ کتابیں تصنیف کیں۔ اس موضوع سے متعلق ان کی عربی زبان میں تین کتابیں ہیں، ایک ''الإقليد لأدلة الاجتهاد و التقليد'' دوسری ''الطريق المثلى

في إرشاد إلى ترك التقليد و اتباع ما هو الهوىٰ، الجنة في الأسوة الحسنة" اردو میں ایک کتاب "بذل المنفعة لإيضاح الأركان الأربعة" ہے۔اس موضوع پر فارسی زبان میں ان کی تین تصانیف ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ہر موضوع ان کے اشہبِ فکر کی زد میں ہے اور ہر علمی میدان میں وہ اپنے اقران و معاصرین سے آگے نظر آتے ہیں۔ پھر جس موضوع کو زیر بحث لاتے ہیں، اس کے تمام پہلوؤں کی خوب صورتی سے وضاحت کرتے چلے جاتے ہیں۔ کسی مقام پر کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ ان کے علم کا بہاؤ ان کے سمند خامہ کو تیز رکھتا ہے۔

نواب صاحب رحمہ اللہ شاعر بھی تھے۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں انھوں نے شعر کہے۔ بہت سے شعرا کے اشعار انھیں زبانی یاد تھے۔ چناں چہ اپنی بعض تصانیف میں مناسب مواقع پر وہ ایسے خوب صورت شعر درج کرتے ہیں کہ جن سے کلام میں ایک نئی روح ابھر آتی ہے۔ "إبقاء المنن" میں وہ کثرت سے شعر لاتے ہیں اور ہر شعر نگینے کی طرح ان کے طرزِ بیان میں موزوں ہوتا چلا جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اسی موقعے کے لیے یہ شعر کہا تھا۔

نواب صاحب رحمہ اللہ بے حد فراخ حوصلہ عالم دین تھے اور اختلافِ مسلک کے باوصف اصحابِ علم سے وسیع تعلقات رکھتے تھے اور ان سے میل جول کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمہ اللہ سے تمام عمر نواب صاحب رحمہ اللہ کی قلمی بحثیں رہیں، لیکن جب انھیں مولانا کے انتقال کی خبر ملی تو اسی وقت تمام دفاتر بند کرنے کا حکم جاری کر دیا اور تعزیت کے لیے خود فرنگی محل تشریف لے گئے۔

الزامات اور سلب اختیارات:

نواب صاحب رحمہ اللہ کے بے شمار حاسد بھی تھے، جن کے لیے ان کی علمی سرگرمیاں بھی ناقابلِ برداشت تھیں اور ان کا دنیوی جاہ و مرتبہ بھی ایسے لوگوں کے لیے شدید ذہنی اذیت کا باعث تھا۔ انھوں نے انگریزی حکومت سے ان کے متعلق اس قسم کی شکایات کا سلسلہ بہت وسیع کر دیا تھا کہ ان کے والد (سید اولاد حسن) کا تعلق سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی رحمہما اللہ کی جماعتِ مجاہدین سے تھا، جو انگریزی حکومت کے خلاف برسرِ پیکار تھی اور اب بھی سرحد پار کے قبائلی علاقوں میں وہ لوگ انگریزوں سے جہاد میں مصروف ہیں۔ نواب محمد صدیق حسن خاں بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ وہ جماعتِ مجاہدین کے حامی اور انگریزی حکومت کے مخالف ہیں۔ انبالہ وغیرہ کے وہابی مقدمات کے قیدیوں (مولانا احمد اللہ عظیم آبادی، مولانا یحییٰ علی عظیم آبادی، مولانا محمد جعفر تھانیسری رحمہم اللہ اور ان کے رفقائے کرام) کا معاملہ بھی جنھیں کالے پانی بھیج دیا گیا تھا، انگریزی حکومت کے سامنے تھا، اس لیے انگریزی حکومت ان شکایات سے متاثر ہوئی اور نواب صاحب رحمہ اللہ کو منصبِ نوابی سے علاحدہ کر دیا گیا۔

نواب صاحب رحمہ اللہ کے خلاف حسب ذیل الزامات عاید کیے گئے:

۱۔ ترغیبِ جہاد اور انگریزی حکومت کی مخالفت۔

۲۔ وہابیت کی تبلیغ، یعنی لوگوں کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر اکسانا۔

۳۔ والیہ بھوپال نواب شاہ جہاں بیگم کو پردہ نشین کر کے ریاست کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لینا۔

۴۔ جاگیروں کی ضبطی۔

۵۔ ریاست کے بندوبست میں سختی کرنا۔

اسی قسم کے چند اور الزامات لگائے گئے تھے۔

نواب صاحب رحمہ اللہ کو ۱۰/ شعبان ۱۲۸۹ھ (۱۳/ اکتوبر ۱۸۷۲ء) کو نوابی کا خطاب اور دیگر اختیارات دیے گئے تھے۔ پھر تیرہ سال بعد ۱۴/ ذیقعدہ ۱۳۰۲ھ (۲۶/ ستمبر ۱۸۸۵ء) کو تمام اختیارات سلب کر لیے گئے۔ نوابی کا خطاب بھی واپس لے لیا گیا۔ اس کے بعد صرف اتنا ہوا کہ نواب صاحب رحمہ اللہ کی اہلیہ محترمہ نواب شاہ جہاں بیگم کی کوششوں سے ابتدائے ذی الحجہ ۱۳۰۷ھ (اگست ۱۸۹۰ء) کو نوابی کا خطاب حکومتِ برطانیہ نے بحال کر دیا تھا۔[1]

حلیہ:

یہاں نواب صاحب کے حلیے، لباس اور اخلاق و عادات کے متعلق چند امور کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ان کا حلیہ یہ تھا: مناسب قد و قامت، سُرخ و سفید رنگ، بھرا ہوا خوب صورت چہرہ، کشادہ پیشانی، روشن آنکھیں، چوڑے شانے، جاذبِ نظر ناک نقشہ، بارعب شخصیت کے مالک۔ مردانہ وجاہت کے دل کش پیکر۔ رنگ اس قدر گورا چٹا کہ پہلی نظر میں دیکھنے والے کو انگریز معلوم ہوتے تھے۔ چناں چہ ۱۸۵۷ء کے شدید ہنگامے کے زمانے میں جب وہ سخت مالی پریشانی میں مبتلا تھے، ایک صاحب کے گھر بلگرام میں مقیم تھے اور ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے خلاف بغاوت میں اتنا آگے نکل گئے تھے کہ انھیں دیکھنا گوارا نہ کرتے تھے۔ ایک دن نواب صاحب رحمہ اللہ دریائے گنگا کے کنارے غسل کر رہے تھے کہ ادھر سے چند ہندوستانیوں کا گزر ہوا۔ انھوں نے انگریز سمجھ کر بندوق کی نالی ان کی طرف کر دی۔ اچانک ایک کسان نے دیکھ لیا۔ وہ اونچی آواز میں پکارا: دیکھنا گولی نہ چلانا، یہ بڑے حضرت صاحب کے صاحب زادے ہیں، میں انھیں برسوں سے جانتا ہوں۔ یہ سن کر وہ لوگ آگے بڑھ گئے اور نواب صاحب رحمہ اللہ کی جان بچ گئی۔ یوں سمجھیے کہ زندگی دوبارہ ملی۔ اس کے بعد انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کے طور پر "القصيدة العنبرية في مدح خير البرية" کے عنوان سے عربی میں ایک طویل قصیدہ قلم بند فرمایا اور اس قصیدے نے ان کی عربی تصانیف میں نمایاں جگہ پائی۔

---

[1] نواب صاحب نے اپنے حالات اپنی متعدد کتابوں میں تحریر کیے ہیں۔ ابقاء المنن تو پوری کتاب انھی کے حالات پر مشتمل ہے اور یہ ان کی اپنی تصنیف ہے۔

لباس اور عادات و اطوار:

اب نواب صاحب کے لباس اور عادات و اطوار کے بارے میں ان کے بڑے صاحب زادے نواب علی حسن خاں ﷫ کی زبانی سنیے، جن کی وضاحت انھوں نے اپنی تصنیف ''مآثر صدیقی'' کے حصہ چہارم میں کی ہے:

لباس سادہ اور سفید بہت پسند تھا۔ کبھی رواج کے مطابق مختلف الوان اور نیم رنگ لباس بھی پہن لیا کرتے تھے۔ البتہ اس کا خیال رہتا تھا کہ لباس خوش وضع اور خوش قطع ہو اور عطر سے معطر ہو۔ عیدین کو عربی لباس زیب تن فرماتے تھے۔

خود فرماتے ہیں: ''عربیت نسب اور عربیت زبان دونوں چیزیں ہمارے لیے باعثِ فخر ہیں۔'' کرتہ گھنڈی دار نیچی چولی کا، دہلی کی وضع کا انگرکھا۔ دہلی کی وضع ہی کی گول ٹوپی اور قدرے تنگ پانچے کا پاجامہ زیب تن فرماتے تھے۔ جوتا زیادہ تر امرتسر کا پنجابی ساخت کا استعمال کرتے تھے۔

ذہن کے صاف اور دل کے غنی تھے۔ شیریں بیان، شریف الطبع اور حسنِ اخلاق کا عمدہ ترین نمونہ تھے۔ حیا اور تواضع میں ان کے دور میں کوئی شخص ان کا ثانی نہ تھا۔ حلم اور بردباری غصے پر غالب تھی۔ بے حد منصف مزاج تھے۔ اپنے مخالفین سے نہایت نرمی سے پیش آتے تھے۔ اہلِ علم کی بہت ہی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔

خود ''إبقاء المنن'' میں فرماتے ہیں:

''چوں کہ اللہ تعالیٰ نے حسنِ عمل اور سوے عمل کو میزانِ سعادت و شقاوت قرار دیا ہے، اس لیے میرا دل یہی چاہا کرتا ہے کہ مجھ سے وہ فعل ظہور میں آئے، جو میرے معبودِ حقیقی وحدہ لاشریک کو پسندیدہ ہو۔''

''إبقاء المنن'' میں مزید فرماتے ہیں:

''صحبتِ اہلِ جہاں سے تہہ دل سے بے زار رہتا ہوں اور اہلِ علم کی صحبت کو دوست رکھتا ہوں۔ ایسے لوگوں کی صحبت ہو، جو مذاکرۂ علمی یا ذکرِ الٰہی کریں۔''

اپنے احباب کے ساتھ بہت ہی خلوص و محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ احسان کے بدلے میں دوگنا چوگنا احسان کرنے کی سعی فرماتے۔

اکثر نمازِ جمعہ خود پڑھایا کرتے۔ رمضان المبارک میں تراویح ہمیشہ آٹھ رکعت پڑھتے اور نمازِ تہجد بارہ رکعت۔ نمازِ فجر کے بعد تلاوتِ قرآن اور مختلف ادعیہ کی پابندی کرتے۔ تقویٰ و تورّع کے اوصاف ان کے مزاج میں راسخ ہو چکے تھے۔

شرم و حیا کا اتنا غلبہ تھا کہ کسی بڑے یا چھوٹے مرتبے کے آدمی سے آنکھ ملا کر بات نہیں کرتے تھے۔ دوسرے

سے گفتگو کرتے وقت نگاہ ہمیشہ نیچی رکھتے۔

صلہ رحمی کا بہت خیال رکھتے۔ بعض لوگ بہ طور قرض روپیہ لیتے اور پھر واپس نہیں کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کو وہ قرض معاف کر دیتے تھے۔ اپنے رشتے داروں سے بے حد محبت کا سلوک کرتے۔

روزانہ کے معمولات:

نواب صاحب رحمہ اللہ کے روزانہ کے معمولات یہ تھے کہ نمازِ فجر سے پہلے جاگتے اور تہجد پڑھتے۔ نمازِ فجر کے بعد تلاوتِ قرآن اور وظائف میں مشغول ہوجاتے۔ اس سے فارغ ہو کر ایک گھنٹا وقائع نویسوں کی باتیں سنتے اور ریاست کے متعلق ضروری ہدایات دیتے۔ پھر تصنیف و تالیف میں مصروف ہوجاتے۔ دوپہر کے وقت کھانا تناول فرماتے اور کھانے کے بعد تھوڑی دیر قیلولہ کرتے۔ پھر نمازِ ظہر پڑھ کر ریاستی معاملات میں مشغول ہوجاتے۔ اس اثنا میں نمازِ عصر کا وقت ہوجاتا تو نماز پڑھ کر سیر و تفریح کے لیے تشریف لے جاتے۔ مغرب کی نماز کے بعد ضروری خبریں سنتے۔ پھر بچوں کو اور دوسرے شائقین کو تقریباً ایک گھنٹا قرآن و حدیث کا درس دیتے۔ بعض دفعہ علمائے کرام بھی درس میں شرکت کرتے۔ درس کے بعد بسا اوقات شعر و شاعری کا دور بھی چلتا۔ نمازِ عشا کے بعد کھانا کھا کر سو جاتے۔

نواب صاحب رحمہ اللہ دورِ طالب علمی میں دہلی میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے گھر پر رہے تھے۔ اس پر وہ ان کے نہایت شکر گزار تھے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے نواب مصطفیٰ شیفتہ کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا تو نواب صاحب رحمہ اللہ کو بے حد ذہنی اذیت پہنچی اور بھاگ دوڑ کر کے انھیں قید سے رہائی دلائی۔

مولانا عبد الحی فرنگی محلی رحمہ اللہ سے نواب صاحب رحمہ اللہ کی علمی بحثیں جاری رہتی تھیں۔ مولانا عبد الحی صاحب رحمہ اللہ کی وفات کا پتا چلا تو نواب صاحب رحمہ اللہ نے نہایت حزن و ملال کا اظہار فرمایا اور ان کی تعزیت کے لیے لکھنؤ کے فرنگی محل پہنچے، جہاں مولانا ممدوح سکونت پذیر تھے۔ فرمایا: آج آفتابِ علم غروب ہوگیا۔ ہمارا اور ان کا اختلاف فقط تحقیقاتِ مسائل تک محدود تھا۔ مولانا کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی۔[1]

حیاتِ طیبہ کے آخری ایام اور وفات:

اب نواب صاحب کی حیاتِ طیبہ کے آخری ایام اور سانحہ موت کا تذکرہ اس کے شاگرد رشید سید ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی رحمہ اللہ کی زبانی سنیے۔ سید ذوالفقار احمد نقوی رحمہ اللہ بھوپال کے ممتاز عالم اور وہاں کے مجلسِ علما کے رکن اعظم تھے۔ ان کا تذکرہ میں اپنی کتاب ''برصغیر کے اہلِ حدیث خدام قرآن'' میں کر چکا ہوں۔ علمائے برصغیر کے حالات کے سلسلے میں ان کی ایک کتاب کا نام ''قضاء الأرب من ذکر علماء النحو والأدب'' ہے۔ یہ

[1] ملاحظہ ہو: کتاب ''نواب صدیق حسن خاں'' از ڈاکٹر رضیہ حامد (ص: ۱۳۱، ۱۳۲)

کتاب اردو زبان میں ہے اور کتبِ حوالہ میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے نواب صاحب رحمہ اللہ کے آخری ایام اور وفات سے متعلق اس کتاب میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ نواب صاحب رحمہ اللہ نے ۱۷ر فروری ۱۸۹۰ء کو وفات پائی اور سید ذوالفقار احمد نقوی رحمہ اللہ ان کی وفات سے ۳۱ سال سات مہینے تین دن بعد ۲۴ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو فوت ہوئے۔ اب سید ذوالفقار احمد نقوی رحمہ اللہ کی تحریر ملاحظہ ہو:

''شیخنا المرحوم کی آخری تالیف کتاب ''مقالات الاحسان'' ہے۔ یہ کتاب ترجمہ ہے فتوح الغیب کا، جو سیدنا ومولانا حضرت سید عبد القادر گیلانی رحمہ اللہ کی تالیف ہے۔ جب اس کا طبع ہونا شروع ہوا تو میں نے اور انھوں نے اس کا مقابلہ کیا۔ جب صحت نامہ کا وقت آیا تو وہ بیمار تھے۔ میں نے اور ایک اور شخص نے اس کا مقابلہ ان کے روبرو کیا۔ مرضِ استسقا ہو گیا تھا۔ نہایت ایذا ہوئی، مگر بڑے مستقل مزاج تھے۔ وفات کے وقت تک استقلال رہا۔ ہراس اور بے صبری کا کلمہ ہرگز زبان سے نہیں نکلا۔ ایامِ بیماری میں شب کو میں ان کے پاس رہتا تھا۔ رات کو نیند نہیں آتی تھی اور نہ لیٹا جاتا تھا۔ پلنگ پر قبلہ رخ بیٹھے رہتے۔ سامنے تکیے رکھ لیتے تھے، ان پر سر رکھ لیا، کبھی اٹھا لیا۔ اسی طرح ساری رات بسر ہوتی تھی۔ اکثر یا ارحم الراحمین کہتے تھے۔ بیماری کی اتنی شدت کہ لکھنے کی طاقت نہیں، مگر علم کا شوق وہی۔ مجھ سے کہا: بھائی تم آخر اور جگہ بیٹھ کر لکھتے ہو، ہمارے سامنے ہی لکھا کرو۔ میں اس وقت ''مرأة النسوان'' لکھتا تھا۔ پس میں نے ان کے روبرو لکھنا شروع کیا۔ ظہر سے عصر تک ان کے کمرے میں لکھتا، پھر گھر جاتا، عشا کے بعد پھر آجاتا تھا۔ اس اثنا میں باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ کئی دنوں سے اسی طرح ہوتا تھا۔ کبھی فرماتے: بھائی آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو مثل دوا کے کہ جب بیمار ہوں تو ان کی حاجت ہو اور ایک مثل غذا کے کہ کسی حالت میں اس سے چارہ نہیں ہے۔ تیری مثال یہی ہے۔

غرض کہ چہار شنبہ بست ونہم ماہِ جمادی الاخریٰ ۱۳۰۷ھ کو ناگاہ جی آیا کہ آج ۳ بجے سے ان کے پاس جاؤں، چناں چہ جلدی سے کھانا کھا کر ان کے پاس حاضر ہوا تو تکیے پر سر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے سلام کیا تو سلام کا جواب دیا اور فرمایا: اچھا ہوا سویرے آگئے۔ پھر باتیں کرتے رہے۔ بے قراری زیادہ تھی۔ دوا علاج ہوتا رہا، مگر کچھ نفع نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح ہوتے ہوتے رات کے بارہ بج گئے۔ اس وقت یا اس سے قبل کہا: بھائی آگرہ سے ہماری کتاب نہیں آئی؟ میں نے کہا: وہ چھپ گئی۔ اس کا صحت نامہ بھی تیار ہو کر آگیا۔ فرمایا: اچھا ہوا۔ مہینا پورا ہوا اور ہماری تالیف بھی پوری ہوئی۔ پھر کوئی دوا لایا تو پی لی۔ ذرا دیر بعد میں نے کہا: کچھ آپ کو تسکین ہے؟ فرمایا: کسی قدر! پھر کہا: اب دوا نہیں پییں گے۔

اتنے میں ایک بج گیا۔ ذرا دیر بعد بے قراری ہوئی تو بسرعت ٹوپی سر سے اتار کر ڈال دی اور ذرا پاؤں پھیلائے اور چہرے پر پسینہ آیا۔ بہ کشادہ پیشانی بہ کمال درستیِ ہوش وحواس جان بحق تسلیم کی۔ اس وقت ایک بج کر ۳۵ منٹ ہوگئے تھے۔ إنا لله و إنا إليه راجعون۔رحمه الله تعالىٰ۔ بعد نمازِ صبح غسل دیا گیا۔ نمازِ جنازہ میں ایک خلقِ کثیر تھی۔ کئی بار نماز ہوئی۔ بروز پنج شنبہ یکم رجب ۱۳۰۷ھ (۱۸/ فروری ۱۸۹۰ء) کو قبل دوپہر اپنے خاص قبرستان میں مدفون ہوئے۔''

نواب صاحب رحمہ اللہ نے عیسوی حساب سے ۵۷ برس چار مہینے چار دن اور ہجری حساب سے ۵۹ برس ایک مہینا نو دن عمر پائی۔

کتب خانہ اور اولاد:

نواب صاحب کا بہت بڑا کتب خانہ تھا، جو ان کی وفات کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

نواب صاحب کی اولاد دو بیٹے تھے اور ایک بیٹی۔ بیٹوں میں سے ایک کا نام سید نور الحسن خاں کلیم تھا اور چھوٹے کا سید علی حسن خاں طاہر۔ ذیل کی سطور میں دونوں کا مختصر الفاظ میں تذکرہ کیا جاتا ہے۔

سید نور الحسن خاں کلیم بدھ کے روز ۲۱/ رجب ۱۲۷۸ھ (۲۳/ مارچ ۱۸۶۲ء) کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ان کی پرورش خدا ترسی، علم دوستی اور صلاح وتقویٰ کے اس ماحول میں ہوئی، جس میں قرآن وحدیث کی صدائیں گونجتی تھیں۔ سید نور الحسن خاں کلیم نے جن اساتذۂ کرام سے تعلیم حاصل کی وہ علم وعمل کے اعتبار سے اپنے دور کے عظیم لوگ تھے اور وہ تھے: قاضی ایوب بن قمر الدین پھلتی، قاضی انور علی لکھنوی، مولوی الٰہی بخش فیض آبادی، مولانا بشیر الدین عثمانی قنوجی، مولانا محمد بشیر سہسوانی، قاضی محمد بن عبد العزیز جعفری، شیخ حسین بن محسن انصاری اور خود ان کے والد عالی قدر نواب محمد صدیق حسن خاں۔

سید نور الحسن خاں فارسی اور اردو کے شاعر بھی تھے اور کلیم تخلص کرتے تھے۔ آخر عمر میں تصوف سے زیادہ شغف ہوگیا تھا اور امورِ خیر کی انجام دہی میں مشغول رہتے تھے۔ مصنف بھی تھے اور جو کتابیں تصنیف کیں، ان کا تعلق صالحینِ امت کے واقعات اور حسنات کی ترغیب سے ہے۔ اردو اور فارسی کے شعرا کے تذکرے بھی لکھے۔ مثلاً تذکرۂ طور کلیم، تذکرۂ شعراء الفرس، تذکرۂ شعرائے ہند، تذکرۂ نگارستانِ سخن۔ یہ تذکرے فارسی زبان میں ہیں۔ ایک ضخیم کتاب کا نام ''مجموعہ رسائل'' ہے۔ اس میں تصوف کے بعض موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔

آخر عمر میں بالکل خانہ نشین ہوگئے تھے اور فقیرانہ زندگی بسر کرنے لگے تھے۔ اپنے والد محترم نواب سید محمد

صدیق حسن خاں کی کتابوں کا بہت بڑا خزانہ ان کے سامنے تھا، اس سے استفادہ کرتے رہتے تھے۔ نواب شاہ جہاں بیگم کے انتقال کے بعد بھوپال سے لکھنؤ چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۳۳۰ھ (۹۶۔۱۸۹۵ء) میں لکھنؤ میں انتقال ہوا۔[1]

نواب صاحب کے دوسرے بیٹے نواب سید علی حسن خاں تھے، جو ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ علومِ متداولہ کی تحصیل متعدد مشہور اساتذہ سے کی۔ فارسی کے شاعر تھے اور طاہر تخلص تھا۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ تصانیف یہ ہیں: ①مآثر صدیقی موسوم بہ ''سیرت والا جاہی''۔ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے والد گرامی سید نواب محمد صدیق حسن خاں کے حالات خاصی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ ②شریعۃ الاسلام، ③فطرۃ الاسلام، ④سیرۃ الاسلام، ⑤المدینۃ فی الاسلام، ⑥اسلام اور اس کا طریقِ عبادت، ⑦انتظامِ خانہ داری، ⑧نالۂ دل، ⑨خرمنِ گل، ⑩تعلیم و تربیت، ⑪البیان۔

۱۹/ نومبر ۱۹۳۶ء (۳/ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ) کو اپنی کوٹھی بھوپال ہاؤس لال باغ لکھنؤ میں ۷۲ برس کی عمر میں وفات پائی۔

سید احمد حسن عرشی:

اب نواب صاحب کے بھائی سید احمد حسن عرشی رحمہ اللہ کے مختصر حالات ملاحظہ ہوں، جو نواب صاحب رحمہ اللہ سے عمر میں دو سال بڑے تھے۔ ۱۹/ رمضان ۱۲۴۶ھ (۳/ مارچ ۱۸۳۱ء) کو قنوج میں پیدا ہوئے۔ آغازِ تعلیم گھر ہی میں ہوا۔ پھر تکمیلِ علوم کان پور، فرخ آباد، بریلی اور علی گڑھ میں ہوئی۔ علی گڑھ میں حضرت شاہ عبد الجلیل رحمہ اللہ سے سلسلۂ تعلیم جاری رہا، جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزی حکومت سے جہاد کرتے ہوئے علی گڑھ میں جامِ شہادت نوش کیا۔ کتبِ حدیث شیخ عبد الغنی مجددی دہلوی رحمہ اللہ سے ان کے زمانۂ قیام مدینہ منورہ میں پڑھیں۔ اسی دور میں شیخ محمد عابد سندھی رحمہ اللہ (متوفی ماہِ ربیع الاول ۱۲۵۷ھ) سے سند و اجازۂ حدیث حاصل ہوا۔ دہلی کے بعض علمائے کرام سے بھی استفادہ کیا۔ عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی اور اردو میں مرزا غالب سے مشورۂ سخن حاصل تھا۔ خود فرماتے ہیں:

مغلوب ہیں سب اہلِ جہاں میرے سخن سے ہوں زلہ رُبا غالب اعجاز رقم کا

زیارتِ حرمین شریفین کے بے حد شائق تھے۔ تیسری مرتبہ بہ ارادۂ حج گھر سے روانہ ہوئے۔ بڑودہ میں مولوی غلام حسین بن مولانا رستم علی قنوجی کے مکان پر ٹھہرے۔ وہیں شدید بخار میں مبتلا ہو کر سفرِ آخرت پر روانہ

---

[1] یہ حالات ڈاکٹر رضیہ حامد کی تصنیف ''نواب صدیق حسن خاں۔ حیات، علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی خدمات'' (ص: ۲۲۰، ۲۲۱) سے لیے گئے ہیں۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۸۳ء میں دہلی سے طبع ہوئی تھی۔

ہوئے۔ یہ حادثہ ۹/ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ (۲۳/ نومبر ۱۸۶۰ء) کو پیش آیا۔ صرف تیس سال عمر پائی۔[1] اللھم اغفرلھم وارحمھم وعافھم واعف عنھم.

ایک عجیب واقعہ:

نواب صاحب رحمہ اللہ کی وجہ سے بہت سے اہلِ علم بھوپال آئے اور بھوپال نے مجمع علما اور مرکز شعرا کی حیثیت اختیار کر لی۔ ان میں سے متعدد حضرات کا تذکرہ ڈاکٹر رضیہ حامد نے اپنی کتاب ''صدیق حسن خاں'' میں کیا ہے۔ ان بزرگانِ ذی احترام میں سے ایک بزرگ مولوی قدرت اللہ قدرت رحمہ اللہ تھے، جو اپنے دور کے مشہور شاعر اور عالم دین تھے۔ ان کا خاندان ہمیشہ فضل و کمال اور شعر و ادب میں ممتاز رہا۔ ۱۹۷۳ء میں ہندوستان کے منصب نائبِ صدارت پر جسٹس ہدایت اللہ رحمہ اللہ فائز تھے، وہ مولوی قدرت اللہ قدرت کے حقیقی پوتے تھے۔ نواب صاحب سے مولوی قدرت اللہ قدرت کے گہرے مراسم تھے اور مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی رحمہ اللہ کے مدرسے میں نواب صاحب رحمہ اللہ اور مولوی قدرت اللہ صاحب رحمہ اللہ ہم مکتب تھے اور دونوں کے حجرے بھی قریب قریب تھے۔ اب ایک عجیب واقعہ ملاحظہ فرمایئے جو ڈاکٹر رضیہ حامد نے تحریر فرمایا ہے۔ یہ واقعہ مولانا سید عبدالخالق نقوی پروفیسر عربی اسکول آف فارن لنگویجز دہلی نے محترمہ مصنفہ کے والد مکرم سید فتح علی صاحب سے بیان کیا تھا۔

ایک دن مولوی قدرت اللہ صاحب فجر کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں جانے لگے تو دیکھا کہ صدیق حسن خاں سردی میں ٹھٹھر رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے ان پر اپنا دوشالہ اڑھا دیا۔ گرمی حاصل ہوئی تو صدیق حسن خاں کو نیند لگ گئی۔ جب نیند کھلی تو درس شروع ہو چکا تھا۔ وہ درس میں پہنچے تو مولانا فضل الرحمٰن نے فرمایا: ''کہیے نواب صاحب! اب تشریف لا رہے ہیں۔''

یہ بات صدیق حسن خاں کی طبیعت پر گراں گزری اور وہ اپنے حجرے میں آ کر ہچکیوں سے رونے لگے۔ مولوی قدرت اللہ نے جا کر حال معلوم کیا تو انھوں نے مولانا کے الفاظ سنائے اور انھیں طنز قرار دیا۔ لیکن مولوی قدرت اللہ یہ جملہ سن کر محظوظ ہوئے اور بولے: ''ارے روتا کیوں ہے؟ دیکھنا حضرت کا کہنا سچ ثابت ہوگا اور تو ایک دن نواب بنے گا۔'' پھر مولوی صاحب نے ایک پرچہ ان کو لکھ کر دیا کہ جب صدیق خاں نواب ہوں گے تو قدرت اللہ کو ایک سو چودہ روپے کی نوکری دیں گے۔ صدیق حسن خاں نے اس پرچے پر دستخط کر دیے اور بات ختم ہوگئی۔

حصولِ تعلیم کے بعد تلاشِ معاش کے لیے صدیق حسن خاں بھوپال آئے اور مولوی قدرت اللہ میسور چلے گئے۔ جب شاہ جہاں بیگم سے صدیق حسن خاں کی شادی ہوگئی تو قدرت اللہ نے بھوپال کا رخ کیا اور نواب صدیق حسن خاں

---

[1] تراجم علمائے حدیث ہند (ص: ۲۷۴ تا ۲۷۶) مطبوعہ کراچی۔

کے پاس تشریف لائے اور وہ پرچہ انھیں دکھایا۔ نواب صاحب بہت خوش ہوئے اور فوراً ان کو ایک سو چودہ روپے ماہانہ پر مہتمم کوٹھیات کے عہدے پر مقرر فرما دیا۔[1]

وفات پر اظہارِ حزن و ملال:

نواب صاحب رحمہ اللہ کی وفات پر بہت سے اصحابِ قلم نے نظم و نثر میں اظہارِ حزن و ملال کیا۔ ان سب کا تذکرہ تو مشکل ہے، البتہ ایک عالم و شاعر منشی جمیل احمد سہسوانی کا مرثیہ لکھنے کو جی چاہتا ہے، لیکن مرثیہ پڑھنے سے پہلے چند الفاظ میں ان کا تعارف ہو جانا چاہیے، نیز ان کے دو چار اشعار بھی پڑھ لیے جائیں، جن سے ان کے رنگ غزل گوئی کا پتا چلے گا۔

منشی جمیل احمد سہسوانی ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں بھوپال آئے۔ یہیں تعلیم پائی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر بھوپال میں ملازمت اختیار کر لی اور کئی عہدوں پر مامور رہے۔ شعر و سخن کی صلاحیت رکھتے تھے اور غزل و قصیدہ دونوں میں امتیاز حاصل تھا۔ آخر عمر میں اپنے وطن سہسوان چلے گئے تھے۔ وہیں ۱۹۳۵ء میں وفات پائی۔ اب غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

کیا پوچھتے ہو داغ یہ دل میں کہاں کہاں کے ہیں
کچھ آپ کے دیے ہوئے کچھ آسماں کے ہیں

کچھ بلبلوں کو یاد ہیں کچھ قمریوں کو حفظ
عالم میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں

یاروں سے چھپ کے آپ کہاں جائیں گے جمیل
ہم بھی سمجھ گئے ہیں ارادے جہاں کے ہیں

منشی جمیل احمد سہسوانی نے نواب محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا تھا، جس کا انداز مولانا حالی کے اس مرثیے کا سا تھا، جو انھوں نے غالب کی موت پر لکھا تھا۔ حالی جیسی زبان، وہی جذبۂ خلوص اور وہی سادگی و روانی۔ ملاحظہ فرمائیے:

اب کس کو ہم سخن اپنا سنائیں گے
کس کی زباں سے دادِ سخن پائیں گے

ڈھونڈیں گے گو زمانہ میں شاعر سخن شناس
ایسا نہ پائیں گے کوئی ایسا نہ پائیں گے

رکھتے تھے ہم نصیبوں سے امید بہتیری
اس کی خبر نہ تھی ہمیں یہ دن دکھائیں گے

بے قدریوں کا اپنی قلق ان کے غم کا رنج
کیا کیا ہم ان کے ہجر میں صدمے اٹھائیں گے

اوصاف ان کے یاد کریں گے تمام عمر
روئیں گے اور جلیسوں کو ان کے رلائیں گے

غم خواری کرنے والا تو دنیا سے اُٹھ گیا
اب کس کو اپنے غم کی کہانی سنائیں گے

وقعت رہی اپنی نہ آبرو رہی
اے بے مزہ حیات فقط ایک تو رہی[2]

---

① نواب صدیق حسن خاں از ڈاکٹر رضیہ حامد (ص: ۱۷۵، ۱۷۶)

② نواب صدیق حسن خاں، از ڈاکٹر رضیہ حامد (ص: ۱۸۹ تا ۱۹۱)

بابو رام سکسینہ نواب صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نواب صاحب موصوف عربی و فارسی کے بڑے عالم و فاضل اور اپنے زمانے کے مشہور مفسر اور محدث سمجھے جاتے تھے۔ مفتی صدر الدین آزردہ کے شاگرد تھے اور تقریباً ڈیڑھ سو ضخیم کتابوں کے مصنف تھے۔ شعرا اور اہلِ علم کے بڑے قدر دان تھے۔ اردو میں توفیق اور فارسی میں نواب تخلص کرتے تھے۔''[1]

تاریخ ادبِ اردو کے مصنف شہیر بابو رام سکسینہ کو شاید نواب صاحب کی تمام تصانیف کا علم نہیں ہو سکا، ان کی عربی، فارسی اور اردو کی کل تصانیف کی تعداد دو سو تیس کے قریب ہے، جن میں ڈیڑھ سو سے زائد کتابیں بڑی ضخیم اور کئی کئی جلدوں پر محیط ہیں۔ ایک تفسیرِ قرآن پندرہ جلدوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے، لیکن اس کے باوجود نواب صاحب اپنی تصانیف کا ذکر نہایت منکسرانہ انداز میں کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے الفاظ قابلِ مطالعہ ہیں:

''میری تالیفات کا غالب حصہ علمائے راسخین کے تراجم اور آثارِ سلف کے نقول پر مبنی ہے، جو ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ یا نقل کیے گئے ہیں۔ جو کچھ میں نے اپنی تالیفات میں لکھا ہے، وہ درحقیقت علمائے سابقین اور ائمۂ امت کا علم ہے، نہ کہ میرا علم و اجتہاد ہے۔''[2]

اصل مقصد زندگی:

کتاب و سنت کی اشاعت اور بدعات و محدثات کی بیخ کنی نواب محمد صدیق حسن خاں کی زندگی کا اصل مقصد تھا۔ چناں چہ ''إبقاء المنن'' (ص: ٥٤) میں تحریر فرماتے ہیں:

''میرا اگر بس چلتا تو میں یہ نیت رکھتا ہوں کہ کسی کتاب کو جو مخالف کتاب اللہ ہوتی، روے زمین پر باقی رکھتا، نہ کسی بدعت کو جو متصادم سنت ہوتی، باقی چھوڑتا اور نہ کسی فن کو جہاراً اولیلاً ونہاراً عمل میں آنے دیتا اور اگر ایسا وقوع میں آتا تو حدودِ شرع سے اس کا تدارک کرتا۔''

چند واردین بھوپال علمائے کرام:

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ نواب صاحب نے اپنے عہد کے بہت سے اہلِ علم کو بھوپال آنے کی دعوت دی اور وہ وہاں تشریف لائے اور متعدد اصحابِ فضل بھوپال کی علمی فضا کا شہرہ سن کر خود ہی وہاں تشریف لے گئے اور انھوں نے اس ریاست میں بے پناہ خدمات سرانجام دیں۔ ان حضرات کی طویل فہرست میں چند بزرگانِ ذی مکرمت کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

شیخ حسین محسن یمانی (متوفی ۱۳۲۷ھ) مولانا سید ذوالفقار احمد نقوی (۱۳۴۰ھ) شیخ محمد بن حسین انصاری یمانی (متوفی ۱۳۴۴ھ) مولانا محمد بشیر سہسوانی (متوفی ۱۳۲۳ھ) سید حسین شاہ واصف بخاری (متوفی ۱۲۸۵ھ) مولانا

---

[1] تاریخ ادبِ اردو (ص: ۴۱۴) عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور۔

[2] إبقاء المنن (ص: ٧٥)

عبدالباری سہسوانی (متوفی ۱۳۰۳ھ) مولوی صابر حسین صبا سہسوانی (متوفی ۱۳۱۳ھ) مولانا یوسف علی لکھنوی (متوفی ۱۳۰۹ھ) مولانا سلامت اللہ جیراج پوری (متوفی ۳۰ ربیع الاول ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۵/ جون ۱۹۰۴ء)

ان حضرات میں سے صرف مولانا محمد بشیر سہسوانی نے جمادی الاخریٰ ۱۳۲۳ھ کو دہلی میں وفات پائی۔ باقی تمام حضرات بھوپال میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے حضرات واردِ بھوپال ہوئے اور پھر وہیں سکونت پذیر ہوگئے۔

بھوپال کی موجودہ حالت:

ڈاکٹر رضیہ حامد کی کتاب ''نواب صدیق حسن خاں'' سے پتا چلتا ہے کہ اب بھوپال کو اہلِ علم کے خوب صورت مرکز کی حیثیت حاصل ہے اور وہاں متعدد لائبریریاں قائم ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی دینی تعلیم کے لیے مدرسے جاری ہیں اور مسجدیں نمازیوں اور مصلحین و متعلمین سے بارونق ہیں۔

آخری گزارش:

نواب صاحب برصغیر کے بہت بڑے مفسر، بہت بڑے محدث، بہت بڑے مصنف، بہت بڑے محقق، بہت بڑے مورخ، بہت بڑے ہم دردِ خلائق اور بہت بڑے مبلغ اسلام تھے۔ ان کے متعلق بہت کچھ لکھنا چاہیے اور بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ اس مضمون میں ان کی خدماتِ گوناگوں کے بعض گوشوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس کی روشنی میں سلسلۂ تحریر کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے اور ان شاء اللہ کوئی اہلِ علم آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے۔ میں اپنی گزارشات محترمہ ڈاکٹر رضیہ حامد کے ان الفاظ پر ختم کرتا ہوں۔

''نواب صدیق حسن خاں کے علمی کارناموں کی داستان اس یقین کے ساتھ ختم کی جاتی ہے کہ ان کے کارناموں کی صدائے بازگشت اس وقت تک سنی جاتی رہے گی، جب تک دنیا کے کسی گوشے میں بھی حدیث پاک اور سنتِ نبویہ کا پیغام باقی ہے۔''

نواب صاحب رحمہ اللہ اپنے وقت کے مانے ہوئے انشا پرداز، محدث اور زبردست صاحبِ قلم اور صاحبِ نظر تھے۔ ان کی حیات ایک فراخ حوصلہ عالم، جوہر شناس بزرگ، بیدار مغز انسان اور باکمال صاحبِ قلم کی حیات ہے۔ ان کی شخصیت ایک دانش مند مفکر اور محقق عالم کے ساتھ ساتھ ایک حقیقت شناس اور منتظم حاکم کی شخصیت ہے۔ نواب صاحب کی ذاتِ باصفات میں اصابتِ فکر، دور اندیشی، دور بینی اور معاملہ فہمی نیز دین میں پختگی بہ درجۂ اتم موجود تھی۔ علومِ دین کے فروغ میں ان کے کارہائے نمایاں علمائے سلف کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے طرزِ فکر کو ہندوستان سے متجاوز کر کے دنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچایا اور عرب فضلا سے بھرپور دادِ تحسین حاصل کی۔ [1]

[1] دبستانِ حدیث، از مولانا محمد اسحاق بھٹی (ص: ۲۵۹ تا ۲۸۵)

دو اتہامات اور ان کی حقیقت

حافظ شاہد رفیق

نواب سید محمد صدیق حسن خاں رحمہ اللہ کو اپنے وقت میں علم وفضل اور دنیوی ریاست و امارت میں بہت بلند مقام حاصل تھا۔ ایسی بلند مرتبت شخصیت کے محبین اور مخلصین کے ساتھ ساتھ ان کے حاسدین اور مخالفین کا پیدا ہونا بھی ایک ناگزیر امر ہے، چنانچہ ان مخالفین نے نواب صاحب کی شخصیت کو داغ دار کرنے کی خاطر کئی جھوٹ تراشے اور بہت سی تہمتوں کا سہارا لیا، لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہر قسم کے شرور وفتن سے ان کی حفاظت فرمائی اور لوگوں کے قلوب واذہان میں ان کے لیے محبوبیت ودیعت کی۔

نواب صاحب رحمہ اللہ کو اپنے دور میں جن اتہامات اور الزامات سے دوچار ہونا پڑا، ان میں سے دو اعتراضات ایسے ہیں، جنھیں آج بھی بعض لوگ اچھالتے اور اپنے اپنے حلقے میں ان کی ترویج و اشاعت کرتے ہیں، حالاں کہ دیگر الزامات کی طرح ان اتہامات کی حقیقت کو بھی علمائے کرام سالہا سال سے طشت ازبام کرتے آئے ہیں۔

ان میں سے ایک اعتراض یہ ہے کہ نواب صاحب رحمہ اللہ اہلِ حدیث نہیں اور ایک عام سے عالمِ دین تھے، جن کا علم وفضل میں کوئی خاص مقام نہیں۔

حیرت ہے کہ نواب صاحب رحمہ اللہ کے دور میں بعض حاسدین نے ان پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ وہ وہابی ہیں، جبکہ آج ان کے مخالفین انھیں یہ الزام دیتے ہیں کہ وہ اہل حدیث نہیں تھے!!

نواب صاحب رحمہ اللہ کی وہابیت اور اہلِ حدیث ہونے کے متعلق اگر ان کے معاصر اور بعد والے اہلِ حدیث علما کے اقوال نقل کیے جائیں کہ وہ کس طرح انھیں مجددِ دوراں، مجتہد العصر اور امام وغیرہ کے بلند مرتبت القاب سے یاد کرتے ہیں تو اس کے لیے کئی صفحات درکار ہوں گے، تاہم ذیل میں ہم اس سلسلے میں اپنے وقت کے بہت بڑے عالم، وکیلِ سلفیت شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کی رائے گرامی کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

”وهذا إمامنا وشيخنا الأستاذ الإمام الملك السيد نواب صديق حسن خان البهوفالي ما أرفق وبله! تصانيفه الغالية الثمينة انتشرت شرقا وغربا واستفاد منه العامة والعلماء“[1]

”یہ ہمارے امام، شیخ، استاذ، امام، ملک، سید نواب صدیق حسن خان ہیں، جو بحرِ بے کنار تھے۔ ان کی

[1] نگارشات مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ (ص: ۱۰۸۔۱۰۹)

بیش قیمت بلند پایہ تصانیف مشرق و مغرب میں پھیل گئیں اور عوام و علما نے اس سے استفادہ کیا۔"

نواب صاحب رحمہ اللہ کے متعلق اہل حدیث علما و شیوخ کی آرا و اقوال سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اگر نواب صاحب رحمہ اللہ کی مولفات ہی کو اس مقصد کے لیے دیکھ لیا جائے تو ہمیں بعض الناس کے عائد کردہ اس اتہام کی حقیقت بہ خوبی معلوم ہو جاتی ہیں۔[1]

اسی طرح نواب صاحب رحمہ اللہ پر ایک دوسرا اعتراض یہ کیا گیا کہ وہ دوسرے علما کی کتابوں ہی کو اپنے نام سے شائع کرتے ہیں اور انھیں میں تقدیم و تاخیر کرنے کے بعد ان پر اپنا نام لکھ لیتے ہیں۔

یہ اتہام دراصل ایک عیسائی مشترق کانیلس ایڈورڈ کی اختراع ہے، جسے سن کر نواب صاحب رحمہ اللہ کے حاسدین نے اسے خوب ترقی دی اور کئی ایک حقیقت سے ناواقف یا عداوت و نفرت کے مارے ہوئے اس الزام کو آج بھی دہراتے رہتے ہیں، حالاں کہ اس بارے میں بھی اگر معاصر علما اور دیگر اصحابِ علم و فضل کی آرا اور نواب صاحب رحمہ اللہ کی مولفات کو دیکھا جائے تو اس اتہام کی قلعی خود بہ خود کھل جاتی ہے۔

علامہ عبدالحی الکتانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وبالجملة فهو من كبار من لهم اليد الطولىٰ في إحياء كثير من كتب الحديث وعلومه بالهند وغيره -جزاه الله خيراً- وقد عد صاحب عون المعبود على سنن أبي داود، المترجم له أحد المجددين علىٰ رأس المائة الرابعة عشر، وما لبعض المسيحيين في كتاب له اسمه "اكتفاء القنوع بما هو مطبوع" من أن المترجم كان عامياً، وتزوج بملكة بوهبال، فعند ما اغتنىٰ بالمال، جمع إليه العلماء، وأرسل يبتاع الكتب بخط اليد، وكلف العلماء بوضع المؤلفات، ثم نسبها لنفسه، بل كان يختار الكتب القديمة العديمة الوجود، وينسبها لنفسه... فكلام أعدائه فيه وإلا فالتآليف تآليفه، ونفسه فيها متحد"[2]

"نواب صدیق حسن خان ان کبار علما میں سے ہیں، جن کا ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان میں علومِ حدیث اور ان کی کتابوں کے احیا و اشاعت میں بہت بڑا حصہ ہے۔ جزاه الله خيراً۔ صاحبِ عون المعبود علامہ شمس الحق ڈیانوی نے، جنھوں نے ان کے عربی میں مختصر حالات تحریر کیے ہیں، نواب صاحب کو اوائل چودھویں صدی ہجری کے مجددین میں شمار کیا ہے۔ بعض عیسائی مستشرقین نے ایک کتاب لکھی ہے،

---

[1] اس سلسلے میں ہندوستان کے معروف عالمِ دین فضیلۃ الشیخ مولانا محمد اعظمی حفظہ اللہ نے ایک مستقل کتاب "نواب صدیق حسن خاں اور ان کی وہابیت" کے عنوان سے لکھی ہے، جس کا مطالعہ یقیناً اس باب میں مفید ہوگا۔

[2] فهرس الفهارس والأثبات (٢/ ١٠٥٧)

جس کا نام ''اکتفاء القنوع بما هو مطبوع'' ہے۔ اس میں نواب صاحب کا ذکر بڑے گھٹیا انداز میں کیا گیا ہے اور ان کی بابت یہ افترا پردازی کی گئی ہے کہ والیہ بھوپال کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد انھوں نے علما کو پیسے دے کر کتابیں لکھوائیں اور اپنے نام سے چھپوالیں، بلکہ کئی عدیم الوجود کتابیں حاصل کر کے انھیں اپنی طرف منسوب کر لیا، لیکن یہ سب باتیں ان کے دشمنوں کی بنائی ہوئی ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تمام تالیفات ان کی اپنی ہی تالیف کردہ ہیں، جس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ان کی تمام کتابوں کا اسلوب یکساں ہے۔''[1]

مذکورہ بالا دونوں اتہامات کی حقیقت عیاں کرنے کے لیے ذیل میں ہم دو اقتباسات درج کر رہے ہیں، جو انھیں الزامات کے جواب میں تحریر کیے گئے ہیں۔

پہلی تحریر شیخ الحدیث علامہ نذیر احمد املوی رحمانی رحمہ اللہ کی ہے، جس میں انھوں نے نواب صاحب رحمہ اللہ کا مسلک تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس پر بعض حضرات کے عائد کردہ شبہات کی حقیقت بیان کی ہے۔

دوسری تحریر نواب صاحب رحمہ اللہ کے تلمیذ خاص مولانا ذوالفقار احمد بھوپالی (المتوفی ۱۹۲۱ء) کی رقم کردہ ہے، جس میں انھوں نے عیسائی مستشرق ایڈورڈ فنڈیک کے اختراع کردہ اتہام کی حقیقت بیان فرمائی ہے اور اپنے مشاہدات پر مبنی شہادتوں کے ذریعے اس الزام کا تار و پود بکھیر دیا ہے۔

① نواب صاحب کا مسلک:

آج اہلِ حدیث ہی نہیں، احناف میں بھی حضرت نواب صاحب قدس سرہ کا مسلکاً اہلِ حدیث ہونا اتنا مشہور و معروف ہے کہ شاید بہتوں کو اس پر تعجب ہوگا کہ اس عنوان پر گفتگو کرنے کی ہم نے ضرورت کیوں محسوس کی؟

قصہ یہ ہے کہ نواب صاحب کے صاحبزادے نواب علی حسن خاں مرحوم نے ''مآثر صدیقی'' (موسوم بہ ''سیرت والا جاہی'') میں نواب صاحب کے مسلک کی بابت بعض ایسی باتیں لکھ دی ہیں، جو اب تک تو قابلِ التفات نہیں سمجھی گئی تھیں، لیکن آج کل بعض لوگوں نے ان کو اُچھالا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ دلائل اور واقعات کی روشنی میں اس مسئلے کی حقیقت بھی واضح کر دی جائے۔

سیرت والا جاہی کا بیان:

نواب صاحب کے مسلک کے متعلق مصنف ''سیرت والا جاہی'' کا ایک بیان تو یہ ہے، لکھتے ہیں:

''سنی خالص، محمدی قح، موحد بحت، متبع کتاب وسنت، حنفی مذہب، نقشبندی مشرب تھے اور ہمیشہ طریقۂ اسلاف

---

[1] إبقاء المنن بإلقاء المحن (إضافات و ملحقات، ص: ۲۱۰)

پر مذہب حنفی کی طرف اپنے کو منسوب کرتے تھے، مگر عملاً و اعتقاداً اتباع سنت کو مقدم رکھتے تھے، چنانچہ خود لکھتے ہیں: باقتفائے نیا کاں بزرگ و دانشمندان سترگ در ظاہر انتساب بروش امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ معروف است، لیکن ہموارہ گفتار و کردار را باتباع سنت آرائش دارد۔'' [1]

ان کا دوسرا بیان یہ ہے، لکھتے ہیں:

''والا جاہ مرحوم نمازِ پنج گانہ حنفی طریقہ پر پڑھتے تھے، البتہ ان کو فاتحہ خلف الامام اور اول وقت کا خاص اہتمام مدنظر رہتا تھا۔'' [2]

نواب صاحب کی تالیفات ان کے مضامین اور تحریروں کا جہاں تک ہم نے مطالعہ کیا ہے، ان کی بنیاد پر اور اس زمانے میں جبکہ نواب صاحب کے رفقا اور مشاہدین ایک ایک کر کے سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، ان چیزوں کے سوا کوئی دوسری چیز اس بحث کی بنیاد بن بھی نہیں سکتی، ہم پورے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ ''سیرت والا جاہی'' کے یہ دونوں بیان غلط اور ناقابل اعتبار ہیں، حتی کہ فارسی کی وہ عبارت بھی ان کے مدعا کی مثبت نہیں ہے، جس کو انھوں نے اس موقع پر اپنی تائید میں پیش کیا ہے۔ ہم ان دونوں بیانوں پر علی الترتیب الگ الگ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

''سیرت والا جاہی'' کے دعویٰ اور دلیل میں مطابقت نہیں:

مصنف ''سیرت والا جاہی'' نے دعویٰ یہ کیا ہے کہ نواب صاحب ہمیشہ مذہب حنفی کی طرف اپنے کو منسوب کرتے تھے۔ ''منسوب کرنے'' کے صاف معنی یہ ہیں کہ نواب صاحب اپنے متعلق خود کہا کرتے تھے یا لکھا کرتے تھے کہ میں حنفی ہوں اور ایسا وہ ''ہمیشہ'' کرتے تھے۔ بالفاظ دیگر، سیرت والا جاہی نے حنفی مذہب کی طرف انتساب کو خود نواب صاحب کا فعل بتایا ہے، لیکن اس کے ثبوت اور تائید میں فارسی کی جو عبارت انھوں نے نقل کی ہے، وہ ہرگز اس دعوے کے مطابق نہیں ہے۔ اس میں نواب صاحب نے مذہب حنفی کی طرف انتساب کو اپنا فعل نہیں قرار دیا ہے اور نہ یہ تسلیم کیا ہے کہ میں حنفی ہوں۔ ہاں یہ البتہ کہا ہے کہ مذہب امام ابو حنیفہ کی طرف انتساب ''معروف'' ہے، یعنی انتساب کی نسبت اِنھوں نے عرف کی طرف کی ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگوں کا عمل ہے، خود ان کا اپنا عمل یہ نہیں ہے۔ اس لیے اس عبارت سے یہ دعویٰ تو ثابت نہیں ہوتا کہ نواب صاحب اپنے کو مذہب حنفی کی طرف منسوب کرتے تھے اور جب یہ ثابت نہ ہوا تو یہ بھی ثابت نہ ہوگا کہ وہ ''حنفی مذہب'' تھے۔

رہا عرف کا معاملہ تو اس کے اعتبار سے یہ عبارت دو معنوں کا احتمال رکھتی ہے، ایک یہ کہ لوگ آپ کو حنفی مذہب کی طرف منسوب کرتے ہیں اور ہر چند یہ انتساب لوگوں میں معروف و مشہور ہے، لیکن میں نے اس شہرت کی

---

[1] سیرت والا جاہی (۱/۴)

[2] کتاب مذکور (ص: ۶۳)

پیروی نہیں کی۔ میں نے اتباعِ سنت کو اختیار کیا ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ نواب صاحب نے اپنے ہی متعلق یہ بات کہی ہو کہ بہ ظاہر ان کا انتساب حنفی مذہب کی طرف معروف ہے، مگر پھر ساتھ ہی انھوں نے حرف استدراک ''لیکن'' سے اس توہم کو بھی دفع کیا ہے کہ اس ظاہری انتساب کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ میں امام ابوحنیفہ کا مقلد اور ان کے اقوال کا پابند ہوں۔ میں نے اپنے قول وعمل کو تقلید کے عیب سے بچا کر اتباعِ سنت کی زینت سے آراستہ کیا ہے۔

عبارت کا پورا متن اور اس کا صحیح مطلب:

اس عبارت کا ایک بڑا اہم لفظ مصنف ''سیرت والا جاہی'' نے نقل نہیں کیا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پوری عبارت قارئین کے سامنے رکھی جائے، تاکہ نواب صاحب کا صحیح منشا ان کی سمجھ میں آجائے۔ نواب صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''امروز کہ چہل وہشت مرحلہ از عمر گرامی طے شدہ با آنکہ استخواں درتن ناتواں کہنہ شد، وموئے سر بسفیدی چوں شعلۂ تاباں گردید، آثار گرمی درونی وسوز باطن ہمچناں افزائش دارد و بسا نکات دل افروز برفراز ظہور می آرد، درآئین مالک رحمہ اللہ وشافعی رحمہ اللہ وابوحنیفہ رحمہ اللہ وابن حنبل رحمہ اللہ گونا گوں دریافت اصولاً وفروعاً بہم آمد۔ وبقلدوزی بخت بیدار، وتکاپوی طالع سازگار، برپایۂ اجتہاد مجتہداں وقوف حاصل شد، ہرچند باقتضائے نیاکان بزرگ ودانشمندان سترگ در ظاہر انتساب بروش ابوحنیفہ رحمہ اللہ معروف است، لکن ہموارہ گفتار وکردار را باتباع سنت آرائش دارد۔''[1]

''آج جب کہ میں اپنی عمر عزیز کی ۴۸ منزلیں طے کر چکا ہوں، بدن کی ہڈیاں بھی پرانی ہوگئی ہیں۔ سر کے بالوں میں سفیدی چمک رہی ہے۔ سوز باطن بھی ترقی پر ہے۔ امام مالک وامام شافعی وامام ابوحنیفہ و امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ ہر ایک کی فقہ وآئین کو اصولاً وفروعاً ہر طرح سے جان چکا ہوں اور خوش قسمتی سے مجتہدوں کے پایۂ اجتہاد سے بھی واقفیت حاصل کر چکا ہوں۔ ایسی حالت میں بزرگوں کی اتباع اور دانشمندوں کی پیروی میں ظاہری طور پر امام ابوحنیفہ کے طریقے کی طرف انتساب (چاہے) جتنا بھی مشہور ہو، لیکن (اس انتساب کے معنی یہ نہیں کہ میں ان کا مقلد ہوں) میں اپنے گفتار وکردار کو تقلید کے عیب سے بچا کر اتباعِ سنت کی زینت سے آراستہ کرتا ہوں۔''

پوری عبارت کے معنی اور مفہوم پر غور کیجیے! نواب صاحب نے سب سے پہلے اپنی عمر کی مدت بیان کی ہے، جس سے ان کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی عمر کی اس منزل میں پہنچ گئے ہیں، جو طبعی طور پر انسان کے فہم و دانش

[1] المغنم البارد (ص: ۱۳)

کے کمال کی منزل مانی جاتی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس انعام کا ذکر کیا ہے، جو علمِ دین کے متعلق ان کو عطا کیا گیا تھا۔ انھوں نے بتایا ہے کہ چاروں اماموں کے فقہی مسائل اور ان کے استخراج و استنباط کے اصول و قواعد، آئین اور ضابطے؛ سب پر ان کو عبور حاصل ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ کون مجتہد کس درجے کا فقیہ ہے؟ کس کا اجتہاد کتاب وسنت کے موافق ہے اور کس کا اس کے خلاف؟

اپنے علم وفہم کے اس رسوخ اور کمال کا اظہار کر لینے کے بعد تب انھوں نے لکھا ہے: ''ہر چند باقتفائے نیاکان بزرگ و دانشمندان سترگ در ظاہر انتساب...'' یعنی جب اللہ تعالیٰ نے عقل وفہم کے کمال کی منزل تک پہنچا دیا ہے اور فقہ و اصولِ فقہ کا علم بھی وافر عطا فرمایا ہے۔ ایسا علم جو چاروں اماموں کے اصول وفروع پر گوناگوں طریقے سے حاوی ہے۔ مجتہدوں کے پایۂ اجتہاد اور ان کے اقوال و آرا کے خطا وصواب کی معرفت کا ملکہ بھی حاصل ہو تو ایسی صورت میں کسی کا مقلد بن کر، ہر مسئلے میں اس کی رائے کو بلا دلیل مان لینا اور خود کو اس کا پابند بنا کر رکھنا، یہ میرا کام نہیں ہے۔ اس لیے ''ہر چند'' اپنے بزرگوں کی پیروی میں لوگوں کا انتساب ظاہر میں (رسمی طور پر) حنفی مذہب کی طرف معروف ہے، لیکن میرے نزدیک اس شہرت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میں نے اتباعِ سنت کی راہ اختیار کی ہے۔ یا نواب صاحب کا مقصد یہ ہے کہ ''ہر چند'' ظاہر میں میرا انتساب حنفی مذہب کی طرف معروف ہے، لیکن اس ظاہری انتساب کا مطلب مقلد ہونا نہیں ہے، کیوں کہ یہ تو مجھ جیسے شخص کے لیے ایک عیب کی بات ہے۔ میں نے اپنے قول وعمل اور گفتار و کردار کو تحقیق وبصیرت کی روشنی میں سنت کی پیروی سے آراستہ کیا ہے۔

اہلِ علم سمجھ سکتے ہیں کہ نواب صاحب کی محولہ بالا عبارت میں لفظ ''ہرچند'' کو اپنے سیاق وسباق کے ساتھ کتنا گہرا تعلق ہے، اس کے بعد وہ خود فیصلہ کریں کہ کیا ہماری یہ شکایت بے جا ہے کہ مصنف ''سیرت والا جاہی'' نے اس عبارت کا ایک بڑا اہم لفظ نقل نہیں کیا ہے؟

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس عبارت سے نواب صاحب کا ''حنفی'' (بہ معنی مقلد امام ابوحنیفہ) ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوتا، بلکہ اس کے برخلاف اسی عبارت سے ان کا محقق (غیر مقلد) متبع سنت ہونا واضح طور پر ثابت ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اگر ''انتساب معروف'' سے اتباعِ سنت کا حق ادا ہو جاتا تھا تو پھر اس استدراک کے ذریعے کس تو ہم کو دفع کیا گیا ہے کہ ''لیکن ہموارۂ گفتار و کردار را باتباع سنت آرائش دارد''؟ نیز اگر وہ مقلد ہی تھے تو اس اہتمام کے ساتھ اپنے علمی کمال اور جامعیت کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟!

نواب صاحب کی بعض دوسری عبارتوں سے اس کی تائید:

''انتساب معروف'' کا تعلق نواب صاحب ہی کی ذات سے مان کر عبارت زیر بحث کا جو مطلب ہم نے بیان

کیا ہے، اس کی تائید نواب صاحب کی دوسری کتابوں سے بھی ہوتی ہے۔ منجملہ ان کے ایک کتاب "إبقاء المنن بإلقاء المحن" ہے، جو نواب صاحب کی وفات سے ڈھائی تین سال پہلے کی تالیف ہے۔[1] اسی کتاب کے حوالے سے چند عبارتیں ہم یہاں نقل کرتے ہیں، نواب صاحب لکھتے ہیں:

- ''میں نے ابتدا طلبِ علم میں کتبِ فقہ حنفی کو بھی موافق رواج اس ملک کے پڑھا تھا۔ پھر شعور بڑھا تو مذاہبِ ائمہ ثلاثہ پر بھی عبور کیا اور فروع میں ادلۂ مذاہبِ اربعہ پر اطلاع حاصل ہوئی اور اچھی طرح ہوئی۔ ہر مذہب کی دلیل کو میزانِ تحقیق میں بہ قاعدہ علماے جامعین وزن کیا، جس مسئلے کو دلیلاً راجح پایا، اسی کا میں قائل ہوا۔

''بعد عبور کے مذاہب اربعہ پر میں نے اتباع دلیل کا اختیار کیا ہے، جو مذہب موافق دلیل قوی وصحیح کے ہوتا ہے، وہی میرا مختار ہے، خواہ مذہب حنفی ہو یا شافعی یا مالکی یا حنبلی، میں کسی مذہب کا ترک و رد براہِ تعصب کے نہیں کرتا ہوں نہ کسی مذہب کا اخذ براہِ ہوائے نفس کے۔ مثلاً مسئلۂ آب میں مذہب مالک اقوی المذاہب ہے اور مسئلہ صیغ تشہد میں مذہب امام ابو حنیفہ أصح الاقوال ہے اور مسئلہ صفات میں مذہب امام احمد رحمہ اللہ اقوی المذاہب ہے۔ وعلی ہذا القیاس میری کل تالیف میں اسی قاعدہ کی رعایت وحمایت ہے۔

''اس اعتبار سے اگر میں آپ کو حنفی کہوں یا شافعی کہوں یا مالکی یا حنبلی کہوں تو کچھ کذب لازم نہیں آتا ہے اور اگر سنی محض کہوں تو بالکل سچ ہے، اور اگر اس اعتبار سے کہ میں محبّ اور خادم ہوں ہر امام مجتہد کا، ان ائمہ اربعہ وغیرہم سے آپ کو طرف کسی امام کے مضاف کروں تو بھی یہ اضافت درست ہے۔[1] چناں چہ اکثر اضافات ائمۂ علم کی طرف سلفِ امت کے اسی قبیل سے تھے۔'' (ص: ۱۳)

- ''مشکل تو یہ ہے کہ میں تو دلیل کو مذہب کہتا ہوں نہ کہ تقلید کو، اور لوگ اعتراض مجھ پر ازروئے تقلید کرتے ہیں۔'' (ص: ۲۶)

- ''ائمۂ سلف پر طعن مخالفتِ سنت کی کرنا انصاف کا خون بہانا ہے، ہاں جو مقلد ان کے بعد وضوحِ دلیلِ کتاب وسنت کے تقلیدِ رائے بحت پر جامد ہیں، ان کو خاطی سمجھتا ہوں۔'' (ص: ۲۷)

---

[1] نواب صاحب کی وفات ۱۳۰۷ھ میں ہوئی اور "إبقاء المنن" انھوں نے ذو الحجہ ۱۳۰۴ھ میں لکھی، جیسا کہ کتاب کے آخر میں مذکور ہے۔

[1] دیکھیے مقلد ہونے کی حیثیت سے تو نواب صاحب کسی امام کی طرف اپنے کو منسوب کرنا درست نہیں سمجھتے، البتہ دوسرے اعتبارات سے اس کو صحیح سمجھتے ہیں، لیکن اس میں بھی حنفی مذہب کی خصوصیت نہیں ہے، چاروں اماموں اور چاروں مذہبوں کو وہ ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔

❁ ”مجھے یہ بات معلوم ہے کہ اللہ و رسول کے سوا کسی کا اتباع کسی شخص پر امتِ اسلام میں سے واجب نہیں ہے اور اسی وجہ سے سارے سلف تقلیدِ رجال سے منع کرتے آئے ہیں۔“ (ص: ۱۱۸)

❁ ”رجماً بالغیب مجھ پر یہ طوفان باندھا گیا کہ میں خدانخواستہ حق میں ائمہ اربعہ کے عموماً اور حق میں امام اعظم رضی اللہ عنہ کے خصوصاً بے ادب نا مہذب ہوں[1] حالانکہ یہ نرا افترا ہے، اس کی تکذیب کے لیے میرا رسالہ ”جلب المنفعة“ نام بس کرتا ہے۔ اگر میں ایسا ہوتا تو اپنی کتبِ فقہ میں ہرگز کسی مسئلہ حنفی کی ترجیح نہ کرتا ... بے شبہ میں کسی کی رائے مجرد و اجتہاد کا مقلد نہیں ہوں، جب تک کہ اس کو موافق دلیل و سنت کے نہ کرلوں۔ خواہ وہ علمِ ظاہر سے علاقہ رکھتا ہو یا علمِ باطن سے ....“ (ص: ۱۱۹)

❁ ”پھر مجھ سا شخص جو بعد حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عالم اور امامِ امت کی تقلید کا وجوباً قائل نہیں ہے، وہ صاحبِ کتاب التوحید (شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ) کی تقلید کیوں کرنے لگا۔“ (ص: ۱۲۰)

❁ ”ایک محنت مجھ پر یہ آئی کہ اہلِ تقلید نے مجھ پر تہمت تقلید امام محمد بن علی شوکانی رحمہ اللہ کی لگائی۔[2] گویا میں اپنے دین میں ان کا مقلد ہوں۔ یہ تہمت نہایت طرفگی سے قابلِ تماشا ہے، اس لیے کہ جس طرح ائمہ اربعہ رحمہم اللہ مجتہدین وغیرہ سلف صالحین نے تقلیدِ مذاہب سے منع کیا ہے، اسی طرح یا اس سے زیادہ ردِ تقلید میں شوکانی رحمہ اللہ نے میدانِ مباحثہ میں جولانی فرمائی ہے ... پھر میرا کسی اور کا اس نہی کے باوجود ان کا مقلد بننا کیا معنی رکھتا ہے؟ میں نے اپنی تالیف میں کئی جگہ ان کا خلاف کیا ہے، اس لیے کہ ان کی تقریر پر دلیل واضح کی موافقت ظاہر نہیں ہوئی۔“ (ص: ۱۱۸)

❁ ”بعض لوگوں کو یہ گمان ہے کہ میں اولیاء اللہ تعالیٰ کا معتقد نہیں ہوں[3] حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے، کیونکہ ولایتِ خدا کا وجود کتاب وسنت دونوں سے ثابت ہے اور کرامات کے وقوع پر بھی قرآن وحدیث دلیل ہیں۔ پھر ان کا انکار یعنی چہ؟ ... ہاں اتنی بات ہے کہ میں اس علم میں بھی بہ کتاب وسنت ہوں، اس حال و قال کا قائل نہیں ہوں، جو نصِ کتاب و دلیلِ سنت کے برخلاف ہے اور نہ ان رسومِ مشائخ کو جائز جانتا ہوں، جو کسی برہان پر مبنی نہیں ہیں، کیونکہ جس طرح تقلید فروعِ احکام میں بے اصل ہے، اسی

---

[1] سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر سیرت والا جاہی کا یہ بیان صحیح ہے کہ نواب صاحب حنفی مذہب تھے اور ہمیشہ مذہب حنفی کی طرف اپنے کو منسوب کرتے تھے تو پھر ان پر یہ طوفان کیسے باندھا گیا کہ وہ امام ابوحنیفہ کے حق میں بے ادب نا مہذب ہیں؟!

[2]، [3] اگر واقعی نواب صاحب حنفی المذہب تھے اور ہمیشہ حنفی مذہب کی طرف اپنے کو منسوب کرتے تھے تو پھر ان دونوں الزاموں کی گنجایش کہاں سے نکل آئی کہ وہ شوکانی کے مقلد ہیں؟ یا یہ کہ وہ اولیاء اللہ کے معتقد نہیں ہیں؟ اس قسم کے الزام تو اہلِ حدیث کو لگائے جاتے ہیں نہ کہ کسی حنفی المذہب مقلد کو!!

طرح تقلید مکشوفات و رسوم میں بے سند ہے۔ صوفیۂ صافیہ میں کوئی شخص مقلد کسی مذہب خواص کا نہیں تھا، اسی جگہ سے کہا ہے: ''الصوفي لا مذهب له'' احیاء العلوم، فتوحات مکیہ وغیرہما کو دیکھو کہ کس قدر تحذیر اختیار تقلید سے اور کس قدر تحریض ایثار اتباع پر کی ہے۔'' (ص: ۱۲۵)

یہ اقتباسات پوری وضاحت کے ساتھ اس بیان کی تردید کر رہے ہیں کہ نواب صاحب حنفی مذہب تھے اور ہمیشہ مذہب حنفی کی طرف اپنے کو منسوب کرتے تھے۔ لہٰذا ''المغنم البارد'' کی عبارت سے مصنف ''سیرت والا جاہی'' نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ بھی غلط ہے اور اس عبارت کا صحیح مطلب وہی ہے جو ہم نے بتایا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اقتباس اور پڑھیے، جس میں نواب صاحب نے اہلِ حدیث مسلک کی صحیح صحیح ترجمانی کی ہے اور تقلید کی پُر زور مذمت کی ہے۔ لکھتے ہیں:

❁ ''تقلید اس کو کہتے ہیں کہ ایک آدمی دوسرے شخص کی بات کو کسی شے کی حلت یا حرمت میں بلا دلیل و نصِ شارع کے قبول کر لے، سو یہ بات ظاہر ہے کہ سب مسلمان حضرت کی امت ہیں اور حلت و حرمت کسی شے کی بغیر حضرت کے بتائے معلوم نہیں ہو سکتی تو اس باب میں اتباع حضرت کا چاہیے، نہ کہ اور کسی شخص کا، ورنہ اس شخص کو پیغمبر ماننا پڑے گا اور اگر کسی مجتہد نے کسی شے پر بہ سبب نہ ملنے اور معلوم نہ ہونے کسی دلیل کے ایسا حکم اپنے اجتہاد اور رائے و قیاس سے لگا دیا ہے اور بعد اس کے کوئی اور دلیل کسی دوسرے شخص پر قرآن یا حدیث سے واضح ہوگئی تو وہ مجتہد معذور ہے، بلکہ اس کو ایک اجر جہد و سعی کا ملے گا، مگر یہ شخص جس کو آیتِ قرآن یا سنتِ صحیح پہنچ گئی، ہرگز معذور نہ ہوگا، بلکہ اگر وہ دیدہ و دانستہ خلاف نص کے کرے گا تو مخالفِ خدا یا رسول ٹھہرے گا، اس بات کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے، کچھ مشکل بات نہیں ہے اور ہم نے ساری کتبِ فقہ مذاہبِ اربعہ دیکھیں، کسی امام مجتہد سے یہ بات ماثور نہیں پائی کہ ہمارے اجتہاد کے آگے تم قرآن و حدیث کو چھوڑ دینا، بلکہ چاروں اماموں نے اپنی تقلید اور غیر کی تقلید سے منع کیا ہے، ان کے اقوال خود کتابوں میں ان کے مقلدین کی منقول ہیں۔

''اس صورت میں مقلد صحیح صادق ان کا وہی مسلمان ہے، جو اس قول حق میں ان کی پیروی کرتا ہے، نہ وہ مسلمان جو خلاف ان کی نہی کے عمل کرتا ہے، کیونکہ وہ تو ان کا مخالف ہوا نہ مقلد۔''

یہ نواب صاحب کی صرف ایک کتاب کے اقتباسات ہیں، اگر ان کی دوسری کتابوں سے اسی قسم کی عبارتیں ہم نقل کریں تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ''سیرت والا جاہی'' کے بیان کی تردید کے لیے اتنے حوالے ہی کافی ہیں۔

''سیرت والا جاہی'' کے دوسرے بیان پر تنقید:

اسی طرح نواب صاحب مرحوم کی کتابوں کی روشنی میں ہم اس بیان کو بھی نا قابلِ اعتبار سمجھتے ہیں کہ والا جاہ مرحوم نمازِ پنج گانہ حنفی طریقہ پر پڑھتے تھے۔ ''سیرت والا جاہی'' کے حصہ چہارم کے آخر میں خود اسی کے مصنف نے نواب صاحب کی مولفہ کتابوں کی ایک طویل اور مفصل فہرست پیش کی ہے۔ یہ فہرست انھوں نے کتابوں کے ناموں کے پہلے حرف کو ملحوظ رکھ کر حروفِ تہجی کی ترتیب پر مرتب کی ہے اور اللہ کی شان ہے کہ "حرف الألف" سے لے کر "حرف الياء المثناة" تک ہر حرف کے ذیل میں نواب صاحب کی تالیفات موجود ہیں۔ چنانچہ ''حرف التاء'' کے ماتحت ''تعليم الصلاة'' کو بھی انھوں نے نواب صاحب کی تالیفات میں شمار کیا ہے، جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے۔ تقریباً بیس صفحوں کا یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، جس میں طہارت اور نماز کے کچھ مسائل بالاختصار مذکور ہیں۔[1]

مصنف ''سیرت والا جاہی'' کے مذکورہ بالا بیان کو پیشِ نظر رکھ کر جب ہم نے اس رسالے کا مطالعہ کیا تو ہمیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ اس باب میں احناف اور اہلِ حدیث کے مابین جن جن مسائل میں اختلاف مشہور ہے، ان سب میں نواب صاحب نے اہلِ حدیث ہی کے مسلک کو اختیار کیا ہے، کسی ایک مسئلے میں بھی انھوں نے حنفی مذہب کی موافقت نہیں کی ہے۔

مثلاً ''نماز کی ترکیب'' کا عنوان قائم کر کے وہ لکھتے ہیں:

''نماز بے نیت کے نہیں ہوتی ہے۔ نماز کے سب رکن فرض ہیں، مگر بیچ کا تشہد و جلسۂ استراحت اور نماز کے ذکروں میں کوئی ذکر واجب نہیں ہے۔ مگر تکبیرِ تحریمہ اور پڑھنا فاتحہ کا ہر رکعت میں اگرچہ مقتدی ہو اور پچھلا تشہد اور سلام پھیرنا، یہ چار ذکر فرض ہیں۔ اس کے سوا جو کچھ ہے، وہ سنت ہے، جیسے ہاتھ اٹھانا چار جگہ پر، وقت تکبیر کہنے کے اور وقت رکوع کرنے کے، اور سر اٹھانے کے رکوع سے، اور وقت کھڑے ہونے کے واسطے رکعتِ سوم کے، اور جیسے ہاتھ باندھنا وقتِ قیام کے، اور جیسے دعاے توجہ پڑھنا بعد تکبیرِ تحریمہ کے، سب سے زیادہ صحیح متفق علیہ یہ دعا ہے: "اللهم باعد بيني وبين خطاياي..." اور جیسے تعوذ کرنا ... پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہے، پھر فاتحہ پڑھے اور آمین جہر سے کہے۔ یہ آمین امام و مقتدی دونوں کو کہنا چاہیے، روایت جہر کی اصح و اقوی ہے روایت خفض سے، اور جیسے پڑھنا کسی سورت کا ہمراہ فاتحہ کے ... اور جیسے تشہد اوسط ... اور جیسے وہ ذکر جو ہر رکن میں آئے ہیں، مثل تکبیراتِ رکوع و سجود و قیام و قعود کے، پھر بعد تشہد اخیر کے جونسی دعا چاہے، ماثور یا غیر ماثور مانگے۔'' (ص: ۹۔ ۱۰)

---

[1] اس رسالے کے آخری صفحے پر درج ہے کہ ۴/ رجمادی الاخری ۱۳۰۵ھ کو چند گھنٹوں میں یہ رسالہ لکھا گیا۔

اس کے بعد نواب صاحب نے ''فائدہ'' کے ذیل میں ان حدیثوں کا ترجمہ کیا ہے، جن میں تعدیلِ ارکان کی تعلیم اور تورک کے ساتھ نماز ادا کرنے کا ذکر ہے، پھر فرماتے ہیں:

''اب چاہیے کہ کوئی نمازی کیفیتِ نماز میں اس ہیئت سے تجاوز نہ کرے، ورنہ اس کی نماز میں خلل ہوگا۔'' (ص: ۱۱)

ان تصریحات کی موجودگی میں کسی کا یہ بیان کس طرح قابلِ اعتبار سمجھا جائے کہ ''والا جاہ نماز پنج گانہ حنفی طریقہ پر پڑھتے تھے۔'' مسک الختام وغیرہ میں تو نواب صاحب نے ان مسائل کے بارے میں اہلِ حدیث کے موقف و مسلک کی تائید اس طرح کی ہے کہ اس کے خلاف حنفیہ کے شبہات و دلائل کے جوابات بھی دیے ہیں۔

نواب صاحب باقرار خود اہلِ حدیث مشہور تھے:

یہی وہ حقائق ہیں، جن کی بنا پر نواب صاحب اہلِ حدیث مشہور تھے، جیسا کہ انھوں نے خود اس کا اقرار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ایک محنت مجھ پر یہ آئی کہ ہنگامۂ انقلاب سن کر اہلِ عزائم نے آ کر گھیرنا شروع کیا، عامۂ خلق کے ذہن میں یہ بات جمی ہوئی ہے کہ امرا و رؤسا معتقد اعمال کے ہوتے ہیں، حالانکہ میں اول امیر نہیں ہوں، دوسرے علم سے فقیر بھی نہیں ہوں کہ دامِ تزویر اہلِ شرک و بدعت میں گرفتار ہو جاؤں۔ میں تو اپنے اعتقاد میں کسی شخص کا معتقد نہیں ہوں، خصوصاً ان فقراء و مشائخ کا جو اس زمانۂ جہل میں دکان داری کرتے پھرتے ہیں۔ مجھ کو ان کی حرکاتِ بے برکات پر نہایت تعجب آتا ہے کہ باوجود اس جہل وخبث و شرک و بدعت کے یہ کسی موحد کو پھانسنے چلے۔ ان حمقا نے اتنا بھی نہ جانا کہ میں تو اہلِ حدیث مشہور ہوں اور تقویۃ الایمان و رسائلِ توحید کا پابند ہوں۔ میرے سامنے کسی رمال، جفار، منجم، عزیمت خواں کی اتنی بھی قدر نہیں ہے، جتنی کہ دواب کی قدر نظرِ انسان میں ہوتی ہے، کیونکہ موحد ہر بلا و رخا، مصیبت و عافیت میں اللہ ہی کو پکارتا ہے۔''[1]

نواب صاحب مرحوم کی عبارتوں کے یہ اقتباسات صاف اور صریح لفظوں میں ان باتوں کی تردید و تکذیب کر رہے ہیں کہ ''وہ حنفی تھے اور ہمیشہ حنفی مذہب کی طرف اپنے کو منسوب کرتے تھے اور حنفی مذہب کے طریقے پر نماز پڑھتے تھے۔'' ؎

قَدْ أَصْبَحَتْ أُمُّ الْخِيَارِ تَدَّعِيْ عَلَيَّ ذَنْباً كُلُّهُ لَمْ أَصْنَعِ[2]

---

[1] إبقاء المنن (ص: ۱۳۶)

[2] ''اہل حدیث اور سیاست'' از مولانا نذیر احمد املوی رحمانی (ص: ۱۶۴۔ ۱۷۶)

② نواب صاحب کی مولفات:

خاکسار۔عفا اللّٰہ عنہ۔ نے ایک کتاب دیکھی، جس کا نام ”اکتفاء القنوع بما ھو مطبوع“ ہے۔ یہ ادور دبن کرنیلیوس فندیک (ایڈورڈ کانیلس فندیک۔ ناقل) کی تالیف ہے۔ مطبع تالیف ہلال واقع مصر قاہرہ میں مطبوع ہوئی ہے۔ اُس میں کتبِ علوم اور ان کے مصنفین کا ذکر ہے۔ بغایت نفیس کتاب ہے۔ گویا ایک جام جہاں نما ہے۔ مصنف نے قابلِ داد کام کیا ہے۔ اُس میں شیخنا المرحوم (نواب سید صدیق حسن خاں رحمہ اللہ۔ ناقل) کی کتب کا بھی ذکر ہے۔ صفحہ ۴۹۷ میں یوں لکھا ہے، اس کے بعد طویل اقتباس عربی زبان میں ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

”ملکہ بھوپال سے تزوج کے باعث مال و دولت میں (نواب صدیق حسن رحمہ اللہ) غنی ہوگئے۔ اس کے بل بوتے پر بڑی بڑی کتابیں جمع کر کے کتب خانہ بنا لیا اور علما سے کتابیں تالیف کروا کے اپنے نام سے طبع کروا لیں۔“[1]

وضاحت:

صاحب ”اکتفاء القنوع“ نے جو شیخنا المرحوم کا یہ ترجمہ لکھا ہے، سو اُس بنا پر ہے، جس کی اُن کو خبر پہنچی اور خبر صدق و کذب دونوں کی محتمل ہوتی ہے۔ چوں کہ یہ ایک تاریخی بحث ہے، اس لیے ضرور ہوا کہ جو بات واقعی ہے، اُس کو واضح و راست گزارش کروں۔ ان کی تحریر میں کئی امور ہیں:

اوّل امر:

یہ ہے کہ اصل ان کی عوام الناس سے ہے۔ حالاں کہ یہ امر واقعی نہیں ہے، بلکہ اصل ان کی اخص الخواص میں سے ہے، اس لیے کہ شیخنا المرحوم کا نسب طاہر بواسطہ حضرت قطب العالم مخدوم جہانیاں رحمہ اللہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے اور آپ کا خاندان ساداتِ بخارا ہندوستان وغیرہ ممالک میں ایک معزز خاندان ہے۔ یہ تو نسب ہوا، اور باعتبار جاہِ دنیوی آپ کے جد امجد سید اولاد علی خاں المخاطب بہ انور جنگ ریاست حیدر آباد دکن میں بہ جاگیر بیش قرار و منصب معتبر ممتاز تھے۔ آپ کے والد مولانا سید اولاد حسن صاحب قنوجی رحمہ اللہ نے باوجود طلب والی حیدر آباد کے اپنے والد کا منصب و مال و متاع کثیر ترک کیا اور اپنے وطن میں جادۂ زہد و تقویٰ پر مستقیم رہے۔ اپنے شہر میں بہ کمال زہد و قناعت عمر بسر کی۔ سارا شہر آپ کا معتقد تھا۔ بہ اعتبار تقویٰ و تدین کے سب کے سردار تھے۔ اس کی پوری تفصیل اور بھوپال میں آنے کا حال اور روزگار و ترقی مناصب کی کیفیت خود شیخنا المرحوم نے اپنی بعض تصانیف میں خوب تحریر فرمائی ہے۔

دوسرا امر:

یہ ہے کہ جب غنا حاصل ہوئی تو علما کو جمع کیا اور ان کو بھیجا۔ پھر ہر طرف سے قلمی کتابیں خریدیں اور ایک بڑا کتب خانہ جمع کیا اور اپنے پاس رہنے والے علما کو تالیف کی تکلیف دی۔ پھر ان کی تصانیف لے کر اپنی طرف منسوب

---

[1] اکتفاء القنوع بما ھو مطبوع (ص: ۴۹۷)

کر لیں۔ یہ امر بھی غیر واقع ہے، کیوں کہ ان کے غنا سے پہلے چند علمائے معمر یہاں ایک مدت سے موجود تھے۔ اور اپنی اپنی خدمتوں پر مقرر تھے، جن کو نہ تالیف وتصنیف کا شوق تھا اور نہ چنداں فارسی وعربی لکھنے کی عادت تھی۔ ہاں بفرطِ شوق نفائس کتب زرِ خطیر صرف کر کے یمن وغیرہ سے طلب کیں اور ان سے (علمی) نفع لیا اور اطراف و جوانب سے لوگوں نے کتابیں بھیجیں۔ زمانہ غنا میں دو چار اہلِ علم بہ تلاشِ روزگار یہاں آئے۔ حسبِ لیاقت ان کو جگہ ملی۔ ان میں سے بعض نے معاصرین کے اعتراضوں کے جواب بھی لکھے، لیکن شیخنا المرحوم نے ہرگز ان کو تکلیف نہیں دی کہ اپنی کتابیں ان سے تالیف کرا کے اپنی طرف منسوب کریں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو سرعتِ تحریر عطا فرمائی تھی، وہ شاید اس وقت میں کسی کی ہو، عربی و فارسی خوش محاورہ قلم برداشتہ بلا تکلف لکھتے تھے۔ ان کا مسودہ مثل مبیضہ ہوتا تھا۔ اللہ پاک نے ان کے وقت میں بہت برکت رکھی تھی۔ ذرا سے وقت میں کام بہت ہو جاتا تھا۔ بالالتزام تالیف کا وقت صبح کی نماز کے بعد سے نو بجے تک تھا اور اگر دنیاوی کاروبار سے فرصت پائی تو اور اوقات میں بھی لکھتے تھے، ورنہ خیر!

تیسرا امر:

یہ ہے کہ ایسی قدیم کتابیں اختیار کرتے تھے، جن کے ایک نسخے کے سوا اور نسخے نہیں ہوتے تھے اور ان کا عنوان متغیر کرتے اور ان کے نام بدل کر اور نام رکھتے اور اول صفحہ پر اپنا نام مع القاب فخر کے لکھتے۔ یہ امر بھی خلافِ واقع ہے۔ اس لیے کہ ان کی تالیفات کئی قسم کی ہیں، جن کی تفصیل یوں ہے:

① ایک قسم تو یہ ہے کہ کسی کتاب کی شرح لکھی، جیسے عون الباری شرح تجرید بخاری، سراج وہاج شرح تلخیص مسلم، انتقاد رجیح شرح اعتقاد صحیح اور بغیۃ الرائد شرح عقائد۔ یہ سب کتابیں شروحِ حدیث وغیرہ سے تلخیص کر کے لکھی ہیں، جس طرح کہ علمائے متقدمین و متاخرین کا طریقہ ہے۔ جس کتاب سے نقل کیا، اس کا نام لکھ دیا۔

② دوسری قسم یہ ہے کہ کسی متقدم کی کتاب کی تلخیص کی ہے، جیسے "حصول المأمول" إرشاد الفحول کی تلخیص ہے۔ "مثیر ساکن الغرام إلی روضات دار السلام" حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب "حادي الأرواح" کی تلخیص ہے۔ "فتح البیان" تفسیر فتح القدیر امام شوکانی رحمہ اللہ کی تلخیص ہے، لیکن یہ محض تلخیص نہیں ہے، بلکہ اور کتبِ تفاسیر سے اس میں بہت اضافہ کیا گیا ہے۔ گویا خود مستقل کتاب ہے۔ پس جس کتاب کی تلخیص کی، اس کتاب کا نام مع نامِ مصنف دیباچہ میں لکھ دیا ہے۔

③ تیسری قسم یہ ہے کہ کسی کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ مثلاً عربی سے فارسی یا اردو میں، جیسے ترجمہ بلوغ المرام فارسی میں یا ترجمہ "درر بہیہ" اُردو میں، جس کا نام "فتح المغیث" ہے۔ یہ کتب بہت ہیں۔ جس کا ترجمہ ہے، اس کا نام مع مصنف دیباچہ میں لکھ دیا ہے۔ اس قسم کی تالیف ہمیشہ سے ہوتی چلی آئی ہے میرے علم میں ایسا نہیں ہوا ہے کہ غیر کی کتاب کو نام بدل کر اپنی طرف منسوب کر لیا ہو، ان کی کتابیں اقسامِ مذکورہ سے خالی نہیں ہیں۔

اب رہا بعض معاصرین کا انتقادِ سو، تو یہ کچھ نئی بات نہیں ہے، ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ کتبِ تاریخ وتراجم علما میں اس کی تفصیل خوب لکھی ہے۔ معاصرت اصلِ منافرت ہوتی ہے۔ دیکھو حافظ ابن حجر وعینی وسیوطی وسخاوی وعلامہ ابن تیمیہ ابو حیان رحمہ اللہ وغیرہم جن میں کیا کچھ ہو چکا ہے۔ خطا ونسیاں اور سہو وغلط لوازمِ بشری سے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے سوا کوئی معصوم نہیں ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

ومن ذا الذي ترضىٰ سجاياه كلها كفى المرء نبلًا أن تعد معائبه

صاحب ''اکتفاء القنوع'' کو تو جیسے خبر پہنچی، اس کے مطابق لکھا۔ بعض لوگ اور ہندوستان میں بھی اس قسم کا خیال رکھتے تھے۔ اس خیال کی بنا یا تو نادانی پر ہے یا حسد پر۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے، اپنا دیکھا بھالا جانا بوجھا لکھا ہے۔ شیخنا المرحوم کو خاکسار سے ایک طبعی مناسبت ایسی تھی کہ شاید ویسی کسی سے ہو۔ جب مدرسہ سلیمانیہ کا اہتمام اُن کے سپرد ہوا اور میں بھی وہیں مدرس تھا تو اکثر ملاقات و یکجائی رہتی تھی۔ عجب لطف ومحبت سے پیش آتے تھے۔ ہر وقت ہنس کر کشادہ پیشانی سے ملتے۔ بغایت حسنِ خلق کا برتاؤ رکھتے تھے۔ ''مسك الختام شرح بلوغ المرام'' کا مبیضہ مدرسے ہی میں کیا۔ یہ کتاب دو مجلد کلاں میں ہے۔ دوبار اپنے ہاتھ سے اس کو لکھا۔ جب میر منشی ہوئے، پھر نائب دوم، پھر نواب بنے تو مجھے بہ اجازت سرکار عالیہ ۔دام اقبالھا۔ اپنی خدمت میں بلا لیا۔ اس وقت سے لے کر ان کی وفات تک ان کی خدمت میں رہا۔ جس لطف سے پیش آتے تھے، وہی لطف ہمیشہ رہا۔ خفا ہونا کیسا! کسی فکر میں ہوں، جب ملیں تو مسکرا کر ملیں۔ ایسا خلق کسی کا دیکھا نہ سنا۔ شرح ''درر بہیہ'' مسمّٰی بہ ''روضہ ندیہ'' تالیف فرمائی۔ مسودہ خاص سے میں نے ایک نسخہ نقل کیا، تاکہ طبع کے لیے لکھنؤ جائے۔ بعد ازاں آٹھ ماہ میں ''فتح القدیر'' سے ''فتح البیان'' ملخص فرمائی۔ پھر مدارک وخازن سے اس پر اضافہ کیا۔ پھر منظور ہوا کہ جمل (شرح جلالین) وغیرہ سے کچھ اور زیادہ ہو، چوں کہ اصل مسودہ میں اس کی گنجایش نہ تھی، اس لیے مجھے حکم دیا کہ مسودہ سے مبیضہ کروں۔ دو تین سال میں خاکسار نے اس کا مبیضہ کیا، جس قدر اجزا تیار ہوتے خدمت شریف میں پیش کرتا تو آپ جمل سے اس پر اضافہ فرماتے تھے۔ جب چھپنا شروع ہوا تو اس کی کاپی کا مقابلہ میں اور وہ کرتے۔ وہ پڑھتے تھے اور میں سنتا تھا۔ اسی طرح ساری کتاب کا مقابلہ ہوا۔ پھر پے درپے کتب تالیف فرماتے رہے۔ سوائے چند کتب کے جو لکھنؤ یا قسطنطنیہ ومصر میں طبع ہوئیں، ساری تالیف کا مقابلہ میں نے اور انھوں نے کیا۔ وہ پڑھتے اور میں سنتا۔ ان کی تالیفات عربی و فارسی و اردو میں نے ان کی زبان سے سنی ہیں اور پھر دوسروں سے اس کا مقابلہ کیا ہے اور تصحیح وغیرہ کی ہے۔ ان کے سارے مسودے میری نظر سے گزرے ہیں۔ اکثر تو تین بار اور بعض دو بار اور بعض ایک بار۔

منصف مزاج ایسے تھے کہ عبارت پڑھنے میں اگر کہیں سہو ہو گیا تو ان کو ٹوکا، پس اس کو مانا اور صحیح پڑھا۔ گو کتنے ہی آدمی بیٹھے ہوں، میں نے ان کی بعض کتب کے مسودات جلد بندھوا کر تبرکاً اپنے پاس رکھ چھوڑے ہیں۔ اگر سچ پوچھو تو ان کا گوشت پوست سب علم تھا۔ ان کی طبعی بات سوائے ذکر وفکر کے اور کچھ نہ تھی۔ مجھے براہِ محبت تالیف پر

بہت آمادہ کرتے اور رغبت دلاتے تھے۔ چناں چہ انہی کے زور دینے سے کتاب ”المبتكر في بيان المؤنث والمذكر“ تالیف کرنا شروع کی۔ جب تمام ہوئی تو خدمت میں پیش کی۔ بہت خوش ہوئے اور پسند فرمائی۔ آپ کی برکت سے عالم میں مقبول ہوئی۔ چناں چہ صاحب ”اکتفاء القنوع“ نے بھی اُس کا ذکر کیا ہے اور یوں لکھا ہے:

”أبو الحسن ذوالفقار أحمد، له مبتكر في بيان ما يتعلق بالمؤنث والمذكر، طبع في بهوپال الهند ١٢٩٧ھ ولا يقتصر هٰذا المبتكر على المؤنث والمذكر، بل هو مصنف نفيس في اللغة مع كثير من الشواهد والآداب، منه يظهر للقارئ حسن مساعي أهل الهند في خدمة معرفة اللغة العربية“ انتهى

اس کتاب کو پچاس روپیہ ماہوار کے بدلے خوشنویس نے آٹھ ماہ میں لکھا۔ پانچ سو نسخے اس کے طبع ہوئے۔ شیخنا المرحوم کی کتب کے ساتھ مصر، روم، یمن اور مکہ معظمہ وغیرہ کو اکثر نسخے گئے۔ باقی نسخے یہاں تقسیم ہوئے۔ اب اس کا نسخہ کم یاب ہے۔

پھر ”محاسن المحسنين في حكايات الصالحين في ترجمة روضة الرياحين“ لکھی۔ پھر ”شرب المدام السلسال على ذكر سلامان وابسال“ پھر ”طى الفراسخ إلى منازل البرازخ“ پھر ”تشنيف الأسماع بسلوان المطاع“ پھر ”الروض الممطور في ذكر علماء شرح الصدور“ پھر ”حدائق الزهور في رجال شرح الصدور“ بزبان عربی، یہ طبع نہیں ہوا۔ پھر ”الذيل الميسور في رجال شرح الصدور“ نام میں رسالہ مذکور کی تلخیص کی۔ پھر: ”مرأة النسوں“ ترجمہ ”حسن الأسوة“۔ جب یہ کتب میں نے لکھیں تو بہت خوش ہوئے اور پھر فرمایا: الحمد للہ بھائی میری زبردستی اور تقاضے سے یہ کتابیں تالیف ہوگئیں۔ کتب کی طبع اپنے صلبی مال سے کرتے تھے، مالِ زکات سے نہیں، اس لیے سب نسخے مجھے عطا فرماتے تھے اور میری ملک کر دیتے تھے، میں جو چاہوں کروں۔

چناں چہ ”مبتکر“ کے سب نسخے ہدایا میں گئے۔ اس طرح ”محاسن“ کے سب ہزار نسخے، کئی سو نسخے طلبا وغیرہ کے مفت تقسیم ہوئے۔ کئی سو نسخے کا تبادلہ کتب علمی سے کیا گیا۔ ”مرأة النسوان“ چوں کہ سرکار عالیہ۔دام اقبالها۔ کے حکم سے طبع ہوئی تھی، اس لیے اس کے سب نسخے ملک سرکاری ٹھہرے، ان کے حکم سے اس کی تقسیم ہوئی اور ہوتی ہے۔ غرض کہ سیدنا المرحوم کا مجھ پر خاص یہ اتنا عظیم الشان احسان ہے کہ مجھ سے اس کا ادنا شکر ادا ہونا بھی محال ہے، پورے شکر کا کیا ذکر ہے۔ اس کے سوا اور ان کے بہت احسان ہیں۔ ان کی خدمت میں دینی و دنیوی و علمی بہت سے فوائد حاصل ہوئے، مجھ عاجز سے سوائے دعا کے اور کیا ہوسکتا ہے۔ اللہ پاک ان کو درجاتِ عالیہ عطا فرمائے اور ان کی اولاد و احفاد کی عمر و دولت میں برکت دے اور اپنے مرضیات کی توفیق عنایت کرے۔ آمین[1]

---

[1] ”قضاء الأرب من ذكر علماء النحو والأدب“ للشيخ ذوالفقار أحمد البوفالي (ص: ٣٥٥)

نقوشِ حیات

علامہ نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ

محترمہ رضیہ حامد

ماہ	سنہ عیسوی	سنہ ہجری	ماہ	واقعات
۱۴ر اکتوبر	۱۸۳۲ء	۱۲۴۸ھ	۱۹ر جمادی الاول	پیدائش بمقام بانس بریلی، یو۔ پی
	۱۸۳۷ء	۱۲۵۳ھ		والد کا انتقال۔
	۱۸۵۲ء	۱۲۶۹ھ		ورود دہلی برائے تعلیم۔
	۱۸۵۳ء	۱۲۷۰ھ		تعلیم سے فراغت کے بعد وطن واپسی۔
	۱۸۶۴ء	۱۲۸۱ھ		کتبِ حدیث وقرآن کی سند مولوی محمد یعقوب صاحب سے حاصل کی۔
	۱۸۷۸ء	۱۲۹۵ھ		شیخ یحییٰ بن محمد بن احمد بن حسن الحازمی قاضی عدن سے سند حاصل ہوئی۔
	۱۸۷۸ء	۱۲۹۶ھ		علامہ سید نعمان خیر الدین آلوسی زادہ مفتیِ بغداد سے سند حاصل کی۔
	۱۸۵۵ء	۱۲۷۱ھ	۱۳ر رجب	بھوپال روانگی (سفر بھوپال باراول)۔
		۱۲۷۱ھ	شعبان	ورودِ بھوپال۔
		۱۲۷۱ھ	رمضان	بھوپال میں تیس روپیہ ماہوار پر ملازمت۔
	۱۸۵۵ء	۱۲۷۲ھ	۲۹ر ربیع الاول	بھوپال میں پچاس روپیہ تنخواہ پر میر دبیری کی جگہ پر تقرر اور کچھ عرصہ بعد اس جگہ سے علاحدگی۔
	۱۸۵۶ء	۱۲۷۳ھ	۱۶ر محرم	بھوپال سے سوے وطن واپسی۔

ماہ	سنہ عیسوی	سنہ ہجری	ماہ	واقعات
	۱۸۵۶ء	۱۲۷۳ھ	۵؍ربیع الاول	کانپور پہنچے۔
	۱۸۵۶ء	۱۲۷۳ھ	۱۶؍ربیع الاول	واپس قنوج پہنچے۔
	۱۸۵۷ء	۱۲۷۳ھ		جنگ آزادی کا ہنگامہ خیز دور قنوج اور بلگرام میں گزرا۔
	۱۸۵۷ء	۱۲۷۳ھ	رجب	خواب میں زیارتِ نبوی ہوئی اور عربی زبان میں "قصيدة العنبرية في مدح خير البرية" تحریر فرمایا۔
	۱۸۵۸ء	۱۲۷۴ھ	۱۰؍ذی قعدہ	وطن سے روانہ ہو کر مرزا پور پہنچے۔
۱۳؍اگست	۱۸۵۸ء	۱۲۷۵ھ	۳؍محرم	بھوپال کے لیے روانگی بار دوئم۔
	۱۸۵۸ء	۱۲۷۵ھ	۴؍صفر	ورودِ بھوپال۔
	۱۸۵۸ء	۱۲۷۵ھ	۱۹؍ربیع الاول	بھوپال میں ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے جے پور کی جانب روانگی۔
	۱۸۵۸ء	۱۲۷۵ھ	۱۱؍ربیع الثانی	جے پور کے راستے میں ٹونک پہنچے۔
	۱۸۵۹ء	۱۲۷۵ھ	۲۰؍ذی الحجہ	بھوپال کی طرف ٹونک سے کوچ۔
	۱۸۵۹ء	۱۲۷۶ھ	۱۰؍محرم	ورودِ بھوپال۔
	۱۸۵۹ء	۱۲۷۶ھ	یکم صفر	ریاستِ بھوپال میں تاریخ نگاری کی خدمت پر بہ مشاہرہ ۷۵ روپیہ ماہوار مامور ہوئے۔
	۱۸۶۱ء	۱۲۷۷ھ	۲۵؍شعبان	مدار المہام جمال الدین خاں کی صاحبزادی ذکیہ بیگم سے موتی مسجد میں نکاح۔
۲۲؍جنوری	۱۸۶۲ء	۱۲۷۸ھ		پیدایش نور الحسن خاں (صاحبزادہ اول)۔
	۱۸۶۲ء	۱۲۷۹ھ	۵؍ربیع الاول	تکمیل تعمیرِ جدید موتی مسجد بھوپال۔
۱۱؍ستمبر	۱۸۶۳ء	۱۲۸۰ھ	۲۷؍ربیع الاول	پیدایش صفیہ بیگم (صاحبزادی)۔
۱۶؍اگست	۱۸۶۸ء	۱۲۸۳ھ	۴؍ربیع الاول	پیدایش علی حسن خاں (صاحبزادہ خورد)۔
		۱۲۸۴ھ	۲۱؍صفر	امراؤ دولہ نواب باقی محمد خاں کا انتقال۔
	۱۸۶۸ء	۱۲۸۵ھ	۱۳؍رجب	نواب سکندر بیگم کی وفات۔

ماہ	سنہ عیسوی	سنہ ہجری	ماہ	واقعات
۱۶/نومبر	۱۸۶۸ء	۱۲۸۵ھ	یکم شعبان	شاہ جہاں بیگم کی تخت نشینی۔
		۱۲۸۵ھ	۲۷/شعبان	بھوپال سے حج کے لیے روانگی۔
		۱۲۸۵ھ	۲۶/رمضان	ورود بندرگاہ حدیدہ۔
	۱۸۶۸ء	۱۲۸۵ھ	۲۴/محرم	والدہ کا انتقال۔
	۱۸۶۹ء	۱۲۸۶ھ	۱۵/صفر	مدینہ منورہ کے لیے روانگی۔
	۱۸۶۹ء	۱۲۸۶ھ	جمادی الاولیٰ	حج سے واپس روانگی۔
		۱۲۸۶ھ	ربیع الاول	حج سے واپسی پر بھوپال پہنچے۔
		۱۲۸۷ھ	۳/شعبان	عہدہ میر دبیری سند امیر الانشائی و خطاب خانی نیز خلعت مرحمت کیا گیا (مشاہرہ دوسو روپیہ)۔
	۱۸۷۰ء	۱۲۸۷ھ	۸/شوال	عقدِ ثانی ہمراہ نواب شاہجہاں بیگم۔
۸/مئی	۱۸۷۱ء	۱۲۸۸ھ	۱۷/صفر	جشن عقدِ ثانی۔
۲/جولائی	۱۸۷۱ء	۱۲۸۸ھ	۲۱/ربیع الثانی	معتمد المہام نائب دوم ریاست نامزد ہوئے۔
ستمبر	۱۸۷۲ء	۱۲۸۹ھ	۱۵/رجب	نواب سلطان جہاں بیگم کی نواب احمد علی خاں سے شادی۔
۱۷/ستمبر	۱۸۷۲ء	۱۲۸۹ھ	۱۸/رجب	انگریزی حکومت سے اعزازات کی منظوری۔
	۱۸۷۲ء	۱۲۸۹ھ	یکم شعبان	ریاست بھوپال کی طرف سے پچھتر ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر مرحمت ہوئی۔
۱۵/اکتوبر	۱۸۷۲ء	۱۲۸۹ھ	۱۱/شعبان	انعقاد جشن مسرت، خلعت و خطاب مراتب و اعزازات نواب والا جاہ امیر الملک مرحمت ہوئے، سترہ توپوں کی سلامی اور جاگیر عطا ہوئی۔
۱۷/نومبر	۱۸۷۲ء	۱۲۸۹ھ	۱۴/رمضان	نواب شاہجہاں بیگم کے ہمراہ بمبئی روانگی، بعد ازاں سورت اور احمد آباد کا سفر۔
۳۰/نومبر	۱۸۷۲ء	۱۲۸۹ھ	۲۸/رمضان	بھوپال کے لیے واپسی۔
۶/دسمبر	۱۸۷۵ء	۱۲۹۲ھ	۸/ذی قعدہ	سفر کلکتہ ہمراہ نواب شاہ جہاں بیگم۔

ماہ	سنہ عیسوی	سنہ ہجری	ماہ	واقعات
	۱۸۷۶ء	۱۲۹۳ھ	۱۱/محرم	بھوپال واپس پہنچے۔
	۱۸۷۶ء	۱۲۹۳ھ	۲۷/ذیقعدہ	نواب شاہجہاں بیگم کے ہمراہ سفرِ دہلی برائے شمولیت دربار دہلی اور سترہ توپوں کی سلامی۔
فروری	۱۸۷۷ء	۱۲۹۴ھ	۱۸/محرم	بھوپال واپس پہنچے۔
۲۷/فروری	۱۸۷۷ء	۱۲۹۴ھ	۱۳/صفر	انگریزی حکومت کے حدود میں سلامی کا اعزاز حاصل ہونے کی خوشی میں بھوپال میں جشنِ مسرت منعقد ہوا۔
	۱۸۷۹ء	۱۲۹۶ھ		سلطان ترکی عبد الحمید خاں کی طرف سے تمغہ مجیدی درجہ دوم کا اعزاز۔
۲۱/مارچ	۱۸۸۱ء	۱۲۹۸ھ		الزامات عائد کیے گئے۔ تصنیف و تالیف کے کام سے روک دیا گیا۔
	۱۸۸۱ء	۱۲۹۸ھ	۳/ذی الحجہ	قدسیہ بیگم نے اپنی تمام جائداد و جاگیر کا مالک و مختار نواب شاہ جہاں بیگم کو بنا دیا۔
۱۰/دسمبر	۱۸۸۱ء	۱۲۹۹ھ	۲۴/محرم	نواب قدسیہ بیگم کا انتقال۔
	۱۸۸۱ء	۱۲۹۹ھ	۴/ربیع الآخر	مدار المہام محمد جمال الدین خاں کا انتقال۔
۲۳/فروری	۱۸۸۲ء	۱۲۹۹ھ	۴/ربیع الآخر	سفر کلکتہ برائے ملاقات وائسرائے ہند لارڈ رپن ہمراہ نواب شاہ جہاں بیگم۔
	۱۸۸۴ء	۱۳۰۱ھ	یکم رمضان	زوجۂ اول ذکیہ بیگم کا انتقال۔
۲۸/ اگست	۱۸۸۵ء	۱۳۰۲ھ	۱۴/ذیقعدہ	احکامات معزولی اور انتزاع خطابات و اختیارات مدد دہی رئیسہ اور نظم ریاست میں دخل کی ممانعت۔
		۱۳۰۳ھ		تکمیل تعمیر نور محل۔
۲۰/فروری	۱۸۹۰ء	۱۳۰۷ھ	۲۹/جمادی الثانی	انتقال نواب صدیق حسن خاں بمرض استسقاء۔
۱۲/اگست	۱۸۹۰ء	۱۳۰۷ھ		خطابات کی واپسی۔

سلسلة إحياء التراث العلمي

للإمام

النواب محمد صديق حسن خان القنوجي رحمه الله

تفسیر ترجمان القرآن

بلطائف البیان

تالیف

نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ

(۱۸۳۲ — ۱۸۹۰ء)

تصحیح و تنقیح و نظرثانی

فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف — حافظ شاہد رفیق فاضل مدینہ یونیورسٹی

تسہیل: جناب محمد یحییٰ قریشی — تخریج: حافظ حامد مشتاق فاضل مدینہ یونیورسٹی

دار أبي الطيب

للنشر والتوزيع

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دیباچہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ، إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى عَبْدِهٖ وَرَسُوْلِهٖ مُحَمَّدٍ سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَخَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ، وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِالْإِحْسَانِ أَجْمَعِيْنَ أَكْتَعِيْنَ أَبْصَعِيْنَ. أَمَّا بَعْدُ!

ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اپنے معبود رب کو پہچانے، اس کی صفات کو جانے اور اس کی پسند اور ناپسند کو سمجھے، کیوں کہ اس کے بغیر اس کی بندگی ممکن نہیں اور جو بندگی نہ بجا لائے، وہ بندہ نہیں گندہ ہے۔

اللہ کی پہچان بتانے سے آتی ہے۔ آدمی محض نادان پیدا ہوتا ہے، وہ ہر چیز سکھانے سے سیکھتا اور بتانے سے جانتا ہے۔ سو بتانے والے کتنی ہی تقریریں کریں، لیکن انسان وہ بات اس طرح نہیں جان سکتا جو خود اللہ پاک نے بتائی ہے۔ وہ ہدایت جو اللہ کے کلام میں ہے، دوسرے کے کلام میں ہرگز نہیں ہو سکتی۔ چونکہ اللہ کا کلام عربی میں ہے اور ہندوستان وغیرہ کے لوگوں کے لیے اس کا سمجھنا محال تھا، اس لیے پہلے ہندوستان میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے فارسی زبان میں ''فتح الرحمٰن'' کے نام سے قرآنِ مجید کا ترجمہ کیا، پھر ان کے فرزندِ بزرگوار شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے ''موضح قرآن'' کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا۔ جس طرح فارسی ترجمے سے اہلِ علم نے خوب فائدہ اٹھایا، اسی طرح اس اردو ترجمے سے بھی اہلِ ہند کو بڑا نفع ہوا۔

دنیا میں قرآنِ کریم کی بے شمار تفسیریں لکھی گئی ہیں۔ ہماری کتاب ''اکسیر''[1] میں تیرہ سو تفسیروں کا ذکر ہے۔ یہ تفسیریں سب سے زیادہ عربی میں ہیں۔ کچھ فارسی میں اور چند ایک اردو میں ہیں۔ اس لیے اہلِ دین کی ایک جماعت مدت سے مجھے یہ بات کہہ رہی تھی کہ تم اُردو زبان میں ایک ایسی تفسیر لکھو، جو نہ زیادہ لمبی چوڑی ہو نہ مختصر، بلکہ متوسط (درمیانی) ہو، جس سے قرآن کا مطلب سمجھنا آسان اور کم علم لوگوں کے لیے ہدایت کا راستہ واضح ہو جائے۔ مجھے اتنی فرصت کہاں تھی کہ میں اس کام کا ارادہ کرتا، لیکن جب تقاضا زیادہ ہوا تو چار و ناچار رمضان المبارک ۱۳۰۲ھ دوشنبہ (سوموار) سے میں نے اس تفسیر کو لکھنا شروع کر دیا۔[2]

---

[1] یہ نواب صاحب رحمہ اللہ کا اپنی تالیف "إكسير في أصول التفسير" (فارسی) کی طرف اشارہ ہے۔ یہ کتاب اردو ترجمے کے بعد نواب صاحب رحمہ اللہ کے علومِ قرآن سے متعلق دیگر رسائل کے ساتھ ''مجموعہ علومِ قرآن'' (دار ابی الطیب، گوجرانوالہ) میں شائع ہو چکی ہے۔

[2] یہ ایک صدی پیشتر کی بات ہے، جب اردو کی بیشتر تفاسیر، جو اِس وقت موجود ہیں، ان میں سے کوئی بھی نہ تھی۔ اس اعتبار سے ترجمان القرآن کو اردو کی پہلی مفصل تفسیر قرار دینا شاید غلط نہ ہو۔

شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کی ''موضح قرآن'' ۱۲۰۵ھ میں لکھی گئی تھی، جس کو ستانوے برس ہو چکے ہیں، علاوہ ازیں وہ صرف ترجمہ تھا اور یہ تفسیر ہے۔ میں نے رمضان المبارک کے مہینے میں اس لیے اس کا آغاز کیا ہے کہ سب سے پہلے قرآنِ پاک کا نزول آسمانِ دنیا سے بیت العزت پر اس مبارک مہینے میں ہوا تھا۔ جیسے اللہ کا فرمان ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ [البقرہ :۱۸۵] ''رمضان کا مہینا وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔''

اس تفسیر میں آیات کا ترجمہ مع فوائد ''موضح قرآن'' سے لیا گیا ہے۔ باقی مطالب حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی تفسیر، امام محمد بن علی شوکانی رحمہ اللہ کی تفسیر (فتح القدیر) اور راقم کی اپنی عربی تفسیر ''فتح البیان'' سے لکھے گئے ہیں۔ ''موضح قرآن'' کی عبارت کو روز مرہ کے مطابق کیا گیا ہے، بالکل اصل کے مطابق نہیں رکھا، کیوں کہ ستانوے برس کی اس مدت میں اردو زبان کے بہت سے محاورات بدل چکے ہیں۔

اس تفسیر کا مقصد اور منہج:

اس تفسیر سے غرض یہ ہے کہ عام اہلِ اسلام اپنی زبان میں اللہ کا کلام سمجھ لیں اور قرآن شریف کا مطلب معلوم کر لیں۔ اسی لیے جو باتیں زیادہ علمی تھیں اور ان کا سمجھنا عام لوگوں کے لیے مشکل تھا، جیسے صَرف ونحو، معانی و بیان اور اختلافِ قراءات وغیرہ کے مسائل، ان کو اس تفسیر میں بیان کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔ صرف کتاب اللہ کے مقاصد کی وضاحت کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

علاوہ ازیں قرآن شریف کی جو تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث یا صحابہ و تابعین یا تبع تابعین یا لغتِ عرب سے ثابت ہے، صرف وہی تفسیر اس میں لکھی گئی ہے، کیوں کہ اللہ کے پاک کلام کا جیسا مطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خیر القرون یعنی صحابہ و تابعین و تبع تابعین کے ادوارِ ثلاثہ کے لوگوں نے سمجھا ہے، ویسا مطلب کوئی عالم بیان نہیں کر سکتا۔ نیز اپنی یا غیر کی رائے سے قرآن کے معانی بیان کرنا یا اس میں معقولات کی آمیزش کرنا ممنوع اور گناہ ہے۔ قابلِ اعتماد تفسیر صرف وہ ہے، جو سلف سے نقل ہو کر ہم تک پہنچی ہے۔

تعلیمِ قرآن کی ترغیب:

تمام مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس طرح پہلے اپنے بچوں کو قرآن پڑھاتے ہیں، اسی طرح اس بات کا اہتمام کریں کہ جو بچہ حرف شناس ہو کر اُردو زبان پڑھنے اور سمجھنے لگے، اس کو سب سے پہلے ''موضح قرآن'' کا سبق دیں، تاکہ وہ قرآن کریم کے لفظی معانی سمجھ لے، اس کے بعد اسے یہ تفسیر پڑھائیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ سب سے پہلے اللہ کی کتاب کا مطلب اس کے دل میں بیٹھ جائے گا۔ جب بچہ قرآن پاک پڑھ لے اور اس کا مطلب سمجھ لے تو پھر اسے حدیث کی مشہور چھے کتابیں پڑھائیں۔ ان کتابوں کا ترجمہ بھی اُردو زبان میں ہو گیا ہے۔

جس کو صرف دین کے احکام جاننا مقصود ہو، اس کے عمل کے لیے اتنا علم کافی ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ بلند ہمت عطا فرمائے اور وہ سارا درسی علم پڑھ کر عالم ہونا چاہے، اس کے لیے عربی تفسیریں اور صحاح وسنن کی کتابیں موجود ہیں، وہ ان کو پڑھے پڑھائے اور بلند درجہ حاصل کرے۔

علم اور اخلاص کامیابی کے دو بنیادی ارکان ہیں:

قرآن شریف میں ہے: ﴿ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴾ [الزمر: ٩] ''کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے، برابر ہو سکتے ہیں؟'' یعنی نہیں ہو سکتے۔ جن کو علم ملا ہے، ان کے بڑے بڑے رتبے ہیں۔ اللہ سے بھی صحیح معنوں میں وہی لوگ ڈرتے ہیں، جو عالم ہوتے ہیں اور جنت بھی انھی کو ملے گی، جو اللہ کے خوف سے رہتے ہیں۔ اللہ کو علم کے بغیر کوئی نہیں پہچان سکتا۔ علم یہی تین چیزیں ہیں: ایک اللہ کا کلام، دوسرا رسول اللہ ﷺ کی سنت، تیسرا فرائض (وراثت) کا علم، ان کے سوا سب غیر ضروری ہیں۔ دین و دنیا کی اصلاح کے لیے قرآن وحدیث اور فرائض کا علم کافی ہے۔ جب ان پر عمل کی توفیق میسر آ گئی تو سمجھو آخرت درست ہوگئی۔ اب کچھ بھی تو باقی نہیں رہا، جس کے لیے آدمی بے فائدہ محنت برداشت کرے اور تکلیفیں اٹھائے۔ ایسا آدمی جس نے قرآن شریف ترجمہ وتفسیر کے ساتھ پڑھ لیا اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث کا علم حاصل کر لیا، وہ یقیناً اگر اللہ نے چاہا تو اس آیت کا مصداق قرار پائے گا: ﴿ وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَإِنَّهُ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [النحل: ١٢٢] ''اور ہم نے اسے دنیا میں بھلائی دی، اور بلاشبہہ وہ آخرت میں ضرور صالحین میں سے ہوگا۔''

دینِ اسلام کا دار و مدار دو چیزوں پر ہے: ایک اخلاص اور دوسرا صواب (درست طریقے سے کام کرنا)۔ اخلاص کے معنی ہیں صرف ایک اللہ کی پوجا کرنا، اس کی عبادت میں کسی بھی حالت میں کسی طرح کا شرک نہ کرنا، اسی کو اپنا معبود بنانا اور اسی کو اپنا رب جاننا۔ اسی کا نام توحیدِ الوہیت اور توحیدِ ربوبیت ہے۔ صواب (درست طریقے سے کام کرنے) کا مطلب ہے صریح حدیث اور ظاہر سنت کے مطابق عمل کرنا۔ بدعت اور رائے و قیاس کی ہوا بھی نہ لگنے دے۔ جب یہ دونوں باتیں کسی مسلمان میں جمع ہو جاتی ہیں تو وہ مومن کامل بن جاتا ہے، ورنہ اس کے ایمان میں نقص رہتا ہے، کیوں کہ اگر اخلاص نہیں ہوگا تو ضرور اس سے کھلا یا چھپا شرک صادر ہوگا یا وہ اس کے عقیدے میں موجود ہوگا، اسی طرح صواب کے فقدان سے عمل میں بدعت داخل ہو جائے گی اور ''ہر بدعت گمراہی ہے۔'' جیسا کہ فرمانِ نبوی ﷺ ہے۔[1] ایسا شخص شرک و بدعت میں پھنس کر بالکل ناکارہ ہو جاتا ہے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ.

بہر حال اس تفسیر کو اُردو زبان میں بہت آسان کر کے لکھا گیا ہے۔ اس کا تاریخی نام ''ترجمان القرآن

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٧) سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٧٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢)

بلطائف البیان" رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو اپنے فضل و کرم سے ویسے ہی خالصاً لوجہ اللہ قبول فرمائے، جیسے مذکورہ بالا دونوں فارسی اور اُردو تراجم کو ہمارے مشائخ کے حلقوں میں قبول فرما کر ایک عالَم کو ان سے فیض یاب کیا اور لوگوں کی رشد و ہدایت کا ذریعہ بنایا۔ جس طرح ہمارے علم (کتاب و سنت) کا سلسلۂ سند مذکورہ بزرگوں تک پہنچتا ہے، اسی طرح اس خدمت کا سلسلۂ قبولیت بھی سابق الذکر دونوں ترجموں سے جا ملے۔ اللہ کے احسان و انعام سے یہ بات بعید نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ پہلے مجھے، پھر میرے اہل و عیال کو، پھر سارے مومن مردوں اور عورتوں کو کتاب و سنت کی اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

مولف

مقدمۂ تفسیر

قرآن میں ہر چیز کا علم ہے:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ﴾ [النحل: ۸۹] ''اور ہم نے آپ پر ہر چیز کو کھول کر بیان کرنے والی یہ کتاب نازل کی ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ﴾ [الأنعام: ۳۸] ''ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی (جس کا ذکر نہ کیا ہو)۔'' ان دونوں آیات سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کریم ہر چیز بیان کرنے والا ہے اور اس میں کسی چیز کو چھوڑا نہیں گیا ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے: «سَتَكُونُ فِتْنَةٌ، قِيلَ: وَمَا الْمَخْرَجُ مِنْهَا؟ قَالَ: كِتَابُ اللّٰهِ، فِيهِ نَبَأُ مَا قَبْلَكُمْ، وَخَبَرُ مَا بَعْدَكُمْ، وَحُكْمُ مَا بَيْنَكُمْ» [1] (ترمذي وغيره) یعنی عنقریب فتنے پیدا ہوں گے۔ کسی نے پوچھا: ان سے نکلنے (بچنے) کا طریقہ کیا ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی کتاب موجود ہے، جس میں اگلی پچھلی خبر اور حال کا حکم موجود ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو کوئی علم سیکھنا چاہے، وہ قرآن کو حاصل کرے، کیوں کہ اس میں اولین و آخرین کی خبر ہے۔ [2] (سنن سعيد بن منصور) امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس جگہ علم سے مراد علم کے اصول ہیں۔ [3] امام حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ نے ایک سو چار کتابیں اتاری ہیں، ان سب کتابوں کا علم چار کتابوں میں ہے: تورات، انجیل، زبور اور فرقان۔ ان میں بھی پہلی تین کتابوں کا سارا علم فرقان (قرآن کریم) میں ہے۔ فرقان کا سارا علم مفصل سورتوں میں ہے اور مفصل سورتوں کا علم سورۃ الفاتحہ میں ہے۔ جس نے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر معلوم کر لی، اس نے گویا تمام آسمانی کتابوں کا علم حاصل کر لیا۔ [4] (بيهقي)

قرآن اور سنت کا تعلق:

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ائمہ دین جو کچھ کہتے ہیں، وہ سب سنت یعنی رسول اللہ ﷺ کی حدیث کی

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۹۰۶) اس روایت کی سند میں ایک راوی مجہول ہے اور حارث اعور ضعیف ہے۔

[2] سنن سعيد بن منصور (۱/ ۷) المعجم الكبير (۹/ ۱۳۶) مصنف ابن أبي شيبة (۶/ ۱۲۶) اور اس کی سند صحیح ہے۔

[3] الإتقان في علوم القرآن (۲/ ۳۳۰)

[4] شعب الإيمان (۲/ ۴۵۰) اس روایت کی سند میں ''ربیع بن صبیح'' راوی متکلم فیہ ہے۔

شرح ہے اور سنت یا حدیث ساری کی ساری قرآنِ کریم کی شرح ہے۔ بعض سلف نے کہا ہے کہ میں نے جو حدیث بھی سنی، اس پر دلالت کرنے والی اللہ کی کتاب کی کوئی نہ کوئی آیت مجھے ضرور مل گئی۔[1] امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث بھی صحیح سند سے پہنچی، میں نے اس کا مصداق کتاب اللہ میں ضرور پا لیا۔[2] (ابن أبي حاتم) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بھی قول ہے کہ اس قرآن میں ہر علم اتارا گیا ہے اور ہم کو ہر چیز کی تمیز بخشی گئی ہے، لیکن ہمارا علم وفہم ان تمام چیزوں کے سمجھنے سے قاصر ہے۔[3] (ابن جرير و ابن أبي حاتم)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی چیز کو چھوڑتا تو وہ ذرہ، خردلہ (رائی کا دانہ) اور بعوضہ (مچھر) کا ذکر چھوڑ دیتا۔[4] (ابو الشیخ) امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو حکم بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے، وہ قرآن ہی سے ماخوذ ہے۔[5] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اسی چیز کو حلال کرتا ہوں، جو اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے۔[6] (طبراني) امام شافعی رحمہ اللہ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ دین کے معاملے میں کسی شخص پر جو حادثہ بھی پیش آتا ہے تو اللہ کی کتاب میں اس کی بابت ہدایت کا ایک راستہ ضرور موجود ہوتا ہے۔[7]

بعض احکام جن کا ابتداءً سنت سے ثابت ہونا معلوم ہوتا ہے، درحقیقت وہ بھی کتاب اللہ ہی سے ماخوذ ہیں۔ کیوں کہ اللہ کی کتاب ہی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہم پر واجب کی ہے اور آپ کی بات پر چلنا ہم پر فرض کیا ہے۔ ایک مرتبہ امام شافعی رحمہ اللہ نے مکہ معظمہ میں یہ بات کہی کہ لوگو! تم مجھ سے جو چاہو پوچھو، میں ہر بات کا جواب قرآنِ مجید سے دوں گا۔ کسی نے کہا: یہ بتلائیں کہ محرم آدمی کے لیے زنبور (بھڑ) مارنا جائز ہے یا نہیں؟ انھوں نے "بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ" پڑھ کر اللہ کا یہ فرمان پڑھا: ﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوۡلُ فَخُذُوۡهُ وَمَا نَهٰىكُمۡ عَنۡهُ فَانۡتَهُوۡا ۚ ﴾ [الحشر: ۷] "اور اللہ کا رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے منع کرے تو اسے چھوڑ دو۔" پھر اپنی سند سے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اِقْتَدُوْا بِالَّذَيْنِ مِنْ بَعْدِيْ: أَبِيْ بَكْرٍ

---

[1] الإتقان في علوم القرآن (۲/ ۳۳۰) أضواء البيان (۲/ ٤٢٨)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ٢٠١٥) اس کی سند صحیح ہے۔
[3] ہمارے پاس جو تفسیر الطبری اور تفسیر ابن ابی حاتم کے مطبوعہ نسخے ہیں، ان میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس قول کا آخری جملہ نہیں ہے۔ دیکھیں: تفسير الطبري (١٧/ ٢٧٩) تفسير ابن أبي حاتم (٧/ ٢٢٩٧) البتہ امام شوکانی نے "فتح القدیر" میں اور علامہ آلوسی نے روح المعانی میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس قول کو ذکر کر کے اس کی نسبت تفسیر الطبری اور تفسیر ابن ابی حاتم کی طرف کی ہے۔ دیکھیں: فتح القدير (٣/ ٢٦١) روح المعاني (٧/ ١٤٤) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔
[4] العظمة لأبي الشيخ الأصبهاني (٢/ ٥٣٤) اس روایت کی سند میں "ابو اُمیہ اسماعیل بن یعلی" ضعیف راوی ہے۔
[5] الإتقان في علوم القرآن (٢/ ٣٣٠) روح المعاني (٦/ ١٩٠)
[6] المعجم الأوسط (٦/ ٤٢) اس کی سند میں علی بن عاصم واسطی ضعیف ہے، جیسا کہ امام ابن عدی اور حافظ ابن طاہر قیسرانی نے کہا ہے۔
[7] الإتقان في علوم القرآن (٢/ ٣٣١) روح المعاني (٧/ ١٤٤)

وَعُمَرَ ﴾ [1] ''تم میرے بعد ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) کی اقتدا کرنا۔'' پھر اپنی سند سے دوسری حدیث ذکر کی، جس کا مضمون یہ تھا کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے محرم کو زنبور مارنے کا حکم دیا ہے۔ [2]

صحیح بخاری میں مروی ہے کہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث پڑھی: ﴿لَعَنَ اللّٰهُ الْوَاشِمَاتِ وَالْمُسْتَوْشِمَاتِ﴾ ''اللہ تعالیٰ نے بدن گودنے والیوں اور گدوانے والیوں پر لعنت فرمائی ہے۔'' تو ایک عورت نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اللہ نے کہاں یہ لعنت فرمائی ہے؟ انھوں نے فرمایا: بھلا جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہو اور وہ بات قرآن مجید میں بھی موجود ہو تو میں اس پر لعنت کیوں نہ کروں؟ اس عورت نے کہا: میں نے تو یہ سارا قرآن، جو دو لوحوں کے درمیان ہے، پڑھا ہے، مگر تم جو کہہ رہے ہو، وہ میں نے اس میں کہیں نہیں پایا؟ انھوں نے فرمایا: اگر تو قرآن پڑھتی تو ضرور اس کو پا لیتی۔ کیا تو نے قرآن مجید میں یہ آیت نہیں پڑھی: ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ [الحشر: ۷] ''اور اللہ کا رسول تمھیں جو کچھ دے تو وہ لے لو اور جس سے منع کرے تو اسے چھوڑ دو۔'' اس نے کہا: ہاں، یہ آیت تو پڑھی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کاموں سے منع فرمایا ہے۔ [3]

امام ابن برجان [4] رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جو بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، وہ یا تو خود قرآنِ مجید میں موجود ہے یا قرآن میں اس کی اصل ہے، چاہے قریب ہو یا بعید۔ جس نے اسے سمجھا تو ٹھیک سمجھا اور جو اس سے اندھا رہا، وہ اندھا ہی رہا۔ اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر حکم اور فیصلہ قرآن میں موجود ہے۔ [5]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: ﴿كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ﴾ [6] ''آپ کا اخلاق قرآن تھا۔'' غضب ہے! پیغمبر تو قرآن پر چلے، لیکن ان کی امت اس پر نہ چلے۔ بعض علما نے کہا ہے کہ ایسی کوئی چیز نہیں، جس کا نکالنا قرآن سے ممکن نہ ہو، لیکن یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے، جس کو اللہ نے سمجھ عطا کی ہو۔ یہاں تک کہ بعض اہلِ علم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تریسٹھ سال کی عمر سورۃ المنافقین کی اس آیت: ﴿وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا﴾ [المنافقون: ۱۱] ''اور اللہ کسی کو ہرگز مہلت نہیں دیتا، جب اس کی اَجل آ جائے۔'' سے برآمد کی ہے۔ اِس طرح کہ یہ تریسٹھ نمبر سورت کی آخری آیت ہے اور اس کے بعد سورت تغابن ہے (جس کے معنی حسرت اور ندامت کے ہیں) اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٦٢) السلسلة الصحيحة (١٢٣٣)

[2] سنن البيهقي الكبرىٰ (٥/ ٢١٢) اور دوسری حدیث کی سند بھی صحیح ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٢٥)

[4] ان کا نام عبدالسلام بن عبدالرحمٰن لخمی اشبیلی ہے۔ یہ ۵۳۶ھ کو فوت ہوئے۔

[5] الإتقان في علوم القرآن (٢/ ٣٣٢) أضواء البيان (٢/ ٤٢٩)

[6] مسند أحمد (٦/ ٩١) اس کی سند صحیح ہے۔

کے مفقود ہونے پر افسوس ظاہر ہوتا ہے۔

مرسی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن شریف نے اولین و آخرین کے سارے علوم جمع کر لیے ہیں، تاہم اللہ تعالیٰ کے سوا حقیقتاً ان علوم کا احاطہ کوئی نہیں کر سکتا، حتی کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنا علم دیا گیا، وہی آپ جانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے خاص علم تک آپ کی رسائی بھی نہیں ہے۔ آپ ﷺ کے بعد سب سے زیادہ قرآن کا علم رکھنے والے سادات صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ جن میں سب سے نمایاں خلفاے اربعہ، ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم وغیرہ زیادہ بڑے عالم تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اگر اونٹ کے پاؤں باندھنے کی ایک رسی بھی گم ہو جائے تو میں اسے بھی کتاب اللہ میں پالوں گا۔[1]

بحرِ قرآن میں علوم وفنون کے لعل و گہر:

پھر یہ علم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تابعین عظام رحمہم اللہ میں منتقل ہوا، پھر ہمتیں پست ہوگئیں اور عزیمتیں سست پڑ گئیں۔ اُمنگ جاتی رہی اور اہلِ علم کم ہوگئے۔ ان علوم کا جو بوجھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ نے اُٹھایا تھا، وہ ان سے نہ اُٹھ سکا۔ چناں چہ انھوں نے علم کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا اور ہر گروہ کسی ایک خاص فن کے ساتھ وابستہ ہوگیا:

1. کسی نے ضبطِ لغات، تحریرِ کلمات، مخارجِ حروف اور تعدادِ کلمات کی شناخت، اسی طرح آیات، سُوَر و اَجزا، اَنصاف و اَرباع، سجدوں کی تعداد شمار کرنے، تعلیم اَعشارِ آیات اور حصرِ کلماتِ متشابہہ و آیاتِ متماثلہ کی طرف توجہ کی۔ انھوں نے معانی سے کچھ سروکار رکھا نہ مطالب کی تعبیر کا کوئی اہتمام کیا۔ ان کو ''قراء'' کہا جاتا ہے۔
2. کسی نے اسما و افعال، حروفِ عاملہ و غیر عاملہ اور معرب و مبنی سے بحث کی، نیز اسما و توابعِ اسما میں خوب دل کھول کر کلام کیا، نیز اقسام افعالِ لازم و متعدی، رسومِ خطِ کلمات اور جملہ متعلقات وغیرہ امور کو تفصیل سے بیان کیا۔
3. کسی نے مشکل الفاظ پر اعراب لگائے، کسی نے ہر ایک کلمے کا اعراب بیان کر دکھایا۔
4. کئی مفسرین نے الفاظ پر توجہ مبذول کی کہ کوئی لفظ صرف ایک معنی پر دلالت کرتا ہے۔ کوئی لفظ دو معانی پر اور کوئی دو سے بھی زیادہ پر دلالت کرتا ہے۔ پہلی قسم کے لفظ کو انھوں نے اس کے حکم پر رکھا۔ مخفی کے معنی آشکار کیے۔ نیز متعدد محتمل معانی میں سے ایک کو ترجیح دینے کی سعی کی، یعنی جس کے دو یا زیادہ معانی تھے، ان میں سے ایک کو راجح اور دوسرے کو مرجوح بتایا۔ ہر ایک نے اپنی فکر سے کام لیا۔ جدھر اس کی نظر گئی، اسی کے مطابق کہا۔
5. اہلِ اصول اور اہلِ کلام اُٹھے تو عقلی دلائل اور شواہدِ اصلیہ و نظریہ کے بیان کو مطمحِ نظر بنایا۔ جیسے اس آیت: ﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ [الأنبياء: ٢٢] ''اگر ان دونوں (زمین و آسمان) میں اللہ کے

[1] الإتقان في علوم القرآن (٢/ ٣٣٢) روح المعاني (٦/ ١٩١)

سوا اور معبود ہوتے تو ضرور یہ دونوں تباہ ہو جاتے۔'' سے اللہ کی وحدانیت، اس کے وجود و بقا، قِدم و قدرت اور علم و تنزیہ پر بہت سے دلائل برآمد کیے اور کئی حجتیں قائم کیں۔ اس علم کا نام ''اُصولِ دین'' قرار پایا۔

6 ایک گروہ نے معانیِ خطاب میں غور و تامل کیا۔ کسی کو مقتضی عموم اور کسی کو مقتضی خصوص پایا۔ اس سے حقیقت و مجاز لغات کے احکام نکالے۔ تخصیص و اِضمار، نص و ظاہر، مجمل، مفصل، محکم، متشابہ، امر و نہی اور نسخ وغیرہ میں گفتگو کی۔ نیز قیاس کی قسمیں بیان کیں اور استصحابِ حال و استقرائے تمثیل کو حل کیا۔ اس فن کا نام ''اُصولِ فقہ'' ہے۔

7 دوسرے گروہ نے اپنی نظرِ صحیح اور فکرِ صادق سے کام لیا۔ حلال و حرام اور تمام احکام میں غور کیا اور احکام کے اصول و فروع بنائے۔ مفصل و مبسوط قول لکھا۔ اس کا نام ''علمِ فروع'' اور ''فقہ'' ہے۔

8 کسی گروہ نے قرونِ سابقہ اور اممِ ماضیہ کے قصوں کی چھان پھٹک کی۔ اخبار کو نقل کیا، آثار کو مدون اور وقائع کو ضبط کیا اور دنیا کی ابتدا اور پہلی شے کا ذکر کیا۔ یہ فن ''تاریخ و قصص'' کے نام سے موسوم ہوا۔

9 کچھ لوگوں نے جتنے حِکم و اَمثال اور مواعظ تھے، جن سے دل دہل جائیں اور پہاڑ پھٹ پڑیں، ان کو جمع کیا۔ وعد و وعید، تحذیر و تبشیر، ذکرِ موت و معاد، حشر و نشر، حساب و کتاب، عقاب و ثواب اور جنت و جہنم کی تفصیلات بیان کی اور مواعظ کے فصول اور زواجر کے اصول مقرر کیے۔ یہ لوگ ''واعظ'' اور ''خطبا'' کہلائے۔

10 کسی نے تعبیرِ خواب کے اصول قرآن کریم سے اِخذ کیے۔ یوسف علیہ السلام کے قصے میں موٹی گائیوں کا ذکر آیا ہے۔ دو قیدیوں کے خواب کا بیان ہے۔ چاند سورج اور تاروں کے سجدہ کرنے کا تذکرہ ہے۔ اس قسم کی آیات سے انھوں نے اس فن کے اصول و مبادی وضع کیے۔ انھوں نے اس فن کا نام ''تعبیر الرؤیا'' رکھا اور ہر خواب کی تفسیر کتاب اللہ سے برآمد کی۔ جہاں قرآن سے نہ ملی، وہاں سنت سے تعبیر نکالی، کیوں کہ سنت کتاب اللہ کی شرح کرنے والی ہے۔ سنت سے تعبیر نکالنے میں کامیابی نہ ہوئی تو حِکم و اَمثال سے اسے اخذ کیا۔ کچھ عوام کی بول چال، عرف و عادات پر غور کیا اور اس سے بہت کچھ نکالا۔

11 کچھ لوگوں نے آیتِ میراث سے سہام (حصوں) اور اربابِ سہام کا حساب سمجھا۔ اس کا نام ''علمِ فرائض'' ہے۔ انھوں نے نصف، ثلث، ربع، سدس، ثلثان اور ثمن مقرر کیے۔ فرائض کا حساب، عول کے مسائل درست کیے اور وصیتوں کے احکام نکالے۔

12 کسی جماعت نے یہ کام کیا کہ جو آیات، اللہ کی حکمتِ واضحہ پر دلالت کرنے والی تھیں، جن میں رات دن، چاند سورج اور چاند ستاروں کی منازل اور بروج وغیرہ کا ذکر تھا، ان کو جمع کر کے ''علمِ مواقیت'' بنایا۔

13 ادیب و شعرا قسم کے حضرات نے اپنی ساری توجہ جزالتِ لفظ، اِبداعِ نظم، حسنِ سیاق، مبادی و مقاطع و مخالص، تلوینِ خطاب، نیز اِطناب و ایجازِ کلام پر مبذول کر دی اور معانی و بیان اور بدیع کا استنباط کیا۔

14 اربابِ اشارات اور اصحابِ حقیقت نے اپنی نگاہ علاحدہ دوڑائی۔ ان پر کتاب اللہ کے جو الفاظ و معانی اور حقائق واضح ہوئے، انھوں نے ان کو بنیاد بنا کر فنا، بقا، حضور، خوف و ہیبت، انس و وحشت اور قبض و بسط وغیرہ کی اصطلاحات قائم کیں۔

مختلف علوم وفنون کا بیان:

یہ ان فنون اور علوم کا بیان ہے کہ جن کو ملتِ اسلامیہ نے قرآن پاک سے اخذ کیا ہے۔ ان فنون کے علاوہ اور علوم بھی ہیں جن پر فرقانِ عظیم مشتمل ہے، جیسے: علمِ طب، ہیئت، ہندسہ، جدل، جبر، مقابلہ اور نجوم وغیرہ۔

① طب کا دار و مدار نظامِ صحت کی حفاظت اور استحکامِ قوت وغیرہ پر ہے۔ یہ امور اعتدالِ مزاج سے بہ تفاعل کیفیات متضادہ حاصل ہوتے ہیں، چناں چہ اللہ کی کتاب کی ایک آیت ان سب کو جامع ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴾ [الفرقان: ٦٧] ''اور ان کا خرچ اس کے درمیان معتدل ہوتا ہے۔'' پھر یہ پہچاننا کہ اختلال کے بعد دوبارہ صحت کس طرح بحال ہوسکتی ہے اور بیماری کے بعد بدن کس طرح شفایاب ہوتا ہے، یہ بات اس آیت سے معلوم ہوئی: ﴿ شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ﴾ [النحل: ٦٩] ''ان کے پیٹوں سے مختلف رنگوں کا مشروب (شہد) نکلتا ہے، اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔'' پھر جسمانی طب پر دلوں کی طب کو اور بڑھا دیا اور فرمایا: ﴿ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ﴾ [یونس:٥٧] ''اور شفا، ان (بیماریوں) کے لیے جو سینوں میں ہیں۔''

② علمِ ہیئت ان آیات میں بیان ہوا ہے جن میں آسمان و زمین کی بادشاہت کا بیان اور عالمِ علوی و سفلی میں مخلوقات کے پھیلانے کا ذکر ہے۔

③ ہندسہ کا اس آیت میں ذکر ہے: ﴿ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ ﴾ [المرسلات: ٣٠۔ ٣١] ''چلو تین شاخوں والے سائے (دھوئیں) کی طرف۔ نہ ٹھنڈک پہنچانے والا اور نہ شعلوں سے بچاؤ کرے۔'' اس میں قاعدہ ہندسیہ موجود ہے کہ مثلث شکل کے لیے سایا نہیں ہوتا۔

④ جدل کے براہین، مقدمات و نتائج اور قول بموجب و معارضہ اور دیگر بہت سی اشیا پر کتاب اللہ کی متعدد آیات حاوی ہیں۔ اس باب میں ابراہیم علیہ السلام کا مناظرہ (جو نمرود سے ہوا) اصلِ عظیم اور اساسِ قدیم ہے۔

⑤ جبر و مقابلے کی یہ صورت ہے کہ سورتوں کے اوائل (آغاز) میں گذشتہ امتوں کی تاریخوں، دنوں اور سالوں کی مدتوں کا ذکر آیا ہے۔ اس میں ملتِ اسلامیہ کی بقا اور مدتِ دنیا کی تاریخ بھی ہے کہ کتنی گزر گئی اور کتنی باقی ہے۔ بعض کو بعض کے ساتھ ضرب دینے سے یہ سارے حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔

(۷) نجوم اس قول میں ہے: ﴿ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ ﴾ [الأحقاف: ٤] ''یا علمی اثاثہ میرے پاس لاؤ۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تفسیر اسی کے ساتھ کی ہے۔ بعض کے نزدیک اس سے مرادِ علم حدیث کی سند ہے۔ اس آیت کو اگر دونوں علموں کی اصل ٹھہرائیں تو اس میں کوئی مانع نہیں ہے۔ قرآن پاک میں اتباعِ سنت کا حکم اور ردِ تقلید کا اثبات تو جا بجا ہے، اس آیت سے سلسلۂ اسناد کا علم ہونا بھی ثابت ہوا۔ وللہ الحمد.

قرآنِ مجید میں صنعتوں اور اسمائے آلات کے اصول:

قرآن پاک میں جس طرح تمام علوم وفنون کے اصول موجود ہیں، اسی طرح صنعتوں اور اسمائے آلات کے اصول بھی مذکور ہیں کہ جن کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

(1) انھی صنعتوں میں سے خیاطت، یعنی درزی کا کام ہے، جس پر یہ آیت دلالت کرتی ہے: ﴿ وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ﴾ [الأعراف: ٢٢] ''اور وہ دونوں اپنے اوپر جنت کے پتے چپکانے لگے (تاکہ ستر ڈھانک سکیں)۔'' اس آیت سے کفش دوزی (جوتے بنانے) کا کام بھی سمجھا جاتا ہے۔ عربی میں خصف جوتے گانٹھنے کو کہتے ہیں۔

(2) حدادت، یعنی آہن گری (لوہارے) کے کام کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ﴾ [الكهف: ٩٦] ''تم مجھے لوہے کے تختے لا دو۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ﴾ [سبا: ١٠] ''اور ہم نے اس کے لیے لوہا نرم کر دیا۔''

(3) بناء، یعنی معماری کے کام کا ذکر بہت سی آیتوں میں ہے، مثلاً: ﴿ وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ ﴾ [الذاريات: ٤٧] ''اور ہم نے آسمان کو قوت کے ساتھ بنایا۔''

(4) نجارت (ترکھانے یا بڑھئی پن)، کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ ﴾ [هود: ٣٧] ''اور ایک کشتی بنا۔''

(5) غزل، یعنی سوت کاتنے کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ نَقَضَتْ غَزْلَهَا ﴾ [النحل: ٩٢] ''جس نے اپنا سوت محنت سے کاتنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔''

(6) نسج (بُننا)، یعنی جولاہے کے کام کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ﴾ [العنكبوت: ٤١] ''ان لوگوں کی مثال مکڑی کی سی ہے کہ اس نے ایک گھر بنایا۔''

(7) فلاحت (کاشت کاری)، یعنی کھیتی باڑی کے کام کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴾ [الواقعة: ٦٣] ''بھلا بتاؤ تو جو کچھ تم بوتے ہو۔'' اس کے علاوہ دیگر آیات میں بھی کھیتی باڑی کا ذکر ہے۔

(8) صید، یعنی شکار کھیلنا، اس کا ذکر کئی آیتوں میں آیا ہے۔

9 غوص، یعنی غوطہ مارنا، اس کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ ﴾ [ص: ٣٧] ''ہر عمارت بنانے والے اور غوطہ لگانے والے کو۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً ﴾ [النحل: ١٤] ''اور اس میں سے (زیور) موتی نکالو۔''

10 صیاغت، یعنی سنارے کا کام، اس کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا ﴾ [الأعراف: ١٤٨] ''اور موسیٰ کی قوم نے ان کے (طور پر جانے کے) بعد اپنے زیورات سے ایک بچھڑا بنا لیا، وہ ایک جسم تھا۔''

11 زجاجت، یعنی شیشے کا کام، اس کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ﴾ [النمل: ٤٤] ''یہ تو شیشوں سے جڑا صاف محل ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ﴾ [النور: ٣٥] ''چراغ ایک شیشے (کی قندیل) میں ہو۔''

12 فخارت، یعنی اینٹیں بنانے کا کام، اس کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ ﴾ [القصص: ٣٨] ''لہٰذا اے ہامان! تو میرے لیے گارے (کی اینٹوں) کو آگ دے۔''

13 ملاحت، یعنی ملاحی و تیراکی کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ ﴾ [الكهف: ٧٩] ''رہی کشتی تو وہ چند مسکینوں کی تھی جو دریا میں کام کرتے تھے۔''

14 کتابت، یعنی لکھنے کا کام، اس کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ﴾ [العلق: ٤] ''وہ ذات جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔'' اس کے علاوہ دیگر آیتوں میں بھی اس کا ذکر ہے۔

15 خبز و عجن، یعنی روٹی وغیرہ پکانے کا ہنر، اس کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا ﴾ [يوسف: ٣٦] ''اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں۔''

16 طبخ، یعنی باورچی والا کام، اس کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴾ [هود: ٦٩] ''پھر دیر کیے بغیر وہ ایک بھنا ہوا بچھڑا لے آیا۔''

17 غسل و قصارت، یعنی دھوبی کا کام، اس کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴾ [المدثر: ٤] ''اور اپنے کپڑے پاک رکھیے۔'' ﴿ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ ﴾ [الصف: ١٤] ''حواریوں نے کہا'' یہ حواری دھوبی تھے۔

18 جزارت، یعنی قصابی کا کام، اس کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ﴾ [المائدة: ٣] ''سوائے اس کے جسے تم ذبح کر لو۔''

19 بیع و شرا، یعنی سوداگری (تجارت) کا ذکر بہت سی آیتوں میں آیا ہے۔

20 صبغ یعنی رنگ ریزی کا کام، اس کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ صِبْغَةَ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ١٣٨] ''اللہ کا رنگ (اختیار

کرو۔'' ﴿ بِيضٌ وَّحُمْرٌ ﴾ [الفاطر: ٢٧] ''سفید اور سرخ۔''

21 حجارت، یعنی سنگ تراشی کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فَرِهِينَ ﴾ [الشعراء: ١٤٩] ''اور تم اِتراتے ہوئے پہاڑوں سے گھر تراشتے ہو۔''

22 کیالت و وزن، یعنی وزن کشی کا کام، اس کا ذکر متعدد آیات میں آیا ہے۔

23 رَمی، یعنی تیر اندازی کے فن کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ ﴾ [الأنفال: ١٧] ''اور (اے نبی!) جب آپ نے (مٹھی بھر خاک ان کی طرف) پھینکی تو وہ آپ نے نہیں پھینکی۔'' ﴿ وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ ﴾ [الأنفال: ٦٠] ''اور ان (کافروں کے مقابلے) کے لیے تم مقدور بھر قوت (تیر وتفنگ) تیار کرو۔'' قوت کی تفسیر کو حدیث شریف میں تیر اندازی بیان کی گئی ہے،[1] مگر یہ لفظ عام ہے، جو ہر طرح کے فنِ سپاہ گری کو شامل ہے، جیسے: بندوق چلانا، غلیل مارنا اور توپ چھوڑنا۔ اس میں تیر اندازی بھی بطریقِ اولیٰ داخل رہے گی۔

اسی طرح اسمائے آلاتِ ضرب، ماکولات و مشروبات و منکوحات اور کائنات کے تمام حالات و واقعات، جو قرآنِ عظیم میں مذکور ہیں، اس آیت کے معنی کو ثابت کرتے ہیں: ﴿ مَّا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ ﴾ [الأنعام: ٣٨] ''ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی (جس کا ذکر نہ کیا ہو)۔'' یہاں تک اضافوں کے ساتھ مرسی[2] کا قول مکمل ہوا ہے، جسے امام سیوطی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے،[3] البتہ اس میں کفش دوزی (جوتے گانٹھنے) کے فن اور علمِ اسناد کا اضافہ ہماری طرف سے کیا گیا ہے، اسی طرح آیتِ کریمہ: ﴿ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِم بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ ﴾ [بني إسرائيل: ٦٤] ''اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا۔'' سے لشکر کی تقسیم اور اس کے انتظام کا فن ثابت ہوتا ہے، نیز اس آیتِ کریمہ ﴿ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴾ [النحل: ٨] ''اور وہ پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے۔'' میں ساری جدید صنعتیں داخل ہیں، جو قیامت تک دنیا میں پیدا ہوں گی۔

الغرض کوئی شخص قرآنِ کریم میں جتنا زیادہ غور کرتا ہے، اتنا ہی اس بات کو جان لیتا ہے کہ اللہ پاک کی کتاب ہر چیز پر مشتمل ہے۔ خواہ دلالۃ النص کے طور پر ہو یا اشارۃ النص کے طور پر۔ رہے علوم کے انواع و اقسام سو کسی علم کا کوئی باب اور مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کی کوئی بنیاد قرآن میں موجود نہ ہو۔ اس باب یا مسئلے پر قرآن کریم میں کوئی نہ کوئی راہنمائی ضرور ہوتی ہے۔ اگر وہ ہمارے علم کی گرفت میں نہ آئے تو یہ ہمارے علم وفہم کا قصور ہے، نہ کہ کتاب اللہ کا۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩١٧)

[2] ان سے مراد امام شرف الدین ابن ابی الفضل مرسی ہیں، جو ٥٧٠ھ کو پیدا ہوئے اور ربیع الاول ٦٥٥ھ کو فوت ہوئے۔ یہ تفصیل ان کی کتاب "التفسير الكبير" سے ماخوذ ہے۔

[3] الإتقان في علوم القرآن (٢/ ٣٣٢۔ ٣٣٦)

قرآن میں عجائبِ عالم کا علم:

قرآنِ مجید میں عجائبِ مخلوقات کا علم، زمین و آسمان کی بادشاہی کا علم، اس چیز کا علم جو اُفقِ اعلیٰ اور تحت الثریٰ میں ہے۔ ابتدائے آفرینش کا علم، مشاہیر انبیا و رسل علیہم السلام و ملائکہ کے نام اور گزشتہ امتوں کے حالات و واقعات موجود ہیں، نیز آدم علیہ السلام کا ابلیس کے ساتھ جنت سے نکلنے کا قصہ اور اپنی اولاد کا عبد الحارث نام رکھنے کا قصہ، ادریس علیہ السلام کا آسمان پر اُٹھائے جانے کا قصہ، قومِ نوح کے غرق ہونے کا قصہ، عادِ اولیٰ و عادِ ثانیہ کا قصہ، تبع کا قصہ، یونس علیہ السلام کا قصہ، اصحابِ کہف کا قصہ، اصحاب الرس کا قصہ، ثمود اور ناقہ کا قصہ، قومِ لوط و قومِ شعیب کا قصہ، موسیٰ علیہ السلام کی ولادت، ان کے دریا میں پھینکے جانے، قبطی کے قتل کرنے، مدین جانے، دخترِ شعیب سے نکاح کرنے، طور پر اللہ سے ہم کلام ہونے، فرعون کے پاس آنے، پھر مصر سے نکلنے، فرعون کے ڈوبنے، قوم کے بچھڑے کو پوجنے، پھر قوم پر بجلی گرنے وغیرہ کا قصہ، بنی اسرائیل کے مقتول اور گائے ذبح کرنے کا قصہ، جبارین کے قتل کا قصہ، خضر علیہ السلام کی ہم نشینی کا قصہ، ایک قوم کا سرنگ کے ذریعے چھپن جانے کا قصہ، طالوت و داود علیہ السلام کا جالوت کے ساتھ قصہ، سلیمان علیہ السلام کا ملکۂ سبا بلقیس کے ساتھ قصہ، اس قوم کا قصہ جو طاعون کے ڈر سے بھاگ نکلی تھی اور اللہ نے اس کو مار کر دوبارہ زندہ کر دیا، ابراہیم علیہ السلام اور اُن کا اپنی قوم کے ساتھ مجادلے اور مردود نمرود کے ساتھ مناظرے کا قصہ، ہاجرہ علیہا السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو مکہ معظمہ میں چھوڑ آنے کا قصہ، کعبہ کی تعمیر اور اسماعیل ذبیح علیہ السلام کا قصہ، یوسف علیہ السلام کا قصہ، جو تفصیل سے مذکور ہے۔ اس میں عشق و فسق کی مذمت اور تقویٰ و طہارت کی تعریف ہے۔ مریم علیہا السلام کے ہاں عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت، ان کی رسالت اور پھر آسمان پر اٹھائے جانے کا قصہ، زکریا، یحییٰ، ایوب اور ذوالکفل علیہم السلام کا قصہ، ذوالقرنین کے سورج کے طلوع و غروب ہونے کی جگہ تک جانے اور یاجوج و ماجوج کے لیے سدّ (دیوار) بنانے کا قصہ، اصحابِ کہف کا قصہ، اصحابِ رقیم کا قصہ، بخت نصر کا قصہ، ان دو شخصوں کا قصہ جن میں ایک کے پاس باغ تھا، اصحابِ جنت کا قصہ، آلِ یٰسین کے مومن کا قصہ، اصحابِ فیل کا قصہ، احبار کا قصہ کہ جس نے آسمان پر چڑھنے کا ارادہ کیا تھا اور دیگر قصے۔ پھر ہر ایک قصے میں اس قدر مواعظ و حکم ہیں کہ جن کی تفصیل کے لیے ایک دفتر کافی نہیں ہو سکتا۔[1]

قرآنِ کریم میں سیرت کا علم:

قرآن شریف میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے اہم واقعات کے تذکرے کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔

---

[1] مذکورہ بالا قصص اور واقعات میں بیشتر اشیا تو قرآنِ کریم میں صریحاً یا اشارتاً مذکور ہیں، البتہ بعض امور قرآنِ مجید میں نہیں، بلکہ تفسیری روایات و اخبار میں منقول ہیں، جس کی بنا پر مولف رحمہ اللہ نے ضمناً ان کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے، جیسے: آدم علیہ السلام کا اپنی اولاد کا نام شیطان کے کہنے پر عبدالحارث رکھنے والا ضعیف قصہ، ادریس علیہ السلام کا آسمان پر اٹھایا جانا اور احبار کے آسمان پر چڑھنے کا قصہ وغیرہ ہیں۔

آپ ﷺ کا مبعوث ہونا، ہجرت کرنا، آپ ﷺ کی بابت دعاے ابراہیم علیہ السلام اور بشارتِ عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ من جملہ غزوات کا ذکر، سورت انفال میں غزوۂ بدر کا ذکر، سورت آلِ عمران میں غزوۂ اُحد کا ذکر، سورت احزاب میں غزوۂ خندق کا ذکر، جیسے: سورت حشر میں بنونضیر کا، سورت فتح میں حدیبیہ کا، سورت براءت میں تبوک کا، سورت مائدہ میں حجۃ الوداع کا ذکر، پھر سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے نکاح کا قصہ، بعض ازواج کا باہم مل کر منصوبہ بندی کرنا، سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کا قصہ، شبِ معراج کا قصہ، انشقاقِ قمر کا قصہ، یہود کے جادو کرنے کا قصہ، مجملاً یا مفصلاً جیسا جس جگہ مناسب اور ضروری تھا، نازل فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ کی عمر، آپ کی حیات اور بات چیت کی قسم کھائی ہے: ﴿ لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴾ [الحجر: ۷۲] ''(اے نبی!) آپ کی عمر کی قسم! بے شک وہ اپنی مستی (گمراہی) میں بھٹک رہے تھے۔'' ﴿ وَقِيلِهِ يَارَبِّ ﴾ [الزخرف: ۸۸] ''اس (رسول) کے اس قول کی قسم ہے کہ اے میرے رب!'' تمام سیر و مغازی کی کتابیں انھی حالات و واقعات اور مقالات کی شرح ہیں۔

احوالِ آخرت کا علم:

انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک کا حال، موت اور قبضِ روح کی کیفیت سمیت قرآن نے سب حالات کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ بھی بیان کیا ہے کہ روح کے آسمان کی طرف لوٹنے کے بعد کیا ہوتا ہے۔ مومنین کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور کفار کو اوپر سے نیچے گرا دیا جاتا ہے۔ عذابِ قبر، سوالِ قبر، روحوں کی قرار گاہ اور قیامت کی بڑی بڑی علامتوں کا الگ ذکر ہے۔ یہ دس علامتیں ہیں: ① نزولِ عیسیٰ علیہ السلام، ② خروجِ دجال ③ ظہورِ یاجوج ماجوج، ④ سیر دابۃ الارض، ⑤ دخان (دھوئیں کا بلند ہونا)، ⑥ رفعِ قرآن، ⑦ مغرب سے سورج کا طلوع، ⑧ توبہ کا دروازہ بند ہونا، ⑨ خسف کا وقوع، ⑩ احوالِ بعث و قیامت، جیسے: صور کا پھونکا جانا، جس سے سب لوگ گھبرا کر بے ہوش ہو جائیں گے، پھر دوسرا صور پھونکا جائے گا تو لوگ قبروں سے زندہ ہو کر باہر نکل آئیں گے اور میدانِ حشر میں جمع ہو جائیں گے۔

اسی طرح موقف (محشر) کی ہولناکیاں، آفتاب کی شدتِ حرارت، عرش کا سایہ، پل صراط، میزان، حوض، حساب، ایک قوم کا حساب ہونا، دوسری قوم کا معذب ہونا، اعضا کا گواہی دینا، نامۂ اعمال کا دائیں یا بائیں ہاتھ میں یا پسِ پشت ملنا، شفاعت و جنت کا ذکر اور جو کچھ جنت میں ہوگا، جیسے: اس کے آٹھ دروازوں کا ہونا، نہروں، درختوں، پھلوں، زیورات، برتنوں اور درجات و رؤیتِ الٰہی وغیرہ کا ذکر، جہنم کی آگ کا اور جو کچھ اس میں ہوگا، اس کا ذکر، جیسے: جہنم کی مختلف وادیوں اور عقاب و عذاب کی قسموں کا بیان، زقوم، حمیم اور غسلین وغیرہ کا تذکرہ، ان سب کا حال تفصیل سے لکھا جائے تو اس کے لیے کئی مجلدات درکار ہیں۔ ائمۂ اسلام نے ان موضوعات پر جو خاص کتب لکھی ہیں، وہ گویا قرآنِ کریم کی مذکورہ بالا باتوں کی تفسیر ہیں، جن کو انھوں نے سنتِ صحیحہ و آثارِ قویہ سے صراحتاً یا اشارتاً، اجمالاً یا تفصیلاً سمجھا ہے۔

قرآن کا سمجھنا سنت کے علم پر موقوف ہے:

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کے سارے اسماے حسنیٰ موجود ہیں، جیسے: حدیثِ صحیح میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں، جو کوئی ان کو یاد کر لے گا، وہ جنت میں جائے گا۔[1] ان اسما کے علاوہ دیگر اسما وصفات ایک ہزار کے قریب آئے ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے بھی بہت سے نام قرآن میں مذکور ہیں۔ ایمان کی ستر سے کچھ زیادہ شاخوں کا بھی ذکر ہے۔ تین سو پندرہ احکام بیان ہوئے ہیں۔ اسی طرح کبیرہ اور صغیرہ گناہوں کی الگ الگ تفصیل ہے۔ ہر حدیثِ نبوی ﷺ کی تصدیق بھی موجود ہے۔ جب سارا علمِ حدیث ہی ساری سنتِ مطہرہ سمیت، قرآن پاک کی شرح وتفسیر ٹھہرا تو سمجھو کہ قرآن کا سمجھنا علمِ سنت پر موقوف ہوا، لہٰذا جس کو حدیث کا علم نہیں ہے، وہ قرآن کا عالم بھی نہیں ہے۔ اسی طرح جب کوئی سنت کا عامل نہیں ہے تو وہ عامل بالقرآن بھی نہیں ہوسکتا۔ گو فہم یا عمل بالکتاب کا زبانی دعویٰ کیوں نہ کرے، جس طرح اہلِ رائے اور اصحابِ بدعت وغیرہ کیا کرتے ہیں: ﴿ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ﴾ [البقرۃ: ۱۱۱] ''یہ ان کی (باطل) آرزوئیں ہیں۔'' جیسے: مقولہ مشہور ہے: ''ہنوز دلّی دور است'' ''دلّی ابھی دور ہے۔''

الغرض کتاب اللہ کے فضائل میں یہ ایک اجمالی بیان ہے، جو اس جگہ بطورِ نمونہ ذکر کیا گیا ہے۔ قرآنِ مجید کے جس علم وفن کو دیکھو، خواہ صریح ہو یا بطورِ اشارہ، عجب دل کشی رکھتا ہے۔

مخدرات سرا پردہائے قرآنی
چہ دلبرند کہ دل می برند پنہانی[2]

قرآن وحدیث کی لذت وہی شخص پا سکتا ہے جس کو علمِ نافع کے ساتھ اخلاصِ نیت اور عملِ صالح کی توفیق بھی حاصل ہو۔ ورنہ اکثر اہلِ زمانہ کی وہی مثل ہے کہ ''نکتہ دان نشود کرم، گر کتاب خورد'' (کیڑا اگر کتاب کھا جائے تو وہ عالم نہیں بن جاتا)۔

علوم القرآن پر تصانیف:

انواعِ علومِ قرآن میں بہت سے لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ کسی نے اسبابِ نزول میں، کسی نے معرب ومبہمات

---

[1] بعض روایات میں «حَفِظَهَا» (سنن ابن ماجه، رقم الحديث: ۳۸٦۱، مسند أبي يعلىٰ: ۱۱/ ۱٦۰) کے الفاظ ہیں اور بعض میں «مَنْ أَحْصَاهَا» ہے۔ (صحيح البخاري، رقم الحديث: ۵۲۸۵، صحيح مسلم، رقم الحديث: ۲٦۷۷) یعنی جو اُن کو ضبط وشمار کرے۔ اس کا مطلب ملا علی قاری نے یہ بیان فرمایا ہے کہ جو ان پر سچے دل سے ایمان لائے یا ان کو شمار کرے اور ترتیل کے طور پر تبرکاً ایک ایک نام کو پڑھے یا ان کے مطالب ومعانی کو سمجھے اور اپنے اندر بھی صفاتِ الٰہی والی خوبیاں پیدا کرنے کی سعی کرے۔ (مرقاۃ: ٤/ ١٥٦١) بعض روایات میں ننانوے ناموں کی جو تفصیل ہے، یہ روایات سنداً ضعیف ہیں اور ناموں کی یہ تفصیل مدرج ہے، یعنی بعض راویوں کا اپنا اضافہ ہے، یہ نام رسول اللہ ﷺ کے بیان کردہ نہیں ہیں۔ (أحسن البيان: ۳۸۹)

[2] ''قرآن کے حجابوں میں کچھ پردہ نشین اور دل برا ایسے ہیں کہ جو چپکے سے دل چرا لے جاتے ہیں۔''

میں اور کسی نے مواطنِ نزول میں۔ سب سے زیادہ جامع کتاب امام سیوطی رحمہ اللہ کی "الإتقان" ہے۔ پوری امت پر ان کا یہ احسان ہے۔ پھر اپنی ایک اور کتاب "الإکلیل" میں انھوں نے مختصر طور پر اہلِ علم کے وہ استنباطات ذکر کیے ہیں، جو انھوں نے کتاب اللہ کی بعض آیات سے کیے ہیں۔ یہ استنباطات بہت اچھے ہیں، جن کے دیکھنے سمجھنے سے مردِ فہمیدہ اور عالمِ سنجیدہ کے دل میں کتاب اللہ کی قدر بڑھتی ہے۔

آیاتِ احکام کی تعداد:

امام غزالی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ آیاتِ احکام کی تعداد پانچ سو ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ایک سو پچاس ہے۔ ان کی مراد شاید یہ ہے کہ صریح احکام اسی قدر آیات میں ہیں، ورنہ قصص و امثال وغیرہ کی آیات سے بھی بہت سے احکام کا اثبات ہوتا ہے۔[1] انتہیٰ.

حافظ ابن الوزیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ وہ آیاتِ احکام جن کا علم مجتہد مطلق کے لیے ضروری ہے، وہ ایک سو تینتیس آیات ہیں۔ میں نے ان آیات کی تفسیر عربی میں لکھی ہے، جس کا نام "نيل المرام في تفسير آيات الأحكام" ہے۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلام رحمہ اللہ نے کتاب "الإمام" میں لکھا ہے کہ اللہ نے قرآن میں جو مثالیں بیان کی ہیں، ان کا مقصد وعظ و تذکیر ہے، کیوں کہ ان میں سے بعض مراتبِ ثواب کے تفاوت اور عمل کے ضائع ہو جانے کے بیان یا افعال کے مدح و ذم پر مشتمل ہیں اور یہ سب مثالیں احکام پر دلالت کرتی ہیں۔

نیز لکھا ہے کہ قرآنِ کریم کی اکثر آیات احکام سے خالی نہیں ہیں، بلکہ وہ ابوابِ حسنہ اور اخلاقِ جمیلہ پر مشتمل ہیں۔ کسی آیت سے کوئی حکم صراحتاً نکلتا ہے اور کسی آیت سے بطورِ استنباط، خواہ دوسری آیت سے ملا کر نکالا جائے یا بغیر ملانے کے، جیسے: استمنا بالید (مشت زنی) کی حرمت اس آیت سے مستنبط کی گئی ہے: ﴿ إِلَّا عَلَىٰٓ أَزْوَٰجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَٰنُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ فَمَنِ ٱبْتَغَىٰ وَرَآءَ ذَٰلِكَ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْعَادُونَ ۝ ﴾ [المؤمنون: ٦۔ ٧] "سوائے اپنی بیویوں یا ان (کنیزوں) کے جن کے مالک ہوئے ان کے دائیں ہاتھ، تو بلاشبہ (ان کی بابت) ان پر کوئی ملامت نہیں۔ پھر جو شخص ان کے علاوہ (راستہ) تلاش کرے تو ایسے لوگ ہی حد سے گزرنے والے ہیں۔" نیز کافروں کے نکاح کا صحیح ہونا اس قول سے ثابت کیا گیا ہے: ﴿ وَٱمْرَأَتُهُۥ حَمَّالَةَ ٱلْحَطَبِ ۝ ﴾ [اللھب: ٤] "اور اس کی بیوی بھی جو لکڑیاں ڈھونے والی ہے۔" جنبی کے روزے کا صحیح ہونا اس فرمانِ الٰہی سے: ﴿ فَٱلْـَٰٔنَ بَٰشِرُوهُنَّ وَٱبْتَغُوا۟ مَا كَتَبَ ٱللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا۟ وَٱشْرَبُوا۟ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ ٱلْخَيْطُ ٱلْأَبْيَضُ مِنَ ٱلْخَيْطِ ٱلْأَسْوَدِ مِنَ ٱلْفَجْرِ ﴾ [البقرة: ١٨٧]

[1] الإتقان في علوم القرآن (٢/ ٣٤٠)

''اس لیے اب تم ان سے ہم بستری کر سکتے ہو اور اللہ نے تمھارے لیے جو لکھ رکھا ہے وہ تلاش کرو، اور کھاؤ اور پیو، حتی کہ تمھارے لیے صبح کی سفید دھاری کالی دھاری سے واضح (روشن) ہو جائے۔''

یہ سب مثالیں ایسے استنباط کی ہیں، جن میں کسی اور آیت کے ملانے کی ضرورت نہیں، بلکہ براہِ راست اسی آیت کے الفاظ سے وہ مفہوم واضح ہوتا ہے، جس پر استدلال مقصود ہے۔ باقی رہی ایسے استنباط کی مثال جس میں کوئی اور آیت ملانی پڑتی ہے تو یہ وہ آیت ہے جس سے چھے مہینے کے حمل کا استنباط کیا گیا ہے: ﴿ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ﴾ [الأحقاف: ۱۵] ''اور اس کا حمل اور دودھ چھڑانا تیس ماہ (کی مدت) ہے۔'' اس کے ساتھ اللہ کا یہ قول ملانا پڑتا ہے: ﴿ وَفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ ﴾ [لقمان: ۱۴] ''اور اس کا دودھ دو سال میں چھڑانا ہوتا ہے۔'' اس آیت کے ملانے سے یہ بات پہلی آیت سے نکالی گئی کہ حمل چھے مہینے کا بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ تیس مہینے میں سے دو سالہ مدتِ رضاعت نکال دی جائے تو باقی چھے مہینے ہی رہتے ہیں۔

پھر کبھی صیغے سے کسی حکم پر استدلال کیا جاتا ہے اور کبھی اخبار سے۔ جیسے: ﴿ اُحِلَّ لَكُمْ ﴾ ''حلال کر دیا گیا ہے تمھارے لیے۔'' ﴿ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ ﴾ ''تم پر حرام کر دی گئی تھیں۔'' ﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ﴾ ''تمھارے لیے لکھ دیا گیا ہے۔'' کبھی اس خیر و شر یا نفع و نقصان سے استدلال ہوتا ہے، جو جلدی یا دیر میں مرتب ہوتا ہے، پھر اس کی قسمیں ہیں، جیسے: بندوں کو ترہیب و ترغیب دینا اور اَفہام کے قریب کرنا، چناں چہ جو کام ایسا ہے کہ شارع نے اس کو قابلِ عظمت سمجھا ہے یا اس کی تعریف کی ہے یا اس کے کرنے والے کو اچھا کہا ہے یا اس کو یا اس کے فاعل کو محبوب قرار دیا ہے یا اس سے یا اس کے فاعل سے رضا مندی کا اظہار کیا ہے یا اس کو استقامت یا برکت یا پاکیزگی کے ساتھ موصوف فرمایا ہے یا اس کی یا اس کے فاعل کی قسم کھائی ہے، جیسے: شفع، وتر، مجاہدین کے گھوڑوں اور نفسِ لوّامہ کی قسم کھائی ہے یا اس کو اپنے ذکر و محبت یا ثوابِ عاجل یا آجل یا شکر یا ہدایت یا مغفرتِ گناہ یا تکفیرِ سیئات یا قبول یا نصرتِ فاعل یا بشارت کا سبب ٹھہرایا ہے یا کسی امر کو معروف کہا یا اس کے فاعل سے حزن و خوف کی نفی فرمائی یا اس کو امن کا وعدہ دیا یا اس کو اپنی ولایت و قرب کا سبب کہا یا مدح کی صفت سے اسے یاد کیا، جیسے: حیات یا نور یا شفا یا رحمت، یہ ساری قسمیں ان کی مشروعیت پر دلیل ہیں۔ خواہ وہ واجب ہوں یا مندوب۔[1]

اسی طرح جس کام کا ترک کرنا شارع کو مطلوب ہو، اس کے فاعل کو مذموم کہا ہے یا اس پر عتاب کیا ہے یا اس کو دشمن قرار دیا ہے یا اس پر لعنت کی ہے یا اس سے محبت کی نفی فرمائی ہے یا اس کے فاعل کو چوپایوں یا شیطان کے مشابہ ٹھہرایا ہے یا ہدایت یا قبولیت کا مانع بتایا ہے یا کراہت اور برائی کے ساتھ اسے بیان کیا ہے یا اس کو صلاح و فلاح کی نفی یا عذابِ عاجل یا متاخر کا سبب قرار دیا ہے یا اس کو مذمت و ملامت یا ضلالت و معصیت یا خبث

[1] الإتقان في علوم القرآن (۲/ ۳۴۰۔ ۳۴۲)

یا رجس یا نجس یا فسق یا گناہ یا گناہ کا سبب یا لعنت یا غضب یا زوالِ نعمت یا حدوثِ نقمت کے ساتھ بیان کیا ہے یا اس کو من جملہ حدود کے کوئی حد یا سختی یا رسوائی یا ارتہانِ نفس یا عداوتِ الٰہی یا محاربہ یا استہزا و مذاق یا نسیانِ فاعل کا سبب بتایا ہے یا نفس کو اس کی بابت صبر یا حلم یا درگزر یا معاف کرنے کی تاکید کی ہے یا اس سے توبہ کرنے کی طرف بلایا ہے یا اس کے فاعل کو حقارت یا ذلت کے ساتھ متصف کیا ہے یا اس کو عملِ شیطان کی طرف منسوب کیا ہے یا اسے ابلیس کی تزیین اور اس کی طرف سے گمراہ کرنا کہا ہے یا اس کو کسی مذموم صفت سے موصوف کیا ہے، جیسے: ظلم یا بغی یا عدوان یا مرض، یا انبیا کا اس کام سے یا اس کے فاعل سے بیزار ہونا یا ان کا اللہ کی طرف شکوہ کرنے والا ہونا ذکر کیا ہے یا اس پر غم کرنے سے منع کیا ہے یا اس کے فاعل کو ناکام و نامراد کہا ہے یا اس کا نتیجہ جنت سے محرومی قرار دیا ہے یا اس کے فاعل کو اللہ کا دشمن یا اللہ کو اس کا دشمن ٹھہرایا ہے یا فاعل کو اللہ و رسول سے لڑنے والا یا دوسروں کا گناہ اٹھانے والا کہا ہے یا اس کو "لَا یَنْبَغِيْ"، "لَا یَکُوْنُ" (مناسب نہیں) کے لفظ سے یاد کیا ہے یا "لَیْسَ مِنَ اللّٰہِ فِيْ شَيْئٍ" (اللہ کی طرف سے نہیں) یا "لَیْسَ مِنَ الرَّسُوْلِ وَ أَصْحَابِہٖ" (پیغمبر اور صحابہ کی طرف سے نہیں) فرمایا ہے یا اس کو مسلمانوں کے درمیان بغض و عداوت کے وقوع کا سبب یا عدمِ فلاح کا موجب ٹھہرایا ہے یا اس کے حق میں "فَھَلْ أَنْتَ مُنْتَہٍ" (کیا تم باز نہیں آؤ گے) یا "قَاتَلَہُ اللّٰہُ" (اللہ اُسے ہلاک کرے) اور اس قسم کے الفاظ استعمال کیے ہیں یا اس کے فاعل کی بابت کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کے دن بات کرے گا نہ اس کی طرف دیکھے گا نہ اس کو پاک کرے گا یا اس کے مکر کو چلنے نہ دے گا یا اس پر کوئی شیطان وکیل ہے یا وہ کام دل کی کجی کا سبب ہے۔

یہ تمام قسمیں اعمالِ مذکورہ کی ممانعت کی دلیلیں ہیں اور یہ دلالت کراہت کے مقابلے میں حرمت کے لیے زیادہ واضح ہے (یعنی یہ ممانعت کراہتِ تنزیہی نہیں، بلکہ کراہتِ تحریمی پر دلالت کرتی ہے) رہی بات اباحت (کسی فعل کے جائز ہونے کی) تو وہ "اِحلال" کے لفظ سے یا گناہ، حرج اور اثم و مواخذے کی نفی سے یا اذن سے یا عفو سے یا احسان یاد کروانے سے یا اس کی حرمت بیان کرنے کے بجائے سکوت اختیار کرنے سے یا کسی شے کی حرمت کے انکار کرنے سے یا اس کو "خَلَقَ" یا "جَعَلَ" یا "فِعْلُ مَنْ قَبْلَنَا" کے الفاظ کے ساتھ انکار کے بغیر ذکر کرنے سے ثابت ہوتی ہے۔ پھر ان الفاظ کی یہ دلالت جس سے اشیا کی مشروعیت کا علم ہوتا ہے، وجوباً بھی ہوسکتی ہے اور استحباباً بھی۔ واللّٰہ أعلم. (یعنی مذکورہ الفاظ سے بعض چیزوں کا جواز وجوب کے طور پر اور بعض کا استحباب کے طور پر ثابت ہوتا ہے)

رسول اللہ ﷺ کی عمومی بعثت:

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اپنے رسول بھیجے، وہ اس کی طرف سے خوش خبری سنانے والے اور ڈرانے والے بن کر آئے۔ رسولوں کے بھیجنے کا یہ سلسلہ اللہ تعالیٰ نے اس لیے قائم فرمایا، تاکہ لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی

نہ رہے۔ لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ یا اللہ! ہمیں تو تیرے احکام کا پتا ہی نہیں چلا نہ کسی بتانے والے نے ہمیں کچھ بتایا۔ سب سے آخر میں ہمارے نبی اُمّی، عربی، مطلبی، مکی اور مدنی تشریف لائے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے تمام جن و انس کے لیے قیامت تک رسول ٹھہرایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ ﴾ [الأعراف: ۱۵۸] ''لہٰذا تم اللہ پر اور اس کے رسول اُمی نبی پر ایمان لاؤ۔'' دوسری جگہ فرمایا: ﴿ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ﴾ [الأعراف: ۱۵۸] ''بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔'' تیسری جگہ فرمایا: ﴿ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ﴾ [الأنعام: ۱۹] ''تاکہ اس کے ذریعے سے میں تمھیں اور جس جس کو یہ پہنچے (سب) کو ڈراؤں۔'' لہٰذا جس کو یہ قرآن پہنچ گیا، وہ عربی ہو یا عجمی، کالا ہو یا گورا، انسان ہو یا جن، اس کے لیے یہ کتاب نذیر، یعنی: ڈرانے والی ہے۔ چوتھی جگہ فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ﴾ [هود: ۱۷] ''اور ان گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کا ٹھکانا آگ ہی ہے۔''

معلوم ہوا کہ قرآن کا کافر اور فرقان کا منکر، کوئی بھی ہو، وہ دوزخ میں جائے گا۔ قرآن کا انکار ایک تو یوں ہوتا ہے کہ سرے سے اس کو اللہ کا کلام ہی نہ سمجھے۔ رسول اللہ ﷺ کی بابت پیغمبر اور خاتم الانبیاء ہونے کا عقیدہ نہ رکھے، جیسے: یہود و نصاریٰ وغیرہما کا عقیدہ ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ آپ ﷺ کو پیغمبر تو مانے، مگر کلام اللہ کو مخلوق جانے، یہ بھی کفر ہے، جیسے: معتزلہ کا عقیدہ ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ قرآن اور پیغمبر دونوں پر ایمان لائے، لیکن قرآن کے بعض احکام نہ مانے، جیسے: بعض لوگوں نے سود کی حرمت، فرائض کی تقسیم اور طلاق کی صحت کو ماننے سے انکار کیا۔ یہ بھی صریح کفر ہے۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ قرآن کا اقرار کرے، مگر کسی امام یا عالم یا مجتہد کی بات کو قرآن پر غالب رکھے، یہ بھی درحقیقت قرآن کا انکار ہے، جیسے: مقلدینِ مذاہب کا شیوہ ہے۔ اسی طرح کسی کے قول یا رائے یا قیاس یا اجتہاد کو سنتِ صحیحہ پر مقدم کرنا، گویا رسول اللہ ﷺ کا منکر ہونا ہے۔ جب یہ کام دیدہ و دانستہ کیا جائے تو ایمان باقی نہیں رہتا۔

پانچویں جگہ فرمایا: ﴿ فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [القلم: ٤٤] ''لہٰذا چھوڑ دیجیے مجھے اور اس کو جو اس حدیث (قرآن) کو جھٹلاتا ہے، ہم انھیں آہستہ آہستہ (تباہی کی طرف) لے جائیں گے، اس طرح کہ انھیں علم تک نہ ہوگا۔'' حدیث میں بھی آیا ہے: « بُعِثْتُ إِلَى الْأَحْمَرِ وَالْأَسْوَدِ » ''میں ہر گورے اور کالے کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔''[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد انس و جن ہیں۔ غرض کہ رسول اللہ نبیِ ثقلین (پیغمبرِ جن و انس) ہیں۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن میں ان کو وحی کی

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٢١) مسند أحمد (٣/ ٣٠٤)

ہے، وہ اس کو اللہ کی طرف سے تمام انس و جن کو پہنچانے والے ہیں۔[1] اللہ نے فرمایا: ﴿ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴾ [النساء: ٨٢] ''کیا پھر وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے؟ اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ یقیناً اس میں بہت کچھ اختلاف پاتے۔'' دوسری جگہ فرمایا: ﴿ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْۤا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾ [ص: ٢٩] ''(یہ قرآن) ایک کتاب ہے، ہم نے اسے آپ کی طرف نازل کیا، بڑی برکت والی ہے، تاکہ وہ اس کی آیتوں پر غور کریں اور عقل مند اس سے نصیحت حاصل کریں۔'' تیسری جگہ ہے: ﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴾ [محمد: ٢٤] ''کیا پھر وہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے یا اُن کے دلوں پر تالے (لگے ہوئے) ہیں؟''

قرآن میں تدبر ہر ایک کے لیے ضروری ہے:

معلوم ہوا کہ قرآنِ کریم صرف پڑھنے کے لیے نہیں اتارا گیا، بلکہ اصل مقصد اس کے اتارنے کا یہ ہے کہ اس کا مطلب سمجھا جائے اور پھر اس پر عمل کیا جائے۔ یہ بات ہر ایک کے لیے ضروری ہے، وہ پڑھا لکھا ہو یا اَن پڑھ ہو۔ پڑھے لکھے لوگوں پر اس دلیل سے فرض ہے: ﴿ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ﴾ [آل عمران: ١٨٧] ''اور جب اللہ نے ان لوگوں سے عہد لیا جنھیں کتاب دی گئی تھی کہ تم اسے لوگوں کے سامنے ضرور بیان کرو گے اور اسے ہرگز نہیں چھپاؤ گے۔'' اسی لیے علما نے قرآن کی تفسیریں لکھ کر اپنی اس ذمے داری کو پورا کیا ہے۔ اب کوئی ان کی بات سنے نہ سنے، انھوں نے تو اپنا حق ادا کر دیا، پھر جن لوگوں نے اس عہد کو تھوڑے سے داموں کے عوض بیچ دیا، اللہ نے آخرت میں ان کا کچھ حصہ بھی نہیں رکھا، بلکہ قیامت کے دن ان سے بات بھی نہیں کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا نہ ان کو ان کے گناہوں سے پاک کرے گا، ان کے لیے تو دردناک عذاب ہوگا، جیسے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [آل عمران: ٧٧] ''بے شک جو لوگ اللہ کا عہد اور اپنی قسمیں تھوڑی قیمت کے بدلے بیچ ڈالتے ہیں، ان لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا اور قیامت کے روز اللہ ان سے کلام نہیں کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

اس آیت میں ان کتاب والوں کی مذمت ہے، جو ہم سے پہلے گزرے، انھوں نے اللہ کی کتاب کو، جو اُن پر اتری تھی، چھوڑ دیا اور دنیا جمع کرنے میں لگ گئے۔ کتاب کی پیروی کرنے کے بجائے وہ دوسرے دھندوں میں مصروف ہوگئے (اگر ہم مسلمانوں نے بھی قرآن کے ساتھ یہی معاملہ کیا تو ہم بھی مذکورہ وعید کے مستحق قرار پائیں گے)۔

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٨)

نیز اُن پڑھ پر قرآن میں غور کرنا، اس دلیل سے واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُهُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الۡحَقِّ وَلَا یَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلُ فَطَالَ عَلَیۡهِمُ الۡاَمَدُ فَقَسَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ وَکَثِیۡرٌ مِّنۡهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۱۶﴾ ﴾ [الحدید: ١٦] ''کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل ذکرِ الٰہی کے لیے جھک جائیں اور (اس کے لیے) جو حق (اللہ) کی طرف سے نازل ہوا، اور وہ ان لوگوں کے مانند نہ ہوں، جنھیں اس سے پہلے کتاب دی گئی؟ پھر ان پر مدت لمبی ہوگئی تو ان کے دل سخت ہوگئے اور اُن میں سے بہت سے فاسق ہیں۔''

اللہ کی یاد اور حق سے مراد یہی اللہ کی کتاب ہے۔ جس نے اس کتاب کو پڑھا، اس نے اللہ کو یاد کیا، جس نے اس کو سمجھا، اس نے حق مان لیا اور جو اس کو پڑھتے پڑھتے، سمجھتے سمجھتے تھک کر بیٹھ گیا اور گھبرا گیا کہ اس کو کہاں تک پڑھتا رہوں اور کب تک اس پر عمل کروں تو سمجھو کہ اس کا دل سخت ہوگیا ہے اور وہ فاسق بن گیا ہے۔ ورنہ یہ قرآن تو ایسی چیز ہے کہ ایک مومن جتنا اس کو پڑھے گا، اس کا ایمان اتنا ہی قوی ہوگا اور اس کے عمل کو قبولیت حاصل ہوگی۔ اس آیت کے بعد اللہ نے فرمایا ہے: ﴿ اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ؕ قَدۡ بَیَّنَّا لَکُمُ الۡاٰیٰتِ لَعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۷﴾ ﴾ [الحدید: ١٧] ''تم جان لو کہ بلاشبہ اللہ ہی زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے۔ یقیناً ہم نے تمھارے لیے آیات بیان کیں، تاکہ تم عقل کرو۔''

معلوم ہوا کہ جس طرح زمین مر کر جی اُٹھتی (بنجر ہونے کے بعد دوبارہ آباد ہوجاتی) ہے، اسی طرح جو دل گناہ کرتے کرتے سخت ہو جاتے ہیں، وہ ایمان و ہدایت کے ملنے سے نرم ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کوئی ایمان و ہدایت اس قرآن پاک سے بہتر نہیں ہے، اسی کو ہر مسلمان پڑھتا اور اسی کو ہر مومن سمجھتا رہے۔ اس کتاب میں جتنا کوئی شخص غور کرے گا، اتنے ہی علم و رحمت و برکت کے دروازے اس پر کھلتے رہیں گے اور جتنا کوئی آدمی اس کتاب سے دور بھاگے گا، اتنا ہی اس کا دل سخت اور سیاہ ہوتا جائے گا اور ایمان و ہدایت سے دور جا پڑے گا۔ ﴿ رَبَّنَا لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا بَعۡدَ اِذۡ هَدَیۡتَنَا وَهَبۡ لَنَا مِنۡ لَّدُنۡکَ رَحۡمَةً ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡوَهَّابُ ﴿۸﴾ ﴾ [آل عمران: ٨] ''(وہ دعا کرتے ہیں:) اے ہمارے رب! ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر اور عطا کر ہمیں اپنے پاس سے رحمت، بے شک تو ہی بڑا عطا کرنے والا ہے۔''

تفسیرِ قرآن کا صحیح طریقہ:

قرآنِ کریم کی تفسیر سب سے پہلے قرآن ہی سے کی جائے، کیوں کہ جو بات ایک جگہ قرآن میں مجمل طور پر آئی ہے، وہ دوسری جگہ تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ اس کے بعد حدیثِ رسول کو سامنے رکھا جائے۔ جو تفسیر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، وہ ہر چیز پر مقدم ہے، بلکہ وہی تفسیر ساری اُمت پر حجت ہے، اس کے خلاف ہرگز کچھ کہنا یا کرنا نہیں چاہیے۔

سب پر اسی کی پیروی واجب ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو حکم دیا ہے، وہ قرآن سے سمجھ کر دیا ہے۔[1] اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا ﴾ [النساء: ۱۰۵] ''(اے نبی!) بے شک ہم نے آپ کی طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے، تاکہ آپ کو اللہ نے جو سیدھی راہ دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں اور آپ خیانت کرنے والوں کے حمایتی نہ بنیں۔''

دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَمَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ ۙ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴾ [النحل: ٦٤] ''اور ہم نے آپ پر کتاب صرف اس لیے نازل کی ہے، تاکہ آپ ان پر وہ چیز واضح کر دیں جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور وہ ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔'' معلوم ہوا کہ اس قرآن سے آپس کے اختلاف دور ہو جاتے ہیں۔ جب دو آدمیوں میں کسی عقیدے اور حکم کی بابت جھگڑا ہو تو چاہیے کہ قرآن سے اس کا فیصلہ کریں۔ جو لوگ اس قرآن کو ہدایت و رحمت نہیں مانتے، ان کا ایمان درست نہیں ہے۔

تیسری جگہ اللہ نے فرمایا: ﴿ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴾ [النحل: ٤٤] ''(ہم نے انھیں) واضح دلائل اور کتابوں کے ساتھ (بھیجا تھا) اور ہم نے آپ پر یہ ذکر (قرآن) نازل کیا، تاکہ آپ لوگوں کے سامنے بیان کریں، جو کچھ ان کی طرف نازل کیا گیا، اور شاید کہ وہ غور و فکر کریں۔'' معلوم ہوا قرآن دو کاموں کے لیے نازل ہوا ہے: ایک تلاوت و تذکیر کے لیے اور دوسرا غور و فکر کے لیے، تاکہ اچھی طرح غور و فکر کر کے اس کے مطلب و مفہوم کو سمجھ کر اس کے مطابق عمل کریں۔ یہ بات نہیں ہے کہ صرف ذکر ہی کے لیے اتارا گیا ہو، غور و فکر سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو، بلکہ ذکر اور فکر دونوں شریعت کو مطلوب ہیں۔

حدیث میں آیا ہے: « أَلَا إِنِّي أُوتِيتُ الْقُرْآنَ [الْكِتَابَ] وَمِثْلَهُ مَعَهُ » ''مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ وہ چیز بھی دی گئی ہے، جو اس کی مثل ہے۔''[2] یعنی حجت ہونے میں۔ مثل سے مراد سنتِ رسول اللہ ﷺ ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سنت کا نزول بھی (جسے حدیث بھی کہتے ہیں) وحی سے ہوا ہے، جیسے قرآن وحی کے ذریعے سے نازل ہوا ہے، البتہ ان کے درمیان یہ فرق ہے کہ قرآن کی طرح سنت کی تلاوت نہیں ہوتی۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور دیگر ائمہ نے اس بات پر کثرت کے ساتھ دلائل بیان کیے ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں۔[3]

غرض یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر اگر قرآن میں نہ ملے تو پھر سنتِ مطہرہ میں تلاش کرے، جس طرح سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ

---

[1] الإتقان في علوم القرآن (٢/ ٣٣٠) [2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٤) مسند أحمد (٤/ ١٣٠) اس کی سند صحیح ہے۔
[3] تفسير ابن كثير (١/ ٨)

نے یمن کی طرف روانہ ہونے کے وقت کہا تھا کہ میں قرآن کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ اگر قرآن میں نہیں ملے گا تو سنتِ رسول اللہ ﷺ کے مطابق فیصلہ دوں گا۔ اگر سنت میں بھی نہیں ملے گا تو اجتہاد کروں گا۔ آپ ﷺ نے ان کے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا: اللہ کا شکر ہے کہ اس نے اللہ کے رسول ﷺ کے قاصد کو رسول اللہ ﷺ کی مرضی کے مطابق توفیق دی۔ اس حدیث کی سند جید ہے۔[1]

جب قرآن و حدیث سے کچھ نہ ملے تو پھر تفسیرِ قرآن میں اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مدد لینی چاہیے، اس لیے کہ انھوں نے اس وقت کے احوال و قرائن کا مشاہدہ کیا ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت وہ حاضر و موجود رہتے تھے۔ فہمِ کامل، علمِ صحیح اور عملِ صالح سے بھی وہ بہرہ ور تھے۔ یہ بات بہت بعید ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر کریں اور اسے انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے نہ سنا ہو۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انھوں نے نہیں سنا، تب بھی وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو اہلِ لغت ہیں۔ عربی زبان کے اسرار و رموز، اس کے اسلوب اور محاوروں سے وہ خوب واقف تھے، بالخصوص جو اِن میں بڑے عالم تھے، جیسے: چاروں خلفا، سیدنا عبداللہ بن مسعود اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم وغیرہ۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اللہ کی قسم! قرآن کی جو آیت بھی اتری ہے، مجھے معلوم ہے کہ کس کے حق میں اتری ہے اور کہاں اتری ہے۔ اگر مجھے علم ہو کہ کوئی مجھ سے زیادہ قرآن جانتا ہے تو میں ضرور اس کی خدمت میں حاضری دوں۔[2] پھر فرمایا: ہم میں سے جو کوئی قرآن پاک کی دس آیتیں سیکھ لیتا تھا، وہ جب تک ان کے معنی نہ سمجھ لیتا اور ان پر عمل نہ کر لیتا، آگے نہیں بڑھتا تھا۔[3] یہ مضمون متعدد روایات میں بیان ہوا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو تو خود رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا دی تھی کہ اے اللہ! ان کو دین کی سمجھ دے اور قرآن کے معانی سکھا دے۔[4] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما ترجمان القرآن ہیں۔[5] سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا انتقال ۳۲ رہجری میں ہوا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ان کے بعد ۳۶ سال تک زندہ رہے۔ اس

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۵۹۲) سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۳۲۷) اس کی سند میں انقطاع و ارسال ہے اور ایک راوی حارث بن عمرو مجہول ہے۔ علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی سند پر مفصل بحث کرنے کے بعد اسے ضعیف قرار دیا ہے، نیز کہا ہے کہ اجتہاد اس وقت کرنا جائز ہے، جب کوئی نص نہ ہو۔ اسی طرح سنت کی طرف بھی اس وقت دیکھا جائے گا جب قرآن خاموش ہو۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة: ۲/ ۲۷۳، ۲۸٦) لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سنت (یا حدیث) جب قرآن کے اجمال کی تفصیل، اس کے اطلاق کی تقیید اور اس کے عموم کی تخصیص کرنے والی ہے تو پھر قرآن و سنت کے درمیان اس تفریق کا کوئی جواز نہیں، بلکہ مسئلہ معلوم کرنے کے لیے بیک وقت قرآن اور حدیث دونوں کو دیکھا جائے گا، کیوں کہ دونوں کو ایک ساتھ دیکھنے ہی سے مسئلے کی صحیح نوعیت واضح ہوگی۔ [ص۔ ی]

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧١٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲٤٦۳)

[3] تفسير الطبري (۱/ ۸۰) اس کی سند صحیح ہے۔ [4] مسند أحمد (۱/ ۲٦٦) اس کی سند صحیح ہے۔

[5] مصنف ابن أبي شيبة (٦/ ۳۸۳) مستدرك الحاكم (۳/ ٦۱۸) اس کی سند صحیح ہے۔

مدت میں کیا کچھ علم ان کو حاصل نہ ہوا ہو گا۔ ہاں جو ان دونوں اصحاب نے اہلِ کتاب کی باتیں نقل کی ہیں، وہ استشہاد کے لائق تو ہو سکتی ہیں، لیکن اعتضاد و احتجاج کے لائق نہیں (یعنی بہ طور شواہد کے تو ان سے استدلال جائز ہے، لیکن استدلال کی تمام تر بنیاد انھیں نہیں بنایا جا سکتا)۔

اسرائیلی روایات کی حیثیت:

اسرائیلی روایات تین قسم کی ہیں: ایک وہ جن کی صحت کا ہمیں علم ہے، سو وہ روایات صحیح ہیں۔ دوسری وہ جن کا جھوٹ ہونا ہمیں معلوم ہے اور وہ ہماری ملت و شریعت کے خلاف ہیں۔ تیسری وہ جن کے متعلق ہمارا دین خاموش ہے۔ ان کا بیان کرنا، اگرچہ جائز ہے، لیکن ہمیں ان کی تصدیق کرنی چاہیے نہ تکذیب، لیکن ان کے ذکر کرنے میں اکثر دین کا کوئی فائدہ بھی نہیں، مثلاً: اصحابِ کہف کے نام کیا تھے؟ کتے کا رنگ کیا تھا؟ ان کی تعداد کتنی ہے؟ موسیٰ علیہ السلام کا عصا (لاٹھی) کس درخت کی لکڑی کا تھا؟ ان پرندوں کے نام کیا تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے لیے زندہ کر دیا تھا؟ گائے کا وہ کون سا حصہ تھا، جس کے لگانے سے بنی اسرائیل کا مقتول شخص زندہ ہو گیا تھا؟ جس درخت کے پاس اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے بات چیت کی تھی، وہ کون سا درخت تھا؟

ان چیزوں کو جب اللہ پاک نے قرآن شریف میں مبہم رکھا ہے تو ان کی تعیین یا وضاحت میں دین کا کوئی فائدہ ہے نہ دنیا کا کوئی نفع، البتہ اختلافی بات نقل کرنا ممنوع نہیں ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے بھی اختلافی بات نقل کی ہے:

﴿ سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿٢٢﴾ ﴾

[الکھف: ۲۲] ”عن قریب (کچھ لوگ) کہیں گے: وہ تین ہیں ان کا چوتھا ان کا کتا ہے۔ اور (کچھ دوسرے) کہیں گے: وہ پانچ ہیں، ان کا چھٹا ان کا کتا ہے، بن دیکھے پتھر مارتے ہوئے، اور (کچھ لوگ یہ بھی) کہیں گے: وہ سات ہیں، ان کا آٹھواں ان کا کتا ہے۔ آپ کہہ دیجیے: میرا رب ہی ان کی گنتی سے خوب واقف ہے، بہت تھوڑے لوگ ہی ان (کے حال) کو جانتے ہیں، لہٰذا آپ ان کی بابت بحث نہ کریں، سوائے سرسری بحث کے۔ اور آپ ان کی بابت ان میں سے کسی سے بھی نہ پوچھیں۔“

اس آیت میں اللہ نے تین قول نقل فرمائے ہیں۔ دو کو ضعیف ٹھہرایا ہے، جبکہ تیسرے قول پر سکوت اختیار کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے، شاید یہی قول صحیح ہو، کیوں کہ اگر یہ بھی صحیح نہ ہوتا تو پہلے دو قولوں کی طرح اس کا بھی رد فرما دیتا۔ پھر فرمایا کہ ان کی گنتی پر مطلع ہونے میں کچھ فائدہ نہیں۔ اللہ ہی کو معلوم ہے یا جس کو اللہ نے آگاہ کر دیا ہو۔ آخر میں فرمایا کہ تو اپنی جان کو ایسے کام کے پیچھے مشقت میں مت ڈال، جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ نہ ان سے اس

گنتی کے بارے میں کچھ پوچھ، کیوں کہ گپ لگانے اور بڑ مارنے کے سوا ان کو کچھ بھی معلوم نہیں ہے، وہ جو کچھ کہتے ہیں ﴿ رَجۡمًۢا بِالۡغَيۡبِ ﴾ ''بن دیکھے پتھر مارتے ہوئے۔'' کہتے ہیں۔ اس سے اختلافی بات نقل کرنے کے متعلق یہ ادب یا قاعدہ معلوم ہوا کہ مختلف اقوال جمع کر کے صحیح قول بتلا دیا جائے اور باطل قول کی وضاحت کر دی جائے، جیسے قاضی امام شوکانی رحمہ اللہ کی تفسیر ''فتح القدیر'' اور راقم کی عربی تفسیر ''فتح البیان'' میں کیا گیا ہے۔

اقوالِ تابعین کی حیثیت اور قیاس و رائے سے تفسیر کرنے کی ممانعت:

جب قرآن شریف کی تفسیر قرآن پاک یا سنتِ صحیحہ یا اقوالِ صحابہ میں نہ ملے تو اکثر علما اس بات کے قائل ہیں کہ پھر اقوالِ تابعین کو اختیار کیا جائے، مگر جس شخص کو علم نہیں ہوتا، وہ عباراتِ تابعین کو ایک دوسرے کے مخالف سمجھ کر انھیں چند اقوالِ مختلفہ قرار دے دیتا ہے (اور یوں انھیں نظر انداز کر دیتا ہے) حالانکہ بات اس طرح نہیں ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ کوئی ان میں سے لازم شے سے تفسیر کرتا ہے۔ کوئی کسی شے کی نظیر سے اور کوئی بعینہٖ کسی چیز پر نص بیان کرتا ہے۔ ان سب کے معنی اکثر ایک ہی ہوتے ہیں، اکثر و بیشتر عقل مند اس کو معلوم کر سکتا ہے۔ اہلِ علم کی ایک دوسری جماعت نے کہا ہے کہ جب فروعی مسائل میں تابعین کے اقوال حجت نہیں ہیں تو تفسیر میں کیوں حجت ہیں! حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ بات ٹھیک ہے، لیکن جب یہ سب کے سب کسی بات پر اجماع کر لیں گے تو پھر اس کے حجت ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ اگر اختلاف کریں گے تو ایک کا قول دوسرے پر حجت ہوگا نہ کہ بعد میں آنے والوں پر، بلکہ اس وقت لغتِ قرآن یا سنتِ مطہرہ یا اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم یا عمومِ لغتِ عرب کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ بھی کہا ہے کہ صرف اپنی رائے سے قرآن کی تفسیر کرنا حرام ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت ہے، جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے قرآن میں اپنی رائے یعنی عقل و قیاس سے کچھ کہا یا بغیر علم کے کچھ کہا تو وہ اپنی جگہ آتشِ دوزخ میں مقرر کر لے۔ (ترمذي) امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے حسن کہا ہے۔ نسائی اور ابو داود میں بھی یہ روایت ہے۔[2] ایک دوسری روایت میں ہے کہ جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہا اور ٹھیک کہا، تب بھی وہ چوک گیا اور اس نے خطا کا ارتکاب کیا۔[3] (ترمذي، أبو داود)

معلوم ہوا جب قرآن کی تفسیر کرے تو حتی الامکان پہلے قرآن پاک ہی سے کرے، پھر سنتِ مطہرہ سے، پھر اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے، پھر اجماعِ تابعین رحمہم اللہ سے اور پھر لغتِ عرب سے۔ یہ پانچ مرتبے ہوئے۔ اپنی طرف سے ہرگز

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۱)

[2] سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۹۵۱) سنن النسائي الکبریٰ (۵/ ۳۱) اس روایت کی سند میں عبدالاعلیٰ ضعیف راوی ہے اور جو سنن الترمذی میں روایت ہے، اس میں سفیان بن وکیع بھی ضعیف راوی ہے۔

[3] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۶۵۲) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۹۵۲) اس روایت کی سند میں ''سہیل'' ضعیف راوی ہے۔

کوئی بات نہ کہے، اگرچہ اچھی ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ رائے سے تفسیر کرنے والے کو جہنمی فرمایا گیا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ «مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ» ''جس نے قرآن میں اپنی رائے سے بات کی تو وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنا لے۔''[1] اس میں نیچریوں[2] کے لیے ایک بڑی وعید ہے، جنھوں نے سارے قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کی ہے یا اپنے تدبر سے گھڑی ہے۔ حالاں کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے شخص نے فرمایا تھا کہ اگر میں جانے بوجھے بغیر کوئی بات اللہ کی کتاب میں کہوں گا تو کون سی زمین میرا بوجھ اٹھائے گی اور کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا؟[3] (یعنی اپنی رائے سے قرآن میں دخل دینا، اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے مرتکب کو آسمان اور زمین میں کہیں پناہ نہیں ملے گی)

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد کسی اور شخص کی کیا ہستی ہے، جو قرآن کے معنی اپنے دل سے بیان کرے؟ کسی نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے منبر پر پوچھا تھا کہ ﴿وَفَٰكِهَةً وَأَبًّا ۝٣١﴾ [عبس: ۳۱] کے کیا معنی ہیں؟ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد فرمایا: اے عمر! یہ تو تکلف ہے،[4] یعنی سوچ کر اپنے پاس سے ہرگز معنی بیان نہ کرنا۔ مطلب یہی تھا کہ لفظ ''اَبٌّ'' کی پوری کیفیت کا علم محض اپنی رائے سے حاصل نہیں ہو سکتا، ورنہ یہ بات تو واضح تھی کہ ''اَبٌّ'' ایک قسم کی گھاس ہے، جس کو ہندی میں دوب کہتے ہیں۔ اسی طرح ایک شخص نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ ہزار برس کا دن کیسا ہوگا؟ انھوں نے کہا کہ تم یہ بتاؤ کہ پچاس ہزار برس کا دن کیسا ہوگا؟ اس نے کہا: میں تو آپ سے پوچھ رہا ہوں۔ انھوں نے فرمایا: اللہ نے ان دونوں دنوں کا ذکر اپنی کتاب میں فرمایا ہے، ان کا حقیقی مفہوم اللہ ہی جانے۔[5] مطلب یہ ہے کہ اپنی طرف سے علم کے بغیر قرآن شریف کے معنی بیان کرنا، انھوں نے مکروہ اور ناپسند خیال کیا۔

حاصل یہ ہے کہ سلف صالحین قرآن کی تفسیر بیان کرنے میں بہت احتیاط کرتے اور سخت خوف محسوس کرتے تھے۔

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۹۵۱) اس کی سند میں ضعف ہے، جیسا کہ اوپر گزرا ہے۔

[2] نیچر کے معنی قدرت کے ہیں۔ سر سید اور دیگر ان کے ہم نوا ''عقل پرستوں'' کا نظریہ ہے کہ ہر چیز قانونِ قدرت کے مطابق ہوتی ہے، اس سے ہٹ کر نہیں ہو سکتی۔ جیسے آگ کا کام جلانا ہے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی کو آگ میں ڈالا جائے اور آگ اسے نہ جلائے۔ ہر انسان میاں بیوی کے ملاپ کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص اس قانونِ قدرت کے خلاف پیدا ہو جائے۔ اس لیے یہ حضرات معجزات کو تسلیم نہیں کرتے اور ان کو اسبابِ عادیہ کے مطابق باور کرانے کے لیے عجیب و غریب تاویلیں کرتے ہیں۔ چناں چہ خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام کے لیے آگ کے گلزار ہو جانے کو، عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ کے ولادت کو اور اسی طرح دیگر معجزاتِ انبیا کو یہ نہیں مانتے۔ انھی مسلّماتِ اسلامیہ اور احادیثِ صحیحہ کے منکرین کو ''نیچری'' کہا جاتا ہے۔ فراہی گروہ کے حاملین (غامدی و اصلاحی وغیرہ) بھی انکارِ معجزات، مسلماتِ اسلامیہ سے انحراف اور احادیثِ صحیحہ سے گریز میں بالعموم اسی روش کے راہرو ہیں۔ (ص۔ ي)

[3] تفسير الطبري (۱/ ۷۸) سنن سعيد بن منصور (۱/ ۱۶۸) یہ اثر متعدد اسانید سے مروی ہے اور صحیح ہے۔

[4] مصنف ابن أبي شيبة (۶/ ۱۳۶) مستدرك الحاكم (۲/ ۵۵۹) اس کی سند صحیح ہے۔

[5] تفسير الطبري (۲۳/ ۶۰۲) اس کی سند صحیح ہے۔

قرآن اور اہلِ قرآن کے فضائل ومناقب:

قرآن شریف کے فضائل متعدد احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔ قرآن پڑھنے والا اگر چاہتا ہے کہ اسے قرآن کریم کا پورا اجر ملے تو یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ پہلے سارے قرآن کے معنی سمجھے، کیوں کہ قرآن پڑھنے کا نتیجہ یہی ہے، پھر جو شخص معنی سمجھ لے گا، وہ عمل بھی کرے گا، کیوں کہ معنی سمجھے بغیر عمل نہیں ہو سکتا۔ یہ بات بڑی شرم ناک ہے کہ سارا قرآن تو زبان کی نوک پر حفظ ہو اور رات دن طوطے کی طرح اسے رٹے، مگر اس کے معانی معلوم نہ ہوں۔ حرام کی خبر ہو نہ حلال کی، محکم کی پہچان ہو نہ متشابہ کی، مجمل کی شناخت ہو نہ مفصل کی، ترغیب کو جانے نہ ترہیب کو پہچانے۔ صرف عبارت پڑھنا اور منہ سے لفظوں کو ادا کرنا آتا ہو۔ کیوں کہ جو شخص صرف قرآن کے لفظ یاد کر لیتا ہے، مگر معانی نہیں سمجھتا، وہ بلاشبہہ اس اجرِ عظیم سے محروم ہے، جو احادیث میں آیا ہے۔ ایسا شخص اگرچہ مجرد تلاوت اور نفسِ قراءت کے کسی قدر اجر سے محروم نہ رہے گا، مگر عالم کا اجر یقیناً محض قاری سے دوگنا، سہ گنا، بلکہ سات سو گنا، بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو سکتا ہے، گو علما کے مابین بھی علم وعمل کی وسعت یا قلت (کمی بیشی) کی وجہ سے درجات میں فرق و تفاوت ہو گا، تاہم نرے قاری کے مقابلے میں عالم کا شرف و فضل محتاجِ وضاحت نہیں۔ ع

بقدرِ بحر باشد وسعت آغوشِ ساحل ہا [1]

1. سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے، جو قرآن سیکھے اور دوسروں کو سکھائے۔[2] (صحيح البخاري)

2. سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوع روایت میں مروی ہے، جو شخص قرآن کا ماہر ہے، وہ فرشتوں کے ہمراہ ہو گا۔ وہ فرشتے جو بزرگ و نیک اور انسانی اعمال و احوال کے کاتب ہیں اور جو شخص قرآن کریم اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور یہ پڑھنا اس کے لیے مشکل ہے، اس کو دہرا اجر ملے گا۔[3] (بخاری و مسلم)

اس سے معلوم ہوا کہ معانی کے سمجھے بغیر بھی قرآن پڑھنا اجر سے خالی نہیں ہے، بلکہ جس کی زبان نہیں چلتی، اس کو صاف پڑھنے والے کی بہ نسبت دوگنا ثواب ملے گا۔

3. صحیح مسلم میں سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے، اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے سے بعض قوموں کو بڑھاتا (ترقی دیتا) اور بعض کو گھٹاتا (پستی میں کر دیتا) ہے۔[4] (مسلم) جن کو اللہ بڑھاتا ہے، یہ وہ قومیں ہوتی

---

[1] کناروں کی گود کی وسعت دریا کے بقدر ہوا کرتی ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٣٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٩٨)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨١٧)

ہیں جو قرآن کریم کے معانی سمجھ کر حتی الامکان اس پر عمل کرتی ہیں اور جن کو گھٹاتا ہے، یہ وہ ہیں جو اس پر عمل نہیں کرتیں اور اس کے حلال و حرام کو اہمیت نہیں دیتیں۔

④ سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی الفاظ اس طرح ہیں: تم قرآن پڑھا کرو، یہ قیامت کے دن اپنے ساتھیوں کا سفارشی ہوگا۔[1] (مسلم) قرآن کے ساتھی وہی لوگ ہیں جو قرآن کریم کو پڑھتے پڑھاتے، سیکھتے سکھاتے اور فروغ دیتے رہتے ہیں۔ ان کے رات دن اسی کام میں بسر ہوتے ہیں اور وہ جان و مال سے قرآن کے پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔

⑤ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے اندر قرآن کا کوئی حصہ نہیں ہے، وہ اُجڑے ہوئے گھر کی طرح ہے۔[2] (ترمذي، حسن صحيح)

⑥ سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کہتا ہے: جس شخص کو قرآن نے میرے ذکر اور مجھ سے سوال کرنے سے مشغول رکھا، میں اس کو سوال کرنے والوں سے بھی زیادہ دوں گا، اور اللہ کے کلام کی فضیلت دوسرے سب کلاموں پر ایسے ہے، جیسے اللہ کو تمام مخلوق پر فضیلت حاصل ہے۔[3] (ترمذي، دارمي)

⑦ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع روایت کے الفاظ ہیں: جس نے اللہ کی کتاب کا ایک حرف پڑھا، اس کو ایک نیکی ملے گی اور ہر نیکی کا اجر دس گنا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ "الٓمٓ" ایک حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف اور میم ایک حرف ہے (یعنی یہ تین حرفوں کا مجموعہ ہے)۔[4] (ترمذي و دارمي)

⑧ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع روایت میں ہے: جس نے قرآن مجید حفظ کیا، پھر اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانا تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا اور وہ اپنے ایسے دس گھر والوں کی سفارش کرے گا جن پر دوزخ واجب ہو چکی ہو گی (یعنی بہ طورِ سزا عارضی طور پر انھیں جہنم میں بھیجنے کا فیصلہ ہو چکا ہوگا)۔[5]

(أحمد، ترمذي، ابن ماجه)

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٠٤)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩١٣) اس روایت کی سند میں "قابوس بن ابی ظبیان" کمزور راوی ہے۔

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٢٦) سنن الدارمي (٢/ ٥٣٣) اس روایت کی سند میں "محمد بن الحسن الهمدانی" اور "عطیه العوفی" ضعیف راوی ہیں۔ السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٣٣٥)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩١٠) سنن الدارمي (٢/ ٥٢١) اس کی سند صحیح ہے۔

[5] مسند أحمد (١/ ١٤٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٠٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١٦) اس روایت کی سند میں "حفص بن سلیمان" متروک اور کثیر بن زاذان مجہول راوی ہے۔

⑨ سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع روایت میں ہے: تم قرآن کی نگہبانی کرو، اللہ کی قسم! اونٹ اتنی جلدی اپنے بندھن سے نہیں نکلتا، جتنی تیزی سے یہ قرآن آدمیوں کے سینوں سے نکل بھاگتا ہے۔[1] (بخاري و مسلم)

عام دیکھنے میں آیا ہے کہ جب تک کوئی شخص روزانہ تلاوت کرتا ہے اور اس کی نگہبانی کرتا ہے تو قرآن سے اس کا تعلق قائم رہتا ہے اور جہاں سستی یا غفلت سے دو چار دن اس کی تلاوت چھوڑ دی تو پھر مہینوں تک قرآن پڑھنے کی نوبت نہیں آتی، اسی لیے نگہبانی کا حکم فرمایا گیا ہے۔ حدیث میں امر کے صیغے سے یہ بات کہی گئی ہے، جس سے نگہبانی کرنے کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے۔

⑩ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن کریم پڑھنے والے سے (جنت میں) کہا جائے گا: قرآن پڑھتا جا اور (درجوں پر) چڑھتا جا اور اس طرح آہستہ آہستہ (ترتیل سے) پڑھ، جیسے تو دنیا میں ترتیل سے پڑھتا تھا، تیری جگہ اس آخری آیت کے پاس ہے، جسے تو پڑھے گا۔[2] (احمد اور ابن ماجہ کے سوا اہلِ سنن نے اسے روایت کیا ہے) معلوم ہوا جس شخص کو جتنا قرآن یاد ہو گا، ایک سورت سے لے کر ایک پارے تک اور ایک پارے سے لے کر آخر قرآن تک، اسی حد تک مراتبِ جنت میں اس کی ترقی ہوگی۔ اس حدیث میں اس شخص کے لیے بڑی بشارت ہے، جس کو سارا قرآن یاد ہے۔ جب وہ اس کو بسم اللہ کی با سے، والناس کی سین تک پڑھے گا تو آیاتِ قرآن کی تعداد کے برابر درجات میں ترقی کر جائے گا۔ جَعَلَنَا اللّٰهُ مِنْهُمْ. (اللہ ہمیں بھی ان میں سے کر دے)

قرآنِ کریم کے حروف وکلمات اور آیات کی تعداد:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں چھے ہزار آیتیں ہیں۔ چھے ہزار سے اوپر کتنی ہیں؟ اس میں اہلِ علم کا اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ صرف چھے ہزار ہی ہیں اور کسی نے کہا ہے کہ اس سے دو چار سو آیتیں زیادہ ہیں۔ کسی نے چودہ آیتیں زیادہ بتائیں، کسی نے دو سو انیس بتائیں، کسی نے دو سو پچیس یا چھبیس اور کسی نے دو سو چھتیس ٹھہرائیں۔

رہے کلمات تو امام عطاء بن یسار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن میں ستتر ہزار چار سو انتالیس کلمات ہیں۔ حروف کی تعداد کی بابت امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ تین لاکھ اکیس ہزار ایک سو اسی ہیں اور امام عطاء بن یسار رحمہ اللہ کے نزدیک تین لاکھ تئیس ہزار پندرہ حروف ہیں۔ حجاج بن یوسف نے حافظوں اور قاریوں کو جمع کر کے پوچھا کہ بتاؤ قرآن شریف میں کتنے حرف ہیں؟ سب نے گن کر اس پر اتفاق کیا کہ تین لاکھ چالیس ہزار سات سو چالیس حرف ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٤٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٩١)

[2] مسند أحمد (٢/ ١٩٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٦٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩١٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٢٢) اس کی سند صحیح ہے۔ السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٢٤٠)

حجاج نے یہ بھی پوچھا کہ کس حرف پر قرآن مجید آدھا ہوتا ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ سورۃ الکہف کے لفظ ﴿وَلْيَتَلَطَّفْ﴾ کی فاء پر قرآن کا نصف ہے۔ رہا قرآن کا ثلث اول اور ثانی وغیرہ کا مسئلہ تو اس کی تفصیل تفسیر ابن کثیر میں موجود ہے، مگر سب میں اختلاف منقول ہے۔[1]

بہر حال جب قرآن کے ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں تو تمام حروف کی تعداد کو دس گنا کر کے حساب کرو کہ ایک مرتبہ قرآن ختم کرنے میں کتنی نیکیاں ملیں گی (یہ اکتیس لاکھ سے بھی زیادہ ہوں گی)۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، ورنہ کسی بندے کی یہ طاقت کہاں کہ اتنی نیکیاں تمام عمر میں بھی کر سکے؟ دنیا میں کوئی مکان بھی غالباً سات یا نو یا گیارہ منزل سے زیادہ نہیں ہوتا۔[2] لیکن حافظِ قرآن کو جنت میں چھے ہزار سے بھی زیادہ منزلہ مکان عنایت ہوگا۔ اس نعمت و دولت کا کیا ٹھکانا ہے؟! اگر کسی کو کم ہمتی کی بنا پر حفظِ قرآن کی سعادت حاصل نہیں ہے تو قرآن کے حروف ناظرہ پڑھ کر ہی اجر لینا لازم ہے۔ اگر اس اجر سے بھی محرومی ہوئی تو سمجھو کہ سخت بدنصیبی نے اس کا دامن پکڑ لیا ہے۔ تین دن یا سات دن یا ایک ماہ میں اگر لگاتار قرآن ختم نہیں ہوسکتا تو انسان ایک دو رکوع ہی روزانہ پڑھ لیا کرے اور اس کے ترجمے میں غور کر لیا کرے۔ اس سے اتنا فائدہ تو ہوگا کہ اس کا شمار قرآن پڑھنے والوں میں ہو جائے گا۔ اس کے لیے ہر دن میں قرآن پڑھنا لکھا جائے گا اور جتنے حروف روز پڑھے گا، اس کے عوض فی حرف دس نیکیوں کا مستحق تو ٹھہرے گا۔ و باللہ التوفیق.

---

① تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۳۔ ۱٤)

② نواب صاحب رحمہ اللہ نے یہ بات اپنے دور کے حساب سے تحریر فرمائی ہے۔ اب یہ منزلیں کئی درجنوں تک بلند ہوگئی ہیں، تاہم اب بھی دو چار عمارتوں کو چھوڑ کر کوئی عمارت سو منزل تک بھی نہیں ہوتی۔

تفسیر سورۃ الفاتحہ

سورت فاتحہ کے نام:

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾: اُم القرآن، اُم الکتاب، سبع مثانی (سات بار بار دہرائی جانے والی آیات) اور قرآنِ عظیم ہے۔ ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے۔[1] اس کو فاتحہ اس لیے کہتے ہیں کہ اسی سے قرآن کریم کا آغاز ہوتا ہے اور یہی سورت سب سے پہلے لکھی جاتی ہے۔ نماز کی قراءت بھی اسی سے شروع ہوتی ہے۔ اس کو سورۃ الحمد اور سورۃ الصلاۃ بھی کہتے ہیں۔ صحیح حدیثِ قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: « قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِي وَبَيْنَ عَبْدِي نِصْفَيْنِ » ”میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر دیا ہے۔“[2] نماز سے یہاں مراد یہی سورۃ الفاتحہ ہے۔ اس لیے کہ یہ سورت نماز میں شرط ہے اور اس کے پڑھے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

اس کا ایک نام شفا بھی ہے۔ سنن دارمی میں سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ فاتحۃ الکتاب ہر زہر سے شفا ہے۔[3] دوسری روایت میں اس کو رقیہ (دم) فرمایا ہے۔ ایک صحابی نے سانپ کے ڈسے ہوئے شخص پر اس کو پڑھ کر دم کیا (جس سے وہ صحت یاب ہوگیا) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ تجھے کیسے معلوم ہوا کہ یہ رقیہ، یعنی زہر کا دم ہے؟[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس کو اساس القرآن (قرآن کی بنیاد) اور ”بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ“ کو سورۃ الفاتحہ کی اساس (بنیاد) بتلاتے تھے۔[5]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٢٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٢٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٥)

[3] شعب الإيمان (٢/ ٤٥٠) ہمارے پاس جو سنن الدارمی کا مطبوعہ نسخہ ہے، اس میں یہ روایت نہیں ہے اور امام قرطبی رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو امام دارمی کی طرف منسوب کیا ہے۔ دیکھیں: تفسیر القرطبي (١/ ١١٢) البتہ سیدنا ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ کی یہ روایت شعب الایمان میں بھی مروی ہے۔ دیکھیں: شعب الإيمان (٢/ ٤٥٠) اس روایت کی سند میں سلام الطّویل اور زید العمی ضعیف راوی ہیں۔ تاہم صحیح روایات سے اس کی شفایابی کی صفت کی تائید ہوتی ہے، جیسے اگلی روایت میں مذکور ہے۔

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٠١)

[5] تفسير القرطبي (١/ ١١٣) تفسير ابن كثير (١/ ١٦)

مقامِ نزول:

یہ سورت مکہ میں اُتری تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ دو مرتبہ اتری ہے، ایک بار مکہ میں اور ایک بار مدینہ میں۔ کسی نے کہا ہے کہ آدھی مکہ میں اتری اور آدھی مدینہ میں، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ اکثر علما کا یہی قول ہے اور اسی کو امام بغوی رحمہ اللہ اور امام بیضاوی رحمہ اللہ نے صحیح ٹھہرایا ہے۔[1] سب سورتوں کے نام اور سب سورتوں اور آیتوں کی ترتیب توقیفی ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتانے پر موقوف ہے۔ قرآنِ مجید کے ایک ٹکڑے کو سورت کہتے ہیں۔ کبھی کسی سورت کا ایک ہی نام ہوتا ہے اور کبھی کئی نام، جیسے: سورۃ الفاتحہ کے متعدد نام ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مصاحف میں سورتوں کے نام نہیں لکھے تھے۔ حجاج نے اپنی گورنری کے دور میں سورتوں کے نام درج کیے ہیں۔ سورۃ الفاتحہ میں پچیس کلمات اور ایک سو تیرہ حرف ہیں۔

سورت فاتحہ کی فضیلت:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ابوسعید بن معلیٰ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میں تجھ کو مسجد سے باہر نکلنے سے پہلے قرآن مجید کی ایک بہت بڑی سورت سکھاؤں گا، پھر سورۃ الفاتحہ بتائی اور فرمایا کہ یہی وہ سبع مثانی اور قرآنِ عظیم ہے، جو مجھے عطا کیا گیا ہے۔[2] (بخاري، أحمد، أبو داود، نسائي) سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو چاہتا ہے کہ تجھ کو ایک ایسی سورت سکھاؤں، جو نہ تورات اور انجیل میں اتری نہ زبور و فرقان میں؟ پھر فرمایا کہ وہ سورت یہی سورۃ الفاتحہ ہے۔ امام احمد، نسائی نے اسے روایت کیا اور ترمذی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔[3] مسند احمد کی حدیث میں جو سیدنا عبداللہ بن جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اسے بڑی خیر والی سورت بتلایا گیا ہے۔[4] اس سے معلوم ہوا کہ بعض سورتوں کو بعض سورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ اکثر علما اسی بات کے قائل ہیں، اگرچہ یوں تو اللہ کا سارا کلام ہی فضیلت والا بلکہ نور علی نور ہے۔

سورت فاتحہ کے بغیر نماز ناقص ہے:

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ایسی نماز پڑھی، جس میں سورۃ الفاتحہ نہ پڑھی تو وہ نماز ناقص اور ناتمام رہی۔ کسی نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ یہ بتلائیں کہ ہم امام کے پیچھے ہوتے ہیں (اس وقت کیا کریں؟) تو انھوں نے فرمایا: اپنے جی میں پڑھ، اس لیے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے

---

[1] تفسير البغوي (١/ ٤٩) تفسير البيضاوي (١/ ١٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٠٤) مسند أحمد (٣/ ٤٥٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٥٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٩١٣)

[3] مسند أحمد (٥/ ١١٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٩١٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٧٥) اس کی سند صحیح ہے۔

[4] مسند أحمد (٤/ ١٧٧) اس روایت کی سند میں عبداللہ بن محمد بن عقیل "سيئ الحفظ" ہے اور اس کی حدیث حسن درجے کی ہے اور سند کے باقی راوی ثقہ ہیں۔ مجمع الزوائد (٧/ ١٨)

ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر دیا ہے اور میرے بندے کے لیے وہ ہے جس کا وہ سوال کرے۔

جب بندے نے کہا: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے بندے نے میری حمد کی۔ جب اس نے کہا: ﴿ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے بندے نے میری ثنا کی۔ جب اس نے کہا: ﴿ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی (اور کبھی یوں کہا) میرے بندے نے مجھے سونپ دیا اور جب اس نے کہا: ﴿ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لیے وہ ہے، جو اس نے مانگا۔ جب اس نے کہا: ﴿ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴾ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ میرے بندے کے لیے ہے اور بندے کے لیے وہ ہے جو اس نے مانگا۔ (مسلم، نسائي و ترمذي) سنن نسائی کے الفاظ ہیں کہ آدھی سورت میرے لیے ہے اور آدھی میرے بندے کے لیے، بندے کے لیے وہ ہے جو اس نے سوال کیا۔ امام ابو زرعہ رحمہ اللہ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ بھی اس کے راوی ہیں۔[1]

سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جو سنن سعید بن منصور اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے روایت کی ہے، اس میں اس سورت کو ہر زہر سے شفا کہا ہے[2] اور دارمی و بیہقی کی عبدالملک بن عمیر رحمہ اللہ والی حدیث میں ہر بیماری کی شفا فرمایا ہے۔[3]
سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ناگہاں اوپر سے ایک آواز سنی گئی۔ جبرائیل علیہ السلام نے آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اور کہا کہ یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے، جو آج سے پہلے کبھی نہ کھلا تھا۔ اس دروازے سے ایک فرشتہ اترا ہے اور اس نے کہا ہے کہ آپ کو دو نوروں کی بشارت ہو، جو تمھیں دیے گئے ہیں، وہ آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیے گئے۔ ایک فاتحۃ الکتاب اور دوسرا خواتیم سورۃ البقرہ (سورۃ البقرۃ کی آخری آیات)۔ ان دونوں میں سے تو ایک حرف بھی پڑھے گا تو اس کا نور عطا کیا جائے گا۔[4] (مسلم، نسائي)

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٣٩٥) سنن النسائي، رقم الحدیث (٩٠٩) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٩٥٣) مسند أحمد (٢/ ٢٤١) تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٠)

[2] سنن سعید بن منصور (٢/ ٥٣٥) شعب الإیمان (٢/ ٤٥٠) اس روایت کی سند میں "سلام الطّویل" اور "زید العمی" ضعیف راوی ہیں۔ تاہم صحیح روایات سے اس کی شفایابی کی صفت کی تائید ہوتی ہے۔ دیکھیں: صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢١٥٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٢٠١)

[3] سنن الدارمي (٢/ ٥٣٨) شعب الإیمان (٢/ ٤٥٠) یہ روایت مرسل ہے۔

[4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٠٦) سنن النسائي، رقم الحدیث (٩١٢)

نماز میں سورۃ الفاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے:

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے کہ نماز میں خاص سورۃ الفاتحہ کا پڑھنا ضروری نہیں ہے، بلکہ قرآن سے جس جگہ سے بھی کچھ پڑھ لے تو کافی ہے اور نماز ہو جائے گی، جبکہ باقی تینوں اماموں (امام مالک، شافعی اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ) اور جمہور علما کے نزدیک اس سورت کا پڑھنا ضروری ہے اور اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی، کیوں کہ سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اس شخص کی نماز نہیں، جس نے فاتحہ نہ پڑھی۔[1] (صحیح بخاري و مسلم) نیز سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ نماز کافی نہیں، جس میں ام القرآن نہ پڑھی جائے۔[2] (صحیح ابن خزیمة و ابن حبان) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس باب میں کثرت سے حدیثیں آئی ہیں۔[3] یہی مذہب ظاہر سنت کے موافق ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مقتدی کے لیے بھی (نماز سری ہو یا جہری) فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے، ورنہ اس کی نماز بھی نہ ہوگی۔ اس مسئلے میں اگرچہ دو تین قول ہیں، مگر صحیح قول یہی ہے کہ مقتدی پر بھی فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے۔ اس قول کی دلیلیں بہت صحیح اور واضح ہیں اور جو لوگ واجب نہیں کہتے، ان کی دلیلیں قوی اور غالب نہیں ہیں، بلکہ ضعیف اور خفیف ہیں۔

قراءت سے پہلے تعوذ کی تاکید اور اس کے مسنون الفاظ:

قراءت سے پہلے استعاذہ کرنا (أَعُوذُ بِاللّٰهِ... پڑھنا) جمہور کے نزدیک سنت ہے۔ اس کی دلیل اللہ کا یہ فرمان ہے: ﴿ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴾ [النحل: ۹۸] ''پھر جب آپ قرآن پڑھنے لگیں تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگیں۔'' اس طرح پناہ طلب کرنے میں بندے کی طرف سے اپنے ضعف و عجز کا اقرار اور اس بات کا اظہار ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو نقصان سے بچانے کی قدرت حاصل ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ استعاذہ کے لطائف میں سے ایک یہ بات بھی ہے کہ اس کے کہنے سے منہ پاک ہو جاتا ہے۔ جو لغو اور بے ہودہ بات منہ سے نکلتی ہے، اس سے طہارت حاصل ہو جاتی ہے۔[4] انتہی

مطلق استعاذہ کا حکم قرآن پاک میں صرف تین جگہ آیا ہے: ﴿ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ [الأعراف: ۲۰۰] ''اور اگر آپ کو شیطان کا کوئی وسوسہ اُبھارے تو اللہ کی پناہ مانگیے، بے شک وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔'' دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ۝ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴾ [المؤمنون: ۹۷۔ ۹۸] ''اور آپ کہیں: اے میرے رب! میں

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۷۲۳) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳۹٤)

[2] صحیح ابن خزیمة (۱/ ۲٤۸) صحیح ابن حبان (۵/ ۹۱) اس کی سند صحیح ہے۔

[3] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۰۔ ۲۱) [4] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲٤)

شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ اور اے میرے رب! میں (اس سے بھی) تیری پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس حاضر ہوں۔'' تیسری جگہ پہلی آیت کے مثل ہے، البتہ اس میں ﴿ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ کے بجائے ﴿ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾ ہے۔ (دیکھیں: سورت حم السجدۃ: ۳۶)

اس معنی کی کوئی چوتھی آیت نہیں ہے۔ استعاذہ کے لیے کون سے الفاظ پسندیدہ ہیں؟ اس میں اختلاف ہے، جس کے ذکر کا یہاں کوئی فائدہ نہیں۔ جو لفظ قرآن پاک میں اور حدیث میں آیا ہے، وہ کافی ہے۔ سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو نماز پڑھنے کے لیے اٹھتے تو فرماتے: «أَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ »[1] (رواه أهل السنن)۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت میں مرفوعاً یوں آیا ہے: «أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ »[2] دوسری روایت کے الفاظ ہیں: «اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ »[3] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک ضعیف و منقطع اثر میں: «أَسْتَعِيْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ » بھی مروی ہے۔[4] غرض جس لفظ سے کوئی ''أعوذ'' کہے گا، اسے کفایت کر جائے گا، خواہ بلند آواز سے پڑھے یا آہستہ سے کہے۔

شیطان اور رجیم کے معانی:

''شیطان'' اس کو کہتے ہیں جس کی طبیعت اپنے فسق کی وجہ سے انسانوں کی طبیعت سے دور ہو اور وہ ہر چیز سے بیزار ہو۔ ہر متمرد سرکش کو، وہ جن ہو یا انسان یا کوئی حیوان، شیطان کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ﴾ [الأنعام: ۱۱۲] ''اور اسی طرح ہم نے انسانوں اور جنوں میں سے شیاطین، ہر نبی کے دشمن بنائے، ان میں سے ہر ایک دوسرے کے کان میں چکنی چپڑی باتیں ڈالتا رہتا ہے، تاکہ اسے دھوکے میں رکھے۔'' معلوم ہوا کہ شیطانوں کا کام یہ ہے کہ فریب دینے کے لیے جھوٹی بات بنا کر ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔ مسند احمد میں سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابوذر! تو شیاطینِ انس و جن سے اللہ کی پناہ مانگ۔'' انھوں نے پوچھا: کیا انسانوں میں بھی شیطان ہوتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں۔''[5] ایک دوسری روایت، جو صحیح مسلم میں سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے، اس میں کالے کتے کو شیطان فرمایا ہے۔[6]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (۷۷۵) سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۴۲) اس کی سند صحیح ہے۔

[2] عمل اليوم والليلة (۱/ ۳۰۶) اس کی سند صحیح ہے۔ [3] سنن أبي داود، رقم الحديث (۴۷۸۰)

[4] تفسير الطبري (۱/ ۱۱۷) اس روایت کی سند میں ''بشر بن عمارۃ'' راوی ضعیف ہے۔

[5] مسند أحمد (۵/ ۱۷۸) اس روایت کی سند میں ''عبید بن الخشخاش'' اور ابو عمر دمشقی راوی ضعیف ہیں۔ تاہم قرآنِ کریم سے شیطان اور انسان دونوں سے پناہ مانگنا ثابت ہے۔ [6] صحيح مسلم، رقم الحديث (۵۱۰)

''رجیم'' کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ لوگوں کو اپنی وسوسہ اندازی سے رجم کرتا ہے اور خیالاتِ فاسدہ کے جال میں پھنساتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ خود خیر سے دور کیا ہوا، مردود اور مرجوم ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ ﴾ [الملك: ٥] ''اور انھیں شیطانوں کو مار بھگانے کا ذریعہ بنایا ہے۔'' پھر فرمایا: ﴿ وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا ﴾ [الصافات: ٨۔ ٩] ''اور (ان پر) ہر طرف سے (شہاب) پھینکے جاتے ہیں۔ (انھیں) بھگانے کے لیے۔'' نیز تیسری جگہ فرمایا: ﴿ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ۝ ﴾ [الحجر: ١٨] ''مگر جو چوری چھپے سنے تو چمکتا شہاب (دہکتا شعلہ) اس کا پیچھا کرتا ہے۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس دوسرے معنی کو زیادہ مشہور بتلایا ہے۔ یعنی رجیم یہ مرجوم کے معنی میں ہے، یعنی ستاروں کے ذریعے سے ان شیطانوں کو مارا جاتا ہے، جو چوری چھپے اللہ کی باتیں سننے کے لیے آسمانوں پر جاتے ہیں۔[1]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے ①

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اللہ کی پاک کتاب کو اسی مبارک جملے سے شروع کیا تھا۔ سارے علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ سورۃ النمل کی ایک آیت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک ایک سورت کا دوسری سورت سے الگ ہونا معلوم نہیں ہوتا تھا، جب تک بسم اللہ نہ اُترتی۔[2] (أبو داود و مستدرك حاكم بسند صحيح) اس سے معلوم ہوا کہ بسم اللہ ہر سورت کے آغاز میں ایک مستقل آیت ہے۔ آدمی جب نماز میں یا بہ طور تلاوت قرآن کریم کی کوئی سورت پڑھے تو ضروری ہے کہ پہلے بسم اللہ پڑھے۔ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں بسم اللہ کو سورۃ الفاتحہ کے شروع میں پڑھا ہے اور اس کو فاتحہ کی ایک آیت سمجھا ہے۔[3] (ابن خزيمه، وفيه ضعف)

صحابہ وتابعین کی ایک جماعت کا یہی قول ہے کہ بسم اللہ سورت براءت کے سوا ہر سورت کی ایک آیت ہے۔ امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کی رائے بھی یہی ہے۔ امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہما اللہ بسم اللہ کو کسی سورت کی آیت تسلیم نہیں کرتے، لیکن پہلا قول ہی قوی اور زیادہ صحیح ہے۔ کیوں کہ جب سورۃ الفاتحہ اونچی آواز سے پڑھے تو بسم اللہ بھی اونچی آواز سے پڑھے۔ صحابہ وتابعین کے ایک گروہ اور سلف وخلف کے ائمہ مسلمین کا یہی مذہب ہے۔ خطیب نے کہا ہے کہ چاروں خلفا بسم اللہ کو اونچی آواز سے پڑھتے تھے، مگر یہ روایت غریب ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان صحابہ وتابعین

---

[1] تفسير ابن كثير (١/ ٢٦) [2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٨٨) مستدرك الحاكم (١/ ٣٥٥) اس کی سند صحیح ہے۔
[3] صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٤٨) اس روایت کی سند میں عمر بن ہارون ضعیف راوی ہے۔

کے اسمائے گرامی لکھے ہیں، جو بسم اللہ اونچی آواز سے پڑھتے تھے اور پھر کہا ہے کہ جب بسم اللہ سورۃ الفاتحہ کا حصہ ٹھہری تو اسے اونچی آواز سے پڑھنا بھی چاہیے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھی تو بسم اللہ اونچی آواز سے پڑھی اور نماز پڑھ کر فرمایا کہ میں نماز میں تم سب سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہوں۔ (نسائي، ابن خزيمة، ابن حبان) امام حاکم، امام دارقطنی، خطیب اور امام بیہقی رحمہم اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بسم اللہ اونچی آواز سے پڑھتے تھے۔ اس کو حاکم نے صحیح کہا ہے۔[2] صحیح بخاری میں ہے کہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت کیسی تھی؟ انھوں نے فرمایا کہ آپ کی قراءت کھینچ کھینچ کر ہوتی تھی، پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر بتائی کہ "بسم الله" کو کھینچتے، "الرحمن" کو کھینچتے اور "الرحيم" کو کھینچتے۔[3] سیدہ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الگ الگ قراءت کرتے تھے، یعنی ہر آیت پر وقف کرتے ہوئے، جیسے "بسم الله الرحمن الرحيم" پر ٹھہرتے، "الحمد لله رب العالمين" پر ٹھہرتے، "الرحمن الرحيم" پر ٹھہرتے۔ دارقطنی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔[4] اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ "رحيم" کی میم کو "الحمد" کی الف سے کسی عمل کی وجہ سے ملا کر پڑھنا بتاتے ہیں، وہ غلط کرتے ہیں۔ یہ سنتِ صحیحہ کے خلاف ہے۔ اس طرح ملا کر نہیں پڑھنا چاہیے، بلکہ ہر آیت پر وقف کرنا ضروری ہے، تاکہ سنتِ صحیحہ کے موافق ہو۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ کا یہ مذہب ہے کہ نماز میں بسم اللہ اونچی آواز سے نہ پڑھی جائے، لیکن جو اونچی آواز سے پڑھتا ہے، اس کی نماز بھی ان کے نزدیک صحیح ہے۔[5] یہ بھی غنیمت ہے۔ ولله الحمد۔ فتح البیان میں ہے کہ بسم اللہ کے ترک کی حدیثیں اگرچہ زیادہ صحیح ہیں، لیکن بسم اللہ کا اِثبات زیادہ راجح ہے، کیوں کہ ان کا مخرج بھی صحیح ہے۔ اس لیے اسی کو اختیار کرنا اولیٰ ہے، بالخصوص جب ترک کی تاویل ممکن ہے۔ یہ تاویل اس بات کی مقتضی ہے کہ بسم اللہ ذاتاً بھی ثابت ہے، یعنی قرآن ہونے میں اور وصفاً بھی ثابت ہے، یعنی جس سورت کے شروع میں آئی ہے، اس کے ساتھ اس کو بھی اونچی آواز سے پڑھا جائے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بسم اللہ سورۃ الفاتحہ اور قرآنِ کریم کی ہر سورت کی ایک آیت ہے۔ اس کے آہستہ یا

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٩٠٥) صحيح ابن خزيمة (١/ ٢٥١) صحيح ابن حبان (٥/ ١٠٠) مستدرك الحاكم (١/ ٣٥٧) سنن الدارقطني (١/ ٣٠٥) سنن البيهقي الكبرىٰ (٢/ ٤٦) اس کی سند صحیح ہے۔

[2] مستدرك الحاكم (١/ ٣٢٦) اس روایت کی سند میں "عبداللہ بن عمرو بن حسان" ضعیف راوی ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٥٩)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٠١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٢٧) سنن الدارقطني (١/ ٣١٢) اس کی سند صحیح ہے۔

[5] تفسير ابن كثير (١/ ٢٧، ٢٨)

اونچی آواز سے پڑھنے کا وہی حکم ہے، جو سورۃ الفاتحہ کا ہے۔ جہاں کہیں سورۃ الفاتحہ اونچی آواز سے پڑھے، وہاں بسم اللہ بھی اونچی آواز سے پڑھے اور جہاں فاتحہ آہستہ پڑھے، وہاں اسے بھی آہستہ پڑھے۔ اس ترکیب سے سب روایتیں جمع ہو جاتی ہیں اور اختلاف مٹ جاتا ہے۔[1]

بسم اللہ کی فضیلت اور ثواب:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بسم اللہ کی بابت پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے، اس کے اور اللہ کے اسم اکبر کے درمیان ایسا ہی قرب ہے، جیسے دونوں آنکھوں کی سیاہی اور سفیدی کے درمیان ہے۔[2] (ابن أبي حاتم) یہ روایت دوسری سند سے امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے بھی بیان کی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو یہ بات پسند ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کے اُنیس داروغوں سے بچائے تو وہ "بسم الله الرحمن الرحيم" پڑھے، اس کا ہر حرف ایک داروغہ جہنم سے بچائے گا، اس کو امام قرطبی رحمہ اللہ نے بھی ذکر کیا ہے،[3] نیز ابن عطیہ رحمہ اللہ نے اس کی تائید فرمائی ہے، اس تائید کی دلیل انھوں نے یہ بیان کی ہے کہ ایک آدمی نے «رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ حَمْداً كَثِيراً طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيهِ» کہا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے تیس سے کچھ اوپر فرشتوں کو دیکھا، وہ اس کلمے کو لینے میں جلدی کر رہے ہیں،[4] کیوں کہ اس کلمے کے تیس سے کچھ اوپر حرف ہیں۔[5] انتھی.

علاوہ ازیں یہ ایک ایسی بات ہے، جسے کوئی شخص محض اپنی عقل اور اجتہاد سے نہیں کہہ سکتا۔ سیدنا ابوتمیمہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سواری پر سوار تھے۔ سواری کو ٹھوکر لگی تو انھوں نے کہا: "تَعِسَ الشَّيْطَانُ"، "شیطان ہلاک ہو" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس طرح نہ کہو، اس سے شیطان بڑا ہو جاتا ہے، یعنی مارے خوشی کے پھول جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں نے اس کو اپنی قوت سے پچھاڑ دیا، بلکہ تم بسم اللہ کہو کہ اس سے وہ مکھی کی طرح چھوٹا ہو جاتا ہے۔[6] (مسند أحمد) "عمل اليوم والليلة" میں امام نسائی رحمہ اللہ کے الفاظ مرفوعاً اس طرح ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس طرح نہ کہو، اس سے وہ پھول کر گھر کی طرح بڑا ہو جاتا ہے، لیکن بسم اللہ کہو کہ اس سے وہ دب کر مکھی کی

---

[1] فتح البيان (١/ ٤٠)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٥) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسے کذب اور منکر کہا ہے اور اس کی سند کے ایک نامعلوم راوی سلام بن وہب جندی کو اس کا سزاوار قرار دیا ہے۔ دیکھیں: لسان الميزان (٤/ ١٠٤)

[3] تفسير القرطبي (١/ ٩٢) الدر المنثور (١/ ٢٦)

[4] تفسير القرطبي (١/ ٩٢) تفسير ابن كثير (١/ ٢٨)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٦٦)

[6] مسند أحمد (٥/ ٥٩) اس کی سند صحیح ہے۔

طرح چھوٹا ہو جاتا ہے۔[1] یہ تاثیر بسم اللہ کی برکت ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اسی لیے ہر کام اور ہر بات سے پہلے بسم اللہ کہنا مستحب ہے، جیسے: کتاب کے دیباچے میں، بیت الخلاء میں داخل ہونے کے وقت، وضو کے شروع میں۔ بلکہ بعض علما کے نزدیک وضو سے پہلے بسم اللہ کا کہنا واجب ہے۔ اسی طرح ذبح کے وقت، کھانے کے وقت اور جماع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا مستحب یا واجب ہے۔ اس باب میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔[2]

اللہ کے نام اور لفظِ رحمٰن:

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ اللہ کے ننانوے نام ہیں، جس نے انھیں یاد کر لیا، وہ بہشت میں جائے گا۔[3] (متفق علیه) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ﴾ [الأعراف: ١٨٠] ''اور اللہ ہی کے لیے اچھے اچھے نام ہیں، لہٰذا تم اسے ان (ناموں) سے پکارو۔'' دوسری جگہ فرمایا: ﴿ اُدْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ﴾ [بني إسرائيل: ١١٠] ''(اللہ کو) ''اللہ'' کہہ کر پکارو یا ''رحمٰن'' کہہ کر، تم جس نام سے بھی پکارو تو اسی کے لیے اچھے سے اچھے نام ہیں۔'' بعض محققین نے کہا ہے کہ اللہ کا لفظِ مبارک اسمِ اعظم ہے۔ قرآن میں اللہ کا یہ پاک نام دو ہزار تین سو ساٹھ جگہ آیا ہے۔ رحمٰن کا لفظ اللہ کے سوا کسی اور مخلوق پر نہیں بولا جاتا۔

البتہ اللہ پاک کے بعض صفاتی نام ایسے بھی ہیں، جو اللہ کے سوا دوسروں پر بھی بولے جاتے ہیں، جیسے رؤف اور رحیم ہیں۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی استعمال ہوئے ہیں: ﴿ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [التوبة: ١٢٨] ''وہ تمھارے لیے (بھلائی کا) حریص ہے، مومنوں پر نہایت شفیق، بہت رحم کرنے والا ہے۔'' یا جیسے سمیع و بصیر کے الفاظ ہیں کہ جو انسانوں کے لیے بھی استعمال ہوئے ہیں، جیسے: ﴿ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴾ [الدهر: ٢] ''بے شک ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا، ہم اسے آزمانا چاہتے ہیں، چناں چہ ہم نے اس کو سننے، دیکھنے والا بنا دیا۔'' ان کے برعکس اللہ اور رحمٰن کا لفظ غیر اللہ پر بولنا درست نہیں ہے، لیکن چونکہ بعض کفارِ قریش نے رحمٰن کا اطلاق مسیلمہ کذاب پر کیا تھا، اس لیے امام عطا خراسانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بسم اللہ میں رحمٰن کے بعد رحیم کا لفظ اسی لیے آیا ہے کہ ''الرحمن الرحیم'' کا مجموعی وصف اللہ کے ساتھ خاص ہے، کیوں کہ خالی رحمٰن کا لفظ بعض عرب نے اپنی جہالت اور حماقت وعناد کی وجہ سے غیر اللہ پر بھی بولا ہے، مگر یہ مجموعی وصف کسی دوسرے پر نہیں بولا گیا۔ اس اعتبار سے یہ دو الفاظ سے مرکب وصف مذکورہ بالا وہم کا قاطع ہے۔

---

[1] عمل الیوم واللیلة (١/ ٣٧٣) اس کی سند صحیح ہے۔

[2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٩)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٥٨٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٩٥٧)

رحمٰن اور رحیم کے درمیان فرق:

رحمٰن کے لفظ میں لفظ رحیم کی بہ نسبت زیادہ مبالغہ ہے۔[1] امام ابن جریر رحمہ اللہ کی وضاحت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے گویا اس پر سب کا اتفاق ہے۔ رحمٰن وہ ہے جو سب پر رحم کرے اور رحیم وہ ہے جو خاص مومنوں پر کرم فرمائے یا رحمٰن وہ ہے جو دنیا و آخرت دونوں جگہ رحمت کرے اور رحیم وہ ہے، جو خاص آخرت میں رحم فرمائے۔ لیکن دعاے ماثورہ میں یوں آیا ہے:« رَحْمٰنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَ رَحِيْمَهُمَا »[2] ”اے دنیا و آخرت کے رحمٰن! اور دنیا و آخرت کے رحیم!)۔ اس میں ”الرحمن الرحیم“ دونوں کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی بات زیادہ ٹھیک ہے۔ واللہ أعلم.

امام عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ رحمٰن وہ ہے، جب اس سے مانگو تو دے اور رحیم وہ ہے، جب اس سے نہ مانگو تو وہ خفا ہو جائے۔[3] اس کے لیے اس حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اللہ سے نہیں مانگتا، اللہ اس پر غضب ناک ہوتا ہے۔[4] (ترمذي)

اے اللہ! ہم تجھ سے یہ بھیک مانگتے ہیں کہ تو ہم کو دونوں جہانوں میں عفو و عافیت عطا کر اور تو ہماری جھولی اس دعا کی قبولیت سے بھر دے۔ اَللّٰهُمَّ آمِيْن.

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲﴾

سب تعریف اللہ کے لیے ہے، جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے ②

حمد کی فضیلت و اہمیت:

جب کوئی شخص اپنے اختیار سے کوئی اچھا کام کرتا ہے اور دوسرا شخص اس کی بزرگی کے ارادے سے اس کام کی ثنا و صفت کرتا ہے تو اسے ”حمد“ کہتے ہیں۔ یہ حمد خاص اللہ ہی کی ذات پاک کو لائق ہے، کسی اور کو زیبا نہیں۔ حدیث میں آیا ہے:« اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كُلُّهُ »[5]۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ”اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ“ شکر کا کلمہ ہے۔ جب بندہ یہ کلمہ کہتا ہے تو اللہ فرماتا ہے: میرے بندے نے میرا شکر کیا۔[6] سیدنا حکم بن عمیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تو نے ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ کہا تو اللہ کا شکر ادا کیا۔ اب اللہ تجھ کو زیادہ دے گا۔[7] (ابن جریر)

① تفسير الطبري (١/ ١٣٠) تفسير ابن كثير (١/ ٣٣) ② صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٧١)

③ تفسير القرطبي (١/ ١٠٥) تفسير ابن كثير (١/ ٣٢) ④ سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٧٣) اس کی سند حسن ہے۔

⑤ سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ١٥٦) اس کی سند حسن ہے۔

⑥ تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٦) اس کی سند میں ”علی بن زید بن جدعان“ ضعیف راوی ہے۔

⑦ تفسير الطبري (١/ ١٣٦) اس کی سند میں ”عیسیٰ بن ابراہیم“ اور ”موسیٰ بن ابی حبیب“ سخت ضعیف راوی ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث میں یہ الفاظ مروی ہیں: الحمد للہ شکر کی اساس ہے، جس نے اللہ کی حمد نہیں کی، اس نے اللہ کا شکر ادا نہیں کیا۔[1] (عبدالرزاق، خطابي، حکیم ترمذي و بیهقي) قرآن پاک میں نوح علیہ السلام کو شکر گزار بندہ کہا گیا ہے۔ کیوں کہ وہ اللہ کی بہت حمد کیا کرتے تھے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ سب سے افضل ذکر "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" ہے اور افضل دعا "اَلْحَمْدُ لِلّٰه" ہے۔ اس کو ترمذی نے حسن کہا ہے۔ نیز نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان اور بیہقی نے بھی روایت کیا ہے۔[2] سیدنا ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ ہیں: "اَلْحَمْدُ لِلّٰه" ترازو کو بھر دیتا ہے۔[3] (مسلم، نسائي و أحمد) سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ حمد سے زیادہ کوئی چیز اللہ کو محبوب نہیں ہے۔[4]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ ہر عمدہ کام، جو اللہ کی حمد سے شروع نہیں کیا جاتا، وہ برکت سے محروم ہے۔ اسے اہلِ سنن، ابن حبان اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔[5] صحیح مسلم میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندے سے خوش ہوتا ہے، جو ہر نوالے اور ہر گھونٹ پر اللہ کی حمد کرتا ہے۔[6]

رب کا معنی:

''رب'' کسی چیز کے مالک، مربی، مدبر، مصلح، جابر اور قائم کو کہتے ہیں اور معبود پر بھی ''رب'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ یہ سارے معانی اللہ تعالیٰ کی ذات میں موجود ہیں۔ غیر اللہ کے لیے رب کا استعمال اضافت کے ساتھ ہوتا ہے، جیسے: "رَبُّ الدَّارِ" (گھر کا مالک) وغیرہ۔ اضافت کے بغیر اس کا استعمال صرف اللہ کے لیے ہوتا ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ نام اسمِ اعظم ہے۔

عالَم کا مطلب:

اللہ کے سوا ہر موجود چیز کو ''عالَم'' کہتے ہیں، یعنی اللہ کے سوا جو کچھ موجود ہے، وہ سب عالَم ہے۔ لفظِ عالَم میں ساری مخلوق داخل ہے۔ بعض نے کہا: عالَم علامت سے مشتق ہے۔ یہ مصنوعات گویا صانع کے وجود کی علامت ہیں۔

---

① مصنف عبد الرزاق (١٠/ ٤٢٤) غريب الحديث (١/ ٣٤٥، ٣٤٦) نوادر الأصول (٤/ ٨٨) شعب الإيمان (٤/ ٩٦) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٣٧٢)

② سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٨٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٢٠٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٠٠) صحيح ابن حبان (٣/ ١٢٦) شعب الإيمان (٤/ ٩٠) اس کی سند حسن ہے۔

③ صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٤٣٧) مسند أحمد (٥/ ٣٤٢)

④ شعب الإيمان (٤/ ٨٩) مسند أبي يعلىٰ (٧/ ٢٤٧) صحيح الترغيب (٢/ ١١٣) اس کی سند حسن ہے۔

⑤ سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ١٢٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٩٤) صحيح ابن حبان (١/ ١٧٣) سنن البيهقي الكبرىٰ (٣/ ٢٠٨) اس کی سند میں ''قرہ بن عبدالرحمن'' ضعیف ہے۔

⑥ صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٣٤)

ابن المعتز نے کیا خوب کہا ہے:

فَيَا عَجَبًا كَيْفَ يُعْصَى الْإِلٰهُ أَمْ كَيْفَ يَجْحَدُهُ الْجَاحِدُ
وَفِي كُلِّ شَيْئٍ لَّهُ آيَةٌ تَدُلُّ عَلٰى أَنَّهُ وَاحِدٌ[1]

بعض نے کہا ہے کہ ہر زمانے کے لوگ عالم کہلاتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ عالم سے مراد جن و انس ہیں۔[2] بعض نے اس میں فرشتوں اور شیاطین کو بھی شامل کیا ہے، لیکن پہلی بات زیادہ صحیح ہے۔ کیوں کہ جب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا تھا کہ رب العالمین کون ہے؟ تو موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا تھا: ﴿ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ﴾ [الشعراء: ٢٤] ''وہ آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، ان کا رب ہے۔'' اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ عالم سے الگ ہے اور عالم میں داخل نہیں ہے، اسی لیے قرآن میں آیا ہے کہ رحمٰن عرش پر ہے۔

عالم کی گنتی میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ چودہ ہزار عالم ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ سترہ ہزار۔ کسی نے کہا ہے کہ اٹھارہ ہزار اور کسی نے کہا ہے کہ اسّی ہزار۔ صحیح بات یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو عالموں کی گنتی معلوم نہیں۔ کعب احبار رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ عزوجل کے سوا کوئی شخص عالموں کی تعداد نہیں جانتا۔[3] میں کہتا ہوں کہ قرآنِ مجید میں فرمایا گیا ہے: ﴿ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ﴾ [المدثر: ٣١] ''اور آپ کے رب کے لشکروں کو بس وہی جانتا ہے۔''

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿٣﴾

بہت بخشش کرنے والا بڑا مہربان ③

رحمتِ الٰہی کی وسعت و شمولیت:

رب العالمین کے لفظ میں ایک طرح سے ڈرانے کا مفہوم تھا، اس لیے ﴿ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ مبارک ناموں کو ذکر کر کے تسلیِ خاطر بخشی اور ترہیب کو ترغیب سے ملا دیا۔ علاوہ ازیں بسم اللہ کے بعد ﴿ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾ کے دوبارہ ذکر کرنے سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ سب امور سے زیادہ اللہ پاک کی توجہ اس رحمت کی طرف ہے یا مخلوق کو سب سے زیادہ حاجت اسی رحمت کی پڑتی ہے۔

صحیح مسلم میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اگر مومن اس عقوبت کو جان لے، جو اللہ کے پاس ہے تو کوئی ایک بھی جنت کی طمع نہ کرے اور اگر کافر اس رحمت کو جان لے، جو اللہ کے پاس ہے تو کوئی ایک بھی اس

---

① ''ہائے تعجب! اللہ کی نافرمانی کیسے کی جاتی ہے یا انکار کرنے والے اس کا انکار کیسے کرتے ہیں؟ ہر چیز میں اس کی نشانی ہے، جو دلالت کرتی ہے کہ بے شک وہ اکیلا ہے۔''

② تفسیر الطبري (١/ ١٤٤) اس کی سند صحیح ہے۔ ③ تفسیر البغوي (١/ ٥٣)

کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔[1]

اگر ور دہد یک صلائے کرم عزازیل گوید نصیبے برم

''اگر وہ فیاض بادشاہ سخاوت کی ایک بھی صدا لگائے تو شیطان بولے کہ میرا بھی حصہ دیا جائے۔''

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۴

بدلے کے دن (قیامت) کا مالک ہے ④

انصاف کا دن وہ ہے جس دن ساری مخلوق کا حساب کتاب ہوگا۔ ہر عمل کا، عامل کو بدلہ ملے گا، خواہ وہ نیک ہو یا بد۔ مگر یہ کہ کسی کا گناہ معاف کر دیا جائے۔ قرآن میں اس دن کی تفسیر یوں آئی ہے: ﴿ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝۱۷ ثُمَّ مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝۱۸ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ۝۱۹ ﴾ [الانفطار: ١٧۔ ١٩] ''اور آپ کو کیا خبر کہ روزِ جزا کیا ہے؟ پھر آپ کو کیا خبر کہ روزِ جزا کیا ہے؟ اس دن کوئی شخص کسی کے لیے کچھ بھی اختیار نہ رکھے گا اور اس دن حکم صرف اللہ کا ہوگا۔''

اللہ ہی اکیلا مالک اور حاکم ہے:

اس دن کے مالک و حاکم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا اس دن کسی کا حکم نہیں چلے گا، جیسے دنیا میں لوگ حکم چلاتے تھے۔ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین نے یہی معنی بیان کیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝۱۶ ﴾ [المؤمن: ١٦] ''(اللہ پوچھے گا:) آج کس کی بادشاہی ہے؟ (پھر خود ہی فرمائے گا:) صرف اللہ واحد وقہار کی۔'' کسی کی کیا طاقت ہے کہ اللہ کی اجازت کے بغیر اس دن کوئی بات منہ سے نکال سکے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین کو مٹھی میں پکڑ لے گا اور آسمان کو داہنے ہاتھ میں لپیٹ لے گا، پھر فرمائے گا کہ میں بادشاہ ہوں، زمین کے بادشاہ کہاں ہیں، جو سرکشی اور تکبر کرنے والے تھے؟![2] (بخاري و مسلم)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے صحیحین کی ایک دوسری مرفوع روایت میں ہے کہ اللہ کے نزدیک سب سے بُرا نام شہنشاہ ہے، اللہ کے سوا کوئی مالک نہیں۔[3] دنیا میں جو کسی کو ''ملک'' (بادشاہ) کہا جاتا ہے تو یہ مجازاً ہے۔ یہ مجاز قرآن پاک میں بھی آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ۭ ﴾ [البقرة: ٢٤٧] ''بے شک اللہ نے تمھارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔'' دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَكَانَ وَرَاۗءَهُمْ مَّلِكٌ ﴾ [الكهف: ٧٩] ''جبکہ

---

① صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥٥)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٨٧، ٢٧٨٨)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٤٣)

ان کے آگے ایک بادشاہ تھا۔'' تیسری جگہ ہے: ﴿ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ﴾ [المائدة: ۲۰] ''اور تمھیں بادشاہ بنایا۔'' صحیحین میں آیا ہے: «مَثَلُ الْمُلُوْكِ عَلَى الْأَسِرَّةِ» ''بادشاہوں کی طرح تختوں پر فروکش ہوں گے۔''[1]

زیرِ تفسیر آیت میں بھی ''مَالِكِ'' کے بجائے ''مَلِكِ'' پڑھا گیا ہے۔ اس کی دونوں قراءتیں ثابت ہیں۔ اس دن کی تخصیص سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ اور دنوں کا مالک یا ملک (بادشاہ) نہ ہو، کیوں کہ اس سے پہلے رب العالمین فرما دیا گیا ہے جو دنیا و آخرت دونوں کو شامل ہے۔ اس آیت سے معاد (آخرت) کا ہونا ثابت ہوا، یعنی قیامت قائم ہوگی۔ جو معاد کا منکر ہے، وہ کافر ہے۔ یہ معاد جسمانی ہوگا نہ کہ محض روحانی اور اس دن اعمال کا حساب بھی حقیقی ہوگا نہ کہ خیالی اور مجازی۔

اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ؁

ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں ⑤

اس آیت میں جبر اور قدر دونوں کا اِبطال ہے، جمع کا صیغہ اسی لیے ہے، گویا اس جملے کا کہنے والا سارے عبادت گزاروں اور موحدین کی طرف سے خبر دیتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جماعت سے وابستہ رہنا چاہیے، جماعت سے مراد اہلِ سنت ہیں اور سنت حدیث کو کہتے ہیں۔ (گویا اصلی اہلِ سنت حدیث پر عمل کرنے والے ہیں نہ کہ حدیث کو نظر انداز کرنے والے)۔

عبادت اور استعانت صرف اللہ کے لیے ہے:

عبادت استعانت کا وسیلہ ہے، اس لیے پہلے عبادت کا ذکر کیا، پھر استعانت کا۔ ''إِيَّاكَ'' کے لفظ کو ''نَعْبُدُ وَنَسْتَعِيْنُ'' پر مقدم کیا ہے، جس سے حصر و قصر اور اختصاص مقصود ہے، یعنی عبادت اور استعانت صرف اللہ کے ساتھ خاص ہے۔ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق ہے نہ مدد چاہنے کے۔ جب عبادت کرے تو صرف اللہ کی کرے اور جب کسی کام میں (ماورائے اسباب طریقے سے) مدد مانگے تو اللہ ہی سے مانگے۔

جسے تم مانگتے ہو اولیا سے   وہ کیا ہے جو نہیں ہوتا خدا سے

عبادت کہتے ہیں: انتہا درجے کی عاجزی اور بے چارگی اختیار کرنے کو۔ یہ ذلت و عاجزی اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہونی چاہیے۔ عبودیت (ذلت و عاجزی کا اظہار) عبادت کا ایک ادنیٰ مرتبہ ہے۔

استعانت یہ ہے کہ کسی سے کہا جائے کہ تم ہماری مدد کرو اور ہمارا کام بنا دو۔ سارے دین کی چکی انھی دو اُمور کے گرد گھومتی ہے۔ اس لیے بعض سلف نے کہا ہے کہ سورۃ الفاتحہ سارے قرآن کا راز ہے اور فاتحہ کا راز یہی دو کلمے ہیں،

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩١٢)

کیوں کہ پہلے کلمے میں شرک سے بے زاری ہے اور دوسرے کلمے میں اپنی قوت اور تصرف سے علاحدگی اور اپنے ہر کام کو اللہ عزوجل کے سپرد کرنا ہے۔ یہ بات اور بھی آیات میں بیان ہوئی ہے، جیسے: ﴿ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ﴾ [هود: ١٢٣] ''چناں چہ آپ اسی کی عبادت کریں اور اسی پر توکل کریں۔'' ﴿ قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ﴾ [الملك: ٢٩] ''کہہ دیجیے: وہ رحمان ہے، ہم اس پر ایمان لائے اور اسی پر ہم نے توکل کیا۔'' ﴿ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ﴾ [المزمل: ٩] ''(وہ) مشرق و مغرب کا رب ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا اسی کو کارساز بنا لیجیے۔''

اس سورت کے اول میں اللہ نے اپنی ثنا فرمائی ہے، صفاتِ حسنیٰ کا ذکر کیا ہے اور بندوں کو ارشاد فرمایا ہے کہ تم بھی اسی طرح اس کی ثنا وصفت کیا کرو، اسی لیے جو شخص سورۃ الفاتحہ پڑھنے کی قدرت رکھنے کے باوجود نماز میں یہ سورت نہیں پڑھتا، اس کی نماز صحیح نہیں ہوتی، جیسے بخاری و مسلم میں سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث ہے کہ اس شخص کی نماز نہیں، جس نے سورۃ الفاتحہ نہیں پڑھی۔ [1]

عبادت کی قدر و منزلت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عبادت ایک بڑا مقام ہے۔ بندے کو اس مقام سے شرف حاصل ہوتا ہے، کیوں کہ بندہ جنابِ الٰہی کی طرف منسوب ٹھہرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اشرف مقامات میں لفظِ ''عبد'' سے یاد فرمایا ہے، جیسے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ ﴾ [الكهف: ١] ''ساری حمد اللہ ہی کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی۔'' دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ ﴾ [الجن: ١٩] ''اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا۔'' تیسری جگہ فرمایا: ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا ﴾ [بني إسرائيل: ١] ''پاک ہے وہ (اللہ) جو اپنے بندے کو رات کے ایک حصے میں لے گیا۔''

الغرض نزولِ قرآن کے وقت، دعوت و تبلیغ کے لیے قیام کے وقت اور معراج کے وقت ''عبد'' نام رکھا۔ جب مخالفین کی تکذیب سے دل تنگ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم عبادت کے ساتھ قیام کرو: ﴿ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۝ ﴾ [الحجر: ٩٧۔ ٩٩] ''اور یقیناً ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں، اس سے آپ کا سینہ (دل) تنگ ہوتا ہے۔ آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کریں اور سجدہ گزاروں میں ہو جائیں۔ اور آپ اپنے رب کی عبادت کریں، حتیٰ کہ آپ کے پاس یقین (موت) آ جائے۔'' [2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٤)

[2] تفسير ابن كثير (١/ ٤٠)

عبادت کے متعلق صوفیہ کے ایک شبہے کا ازالہ:

صوفیہ کا یہ کہنا کہ حصولِ ثواب اور دفعِ عقاب کے لیے عبادت کرنا بے فائدہ ہے، بلکہ عبادت صرف اللہ کی ذات کے لیے کرنی چاہیے، جنت وجہنم سے غرض نہ رکھی جائے۔ یہ بات ٹھیک نہیں ہے، کیوں کہ حدیثِ اعرابی میں ہے، جب اس نے کہا کہ مجھے تمھاری اور معاذ کی طرح گنگنانا نہیں آتا، میں تو اللہ سے جنت مانگتا ہوں اور جہنم کی آگ سے پناہ چاہتا ہوں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ﴿حَوْلَهَا نُدَنْدِنُ﴾ ''ہم بھی تو اسی کے گرد گنگناتے ہیں۔''[1] اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا﴾ [السجدة: ١٦] ''وہ اپنے رب کو خوف اور اُمید سے پکارتے ہیں۔'' یعنی وہ دوزخ کے ڈر اور جنت کے لالچ سے عبادت کرتے ہیں۔

اس کلمے کی برکت:

سیدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک لڑائی میں ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، جب دشمن سے مڈبھیڑ ہوئی تو میں نے آپ ﷺ کو ان الفاظ میں دعا کرتے ہوئے سنا: «يَا مٰلِكَ يَوْمِ الدِّيْنِ! اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ» تو میں نے دیکھا کہ لوگ زمین پر گر رہے ہیں اور فرشتے ان کو آگے پیچھے سے مار رہے ہیں۔ امام بغوی اور ماوردی رحمہما اللہ نے اسے ''معرفة الصحابة'' میں، امام طبرانی رحمہ اللہ نے ''المعجم الأوسط'' میں اور ابونعیم الاصبہانی رحمہ اللہ نے ''دلائل النبوة'' میں روایت کیا ہے۔[2]

اسی طرح کا ایک قصہ وہ ہے کہ جب دمشق کے حکمران کا مقابلہ دشمن کے لشکر سے ہوا تو حرب وضرب کے وقت بادشاہ نے کہا: یا خالد بن الولید! (اے خالد بن ولید!) شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ وہاں موجود اور شریک جہاد تھے، انھوں نے فرمایا: تو یہ کیا کہتا ہے، یوں کہو: ''يَا مٰلِكَ يَوْمِ الدِّيْنِ! اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنَ'' چناں چہ اس نے اسی طرح کہا تو اللہ نے فتح بخشی۔[3] اس کو یہ برکت اس کلمۂ توحیدِ عبادت اور تفریدِ (خالص) استعانت[4] سے نصیب ہوئی۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ.

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٩٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٩١٠) اس کی سند صحیح ہے۔ ''حولها'' میں ضمیر جنت اور دوزخ کی طرف راجع ہے، یعنی ہماری بھی عبادت کا مقصد جنت کا حصول اور دوزخ سے بچاؤ ہے۔

[2] معجم الصحابة للبغوي (٢/ ٤٥٨) المعجم الأوسط (٨/ ١٢٣) الدر المنثور (١/ ٣٨) حافظ ہیثمی فرماتے ہیں: ''رواه الطبراني في الأوسط، وفيه عبد السلام بن هاشم، وهو ضعيف'' (مجمع الزوائد: ٥/ ٥٩٢) نیز دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥١٠٥)

[3] تاريخ ابن الوردي (٢/ ٢٧٨)

[4] یعنی ایسے کلمے سے جس میں عبادت کا مستحق بھی صرف ایک اللہ کو قرار دیا ہے اور جس سے مدد طلب کی جا سکتی اور جو مدد کر سکتا ہے، وہ بھی صرف ایک اللہ ہی کی ذات ہے، اس کے علاوہ کوئی بھی مافوق الاسباب طریقے سے کسی کی مدد کرنے پر قادر نہیں ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ﴿۶﴾

ہمیں سیدھی (اور سچی) راہ دکھا ⑥

یعنی ثابت رکھ ہم کو واضح راستے پر یا ہدایت دے ہم کو آیندہ زمانے میں، جیسے تو نے ہمیں ہدایت دی ہے زمانۂ حال میں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى ﴾ [محمد: ١٧] ''اور جن لوگوں نے ہدایت پائی ہے، اللہ نے انھیں ہدایت میں زیادہ کیا۔'' دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ﴾ [العنکبوت: ٦٩] ''اور جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کریں، ہم انھیں اپنی راہیں ضرور دکھاتے ہیں۔''

ہدایت اور صراطِ مستقیم سے مراد:

ہدایت کہتے ہیں: راہ دکھانے، توفیق دینے، مطلب کھولنے، الہام کرنے اور نرمی کے ساتھ راستہ بتانے کو جو مقصود تک پہنچا دے۔ مستقیم کہتے ہیں: برابر سیدھی چیز کو۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تمام مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ صراطِ مستقیم وہ واضح راستہ ہے، جس میں کسی قسم کی ٹیڑھ نہ ہو۔ اس کے یہی معنی لغتِ عرب میں ہیں۔[1] انتہیٰ یہاں سیدھی راہ سے مراد طریقِ حق اور ملتِ اسلام ہے۔ سیدنا نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بھی نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صراط کو اسلام سے تعبیر فرمایا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن صحیح کہا ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے نزدیک صراط سے مراد اللہ کی کتاب ہے۔[3] یعنی ہم کو قرآن پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ کسی نے کہا ہے کہ سنت و جماعت کا طریقہ مراد ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر چلا دے، جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم چلے۔ کسی نے کہا ہے کہ حج کا راستہ مراد ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس کے معنی ہیں کہ ہم کو دینِ حق سمجھا۔[4] کسی نے کہا کہ ہم کو مستحقینِ جنت کا راستہ دکھا۔ پہلا قول اولیٰ (زیادہ واضح) ہے اور اگر سارے ہی معنی مراد لیں، تب بھی کوئی اَمر مانع نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مفسرین سلف و خلف کی عبارتیں صراط کے معانی بیان کرنے میں مختلف ہیں، لیکن سب کا حاصل یہی ایک بات ہے کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت، یعنی کتاب و سنت کا اتباع مراد ہے۔[5] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صراطِ مستقیم وہ راہ ہے جس پر ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑا ہے۔[6]

---

① تفسیر ابن کثیر (١/ ٤١)
② مسند أحمد (٤/ ١٨٢) مستدرك الحاكم (١/ ١٤٤) تفسير ابن كثير (١/ ٤٢)
③ تفسیر الطبري (١/ ١٧٣) اس کی سند صحیح ہے۔
④ تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٣٠) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔
⑤ تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٢)
⑥ المعجم الکبیر (١٠/ ١٩٩) اس کی سند صحیح ہے۔

﴿ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ۬ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۧ﴾

ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام کیا ان کی نہیں جن پر غضب کیا گیا اور نہ گمراہوں کی ⑦

انعام یافتہ کون ہیں؟

اس سے مراد وہ چار قسم کے لوگ ہیں جن کا ذکر اللہ نے سورۃ النساء میں کیا ہے: ﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝ ﴾ [النساء: ٦٩] ''اور جو کوئی اللہ اور رسول کی اطاعت کرے، تو وہ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا، (یعنی) انبیا، صدیقین، شہیدوں اور نیک لوگوں کے ساتھ، اور یہ لوگ اچھے رفیق ہوں گے۔'' البتہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک ان سے مراد موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کے پیروکار ہیں، جو اپنے دینِ حق پر قائم رہے[1] یا اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ اہلِ بیت ہیں، جو صدق و صفا میں ممتاز ہیں یا انبیاء علیہم السلام یا سارے ایمان دار ہیں۔ پہلا قول راجح ہے۔

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سلف صالح کا مقتدی بننا اچھا ہے، لیکن یاد رہے کہ اقتدا اور چیز ہے اور تقلید اور چیز۔ اقتدا کا تو حکم ہے: ﴿ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ﴾ [الأنعام: ۹۰] ''لہٰذا (اے نبی) آپ بھی ان کے طریقے کی پیروی کریں۔'' یعنی جیسے وہ موحد، دینِ دار تھے، اسی طرح کا موحد اور حق پرست تو بھی بن، (جب کہ تقلید اس سے مختلف ہے کہ ہر معاملے میں کسی ایک ہی امام کی رائے پر اندھا دھند اعتماد کرنا اور بلا دلیل اسی کے قول وفتویٰ پر چلنا۔ یہ ایجادِ بندہ ہے، شریعت نے اس کا حکم نہیں دیا ہے)

غضب کے حق دار اور ضلالت میں گرفتار لوگوں سے مراد:

سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ ﴿ اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ﴾ ''جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا'' سے مراد یہود ہیں اور ﴿ اَلضَّآلِّيْنَ ﴾ (بھٹکنے والوں) سے مراد نصاریٰ ہیں۔ (مسند احمد و ترمذی، ترمذی نے اسے حسن کہا ہے)۔[2] اسی طرح ابن مردویہ میں سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں اس کی یہی تفسیر آئی ہے۔[3] یہی قول تمام صحابہ رضی اللہ عنہم و مفسرین رحمہم اللہ کا ہے اور اس میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بدعت کی وجہ سے اللہ ان پر غضب ناک ہوا اور وہ سنت سے بہک گئے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ اس میں سب کافر، عاصی (نافرمان) اور بدعتی شامل ہیں، لیکن ٹھیک بات وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی

---

① تفسير البغوي (١/ ٥٤) ② مسند أحمد (٤/ ٣٧٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٥٣) اس کی سند حسن ہے۔
③ تفسير ابن كثير (١/ ٤٥) الدر المنثور (١/ ٤٢) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ فتح الباري (٨/ ١٥٩)
④ تفسير القرطبي (١/ ١٥٠)

ہے کہ اس سے مراد اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) ہیں، جو غضب و ضلالت (گمراہی) کے حامل ہیں۔ ان کا طریقہ اہلِ ایمان کے طریقے سے الگ ہے۔ اہلِ ایمان کا طریقہ علم حق اور درست عمل پر مشتمل ہے، لیکن یہود نے درست عمل اختیار نہیں کیا اور نصاریٰ علم حق سے محروم رہے۔

اس لیے یہود غصے کے مستحق قرار پائے اور نصاریٰ کے حصے میں بھٹکنا آیا، کیوں کہ جو عالم ہو کر عمل نہیں کرتا، وہ مستحقِ غضب ٹھہرتا ہے۔ اس شخص کے برخلاف جسے سرے سے کچھ علم ہی حاصل نہ ہوا اور وہ جاہل رہا۔ نصاریٰ نے حق دریافت کرنے کا ارادہ کیا تھا، مگر راستہ نہ ملا اور اتباعِ حق ہاتھ نہ لگا، چناں چہ وہ گمراہ ہو کر رہ گئے۔ اگرچہ یہود و نصاریٰ دونوں ہی گمراہ اور مغضوب ہیں، لیکن یہود کا وصفِ خاص یہی غضب ہے، جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ ﴾ [المائدۃ: ٦٠] ''اللہ نے اس پر لعنت کی اور اس پر اپنا غضب نازل کیا۔'' ﴿ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ﴾ [البقرۃ: ٩٠] ''پس وہ غضب در غضب کے ساتھ لوٹے۔'' اور نصاریٰ کا وصفِ خاص ضلالت (گمراہی) ہے، جیسے اللہ کا ارشاد ہے: ﴿ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴾ [المائدۃ: ٧٧] ''جو اس سے پہلے گمراہ ہو چکے ہیں، اور انھوں نے بہت سوں کو گمراہ کیا اور وہ سیدھی راہ سے بہک گئے۔'' معلوم ہوا کہ ''مغضوب علیہم'' اور ''ضالین'' کی یہ تفسیر احادیث و آثار کے علاوہ خود کلام اللہ سے بھی ثابت ہے۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ.

سورت فاتحہ کے آغاز و اختتام کی توجیہ:

سورۃ الفاتحہ کا آغاز حمد سے اور اختتام ذم پر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی طرف توجہ کرنا مطلعِ خیرات اور عنوانِ سعادت ہے، جبکہ اللہ سے منہ پھیرنا، اس کی طاعت و عبادت سے دور رہنا، یہی تمام آفات کی بنیاد اور مخالفت کی اصل ہے، جس کا انجام غضبِ الٰہی اور گمراہی ہوتا ہے۔

سورت فاتحہ میں چار علوم کا تذکرہ ہے:

اس سورت میں چار قسم کے علوم کا ذکر ہوا ہے۔ ایک علمِ اصول (صفاتِ الٰہی کا بیان) ہے۔ ﴿ اَلْحَمْدُ ﴾ سے لے کر ﴿ الرَّحِيْمِ ﴾ تک اسی طرف اشارہ ہے۔ ﴿ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ سے معرفتِ نبوت حاصل ہوتی ہے۔ ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ سے معاد (آخرت) کا اثبات ہوتا ہے۔ دوسرا علم فروع (احکام شرعیہ کا بیان) ہے۔ اس علم میں بڑی چیز عبادت ہے، مالی ہو یا بدنی، سو وہ ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ ﴾ سے ثابت ہوئی۔ تیسرا علم اخلاق ہے، وہ ﴿ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴾ سے ﴿ الْمُسْتَقِيْمَ ﴾ تک پایا جاتا ہے۔ چوتھا علم تاریخ ہے کہ اگلی اُمتوں میں کون نیک بخت ہوا اور کون بد بخت، وہ ﴿ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾ سے آخر تک دریافت ہوتا ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ اور امام رازی رحمہ اللہ نے بہت شرح و بسط سے اس سورت کا علومِ قرآن پر مشتمل ہونا بیان کیا ہے۔ یہاں تک کہ امام رازی رحمہ اللہ نے دس ہزار مسئلے اس سورت سے نکالے ہیں۔

نزولِ قرآن کا مقصد اور سورت فاتحہ کی وسعت و جامعیت:

اہلِ علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن شریف کے اتارنے کا سب سے بڑا مقصد توحید میں اخلاص و یکسوئی پیدا کرنا اور تمام شرکیہ علائق کا خاتمہ کرنا ہے، چاہے کوئی سا بھی علاقہ (تعلق) ہو۔ یہ ایسی واضح بات ہے جس کے لیے اقوال نقل کرنے کی حاجت نہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اسی کام کے لیے بھیجے اور کتابیں اسی غرض سے اتاریں۔ یہ اجمال تفصیل سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ جس کو شک ہو، وہ قرآن کریم میں غور و فکر کرے۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ اس کتاب کا بڑا مقصد یہی ہے۔ اگر قرآن میں غور کرنے سے عاجز ہے تو اسی سورۃ الفاتحہ میں ذرا تدبر کر لے۔ اس کے تیس مقامات سے اخلاصِ توحید کا حکم نکلتا ہے۔ تفسیر فتح البیان (عربی) اور ''الدین الخالص'' (نواب صاحب کی ایک عربی کتاب) میں ان مقامات کو بیان کیا گیا ہے۔[1]

ضاد اور ظا کی قراءت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علما کا صحیح مذہب یہ ہے کہ ''ضاد'' اور ''ظا'' کے درمیان جو (پڑھنے میں) خلل ہو جاتا ہے، وہ معاف ہے، اس لیے کہ ان دونوں کا مخرج ایک دوسرے کے قریب ہے۔ ''ضاد'' اول زبان کی کروٹ اور ڈاڑھوں سے نکلتا ہے، جب کہ ''ظا'' نوکِ زبان اور اوپر والے دو دانتوں سے برآمد ہوتا ہے۔ دونوں حرف اقسامِ مجہورہ رخوہ مطبقہ سے ہیں۔ اس لیے اس آدمی کے لیے کہ جس کو تمیز کی صلاحیت نہیں، ایک حرف کا دوسرے حرف کی جگہ استعمال جائز ہے۔ رہی یہ حدیث کہ «أَنَا أَفْصَحُ مَنْ نَطَقَ بِالضَّادِ» ''ضاد بولنے والوں میں مَیں سب سے زیادہ فصیح ہوں۔'' سو یہ بے اصل ہے۔[2]

سورت فاتحہ کے اہم مباحث کا خلاصہ:

اس سورت کی سات آیات ہیں، اختصار کے باوجود اس میں اللہ کی حمد و تمجید اور ثنا مذکور ہے۔ اسمائے حسنیٰ اور صفاتِ علیا کا بیان ہے، معاد کا ذکر ہے۔ بندوں کو حکم ہے کہ وہ اپنی عاجزی و بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے اللہ سے سوال اور تضرع کریں۔ اخلاصِ عبادت، توحیدِ الوہیت اور توحیدِ ربوبیت کے تقاضوں کو بجا لائیں۔ اللہ کو

---

[1] دیکھیں: فتح البیان (۱/ ٥٦) مجموعہ رسائلِ عقیدہ (۱/ ۲۹۴)

[2] تفسیر ابن کثیر (۱/ ٤٥) اس موضوع حدیث سے غالباً یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ دوسرے لوگ چونکہ ضاد بولنے پر قادر نہیں ہیں، اس لیے وہ ضاد اور ظا میں فرق نہیں کر سکتے، چناں چہ وہ ضاد کو دال کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ نواب صاحب کا مقصد اس کی تردید کرنا اور یہ بتلانا ہے کہ عام آدمی کے لیے ضاد کو ظا اور ظا کو ضاد کی طرح پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بلکہ اس کو دال (د) کی طرح پڑھنے میں حرج ہے۔

شریک ونظیر اور مماثل سے پاک جانیں۔ دینِ قیم اور صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہنے کی دعا مانگیں، تاکہ وہ جنت میں انبیا و صدیقین اور شہدا و صالحین کی رفاقت سے مشرف ہوں۔ اس سورت میں اعمالِ صالحہ کی ترغیب ہے، تاکہ انسان قیامت کے دن ایسے اعمال والوں کے ہمراہ ہو اور اس میں مسالکِ باطلہ سے ترہیب (ڈراوا) ہے، تاکہ ان کا حشر اہلِ باطل کے ساتھ نہ ہو۔

انعام ایک اچھی چیز ہے، اس لیے اس کی نسبت اپنی طرف کی اور غضب و ضلال بری چیز ہے، اس لیے اس کا فاعل ذکر نہیں کیا، اگرچہ دونوں کا فاعل حقیقی اللہ ہی ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ﴾ [الفتح: ٦] ''اور اللہ ان پر ناراض ہوا۔'' ﴿ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴾ [الکهف: ١٧] ''اور جسے وہ گمراہ کر دے تو آپ اس کے لیے ہرگز کوئی راہنما دوست نہیں پائیں گے۔'' ﴿ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ﴾ [الأعراف: ١٨٦] ''جسے اللہ گمراہ کر دے تو اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔'' اس طرح کی اور بھی بہت سی آیات ہیں، جن سے یہ بات بہ خوبی ثابت ہوتی ہے کہ ہدایت دینے اور گمراہ کرنے میں وہ متفرد (یکتا) ہے، نہ کہ جس طرح فرقہ قدریہ کہتا ہے کہ بندے اپنے کام کے مختار ہیں، وہ جو چاہیں سو کریں۔ وہ اپنے اس مطلب کو قرآن کریم کی متشابہ آیات سے ثابت کرنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں اور جن آیتوں سے ان کی صریح تردید ہوتی ہے، ان کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی حال سب گمراہ فرقوں کا ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ جب تم ان لوگوں کو دیکھو، جو قرآن کے متشابہ کی جستجو کرتے ہیں، سو اللہ نے ان کا نام لیا ہے (یعنی انھیں گمراہ قرار دیا ہے) تم ان سے بچو۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ الحمد للہ قرآن میں کسی بدعتی کے لیے صحیح حجت نہیں ہے۔ قرآن تو آیا ہی اس لیے ہے کہ حق کو باطل سے اور ہدایت کو ضلالت سے الگ کر دے، اس میں تناقض و اختلاف کیوں ہونے لگا؟ وہ تو حکیم اور حمید کی طرف سے نازل کردہ ہے۔[2]

اُونچی آواز سے آمین کہنا:

سورۃ الفاتحہ پڑھنے کے بعد آمین کہنا مشروع و مستحب ہے۔ آمین کے معنی ہیں: اے اللہ! ہم سے قبول کر، اس دعا کو ٹھکانے لگا۔ سیدنا وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ کہا تو میں نے سنا کہ آپ نے لمبی (بلند) آواز سے آمین کہی۔ (احمد، ابو داود و ترمذی۔ ترمذی نے اسے حسن کہا ہے) حدیثِ مذکور کے الفاظ «مَدَّ بِهَا صَوْتَهُ» ''اس کے ساتھ اپنی آواز کو کھینچا اور بلند کیا'' ہیں۔ سنن ابو داود کے الفاظ ہیں: «رَفَعَ بِهَا صَوْتَهُ» یعنی آمین اونچی آواز سے کہتے نہ کہ چپکے سے۔[3] دوسری روایت میں مرفوعاً یوں آیا ہے کہ

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٢٧٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٦٥) [2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٦)

[3] مسند أحمد (٤/ ٣١٨) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٩٣٢) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٤٨) اس کی سند صحیح ہے۔

آخر میں «رَبِّ اغْفِرْ لِيْ آمِيْنَ» ''پروردگار! مجھے بخش دے۔'' کہتے۔[1] (طبراني)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ ﴿ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ پڑھتے تو آمین کہتے۔

پہلی صف والے جو قریب ہوتے اسے سنتے۔ (أبو داود) ابن ماجہ کی روایت میں اور اضافہ ہے «فَيَرْتَجُّ بِهَا الْمَسْجِدُ» کہ آمین کی آواز سے مسجد گونج جاتی۔[2] دار قطنی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔[3] صحیح بخاری و مسلم میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ جس کی آمین ملائکہ کی آمین کے موافق ہوگئی تو اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔[4] صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں کہ جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں آمین کہتا ہے اور فرشتے آسمان پر آمین کہتے ہیں تو جس کی آمین ان کے موافق ہو جاتی ہے، اس کے پچھلے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔[5] موافق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وقت یا اجابت (قبولیت) یا اخلاص یکساں ہوں۔

سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ جب امام ﴿ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ کہے تو تم آمین کہو، اللہ تعالیٰ تمھاری دعا ضرور قبول فرمائے گا۔[6] (مسلم) سنن ابن ماجہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی مرفوع حدیث میں ہے کہ یہود نے تم پر کسی چیز کے سبب اتنا حسد نہیں کیا، جتنا حسد ان کو تمھارے آمین اور سلام کہنے پر ہے۔[7]

معلوم ہوا کہ جس کو آمین کا (اونچی آواز سے) کہنا برا لگتا ہے، اس میں ایک طرح کا یہودیت کا شائبہ ہے۔

مسند احمد میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت ان الفاظ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس یہود کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا، انھوں نے ہم پر کسی چیز سے اتنا حسد نہیں کیا، جتنا حسد وہ ہم پر جمعے (کے دن) کی بابت کرتے ہیں کہ اللہ نے ہماری راہنمائی اس طرف فرمائی اور وہ اس سے گمراہ ہوگئے، اسی طرح قبلے کی وجہ سے حسد کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ نے بتلا دیا، لیکن ان کو یہ قبلہ نہیں ملا اور امام کے پیچھے آمین کہنے پر (بھی) وہ حسد کرتے ہیں۔[8]

---

① المعجم الکبیر (۲۲/ ٤٢) امام ذہبی نے اس حدیث کو منکر کہا ہے اور اس کے راوی احمد بن عبدالجبار عطاردی اور ابوبکر نہشلی پر جرح کی ہے۔ (المھذب: ۱/ ٥٠٨)

② سنن أبي داود، رقم الحدیث (٩٣٤) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٨٥٣) اس روایت کی سند میں ''بشر بن رافع'' ضعیف راوی ہے اور ''ابو عبداللہ بن عم ابی ہریرہ'' مجہول ہے۔ البتہ دیگر روایات میں بلند آواز سے آمین کہنا ثابت ہے، جیسا کہ صحیح بخاری (٧٨٠) میں سیدنا عبداللہ بن زبیر اور اُن کے مقتدیوں اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔

③ امام دار قطنی رحمہ اللہ نے جس روایت کی سند کو حسن کہا ہے، وہ روایت یہ ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے، رسول اللہ ﷺ جب سورۃ الفاتحہ مکمل کرتے تو آواز بلند کرتے اور آمین کہتے۔ دیکھیں: سنن الدارقطني (١/ ٣٣٥)

④ صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٤٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤١٠) ⑤ صحيح مسلم، رقم الحديث (٤١٠)

⑥ صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٠٤) ⑦ سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٥٦) اس کی سند صحیح ہے۔

⑧ مسند أحمد (٦/ ١٣٤) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ١٢٤) اس کی سند صحیح ہے۔

مقتدی بھی اونچی آواز سے آمین کہے:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام اگر اونچی آواز سے آمین کہنا بھول جائے تو مقتدی ایک مرتبہ پکار کر آمین کہے اور اگر امام نے آمین اونچی آواز سے کہی ہے تو مقتدی اونچی آواز سے نہ کہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ مقتدی اور امام دونوں اونچی آواز سے آمین کہیں۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اگر مسجد چھوٹی ہو تو مقتدی اونچی آواز سے نہ کہے، تاکہ لوگ امام کی آمین کی آواز سن لیں۔ مسجد بڑی ہو تو اونچی آواز سے کہے، تاکہ مسجد کے تمام اطراف میں آمین کی آواز پہنچ جائے۔[1] انتہیٰ.

اس علت کی کوئی حیثیت نہیں ہے، بلکہ آمین کا اونچی آواز اور آہستہ آواز سے کہنا دونوں طرح ثابت ہے،[1] تاہم آج کل جب کہ بدعت کا زور شور ہے، اونچی آواز سے آمین کہنا، مردہ سنت کو زندہ کرنا ہے (جس کا بڑا اجر ہے) وباللہ التوفیق. لیکن جس جگہ آمین بالجہر سے لڑائی جھگڑے کی نوبت آ جائے تو وہاں پست آواز میں آمین کہنا مصلحت ہے۔[2] واللہ أعلم.

موضحِ قرآن میں ہے کہ یہ سورت اللہ تعالیٰ (صاحب) نے بندوں کی زبان سے فرمائی ہے کہ وہ اس طرح کہا کریں۔ انتہیٰ.

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٧)

[2] امام بخاری فرماتے ہیں کہ آہستہ آمین کہنے والی روایت صحیح نہیں ہے، بلکہ اونچی آواز سے آمین کہنا ہی درست ہے۔ دیکھیں: سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٨)

[2] لڑائی جھگڑے کی نوبت بالعموم اس وقت اور وہاں آتی ہے جب اور جہاں ضرورت سے زیادہ اونچی آواز سے یا اکا کر کے آمین کہی جائے، جب کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ آمین مناسب اونچی آواز سے کہنی چاہیے، جس میں تواضع اور عاجزی کا اظہار ہو، جس کو ''لجاجت'' کہتے ہیں۔ لجاجت کے برعکس دھونس ہے، یعنی دھمکی نما انداز میں قبولیت کی التجا کا اظہار ہے۔ یہ ضرورت سے زیادہ اونچی میں ہوتا ہے۔ اس لیے کہ آمین کے معنی ہیں: ''اِسْتَجِبْ'' (ہماری دعا قبول فرما) اس التجا میں عاجزی مطلوب ہے، نہ کہ دھونس دھاندلی مقصود ہے۔

اسی طرح دوسرے مسلک کی مسجد میں چند افراد کا اکا کر کے ایسا کرنا بھی نامناسب ہے۔ اس میں اجتماعیت یا سازش کا پہلو آ جاتا ہے جو انتشار کا باعث ہے۔ اس کی بھی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

مقصد تو ایک سنت پر عمل کرنا ہے اور ایک ایسے ماحول میں کرنا ہے، جہاں اس کے لیے فضا سازگار نہیں ہے، بلکہ اس میں فقہی جمود کی وجہ سے سنت سے اعراض ہی نہیں، بلکہ اس سے نفرت و کراہت پائی جاتی ہے۔ ایسے ناموافق ماحول میں سنت پر ایسے انداز سے عمل کرنا کہ دیگر احکامِ شرعیہ سے انحراف ہو جائے، ایک ناپسندیدہ عمل ہی قرار پائے گا اور حکمت و موعظتِ حسنہ کے خلاف بھی۔

آج کل الحمد للہ وسائل کی فراوانی کی وجہ سے گھروں میں بالعموم تیز رفتار گاڑیاں (کار یا موٹر سائیکل) موجود ہوتی ہیں۔ اہلِ حدیث مسجد قریب نہ ہو تو ان کے ذریعے سے دور کی مسجد میں جا کر نماز بہ آسانی پڑھی جا سکتی ہے اور پڑھنی چاہیے۔ اس میں ان شاء اللہ اجر و ثواب بھی زیادہ ملے گا اور سنت کے مطابق اعتدالِ ارکان کے ساتھ نماز پڑھنے کا موقع بھی۔ [ص۔ ي]

تفسیر سورۃ البقرہ

یہ سورت کافی عرصے تک مدینے میں اترتی رہی۔ کہتے ہیں سب سے پہلے مدینے میں یہی سورت نازل ہوئی تھی، سوائے اس ایک آیت کے: ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ﴾ [البقرۃ: ۲۸۱] کیوں کہ یہ آیت سارے قرآن کے بعد قربانی کے دن منیٰ میں حجۃ الوداع کے موقعے پر نازل ہوئی۔ اسی طرح آیاتِ ربا کو بھی نزول کے اعتبار سے آخری آیات کہا گیا ہے۔

اس سورت کی فضیلت میں بہت سی حدیثیں صحاح وسنن میں آئی ہیں۔ جن میں سے کچھ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ذکر کی ہیں۔ بعض آیۃ الکرسی کے ساتھ، جب کہ بعض سورت بقرہ کی آخری آیات کے ساتھ خاص ہیں۔ بعض روایات میں اس کی اور سورت آلِ عمران دونوں کی فضیلت کا بیان ہے اور بعض میں صرف سبع طوال (سات بڑی سورتوں) کی فضیلت کا ذکر ہے۔[1] اس سورت میں دوسو چھیاسی یا ستاسی (۲۸۶، ۲۸۷) آیات، چھے ہزار دوسو اکیس (۶۲۲۱) کلمات اور پچیس ہزار پانچ سو (۲۵۵۰۰) حروف ہیں۔ واللّٰہ أعلم.

ابن عربی نے کہا ہے کہ اس میں ایک ہزار اَمر (حکم) اور ایک ہزار نہی (ممنوع کام) اور ایک ہزار خبر ہے۔[2]

خالد بن معدان رحمہ اللہ نے اس سورت کا نام ''فسطاط القرآن'' رکھا تھا۔[3] اس سورت کا حاصل کرنا برکت کا باعث اور ترک کرنا حسرت کا سبب ہے۔ جادوگر اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔[4] وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
الٓمّٓ ﴿١﴾

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے۔

الٓمّٓ ①

حروفِ مقطعات:

محدثین کی ایک جماعت کا قول ہے حروفِ مقطعہ اللہ تعالیٰ کے راز ہیں۔ یہ راز اللہ کی ہر کتاب میں ہوتا ہے۔

---

① تفسیر ابن کثیر (۱/ ۴۸۔ ۵۲) ② أحکام القرآن لابن العربي (۱/ ۱۵) ③ تفسیر القرطبي (۱/ ۱۵۲)

④ صحیح مسلم، رقم الحدیث (۸۰۴).

یہ وہ متشابہ ہے جسے صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ کسی دوسرے کو اس کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ ہمارا کام اس پر ایمان رکھنا ہے۔ اس کے بارے میں گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کا بھی یہی مذہب تھا، جن میں خلفاے اربعہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہ شامل ہیں۔ ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حروف سورتوں کے شروع میں ہیں۔ ہم نہیں جانتے اللہ تعالیٰ کی ان سے کیا مراد ہے؟[1] دوسرے گروہ نے ان حروف کے معانی مقرر کیے ہیں اور طرح طرح کے مطلب بیان کیے ہیں۔ امام رازی رحمہ اللہ نے یہ اقوال ذکر کیے ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ باریک بینی کا مظاہرہ زمخشری معتزلی نے اپنی تفسیر کشاف میں کیا ہے۔[2] امام شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر ''فتح القدیر'' میں اس کی خوب تردید کی ہے۔[3] بڑے افسوس کی بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ان حروف کے معانی کے سلسلے میں کوئی گفتگو نہ فرمائیں اور مطلب ان کا بیان نہ کریں، اگر کہیں بھی تو صرف اتنا کہ ''میں نہیں کہتا ''الٓمٓ'' ایک حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔ ہر حرف پر ایک نیکی ہے اور ہر نیکی کا اجر (کم از کم) دس گنا ہے۔''[4] مگر اُمت نے از خود ہی ان پر ایسا غور و خوض کیا، جس کا دین و دنیا میں وقت ضائع کرنے اور برائی حاصل کرنے کے سوا کوئی فائدہ نہیں۔ اس پر مفصل بحث ہماری عربی تفسیر ''فتح البیان'' میں کی گئی ہے۔[5]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایک جماعت کا قول ہے: سورتوں کے آغاز میں ان حرفوں کا ذکر قرآن کا اعجاز بیان کرنے کے لیے ہے، تاکہ مخلوق جان لے کہ وہ قرآن کا معارضہ (مقابلہ) کرنے سے عاجز ہے، حالاں کہ یہ وہی حروف ہیں، جن کے ساتھ وہ رات دن باہم گفتگو کرتے ہیں، مگر وہ لوگ ان کو قرآن جیسی ترکیب عطا نہیں کر سکتے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے: مبرد رحمہ اللہ اور محققین کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔ اسی کو امام قرطبی رحمہ اللہ نے فراء اور قطرب رحمہما اللہ سے بھی نقل کیا ہے۔[6] اسی کی تائید کشاف میں کی گئی ہے اور یہی ہمارے شیخ امام ابو العباس ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور حافظ مجتہد ابو الحجاج مزی رحمہ اللہ کا موقف ہے۔[7] انتہی

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲

اس کتاب کے اللہ کی کتاب ہونے میں کوئی شک نہیں، پرہیز گاروں کو راہ دکھانے والی ہے ②

کتاب سے مراد:

اس جگہ کتاب سے مراد کتاب اللہ ہے، جس کا نام قرآنِ کریم اور فرقانِ عظیم ہے۔ اس کی تفسیر میں دس اقوال

① تفسير القرطبي (١/ ١٥٤) ② تفسير الكشاف (١/ ٦٣) ③ فتح القدير (١/ ١٠٣)

④ سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩١٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٣٢٧)

⑤ فتح البيان (١/ ٦٥ ـ ٧٣) ⑥ تفسير القرطبي (١/ ١٥٥) ⑦ تفسير ابن كثير (١/ ٥٥)

اور بھی ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ قوی یہی قول ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے آئی ہے اور سراپائے حق وصدق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ الٓمّٓ ﴿١﴾ تَنۡزِيۡلُ الۡكِتٰبِ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ مِنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿٢﴾ ﴾ [السجدة: ١، ٢] ''الٓمّٓ ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ (اس) کتاب کا نزول رب العالمین کی طرف سے ہے۔''

''ریب'' کا معنی:

''ریب'' کے معنی ہیں شک۔ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کا قول ہے کہ مجھے اس معنی میں کسی کا اختلاف معلوم نہیں۔[1] مطلب یہ ہے کہ اس میں کسی طرح کا شک وشبہہ نہ کرو۔ گویا یہ خبر یہاں نہی کے معنی میں ہے۔ ریب کے ایک معنی تہمت کے بھی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ کذب ریبت (تہمت) ہے اور صدق طمانینت (اطمینان) ہے۔[2] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس نفیِ عام کا یہ معنی ہے کہ یہ کتاب کسی طرح بھی شک وشبہہ اور تہمت و بدگمانی کی جگہ نہیں ہے۔ اس کی واضح دلالت، جو اپنی جگہ خود زبردست برہان ہے، اس بات کو چاہتی ہے کہ کسی طرح کا کوئی شک اس میں راہ نہ پائے۔[3]

معلوم ہوا کہ اگرچہ یہ کتاب فی نفسہٖ ہدایت ہے، لیکن اس کا فائدہ خاص طور پر ایمان والوں ہی کو ہوتا ہے، جن کے دلوں میں اللہ کا ڈر ہے، لیکن جو لوگ خوفِ الٰہی سے بے نیاز ہیں، ان کو اس کتاب سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَلَا يَزِيۡدُ الظّٰلِمِيۡنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿٨٢﴾ ﴾ [بني إسرائيل: ٨٢] ''اور ہم قرآن میں سے جو نازل کرتے ہیں وہ مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے، اور وہ ظالموں کو خسارے ہی میں زیادہ کرتا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ قُلۡ هُوَ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ وَالَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ فِيۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرٌ وَّهُوَ عَلَيۡهِمۡ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوۡنَ مِنۡ مَّكَانٍۭ بَعِيۡدٍ ﴿٤٤﴾ ﴾ [حم السجدة: ٤٤] ''کہہ دیجیے: وہ ان کے لیے، جو ایمان لائے، ہدایت اور شفا ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور وہ اُن کے حق میں اندھا پن ہے، یہ لوگ (جو حق بات نہیں سنتے گویا) دور دراز جگہ سے پکارے جا رہے ہوں۔'' نیز فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ مَّوۡعِظَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوۡرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحۡمَةٌ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴾ [يونس: ٥٧] ''اے لوگو! یقیناً تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے نصیحت اور شفا، ان (بیماریوں) کے لیے جو سینوں میں ہیں اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت آ گئی ہے۔''

معلوم ہوا کہ جو لوگ قرآن پاک کو شفا و ہدایت اور رحمت و موعظت نہیں سمجھتے، وہ ایمان سے محروم ہیں۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٤)
[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥١٨) صحيح الترغيب و الترهيب (٣/ ٧١)
[3] تفسير القرطبي (١/ ١٥٩)

جب ایمان نہ ہوا تو وہ متقی بھی نہ ہوئے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے کہا ہے، یہ کتاب اہلِ تقویٰ کے لیے نور ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: متقی وہ مومن ہیں، جو شرک سے بچتے ہیں اور نیکی پر عمل کرتے ہیں۔[1] ایک دوسری روایت میں انھوں نے فرمایا ہے: متقی وہ ہیں، جو ہدایت کو چھوڑنے پر اللہ کی سزا سے ڈرتے ہیں اور قرآن مجید کی تصدیق پر رحمت کی امید رکھتے ہیں۔[2] امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ متقی وہ آدمی ہیں، جو کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ امام اعمش رحمہ اللہ نے بھی اسی کی تائید کی ہے۔ کسی نے کہا: متقی وہ ہیں، جن کا ذکر اس کے بعد آیا ہے، یعنی وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم رکھتے ہیں۔ الآیة. امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ان سب اقسام کو شامل ہے۔[3]

سیدنا عطیہ سعدی رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ ''بندہ اس وقت تک متقی نہیں ہوتا، جب تک ایسی چیزیں بھی نہ چھوڑ دے، جن میں کوئی شرعی ڈر نہیں، تاکہ وہ ڈر والی چیزوں سے بچ جائے۔'' (ترمذي، ابن ماجه) امام شوکانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تقوے کے شرعی معنی یہی ہیں، جو اس حدیث میں آئے ہیں۔ اسی معنی کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس حدیث کو امام احمد، عبد بن حمید، امام بخاری نے تاریخ میں، نیز ابن ابی حاتم اور بیہقی رحمہم اللہ وغیرہ نے بھی روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے حسن غریب بتایا ہے۔[4] اس حدیث کی موجودگی میں تقوے کی اس تعریف کی کوئی ضرورت نہیں، جو لوگوں نے اپنے اپنے طور پر کی ہے۔ گو اس تعریف میں کوئی برائی نہ بھی ہو، لیکن آفتاب کے سامنے مشعل اور چراغ بے کار ہوتے ہیں۔

ہدایت سے کبھی ایمان مراد لیتے ہیں اور دل میں ایمان پیدا کرنا صرف اللہ کا کام ہے۔ اس کے سوا یہ کوئی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو خطاب کر کے فرمایا: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ ﴾ [القصص: ٥٦] ''(اے نبی!) بے شک جسے آپ چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے۔'' نیز فرمایا: ﴿ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ ﴾ [البقرة: ٢٧٢] ''(اے نبی!) لوگوں کو ہدایت دینا آپ کی ذمے داری نہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ﴾ [الأعراف: ١٨٦] ''جسے اللہ گمراہ کر دے تو اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴾ [الكهف: ١٧] ''جسے اللہ ہدایت دے تو وہی ہدایت یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے تو آپ اس کے لیے ہرگز کوئی راہنما دوست نہیں پائیں گے۔''

---

[1] تفسیر الطبري (١/ ٢٣٣) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر الطبري (١/ ٢٣٣) اس کی سند حسن ہے۔ [3] تفسیر الطبري (١/ ٢٣٣، ٢٣٤)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٥١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢١٥) فتح القدير (١/ ١١٠) مسند عبد بن حميد (١/ ١٧٦) التاريخ الكبير (٥/ ١٥٨) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٤، ٣٥) سنن البيهقي الكبرىٰ (٥/ ٣٣٥) اس کی سند میں ''عبداللہ بن یزید'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٦٣٢٠)

کبھی ہدایت سے مراد بیانِ حق ہوتا ہے، یعنی حق کو کھول کر ظاہر کرنا، اس کی طرف راہنمائی کرنا اور اس کا پتا بتانا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ [الشوریٰ: ٥٢] ''اور بلاشبہ آپ سیدھے راستے ہی کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾ [الرعد: ٧] ''(اے نبی!) آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں، اور ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہوتا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى ﴾ [حم السجدة: ١٧] ''اور جو ثمود تھے، تو ہم نے ان کی راہنمائی کی تو انھوں نے ہدایت پر اندھے پن کو پسند کیا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴾ [البلد: ١٠] ''اور ہم نے اسے دونوں راستے سمجھا دیے۔'' زیادہ راجح یہ ہے کہ یہاں نجدین (دو گھاٹیوں) سے مراد خیر اور شر ہیں۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا: تقویٰ کیا چیز ہے؟ انھوں نے جواب دیا: کبھی آپ خار دار کانٹوں والے راستے پر چلے ہیں؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں، سیدنا ابی نے کہا: پھر جس طرح دامن اٹھا کر، الگ تھلگ، ان سے بچتے بچاتے چلتے ہوں گے، بس یہی تقویٰ ہے۔[1] سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ اللہ سے ڈرنے کے بعد مومن نیک بیوی سے زیادہ فائدہ مند کوئی چیز نہیں۔ اگر وہ اس کو کوئی حکم دے تو وہ بجا لائے، اس کی طرف دیکھے تو اسے خوش کر دے، اس پر اگر قسم کھالے تو اسے پورا کر کے سچا کر دے اور اس سے غائب ہو تو اس کے مال اور اپنی عصمت کی حفاظت کر کے اس کی خیر خواہی کرے۔[2] (ابن ماجه) (اس میں مومن کے لیے تقوے کو سب سے بہتر چیز قرار دیا گیا ہے اور دوسرے نمبر پر نیک بیوی کو، کیوں کہ عورت بھی نیک بیوی اسی وقت ثابت ہوگی، جب اس کے اندر تقویٰ (اللہ کا ڈر) ہوگا، ورنہ عورت عمر بھر کا روگ اور وبال بن کر رہے گی)۔

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ

جو لوگ غیب پر ایمان لاتے ہیں

پرہیز گاروں کی صفت ہے کہ وہ غیب کی بات پر ایمان لاتے ہیں۔ ایمان تصدیق کرنے، یعنی دل سے کسی بات کو سچا سمجھنے کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس جگہ ایمان ڈر کے معنی میں ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٨)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٨٥٧) اس روایت کی سند میں ''علی بن یزید'' اور ''عثمان بن ابی العاتکہ'' ضعیف ہیں۔ البتہ اس روایت کے شاہد موجود ہیں، جو کہ صحیح سند سے مروی ہیں۔ دیکھیں: سنن النسائي الکبریٰ (٥/ ٣١٠) مسند أحمد (٢/ ٤٣٢) مستدرك الحاکم (٢/ ١٧٥) نیز ان الفاظ سے ایک حدیث صحیح مسلم میں مروی ہے: « الدنیا متاع و خیر متاع الدنیا المرأة الصالحة » یعنی دنیا کی سب سے قیمتی ترین متاع نیک عورت ہے۔

بہتر یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو قول و اعتقاد (اور عمل میں ایمان بالغیب کے ساتھ موصوف ہیں۔[1] پھر کبھی اللہ کا ڈر بھی ایمان کے معنی میں داخل اور شامل ہو جاتا ہے، یعنی اس ایمان میں، جس کے معنی یہ ہیں کہ عمل سے قول کی تصدیق کرے۔ ایمان کا لفظ ایک ایسا جامع کلمہ ہے جو اللہ، اس کے رسولوں اور اس کی نازل کردہ کتابوں کی تصدیق، اقرار اور عمل کو شامل ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لغت میں ایمان کا لفظ محض تصدیق پر بولا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [التوبة: ٦١] ''وہ اللہ پر یقین رکھتا ہے اور مومنوں (کی باتوں) پر یقین رکھتا ہے۔'' یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے باپ سے کہا تھا: ﴿ وَمَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴾ [يوسف: ١٧] ''اور آپ ہماری بات کا یقین کرنے والے نہیں، اگرچہ ہم سچے ہی ہوں۔'' اسی طرح جب یہ لفظ اعمال کے ہمراہ آتا ہے تو تصدیق کے معنی میں ہوتا ہے، جیسے اللہ کا قول ہے: ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾ [الانشقاق: ٢٥] ''مگر جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے۔'' لیکن جب اس کا استعمال مطلقاً ہوگا تو ایمان شرعی مراد ہوگا، جو اعتقاد، قول اور عمل کا نام ہے۔ اکثر ائمہ کا یہی مذہب ہے، بلکہ امام شافعی و احمد اور ابو عبیدہ رحمہم اللہ وغیرہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ ایمان قول اور عمل ہے، نیز گھٹتا اور بڑھتا ہے۔[2]

اس باب میں بہت سی احادیث اور آثار آئے ہیں، جن کو امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے شرح بخاری کے اوائل میں علاحدہ ذکر کیا ہے۔ جس نے اس جگہ ایمان کی تفسیر خشیت کے ساتھ کی ہے، اس کی دلیل اللہ کا یہ قول ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ ﴾ [الملك: ١٢] ''بے شک جو لوگ اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں۔'' نیز یہ قول بھی دلیل ہے: ﴿ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ ﴾ [قٓ: ٣٣] ''جو رحمٰن سے بن دیکھے ڈر گیا اور وہ رجوع کرنے والا دل لے آیا ہے۔'' یہ خشیت ایمان اور علم کا خلاصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ﴾ [الفاطر: ٢٨] ''بس اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف علما ہی ڈرتے ہیں۔'' دوسری جگہ فرمایا: ﴿ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ﴾ [البينة: ٨] ''یہ (مقام) اس کو ملتا ہے، جو اپنے رب سے ڈر گیا۔'' معلوم ہوا بہشت اہلِ علم ہی کا حصہ ہے۔

رہی یہ بات کہ اس جگہ غیب سے کیا مراد ہے؟ تو کسی نے کہا: اللہ تعالیٰ، فرشتے، کتابیں، رسول، یومِ آخرت، جنت، دوزخ اور اللہ کی ملاقات ہے۔ یہ لوگ اس بات پر ایمان لائے کہ مرنے کے بعد پھر جی اٹھیں گے، سو یہ سب غیب ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ غیب وہ ہے، جو اللہ کی طرف سے آیا۔[3] کسی نے کہا ہے کہ قرآن ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جو شخص اللہ پر ایمان لایا، وہ غیب پر ایمان لایا۔ کسی نے کہا ہے کہ غیب سے مراد

[1] تفسير الطبري (١/ ٢٣٥) [2] تفسير ابن كثير (١/ ٥٩) [3] تفسير الطبري (١/ ٢٣٦) اس کی سند حسن ہے۔

اسلام ہے اور کسی نے کہا ہے کہ قضا و قدر ہے۔ یہ سارے معانی ملتے جلتے ہیں۔ یہ ساری ہی چیزیں ایسی ہیں، جو کسی نے نہیں دیکھیں۔ ان سب پر ایمان لانا واجب ہے۔ ابو جمعہ انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صبح کا کھانا کھایا۔ ہمارے ساتھ ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! بھلا ہم سے بہتر بھی کوئی ہے؟ ہم آپ پر ایمان لائے اور آپ کے ساتھ مل کر جہاد کیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں، ایک قوم تمھارے بعد آئے گی، جو مجھ پر ایمان لائے گی، حالاں کہ انھوں نے مجھے دیکھا نہیں ہے۔[1] (مسند أحمد)

دوسری روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! کوئی قوم ہم سے زیادہ اجر کی مستحق ہوگی؟ ہم اللہ پر ایمان لائے، ہم نے آپ کی پیروی کی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم کو اس بات سے کون منع کرتا ہے، اللہ کا رسول تمھارے اندر موجود ہے، ہر دم آسمان سے وحی آتی رہتی ہے؟ ہاں تمھارے بعد لوگ ہوں گے، ان کو ایک کتاب دو لوحوں کے درمیان ملے گی، وہ اس کی تصدیق کریں گے اور جو کچھ اس کتاب میں ہے اس پر عمل کریں گے، ان کا اجر تمھارے اجر سے دو چند بڑا ہے۔[2] (ابن مردويه) اس جگہ کتاب سے مراد یہی قرآن کریم ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وجادت[3] پر عمل کرنا جائز ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "فتح الباری" میں وضاحت کی ہے کہ صحابہ کی فضیلت کے برابر کوئی چیز نہیں ہو سکتی، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، صرف اجر کے زیادہ ہونے سے غیر صحابی کا صحابی سے افضل ہونا لازم نہیں آتا، اجر میں کمی بیشی عمل کے اعتبار سے ہوتی ہے، (اور بعض دفعہ حالات و واقعات اور خاص جذبات کی وجہ سے اور اللہ کے خصوصی فضل و کرم سے بھی اس کا امکان ہے) لیکن مشاہدۂ رسول ایک ایسا عمل ہے، جو بعد والوں کو میسر نہیں۔[4]

عمرو بن شعیب عن أبيه عن جده کی روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ مجھے ایمان میں سب سے زیادہ وہ لوگ پسند ہیں، جو تمھارے بعد ہوں گے۔ ان کو صحیفے ملیں گے، جن میں کتاب ہوگی، وہ اس پر ایمان لائیں گے، جو ان صحیفوں میں ہوگا۔ (ابن عرفہ) امام ابو حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سند میں ایک راوی مغیرہ بن قیس "منکر الحدیث" ہے،[5] لیکن اسی کے لگ بھگ ابو یعلی، ابن مردویہ اور حاکم رحمہم اللہ نے بھی محمد بن ابی حمید رحمہ اللہ کی حدیث

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١٠٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ نے کہا کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔ مجمع الزوائد (١٠/ ٥٢)

[2] المعجم الكبير (٤/ ٢٣) تفسير ابن كثير (١/ ٦٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٣١٠)

[3] وجادۃ: اصولِ حدیث کی ایک اصطلاح ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ شاگرد کا استاذ کے ہاتھ سے لکھی ہوئی حدیث کا دیکھنا۔ اسے آگے بیان کرنے کے لیے استاذ کی اجازت ضروری ہے، تاہم شاگرد کے لیے اس پر عمل کرنا جائز ہے۔ [ص-ي]

[4] فتح الباري (٧/ ٧)

[5] دلائل النبوة للبيهقي (٦/ ٥٣٨) تفسير ابن كثير (١/ ٦٠-٦١)

روایت کی ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔[1]

ان احادیث میں کتاب و سنت کے پیروکاروں کے لیے خوش خبری ہے کہ انھوں نے اگرچہ رسول اللہ ﷺ کو نہیں دیکھا، صرف قرآن کو پایا، اس پر ایمان لائے اور اس پر عمل کیا ہے۔

لغت میں غیب ہر اس چیز کو کہتے ہیں، جو انسان سے غائب اور پوشیدہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ غیب سے مراد دل ہے، یعنی سچے دل سے اس کتاب کی تصدیق کرتے ہیں اور کسی نے کہا ہے کہ جس چیز کی خبر رسول اللہ ﷺ نے دی ہے اور وہ عقل سے دریافت نہیں ہو سکتی، جیسے: علاماتِ قیامت، عذابِ قبر، حشر و نشر، صراط، میزان، جنت اور دوزخ، وہ سب غیب ہے۔ حدیثِ جبریل علیہ السلام میں اسی کو ایمانِ شرعی بتلایا گیا ہے۔ فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تو اللہ کی، اس کے فرشتوں کی، کتابوں اور رسولوں کی اور آخرت کے دن کی تصدیق کرے اور تقدیر پر، وہ خیر ہو یا شر، ایمان لائے۔[2]

نویلہ بنت مسلم رضی اللہ عنہا کی حدیث میں تحویلِ قبلہ کے ذکر میں یوں آیا ہے کہ جب ان کو یہ خبر ملی کہ رسول اللہ ﷺ نے قبلے کی طرف منہ کر لیا ہے تو وہ بھی نماز کے اندر ہی اس طرف پھر گئے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ بات سنی تو فرمایا: «أُولَئِكَ قَوْمٌ آمَنُوا بِالْغَيْبِ» ”یہ وہ لوگ ہیں، جو غیب پر ایمان لائے۔“[3] (ابن أبي حاتم، طبراني، ابن منده و أبو نعيم) عوف بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کاش! میں اپنے بھائیوں کو دیکھتا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی: کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں؟ فرمایا: ہاں ہو، لیکن تمھارے بعد ایسے لوگ آئیں گے، جو مجھ پر تمھاری طرح ایمان لائیں گے، تمھاری طرح میری تصدیق کریں گے اور تمھارے مدد کرنے کی طرح میری مدد کریں گے۔ کاش! میں اپنے ان بھائیوں سے ملاقات کرتا۔[4] (ابن أبي شيبة)

اس حدیث کا مصداقِ کامل اہلِ حدیث ہیں۔ ان کو رسول اللہ ﷺ نے اپنا بھائی کہا ہے اور ان کی یہ پہچان بتائی ہے کہ وہ ایمان و تصدیق اور نصرتِ نبوی میں صحابہ کی مثل ہوں گے، سو یہ وصف سوائے اہلِ حدیث کے کسی اور کے اندر نظر نہیں آتا، کیوں کہ صرف اہلِ حدیث ہی اس طریقے پر قائم ہیں، جس پر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ قائم تھے۔

---

[1] مستدرك الحاكم (٤/ ٩٦) مسند أبي يعلىٰ (١/ ١٤٧) اس روایت کی سند میں ”محمد بن ابی حمید“ ضعیف راوی ہے۔ تاہم مذکورہ بالا دو صحیح روایات سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٧) المعجم الكبير (٢٥/ ٤٣) معرفة الصحابة لأبي نعيم (٧٢٢٠) حافظ ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رواه الطبراني في الكبير، وفيه إسحاق بن إدريس الأسواري، وهو ضعيف متروك“ (مجمع الزوائد: ٢/ ١٢١) البتہ دورانِ نماز میں تحویلِ قبلہ یہی حدیث نویلہ بنت مسلم سے بسند حسن مروی ہے۔ دیکھیں: المعجم الكبير (٢٤/ ٢٠٧) معرفة الصحابة لأبي نعيم الأصبهاني (٤٣٣٣) لیکن اس روایت میں «أولئك رجال [أو قوم] آمنوا بالغيب» کے مرفوع الفاظ نہیں ہیں۔

[4] اس کی سند میں موسیٰ بن عبیدہ ربذی ضعیف ہے۔ دیکھیں: إتحاف الخيرة للبوصيري (٧/ ٣٤٢)

یہ سنتوں کو زندہ کر کے ہمیشہ دینِ اسلام کی مدد کرتے اور بدعات کا قلع قمع کر کے رسول اللہ ﷺ کے مددگار رہتے ہیں۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ.

سیدنا ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خوشی ہو اس کے لیے (ایک مرتبہ) جس نے مجھے دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا اور خوشی ہو، اس کے لیے (سات مرتبہ) جو مجھ پر ایمان لایا، حالاں کہ اس نے مجھے دیکھا نہیں۔[1] (أحمد، طیالسي، بخاري في التاریخ، طبراني، الحاکم) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قسم ہے اس ذات کی کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس شخص سے بہتر کوئی نہیں، جو غیب پر ایمان لایا، پھر "الٓمّٓ" یہ آیت پڑھی۔[2]

ایمان بالغیب کی بابت تابعین کے اقوال بھی بہت ہیں۔ راجح یہی ہے کہ ایمانِ شرعی ان سب مذکورہ باتوں پر صادق آتا ہے اور اعمال ایمان میں داخل ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں، ان میں سب سے افضل "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" کہنا ہے اور سب سے ادنیٰ راستے سے تکلیف دینے والی چیز کا ہٹا دینا ہے اور حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔[3] (صحیح البخاري و صحیح مسلم)

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ ۝۳

اور نماز کو قائم رکھتے ہیں اور ہمارے دیے ہوئے مال میں سے خرچ کرتے ہیں ③

یعنی ہمیشہ نماز ٹھیک وقت پر بلا تاخیر، قضا کے بغیر، ارکان و سنن اور ہیئات ثابتہ کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ فرائض و حدود اور افعالِ نماز کو خلل سے بچاتے ہیں۔ اقامت کے اصل معنی ہیں: ہمیشگی کرنا، ثابت رکھنا۔ معلوم ہوا جو شخص وقت پر نماز نہیں پڑھتا یا کچھ وقت کی پڑھتا ہے اور کچھ وقت کی نہیں پڑھتا یا بے وقت ادا کرتا ہے یا اس طرح نہیں پڑھتا، جس طرح حدیث سے ثابت ہے یا غفلت کے ساتھ بے پروائی سے پڑھتا ہے، وہ نماز کا قائم کرنے والا نہیں ہے، حالاں کہ اسلام میں نماز کی یہ اہمیت ہے کہ ایک فرض نماز عمداً ترک کرنے سے کفر لازم آجاتا ہے۔ اگر توبہ کیے بغیر مر گیا یا مارا گیا تو مرتد کے حکم میں ہوگا۔ اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کرنا چاہیے۔ لوگ ایمان و اسلام کا دعویٰ رکھتے ہیں، مگر اکثر عمداً نمازیں ترک کرتے یا تاخیر سے پڑھتے یا غفلت سے ادا کرتے ہیں۔ ان کے انجام کا اللہ ہی حافظ ہے۔ خصوصاً عورتیں کہ ان سے اوقاتِ نماز کی پابندی کسی طرح نہیں ہوتی۔ اس لیے اگر جہنم میں عورتوں کی کثرت ہوگی تو اس میں کیا تعجب ہے؟ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس جگہ نماز سے پانچوں نمازیں

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٢٥٧) مسند الطیالسي (١/ ١٥٤) التاریخ الکبیر (٢/ ٢٧) المعجم الکبیر (٨/ ٢٦٠) مستدرك الحاکم (٤/ ٩٦) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (١٢٤١)

[2] سنن سعید بن منصور (٢/ ٥٤٤) مستدرك الحاکم (٢/ ٢٨٦) اس کی سند صحیح ہے۔

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٣٥)

مراد ہیں۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ وقت، وضو اور رکوع و سجود کی حفاظت کی جائے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اقامت سے مراد رکوع و سجود اور تلاوت و خشوع کا پورا کرنا ہے۔

بہرحال ان تمام اقوال کا حاصل یہ ہے کہ نماز ایسے پڑھی جائے، جیسے رسول اللہ ﷺ پڑھتے تھے۔ آپ ﷺ کا فرمان بھی ہے: «صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ» ''تم اس طرح نماز پڑھو، جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔''[3] اس نماز میں رفع الیدین، آمین بالجہر، ہاتھوں کا سینے پر باندھنا، استراحت کے لیے بیٹھنا، رکوع کے بعد اعتدال کرنا وغیرہ سب سنتوں کا اہتمام ہے۔ اس نماز کی ترکیب ''مسك الختام شرح بلوغ المرام'' (فارسی میں نواب صاحب کی بلوغ المرام کی شرح) میں لکھی گئی ہے اور رسالہ ''حقیقة الصلاة'' میں بھی کسی نے نماز کا طریقہ خوب بیان کیا ہے۔

یعنی اللہ کی راہ اور اطاعت میں صدقہ دیتے ہیں۔ جمہور کے نزدیک رزق ہر وہ چیز ہے جو قابلِ انتفاع ہو، (جس سے فائدہ اٹھایا جا سکے) چاہے وہ حلال ہو یا حرام۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ حرام چیز رزق نہیں ہے،[4] لیکن یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حرام رزق کا کھانا، اس کا لین دین کبیرہ گناہ ہے، مگر وہ رزق ہونے سے تو باہر نہیں ہو سکتا۔ اس لفظ سے کہ ''کچھ خرچ کرتے ہیں۔'' یہ نکلا کہ اسراف و تبذیر (فضول خرچی) بری چیز ہے۔ مال کا اڑانا اور اسے اللہ کی مرضی کے خلاف خرچ کرنا بڑا گناہ ہے۔ قرآن کریم میں ایسے فضول خرچوں کو ''إخوان الشياطين'' (شیطان کے بھائی) کہا گیا ہے۔ یہ مرض ان امرا میں جو بخیل نہ ہوں، سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ رؤسا میں سے کوئی بخل سے ہلاک ہوا تو کوئی اِسراف (فضول خرچی) سے تباہ ہوا۔

امام قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ انفاق سے مراد زکات کا نکالنا ہے۔[5] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ اپنے گھر والوں پر خرچ کرنا مراد ہے۔[6] امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ہر قسم کے خرچ کرنے کو شامل ہے، چاہے وہ فرض زکات ہو یا نفلی صدقہ، خواہ کسی قریبی کو دینا ہو یا غریب کو۔[7]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نماز اور انفاقِ مال کو متعدد جگہ ایک ساتھ ذکر کیا ہے، کیوں کہ نماز اللہ کا حق اور اس کی عبادت ہے۔ اللہ کی یہ عبادت اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی ثنا و تمجید، اپنی عاجزی، دعا اور توکل پر مشتمل ہے، جبکہ انفاق، اللہ کی مخلوق کے ساتھ احسان کرنا ہے۔ یہ نفع متعدی ہوتا ہے۔ اس احسان کے سب سے زیادہ

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٣٨٨) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٥) [4] فتح القدير (١/ ١١٤)

[5] الدر المنثور (١/ ٦٨) [6] تفسير الطبري (١/ ٢٤٤)

[7] تفسير الطبري (١/ ٢٤٣، ٢٤٤) علامہ احمد شاکر نے اس روایت کی سند پر مفصل بحث کرتے ہوئے کہا: ''أرجو أن يكون صوابا، إن شاء الله، وما توفيقي إلا بالله'' دیکھیں: تفسير الطبري (١/ ١٥٦)

مستحق قرابت دار، گھر والے اور مملوک (غلام) ہیں، پھر اجنبی لوگ۔ ''اول خویش بعدہ درویش۔'' (پہلے اعزا و اقارب اور پھر فقیر) پس اس آیت میں تمام واجب اخراجات اور فرض زکات داخل ہیں، اسی لیے صحیح بخاری و مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ اول: اس بات کی گواہی دینا کہ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں) دوم: نماز کا قائم رکھنا۔ سوم: زکات دینا۔ چہارم: روزہ رکھنا۔ پنجم: بیت اللہ کا حج کرنا۔[1] امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بارے میں متعدد احادیث وارد ہیں۔[2] انتہی

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ

اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ کی طرف اتارا گیا

اس سے مراد سارا قرآن اور ساری اسلامی شریعت ہے۔ قرآن کے اترنے کا مطلب یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام نے آسمان میں اللہ کا کلام سنا، اس کو جوں کا توں لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ اس کو اوپر سے نیچے اتار لائے، اس سے اللہ کا بلندی پر ہونا، قرآن کا کانوں سے سنا جانا، زبانوں سے پڑھا جانا، سینوں میں محفوظ ہونا، مصحفوں میں لکھا جانا اور حرف وصوت کا ہونا ثابت ہوا۔ کلام اللہ کے یہ سارے اوصاف خود کلام اللہ اور حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔

وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

اور جو آپ سے پہلے اتارا گیا

یعنی سابقہ رسولوں پر، جیسے: صحفِ ابراہیم علیہ السلام، داود علیہ السلام کی زبور، موسیٰ علیہ السلام کی تورات اور عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل وغیرہ ہیں، ان سب پر اجمالاً اور قرآن پر تفصیلاً ایمان لانا فرض ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ ایمان والے ہیں، جو پہلے اہلِ کتاب (یہودی و نصاریٰ) تھے۔ ان کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ ﴾ [آل عمران: ۱۹۹] ''اور بے شک اہلِ کتاب میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ پر اور جو کچھ تمھاری طرف نازل کیا گیا اور جو کچھ ان کی طرف نازل کیا گیا، اس پر ایمان لاتے ہیں۔'' دوسری جگہ فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴾ [القصص: ۵۲] ''وہ لوگ جنھیں ہم نے اس (قرآن) سے پہلے کتاب دی تھی، وہی اس پر ایمان لاتے ہیں۔'' اس جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک پہلی آیت ﴿ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ﴾ سے مومنین عرب مراد ہیں۔ بعض نے کہا ہے: نہیں، بلکہ دونوں ہی آیتیں تمام مومنوں کے حق میں ہیں، چاہے عربی ہوں یا عجمی، انسان ہوں یا جن، کتابی ہوں یا غیر کتابی۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے اسی بات کو راجح کہا ہے۔ اس کی دلیل بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے: دیکھو اللہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۸) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۶) [2] تفسير ابن كثير (۱/ ۶۱، ۶۲)

نے کئی جگہ ان مومنوں کی تعریف کی ہے، جنھوں نے ان دونوں حکموں کو مانا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ﴾ [النساء: ۱۳۶] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ، اس کے رسول اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی اور اس کتاب پر بھی جو اس نے پہلے نازل کی۔'' دوسری جگہ فرمایا: ﴿ اٰمَنَّا بِالَّذِيْۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ ﴾ [العنکبوت: ٤٦] ''ہم اس (کتاب) پر ایمان لائے ہیں جو ہماری طرف نازل کی گئی اور (جو) تمھاری طرف نازل کی گئی۔'' تیسری جگہ فرمایا: ﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ﴾ [البقرۃ: ۲۸۵] ''رسول (ﷺ) اس (ہدایت) پر ایمان لائے ہیں جو ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل کی گئی ہے اور سارے مومن بھی، سب اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں (وہ کہتے ہیں:) ہم اس کے رسولوں میں سے کسی ایک میں بھی فرق نہیں کرتے۔'' چوتھی جگہ ارشاد فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ﴾ [النساء: ۱۵۲] ''اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، اور انھوں نے ان میں سے کسی ایک کے درمیان بھی تفریق نہیں کی۔''[1] (ان تمام آیات میں اہلِ ایمان کی صفت یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل شدہ قرآنِ کریم اور انبیاے سابقین پر اتاری ہوئی کتابوں، سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ قرآن پر ایمان رکھنے کا مطلب ہے کہ اس کے احکام وقوانین پر عمل کرنا اور پچھلی کتابوں پر ایمان رکھنے کا مطلب ہے کہ ان کے بارے میں یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ کتابیں بھی اللہ نے نازل کی تھیں اور اپنے اپنے زمانے میں ان پر عمل کرنا ضروری تھا)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں اگرچہ سارے مومن داخل ہیں، لیکن اہلِ کتاب کو ایک یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ اپنی کتاب پر ایمان لائے، پھر جب مسلمان ہو کر قرآن پر بھی ایمانِ مفصل لائیں گے تو ان کو دُگنا اجر ملے گا۔ اہلِ کتاب کے علاوہ دوسروں کا پچھلی کتابوں پر ایمان اجمالی ہے۔ ہاں کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بہت سے عربوں کا رسول اللہ ﷺ پر ایمان، ان لوگوں کے ایمان سے جو اُن میں سے اسلام میں داخل ہوتے ہیں، زیادہ کامل ہوا ہے، اس لیے گو مومنین اہلِ کتاب کو دُگنا اجر ملے، مگر ان کی تصدیق کا ثواب ان کے دہرے اجر سے بھی بڑھ جائے گا۔ واللّٰہ أعلم (ابن کثیر)[2]

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ؕ۝۴

اور وہ آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں ④

یعنی جتنے کام یومِ آخرت کو ہوں گے، جیسے بعث (قبروں سے اُٹھنا)، حشر اور نشر وغیرہ، کسی میں ان کو کچھ

[1] فتح القدیر (۱/ ۱۱۵) [2] تفسیر ابن کثیر (۱/ ٦۳)

شک نہیں ہے۔ سب کی سچے دل سے تصدیق کرتے ہیں۔ معلوم ہوا متقین کی یہ صفت ہے کہ وہ آخرت پر یقین کو ایمان کی اساس اور اسلام کی اصل سمجھتے ہیں، اہلِ کتاب کے برعکس کہ امورِ آخرت کے بارے میں ان کا اعتقاد صحت سے دور ہے، چہ جائیکہ وہ یقین کے مرتبے تک پہنچ سکیں۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ آخرت سے مراد بعث، قیامت، جنت و نار اور حساب و میزان ہے۔ قیامت کا یہ دن چوں کہ دنیا کے بعد آئے گا، اس لیے اس کو آخرت اور یومِ آخر بولتے ہیں۔[1]

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥﴾
إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾

یہ لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب کی طرف سے اور یہی فلاح پانے والے ہیں ⑤ بے شک وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا، آپ انھیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں ان کے لیے برابر ہے، وہ ایمان نہیں لائیں گے ⑥

راہ (ہدایت) سے مراد نور یا استقامت یا بیان یا برہان یا بصیرت یا توفیق یا سداد (درست روی) ہے، بلکہ یہ سب معانی مراد ہوسکتے ہیں۔ اس جملے میں متقین کے حالات کی خبر دی ہے کہ ان کے اندر اعمالِ صالحہ کو بجا لانے اور محرمات کو ترک کرنے کی استعداد بہ درجہ کمال موجود ہے، اس وجہ سے وہ اللہ کی طرف سے کامیاب و کامران اور راہ شناس ہوگئے ہیں۔

﴿ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴾ اور وہی مراد کو پہنچے، یعنی دنیا و آخرت میں کامیاب ہوئے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ انھوں نے اپنا مطلب اور مدعا پالیا۔ وہ اس چیز کی برائی سے بچ گئے جس سے وہ بھاگے تھے۔[2] کسی نے کہا: جہنم کی آگ سے بچے اور جنت میں پہنچ گئے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ بعض دفعہ ہم قرآن پڑھتے ہیں تو ہم پُر امید ہو جاتے ہیں اور بعض جگہ ناامیدی آ گھیرتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تم کو جنت اور دوزخ والوں کی خبر نہ دوں؟ ہم نے کہا: کیوں نہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ الٓمٓ ﴾ سے لے کر ﴿ الْمُفْلِحُونَ ﴾ تک اہلِ جنت کا ذکر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہمیں امید ہے کہ ہم ہی یہ لوگ ہوں گے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ ﴾ سے ﴿ عَظِيمٌ ﴾ تک جہنمیوں کا ذکر ہے۔ ہم نے کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ لوگ ہم نہیں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سچ کہتے ہو۔[3] (ابن أبي حاتم)

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ٦٢)

[2] تفسیر الطبري (۱/ ۲۵۰) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۳۹) اس کی سند حسن ہے۔ علامہ حکمت بشیر یاسین نے اس روایت کی سند پر مفصل بحث کرتے ہوئے اس کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: الصحیح المسبور (۱/ ۳۷۔ ٤٥)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۳۹) اس کی سند میں عبداللہ بن لہیعہ ضعیف ہے۔

یعنی وہ لوگ جو منکر ہوئے، ان کو تیرا ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے، وہ نہیں مانیں گے۔ یعنی اللہ نے ان پر کفر لکھ دیا ہے، وہ کسی طرح ایمان لانے والے نہیں، خواہ ان کو خوف دلایا جائے یا نہ دلایا جائے، جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝ ﴾ [یونس: ۹۶۔ ۹۷] ''بے شک جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا حکم (عذاب) صادر ہو چکا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آ جائیں، حتی کہ وہ دردناک عذاب (بھی) دیکھ لیں۔'' تیسری جگہ اہل کتاب کے معاندین کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَلَىِٕنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ﴾ [البقرۃ: ۱۴۵] ''اور (اے نبی!) اگر آپ ان لوگوں کے پاس ہر قسم کی نشانی لے آئیں جنھیں کتاب دی گئی تو بھی وہ آپ کے قبلے کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں۔'' یعنی جس کو اللہ نے بد بخت ٹھہرا دیا ہے، اسے کوئی نیک بخت نہیں کر سکے گا اور جس کو اس نے گمراہ کر دیا ہے، اسے کوئی راہ پر نہ لگا سکے گا، پھر اے رسول! تو اپنی جان اس حسرت میں کیوں کھوتا ہے؟ تو صرف رسالت کو پہنچا دے، کوئی مانے یا نہ مانے۔ جو مانے گا، وہ اپنا بھلا کرے گا اور جو نہ مانے گا، وہ تیرا کیا بگاڑ سکتا ہے؟ اس کے لیے آپ کیوں رنج کرتے ہیں؟ تیرا کام اِبلاغ (پہنچا دینا) ہے۔ حساب لینا ہمارا کام ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ آرزو تھی کہ سارے لوگ ایمان لے آئیں، ہدایت کے راستے پر چلیں اور آپ کا کہنا مانیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایمان وہی شخص لاتا ہے، جس کے لیے پہلے سے سعادت مقرر ہو چکی ہے اور گمراہ وہی ہوتا ہے، جو پہلے سے بدبخت ٹھہر چکا ہے۔[1] ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیات ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہیں، جو مختلف گروہوں کے سردار تھے۔ انھی کے بارے میں دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ﴾ [إبراهيم: ۲۸۔ ۲۹] ''کیا آپ نے ان لوگوں کو دیکھا نہیں جنھوں نے اللہ کی نعمت (ایمان) کو کفر سے بدل ڈالا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں لے جا اُتارا؟ (یعنی) جہنم میں، وہ اس میں داخل ہوں گے۔''[2]

علما نے کہا ہے کہ یہ آیت عام ہے، مگر اس کے معنی خاص ہیں، یعنی اس سے وہ شخص مراد ہے جس کا کفر پر مرنا اللہ کے علم میں ثابت ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو یہ بات بتانا چاہی ہے کہ ان میں ایسے آدمی بھی ہیں، جن کا یہ حال ہوگا۔ کسی شخص کی خاص تعیین نہیں کی ہے۔

---

[1] تفسیر الطبري (۱/ ۲۵۲) اس کی سند میں انقطاع ہے۔

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۴۰)

﴿ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۠ ۝۷ ﴾

اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے ⑦

دل، کان، آنکھ کا ذکر اس لیے کیا کہ علم کے یہی تین راستے ہیں۔ دل سے انسان سمجھتا ہے، کان سے سنتا ہے اور آنکھ سے دیکھتا ہے۔ لہٰذا جب دل اور کان پر مہر لگ گئی اور آنکھ پر پردہ پڑ گیا تو اب ہدایت کو سمجھ سکتے ہیں نہ حق کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ اسے سن ہی سکتے ہیں۔ بعض اہلِ علم کہتے ہیں کہ اس آیت میں اس بات کی خبر دی گئی ہے کہ وہ حق بات سننے سے تکبر اور اعراض کرتے ہیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول ٹھیک نہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے تو یہ کہا ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔[1] زمخشری رحمہ اللہ نے پانچ وجوہ سے ابن جریر رحمہ اللہ کا رد کیا ہے،[2] مگر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ وہ سب وجوہ ضعیف ہیں۔ اس نے اعتزال کی وجہ سے یہ جرأت کی ہے، کیوں کہ معتزلہ کے نزدیک اللہ کا مہر لگانا، ایک قبیح امر ہے، حالاں کہ اگر وہ اس آیت میں غور کرتا: ﴿ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ﴾ [الصف: ٥] ''پھر جب وہ ٹیڑھے ہوگئے تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے کر دیے۔'' نیز اللہ کے اس قول میں غور وفکر کرتا: ﴿ وَ نُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۠ ۝۱۱۰ ﴾ [الأنعام: ١١٠] ''اور ہم (اسی طرح) ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر دیتے ہیں، جس طرح یہ پہلی بار اس (قرآن) پر ایمان نہیں لائے تھے، اور ہم انھیں ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیں گے۔'' تو وہ ابن جریر رحمہ اللہ کا رد نہ کرتا اور یہ جان لیتا کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا کر ان کے درمیان اور ہدایت کے درمیان حائل ہو گیا ہے اور یہ اُن کے ترکِ حق اور باطل سے مسلسل لگاؤ کی پوری پوری سزا اور جزا ہے۔[3]

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ اللہ نے اپنے آپ کو کافروں کے دلوں پر مہر لگانے کے ساتھ موصوف کیا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ ﴾ [النساء: ١٥٥] ''بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔''[4] نیز اس حدیث سے بھی اس کا اثبات ہوتا ہے، جس میں مروی ہے کہ لوگوں کے دل اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ انھیں جیسے چاہے پھیرتا ہے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ دعا مانگا کرتے تھے: ((یا

---

① تفسیر الطبري (١/ ٢٦٠، ٢٦١) ② تفسیر الکشاف (١/ ٨٨۔ ٩٣) ③ تفسیر ابن کثیر (١/ ٦٦)

④ تفسیر القرطبي (١/ ١٨٧)

مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ، ثَبِّتْ قُلُوْبَنَا عَلٰى دِيْنِكَ ﴾[1] ''اے دلوں کے پھیرنے والے! ہمارے دلوں کو اپنے دین پر قائم رکھ۔'' اسی طرح سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، جس میں دلوں پر فتنوں کے وارد ہونے کا ذکر ہے۔ یہ حدیث صحیح بخاری میں ہے۔[2]

امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ مومن جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک کالا نقطہ پڑ جاتا ہے۔ اگر اس نے اس سے توبہ کر لی اور گناہ سے باز رہا تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر زیادہ گناہ کرتا ہے تو یہ سیاہ نقطہ بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ سارے دل پر چھا جاتا ہے۔ یہ وہی زنگ ہے، جس کا ذکر اللہ نے فرمایا ہے: ﴿ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝۱۴ ﴾ [المطففين: ١٤] ''ہرگز نہیں! بلکہ ان کے دلوں پر ان کے (برے) اعمال نے زنگ لگا دیا ہے۔'' اس حدیث کو امام ترمذی نے ''حسن صحیح'' کہا ہے۔ اسے امام نسائی رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔[3] امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب گناہ دل پر لگاتار آتے ہیں، تو وہ دل کو بند کر دیتے ہیں۔ جب دل بند ہو گیا تو اللہ کی طرف سے اس پر مہر لگ گئی۔ اب ایمان اس کے اندر جا سکتا ہے نہ کفر اس سے باہر آ سکتا ہے۔ یہی مطلب ہے اس آیت کا۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر بھی بیان فرمایا ہے: ﴿ وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ﴾ [الجاثية: ٢٣] ''اور اس کے کانوں اور اس کے دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔''[4]

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''رَیْنٌ'' جس کا ذکر سورت مطففین کی آیت مذکور میں ہے، ''طبع'' سے ہلکا ہے، جس کا ذکر سورۃ النساء کی آیت (١٥٥) میں ہے اور ''طبع'' یہ ''أقفال'' ''دلوں پر تالے لگ جانا'' سے کم ہے۔ اقفال سب سے زیادہ سخت ہے۔[5] باقی رہا عذابِ عظیم تو اس جگہ اس سے مراد عذابِ آخرت اور عقابِ قیامت ہے یا دنیا میں قتل و قید ہے۔ عذاب ہر اس چیز کا نام ہے، جو انسان کو تکلیف دے، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ عظیم، حقیر کی ضد ہے، جس طرح کبیر، صغیر کی ضد ہے۔ اس بنیاد پر عظیم، کبیر سے بڑھ کر ٹھہرا، جس طرح حقیر، صغیر سے کم تر ہے۔

پہلے اللہ تعالیٰ نے چار آیتوں میں مخلص مومنین کا ذکر کیا تھا، پھر دو آیات میں خالص کافروں کا ذکر فرمایا۔ اب تیرہ آیتوں میں منافقین کا ذکر شروع کیا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے، جو نہ اِدھر تھا نہ اُدھر۔ ظاہر میں مومنوں کے موافق تھے، مگر باطن میں کافروں کے مطابق۔ اس لیے اس تیسرے گروہ کے بارے میں اللہ نے یوں فرمایا: ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٤٠) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٤١٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٩) اس کی سند صحیح ہے۔

[2] سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت صحیح بخاری کے بجائے صحیح مسلم میں مروی ہے۔ دیکھیں: صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٤)

[3] تفسير الطبري (١/ ٢٦٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٣٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ١١٠، ٥٠٩) اس کی سند صحیح ہے۔

[4] تفسير الطبري (١/ ٢٦١) [5] تفسير الطبري (١/ ٢٥٩)

الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ﴾ [النساء: ١٤٥] ''بے شک منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں جائیں گے۔''
امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس فرقے کا حال اکثر لوگوں پر مشتبہ رہتا تھا، اس لیے ان کے کئی وصف بیان فرمائے، ہر وصف ایک طرح کا نفاق ہے۔ ان کا ذکر سورت براءت، سورت منافقون اور سورت نور وغیرہ میں آیا ہے، تاکہ سب لوگ ان کے حال معلوم کر کے ان سے بچتے رہیں۔[1]

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ
بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ
اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

اور بعض لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے، حالاں کہ وہ مومن نہیں ہیں ⑧ وہ اللہ کو اور ان لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں جو ایمان لائے مگر وہ اپنے آپ کے سوا کسی کو دھوکا نہیں دیتے اور وہ شعور نہیں رکھتے ⑨

یہ آیت عبداللہ بن اُبی، معتب بن قشیر، جد بن قیس اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں اتری ہے۔ یوم آخرت سے مراد وہ وقت ہے، جو ختم نہ ہو، بلکہ ہمیشہ رہے۔ سو ایسا وقت قیامت کا دن ہے۔ اللہ نے ان سے ایمان کی بالکل نفی کر دی کہ یہ کسی زمانے میں بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

''خداع'' لغت میں فساد کے معنی میں آتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ مفسدوں کا سا کام کرتے ہیں، گو اللہ پر کسی کا فساد مخفی نہیں رہتا۔ نفاق اس بات کو کہتے ہیں کہ خیر ظاہر کرے اور شر چھپائے۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک نفاق اعتقادی ہے، ایسے نفاق والا جہنمی ہے۔ دوسرا نفاق عملی ہے، یہ سب سے بڑا گناہ ہے۔ ابن جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ منافق وہ ہے، جس کا قول اس کے فعل کے خلاف ہو، اس کا باطن اس کے ظاہر کے خلاف ہو، داخل کہیں سے ہو اور خارج کہیں سے، حاضر کچھ، غائب کچھ ہو۔[2] اس لیے منافقوں کا حال مدینہ میں نازل ہوا، مکہ میں نفاق نہیں تھا۔ وہاں تو کافر کھل کر اپنے کفر، نیز اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنے بغض و عناد کا اظہار کرتے تھے۔

البتہ بعض ایمان لانے والے کمزور قسم کے مسلمان اپنا ایمان بعض دفعہ مخفی رکھنے پر مجبور تھے، تاکہ کافروں کے ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنیں۔ جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئے تو یہاں کے (اکثر) انصار بت پرست تھے۔ یہود اپنے آبا و اجداد کی روش پر تھے۔ جب بدر کی لڑائی ہوئی تو عبداللہ بن ابی بن سلول اور اطرافِ مدینہ میں آباد اَعراب (دیہاتیوں) نے نفاق کا اظہار کیا۔ یہ عبداللہ خزرج قبیلے سے تھا۔ اللہ نے اہلِ ایمان کو خبردار کر دیا

① تفسیر ابن کثیر (١/ ٦٧) ② تفسیر الطبري (١/ ٢٧٠)

کہ تم ان کے ظاہری حال سے دھوکا نہ کھانا، وہ دل میں کافر ہیں، گو ظاہر میں ایمان دار باور کراتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ فاجروں اور فاسقوں کے متعلق کبھی اچھائی کا گمان نہیں کرنا چاہیے۔

آیت کا یہ مطلب ہے کہ یہ لوگ یوں خیال کرتے ہیں کہ جس طرح کفر چھپا کر اور ایمان کا اظہار کر کے ہم نے لوگوں کو دھوکا دیا ہے، اسی طرح ہمارا یہ فقرہ اللہ اور اہلِ ایمان کے سامنے بھی چل جائے گا۔ اسی لیے اللہ نے ان کے مقابلے میں یہ کہا کہ تمھارا یہ فقرہ تمھاری ہی جان پر وبال ہوگا، گو تمھیں اس کا شعور نہیں۔ ان باتوں سے اللہ تعالیٰ کا کچھ بگڑتا ہے نہ مومنوں کا کچھ بگڑے گا، بلکہ چاند پر تھوکا تمھارے ہی مونہوں پر آئے گا۔ ابن جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان کی دغا بازی یہ تھی کہ ظاہر میں "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" کہہ کر اپنی جان و مال بچا لیتے تھے، مگر ان کے جی میں کچھ اور ہی بسا ہوتا تھا۔ قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ منافق وہ ہے، جو بد اخلاق ہو۔ زبان سے تصدیق کرے، دل سے انکار کرے۔ قول کچھ ہو اور عمل کچھ۔ صبح کو اور حال اور شام کو اور حال۔ کشتی کی طرح کہ جدھر کی ہوا چلی، اس کا رخ اُدھر کو ہو گیا۔[1] لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ۔ ابن سیرین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سلف کے نزدیک کوئی آیت اس آیت سے زیادہ خوفناک نہیں۔[2]

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ

ان کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے، پس اللہ نے ان کی بیماری بڑھا دی

مرض اس چیز کو کہتے ہیں، جو آدمی کو صحت و تندرستی کی حد سے نکال دے، جیسے کسی معاملے میں کوئی علت یا نفاق یا کوتاہی۔ بعض نے ہر درد کا نام مرض رکھا ہے۔ اس صورت میں یہ لفظ عقیدے کے فساد کے لیے مستعار لیا گیا ہے، خواہ شک اور نفاق ہو یا انکار و تکذیب۔ اللہ کی دینی اور دنیاوی نعمتیں جس قدر زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوتیں، اتنا ہی ان منافقین کا مرضِ نفاق زیادہ ہو جاتا۔ یہ جملہ ان کے حق میں بد دعا ہے کہ تم اسی طرح شک، حسرت اور نفاق میں پڑے رہو۔ ابن زید کا قول ہے کہ یہاں دین کا مرض مراد ہے، جسمانی مرض نہیں۔[3] امام عکرمہ اور طاؤس رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اس مرض سے مراد ریا کاری ہے۔[4] بعض نے کہا ہے کہ یہ مرض اسلام میں شک کرنا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ ﴾ [التوبة: ١٢٤۔ ١٢٥] ''چناں چہ جو لوگ ایمان لائے ہیں، اس (سورت) نے ان کو ایمان میں زیادہ کیا ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے دلوں میں روگ ہے، تو اس (سورت) نے ان کی (پہلی) پلیدی پر مزید پلیدی کا اضافہ کر دیا۔'' یعنی شر پر شر اور ضلالت پر ضلالت بڑھتی جاتی ہے، گویا یہ جزا

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٤٢۔ ٤٣)
[2] الدر المنثور (١/ ٧٤)
[3] تفسير الطبري (١/ ٢٨٠)
[4] تفسير ابن كثير (١/ ٦٩)

جنسِ عمل سے ہے کہ جیسا کیا ویسا ہی پایا۔ ان کے مقابلے میں یہ آیت ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴾ [محمد: ۱۷] ''اور جن لوگوں نے ہدایت پائی ہے، اللہ نے انھیں ہدایت میں زیادہ کیا اور انھیں ان کا تقویٰ عطا فرمایا۔'' موضح قرآن میں شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک آزار یہ تھا کہ جس دین کو دل نہیں چاہتا تھا، ناچار قبول کرنا پڑا اور دوسرا آزار اللہ نے یہ زیادہ دیا کہ جہاد کا حکم کیا، اس طرح انھیں ان سے لڑنا پڑا، جن کے وہ خیر خواہ تھے۔ انتہیٰ

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌۢ ۙ۬ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝۱۰

اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اس بنا پر کہ وہ جھوٹ بولتے تھے ⑩

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ قرآن میں جہاں بھی ﴿ اَلِيْمٌ ﴾ کا لفظ آیا ہے، اس سے مراد ''موجع'' یعنی ایسا دردناک عذاب ہے، جس کا دُکھ دل کی گہرائی تک اثر کرے۔[1] جھوٹ یہ ہے کہ کسی چیز کا حال اس کی ماہیت (حقیقت) کے خلاف ظاہر کریں۔ یہ حرام ہے، کیوں کہ اس پر عذاب کی وعید ہے۔ ان منافقین کا جھوٹ یہ تھا کہ مومن نہیں تھے، مگر اپنے آپ کو مومن کہتے تھے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ وہ تبدیلی و تحریف کرتے تھے۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ بعض منافقین کو جانتے پہچانتے تھے، مگر آپ نے ان کو قتل نہیں کیا، تاکہ عرب یہ نہ کہیں کہ آپ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کا قتل ان کے کفر کی وجہ سے ہوتا (جو جائز تھا)، مگر یہ عرب (اہلِ بادیہ اور گنوار) ظاہر میں ان کو مسلمان سمجھتے تھے۔ وہ قتل کی اصل وجہ اور حکمت سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس لیے مفت میں بدنام کرتے۔ منافقین کے ساتھ آپ کا یہ رویہ ایسے ہی تھا، جیسے آپ ''مؤلفة القلوب'' (وہ لوگ جن کی دل بستگی کے لیے ان کو صدقہ دیا جاتا) کو ان کے سوئے اعتقاد کے باوجود دیتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ بعض اور توجیہات بھی کی گئی ہیں، جن کا ذکر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کیا ہے۔[3]

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝۱۱ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۲

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اصلاح کرنے والے ہیں ⑪ سن لو! بے شک وہی فساد کرنے والے ہیں، لیکن وہ شعور نہیں رکھتے ⑫

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس جگہ فساد سے مراد کفر اور گناہ کرنا ہے۔ جس نے زمین میں اللہ کی نافرمانی کی یا کسی معصیت کا حکم دیا تو اس نے زمین میں فساد ڈالا، کیوں کہ ملک کی درستی اور آسمان و زمین کی

---

① تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۰۹،۲) اس کی سند حسن ہے۔ ② فتح البیان (۱/ ۹۲)
③ تفسیر ابن کثیر (۱/ ۶۹۔۷۰)

اصلاح فرمانبرداری میں ہے۔ سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ابھی اس آیت کے مصداق لوگ نہیں آئے۔ ①

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ مذکورہ صفات کے حامل، فساد میں ان لوگوں سے، جو عہدِ رسالت میں تھے، کہیں زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اس صفت کا کوئی آدمی اس وقت موجود نہ تھا۔② پھر کہا: زمین میں بڑے مفسد یہی اہلِ نفاق ہیں۔ اللہ کی نافرمانیاں کرتے ہیں۔ فرائض بجا نہیں لاتے۔ دین میں شک رکھتے ہیں۔ مومنوں کے دعووں کو جھٹلاتے ہیں۔ اہلِ تکذیب کے مددگار ہیں۔ اس کے باوجود ان کا گمان یہ ہے کہ وہ زمین اور زمانے کی اصلاح کرتے ہیں۔ زمین کے لیے ایک فساد یہ ہے کہ اہلِ ایمان کافروں کے دوست ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ﴿۷۳﴾ ﴾ [الأنفال: ٧٣] ''اور جن لوگوں نے کفر کیا، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ (اے مسلمانو!) اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد مچے گا۔'' اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مومن اور کافر کے درمیان دوستی کا رشتہ کاٹ دیا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [النساء: ١٤٤] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ۔''

اس میں اس بات کی صریح ممانعت ہے کہ مسلمان کسی کافر سے دوستی کرے۔ ممانعت (نہی) تحریم کا فائدہ دیتی ہے۔ جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جو مسلمان (کسی) کافر کا دوست ہے، دل سے اس کی دوستی کا منکر نہیں ہے تو وہ حرام کا مرتکب ہے۔ وہ مخلص مسلمان نہیں ہے، بلکہ خالص منافق ہے۔ یہ دوستی زمین میں کوئی فتنہ اور فساد کھڑا کرے گی۔ چناں چہ ایسی دوستی کا نتیجہ آج کل سب اہلِ تجربہ پر ظاہر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ جب ان سے کہو کہ تم فساد نہ کرو، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو مومنوں اور اہلِ کتاب دونوں فریقوں کے درمیان صلح کراتے ہیں۔③ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس کو یہ اصلاح سمجھتے ہیں، وہی تو عین فساد ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جیسے اور لوگ ایمان لائے ہیں تو وہ کہتے ہیں: کیا ہم ایمان لائیں جیسے بے وقوف ایمان لائے ہیں؟ سن لو! بے شک وہی بے وقوف ہیں لیکن وہ نہیں جانتے ⑬

پہلی آیت میں منافقوں کو فساد سے روکا تھا، اس آیت میں ان کو ایمان لانے کا حکم فرمایا۔ لوگوں سے اس جگہ

---

① تفسیر الطبري (١/ ٢٨٧) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٤٥) اس کی سند میں ''عباد بن عبداللہ اسدی'' ضعیف راوی ہے۔

② تفسیر الطبري (١/ ٢٨٩)

③ تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٤٥) اس کی سند حسن ہے۔ علامہ حکمت بشیر یاسین نے اس روایت کی سند پر مفصل بحث کرتے ہوئے اس کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: الصحیح المسبور (١/ ٣٧۔ ٤٥)

مراد اصحاب رسول اللہ ﷺ ہیں، خواہ وہ مہاجر ہوں یا انصار، یا پھر اس جگہ عبداللہ بن اُبی اور ان کے ساتھی مراد ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ زندیق کی توبہ قبول ہوتی ہے اور زبان سے اقرار کرنا بھی ایمان ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے سب لوگ اللہ، فرشتوں، آسمانی کتابوں، رسولوں، مرنے کے بعد اُٹھنے اور جنت وجہنم پر ایمان لائے ہیں، اسی طرح تم بھی ایمان لاؤ۔ وہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ کیا ہم ان اصحاب کی طرح یقین لائیں، یہ تو اَحمق ہیں۔ سفیہ لغت میں جاہل اور کمزور رائے والے کو کہتے ہیں، جو نفع ونقصان اچھی طرح نہیں پہچانتا، چنانچہ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے عورتوں اور بچوں کو ''سُفَهَآءَ'' کہا ہے: ﴿ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا ﴾ [النساء: ٥] ''اور تم اپنے وہ مال نادان لوگوں کے سپرد نہ کرو جو اللہ نے تمھارے لیے گزر بسر کا ذریعہ بنائے ہیں۔'' عام علما نے اس آیت میں ''سُفَهَآءُ'' کی تفسیر بچوں اور عورتوں ہی سے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ وہ خود ہی اَحمق ہیں۔ اس سے زیادہ اور ان کی حماقت کیا ہوگی کہ وہ اپنی ضلالت و جہالت ہی کو نہیں جانتے، ان سے بڑھ کر اور کون اندھا اور ہدایت سے دور تر ہوگا۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٤﴾ اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَیَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ﴿١٥﴾

اور جب وہ ان سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے اور جب وہ اپنے شیطانوں کے پاس تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: یقیناً ہم تمھارے ساتھ ہیں ان لوگوں سے تو ہم صرف مذاق کرتے ہیں (14) اللہ بھی ان سے مذاق کرتا ہے اور انھیں ان کی سرکشی میں ڈھیل دیتا ہے، وہ (اس میں) بھٹکتے پھرتے ہیں (15)

اس جگہ شیاطین سے مراد ان کے سردار، گروہ یہود اور مشرکین کے بڑے رئیس ہیں۔ وہ علمائے یہود اور مشرکین کے سرداروں کے پاس جا کر اپنا دلی اتحاد ظاہر کرتے تھے اور کہتے کہ ہم تم ایک ہیں۔ ہم تو ان مسلمانوں کو مذاق کا نشانہ بناتے اور ان سے دل لگی کرتے ہیں، ہم حقیقت میں ایمان نہیں لائے۔ اللہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ تم کیا ان سے ہنسی کرو گے، اللہ خود تم سے ہنسی کرتا ہے کہ جس سے تمھاری گمراہی بڑھتی جاتی ہے۔ اس ہنسی کا نتیجہ تم کو قیامت کے دن معلوم ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِیْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِیْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿١٣﴾ ﴾ [الحدید: ١٣] ''اس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ان لوگوں سے جو ایمان لائے، کہیں گے: تم ہمارا انتظار کرو کہ ہم

بھی تمھارے نور سے کچھ روشنی حاصل کرلیں۔ (ان سے) کہا جائے گا: اپنے پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ، پھر نور تلاش کرو۔ تب ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس کا ایک دروازہ ہوگا، اس کے اندر کی طرف رحمت ہوگی اور اس کے باہر کی طرف عذاب ہوگا۔'' دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِّأَنفُسِهِمْ ۚ إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا ﴾ [آل عمران: ۱۷۸] ''وہ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ ہم انھیں جو ڈھیل دیتے ہیں، وہ ان کے لیے بہتر ہے۔ ہم تو انھیں صرف اس لیے ڈھیل دیتے ہیں کہ وہ گناہ میں بڑھ جائیں۔''

پس اس قسم کی آیتیں گویا منافقین و مشرکین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا استہزا اور مذاق ہے۔ بعض دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ ان سے اللہ کا استہزا یہ ہے کہ ان کو ملامت کی ہے اور اُن کے کفر وعصیان پر اُن کو جھڑکا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ہم اس استہزا کی سزا دیں گے۔ اول ظلم تھا، دوسرا عدل ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جس طرح وہ اپنے شیطانوں (سرداروں) سے مل کر یہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی تکذیب میں تمھارے ساتھ ہیں، اس کے سبب اللہ نے دنیا میں تو ان کے مال اور خون کو محفوظ رکھا، لیکن آخرت میں ان پر عذاب و نکال ہوگا اور یہی اللہ کا ان کے ساتھ استہزا ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قول کو قوی قرار دیا ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورِ عبث مکر و خداع اور استہزا ناممکن ہے، البتہ مقابلے اور انتقام کے طور پر عدل و مجازات کے اعتبار سے ممنوع نہیں ہے۔[1] بعض نے کہا کہ جب یہ لوگ کوئی گناہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو ایک نئی نعمت دیتا ہے، وہ نعمت درحقیقت نقمت ہے، راحت نہیں، بلکہ جراحت ہے۔ جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ ﴿٤٤﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٤٥﴾ ﴾ [الأنعام: ٤٤۔ ٤٥] ''پھر جب انھوں نے وہ نصیحت بھلا دی جو انھیں کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے، حتیٰ کہ جب وہ ان چیزوں پر اِترانے لگے جو انھیں دی گئی تھیں، تو ہم نے انھیں اچانک پکڑ لیا، پھر وہ ناامید ہوکر رہ گئے۔ پھر اس قوم کی جڑ کاٹ دی گئی جنھوں نے ظلم کیا تھا اور تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ بڑھانے سے مراد مہلت دینا ہے۔ یہ مہلت ان کے لیے ہلاکت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُم بِهِ مِن مَّالٍ وَبَنِينَ ﴿٥٥﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ ۚ بَل لَّا يَشْعُرُونَ ﴿٥٦﴾ ﴾ [المؤمنون: ٥٥۔ ٥٦] ''کیا وہ سمجھتے ہیں کہ بے شک ہم جو بھی ان کے مال اور اولاد میں اضافہ کیے جا رہے ہیں۔ (تو) کیا ہم ان کے لیے بھلائیوں میں جلدی کر رہے ہیں (نہیں نہیں) بلکہ، وہ (اصل حقیقت کا) شعور نہیں رکھتے۔'' نیز فرمایا: ﴿ سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٨٢﴾ وَأُمْلِي لَهُمْ ۚ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ ﴿١٨٣﴾ ﴾ [الأعراف: ١٨٢۔ ١٨٣] ''ہم ضرور انھیں بتدریج پکڑیں گے جہاں سے انھیں علم تک نہ ہوگا۔ اور میں انھیں مہلت دیتا

---

[1] تفسیر الطبري (١/ ٣٠٣۔ ٣٠٤)

ہوں، بے شک میری تدبیر نہایت مضبوط ہے۔‘‘

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ ہم ان کو مہلت دے کر ان کی سرکشی اور تمرد کو بڑھاتے ہیں، جس طرح فرمایا: ﴿ وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴾ [الأنعام: ١١٠] ’’اور ہم (اسی طرح) ان کے دلوں اور نگاہوں کو پھیر دیتے ہیں، جس طرح یہ پہلی بار اس (قرآن) پر ایمان نہیں لائے تھے، اور ہم انھیں ان کی سرکشی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیں گے۔‘‘ (1)

طغیان یہ ہے کہ کسی کام میں حد سے تجاوز کیا جائے۔ جیسے فرمایا: ﴿ إِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَاءُ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ﴾ [الحاقة: ١١] ’’بے شک جب پانی میں طغیانی آئی تو ہم نے تمھیں بہتی ناؤ میں سوار کیا۔‘‘ سیدنا ابن عباس وغیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ طغیان سے اس جگہ کفر مراد ہے۔ (2) ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طغیان سے مراد ضلالت ہے۔ (3) بعض نے کہا ہے کہ آنکھ کے اندھے پن کو ’’عمی‘‘ کہتے ہیں اور دل کے اندھے پن کو ’’عَمَهٌ‘‘ بولتے ہیں۔ کبھی ’’عمہ‘‘ کے بجائے ’’عمی‘‘ بھی استعمال میں آجاتا ہے۔ جیسے: ﴿ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ﴾ [الحج: ٤٦] ’’پس بے شک قصہ یہ ہے کہ (ان کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، لیکن دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔‘‘ مطلب یہ ہے کہ دل کے اندھے ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنا نقصان تک نہیں پہچانتے۔ اپنی چالاکی کو انھوں نے عقل سمجھ رکھا ہے، حالاں کہ یہی عقل ایک دن ان کو جہنم کی سیر کروائے گی۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَى فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾

یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے گمراہی خرید لی ہدایت کے بدلے تو ان کی تجارت نے انھیں کوئی نفع نہ دیا اور (اس میں) وہ ہدایت یافتہ نہ ہوئے (16)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ گمراہی قبول کر لی اور ہدایت چھوڑ دی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ایمان دے کر کفر خریدا۔ (4) مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایمان لا کر کافر ہوئے۔ (5)

(1) تفسیر الطبري (١/ ٣٠٧۔ ٣٠٨)

(2) تفسیر الطبري (١/ ٣٠٩) علامہ احمد شاکر نے اس روایت کی سند پر مفصل بحث کرتے ہوئے کہا: ’’أرجو أن یکون صوابا، إن شاء الله. وما توفیقي إلا بالله‘‘ دیکھیں: تفسیر الطبري (١/ ١٥٦)

(3) تفسیر الطبري (١/ ٣٠٩)

(4) تفسیر الطبري (١/ ٣١٢) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٤٩) علامہ حکمت بشیر یاسین نے اس روایت کی سند پر مفصل بحث کرتے ہوئے اس کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: الصحیح المسبور (١/ ٣٧۔ ٤٥)

(5) تفسیر الطبري (١/ ٣١٢)

قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے گمراہی کو ہدایت کے مقابلے میں پسند کیا۔[1] جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى ﴾ [حم السجدة: ١٧] ''اور جو ثمود تھے، تو ہم نے ان کی راہنمائی کی تو انھوں نے ہدایت پر اندھے پن کو پسند کیا۔'' قتادہ رحمہ اللہ نے مزید کہا کہ واللہ! تم نے ان کو دیکھا ہے کہ وہ سیدھے راستے سے نکل کر گمراہ ہوگئے ہیں۔ جماعت سے باہر آ کر فرقہ بندی کی طرف چلے گئے ہیں۔ امن چھوڑ کر خوف میں جا پڑے ہیں۔ سنت سے علاحدہ ہو کر بدعت میں پھنس گئے ہیں۔[2] اصل سرمائے پر جو زیادہ آمدنی ہو، اسے ''ربح'' (فائدہ) کہتے ہیں۔ سوداگر کے کام کاج کو ''تجارت'' کہتے ہیں۔ سو ان کو اس تجارت میں خسارہ ہے، نفع نہیں، کیوں کہ راس المال ایمان کو برباد کر کے گمراہی کے معتقد ہوئے اور ہدایت سے بہک گئے ہیں۔

ہوا شب کو داد و ستد[3] کچھ عجب کہ بوسے کے لینے پہ ہم جو اڑے
حسن اور لینے کے دینے پڑے تو لبوں سے ملتے ہی لب کی جان دی

﴿ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ۝ ١٧ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ ١٨ ﴾

ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی، پھر جب اس (آگ) نے اس کے اردگرد کو روشن کر دیا تو اللہ ان کی روشنی لے گیا اور انھیں اندھیروں میں چھوڑ دیا، پس وہ دیکھ نہیں پاتے (17) (وہ) بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، پس وہ (سیدھے راستے کی طرف) نہیں لوٹیں گے (18)

یعنی اللہ نے نبی اکرم ﷺ کے ذریعے سے دینِ اسلام کو روشن کیا۔ مخلوق نے اس سے راہنمائی حاصل کی، مگر منافق اس وقت اندھے ہوگئے۔ آنکھ کی روشنی نہ ہو تو مشعل کیا کام آ سکتی ہے؟ محض اندھا ہو تو کسی کو پکار کر کام چلا سکتا ہے یا کسی کی بات سن سکتا ہے، مگر بہرا بھی ہو اور گونگا بھی تو وہ کیوں کر راہ پر آ سکتا ہے؟ منافقوں کے پاس عقل کی آنکھ ہے کہ آپ کو پہچان لیں نہ مرشد کی طرف رجوع ہے کہ وہ ہاتھ پکڑ کر منزل کی نشاندہی کرے اور نہ وہ حق بات سننے کی کوشش ہی کرتے ہیں۔ ایسے شخص سے کس طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ہدایت کی طرف آئے؟ اس مثال میں اس بات پر دلیل ہے کہ یہ لوگ ایمان لا کر کافر ہوگئے، جیسے اللہ نے متعدد جگہ فرمایا ہے: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝ ٣ ﴾ [المنافقون: ٣] ''یہ اس لیے کہ بے شک وہ ایمان لائے، پھر انھوں

---

[1] تفسير الطبري (١/ ٣١٢) [2] تفسير الطبري (١/ ٣١٦) [3] لین دین۔

نے کفر کیا، تو ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی، تو وہ سمجھتے ہی نہیں۔‘‘

امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تشبیہ نہایت صحیح ہے، کیوں کہ انھوں نے ایمان لا کر جو نور حاصل کیا تھا، منافق بن کر اسے ضائع کر دیا۔ وہ ایک بڑی حیرانی میں پڑ گئے۔ دین کی حیرانی سے زیادہ بڑی کوئی حیرانی نہیں ہے۔[1] امام ابن جریر رحمہ اللہ کا یہ خیال ہے کہ وہ کبھی ایمان لائے ہی نہیں تھے، کیوں کہ اللہ نے ان کی بابت فرمایا: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [البقرة: ۸] ’’اور بعض لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے، حالاں کہ وہ مومن نہیں ہیں۔‘‘[2] لیکن یہ بات صحیح نہیں، کیوں کہ اس آیت میں ان کے کفر و نفاق کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے پہلے کبھی ان کو ایمان حاصل ہی نہ ہوا ہو، بلکہ ان سے وہ ایمان لے کر ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی۔ امام ابن جریر کو شاید یہ آیت: ﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ﴾ [المنافقون: ۳] یاد نہیں رہی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آئے تو کچھ لوگ مسلمان ہوگئے، پھر بعد میں منافق بن گئے۔ ان کی مثال ایسے ہی ہے، جیسے ایک شخص اندھیرے میں تھا، اس نے آگ سلگائی، آگ کی روشنی میں جو خوف و خطر تھا، اسے نظر آنے لگا، جس چیز سے بچنا چاہیے تھا، وہ اس نے پہچان لی۔ ناگہاں وہ آگ بجھ گئی، اب اسے کچھ نہیں سوجھتا کہ کس چیز سے بچے اور کس سے نہ بچے۔ یہی حال منافق کا ہے کہ وہ شرک و کفر کے اندھیرے میں پڑا تھا، اسلام لایا تو اس کو حلال و حرام اور خیر و شر کی پہچان ہوئی، اتنے میں وہ پھر کافر ہوگیا، اب وہ کچھ نہیں پہچانتا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ نور سے مراد اُن کا ایمان ہے، جس کے بارے وہ بات چیت کرتے تھے۔ ظلمات سے مراد ان کا کفر و ضلال ہے، جس میں وہ پھنس گئے۔ یہ ہدایت پر تھے، پھر وہ ہدایت ان سے لے لی گئی۔[3] امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت منافق کی مثال ہے کہ کبھی دیکھتا پہچانتا ہے، پھر اس کا دل اندھا ہو جاتا ہے۔[4] امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ منافقوں کی صفت ہے کہ وہ پہلے تو ایمان لائے اور ایمان ان کے دلوں میں چمکا، جس طرح آگ سلگانے والے کے لیے روشن ہو جاتی ہے، پھر کافر ہوگئے۔ اللہ ان کے ایمان کی روشنی لے گیا، جس طرح کہ وہ آگ بجھ گئی۔ اب اندھیرے میں پڑے ہیں اور کچھ سجھائی نہیں دیتا۔[5] ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منافق جب کلمۂ اخلاص ’’لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ‘‘ کہتا ہے تو چمک اٹھتا ہے، پھر جب اس نے شک کیا تو

---

① تفسیر الرازي (۲/ ۶۷) ② تفسیر الطبري (۱/ ۳۲۴۔ ۳۲۵)

③ تفسیر الطبري (۱/ ۳۲۲) علامہ احمد شاکر نے اس روایت کی سند پر مفصل بحث کرتے ہوئے کہا ہے: ’’وھو إسناد مسلسل بالضعفاء‘‘ دیکھیں: تفسیر الطبري (۱/ ۲۶۳)

④ تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۵۰۔ ۵۱) ⑤ تفسیر الطبري (۱/ ۳۲۴)

اندھیرے میں جا گرا۔[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ منافق لوگ دنیا میں کلمہ پڑھ کر کھاتے پیتے، نکاح کرتے اور خون اور مال بچاتے ہیں، لیکن جب مریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو اندھیرے میں اندھوں کی طرح چھوڑ دے گا۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ظلمت سے مراد وہ عذاب ہے، جس سے مرنے کے بعد دوچار ہوں گے۔[3] قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مرنے کے وقت ان سے ایمان لے لیا جاتا ہے۔[4] کیوں کہ اس کی کوئی اصل ان کے دل میں نہیں تھی، نہ اُن کا وہ عمل کچھ حقیقت رکھتا تھا، بلکہ وہ ایک دھوکا اور فریب تھا۔ اب قبر کے اندھیرے میں پڑے رہو۔ وہ ایسے اندھے، بہرے، گونگے ہیں کہ کبھی ہدایت کی طرف پھریں گے، نہ اسلام قبول کریں گے اور نہ اپنے نفاق و ضلالت سے تائب ہی ہوں گے۔ یہ آگ باطل کی آگ ہے۔ اس کے لیے چمکنے کا لفظ اس لیے استعمال فرمایا کہ ایک لمحے کے لیے ہر باطل کی بڑی دھوم دھام سے چمک ہو جاتی ہے، پھر آخر میں مٹ جاتی ہے۔ ایک عربی مثل ہے کہ "لِلْبَاطِلِ صَوْلَةٌ ثُمَّ يُضْمَحِلُّ" "باطل کا ابتدا میں ایک دبدبہ ہوتا ہے، پھر بتدریج ختم ہو جاتا ہے۔" علمائے بلاغت نے کہا ہے کہ پردہ کشائی اور پوشیدہ چیز کے اظہار کے لیے ضرب المثل کا رتبہ بہت بلند ہے۔ اسی لیے اللہ نے قرآن مجید میں جا بہ جا مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اکثر وعظ و نصیحت اور گفتگو میں مثالیں بیان فرمایا کرتے تھے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک جماعت کی مثال ایک شخص سے بھی ہو سکتی ہے، جیسے یہ آیت ہے: ﴿ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ﴾ [الأحزاب: ١٩] "تو آپ انھیں دیکھتے ہیں کہ وہ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں، ان کی آنکھیں (اس طرح) گھومتی ہیں، جیسے وہ شخص جس پر موت کی غشی طاری ہو۔"[5] نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ﴾ [الجمعة: ٥] "ان لوگوں کی مثال، جنھیں حاملِ تورات بنایا گیا، پھر انھوں نے اسے نہیں اُٹھایا، اس گدھے کی سی ہے جو کتابیں اُٹھاتا ہے۔" مثال بیان کرنے سے قائل کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بات سننے والے کے دل میں اُتر جائے۔ اگر اس میں کچھ بھی عقل و شعور ہو تو مثال اپنا کامل اثر دکھاتی ہے، ورنہ اندھے کے آگے رونا، اپنی آنکھیں کھونے والی بات ہے۔ ہر زبان میں مثال کا اپنا اپنا رنگ اور انداز ہوتا ہے۔ عربی، فارسی، اردو اور دیگر سب زبانوں میں اس کا استعمال عام ہے۔ علمائے ادب نے اس باب میں مستقل کتابیں لکھی ہیں، جیسے: امثال میدانی اور خزینۃ الامثال وغیرہ ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٥٠) [2] تفسیر الطبري (١/ ٣٢٣)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٥٢) علامہ حکمت بشیر یاسین نے اس روایت کی سند پر مفصل بحث کرتے ہوئے اس کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: الصحیح المسبور (١/ ٤٦۔ ٤٩)

[4] تفسیر الطبري (١/ ٣٢٣) [5] تفسیر الطبري (١/ ٣١٨)

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ يَجْعَلُوْنَ
اَصَابِعَهُمْ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ
بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ كُلَّمَاۤ اَضَآءَ لَهُمْ
مَّشَوْا فِيْهِ وَاِذَاۤ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ
بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾

یا (ان کی مثال) زور دار بارش کی سی ہے جو آسمان سے (آتی) ہے، اس میں اندھیرے، گرج اور بجلی ہوتی ہے، وہ بجلی کے کڑکے سن کر موت کے ڈر سے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں اور اللہ کافروں کو گھیرنے والا ہے (19) قریب ہے کہ بجلی اُچک لے جائے ان کی آنکھیں۔ جب بجلی ان پر چمکتی ہے تو وہ اس (کی روشنی) میں چلنے لگتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا ہوتا ہے تو ٹھہر جاتے ہیں۔ اور اگر اللہ چاہے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں چھین لے، یقیناً اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے (20)

یعنی دینِ اسلام میں بالآخر سب نعمت ہی نعمت ہے۔ گو ابتدا میں کچھ محنت و زحمت ہو، جیسے بارش کہ اس کے شروع میں پہلے کڑک اور چمک ہوتی ہے، لیکن اس کا انجام خوش حالی اور آبادی ہے۔ لہٰذا جو لوگ منافق ہیں، وہ ابتدا میں احکامِ الٰہیہ سے ڈر جاتے ہیں، انھیں وہ ایک آفت نظر آتے ہیں، جیسے بجلی میں کبھی اُجالا کبھی اندھیرا ہوتا ہے۔ اسی طرح منافق کے دل میں کبھی اقرار اور کبھی انکار رہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورت کے آغاز سے یہاں تک تین لوگوں کا حال بیان فرمایا ہے: ایک مومن کا، دوسرے کافر کا، جن کے دلوں پر مہر ہے، یعنی ان کی قسمت میں ایمان نہیں ہے اور تیسرے منافق کا، جو بہ ظاہر مسلمان ہیں، لیکن ان کا دل ایک طرف نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک دوسری مثال ہے، جو اللہ نے منافقوں کے لیے بیان فرمائی ہے، یہ وہ قوم ہے جو کبھی تو حق کا اظہار کرتی ہے اور کبھی شک۔ ان کے دل بارش کی مثل ہمیشہ شک، کفر اور تردد میں رہتے ہیں۔ ظلمات سے مراد شک، کفر اور نفاق ہے۔

''رعد'' سے مراد خوف ہے۔ منافقوں کو ہمیشہ دہشت اور گھبراہٹ رہتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ﴾ [المنافقون: ٤] ''وہ ہر اونچی آواز کو اپنے خلاف سمجھتے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿56﴾ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿57﴾ ﴾ [التوبة: ٥٦۔ ٥٧] ''اور وہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ بے شک وہ تم میں سے ہیں، حالاں کہ

وہ تم میں سے نہیں، بلکہ وہ تو ڈرپوک لوگ ہیں۔ اگر وہ کوئی پناہ کی جگہ یا غاریں یا کوئی اور گھس بیٹھنے کی جگہ پائیں تو اس کی طرف رسیاں تڑا کر ضرور بھاگ نکلیں۔''

''برق'' سے مراد ایمان کی چمک ہے۔ جو کبھی کبھی ان منافقوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے فرمایا کہ وہ کڑک کے ڈر سے کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے ہیں، لیکن اس کا کیا فائدہ؟ اللہ تو ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ وہ اس کی قدرت، مشیت اور ارادے سے نکل کر کہاں بھاگ سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ۝ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ مُّحِيْطٌ ۝ ﴾ [البروج: ۱۹۔ ۲۰] ''بلکہ کافر تو جھٹلانے میں لگے ہوئے ہیں۔ اور اللہ ہر طرف سے انھیں گھیرے ہوئے ہے۔''[1]

﴿ ظُلُمٰتٍ ﴾ (بصیغہ جمع) اس لیے کہا کہ ایک تاریکی رات کی ہوتی ہے، دوسری بادل کی اور تیسری بارش کی۔ رعد ایک فرشتے کا نام ہے، جو بادل کو ڈانٹتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ رعد کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک فرشتہ ہے۔ اس کے ہاتھ میں آگ کے کوڑے ہیں، جن سے وہ بادل کو جدھر اللہ چاہے، ہانکتا ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ یہ آواز کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ بادل کو ڈانٹ ہے کہ جہاں کا حکم ہے، وہیں جائے۔ یہود نے کہا: سچ ہے۔[2] الحدیث (ترمذی) اس کی سند میں اگرچہ کچھ کلام ہے، لیکن اکثر علما اسی طرف گئے ہیں۔

فلاسفہ و متکلمین کا یہ قول کہ ''رعد کی یہ آواز اجرامِ اَبر کی گڑگڑاہٹ ہے، یہ پانی زمین کے بخارات ہیں اور یہ بجلی بخارات کے ٹکراؤ سے نکلتی ہے''، بے اصل ہے۔ اس کی کوئی شرعی بنیاد نہیں ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ رعد ایک فرشتے کا نام ہے، جو بادل کو ہانکتا ہے۔ بجلی اس کے کوڑے کی چمک ہے۔ یہ کوڑا نور کا ہے۔ وہ اس سے بادل کو جھڑکتا ہے۔[3] اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور جمہور علمائے شریعت یہی کہتے ہیں کہ برق فرشتے کے ہاتھ میں ایک مخراق، یعنی پھاڑنے والا کوڑا ہے۔ جب وہ کسی ابر کو چابک مارتا ہے تو وہ ابر، جہاں کا اسے حکم ہوتا ہے، وہاں متفرق ہو کر چلا جاتا یا برستا ہے۔

''صاعقہ'' آگ کا ایک ٹکڑا ہے، جو شدت، غضب اور ضرب کے وقت فرشتے کے مخراق سے الگ ہو کر گرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ آگ فرشتے کے منہ سے نکلتی ہے۔ کسی نے کہا کہ نہیں، بلکہ رعد کی آواز کے وقت آسمان سے اترتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رعد اور صاعقہ کی آواز سنتے تھے تو یہ دعا

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۷۷)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۱۱۷) وقال: "هذا حديث حسن غريب" السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۱۸۷۲)

[3] تفسير الطبري (۱/ ۳۴۳) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔

پڑھتے تھے:«اَللّٰھُمَّ لَا تَقْتُلْنَا بِغَضَبِكَ وَلَا تُهْلِكْنَا بِعَذَابِكَ وَعَافِنَا قَبْلَ ذٰلِكَ» [الٰہی! ہمیں اپنے غضب کے ساتھ نہ مارنا اور اپنے عذاب کے ساتھ ہلاک نہ کرنا، بلکہ ہمیں اس سے پہلے ہی عافیت سے نواز دینا] اس حدیث کو امام ترمذی نے غریب کہا ہے۔[1] غریب حدیث صحیح کی ایک قسم ہے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ معلوم ہوتا ہے قرآنِ محکم نے منافقوں کے سارے عیب بتا دیے ہیں۔ جب ان کو اسلام سے کچھ عزت ملتی ہے تو وہ مطمئن ہو جاتے ہیں اور جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کافر ہونے پر تیار ہو جاتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ ﴾ [الحج: ١١] ''اور لوگوں میں سے کوئی اللہ کی عبادت کرتا ہے کنارے (شک) پر، پھر اگر اسے بھلائی مل گئی تو اس پر مطمئن ہو گیا۔''[3]

میں نے ایک عیسائی جوان دیکھا جس نے مسلمان بن کر قرآن پڑھنا شروع کیا اور کئی ماہ تک یہ سلسلہ جاری رکھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شاید اس طرح ریاست میں کوئی معقول تنخواہ والی نوکری مل جائے گی، اتفاقاً اسے ملازمت نہ ملی تو وہ مرتد ہو کر پھر عیسائی ہو گیا۔ اکثر نومسلموں کا یہی حال دیکھا سنا جاتا ہے کہ دنیا کے لیے اسلام قبول کرتے ہیں۔ جب رزق کی تکلیف ہونے لگتی ہے تو اسلام چھوڑ کر پھر کفر اختیار کر لیتے ہیں۔ اخلاص اس وقت عنقا (نایاب) اور کیمیا (نہایت مشکل) ہو گیا ہے۔ وہ پرانے مسلمانوں میں بھی باقی نہیں رہا، نئے ایمان والوں کا تو ذکر ہی کیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ حق کو پہچانتے اور کہتے ہیں کہ ان کی بات میں استقامت ہے، مگر جب کفر کی طرف جھکتے ہیں تو حیران و سرگرداں ہو کر رہ جاتے ہیں۔[4] یہی قول اکثر صحابہ کا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اسی قول کو زیادہ صحیح اور واضح قرار دیا ہے۔ اسی طرح قیامت کے دن بھی ان کا یہی حال ہو گا کہ جب لوگوں کو ان کے ایمان کے مطابق نور دیا جائے گا، کسی کو کئی میل تک، کسی کو اس سے کم یا اس سے زیادہ، پھر کسی کا نور کبھی بجھے گا، کبھی چمکے گا، کوئی ایک بار پل صراط پر چلے گا، پھر ٹھہر جائے گا اور کسی کا نور بالکل بجھ جائے گا۔ یہ وہ خالص منافق ہوں گے، جن کے حق میں فرمایا گیا ہے: ﴿ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٥٠) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٢٣٠) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٠٤٢)

[2] یہ قول علی الاطلاق صحیح نہیں، بلکہ غریب حدیث اس کو کہتے ہیں جس کی سند کے کسی طبقے میں صرف ایک راوی ہو۔ ایسی حدیث ضعیف بھی ہو سکتی ہے، اگر راوی ضعیف ہو یا کوئی اور علتِ قادحہ اس میں ہو۔ اگر اس میں ضعف کی کوئی علت نہیں ہو گی تو وہ صحیح ہو گی۔ یعنی محض غریب السند ہونا، روایت کے ضعف یا صحت کی علامت نہیں۔ [ص۔ی]

[3] تفسير الطبري (١/ ٣٤٩) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٥٧) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحيح المسبور (١/ ٤٦۔ ٤٩)

[4] تفسير الطبري (١/ ٣٤٦) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٥٨) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحيح المسبور (١/ ٣٧۔ ٤٥)

اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ﴾ [الحديد: ١٣] ''اس دن منافق مرد اور منافق عورتیں اُن لوگوں سے جو ایمان لائے، کہیں گے: تم ہمارا انتظار کرو کہ ہم بھی تمھارے نور سے کچھ روشنی حاصل کر لیں۔ (ان سے) کہا جائے گا: اپنے پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ، پھر نور تلاش کرو۔''

مومنین کے حق میں یوں فرمایا گیا ہے: ﴿ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ [الحديد: ١٢] ''اس دن آپ ایمان والوں اور ایمان والیوں کو دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں دوڑتا ہوگا۔ (کہا جائے گا:) آج تمھیں ایسے باغات کی بشارت ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [التحريم: ٨] ''اس دن جب اللہ نبی کو اور اس کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہیں کرے گا، ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں دوڑتا ہوگا، وہ کہیں گے: (اے) ہمارے رب! ہمارے لیے ہمارا نور پورا کر اور ہماری مغفرت فرما، بے شک تو ہر چیز پر خوب قادر ہے۔''[1]

''اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔'' اس سے کسی استثنا کے بغیر قدرتِ الٰہی کا عموم ثابت ہوا۔ کوئی بھی چیز کیسی ہی مشکل کیوں نہ ہو، اللہ سب پر قادر ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ حادث اپنے حدوث کے وقت اور ممکن اپنے بقا کے وقت بھی مقدوراتِ الٰہی میں داخل ہیں۔ معتزلہ کا یہ خیال ہے کہ استطاعت فعل سے پہلے ہوتی ہے، ان کا یہ خیال صحیح نہیں۔ اس جگہ قدرت کا ذکر منافقین کو ڈرانے کے لیے فرمایا ہے، تاکہ اللہ کی سطوت (رعب و طاقت) سے ڈر کر نفاق ترک کر دیں اور یہ بات سمجھ لیں کہ اگر اللہ ان کو اندھا، بہرا کر دے تو کیا بعید (مشکل) ہے، کیوں کہ ہر چیز اس کے احاطے میں ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ قادر و محیط کے سامنے ان کا یہ نفاق کسی طرح چل نہ سکے گا۔ غرض یہ مثال اللہ نے منافقوں کے لیے بیان کی ہے۔ منافق دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک اعتقادی جو ظاہر میں مسلمان اور باطن میں کافر اور شیطان ہوتے ہیں۔ دوسرے عملی جن کے حق میں یوں فرمایا گیا ہے کہ تین چیزیں ہیں، جس میں وہ ہوں گی تو وہ خالص منافق ہے اور جس میں ایک ہی چیز ہو تو اس میں نفاق کی ایک ہی خصلت ہے، جب تک کہ اس خصلت کو چھوڑ نہ دے: ① جب بات کرے تو جھوٹ کہے، ② جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے، ③ جب اس کے پاس امانت رکھوائی جائے تو خیانت کرے۔[2] (صحيح بخاري و مسلم عن ابن عمرو)

---

① تفسیر ابن کثیر (١/ ٧٧، ٧٨)

② صحیح بخاری و مسلم میں ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے بجائے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩) البتہ دوسری اور تیسری روایت سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے۔

دوسری روایت میں چوتھی چیز یہ آئی ہے کہ جب لڑے تو گالی بکے۔ تیسری روایت میں پانچویں چیز یہ آئی ہے کہ جب عہد کرے تو توڑ ڈالے۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ انسان میں کبھی ایمان کی ایک شاخ ہوتی ہے اور دوسری نفاق کی، خواہ نفاقِ عملی ہو، جس طرح کہ اس حدیث میں آیا ہے یا اعتقادی ہو، جیسے آیت سے ثابت ہوا۔ اکثر سلف اور بعض علما کا یہی قول ہے کہ یہ بات ویسی ہی ہے، جیسے قرآن میں فرمایا گیا ہے: ﴿ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴾ [یوسف: ۱۰۶] ''اور ان کے اکثر اللہ پر (اس طرح) ایمان لاتے ہیں کہ وہ مشرک ہی ہوتے ہیں۔'' معلوم ہوا کہ اکثر باطنی شرک، ظاہری ایمان کے ساتھ جمع ہو جاتا ہے، گو کوئی فائدہ نہ دے، پس جس طرح شرک، ایمان کو تباہ کر دیتا ہے، اسی طرح نفاق، اِخلاص کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ کفر و نفاق کا باہمی تعلق دامن اور گریبان کی مثل ہے۔ اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہاں تک اللہ نے کئی قسم کے آدمیوں کا ذکر فرمایا ہے، ایک خالص مومنوں کا، ان کے اوصاف چار آیتوں میں گزر چکے ہیں۔ دوسرے خالص کفار کا، ان کا ذکر دو آیتوں میں بیان ہوا ہے۔ تیسرے خالص منافقوں کا، ان کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جن کے لیے آگ سلگانے کی مثال دی گئی ہے۔ دوسرے وہ جو متردد ہیں۔ کبھی ایمان ظاہر کرتے ہیں اور کبھی چھپاتے ہیں۔ ان کی مثال بارش سے دی گئی ہے۔ یہ پہلی قسم سے قدرے ہلکے ہیں۔ یہ مقام بعض وجوہ سے اس ضرب المثل کے مشابہ ہے، جس کا ذکر سورۃ النور میں ہے۔ مومن کی مثال وہاں چراغ اور فانوس سے دی گئی ہے۔ مثالِ مذکور پر مفصل گفتگو اس کی جگہ آئے گی۔

پھر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ کہا ہے کہ اس کے بعد اللہ نے ان کفار کی مثال بیان کی ہے، جن کا یہ خیال ہے کہ وہ کچھ دین رکھتے ہیں، حالاں کہ وہ کچھ بھی نہیں ہیں، بلکہ جہلِ مرکب کے اسیر ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۚ حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا ﴾ [النور: ۳۹] ''اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال چٹیل میدان میں ریت کی طرح ہیں، پیاسا اس (ریت) کو پانی سمجھتا رہا، حتی کہ جب وہ اس کے پاس پہنچا تو اس نے وہاں کچھ بھی نہ پایا۔'' پھر ان کافروں کی مثال بیان کی، جو جہلِ بسیط میں مبتلا ہیں۔ ان کے حق میں یہ فرمایا: ﴿ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّـجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴾ [النور: ۴۰] ''یا (کافروں کے اعمال) گہرے سمندر میں اندھیروں کی طرح ہیں، جسے ایک موج ڈھانپتی ہو، اس کے اوپر ایک اور موج ہو، اس کے اوپر بادل ہو، (غرض) اوپر تلے اندھیرے (ہی اندھیرے) ہوں، جب وہ اپنا ہاتھ نکالے تو لگتا نہیں کہ اسے دیکھ سکے، اور جس کے لیے اللہ نے نور نہیں بنایا تو اس کے لیے (کہیں بھی) کوئی نور نہیں۔''

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٨)

غرض کفار کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں: ایک داعی اور دوسری مقلد، چناں چہ ان دونوں کا ذکر سورۃ الحج کے آغاز میں اس طرح آیا ہے: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ﴾ [الحج: ۳] ''اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں علم کے بغیر بحث کرتے ہیں، اور وہ ہر سرکش شیطان کی اتباع کرتے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ﴾ [الحج: ۸] ''اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کے بارے میں بغیر علم، بغیر ہدایت اور بغیر روشن کتاب کے بحث کرتے ہیں۔'' اسی طرح اللہ نے مومنوں کی تقسیم کی، جیسے سورت واقعہ کے اول اور اسی سورت کے آخر میں اور سورت نساء میں دو قسمیں بیان فرمائیں، ایک سابقین، جو مقربین کہلاتے ہیں اور دوسرے اصحاب یمین، جن کو ابرار کہتے ہیں۔

ان آیات کے مجموعے کا حاصل یہ ہے کہ مومنوں کی دو قسمیں ہیں: مقربین اور ابرار۔ اسی طرح کفار کی بھی دو قسمیں ہیں: داعی اور مقلد۔ نیز منافق بھی دو طرح کے ہیں: ایک خالص منافق، دوسرے وہ جن میں نفاق کا کوئی شعبہ ہے، جس طرح پہلے ابن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث میں گزرا۔ سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ دل چار طرح کے ہوتے ہیں: ایک ''اجرد'' اس میں چراغ سا جلتا ہے۔ اجرد برہنہ کو کہتے ہیں۔ دوسرا ''اغلف''، جس کو غلاف میں باندھ دیا ہے۔ تیسرا ''منکوس''، یعنی اوندھا اور الٹا۔ چوتھا ''مصفح''۔ پس اجرد مومنِ کامل کا دل ہے۔ اس کا چراغ وہی نورِ ایمان ہے۔ اغلف کافر کا دل ہے۔ منکوس خالص منافق کا دل ہے کہ حق کو پہچان کر منکر ہو گیا۔ مصفح وہ دل ہے، جس میں ایمان و نفاق ہے، اس کے اندر ایمان کی مثال ایسی ہے، جیسے سبزی (ساگ وغیرہ) جس کو پاک پانی بڑھاتا ہے۔ اس کے اندر نفاق کی مثال ایسی ہے، جیسے پھوڑا کہ پیپ اور لہو اس کو بڑھاتا ہے۔ سو جو مادہ دوسرے مادے پر غالب آ گیا، وہی اس دل پر غالب ہو گیا۔[1] (مسند أحمد) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو جید اور حسن کہا ہے۔[2]

امام ابن جریر رحمہ اللہ وغیرہ مفسرین کہتے ہیں کہ آیت میں بیان کردہ دونوں مثالیں ایک ہی قسم کے منافقوں کے لیے ہیں۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ منافقوں کی جنس کے اعتبار سے ہے، کیوں کہ ان کی کئی قسمیں اور بھی ہیں، جن کے احوال و اوصاف کا ذکر اللہ نے سورت براءت میں کیا ہے اور اُن کے اقوال و افعال کی نشاندہی کی ہے۔ اس لیے ان دونوں مثالوں کو ان کے احوال و اوصاف کے اعتبار سے دو قسم کے منافقین کے لیے قرار دینا زیادہ صحیح ہے۔ واللّٰہ أعلم.

جس طرح سورت نور میں دو قسم کے کافروں کی دو مثالیں ذکر کی ہیں: ایک دعاۃ اور دوسرے مقلدین۔ پہلی قسم کے حق میں سراب کی مثال دی ہے، جس کو پیاسا شخص پانی سمجھتا ہے، یہ دعاۃ ہیں۔ دوسری قسم کے حق میں تاریک دریا کی مثال فرمائی ہے، یہ مقلدین ہیں۔ دعاۃ جہلِ مرکب میں گرفتار ہیں اور مقلدین جہلِ بسیط میں مبتلا ہیں۔[4] واللّٰہ أعلم، انتہی

---

[1] مسند أحمد (۳/ ۱۷) اس کی سند میں ''لیث بن ابی سلیم'' ضعیف ہے اور سند میں انقطاع بھی ہے۔

[2] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۷۸، ۷۹) [3] تفسیر الطبري (۱/ ۳۳۶۔ ۳۳۸) [4] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۷۹۔ ۸۰)

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٢١﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٢﴾

اے لوگو! تم اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمھیں پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم پرہیز گار بن جاؤ (21) وہ (رب) جس نے تمھارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت (بنایا) اور اس نے آسمان سے پانی نازل کیا، پھر اس کے ذریعے سے (کئی قسم کے) پھلوں سے تمھارے لیے رزق نکالا، پس تم اللہ کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ، اس حال میں کہ تم جانتے ہو (22)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول کہ ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ﴾ اہلِ مکہ کو خطاب ہے اور ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ اہلِ مدینہ کو خطاب ہے،[1] یہ اکثریت کے اعتبار سے ہے نہ کہ کلی طور پر (یعنی اکثر جگہوں پر ایسا ہے، ہر جگہ نہیں) کیوں کہ سورۃ البقرہ، سورۃ النساء اور سورت حجرات بالاتفاق مدنی سورتیں ہیں اور ان میں سے ہر سورت میں ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ﴾ آیا ہے اور یہ خطاب سارے مکلفین کے لیے عام ہے (صرف اہلِ مکہ مخاطب نہیں ہیں) نیز سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں ﴿ اعْبُدُوْا ﴾ آیا ہے، وہ ''وَحِّدُوْا'' کے معنی میں ہے، یعنی اللہ کی توحید اختیار کرو اور شرک سے بچو۔[2] پیدا کرنے کا ذکر اس جگہ اس لیے کیا ہے کہ سارے کافر اللہ کے خالق ہونے کا اقرار کرتے ہیں، جیسے فرمایا: ﴿ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ [الزخرف: ۸۷] ''اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ انھیں کس نے پیدا کیا تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے!'' اس لیے اسی بات کا احسان ان پر رکھا، جس کے وہ معترف تھے، تاکہ انکار نہ کر سکیں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ نے اپنی توحیدِ الوہیت کو بیان فرمایا ہے کہ اس انعام کو تو دیکھو کہ ہم نے تم کو معدوم سے موجود کیا، طرح طرح کی کھلی چھپی نعمتیں دیں، زمین کو پہاڑوں سے مضبوط کر کے تمھارے چلنے پھرنے کے لیے ایک فراش (بچھونا) اور آسمان کو چھت بنا دیا۔ جیسے فرمایا: ﴿ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ۚ وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿32﴾ ﴾ [الأنبياء: ۳۲] ''اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا، جبکہ وہ اس (آسمان) کی نشانیوں سے اعراض کرنے والے ہیں۔''[3] فتح البیان میں ہے کہ اگر کوئی آدمی اس جہان میں غور کرے تو

[1] تفسير الخازن (۱/ ۳۸) اللباب في علوم الكتاب (۱/ ٤٠٨)

[2] تفسير الطبري (۱/ ۳٦۳) تفسير ابن أبي حاتم (۱/ ٦٠) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحيح المسبور (۱/ ۳۷۔ ٤٥)

[3] تفسير ابن كثير (۱/ ۸٠)

کو ایک آباد گھر کے مانند پائے گا، جس میں ہر ضرورت کی چیز موجود ہے۔ آسمان کو دیکھو، چھت کی طرح بلند ہے۔ زمین کو دیکھو، فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے۔ تاروں کو دیکھو، چراغوں کی طرح روشن ہیں۔ انسان کو دیکھو، جیسے گھر کا کوئی مالک ہو، پھر اس گھر میں ہر طرح کی پیداوار، ہر طرح کے جانور اور ہر کام کی چیز انسان کے لیے موجود اور مہیا ہے، جس کی خدمت پر یہ سب اشیا مامور ہیں، لہٰذا اس پر واجب ہے کہ اللہ کا شکر بجا لائے اور یہ نعمتیں استعمال کر کے غفلت کا شکار نہ ہو۔[1]

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

''بادل، ہوا، آفتاب و ماہتاب اور فلک سب کام میں لگے ہوئے ہیں تاکہ تو روٹی ہاتھ میں پکڑے اور غفلت سے نہ کھائے۔''

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار شرط انصاف نہ باشد کہ تو فرماں نہ بری

''یہ تمام تیرے لیے پریشان اور فرماں بردار ہیں، یہ انصاف کی شرط نہیں کہ تو اطاعت شعاری سے کام نہ لے۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ آسمان سے مراد بادل ہے، یعنی اللہ نے ضرورت کے وقت بادل سے مینہ برسایا اور اس مینہ سے طرح طرح کی کھیتی اور پھل پیدا کیے۔ یہ مضمون قرآن پاک میں متعدد جگہ بیان ہوا ہے۔ یہ آیت بھی اس کے مشابہ ہے: ﴿ اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۖۚ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [المؤمن: ٦٤] ''اللہ وہ ہے جس نے زمین کو تمھارے لیے قرار گاہ اور آسمان کو چھت بنایا اور اس نے تمھاری صورتیں بنائیں تو بہت اچھی صورتیں بنائیں اور اس نے تمھیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا، یہی اللہ تمھارا رب ہے، سو اللہ رب العالمین بہت بابرکت ہے۔''

مطلب یہ ہوا کہ جب اس گھر کا خالق، رازق اور مالک وہی ایک اللہ ہے، جس نے یہ سب کچھ بنایا ہے تو اسی ایک وحدہ لا شریک لہ کی عبادت کرنی چاہیے نہ کہ کسی دوسرے کی بھی۔ غیر کو اس کی عبادت میں شریک نہ کیا جائے۔ صحیح بخاری و مسلم میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! اللہ کے نزدیک کون سا گناہ بہت بڑا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ گناہ کہ تو کسی کو اس کے برابر ٹھہرائے، حالاں کہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے۔[2] الحدیث۔ اسی طرح حدیثِ معاذ رضی اللہ عنہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: تو جانتا ہے کہ اللہ کا حق اس کے بندوں پر کیا ہے؟ پھر فرمایا: اللہ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ بندے اس کی عبادت کریں، کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔[3] الحدیث۔ تیسری حدیث میں ہے کہ تم میں سے کوئی شخص یوں نہ کہا کرے: «مَا شَاءَ اللّٰهُ وَشَاءَ فُلَانٌ» ''جو اللہ چاہے اور فلاں چاہے۔'' بلکہ یوں کہو: «مَا شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ شَاءَ فُلَانٌ»[4] ''جو

---

[1] فتح البیان (١/ ١٠٤) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٢٠٧) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٦)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٧٠١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٣٠)

[4] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٩٨٠) سنن النسائي الکبریٰ (٦/ ٢٤٥) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (١٣٧)

اللہ نے چاہا، پھر جو فلاں نے چاہا۔'' یعنی کسی کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا، جب تک کہ اللہ نہ چاہے۔ جب پہلے اللہ چاہ لیتا ہے، تب ہی کسی اور کے چاہنے کا فائدہ ہوتا ہے، وگرنہ نہیں ۔

چاہا ہم نے ولے نہ چاہا اس نے　　　　چاہا اس کا ہوا ہمارا نہ ہوا

سیدنا طفیل بن سخبرہ رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی یوں کہے: ((مَا شَآءَ اللّٰهُ وَشَآءَ مُحَمَّد)) ''جو اللہ چاہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں۔'' بلکہ یوں کہوں: ((مَا شَآءَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ)) ''جو صرف اکیلا اللہ چاہے۔''[1] (ابن مردویه) اس کو ابن ماجہ نے بھی ان سے ملتے جلتے الفاظ میں ایک دوسری سند سے روایت کیا ہے۔[2] سفیان ثوری رحمہ اللہ کی روایت میں بھی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے کہا: ''مَا شَآءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ'' ''جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں۔'' تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تو نے مجھے اللہ کے برابر ٹھہرا دیا؟ اس طرح کہو: ((مَا شَآءَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ)) ''جو صرف اکیلا اللہ چاہے۔''[3] (ابن مردويه، نسائي، ابن ماجه) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تاکید اور وضاحت اس لیے ہے کہ توحید کا مسئلہ بے غبار اور محفوظ رہے۔[4] فتح البیان میں ہے کہ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ دلیل و حجت استعمال کرنا اور تقلید ترک کرنا واجب ہے۔[5]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ ﴾ ''اے لوگو! تم اپنے رب کی عبادت کرو۔'' میں کفار اور منافقین دونوں گروہوں کو خطاب ہے۔[6] پھر فرمایا: ''تم جانتے ہو کہ یہ توحید جس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو بلاتے ہیں، بلاشبہ یہی حق ہے، پھر تم کیوں کسی اور کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہو، جو نفع دے سکتا ہے نہ نقصان پہنچا سکتا ہے؟''

أنداد بنانے سے مراد شرک ہے۔ یہ شرک اس چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی ہے، جو اندھیری رات میں کسی کالے پتھر پر چلتی ہے۔ اللہ کے ساتھ برابری اور شرک اس طرح ہوتا ہے کہ یوں کہا جائے: اللہ کی قسم اور تیری جان کی قسم! یا کوئی یوں کہے کہ اگر یہ کتا یا یہ بطخ گھر میں نہ ہوتی تو چور گھس کر چوری کر لے جاتے یا کسی سے یہ کہے کہ اگر اللہ اور تو چاہے گا تو یوں ہوگا یا اگر اللہ اور فلاں شخص نہ ہوتا تو یوں ہوتا۔ یہ سب باتیں اللہ کے ساتھ شرک کرنے کی ہیں۔ اس کی نظیر یہ ہے جیسے بعض جاہل حاجت مند کسی امیر یا دولت مند سے یہ کہتے ہیں کہ اوپر اللہ ہے اور نیچے آپ

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٧٢) مستدرك الحاكم (٣/ ٥٢٣) تفسير ابن كثير (١/ ٨٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣٨)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١١٨) امام البانی رحمہ اللہ نے "السلسلة الصحيحة" میں ۱۳۷ نمبر روایت کے تحت اس حدیث کو ذکر کرتے ہوئے کہا ہے: "وهو سند صحيح في الظاهر، فإن رجاله كلهم ثقات"

[3] مسند أحمد (١/ ٢٨٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٢٤٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١١٧)

[4] تفسير ابن كثير (١/ ٨٠)　　[5] فتح البيان (١/ ١٠٥)

[6] تفسير الطبري (١/ ٣٦٣) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٥٩۔ ٦٠) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحيح المسبور (١/ ٣٧۔ ٤٥)

ہیں۔ اس طرح کہنا شرک ہے، جس سے بچنا چاہیے۔ سننے والا بھی اگر اسے اس طرح کہنے سے منع نہیں کرے گا تو خطرہ ہے کہ وہ بھی شرک کی زد میں نہ آ جائے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت توحید باری تعالیٰ پر دلیل ہے، یعنی صرف ایک اللہ کی عبادت کی جائے اور اس میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ بہت سے مفسرین نے اس آیت سے صانع عالم (کائنات کے بنانے والے) کے وجود پر استدلال کیا ہے، جیسے امام رازی رحمہ اللہ وغیرہ۔ پس جس طرح یہ آیت صانع عالم (کائنات کے بنانے والے) کے وجود پر دلالت کرتی ہے، اسی طرح یہ آیت توحیدِ عبادت پر بھی بہ طریقِ اولیٰ دلیل ہے، کیوں کہ جو شخص ان زیریں اور بالا موجودات، اَشکال واَلوان اور طبائع و منافع کے اختلاف میں غور کرے گا اور دیکھے گا کہ ان منافع کو ان کی جگہوں میں کس عمدہ طریق سے رکھا گیا ہے تو ضرور ہی وہ ان سب کے خالق کی قدرت وحکمت، علم واتقان اور عظمتِ سلطان کو معلوم کر لے گا۔ جیسے ایک اعرابی، یعنی گنوار آدمی سے کسی نے پوچھا کہ اللہ کے وجود پر کیا دلیل ہے؟ تو اس نے جواب دیا:

”سُبْحَانَ اللّٰهِ! إِنَّ الْبَعْرَ لَيَدُلُّ عَلَى الْبَعِيْرِ، وَإِنَّ أَثَرَ الْأَقْدَامِ لَيَدُلُّ عَلَى الْمَسِيْرِ، فَسَمَاءٌ ذَاتُ أَبْرَاجٍ، وَأَرْضٌ ذَاتُ فِجَاجٍ، وَبِحَارٌ ذَاتُ أَمْوَاجٍ، أَلَا تَدُلُّ عَلٰى وُجُوْدِ اللَّطِيْفِ الْخَبِيْرِ؟!“ یعنی تعجب کی بات ہے کہ مینگنی اونٹ پر دلالت کرتی ہے، قدموں کے نشان چلنے پر دلالت کرتے ہیں تو کیا یہ بُرجوں والا آسمان اور راستوں والی یہ زمین اور موجیں مارنے والے یہ دریا؛ اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلالت نہیں کرتے ہیں؟!

امام رازی رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید نے ان سے پوچھا کہ اللہ کے وجود کی کیا دلیل ہے؟ انھوں نے قرآن کریم کی بیان کردہ اس حقیقت سے استدلال کیا کہ زبانوں، آوازوں اور رنگوں کے اختلاف میں بڑی نشانی ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے ایک زندیق نے اللہ کے وجود کی بابت سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ مجھے ایک خبر پہنچی ہے۔ میں اس کی فکر میں ہوں کہ یہ کس طرح ممکن ہے؟ مجھے بتلایا گیا ہے کہ دریا میں ایک کشتی طرح طرح کے سامانِ تجارت کے ساتھ بھری ہوئی چلی جاتی ہے، کوئی اس کا نگہبان اور ملاح (چلانے والا) نہیں۔ وہ خود ہی ساحل پر آتی ہے اور سامانِ تجارت بھر کر چلی جاتی ہے اور دوسرے ساحل پر پہنچ کر خود ہی سامان اتار دیتی اور پھر واپس چل پڑتی ہے۔ یہ سارا کام از خود کرتی ہے، بڑی بڑی موجوں کو خود ہی چیر کر اپنا راستہ بناتی اور بڑے بڑے طوفانوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے خود ہی چلتی پھرتی اور سامان بھرتی اور اُتارتی ہے۔ لوگوں نے کہا کہ یہ تو کسی طرح ممکن نہیں، عقل کسی طرح اس بات کو صحیح نہیں سمجھ سکتی۔ امام صاحب نے فرمایا: اگر یہ نہیں ہو سکتا تو کم عقلو! یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ یہ ساری کائنات جس میں عالمِ سفلی وعلوی بھی ہے اور یہ مضبوط ومحکم چیزیں، جو اس میں پائی جاتی ہیں۔ کیا

کسی صانع کے بغیر یہ کائنات اور اس کا ایک منظم سلسلہ چل رہا ہے؟ کوئی اس کا بنانے والا اور چلانے والا نہیں ہے؟ سب لوگ لاجواب ہو کر اسلام لائے اور حق کی طرف لوٹ آئے۔

اسی طرح کسی نے امام شافعی رحمہ اللہ سے پوچھا تو انھوں نے جواب دیا کہ دیکھو! یہ توت کے پتے ہیں۔ ان کا ایک ہی مزا ہے۔ مگر اسے کیڑا کھاتا ہے تو اس سے ریشم بنتا ہے۔ شہد کی مکھی کھاتی ہے تو شہد بنتا ہے۔ گائے بکری کھاتی ہے تو مینگنی اور گوبر ہو جاتا ہے۔ ہرن کھاتا ہے تو کستوری نکلتی ہے، حالاں کہ یہ سب ایک ہی چیز ہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ سے بھی یہی سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہاں ایک چکنا مضبوط قلعہ ہے۔ باہر سے سفید چاندی اور اندر سے صاف سونے کی طرح، اچانک اس قلعے کی دیوار ٹوٹ جاتی ہے اور اس میں سے ایک سنتا دیکھتا جانور نکلتا ہے۔ خوش شکل اور نمکین آواز والا، یعنی انڈے سے چوزے کا نکلنا، کیا یہ از خود ہو سکتا ہے؟[1] بعض نے کہا ہے کہ جو کوئی ان آسمانوں کی اونچائی اور کشادگی میں تأمل کرے گا، چھوٹے بڑے تارے چلتے اور ٹھہرے ہوئے دیکھے گا، فلکِ اعظم کا رات دن چکر لگانا اور اپنی خاص چال پر چلنا جان لے گا۔ نیز ان دریاؤں کو دیکھے گا، جو ہر طرف سے زمین کو گھیرے ہوئے ہیں اور پہاڑ زمین پر رکھے ہوئے ہیں، تاکہ زمین اور زمین والے ٹھہرے رہیں، نہ زمین ڈولے اور نہ اس پر رہنے والے پریشان ہوں، پھر ان کی شکلوں اور رنگوں کے اختلاف کو دیکھے گا تو یقیناً جان لے گا کہ کوئی ہستی ایسی ہے، جو یہ سارے کام کرنے والی ہے اور وہ اللہ کی ہستی ہے، جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ۝ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ۗ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۗ ﴾ [الفاطر: ۲۷۔ ۲۸] ''اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ گھاٹیاں ہیں، ان کے رنگ مختلف ہیں اور بہت گہری سیاہ (بھی)۔ اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور چوپایوں میں سے بھی (ایسے ہیں کہ) ان کے رنگ مختلف ہیں، بس اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف علما ہی ڈرتے ہیں۔''

اسی طرح ان نالوں ندیوں میں غور کرے گا، جو ایک طرف سے دوسری طرف کو بہتے ہیں اور ہر جگہ نفع پہنچانے کے لیے جاری ہیں، پھر ان طرح طرح کے جانوروں کو دیکھے گا جو زمین پر پھیلے ہوئے ہیں، اس گھاس پھوس اور پھولوں کو ملاحظہ کرے گا جن کی شکل، مزہ، بو اور رنگت، آب و خاک کی طبیعت کے ایک ہونے کے باوجود مختلف ہے، تو وہ ضرور سمجھ لے گا کہ یہ سب اللہ کے وجود، اس کی قدرت اور حکمتِ صانع پر دلیل ہے۔ عام مخلوق پر یہ رحمت، یہ لطف و احسان، جس میں انسان اور غیر انسان سب شامل ہیں، بغیر کسی صانع کے کیوں کر ہو سکتا ہے؟ اس کے سوا کوئی معبود ہے نہ رب، میرا اسی پر توکل اور اسی کی طرف رجوع ہے۔ اسی طرح کی آیات قرآنِ عظیم میں کثرت سے ہیں۔[2]

[1] تفسير الرازي (۲/ ۹۱)
[2] تفسير ابن كثير (۱/ ۸۲۔ ۸۳)

وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ
وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۲۳﴾
فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىۡ وَقُوۡدُهَا
النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۴﴾

اور اگر تم اس (قرآن) کے متعلق شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا تو تم اس جیسی ایک سورت لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے مددگاروں کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو (23) چناں چہ اگر تم (یہ کام) نہ کر سکو اور تم کر بھی نہیں سکو گے، تو اس آگ سے بچو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور (وہ) کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے (24)

قرآنِ کریم کا اعجاز:

مسئلہ توحید کی وضاحت کے بعد اب نبوت کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ کافروں سے مخاطب ہو کر اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر تم کو اس کتاب میں، جو ہم نے اپنے بندے محمد ﷺ پر اُتاری، کچھ شک ہے اور تم اس کو غیر اللہ کی طرف سے سمجھتے ہو تو تم بھی اس کی مثل بنا لاؤ اور اس کام کے لیے جس سے چاہو مدد لو۔ اللہ کے علاوہ جن کی تم پوجا کرتے ہو، ان سے اس کام میں تعاون حاصل کر لو۔ اگر یہ کتاب اللہ جل جلالہ کا کلام نہیں تو تم بھی ایسی کتاب اکیلے یا مل کر بنا لاؤ گے اور اگر نہ بنا سکو تو سمجھ لینا، اس کتاب سے تمھارا انکار کرنا ناجائز ہے اور تم اس میں ناحق شک کرتے ہو۔

اس طرح کا دعویٰ قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے اور منکرین کو مقابلے کے لیے کھلا چیلنج دیا گیا ہے۔ سورت قصص [آیت: ۴۹] میں فرمایا ہے: ﴿ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِكِتٰبٍ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ هُوَ اَهۡدٰى مِنۡهُمَاۤ اَتَّبِعۡهُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿49﴾ ﴾ ”کہہ دیجیے: اگر تم سچے ہو تو اللہ کے پاس سے کوئی ایسی کتاب لے آؤ جو (ان) دونوں سے زیادہ ہدایت والی ہو، تاکہ میں بھی اس کی اتباع کروں۔“

اسی طرح سورۃ الاسراء [آیت: ۸۸] میں فرمایا: ﴿ قُلۡ لَّئِنِ اجۡتَمَعَتِ الۡاِنۡسُ وَالۡجِنُّ عَلٰٓى اَنۡ يَّاۡتُوۡا بِمِثۡلِ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ لَا يَاۡتُوۡنَ بِمِثۡلِهٖ وَلَوۡ كَانَ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ ظَهِيۡرًا ﴿88﴾ ﴾ ”کہہ دیجیے: البتہ اگر تمام انسان اور جن اس (بات) پر جمع ہو جائیں کہ اس قرآن کی مثل لائیں تو وہ اس کی مثال نہ لا سکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں۔“ سورت ھود [آیت: ۱۳] میں فرمایا: ﴿ اَمۡ يَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰٮهُ‌ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِهٖ مُفۡتَرَيٰتٍ وَّادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿13﴾ ﴾ ”کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے یہ (قرآن) خود گھڑ لیا ہے؟ کہہ دیجیے: پھر تم بھی اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں لے آؤ اور اللہ کے سوا جنھیں (مدد کے لیے) بلا سکتے ہو بلا لو،

اگر تم سچے ہو۔'' سورت یونس [آیت: ۳۷۔ ۳۸] میں فرمایا: ﴿ وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ یُّفْتَرٰی مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِیْقَ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَتَفْصِیْلَ الْكِتٰبِ لَا رَیْبَ فِیْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ ﴾ ''اور یہ قرآن (ایسا) نہیں کہ غیر اللہ کی طرف سے گھڑ لیا گیا ہو، بلکہ یہ تو ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے کی ہیں اوز ان تمام کتابوں کی تفصیل (بیان کرتا) ہے، اس میں کوئی شک نہیں، (یہ) رب العالمین کی طرف سے ہے۔ کیا وہ (کافر) کہتے ہیں کہ اس (رسول) نے اسے گھڑ لیا ہے؟ (اے نبی!) کہہ دیجیے: تو تم اس جیسی ایک ہی سورت لے آؤ اور (اس میں مدد کے لیے) اللہ کے سوا جن کو بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم سچے ہو۔''

یہ ساری آیات مکہ میں اتری ہیں۔ پھر یہی چیلنج ان کو مدینہ میں بھی دیا گیا کہ اگر تم کو اس قرآن میں کچھ شک ہے تو اس قرآن جیسی کوئی ایک سورت بنا لاؤ۔ اسی کو امام ابن جریر طبری، زمخشری اور امام رازی رحمہم اللہ وغیرہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین اور محققین کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے اور اسے ہی ترجیح دی ہے۔[1] حاصل یہ ہے کہ یہ چیلنج سب کو دیا گیا، خواہ متفرق ہوں یا مجتمع، اُمی ہوں یا کتابی، اگر صرف امیین (اَن پڑھ عربوں) کو یہ چیلنج ہوتا تو اس میں اس قدر عموم و شمول نہ ہوتا، دس آیات سے لے کر ایک آیت تک، یہ کہا کہ تم اس کے مثل پیش کرو۔ علاوہ ازیں یہ چیلنج مکہ اور مدینہ میں متعدد مرتبہ دیا گیا اور یہ بھی واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کافروں کی دشمنی اور دینِ اسلام سے ان کا بغض بے حساب تھا، مگر اس شدتِ عداوت کے باوجود قرآن کریم کے مقابلے سے وہ بالکل عاجز نکلے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یقیناً تم ایسا نہیں کر سکو گے، یعنی اب نہ آیندہ ہوگا۔ یہ ایک دوسرا معجزہ ہوا کہ قطعی خبر دی کہ یہ بات ہرگز قیامت تک ان سے نہ ہو سکے گی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا۔ اس زمانے سے لے کر ہمارے زمانے تک کسی نے مقابلہ نہیں کیا، نہ یہ معارضہ (مقابلہ) ہو سکتا ہے۔ یہ معارضہ کوئی کس طرح کر سکتا ہے، قرآن اس اللہ کا کلام ہے، جو ہر چیز کا خالق ہے، بھلا مخلوق کی بات خالق کی بات کی طرح ہو سکتی ہے؟ جو قرآن میں غور کرے گا، اسے کھلے اور چھپے بہت سے وجوہِ اعجاز لفظاً و معناً معلوم ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ الٓرٰ ۫ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِیْمٍ خَبِیْرٍ ۝ ﴾ [هود: ۱] ''الٓرٰ (یہ وہ) کتاب ہے جس کی آیتیں محکم کی گئی ہیں، پھر تفصیل سے بیان کی گئی ہیں، بڑی حکمت والے، بہت خبر رکھنے والے کی طرف سے۔''

معلوم ہوا کہ اس کتاب کے الفاظ محکم ہیں اور معانی مفصل ہیں، یا اس کے برعکس ہیں، غرض کہ کچھ بھی ہو، الفاظ اور معانی دونوں فصیح اور معجز ہیں۔ کس کے اندر یہ قدرت ہے کہ اس کا مقابلہ کر سکے اور اس کی طرح گذشتہ چھپی

[1] تفسیر الطبري (۱/ ۳۷٤) الکشاف (۱/ ۱۲۸۔ ۱۲۹) تفسیر الرازي (۲/ ۱۰۹)

باتیں بیان کر سکے، جن کی خبر قرآن پاک نے دی ہے اور وہ ساری باتیں درست ہیں، پھر ہر خیر کا حکم اور ہر شر سے منع فرمایا۔ جیسے فرمایا: ﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ﴾ [الأنعام: ١١٥] ''اور آپ کے رب کی بات صدق اور عدل میں مکمل ہے۔'' یعنی اللہ کی یہ باتیں خبروں کے اعتبار سے صادق ہیں اور احکام میں عادل ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا سارا کلام حق وصدق اور عدل و ہدایت ہے، نہ یہ گپ شپ ہے نہ جھوٹ اور نہ کسی طرح کا افترا ہے، جس طرح عربوں کے اَشعار وغیرہ میں لاف وگزاف ہوتا اور دروغ بندی کی جاتی ہے، بلکہ بعض نقاد کا کہنا ہے کہ زیادہ شیریں شعر وہ ہوتا ہے، جس میں جھوٹ زیادہ ہو۔ ذرا کسی طویل قصیدے کو دیکھو، اس کے بیشتر اشعار عورتوں، گھوڑوں، شراب یا کسی مخصوص شخص کی تعریف یا اونٹنی کے ذکر یا جنگ یا کسی درندے کے اندیشے یا کسی مشہور شے کے بیان میں ہوتے ہیں، جس سے شاعر کی قدرتِ بیان کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ پھر اس غزل یا قصیدے میں ایک دو شعر ہی عمدہ ہوتے ہیں کہ جن کو بیت الغزل یا بیت القصیدہ کہہ سکتے ہیں، باقی سارے اشعار ہذیان وطغیان کے سوا کچھ نہیں ہوتے۔

اس کے برعکس قرآن کریم ہے، جو اول سے آخر تک نہایت درجہ فصاحت اور غایت درجہ بلاغت پر مبنی ہے۔ اس بات کو وہ شخص اچھی طرح جانتا ہے، جو کلامِ عرب سے اجمالاً یا تفصیلاً واقف ہے۔ نیز عبارت کی تبدیلی اور اُسلوبِ بیان کو سمجھتا ہے۔ قرآن کے بیان کردہ واقعات و اخبار میں غور کرو، ان میں کس درجہ حلاوت (شیرینی) ہے، خواہ وہ مفصل ہیں یا مختصر، مکرر ہیں یا تکرار کے بغیر۔ علاوہ ازیں جو مکرر ہیں، ان کی حلاوت اور بلندی کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں کہ قندِ مکرر کا مزہ آتا ہے۔ کتنا ہی تکرار کرو، بار بار پڑھے سنے جاؤ، نہ پرانا ہوتا ہے، نہ علما اس سے اُکتاتے ہیں، نہ جی گھبراتا ہے، نہ دل میں کوئی وحشت ہی پیدا ہوتی ہے۔ وعید وتہدید کو اگر دیکھو تو بڑے بڑے سخت درشت پہاڑ ہل جائیں، پھر ان دلوں کا کیا ذکر ہے، جن کو کچھ فہم وشعور حاصل ہے!!

اللہ کے وعدوں کو دیکھو تو ایسے کہ جن سے دل اور کان کھل جائیں، دارالسلام کا شوق پیدا ہو اور عرشِ رحمان کی ہمسائیگی کا ذوق دو بالا ہو، جیسے ترغیب کے موقع پر فرمایا: ﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴾ [السجدة: ١٧] ''کوئی شخص نہیں جانتا کہ (ان کے اعمال کے بدلے میں) ان کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک کی کون کون سی چیزیں پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔'' دوسری جگہ فرمایا: ﴿ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ وَأَنتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴾ [الزخرف: ٧١] ''اور اس (جنت) میں جس شے کو ان کے دل چاہیں گے اور (ان کی) آنکھیں متلذذ ہوں گی (وہ موجود ہوگی) اور تم اس میں ہمیشہ رہو گے۔''

نیز ترہیب (ڈرانے) کے موقع پر فرمایا: ﴿ أَفَأَمِنتُمْ أَن يَخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ ﴾ [بني إسرائيل: ٦٨] ''کیا پھر تم اس سے بے خوف ہوگئے ہو کہ وہ تمھیں خشکی کی جانب (زمین میں) دھنسا دے۔'' نیز فرمایا: ﴿ ءَأَمِنتُم

مَّنْ فِي السَّمَاۗءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ۝ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَاۗءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ۭ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ نَذِيْرِ ۝﴾ [الملك: ١٦۔ ١٧] ''کیا تم اس (اللہ) سے بے خوف ہوگئے ہو جو آسمان میں ہے، یہ کہ وہ تمھیں زمین میں دھنسا دے تو ناگہاں وہ لرزنے لگے؟ یا تم اس (اللہ) سے بے خوب ہوگئے ہو جو آسمان میں ہے، یہ کہ وہ تم پر پتھراؤ کرنے والی آندھی بھیجے؟ پھر جلد تم جان لو گے کہ میرا ڈرانا کیسا ہے؟'' زجر وتوبیخ کے مقام پر کہا: ﴿ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ﴾ [العنکبوت: ٤٠] ''پھر ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ پر پکڑا۔'' وعظ ونصیحت کے مقام پر فرمایا: ﴿ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ۝ ثُمَّ جَاۗءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ۝﴾ [الشعراء: ٢٠٥۔ ٢٠٧] ''بھلا آپ دیکھیں تو! اگر ہم انھیں کئی برس (دنیا کا) فائدہ دیں۔ پھر وہ (عذاب) ان پر آجائے جس سے انھیں ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے۔ تو جس (سامانِ عیش) سے وہ مزے اُڑا رہے تھے ان کے کچھ کام نہ آئے گا۔''

یہ قرآنِ کریم اس طرح کی فصاحت و بلاغت اور حلاوت وطلاوت کی انواع سے بے حساب بھرا ہوا ہے، پھر ان آیات کو دیکھو جو اَحکام اور اوامر ونواہی پر مشتمل ہیں کہ ان میں کس طرح ہر اس چیز کا حکم دیا ہے، جو اچھی، مفید معروف و نافع، حسین ومحبوب اور پاک ہے اور ہر اس چیز سے منع کیا ہے، جو قبیح، رذیل اور خسیس و ناپاک ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ نے کہا ہے کہ جب تو قرآن میں سنے کہ اللہ تعالیٰ نے ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ فرمایا ہے تو ذرا اس پر کان رکھ کہ اس میں یا تو کسی خیر کا حکم ہے یا کسی شر سے منع کیا گیا ہے۔[1] چناں چہ ایسا ہی یہ ارشاد ہے: ﴿ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَـبٰۗىِٕثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ﴾ [الأعراف: ١٥٧] ''وہ انھیں اچھے کاموں کا حکم دیتا ہے اور انھیں برے کاموں سے روکتا ہے۔ اور وہ ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام ٹھہراتا ہے۔ اور ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ طوق اتارتا ہے جو ان پر تھے۔''

پھر جن آیتوں میں آخرت کا بیان، قیامت کے احوال کا ذکر، جنت اور جہنم کی کیفیت کا بیان، نعمتوں اور عذابوں کا ذکر اور لذت اور دردناک عذاب کا تذکرہ ہے، وہ نیکیاں کرنے اور برائیاں چھوڑنے کی طرف بلاتی ہیں۔ دنیا سے بے رغبت بناتی اور آخرت کا شوق پیدا کرتی ہیں۔ عمدہ طریقے اور راہِ مستقیم پر استقامت کا سبق دیتی ہیں اور شیطان مردود کے ناپاک عملوں کو دلوں سے باہر نکالتی ہیں۔

چنانچہ صحیح بخاری ومسلم میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ انبیا میں سے ہر نبی کو کچھ نشانیاں دی گئی تھیں، جن کی وجہ سے لوگ ان پر ایمان لائے تھے اور مجھے اللہ کی طرف سے یہ وحی (کتابِ الٰہی) دی گئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ میرے ہی پیروکار ہوں گے۔[2] (یہ الفاظ مسلم کے ہیں) مطلب یہ ہے

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٩٦) اس کی سند حسن ہے۔

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٦٩٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٥٢)

کہ مجھے خاص طور پر یہ وحیِ الٰہی کا معجزہ عطا ہوا ہے۔ یہ قرآن تمام انسانوں کو عاجز کرنے والا ہے۔ کوئی انسان اس کے مقابلے میں کوئی کلام بنا کر پیش نہیں کر سکتا، جب کہ دوسرے انبیا علیہم السلام کو ملنے والی کتابیں اکثر علما کے نزدیک اس حیثیت کی حامل نہیں تھیں کہ وہ معجز (عاجز کر دینے والی) ہوں اور ان کے مقابلے میں کوئی کلام پیش نہ کیا جاسکتا ہو۔ علاوہ ازیں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات، جو آپ کی صداقت کی دلیل ہیں، اَن گنت ہیں اور اُن کا شمار نہیں ہوسکتا۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ.

بعض متکلمین نے اعجازِ قرآن کا اثبات اس انداز سے کیا ہے کہ اس میں اہلِ سنت اور معتزلہ دونوں کا موقف آ جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اگر یہ قرآن فی نفسہٖ معجز ہے اور کوئی انسان اس جیسا کلام نہیں لا سکتا اور ان کی قوت میں اس کا مقابلہ کرنا ممکن ہی نہیں ہے، تب بھی مطلب واضح اور حاصل ہے اور اگر (معتزلہ کے موقف کی رو سے) اس کا مقابلہ ممکن ہے، لیکن شدتِ عداوت کے باوجود مقابلہ و معارضہ نہیں کر سکتے تو ان کا یہ عجز اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ نے ان کو قدرت کے باوجود معارضہ (مقابلہ) کرنے سے پھیر دیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ تقریر اگرچہ پسندیدہ نہیں ہے، کیوں کہ قرآن فی نفسہٖ معجز ہے اور اس کا مقابلہ کرنا کسی بشر کی طاقت میں نہیں، لیکن بحث برائے بحث اور حق کے دفاع کے لحاظ سے یہ تقریر درست ہوسکتی ہے، چناں چہ امام رازی رحمہ اللہ نے بھی قصارِ مفصل، جیسے: سورۃ العصر اور سورۃ الکوثر کے سوال کا جواب اسی طریقے پر دیا ہے۔[1]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا بندہ کہا ہے۔ یہ اضافت تکریم و تعظیم کے لیے ہے (یعنی اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف و فضل اور آپ کی عظمت ثابت ہوتی ہے)۔ عبد کا لفظ تعبد سے ماخوذ ہے، جس کے معنی عاجزی کے اظہار کے ہیں۔

داغِ غلامیت کرد پایۂ خسرو بلند ‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏‏ میرِ ولایت شود بندہ کہ سلطان خرید

''غلامی کے داغ نے خسرو کے مرتبے کو بلند کر دیا، غلام ریاست کا امیر بن گیا کہ بادشاہ نے اسے خرید لیا۔''

اسی لیے اہلِ تجربہ نے کہا ہے کہ بندہ بننا تو مشکل ہے، مگر خدا بننا آسان ہے، کیوں کہ اکثر لوگ غرور و تکبر میں مبتلا ہو جاتے ہیں، حالانکہ یہ صفت اللہ کے سوا کسی کے لیے زیبا نہیں۔ متکبر گویا خدائی کا مدعی ہوتا ہے، جس طرح خاکساری کرنے والا عبدیت (غلامی) کا مدعی ہوتا ہے۔ اس لیے جو شخص رتبۂ غلامی و بندگی میں جتنا بلند اور نمایاں ہوگا، اتنا ہی وہ اللہ کے نزدیک مقبول و مقرب ٹھہرے گا اور جو شخص جتنا خود بینی و خود پرستی میں پھنسا ہوگا، اتنا ہی اللہ سے دور اور اس کی رحمت سے محروم رہے گا۔

''سورت'' قرآن کے ایک ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ چھوٹی سے چھوٹی سورت وہ ہے، جس میں تین آیتیں ہوں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۸۴، ۸۵)

ایسی سورت بھی معجز ہے (یعنی اس کی مثل پیش کرنے سے لوگ عاجز ہیں)۔ معتزلہ کا یہ قول کہ اعجاز کا تعلق سارے قرآن کے ساتھ ہے، صحیح نہیں ہے، بلکہ سورۃ العصر اور سورۃ الکوثر جیسی سورتیں بھی معجز ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ جو ﴿ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ ﴾ [البقرة: ٢٣] آیا ہے اور وہ جو سورت یونس میں ﴿ بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ ﴾ [یونس: ٣٨] فرمایا ہے تو یہ چیلنج قرآن کی ہر سورت کو شامل ہے، چاہے وہ لمبی ہو یا چھوٹی۔ کیوں کہ نکرہ شرط کے سیاق میں محققین کے نزدیک اسی طرح عام ہوتا ہے، جیسے نفی کے سیاق میں ہوتا ہے۔ پس قرآن کا اعجاز طوال اور قصار دونوں قسم کی سورتوں میں موجود ہے۔ اس میں سلف و خلف میں سے کسی کا نزاع مجھے معلوم نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ لوگ اگر سورت ''والعصر'' ہی میں غور کرلیں تو وہی ان کے لیے کافی ہے۔

حکایت:

کہتے ہیں کہ سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے پہلے مسیلمہ کذاب کے پاس گئے تو اس نے کہا: سناؤ آج کل تمھارے ساتھی پر کیا اترا ہے؟ انھوں نے کہا: ایک نہایت بلیغ اور مختصر سورت اتری ہے، پھر سیدنا عمرو رضی اللہ عنہ نے سورت والعصر پڑھ کر سنائی۔ مسیلمہ نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر سر اٹھا کر کہا: مجھ پر بھی اسی طرح کی ایک سورت نازل ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ کیا؟ تو اس نے کہا: '' يَا وَبْرُ! يَا وَبْرُ! إِنَّمَا أَنْتَ أُذُنَانِ وَصَدْرٌ، وَسَائِرُكَ حَقْرٌ فَقْرٌ'' [اے جنگلی چوہے! اے جنگلی چوہے! تیرے بس دو کان اور سینہ ہے اور باقی تو حقیر و نادر ہے] سنانے کے بعد مسیلمہ نے کہا: اے عمرو! یہ سورت کیسی ہے؟ انھوں نے کہا: اللہ کی قسم! تو خود جانتا ہے کہ میں تجھے کاذب سمجھتا ہوں۔ انتهى۔ یعنی یہ زٹل قافیہ جو تو نے قرآن کے مقابلے میں ہانکا ہے، ہرگز وحی نہیں اور نہ تو رسول ہے۔[1]

مَیں کہتا ہوں کہ پوری سورت اور آیت کو بھی، چاہے طویل ہو یا قصیر جانے دو، قرآن پاک کا ہر جملہ تامہ (مکمل) بجائے خود معجز ہے۔ کسی بڑے اَدیب، فصیح و بلیغ شاعر، عربی دان کی کیا مجال ہے کہ اس کا معارضہ (مقابلہ) کر سکے اور الفاظ کی ترکیب اس طرح بٹھا سکے؟ کوئی اَحمق جاہل اس کو نہ مانے تو کیا کیا جائے؟ اسی لیے اللہ نے ماضی، حال اور استقبال کی نفی فرمائی ہے۔ سو اگر کسی انسان کو کچھ بھی قدرت حاصل ہوتی تو ضرور اب تک کچھ نہ کچھ بنا لاتا، مگر جب نہ لایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ اور اس کا عجز بہ خوبی ظاہر ہوگیا، حالاں کہ عرب اہلِ فصاحت و بلاغت تھے۔ قرآن پاک ان کی جنسِ کلام ہی سے آیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی یہ بھی بڑی آرزو تھی کہ قرآن کے نور کو بجھا دیں اور امرِ نبوی کو باطل کر دیں، لیکن اس کے باوجود وہ قرآن کی ہم مثل کوئی چھوٹی سے چھوٹی سورت بھی بنا کر پیش نہ کر سکے، جس سے ان کا عجز ظاہر ہوگیا اور جب ان کا عجز واضح ہوگیا تو اس کے بعد اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت میں کیا شک باقی رہا؟ جب یہ بات صحیح ہے تو سب کے لیے ضروری ہے کہ وہ عناد و مخالفت ترک کر دیں۔ یہ خبر تو قرآن نے وقوع سے

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٨٦۔ ٨٧)

پہلے دی ہے۔ اسی لیے ایامِ نبوت میں اور اس کے بعد اب تک کسی ایک کافر سے بھی مقابلہ نہ ہو سکا۔

''وقود'' لکڑی اور ایندھن کو کہتے ہیں۔ جیسے اللہ کا فرمان ہے: ﴿ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۝ ﴾ [الجن: ۱۵] ''اور لیکن جو ظالم ہیں تو وہ جہنم کا ایندھن ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ۝ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَاۗءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ۭ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ﴾ [الأنبياء: ۹۸۔ ۹۹] ''بے شک تم اور جن کی اللہ کے سوا تم عبادت کرتے ہو جہنم کا ایندھن ہیں، تم اس میں داخل ہونے والے ہو۔ اگر یہ (واقعی) معبود ہوتے تو اس میں داخل نہ ہوتے اور وہ سب ہمیشہ اس (جہنم) میں رہیں گے۔'' پتھر سے مراد اس جگہ بُت ہیں، جن کو وہ کافر پوجتے تھے یا گندھک کا پتھر مراد ہے، جس میں آگ جلد لگ جاتی ہے یا ہر قسم کے پتھر مراد ہیں۔ بہرحال جو بھی ہو، اس سے اس آگ کی قوت ظاہر ہوتی ہے، جو آدمی کو چھوڑے گی نہ پتھر سے منہ موڑے گی، (سب کو جلا ڈالے گی)۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع روایت میں ہے کہ جہنم کی آگ کو ہزار سال سلگایا گیا، تب وہ لال ہوئی، پھر ہزار برس جلایا گیا تو سفید ہوئی، پھر ہزار برس سلگایا گیا، تب کہیں جا کر سیاہ ہوئی۔ اب یہ کالی بھڑی (مشتعل) ہے، اس کی لپیٹ نہیں بجھتی۔ (ابن مردويه، والبيهقي في شعب الإيمان)[1] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ ہیں کہ دنیا کی یہ آگ جسے لوگ سلگاتے ہیں، جہنم کی آگ کا سترواں حصہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہی ایک جز کافی ہے۔ فرمایا: بلکہ انہتر جز اس پر گرمی بڑھی ہوئی ہے۔ (یعنی جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے ۶۹ حصے زیادہ ہے)۔[2] (موطأ إمام مالك، مسند أحمد، صحيح بخاري و مسلم)

اللہ کے اس قول سے کہ یہ آگ یا آگ کے یہ پتھر منکروں کے لیے تیار ہیں، ثابت ہوا کہ دوزخ اپنے ہولناک عذابوں سمیت، اس وقت موجود ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ قیامت کے دن پیدا کی جائے گی۔ متعدد احادیث سے بھی اس بات کا اثبات ہوتا ہے، جیسے «تَحَاجَّتِ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ»[3] ''جنت اور دوزخ نے باہم جھگڑا کیا۔'' یا جیسے فرمایا: «اِسْتَاذَنَتِ النَّارُ رَبَّهَا»[4] ''دوزخ نے اپنے رب سے سانس لینے کی اجازت مانگی۔'' یا جیسے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ ہم نے ایک آواز سنی تو ہم نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! یہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ ایک پتھر ہے، جس کو جہنم کے کنارے سے نیچے ڈالا گیا تھا اور وہ ستر سال کے بعد اب جہنم کی تہہ (گہرائی) میں پہنچا

---

[1] شعب الإيمان (۱/ ٤٨٩) تفسير ابن كثير (۲/ ٤٩٤) ضعيف الترغيب والترهيب (۲/ ۱۸۳)

[2] الموطأ (۲/ ۹۹٤) مسند أحمد (۲/ ۳۱۳) صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۰۹۲) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۸٤۳)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۸٤٦)

[4] صحیح بخاری میں «إِسْتَأْذَنَتْ» ''اجازت مانگی'' کے بجائے «اِشْتَكَتْ» ''شکایت کی'' کے الفاظ ہیں۔ دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (۵۱۲) اور صحیح مسلم میں بھی «اِشْتَكَتْ» ہی کے الفاظ ہیں۔ دیکھیں: صحيح مسلم، رقم الحديث (٦١٧)

ہے (یہ اس کے گرنے کی آواز ہے)۔[1] (صحیح مسلم)

اسی طرح جہنم کا ذکر نمازِ کسوف اور معراج وغیرہ کی احادیث میں بھی ہے، جو متواتر المعنی ہے۔ معتزلہ کا عقیدہ اس کے خلاف ہے۔ اندلس کے قاضی بلوطی بھی اسی طرف گئے ہیں۔ یہ ان کی صریح غلطی ہے۔ یہ عقیدہ قرآن وحدیث کے ظاہر کے خلاف ہے، کیوں کہ کتاب وسنت دونوں میں ماضی کا صیغہ آیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جہنم آج بھی موجود اور تیار ہے، ورنہ اللہ کی خبر میں کذب لازم آئے گا۔ اس کی کیا ضرورت ہے کہ ماضی کو مستقبل کے معنی میں ٹھہرایا جائے؟ جو اللہ جہنم کو اس دن پیدا کر سکتا ہے، اس نے اگر اسے پہلے سے پیدا کر رکھا ہے تو اس میں معتزلہ کا کیا نقصان ہے؟ دیکھو! قومِ فرعون کی بابت فرمایا گیا: ﴿ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ﴾ [المؤمن: ٤٦] ''(وہ دوزخ کی) آگ ہے جس پر انھیں صبح وشام پیش کیا جاتا ہے۔'' اگر اس وقت دوزخ نہیں ہے تو پھر کس کے سامنے اسے پیش کیا جاتا ہے؟ حدیث میں آیا ہے کہ ہر میت پر صبح وشام، جنت یا دوزخ سے اس کی جگہ اس پر پیش کی جاتی ہے اور اس سے کہا جاتا ہے کہ جب تو قبر سے زندہ ہو کر اٹھے گا تو یہ تیری جگہ ہے۔[2] ظاہر بات ہے کہ پیش کرنا تب ہی ممکن ہے جب وہ چیز موجود ہو، اس کے بغیر کسی شے کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۵

اور ان لوگوں کو خوش خبری دے دیجیے جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے عمل کیے، یقیناً ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جب بھی انھیں اس میں سے کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے دیا گیا تھا اور ان کو اس سے ملتا جلتا (پھل) دیا جائے گا اور ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ ان باغوں میں ہمیشہ رہیں گے (25)

یعنی جنت کے ہر میوے کا مزا جدا ہے، اگرچہ صورت نئی نہ ہو۔ صورت دیکھ کر کہا جائیں گے کہ یہ اسی قسم کا ہے، جو پہلے دنیا میں کھاتے تھے یا پھر اس سے پہلے جنت میں کھا چکے ہیں، لیکن جب چکھیں گے تو مزا جدا پائیں گے۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٤٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٦٦)

اللہ تعالیٰ نے جب کافروں کا انجام اور ان کے عذاب و نکال کا حال بتلا دیا تو اب مومنوں کا انجامِ خیر بیان فرما دیا ہے، اسی لیے قرآن کا نام مثانی رکھا ہے کہ ایمان کے ذکر کے بعد کفر کا ذکر یا اس کے برعکس آتا ہے، بدبختوں کا حال بیان کرنے کے بعد، نیک بختوں کا حال یا اس کے برعکس بیان کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک چیز کا ذکر کر کے پھر اس کے مقابل چیز کا ذکر کیا جاتا ہے، جب کہ کسی چیز کی نظیر (ہم مثل) کا ذکر کرنا، تشابہ کہلاتا ہے، بہرحال ترغیب و ترہیب اور وعد وعید دونوں کو جمع کرنے میں مومنوں کو اطاعتِ الٰہی کی بجا آوری میں یک گونہ نشاط و سرور حاصل ہوتا ہے اور کافروں کا حوصلۂ نافرمانی پست پڑتا ہے۔

عملِ صالح کی قید سے معلوم ہوا کہ جنت اس وقت ملے گی، جب ایمان کے ساتھ عمل بھی اچھے ہوں گے۔ ایسا نہیں ہوگا کہ عمل کے بغیر نرے ایمان سے جنت مل جائے۔ اہلِ علم نے کہا ہے کہ عملِ صالح وہ ہے، جس میں چار باتیں ہوں: ① علم ② نیت ③ صبر ④ اخلاص، یعنی ریا سے پاک ہو۔

جنت کے درختوں اور کھڑکیوں کے نیچے ندیاں جاری ہوں گی، اس کی وضاحت حدیث میں آتی ہے کہ یہ نہریں خندق کے بغیر بہتی ہوں گی، یعنی زمین کے برابر۔ یہ نہیں ہوگا کہ دنیا کی طرح وہ نہریں اور ندیاں زمین کے نشیب میں جاری ہوں۔ حوضِ کوثر کی بابت جو آیا ہے کہ اس کے دونوں کناروں پر خالی موتیوں کے قبّے ہوں گے تو اس میں کوئی منافات نہیں ہے، کیوں کہ کوثر کی مٹی مشکِ خالص ہوگی، اس کے سنگ ریزے موتی اور جواہر کے ہوں گے۔ اے اللہ! ہم تجھ سے تیرا فضل مانگتے ہیں تو احسان کرنے والا، رحمت فرمانے والا ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں ہے کہ جنت کی نہریں ٹیلوں کے نیچے سے پھوٹ کر آتی ہیں، یا مشک کے پہاڑوں کے نیچے سے آتی ہیں۔[1] (ابن أبي حاتم) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جنت کی کوئی چیز بھی نام کے سوا دنیا کی کسی چیز کے مشابہ نہیں ہوگی،[2] یعنی یہاں اور وہاں صرف نام ایک جیسے ہوں گے، باقی سب کچھ مختلف۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے: جنت میں صرف نام سے چیزوں کو پہچانیں گے، جیسے دنیا میں سیب، انار، وغیرہ، لیکن مزا جدا ہوگا۔[3]

جنت میں ملنے والی بیویاں ہر قسم کی گندگی اور نجاست سے پاک ہوں گی۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی حیض، پیشاب، پاخانہ، بلغم، تھوک، رینٹھ، منی اور خونِ نفاس وغیرہ سب سے پاک ہیں۔[4] قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایذا و اثم سے پاک ہوں گی، نہ حیض آئے گا نہ کلف (چہرے کا رنگ سیاہ) ہوگا۔[5] سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اہلِ جنت

---

① تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٦٥) صحیح ابن حبان (١٦/ ٤٢٣) اس کی سند حسن ہے۔

② تفسیر الطبري (١/ ٣٩٢) اس کی سند صحیح ہے۔

③ تفسیر الطبري (١/ ٣٩٢)

④ تفسیر الطبري (١/ ٣٩٦)

⑤ تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٦٧)

کھائیں گے، پئیں گے، مگر ان کو پیشاب آئے گا نہ پاخانہ، رینٹھ ہوگی نہ تھوک۔ ان کو حمد و تسبیح کا اس طرح الہام ہوگا، جیسے انسان سانس لیتا ہے، ان کا کھانا ایک ڈکار سے ہضم ہو جائے گا، پسینہ ایسے ہوگا جیسے مشک، یعنی خوش بودار۔[1] (صحیح مسلم) کسی نے کہا ہے کہ وہ دنیا کی یہی عورتیں ہوں گی، جو دنیا میں بدمزاج اور بداخلاق رہی ہوں گی، لیکن وہاں ان کوتاہیوں سے پاک ہوں گی اور بدصورت بھی خوب صورت ہوں گی۔ بعض نے کہا ہے کہ اخلاقِ بد سے پاک ہوں گی۔

جنت ایسے گلستان و بوستان کو کہتے ہیں، جسے درختوں کے پتوں اور پھلوں نے چھپایا ہوا ہو۔ بعض نے کہا ہے کہ جنت کھجور کے باغ کو کہتے ہیں اور فردوس انگور کے باغ کو۔ یہاں جنت سے مراد ثواب کا گھر ہے۔

خلود کہتے ہیں ہمیشہ باقی رہنے کو، جس کی انتہا نہ ہو یا دیر تک رہنے کو، خواہ ہمیشہ رہے یا نہ رہے۔ یہاں پہلے معنی مراد ہیں۔ آیات و احادیث میں اسی طرح آیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ نہ جنت سے باہر ہوں گے، نہ موت آئے گی، اپنے حال پر بلا انقطاع ہمیشہ ناز و نعمت میں رہیں گے۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔ صحیح بخاری و مسلم میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ جب جنتی جنت میں اور جہنمی جہنم میں چلے جائیں گے تو ایک آواز دینے والا ان کے درمیان کھڑا ہو کر یہ منادی کرے گا: اے جہنم اور جنت والو! اب موت نہیں ہے، ہر شخص جس حال میں ہے، ہمیشہ اسی حال میں رہے گا۔[2]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ اگر جہنمیوں سے کہیں کہ تم جہنم میں دنیا کے کنکروں کی تعداد کے برابر رہو گے تو وہ خوش ہو جائیں اور اگر جنتیوں سے کہیں کہ تم جنت میں دنیا کے سنگ ریزوں کی تعداد کے برابر رہو گے تو وہ غمگین ہو جائیں، لیکن ان سب کے لیے اَبدی زندگی ہے۔[3] (طبراني، ابن مردويه و أبو نعيم) سیدنا اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی مرفوع حدیث میں ہے کہ ہے کوئی جنت کے لیے کمر باندھنے والا؟ جنت میں کوئی خطرہ نہیں۔ ربِ کعبہ کی قسم! جنت ایک چمکتا ہوا نور ہے، ایک لہراتا ہوا پھول ہے، ایک مضبوط بنایا ہوا محل ہے، ایک بہتی ہوئی نہر ہے، ایک پکا ہوا میوہ ہے، ایک حسین و جمیل بیوی ہے، بہت سارے کپڑے ہیں، ہمیشہ کے لیے خوش حالی، فراوانیِ نعمت میں بلند محفوظ اور پُر رونق گھروں میں رہنا ہے۔[4] (ابن ماجه، بزار، ابن حبان، بيهقي وغيرهم)

جنت، اہلِ جنت کی عورتوں، جنت کی نعمتوں اور جنت کے سامان وغیرہ کے اوصاف کے بارے میں بہت سی احادیث مروی ہیں، جو صحیحین وغیرہما میں موجود ہیں، یہ صفحات ان کے متحمل نہیں۔ جنت کے بیان میں "حادي الأرواح"

---

(1) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٣٥)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٨٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٥٠)

(3) المعجم الكبير (١٠/ ١٧٩) حلية الأولياء لأبي نعيم (٤/ ١٦٨) اس روایت کی سند میں "الحکم بن ظہیر" ضعیف راوی ہے۔ السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٠٥)

(4) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٣٢) مسند البزار (٧/ ٤٣) صحيح ابن حبان (١٦/ ٣٨٩) اس روایت کی سند میں "الضحاک بن المعافری الدمشقی" مجہول ہے اور "سلیمان بن موسیٰ" متکلم فیہ راوی ہے۔ السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣٣٥٨)

اور ”مثير ساكن الغرام“ سے بہتر اسلام میں کوئی کتاب تالیف و تلخیص نہیں ہوئی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جنت میں ہمیشہ رہنے کی خبر پوری سعادت ہے، وہ اس نعمت کے ساتھ اس مقام میں موت و انقطاع سے بالکل امن میں ہوں گے، جس کے لیے نہ انتہا ہے نہ منتہا، بلکہ علی الدوام نعمت سرمدی ابدی ہوگی۔ اللہ ہم سب کو نصیب کرے۔[1] [آمین]

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِۦٓ أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ
فَأَمَّا الَّذِينَ ءَامَنُوا۟ فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ
كَفَرُوا۟ فَيَقُولُونَ مَاذَآ أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِۦ كَثِيرًا
وَيَهْدِى بِهِۦ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِۦٓ إِلَّا الْفَٰسِقِينَ ﴿٢٦﴾ الَّذِينَ
يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنۢ بَعْدِ مِيثَٰقِهِۦ وَيَقْطَعُونَ مَآ أَمَرَ
اللَّهُ بِهِۦٓ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِى الْأَرْضِ ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ الْخَٰسِرُونَ ﴿٢٧﴾

یقیناً اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ کوئی سی بھی مثال بیان کرے مچھر کی ہو یا اس سے بھی بڑھ کر (حقیر یا عظیم) ہو۔ پھر جو لوگ ایمان لائے وہ تو جانتے ہیں کہ بے شک یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے، لیکن جن لوگوں نے کفر کیا، وہ کہتے ہیں کہ بے شک یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے، لیکن جن لوگوں نے کفر کیا وہ کہتے ہیں کہ ایسی مثالیں پیش کرنے سے اللہ کی مراد کیا ہے؟ اللہ اس سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے اور وہ ان سے نافرمانوں کے سوا کسی کو گمراہ نہیں کرتا 26 جو لوگ اللہ کا عہد پکا کر لینے کے بعد اسے توڑتے ہیں اور جن (رشتوں) کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے انھیں کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں، وہی لوگ خسارہ اُٹھانے والے ہیں 27

قرآن شریف میں کہیں مکڑی کی مثال بیان کی گئی ہے اور کہیں مکھی کی، اس پر کافروں نے کہا کہ اللہ کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ ایسی حقیر چیزوں کا ذکر کرے۔ یہ کلام اگر اللہ کا ہوتا تو اس میں ان چیزوں کا ذکر نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے انہی کافروں کے جواب میں یہ دو آیات نازل فرمائیں۔

امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا کی مثال بیان کی ہے کہ جس طرح مچھر جب تک بھوکا رہتا ہے زندہ رہتا ہے اور جب خوب سیر ہو کر کھا لیتا ہے تو مرجاتا ہے، اسی طرح ان لوگوں کا حال ہے۔ یہ جب پیٹ بھر کر دنیا حاصل کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں پکڑ لیتا ہے، جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ فَلَمَّا نَسُوا۟ مَا ذُكِّرُوا۟ بِهِۦ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۸۸)

اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ﴾ [الأنعام: ٤٤] ''پھر جب انھوں نے وہ نصیحت بھلا دی جو انھیں کی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے۔'' (تفسیر ابن جریر) یہ گویا سببِ نزول کے اختلاف کا بیان ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے،[1] اس لیے کہ اس کا تعلق سورت سے زیادہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ اگر دنیا اللہ کے نزدیک مچھر کے پَر کے برابر بھی قدر و قیمت رکھتی تو اللہ تعالیٰ کبھی کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیتا۔[2] اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں دنیا ایک مچھر کے پَر سے بھی زیادہ بے حیثیت ہے۔ یہ معنی اس وقت ہیں جب ﴿ فَوْقَهَا ﴾ سے مراد یہ ہو کہ وہ مثال چھوٹے یا حقیر ہونے میں مچھر کے پَر سے بھی بڑھ کر ہے اور اکثر محققین کا یہی قول ہے۔

بعض کے نزدیک ﴿ فَوْقَهَا ﴾ سے مراد اس سے بڑا ہونا ہے، یعنی مچھر کی مثال ہو یا اس سے زیادہ کسی بڑی چیز کی، کیوں کہ مچھر سے زیادہ کوئی چیز حقیر اور چھوٹی نہیں ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے[3] اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث اس قول کی تائید کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی مسلمان کو کوئی کانٹا یا اس سے اوپر کوئی چیز نہیں لگتی، مگر اس کے لیے ایک درجہ لکھ دیا جاتا اور ایک گناہ معاف کر دیا جاتا ہے۔[4] سو اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ مثال بیان کرنے میں کسی چیز کو چھوٹا نہیں سمجھا جاتا ہے، اگرچہ حقارت اور چھوٹے پن میں مچھر کے برابر ہی کیوں نہ ہو۔ جس طرح مچھر کے پیدا کرنے میں اللہ کو کوئی عار نہیں، اسی طرح مچھر کی مثال بیان کرنا بھی اس کے لیے عار کا موجب نہیں۔

اسی لیے اس نے مکھی اور مکڑی کی بھی مثالیں بیان فرمائی ہیں: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾ ﴾ [الحج: ۷۳] ''اے لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے، لہٰذا تم اسے غور سے سنو، بے شک جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، وہ ایک مکھی بھی ہرگز نہیں پیدا کر سکتے، اگرچہ وہ (سارے بھی) اس کے لیے جمع ہو جائیں، اور اگر ان سے مکھی کچھ چھین لے تو وہ اسے اس سے چھڑا نہیں سکتے، طالب و مطلوب (عابد و معبود دونوں) کمزور ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا ؕ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ ﴾ [العنکبوت: ٤١] ''ان لوگوں کی مثال، جنھوں نے اللہ کے سوا کارساز بنائے، مکڑی کی سی ہے کہ اس نے ایک گھر بنایا، اور بے شک گھروں میں سب سے کمزور مکڑی کا گھر ہے، کاش! وہ جانتے ہوتے۔''

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا

---

[1] تفسیر الطبري (۱/ ۳۹۹_ ٤۰۰)

[2] سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۳۲۰) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٤۱۱۰) السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (٦۸٦)

[3] تفسیر الطبري (۱/ ٤۰۵_ ٤۰٦) [4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۵۷۲)

فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۨاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿۲۷﴾ ﴾ [إبراهيم: ۲۴۔ ۲۷] ''(اے نبی!) کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے کلمۂ طیبہ (اسلام) کی کیسی مثال بیان کی کہ وہ ایک پاکیزہ درخت کی طرح ہے، اس کی جڑ مضبوط ہے اور اس کی شاخیں آسمان میں ہیں۔ وہ ہر وقت اپنے رب کے حکم سے اپنا پھل لاتا ہے۔ اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے، تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔ اور کلمۂ خبیثہ (کفر و شرک) کی مثال ایک خبیث درخت کی سی ہے کہ اسے زمین پر سے اُکھاڑ دیا جاتا ہے، اس کے لیے کوئی قرار نہیں۔ اللہ ایمان والوں کو قولِ ثابت (کلمۂ توحید) سے دنیا کی زندگی اور آخرت میں ثابت قدم رکھتا ہے اور اللہ ظالموں کو گمراہ کر دیتا ہے اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ﴾ [النحل: ۷۵] ''اللہ نے مثال بیان کی ایک غلام مملوک کی جو کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا، اور (دوسرا) وہ جسے ہم نے اپنی طرف سے اچھا رزق دیا، چنانچہ وہ اس میں سے خفیہ اور علانیہ خرچ کرتا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۶﴾ ﴾ [النحل: ۷٦] ''اور اللہ نے دو شخصوں کی (ایک اور) مثال بیان کی، ان میں سے ایک گونگا (اور بہرا) ہے، وہ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا، جب کہ وہ اپنے آقا پر ایک بوجھ ہے، جہاں کہیں بھی وہ اسے بھیجے وہ کوئی خیر اور بھلائی نہیں لاتا۔ کیا وہ اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو عدل کا حکم دیتا ہے اور وہ صراطِ مستقیم پر ہے؟'' جیسے فرمایا: ﴿ ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ﴾ [الروم: ۲۸] ''اس نے تمھارے (سمجھانے کے) لیے خود تمھی میں سے ایک مثال بیان کی ہے کہ ہم نے تمھیں جو رزق دیا ہے، کیا اس میں جس کے تمھارے دائیں ہاتھ مالک ہوئے ہیں شریک ہو سکتے ہیں کہ تم اس میں برابر ہو جاؤ۔ تم ان سے ایسے ڈرتے ہو جیسے اپنے (ہمسر) لوگوں سے'' نیز فرمایا: ﴿ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ ﴾ [الزمر: ۲۹] ''اللہ نے ایک آدمی (غلام) کی مثال بیان کی جس میں کئی باہم اختلاف رکھنے والے شریک ہیں۔'' اور فرمایا: ﴿ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ ﴾ [العنکبوت: ۴۳] ''اور یہ مثالیں ہم لوگوں (کو سمجھانے) کے لیے بیان کرتے ہیں اور انھیں بس علم والے ہی سمجھتے ہیں۔'' غرض یہ کہ قرآن میں بہت ساری مثالیں آئی ہیں۔ بعض سلف نے کہا ہے کہ جب میں قرآن کی کوئی مثال سنتا ہوں اور اس کو سمجھ نہیں پاتا تو اپنی جان پر روتا ہوں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ ﴾

[العنکبوت: ٤٣] ''اور یہ مثالیں ہم لوگوں (کو سمجھانے) کے لیے بیان کرتے ہیں اور انھیں بس علم والے ہی سمجھتے ہیں۔''

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مثالیں چھوٹی ہوں یا بڑی، اہلِ ایمان سب پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ سب کو اللہ کی طرف سے جانتے ہیں اور اللہ ان کو مثالوں سے راستہ دکھاتا ہے۔[1] ابو العالیہ نے کہا ہے: کافر کہتے ہیں کہ اللہ کا ان مثالوں سے کیا مقصود ہے؟ جیسا کہ سورۃ المدثر میں فرمایا: ﴿ وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓىِٕكَةً ۠ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ ﴾ [المدثر: ٣١] ''اور ہم نے فرشتے ہی دوزخ کے نگران بنائے ہیں، اور ہم نے ان کی تعداد ہی کافروں کے لیے آزمائش بنا دی ہے، تاکہ اہلِ کتاب یقین کریں اور ایمان داروں کا ایمان زیادہ ہو، اور اہلِ کتاب اور مومن شک میں نہ پڑیں اور تاکہ دل کے روگی اور کافر کہیں: اس مثال سے اللہ کی کیا مراد ہے؟ اسی طرح اللہ جسے چاہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔ اور آپ کے رب کے لشکروں کو بس وہی جانتا ہے۔''[2]

اسی طرح اللہ نے اس مقام پر فرمایا کہ اس سے وہ بہت زیادہ کو گمراہ کرتا اور بہت زیادہ کو راہ دکھاتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کے نزدیک ﴿ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ﴾ سے مراد منافقین ہیں اور ﴿ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ﴾ سے مومنین مقصود ہیں۔ منافقوں نے جب مثال کو سچ سمجھ کر جھٹلایا تو وہ گمراہی میں اور زیادہ ہوگئے اور مومنوں نے جب مثال کو حق سمجھ کر اس کی تصدیق کی تو ان کی ہدایت میں اور اضافہ ہوگیا۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد کافر ہیں کہ جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں اور کسی نے کہا ہے کہ خوارج مراد ہیں۔ یہ تفسیر بالمعنی ہے، کیوں کہ یہ آیت، جس وقت اتری تھی، خوارج موجود ہی نہیں تھے، ہاں عمومِ مفہوم میں وہ داخل ہیں۔ کیوں کہ خارجی وہ شخص ہے، جو امام کی اطاعت اور شریعتِ اسلامیہ کے قیام سے باہر نکلا اور فاسق بھی اسی کو کہتے ہیں، جو طاعت سے خارج ہوا۔

فاسق کا لفظ کافر اور نافرمان دونوں کو شامل ہے، البتہ کافر کا فسق زیادہ شدید ہوتا ہے۔ اس آیت میں فاسق سے مراد کافر ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس جگہ اس کے بعد فاسقوں کے جو عہد شکنی وغیرہ کے اوصاف بیان ہوئے ہیں، وہ سب کافروں کے اوصاف ہیں، مومنوں کے اوصاف اس کے برعکس ہوتے ہیں۔ جیسے سورۃ الرعد میں فرمایا:

﴿ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْۗءَ الْحِسَابِ ۝ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

---

[1] تفسیر الطبري (١/ ٤٠١) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٧٠) تفسیر ابن کثیر (١/ ٩٠)

سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿22﴾ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا
وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿23﴾ سَلٰمٌ
عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴿24﴾ وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ
وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ
الدَّارِ ﴿25﴾ [الرعد: ١٩۔ ٢٥]

”کیا پھر وہ شخص جو جانتا ہے کہ یقیناً جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے، وہی حق ہے، وہ اس شخص کے مانند (ہوسکتا) ہے جو اندھا ہے؟ بس عقل والے ہی نصیحت پکڑتے ہیں۔ وہ جو اللہ کا عہد پورا کرتے ہیں اور پختہ وعدہ نہیں توڑتے۔ اور جو جوڑتے ہیں وہ چیز جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا، اور وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور برے حساب سے گھبراتے ہیں۔ اور جنھوں نے اپنے رب کے چہرے کی طلب کے لیے صبر کیا اور نماز قائم کی اور ہمارے دیے رزق میں سے پوشیدہ اور ظاہر طور پر خرچ کیا اور وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں، انھی لوگوں کے لیے آخرت کا گھر ہے۔ جو کہ ہمیشہ کے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے، اور وہ بھی جو ان کے باپ دادا اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے صالح ہوئے۔ اور فرشتے (جنت کے) ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے۔ (اور کہیں گے:) تم پر سلام ہو، اس لیے کہ تم نے صبر کیا، لہٰذا آخرت کا گھر بہت خوب ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور وہ چیز قطع کرتے ہیں جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا، اور وہ زمین میں فساد کرتے ہیں، انھی لوگوں کے لیے لعنت ہے اور ان کے لیے (آخرت کا) بہت برا گھر ہے۔“

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اہلِ سنت کے اس موقف کی دلیل ہے کہ ہدایت اور گمراہی اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔[1] زمخشری رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ ”اللہ کی طرف گمراہ کرنے کی نسبت مجاز کے طور پر ہے۔“[2] صحیح نہیں۔ یہ معتزلہ کا عقیدہ ہے۔ اس مقام پر امام رازی نے بہت عمدہ بحث کی ہے اور اسے خوب حل کیا ہے۔[3]

عہدِ الٰہی کا مطلب:

عہد سے مراد امر و نہی کے وہ احکام ہیں، جو اللہ نے انبیا علیہم السلام کی زبانی اور آسمانی کتابوں کے ذریعے سے بیان فرمائے۔ اس کے توڑنے کا مطلب یہ ہے کہ ان احکام پر عمل نہ کیا جائے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس میں اہلِ کتاب اور منافقین کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ تورات پر چلیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے

[1] تفسیر القرطبي (١/ ٢٤٤) [2] تفسیر الكشاف (١/ ١٤٧، ١٤٨) [3] تفسیر الرازي (٢/ ١٢٧)

بعد ان کی تصدیق اور اتباع کریں۔ جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو انھوں نے آپ کو پہچان لیا، لیکن اس کے باوجود انھوں نے انکار کیا اور ان کے حق ہونے کو چھپایا۔ یہ انھوں نے عہد شکنی کی۔ ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اسی تفسیر کو پسند کیا ہے۔[1] بعض کے نزدیک اس آیت میں تمام اہلِ کفر و شرک اور اہلِ نفاق کا بیان ہے کہ ان سب سے توحید کا عہد لیا گیا تھا اور ربوبیت کے دلائل ان پر واضح کیے گئے تھے۔ یہ اقرار بھی اس میں شامل تھا کہ جب ہمارے رسول ایسے معجزات لے کر آئیں، جن کے پیش کرنے پر کوئی شخص قادر نہیں ہے تو تم ان پر ایمان لانا اور ان کی اطاعت کرنا، پھر انھوں نے اس عہد و اقرار کو اس طرح توڑا کہ توحید، نبوت اور آسمانی کتابوں سب کا انکار کر دیا۔ زمخشری رحمہ اللہ کا رجحان اسی طرف ہے۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اس رائے کو اچھا سمجھا ہے۔[3] بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ﴿ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ﴾ والا عہد ہے، اس عہد کو پورا نہ کرنا، اس کو توڑنا ہے۔

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منافقوں میں چھے عادتیں ہوتی ہیں، جب ان کو لوگوں پر غلبہ حاصل ہوتا ہے تو وہ ساری خصلتیں ظاہر کر دیتے ہیں: ① جب بات کریں تو جھوٹ بولیں ② جب وعدہ کریں تو اس کی خلاف ورزی کریں ③ جب امین بنائے جائیں تو خیانت کریں ④ اللہ سے عہد باندھ کر توڑ ڈالیں ⑤ جس کے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، اس کو توڑیں ⑥ زمین میں فساد کریں۔ اگر لوگوں کا ان پر غلبہ ہو تو پھر پہلی تین باتوں کا اظہار تو ان سے ہوتا ہے، البتہ پچھلی باتوں میں ان کا بس نہیں چلتا۔ یہی بات ربیع بن انس رحمہ اللہ نے بھی کہی ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ عہد وہ ہے جو قرآن میں ان سے لیا گیا اور انھوں نے اس کا اقرار کیا تھا، لیکن کافر ہو کر اس عہد کو توڑ ڈالا۔[4] توڑنے سے مراد قطع رحمی (رشتوں کو کاٹنا) ہے۔ جیسے اللہ کا فرمان ہے: ﴿ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ﴾ [محمد: ۲۲] ''پھر (اے منافقو!) تم سے یہی امید ہے کہ اگر تم حکمران بن جاؤ تو تم زمین میں فساد کرو اور اپنے رشتے ناتے توڑ ڈالو'' امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسے راجح قرار دیا ہے۔[5] کسی نے کہا ہے کہ اس عہد سے ہر وہ چیز مراد ہے جس کو ملانے اور کرنے کا حکم تھا اور اس کا توڑنا یہ ہے کہ اس کو چھوڑ دیا جائے اور اس پر عمل نہ کیا جائے، جیسے موالاتِ مومنین (مومنوں سے محبت و تعلق رکھنا) ہے، قول کو عمل کے ساتھ ملانا ہے، فرض نمازوں کو جماعت کے ساتھ پڑھنے کا التزام کرنا ہے، احکامِ شریعت اور حدودِ الٰہی کی حفاظت کرنا ہے۔ ہر نیکی کے کام کو چھوڑنے اور ہر شرک کو کرنے سے بندے اور اللہ کے درمیان جو تعلق ہے، وہ کٹ جاتا ہے۔ جمہور کا یہی قول ہے اور یہی قول کہ آیت عام ہے، ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ واللہ أعلم.

---

① تفسیر الطبري (۱/ ۴۱۱، ۴۱۲) ② تفسیر الکشاف (۱/ ۱۴۹) ③ تفسیر ابن کثیر (۱/ ۹۱، ۹۲)

④ تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۷۱) ⑤ تفسیر الطبري (۱/ ۴۱۶)

زمین میں فساد کرنے سے مراد ان افعال و اقوال کو اختیار کرنا ہے جو اللہ کے حکم کے مخالف ہوں، جیسے غیر اللہ کی عبادت کرنا، مخلوق کو نقصان پہنچانا، اس چیز کو بدل دینا جس کی حفاظت کا حکم ہے، غرض کہ جو چیز شرعاً یا عقلاً خلاف صلاح ہے، وہ فساد ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے میثاق (عہد شکنی) پر جتنی سخت وعید بیان فرمائی ہے، ایسی سخت وعید کسی اور گناہ کی بابت میرے علم میں نہیں، اس لیے جس نے اللہ سے کوئی اقرار کیا ہو اور سچے دل سے عہد باندھا ہو، اسے چاہیے کہ اپنا اقرار پورا کرے اور اپنا عہد نبھائے۔[1] احادیث صحیحہ میں بھی عہد شکنی کی ممانعت اور اس پر سخت وعید آئی ہے۔

مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ ''وہی لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں۔''[2] اس آیت کی مثل یہ آیت ہے: ﴿ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ۝۲۵ ﴾ [الرعد: ۲۵] ''انھی لوگوں کے لیے لعنت ہے اور ان کے لیے (آخرت کا) بہت برا گھر ہے۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ہر وہ چیز جس کی نسبت اللہ نے غیر مسلمانوں کی طرف کی ہے، جیسے خاسر (نقصان اٹھانے والا) مسرف (حد سے تجاوز کرنے والا، ظالم، مجرم اور فاسق وغیرہ) تو وہاں اس سے مراد کفر اور کافر ہیں اور جب ان الفاظ کی نسبت مسلمانوں کی طرف ہوگی تو اس سے مراد صرف گناہ اور ان افعال کی مذمت مقصود ہوگی۔[3] خسران، تجارت میں نقصان ہونے کو کہتے ہیں۔ منافق اور کافر کا یہی نقصان ہے کہ وہ رحمتِ الٰہی سے محروم ہیں، اس سے زیادہ نقصان اور کیا ہوگا؟

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۲۸

تم اللہ کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو؟ حالاں کہ تم مردے تھے، پھر اس نے تمھیں زندہ کیا، پھر تمھیں موت دے گا، پھر وہی تمھیں زندہ کرے گا، پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ﴿28﴾

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے وجود و قدرت اور خالق و متصرف ہونے کی دلیل بیان فرمائی ہے، یعنی تم کس طرح اللہ کے وجود کا انکار کرتے اور غیر اللہ کو پوجتے ہو، جب کہ اسی نے تمھیں عدم سے وجود بخشا، جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝۳۵ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۝۳۶ ﴾ [الطور: ۳۵۔ ۳۶] ''کیا وہ بغیر کسی شے کے پیدا کیے گئے ہیں، یا وہی (خود اپنے) خالق ہیں؟ کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا؟ بلکہ وہ یقین نہیں رکھتے۔'' نیز فرمایا: ﴿ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ۝۱ ﴾ [الدھر: ۱] ''یقیناً (ہر) انسان پر زمانے سے ایک ایسا وقت گزر چکا ہے جب وہ کوئی قابلِ ذکر شے

[1] تفسير الطبري (۱/ ٤١٤) [2] تفسير ابن أبي حاتم (۱/ ۷۳) [3] تفسير الطبري (۱/ ٤١٧)

نہ تھا۔'' اس طرح کی متعدد آیات ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ قرآن کریم کی آیت: ﴿ قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا ﴾ [المؤمن: ١١] ''وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو بار موت دی اور تو نے ہمیں دو بار زندہ کیا، تو ہم اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں۔'' کا بھی وہی مطلب ہے، جو سورۃ البقرہ کی زیر تفسیر آیت کا ہے۔[1]

دو زندگیوں اور دو موتوں کا مفہوم:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ''تم مردہ (بے جان) تھے۔'' کا مطلب ہے کہ تم اپنے باپوں کی پشتوں میں کوئی چیز نہ تھے، پھر تم کو پیدا کیا، پھر سچ مچ مارا، پھر زندہ کرے گا۔ یہ آیت اس آیت: ﴿ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ ﴾ کے مثل ہے۔[2] ایک اور روایت میں ان کے الفاظ اس طرح ہیں کہ تم پیدا ہونے سے پہلے مٹی تھے، یہ مردہ ہونا ہوا، پھر تمھیں جلایا، یہ زندگی ہوئی، پھر تم کو مارے گا اور تم قبر میں جاؤ گے، یہ دوسری موت ہے، پھر قیامت کو اٹھانا دوسری زندگی ہوئی، غرض کہ دو بار مرنا اور دو بار جینا ثابت ہوا۔ کسی نے کہا ہے کہ زندہ کر کے مارنا یہ ہے کہ قبر میں زندہ کر کے پھر مارے گا۔[3] لیکن صحیح بات وہی ہے جو سیدنا عبداللہ بن مسعود اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کے حوالے سے پہلے گزر چکی ہے۔

تابعین کی ایک جماعت کی بھی یہی رائے ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ [الجاثية: ٢٦] ''(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: اللہ ہی تمھیں زندہ کرتا ہے، پھر وہی تمھیں مارتا ہے، پھر وہی تمھیں روزِ قیامت جمع کرے گا، جس میں کوئی شک نہیں۔'' بتوں کی بابت اللہ نے فرمایا: ﴿ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴾ [النحل: ٢١] ''(وہ) مردے ہیں، زندہ نہیں اور وہ شعور نہیں رکھتے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ﴾ [يٰس: ٣٣] ''اور ان کے لیے مردہ زمین ایک (عظیم) نشانی ہے، ہم نے اسے زندہ کیا اور ہم نے اس سے (اناج کا) دانہ نکالا، پھر وہ اسی سے کھاتے ہیں۔''

حاصل یہ ہوا کہ پہلی موت سے مراد عدمِ سابق (پہلے نہ ہونا) ہے اور پہلی حیات سے مراد پیدائش ہے۔ دوسری موت سے مراد معمول کے مطابق موت اور دوسری زندگی سے مراد قبر سے زندہ ہو کر اٹھنا ہے۔ تفسیر فتح البیان میں ہے کہ یہ سب سے بہترین قول ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔[4]

---

[1] تفسير الطبري (١/ ٤١٨) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٧٣) اس کی سند صحیح ہے۔

[2] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٧٣) اس کی سند صحیح ہے۔

[3] تفسير الطبري (١/ ٤١٩) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٧٣) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔

[4] فتح البيان (١/ ١١٨)

﴿ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ ٢٩

وہی ہے (اللہ) جس نے تمھارے لیے پیدا کیا سب کا سب جو کچھ زمین میں ہے، پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا، پھر ان کو ٹھیک کر کے سات آسمان بنا دیے، اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے (29)

ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا ہے، یعنی یہ سارے معدنیات، نباتات، حیوان، پہاڑ، دریا تمھارے دین و دنیا کے نفع کے لیے بنائے ہیں۔ دین کا نفع یہ ہے کہ تم اللہ کی ان عجیب و غریب مخلوقات کو دیکھ کر عبرت و نصیحت حاصل کرو اور توحید کو تسلیم کرو، جبکہ دنیا کا نفع یہ ہے کہ ان چیزوں کو اپنے استعمال میں لا کر ان سے فوائد حاصل کرو۔[1] اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اشیا میں اصل اِباحت ہے، یعنی جب تک کسی دلیل سے کسی چیز کا حرام ہونا ثابت نہ ہوا سے حلال سمجھا جائے گا، اس میں حیوانات وغیرہ سب یکساں ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ آیت سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ مٹی کا کھانا حرام ہے، کیوں کہ اللہ نے ﴿ مَا فِي الْاَرْضِ ﴾ ''جو کچھ زمین میں ہے'' فرمایا ہے، یعنی زمین کے اندر کی چیزیں حلال ہیں نہ کہ نفسِ ارض حلال ہے۔ اس سے بہتر دلیل یہ ہے کہ حدیث میں مٹی کھانے کی حرمت بیان ہوئی ہے۔[2] علاوہ ازیں مٹی مضر بھی ہے۔

پہلے توحید کی دلیل ایسی بیان کی تھی جو خاص ان کے نفوس میں نظر آتی ہے۔ اب یہ دوسری دلیل آسمان و زمین کی پیدایش کی ذکر فرمائی ہے۔

استوا کے معنی اس جگہ قصد کے ہیں۔ لفظِ آسمان بہ طور جنس ہے۔ ہر چیز سے واقف ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کا علم ساری مخلوق کو محیط ہے، جیسے فرمایا: ﴿ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ﴾ [الملك:١٤] ''بھلا وہ نہ جانے گا جس نے (سب کو) پیدا کیا۔'' کل شیٔ (ہر چیز) میں ساری کلیات و جزئیات کا علم داخل ہے۔ یہ اس لیے فرمایا ہے، کیوں کہ خالق کے لیے ساری مخلوق سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ بعض علما نے کہا ہے کہ علم کی صفت ساری صفتوں کی امام ہے۔

اس آیت کی تفصیل سورت حم السجدہ میں یوں آئی ہے: ﴿ قُلْ اَىِٕنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِيْۤ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِيْنَ ۝ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَاۤ اَتَيْنَا طَآىِٕعِيْنَ ۝ فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ

[1] تفسیر القرطبي (١/ ٢٥١) فتح البیان (١/ ١١٩)

[2] امام بیہقی رحمہ اللہ نے مٹی کھانے کی حرمت پر باب باندھا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس مسئلے میں کوئی بھی حدیث صحیح نہیں ہے۔ پھر اس سلسلے میں وارد احادیث کو ذکر کر کے ان کا ضعف و نکارت بیان کیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: سنن البیهقي الکبریٰ (١٠/ ١١)

الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ وَ حِفۡظًا ؕ ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ﴿۱۲﴾﴾ [حم السجدة: ۹۔ ۱۲] ''آپ کہہ دیجیے: کیا تم واقعی اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کیا اور تم اس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو؟ وہ تو جہانوں کا رب ہے۔ اور اس نے اس (زمین) میں اس کے اوپر مضبوط پہاڑ بنائے اور اس میں برکتیں رکھیں اور اس میں (رہنے والوں کے لیے) اس کی غذاؤں کا (ٹھیک) اندازہ کیا، محتاجوں کے لیے یکساں طور پر (یہ سارا کام) چار دنوں میں (مکمل ہوا)۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا، جبکہ وہ دھواں تھا، تب اللہ نے اس سے اور زمین سے کہا: تم دونوں خوشی یا ناخوشی سے آؤ، تو ان دونوں نے کہا: ہم دونوں خوشی خوشی حاضر ہیں۔ پھر (اللہ نے) انھیں دو دنوں میں سات آسمان بنا دیا اور ہر آسمان میں اس کا کام الہام کر دیا، اور ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں (ستاروں) سے زینت دی اور (اس کی خوب) حفاظت کی، یہ نہایت غالب، خوب جاننے والے کی تدبیر ہے۔''

اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ نے پہلے زمین بنائی، پھر سات آسمان بنائے۔ ہر عمارت بنانے والے کا یہی دستور ہوتا ہے کہ اول نیچے کی بنیاد رکھتا ہے، پھر اوپر کی عمارت بناتا ہے۔ رہی یہ آیت: ﴿ اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمۡكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾ وَ اَغۡطَشَ لَیۡلَهَا وَ اَخۡرَجَ ضُحٰىهَا ﴿۲۹﴾ وَ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِکَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾﴾ [النازعات: ۲۷۔ ۳۰] ''یا آسمان کی؟ جسے اسی نے بنایا ہے۔ اس نے آسمان کی چھت بلند کی، پھر اسے ٹھیک ٹھاک کیا۔ اور اس کی رات کو تاریک اور اس کے دن کو روشن بنایا۔ اور اس کے بعد زمین کو بچھایا۔'' دراصل اس جگہ خبر کا عطف خبر پر ہے نہ کہ فعل کا فعل پر۔ بعض نے کہا ہے کہ زمین کا پھیلانا آسمان و زمین کی تخلیق کے بعد ہوا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اللہ کا عرش پانی پر تھا۔ پانی سے پہلے اللہ نے مخلوق بنانے کا ارادہ کیا تو پانی سے دھواں نکالا، وہ پانی کے اوپر اونچا ہو گیا تو اللہ نے اس کا نام آسمان رکھا، پھر پانی کو خشک کر دیا تو اس کا نام زمین رکھا۔ یہ زمین یک لخت تھی (یعنی ایک ٹکڑا تھا) اس کو پھاڑ کر سات زمینیں بنائیں۔ یہ کام دو دن میں کیا اتوار اور پیر کو۔ اس زمین کو ایک مچھلی کے اوپر پیدا کیا ہے۔ یہ وہی مچھلی ہے، جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے: ﴿ نٓ وَ الۡقَلَمِ ﴾ [القلم: ۱] ''نٓ، قسم ہے قلم کی!'' یہ مچھلی پانی میں ہے۔ پانی ایک صاف پتھر پر ہے۔ پتھر ایک فرشتے کی پشت پر ہے۔ فرشتہ ایک سخت پتھر پر ہے اور وہ پتھر ہوا میں ہے۔ اس پتھر کا ذکر لقمان نے کیا ہے۔ یہ پتھر آسمان میں ہے نہ زمین میں۔ مچھلی نے حرکت کی تو زمین ہلنے لگی۔ اللہ نے اس پر پہاڑ رکھ دیے تو وہ تھم گئی۔

زمین از تپ لرزہ آمد ستوہ فرو کوفت بر دامنش میخ کوہ

''زمین خوف سے درماندہ ہو کر لرز اٹھی تو اس کے دامن میں میخیں گاڑ کر اسے نیچے ٹھونک دیا۔''

پہاڑوں کو اس بات میں زمین پر فخر ہے۔ اس آیت کا مطلب بھی یہی ہے: ﴿ وَ جَعَلۡنَا فِی الۡاَرۡضِ رَوَاسِیَ اَنۡ تَمِیۡدَ بِهِمۡ ﴾ [الأنبیاء: ۳۱] ''اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے، تاکہ وہ ان کے ساتھ جھکنے (نہ) پائے۔''

اللہ نے پہاڑ، لوگوں کی خوراک اور درخت وغیرہ دو دن منگل بدھ کو پیدا کیے۔ اس آیت کا مطلب یہی ہے: ﴿ قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ ﴾ [حم السجدة: ۹] ''آپ کہہ دیجیے: کیا تم واقعی اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کیا۔'' دھواں پانی کے سانس سے اٹھا اور اس کو آسمان ٹھہرایا۔ یہ آسمان بھی یک لخت تھا، پھر اس کے سات آسمان کیے۔ یہ کام جمعرات اور جمعہ دو دن میں ہوا۔ جمعہ کو اسی لیے جمعہ کہا جاتا ہے کہ آسمان اور زمین کی پیدائش اس دن میں جمع ہو گئی تھی۔

ہر آسمان میں امرِ الٰہی کی وحی کرنا یہ ہے کہ اس میں فرشتے بنائے، دریا، پانی، پہاڑ اور برف اور وہ چیزیں بنائیں جو معلوم نہیں، پھر آسمان کو تاروں سے مزین کر کے شیطانوں سے محفوظ رکھا، پھر جب پیدائش سے فراغت ہوئی تو اللہ عرش پر متمکن ہو گیا۔ اس آیت کا یہی مطلب ہے: ﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ﴾ [الأعراف: ٥٤] ''جس نے آسمانوں اور زمین کو چھے دنوں میں پیدا کیا، پھر وہ عرش پر مستوی ہو گیا۔'' نیز فرمایا: ﴿ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ ﴾ [الأنبياء: ۳۰] ''باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے ان دونوں کو الگ الگ کر دیا، اور ہم نے پانی سے ہر زندہ شے بنائی۔''[1]

سیدنا عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اللہ نے تخلیق کی ابتدا اتوار سے کی، اتوار اور پیر کو ساری زمینیں بنائیں، منگل بدھ کو خوراکیں اور پہاڑ بنائے، جمعرات جمعہ کے دن آسمانوں کو بنایا اور جمعہ کے دن پچھلی گھڑی میں اس کام سے فارغ ہوا، پھر اسی گھڑی میں آدم کو بنایا اور اسی گھڑی میں قیامت قائم ہوگی۔[2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک آسمان دوسرے آسمان کے اوپر اور ایک زمین دوسری زمین کے نیچے ہے۔[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ زمین کی پیدائش آسمان کی پیدائش سے پہلے ہے۔ سورت سجدہ کی آیت میں بھی پہلے زمین کی تخلیق اور پھر آسمان کی طرف جانے کا ذکر ہے۔ یہ دونوں آیتیں اس مفہوم میں واضح ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس میں علما میں سے کسی نے اختلاف کیا ہو، مگر قتادہ رحمہ اللہ نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ زمین سے پہلے آسمان پیدا ہوا ہے۔[4] امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس میں توقف کیا ہے۔[5] صحیح بخاری میں ہے کہ یہی سوال بعینہٖ کسی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کیا تھا تو انھوں نے فرمایا کہ زمین کا پھیلانا آسمان کی

---

(1) تفسير الطبري (۱/ ٤٣٥۔ ٤٣٦) علامہ احمد شاکر نے اس کی سند پر مفصل بحث کرتے ہوئے کہا ہے: ''أرجو أن يكون صواباً إن شاء الله، وما توفيقي إلا بالله'' تفصیل کے لیے دیکھیں: تفسير الطبري (۱/ ١٥٦۔ ۱/ ٤٣٦)

(2) تفسير الطبري (۱/ ٤٣٧) اس کی سند میں ''ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ امام فریابی رحمہ اللہ نے اسی روایت کو دوسری سند سے ذکر کیا ہے اور وہ صحیح ہے۔ دیکھیں: كتاب القدر (۱/ ٢٩۔ ٣٢)

(3) تفسير الطبري (۱/ ٤٣٦) (4) تفسير الطبري (۱۱/ ٢٥٠) (5) تفسير القرطبي (۱/ ٢٥٧)

پیدائش کے بعد ہوا، یعنی اللہ نے پہلے زمین پیدا کی، پھر آسمان بنایا، پھر زمین کو پھیلایا۔[1] یہی جواب حدیث وتفسیر کے قدیم علما نے بھی دیا ہے۔ اس پر مزید بحث سورۃ النازعات میں آئے گی۔

حاصل یہ ہے کہ اللہ نے جو چیزیں زمین کے اندر رکھی ہیں، ان سب کو آسمان کی تخلیق کے بعد قوت سے فعل میں لایا۔ زمین فی نفسہٖ آسمان سے پہلے بنی ہے، جیسے: نباتات، جمادات، پانی وغیرہ باختلافِ نوع، صفت، رنگ۔ اسی طرح آسمانوں کا اپنے ثوابت اور سیاروں سمیت گردش کرنا اور افلاک کا ان چیزوں سمیت چکر مارنا ہے، جو اللہ نے ان کے اندر رکھی ہیں۔ واللہ أعلم۔[2] فتح البیان میں بھی ان آیتوں کے درمیان یہی تطبیق بیان کی گئی ہے کہ زمین کا پھیلانا (اس میں نباتات، جمادات، پانی اور خوراک وغیرہ کا پیدا کرنا) آسمان کی تخلیق کے بعد ہے۔ یہی جمع و تطبیق بہتر ہے، جسے اختیار کرنا ضروری ہے۔[3] امام شوکانی رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔[4]

اس آیت سے ثابت ہوا کہ آسمان سات ہیں۔ باقی رہا زمین کا معاملہ تو سارے قرآن میں صرف ایک جگہ یہ الفاظ بیان ہوئے ہیں: ﴿ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ ﴾ [الطلاق: ١٢] ''اور زمینیں بھی ان (آسمانوں) کی مثل۔'' اسی سے استدلال کرتے ہوئے کسی نے کہا ہے کہ مثل سے مراد گنتی ہے، یعنی زمینیں بھی سات ہیں۔ کسی نے کہا کہ مثل سے مراد موٹاپا ہے۔ داودی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ساتوں زمینیں یک لخت ہیں، بیچ میں فاصلہ نہیں ہے،[5] لیکن صحیح بات یہ ہے کہ زمینیں بھی آسمانوں کی مثل الگ الگ ہیں، مگر اسلام کی دعوت اسی زمین کے ساتھ خاص ہے، جس پر ہم رہتے ہیں۔ صحیح حدیث میں بھی زمینوں کی تعداد سات بتلائی گئی ہے۔[6]

امام رازی رحمہ اللہ اس بحث کے آخر میں کہ ''حکما کے نزدیک آسمان سات ہیں یا آٹھ'' کیا اچھی بات لکھی ہے کہ ''اس خبط سے تجھے اچھی طرح یہ معلوم ہو جائے گا کہ انسانی عقلیں ان چیزوں کی حقیقت معلوم کرنے سے عاجز ہیں، ان کا علم صرف اسی کو ہے جس نے ان کو بنایا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ (عقلی دلائل کے بجائے) صرف سمعی (قرآن وحدیث کے) دلائل پر قناعت کرے۔''[7]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے آسمان کے بیان میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔ ہر آسمان کی موٹائی پانچ سو برس کی مسافت ہے اور ایک آسمان کا دوسرے آسمان کے درمیان فاصلہ بھی پانچ سو سال کی مسافت کے برابر ہے۔ آسمان اور زمین دونوں کی تعداد سات سات ہے، لیکن کسی بھی صحیح حدیث میں یہ صراحت نہیں ہے کہ زمین کے ہر طبقے میں اس بالائی زمین کی طرح عوالم (عالم کی جمع) اور اوادم (آدم کی جمع) انبیا اور علما و جہلا ہیں۔ صحابہ وتابعین کے آثار چاہے سنداً صحیح ہی ہوں، لیکن اس معاملے میں وہ قابلِ حجت نہیں، کیوں کہ یہ آثار (اقوالِ صحابہ) غالباً اسرائیلیات سے

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤/ ١٨١٤) [2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٩٤۔ ٩٥) [3] فتح البیان (١/ ١٢٠۔ ١٢١)
[4] فتح القدیر (١/ ١٥٣) [5] تفسیر القرطبي (١/ ٢٥٩)
[6] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٣٢٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦١٠) [7] تفسیر الرازي (٢/ ١٤٦)

لیے گئے ہیں اور اسرائیلیات کا حکم یہ ہے کہ ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب، اس لیے اس جگہ توقف کرنا ضروری ہے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہفتے کے دن مٹی بنائی، اتوار کو پہاڑ، پیر کے دن درخت، منگل کو ناپسندیدہ چیزیں، بدھ کو روشنی اور جمعرات کے دن جانور پیدا کیے اور آدم کو جمعہ کے دن عصر کے بعد پیدا فرمایا۔[1] (نسائي، مسلم) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث امام مسلم کے غرائب میں سے ہے۔ علی بن مدینی، امام بخاری رحمہما اللہ اور بہت سے حفاظ نے اس حدیث میں کلام کیا ہے اور اسے کعب احبار کا کلام قرار دیا ہے، یعنی سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کو کعب رحمہ اللہ سے سنا، لیکن بعض راویوں کو وہم ہوگیا اور انھوں نے اسے مرفوع قرار دے دیا۔ اس کی تحقیق امام بیہقی نے کی ہے۔[2]

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاۗءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۰

اور (یاد کرو) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا: بے شک میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ انھوں نے کہا: کیا تو زمین میں اس کو بنائے گا جو اس میں فساد کرے گا اور خون بہائے گا؟ اور ہم تیری تعریف کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا: بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے (30)

اللہ تعالیٰ اس احسان کا ذکر فرما رہا ہے جو اس نے انسانوں پر کیا کہ دیکھو، تمھیں عدم سے وجود میں لانے سے

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٧٨٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٢٩٣)

[2] الأسماء والصفات للبیهقي (٢/ ٢٥٠۔ ٢٥٦) تفسیر ابن کثیر (١/ ٩٥) علامہ عبدالرحمٰن المعلمی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں اس حدیث پر نہایت ہی عمدہ کلام کیا ہے اور حدیث کی صحت کا اثبات اور قرآنِ مجید سے بہ ظاہر تعارض کی نفی کی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الأنوار الكاشفة (١/ ١٩٩۔ ٢٠٤)

بعض منکرینِ حدیث کا شبہہ اور اس کا ازالہ:

آج کے بعض منکرینِ حدیث نے اس حدیث پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں تخلیق کا آغاز ہفتے کے دن سے اور اس کا اختتام جمعہ کو بتلایا گیا ہے۔ یہ سات دن بنتے ہیں، جب کہ قرآن میں آسمانوں اور زمین کی پیدائش چھے دنوں میں بتلائی گئی ہے، لیکن ان میں منافات اور تضاد نہیں ہے، کیوں کہ اس حدیث میں ایک مختلف چیز، اس سے زائد، یہ بیان ہوئی ہے کہ ہفتے کے دن میں مٹی بنائی، جس سے مراد ہے زمین (مٹی) کو انسانوں کی رہائش کے قابل بنانے کے لیے زمین میں مزید چیزیں پیدا فرمائیں۔ گویا اس میں زمین کی بابت مزید تفصیلات کا ذکر ہے، جس کا کوئی تصادم قرآن کے ساتھ نہیں ہے، اسی لیے شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کی تضعیف کرنے والوں کا رد کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ (تعلیقات الألباني علی المشکاة: ٣/ ٣٤٦ و السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث: ١٨٣٣)۔ [ص-ي]

پہلے ہم نے تمھارا ذکر ملائے اعلیٰ (فرشتوں) میں کیا تھا اور صدی بعد صدی اور قوم بعد قوم تمھاری بابت ایک دوسرے کا خلیفہ ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ جیسے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓىِٕفَ الْاَرْضِ ﴾ [الأنعام: ١٦٥] ''اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ﴾ [النمل: ٦٢] ''اور وہ تمھیں زمین میں جانشین بناتا ہے؟'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓىِٕكَةً فِی الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٦٠] ''اور اگر ہم چاہتے تو تم سے فرشتے بنا دیتے جو زمین میں (تمھارے) جانشین ہوتے۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ ﴾ [مریم: ٥٩] ''پھر ان کے بعد ناخلف (نالائق ان کے) جانشین ہوئے۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ خلیفہ سے مراد صرف آدم علیہ السلام نہیں ہیں، جیسا کہ مفسرین کے ایک گروہ کی رائے ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس قول کو سیدنا عبداللہ بن مسعود، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور تمام اہلِ تاویل کی طرف منسوب کیا ہے،① کیوں کہ اس کے متعلق کافی اختلاف ہے، جس کا ذکر امام رازی رحمہ اللہ نے کیا ہے۔② اگر صرف آدم علیہ السلام مراد ہوتے تو فرشتے یہ نہ کہتے کہ یا اللہ! تو مفسدوں اور خون ریزی کرنے والوں کو کیوں پیدا فرماتا ہے؟ اس لیے آدم سے مراد یہاں جنس انسان ہے۔ یہ بات فرشتوں کو کسی ذریعۂ خاص سے معلوم ہوگئی ہوگی یا انسانی طبیعت سے اس کا اندازہ کیا ہوگا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ تو بتلایا تھا کہ میں اس جنس کو کھنکھناتی مٹی سے بناؤں گا یا لفظِ خلیفہ سے انھوں نے یہ سمجھا ہو، کیوں کہ خلیفہ کا کام یہی ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان مظالم کا فیصلہ کرے اور حرام کاموں اور گناہوں سے ان کو روکے، لیکن یہ بات اللہ پر اعتراض یا انسان پر حسد کے طور پر نہ تھی، جس طرح بعض مفسرین نے خیال ظاہر کیا ہے۔③

کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ ﴾ [الأنبياء: ٢٧] ''وہ بات کرنے میں اس سے سبقت نہیں کرتے۔'' یعنی اجازت کے بغیر وہ اللہ سے کوئی بات نہیں پوچھ سکتے۔ مزید فرمایا: ﴿ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٢٦] ''بلکہ وہ (فرشتے) تو (اللہ کے) معزز و مکرم بندے ہیں۔'' یعنی حسد سے بھی بری ہیں اور یہاں تو اللہ نے ان کو بتلا دیا تھا کہ میں اس کو پیدا کرنے لگا ہوں، اس لیے ان کا سوال دریافتِ حال کے طور پر تھا کہ اس طرح کی مخلوق پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے؟ وہ لوگ تو مفسد اور خون ریزی کرنے والے ہوں گے، اگر صرف عبادت کروانی مقصود ہے تو ہم تیری عبادت کرتے ہی ہیں۔ ہم سے کوئی قصور بھی سرزد نہیں ہوتا۔ ہمیں پر قناعت کرنا کیا برا ہے؟ اللہ نے جواب دیا کہ اس کام کی جو راجح مصلحت اس خرابی کے باوجود کہ جو تم بتلا رہے ہو، مجھے معلوم ہے، وہ تمھیں معلوم نہیں ہے، کیوں کہ میں ان میں نبی اور رسول بھیجوں گا، ان میں صدیق، شہید، صالح، عابد و زاہد، اولیا، ابرار، مقرب علما، عامل، خاشع (جھکنے والا) اور محبّ و متبع پیدا کروں گا۔

صحیح حدیث میں ہے کہ جب فرشتے بندوں کے اعمال لے کر آسمان پر چڑھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس بات کے

① تفسیر القرطبي (١/ ٢٦٣) ② تفسیر الرازي (٢/ ١٥٢) ③ تفسیر ابن کثیر (١/ ٩٦)

باوجود کہ وہ ان سے زیادہ باخبر اور جاننے والا ہے، فرشتوں سے پوچھتا ہے: تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ وہ کہتے ہیں، جب ہم ان کے پاس گئے تھے تو وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ان کو چھوڑ کر آئے تو وہ نماز میں مصروف تھے۔[1] یہ اس لیے کہ فرشتے ہمارے درمیان آتے جاتے رہتے ہیں اور عصر اور صبح کی نماز میں یہ یک جا ہو کر ٹھہر جاتے ہیں، پھر وہ اعمال اوپر لے جاتے ہیں۔ دوسری حدیث میں ہے کہ رات کا عمل دن سے پہلے اور دن کا کام رات سے پہلے اللہ کی طرف جاتا ہے۔[2] اس لیے فرشتوں کا یہ کہنا کہ ہم نے ان کو نماز پڑھتے پایا اور نماز پڑھتے چھوڑا، گویا ﴿ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴾ ''بے شک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔'' کی تفسیر ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس زمین میں پہلے جن بستے تھے، جب انھوں نے فساد اور خون ریزی کی اور بعض نے بعض کو مارا تو اللہ نے ان کو قتل کرنے کے لیے ابلیس کو بھیجا۔ اس نے ان کو مار دھاڑ کر کے سمندروں کے جزیروں اور پہاڑوں کی طرف نکال دیا، پھر اللہ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے اس جگہ بسایا، اس لیے آدم کو خلیفہ کہا۔[3] سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ بنو جان (جن) آدم علیہ السلام کی پیدائش سے دو ہزار برس پہلے تھے۔ ان کی فساد انگیزی اور خون ریزی کی وجہ سے اللہ نے ان کی طرف فرشتے بھیجے، جنھوں نے ان کو سمندروں کے جزیروں کی طرف نکال دیا اور ان کی جگہ آدم کو آباد کیا۔[4]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تسبیح سے مراد سبحان اللہ کہنا ہے اور تقدیس سے مراد نماز پڑھنا۔ یہی بات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے بھی کہی ہے۔[5] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تسبیح سے مراد تعظیم اور تقدیس سے مراد تکبیر ہے۔[6] امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تقدیس کا مطلب تطہیر ہے۔[7] محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ ہم تیری نافرمانی کریں گے نہ ایسی بات کہیں گے جو تجھے ناپسند ہو۔[8] ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تقدیس کا مطلب تعظیم و تطہیر ہے، یعنی بڑائی کرنا اور پاک کہنا۔ اسی لفظ سے یہ لفظ ہے: ''سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ''، یعنی ہم تجھ کو اس چیز سے پاک اور بَری کہتے ہیں، جو اہلِ شرک تیری طرف منسوب کرتے ہیں اور اس میل کچیل سے، جس کو اہلِ کفر تیرے ذمے لگاتے ہیں، تجھے منزّہ و مبرّا کہتے ہیں۔[9]

---

(1) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٣٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٣٢)

(2) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧٩)

(3) تفسیر الطبري (١/ ٤٥٠) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ مستدرک الحاکم میں اس کے ہم معنی روایت مروی ہے اور امام حاکم رحمہ اللہ نے روایت نقل کرنے کے بعد کہا ہے: ''هذا حدیث صحیح الإسناد ولم یخرجاه، ووافقه الذهبي'' دیکھیں: مستدرك الحاکم (٢/ ٢٨٧)

(4) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٧٧) اس کی سند صحیح ہے۔

(5) تفسیر الطبري (١/ ٤٧٤۔ ٤٧٥)

(6) تفسیر الطبري (١/ ٤٧٥)

(7) تفسیر الطبري (١/ ٤٧٦)

(8) تفسیر الطبري (١/ ٤٧٦)

(9) تفسیر الطبري (١/ ٤٧٥)

صحیح مسلم میں سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: افضل کلام کیا ہے؟ فرمایا: وہ کلام جسے اللہ نے اپنے فرشتوں کے لیے چنا ہے، یعنی "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ"۔[1] امام بیہقی رحمہ اللہ نے عبدالرحمن بن قرط رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شبِ معراج میں آسمانوں کے اوپر یہ تسبیح سنی: "سُبْحَانَ الْعَلِيِّ الْأَعْلٰى سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى" "اونچا اور سب سے بلند، وہ پاک اور بلند ہے۔"[2]

خلیفہ کا وجوبِ تقرر:

امام قرطبی رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ اس آیت سے یہ مسئلہ ثابت ہوا کہ مخلوق کے فیصلے کرنے، مظلوم کی نصرت کرنے، حدود قائم کرنے، بے حیائی کے کاموں سے لوگوں کو روکنے اور اس طرح کے دیگر امور کے لیے خلیفہ کا تقرر کرنا واجب ہے، کیوں کہ امام کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتے اور قاعدہ ہے کہ واجب کام جس چیز کے بغیر انجام نہ پا سکے تو وہ چیز بھی واجب ہو جاتی ہے۔ یہ امامت و خلافت یا تو نص (شارع یا پیغمبر کے حکم) سے مل سکتی ہے، جیسے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ امام و خلیفہ ہوئے یا ایما سے یا خلیفہ مقرر کرنے سے، جیسے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کیا یا صلحا کی ایک جماعت کے مشورے پر چھوڑ دینے سے، جیسے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کیا یا اہلِ حل و عقد کسی شخص کی بیعت پر مجتمع ہو جائیں، حتیٰ کہ کوئی ایک شخص ان اہلِ حل و عقد میں سے کسی ایک کی بیعت کر لے گا تو وہ بھی خلیفہ ہو سکتا ہے، کیوں کہ خلیفہ بنانا جمہور کے نزدیک واجب ہے۔ امام الحرمین نے کہا ہے کہ یہ مسئلہ اجماعی ہے۔ واللّٰه أعلم۔ علاوہ ازیں کوئی شخص لوگوں کو اپنی اطاعت پر طاقت کے ذریعے سے مجبور کر دے تو اس صورت میں بھی اس کی اطاعت واجب ہو جاتی ہے، تاکہ انتشار و اختلاف نہ ہو۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس کی وضاحت کی ہے۔[3]

خلیفہ کے تقرر کی شرائط:

انعقادِ خلافت کے لیے گواہی کا ہونا کسی کے نزدیک شرط نہیں ہے۔ اگر کسی نے اسے ضروری قرار دیا بھی ہے تو اس کے لیے دو گواہ کافی بتلائے ہیں۔ یہ بات ضروری ہے کہ امام و خلیفہ مرد ہو، مسلمان ہو اور آزاد، بالغ، عاقل، عادل، مجتہد، صاحبِ بصیرت، تندرست ہو، نیز جنگی اسرار و رموز سے واقف اور نسباً قریشی ہو۔ یہی صحیح ہے۔ ہاشمی ہونا یا خطا سے معصوم ہونا شرط نہیں ہے۔ فسق سے معزول نہ ہوگا، مگر یہ کہ کفرِ صریح ظاہر ہو (اس صورت میں معزول کرنا ضروری ہوگا) اور کفرِ صریح کی دلیل موجود ہو، تاہم خود معزول ہونے میں اختلاف ہے۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے خود معزول ہو کر

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۷۳۱)

[2] الأسماء والصفات للبیهقي (۱/ ۵۲، ۵۳) المعجم الأوسط (٤/ ۱۱۱) اس کی سند کے ایک راوی "مسکین بن میمون" کے متعلق حافظ ذہبی فرماتے ہیں: "لا أعرفه" اور اس کی مذکورہ بالا روایت کے متعلق کہتے ہیں: "خبره منكر" (میزان الاعتدال: ٤/ ۱۰۱)

[3] دیکھیں: تفسیر القرطبي (۱/ ۲٦٤) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۹۹)

خلافت سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو دے دی تھی۔ ان کے پاس اس کا عذر موجود تھا، اسی لیے ان کے اس فعل کی تعریف کی گئی ہے۔

بیک وقت دو یا زیادہ اماموں (خلفا) کا تقرر درست نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ جو شخص تمھارے پاس اس حال میں آئے کہ تمھارا کام صحیح چل رہا ہو اور وہ تمھارے درمیان جدائی ڈالنا چاہے تو اسے مار ڈالو، چاہے کوئی بھی ہو۔[1] جمہور کا قول بھی یہی ہے۔ امام الحرمین رحمہ اللہ وغیرہ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے، البتہ استاذ ابو اسحاق رحمہ اللہ نے دو یا زیادہ اماموں کے قائم ہو جانے کو جائز کہا ہے، جب کہ مملکت وسیع اور اس کے علاقے دور دراز تک ہوں، مگر امام الحرمین نے اس میں تردد کا اظہار کیا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے عراق میں عباسی خلفا تھے تو مصر میں فاطمی اور مغرب (اندلس وغیرہ) میں اموی خلفا۔ اس مسئلے کی ضروری تفصیل ہم کتاب الاحکام سے کسی اور جگہ بیان کریں گے۔[2] انتهى كلام ابن كثير.

میں کہتا ہوں: یہ مسئلہ طوائف الملوکی کا ہے، جس کی تحقیق ہم نے اپنی کتاب "حسن المساعي" میں کی ہے۔ اسے وہاں ملاحظہ کیا جائے۔ استاذ ابو اسحاق کا کہنا درست ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ "ہم خلیفہ مقرر کریں گے۔" یہ خطاب زمین کے فرشتوں سے تھا، جو جنوں کو زمین سے نکالے جانے کے بعد زمین پر آباد ہو گئے تھے یا مطلق ملائکہ سے تھا۔ دوسری بات صحیح ہے، جس کی تائید قرآن کے الفاظ کرتے ہیں۔ ان کو مشاورت کا سبق سکھایا، نیز آدم علیہ السلام کی تعظیم بتائی اور وجودِ آدم کی حکمت ان کے سامنے واضح کی ہے کہ جس میں خیر غالب ہو، اس کو شر کے مقابلے میں اختیار کرنا بہتر ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ فرشتوں سے مشورہ کرنا نہ تھا، بلکہ ان کے دل کی بات دریافت کرنا تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس میں دراصل بندوں کو ارشاد کیا گیا ہے کہ آپس میں مشورہ کیا کرو۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ فرشتوں کو غیب کا علم نہیں ہے اور اللہ کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ
فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا
سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ
الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ
قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ
وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور اس نے آدم کو سب کے سب نام سکھا دیے، پھر انھیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا: اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ (31) انھوں نے کہا: تو پاک ہے، ہمیں علم نہیں سوائے

[1] صحیح مسلم، رقم الحديث (١٨٥٢) [2] تفسير ابن كثير (١/ ٩٩۔ ١٠٠)

اس کے جو تو نے ہمیں سکھا دیا، بے شک تو ہی خوب جاننے والا، بڑا حکمت والا ہے (32) اللہ نے کہا: اے آدم! تو انھیں ان چیزوں کے نام بتا دے، چناں چہ جب اس نے انھیں ان چیزوں کے نام بتا دیے تو اللہ نے کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ بے شک میں آسمانوں اور زمین کے غیب جانتا ہوں اور وہ بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو (33)

اللہ پاک نے اس جگہ آدم علیہ السلام کی عظمت و بزرگی فرشتوں کے سامنے بیان کی ہے کہ ہم نے اس کو خصوصی طور پر تمام چیزوں کے ناموں کا علم عطا کیا تھا اور وہ ہر چیز کا نام جانتا تھا، جبکہ فرشتے اس علم سے محروم تھے۔ یہ واقعہ اس کے بعد کا ہے جب فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کر لیا تھا، لیکن اس قصے سے پہلے اس فضل کا بیان اس لیے کیا کہ اس مقام کو خلیفہ کی تخلیق کی حکمت کے متعلق فرشتوں کی لاعلمی کے ساتھ مناسبت ہے، کیوں کہ اللہ نے ان کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ میں جو جانتا ہوں، وہ تم نہیں جانتے۔ اسی لیے اللہ نے اس امتحان کا ذکر اس جگہ کیا، تاکہ علم میں آدم کا شرف و منزلت ان پر ظاہر ہو جائے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو ان کی اولاد کے اور جانوروں کے نام الگ الگ بتا دیے کہ یہ گدھا ہے، یہ اونٹ ہے، یہ گھوڑا ہے، یہ زید، عمر اور بکر وغیرہ ہیں۔[1] ان کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ وہ یہی متعارف نام تھے جو سب لوگ بولتے ہیں، جیسے: انسان، جانور، آسمان، زمین، سمندر، گھوڑا، گدھا وغیرہ۔[2] تیسری روایت ہے کہ ان کو رکابی، دیگچی، یہاں تک کہ چھوٹے بڑے کوزے کا نام بھی سکھایا۔[3] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر جانور، ہر پرندے اور ہر چیز کا نام سکھایا۔[4] امام ربیع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرشتوں کے نام سکھائے۔[5] کسی نے کہا ہے کہ ستاروں کے نام تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ ساری ذریت (اولاد) کے تھے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔[6] امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ تمام چیزوں کے نام بھی سکھائے اور ان کی ذات و صفات اور افعال بھی بتلائے، جیسا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے، حتی کہ الفاظ کا مصغر و مکبر ہونا بھی بتلا دیا، جیسے: ”رَجُلٌ“ (مکبر) ہے اور رُجَیْلٌ (مصغر)۔[7]

اسی لیے صحیح بخاری میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے کہ قیامت کے دن سب مومن جمع ہو کر کہیں گے

---

(1) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۸۰) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔

(2) تفسیر الطبري (۱/ ٤٨٢) اس کی سند میں ”بشر بن عمارہ“ ضعیف راوی ہے۔

(3) تفسیر الطبري (۱/ ٤٨٣۔ ٤٨٤) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۸۰) اس کی سند میں ”سعید بن معبد“ کا تذکرہ ”التاریخ الکبیر للبخاري“ (۳/ ٥١٢) اور ”الجرح لابن أبي حاتم“ (٤/ ٦٣) میں ہے، لیکن اس کے بارے میں کوئی تعدیل یا توثیق نہیں ملی ہے۔

(4) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۸۰)

(5) تفسیر الطبري (۱/ ٤٨٥)

(6) تفسیر الطبري (۱/ ٤٨٥)

(7) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۰۰۔ ۱۰۱)

کہ کسی سفارشی کو ساتھ لے کر رب کے پاس چلو، تاکہ وہ سفارش کرے۔ چناں چہ سب لوگ آدم علیہ السلام کے پاس آ کر کہیں گے کہ آپ سب انسانوں کے باپ ہیں، اللہ نے آپ کو اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا، فرشتوں سے آپ کو سجدہ کروایا اور ہر چیز کا نام آپ کو سکھایا، لہٰذا آپ اپنے رب سے ہماری بابت سفارش کریں۔ (لمبی حدیث ہے) اسے مسلم، نسائی اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔[1] اس جگہ اس حدیث کے بیان کرنے سے یہ مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ساری مخلوقات کے نام سکھائے تھے، اس لیے یہ کہا کہ پھر ان کو، یعنی مسمیات کو آدم نے فرشتوں پر پیش کیا۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ ان ناموں کو پیش کیا۔[2] سیدنا عبداللہ بن مسعود اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کا قول ہے کہ مخلوق کو فرشتوں پر پیش کیا۔[3] مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اربابِ اسماء کو پیش کیا۔ حسن و قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ ہر چیز کا نام سکھایا، وہ ہر ایک چیز کا نام لیتے اور ایک ایک گروہ پیش کیا جاتا۔[4]

مطلب یہ ہوا کہ فرشتوں سے کہا گیا کہ یہ چیزیں جو تم کو دکھائی گئی ہیں، ان کے نام بتاؤ، اگر تم اس بات میں سچے ہو کہ جس کو میں زمین میں خلیفہ بنانے لگا ہوں، وہ فسادی اور خون ریزی کرنے والا ہوگا اور اگر صرف تم رہو گے تو مطیع و فرمانبردار رہو گے۔ لہٰذا جب تم کو ان چیزوں کے، جو تمھیں دکھائی گئی ہیں، نام تک معلوم نہیں، حالاں کہ تم ان کو دیکھ رہے ہو تو جو چیزیں ابھی وجود ہی میں نہیں آئی ہیں اور آیندہ پیدا ہوں گی، ان کو تم کیا معلوم کرو گے؟ اس بات پر فرشتوں نے اللہ کی تنزیہ و تقدیس کی اور اپنی کم علمی کا اقرار کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سبحان اللہ سے مقصود اللہ تعالیٰ کو ہر برائی سے پاک بیان کرنا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ یہ کیا کلمہ ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کلمے کو اپنے لیے پسند کیا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ یہ کلمہ پڑھا جائے۔[5] میمون بن مہران رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کلمے میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے۔[6]

زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام نے اس طرح نام بتلائے کہ تم جبریل ہو، یہ میکائیل ہے اور وہ اسرافیل ہے، یہاں تک کہ کوّے تک سارے نام گن ڈالے۔[7] مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کبوتر، کوا اور ہر چیز کا نام لیا۔[8] پھر جب اس طرح فرشتوں پر آدم علیہ السلام کی فضیلت ظاہر ہوگئی تو اللہ نے کہا کہ کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ میں ظاہر اور پوشیدہ ہر چیز کو جانتا ہوں۔ جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝ ﴾ [طٰہٰ: ۷] ''اور اگر آپ

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٢٨٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣١٢) (2) تفسير الطبري (١/ ٤٨٧)

(3) تفسير الطبري (١/ ٤٨٧) علامہ احمد شاکر نے اس روایت کی سند پر مفصل بحث کرتے ہوئے کہا ہے: ''أرجو أن يكون صواباً إن شاء الله، وما توفيقي إلا بالله'' دیکھیں: تفسير الطبري (١/ ١٥٦) (4) تفسير الطبري (١/ ٤٨٨)

(5) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٨١) اس کی سند میں ''حجاج بن أرطاة'' مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔

(6) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٨١) (7) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٨٢) (8) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٨٢)

بلند آواز سے بات کریں تو بلاشبہہ وہ ہر راز اور (اس سے بھی) پوشیدہ تر بات کو جانتا ہے۔''

نیز سلیمان علیہ السلام کو ہُد ہُد کے ذریعے یوں خبر دی ہے: ﴿ أَلَّا يَسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ﴿٢٥﴾ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿٢٦﴾ ﴾ [النمل: ٢٥۔ ٢٦] ''یہ کہ وہ اس اللہ کو سجدہ کریں جو آسمانوں اور زمین میں چھپی چیزیں نکالتا ہے، اور وہ (سب کچھ) جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو۔ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی بہت بڑے عرش کا مالک ہے۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مطلب یہ ہے کہ میں پوشیدہ کو بھی ویسے ہی جانتا ہوں، جیسے علانیہ کو جانتا ہوں۔[1] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَا تُبْدُونَ ﴾ سے مراد ملائکہ کا یہ قول ہے: ﴿ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا ﴾ [البقرة: ٣٠] ''کیا تو زمین میں اس کو بنائے گا جو اس میں فساد کرے گا۔'' اور ﴿ تَكْتُمُونَ ﴾ سے مراد وہ تکبر اور غرور ہے، جو ابلیس کے نفس میں تھا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ ﴿ تَكْتُمُونَ ﴾ سے ملائکہ کا قول مراد ہے کہ اللہ نے جتنی مخلوق بنائی ہے، سب سے زیادہ علم ہم کو ہے۔ اللہ کے نزدیک ہم سے زیادہ کسی کا مقام نہیں ہے۔[2] اب ان کو معلوم ہو گیا کہ آدم علیہ السلام کو علم و کرم میں ان پر فضیلت حاصل ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ سب سے بہتر قول اس مسئلے میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ جو تم زبان سے کہتے ہو اور جو تم دل میں چھپاتے ہو، وہ سب میرے نزدیک برابر ہے، کوئی بھی چیز پوشیدہ ہو یا ظاہر، مجھ پر مخفی نہیں ہے۔[3]

تفسیر کشاف میں ہے کہ آدم عجمی نام ہے۔[4] یہی قول امام بیضاوی اور امام سمین رحمہ اللہ کا بھی ہے[5] کہ یہ نام کسی لفظ سے نکالا نہیں گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا کر لیا تو پھر ان کو تمام چیزوں کے نام بھی سکھا دیے۔ ''أسماء'' سے مراد مسمیات ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ساری لغات مراد ہیں، لیکن جب ان کی اولاد جدا جدا ہو گئی تو کسی کو عربی زبان یاد رہی تو کسی کو بھول گئی۔

﴿ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ لفظ اور معنی، مفرد و مرکب، حقیقت و مجاز، سب کچھ سکھا دیا۔ اسم سے مراد وہ لفظ ہے جو کسی معنی پر دلالت کرے، خواہ وہ ذات ہو یا عرض، یعنی وہ اپنا معنی کسی دوسرے کے ملائے بغیر دے سکتا ہو یا نہ دے سکتا ہو، پس اس میں اسم و فعل اور حرف سب داخل ہو گئے۔ تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام اسمائے حسنیٰ سکھا دیے تھے، مگر خصوص سے عموم بہتر ہے۔ علیم کہتے ہیں: جو سارے معلومات کا احاطہ

---

[1] تفسیر الطبري (١/ ٤٩٨) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔
[2] تفسیر الطبري (١/ ٤٩٩)
[3] تفسیر الطبري (١/ ٥٠٠)
[4] تفسیر الکشاف (١/ ١٥٤)
[5] تفسیر البیضاوي (١/ ٢٨٤) الدر المصون في علم الکتاب المکنون (١/ ١١٩)

رکھنے والا ہو۔ حکیم کہتے ہیں: انصاف سے فیصلہ کرنے والے کو یا ایسا کہ جس کا کام بہت پختہ ہو اور اس میں کسی قسم کا خلل و فساد نہ ہو۔ اس آیت سے یہ بھی نکلا کہ آدم علیہ السلام ان انبیا میں سے ہیں جنھوں نے اللہ سے کلام کیا ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے کہا کہ تم ملائکہ کو ان چیزوں کے نام بتاؤ اور نام بتانے سے یہ بھی نکلا کہ علم کو جہالت پر مرتبہ وفضیلت حاصل ہے۔

اسی لیے خلافت کے واسطے بھی علم کی شرط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی علم کی وجہ سے آدم علیہ السلام کی ملائکہ پر فضیلت ظاہر کی تھی اور اگر علم سے بڑھ کر کوئی اور چیز فضیلت والی ہوتی تو اسی سے ان کی فضیلت ظاہر کرتا۔ نیز اسی علم کی فضیلت کی وجہ سے آدم علیہ السلام کو ملائکہ سے سجدہ کروایا۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ کسی عالم کے لیے کھڑا ہونا جائز ہے، بشرطیکہ یہ کھڑا ہونا اس کے علم سے محبت رکھتے ہوئے ہو نہ کہ اس آدمی کی تعظیم کرتے ہوئے۔ طیبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ لغت کا علم عبادت سے بڑھ کر ہے، پھر شریعت کے علم کا ذکر ہی کیا ہے۔[1] یہ جو ارشادِ باری ہے کہ میں آسمان اور زمین کے غیب کو جانتا ہوں، اس بات پر دلیل ہے کہ غیب کا یا کسی چھپی بات پر مطلع ہونے کا دعویٰ کرنے والے جس طرح نجومی و کاہن، اہلِ رمل [ریت سے جادو کرنے والے] اور جادوگر اور شعبدہ باز اور ان کے علاوہ جو بھی ہے، یہ تمام کے تمام اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہیں اور ان کا دعویٰ باطل ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی غیب کا علم نہیں جانتا، نہ ملائکہ نہ انبیا نہ اولیا اور ان کے علاوہ اور کوئی بھی غیب کا علم نہیں جانتا ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ٭ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٣٤﴾

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا: تم آدم کو سجدہ کرو تو سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا، اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا (34)

یہ ایک دوسرا کرم ہے جو اللہ نے اولادِ آدم پر کیا کہ اللہ نے فرشتوں سے آدم کو سجدہ کرایا۔ اس بارے میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔ حدیثِ شفاعت اوپر گزر چکی ہے۔ موسیٰ و آدم علیہما السلام کی جب ملاقات ہوئی تو انھوں نے بھی ان سے یہی کہا کہ تم وہی آدم علیہ السلام ہو، جسے اللہ نے اپنے ہاتھ سے بنایا، اپنی روح اس میں پھونکی اور اپنے فرشتوں سے اس کو سجدہ کرایا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ابلیس فرشتوں کے ایک ایسے قبیلے سے تھا جسے ''جن'' کہتے ہیں۔ یہ قبیلہ فرشتوں کے دوسرے قبیلوں کے برعکس گرم آگ سے پیدا کیا گیا تھا اور اس کا نام حارث تھا۔ یہ بھی ایک جنت کا خزانچی ہو گیا

---

[1] تفسير ابن عرفة المالكي (١/ ٩٨)

تھا۔ باقی سب فرشتے نور سے بنے ہیں اور وہ جنات جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے، ان کی پیدایش آگ کے شعلے سے ہوئی ہے۔ وہ شعلہ آگ کی لپٹ ہوتا ہے، جب وہ بھڑکتی ہے۔ انسان مٹی سے بنا ہے۔ سب سے پہلے زمین میں جن آباد ہوئے، جب انھوں نے فساد کیا، خون بہایا اور ایک دوسرے کو قتل کر ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کا ایک لشکر ابلیس کو دے کر ان کی طرف بھیجا۔ یہ ملائکہ اس قبیلے سے تھے، جنھیں ''جن'' کہتے ہیں۔

جب ابلیس نے ان کو مار کر مختلف جزیروں اور پہاڑوں کی طرف بھگا دیا تو اس نے اپنے دل میں یہ غرور کیا کہ میں نے ایسا کام کیا جو کسی سے نہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ کو اس کے دل کی بات معلوم ہوگئی اور وہ فرشتے جو اس کے ساتھ گئے، بے خبر رہے۔ جب اللہ نے ان فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک نائب مقرر کروں گا تو انھوں نے کہا کہ جس طرح جنوں نے فساد کیا، خون بہایا، اسی طرح یہ بھی کرے گا، ہم کو اسی کام کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو مجھے معلوم ہے، وہ تمھیں معلوم نہیں، یعنی وہ کبر و غرور جو ابلیس کے دل میں ہے، وہ صرف میں ہی جانتا ہوں۔ پھر آدم کو ایک چپکتی اور کھنکھناتی مٹی سے پیدا کیا اور اسے اپنے ہاتھ سے بنایا، ان کا دھڑ چالیس رات تک پڑا رہا۔ ابلیس آتا، پاؤں سے اسے ٹھوکر مارتا تو وہ دھڑ کھنکھناتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ﴾ [الرحمن: ١٤] ''اس نے انسان کو ٹھیکرے جیسی کھنکتی مٹی سے پیدا کیا۔''

ابلیس ان کے منہ کی طرف سے گھس کر پیٹھ کی طرف سے نکلتا۔ کبھی پیٹھ کی طرف سے گھس کر منہ کی طرف سے باہر آتا، پھر کہتا تو صرف اس صلصلہ (کھنکھناہٹ) کے لیے نہیں ہے، کسی اور کام کے لیے بنایا گیا ہے، اگر میں تجھ پر غالب ہوا تو تجھے برباد کروں گا اور اگر تو مجھ پر غالب آیا تو میں تیری نافرمانی کروں گا۔ جب اللہ نے اس دھڑ میں اپنی روح پھونکی تو یہ پھونکنا سر کی طرف سے ہوا۔ بدن میں جہاں تک روح جاتی خون اور گوشت بنتا جاتا۔ جب روح ناف تک پہنچی تو بابا جی بدن کو دیکھ کر خوش ہوئے اور چاہا کہ اُٹھ بیٹھیں، مگر یہ نہ ہو سکا۔ یہی اس آیت کا مطلب ہے: ﴿ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ﴾ [الأنبياء: ٣٧] ''انسان جلد بازی (کے خمیر) سے تخلیق کیا گیا ہے۔'' یعنی راحت و تکلیف پر اس کو صبر نہیں، جلد باز ہے۔

جب جان سارے بدن میں پہنچ گئی اور انھیں چھینک آئی تو ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ'' کہا، یعنی سب طرح کی تعریف اللہ کے لیے ہے، جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ یہ کہنا اللہ کے الہام سے تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''يَرْحَمُكَ اللّٰهُ يَا آدَمُ!'' ''اللہ تجھ پر رحم فرمائے اے آدم!'' پھر اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں سے، جو ابلیس کے ساتھ بھیجے گئے تھے نہ کہ ان فرشتوں سے جو آسمانوں میں تھے، کہا: تم آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو۔ سب نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہ کیا، اس نے غرور کیا کہ اس کے دل میں تکبر تھا۔ دل میں کہتا تھا کہ میں اس کو ہرگز سجدہ نہیں کروں گا۔ عمر میں مَیں اس سے کہیں بہتر ہوں۔ اس سے بڑا اور پیدایش میں اس سے طاقتور ہوں۔ یہی اس آیت کا مطلب ہے: ﴿ خَلَقْتَنِيْ

﴿مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ﴾ [الأعراف: ١٢] ”مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اسے تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔“ یعنی آگ مٹی سے زیادہ زبردست ہے۔

جب ابلیس نے سجدہ نہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ہر طرح کی بھلائی سے ناامید کر کے شیطان مردود کر دیا۔ یہ اس کی نافرمانی کی سزا ہوئی۔ پھر آدم کو سب چیزوں کے نام بتائے۔ سب چیزوں کو حاضر کر کے ان فرشتوں کے سامنے جو ابلیس کے ہمراہ تھے، آدم علیہ السلام سے نام ظاہر کرائے۔ سب کو معلوم تھا کہ اللہ کا اُن پر غصہ ہے، اس لیے انھوں نے علمِ غیب سے اپنی براءت ظاہر کی۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس روایت کا یہ سیاق غریب ہے، جو محلِ نظر ہے، اس کی تفصیل لمبی ہے (جس کی یہاں ضرورت نہیں)۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مشہور تفسیر میں اسی طرح یہ روایت آئی ہے، تقریباً ایسے ہی امام سدی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔[2] امام سدی رحمہ اللہ کی روایت میں اسرائیلیات بہت ہیں۔ ہوسکتا ہے کچھ بات مُدرج ہو اور صحابی کا قول نہ ہو یا صحابہ نے بعض اگلی کتابوں سے لی ہو۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں امام سدی رحمہ اللہ کی بعینہٖ اُسی سند سے روایت لا کر اسے شرطِ بخاری پر بتایا ہے۔[3]

پھر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ غرض کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس بھی اس خطاب میں داخل تھا، اگرچہ وہ ان کی ذات کا نہیں تھا، مگر ان جیسے کام کر کے ان سے ملتا جلتا ہوگیا تھا، اسی لیے حکم نہ ماننے پر وہ قابلِ مذمت ہوگیا۔ اس کا بیان اپنی جگہ آئے گا، جہاں یہ فرمایا ہے: ﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ﴾ [الکھف: ٥٠] ”وہ جنوں میں سے تھا، چناں چہ اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔“[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ابلیس نافرمانی سے پہلے فرشتوں میں سے تھا۔ اس کا نام عزازیل تھا اور زمین میں رہنے والوں سے تھا۔ تمام فرشتوں سے زیادہ عبادت کرتا اور سب سے زیادہ علم رکھتا تھا۔ اسی گھمنڈ پر اس نے تکبر کیا۔ اس کی قوم کا نام ”جن“ تھا۔[5] دوسری روایت یہ ہے کہ پہلے اس کا نام عزازیل تھا اور بزرگ فرشتوں میں سے تھا۔ اس کے چار پَر تھے، پھر ابلیس ہوگیا۔[6] تیسری روایت کے مطابق وہ آسمانِ دنیا اور زمین کا سلطان تھا۔[7] دونوں جگہ کی سیاست کرتا تھا۔ جب نافرمان ہوگیا تو اللہ نے مسخ کر کے شیطان رجیم کر دیا۔[8] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابلیس ایک سیکنڈ کے لیے بھی فرشتوں میں سے نہیں تھا، بلکہ جس طرح انسان کی اصل آدم علیہ السلام ہیں، اسی طرح اس ملعون کی اصل جن ہے۔[9]

---

① تفسیر الطبري (١/ ٤٥٥۔ ٤٥٧) اس کی سند میں ”بشر بن عمارۃ“ ضعیف ہے۔ ② تفسیر الطبري (١/ ٤٥٨۔ ٣٦٠)
③ تفسیر ابن کثیر (١/ ١٠٤، ١٠٥) ④ تفسیر ابن کثیر (١/ ١٠٥)
⑤ تفسیر الطبري (١/ ٥٠٢۔ ٥٠٣) اس کی سند میں ”محمد بن حمید“ ضعیف راوی ہے۔
⑥ تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٨٤) اس کی سند حسن ہے۔
⑦ تفسیر الطبري (١/ ٥٠٣) اس کی سند میں انقطاع ہے، کیوں کہ ابن جریج رحمہ اللہ کی ملاقات سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔
⑧ تفسیر الطبري (١/ ٥٠٤) اس کی سند میں ”حسین بن داود“ ضعیف راوی ہے۔
⑨ تفسیر الطبري (١/ ٥٠٦)

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ ''کافرین'' سے مراد نافرمان ہیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی ان کافروں میں سے ہوگیا جو ابھی تک پیدا نہیں ہوئے، بلکہ بعد میں ہوں گے۔[1] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے ابلیس کو کفر اور گمراہی ہی پر پیدا کیا تھا، اگرچہ فرشتوں جیسے کام کرتا تھا، پھر اس کو اس کی اصل پر پھیر دیا اور ﴿ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ فرما دیا۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرشتوں کا آدم کو یہ سجدہ کرنا، اللہ کی فرماں برداری میں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کی یہ عزت افزائی فرمائی کہ فرشتوں سے ان کو سجدہ کرایا۔[3] کسی نے کہا کہ یہ سجدہ اکرام و سلام تھا، جس طرح یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے سجدہ کیا تھا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ﴾ [يوسف: ١٠٠] ''اور سب اس کے آگے سجدے میں گر گئے۔'' یہ سجدہ پہلی امتوں میں جائز تھا، ہمارے دین میں منسوخ ہوگیا۔

سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ملک شام گیا۔ وہاں دیکھا کہ لوگ اپنے علما کو سجدہ کرتے ہیں۔ میں نے عرض کی: آپ اللہ کے رسول ہیں، آپ کو سجدہ کرنا بہت بہتر ہے۔ فرمایا: اگر میں کسی بشر کو یہ حکم دیتا کہ وہ کسی بشر کو سجدہ کرے تو عورت سے کہتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کیا کرے، کیوں کہ شوہر کا اس پر بہت بڑا حق ہے۔[4] امام رازی رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ سجدہ اللہ کو تھا، آدم قبلہ تھے، جس طرح فرمایا: ﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ ﴾ [بني اسرائيل: ٧٨] ''سورج ڈھلنے سے لے کر رات کے اندھیرے تک نماز قائم کیجیے۔'' لیکن اس مثال پر اعتراض ہے۔ زیادہ بہتر یہی ہے کہ پہلا قول ہی قابلِ ترجیح ہے۔ یہ سجدہ آدم ہی کو تھا۔ ان کی عزت، عظمت، احترام اور سلام کے لیے اس کے بجا لانے میں اللہ کے حکم کی اطاعت تھی۔ قبلہ ٹھہرانے میں کیا بزرگی ظاہر ہوتی ہے یا سجدے میں جھکنے اور ناک پیشانی کو زمین پر رکھنے کے علاوہ صرف عاجزی مراد لینے میں کیا خوبی ہے؟ اس لیے امام رازی رحمہ اللہ نے ان دونوں اقوال کو ضعیف کہا اور پہلی بات کو قوی قرار دیا ہے[5] اور یہی ٹھیک ہے۔ علاوہ ازیں شفاعت کے سلسلے میں صحیح بخاری کی حدیث بھی اسی کی تائید و تصریح کرتی ہے: « وَأَسْجَدَ لَكَ مَلَائِكَتَهُ » ''اور اللہ نے آپ کے لیے اپنے فرشتوں سے سجدہ کرایا۔''[6]

امام رازی نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کے لیے زمین کے فرشتوں ہی کو حکم دیا گیا تھا یا آسمانوں کے فرشتوں کو بھی؟ اہلِ علم کے ہر ایک قول کو ایک گروہ نے ترجیح دی ہے، مگر آیتِ کریمہ کا ظاہر عام ہے: ﴿ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ﴾ [الحجر: ٣٠۔ ٣١، صٓ: ٧٣۔ ٧٤] ''پھر سارے فرشتوں نے اکٹھے سجدہ کیا۔ سوائے ابلیس کے۔''[7] بالآخر میں یہ کہتا ہوں کہ یہ عموم مطلب اسی وقت ہوسکتا ہے جب فرشتوں سے بالخصوص وہ

---

[1] تفسير الطبري (١/ ٥١١) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٨٥)
[2] تفسير القرطبي (٧/ ١٨٨)
[3] تفسير الطبري (١/ ٥١٢)
[4] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٥٣) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٩٧)
[5] تفسير الرازي (٢/ ١٩٤۔ ١٩٥)
[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٢)
[7] تفسير الرازي (٢/ ٢١٨)

فرشتے مراد نہ ہوں، جو ابلیس کے ساتھ گئے تھے، وگرنہ یہ عموم انھی کے ساتھ مخصوص رہے گا، لیکن چوں کہ اس بارے میں کوئی مرفوع حدیث نہیں ہے، اس لیے ایسی جگہ پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں، صرف ظاہر کتاب و سنت پر ایمان لانا کافی ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کے دشمن ابلیس نے آدم علیہ السلام پر حسد کیا کہ یہ عزت اور بزرگی انھیں کیوں ملی، جبکہ میں آتشی ہوں اور یہ خاکی ہے۔ تکبر کے گناہ کی ابتدا اسی مردود سے ہوئی، جس نے حسد اور تکبر کی وجہ سے آدم کو سجدہ نہ کیا۔[1] صحیح حدیث میں آیا ہے، وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا، جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوا۔[2] ابلیس کے دل میں تکبر و کفر و عناد تھا، اسی وجہ سے وہ اللہ کی رحمت سے محروم اور جنت سے نکالا گیا۔

تکبر عزازیل را خوار کرد بزندان لعنت گرفتار کرد

"تکبر نے عزازیل (ابلیس) کو رسوا کر کے لعنت کے قید خانے میں بند کر دیا۔"

کسی نے کہا ہے کہ کافر ہو گیا اور کسی نے کہا ہے کہ اللہ کے علم میں پہلے ہی سے کافر تھا۔ قرطبی رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے، پھر یہ لکھا ہے کہ ہمارے علما نے یہ کہا ہے کہ اگر کسی شخص کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کوئی کرامت یا کرشمہ ظاہر کرے اور وہ شخص نبی نہ ہو تو یہ اس کے ولی اللہ ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ جیسے بعض صوفیوں اور رافضیوں کا خیال ہے۔ پھر کہا کہ ہم یقین نہیں کر سکتے کہ اپنا شخص اللہ سے ایمان کی حالت میں ملے گا، ہاں ولی ایمان کی حالت میں ملتا ہے۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خارقِ عادت (خلافِ معمول کام) کبھی فاجر کافر کے ہاتھ پر بھی ظاہر ہوتا ہے۔ دیکھو ابن صیاد نے کہا تھا: "هُوَ الدُّخُّ" جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو پوشیدہ رکھا: ﴿ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ﴾ [الدخان: ۱۰] "جس دن جب آسمان صاف دھواں لائے گا۔" اسی طرح جب اس کو غصہ آتا تو اتنا پھول جاتا کہ راستہ بھر جاتا۔[4] ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اسی وجہ سے اس کو مارا تھا۔

احادیث میں دجال سے کتنی ہی خوارق عادات کا سرزد ہونا آیا ہے، جیسے آسمان سے پانی برسانا، زمین کا خزانہ ہمراہ لیے پھرنا، ایک جوان کو مار کر زندہ کرنا وغیرہ۔ امام شافعی اور لیث بن سعد رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ جب تم کسی آدمی کو دیکھو کہ وہ پانی پر چل رہا ہے یا ہوا میں اڑ رہا ہے تو دھوکا نہ کھاؤ، جب تک اس کے کام کو کتاب و سنت پر پیش نہ کر لو۔[5]

میں کہتا ہوں کہ ہوا میں باز اور کبوتر اڑتے ہیں، پانی پر کتے یا دیگر حیوان چلتے (تیرتے) ہیں، اس میں کون سی فخر والی بات ہے؟ اللہ نے انسان کو اکرم مخلوقات اور اشرف کائنات بنایا ہے، اس کا فخر یہ نہیں ہے کہ پانی پر چلے یا ہوا میں اڑے، اس کی بزرگی اس میں ہے کہ بندگی کا پورا پورا حق ادا کرے، غرور و تکبر کی ہوا بھی نہ لگنے دے اور نعلین کی

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۸٤) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۱) [3] تفسیر القرطبي (۱/ ۲۹۷)
[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۲۸۹) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۹۳۰۔ ۲۹۳۲) [5] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۰۷)

طرح خاکسار ہو، دستار کی طرح صاحب نخوت نہ ہو۔

امام بقاعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلے آدم علیہ السلام کو تمام ناموں کی تعلیم دی گئی، پھر انھیں سجدہ کروایا گیا، پھر جنت میں سکونت۔ پھر جنت سے نکالا گیا، پھر زمین میں بسایا۔[1] اس آیت میں اہلِ سنت کے مذہب کی دلیل ہے کہ انبیا فرشتوں سے افضل ہیں۔ آدم علیہ السلام کا یہ قصہ قرآن کی سات سورتوں میں آیا ہے، جن میں سورۃ الاعراف، سورۃ الحجر، سورۃ الاسراء، سورۃ الکہف، سورت طٰہٰ اور سورت ص شامل ہیں۔ اس قصے کو بار بار بیان کرنے کا مقصد شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ زمانہ اور اپنی قوم کے ہاتھوں بڑی تکلیف میں گرفتار تھے۔ یہ بات امام خطیب رحمہ اللہ نے کہی ہے۔ مگر ظاہر یہ ہے کہ یہ تکرار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا آدم علیہ السلام کی ساری مخلوق پر فضیلت کے اظہار کے لیے ہے، حتیٰ کہ فرشتوں پر بھی، نہ کہ اس لیے کہ آدم علیہ السلام کسی آزمایش میں تھے۔

فتح البیان میں ہے کہ یہ سجدہ جمعہ کے دن زوال سے عصر تک تھا۔ سب سے پہلے جبریل علیہ السلام نے سجدہ کیا، پھر میکائیل نے، پھر اسرافیل نے، پھر عزرائیل نے، پھر سارے مقرب فرشتوں نے سجدہ کیا۔ یہ قول اسی بنیاد پر ٹھیک ہوگا، جب سجدے کو ابلیس اور فرشتوں کے ساتھ خاص نہ کیا جائے، جس طرح اکثر اہلِ علم کا قول ہے۔ شیطان کا نام سریانی میں عزازیل، عربی میں حارث تھا اور نافرمانی کے بعد نام ابلیس ہوا۔ ابلیس کے معنی مایوس کے ہیں، نام کے ساتھ اس کی صورت بھی بدل دی گئی۔[2]

استکبار اور اِباء میں فرق:

استکبار یہ ہے کہ اپنی جان کو بڑا سمجھے۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ تکبر حق کو رد کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔[3] ''إِبَاءٌ'' یعنی انکار، استکبار کے بعد تھا، لیکن اس کا ذکر پہلے کیا گیا، کیوں کہ انکار ظاہری افعال سے ہے اور استکبار قلبی افعال سے۔ پھر سورت صٓ میں صرف استکبار کا ذکر فرمایا اور سورۃ الحجر میں صرف انکار کا ذکر کیا۔ آیت شریفہ سے تکبر کا قبیح ہونا اور اللہ کے حکم کے بارے میں لیت ولعل کا برا ہونا معلوم ہوا۔ یہ بھی پتا چلا کہ صیغۂ امر وجوب کے لیے ہوتا ہے۔

مسئلۂ موافات:

جس کے بارے میں اللہ نے جان لیا ہے کہ وہ کفر پر مرے گا، حقیقت میں کافر وہی شخص ہے، کیوں کہ اعتبار خاتمے کا ہے، اگرچہ فی الحال مومن ہی کیوں نہ ہو، اسی کو مسئلۂ موافاۃ کہتے ہیں۔ اس میں حنفیہ، شافعیہ اور ماتریدیہ کا اختلاف ہے۔ علامہ سبکی رحمہ اللہ نے اس بارے میں ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔

---

[1] نظم الدرر (١/ ٨٤) [2] فتح البیان (١/ ١٣٢) [3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩١)

وَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا
حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾
فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا
اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ
وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾

اور ہم نے کہا: اے آدم! تو اور تیری بیوی جنت میں رہو اور اس میں سے سیر ہو کر کھاؤ جہاں سے چاہو (لیکن) اس درخت کے قریب مت جانا، ورنہ تم دونوں ظالموں میں سے ہو جاؤ گے (35) پھر شیطان نے ان کو اس سے پھسلا دیا اور انھیں اس سے نکلوا دیا، جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا: یہاں سے اترو، تم میں سے بعض لوگ بعض کے دشمن ہیں اور تمھارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور تمھیں ایک (خاص) وقت تک اس سے فائدہ اُٹھانا ہے (36)

یہ بنی آدم پر اللہ کا تیسرا احسان ہے کہ اس نے جنت کو ان کے باپ آدم علیہ السلام کے لیے مباح کر دیا تھا کہ جہاں چاہیں رہیں اور جو چاہیں کھائیں اور جو چاہیں اوڑھیں۔ ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا آدم نبی تھے؟ فرمایا: ہاں نبی رسول تھے۔ اللہ نے ان سے کلام کیا تھا۔[1]

فرمایا: اے آدم! تم اور تمھاری بیوی جنت میں رہو۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس میں اختلاف کیا ہے کہ یہ جنت کہاں تھی: آسمان پر یا زمین میں؟ اکثر نے کہا ہے کہ آسمان پر تھی۔[2] امام قرطبی رحمہ اللہ نے معتزلہ وقدریہ سے نقل کیا ہے کہ زمین میں تھی۔[3] اس کے بارے میں تفصیل سورۃ الاعراف کی تفسیر میں دی جائے گی۔ فتح البیان میں ہے کہ بعض نے کہا ہے کہ یہ جنت ارضِ فلسطین میں تھی یا فارس اور کرمان کے درمیان تھی۔ اللہ نے اسے آدم علیہ السلام کی آزمایش کے لیے بنایا تھا۔ وہاں سے ان کا اُتارنا یہ تھا کہ ارضِ ہند کی طرف منتقل ہو جائیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا﴾ [البقرۃ: ٦١] یعنی مصر کو جاؤ، یہاں سے نکل جاؤ، راستہ لو، اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔

آدم علیہ السلام کی پیدایش بلا اختلاف اسی زمین پر ہوئی تھی، اس قصے میں ان کا آسمان کی طرف اٹھایا جانا مذکور نہیں۔ اگر اٹھایا جانا ہوتا تو اس نعمتِ عظمیٰ کا ذکر ضرور کیا جاتا اور یہ جنت اگر دار الخلد ہوتی تو ابلیس اس میں نہ جاتا۔

---

[1] مسند أحمد (٥/ ١٧٨) اس کی سند میں ''عبید بن خشخاش'' ضعیف ہے، البتہ سیدنا ابو امامہ سے اس معنی میں ایک صحیح روایت مروی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الصحيحة (٢٦٦٨)

[2] تفسير ابن كثير (١/ ١٠٧) [3] تفسير القرطبي (١/ ٣٠٢)

کسی نے کہا ہے کہ یہ سب ممکن ہے۔ اس سلسلے میں دی جانے والی تمام دلیلیں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ کسی بات پر یقین کرنے کے بجائے اس معاملے میں توقف کیا جائے۔ ابوالسعود رحمہ اللہ نے بھی یہی بات کہی ہے۔[1] حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''حادي الأرواح'' میں دونوں طرف کے دلائل کا تفصیل سے ذکر کیا ہے،[2] لیکن یہ تصریح نہیں فرمائی کہ کس کو ترجیح دی جائے۔[3] اس میں شک نہیں کہ جس بات کی وضاحت اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمائی، اس میں غور کرنا ضروری نہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ آیت کا انداز یہ بتاتا ہے کہ حوا علیہا السلام آدم علیہ السلام کے جنت میں جانے سے پہلے پیدا ہوئیں۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے اسی بات کی تصریح کی ہے، مگر علمائے تورات کے حوالے سے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب آدم پر نیند ڈالی گئی تو ان کے بائیں جانب کی پسلی لے کر اس جگہ کو گوشت سے جوڑ دیا گیا، آدم بدستور سوتے رہے، جاگے نہیں، یہاں تک کہ ان کی پسلی سے بی بی حوا پیدا ہو کر ایک پوری عورت بن گئیں، تاکہ آدم کو ان سے چین و آرام ملے۔ جب وہ اس خوابِ راحت سے جاگے اور حوا کو اپنے پہلو کے پاس بیٹھے ہوئے دیکھا تو کہا: ''لَحْمِيْ وَدَمِيْ وَزَوْجَتِيْ'' یعنی یہ میرا ہی گوشت اور خون ہے اور میرا جوڑا ہے۔ پھر ان سے ان کا دل لگ گیا، پھر اللہ نے ان کا نکاح آدم علیہ السلام سے کر دیا اور کہا تم دونوں جنت میں رہو، مگر اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا۔[4] کسی نے کہا ہے کہ حوا علیہا السلام کی پیدائش جنت میں داخل ہونے کے بعد ہوئی تھی۔ ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ حوا کا نام حوا اس لیے ہوا کہ وہ زندہ چیز سے پیدا ہوئیں، یعنی تم جیو۔[5]

اللہ تعالیٰ کا فرمانا کہ اس درخت کے پاس نہ جانا، امتحان و آزمائش کے لیے تھا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ درخت انگور کا تھا۔ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی ایک جماعت کا بھی یہی قول ہے۔ یہودیوں کا خیال ہے کہ وہ درخت گیہوں کا تھا۔[6] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایک روایت میں ایسا ہی آیا ہے، جب کہ دوسری روایت میں سنبلہ (سِٹہ) کہا ہے۔[7] ابوالجلد رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ پھر جس درخت کے پاس آدم علیہ السلام نے توبہ کی تھی، وہ زیتون کا تھا،[8] مگر اس گیہوں کا دانہ جنت میں بہت بڑا تھا، جیسے گائے کا سر ہے، وہ مکھن سے زیادہ نرم اور شہد سے

---

[1] تفسیر أبي السعود (١/ ٩٠) [2] حادي الأرواح (١/ ١٩۔ ٣٤)

[3] فتح البيان (١/ ١٣٤۔ ١٣٥) [4] تفسير الطبري (١/ ٥١٤)

[5] تفسیر الطبري (١/ ٥١٣) اس کی سند پر ''علامہ احمد شاکر'' کا کلام دیکھیں: تفسیر الطبري (١/ ١٥٦) تفسیر ابن کثیر (١/ ١٠٨)

[6] تفسیر الطبري (١/ ٥١٩) اس کی سند پر ''علامہ احمد شاکر'' کا کلام دیکھیں: تفسیر الطبري (١/ ١٥٦)

[7] تفسیر الطبري (١/ ٥١٦۔ ٥١٧) اس کی سند میں ''النضر بن عبدالرحمٰن'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[8] تفسیر الطبري (١/ ٥١٧۔ ٥١٨) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔

زیادہ میٹھا تھا۔ ابو مالک رحمہ اللہ نے کہا کہ کھجور کا درخت تھا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ انجیر کا تھا۔[1] کسی نے لوز (بادام) کا درخت بتایا ہے اور کسی نے کہا کہ قلم کا درخت تھا۔ کسی نے کہا کہ کافور کا تھا۔ کسی نے کہا کہ اترج (سنگترہ) تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ درخت کی جنس سے تھا۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو کوئی اس درخت کو کھاتا، اس کو حدث (ہوا خارج ہوتی) ہوتا اور بہشت حدث کی جگہ نہیں، یعنی اس لیے آدم وہاں سے نکالے گئے۔[2] وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک شاخ دار درخت تھا اور اس میں پھل لگتا تھا، جس کو فرشتے اپنے ہمیشہ رہنے کے لیے کھاتے تھے۔ اللہ نے آدم و حوا سے کہا کہ اس درخت کو کھانا تو کجا، تم اس کے قریب بھی نہ جانا۔[3]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے: درست یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ایک خاص درخت سے منع کیا تھا نہ کہ جنت کے تمام درختوں سے۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کون سا خاص درخت تھا، کیوں کہ اللہ نے قرآن مجید میں کوئی دلیل نہیں دی کہ جس سے کوئی خاص درخت متعین ہوتا اور نہ سنتِ صحیحہ ہی سے اس کا کوئی پتا چلتا ہے۔ کوئی کسی درخت کا ذکر کرتا ہے، کوئی کسی جھاڑی کا۔ یہ ایسا علم ہے جس کے جاننے والے کو کوئی فائدہ نہیں اور نہ جاننے والے کا کوئی نقصان نہیں۔ واللہ أعلم۔ رازی رحمہ اللہ نے بھی اسی اِبہام کو ترجیح دی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو صحیح کہا ہے اور امام شوکانی رحمہ اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔[4]

الغرض کچھ ہی کیوں نہ ہو، شیطان نے ان دونوں میاں بیوی کو اس درخت کی وجہ سے جنت سے نکالا اور انھیں لغزش دی، وہ جس اچھے لباس، اچھے گھر، اچھے رزق اور اچھے چین آرام میں تھے، اس سے انھیں نکال باہر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب تم زمین میں ایک وقت تک، یعنی موت تک یا قیامت کے قائم ہونے تک رہو۔ تمھارا ٹھکانا اور رزق اسی زمین میں ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سانپ اور ابلیس کا قصہ کہ کس طرح جنت میں جاکر وسوسہ ڈالا، سورۃ الاعراف کی تفسیر میں بیان کیا ہے، اس لیے کہ وہاں آدم کا ذکر زیادہ تفصیل سے آیا ہے، مگر یہ تمام باتیں اسرائیلی ہیں، جن کو نہ سچا سمجھا جا سکتا ہے اور نہ انھیں جھٹلایا جا سکتا ہے۔

سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ایک لمبا آدمی بنایا تھا، ان کے سر پر بہت بال تھے، جیسے کھجور کا درخت ہو، جب انھوں نے شجرہ ممنوعہ کو چکھا تو بدن پر سے لباس اتر گیا اور ستر نظر آنے لگا، وہ جنت میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگے، حتی کہ ایک درخت میں ان کے بال اُلجھ گئے۔ یہ اس سے چھڑانے لگے تو رحمٰن نے کہا

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٨٦)
[2] تفسیر الطبري (١/ ٥٢٨) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٨٧)
[3] تفسیر الطبري (١/ ٥٢٥، ٥٢٦) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٨٧)
[4] تفسیر الطبري (١/ ٥٢٠۔ ٥٢١) تفسیر الرازي (٣/ ٦) تفسیر ابن کثیر (١/ ١٠٩)

کہ اے آدم! کیا تو مجھ سے بھاگتا ہے؟ کہا: نہیں اے رب! بلکہ شرماتا ہوں۔ اس کو ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: آدم علیہ السلام جنت میں عصر سے مغرب تک رہے۔[2] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دن کی ایک گھڑی رہے، یہ گھڑی دنیا کے ایک سو تین دن کے برابر تھی۔[3] امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آدم جنت سے نویں یا دسویں گھڑی میں نکلے اور اُن کے سر پر جنت کے درخت کا ایک تاج تھا۔[4] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہاں سے نکلو تو آدم ہند میں اترے اور ان کے ساتھ حجرِ اسود اور جنت کے کچھ پتے تھے۔ وہ پتے ہند میں پھینک دیے اور اُن سے یہ سارے خوش بودار درخت پیدا ہوئے۔ ہندوستان کے عطر کی اصل جنت کے وہی پتے ہیں۔ آدم ان پتوں کی مٹھی بھر جنت سے اپنے ہمراہ نہایت حسرت و افسوس کے ساتھ بطور یادگار لے آئے۔[5]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ آدم دحنا نامی جگہ پر اترے۔ یہ جگہ مکہ اور طائف کے درمیان ہے۔[6] حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آدم ہند میں، حوا جدّہ میں، ابلیس بصرہ سے چند میل کے فاصلے پر دست میسان میں اور سانپ اصبہان میں اترے۔[7] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام صفا پر اور حوا علیہا السلام مروہ پر اتریں۔[8] رجا بن ابی سلمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آدم زانو پر ہاتھ رکھے ہوئے سرنگوں اترے اور ابلیس انگلیوں میں انگلیاں ڈالے ہوئے آسمان کی طرف دیکھتا ہوا اترا۔[9]

یہ سب آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں۔ مرفوع حدیث میں آدم علیہ السلام کے اترنے کی جگہ کی صراحت نہیں آئی۔ اتنا صحیح ہے کہ ہند میں اترے،[10] مگر کسی شہر، قصبے یا گاؤں کا نام مرفوعاً ثابت نہیں، ہمارے لیے اتنا کافی ہے کہ جہاں اللہ نے چاہا اتارا، جگہ کے معلوم ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو زمین پر اتارا، اُنھیں ہر چیز کی صنعت سکھا دی اور جنت کے کچھ پھل بہ طورِ توشہ اور زادِ راہ ساتھ کر دیے۔ دنیا کے یہ

---

(1) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٨٧۔ ٨٨) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو نہیں پایا۔ امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وهذا منقطع بين الحسن وأبي بن كعب فلم يسمعه منه، وفي رفعه نظر أيضاً" (تفسير ابن كثير: ٣/ ٢٢٥)

(2) مستدرك الحاكم (٢/ ٥٩١) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عمارہ بن معاویہ کا سماع سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے ثابت نہیں ہے۔ دیکھیں: ضعفاء العقيلي (٣/ ٣٢٣)

(3) حلية الأولياء (٦/ ٢٧٢) ، (4) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٨٨) (5) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٨٩) اس کی سند حسن ہے۔

(6) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٨٩) اس کی سند میں جریر کا سماع عطاء سے اختلاط کے بعد ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: تهذيب التهذيب (٧/ ١٨٥)

(7) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٨٩) (8) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٨٨) (9) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٨٨)

(10) اس سلسلے میں وارد روایت بھی ضعیف ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٠٣) اس بارے میں بعض اقوال بھی مروی ہیں، لیکن اس کی کوئی مستند دلیل نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام زمین کے کس حصے پر اترے تھے۔

پھل وہیں سے آئے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ یہ بگڑ جاتے ہیں، وہ بگڑتے نہیں۔[1]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ بہترین دن جس پر سورج طلوع ہوا جمعہ کا دن ہے، اسی دن آدم علیہ السلام پیدا ہوئے، اسی دن جنت میں داخل ہوئے اور اسی دن وہاں سے نکالے گئے۔[2] (رواہ مسلم والنسائي)۔ امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیتِ شریفہ میں بوجوہ سب گناہوں کے لیے بڑی وعید اور دھمکی ہے۔ ایک یہ کہ جو شخص یہ تصور کرے گا کہ آدم علیہ السلام پر ذرا سی لغزش کی وجہ سے کیا گزری تو وہ معصیت سے بہت ڈرے گا، وہاں تو آدم ایک ادنیٰ قصور پر نکال دیے گئے۔[3] یہاں بنی آدم سے رات دن پے در پے گناہ سرزد ہوتے ہیں اور کسی کو اس کے انجام کا دھیان تک نہیں ہوتا۔ ان فاسقوں کی وہی مثل ہے:

پدرم جنتِ جاوید بہ گندم بفروخت ناخلف باشم اگرمن بجوئے نفروشم

''میرے باپ نے ہمیشہ رہنے والی جنت گندم کے عوض بیچ دی، میں ناخلف اولاد ہوں گا، اگر میں نے (اسے) جَو کے بدلے نہ بیچا۔''

فتح موصلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلے ہم جنت کی ایک قوم تھے اور ابلیس ہم کو قید کر کے دنیا میں لے آیا ہے، جب تک ہم پھر اسی گھر میں نہ پہنچیں، جہاں سے نکالے گئے تھے تو ہمیں رنج و غم کے سوا کچھ حاصل نہیں۔[4] سچ ہے مسافر کو آرام اسی وقت ملتا ہے، جب وہ سفر کی تکلیف سے چھوٹ کر اپنے وطن اور اپنے گھر میں پہنچ جائے۔

انسان کے دو دشمن:

انسان کے پرانے دشمن دو ہی ہیں: ایک ابلیس اور دوسرا سانپ۔ اسی لیے فرمایا: تم کو بعض تمھارے بعض کے دشمن ہیں، یعنی ابلیس اور اولادِ آدم میں سے مومنین کے درمیان پرانی دشمنی چلی آ رہی ہے، اسی طرف اس آیت میں بھی اشارہ فرمایا ہے: ﴿ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ﴾ [الفاطر: ٦] ''بے شک شیطان تمھارا دشمن ہے، لہٰذا تم اسے دشمن ہی جانو۔'' عدوان کہتے ہیں ظلم کو اور عدو وہ ہے، جو دوست دار نہ ہو۔

بقولِ دشمن پیمانِ دوستی بشکستی ببیں کہ از کہ بریدی وبا کہ پیوستی

''دشمن کے کہنے پر تو نے دوستی کے بندھن کو توڑ دیا، ذرا غور کر تو نے کس سے رشتہ توڑا اور کس سے رشتہ جوڑا۔''

سانپوں کی دشمنی ایسی ہے کہ اہلِ سنن کے نزدیک بہت سی حدیثوں میں حکم آیا ہے کہ سانپوں کو قتل کرو۔ ان کا

---

[1] تفسیر الطبري (١/ ٣٩٣) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٩٢) علامہ احمد شاکر نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٥٤) سنن النسائي، رقم الحدیث (١٣٧٣)

[3] تفسیر الرازي (٣/ ١٨) [4] تفسیر الرازي (٣/ ١٨)

معاوضہ لینے سے نہ ڈرو۔ قرطبی رحمہ اللہ نے یہ حدیثیں لکھی ہیں،[1] کچھ روایتیں فتح البیان میں بھی مذکور ہیں۔[2] سانپ کو تو لوگ مارتے ہیں، اس لیے کہ اس کے کاٹنے سے آدمی مرجاتا ہے، مگر شیطان، جس کے سبب سے ایمان جاتا ہے اور جس کا فتنہ سانپ کے زہر سے بڑھا ہوا ہے، اس کو ہزاروں لاکھوں میں سے شاید دو چار آدمی ہی خالص عبادت اور سچی توحید اختیار کر کے مارتے ہوں۔

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۳۷

پھر آدم نے اپنے رب سے چند کلمے سیکھ لیے تو (اللہ نے مہربانی کرتے ہوئے) اس پر توجہ دی، بے شک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (37)

توبۂ آدم کی قبولیت:

موضح قرآن میں ہے کہ آدم کے دل میں اللہ نے کچھ الفاظ ڈال دیے، اس طرح پکارا تو بخشا گیا۔ وہ الفاظ سورۃ الاعراف میں ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ کلمے یہ تھے: ﴿ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۲۳ ﴾ [الأعراف: ۲۳] ”انھوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم نے اپنے آپ ظلم کیا، اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور تو نے ہم پر رحم نہ فرمایا تو یقیناً ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔“ اسلاف کی ایک جماعت نے بھی یہی بات کہی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ تلقی (کلمات کا سیکھنا) یہ تھا کہ حج کرنے کا طریقہ معلوم کر لیا۔[3] عبید بن عمیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آدم نے عرض کی: اے رب! یہ خطا جو مجھ سے ہوئی ہے، میرے پیدا کرنے سے پہلے مجھ پر لکھی گئی تھی یا میں نے اپنی طرف سے ایجاد کی ہے اور ایک بدعت نکالی ہے؟ فرمایا: نہیں، بلکہ تیری پیدائش سے پہلے میں نے تجھ پر لکھ دی تھی۔ انھوں نے عرض کی: جس طرح مجھ پر وہ خطا لکھی گئی ہے، اسی طرح اب تو مجھ کو بخش بھی دے۔ سو تلقی مذکور یہ کلمے تھے۔[4]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ آدم علیہ السلام نے عرض کی: اے رب! کیا تو نے مجھے اپنے ہاتھ سے نہیں بنایا ہے؟ کہا: ہاں۔ کہا: کیا اپنی روح مجھ میں نہیں پھونکی ہے؟ فرمایا: ہاں۔ کہا: کیا چھینک کے جواب میں ”يَرْحَمُكَ اللّٰهُ“ نہیں کہا ہے؟ فرمایا: ہاں۔ کہا: کیا تیری رحمت تیرے غضب سے بڑھ کر نہیں ہے؟ فرمایا: ہاں۔ کہا: کیا تو نے اس

---

[1] تفسیر القرطبي (۱/ ۳۱۳) [2] فتح البیان (۱/ ۱۳۷)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۹۱) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔

[4] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۹۱) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۱۱)

خطا کو مجھ پر نہیں لکھا تھا؟ فرمایا: ہاں۔ عرض کی: بھلا اگر میں توبہ کروں اور پشیمان ہوں تو پھر تو مجھ کو جنت میں لے جائے گا؟ فرمایا: ہاں۔ اس کو حاکم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور صحیح الاسناد بتایا ہے۔[1] معلوم ہوا کہ توبہ کرنے سے جنت مل سکتی ہے۔ جو توبہ نہیں کرتا، وہ جنت سے محروم رہتا ہے۔ توبہ کا اول وقت تو وہی ہے، جس وقت بھولے چوکے گناہ ہو جائے، اسی وقت توبہ سے اس کا ازالہ کرے اور دیر نہ کرے، کیوں کہ آخری وقت مرنے سے پہلے عین حالتِ نزع میں توبہ کام نہیں آتی۔

توبہ ہا را نفس باز پسیں دست زدست بیخبر دیر رسیدی درِ محمل بستند

''دم واپسیں تونے توبہ کو ہاتھ سے چھوڑ دیا، اے بے خبر! تونے آنے میں دیر کر دی، محمل کا دروازہ تو بند ہو چکا۔''

اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدم علیہ السلام نے عرض کی کہ اے رب! اگر میں توبہ کروں اور رجوع کروں تو کیا تو مجھ کو جنت دے گا اور پھر وہاں لوٹا کر لے جائے گا؟ فرمایا: ہاں، وہ کلمے یہی باتیں ہیں۔ اس کو ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ یہ حدیث غریب منقطع ہے۔[2] مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ کلمات یہ تھے:
«اَللّٰهُمَّ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ رَبِّ إِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ إِنَّكَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ»
''اے اللہ! تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے اور اپنی تعریف کے ساتھ۔ اے میرے پروردگار! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا، پس بخش دے مجھ کو بے شک تو بہتر بخشنے والا ہے۔''[3]

پہلا قول زیادہ بہتر ہے، اگرچہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں وہ کلمات نہیں بتلائے، وہی جانے کہ وہ کلمات کیا تھے۔ کچھ ہی ہوں، بہرحال آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی۔ اللہ کا یہی وعدہ اولادِ آدم سے بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ ﴾ [التوبة: ١٠٤] ''کیا انھیں معلوم نہیں کہ بے شک اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ﴾ [النساء: ١١٠] ''اور جو شخص برا عمل کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے۔'' پھر فرمایا: ﴿ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صٰلِحًا ﴾ [الفرقان: ٧١] ''اور جو توبہ کرے اور نیک کام کرے۔'' ان کے علاوہ اور بہت سی آیات ہیں، جو ایک نادم کے گناہوں کی بخشش اور توبہ کرنے والے کی توبہ کی قبولیت پر دلالت کرتی ہیں۔ ''محو الحوبة'' نامی رسالے (از مصنف) میں بخشش طلب کرنے اور توبہ کرنے کا حال تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا توبہ کو قبول کرنا، اپنی مخلوق پر محض اس کا لطف و کرم اور اپنے بندوں پر اس کی

---

[1] تفسير الطبري (١/ ٥٤٢۔ ٥٤٣) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٩٠۔ ٩١) مستدرك الحاكم (٢/ ٥٩٤) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (كتاب التوسل، ص: ١١٥)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٩٠) اس کی سند میں امام حسن بصری اور سیدنا اُبی بن کعب کے درمیان انقطاع ہے۔

[3] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٩١۔ ٩٢) وفي آخره: "اللهم لا إله إلا أنت سبحانك وبحمدك، رب إني ظلمت نفسي فتب علي إنك أنت التواب الرحيم"

رحمت اور نرمی ہے۔ ”لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ. اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي وَتُبْ عَلَيَّ“ ”نہیں کوئی معبود سوائے اس کے کہ جو بہت زیادہ معاف کرنے والا نہایت رحم والا ہے، اے اللہ! مجھے بخش دے اور میری توبہ قبول فرما۔“ توبہ قبول ہونے کی علامت یہ ہے کہ جس کام کو اللہ کے ڈر سے چھوڑا ہے اور اس پر ندامت ہو چکی ہے، پھر اس کام کو نہ کرے، بلکہ اس کے قریب بھی نہ جائے۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ
هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا
وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٩﴾

ہم نے کہا: تم یہاں سے اکٹھے اترو، پھر اگر تمھارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو ان پر کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے (38) اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہی دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے (39)

اگرچہ یہ ڈرانا آدم و حوا اور ابلیس سب کو تھا، جس وقت ان سب کو جنت سے نکالا گیا تھا، لیکن اس جگہ مراد اولادِ آدم ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ هُدًى ﴾ سے مراد انبیا و رسل اور بینات اور بیان ہیں۔ [1] مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ هُدًى ﴾ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ [2] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ هُدًى ﴾ قرآن ہے۔ [3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ دونوں قول صحیح ہیں۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ کا قول زیادہ عام ہے۔ اس بات کی دلیل یہ آیت ہے کہ کتاب و رسول کے پیروکار پر آخرت میں کوئی خوف اور غم نہیں ہوگا، یعنی ڈر آخرت کے عذاب کا اور غم دنیا کے امور کی کمی کا نہ ہوگا۔ سورت طٰہٰ میں فرمایا: ﴿ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿١٢٣﴾ ﴾ [طٰہٰ: ١٢٣] ”تم دونوں یہاں سے اکٹھے اتر جاؤ، تمھارے بعض، بعض کے دشمن ہیں، پھر جب تمھارے پاس میری ہدایت پہنچے تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ مشقت میں پڑے گا۔“

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یعنی ہدایت کا متبع دنیا میں گمراہ اور آخرت میں بد بخت نہیں ہوگا۔ [4] ﴿ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿١٢٤﴾ ﴾ [طٰہٰ: ١٢٤] ”اور جس نے میری یاد سے اعراض کیا تو بلاشبہ اس کے لیے گزران تنگ ہوگا، اور روزِ قیامت ہم اسے اندھا کر کے اٹھائیں گے۔“ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سعد بن مالک خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ دوزخی لوگ دوزخ میں نہ مریں گے نہ جئیں گے، لیکن کچھ

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٩٣)
(2) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٩٣)
(3) تفسير ابن كثير (١/ ١١٢)
(4) تفسير الطبري (١٨/ ٣٨٩) اس کی سند حسن ہے۔

تو میں جن کو خطاؤں کی وجہ سے آگ پہنچی ہے، اللہ ان کو مارے گا، پھر جب وہ کوئلہ ہو جائیں گے تو ان کے لیے شفاعت کی اجازت دی جائے گی۔ اس کو مسلم نے بھی ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔[1] باقی رہی تیسری قسم جو ایمان لائے، مگر کوئی اطاعت نہ کی، وہ قسم ان دونوں آیتوں میں داخل نہیں ہے۔

خلود کے معنی اس جگہ بغیر انقطاع کے ہمیشگی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ دوبارہ اترنا برائے تاکید ہے اور کسی نے کہا ہے کہ پہلا اُترنا جنت سے آسمانِ دنیا پر تھا اور دوسرا اترنا آسمانِ دنیا سے زمین پر ہوا۔ پہلا قول صحیح ہے۔ صحیحین وغیرہما میں آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے مناظرے کا قصہ آیا ہے۔ اس کے آخر میں یہ بات کہی ہے کہ کیا یہ ملامت اس بات پر ہے جس کو اللہ نے مجھے پیدا کرنے سے پہلے میرے مقدر میں لکھ دیا تھا؟[2]

صحابہ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے کہ آدم علیہ السلام کا اترنا زمینِ ہند پر ہوا۔[3] علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ خوش بودار یہی ہند کی زمین ہے۔ آدم علیہ السلام یہیں اترے تھے، جنت کی خوشبو یہاں کے درختوں کو لگ گئی۔[4]

یہ بات کہ آدم علیہ السلام کس طرح اُترے؟ ان کے ساتھ کیا کیا چیز آئی؟ اتر کر کیا کام کیا؟ اس کا کچھ ذکر حافظ ابن القیم نے ”حادي الأرواح“ میں کیا ہے۔ میر آزاد بلگرامی نے فضائلِ ہند پر ایک مستقل رسالہ بنام ”شمامة العنبر“ تالیف کیا ہے، اس کا ترجمہ ”هداية السائل“ میں مرقوم ہے۔[5] آدم جب یہاں آئے تو نورِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کی پیشانی پر چمکتا تھا۔ وہ نور پشت در پشت منتقل ہو کر مکہ معظمہ سے ظاہر ہوا۔[6] سارے جہان کے لوگوں کا اصل وطن یہی سرزمینِ ہند ہے، اسی جگہ سے آدم کی اولاد متفرق ہو کر سات اقلیم میں جا کر بسی ہے۔

گر نیست از بہشت فزوں بوستانِ ہند   آدم ز ناز و نعمتِ جنت چساں گذاشت

”اگر ہند کے باغات بہشت کے باغ سے بہتر نہ ہوتے تو آدم جنت کے نازونعمت کو کیوں چھوڑ دیتے!“[7]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو گوشت نہ سڑتا اور اگر حوا نہ ہوتیں تو کوئی عورت اپنے شوہر کی خیانت نہ کرتی۔ اس کو بخاری اور حاکم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔[8] سب سے پہلے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٥) تفسير الطبري (١/ ٥٥٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٢) [3] فتح القدير (١/ ١٧٠)

[4] مستدرك الحاكم (٢/ ٥٩٢) اس کی سند میں ”محمد بن حسن کارزی“ کا تذکرہ ”تاريخ الإسلام“ (٧/ ٨٤١) میں ہے، البتہ کسی قسم کی تعدیل یا توثیق کا ذکر نہیں ہے۔

[5] هداية السائل للمؤلف (ص: ٢٢١)

[6] نورِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلے آدم کی پیشانی میں چمکنا اور پھر پشت در پشت منتقل ہونا بے بنیاد اور بے دلیل بات ہے۔ [ص۔ ي]

[7] یہ بھی شاعرانہ ترنگ ہے، ورنہ بہشت کے باغات کے مقابلے میں ہند کے باغات کی کیا حیثیت ہے اور آدم علیہ السلام نے ہند کے باغات کے سبب جنت کی ناز ونعمت ترک نہیں کی تھی۔ [ص۔ ي]

[8] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٥٢) مستدرك الحاكم (٤/ ١٩٤)

جس نے شرک کیا وہ عورت ہے اور اس کا فتنہ سب سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ ہابیل اسی کے پیچھے مارے گئے۔ بقرہ (گائے) کا قصہ بھی اسی فتنے کی بنا پر تھا۔ سب سے پہلے عشق اسی سے ظاہر ہوا۔ زنا کی ابتدا بھی اسی سے ہوتی ہے۔ ان کا مکر سب سے بڑا ہے۔[1] رسول اللہ ﷺ نے عورت کو ناقصِ عقل اور ناقصِ دین فرمایا ہے، پھر یہ بھی فرمایا کہ بڑے عقل مند کی عقل کو یہ کھو دیتی ہے۔[2] اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنْهَا.

يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِىْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّاىَ فَارْهَبُوْنِ ﴿40﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ ﴿41﴾

اے بنی اسرائیل! تم میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی اور تم میرا عہد پورا کرو، میں تمھارے عہد پورے کروں گا، اور مجھ ہی سے ڈرو (40) اور اس (کتاب) پر ایمان لاؤ جو میں نے نازل کی، جب کہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے جو تمھارے پاس ہے اور تم اس کا سب سے پہلے انکار کرنے والے نہ بنو، اور تم میری آیتوں کو تھوڑی قیمت میں نہ بیچو اور مجھ ہی سے ڈرو (41)

بنی اسرائیل، یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو کہتے ہیں۔ انھی میں موسیٰ علیہ السلام بھی پیدا ہوئے اور ان پر تورات اُتری تھی۔ انھوں نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ہاتھ سے چھڑا کر ملکِ شام میں بسایا تھا۔ اللہ نے ان سے اقرار لیا تھا کہ تورات کے حکم پر قائم رہنا، جو نبی بھیجوں تم اس کی مدد کرنا۔ ملکِ شام تمھارے پاس رہے گا، مگر وہ گمراہ ہو گئے۔ بدنیت ہو کر رشوت لیتے، غلط مسئلے بتاتے، خوشامد کے لیے حق بات چھپاتے، اپنی سرداری چاہتے، پیغمبر کی اطاعت نہ کرتے اور پیغمبر کی صفت، جو تورات میں مذکور تھی، انھوں نے بدل ڈالی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا احسان اور ان کی نافرمانی یاد دلائی۔ تورات میں یہ علامت بتائی تھی کہ جو کوئی نبی ہونے کا دعویٰ کرے، اگر وہ تورات کو سچا کہے تو تم سمجھو کہ وہ ہمارا بھیجا ہوا ہے، نہیں تو جھوٹا ہے۔ آیتوں پر تھوڑی قیمت یہ تھی کہ دنیا کی محبت سے دین چھوڑ دیتے تھے۔

بنی اسرائیل کو اسلام قبول کرنے کا حکم:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں اللہ پاک نے بنی اسرائیل کو اسلام میں داخل ہونے اور رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنے کا حکم دیا ہے۔ یعقوب علیہ السلام کا نام حوصلہ بڑھانے کے لیے لیا، یعنی اے اللہ کے نیک اور فرماں

---

(1) یہ سب باتیں غیر مستند ہیں۔ [ص۔ ی] (2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٩)

بردار بندے کی اولاد! تم بھی حق کی پیروی کے لیے ویسے ہی چاق چوبند ہو جاؤ، جیسے تمھارے باپ تھے، جس طرح کہتے ہیں: "یَا ابْنَ الْكَرِيمِ! اِفْعَلْ كَذَا. يَا ابْنَ الْعَالِمِ! اُطْلُبِ الْعِلْمَ"[1] ''اے سخی کے بیٹے! ایسا کر، یعنی کچھ دے۔ اے عالم کے بیٹے! علم طلب کر۔''

یہ ان یہودیوں کو خطاب ہے، جو یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے مدینہ میں سکونت پذیر تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اسرائیل کے معنی ہیں: عبداللہ۔[2] کسی نے کہا ہے کہ ''رَجُلُ اللّٰهِ''، یعنی اللہ کا آدمی۔ کسی نے کہا ہے: ''صَفْوَةُ اللّٰهِ'' اللہ کا چنا ہوا۔ مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ یاد کرنے کا مطلب ہے: شکر کرو، کیوں کہ جس نے نعمت کو یاد کیا اور اس نے شکر ادا کیا، جس نے انکار کیا، اس نے کفرانِ نعمت کیا۔ ذِکر (دال کی زیر کے ساتھ) خاموشی کی ضد ہے اور پیش کے ساتھ (ذُکر) فراموشی کی ضد ہے۔ نعمت سے مراد ہے کہ پتھر سے نہر جاری کی، من وسلویٰ اتارا، فرعون کی غلامی سے نجات دی اور بادل کا سایہ کیا۔

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ کا قول ہے نعمت یہ تھی کہ نبی و رسول بھیجے اور کتابیں اُتاریں۔[3] جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا: ﴿ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [المائدة: ۲۰] ''اے میری قوم! اللہ کی نعمت یاد کرو جو اس نے تم پر کی، جب اس نے تم میں سے نبی بنائے اور تمھیں بادشاہ بنایا، اور تمھیں وہ کچھ دیا جو ساری دنیا میں کسی کو نہیں دیا گیا۔'' عالمین سے مراد اسی زمانے کے لوگ ہیں۔

عہدِ بنی اسرائیل سے مراد:

عہد سے وہ عہد مراد ہے، جو خاتم الانبیاء کے بارے میں لیا گیا تھا کہ جب وہ آئیں تو تم ان کی تصدیق اور پیروی کرنا۔ ہم بھی اپنا عہد پورا کریں گے، جو بوجھ اور طوق تمھارے گناہوں کے سبب تمھاری گردنوں پر رکھے گئے ہیں، وہ دور کر دیں گے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت سے مراد یہ آیت ہے: ﴿ وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ [المائدة: ۱۲] ''اور بے شک اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا، اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کیے تھے، اور اللہ نے کہا: بے شک میں تمھارے ساتھ ہوں۔ اگر تم نماز قائم کرو گے، اور زکات ادا کرو گے اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ گے اور ان کی مدد کرتے رہو گے اور اللہ کو اچھا قرض دو گے، تو میں ضرور تم

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۱۲)
[2] تفسیر الطبري (۱/ ۵۵۳) اس کی سند صحیح ہے۔
[3] تفسیر الطبري (۱/ ۵۵۵۔ ۵۵۶)

سے تمھاری برائیاں دور کر دوں گا اور ضرور تمھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔''[1]

دیگر مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ عہد وہ تھا، جو تورات میں لیا گیا تھا کہ ہم عن قریب ایک عظیم نبی بنی اسماعیل سے مبعوث فرمائیں گے اور ساری اقوام ان کی اطاعت کریں گی، مراد محمد ﷺ ہیں۔ جس نے ان کی پیروی کی، اللہ اس کے گناہ بخش دے گا، پھر اس کو بہشت میں لے جائے گا اور دوہرا اجر دے گا۔ قرآن پاک اس کی تصدیق یوں کرتا ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ۝ اُولٰٓىِٕكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا ﴾ [القصص: ٥٢۔ ٥٤] ''وہ لوگ جنھیں ہم نے اس (قرآن) سے پہلے کتاب دی تھی، وہی اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب ان پر (قرآن) تلاوت کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائے، بے شک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے، بلاشبہہ ہم تو اس سے پہلے ہی مسلمان تھے۔ ان لوگوں کو ان کا دو بار اجر دیا جائے گا، کیوں کہ انھوں نے صبر کیا۔''

علی بن عیسیٰ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس کی تصدیق کرتی ہے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ ﴾ [الحدید: ٢٨] ''اے ایمان والو! تم اللہ سے ڈرو، اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، وہ تمھیں اپنی رحمت سے دو حصے (اجر) دے گا۔''[2] پھر حدیث میں جن لوگوں کے دوہرے اجر آئے ہیں، ان میں ایک وہ شخص ہے، جو اہلِ کتاب میں سے پہلے عیسیٰ پر اور پھر حضرت محمد ﷺ پر ایمان لایا۔[3] امام رازی رحمہ اللہ نے اس جگہ پر بعثتِ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں انبیا علیہم السلام کی بہت سی بشارتیں لکھی ہیں۔[4] بعض بشارتیں ''فتح البیان'' میں بھی مذکور ہیں۔[5] امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کا عہد یہ تھا کہ دینِ اسلام کی عبادت بجا لاؤ۔[6] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ کا ان سے یہ عہد تھا کہ میں تم سے راضی ہو جاؤں گا اور تمھیں جنت میں داخل کروں گا۔[7]

ابن الفارس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا انعام کفار پر بھی ہوتا ہے۔[8] کسی نے کہا ہے کہ وہ عہد یہ تھا: ﴿ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ ﴾ [آل عمران: ١٨٧] ''اور جب اللہ نے ان لوگوں سے عہد لیا جنھیں کتاب دی گئی تھی کہ تم اسے لوگوں کے سامنے ضرور بیان کرو گے۔'' کسی نے کہا ہے کہ یہ تھا: ﴿ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ ﴾ [البقرۃ: ٦٣] ''ہم نے تمھیں جو دیا ہے اسے قوت سے پکڑ لو۔'' کسی نے کہا کہ وہ ہے، جو سورۃ الاعراف میں آیا ہے: ﴿ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ١١٣) [2] تفسیر الرازي (٣/ ٣٣)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٢٦٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٥٤)

[4] تفسیر الرازي (٣/ ٣٤) [5] فتح البیان (١/ ١٤٢) [6] تفسیر الطبري (١/ ٥٥٨)

[7] تفسیر الطبري (١/ ٥٥٩) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔ [8] فتح البیان (١/ ١٤١)

﴿فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ﴾ [الأعراف: ١٥٦۔ ١٥٧] ''اور میری رحمت نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے، چناں چہ جلد ہی میں اس (رحمت) کو ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو پرہیز گار ہیں اور زکات دیتے ہیں اور (ان کے لیے بھی) جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ (یعنی) وہ لوگ جو اس رسول اُمی نبی (محمد ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔''

رہا اللہ کا عہد ان کے ساتھ تو کسی نے کہا کہ وہ عہد یہ تھا: ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝﴾ [آل عمران: ٨١] ''اور (یاد کرو) جب اللہ نے تمام نبیوں سے عہد لیا تھا کہ جب میں تمھیں کتاب اور حکمت عطا کروں، پھر تمھارے پاس کوئی رسول آئے جو اس (کتاب) کی تصدیق کرتا ہو جو تمھارے پاس ہے تو تمھیں اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی۔ اللہ نے فرمایا: کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرا عہد قبول کرتے ہو؟ انھوں نے کہا: ہم نے اقرار کیا۔ اللہ نے فرمایا: تو تم گواہ رہنا اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾ [الصف: ٦] ''اور جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا: اے بنی اسرائیل! بے شک میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس (کتاب) تورات کی جو مجھ سے پہلے ہے اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں، وہ میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا، پھر جب وہ (رسول) ان کے پاس کھلی نشانیوں کے ساتھ آیا تو وہ بولے: یہ تو کھلا جادو ہے۔''

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ سارے عہد مراد ہوں، جو ان تمام آیتوں سے سمجھے جاتے ہیں۔ واللہ أعلم.

''پہلے منکر نہ ہوں'' کا مفہوم:

یہ جو کہا ہے کہ میرا ہی ڈر رکھو۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر تم عہد توڑو گے تو میں تم کو سزا دوں گا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ جو آفات تمھارے آبا واجداد پر نازل ہوئی تھیں، جیسے مسخ وغیرہ، وہی بلائیں تم پر نازل کروں گا۔[1] پہلے رغبت دلائی تھی، پھر یہ وعید سنائی، الغرض ہر طرح کی ترغیب وترہیب سے انھیں حق اختیار کرنے اور رسولِ برحق ﷺ کی اتباع کی دعوت دی، انھیں قرآن پاک کی جھڑکیوں سے نصیحت پکڑنا، اللہ کے حکم کو بجا لانا اور اللہ کی کتاب میں دی ہوئی خبروں کی تصدیق کرنا سمجھایا، مگر ہدایت اسی کو ملتی ہے، جس کو اللہ چاہے۔ اسی لیے یہ کہا

[1] تفسیر الطبري (١/ ٥٦٠) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٩٦) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحیح المسبور (١/ ٣٧۔ ٤٥)

ہے کہ تم پہلے کافر نہ بنو۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یعنی تمھیں وہ علم ہے، جو دوسروں کو نہیں،[1] پھر کس لیے سب سے پہلے تمھی رسول اللہ ﷺ کے منکر بنتے ہو، حالاں کہ ان کے مبعوث ہونے کی خبر تم سن چکے اور پڑھ چکے ہو۔

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے، یعنی تم قرآن کے پہلے منکر نہ بنو۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دونوں قول صحیح ہیں، کیوں کہ یہ باہم لازم وملزوم ہیں۔ جو قرآن کا انکار کرے گا، وہ رسول اللہ ﷺ کا بھی منکر ہوگا اور جو رسول اللہ کا منکر ہوگا، وہ قرآن کا بھی انکار کرے گا۔ اول کافر سے مراد بنی اسرائیل ہیں، جبکہ ان سے پہلے اور بہت سے کفارِ عرب، قریش وغیرہ انکار کر چکے تھے تو مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی قوم میں سب سے پہلے منکر تم نہ بنو، کیوں کہ قرآن میں سب سے پہلے یہی یہودِ مدینہ مخاطب ہوئے ہیں، ان کے انکار سے یہ بات لازم آئے گی کہ ان کی جنس میں سب سے پہلے وہی کافر ومنکر ہوئے۔[3]

تھوڑی قیمت سے مراد:

امام حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ تھوڑا مول ساری دنیا سے عبارت ہے، یعنی تم ایمان اور رسول کی تصدیق کے عوض معمولی خواہشاتِ نفسانی کو اختیار نہ کرو۔[4] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تھوڑے لالچ پر اللہ کے نام کو نہ چھپاؤ۔ یہی لالچ مول ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علم کی تعلیم دینے پر اُجرت نہ لو۔ دیکھو تمھاری پہلی کتاب میں کیا لکھا ہے: اے ابن آدم! تو علم مفت سکھا، جس طرح تو نے اس کو مفت میں سیکھا ہے۔[5]

کسی نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ تم علم کے بیان، وضاحت اور پھیلانے کے بجائے علم کو نہ چھپاؤ، خلط ملط نہ کرو اور دھوکا نہ دو، تا کہ دنیا میں تمھاری ریاست قائم رہے، کیوں کہ یہ دنیا ناپائیدار اور حقیر ہے اور عنقریب ختم ہو جائے گی۔ حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ میں مرفوعاً مروی ہے کہ جس نے کوئی ایسا علم، جس سے ذاتِ الٰہی مقصود ہوتی ہے، دنیا حاصل کرنے کے لیے سیکھا تو وہ شخص قیامت کے دن جنت کی خوش بو بھی نہ پائے گا۔[6] (رواہ أبو داود)

اُجرت پر تعلیم دینے کا حکم:

معلوم ہوا کہ دین کا علم پڑھ کر دنیا کمانا جہنم میں جانا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طے شدہ اُجرت پر علم سکھانا جائز نہیں ہے۔ البتہ بیت المال سے اپنے اور اپنے اہل وعیال کی کفایت کے لیے لے سکتا ہے اور اگر وہاں سے کچھ نہیں ملتا اور تعلیم دینے کی وجہ سے اور کمائی بھی نہیں کر سکتا تو یہ بندہ اس شخص کی طرح ہے جس کی کوئی اُجرت

---

[1] تفسیر الطبري (١/ ٥٦٤۔ ٥٦٥) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٩٧) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحیح المسبور (١/ ٣٧۔ ٤٥)

[2] تفسیر الطبري (١/ ٥٦٣)

[3] تفسیر ابن کثیر (١/ ١١٤)

[4] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٩٨)

[5] تفسیر الطبري (١/ ٥٦٥) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٩٧)

[6] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٣٦٦٤) صحیح الترغیب والترهیب (١/ ٢٥)

مقرر نہیں ہوئی تو اب مالک، شافعی، احمد اور جمہور علما کے نزدیک تعلیم دینے پر اُجرت لے سکتا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں سانپ کے کاٹے ہوئے شخص کے واقعے میں یوں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللّٰهِ» ''بے شک تمھارا کتاب اللہ پر مزدوری لینا لائق تر ہے۔''[1] پھر اس عورت کے قصے میں، جس کو نکاح کا پیغام دیا گیا، آیا ہے: «زَوَّجْتُكَهَا بِمَا مَعَكَ مِنَ الْقُرْآنِ» ''میں نے تیرا نکاح اس عورت سے کر دیا ہے، بعوض اس قرآن کے جو تجھے یاد ہے۔''[2] (یعنی تیرے لیے حق مہر یہ ہے کہ تجھے جتنا قرآن یاد ہے، وہ تو اپنی اس بیوی کو سکھلا دینا، یہی تیری طرف سے مہر ادا کرنا ہے)[3]

پہلی صورت میں اُجرت دم کرنے کے عوض تھی نہ کہ تعلیم کے عوض اور دوسری صورت میں تعلیم مہر کے عوض تھی نہ کہ اُجرت کے عوض۔ اسی لیے عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ والی حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے ان کو قرآن کی تعلیم کے عوض ایک کمان تحفے میں دی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تو آگ کی کمان اپنے گلے میں لٹکانا چاہتا ہے تو اس کو قبول کر۔[4] (رواه أبو داود) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ تعلیم اللہ کے لیے تھی، اسی لیے ثواب کے بدلے تحفہ لینا ناجائز ہوا۔[5] اگر پہلے ہی سے اُجرت مقرر کر لی جاتی تو درست ہوتا۔ پھر کہا ہے کہ اس حدیث کا اکثر علما کے نزدیک یہی مطلب ہے۔[6]

ڈر کو تقویٰ کہتے ہیں۔ تقویٰ یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت اس کی رحمت کی اُمید رکھ کر کی جائے اور اللہ کی نافرمانی اس کے عذاب کے ڈر سے ترک کی جائے۔ یہ کہنے میں کہ مجھ ہی سے ڈرتے بچتے رہو، حق کے ظاہر کرنے کے بجائے اسے چھپانے اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت بجا لانے پر سخت وعید ہے۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤٢﴾ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِينَ ﴿٤٣﴾

اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو اور حق کو مت چھپاؤ، حالاں کہ تم جانتے ہو (42) اور نماز قائم کرو اور زکات دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو (43)

حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرنے کا مفہوم اور اس کی ممانعت:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہودیوں کو دو چیزوں سے منع کیا اور حق کو ظاہر کرنے کا حکم دیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٠٥) (2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٤١) (3) تفسير ابن كثير (١/ ١١٤)

(4) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤١٦) السلسلة الصحيحة (٢٥٦)

(5) ابو داود کی محولہ روایت اکثر علما کے نزدیک سنداً صحیح نہیں ہے، اس لیے اس سے تعلیمِ قرآن پر اُجرت لینے کا عدمِ جواز ثابت نہیں ہوتا۔ بالفرض اگر صحیح بھی ہو تو صحیح بخاری کی مذکورہ بالا روایت کی رو سے قرآن کے عوض اجرت لینا درست اور حق ہے، خواہ وہ دم سے ہو یا تعلیمِ قرآن سے۔ [ص-ي] (6) تفسير ابن كثير (١/ ١١٤)

قول ہے کہ یعنی حق کو باطل سے اور سچ کو جھوٹ سے نہ ملاؤ۔[1] ابو العالیہ رحمہ اللہ نے اس میں اس بات کا اضافہ کیا ہے کہ امتِ محمد ﷺ کے ساتھ خیر خواہی بجا لاؤ۔[2] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی یہودیت اور نصرانیت کو اسلام میں داخل نہ کرو، حالاں کہ تم جانتے ہو کہ اللہ کا دین یہی اسلام ہے۔ یہودیت و نصرانیت بدعت ہے اور اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔[3] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سچ کو جان بوجھ کر چھپانا یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا ذکر تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پایا۔ رسول کو بھی پہچان لیا، مگر نہ مانا۔ جان بوجھ کر انکار کر گئے اور حق بات کو چھپا ڈالا۔[4] یہ مطلب ہے کہ تم حق بات کو چھپاتے ہو، حالاں کہ تمھیں معلوم ہے کہ اس چھپانے میں ان لوگوں کا کتنا بڑا نقصان ہے، جو تمھارے اس گمراہ کن جھوٹ میں پھنس جائیں گے، کیوں کہ یہ پھنسنا انھیں جہنم میں لے جائے گا۔

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس کو کوئی حق بات معلوم ہو، اس پر اُس حق بات کو ظاہر کرنا واجب اور اس کو چھپانا حرام ہے، اس میں سارے لوگوں کو ایسے کام کی برائی پر متنبہ کیا گیا ہے اور ڈرایا گیا ہے۔ یہ خطاب اگرچہ ظاہری طور پر خاص ہے، مگر معنی کے لحاظ سے عام ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر شخص پر حق کو باطل کے ساتھ نہ ملانا اور حق کو کسی سے نہ چھپانا فرض ہے۔ جس مسلمان نے علمِ حدیث کی کتابیں پڑھی یا سنی ہیں اور اس کو دین و دنیا کے کسی معاملے میں رسول اللہ ﷺ کا حکم معلوم ہو چکا ہے، مگر سوال کے وقت وہ اس حق کو چھپاتا ہے یا کسی ملاّ یا مشائخ کی بات سے ملا کر صحیح راستے سے گمراہ کرتا ہے تو وہ اس آیت میں داخل ہے۔ لفظ: ﴿ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ سے یہ ثابت ہوا کہ یہودیوں کا کفر، کفرِ عناد تھا نہ کہ کفرِ جہل۔ اس کفر کا گناہ بہت بھاری اور سزا بہت سخت ہے، جس طرح مقلدین کا اتباعِ سنت سے انکار عناد کی وجہ سے ہے، جہالت کی وجہ سے نہیں۔

تقلید و رائے کی مذمت:

اس آیت سے یہ نہیں نکلتا کہ لاعلمی کے ساتھ حق کو باطل سے ملانا یا حق کو چھپانا جائز ہوتا ہے، کیوں کہ جاہل کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی چیز میں بالخصوص دین کے معاملے میں سوچے سمجھے بغیر پیش قدمی نہ کرے۔ اس لیے کہ دین کے بارے میں گفتگو کرنا یا احکامِ دین کی تصدیق کرنا، ایسے شخص کا کام ہے جو علم و فہم میں بے مثال دسترس رکھتا ہو۔ کہاں جاہل مقلدین اور کہاں شرعِ مبین کے مسائل۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ!

آیات کے درمیان مناسبت کا تکلف:

فتح البیان میں اس مقام پر ان متکلمین و مفسرین کا رد کیا گیا ہے جنھوں نے قرآنی آیات کی ایک دوسری آیت

[1] تفسیر الطبري (۱/ ٥٦٨) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر الطبري (۱/ ٥٦٨) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۹۸)

[4] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۹۸) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحیح المسبور (۱/ ۳۷۔ ٤٥)

کے ساتھ مناسبت بیان کرنے میں تکلف سے کام لیا ہے۔ پہلے بقاعی نے یہ کام کیا تھا، پھر دوسروں نے بھی ایسا کیا۔ تفسیر رحمانی اور تفسیر عزیزی میں بھی یہی کچھ ہے۔ اللہ کے کلام پاک کو ایسے تکلف سے کیا تعلق؟ آیات کا نزول ہمیشہ مختلف حالات و حادثات کے مطابق رہا ہے، ان کی وجوہات کو تلاش کرنا ایسا ہے، جیسے ''کوہ کندن و کاہ بر آوردن'' یا ''باد بمشت پیمودن'' یا ''آہنِ سرد کوفتن''۔ پہاڑ کھود کر گھاس نکالنا، یا مشت سے ہوا کی پیمائش کرنا یا سرد لوہے کو کوٹنا۔ اس پر ''اِنَّا لِلّٰهِ...'' پڑھنے کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے؟[1]

مقاتل کا قول ہے کہ اس آیت میں اہلِ کتاب کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھنے، اور آپ ﷺ کی خدمت میں اپنے مالوں کی زکات پیش کرنے اور اُمتِ مسلمہ میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس جگہ زکات سے مراد فرماں برداری اور اخلاص ہے۔[3] دوسرا مطلب یہ ہے کہ زکات کی مقدار مراد ہے دوسو یا زیادہ۔ یہ قول زیادہ ظاہر ہے، کیوں کہ زکات کا ذکر نماز کے ساتھ آیا ہے، اگرچہ پہلا معنی بھی لغت کے لحاظ سے صحیح ہوسکتا ہے۔ ادائے زکات خود ایک عبادت و اخلاص ہے، اسی لیے امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زکات سے مراد فریضہ واجبہ ہے، کیوں کہ اعمال نماز و زکات کے بغیر کچھ نفع نہیں دیتے۔[4] حارث عکلی کا قول ہے کہ صدقۂ فطر مراد ہے،[5] مگر عمومِ زکات بہتر ہے۔

رکوع کا لفظ ذکر کرنے کی حکمت:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ نماز سے مراد وقت معین پر تمام لوازمات کے ساتھ پانچ وقت کی نماز ہے، اسی طرح زکات ہے۔ رکوع کمر جھکانے اور سر نیچا کرنے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نمازیوں کے ساتھ نماز پڑھو۔ اس جگہ رکوع کا ذکر اس لیے کیا کہ یہودیوں کی نماز میں رکوع نہیں تھا یا اہلِ جاہلیت پر رکوع کرنا بھاری تھا۔ تمام نمازی جانتے ہیں کہ حدیثوں میں شرعی رکوع کا طریقہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ گردن اور کمر کو جھکا کر گھٹنوں کو ہاتھ سے پکڑ کر اطمینان کے ساتھ مسنون ذکر کرنا۔

باجماعت نماز کی اہمیت اور حکم:

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نماز کو باجماعت پڑھنا چاہیے۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک یہ جماعت واجب ہے۔ جمہور کے نزدیک سنتِ موکدہ ہے نہ کہ واجب۔ یہی قول صحیح ہے، کیوں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے صحیح احادیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ باجماعت نماز تنہا نماز سے پچیس یا ستائیس درجے بڑھ کر ہے۔[6]

---

[1] فتح البیان (۱/ ۱۵۱) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۹۹۔ ۱۰۰)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۹۹) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحیح المسبور (۱/ ٤٦۔ ٤٩)

[4] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۰۰) [5] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۰۰)

[6] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦١٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٤٩، ٦٥٠)

معلوم ہوا اگر کسی عذر سے یا بلا عذر فرض نماز اکیلے پڑھی جائے تو وہ ہو جاتی ہے، جماعت اگر فرض ہوتی تو تنہا پڑھنے سے فرض ادا نہ ہوتا۔ بخاری میں مرفوعاً ذکر ہوا ہے کہ جو شخص امام کے ساتھ نماز پڑھتا ہے، وہ اس شخص سے بہتر ہے، جو اکیلا نماز پڑھ کر سو رہتا ہے۔[1] اس مسئلے کی پوری بحث ''شرح منتقی'' میں ہے۔[2] امام قرطبی رحمہ اللہ نے اس آیت کے تحت جماعت و امامت کے مسائل اچھی طرح تحریر کیے ہیں۔[3]

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ
الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝44

کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالاں کہ تم کتاب پڑھتے ہو، پھر کیا تم عقل نہیں رکھتے؟ (44)

قول و عمل میں تضاد سے ممانعت:

یہ اہل کتاب سے خطاب ہے کہ جو تم دوسروں کو کہتے ہو، وہ کام خود نہیں کرتے۔ کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ کیا کر رہے ہو؟ ذرا نیند سے جاگو اور آنکھیں کھولو۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بنو اسرائیل لوگوں سے کہتے کہ اللہ کی اطاعت کرو، نیک کام کرو اور اللہ سے ڈرو، مگر خود اس کے خلاف کرتے، اس پر ان کو اللہ نے یہ عار دلائی۔[4] ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ منافق لوگ دوسروں سے کہتے تھے کہ روزہ رکھو، نماز پڑھو اور خود یہ کام نہ کرتے، لہٰذا جو کوئی دوسرے کو بھلائی کا حکم دے، اسے چاہیے کہ سب سے پہلے خود اس کام کو بجا لائے،[5] ورنہ وہی مثل ہوگی کہ ''خود فضیحت دیگراں را نصیحت۔'' (خود ذلت میں اور دوسروں کو نصیحت) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے، مطلب یہ ہے کہ اے اہلِ کتاب! تم لوگوں کو کفر سے منع کرتے ہو، کیوں کہ تمھارے پاس نبوت اور عہدِ تورات ہے، مگر خود تم اس عہد کا انکار کرتے ہو، جو تم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنے کے بارے میں لیا گیا تھا۔[6]

دوسرا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ تم لوگوں سے تو کہتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں داخل ہو جاؤ، لیکن خود مسلمان نہیں ہوتے۔[7] سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ آدمی اس وقت تک ہرگز سمجھ دار نہیں ہوتا، جب تک لوگوں سے دشمنی اللہ کے لیے نہ رکھے، پھر اپنی جان کی طرف توجہ کرے اور اس کو لوگوں سے بھی زیادہ دشمن سمجھے۔[8] ابن زید رحمہ اللہ

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٣) (2) نيل الأوطار (٣/ ١٥١) فتح البيان (١/ ١٥٤۔ ١٥٥)

(3) تفسير القرطبي (١/ ٣٤٨) (4) تفسير الصنعاني (١/ ٤٤) (5) تفسير الطبري (٢/ ٨)

(6) تفسير الطبري (٢/ ٧) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٠١) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحيح المسبور (١/ ٣٧۔ ٤٥)

(7) تفسير الطبري (٢/ ٨) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔

(8) تفسير الطبري (٢/ ٨۔ ٩) اس کی سند پر علامہ احمد شاکر کا کلام دیکھیں۔

نے کہا ہے کہ جب کوئی آدمی آ کر یہود سے کوئی بات پوچھتا، جس میں سچ نہ ہوتا اور وہ راشی (رشوت دینے والا) بھی نہ ہوتا تو اس کو سچی بات بتا دیتے۔[1]

الغرض اللہ نے اس کام پر اہلِ کتاب کی مذمت کی اور انھیں اپنے نفس کے بارے میں اپنی غلطی پر آگاہ کیا کہ تم دوسروں کو تو بھلائی کا حکم کرتے ہو، مگر خود نہیں کرتے۔ یعنی نیک بات کا حکم کرنا تو اچھا ہے، اس پر کوئی مذمت نہیں، مذمت اس پر ہے کہ اس نیک کام کو خود تم نے چھوڑ رکھا ہے۔ یہ اس لیے فرمایا کہ امر بالمعروف ہر عالم پر واجب ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ وہ کام آپ بھی کرے۔ یہ نہ ہو کہ فقط ان کو حکم دے کر بیٹھ رہے، جس طرح شعیب علیہ السلام نے فرمایا تھا: ﴿ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ۭ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۭ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴾ [ھود: ۸۸] ''اور میں یہ نہیں چاہتا کہ تمھاری مخالفت کروں (اس طرح کہ) وہ کام کروں جن سے تمھیں روکتا ہوں۔ میں کچھ نہیں چاہتا سوائے (تمھاری) اصلاح کے جہاں تک مجھ سے ہو سکے۔ اور مجھے (اس کی) توفیق ملنا اللہ کی مدد کے سوا (ممکن) نہیں۔ میں نے اسی پر بھروسا کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔'' سو نیکی کا حکم کرنا اور نیک کام کرنا دونوں واجب ہیں، ایک کے کرنے سے دوسرا کام ساقط نہیں ہوتا۔

بے عملی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے عذر نہیں:

سلف و خلف کے نزدیک زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ قول کہ ''گناہوں کا مرتکب شخص دوسروں کو بھی برائی سے منع نہ کرے''، ضعیف ہے۔ اس سے بھی زیادہ ضعیف یہ ہے کہ اس آیت سے اس قول کی تائید کی جائے، حالاں کہ آیت سے یہ مطلب نہیں نکلتا، بلکہ صحیح یہ ہے کہ عالم اَمر بالمعروف کرے، اگرچہ خود اس نے وہ کام نہ کیا ہو اور نہی عن المنکر بجا لائے، اگرچہ اس سے وہ کام ہو گیا ہو۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر یہی بات ہو تو پھر نہ کوئی امر بالمعروف کر سکے گا اور نہ نہی عن المنکر۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات سچ ہے۔ وہ کون شخص ہے کہ جس سے گناہ نہیں ہوتا۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لیکن یہ حالت قابلِ مذمت ہے، یعنی جان بوجھ کر اطاعت سے ہاتھ کھینچ لینا اور نافرمانی کے کام کرنا، دیدہ و دانستہ مخالفت کی راہ پر چلنا ہے، کیوں کہ عالم اور غیر عالم برابر نہیں ہوتے، اسی لیے احادیث میں اس حال پر سخت وعید آئی ہے۔[3]

بے عملی کا گناہ:

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شبِ معراج کو میرا گزر ایک قوم پر ہوا، جن کے ہونٹ آگ کی قینچی سے کترے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ جواب ملا: یہ تمھاری امت کے دنیا دار خطیب ہیں، جو لوگوں کو تو نیک کام کا حکم کرتے تھے، مگر اپنے آپ کو بھول جاتے تھے اور وہ کتاب پڑھتے

[1] تفسير الطبري (٢/ ٨) [2] تفسير القرطبي (١/ ٣٦٧۔ ٣٦٨) [3] تفسير ابن كثير (١/ ١١٦)

ہیں، پھر کیوں نہیں سمجھتے۔[1] (رواہ أحمد)

دوسری روایت اسامہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک آدمی کو قیامت کے دن لا کر آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کی آنتیں اس کو لپٹ جائیں گی۔ وہ آگ میں ایسے پھرے گا، جیسے گدھا چکی کے گرد چکر کھاتا ہے۔ دوزخی لوگ اس کے پاس آ کر پوچھیں گے کہ اے فلاں! تجھے کیا ہوا تو تو ہمیں نیکی کا حکم اور بدی سے منع نہیں کرتا تھا؟ وہ کہے گا کہ میں تم کو امر بالمعروف کرتا تھا، مگر خود بجا نہیں لاتا تھا اور تم کو بدی سے منع کرتا اور خود اس کو بجا لاتا تھا۔ شیخین رحمہما اللہ نے بھی اسی کے لگ بھگ روایت کی ہے۔[2]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ قیامت کے دن ان پڑھوں کے وہ گناہ معاف کر دے گا، جو علما کے معاف نہیں کرے گا۔[3] (رواہ أحمد) معلوم ہوا کہ شرک و کفر کے علاوہ بعض گناہوں میں لاعلمی ایک عذر ہو سکتا ہے۔ یہ اس لیے کہ پڑھا اور ان پڑھا برابر نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۗ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ ﴾ [الزمر: ۹] ”کیا جو لوگ علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے، برابر ہو سکتے ہیں؟ بس عقل والے ہی نصیحت پکڑتے ہیں۔“ ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ کچھ جنتی لوگ دوزخیوں کو جھانک کر کہیں گے کہ تم کیسے آگ میں آئے؟ واللہ! ہم تو تم سے سیکھ کر یہاں پہنچے۔ وہ کہیں گے کہ ہم جو کہتے تھے وہ کرتے نہیں تھے۔[4] (رواہ ابن عساکر)

ایک آدمی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کہا کہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ کیا تو اس مقام کو پہنچ گیا ہے؟ اس نے کہا: امید تو ہے۔ کہا کہ اگر تجھے اس بات کا ڈر نہ ہو کہ کتاب اللہ کی تین آیتیں تجھے رسوا کریں گی تو یہ کام کرو۔ کہا: وہ کون سی آیتیں ہیں؟ کہا: ﴿ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ ﴾ [البقرة: ٤٤] ”کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالاں کہ تم کتاب پڑھتے ہو، پھر کیا تم عقل نہیں رکھتے؟“ اس کو تو نے مضبوط کر لیا ہے؟ کہا: نہیں۔ پوچھا: دوسری آیت کون سی ہے؟ کہا: ﴿ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ ﴾ [الصّف: ۲۔ ۳] ”اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو تم کرتے نہیں؟ اللہ کے ہاں بڑی ناراضی (والی بات) ہے کہ تم وہ بات کہو جو تم کرتے نہیں۔“ پوچھا: اس کو تو نے محکم کر لیا ہے یا نہیں؟ کہا: نہیں۔ کہا: تیسری

---

[1] مسند أحمد (۳/ ۱۲۰) صحیح ابن حبان (۱/ ۲۴۹) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۲۹۱)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۰۹۴) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۹۸۹) مسند أحمد (۵/ ۲۰۵)

[3] حلیة الأولیاء (۲/ ۳۳۱) اس روایت کو امام احمد نے منکر کہا ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (۳۱۵۴)

[4] تاریخ دمشق (۶۳/ ۲۱۸) السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (۱۲۶۸)

آیت کون سی ہے؟ کہا: شعیب علیہ السلام کا قول: ﴿ وَمَاۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اُخَالِفَكُمۡ اِلٰی مَاۤ اَنۡهٰكُمۡ عَنۡهُ ؕ اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ ؕ وَمَا تَوۡفِیۡقِیۡۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَیۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَاِلَیۡهِ اُنِیۡبُ ﴾ [هود: ۸۸] ''اور میں یہ نہیں چاہتا کہ تمھاری مخالفت کروں (اس طرح کہ) وہ کام کروں جن سے تمھیں روکتا ہوں۔ میں کچھ نہیں چاہتا سوائے (تمھاری) اصلاح کے جہاں تک مجھ سے ہو سکے۔ اور مجھے (اس کی) توفیق ملنا اللہ کی مدد کے سوا (ممکن) نہیں۔ میں نے اسی پر بھروسا کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔'' کہا کہ اس کو بھی محکم نہیں کیا ہے تو پھر اپنی ہی ذات سے شروع کرو۔[1] اس کو ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔

ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں انھی تین آیتوں کی وجہ سے (غیر ثابت شدہ) قصص و واقعات (پر مشتمل وعظ) کہنا مکروہ سمجھتا ہوں۔[2]

وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِیۡرَةٌ اِلَّا عَلَی الۡخٰشِعِیۡنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِیۡنَ یَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ وَاَنَّهُمۡ اِلَیۡهِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۴۶﴾

اور تم صبر اور نماز کے ذریعے سے اللہ کی مدد طلب کرو، اور بے شک یہ بہت بھاری ہے، مگر عاجزی کرنے والوں پر (بھاری نہیں) (45) جو لوگ اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ضرور ملنے والے ہیں اور یہ کہ بے شک وہ اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں (46)

مصیبت کے وقت صبر اور نماز:

یعنی تکلیفیں برداشت کرنے کی عادت بنا لو تو دین کے سب کام آسان ہو جائیں گے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ صبر سے مراد روزہ ہے۔[3] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسی لیے رمضان کو صبر کا مہینا کہتے ہیں،[4] جس طرح حدیث میں مروی ہے کہ روزہ آدھا صبر ہے۔[5] کسی نے کہا ہے کہ صبر یہ ہے کہ گناہوں سے باز رہے، اسی لیے اس کا نماز کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ صبر دو طرح کا ہے: ایک مصیبت پر، یہ بہتر ہے، لیکن اس سے زیادہ بہتر اللہ کی حرام کردہ چیزوں پر صبر کرنا ہے۔[6] ابو العالیہ نے کہا ہے کہ اللہ کی مرضی پر رہنا، اس کو اللہ کی اطاعت سمجھنا، یہی صبر و نماز سے مدد لینا ہے۔[7] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نماز کسی کام میں ثابت قدمی کے لیے

---

(1) شعب الإيمان (٦/ ٨٨) تاريخ دمشق (٢٣/ ٧٣) اس کی سند میں ''بشر بن حسین'' ضعیف راوی ہے۔

(2) تفسير القرطبي (١/ ٣٦٧)

(3) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٠٢) (4) تفسير القرطبي (١/ ٣٧٦)

(5) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥١٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٤٥) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣٨١١)

(6) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٠٢) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ (7) تفسير الطبري (٢/ ١٤۔ ١٥) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٠٢)

بڑی مددگار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾ [العنکبوت: ٤٥] ’’اور نماز قائم کیجیے، یقیناً نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے، اور بلاشبہ اللہ کا ذکر تو سب سے بڑی چیز ہے۔‘‘[1]

معلوم ہوا جس کی نماز اس کو خلاف شرع اور بے حیائی کے کا سے نہیں روکتی، وہ نماز اللہ کے ہاں مقبول نہیں۔ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی معاملہ پریشان کرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھنے لگتے۔[2] (رواه أحمد و أبو داود) امام ابن جریر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ نماز کے ذریعے پناہ پکڑتے۔[3] سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شبِ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا سب سو رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے اور صبح تک دعا کرتے رہے۔[4] (رواه ابن نصر المروزي) ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرے تو وہ پیٹ کے بل پڑے ہوئے تھے۔ فرمایا: کیا تمھارے پیٹ میں درد ہے؟ کہا: ہاں۔ فرمایا: اُٹھ کر نماز پڑھو، بے شک نماز شفا ہے۔[5] (رواه ابن جرير)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو سفر میں خبر ملی کہ ان کے بھائی قثم رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے۔ وہ ’’إنا للہ... الخ‘‘ کہہ کر راستے سے الگ ہو کر اونٹ بٹھا کر نماز پڑھنے لگے، پھر سواری کے پاس جا کر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ ﴾ ’’اور تم صبر اور نماز کے ذریعے سے اللہ کی مدد طلب کرو۔‘‘ اس کو بھی امام ابن جریر رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔[6] ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ دونوں چیزیں اللہ کی رحمت حاصل کرنے کے لیے مددگار ہیں۔[7] صبر کی تعریف اور اس کی جزا کے بارے میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں، مگر وہ سب عام ہیں، اس آیت کے ساتھ خاص نہیں۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے ان میں سے بعض کو ’’درمنثور‘‘ میں ذکر کیا ہے۔[8] اسی طرح اللہ نے قرآن شریف میں جا بجا صبر کی تعریف و ترغیب کے لیے آیات ذکر فرمائی ہیں۔

صبر ست علاج دل بیمار تو واقف | افسوس کہ کم داری و بسیار ضرورست

’’آگاہ رہو کہ صبر بیمار دل کا علاج ہے، مگر افسوس کہ تو کم صبر کرتا ہے، حالاں کہ اس کی ضرورت زیادہ ہے۔‘‘

مَیں کہتا ہوں کہ اگر صبر کی جزا میں اس ایک آیت: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ ﴾ [الزمر: ١٠]

---

① تفسیر ابن کثیر (١/ ١١٨)

② سنن أبي داود، رقم الحديث (١٣١٩) مسند أحمد (٥/ ٣٨٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٧٠٣)

③ تفسیر الطبري (٢/ ١٢) علامہ احمد شاکر نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

④ تعظیم قدر الصلاة (١/ ٢٣١) سنن النسائي الکبریٰ (١/ ٢٧٠) اس کی سند صحیح ہے۔

⑤ تفسیر الطبري (٢/ ١٣) مسند أحمد (٢/ ٣٩٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٤٥٨) اس کی سند میں ’’ذواد بن علبہ‘‘ اور ’’لیث بن ابی سلیم‘‘ ضعیف ہیں۔ نیز دیکھیں: التاريخ الصغير للبخاري (٢/ ٢٣٥)

⑥ تفسیر الطبري (٢/ ١٤) اس کی سند صحیح ہے۔ ⑦ تفسیر الطبري (٢/ ١٥) ⑧ الدر المنثور (١/ ١٥٩)

’’بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ان کا پورا پورا اجر بے حساب دیا جائے گا۔‘‘ کے سوا کوئی آیت اور حدیث نہ ہوتی تو صبر کو اختیار کرنا، دین و دنیا کی بھلائی کے لیے کافی تھا۔ صہیب رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ انبیا گھبراہٹ کے وقت نماز پڑھا کرتے تھے۔[1] (رواه أحمد و النسائي وابن حبان)

خشوع کا مفہوم:

بعض کے نزدیک خاشعین سے مراد مومن ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ڈرنے والے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد اطاعت کرنے والے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وعد و وعید کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ مسکینی اختیار کرنے والے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ متذللین (عاجزی کرنے والے) ہیں اور کسی نے کہا ہے کہ تواضع و انکساری کرنے والے ہیں۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اعمش رحمہ اللہ سے پوچھا: خشوع کیا چیز ہے؟ انھوں نے کہا: اے ثوری رحمہ اللہ! تو لوگوں کا امام بننے کو ہے اور خشوع کو نہیں جانتا۔ خشوع یہ نہیں ہے کہ روکھا سوکھا کھائے، موٹے کپڑے پہنے، سرنگوں رہے، بلکہ خشوع یہ ہے کہ شریف و کمینے، امیر و غریب کو حق میں برابر سمجھے۔ جو کام اللہ نے تجھ پر فرض کیا ہے، اس میں عاجزی، فروتنی، خاکساری اور غریبی برتے۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگرچہ ظاہراً یہ آیت بنی اسرائیل کو ڈرانے کے سلسلے میں آئی ہے، لیکن اس سے خاص کر وہی لوگ مقصود نہیں، بلکہ ان کے لیے اور دوسروں کے لیے یہ آیت یکساں ہے۔[3]

آخرت پر ایمان کا فائدہ:

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ نماز یا یہ وصیت یا یہ مدد طلب کرنے کا طریقہ اسی پر آسان ہوتا ہے، جو قیامت کا اقرار کرنے والا ہے، اللہ سے ملنے اور اپنے اٹھائے جانے کا یقین رکھتا ہے۔ لہٰذا جس کو آخرت کا یقین آ گیا، اس پر اطاعت کا بجا لانا اور برائیوں کو چھوڑ دینا آسان ہو جاتا ہے، لیکن جس کا ایمان کمزور ہو، اس کے لیے اطاعت بجا لانا اور گناہوں کو چھوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ.

ظن بمعنی یقین:

اس جگہ اہلِ عرب کے محاورے اور اہلِ ادب کے اشعار کے مطابق ظن سے مراد یقین ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں ظن کا لفظ آیا ہے، اس کے معنی علم ہیں۔[4] یہی بات سلف کی ایک جماعت نے کہی ہے۔ صحیح کی حدیث میں مروی ہے کہ اللہ قیامت کے دن ایک بندے سے کہے گا: ((أَظَنَنْتَ أَنَّكَ مُلَاقِيَّ فَيَقُوْلُ:

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٣٣٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ١٥٧) صحیح ابن حبان (٥/ ٣١٢) اس کی سند صحیح ہے۔

[2] تفسير القرطبي (١/ ٣٧٥) [3] تفسير ابن كثير (١/ ١١٩)

[4] تفسير الطبري (٢/ ١٩) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ تفسير ابن كثير (١/ ١٢٠)

لَا . فَيَقُولُ اللّٰهُ: اَلْيَوْمَ أَنْسَاكَ كَمَا نَسِيْتَنِيْ » ''کیا تو میری ملاقات پر یقین رکھتا تھا؟ وہ کہے گا: نہیں، پس اللہ فرمائے گا: آج میں تجھ کو بھلا دوں گا (یعنی ترک کر دوں گا) جیسے تو مجھ کو بھول گیا تھا۔''[1] اس جگہ بھی ظن بہ معنی یقین بولا گیا ہے۔ اس آیت پر پارہ اول کا ربع اول ختم ہوا۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ.

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

اے بنی اسرائیل! تم میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی اور بے شک میں نے تمھیں فضیلت دی تھی جہانوں پر (47)

اللہ تعالیٰ کی بنی اسرائیل پر نعمتیں:

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جب اس آیت کو پڑھتے تو کہتے کہ وہ قوم تو گزر چکی،[2] لہٰذا اب مراد تم لوگ ہو۔ یعنی لفظ کی عمومیت کا اعتبار ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان نعمتوں کو یاد دلایا ہے، جو یہود کے آبا و اجداد پر کی گئی تھیں اور جو فضیلت انھیں اس زمانے کے لوگوں پر دی تھی، جیسے: انھیں میں سے رسولوں کا بھیجنا اور ان پر کتابوں کا نازل کرنا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۲﴾ ﴾ [الدخان: ۳۲] ''اور بے شک ہم نے بنی اسرائیل کو جانتے بوجھتے ہوئے جہانوں پر ترجیح دی۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [المائدۃ: ۲۰] ''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اللہ کی نعمت یاد کرو جو اس نے تم پر کی، جب اس نے تم میں سے نبی بنائے اور تمھیں بادشاہ بنایا، اور تمھیں وہ کچھ دیا جو ساری دنیا میں کسی کو نہیں دیا گیا۔''

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ فضیلت یہ تھی کہ ان کو بادشاہی اور پیغمبری دی۔ اس وقت میں جو شخص عالم تھا، اس پر کتابیں اُتاریں۔ ہر زمانے میں ایک عالم ہوتا ہے۔[3]

افضیلت اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کو اسی بات پر محمول کرنا ضروری ہے، کیوں کہ یہ اُمت اس آیتِ کریمہ کی روشنی میں ان سے افضل ہے: ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۗ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴾ [آل عمران: ۱۱۰] ''تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۹۶۸) [2] تفسير ابن أبي حاتم (۱/ ۱۰۴) اس کی سند میں انقطاع ہے۔

[3] تفسير الطبري (۲/ ۲۴) تفسير ابن أبي حاتم (۱/ ۱۰۴) اس کی سند حسن ہے۔

اصلاح) کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہلِ کتاب ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہت بہتر ہوتا۔'' اہلِ سنن نے معاویہ قشیری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ تم ستر امت کو پورا کرو گے۔ اللہ کے نزدیک تم ان میں سب سے بہتر و بزرگ ہو۔[1] اس بارے میں اور بھی احادیث آئی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ سب لوگوں پر ایک طرح کی فضیلت ہے نہ کہ مطلقاً ہر طرح کی، مگر اس میں نظر ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ نہیں، بلکہ ساری اُمتوں پر فضیلت دی گئی تھی، کیوں کہ اکثر انبیا اسی امت میں ہوئے ہیں، مگر اس میں بھی نظر ہے، کیوں کہ ''عالمین'' کا لفظ عام ہے اور سارے اگلے پچھلے انبیا کو شامل ہے، حالانکہ ابراہیم خلیل علیہ السلام ان سے پہلے تھے اور وہ سارے انبیا سے افضل ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بعد ہوئے اور وہ آدم تا ایں دم تمام مخلوق سے افضل ہیں، بلکہ دنیا اور آخرت میں اولادِ آدم کے سردار ہیں۔[2]

عالمین کا مفہوم:

فتح البیان میں الفاظ یہ ہیں کہ عالمین سے مراد اس زمانے کے لوگ ہیں، لہٰذا یہ لفظ گزرے ہوئے اور آیندہ آنے والے زمانے پر لاگو نہیں ہوگا اور وہ فضیلت اگرچہ آبا کے حق میں ہے، لیکن اس سے ایک طرح کی بزرگی اولاد کو بھی حاصل ہوتی ہے۔ کشاف میں ہے کہ ''عالمین'' سے مراد ایک بڑا گروہ ہے، جس طرح فرمایا ہے: ﴿بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ﴾ [الأنبياء: ٧١] ''جس میں ہم نے اہلِ عالم کے لیے برکت رکھی تھی۔'' لفظ ''عالم'' بولتے ہیں، مراد اکثریت ہوتی ہے۔[3] مگر امام رازی رحمہ اللہ نے اس کو ضعیف کہا ہے۔[4] امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس ضعف کو نہیں مانا، بلکہ کشاف کی تائید فرمائی ہے اور یہی بات درست ہے۔[5]

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٤٨﴾

اور اس دن سے ڈرو جب کوئی جان کسی جان کو کچھ فائدہ نہیں دے گی اور نہ اس سے کوئی عوض لیا جائے گا اور نہ ان کی مدد ہی کی جائے گی (48)

بنی اسرائیل کہتے تھے کہ ہم کیسے ہی گناہ کریں، پکڑے نہیں جائیں گے، کیوں کہ ہمارے آبا و اجداد پیغمبر تھے،

---

(1) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٠١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٨٨) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو حسن کہا ہے۔

(2) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٧٨) تفسير ابن كثير (١/ ١٢٠۔ ١٢١)

(3) تفسير الكشاف (١/ ١٦٤) (4) تفسير الرازي (٣/ ٤٩) (5) فتح القدير (١/ ١٨٦) فتح البيان (١/ ١٦١۔ ١٦٢)

وہ ہم کو چھڑوا لیں گے۔ اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے۔ وہاں کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴾ [النجم: ۳۸] ''یہ کہ کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔'' نیز فرمایا: ﴿ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَىِٕذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴾ [عبس: ۳۷] ''ان میں سے ہر شخص کا اس دن ایسا حال ہوگا جو اسے دوسروں سے بے پروا کر دے گا۔'' نیز فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِهٖ شَيْـًٔا ﴾ [لقمان: ۳۳] ''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو اور ڈرو اس دن سے جب کوئی باپ اپنی اولاد کے کام نہ آئے گا اور نہ اولاد اپنے باپ کے کچھ کام آئے گی۔'' یہ مقام نہایت بلیغ ہے کہ نہ باپ بیٹے کا بھلا کر سکے گا اور نہ بیٹا باپ کے کام آ سکے گا، بلکہ اس دن ہر شخص اپنے بھائی، ماں اور باپ سے بھاگے گا۔

روزِ قیامت کفار کی بے بسی:

پہلے نفس سے مراد نفسِ مومنہ ہے اور دوسرے نفس سے مراد نفسِ کافرہ ہے، یعنی کسی مسلم کی فرماں برداری کسی گناہ گار سے اس عذاب کو دور نہیں کر سکے گی، جو اس پر واجب ہو گیا ہے۔ نہ کسی شخص کی کوئی سفارش چلے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴾ [المدثر: ٤٨] ''پھر سفارشیوں کی سفارش انھیں نفع نہ دے گی۔'' اسی طرح دوزخیوں کی زبان سے ارشاد کیا: ﴿ فَمَا لَنَا مِنْ شٰفِعِيْنَ ۝ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴾ [الشعراء: ۱۰۰۔ ۱۰۱] ''تو (اب) ہمارے لیے کوئی سفارشی نہیں ہے۔ اور نہ کوئی مخلص دوست۔''

اسی طرح اگر کوئی یہ چاہے کہ فدیہ یا بدلہ دے کر چھوٹ جائے تو یہ بھی ممکن نہ ہوگا، جیسا کہ اللہ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ﴾ [آل عمران: ۹۱] ''بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور حالتِ کفر میں مرے ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا بھی قبول نہ کیا جائے گا اگرچہ وہ فدیے میں دینا چاہے۔''

نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [المائدة: ۳٦] ''بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اگر ان کے پاس وہ سب کچھ ہو جو ساری زمین میں ہے اور اس کے برابر اور بھی ہوتا کہ وہ قیامت کے دن عذاب سے بچنے کے لیے فدیے میں دے دیں تو بھی وہ ان سے قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کے لیے بہت دردناک عذاب ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ﴾ [الأنعام: ۷۰] ''اور اگر وہ بدلے میں ہر طرح کا فدیہ دے تو وہ بھی اس سے نہیں لیا جائے گا۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ﴾ [الحديد: ۱۵] ''لہٰذا آج تم سے کوئی فدیہ نہ لیا جائے گا اور نہ ان لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا۔ تمھارا ٹھکانا آگ ہے۔''

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ نہ وہ رسول پر ایمان لائے نہ انھوں نے رسول کی پیروی اختیار کی تو اب وہ اللہ سے بھی قیامت کے دن اس حال میں ملیں گے کہ نہ کوئی قرابت ان کے کام آئے گی نہ کسی بڑے شخص کی سفارش ان کے لیے چلے گی۔ اگر وہ زمین بھر کر سونا دیں گے تو وہ بھی نہیں لیا جائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ﴾ [البقرة: ٢٥٤] ''اس سے پہلے کہ وہ دن آ جائے جس میں نہ خرید وفروخت ہوگی اور نہ کوئی دوستی اور نہ سفارش ہی کام آئے گی۔'' نیز فرمایا: ﴿ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ﴾ [إبراهيم: ٣١] ''جس میں نہ سودا بازی ہوگی نہ دوستی (کام آئے گی)۔'' ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ لفظ عدل سے مراد بدل ہے۔ بدل فدیہ ہوتا ہے۔① سلف کی ایک جماعت نے بھی یہی کہا ہے کہ اس جگہ عدل سے مراد فدیہ ہے۔ علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ صرف نفل ہے اور عدل فرض۔② لیکن یہ قول اس جگہ غریب ہے۔ پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ ایک حدیث میں بھی آیا ہے کہ عدل فدیہ ہے۔③ (رواہ ابن جریر)

ان کو مدد نہ پہنچے گی، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کوئی ایسا شخص نہیں ہوگا، جو غصے میں آ کر اُن کی مدد کے لیے کھڑا ہو اور اللہ کے عذاب سے ان کو رہائی دلوا دے۔ غرض کہ ان کا نہ کوئی اپنا مددگار ہوگا نہ پرایا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ﴾ [الطارق: ١٠] ''تو انسان کے پاس نہ کوئی قوت ہوگی اور نہ کوئی اس کا مددگار ہوگا۔'' یعنی اللہ کافر کے حق میں نہ کوئی فدیہ قبول کرے گا نہ کسی کی سفارش، نہ کوئی اس کو عذاب سے چھڑا سکے گا، نہ پناہ دے سکے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ ﴾ [المؤمنون: ٨٨] ''جبکہ وہی پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابل کسی کو پناہ نہیں دی جا سکتی۔''

نیز فرمایا: ﴿ فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌ ۝ وَّلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗۤ اَحَدٌ ﴾ [الفجر: ٢٥۔ ٢٦] ''چنانچہ اس دن اس جیسا عذاب دینے والا اور کوئی نہیں ہوگا۔ اور اس جیسا جکڑنے والا بھی اور کوئی نہیں ہوگا۔'' نیز فرمایا: ﴿ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ۝ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴾ [الصّافات: ٢٥۔ ٢٦] ''(کہا جائے گا:) تمھیں کیا ہوا، تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔ بلکہ آج وہ (سب) فرماں بردار ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴾ [الأحقاف: ٢٨] ''پھر ان لوگوں نے ان کی مدد کیوں نہ کی جنھیں انھوں نے قربِ الٰہی حاصل کرنے کے لیے اللہ کو چھوڑ کر معبود بنا رکھا تھا، بلکہ وہ (معبود) ان سے گم ہو گئے، اور یہ تھا ان کا جھوٹ اور ان کا افترا۔''

---

① تفسیر الطبري (٢/ ٣٤) اس کی سند میں ''حسین بن داود'' ضعیف راوی ہے۔

② تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٠٥) اس کی سند حسن ہے۔ ③ تفسیر الطبري (٢/ ٣٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کے معنی ہیں کہ اس دن کوئی ان کی مدد نہ کرے گا، جس طرح کوئی سفارش نہ ہوگا، نہ بدلہ قبول کیا جائے گا اور نہ فدیہ ہی لیا جائے گا۔ اس دن دوستی باطل ہو جائے گی۔ رشوت بے اثر اور سفارش بے کار ہو جائے گی۔ ایک دوسرے کی مدد اور تعاون کا جذبہ ختم ہو جائے گا۔ اسی ایک جبار عادل کی حکومت ہوگی کہ جس کے سامنے نہ سفارش کرنے والوں کا بس چلے گا اور نہ مددگاروں سے کچھ بن آئے گا۔ بدی کی سزا اسی کے برابر اور نیکی کا اجر دوگنا دے گا۔

یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ۝ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ۝ ﴾ [الصّافات: ٢٤۔ ٢٥]

”اور انھیں ٹھہراؤ، بلاشبہ ان سے باز پرس کی جائے گی۔ (کہا جائے گا:) تمھیں کیا ہوا، تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔“[1] غرض کہ اہلِ کتاب ہوں یا مشرکین خانہ خراب، ان کے لیے اس دن اللہ کے عذاب سے رہائی کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ وہ دن دنیا کے دن کی طرح کا نہیں ہے کہ وہاں لے دے کر، کھلا پلا کر، چکنی چپڑی باتیں کر کے یا کوشش اور سفارش سے کام بن جائے۔ بھائی بند مدد کریں یا دوست احباب کام آئیں یا باپ دادا آ کر بچالیں۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ
اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ
عَظِيْمٌ ۝

اور (یاد کرو) جب ہم نے تمھیں آلِ فرعون سے نجات دی، وہ تمھیں سخت عذاب دیتے تھے، تمھارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمھاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے، اور اس میں تمھارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی (49)

ان کی یہ مخلصی موسیٰ علیہ السلام کے طفیل سے ہوئی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرعون ۔لعنه الله۔ نے خواب دیکھا تھا اور ڈر گیا۔ وہ خواب یہ تھا کہ بیت المقدس سے ایک آگ نکلی، جو بلادِ مصر میں قبطیوں کے گھروں میں گھس گئی اور بنی اسرائیل کے گھر اس سے بچ گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے ملک کا زوال ایک اسرائیلی شخص کے ہاتھ پر ہوگا۔ کسی نے کہا کہ فرعون کو بھی یہ بتایا گیا تھا کہ بنی اسرائیل ایک شخص کے منتظر ہیں، جس کے ہاتھ پر انھیں دولت اور بلندی حاصل ہوگی۔ تب فرعون نے یہ حکم دیا کہ ان میں جو لڑکا پیدا ہو، اسے قتل کر دو اور لڑکیوں کو چھوڑ دو، پھر بنی اسرائیل کو سخت محنت کے کاموں میں لگا دیا اور ان سے رذیل خدمتیں لینا شروع کر دیں۔[2]

[1] تفسير الطبري (٢/ ٣٥۔ ٣٦)
[2] تفسير ابن كثير (١/ ١٢٢)

فرعون کا نام ونسب:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مصر کی قوم عمالقہ وغیرہ کے ہر بادشاہ کا نام فرعون تھا، جس طرح روم وشام کے ہر کافر بادشاہ کا نام قیصر، فارس کے بادشاہ کا نام کسریٰ، یمن کے ہر بادشاہ کا نام تبع، حبشہ کے ہر بادشاہ کا نام نجاشی اور ہند کے ہر بادشاہ کا نام بطلیموس ہوا کرتا تھا۔[1] لیکن کتبِ تاریخ میں یونان کے بادشاہوں کا نام بطالسہ بتایا گیا ہے، ہند کے ہر بادشاہ کا لقب جے پال اور چین کے ہر بادشاہ کا لقب خاقان۔ پھر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس فرعون کا نام جو موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تھا، ولید بن مصعب بن ریان ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مصعب بن ریان تھا اور وہ عملیق بن اود بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے تھا۔ اس کی کنیت ابو مرہ تھی۔ اصل میں اہلِ اصطخر کے فارسیوں میں سے ہے، پھر کہا کہ کچھ بھی ہو، اللہ کی اس پر لعنت ہو۔[2] فتح البیان میں اتنا اور زیادہ ہے کہ اہلِ کتاب کے بیان کے مطابق فرعون کا نام قابوس تھا، جو چار سو برس سے زیادہ زندہ رہا۔ موسیٰ علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس سال ہوئی۔ مسعودی نے کہا ہے کہ عربی میں فرعون کے کچھ معنی نہیں ہیں۔ امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرعون ہر سرکش، جبار، متکبر اور مکار کو کہتے ہیں۔[3]

لفظِ ''بلاء'' کا مفہوم:

بلا کا لفظ خیر اور شر دونوں میں آتا ہے۔ یہاں اگر خیر مراد ہے تو وہ خیر یہ تھی کہ اللہ نے ان کے آبا و اجداد کو فرعون کے عذاب سے نجات دی، اسی لیے ابن جریر رحمہ اللہ، ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمہ اللہ نے اس جگہ ''بَلَاءٌ'' کا ترجمہ نعمتِ عظیمہ کیا ہے۔[4] امام سدی اور ابو العالیہ رحمہما اللہ وغیرہما نے ایسے ہی کہا ہے اور اگر مراد شر ہے تو یہ شر لڑکوں کا ذبح کرنا اور لڑکیوں کا زندہ رکھنا تھا۔ اور اصل میں بلا آزمایش ہے۔ یہ آزمایش کبھی خیر اور کبھی شر سے ہوتی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ﴾ [الأنبياء: ٣٥] ''اور ہم تمھیں پرکھنے کے لیے برائی اور بھلائی سے آزماتے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٦٨] ''اور ہم نے انھیں خوش حالی اور بدحالی کے ساتھ آزمایا، شاید کہ وہ (اللہ کی طرف) لوٹ آئیں۔''[5] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا کہ اس جگہ ''بلاء'' سے مراد شر ہے۔ یہی جمہور کا قول صحیح ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۲۳) [2] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۲۳) [3] فتح القدیر (۱/ ۱۸۸) فتح البیان (۱/ ۱٦٤)

[4] تفسیر الطبري (۲۲/ ٤۸۔ ٤۹) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۰٦) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱٦۳) ان کی اسناد حسن ہے۔

[5] تفسیر القرطبي (۱/ ۳۸۷)

وَاِذۡ فَرَقۡنَا بِكُمُ الۡبَحۡرَ فَاَنۡجَيۡنٰكُمۡ وَاَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ۝۵۰

اور جب ہم نے تمھارے لیے سمندر کو پھاڑ دیا، پھر ہم نے تمھیں نجات دی اور ہم نے آلِ فرعون کو غرق کر دیا، جب کہ تم دیکھ رہے تھے (50)

یہ قصہ تفصیل کے ساتھ سورۃ الشعراء میں ہے اور وہیں لکھا جائے گا۔ دیکھنے کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ جب دشمن کی ذلت اپنی آنکھوں سے دیکھیں تو ان کا دل ٹھنڈا ہو۔ عمرو بن میمون رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر نکلے تو فرعون نے کہا کہ جب تک صبح مرغ نہ بولے تم پیچھا نہ کرنا، لیکن اس دن مرغ ہی نہ بولا تو صبح کو ایک بکری منگوا کر حلال کی اور کہا کہ جب تک میں اس کی کلیجی سے فارغ ہوں، تب تک چھے لاکھ قبطی جمع ہو جائیں۔ چناں چہ وہ جمع ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام جب دریا پر پہنچے تو ان کے ایک صحابی نے، جن کا نام یوشع بن نون تھا، کہا کہ آپ کے رب کا حکم کہاں جانے کا ہے؟ انھوں نے کہا کہ سامنے اور اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا، وہ غوطہ کھانے لگا، یوشع پھر کر آئے اور پھر کہا کہ کہاں کا حکم ہے، واللہ نہ میں جھوٹا ہوں نہ آپ؟ تین بار یہی کہا، پھر موسیٰ علیہ السلام کو وحی آئی کہ تم اس دریا کو اپنی لاٹھی سے مارو۔ جب مارا تو وہ پھٹ گیا، اس کا ہر ٹکڑا ایک بڑے پہاڑ کی طرح ہو گیا۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھیوں کے ہمراہ چل نکلے۔ راستے میں فرعون نے آلیا، جب دریا کے بیچ میں پہنچے تو دریا برابر ہو گیا۔[1]

یوم عاشوراء کا روزہ:

یہ ہے مطلب اس آیت کا کہ ہم نے فرعون کو غرق کر دیا اور تم دیکھتے تھے۔ اسی طرح بہت سے سلف صالحین نے کہا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ عاشوراء کا دن تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آئے تو دیکھا کہ یہودی عاشوراء کے دن روزہ رکھتے ہیں۔ پوچھا: یہ کیا دن ہے، جس میں تم روزہ رکھتے ہو؟ کہا کہ یہ ایک اچھا دن ہے، اس دن اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دشمن سے نجات دی تھی اور موسیٰ علیہ السلام نے روزہ رکھا تھا۔ فرمایا کہ میں موسیٰ کا تم سے زیادہ حق دار ہوں۔ پھر اس دن روزہ رکھا اور سب کو روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ (رواه أحمد) اسی کے لگ بھگ اس حدیث کو بخاری، مسلم، نسائی اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔[2]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ بنی اسرائیل کے لیے عاشوراء کے دن اللہ نے دریا کو چیر دیا۔[3] (رواه أبو یعلیٰ) لیکن اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔ زید عمی اس کے راوی ہیں، ان میں ضعف ہے اور اُن سے

[1] تفسیر الصنعاني (۱/ ۴۵۔ ۴۶) تفسیر الطبري (۲/ ۵۳)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۹۰۰) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۱۳۰) مسند أحمد (۱/ ۲۹۱) سنن النسائي الكبرىٰ (۲/ ۱۵۶) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۱۷۳۴)

[3] مسند أبي یعلیٰ (۷/ ۱۳۳)

زیادہ ان کے شیخ یزید رقاشی ضعیف ہیں۔ فتح البیان میں ہے کہ یہ قصہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کا ایک بڑا معجزہ ہے، جس کا شکر کرنا سارے بنی اسرائیل پر جان و زبان سے واجب ہے، اسی طرح اس قصے کو بعینہٖ رسول اللہ ﷺ کا بیان کرنا بھی ایک بڑا معجزہ ہے، یہودیوں کے لیے اور اُن کی اولاد پر اس کا قبول کرنا لازم ہے۔[1]

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾

اور (یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ سے وعدہ کیا چالیس راتوں کا، پھر موسیٰ کے (طور پر) جانے کے بعد تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم ظالم تھے (51)

بنی اسرائیل کا بچھڑے کو معبود بنانا:

اس کا قصہ سورت اعراف اور سورت طٰہٰ میں آئے گا۔ سورت اعراف میں فرمایا ہے: ﴿ وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ ﴾ [الأعراف: ١٤٢] ”اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا (کہ وہ اتنی راتیں کوہِ طور پر گزارے) اور ہم نے انھیں (مزید) دس راتوں کے ساتھ پورا کیا۔“ کہتے ہیں کہ یہ ایک مہینا ذوالقعدہ کا اور ذوالحجہ کے دس دن تھے۔ یہ ماجرا فرعون اور سمندر سے نجات کے بعد ہوا۔ ظالم اس لیے فرمایا کہ انھوں نے شرک کیا تھا اور شرک سے بڑھ کر کوئی بے انصافی اور ظلم نہیں ہے۔ یہ آٹھ ہزار لوگ تھے اور ہارون علیہ السلام اور بارہ ہزار اشخاص کے سوا سب نے اس کو پوجا تھا۔ یہی قول زیادہ صحیح ہے۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾

پھر اس کے بعد ہم نے تمھیں معاف کر دیا، تا کہ تم شکر کرو (52)

یعنی موسیٰ علیہ السلام کے طور پہاڑ پر چلے جانے کے بعد انھوں نے ایک بچھڑے کو پوجا تھا۔ اللہ نے ان کا وہ قصور معاف کر دیا اور اپنا احسان یاد دلایا۔ کہتے ہیں کہ اس بچھڑے کا نام بھموت یا بہبوت تھا۔ موسیٰ عجمی عبری نام ہے۔ ”مو“ پانی کو ”شا“ شجر کو بولتے تھے، ان کو پانی اور درخت کے درمیان سے پایا تھا، اس لیے موسیٰ کہنے لگے اور شین سین ہو گیا۔ شکر کا مطلب ہے: احسان کرنے والے کا احسان تسلیم کرنا اور اس کی تعریف کرنا۔

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان (حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والی) دی، تا کہ تم ہدایت پاؤ (53)

---

[1] فتح البیان (١/ ١٦٦)

فرقان کا مفہوم:

اُس جگہ کتاب سے مراد تورات شریف ہے۔ فرقان وہ ہے، جو حق اور باطل، ہدایت اور گمراہی میں فرق ظاہر کر دے یا ان میں تمیز بخشے۔ کسی نے کہا ہے کہ فرقان یہ تھا کہ انھیں بچا لیا اور فرعون کو غرق کر دیا۔ کسی نے کہا ہے کہ فرقان وہ ہے، جو حلال اور حرام میں فرق کر دے یا دریا کا پھٹ جانا مراد ہے۔

زیادہ صحیح یہ ہے کہ فرقان سے حجت و بیانِ الٰہی مراد ہے، جیسے: عصا اور یدِ بیضا وغیرہ۔ یعنی ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور معجزے دیے۔ یہ معجزات دینا بھی دریا سے نکلنے کے بعد ہوا تھا، جس طرح سورت اعراف سے سمجھا جاتا ہے، نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی اسی پر دلالت کرتا ہے: ﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰى بَصَآىِٕرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝﴾ [القصص: ٤٣] ''اور بلاشبہ ہم نے پہلی امتوں کو ہلاک کرنے کے بعد موسیٰ کو ایسی کتاب دی جو کہ لوگوں کے لیے بصیرت افروز دلائل اور ہدایت اور رحمت تھی، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔''

اس کے بعد بنی اسرائیل کی توبہ کی صفت بیان فرمائی۔ ارشاد ہے:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝٥٤

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! بے شک تم نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے بچھڑے کو (معبود) بنا کر، لہٰذا اب تم اپنے پیدا کرنے والے کے حضور توبہ کرو، اور تم اپنے آپ کو قتل کرو، یہ تمھارے لیے تمھارے پیدا کرنے والے کے نزدیک بہت بہتر ہے۔ پھر اللہ نے تم پر توجہ کی، بے شک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (54)

بنی اسرائیل کی توبہ کی کیفیت:

لفظ ''باریٔ'' کے کہنے میں یہ جتلایا کہ تم سے یہ گناہ بہت بڑا سرزد ہوا کہ تم نے اپنے خالق کو چھوڑ کر کسی اور کو پوجا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کی توبہ یہ تھی کہ ہر ایک شخص، جس سے ملے، خواہ وہ باپ ہو یا بیٹا، اس کو تلوار سے قتل کر دے اور کچھ پروا نہ کرے کہ اُس جگہ کس کو جان سے مارا۔ پس ان لوگوں نے، جن کی کیفیت موسیٰ و ہارون علیہما السلام پر چھپی رہی، مگر اللہ کو ان کے گناہ معلوم تھے، توبہ کی، اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور اللہ

کا حکم بجا لائے، اللہ نے قاتل و مقتول دونوں کو بخش دیا۔[1] (رواه النسائي و ابن جرير و ابن أبي حاتم)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے یہ حکم دیا تھا کہ تم آپس میں قتل کرو۔ جن لوگوں نے بچھڑے کو پوجا تھا، وہ بیٹھ گئے اور جنھوں نے نہیں پوجا تھا، انھوں نے ہاتھ میں خنجر لے کر قتل کرنا شروع کیا، اتنے میں اندھیرا ہو گیا اور ایک نے دوسرے کو قتل کیا۔ جب اندھیرا دور ہوا، دیکھا تو ستر ہزار آدمی قتل ہو چکے تھے۔ جو شخص قتل ہوا، اس کی توبہ قبول اور جو بچ گیا، وہ بھی تائب ٹھہرا۔[2] (رواه ابن جرير) اس تعداد کے ساتھ یہ قصہ سلف کی ایک جماعت سے منقول ہے، جن کے نام حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ذکر کیے ہیں۔[3]

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے، یہاں تک کہ ہم اللہ کو سامنے (علانیہ) نہ دیکھ لیں تو تمھیں بجلی نے پکڑ لیا اور تم دیکھ رہے تھے (55) پھر ہم نے تمھیں زندہ کیا تمھاری موت کے بعد تاکہ تم شکر کرو (56)

اللہ کو دیکھنے کا مطالبہ اور ان کا مر کر جی اُٹھنا:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ جَهْرَةً ﴾ کے معنی علانیہ ہیں۔[4] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عیاناً (آنکھوں سے دیکھنا) مراد ہیں۔[5] یہ وہ ستر آدمی تھے جنھیں موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھ لے جانا پسند کیا تھا، انھوں نے اللہ کا کلام سن کر کہا کہ ہم تب ایمان لائیں گے، جب اللہ کو اپنے سامنے دیکھ لیں گے۔ اس پر وہ بجلی کی آواز سن کر بے ہوش ہو کر مر گئے۔ کسی نے کہا ہے کہ "صاعِقہ" آسمانی چیخ کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ آگ کو۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موسیٰ یہ حال دیکھ کر روئے اور اللہ سے دعا کی کہ اے رب! یہ بنی اسرائیل کے چیدہ لوگ تھے، میں انھیں کیا کہوں گا؟ اللہ تعالیٰ نے وحی کی کہ یہ وہ ستر لوگ ہیں جنھوں نے بچھڑے کی پرستش کی تھی۔ پھر اللہ نے ان کو زندہ کر دیا اور وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہر ایک دوسرے کے زندہ ہو جانے کو دیکھ رہا تھا۔ ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ موت ان کی سزا تھی۔ اب زندہ ہو کر وہ اپنی عمر پوری کریں گے۔[6]

---

[1] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٩٦) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١١٠) اس کی سند حسن ہے۔
[2] تفسير الطبري (٢/ ٧٣۔ ٧٤) اس کی سند صحیح ہے۔ [3] تفسير ابن كثير (١/ ١٢٥)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١١١) اس کی سند حسن ہے۔ [5] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١١١)
[6] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١١٢۔ ١١٣)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس قصے کو ابن اسحاق سے تفصیلاً روایت کیا ہے۔[1] امام رازی رحمہ اللہ کا یہ قول کہ وہ سب اس واقع کے بعد نبی ہو گئے،[2] ٹھیک نہیں ہے، کیوں کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں سوائے ہارون اور یوشع علیہما السلام کے کوئی نبی نہیں ہوا۔ اہلِ کتاب کا یہ قول کہ ان سب نے اللہ کو دیکھا، غلط ہے۔ موسیٰ علیہ السلام خود تو دیکھ نہ سکے، وہ سب کیا دیکھتے؟! قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ سب اس حیات کے بعد اس شریعت کے مکلّف رہے۔ یہ نہیں ہوا کہ شریعت کی پابندی ان سے ساقط ہوگئی تھی۔[3]

دیدارِ الٰہی کا ثبوت:

معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ کا دیدار نہ دنیا میں ہوسکتا ہے اور نہ آخرت میں ہوگا۔ اہلِ سنت کا قول ہے کہ یہاں تو نہیں ہوتا، مگر وہاں ضرور ہوگا۔ احادیثِ صحیحہ متواترہ سے ثابت ہے کہ لوگ اپنے رب کو دیکھیں گے۔ یہ حدیثیں اس بارے میں قطعی دلیل ہیں۔ عقلی دلائل اور علمِ کلام کے قواعد اس لائق نہیں کہ احادیث کے مقابلے میں حجت ہوسکیں۔ حافظ ابن القیم نے ''حادي الأرواح'' میں اس مسئلے پر مفصل بحث لکھی ہے۔[4] اسلاف کی ایک کثیر تعداد نے کتاب وسنت کی دلیلوں سے قیامت کے دن دیدارِ الٰہی ہونا ثابت کیا ہے۔ جَزَاهُمُ اللّٰهُ خَيْراً.

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۖ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٥٧﴾

اور ہم نے تم پر سایہ کیا بادلوں کا اور (کھانے کے لیے) تم پر من وسلویٰ اتارا (اور کہا کہ) ان پاکیزہ چیزوں سے کھاؤ جو ہم نے تمھیں عطا کیں اور انھوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ اپنے آپ ہی پر ظلم کرتے تھے (57)

بادلوں کا سایہ اور من وسلویٰ کا اُترنا:

جب فرعون غرق ہو چکا اور بنی اسرائیل اس سے چھٹکارا حاصل کر کے جنگل میں گئے اور ان کے خیمے پھٹ گئے تو دھوپ سے بچاؤ کے لیے سارا دن بادل رہتا۔ اناج نہ ملتا تو من وسلویٰ اترتا۔ ''منّ'' دھنیے کے دانے جیسی ایک میٹھی چیز تھی۔ یہ دانے رات کو اوس میں برستے اور لشکر کے اردگرد ڈھیر لگ جاتا، تو صبح کو ہر آدمی اپنی طاقت کے مطابق چن لاتا۔ ''سلویٰ'' ایک جانور کا نام ہے۔ شام کو لشکر کے گرد ہزاروں جانور جمع ہو جاتے، اندھیرا ہوتے ہی وہ

[1] تفسیر الطبري (٢/ ٨٦۔ ٨٧) تفسیر ابن کثیر (١/ ١٢٦)
[2] تفسیر الرازي (٣/ ٧٩)
[3] تفسیر القرطبي (١/ ٤٠٥)
[4] حادي الأرواح (١/ ١٩٦)

ان کو پکڑ لاتے اور ان کو بھون کر کھاتے۔ مدتوں تک یہی کھانا کھاتے رہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ بادل ایسا نہ تھا جیسا ہوتا ہے، بلکہ اس سے زیادہ ٹھنڈا اور پاکیزہ تھا۔ قیامت کے دن اللہ ایسے ہی بادل میں آئے گا۔ بدر کے دن فرشتے بھی اسی قسم کے بادل میں آئے تھے۔ یہ بادل ان کے ساتھ ''تیہ'' یعنی جنگل میں رہتا تھا۔[1]

مَن کی تفسیر:

''مَن'' کہتے ہیں ترنجبین کو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ایک طرح کا گوند تھا۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ایک گاڑھی اوس تھی۔ امام سدیؒ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اوس زنجبیل کے درخت پر پڑتی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اوس دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھی تھی اور ان کی جگہ میں گرتی۔ یہ اوس طلوعِ فجر سے سورج نکلنے تک برستی تھی۔ جو شخص ایک دن کی ضرورت سے زیادہ لیتا تو خراب ہو جاتی۔ ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ من شہد جیسا ایک پانی تھا، اس کو پانی میں ملا کر پیتے۔ وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ من پتلی روٹی، یعنی چپاتی تھی۔ شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تمھارا شہد من کا سترواں حصہ ہے۔ ابن زید رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔[2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ من کی شرح میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں، مگر ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کسی نے اس کو طعام کہا ہے اور کسی نے پینے والی چیز۔ ظاہر یہ ہے کہ منّ وہ ہے، جس کا اللہ نے ان پر احسان جتلایا ہے، وہ کھانے والی چیز ہو یا پینے والی۔ وہ انھیں بغیر محنت و مشقت کے ملتی تھی۔ جو منّ اب مشہور ہے، اس کو اگر اکیلے کھائیں تو طعام ہے۔ اگر پانی میں ملائیں تو شراب ہے۔ کسی اور چیز سے جوڑو تو کچھ اور بن جائے، لیکن وہ اس جگہ آیت سے مراد نہیں ہے۔[3]

صحیح بخاری میں سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے جو روایت مرفوعاً مروی ہے کہ ''کمأۃ (کھمبی) منّ کی قسم سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لیے شفا ہے۔'' اس حدیث کو امام احمد نے بھی روایت کیا ہے، بلکہ ابو داود کے سوا تمام اہلِ سنن اس کو نقل کرتے ہیں۔ ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے۔ یہ حدیث شیخین وغیرہما کے نزدیک کئی طریق سے آئی ہے۔[4]

سلویٰ کی تفسیر:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس حدیث کے بہت سے طرق ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ سیدنا

[1] تفسیر الطبري (٢/ ٩٠۔ ٩١) اس کی سند میں ''حسین بن داود'' ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر الطبري (٢/ ٩١۔ ٩٣) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١١٤۔ ١١٥)

[3] تفسیر ابن کثیر (١/ ١٢٨۔ ١٢٩)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٢٠٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٠٤٩) مسند أحمد (١/ ١٨٧) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٠٦٧) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٣٤٥٤) سنن النسائي الکبریٰ (٤/ ١٥٦)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ''سلویٰ'' سمانی (بٹیر) سے ملتا جلتا ایک پرندہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور صحابہ کی ایک جماعت نے بھی یہی کہا ہے۔[1] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ جنت کی چڑیا جیسی اور کنجشک سے بڑی ایک چڑیا تھی۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ایک سرخی مائل پرندہ تھا، جو جنوب کی طرف سے آنے والی ہوا کے ساتھ آتا تھا۔ وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سلویٰ کبوتر کی طرح کا ایک موٹا پرندہ تھا اور وہ اس کو ایک ہفتے سے دوسرے ہفتے تک پکڑ کر رکھتے تھے۔ وہ تقریباً ایک میل کے فاصلے پر زمین سے ایک نیزے کی بلندی سے گرتا برستا تھا۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب بنی اسرائیل جنگل میں گھسے تو موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ یہاں کھانا کہاں ہے؟ تو اللہ نے من وسلویٰ اُتارا، پھر کہا کہ پانی کہاں ہے تو پتھر پر اپنا عصا مارا اور بارہ چشمے جاری ہوگئے۔ پھر کہا کہ سایہ کہاں ہے؟ تو بادل سایہ کرنے کے لیے آگیا۔ کہا کہ لباس کہاں ہے؟ تو بدن پر جو کپڑا تھا، وہ بچوں کی طرح بڑھتا رہتا، نہ پرانا ہوتا اور نہ پھٹتا تھا۔[2]

بادل اور جنگل کی کیفیت:

فتح البیان میں ہے کہ وہ بادل ان کے ساتھ جنگل ہی میں رہتا تھا۔ نور کا ایک ستون تھا۔ جب رات کو چاند نہ ہوتا تو وہ چمکتا تھا۔ جنگل جس کا نام تیہ تھا، شام اور مصر کے درمیان تھا۔ اس کی لمبائی چوڑائی نو کوس تھی۔ بنی اسرائیل اس جنگل میں چالیس سال تک حیران و پریشان رہے اور انھیں باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تھا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ یہ سزا اس لیے ہوئی کہ انھوں نے جبارین کے شہر میں یہ کہہ کر جانے سے انکار کر دیا تھا کہ تو اور تیرا رب جا کر لڑو۔ ان کی تعداد چھے لاکھ تھی۔ بیس سال سے کم عمر نوجوان کے سوا سب اسی جنگل تیہ میں تباہ ہو کر مر گئے۔ ہارون علیہ السلام بھی یہیں فوت ہوئے، ان کے سال بھر بعد موسیٰ علیہ السلام نے بھی انتقال فرمایا۔ اللہ نے اس من وسلویٰ کو حلال ٹھہرایا اور مزے دار بنایا۔ فرمایا کہ کھاؤ، مگر جمع کرنے سے منع کیا تھا۔

مہمان مالک نہیں بنتا:

معلوم ہوا مہمان کے پاس جو چیز لائی جائے، وہ اس کا مالک نہیں ہو جاتا اور میزبان کی اجازت کے بغیر اس میں تصرف کرنے کا حق بھی نہیں رکھتا۔ انھوں نے یہ ظالمانہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جو رزق انھیں محنت و مشقت کے بغیر اور آخرت کے حساب کے بغیر ملتا تھا کہ اسے لے کر جمع کرنا شروع کر دیا اور جو حد مقرر کی گئی تھی، اس سے تجاوز کرنے لگے اور عذاب کے مستحق بن گئے، نافرمانی کے مرتکب ہوگئے اور نعمت کا شکر نہ بجا لائے۔[3]

---

[1] تفسیر الطبري (۲/ ۹۶) اس کی سند پر علامہ احمد شاکر کا مفصل کلام دیکھیں: تفسیر الطبري (۱/ ۱۵۶)

[2] تفسیر الطبري (۲/ ۹۶۔ ۹۸) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۳۰۔ ۱۳۱)

[3] فتح البیان (۱/ ۱۷٤۔ ۱۷٦)

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾

اور جب ہم نے کہا: تم اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور اس میں جہاں سے تم چاہو جی بھر کر کھاؤ اور تم دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا اور کہنا: اے اللہ! ہمیں بخش دے، تو ہم تمھاری خطائیں معاف کر دیں گے اور عن قریب ہم احسان کرنے والوں کو زیادہ دیں گے (58) تو جن لوگوں نے ظلم کیا انھوں نے بات بدل دی، سوائے اس کے جو ان سے کہی گئی تھی، پھر ہم نے ان ظالم لوگوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا، اس وجہ سے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے (59)

فتح پر شکر ادا کرنے کے بجائے سرکشی کرنا:

بنی اسرائیل جنگل میں اپنی خطاؤں کی بدولت پھنسے تھے۔ سورۃ المائدہ میں اس کا مفصل بیان ہے۔ پھر ایک کھانے سے اُکتا گئے تو انھیں ایک شہر میں پہنچایا اور حکم دیا کہ دروازے میں سجدہ کر کے جاؤ اور ''حِطَّةٌ'' کہو، یعنی گناہ اُترے۔ لیکن انھوں نے مذاق سے ''حِطَّةٌ'' کے بدلے ''حِنْطَةٌ'' یعنی گیہوں کہا اور سجدے کے بجائے چوتڑ کے بل سرکنے لگے۔ شہر میں جا کر ان پر طاعون کی وبا آئی تو دو پہر میں تقریباً ستر ہزار آدمی مر گئے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں ان کو ملامت کی گئی ہے۔ جب وہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مصر سے نکلے تھے تو ان کو حکم ہوا تھا کہ ارضِ مقدس میں، جو تمھارے باپ اسرائیل کی میراث ہے، جاؤ اور وہاں جو کفار عمالیق رہتے ہیں، ان سے لڑائی کر کے انھیں وہاں سے نکال دو، مگر انھوں نے جنگ سے پیٹھ دکھائی اور ہمت ہار دی، اس پر اللہ نے انھیں بہ طور سزا ایک جنگل میں پھینک دیا، جس طرح سورۃ المائدہ میں مذکور ہے۔

اس لیے زیادہ صحیح یہی قول ہے کہ وہ شہر بیت المقدس تھا۔ خود اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو یہی بتلایا ہے: ﴿ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿21﴾ ﴾ [المائدۃ: ۲۱] ''اے میری قوم! مقدس زمین میں داخل ہو جاؤ، جو اللہ نے تمھارے نام لکھ دی ہے اور تم اپنی پشت کے بل منہ نہ موڑو،

پھر تم خسارہ اُٹھانے والے ہو جاؤ گے۔‘‘ کسی نے کہا ہے کہ وہ شہر اریحا قریہ جبارین تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور عبدالرحمن بن زید رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔[1] مگر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ بات بعید از قیاس ہے، کیوں کہ وہ بیت المقدس کے ارادے سے نکلے تھے اور یہ شہر اُن کے راستے پر نہ تھا۔ لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اریحا بیت المقدس کے نزدیک نشیبی زمین میں ایک بستی ہے۔

پھر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے زیادہ بعید یہ قول ہے کہ اس سے مراد مصر ہے۔ اس کو امام رازی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔[2] صحیح یہی ہے کہ مراد بیت المقدس ہے، کیوں کہ جب چالیس سال بعد یوشع بن نون علیہ السلام کے ساتھ وہ تیہ سے نکلے اور اللہ نے ان کو فتح دی، اس دن جمعہ کو تیسرے پہر تھوڑی دیر کے لیے سورج روک دیا گیا تھا، یہاں تک کہ فتح حاصل ہوئی تو اس وقت انھیں یہ حکم ملا کہ دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے شہر کے اندر جاؤ۔ یہ سجدہ مذکورہ بالا فتح و کامرانی حاصل ہونے پر اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے تھا اور اِس بات کا شکر ادا کرنے کے لیے کہ اللہ نے ان کو ان کا شہر دلا دیا اور جنگل سے نجات بخشی۔ اس بستی میں باقی ماندہ قومِ عاد تھی جنھیں عمالقہ کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ ملکِ شام کی کوئی بستی تھی۔ قاضی بیضاوی اور جمہور مفسرین کا پہلا قول ہے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس جگہ سجدے سے مراد رکوع ہے، یعنی بابِ صغیر سے رکوع کرتے ہوئے اندر جاؤ۔[5] حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی سجدہ مراد ہے، یعنی سر زمین پر رکھا جائے، مگر رازی رحمہ اللہ نے اس کو بعید سمجھا ہے۔[6] کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ سجدے سے مراد عاجزی ہے، کیوں کہ یہاں حقیقی سجدے کے معنی نہیں بنتے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ دروازہ قبلہ رو تھا۔[7] کسی نے کہا ہے کہ دروازے سے قبلے کی کوئی سمت مراد تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ جگہ اب تک بابِ حطہ کے نام سے مشہور ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد بابِ قبہ ہے، جس طرف موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل نماز پڑھتے تھے۔ جس نے یہ کہا ہے کہ مراد اریحا شہر ہے، وہ کہتا ہے کہ اس کا مطلب ہے کہ جس دروازے سے چاہو اندر جاؤ، کیوں کہ اس شہر کے سات دروازے تھے۔ وہ لوگ سجدہ کرنے کے بجائے سر اوپر اٹھائے ہوئے گئے، یعنی حکم کے خلاف کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ’’حِطَّةٌ‘‘ کا مطلب ہے کہ یہ امرِ حق ہے۔[8] دوسرا مطلب مغفرت و استغفار ہے۔[9] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ ’’لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ‘‘ کہو۔[10] کسی نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ اپنے گناہ کا اقرار کرو۔[11]

---

[1] تفسیر الطبري (۱۰/ ۱۶۸) اس کی سند صحیح ہے۔ [2] تفسیر الطبري (۱۰/ ۱۶۸) [3] تفسیر الرازي (۳/ ۸۲)

[4] تفسیر البیضاوي (۱/ ۳۲۷) [5] تفسیر الطبري (۲/ ۱۰۴) اس کی سند حسن ہے۔

[6] تفسیر الرازي (۳/ ۸۳) [7] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۱۷) اس کی سند حسن ہے۔

[8] تفسیر الطبري (۲/ ۱۰۷) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۱۸) اس کی سند میں ’’بشر بن عمارہ‘‘ ضعیف راوی ہے۔

[9] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۱۸) اس کی سند حسن ہے۔ [10] تفسیر الطبري (۲/ ۱۰۶) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۱۸)

[11] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۳۲۔ ۱۳۳)

فتح کے وقت عجز و استغفار کا حکم:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حاصلِ کلام یہ ہوا کہ ان کو یہ حکم تھا کہ فتح کے وقت عاجزی و خاکساری کا اظہار کریں، فعل و عمل سے اپنے قصور کا اقرار کر کے بخشش چاہیں اور اللہ کی نعمت کا شکر بجا لائیں، کیوں کہ اللہ کو ایسے کام کرنا محبوب ہوتا ہے، جیسے فرمایا: ﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ ﴾ [النصر: ۱۔۳] ''(اے نبی!) جب اللہ کی مدد اور فتح آ جائے گی۔ اور آپ لوگوں کو دیکھیں کہ وہ اللہ کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہو رہے ہیں۔ تو آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیجیے اور اس سے بخشش مانگیے، بلاشبہ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔''

اس سورت (سورۃ نصر) کی تفسیر میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد فتح و نصرت کے وقت کثرت کے ساتھ ذکر و استغفار کرنا ہے، مگر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یوں کہا ہے کہ اس میں وفاتِ نبوی کی خبر دی گئی ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے بھی یہی کہا ہے، لیکن ان دونوں اقوال میں تضاد نہیں، کیوں کہ پہلے ذکر و استغفار کا حکم دیا، پھر اس کے ساتھ ہی انتقال کی خبر بھی بیان کر دی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ تھی کہ جب فتح ہوتی تو بہت عاجزی کرتے۔ فتح مکہ کے دن جب ثنیہ علیا سے شہر میں داخل ہوئے تو متواضع تھے، پھر غسل فرما کر آٹھ رکعتیں پڑھیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ چاشت کی نماز تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ فتح کی نماز تھی، اس لیے امیر و امام کے لیے مستحب ہے کہ جب کوئی شہر فتح کرے تو شہر میں داخل ہو کر سب سے پہلے آٹھ رکعت نماز پڑھے۔ جس طرح سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کیا کہ جب وہ ایوانِ کسریٰ میں پہنچے تو آٹھ رکعت نماز پڑھی۔ صحیح یہ ہے کہ اس نماز کو دو دو رکعت کر کے پڑھے۔ کسی نے کہا ہے کہ ساری نماز کے بعد ایک ہی سلام پھیرے۔ واللہ أعلم۔[1]

امام بخاری نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ بنی اسرائیل سے یہ کہا گیا تھا کہ تم دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے ''حِطَّةٌ'' کہتے ہوئے داخل ہو جاؤ۔ یہ چوتڑ کے بل گھسٹتے ہوئے گھسے اور ''حَبَّةٌ فِيْ شَعْرَةٍ'' کہا۔[2] دوسری روایت میں ''حَبَّةٌ'' کے بجائے ''حِنْطَةٌ'' آیا ہے۔ اس کو ابن اسحاق رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔[3] تیسری روایت میں ''حِنْطَةٌ حَمْرَاءُ فِيْهَا شَعِيْرَةٌ'' آیا ہے۔ یہ براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ان کے الفاظ یہ تھے: ''هطا سمعاتا ازبة مزبا'' اس کا عربی میں ترجمہ یہ ہے: ''حَبَّةُ حِنْطَةٍ حَمْرَاءُ مَثْقُوْبَةٌ فِيْهَا شَعْرَةٌ سَوْدَاءُ''[4]

الغرض مفسرین کے اقوال کا حاصل یہ ہے کہ اللہ نے جس بات کا انھیں حکم دیا تھا کہ اپنے قول و فعل میں خاکساری کا اظہار کریں، ''حِطَّةٌ'' کہیں، یعنی ہمارے گناہوں کو دور کر دو۔ انھوں نے وہ تو کیا نہیں، البتہ ''حِطَّةٌ''

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۳۳) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۲۲۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳۰۱۵)
[3] تفسیر الطبري (۲/ ۱۱۲۔ ۱۱۳) [4] تفسیر الطبري (۲/ ۱۱۴) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۳۴) اس کی سند حسن ہے۔

کی جگہ بطور تمسخر ''حِنۡطَةٌ''، وغیرہ کہا اور سجدے کے بجائے سرین کے بل اندر گھسے۔ یہ انتہائی مخالفت، معاندت اور بے ادبی تھی، اسی لیے اللہ نے ان پر اپنا عذاب اتارا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ فَاَنۡزَلۡنَا عَلَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا رِجۡزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ﴾ [البقرة: ٥٩] ''پھر ہم نے ان ظالم لوگوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا، اس وجہ سے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔'' معلوم ہوا کہ فسق عذاب کے نزول کا سبب ہے۔

رجز کا معنی:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں لفظِ رجز آیا ہے، اس سے مراد عذاب ہے۔[1] یہی بات مجاہد، ابو مالک اور سدی رحمہم اللہ نے بھی کہی ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رجز غضب کے معنی میں ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رجز طاعون ہے۔ سعد، اسامہ اور خزیمہ رضی اللہ عنہم کی حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ طاعون رجز ہے۔ یہ عذاب تھا، جو اللہ نے تم سے پہلے لوگوں پر اتارا تھا۔[2] (رواه ابن أبي حاتم والنسائي) سیدنا اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے دوسری روایت میں مرفوعاً مروی ہے کہ یہ درد و بیماری رجز ہے اور تم سے پہلے بعض اُمتوں پر یہ عذاب آیا تھا۔[3] (رواه ابن جرير)

منصوص الفاظ کو بدلنا جائز نہیں:

ماہر اہلِ علم کہتے ہیں کہ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ ان اقوال کو بدلنا جائز نہیں، جن پر نص موجود ہو، بلکہ ان کی بعینہٖ اتباع لازم ہوتی ہے۔ رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ توقیفی اذکار و اقوال کو بدلنا جائز نہیں۔[4] مَیں کہتا ہوں کہ اُمت نے جب سے مسائل و احکام میں نبوی الفاظ اور قرآنی عبارات کو چھوڑ کر اپنے یا لوگوں کے الفاظ اپنا کر تحریری یا زبانی فتوے صادر کرنا شروع کیے ہیں، اس وقت سے اہلِ اسلام کے درمیان اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔ اگر لوگ کتاب و سنت کے الفاظ کی حفاظت کرتے تو تقلید، اتباع اور رائے وغیرہ کی خرابی پیش نہ آتی۔ غزالی نے ''إحياء العلوم'' میں ایسے کئی الفاظ کی نشاندہی کی ہے، جن کے معنی اسلاف نے کچھ لیے تھے، پھر بعد والوں کی اصطلاح میں ان الفاظ کے معنی بدل گئے۔[5] انھی جملہ الفاظ میں ایک ''فقہ'' کا لفظ بھی ہے۔ پہلے زمانے میں فقیہ اس کو کہتے تھے جو دنیا میں زاہد اور آخرت میں راغب ہوتا، لیکن اب فقیہ وہ شخص ہے جس کو خرید و فروخت، نکاح، اجارہ وغیرہ کے مسائل معلوم ہوں اور کتبِ فروع سے ایسے مسئلے نکال کر بتا سکے۔

---

[1] تفسير الطبري (٢/ ١١٨) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٢٠) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔
[2] سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٣٦٢) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٢٠) اس کی سند صحیح ہے۔
[3] تفسير الطبري (٢/ ١١٦) اس کی سند صحیح ہے۔ [4] تفسير الرازي (٣/ ٨٦)
[5] إحياء علوم الدين (١/ ٣١۔ ٣٨)

فسق و فجور باعثِ عذاب ہے:

بہرحال اللہ تعالیٰ نے بات بدلنے والوں کو ظالم و فاسق کہا اور ان پر عذاب اُتارا۔ معلوم ہوا کہ فسق عذاب آنے کا سبب بنتا ہے۔ اب بھی یہی دیکھا گیا ہے کہ جب کسی شہر اور بستی میں فسق و فجور کی کثرت ہو جاتی ہے تو وہاں کوئی وبا آتی ہے، جو سیکڑوں ہزاروں کو برباد کر جاتی ہے۔ یہ وبا رجز ہے۔ کسی جگہ قحط پڑتا ہے۔ کسی جگہ زلزلہ آتا ہے۔ کہیں زمین میں دھنسایا جاتا اور کہیں شکلیں مسخ ہوتی ہیں۔ کسی جگہ سیلاب وطوفان تباہی لاتا ہے اور کسی جگہ طاعون ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل پر جو رجز اترا تھا، اس میں ایک ساعت میں ستر ہزار لوگ مر گئے تھے۔ یہ اس وبا کے علاوہ تھی، جو ان پر تیہ میں نازل ہو چکی تھی۔ سورۃ الاعراف میں ﴿ يَفْسُقُوْنَ ﴾ کے بجائے ﴿ يَظْلِمُوْنَ ﴾ فرمایا ہے۔ معلوم ہوا ان میں یہ دونوں صفتیں موجود تھیں۔

وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝۶۰

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے کہا: اپنی لاٹھی پتھر پر مار، چناں چہ اس (پتھر) سے بہہ نکلے بارہ چشمے، ہر قبیلے نے اپنا اپنا گھاٹ پہچان لیا۔ (ہم نے کہا:) کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق سے اور تم زمین میں فساد کرتے ہوئے نہ پھرو ⑥⓪

بارہ چشموں کا پھوٹنا:

اسی جنگل میں جہاں وہ حیران و پریشان پڑے پھرتے تھے، پانی نہ ملا تو ایک پتھر سے بارہ چشمے نکلے۔ وہ لوگ بارہ قومیں تھے۔ کسی میں زیادہ لوگ تھے، کسی میں کم۔ ہر قوم کے لیے ایک چشمہ تھا، اس نے اس کو پہچان لیا۔ جب لشکر کوچ کرتا تو وہ پتھر ساتھ اٹھا لیتے اور جب کہیں قیام کرتے تو رکھ دیتے۔ کہتے ہیں کہ یہ کئی گز ایک لمبا نرم پتھر تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ آدمی یا گائے کے سر کے برابر تھا یا جنت کا پتھر تھا اور وہ دس گز لمبا موسیٰ علیہ السلام کے قد کے برابر تھا۔ اس کے دو حصے تھے، جو رات کو چمک کر مشعل کا کام دیتے تھے۔ وہ پتھر گدھے یا گائے پر لادا جاتا تھا اور کسی نے کہا ہے کہ وہ پتھر آدم علیہ السلام کے ساتھ آیا اور شعیب علیہ السلام کو ورثے میں ملا تھا، انھوں نے عصا کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو دیا تھا یا یہ وہ پتھر تھا، جو موسیٰ علیہ السلام کے کپڑے لے کر بھاگا تھا۔ جبریل علیہ السلام نے ان سے کہا: تم اس پتھر کو اُٹھا لو، اس میں اللہ کی قدرت اور تمھارے لیے معجزہ ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ پتھر چوکور تھا۔ ہر جانب سے تین تین چشمے

بہتے۔ یہ امام نسائی ؒ کی روایت کردہ حدیث الفتون میں مذکور ہے۔[1]

حافظ ابن کثیر ؒ کہتے ہیں کہ یہ قصہ سورۃ الاعراف کے مشابہ ہے، فرق صرف یہ ہے کہ وہ مکی ہے اور یہ مدنی، اس لیے وہاں ضمیر غائب کی ہے اور یہاں حاضر کی۔ وہاں ﴿ فَانْۢبَجَسَتْ ﴾ فرمایا تھا، یعنی پہلا بہاؤ اور یہاں ﴿ فَانْفَجَرَتْ ﴾ کہا ہے، یعنی پچھلا بہاؤ۔ ان دونوں سیاق میں دس فرق ہیں۔ جن کا ذکر کشاف میں کیا گیا ہے۔[2] لیکن وہ سب قریب المعنی ہیں۔ بہر حال اس آیت میں ان کو زمین میں فساد کرنے سے منع کیا تھا، ان کو ظالم و فاسق کہا تھا اور اب گویا مفسد بھی ٹھہرایا۔ جو لوگ مفسد نہیں ہیں، ان کے لیے آخرت کا وعدہ کیا ہے: ﴿ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ [القصص: ۸۳] ''وہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں نہ بڑائی چاہتے ہیں اور نہ فساد، اور (اچھا) انجام تو پرہیز گاروں ہی کے لیے ہے۔'' جس کسی شخص میں ظلم، فسق اور فساد جمع ہو تو سمجھو کہ وہ بنی اسرائیل جیسا ہے، اس کا انجام بھی انھیں جیسا ہوگا۔ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا.

عصائے موسیٰ علیہ السلام:

یہ عصا جس سے پتھر کو مارا تھا، اس درخت کا تھا جو آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت سے آیا تھا۔ وہ موسیٰ علیہ السلام کے قد کے برابر، یعنی دس گز کا تھا، اس کا نام عمیق یا نبغہ تھا۔

وہ بارہ قومیں، جن کے لیے بارہ چشمے نکلے تھے، چھ لاکھ آدمی تھے، جن کا پڑاؤ بارہ کوس میں ہوتا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کا یہ ایک بڑا معجزہ تھا کہ ایک چھوٹے سے پتھر سے اپنے اتنے بڑے مجمعے کو سیراب کرتے تھے، مگر ہمارے رسول ﷺ کا معجزہ اس سے بھی بڑھ کر تھا۔ آپ ﷺ کی دو انگلیوں کے درمیان سے اتنا پانی نکلا کہ ایک جم غفیر نے پیا۔[3] پتھر سے پانی نکلنا تو کچھ بعید نہیں، گوشت اور خون کے درمیان سے نکلنا کرامتِ عظمیٰ ہے۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّاۗىِٕهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۭ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ ۭ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۭ

اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ایک ہی کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے، لہٰذا ہمارے لیے

[1] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٩٦) یہ ایک طویل روایت ہے کہ جو اس آیت ﴿ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ﴾ [طٰهٰ: ٤٠] کی تفسیر میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ حافظ ابن حجر ؒ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: فتح الباري (٧/ ٢٣٨)

[2] تفسیر ابن کثیر (١/ ١٣٦) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٧٩)

اپنے رب سے دعا مانگ کہ وہ ہمارے لیے وہ چیزیں نکال دے جو زمین اُگاتی ہے، (یعنی) اس کی ترکاری، ککڑی، گندم، مسور اور پیاز۔ موسیٰ نے کہا: کیا تم کمتر چیز لینا چاہتے ہو بدلے اس چیز کے جو بہتر ہے؟ اُترو کسی شہر میں، تو بے شک وہاں تمھارے لیے وہی کچھ ہے جس کا تم نے سوال کیا۔

من وسلویٰ کے مقابلے میں حقیر خوراک کا مطالبہ:

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے پہلی عیش وعشرت یاد کی اور وہ قوم انھی چیزوں والی تھی۔[1] ایک کھانا اس لیے کہا کہ ہر دن وہی تھا، اگرچہ وہ من وسلویٰ تھا۔ ''فوم'' کو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ''ثوم'' پڑھا ہے۔[2] ''ثوم'' لہسن کو کہتے ہیں۔ سلف کی ایک جماعت بھی اسی طرف گئی ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور حسن رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے۔[3] اگرچہ حرف بدل گیا ہے، بجائے ''ثا'' کے ''فا'' استعمال ہوا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''فوم'' گیہوں کو کہتے ہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ بنی ہاشم کی زبان میں ''حنطہ'' کو ''فوم'' کہتے ہیں۔[4] مجاہد اور عطاء رحمہما اللہ کے نزدیک فوم سے مراد روٹی ہے۔[5] قدیم لغت میں ''فَوِّمُوْا'' بمعنی ''اِخْتَبِزُوْا'' (روٹی بنائی) آیا ہے۔

جوہری نے بھی فوم کا ترجمہ ''حِنْطَةٌ'' کیا ہے۔[6] ابن درید نے اسے سنبلہ ٹھہرایا ہے، یعنی گیہوں کی بالی جس میں دانے ہوں۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس دانے کی روٹی ہوگی، وہی فوم ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ لغتِ شامیہ میں فوم چنے کو کہتے ہیں، نخود فروش (چنے بیچنے والے) کو فومی کے بجائے فامی کہتے ہیں۔[7] امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جتنے کھانے والے دانے ہوتے ہیں، وہ سب فوم ہیں۔[8] جس روئیدگی کی بیل نہ چلے، اس کو ساگ کہتے ہیں۔

کشاف میں ہے کہ جو سبزہ زمین سے اُگتا ہے، اسے بقل کہتے ہیں، ان کی مراد اچھے پاکیزہ ساگ تھے، جنھیں لوگ کھاتے ہیں، جیسے: پودینہ، کرفس (اجوائن خراسانی) کراث (گندنا) وغیرہ۔[9] یہ چیزیں اس لیے مانگیں کہ شہوت کو قوت ملے یا اس لیے کہ جنگل میں پڑے پڑے اُکتا گئے تھے اور اس بہانے سے شہر جانا چاہا، لیکن پہلی بات بہتر ہے۔

یہ جو فرمایا کہ شہر کو جاؤ تو یہ ان کی ذلت اور عاجزی ظاہر کرنے کے لیے تھا، کیوں کہ جنگل میں تمام راہوں کے بند ہونے کی وجہ سے وہ کسی شہر میں جا نہیں سکتے تھے۔ اگر راستہ پاتے تو چالیس سال تیہ میں حیران و پریشان رہ کر بسر

---

① تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٢٣_ ١٢٤) ② تفسیر الطبري (٢/ ١٣٠) تفسیر القرطبي (١/ ٤٢٥)

③ تفسیر الطبري (٢/ ١٢٩) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٢٣)

④ تفسیر الطبري (٢/ ١٢٨_ ١٢٩) اس کی سند میں ''رشدین بن کریب'' ضعیف راوی ہے۔

⑤ تفسیر الطبري (٢/ ١٢٧) ⑥ الصحاح للجوهري (٦/ ٢٨٢)

⑦ تفسیر القرطبي (١/ ٤٢٥_ ٤٢٦) ⑧ صحیح البخاري (٤/ ١٦٢٤) ⑨ تفسیر الکشاف (١/ ١٧٤)

نہ کرتے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اچھی چیز کو چھوڑ کر کم تر چیز لینا، حماقت اور جہالت کی دلیل ہے اور ایسی ادلا بدلی کا انجام نقصان اور خسارہ ہوتا ہے۔ کتاب و سنت بالکل خیر ہیں اور رائے و قیاس ادنیٰ ہیں۔ جو لوگ اس ادنیٰ کو لیتے ہیں اور خیر کو چھوڑتے ہیں، وہ بلندی سے پستی کی طرف آتے ہیں، یہ کمینے اور بے خیر ہیں۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۚ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۟﴿۶۱﴾

اور ان پر ذلت اور محتاجی مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹے۔ یہ اس لیے ہوا کہ بے شک وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور قتل کرتے تھے نبیوں کو ناحق، یہ اس سبب سے کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے بڑھ جانے والے تھے ﴿61﴾

ذلت و محتاجی یہود کا مقدر ہے:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ذلت و محتاجی شرعاً و قدراً ان کے گلے کا ہار ہوگئی تھی۔ جس نے انھیں دیکھا، ذلیل و خوار کیا۔ وہ خود بھی ذلیل و محتاج تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ اصحاب قبالات ہیں، یعنی جزیہ دینے والے،[1] یہی ان کی ذلت اور مسکینی ہے۔ حسن و قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں خوار کر دیا، چنانچہ ان کی قوت باقی نہ رہی اور وہ مسلمانوں کے ہاتھ سے پامال ہوئے۔ جب اس اُمت نے انھیں پایا تو وہ مجوس کے جزیہ گزار تھے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مسکنت سے مراد فاقہ کشی ہے اور عطیہ عوفی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خراج ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جزیہ مراد ہے۔[2]

امام شوکانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جو خبر اللہ پاک نے دی، وہ سب زمانوں میں برابر معلوم ہوئی۔ یہودیوں سے زیادہ ذلیل و خوار، محتاج و فقیر کوئی فرقہ نہیں ہے۔ ان کو کبھی شان و شوکت اور جمعیت نہ ملی۔ ہر زمانے میں وہ جہاں کہیں رہے، غلاموں کی طرح رہے۔ ان میں سے اگر کوئی اتفاقاً مال دار بھی ہوتا ہے تو وہ محتاجی اور فقیری ظاہر کرتا ہے، تاکہ کوئی اس کے مال کو لالچ کی نظر سے نہ دیکھے، خواہ ایسے کہ ان پر جزیہ بڑھا دے یا ایسے کہ ظلم سے ان کا مال چھین لے۔[3]

غرض کہ تمام قوموں میں ان سے بڑھ کر نہ کوئی ذلیل ہے نہ مال کا حریص، گویا سب کے سب فقیر اور گدا ہیں، اگرچہ آسودہ حال ہی کیوں نہ ہوں۔ ضحاک رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ اللہ کے غصے میں گرفتار ہونے کا مطلب یہ

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۲٤) اس کی سند میں ''محمد بن قاسم اسدی'' ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۲٤۔ ۱۲۵) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۳۷۔ ۱۳۸) [3] فتح القدیر (۱/ ۲۰۲)

ہے کہ وہ اللہ کے غصے کے مستحق ٹھہر چکے ہیں۔[1] ناراضی کے لائق بن گئے ہیں۔ ان کی یہ سزا و جزا اس لیے ہوئی کہ انھوں نے حق کی پیروی سے تکبر کیا اور اللہ کی آیتوں کا انکار کیا، انبیا علیہم السلام اور ان کے متبعین کو ذلیل و خوار کیا، یہاں تک کہ ان کو قتل کر دیا۔ اس سے بڑھ کر اور کفر کیا ہوگا؟

تکبر کی تعریف:

حدیث میں مروی ہے کہ کبر کہتے ہیں حق کو تسلیم نہ کرنا اور لوگوں کو حقیر جاننا۔[2] یعنی اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو کم تر یا ذلیل سمجھنا اور حق باتوں کو نہ ماننا، اسی لیے جب بنی اسرائیل سے یہ کام ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا عذاب اُتارا اور دنیا میں ان کو ذلت اور بے اعتباری کا لباس پہنا دیا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل ایک ایک دن میں اول وقت میں تین تین سو انبیا کو قتل کرتے تھے اور تیسرے پہر کو سبزی وغیرہ کا بازار لگاتے، لین دین کرتے۔[3] شعیب، زکریا اور یحییٰ علیہم السلام کو انھی نے قتل کیا تھا۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب میں وہ شخص ہوگا، جس کو کسی نبی نے قتل کیا ہو یا اس نے کسی نبی کو جان سے مارا ہو یا وہ گمراہی پھیلانے والوں کا سردار ہو، یعنی امامِ بدعت ہو یا مورت بنانے والا ہو۔[4] (رواه أحمد)

عصیان کا مطلب نافرمانی کا فعل ہے اور اعتدا حد سے بڑھ جانے کو کہتے ہیں۔ اس قوم میں یہ دونوں وصف موجود تھے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾

بے شک جو لوگ ایمان لائے، اور جو یہودی، عیسائی اور صابی (بے دین) ہوئے، ان میں سے جو بھی اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان لایا اور نیک عمل کیے تو ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، نہ تو انھیں کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے (62)

ایمان اور نیک عمل ہر دور میں مدارِ نجات رہا ہے:

یعنی یہ کسی خاص فرقے پر موقوف نہیں ہے، بلکہ ایمان لانا اور نیک عمل کرنا اپنے اپنے وقت پر شرط ہے۔ جس نے نیک کام کیا، اس نے ثواب پایا۔ یہ اس لیے فرمایا کہ بنی اسرائیل اس بات پر مغرور تھے کہ ہم پیغمبروں کی اولاد

---

[1] تفسير الطبري (٢/ ١٣٨)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩١)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٧٣٦) اس کی سند صحیح ہے۔
[4] مسند أحمد (١/ ٤٠٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٨١)

ہیں اور ہم ہر طرح اللہ کے نزدیک بہتر ہیں۔ یہود موسیٰ علیہ السلام کی اُمت کو کہتے ہیں اور نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کی اُمت کو۔ صابئین ایک فرقہ تھا، جو ابراہیم علیہ السلام کو مانتا تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب اللہ نے اس فرقے کا حال بیان کر دیا، جس نے اللہ کے حکم کے خلاف کام کیا، جرموں کا ارتکاب کیا، جس کام کی اجازت نہ تھی، وہ کرتا رہا اور حرمت والی چیزوں کی بے حرمتی کرتا رہا تو اب اس بات سے آگاہ فرمایا کہ گزشتہ اُمتوں میں، جس کسی نے اچھا کام کیا ہے، اس کو اچھا بدلہ ملے گا، یہی حکم قیامت قائم ہونے تک ہے، یعنی جو کوئی رسولِ نبی اُمّی کا متبع ہوگا، اس کے لیے ہمیشہ کی نیک بختی ہے نہ اس کو آیندہ کچھ ڈر ہے اور نہ اسے کسی چیز کے چلے جانے پر کچھ غم ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ [يونس: ٦٢] ''آگاہ رہو! بے شک اولیاء اللہ پر کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

فرشتے جب مومنوں پر حاضر ہوتے ہیں تو یہ کہتے ہیں، جو اس آیت میں مذکور ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴾ [حم السجدة: ٣٠] ''بلاشبہ جن لوگوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے (یہ کہتے ہوئے) اُترتے ہیں: نہ تم ڈرو اور نہ غم کھاؤ اور جنت سے خوش ہو جاؤ، جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔'' سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس دین والوں کا حال پوچھا، جن کے ساتھ میں تھا اور میں نے ان کی نماز اور عبادت کا ذکر کیا تو اس پر یہ آیت اُتری۔ (رواه ابن أبي حاتم)[1] سدی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے کہ یہ آیت سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے اَصحاب کے حق میں نازل ہوئی ہے۔[2]

مومن کی تعریف:

یہودیوں کا ایمان یہ تھا کہ تورات اور سنتِ موسیٰ پر چلنا چاہیے، لیکن جب عیسیٰ آئے تو جس نے تورات اور سنتِ موسیٰ کو چھوڑ کر عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی نہ کی، وہ ہلاک ہوگیا۔ نصاریٰ کا ایمان یہ تھا کہ انجیل اور شریعتِ عیسیٰ پر چلنا چاہیے، مگر جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے تو جس کسی نے انجیل اور شرعِ عیسوی کو چھوڑ کر آپ کا اتباع نہ کیا، وہ ہلاک ہوا۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اس آیت کے بعد یہ آیت اتری: ﴿ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [آل عمران: ٨٥] ''اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔''[3] معلوم ہوا کہ

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٢٦) اس کی سند میں انقطاع ہے۔

[2] تفسير الطبري (٢/ ١٥٠۔ ١٥٤) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٢٧)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٢٦) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحيح المسبور (١/ ٤٦۔ ٤٩)

کسی شخص سے کوئی عمل و طریقہ مقبول نہیں ہے، جب تک وہ شریعتِ محمد ﷺ کے مطابق نہ ہو، ہاں آپ کی بعثت سے پہلے جس نے اپنے زمانے کے رسول کی پیروی کی ہے، وہ ہدایت اور نجات کے راستے پر تھا۔[1]

اس آیت میں صرف اللہ اور یومِ آخر پر ایمان لانے کا ذکر ہے، رسول ﷺ کا ذکر نہیں ہے۔ کیوں کہ رسول ﷺ کی اتباع کے بغیر کوئی شخص بھی اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں لا سکتا۔ اللہ پر وہی آدمی ایمان لائے گا، جو پہلے رسول ﷺ پر ایمان لا چکا ہوگا۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ سے منافقین مراد ہیں، کیوں کہ ان کا ذکر تین فرقوں کے ساتھ کیا ہے، یعنی ظاہر میں وہ ایمان دار بنے ہیں۔ لیکن زیادہ بہتر یہی ہے کہ اس جگہ سچے مومن اور رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرنے والے مراد ہیں۔ گویا اللہ نے اس اُمتِ مسلمہ اور اگلی اُمتوں کا بیان فرمایا ہے کہ ان سب کا مرجع ایک ہی اَمر کی طرف ہے، یعنی اللہ اور آخرت پر ایمان لائیں اور عملِ صالح کریں۔

ایمان سے وہی مراد ہے جو حدیثِ جبریل علیہ السلام میں آیا ہے: «أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ» ''ایمان لائے تو اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اُس کے رسولوں، آخرت کے دن اور تقدیر کے اچھی اور بری ہونے کے ساتھ۔''[2] سو ایسا ایمان اسی کو ملتا ہے، جو ملتِ اسلامیہ میں داخل ہوتا ہے، کیوں کہ جو کوئی رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لایا، اور اس نے قرآن کو نہ مانا، وہ ہرگز مومن نہیں ہے اور جس نے ان دونوں کو مانا، وہ مسلمان ایمان دار ہوا، وہ نہ یہودی رہا نہ نصرانی اور نہ مجوسی۔

یہودی کی تعریف:

اولادِ یہود یہوذ بن یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو کہتے ہیں۔ ذال پھر دال ہوگئی یا یہ تہود سے مشتق ہے، اس کا معنی توبہ کرنا ہے، جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ﴾ [الأعراف: ١٥٦] ''بے شک ہم نے تیری ہی طرف رجوع کیا ہے۔'' یا تہود ہلنے کو کہتے ہیں۔ یہ تورات کی قراءت کے وقت ہلتے تھے، جس طرح لڑکے مکتب میں پڑھتے وقت ہلا کرتے ہیں، اس لیے یہ یہود کہلائے۔

عیسائی کی تعریف:

جب عیسیٰ علیہ السلام آئے تو ان پر ان کی اتباع واجب ہوئی، جنھوں نے ان کا دین قبول کیا وہ نصاریٰ کہلائے۔ ان کو انصار بھی کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ﴾ [آل عمران: ٥٢] ''حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے انصار ہیں۔'' یا اس لیے کہ وہ ناصرہ نامی گاؤں میں آ کر بسے تھے، پھر جب خاتم النبیین ﷺ سارے بنی آدم کے رسول ہو کر آئے تو ان پر ان کی تصدیق فرض ہوئی، جنھوں نے مان لیا، وہ سچے مومن کہلائے۔ امتِ محمدیہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ١٣٨۔ ١٣٩)
[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨)

کا نام مومنین ٹھہرا، کیوں کہ اس اُمت کا ایمان بہت کثرت سے ہے اور اُن کی تصدیق نہایت شدت سے ہے، اس لیے کہ یہ سارے پہلے نبیوں پر ایمان لائے ہیں اور آیندہ کے غیب کے حالات پر یقین رکھتے ہیں۔

صابی کی تعریف:

رہے صابئین تو مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ مجوس، یہود اور نصاریٰ کے درمیان ایک قوم تھی۔ ان کا کوئی دین نہیں تھا، یعنی وہ لا مذہب تھے۔[1] سلف کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ وہ اہلِ کتاب کا ایک فرقہ ہے جو زبور پڑھتا تھا۔ اسی لیے ابوحنیفہ اور اسحاق رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ ان کا ذبیحہ حلال ہے اور ان سے نکاح کرنا درست ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مجوس کی طرح تھے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ یہ فرشتوں کی پرستش کرتے تھے۔ امام زیاد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ قبلے کی طرف نمازِ پنج گانہ پڑھتے تھے۔ ابو الزناد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ قوم عراق سے متصل بستی کوثی میں آباد تھی۔ وہ سب نبیوں کو مانتے تھے، تیس روزے رکھتے تھے اور یمن کی طرف نمازِ پنج گانہ پڑھتے تھے۔ وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صابی وہ شخص ہے، جو موحد ہو نہ کافر اور نہ کسی شریعت پر چلے۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ایک دین ہے۔ یہ لوگ جزیرہ موصل میں آباد تھے۔ ''لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کہتے تھے۔ وہ نہ عمل کرتے، نہ کوئی کتاب رکھتے اور نہ نبی، فقط یہی کلمہ کہتے۔[2]

اسی لیے مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو صابئین کہہ دیا تھا، یعنی کلمہ کہنے میں صابئین کے مشابہ ہیں۔ خلیل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ایک قوم تھی، جس کا دین نصاریٰ کے دین سے ملتا جلتا تھا، مگر ان کا قبلہ بادِ جنوب کی طرف ہے۔ ان کو یہ زعم ہے کہ وہ نوح علیہ السلام کے دین پر ہیں۔ مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ ان کا دین یہود اور مجوس سے مل کر بنا ہے، اس لیے ان کا ذبیحہ درست نہیں ہے اور ان سے نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حاصل یہ ٹھہرا کہ وہ موحد تھے، مگر ستاروں کی تاثیر کے قائل اور ستاروں کو فاعل مانتے تھے۔ اسی لیے ابوسعید اصطخری رحمہ اللہ نے خلیفہ قادر باللہ کے جواب میں ان کے کفر کا فتویٰ دیا تھا۔[3]

رازی کا مذہب یہ ہے کہ وہ ایک ستارہ پرست قوم تھی۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ نے ستاروں کو عبادت اور دعا کا قبلہ ٹھہرایا ہے یا ان کو اس عالم کا اختیار سونپا ہے، پھر کہا ہے کہ یہی قول کلدانیوں کی طرف منسوب ہے، جن کے رد و ابطال کے لیے ابراہیم علیہ السلام تشریف لائے تھے۔[4] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ ظاہر قول مجاہد اور ابن منبہ رحمہما اللہ وغیرہما کا ہے کہ وہ قوم نہ دینِ یہود و نصاریٰ پر تھی نہ مجوس و مشرکین کے مذہب پر، بلکہ اپنی فطرت پر تھی اور ان کا کوئی دین بھی نہ تھا، جس کی پیروی کرتے، اسی لیے مشرک لوگ مسلمانوں کو صابی کہتے تھے، یعنی اہلِ ارض کے تمام دینوں سے باہر ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٢٧)
[2] تفسیر الطبري (٢/ ١٤٧) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٢٨) تفسیر ابن کثیر (١/ ١٠٤)
[3] تفسیر القرطبي (١/ ٤٣٤۔ ٤٣٥)
[4] تفسیر الرازي (٣/ ٩٨)

ہم طرزِ جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

بعض علمانے یہ بھی کہا ہے کہ صابئین سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو کسی نبی کی دعوت نہیں پہنچی۔ واللہ أعلم۔[1]

کسی نے کہا ہے کہ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ صابی بن شیث بن آدم کے دین پر ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کتاب "الرد علی المنطقیین" میں لکھا ہے کہ شہرِ حران پہلے صابئین کا مسکن تھا اور یہ جگہ اسی قوم کی منڈی تھی۔ ابراہیم علیہ السلام اسی جگہ پیدا ہوئے تھے یا عراق سے چل کر یہاں آئے تھے۔ یہاں بہت سے ستاروں کی مورتیں تھیں، مثلاً: زحل، مشتری، زہرہ، عطارد، قمر، بلکہ علتِ اولیٰ، عقلِ اول اور نفسِ کلیہ کی بھی شبیہ بنائی ہوئی تھی۔ ان کا یہ دین نصرانیت کے ظہور سے پہلے تھا، پھر ان میں نصرانیت آگئی، جبکہ کچھ صابی ہی بنے رہے۔ اتنے میں اسلام آگیا۔ یہ صابیہ وفلاسفہ دولتِ اسلام میں بھی آخر وقت تک باقی رہے۔ بغداد میں طبابت وکتابت کا پیشہ کیا کرتے تھے۔ فارابی جب ۴۰۰ھ میں حران میں آیا تو اس نے یہیں کے فلسفیوں سے علم سیکھا تھا، اسی طرح دمشق والے بھی دینِ نصرانیت کے ظہور سے پہلے صابی تھے اور قطبِ شمالی کی طرف نماز پڑھتے تھے۔ دمشق کی قدیم مساجد کا قبلہ اسی قطب کی طرف ہے۔ اس قوم کا ایک بڑا عبادت خانہ جامع دمشق کے نیچے تھا۔ یہ دو قسم کے ہیں: ایک حنیف موحد، دوسرے مشرک۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں پہلی ہی قسم کی تعریف فرمائی ہے۔

یہ نسخ وتبدیلی سے پہلے تورات پر چلتے تھے، پھر انجیل پر چلے اور جو اُن سے بھی پہلے تھے، وہ ملتِ ابراہیمی کے تابع تھے۔ مجوس ومشرک ان کے خلاف ہیں، کیوں کہ ان میں کوئی مومن نہیں ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴾ [الحج: ١٧] ''بے شک جو لوگ ایمان لائے، اور جو یہودی ہوئے، اور صابی (بے دین) اور نصاریٰ اور مجوسی اور وہ لوگ جنھوں نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، بے شک اللہ ان کے مابین یومِ قیامت فیصلہ کرے گا، یقیناً اللہ ہر شے پر شاہد ہے۔''

اس جگہ چھے ملتوں کا ذکر فرما کر یہ ارشاد فرمایا کہ ان کا فیصلہ اس دن ہم کریں گے، ان میں کسی مومن کا ذکر نہیں کیا۔ پھر یہ صابئہ مشرک ہوگئے۔ فلاسفہ انھی مشرکین میں سے ہیں۔ ہاں پہلے فلسفی جو موحد اور تمام جہانوں کو پیدا کرنے اور آخرت کو مقرر کرنے والی ہستی کے قائل تھے، وہ ان صابئین میں سے تھے جو حنیف تھے اور جن کی اللہ نے تعریف کی ہے۔

رہے صابئہ مشرکین تو یہ بھی مشرکینِ عرب کی طرح دنیا کے خاتمے کا عقیدہ رکھنے والے تھے، جس طرح مشرکینِ ہند بھی اسی کے قائل ہیں۔ اہلِ مقالات (فرقوں پر لکھنے والے) نے ذکر کیا ہے کہ سب سے پہلے ان مشرکین کے علاوہ فلاسفہ میں سے جو شخص قِدَمِ عالَم (جہاں کا قدیم وازلی ہونا) کا قائل ہوا وہ ارسطو ہے۔[2]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ١٤٠) [2] الرد علی المنطقیین (١/ ٢٨٧۔ ٢٨٩)

رہے اسلام کے فلسفی، جیسے ابن سینا وغیرہ تو ان کا حال بھی مشرک صابئین جیسا تھا۔ ان کے علوم بھی اسی مذموم قوم سے ماخوذ ہیں۔ اسی لیے علمائے اسلام نے ان کو ملحدین میں شمار کیا ہے۔ اس زمانہ آخر میں جو قیامتِ کبریٰ کے نزدیک معلوم ہوتا ہے۔ سرزمینِ ہند میں دہریت کا بڑا زور شور ہے۔ یہ دعویٰ اسلام کا کرتے ہیں، مگر در پردہ اسلام کی بیخ کنی کرتے ہیں۔ أَقْمَاهُمُ اللّٰهُ تَعَالٰی۔ اللہ تعالیٰ انھیں نیست و نابود کر دے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾

اور جب ہم نے تم سے پختہ وعدہ لیا اور تم پر طور پہاڑ کو بلند کیا (اور کہا:) ہم نے تمھیں جو دیا ہے اسے قوت سے پکڑ لو، اور جو کچھ اس (کتاب) میں ہے اسے یاد رکھو، تا کہ تم متقی بن جاؤ (63) پھر اس کے بعد تم پھر گئے، تو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم ضرور خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاتے (64)

یہود سے وعدہ لینا، ان پر طور کو بلند کرنا اور ان کا پھر جانا:

جب تورات اُتری تو یہ کہنے لگے کہ ہم سے اتنے حکموں پر عمل نہیں ہوگا، تب پہاڑ اوپر آیا، گویا گر پڑے گا تو انھوں نے ڈر کر اسے قبول کیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ ﴾ [الأعراف: ۱۷۱] ”اور جب ہم نے ان (کے سروں) پر پہاڑ اُٹھا کھڑا کیا گویا وہ ایک سائبان تھا اور انھوں نے خیال کیا کہ یقیناً وہ ان پر گرنے والا ہے۔ (ہم نے کہا:) اس (تورات) کو جو ہم نے تمھیں دی، قوت کے ساتھ پکڑو اور جو کچھ اس میں ہے اس کو یاد رکھو، تا کہ تم (برے کاموں سے) بچ جاؤ۔“

طور پہاڑ کو کہتے ہیں۔ سورۃ الاعراف میں یہی تفسیر کی گئی ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کی ایک جماعت بھی اسی طرف گئی ہے اور ظاہر میں بھی یہی معنی ہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں، جو پہاڑ کچھ اُگاتا ہو، وہ طور ہے اور جو نہیں اُگاتا، وہ طور نہیں ہے۔[1] طور اس پہاڑ کا بھی نام ہے جس پر موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا تھا اور ان پر تورات اُتری تھی۔ یہ اس پہاڑ کے نیچے آ گئے تھے اور وہ ان کے اوپر ہو گیا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ سریانی زبان میں طور ہر پہاڑ کو کہتے ہیں۔ جو پہاڑ ان کے سر پر اونچا کیا گیا تھا، وہ فلسطین کے پہاڑوں میں سے ایک تھا۔

[1] تفسیر الطبري (۲/ ۱۵۹) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۲۹) اس کی سند میں ”بشر بن عمارہ“ ضعیف راوی ہے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث الفتون میں آیا ہے کہ جب انھوں نے اطاعت نہ کی تو ان پر پہاڑ لایا گیا تھا، تاکہ وہ سنیں اور مانیں۔[1] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھیں حکم ہوا تھا کہ سجدہ کرو۔ جب نہ مانے تو پہاڑ لایا گیا اور وہ اس کو دیکھ کر بدحواس ہو کر سجدے میں گر پڑے، لیکن ایک جانب سے پہاڑ کو دیکھتے جاتے تھے کہ کہیں گر نہ پڑے۔ اللہ نے رحم کیا اور پہاڑ ہٹا لیا۔ انھوں نے کہا کہ سب سے زیادہ محبوب یہی سجدہ ہے، جس کی وجہ سے عذاب دور ہو گیا، اسی لیے اب تک وہ اسی طرح سجدہ کرتے ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿مَآ اٰتَيْنٰكُمْ﴾ سے مراد تورات ہے، یعنی اس کو پکڑے رہو۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قوت سے مراد اطاعت ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عمل کرنا مراد ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد کوشش اور طاقت ہے۔[2]

یاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اس میں لکھا ہے، اس کو پڑھو، سمجھو اور اس پر چلو۔ لیکن وہ ایسے مضبوط عہد کے بعد اپنے اقرار سے پھر گئے اور انھوں نے عہد کو توڑ ڈالا، مگر اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور نبی و رسول بھیجے۔ ورنہ وہ دنیا و آخرت دونوں برباد کر چکے تھے۔ بعض علما نے کہا ہے کہ اگر وہ پہلی بار مان لیتے تو اس عہد و پیمان کی ضرورت نہ ہوتی۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سجدے کے وقت اللہ نے ان کے دلوں میں ایمان پیدا کر دیا تھا۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ زبردستی ایمان لائے ہوں اور دل مطمئن نہ ہوا ہو۔[3] امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ تقریر مصنوعی ہے، جو مذہبی قواعد کی پابندی سے کی گئی ہے، ورنہ ہر عقل مند شخص جانتا ہے کہ اس سے زیادہ زبردستی اور کیا ہوگی کہ ایک پہاڑ سر پر لا کر دھر دیا جائے کہ مانتے ہو تو مانو، ورنہ یہ تم پر گرتا ہے۔[4] بلکہ بعض مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ سامنے سے آگ آئی اور پیچھے سے دریا آیا، جبکہ ان کے اوپر پہاڑ تھا۔

قولی ایمان کا اعتبار:

غرض کہ ہمارا تو یہ قول ہے کہ بے شک اللہ نے ان کو مجبور کیا اور وہ زبردستی ایمان لائے۔ اسی ایمان کی بنا پر اللہ نے ان سے عذاب دور کر دیا۔ یہ ویسی ہی بات ہے کہ ہماری شریعت میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جب کوئی منہ سے کلمۂ اسلام کہہ لے تو اب اس پر تلوار نہ چلاؤ، ہاتھ کھینچ لو، جہاں تک ہاتھ بلند ہوا ہو، اس کو وہیں تک روک لو۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک شخص نے اسی طرح ایک شخص کو کلمہ پڑھنے کے بعد مار ڈالا تھا۔ جب اس نے یہ عذر پیش کیا کہ اس نے تقیہ سے کلمہ کہا ہے اور پکے ارادے سے نہیں کہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تو نے اس کے دل کو چیر کر دیکھ لیا ہے۔ مجھ کو یہ حکم نہیں ہے کہ میں لوگوں کے دلوں کو پھاڑ کر دیکھوں۔[5]

---

[1] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٩٦) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسير الطبري (٢/ ١٥٩۔ ١٦١) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٣٠)
[3] المحرر الوجيز (١/ ١٣٨) [4] فتح القدير (١/ ٢٠٦) [5] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٦، ١٠٦٤)

رہی یہ بات کہ ﴿لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ﴾ [البقرة: ٢٥٦] ''دین میں کوئی زبردستی نہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان کہ ﴿اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ﴾ [یونس: ٩٩] ''پھر کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے۔'' تو یہ معاملہ جنگ کے حکم سے پہلے کا تھا، پھر منسوخ ہوگیا۔ حدیث میں آیا ہے کہ میں نے تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑی ہیں، جب تک تم ان کو پکڑے رہو گے، ہرگز گمراہ نہ ہوگے: ایک کتاب اللہ اور دوسری میری سنت۔ یہ حدیث مشکات میں ہے۔[1]

تقلید کی مذمت:

اسی طرح اور بہت سی حدیثوں میں تمسک بالقرآن والحدیث کی ترغیب، بلکہ ان کے اتباع کی وصیت فرمائی گئی ہے اور یہ ارشاد کیا گیا ہے کہ ان کو اپنے دانتوں سے مضبوط پکڑے رہو۔ قرآن پاک میں اہلِ علم سے اس بات کا عہد لیا گیا ہے کہ تم قرآن کے احکام کو بیان کرو، سو جس طرح بنی اسرائیل تورات کو پکڑنے اور اس پر عمل کرنے کے قول و قرار سے پھر گئے، اسی طرح ایک مدت سے ان کا طریقہ اس امت نے بھی اختیار کر لیا ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہے کہ جیسا فرمایا تھا، ویسا ہی ہوا، یعنی ارشاد فرمایا تھا کہ تم اگلی اُمتوں کی چال پر چلو گے: «شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ»[2] ''بالشت برابر بالشت کے اور ہاتھ برابر ہاتھ کے۔''

سو دراصل تقلید یہودیوں کا طریقہ ہے۔ اس آخری امت میں یہ تقلید ایسی آ گھسی ہے کہ مہدی اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے پہلے اس کا دور ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ جب سے اس اُمتِ اسلامیہ نے رائے کی تقلید اور عوام کی قیاس پسند کر لی ہے، تب سے تیرے میرے کہنے سننے پر قناعت کر کے بیٹھ رہے ہیں۔ قرآن کا پڑھنا، حدیث کا سمجھنا، کتاب پر چلنا اور سنت پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ تب ہی سے اسلام اجنبی ہوگیا ہے۔ مسلمانوں پر برا وقت آ گیا ہے اور یہودیوں کی طرح ذلیل و محتاج ہوگئے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ...!

اب ان کی بھی یہی حالت ہوگئی ہے کہ جب تک بنی اسرائیل کے پہاڑ کی طرح کسی امام مہدی ہادی یا نبی برحق کا کوڑا ان کو نہ لگے گا، تب تک یہ بھی اپنے عہد پر نہ چلیں گے۔ سیرتِ مہدی میں آیا ہے کہ وہ سنت کو زندہ اور بدعت کو مردہ کریں گے۔ تقلید کو اُٹھا دیں گے اور سب کو کتاب و سنت پر چلا دیں گے۔ پس جب کبھی ان مقلدین اور مبتدعین کے سر پر ان کی تلوار چمکے گی، تب کہیں یہ بھی یہودیوں کی طرح توبہ کریں گے اور راہِ راست پر آئیں گے۔ ابھی تو بنی اسرائیل کی طرح اپنی جہالت، حماقت، ضد اور عناد پر جمے ہوئے ہیں۔ یہ اہلِ حق کا رد کرتے ہیں، حق کو جھٹلاتے اور باطل پرستی پر مستعد ہیں، مگر یہ ظالم بہت جلد جان جائیں گے کہ کون سا پلٹنے والا پلٹتا ہے، یہ لوگ یا اہلِ حق...!

---

[1] مشكاة المصابيح (١/ ٤٠) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٦٩)

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝۶۵ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۶۶

اور یقیناً تمھیں ان لوگوں کا علم ہے جنھوں نے تم میں سے ہفتے (کے دن) میں زیادتی کی، تو ہم نے ان سے کہا: تم ذلیل بندر بن جاؤ۝65 پھر ہم نے اس (واقعے) کو ان کے لیے عبرت بنا دیا جو اس زمانے میں تھے اور جو اس کے بعد آنے والے تھے اور پرہیزگار لوگوں کے لیے اسے نصیحت (بنا دیا)۝66

ہفتے کے دن کی بے حرمتی اور یہود کا بندر وخنزیر بننا:

یہ قصہ سورۃ الاعراف میں ہے: ﴿ وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِيْهِمْ كَذٰلِكَ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝۱۶۳ ﴾ [الأعراف: ١٦٣] ''اور (اے نبی!) ان (یہودِ مدینہ) سے اس بستی (ایلہ) کے بارے میں پوچھیں جو سمندر کے ساحل پر واقع تھی، جب وہ لوگ سبت (ہفتے کے دن) کے بارے میں حد سے گزر جاتے تھے، جب کہ ان کے یومِ سبت کو ان کی (شکار کی) مچھلیاں ان کے پاس ظاہر (پانی کے اوپر) آجاتی تھیں اور جس دن ان کا ہفتہ نہ ہوتا وہ (ان کے پاس) نہیں آتی تھیں۔ اسی طرح ہم انھیں آزماتے تھے، اس لیے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔''

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ گاؤں والے اہلِ ایلہ تھے۔ قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔[1] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ گاؤں ایلہ اور طور کے درمیان تھا اور اسے مدین کہتے تھے۔[2] بہر حال اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ عہد لیا تھا کہ تم ہفتے کے دن کی تعظیم کرو اور اس دن مچھلی کا شکار نہ کھیلو۔ انھوں نے یہ حیلہ نکالا کہ ہفتے سے ایک دن پہلے جال ڈالتے اور حوض بناتے۔ مچھلی اس میں پھنس کر رہ جاتی، جسے رات کو پکڑ لیتے۔ اللہ کو غصہ آیا تو ان کو بندر بنا دیا۔ بندر شکل وصورت میں انسان کے سب سے زیادہ مشابہ ہے۔ اگرچہ درحقیقت حیوان ہے، اسی طرح جب کہ ان کے اعمال و حیلے ظاہر میں حق کے مشابہ تھے اور باطن میں حق کے مخالف تو اللہ تعالیٰ نے ان کو وہی جزا وسزا دی، جو ان کے عمل کے مطابق تھی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ١٨١)

[2] تفسير الطبري (٢/ ١٦٩) اس کی سند میں ''داود بن حصين عن عكرمة'' کے بارے میں امام ابو داود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''أحاديثه عن عكرمة مناكير'' علی بن مدینی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''ما روي عن عكرمة فمنكر الحديث'' تفصیل کے لیے دیکھیں: تهذيب الكمال (٨/ ٣٧٩)

نے کہا ہے کہ ان کے دل مسخ ہو گئے تھے، وہ سچ مچ بندر کی شکل کے نہیں بن گئے تھے۔ یہ ایک مثال ہے جو اللہ نے بیان کی: ﴿ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ﴾ [الجمعة: ٥] ''مثال اس گدھے کی سی ہے جو کتابیں اُٹھاتا ہے۔''[1]

مسخ کی کیفیت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام مجاہد رحمہ اللہ کا یہ قول غریب اور آیت کے ظاہر کے خلاف ہے، کیوں کہ اس جگہ کے سوا دوسری جگہ بھی یوں ہی فرمایا ہے: ﴿ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ ﴾ [المائدة: ٦٠] ''اور ان میں سے بعض کو بندر اور سُوّر بنا دیا۔''[2] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جوان لوگ بندر ہو گئے تھے اور بوڑھے سور بن گئے تھے۔[3] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قوم کی دم نکل آئی تھی اور وہ چیخنے چلانے لگے۔ پہلے وہ مرد عورت تھے اور اب بندر ہو گئے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ نے ان کی نافرمانی پر انھیں بندر بنا دیا، وہ تین دن زندہ رہے۔ مسخ ہونے والا کوئی بھی تین دن سے زیادہ نہیں جیا۔ نہ کھایا نہ پیا اور نہ نسل چلی۔ اللہ نے بندر، سور اور ساری مخلوق چھ دن میں بنائی ہے۔ اس قوم کو بندر کی صورت میں کر دیا، اسی طرح جس کے ساتھ جو چاہتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے۔ وہ جس کو جو چاہے بنا دے۔[5] ان میں صرف وہ لوگ بچ گئے جو قوم کو اس کام سے منع کرتے تھے۔ ورنہ سب کے سب ہلاک ہو جاتے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ بات نہیں ہے، جو مجاہد رحمہ اللہ نے کہی تھی کہ ان کا مسخ معنوی تھا اور صوری نہیں تھا، بلکہ صحیح یہی ہے کہ صوری اور معنوی دونوں طرح کا مسخ تھا۔[6] پھر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ان کے مسخ کا قصہ تفصیل سے نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ اوپر گزرا ہے۔ فتح البیان میں ہے کہ اس آیت میں امر کا صیغہ تحویل، تسخیر اور تکوین کے لیے ہے، یعنی قدرت کا تعلق ان کے حقیقتِ بشریت سے حقیقتِ بندر کی طرف منتقل ہو جانے کے واسطے سے ہوا۔ یہ سچ مچ مسخ ہو گئے۔ پھر کہا ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت نے ذکر کیا ہے کہ یہودی دو فرقے ہو گئے تھے۔ ایک فرقے نے ہفتے کے دن زیادتی کی، حد سے آگے بڑھ گئے، اللہ کے حکم کے خلاف کیا اور مچھلی کا شکار کرنے لگے۔ دوسرا فرقہ دو قسم کا ہو گیا، ایک قسم نے کھل کر منع کیا اور کنارہ کش ہو گئے۔ دوسری قسم نے شکاریوں کا ساتھ نہ دیا، لیکن ان سے میل جول رکھا، کھل کر انھیں منع نہ کیا اور نہ الگ ہوئے۔ اللہ نے سب کو مسخ کر دیا اور پہلے فرقے کے سوا کوئی نہ بچا۔[7]

---

[1] تفسیر الطبري (٢/ ١٧٣) [2] تفسیر ابن کثیر (١/ ١٤٢)

[3] تفسیر الطبري (١٣/ ٢٠٣) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٣٣) اس کی سند کو علامہ احمد شاکر نے مسلسل بالضعفاء کہا ہے۔ دیکھیں: تفسیر الطبري (١/ ٢٦٣)

[4] تفسیر الطبري (٢/ ١٧٠۔ ١٧١) [5] تفسیر الطبري (٢/ ١٦٧۔ ١٦٨) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔

[6] تفسیر ابن کثیر (١/ ١٤٣) [7] فتح البیان (١/ ١٩١)

مسخ کا زمانہ:

یہ قصہ داود علیہ السلام کے زمانے میں واقع ہوا: ﴿ لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴾ [المائدة: ٧٨] ”بنی اسرائیل میں سے جو لوگ کافر ہوئے ان پر داود اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی، یہ اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے نافرمانی کی اور وہ حد سے گزر جاتے تھے۔“ اللہ تعالیٰ نے اس سزا کو اس شہر والوں اور جو اس کے اردگرد تھے، سب کے لیے عبرت ٹھہرایا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ [الأحقاف: ٢٧] ”اور البتہ تحقیق ہم نے تمھارے آس پاس کی بستیاں ہلاک کر دیں، اور ہم نے آیات پھیر پھیر کر بیان کیں، تاکہ وہ (ہماری طرف) رجوع کریں۔“ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ﴾ [الرعد: ٤١] ”کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ بلاشبہ ہم (کفر کی) زمین کو اس حال میں آتے ہیں، کہ اسے اس کے اطراف سے گھٹاتے جاتے ہیں (یعنی اسلام پھیل رہا ہے)۔“ اطراف سے مراد آس پاس کے شہر ہیں۔

امام قتادہ رحمہ اللہ کا ایک قول ہے کہ ”مَا بَيْنَ يَدَيْهَا“ سے مراد اگلے لوگ ہیں اور ”مَا خَلْفَهَا“ سے بنی اسرائیل کے پچھلے لوگ۔[1] لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے، کیونکہ مکان مراد ہے، زمان نہیں۔ اگر پچھلوں کے بارے میں یہ عبرت درست بھی ہو تو اگلوں کے بارے میں نہیں بنتی، اس لیے مضبوط بات یہی ہے کہ وہ گاؤں مراد ہیں جو اس وقت موجود تھے اور جن کو اس واقعے کی خبر پہنچی تھی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ ﴾ [الرعد: ٣١] ”اور جنھوں نے کفر کیا ان کے کرتوتوں پر انھیں آفت پہنچتی ہی رہے گی۔“ نیز فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ﴾ [الرعد: ٤١] ”کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ بلاشبہ ہم (کفر کی) زمین کو اس حال میں آتے ہیں، کہ اسے اس کے اطراف سے گھٹاتے جاتے ہیں (یعنی اسلام پھیل رہا ہے)۔“

حاصل یہ کہ اللہ نے ان کو ان لوگوں کے لیے باعثِ عبرت بنایا، جو اس زمانے میں تھے اور جو بعد میں آئیں گے اور اس خبرِ متواتر کو معلوم کریں گے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ نصیحت قیامت تک کے لیے ہے۔[2] امام حسن و قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ تاکہ لوگ اللہ کے انتقام سے ڈر کر اس کی نافرمانی سے بچیں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ متقین سے مراد اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔[3]

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٣٤)

(2) تفسير الطبري (٢/ ١٨١) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٣٥) اس کی سند میں ”داود بن حصین عن عکرمۃ“ متکلم فیہ راوی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: تهذيب الكمال (٨/ ٣٧٩)

(3) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٣٥)

حیلہ سازی کی مذمت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ وہ پھٹکار اور وبال ان پر اس لیے آیا کہ انھوں نے اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کا ارتکاب کیا تھا اور طرح طرح کے حیلے نکالے۔ اب جو لوگ متقی ہوں، انھیں ایسے کام سے بچنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو آفت ان پر آئی تھی، وہ ان پر بھی آ جائے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں ہے کہ تم وہ کام نہ کرو، جو یہودیوں نے کیا تھا کہ ذرا سے حیلے نکال کر اللہ کے حرام کو حلال ٹھہرا لیا تھا۔ اس کی سند جید ہے۔[1] جامی رحمہ اللہ نے فقہا کے حیلوں کا شکوہ اپنے اشعار میں خوب کیا ہے۔ ان کو حیلہ گر اور شعبدہ باز بتایا ہے، کیوں کہ وہ لوگ دنیا کے طمع کی خاطر امرا کی خوشامد کے لیے کسی ناجائز کام کو کسی حیلے بہانے سے جواز کا لباس پہنا دیتے ہیں۔ امام ابن القیم رحمہ اللہ نے "أعلام الموقعین" میں حیلوں کا مفصل ابطال کیا ہے۔[2] اللہ نے ہمیشہ اہلِ حدیث وقرآن کو اس حیلہ گری سے بچایا ہے اور بچائے گا۔ إن شاء الله.

صد شکر کہ در مذہب ما حیلہ و فن نیست　　　ما اہل حدیثیم دغا را نشناسیم

"ہم اہلِ حدیث ہیں اور دغا بازی سے نا آشنا ہیں۔ صد شکر کہ ہمارے مسلک میں مکر و حیلہ نہیں ہے۔"

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۞۶۷

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: بے شک اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو، انھوں نے کہا: کیا تو ہم سے ہنسی مذاق کرتا ہے؟ موسیٰ نے کہا: میں اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہلوں میں شامل ہو جاؤں (67)

بنی اسرائیل کے مقتول اور گائے کا واقعہ:

عبیدہ سلمانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بانجھ شخص تھا۔ اس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی تھی، مگر وہ بڑا مال دار تھا۔ اس کے بھتیجے نے، جس نے وارث ہونا تھا، اس شخص کو قتل کر دیا اور رات کو اس کی لاش اُٹھا کر کسی اور شخص کے دروازے پر رکھ دی، پھر صبح کو ان گھر والوں پر خون کا دعویٰ کر دیا اور لوگ ہتھیار باندھ کر لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ایک عقلمند آدمی نے کہا کہ تم خانہ جنگی کیوں کرتے ہو، تمھارے درمیان اللہ کے رسول موسیٰ علیہ السلام موجود ہیں؟ انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کے پاس آ کر یہ حال بیان کیا تو انھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ وہ

---

[1] إبطال الحيل لابن بطة (١/ ٤٦۔ ٤٧) تفسير ابن كثير (١/ ١٤٤)　[2] أعلام الموقعين (٣/ ٢٤٠)

لوگ اعتراض نہ کرتے تو ایک عام گائے کافی ہو جاتی، ان کے طول دینے سے نوبت یہاں تک پہنچی، جس کا ذکر اللہ نے اس جگہ کیا ہے۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ قصہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابو العالیہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم سے مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کر کے یہ بات لکھی ہے کہ ان کی ترتیب میں کسی قدر اختلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بنی اسرائیل کی کتابوں سے ماخوذ ہے، اگرچہ ان کو نقل کرنا جائز ہے، مگر ان کی تصدیق ہو سکتی ہے نہ تکذیب۔ یہ ترتیب اتنی قابلِ اعتماد ہے جتنی حق کے مطابق ہو۔[2] گائے کو ذبح کرنے کا یہ قصہ تلاوت میں مقدم اور آیت ﴿ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا ﴾ کے معنی کے مطابق مؤخر ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ﴿ وَاِذْ قَتَلْتُمْ ﴾ نزول کے لحاظ سے پہلے ہو اور ذبح کا حکم بعد میں ہو۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا
بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَیْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا
تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ
یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا
ادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا هِیَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَیْنَا ؕ
وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا
ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِی الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِیَةَ فِیْهَا ؕ
قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا یَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

انھوں نے کہا: تو ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر کہ وہ ہمارے لیے بیان کرے کہ وہ (گائے) کیسی ہو؟ موسیٰ نے کہا: بے شک اللہ کہتا ہے کہ بے شک وہ گائے نہ بوڑھی ہو اور نہ بچھیا، ان کے درمیان عمر کی ہو، چناں چہ تم وہ کرو جو تمھیں حکم دیا جاتا ہے (68) انھوں نے کہا: تو ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر کہ وہ ہمارے لیے بیان کرے اس کا رنگ کیسا ہو؟ موسیٰ نے کہا: اللہ فرماتا ہے: بے شک وہ گائے زرد رنگ کی ہو، اس کا رنگ خوب گہرا ہو، وہ دیکھنے والوں کو خوش کر دے (69) انھوں نے کہا: ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کرو، ہمارے لیے (مزید) بیان کرے کہ وہ گائے کس قسم کی ہو؟ بے شک گائیں ہم پر مشتبہ ہو گئی ہیں اور یقیناً اگر

[1] تفسیر الطبري (۲/ ۱۸۳۔ ۱۸۴) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۳۶)
[2] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۴۵۔ ۱۴۸)

اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راہ پا لیں گے ﴿70﴾ موسیٰ نے کہا: بے شک اللہ فرماتا ہے کہ بے شک وہ گائے مشقت کرنے والی نہ ہو کہ زمین میں ہل چلاتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہو، وہ بے عیب ہو، اس میں کوئی داغ دھبا نہ ہو۔ انھوں نے کہا: اب تو حق لایا ہے، پھر انھوں نے اسے ذبح کیا اور لگتے نہیں تھے کہ وہ یہ کام کریں گے ﴿71﴾

کثرتِ سوال:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے تنگ کرنے کی خصلت بیان کی ہے کہ انھوں نے رسول کو کثرتِ سوال سے تنگ کر دیا، اسی لیے اللہ نے ان کی جان پر تنگی کی۔ یہ اگر کوئی گائے پکڑ کر حلال کر دیتے تو کام چل جاتا، لیکن انھوں نے تشدد کیا، پھر ویسا ہی تشدد ان پر ہوا۔ حدیث میں آیا ہے کہ اگر یہ ان شاء اللہ نہ کہتے تو قیامت تک گائے کا حال نہ کھلتا۔ اس کو ابن ابی حاتم نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔[1]

بوڑھی اور بچھڑے کے درمیان ہونا، قوت وحسن کی علامت ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک جنگلی گائے تھی۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جو شخص زرد جوتا پہنے گا، وہ جب تک پہنے گا، خوش رہے گا۔[3] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس گائے کے کھر زرد تھے۔[4] امام ابن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے بلکہ سینگ بھی زرد تھے۔ امام عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زردی ایسی تھی کہ سیاہی کے قریب تھی۔ امام ابن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ گائے صاف رنگ تھی۔[5] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ لگتا تھا کہ زردی کی شدت سے سفید ہو جائے۔[6] وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تو اس کی کھال کو دیکھتا تو سمجھتا گویا سورج اس کے پوست سے نکلتا ہے۔[7] تورات میں اس گائے کا رنگ سرخ لکھا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ تعریب کی غلطی ہے، یعنی مترجم نے ترجمہ غلط کیا ہے، زرد کی جگہ سرخ لکھ دیا ہے، حقیقت میں وہ پیلی تھی۔ زردی کی شدت سے لال کالی نظر آتی تھی۔[8] واللہ أعلم.

یہ جو فرمایا کہ اس میں داغ نہ تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ بے عیب تھی، نہ سفید نہ سیاہ نہ سرخ، بلکہ ایک رنگ تھی

---

① تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱٤۱) علامہ البانی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے اور علامہ احمد شاکر نے اس کے موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے۔ نیز امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "في صحته نظر" دیکھیں: البدایة والنهایة (۱/ ۲۹٤) عمدة التفسیر (۱/ ۱۲۵) السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (۱٦۵۲)

② تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۳۸) ③ تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۳۸) السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (۷۱٦)

④ تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۳۹) اس کی سند حسن ہے۔ ⑤ تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۳۹)

⑥ تفسیر الطبري (۲/ ۲۰۱۔ ۲۰۲) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱٤۰) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

⑦ تفسیر الطبري (۲/ ۲۰۲) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱٤۰) ⑧ تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱٤۹)

اور یہ کہنے میں: ''وہ ایسا کرنے والے نہیں تھے۔'' ان کی مذمت ہے کہ اس بیان اور سوال و جواب اور وضاحت کے باوجود انھوں نے بڑی مشکل سے اس کو ذبح کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ قیمت کی گرانی کے سبب ذبح کرنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر اس قول پر اعتراض ہے، کیوں کہ یہ قول بنی اسرائیل سے منقول ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ ان کو تنگ کرنے اور شرارت کی خصلت کی وجہ سے باز رہنا مقصود تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ فضیحت کے خوف سے باز رہنا چاہتے تھے۔ پہلی بات راجح ہے۔

اس آیت سے نکلنے والے احکام:

اس آیت سے کئی احکام نکلتے ہیں: ایک یہ کہ حکم دینے والا اس حکم کے عموم میں داخل نہیں ہوتا۔ چناں چہ موسیٰ علیہ السلام اس آیت ﴿ فَذَبَحُوْهَا ﴾ کی دلیل سے اس میں شامل نہیں تھے۔ دوسرا یہ کہ گائے ذبح کرنا سنت ہے۔ تیسرا یہ کہ کسی کام کا حکم پہلے ہو، مگر بیان بعد میں ہو، یہ جائز ہے۔ چوتھا یہ کہ مذاق کرنے والے کو جاہل کہہ سکتے ہیں۔ پانچواں یہ کہ ''إن شاء الله'' کہنے سے کسی امر سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ چھٹا یہ کہ حکم مشیتِ الٰہی کو مستلزم نہیں ہے۔ ساتواں یہ کہ امر فوری بجا آوری کے لیے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق: ﴿ وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴾ ''اور لگتے نہیں تھے کہ وہ یہ کام کریں گے۔'' آٹھواں یہ کہ حیوان میں بیع سلم جائز ہے اور حیوان کا بیان وصف سے کر سکتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حیوان میں سلم کرنا مالک، اوزاعی، لیث، شافعی، احمد رحمہم اللہ اور پہلے پچھلے جمہور علما کا مذہب ہے، مگر ابو حنیفہ و ثوری رحمہما اللہ ایسے سلم کو صحیح نہیں کہتے۔[1]

﴿ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۭ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ؀ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۭ كَذٰلِكَ يُحْىِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ؀ ﴾

اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، پھر تم نے اس کے بارے میں جھگڑا کیا اور اللہ اسے ظاہر کرنے والا تھا جسے تم چھپاتے تھے (72) چناں چہ ہم نے کہا: تم اس (گائے کے گوشت) کا ایک ٹکڑا اس مردے کو مارو، اللہ اسی طرح مردوں کو زندہ کرے گا اور وہ تمھیں اپنی (قدرت کی) نشانیاں دکھاتا ہے، تاکہ تم سمجھو (73)

مقتول کو زندہ اور قاتل کی تعیین کرنا:

بنی اسرائیل میں ایک شخص مارا گیا تھا، اس کا قاتل معلوم نہیں تھا، اس کے وارث ہر کسی پر دعویٰ کرتے تھے، اللہ نے اس طرح اس مردے کو زندہ کر دیا، اس نے بتایا کہ ان وارثوں ہی نے مجھے مارا تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۵۰)

ہے کہ "اِدّٰرَأْتُمْ" کے معنی "اِخْتَلَفْتُمْ" ہیں۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ عطا خراسانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کے معنی "اِخْتَصَمْتُمْ" ہیں۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ بعض نے کہا کہ تم نے مارا، دوسروں نے کہا کہ تم نے مارا۔[2] بہرحال گائے کا ایک ٹکڑا اسے مارا۔ اس ٹکڑے میں اختلاف ہے۔ کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ سب اقوال نقل کیے ہیں، پھر کہا ہے کہ کوئی سا بھی عضو ہو، اصل حاصل معجزہ ہے۔ اس عضو کے متعین کرنے میں اگر کوئی دینی یا دنیوی فائدہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ ہمیں بتا دیتا، لیکن جب عضو مذکور مبہم رہا اور معصوم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کسی صحیح طریقے سے معلوم نہ ہوا تو ہمارے لیے بھی اس کو مبہم رکھنا ہی بہتر ہے۔[3]

قتل، زنا اور جادو چھپائے نہیں چھپتے:

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی کام کسی ایسے ٹھوس پتھر کے اندر کرے گا، جس کا نہ کوئی دروازہ ہے اور نہ اس میں کوئی سوراخ، تو اس کا وہ کام خواہ کیسا ہی ہو، لوگوں میں ظاہر ہو جائے گا۔ اس کو احمد نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔[4] مسیب بن رافع نے کہا ہے کہ کوئی شخص اگر کوئی اچھا کام سات پردوں کے اندر رہ کر بھی کرے گا تو اللہ اس کو ظاہر کر دے گا اور اگر کوئی برا کام سات پردوں کے اندر رہ کر بھی کرے گا تو اللہ اس کو ظاہر کر دے گا۔ اس کی تصدیق اللہ کی کتاب میں موجود ہے: ﴿ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴾ [البقرۃ: ٧٢] "اور اللہ اسے ظاہر کرنے والا تھا جسے تم چھپاتے تھے۔"[5] عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جس کی کوئی خصلت اچھی یا بُری ہے، اللہ اس کی ایک چادر ظاہر کرتا ہے، جس سے وہ خصلت پہچانی جاتی ہے۔[6] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کی ایک جماعت نے اسی قسم کے کلمات ذکر کیے ہیں۔

مَیں کہتا ہوں کہ اگرچہ یہ بات عام ہے، مگر بالخصوص قتل، زنا اور سحر کسی طرح چھپ نہیں سکتا۔ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے چالیس برس تک گائے کو تلاش کیا، پھر ایک شخص کے پاس پایا تو اسے کھال بھر کر دینار دیے، پھر اس کو حلال کر کے اس کا ایک عضو مقتول کو مارا۔ وہ خون آلود شخص اُٹھ بیٹھا، پوچھا: تجھ کو کس نے قتل کیا ہے؟ اس نے کہا: فلاں شخص نے مارا ہے۔[7] اللہ نے اس کام کو قیامت کی ایک حجت ٹھہرایا، یعنی جس طرح وہ مردہ زندہ ہوگیا، اسی طرح اللہ سب مردوں کو قیامت کے دن زندہ کرے گا۔

---

[1] صحيح البخاري (٣/ ١٢٥٠) [2] تفسير الطبري (٢/ ٢٢٥) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٤٤) [3] تفسير ابن كثير (١/ ١٥٠)

[4] مسند أحمد (٣/ ٢٨) مستدرك الحاكم (٤/ ٣٤٩) اس کی سند میں "دراج عن ابی الہیثم" ضعیف ہے۔

[5] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٤٤)

[6] مصنف ابن أبي شيبة (٧/ ٢١١) شعب الإيمان (٥/ ٣٥٩) امام بیہقی روایت ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: "هذا هو الصحيح موقوفاً على عثمان وقد رفعه بعض الضعفاء"

[7] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٤٥) اس کی سند حسن ہے۔

قیامت کا اثبات اور منکرین کا رد:

معلوم ہوا کہ قیامت کا ہونا اور معاد کا آنا حق ہے اور اس کا منکر کافر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں پانچ جگہ مردوں کو زندہ کرنے کا ذکر فرمایا ہے: ایک یہ ہے: ﴿ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ ﴾ [البقرة: ٥٦] ''پھر ہم نے تمھیں زندہ کیا تمھاری موت کے بعد۔'' دوسرا یہ قصہ ہے، تیسرا یہ قصہ ہے: ﴿ الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ﴾ [البقرة: ٢٤٣] ''ان لوگوں کو جو اپنے گھروں سے موت کے ڈر سے نکلے اور وہ کئی ہزار تھے۔'' چوتھا قصہ: ﴿ اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰى قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ﴾ [البقرة: ٢٥٩] ''یا اسی طرح اس شخص کو (نہیں دیکھا) جو ایک بستی سے گزرا اور وہ اپنی چھتوں پر گری پڑی تھی؟'' پانچواں قصہ ابراہیم علیہ السلام اور چار پرندوں کا ہے۔ اسی طرح زمین کو موت کے بعد زندہ کرنے کو جسموں کے مٹی ہو جانے کے بعد انھیں لوٹانے کی دلیل ٹھہرایا ہے۔ چناں چہ ابو رزین عقیلی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اللہ مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ فرمایا کہ تیرا گزر کسی سوکھے جنگل میں نہیں ہوا، پھر دوبارہ گزرنے پر تو نے اس کو سرسبز پایا ہو؟ کہا: ہاں، فرمایا: اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرے گا۔[1] (رواه أبو داود الطيالسي)

اس حدیث کے لیے یہ آیت بھی گواہ ہے: ﴿ وَاٰیَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَةُ اَحْیَیْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ یَاْكُلُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا فِیْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِیْهَا مِنَ الْعُیُوْنِ ۝ لِیَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ اَیْدِیْهِمْ اَفَلَا یَشْكُرُوْنَ ۝ ﴾ [یٰسین: ٣٣۔ ٣٥] ''اور ان کے لیے مردہ زمین ایک (عظیم) نشانی ہے، ہم نے اسے زندہ کیا اور ہم نے اس سے (اناج کا) دانہ نکالا، پھر وہ اسی سے کھاتے ہیں۔ اور ہم نے اس (زمین) میں کھجوروں اور انگوروں کے باغات پیدا کیے اور ہم نے ان میں چشمے جاری کیے۔ تاکہ وہ اس کے پھلوں سے کھائیں اور وہ (پھل) ان کے ہاتھوں نے نہیں بنائے، پھر کیا وہ شکر نہیں کرتے؟''

اس بیان کا مقصد مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کے منکرین کا رد کرنا ہے اور اس رد کا تقاضا ہے کہ اس آیت کے مخاطب عرب ہوں نہ کہ یہودی، اس لیے کہ وہ تو مر کر اٹھائے جانے اور جزا و سزا کا اقرار کرنے والے ہیں، مگر اس بنا پر یہ درمیانی حصہ جملہ معترضہ ٹھہرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے ہم نے اس مقتول کو زندہ کر دیا، اسی طرح قیامت کے دن سارے مردوں کو زندہ کریں گے، ان دونوں امور میں جواز یا امکان کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ نمونہ اس لیے دکھایا گیا ہے کہ شاید تم اپنے آپ کو اللہ کی نافرمانیوں سے باز رکھو۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے ''درِ منثور'' میں وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے گائے کا قصہ بڑا لمبا چوڑا نقل کیا ہے۔[2] یہاں اس کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ اگر مرفوع ہوتا تو ذکر کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں تھا۔

---

[1] مسند الطيالسي (١/ ١٤٧) كتاب التوحيد لابن خزيمة (٢/ ٤٤٠) اس کی سند حسن ہے۔ [2] الدر المنثور (١/ ١٩٤)

زخمی شخص کی گواہی:

کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت اس بات میں امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب کی دلیل ہے کہ زخمی کی گواہی کہ مجھ کو فلاں شخص نے قتل کیا ہے، قابلِ قبول ہوتی ہے۔ کیوں کہ جب اس مردے نے زندہ ہوکر بتایا تو یہ اس کا قول قابلِ قبول ٹھہرا، کیوں کہ اس کی یہ حالت ایسی نہیں تھی کہ اس میں تہمت کی گنجایش ہو سکے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی اسی کو قابلِ ترجیح بتاتی ہے۔ ایک یہودی نے ایک لڑکی کا سر پتھر سے کچل کے ہلاک کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ تجھے کس نے مارا، فلاں فلاں نے؟ جب یہودی کا نام لیا تو اس نے سر ہلا دیا۔ اس پر اسے گرفتار کیا گیا اور آخر اس نے اقرار کرلیا۔[1] امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لوث (شبہہ) کی صورت میں ولیِ قتیل سے قسامت کے طور پر حلف لیں گے۔ جمہور کہتے ہیں کہ قتیل کا یہ قول لوث نہیں۔[2] میں کہتا ہوں کہ لوث کا مسئلہ امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ”الطرق الحکمیة“ میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے[3] جس کا کچھ خلاصہ کتاب ”حسن المساعی“[4] میں آ گیا ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاۗءُ ۭ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿74﴾

پھر اس کے بعد تمھارے دل سخت ہوگئے، چناں چہ وہ پتھروں کے مانند ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت، اور بے شک کچھ پتھر وہ ہیں کہ ان سے نہریں پھوٹتی ہیں، اور بے شک ان میں سے کچھ وہ ہیں کہ پھٹ پڑتے ہیں پھر ان سے پانی نکلتا ہے، اور بے شک ان میں سے کچھ وہ ہیں کہ اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں، اور اللہ اس سے غافل نہیں جو تم عمل کرتے ہو (74)

یہود کی سنگ دلی کا بیان:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بنی اسرائیل کو لتاڑا ہے کہ تم عجیب کم بخت نالائق ہو کہ یہ ساری نشانیاں تم نے دیکھیں۔ مردے کا جی اُٹھنا دیکھا۔ اس پر بھی کچھ نرم نہ ہوئے، بلکہ سخت دل ہوگئے، جیسے پتھر کسی طرح نرم نہیں پڑتا۔

موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر نکلا

اسی لیے مومنین کو منع کیا کہ دیکھو تم ان کا سا کام نہ کرنا۔ فرمایا: ﴿ اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٨٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٧٢) [2] تفسير ابن كثير (١/ ١٥١)

[3] الطرق الحكمية (ص: ٧۔ ٩) [4] یہ صاحبِ تفسیر نواب صدیق حسن خاں کی اپنی تالیف ہے۔

لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۱۶﴾ ﴾ [الحديد: ١٦] ''کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل ذکرِ الٰہی کے لیے جھک جائیں اور (اس کے لیے) جو حق (اللہ کی طرف سے) نازل ہوا، اور وہ ان لوگوں کے مانند نہ ہوں، جنھیں اس سے پہلے کتاب دی گئی؟ پھر ان پر مدت لمبی ہوگئی تو ان کے دل سخت ہوگئے اور اُن میں سے بہت سے فاسق ہیں۔''

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب مقتول نے زندہ ہو کر کہہ دیا کہ مجھ کو میرے بھتیجوں نے قتل کیا ہے تو پھر وہ بدستور فوت ہوگیا۔ اس وقت انھوں نے پھر انکار کیا کہ ہم نے نہیں مارا۔ دیکھنے کے بعد یہ حق کا انکار تھا۔ اس لیے اللہ نے ان سے کہا کہ تمھارے دل تو پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوگئے ہیں۔[1] کسی طرح نہیں پسیجتے، بلکہ تم نے پتھر کے بھی کان کترے کہ ان میں سے کسی سے تو ندی بہتی ہے، کوئی پہاڑ کے اوپر سے اللہ کے خوف سے نیچے آ گرتا ہے۔ تمھاری سختی ایسی ہے کہ اس کا کچھ علاج نہیں ہے۔ ﴿ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ﴾ [الحشر: ٢١] ''(اے نبی!) اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دب جاتا (اور) پھٹ جاتا۔''

جمادات میں قوتِ ادراک:

معلوم ہوا کہ پتھر کو بھی بہ حسبِ حال خود ایک طرح کا شعور ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾ ﴾ [بني إسرائيل: ٤٤] ''ساتوں آسمان اور زمین اور جو (مخلوق) ان میں ہے اس (اللہ) کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو، لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے، بے شک وہ نہایت حوصلے والا، بہت بخشنے والا ہے۔'' مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو بھی پتھر ہے، اس سے یا تو کوئی ندی نالہ نکلتا ہے یا ذرا سا پانی بہتا ہے یا اللہ کے ڈر سے پہاڑ سے نیچے گرتا ہے، یعنی ان کاموں سے خالی نہیں۔ قرآن میں ایسے ہی آیا ہے۔[2] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ بعض پتھر تمھارے دل سے زیادہ نرم ہیں، تم اللہ کے حکم کو نہیں مانتے اور وہ مانتے ہیں۔[3] فرمایا: ﴿ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ﴿۱۰﴾ ﴾ [سبا: ١٠] ''(ہم نے حکم دیا:) اے پہاڑو! اس کے ساتھ تسبیح دہراؤ، اور (اے) پرندو! (تم بھی) اور ہم نے اس کے لیے لوہا نرم کر دیا۔''

---

[1] تفسیر الطبري (٢/ ٢٣٤) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ [2] تفسیر الطبري (٢/ ٢٤٠)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٤٧) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحیح المسبور (١/ ٣٧۔ ٤٥)

پتھر گرنے کی تاویل کی تردید:

جبائی رحمہ اللہ کا یہ قول کہ پتھر کے گرنے سے بادل سے اولوں کا برسنا مراد ہے، بعید ہے۔ امام رازی اور حافظ ابن کثیر رحمہما اللہ نے بھی اس کو بعید سمجھ کر یہ کہا ہے کہ اس میں دلیل کے بغیر ظاہر لفظ سے خروج ہے۔[1] پتھر کا پہاڑوں پر سے گرنا بہت لوگوں نے دیکھا ہے اور خبرِ متواتر سے سنا گیا ہے، پھر اس کا انکار کرنا اور بات بنانا ضروری نہیں۔ ہم پر قرآن کے الفاظ حجت ہیں اور ظاہر لفظ کا اتباع فرض ہے۔ یحییٰ بن یعقوب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ندی سے مراد زیادہ رونا اور پانی نکلنے سے مراد کم رونا ہے۔ گرنے سے مراد آنسو کے بغیر دل کا رونا ہے۔[2] کسی نے سمجھا کہ یہ اسناد مجازی ہے، جس طرح دیوار کے ارادے کا ذکر کیا: ﴿ يُرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ ﴾ [الكهف: ۷۷] ''جو گرا چاہتی تھی۔'' مگر رازی اور قرطبی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔[3] اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ پتھر میں یہ صفت پیدا کر دے، جیسا کہ اس کے فرمان سے ظاہر ہے: ﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا ﴾ [الأحزاب: ۷۲] ''بلاشبہ ہم نے (اپنی) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انھوں نے اسے اُٹھانے سے انکار کر دیا اور وہ اس سے ڈر گئے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۝ ﴾ [الرحمن: ٦] ''اور بیلیں اور درخت سجدہ کرتے ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴾ [بني إسرائيل: ٤٤] ''ساتوں آسمان اور زمین اور جو (مخلوق) ان میں ہے اس (اللہ) کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو، لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے، بے شک وہ نہایت حوصلے والا، بہت بخشنے والا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ۝ ﴾ [النحل: ٤٨] ''کیا یہ لوگ اللہ کی پیدا کی ہوئی ان چیزوں کو نہیں دیکھتے کہ ان کے سائے دائیں اور بائیں جانب سے ڈھلتے ہیں، اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے، اور (اس کے سامنے) وہ سب عاجز ہیں۔'' نیز اللہ کا فرمان ہے: ﴿ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ﴾ [حم السجدة: ۱۱] ''ہم دونوں خوشی خوشی حاضر ہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ﴾ [الحشر: ۲۱] ''(اے نبی!) اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو آپ دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دب جاتا (اور) پھٹ جاتا۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوْا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ [حم السجدة: ۲۱] ''اور وہ اپنی جلدوں سے کہیں گے: تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟ وہ کہیں گی: ہمیں اس اللہ نے بلوایا جس نے ہر چیز کو بلوایا۔''

---

[1] تفسير ابن كثير (١/ ١٥٢) تفسير الرازي (٣/ ١٢١)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٤٦۔ ١٤٧)
[3] تفسير القرطبي (١/ ٤٦٥) تفسير الرازي (٣/ ١٢٠)

صحیح حدیث میں مروی ہے کہ « هٰذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهُ » ''یہ پہاڑ ہم کو دوست رکھتا ہے اور ہم اسے دوست رکھتے ہیں۔''[1] ستونِ منبر کا رونا خبرِ متواتر سے ثابت ہے۔[2] صحیح مسلم میں آیا ہے کہ میں اب تک اس پتھر کو پہچانتا ہوں، جو مکہ میں بعثت سے پہلے مجھے سلام کرتا تھا۔[3] حجرِ اسود کے متعلق آیا ہے کہ وہ قیامت کے دن اپنے ہاتھ منہ لگانے والے کے لیے گواہی دے گا۔[4] اسی طرح کی اور بھی بہت سی دلیلیں آئی ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ تمھارے دل یا تو پتھر کی طرح ہیں یا پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ وہ ان دو صفتوں سے کسی طرح باہر نہیں ہو سکتے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی بعض دل پتھر کی طرح ہیں اور بعض پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں۔[5] سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ تم اللہ کے ذکر کے بغیر بہت باتیں نہ کیا کرو، کیوں کہ اللہ کو یاد کیے بغیر بہت باتیں کرنا دل کو سخت کر دیتا ہے اور لوگوں میں اللہ سے سب سے زیادہ دور وہ شخص ہوتا ہے، جس کا دل سخت ہو۔ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے اس کو روایت کیا ہے اور ترمذی رحمہ اللہ نے اس روایت کو حسن غریب کہا ہے۔[6] امام بزار رحمہ اللہ کے نزدیک سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ چار چیزیں بدبختی ہیں: ایک آنکھ کا خشک ہونا، یعنی آنسو نہ نکلے۔ دوسری دل کی سختی۔ تیسری لمبی اُمید۔ چوتھی دنیا کی حرص۔[7]

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۷۵ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۷۶ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝۷۷

(مسلمانو!) کیا پھر تم توقع رکھتے ہو کہ وہ تمھاری بات مان لیں گے؟ حالاں کہ ان میں سے ایک فریق ایسا ہے کہ وہ اللہ کا کلام سنتے ہیں، پھر وہ اسے سمجھ لینے کے بعد اس میں تحریف کر دیتے ہیں،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٣٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٦٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٣٩٠) [3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٧٧)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٦١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٩٤٤) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٤)

[5] تفسير الطبري (٢/ ٢٣٦)

[6] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤١١) اس کی سند حسن ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ کا اس کو ''ابراہیم بن عبداللہ جمحی'' کی وجہ سے ضعیف کہنا درست نہیں ہے، کیوں کہ اس راوی کو امام ابن حبان نے ''مستقیم الحدیث'' اور حافظ ابن حجر نے ''صدوق'' کہا ہے۔

[7] مسند البزار (١٣/ ٨٧) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٥٢٢)

حالاں کہ وہ جانتے ہیں (75) اور جب وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے تو کہتے ہیں: ہم بھی ایمان لائے ہیں، اور جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ تنہا ہوتے ہیں تو (آپس میں) کہتے ہیں: کیا تم مسلمانوں کو وہ باتیں بتلاتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں، تاکہ وہ تمھارے رب کے ہاں تمھارے خلاف ان باتوں کو بطور حجت پیش کریں؟ پھر کیا تم عقل نہیں رکھتے؟ (76) کیا وہ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ (سب کچھ) جانتا ہے جو وہ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہیں؟ (77)

تورات میں تحریف:

جو اِن میں منافق تھے، وہ خوشامد کے لیے اپنی کتاب میں سے پیغمبر آخر الزمان کی باتیں مسلمانوں کے پاس بیان کرتے اور جو مخالف تھے، وہ اس پر ان کو الزام دیتے کہ تم اپنے علم میں سے ان کے ہاتھ سند کیوں دیتے ہو؟ تحریف کا ذکر جس طرح اس آیت میں ہے، ایسا ہی دوسری جگہ پر فرمایا ہے: ﴿ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ﴾ [المائدة: ١٣] ''چناں چہ ان کے اپنا عہد توڑنے کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی اور ہم نے ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔ وہ کلمات کو ان کے موقع ومحل سے بدل ڈالتے ہیں۔'' ان کا یہ تحریف کرنا، اچھی طرح سمجھ، غور وفکر اور عقل کر لینے کے بعد تھا۔ لفظ کے کچھ اور ہی معنی بناتے تھے۔ یہ وہی لوگ ہیں، جنھوں نے اللہ کے دیدار کی طلب کی تھی، بجلی گری تو مر گئے، پھر دوبارہ زندہ ہوئے۔ انھوں نے وہاں پہاڑ پر اللہ کا کلام سنا اور اسے سمجھ بوجھ لیا اور جب لوٹ کر آئے تو ایک فریق نے اس کو بدل ڈالا۔

تحریف کے اسباب:

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ تورات میں تحریف کی، حرام کو حلال، حلال کو حرام، حق کو باطل اور باطل کو حق ٹھہرا دیا۔ جب کوئی شخص حق دار رشوت لے کر آتا تو اس کو کتاب اللہ سے مسئلہ نکال کر بتا دیتے۔ جب کوئی مدعی باطل آتا اور رشوت لاتا تو اس کو ویسا ہی مسئلہ نکال کر بتا دیتے۔ جب کوئی ایسا آدمی آتا جو نہ حق دار ہوتا نہ رشوت گزار اور نہ اس مسئلے سے ان کو کوئی غرض ہوتی تو اس کو ٹھیک ٹھیک مسئلہ بتا دیتے۔ اسی بنیاد پر اللہ نے فرمایا: ﴿ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ ﴾ [البقرة: ٤٤] ''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔''[1] یہی حال بعینہٖ آج کل کے فقہائے زمانہ کا ہے کہ جس طرح کا مسئلہ کہو، کتبِ فتاوی سے نکال کر بتا دیں گے اور زبانی وتحریری حکم جاری کر دیں گے، حالانکہ خوب جانتے ہیں کہ وہ مسئلہ کتاب اللہ کے خلاف اور سنتِ رسول اللہ کے مخالف ہے، مگر رسم و رواج، رشتے داری، مرید یا شاگرد کی مروت، رشوت، تحفہ کی آمد حق بات کہنے یا لکھنے کی راہ

[1] یہ قول امام سدی رحمہ اللہ کے بجائے ابن زید رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ دیکھیں: تفسير الطبري (٢/ ٢٤٦)

میں حائل ہو جاتی ہیں۔ إِنَّا لِلّٰہِ! یہ آزمائش نہ ہوتی تو اسلام اس قابلِ ملال حالت تک کیوں پہنچتا؟

آج کل یہود و نصاریٰ کے پاس جو تورات و انجیل موجود ہے، وہ بعض اہلِ علم کے نزدیک بالکل تبدیل شدہ اور محرف ہے۔ اس کے الفاظ بدل دیے گئے ہیں۔ بعض محدثین و فقہا کے نزدیک وہ تحریف معنوی تھی۔ بخاری میں اسی طرح لکھا ہے۔ فخر رازی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔[1] تیسرے گروہ نے کہا ہے کہ کہیں لفظ کو بدلا ہے اور کسی جگہ معنوں کو بگاڑا ہے۔ یہی قول سچ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو صرف ایک سورت دی تھی، باقی تورات ہارون علیہ السلام کی اولاد کے پاس رکھ دی تھی۔ جب وہ سب قتل ہو گئے، یعنی بخت نصر کے واقعے میں تو عزیر علیہ السلام نے کچھ تھوڑی سی تورات حافظوں کی زبان سے جمع کی، وہی تورات آج موجود ہے۔ اس میں بھی کمی بیشی ہو گئی ہے۔ ترجمہ خلافِ اصل کیا گیا ہے۔ اصل کا کہیں اتا پتا نہیں چلتا۔ انجیل کا بھی یہی حال ہے۔ اس کے چار نسخے ہیں۔ آپس میں مختلف الالفاظ ہیں اور اس میں معنوی تحریف ہو گئی ہے۔ اب یہ سنا گیا ہے کہ اہلِ اسلام کے اعتراضات کو دور کرنے کے لیے نئے سرے سے ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ اعتراض کی جگہ کو بدل دیا جاتا ہے۔

لو مبارک ہو تمھیں میری بھی شامت آئی

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ان لوگوں سے مراد منافق ہیں۔ یہ یہودی جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ملتے تو کہتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔[2] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وہ یہودی تھے جو ایمان لائے، پھر منافق ہو گئے۔[3] بہت سے سلف و خلف کا یہی قول ہے۔ امام ابن وہب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم جاری کیا کہ ہمارے اس قصبے مدینہ میں مسلمانوں کے سوا اور کوئی نہ آئے۔ اس پر کفار اور منافقین کے سرداروں نے کہا کہ تم جا کر کہو کہ ہم مسلمان ہیں، پھر جب ہمارے پاس آؤ تو انکار کر جاؤ۔ وہ لوگ صبح کو مدینہ میں جاتے اور عصر کے بعد لوٹ جاتے۔ پھر ابن وہب نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ [آل عمران: ۷۲] ''اور اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ نے (اپنے لوگوں سے) کہا: مسلمانوں پر جو چیز نازل کی گئی ہے اس پر تم صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس کا انکار کر دو، تا کہ وہ بھی (ایمان سے) پھر جائیں۔'' ان کا مدینہ میں جانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جاسوسی کرنے کے لیے تھا، جب پھر کر آتے تو وہی کافر کے کافر رہتے۔ مسلمان ان کو مسلمان ہی سمجھتے تھے۔ اللہ نے ان کے حال پر آگاہ کر دیا۔[4]

فتح سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ذکر ہے۔ آپس میں چرچا کرتے کہ ایک نبی ہونے والا ہے، پھر دوسروں کو منع کرتے کہ تم یہ ذکر نہ کرنا۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بنو قریظہ کے دن قلعے کے نیچے کھڑے ہو کر رسول

---

[1] تفسیر الرازي (۳/ ۱۲۳)
[2] تفسیر الطبري (۲/ ۲۵۰) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔
[3] تفسیر الطبري (۲/ ۲۵۰)
[4] تفسیر الطبري (۲/ ۲۵۳)

اللہ ﷺ نے یہ فرمایا: «يَا إِخْوَانَ الْقِرَدَةِ وَالْخَنَازِيرِ وَيَا عَبَدَةَ الطَّاغُوتِ!» ''اے بندروں اور خنزیروں کے بھائیوں اور اے شیطان کے پوجنے والو!'' اس پر انھوں نے کہا کہ یہ خبر محمد ﷺ کو کہاں سے ملی؟ تمھی میں سے یہ بات نکلی ہے۔ تم یہ حال ان سے کیوں کہتے ہو کہ خود تم پر ان کی حجت قائم ہو؟

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی تم مسلمانوں سے اپنے پہلے عذاب کا ذکر کیوں کرتے ہو، وہ کہنے لگے کہ ہم اللہ کے ہاں تم سے زیادہ محبوب اور عزت والے ہیں؟[1] اللہ نے فرمایا کہ تمھاری اس تدبیر سے کیا ہوتا ہے، تم کہو یا نہ کہو، اللہ کو تو سب کھلی چھپی بات کی خبر ہے۔ الحمد للہ۔ اس آیت پر ''الم'' کا نصف پارہ مکمل ہوا۔

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿٧٨﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ ﴿٧٩﴾

اور ان میں سے کچھ اَن پڑھ ہیں، وہ کتاب کو نہیں جانتے سوائے جھوٹی آرزوؤں کے، اور بس وہ صرف گمان کرتے ہیں (78) چناں چہ ان لوگوں کے لیے ہلاکت ہے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، تاکہ اس کے بدلے میں تھوڑی سی قیمت لے لیں، چناں چہ ان کے ہاتھوں نے جو لکھا اس کی وجہ سے ان کے لیے ہلاکت ہے، اور جو وہ کماتے ہیں اس کی وجہ سے ان کے لیے ہلاکت ہے (79)

یہود اور مفاد پرست فقہا میں مماثلت:

یہ وہ لوگ ہیں جو عوام کو ان کی خوشی کے مطابق باتیں جوڑ کر لکھ دیتے ہیں اور اس کی نسبت اللہ یا رسول کی طرف کرتے تھے، جیسے اس زمانے کے اکثر فقہا اہلِ رائے و قیاس ہیں۔ ان کا حال وہی ہے جو اگلے یہودیوں کا حال تھا کہ رشوت لے کر مسئلہ بناتے تھے۔ فقہ کی کتابوں کو دیکھو، کتنے مسئلے اور حیلے بنا کر تیار کر رکھے ہیں۔ جدھر کہو، حکم کی باگ موڑ دیں۔ جس ناجائز کو کہو، جائز کر دیں۔ دارالحرب کا نام لے کر سود کھلا دیں۔ شراب دو آتشہ پلا دیں۔ مَحرم سے زنا کرنے پر حد ساقط کر دیں۔ نبی کے جوتے کی مثل کی پوجا کرا دیں۔ قبروں پر چادر چڑھوا دیں۔ چراغ جلوا دیں۔ غرض اب سب کچھ ہو سکتا ہے۔ إِنَّا لِلّٰهِ...!

---

[1] تفسير الطبري (٢/ ٢٥٢۔ ٢٥٣) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٥٠)

اُمّی کا معنی:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: اُمی وہ ہے جو لکھنا نہیں جانتا۔ یہی قول ابو العالیہ، ربیع، قتادہ اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ وغیرہم کا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو اُمی اسی لیے کہا ہے کہ آپ لکھ نہیں سکتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴾ [العنكبوت: ٤٨] ''اور آپ اس (قرآن) سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے دائیں ہاتھ سے اسے لکھتے تھے، (اگر ایسا ہوتا) تب تو باطل پرست یقیناً شک کر سکتے تھے۔''[1]

حدیث میں مروی ہے کہ « إِنَّا أُمَّةٌ أُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسِبُ، اَلشَّهْرُ هٰكَذَا وَهٰكَذَا »[2] (الحدیث) ''ہم اَن پڑھ اُمت ہیں، لکھتے ہیں نہ حساب کرتے ہیں، مہینا اس طرح ہوتا ہے اور اس طرح ہوتا ہے (یعنی ۳۰ دن کا) پھر آپ نے اسی طرح کیا اور تیسری مرتبہ میں انگوٹھا نیچے کر لیا۔'' یعنی مہینا کبھی ۲۹ دن کا ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ ہم اپنی عبادات میں کسی حساب و کتاب کے محتاج نہیں ہیں، نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾ [الجمعة: ٢] ''وہی ہے جس نے اَن پڑھوں میں ایک رسول بھیجا انھی میں سے۔'' امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس کسی کو لکھنا نہیں آتا، عرب جہالت میں اس کو اس کی ماں کی طرف نسبت کرتے ہیں نہ کہ باپ کی طرف، یعنی یہ اپنی ماں کی طرح اَن پڑھ ہے۔[3]

﴿ اَمَانِيَّ ﴾ کی تفسیر:

لفظ ﴿ اَمَانِيَّ ﴾ سے جھوٹی باتیں مراد ہیں۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ہے۔[4] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد اُمیدیں ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ سے ویسی آرزو کرتے جو ان کے لیے نہیں ہے۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تمنا کر کے یہ کہتے ہیں کہ ہم اہلِ کتاب ہیں، حالاں کہ نہیں ہیں۔[5] یہ ویسی بات ہے جیسے اہلِ رائے و قیاس اپنے آپ کو اہل السنۃ کہتے ہیں، حالاں کہ وہ تارکِ سنت اور عاملِ بدعت ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ درستی کے زیادہ قریب سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ وہ تورات کو کچھ نہ سمجھتے تھے، لیکن جھوٹ بناتے۔[6]

اس جگہ ''تمنی'' سے مراد یہی جھوٹ گھڑ لینا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''تمنی'' سے مراد تلاوت ہے، یعنی صرف پڑھنا اور عمل سے کچھ تعلق نہ رکھنا۔ جن کی خرابی کا ذکر فرمایا ہے، وہ اَن پڑھوں کے سوا یہودیوں کی یہ دوسری قسم ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو جھوٹ اور فریب کی طرف دعوت دیتے، اللہ پر جھوٹ باندھتے اور لوگوں کا مال دھوکا دہی سے کھا جاتے تھے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ١٥٦)
[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٨١٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٨٠)
[3] تفسیر الطبري (٢/ ٢٥٩)
[4] تفسیر الطبري (٢/ ٢٦١) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔
[5] تفسیر الطبري (٢/ ٢٦١)
[6] تفسیر الطبري (٢/ ٢٦٢)

﴿ وَيْلٌ ﴾ کا معنی:

’’وَيْلٌ‘‘ کے معنی ہیں: ہلاکت اور بربادی۔ کسی نے کہا ہے کہ جہنم کا ایک جنگل ہے یا دوزخ کا زرد پانی۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں مروی ہے کہ ویل جہنم میں ایک وادی ہے۔ کافر آدمی اس کی تہہ تک پہنچنے کے لیے چالیس برس تک نیچے گرتا اور دھنستا رہے گا۔ (رواہ ابن أبي حاتم) ترمذی نے بھی اس کو روایت کیا ہے اور غریب کہا ہے۔ مگر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ترمذی کی سند کو منکر بتایا ہے۔[1] (غرابت منکر ہونے کے منافی نہیں ہے)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ویل عذاب کی مشقت کو کہتے ہیں۔ خلیل بن احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شدتِ شر کو کہتے ہیں۔ امام سیبویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو ہلاکت میں پڑا، اس کو ویل کہتے ہیں۔ امام اصمعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ویل دُکھ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ حزن ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ان سے علمائے یہود اور مشرکین مراد ہیں۔[3] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کچھ یہودی کتاب لکھ کر عرب کے ہاتھ فروخت کرتے تھے اور کہتے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور تھوڑی سی قیمت لے لیتے۔[4]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مسلمانو! تم اہلِ کتاب سے کیا پوچھتے ہو، یہ کتاب جو اللہ نے اپنے نبی پر اُتاری ہے، یہ سب خبریں دیتی ہے۔ یہ تر و تازہ ہے، بوڑھی نہیں ہوئی۔ اللہ نے تم کو بتا دیا ہے کہ اہلِ کتاب نے اللہ کی کتاب کو بدل ڈالا۔ وہ اپنے ہاتھ سے کتاب لکھ کر اسے اللہ کی کتاب ٹھہرا کر تھوڑی قیمت پر بیچ دیتے ہیں۔ یہ علم جو تمھارے پاس آیا ہے، کیا یہ تم کو ان سے پوچھنے سے منع نہیں کرتا؟ واللہ! ہم نے نہیں دیکھا کہ کبھی انھوں نے تم سے تمھاری کتاب کی کوئی بات پوچھی ہو۔ اس کو بخاری نے روایت کیا ہے۔[5]

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تھوڑے مول سے ساری دنیا مراد ہے۔[6] جو کچھ انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا، وہ سب جھوٹ، بہتان اور افترا پردازی ہے اور جو کچھ کما کر کھایا ہے، وہ سب حرام ہے۔ تفتازانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لفظِ ویل کا دہرانا اس لیے ہے کہ لکھنا اور قیمت لینا دو علاحدہ علاحدہ گناہ ہیں۔ ہر گناہ پر ویل ہے، نہ کہ ان کے مجموعے پر۔

مصحف کی خرید و فروخت کا حکم:

امام سیوطی رحمہ اللہ نے اس پر سلف سے کچھ آثار نقل کیے ہیں کہ اس آیت میں صحیفوں کی بیع کی کراہت کی دلیل

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٦٤) تفسير ابن كثير (١/ ١٥٧) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٥٣) اس کی سند میں ’’دراج عن أبي الهيثم‘‘ ضعیف ہے۔

[2] تفسير ابن كثير (١/ ١٥٧)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٥٣) اس کی سند حسن ہے۔

[4] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٥٣۔ ١٥٤)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٣٩)

[6] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٥٥)

ہے، حالاں کہ اس میں یہ دلیل نہیں ہے۔ پھر سلف کی ایک جماعت سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ مصحف کی خرید وفروخت بلا کراہت جائز ہے۔[1]

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸۰

اور انھوں نے کہا: آگ ہمیں گنتی کے چند دنوں کے سوا ہرگز نہیں چھوئے گی۔ کہہ دیجیے: کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لیا ہے؟ پھر تو اللہ اپنے عہد کے خلاف ہرگز نہیں کرے گا، کیا تم وہ بات کہتے ہو اللہ کے بارے میں جو تم نہیں جانتے؟ (80)

یہود کا زعمِ باطل:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ دنیا سات ہزار برس ہے۔ ہم ہر ہزار برس کے بدلے ایک دن آگ میں رہیں گے۔ یہ سات دن ہوئے اور پھر عذاب موقوف ہو جائے گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ اور اگلی آیت ﴿خٰلِدُوْنَ﴾ تک نازل فرمائی۔[2] دوسرا مطلب یہ ہے کہ یوں کہتے تھے کہ ہم نے جو چالیس دن تک بچھڑے کی پوجا کی ہے، بس اتنے ہی دن ہمیں آگ لگے گی باقی خیر سلا۔[3] تیسرا مطلب یہ ہے کہ چالیس برس آگ لگے گی۔[4]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح خیبر سے لوٹ کر یہودیوں کو جمع کر کے پوچھا: دوزخی کون لوگ ہیں؟ انھوں نے کہا: ہم دوزخ میں تھوڑا سا رہیں گے، پھر ہماری جگہ تم سب رہو گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھارا منہ کالا ہو، ہم ہرگز کبھی تمھاری جگہ نہ ہوں گے۔ اسی طرح لیث بن سعد رحمہ اللہ سے بخاری واحمد ونسائی رحمہم اللہ نے بھی حدیث روایت کی ہے۔[5] یہ کہنے میں کہ ''کیا تم نے کوئی اقرار لیا ہے؟'' ان کے اس باطل دعوے کا، کہ وہ چند روز سے زیادہ آگ میں نہیں رہیں گے، انکار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ تو اللہ کا اس بارے میں تمھارے ساتھ کوئی عہد ہوا ہے اور نہ تم نے کوئی عملِ صالح کیا ہے، جو تمھارے اس دعوے کو سچا کر دے۔ اس جگہ عہد سے وعدہ مراد ہے، بلکہ تم کو آگ ہمیشہ لگے گی نہ کہ چند روز، جیسا کہ تم کہتے ہو۔

---

① الدر المنثور (١/ ٢٠٣۔ ٢٠٦)

② تفسير الطبري (٢/ ٢٧٨) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٥٥) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحيح المسبور (١/ ٣٧۔ ٤٥)

③ تفسير الطبري (٢/ ٢٧٤، ٢٧٥) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔

④ تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٥٦) اس کی سند حسن ہے۔

⑤ صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٩٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤١٣) مسند أحمد (٢/ ٤٥١)

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

کیوں نہیں! جس نے کوئی برائی کمائی اور اسے اس کی برائی نے گھیر لیا، تو وہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے (81) اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے، وہی جنتی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے (82)

نجات کا دار و مدار:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بات یوں نہیں ہے، جیسے تم تمنا کرتے ہو، بلکہ جو کوئی گناہ کرتا ہے اور شرمندہ نہیں ہوتا، ان گناہوں کو لے کر قیامت کے دن آئے گا۔ برائیوں کے سوا کوئی اچھائی اس سے نہ ہوئی تو وہ اہلِ دوزخ میں سے ہے اور جس نے ایمان کے بعد شریعت کے مطابق عملِ صالح کیے، وہ اہلِ جنت میں سے ہے۔ یہ آیت ویسی ہی ہے، جیسے فرمایا ہے: ﴿ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ ﴾ [النساء: ۱۲۳۔ ۱۲۴] ’’(انجام کا دارومدار) نہ تمھاری خواہشات پر ہے نہ اہلِ کتاب کی خواہشات پر، بلکہ جو کوئی برا عمل کرے گا، اس کا اسے بدلہ دیا جائے گا، اور وہ اللہ کے سوا کوئی دوست اور مددگار نہ پائے گا۔ اور جو کوئی نیک کام کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، جب کہ وہ مومن ہو تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔‘‘

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ گناہ کمانے کا مطلب یہ ہے کہ تمھارے جیسے عمل کیے، تمھارے جیسا کفر کیا، ہر طرف سے کفر نے آ کر گھیر لیا، کوئی اچھا کام نہ ہوا۔ (1) دوسرا مطلب یہ ہے کہ مراد شرک ہے۔ (2) مجاہد، عکرمہ، حسن، قتادہ رحمہ اللہ وغیرہم کا بھی یہی قول ہے۔ امام سدی و حسن رحمہ اللہ نے یہ بھی کہا ہے کہ ﴿ سَيِّئَةً ﴾ سے مراد گناہِ کبیرہ ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی گناہ نے دل کو گھیر لیا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، امام عطا اور ابو وائل نے کہا ہے کہ شرک نے گھیر لیا۔ ربیع بن خثیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جس کی موت توبہ کرنے سے پہلے خطاؤں پر

---

(1) تفسير الطبري (۲/ ۲۸۰) تفسير ابن أبي حاتم (۱/ ۱۵۸) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحيح المسبور (۱/ ۳۷۔ ۴۵)

(2) تفسير ابن أبي حاتم (۱/ ۱۵۷) اس کی سند میں ’’نضر بن عبد الرحمٰن خزاز‘‘ متروک راوی ہے۔

ہوئی۔ ابو رزین اور سدی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ امام ابو العالیہ، مجاہد اور حسن رحمہ اللہ نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کو ایسی خطا نے گھیر لیا، جو گناہِ کبیرہ کو واجب کرتی ہے۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ سب اقوال معنی میں ایک دوسرے کے لگ بھگ ہیں۔ پھر سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث لکھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صغیرہ گناہوں سے بچو کہ یہ جمع ہو کر آدمی کو ہلاک کر دیتے ہیں، پھر یہ مثال بیان فرمائی کہ ایک قوم ایک جنگل میں اتری، باورچی آیا، کوئی لکڑی لایا، کوئی لکڑی لینے گیا، جب ایک ڈھیر جمع ہو گیا تو آگ جلائی، اس میں جو کچھ ڈالا، وہ پک گیا۔ اس کو احمد نے روایت کیا ہے۔[2] یعنی چھوٹے چھوٹے گناہ جمع ہوتے ہوتے گناہ گار کو ہلاک کر دیتے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ عملِ صالح کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس پر ایمان لایا جس کا تم نے انکار کیا، جو دین تم نے چھوڑ دیا، اس پر عمل کیا تو اس کے لیے بہشت ہے۔[3] خلود کے معنی دوام اور ہمیشگی کے ہیں، یعنی خیر اور شر کا ثواب خیر اور شر کرنے والوں کے لیے بلا انقطاع ہمیشہ قائم رہے گا۔

کبیرہ گناہ کرنے والا دائمی جہنمی نہیں:

اس کہنے سے کہ ''گھیر لیا گناہ نے'' یہ معلوم ہوا کہ صرف گناہ ہو جانا آگ میں ہمیشہ رہنے کا سبب نہیں ہوتا، بلکہ جب گناہ ہر طرف سے آ کر گھیر لیتا ہے، کوئی نیکی بھی باقی نہیں رہتی۔ نجات کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں تو تب آگ میں ہمیشگی ہوتی ہے۔ یہ قول کہ اس جگہ خطا سے مراد شرک ہے، زیادہ بہتر ہے، کیوں کہ حدیث سے تواتر کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے کہ موحد گناہ گار آگ سے باہر نکالے جائیں گے۔

اس کے علاوہ اگرچہ خصوصیتِ سبب کے بجائے لفظ کی عمومیت کا اعتبار ہے، مگر اس آیت کا نزول یہودیوں کے حق میں ہوا ہے۔ اس سے بھی شرک کی تائید نکلتی ہے۔ مفسرین کا اسی پر اجماع ہے۔ اس سے معتزلہ کے قول کا رد ہوا، کیوں کہ آگ میں ہمیشہ رہنا مشرکین اور کفار کا خاصا ہے۔ اس سے یہ بات متعین ہوگئی کہ اس جگہ ﴿سَيِّئَةً﴾ اور ﴿خَطِيْٓـئَتُهٗ﴾ سے مراد وہی کفر و شرک ہے، نہ کہ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرنا۔ پہلی آیت میں ﴿فَاُولٰٓئِكَ﴾ فرمایا تھا۔ دوسری آیت میں ﴿اُولٰٓئِكَ﴾ کہا۔ معلوم ہوا کہ شرک تو آگ میں ہمیشگی کا سبب ہے، مگر ایمان جنت میں ہمیشہ رہنے کا سبب نہیں، بلکہ جنت میں ہمیشگی صرف اللہ کے فضل پر موقوف ہے۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۵۷۔ ۱۵۹)

[2] مسند أحمد (۱/ ٤۰۲) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۵۹) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۳۱۰۲)

[3] تفسیر الطبري (۲/ ۲۸۷) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۵۹) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحیح المسبور (۱/ ۳۷۔ ٤۵)

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے پکا وعدہ لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور والدین، رشتے داروں، یتیموں اور مسکینوں سے نیک سلوک کرنا اور تم لوگوں سے اچھی باتیں کہنا اور نماز قائم کرنا، اور زکات دینا، پھر تم اس (وعدے) سے پھر گئے، مگر تم میں سے تھوڑے (اس کے پابند رہے) اور تم تو پھر جانے والے ہی ہو (83)

میثاقِ بنی اسرائیل:

بنی اسرائیل کا اقرارِ مذکور سے پھر جانا جان بوجھ کر تھا۔ وہ اپنے اقرار کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اللہ نے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ عبادت میں شرک نہ کریں۔ یہی حکم تمام لوگوں کو دیا ہے، بلکہ مخلوق کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ شرک کے بغیر اللہ کی عبادت بجا لائیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴿۲۵﴾ ﴾ [الأنبياء: ٢٥] ''اور آپ سے پہلے ہم نے جو بھی رسول بھیجا اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ بے شک میرے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [النحل: ٣٦] ''اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔'' سو تمام حقوق میں سے سب سے بڑا اور عمدہ حق بھی اللہ کا ہے کہ اکیلے اسی کو پوجیں، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں، اس کے بعد پھر مخلوق کا حق ہے۔ ان میں سب سے اہم اور تاکیدی حق ماں باپ کا ہے۔

والدین کا حق:

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے اور والدین کے حق کو ملا کر ذکر کیا ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۱۴﴾ ﴾ [لقمان: ١٤] ''(اور) یہ کہ تو میرا اور اپنے والدین کا شکر کر (بالآخر) میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ

رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴿24﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ۚ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا﴿25﴾ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا﴿26﴾﴾ [بني إسرائيل: ٢٣۔ ٢٦] ''اور آپ کے رب نے فیصلہ کر دیا کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور والدین سے اچھا سلوک کرو، اگر ان دونوں میں سے ایک یا دونوں تیرے ہاں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو تُو ان سے ''اُف'' تک نہ کہہ اور انھیں مت جھڑک، اور ان سے نرم (لہجے میں ادب و احترام سے) بات کر۔ اور ان کے لیے رحم دلی سے عاجزی کے ساتھ اپنا بازو (پہلو) جھکائے رکھ اور کہہ: میرے رب! ان دونوں پر رحم فرما جیسے انھوں نے بچپن میں میری پرورش کی۔ تمھارا رب خوب جانتا ہے جو کچھ تمھارے نفسوں میں ہے، اگر تم صالح ہو گے تو بلاشبہہ وہ (اپنی طرف) رجوع کرنے والوں کو بہت بخشنے والا ہے۔ اور قرابت دار کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو بھی، اور فضول خرچی سے مال نہ اُڑا۔'' صحیحین (بخاری و مسلم) میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! کون سا عمل افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وقت پر نماز پڑھنا۔ میں نے کہا کہ پھر کون سا عمل؟ فرمایا: ماں باپ سے حسنِ سلوک کرنا۔ میں نے کہا کہ پھر کون سا عمل؟ فرمایا: اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔[1] انتہیٰ

نماز اللہ کا حق ہے اور والدین کے ساتھ نیکی کرنا مخلوق کا حق ہے۔ اس کو جہاد پر بھی فوقیت دی۔ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ ایک آدمی نے کہا کہ میں کس کے ساتھ احسان اور نیکی کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی والدہ سے۔ اس نے کہا کہ پھر؟ فرمایا: وہی تیری ماں۔ اس نے کہا کہ پھر؟ فرمایا: اپنی والدہ سے۔ اس نے کہا کہ پھر؟ اپنے باپ سے، پھر جو تجھ سے جتنا قریب ہو۔[2] یہ جملہ کہ ''عبادت نہ کرنا مگر اللہ کی۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔

یتیم ان بچوں کو کہتے ہیں جن کے لیے کوئی کمانے والا باپ دادا نہیں ہوتا۔ مسکین وہ ہے جو اپنے اور گھر والوں کے لیے خرچ نہیں پاتا۔ اس کا بیان صراحتاً سورۃ النساء کی اس آیت کے نیچے آئے گا: ﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسٰنًا﴾ [النساء: ٣٦] ''اور تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔''

قولِ حسن کا معنیٰ:

نیک بات کہنے سے مراد یہ ہے کہ بھلی بات اور اچھا کلمہ کہے۔ نیز نرمی سے پیش آئے۔ اس میں اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر شامل ہے۔ جس طرح حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قولِ حسن یہ ہے کہ نیکی کا حکم دے اور

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٨)

بدی سے روکے۔ حوصلے اور معافی سے کام لے، قصور سے درگزر کرے۔ ہر نیک عادت، جس کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے، [1] وہ قولِ حسن ہے۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ تو کسی احسان کو حقیر نہ سمجھ، اگر کچھ نہ پائے تو خندہ پیشانی سے ہی ملے۔ اس کو مسلم رحمہ اللہ نے ابو عامر سے مروی حدیث میں روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ [2] ابو عامر کا نام صالح بن رستم ہے۔

پہلے فعلِ حسن کا ذکر کیا ہے، یعنی ماں باپ اور قریبی یتیم مسکین سے سلوک کرو۔ پھر قولِ حسن کا ذکر کیا۔ قولی و فعلی دونوں طرح کے احسانوں کو جمع کر دیا، پھر اپنی عبادت اور مخلوق کے ساتھ احسان کو نماز و زکات کے ساتھ تاکیداً ذکر فرمایا، پھر یہ خبر دی ہے کہ بنی اسرائیل نے یہ سب کام چھوڑ دیے تھے اور سب سے دیدہ و دانستہ منہ موڑ لیا تھا، مگر بہت تھوڑے لوگ اپنے اقرار پر قائم رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو بھی اسی طرح کا حکم دیا ہے۔

سورۃ النساء میں فرمایا ہے: ﴿ وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ﴾ [النساء: ٣٦] ”اور تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، رشتہ دار پڑوسی، اجنبی پڑوسی، پہلو کے ساتھی اور مسافر کے ساتھ اپنی اور اپنی زیرِ ملکیت کنیزوں اور غلاموں سے بھی نیکی کرو۔ بے شک اللہ ہر اِترانے والے، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔“ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جیسا کچھ اس اُمت نے ان کاموں کو اپنایا ہے، کسی پہلی اُمت نے نہیں اپنایا۔ [3]

مَیں کہتا ہوں کہ اس اُمت کے اسلاف نے ان کاموں کو اپنایا تھا، بعد میں آنے والوں نے، اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰه، ان کی خلاف ورزی ہی کی، لہٰذا جو طاقت اور امکان رکھنے کے باوجود ان اُمور پر قائم نہیں ہے، اس میں گویا یہودیوں کی خصلت اور بنی اسرائیل کی جہالت کا ایک نمونہ ہے۔ ابن ابی حاتم نے اس جگہ ایک بات نقل کی ہے جو غریب ہے کہ اسد بن وداعہ رحمہ اللہ جب گھر سے باہر نکلتے تو جو یہودی نصرانی ملتا اس کو سلام کرتے۔ کسی نے کہا کہ تم یہ کام کیوں کرتے ہو؟ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا ﴾ ”اور تم لوگوں سے اچھی باتیں کہنا۔“ وہ قولِ حسن یہی سلام ہے۔ اسی طرح عطا خراسانی رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ [4]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٦١۔ ١٦٢) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٢٦) سنن الترمذي، رقم الحدیث (١٨٣٣)

[3] تفسیر ابن کثیر (١/ ١٦١)

[4] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٦٢) اگر کسی عیسائی اور یہودی سے ملاقات کے موقع پا کر اس کا حال احوال پوچھ لیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن کسی غیر مسلم کو ملاقات پر سلام میں پہل کرنا یہ شرعاً درست نہیں ہے، کیوں کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہود و نصاریٰ کو سلام میں پہل نہ کرو۔ دیکھیں: صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢١٦٧)

یہود و نصاریٰ کو سلام میں پہل کرنا جائز نہیں:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سنتِ صحیحہ سے ثابت ہوا ہے کہ ان کو سلام کرنے میں پہل نہ کرے۔[1] وہ سلام کریں تو فقط ''وعلیکم'' کہے۔ لیکن اس زمانے میں غربتِ اسلام کی شدت کی وجہ سے یہ سنت بالکل متروک ہو گئی ہے۔

بنی اسرائیل سے جو یہ اقرار لیا تھا، یہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ہوا تھا۔ یہ اقرار وہی ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے۔ ایک شرک نہ کرنا۔ دوسرے ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا، اگرچہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو، جو کام اللہ کے حکم کے خلاف نہیں ہے، اس میں والدین کی اطاعت لازمی ہے۔ محتاج ہوں تو صلہ رحمی کرے، کافر ہوں تو ایمان کی طرف دعوت دے، بات چیت، اُٹھنا بیٹھنا ادب و لحاظ سے کرے۔ فاسق ہوں تو سختی کیے بغیر اَمر بالمعروف کرے اور اُف نہ کہے۔ کسی نے کہا ہے کہ قولِ حسن سے مراد کلمہ توحید یا سچی بات یا اچھا اخلاق ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ قول کوئی خاص نہیں، جس کو شرعاً حسن کہنا درست ہو، وہ سب اس میں داخل ہیں۔ ﴿قُوْلُوْا﴾ میں یا تو موسیٰ کے زمانے کے یہودیوں کو خطاب تھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے یہودیوں کو۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو یہ آٹھ حکم دیے تھے، مگر وہ اس پر قائم نہ رہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿٨٤﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٨٥﴾

اور جب ہم نے تم سے پکا وعدہ لیا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہاؤ گے اور نہ نکالو گے اپنے لوگوں کو اپنے وطن سے، پھر تم نے اقرار کیا اور تم (اس بات کے) گواہ ہو (84) پھر تم ہی وہ لوگ ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو اور اپنوں میں سے ایک فریق کو ان کے گھروں سے نکال

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ١٦١)

دیتے ہو، تم ان کے خلاف گناہ اور زیادتی کے ساتھ دوسروں کی مدد کرتے ہو۔ اور اگر وہ تمھارے پاس قیدی ہو کر آئیں تو تم انھیں فدیہ دے کر چھڑاتے ہو، حالاں کہ تم پر ان کا نکال دینا ہی حرام کر دیا گیا تھا۔ کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو شخص یہ کام کرے گا اس کی سزا اس کے سوا کوئی نہیں کہ رسوائی ہو دنیاوی زندگی میں اور قیامت کے دن وہ سخت ترین عذاب کی طرف دھکیلے جائیں گے اور تم جو عمل کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے (85)

یہودیوں کا یہودیوں کو حلفا کے لیے قتل کرنا:

یعنی اپنی قوم غیر کے ہاتھ پھنسے تو چھڑانے کو موجود ہوتے ہیں اور خود اُن کے ستانے میں کمی نہیں کرتے۔ اگر اللہ کے حکم پر چلتے ہو تو دونوں جگہ چلو۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں ان یہودیوں پر تنقید ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تھے۔ وہ اُوس اور خزرج سے لڑتے تھے۔ یہ دونوں قبیلے جاہلیت کے زمانے میں بُت پرست تھے اور اُن کی باہم لڑائی رہتی تھی۔ مدینے کے یہودیوں کے تین قبیلے تھے، بنو قینقاع، بنو نضیر جو خزرج کے حلیف تھے اور بنو قریظہ جو اوس کے حلیف تھے۔ جب لڑائی ہوتی تو ہر قبیلہ اپنے حلیفوں کے ہمراہ لڑتا۔ یہودی اپنے دشمن کو مارتا اور کبھی دوسرے یہودی کو بھی قتل کرتا، حالاں کہ ان کے دین میں شرعی حکم کے مطابق یہودی کا یہودی کو قتل کرنا حرام تھا۔ مگر وہ اسے مارتا، گھر سے نکال دیتا اور سارا مال لوٹ لیتا، پھر جب لڑائی ختم ہو جاتی تو شکست خوردہ فریق تورات کے حکم کے مطابق اپنے قیدی چھڑاتا۔

میثاق کی شقیں:

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم کتاب کے بعض حصے کو مانتے ہو، بعض کو نہیں مانتے۔ ہمارا تمھارا اقرار تو یہ تھا کہ نہ کسی کو قتل کرو، نہ کسی کو اس کے گھر سے نکالو اور نہ اس پر چڑھائی کرو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ﴾ [البقرۃ: ٥٤] ''لہٰذا اب تم اپنے پیدا کرنے والے کے حضور توبہ کرو، اور تم اپنے آپ کو قتل کرو یہ تمھارے لیے تمھارے پیدا کرنے والے کے نزدیک بہت بہتر ہے۔'' یہ اس لیے کہ ایک ملت والے ایک جان کی طرح ہوتے ہیں، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دوستی، رحمت اور میل جول کے لحاظ سے اہلِ ایمان کی مثال ایک جسم کی طرح ہے کہ جب ایک عضو بیمار ہو تو سارا بدن بخار سے گرم ہو جاتا ہے۔[1]

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٥٨٦) تفسیر ابن کثیر (١/ ١٦١)

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴿٨٦﴾

یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت کے عوض خرید لیا ہے، لہٰذا نہ تو ان سے عذاب ہلکے ہوں گے اور نہ ان کی مدد ہی کی جائے گی (86)

یہود کے کرتوت اور ان کی سزا:

اول آیت کے شروع سے یہاں تک یہودیوں کی مذمت ہے کہ جس تورات کو وہ صحیح کہتے ہیں، اسی کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس تضاد کی وجہ سے تورات سے ان کی نقل کا کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ ﷺ کی صفات، آپ کی بعثت کی جگہ اور ہجرت وغیرہ کے متعلق جو کچھ تورات میں مذکور تھا، انھوں نے وہ سب چھپا ڈالا اور غائب کر دیا تھا۔ اگلے پیغمبروں نے جو پیغمبر آخر الزمان کے بارے میں اطلاع دی تھی، ان ملعونوں نے اس کو آپس میں بھی پوشیدہ رکھا۔ اسی لیے اللہ نے کہا کہ اس کام کی سزا دنیا میں ذلت اور آخرت میں سخت سے سخت عذاب ہے۔ بھلا ان کے وہ کرتوت اللہ سے چھپے رہ سکتے ہیں، کیا انھوں نے اسے بے خبر سمجھ لیا ہے؟ ہاں انھوں نے آخرت دے کر دنیا مول لی ہے تو اب ایک گھڑی کے لیے بھی نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ کوئی انھیں اس عذاب سے چھڑائے گا۔

فتح البیان میں لکھا ہے کہ دنیا میں یہ رسوائی ہوئی کہ مارے گئے۔ ذلیل وخوار ہوئے۔ جزیہ دینا پڑا۔ وطن سے نکالے گئے۔ بنی قریظہ قتل ہوئے۔ قید میں پھنسے۔ بنی نضیر اپنے گھروں سے سرزمینِ شام میں اریحا و اذرعات کی طرف نکالے گئے اور آخرت کا عذاب الگ ہے۔ گویا دونوں جہان کی ذلت وخواری ان کا مقدر ہو گئی۔[1]

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ بِالرُّسُلِ ۖ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۗ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ﴿٨٧﴾

اور بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد اس کے پیچھے پے در پے رسول بھیجے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو کھلے معجزات دیے اور اسے روح القدس (جبریل) کے ساتھ قوت دی، کیا پھر جب کبھی تمھارے پاس کوئی رسول وہ چیز لایا، جسے تمھارے نفس نہ چاہتے تھے، تو تم نے

[1] فتح البیان (۱/ ۲۱۷)

تکبر کیا، پھر تم نے ایک فریق کو جھٹلایا اور دوسرے فریق کو تم قتل کر دیتے رہے ﴿87﴾

یہود کی سرکشی، انبیا کو جھٹلانا اور قتل کرنا:

کتاب سے مراد تورات ہے، جس کو انھوں نے تبدیل کر ڈالا اور اس کے خلاف عمل کیا۔ پھر جو رسول اور نبی موسیٰ علیہ السلام کے بعد آئے، وہ انھی کی شریعت کے مطابق حکم دیتے رہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ﴾ [المائدة: ٤٤] ''بے شک ہم نے تورات نازل کی، اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ اسی کے ذریعے سے فیصلے کرتے تھے انبیا جو اللہ کی اطاعت کرنے والے تھے، ان لوگوں کے لیے جو یہودی تھے اور اللہ والے اور علما فیصلے کرتے تھے، اس لیے کہ وہ اللہ کی کتاب کے نگران بنائے گئے تھے اور وہ اس پر گواہ تھے۔''

پے در پے رسولوں کو بھیجنے کے متعلق سدی رحمہ اللہ نے ابو مالک رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ ﴿ قَفَّيْنَا ﴾ کا معنی ''أَتْبَعْنَا'' ہے[1] اور کسی نے کہا ہے کہ ''أَرْدَفْنَا'' ہے۔ دونوں کا مطلب تقریباً ایک جیسا ہی ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ﴾ [المؤمنون: ٤٤] ''پھر ہم لگاتار اپنے رسول بھیجتے رہے۔'' یہاں تک کہ بنی اسرائیل کے انبیا کا اختتام عیسیٰ بن مریم علیہ السلام پر ہوا۔

یہ (عیسیٰ علیہ السلام) بعض احکام، تورات کے خلاف لے کر آئے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو معجزات عطا فرمائے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ مردے کو زندہ کرتے، مٹی سے پرندہ بناتے، اس میں جان پھونکتے، بیمار کو اچھا کرتے، غیب کی خبر سناتے اور روح القدس، یعنی جبریل علیہ السلام ہر وقت ان کے ساتھ بہ طور مددگار رہتے۔[2] یہ سب شان و شوکت اس لیے تھی کہ بنی اسرائیل انھیں سچا سمجھیں، مگر انھوں نے تورات کے بعض احکام کی مخالفت کی وجہ سے ان پر حسد کیا، پھر ان کے دشمن ہوگئے اور انھیں جھٹلانے لگے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے خبر دی: ﴿ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ [آل عمران: ٥٠] ''اور تاکہ میں تمھارے لیے بعض وہ چیزیں حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی تھیں اور میں تمھارے پاس تمھارے رب کی نشانی لے کر آیا ہوں۔''

الغرض بنی اسرائیل کا معاملہ انبیا کے ساتھ بہت برا تھا۔ ایک گروہ کو اگر جھٹلاتے تو دوسرے گروہ کو قتل کرتے۔ یہ اس لیے تھا کہ وہ انبیا ان کی رائے اور خواہشات کے خلاف حکم کرتے تھے اور تورات کے احکام کو ان کے لیے لازمی قرار دیتے تھے۔ تورات کی مخالفت کے لیے وہ جو زیادتی کرتے تھے، وہ پیغمبر اس سے روکتے تھے۔ یہ بات ان پر بہت گراں گزرتی تھی، لہٰذا بعض کے قتل اور بعض کو جھٹلانے کی نوبت آئی۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٦٨)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٦٨) تفسير ابن كثير (١/ ١٦٣) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحیح المسبور (١/ ٣٧ـ ٤٥)

مقلدین اور یہود میں مشابہت:

یہودیوں کی یہ خصلت اپنے آخر زمانے میں اس اُمتِ اسلام میں بھی پھیل گئی ہے۔ اہلِ بدعت اور اہلِ رائے سے جو کہتا ہے کہ قرآن و حدیث پر چلو تو یہ اس کی جان اور عزت کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اسے قتل کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ جو کوئی مسائلِ شریعت میں ان کی زیادتیوں کو ظاہر کرتا ہے، اس کو جھٹلاتے اور الغرض رسول اللہ ﷺ کا فرمان کہ تم «شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعاً بِذِرَاعٍ» یعنی بالشت بہ بالشت قدم بہ قدم یہود کی چال چلو گے۔[1] سچ ثابت ہوا اور مقلدینِ مذاہب نے یہ کام کر دکھایا۔

روح القدس کی تفسیر:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے مطابق:
﴿ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿١٩٣﴾ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ﴿١٩٤﴾ ﴾ [الشعراء: ١٩٣۔ ١٩٤] ''روح الامین (جبریل) اسے لے کر نازل ہوا۔ آپ کے دل پر، تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہوں۔'' اس جگہ روح القدس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے حق میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اَللّٰهُمَّ أَيِّدْ حَسَّانَ بِرُوحِ الْقُدُسِ»[2] ''اے اللہ! حسان کو روح القدس کے ساتھ مدد دے۔'' بعض روایات میں یہ الفاظ منقول ہیں کہ سیدنا حسان رضی اللہ عنہ سے کہا: «اُهْجُهُمْ أَوْ هَاجِهِمْ، وَجِبْرِيلُ مَعَكَ» ''تو بھی ان کی ہجو کر اور جبریل تیرے ساتھ ہے۔''[3]

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید　　　دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا میکرد

''روح القدس کا فیض اگر دوبارہ مدد کرے تو دوسرے بھی وہی کام کریں جو مسیحا نے سرانجام دیے۔''

شہر بن حوشب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کچھ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ ہم کو روح کے بارے میں بتاؤ؟ فرمایا: تمھیں اللہ کی اور اللہ کے ایام کی قسم! تم جانتے ہو کہ روح، جبریل ہیں؟ کہا: ہاں۔[4] صحیح ابن حبان میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: «إِنَّ رُوحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِي رُوعِي أَنَّهُ لَنْ تَمُوتَ نَفْسٌ حَتّٰى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا؛ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَجْمِلُوا فِي الطَّلَبِ»[5] ''تحقیق روح القدس نے میرے دل میں پھونکا کہ کوئی نفس نہیں مرے گا، یہاں تک کہ اپنے رزق کو پورا کرلے، پس ڈرو اللہ سے اور طلبِ رزق میں اچھا طریقہ اختیار

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٦٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٨٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٤١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٨٦)

[4] تفسير الطبري (٢/ ٣٢٠) یہ روایت مرسل ہے۔

[5] شعب الإيمان (٧/ ٢٩٩) نیز صحیح ابن حبان (٨/ ٣٢۔٣٣) میں اسی معنی کی ایک روایت سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٨٦٦)

کرو۔'' ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قابلِ ترجیح یہی قول ہے۔[1] اس کے سوا اور بھی اقوال ہیں، مثلاً: سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ روح القدس وہ اسم اعظم ہے جس کے ذریعے سے عیسیٰ مردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ روح دوسرے فرشتوں پر محافظ ہے۔ ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قدس سے مراد اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔[3] مجاہد اور حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قدس اللہ پاک ہے اور اس کی روح (یعنی اس کی پیدا کردہ) جبریل ہیں۔[4]

صدائے شہپر جبریل عشق ہر ساعت زجنبش دل پر اضطراب مے شنوم

''جبریل علیہ السلام کے لمبے پَروں کی صدا ہر لحظہ عشق ہے کہ جسے میں دل کی جنبش سے بے کل ہو کر سنتا ہوں۔''

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قدس برکت کے معنی میں ہے۔[5] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ طہر کے معنی میں ہے۔[6] کسی نے کہا ہے کہ روح سے مراد انجیل ہے، جس طرح قرآن بھی روح ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ﴾ [الشوریٰ: ٥٢] ''اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے ایک روح (قرآن) کی وحی کی۔'' لیکن صحیح وہی پہلا قول ہے، کیوں کہ ﴿ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ﴾ [المائدۃ: ١١٠] ''جب میں نے تجھے روح القدس (جبریل) کے ساتھ قوت دی۔'' فرما کر انجیل وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ پس اگر روح سے مراد انجیل ہوگی تو اللہ کے کلام میں بے فائدہ تکرار ظاہر ہوگی۔ امام زمخشری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قدس روح کی صفت ہے، یعنی پاک روح، گویا خود عیسیٰ علیہ السلام کی پاک روح مراد ہے،[7] مگر درست اور مضبوط بات وہی ہے، جو اوپر گزری۔ وللہ الحمد.

شریعت موسوی تا زمانۂ مسیح علیہ السلام:

موسیٰ علیہ السلام کے بعد پیغمبروں کا لگاتار آنا، ان کی شریعت کی اتباع کے طور پر تھا، نہ کہ ایک مستقل حیثیت سے۔ زمانہ عیسوی تک متواتر نبی آتے رہے۔ شریعت ایک ہی تھی۔ تمام انبیا تورات کی طرف بلاتے تھے، جیسے: شمویل، الیاس، ملشائیل، یسع، یونس، زکریا، یحییٰ، شعیا، خرقیل، داود، سلیمان، ارمیا، عیسیٰ علیہم السلام۔ اللہ نے ان رسولوں کو امتِ موسیٰ سے چن لیا اور ان سب سے یہ اقرار لیا تھا کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی امت کی صفت اپنی امتوں کو پہنچا دو۔ عیسیٰ علیہ السلام کو جو معجزے دیے تھے، ان کا ذکر سورت آلِ عمران اور مائدہ میں ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کا نام سریانی میں یسوع ہے۔ مریم کے معنی خادم ہیں۔

---

[1] تفسیر الطبري (٢/ ٣٢١)

[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہوئے اس کی نسبت ابن ابی حاتم کی طرف کی ہے۔ البتہ تفسیر ابن ابی حاتم میں ''اعظم'' کا ذکر نہیں ہے۔ دیکھیں: تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٦٩) تفسیر ابن کثیر (١/ ١٦٤) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٦٩) [4] تفسیر القرطبي (٢/ ٢٤)

[5] تفسیر الطبري (٢/ ٣٢٢) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٦٩) [6] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٦٩) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

[7] تفسیر الکشاف (١/ ١٨٩)

یہ اللہ کے گھر کی خادم تھیں۔ عبری زبان میں مریم کے معنی ہیں جو مرد سے لگاؤ نہ کرے۔ سیوطی نے ''تحبیر'' میں لکھا ہے کہ موسیٰ سے عیسیٰ تک ایک ہزار نو سو پچیس برس کا عرصہ گزرا۔

وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَل لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾

اور انھوں نے کہا: ہمارے دل غلافوں میں ہیں (نہیں) بلکہ ان کے کفر کے باعث اللہ نے ان پر لعنت کی ہے۔ لہٰذا کم لوگ ہی ایمان لاتے ہیں ﴿88﴾

دل پر پردہ کا معنیٰ:

یہودی اپنی تعریف میں کہتے تھے کہ ہمارے دل پر پردہ ہے۔ یعنی ہمیں اپنے دین کے سوا اور کسی کی بات اثر نہیں کرتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ لعنت کی نشانی ہے کہ حق بات اثر نہ کرے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ غلاف سے مراد ہے کہ کچھ نہیں سمجھتا۔[1] دوسرا مطلب یہ ہے کہ دل پر مہر لگ گئی ہے۔[2] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پردہ پڑ گیا ہے۔[3] جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ ﴾ [حم السجدة: ٥] ''اور انھوں نے کہا: جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے، اس سے ہمارے دل پردوں میں ہیں۔'' ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو قابلِ ترجیح بتایا ہے۔[4]

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ دل چار طرح کے ہوتے ہیں، ان میں سے ایک اغلف ہے، جس پر اللہ کا غصہ ہوا۔ یہ کافر کا دل ہوتا ہے۔[5] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس دل کا ختنہ نہیں ہوا،[6] یعنی بھلائی سے دور اور پاکیزگی سے الگ ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی منقول ہے کہ ہمارے دل علم سے پُر ہیں اور ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے محتاج نہیں ہیں۔[7] اس پر اللہ نے لعنت کی، جیسا کہ سورۃ النساء میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿١٥٥﴾ ﴾ [النساء: ١٥٥] ''اور انھوں نے یہ کہا کہ ہمارے دل پردوں میں ہیں، بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی، چناں چہ وہ ایمان نہیں لاتے مگر تھوڑے ہی۔'' یعنی ایمان لانے والے تھوڑے ہیں۔ کافر بہت منکر ہیں یا ان کا ایمان تھوڑا ہے، یعنی قیامت، ثواب و عذاب کے بارے میں جو حکم موسیٰ علیہ السلام لائے تھے، اس کو تو مانتے ہیں، لیکن جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں، اس کو نہیں مانتے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار کے بعد سابقہ ایمان کیا فائدہ دے سکتا ہے؟ بعض نے کہا ہے کہ قلیل سے مراد یہ ہے کہ کچھ بھی ایمان نہیں

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ١٦٥)
[2] تفسیر الطبري (٢/ ٣٢٦) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔
[3] تفسیر الطبري (٢/ ٣٢٧)
[4] تفسیر الطبري (٢/ ٣٢٧۔ ٣٢٨)
[5] مسند أحمد (٣/ ١٧) السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (٥١٥٨)
[6] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٧٠)
[7] تفسیر الطبري (٢/ ٣٢٧) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٧٠) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔

لاتے، سب کے سب ہی تو منکر ہو رہے ہیں، جیسے یہ محاورہ ہے "مَنْ زَنٰی بِأَرْضٍ قَلَّمَا تَنْبُتُ، یَعْنِيْ لَا تَنْبُتُ شَیْئًا"، یعنی جس زمین میں حرام کاری ہوتی ہے، وہاں کم ہی پیداوار ہوتی ہے، یعنی وہاں کسی طرح کی پیداوار نہیں ہوتی۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٨٩﴾

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آگئی جو اس (کتاب) کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس ہے، اور اس سے پہلے وہ ان لوگوں کے خلاف فتح مانگتے تھے، جنھوں نے کفر کیا، پھر جب ان کے پاس وہ (حق) آگیا جسے انھوں نے پہچان لیا تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا، لہٰذا کافروں پر اللہ کی لعنت ہے (89)

یہود بعثت کے منتظر تھے:

یہودی جب کافروں کا غلبہ دیکھتے تو دعا مانگتے کہ نبیِ آخر الزمان جلدی ظاہر ہوں، لیکن جب آپ پیدا ہوئے تو آپ ہی ان کے منکر ہوگئے۔ اس جگہ کتاب سے مراد قرآن ہے اور یہ قرآن تورات کو سچا بتاتا ہے۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ یہ آیت انصار اور یہود کے حق میں اُتری ہے۔ وہ یہود جو انصار کے ہمسائے تھے۔ انصار کہتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں ہم مدت تک ان پر غالب رہے، جبکہ ہم مشرک تھے اور وہ اہلِ کتاب۔ وہ کہا کرتے تھے کہ عن قریب ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے۔ اس کا زمانہ آگیا تو ہم اس کے ہمراہ ہو کر تم کو قومِ عاد و اِرم کی طرح قتل کریں گے۔ جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو قریش میں سے بھیجا تو ہم نے آپ ﷺ کی پیروی اختیار کی اور وہ یہودی منکر ہوگئے۔ اور اُن کو پہچاننے کے باوجود کافر بن گئے،[1] یہی اس آیت کا مطلب ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب انھوں نے دیکھا کہ یہ پیغمبر یہودیوں میں سے نہیں ہوئے، بلکہ غیر یہود سے اٹھے ہیں تو حسد کیا۔[2] ورنہ بقول ابو العالیہ رحمہ اللہ یوں کہا کرتے تھے کہ اے اللہ! اس نبی کو بھیج، جس کو ہم اپنے نزدیک، یعنی تورات میں لکھا ہوا پاتے ہیں، تاکہ ہم مشرکین کو عذاب دیں اور قتل کریں۔[3]

تقلید کی مذمت:

اس آیت سے یہ واضح ہوا کہ حق کو پہچان کر نہ ماننا، لعنت کا سبب ہوتا ہے۔ یہ بڑے خوف کا مقام ہے جسے

---

① تفسیر الطبري (۲/ ۳۳۲۔ ۳۳۳)
② تفسیر الطبري (۲/ ۳۳٤) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔
③ تفسیر الطبري (۲/ ۳۳۵)

یار لوگوں نے ہلکا سمجھ لیا ہے۔ قرآن و حدیث کی اتباع فرض ہے۔ اس فرضیت کو سارے مسلمانوں نے اس دن سے پہچان رکھا ہے، جس دن سے قرآن نازل ہوا اور سنت ملی، مگر اس حق پر اکثر مخلوق نہیں چلتی۔ جاہل لوگ دین میں تقلید کو واجب خیال کرتے ہیں اور رائے و قیاس پر عمل کرتے ہیں۔ یہ یہودیت کا ایک شعبہ ہے، جو اس اُمت کے بعض لوگوں میں آ گیا ہے، کیوں کہ اصل تقلید یہودیوں ہی سے نکلی ہے، جس طرح قرآن پاک سے ثابت ہوتا ہے۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹۰

وہ چیز بہت بری ہے جس کے بدلے انھوں نے اپنے نفس بیچ دیے، یہ کہ وہ اس چیز کا انکار کرتے ہیں جو اللہ نے نازل کی، صرف اس حسد کی بنا پر کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے اپنا فضل نازل کرے، پس وہ غضب در غضب کے ساتھ لوٹے اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے (90)

غضب بالائے غضب کا معنی:

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہودیوں نے حق دیا اور باطل لیا، جبکہ محمد ﷺ کی تعریف کو چھپایا۔[1] سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن کا انکار کیا، نبی کی تصدیق اور مدد سے الگ رہے۔[2] یہ بات اس حسد، کراہت اور ضد سے کی کہ اللہ کا کلام آپ ﷺ پر کیوں اترا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا حسد ہوگا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ایک غضب اس پر ہوا کہ تورات کو ضائع کیا۔ دوسرا غضب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا انکار کیا۔[3] غضب بالائے غضب میں مبتلا ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس دہرے غضب و غصے کے مستحق ٹھہر گئے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلا غصہ یہ ہے کہ انجیل و عیسیٰ علیہ السلام کو نہ مانا۔ دوسرا یہ کہ قرآن و محمد ﷺ کا انکار کیا۔ امام عکرمہ و قتادہ رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلا غضب بچھڑے کے پوجنے پر تھا اور دوسرا رسول اللہ ﷺ کے انکار پر۔[4]

تکبر کی سزا:

ذلت کا عذاب اس لیے مقرر ہوا کہ یہ کفر، حسد و ضد کے سبب سے تھا۔ بغاوت و حسد کا مقصد یہی تکبر ہوتا ہے، اس لیے تکبر کے مقابلے پر خواری اور ذلت دارین تجویز ہوئی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ

(1) تفسير الطبري (٢/ ٣٤٠، ٣٤١) (2) تفسير ابن كثير (١/ ١٦٧)
(3) تفسير الطبري (٢/ ٣٤٥) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٧٣) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحيح المسبور (١/ ٣٧۔ ٤٥)
(4) تفسير الطبري (٢/ ٣٤٦) تفسير ابن كثير (١/ ١٦٧)

عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴿٦٠﴾ ﴾ [المؤمن: ٦٠] ''بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں، وہ عن قریب ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔'' یعنی خوار، ذلیل، حقیر اور فقیر و بے حقیقت ہو کر جہنم میں جائیں گے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ متکبر لوگ قیامت کے دن چیونٹیوں کی مثل آدمی کی شکل میں اٹھائے جائیں گے، ان پر ہر قسم کی ذلت و خواری چڑھی آتی ہوگی، یہاں تک کہ جہنم کے بولس نامی قید خانے میں داخل ہوں گے، وہاں ان پر سب سے بڑی آگ سوار ہوگی اور دوزخیوں کا نچوڑ (پیپ) ان کو پلایا جائے گا۔[1]

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٩١﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی (کتاب) پر ایمان لاؤ تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے اور وہ اس کے ما سوا کا انکار کرتے ہیں، حالاں کہ وہ (قرآن) حق ہے اس (کتاب) کی تصدیق کرتا ہے جو ان کے پاس ہے، کہہ دیجیے: پھر اس سے پہلے اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کرتے رہے اگر تم مومن تھے؟﴿91﴾

یہود کا جھوٹا دعوائے ایمان:

مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارے لیے تورات اور انجیل پر ایمان لانا کافی ہے، لہٰذا ہم قرآن کو نہیں مانتے، حالاں کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ قرآن تورات و انجیل کی تصدیق کرنے والا ہے۔ لہٰذا جب وہ ان کی تصدیق کرنے والا ہے تو ان پر اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق حجت قائم ہوگئی: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ﴾ [البقرة: ١٤٦] ''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس (رسول) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔'' پھر اللہ نے یہ الزام دیا کہ اگر تمھارا یہ دعویٰ کہ تم تورات اور انجیل پر ایمان رکھتے ہو، سچا ہوتا تو تم انبیا کو کیوں قتل کرتے؟ آخر وہ بھی تو یہی کہتے تھے کہ تورات سچی کتاب ہے اور تم کو بھی ان کا سچ معلوم ہو گیا تھا، پھر جو تم نے ان کو قتل کیا تو یہ بغاوت، دشمنی اور تکبر نہیں تھا تو اور کیا تھا؟

معلوم ہوا کہ تم صرف اپنی رائے اور خواہشات کے تابع ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿٨٧﴾ ﴾ [البقرة: ٨٧] ''کیا پھر جب کبھی

[1] مسند أحمد (٢/ ١٧٩) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٦٧)

تمھارے پاس کوئی رسول وہ چیز لایا، جسے تمھارے نفس نہ چاہتے تھے، تو تم نے تکبر کیا، پھر تم نے ایک فریق کو جھٹلایا اور دوسرے فریق کو تم قتل کر دیتے رہے۔'' امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انھیں قتلِ انبیا پر عار دلائی ہے۔[1] فتح البیان میں ہے کہ اگرچہ بہ ظاہر یہ اس وقت کے یہود و نصاریٰ سے خطاب ہے، مگر ان کے اسلاف مراد ہیں، کیوں کہ یہ جب ان کے فعل پر راضی ہوئے تو گویا انھی جیسے ہوئے۔ معلوم ہوا کہ معصیت پر راضی ہونے والا، معصیت کرنے والے کی طرح ہوتا ہے۔[2]

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

اور بے شک موسیٰ تمھارے پاس کھلے معجزات لے کر آئے، پھر اس کے بعد تم نے بچھڑے کو پوجنا شروع کر دیا اور تم ہو ہی ظالم ﴿92﴾

موسیٰ علیہ السلام کی نشانیاں:

بینات سے مراد واضح آیات اور اس بات کے قطعی دلائل ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ نشانیاں یہ تھیں: طوفان، ٹڈی، مینڈک، عصا، من و سلوی، بادل کا سایہ، دریا کا پھٹ جانا اور پتھر سے نہروں کا جاری ہونا وغیرہ۔ اس کے ساتھ جب طور پر گئے تو تم نے ان کے پیچھے بچھڑے کو معبود ٹھہرا لیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ﴾ [الأعراف: ۱۴۸] ''اور موسیٰ کی قوم نے ان کے (طور پر جانے کے) بعد اپنے زیورات سے ایک بچھڑا بنا لیا، وہ ایک جسم تھا جس کی آواز گائے کی تھی۔'' سو تم ظالم ہو، یعنی بچھڑے کی عبادت میں، یہ اس لیے کہ شرک ظلم ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [لقمان: ۱۳] ''بے شک شرک تو بہت بڑا ظلم ہے۔''

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

اور (یاد کرو) جب ہم نے تم سے پکا وعدہ لیا اور ہم نے تم پر طور پہاڑ کو بلند کیا (اور

---

[1] تفسیر الطبري (۲/ ۳۵۰)
[2] فتح البیان (۱/ ۲۲۳)

کہا:) ہم نے تم کو جو دیا ہے اسے قوت کے ساتھ پکڑو اور سنو! انھوں نے کہا: ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی، اور ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت پلا (ڈال) دی گئی ان کے کفر کی وجہ سے۔ کہہ دیجیے: اگر تم مومن ہو تو وہ کام برا ہے جسے کرنے کا تمھارا ایمان تمھیں حکم دیتا ہے (93)

بچھڑے کی محبت پلانے کا مفہوم:

اس آیت کی تفسیر پہلے گزر چکی ہے۔ اللہ گن گن کر ان کی خطائیں جتلا رہا ہے۔ بچھڑے کا رچ جانا یہ ہے کہ دل میں اس کی محبت گھس گئی۔ ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ کسی چیز کی محبت تجھے اندھا بہرا کر دیتی ہے۔ (رواه أحمد)[1] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بچھڑے کو لے کر ذبح کیا اور اس کو ریتی سے رگڑ رگڑ کر اس کے برادے کو دریا میں پھینک دیا۔ اس دن جو دریا بہتا تھا، کچھ نہ کچھ اس میں سے اس میں جا ملا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اس کا پانی پیو۔ سب نے پانی پیا، جس کے دل میں اس بچھڑے کی محبت تھی، اس کی مونچھوں پر سونے کا اثر ظاہر ہوا۔ یہ اس آیت کا مطلب ہے کہ وہ اپنے دلوں میں اس کی محبت پلائے گئے تھے۔[2]

سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جس کسی نے اس پانی کو پیا اور وہ بچھڑے سے محبت کرنے والا تھا تو اس کا چہرہ سونے کی طرح زرد ہو گیا۔[3] سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے چہرے زعفران کی طرح زرد ہو گئے۔[4] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کتبِ قشیری سے نقل کیا ہے کہ بچھڑے کے جس عبادت گزار نے بھی وہ پانی پیا، وہ مجنون ہو گیا۔ پھر کہا کہ یہاں یہ مقصد نہیں، کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے لب اور چہرے پر اثر ظاہر ہوا،[5] حالاں کہ یہاں یہ مذکور ہے کہ ان کے دل میں اس بچھڑے کی محبت گھس گئی تھی، یعنی اس وقت جب وہ اس کے عبادت گزار تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ان قبیح اعمال کے باوجود تم کس طرح ایمان کے دعوے دار بنتے ہو؟ یعنی درحقیقت تم مومن نہیں ہو، اس لیے کہ ایمان کسی طرح یہ حکم نہیں کرتا کہ بچھڑے کو پوجو یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرو۔

---

(1) مسند أحمد (٥/ ١٩٤) اس روایت کی سند میں ''ابو بکر بن عبداللہ بن ابی مریم'' ضعیف راوی ہے۔ تاہم موقوفاً صحیح ہے، یعنی حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

(2) تفسیر الطبري (٢/ ٧٤)

(3) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٧٦) اس کی سند حسن ہے۔

(4) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٧٦)

(5) تفسیر القرطبي (٢/ ٣٢)

قُلۡ اِنۡ كَانَتۡ لَكُمُ الدَّارُ الۡاٰخِرَةُ عِنۡدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنۡ
دُوۡنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنۡ يَّتَمَنَّوۡهُ اَبَدًاۢ
بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِالظّٰلِمِيۡنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمۡ
اَحۡرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا ۚۛ يَوَدُّ اَحَدُهُمۡ
لَوۡ يُعَمَّرُ اَلۡفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحۡزِحِهٖ مِنَ الۡعَذَابِ اَنۡ يُّعَمَّرَ ؕ
وَاللّٰهُ بَصِيۡرٌۢ بِمَا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۶﴾

کہہ دیجیے: اگر اللہ کے ہاں آخرت کا گھر، خاص تمھارے ہی لیے ہے اوروں کو چھوڑ کر تو تم موت کی تمنا کرو، اگر تم سچے ہو ﴿94﴾ اور وہ اپنے ان گناہوں کی وجہ سے جو اپنے ہاتھوں کما کر آگے بھیج چکے ہیں، اس (موت) کی کبھی تمنا نہیں کریں گے اور اللہ ظالموں کو خوب جاننے والا ہے ﴿95﴾ اور یقیناً آپ ان (یہودیوں) کو سب لوگوں سے بڑھ کر جینے کے حریص پائیں گے، اور ان لوگوں سے بھی زیادہ جنھوں نے شرک کیا، ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کاش! اسے ایک ہزار سال کی عمر مل جائے، حالاں کہ اس قدر عمر کا ملنا بھی اسے عذاب سے بچانے والا نہیں اور جو عمل وہ کرتے ہیں اللہ اسے خوب دیکھنے والا ہے ﴿96﴾

یہود کو مباہلہ کی دعوت:

وہ کہتے تھے کہ جنت میں ہمارے سوا کوئی نہیں جائے گا اور ہم کو عذاب نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم یقیناً جنتی ہو تو مرنے سے کیوں ڈرتے ہو۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سے فرمایا کہ تم ان سے کہہ دو کہ اس فریق کے لیے، جو جھوٹا ہے، موت کی دعا کرو، لیکن انھوں نے یہ نہ مانا۔ اگر ایک دن بھی وہ یہ آرزو کرتے تو روئے زمین پر تمام یہودی مر جاتے۔[1] موت کی تمنا سے مراد موت طلب کرنا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ اگر یہودی موت کی آرزو کرتے تو مر جاتے اور آگ میں اپنی جگہ دیکھ لیتے اور جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مباہلہ کرنے کے لیے نکلے تھے، وہ اگر لوٹ کر جاتے تو اہل و مال میں سے کچھ نہ پاتے۔[2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس آیت کی تفسیر میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا وہی پہلا قول متعین ہے، یعنی فریقین میں سے یا مسلمانوں میں سے جو سب سے زیادہ جھوٹا ہو، اس پر بہ طور مباہلہ بد دعا کرو۔ اسی طرح سورت

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٧٧) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحیح المسبور (١/ ٣٧۔ ٤٥)
[2] تفسیر الطبري (٢/ ٣٦٢) و إسناده صحیح، کما قال العلامة أحمد شاکر رحمہ اللہ.

جمعہ کی یہ آیت بھی آئی ہے: ﴿ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ۝ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝ ﴾ [الجمعة:٦۔ ٨] ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: اے لوگو جو یہودی ہوئے! اگر تم دعویٰ کرتے ہو کہ بے شک تم اللہ کے دوست ہو سب لوگوں کے سوا، تو موت کی تمنا کرو، اگر تم سچے ہو۔ اور وہ کبھی یہ تمنا نہیں کریں گے بوجہ ان (برے اعمال) کے جو وہ اپنے ہاتھوں آگے بھیج چکے ہیں، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ کہہ دیجیے: بے شک موت جس سے تم فرار ہوتے ہو، وہ تو یقیناً تمھیں ملنے والی ہے، پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو غیب اور حاضر کو جاننے والا ہے، پھر وہ تمھیں بتائے گا جو تم عمل کرتے تھے۔''

غرض کہ جب ان ملعونوں نے یہ گمان کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور محبوب ہیں اور یہ کہا کہ جنت میں یہودی اور نصرانی کے سوا اور کوئی نہیں جائے گا تو انھیں مباہلہ اور سب سے جھوٹے فریق پر بد دعا کرنے کے لیے بلایا گیا۔ جب وہ بھاگ گئے تو سب نے جان لیا کہ وہی ظالم ہیں، کیوں کہ اگر انھیں اپنے سچا ہونے کا یقین تھا تو پھر وہ آگے کیوں نہ بڑھے۔ جب وہ آگے نہیں آئے تو معلوم ہوا کہ جھوٹے اور دغا باز ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ویسی بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نجران کے وفد کو، جو نصاریٰ تھے، مناظرے میں قیامِ حجت کے بعد ان کو مباہلے کی طرف بلایا اور آیتِ مباہلہ نازل ہوئی تو انھوں نے آپس میں یہ بات کہی کہ اگر تم نے اس نبی سے مباہلہ کیا تو تم میں سے کوئی بھی باقی نہ بچے گا، چناں چہ انھوں نے مجبوراً جزیہ دینے پر صلح کر لی۔[1]

مباہلے میں وسعت:

اسی سے ملتی جلتی وہ آیت ہے جو مشرکین سے کہی گئی: ﴿ قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ﴾ [مریم: ٧٥] ''کہہ دیجیے: جو شخص گمراہی میں ہے، (لازم ہے کہ) اسے رحمٰن لمبی ڈھیل دے دے۔'' یعنی ہم میں اور تم میں جو کوئی گمراہ ہوگا، اللہ اس کی گمراہی کو زیادہ کرے گا۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے صفاتِ الٰہی کے مسئلے میں منکرینِ صفات سے مباہلہ کرنا چاہا تھا، مگر وہ تیار نہ ہوئے، اسی طرح اپنے وقت میں اہلِ علم کی ایک اور جماعت نے اہلِ بدعت و ضلالت سے مباہلے کا ارادہ کیا تھا، مگر کوئی مباہلے پر راضی نہ ہوا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ اہلِ باطل و ضلال کو ہمیشہ نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ مباہلہ رسول اللہ ﷺ یا آپ ﷺ کے زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ یہ قیامت تک ہر زمانے میں حق کے مخالفین اور باطل کے مددگاروں کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ وہ مباہلے کا معاملہ نہیں تھا۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ کا بھی یہی خیال ہے۔[2] لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ

---

[1] تفسير ابن كثير (١/ ١٧٠)
[2] تفسير الطبري (٢/ ٣٦٣۔ ٣٦٤)

نے کہا ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق وہ گفتگو مباہلے کے طور پر تھی، اسی لیے وہ اس میدان سے بھاگ نکلے، کیوں کہ انھیں اپنے جھوٹ، افترا (بہتان بازی) اور نبی کی صفتوں کو چھپانے کا حال معلوم تھا اور وہ جانتے تھے کہ مباہلے میں جھوٹا فریق نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ اس جگہ اس مباہلے کا نام تمنی اس لیے رکھا گیا کہ ہر حق پرست یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ باطل کے حق میں مناظرہ کرنے والے کو ہلاک کر دے، خصوصاً جب اس کے پاس حق بیان کرنے اور سچائی ظاہر کرنے کے لیے حجت بھی موجود ہوتی ہے۔

لمبی زندگی کی تمنا کا سبب:

وہ مباہلہ موت کے لیے تھا، کیوں کہ انھیں زندگی بہت پیاری تھی اور جانتے تھے کہ مرنے کے بعد برا انجام ہوگا۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا ہے کہ وہ ہرگز ایسی تمنا نہیں کریں گے، بلکہ ان کی تو یہ تمنا ہے کہ ہزار برس جئیں۔ اس قدر لمبی عمر اس لیے چاہتے تھے کہ وہ عاقبت کے برے انجام کو جانتے تھے، کیوں کہ دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے، ان کی آرزو مشرکوں کی آرزو سے بھی بڑھی ہوئی تھی جو کتاب نہیں رکھتے تھے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مشرکین سے اس جگہ عجمی لوگ مراد ہیں۔ اسی طرح حاکم رحمہ اللہ نے ثوری رحمہ اللہ سے بھی صحیح سند سے روایت کیا ہے۔[2] امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَحْرَصَ النَّاسِ ﴾ سے مراد منافق ہیں کہ وہ حرص میں مشرکوں سے بھی زیادہ تھے۔[3] ہر یہودی یا ہر مجوسی یہ چاہتا ہے کہ وہ ہزار برس جیے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ فارسی کا مقولہ ہے کہ ''ہزار سال بزی'' یا ''ہزار سال نو روز یا مہرجان بزی۔'' تو ہزار سال جیے یا ہزار سال نو روز کا یا مہرجان کا جشن منائے۔[4] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ ان کو ساری عمر گناہ کرنا محبوب ہے۔[5]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ جینا ان کو عذاب سے نجات نہ دے گا، کیوں کہ مشرک کو مرنے کے بعد جی اُٹھنے کی امید نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جتنا زندہ رہے، وہی غنیمت ہے۔ یہودی سمجھ چکا ہے کہ آخرت میں ذلت و رسوائی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔[6] اس لیے لمبی زندگی کو دوست رکھتا ہے۔ یہ یہودی وہی ہیں جو جبریل علیہ السلام کے دشمن تھے، سو جس طرح ابلیس کو لمبی عمر کا کوئی فائدہ نہیں، اسی طرح لمبی عمر ان کو بھی اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔

---

1. تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۷۱)
2. تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۷۸) مستدرك الحاكم (۲/ ۲۸۹) ان دونوں کی اسناد صحیح ہے۔
3. تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۷۸)
4. تفسیر الطبري (۲/ ۳۷۲۔ ۳۷۳) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۷۹) اس کی سند صحیح ہے۔
5. تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۷۹)
6. تفسیر الطبري (۲/ ۳۷۱) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۷۹) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحیح المسبور (۱/ ۳۷۔ ٤٥)

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَإِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِإِذْنِ
اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٩٧﴾
مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ
فَإِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٩٨﴾

(اے نبی!) کہہ دیجیے: جو کوئی جبریل کا دشمن ہے، تو اُسی نے اِس قرآن کو اللہ کے حکم سے آپ کے دل پر نازل کیا ہے، یہ اس (کتاب) کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے نازل ہوئی اور مومنوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہے (97) جو کوئی اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کے رسولوں کا اور جبریل اور میکائیل کا دشمن ہے تو بے شک اللہ بھی کافروں کا دشمن ہے (98)

یہودیوں کی جبرائیل سے عداوت:

یہودیوں نے کہا ہے کہ یہ کلام جبریل لاتا ہے اور وہ ہمارا دشمن ہے۔ کئی بار ہمارے دشمنوں کو ہم پر غالب کر گیا ہے۔ کوئی اور فرشتہ لاتا تو ہم مانتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فرشتے جو کچھ کرتے ہیں، وہ حکم کے بغیر نہیں کرتے۔ جو کوئی ان کا دشمن ہوگا، بے شک اللہ اس کا دشمن ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ آیت بنی اسرائیل کے یہودیوں کے جواب میں اُتری، وہ جبریل علیہ السلام کو اپنا دشمن اور میکائیل علیہ السلام کو دوست سمجھتے تھے۔ اس میں اختلاف ہے کہ یہ بات انھوں نے کس طرح کہی؟ بعض نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نبوت کے بارے میں ان کا مناظرہ ہوا تھا تو اس پر یہ گفتگو ہوئی،[1] پھر اس مناظرے کی تفصیل لکھی ہے، جو امام احمد و ترمذی وغیرہما کی روایت سے تفسیر ابن کثیر میں مذکور ہے۔[2]

فرشتوں کے نام، کام اور ان پر ایمان:

امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''جبر''، ''میک''، ''اسراف'' کے معنی عبد ہیں اور ایل کے معنی اللہ ہیں۔[3] دیگر سلف نے بھی اسی طرح کہا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ''ایل'' کے معنی عبد کے ہیں، باقی کلمات کے معنی اللہ، کیوں کہ ''ایل'' کا لفظ کسی جگہ نہیں بدلتا، جیسے عبداللہ، عبدالرحمن، عبدالملک، عبدالسلام، عبدالکافی، عبدالجلیل وغیرہ کہ ان ناموں

(1) تفسير الطبري (٢/ ٣٧٧)

(2) تفسير ابن كثير (١/ ١٧٢۔ ١٧٣) مسند أحمد (١/ ٢٧٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١١٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٣٣٦)
امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رواه أحمد و الطبراني و رجالهما ثقات'' مجمع الزوائد (٨/ ٤٣٦۔ ٤٣٨)

(3) صحيح البخاري (٤/ ١٦٢٧)

میں لفظ عبد موجود ہے، بس مضاف الیہ بدلا گیا ہے۔ غیر عرب کے کلام میں مضاف الیہ پہلے آتا ہے اور مضاف بعد میں، سو اسی طرح یہ نام جبریل، میکائیل اور اسرافیل ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ گفتگو اس مناظرے میں ہوئی جو رسول اللہ ﷺ کے بارے میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور یہودیوں کے درمیان ہوا تھا۔ اس مناظرے کو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں تحریر کیا ہے۔[1]

آیت شریف کا مطلب یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام روحِ امین ہیں، وہ اللہ کی طرف سے ذکرِ حکیم لے کر آئے۔ یہ رسول فرشتوں میں سے اللہ کے ایک رسول اور فرشتے ہیں۔ جس نے اللہ کے کسی ایک رسول کو بھی دشمن ٹھہرایا، اس نے گویا تمام رسولوں سے دشمنی پیدا کی، جس طرح ایک رسول پر ایمان لانے سے سب رسولوں پر ایمان لانا لازم آتا ہے اور ایک رسول کے انکار سے سب رسولوں کا انکار کرنا پڑتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ ﴾ [النساء: ١٥٠] ''بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور وہ کہتے ہیں: ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کوئی راہ اختیار کریں۔''

ان آیتوں میں اللہ نے بعض پر ایمان لانے اور بعض سے انکار کرنے پر پکے کفر کا حکم لگایا ہے۔ اسی طرح جبریل کا دشمن اللہ کا دشمن ہے، کیوں کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں لاتے اور نہ خود آتے ہیں، اللہ کے حکم سے اترتے ہیں اور اُس کا کلام لاتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ﴾ [مريم: ٦٤] ''اور ہم (فرشتے) آپ کے رب ہی کے حکم سے نازل ہوتے ہیں۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ ﴾ [الشعراء: ١٩٢۔ ١٩٤] ''اور بلاشبہ یہ (قرآن) رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔ روح الامین (جبریل) اسے لے کر نازل ہوا۔ آپ کے دل پر، تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہوں۔''

بخاری شریف میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جس نے میرے کسی دوست کو دشمن رکھا، وہ مجھ سے لڑنے کو نکلا۔[2] اسی لیے اللہ نے جبریل علیہ السلام کے دشمن پر غصہ فرمایا۔ ''جو آگے ہے۔'' سے مراد پہلی کتابیں ہیں۔ قرآن ان سب کتابوں کی تصدیق کرتا ہے، دلوں کو ہدایت کی راہ دکھاتا ہے اور جنت کی خوش خبری دیتا ہے۔ یہ ہدایت اور خوش خبری خاص مومنین کے لیے ہے۔ جس طرح فرمایا ہے: ﴿ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ﴾ [حم السجدة: ٤٤] ''کہہ دیجیے: وہ ان کے لیے، جو ایمان لائے، ہدایت اور شفا ہے۔'' نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [بني اسرائيل: ٨٢] ''اور ہم قرآن میں سے جو نازل کرتے ہیں وہ مومنوں

---

[1] تفسیر ابن کثير (١/ ١٧٤، ١٧٥)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٣٧)

کے لیے شفا اور رحمت ہے۔'' لفظ ''رُسل'' کا اطلاق فرشتوں اور انسانوں کے رسولوں پر ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ﴾ [الحج: ۷۵] ''اللہ فرشتوں میں سے کچھ پیغام رساں چن لیتا ہے اور لوگوں میں سے (بھی)۔''

فرشتوں میں تفریق جائز نہیں:

جبرائیل و میکائیل علیہما السلام کا علاحدہ ذکر اس لیے کیا ہے کہ مقصد انھیں کی مدد کرنا ہے۔ جبریل انبیا علیہم السلام کی طرف اللہ کے سفیر و وکیل ہیں۔ میکائیل علیہ السلام کو اس لیے ملا لیا ہے کہ یہودی ان کو اپنا دوست کہتے تھے۔ اللہ نے یہ بات جتلا دی ہے کہ ایک کی دشمنی بعینہٖ دوسرے کی دشمنی ہے، بلکہ خود اللہ کی دشمنی ہے۔ میکال بھی تو بعض اوقات پیغمبروں کے پاس آتے رہے ہیں، جس طرح نبوت کے ابتدائی ایام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے، لیکن جبریل کا آنا جانا اس لیے زیادہ ہوتا ہے کہ وحی لانا انہی کی ذمے داری ہے۔ میکال پانی اور زمین کی پیداوار پر موکل (مقرر) ہیں، جس طرح اسرافیل قیامت کے دن صور پھونکنے پر مقرر ہیں۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو اُٹھتے تو یہ دعا پڑھتے: «اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ وَإِسْرَافِيْلَ فَاطِرَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ، اِهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِكَ إِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ»[1] ''اے اللہ! جبریل، میکائیل اور اسرافیل علیہم السلام کے پروردگار، آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے چھپے ہوئے اور ظاہر کو جاننے والے! تو ہی اپنے بندوں کے درمیان، جس چیز میں وہ اختلاف کرتے ہیں، فیصلہ کرتا ہے، مجھ کو اپنے حکم سے مختلف فیہ امور میں سے حق کی ہدایت کر، تحقیق تو جس کو چاہتا ہے، سیدھی راہ کی ہدایت کرتا ہے۔''

جبرائیل کی فضیلت:

بعض سلف نے کہا ہے کہ جبرئیل فرشتوں میں سے اللہ کے خادم (اطاعت شعار) کا نام ہے۔ سلیمان دارانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث مجھ کو اس سارے دفتر میں سب سے زیادہ پسند آئی ہے۔ علی بن حسین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نام میں ''ایل'' ہے، اس کا مرجع اللہ عزوجل کی طرف ہے۔[2] اس آیتِ شریفہ میں جبریل علیہ السلام کی بزرگی اور بلند درجے کی دلیل ہے اور اس بات پر کہ یہودیوں کی ان سے دشمنی بالکل بلا وجہ ہے۔ ان سے تو محبت کے سوا اور کوئی کام ہوا ہی نہیں۔ ان کا آنا اللہ کے حکم سے تھا، وہ یہ کلام اپنی رائے سے نہیں لائے۔

دل کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ وہ عقل وعلم کی جگہ، حافظے کا خزانہ اور اللہ کا گھر ہے۔ کرمانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۷۷۰) [2] تفسير ابن أبي حاتم (۱/ ۱۸۲۔ ۱۸۳)

ملائکہ کو رسولوں پر سب سے پہلے ذکر کیا، جس طرح اللہ کو سب سے پہلے ذکر فرمایا، کیوں کہ پیغمبروں کی عداوت کتابوں کے اُترنے کی وجہ سے تھی۔ کتابوں کا اُترنا فرشتوں کے ذریعے ہوتا ہے اور فرشتوں کا آنا جانا اللہ کے حکم سے ہوتا ہے، اس لیے یہ ترتیب اختیار فرمائی گئی۔[1]

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿٩٩﴾
اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ
لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠٠﴾ وَلَمَّا جَاۗءَھُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ
لِّمَا مَعَھُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ
اللّٰهِ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّھُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠١﴾ وَاتَّبَعُوْا مَا
تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰي مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ
سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ
السِّحْرَ ۤ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَي الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ
وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ
فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا
ھُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا
يَضُرُّھُمْ وَلَا يَنْفَعُھُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي
الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڜ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَھُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا
يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠٢﴾ وَلَوْ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ
لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠٣﴾

اور یقیناً ہم نے نازل کیں آپ کی طرف واضح آیتیں اور نافرمانوں کے سوا کوئی ان کا انکار نہیں کرتا (99) کیا (ایسے نہیں ہوتا رہا کہ) جب بھی انھوں نے کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک گروہ نے اسے پھینک دیا، بلکہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے (100) اور جب بھی اللہ کی طرف سے ان کے پاس کوئی رسول آیا جو ان کے پاس موجود کتاب کی تصدیق کرتا تھا تو جن

[1] فتح البیان (۱/ ۲۳۱)

لوگوں کو کتاب دی گئی تھی ان میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا، گویا وہ جانتے ہی نہیں ﴿101﴾ اور انھوں نے اس کی پیروی کی جسے شیطان، سلیمان کی بادشاہت میں پڑھتے تھے، اور سلیمان نے کفر نہیں کیا تھا بلکہ شیطانوں نے کفر کیا تھا، وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور انھوں نے اس کی پیروی کی جو بابل میں ہاروت اور ماروت دو فرشتوں پر نازل کیا گیا تھا، وہ دونوں (فرشتے) کسی کو جادو نہیں سکھاتے تھے، یہاں تک کہ (پہلے) کہہ دیتے، ہم تو صرف آزمایش ہیں، لہٰذا تو کفر نہ کر، چناں چہ لوگ ان دونوں سے وہ جادو سیکھتے جس کے ذریعے سے وہ مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈالتے، اور وہ اس جادو سے اللہ کے حکم کے سوا کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ اور لوگ ان سے وہ علم سیکھتے تھے جو انھیں نقصان پہنچاتا تھا، ان کو نفع نہیں دیتا تھا، حالاں کہ وہ بالیقین جانتے تھے کہ جس نے اس (جادو) کو خریدا آخرت میں اس کے لیے کوئی حصہ نہیں، اور البتہ وہ بہت بری چیز تھی، جس کے بدلے میں انھوں نے اپنی جانیں بیچ ڈالیں کاش! وہ جانتے ہوتے ﴿102﴾ اور اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو بے شک اللہ کے ہاں سے بہت اچھا ثواب ملتا، کاش! وہ جانتے ہوتے ﴿103﴾

جادو کے سرچشمے:

یعنی یہودیوں نے اپنے دین اور کتاب کا علم چھوڑ دیا اور جادوگری کے اعمال کی تلاش میں لگ گئے۔ جادو لوگوں میں دو طرف سے آیا ہے۔ سلیمان علیہ السلام کے عہد میں آدمی اور شیطان اکٹھے رہتے تھے۔ آدمیوں نے یہ ان شیطانوں سے سیکھا، لیکن یہودی اس کی نسبت سلیمان علیہ السلام کی طرف کرتے اور کہتے تھے کہ ہم کو یہ انھی سے پہنچا ہے، جنوں اور انسانوں پر اُن کی حکومت اسی کے زور سے تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے بیان کر دیا کہ وہ کفر کا کام ہے، سلیمان کا کام نہیں ہے۔ ان کے عہد میں شیطانوں نے یہ سکھایا ہے۔ دوسرے ہاروت و ماروت کی طرف سے کہ یہ دو فرشتے تھے، جو شہرِ بابل میں آدمی کی صورت میں رہتے تھے۔ ان کو جادو کا علم تھا۔ جو کوئی جادو کا طلب گار ان کے پاس جاتا، وہ اس سے پہلے کہہ دیتے کہ اس میں ایمان جاتا رہے گا، پھر اگر وہ چاہتا تو سکھا دیتے۔

اللہ تعالیٰ کو آزمایش منظور تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسے علموں سے آخرت کا کچھ فائدہ نہیں، بلکہ نقصان ہے۔ دنیا میں بھی نقصان اُٹھاتے ہیں۔ اللہ کے حکم کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر دین اور کتاب کا علم سیکھتے تو اللہ کے ہاں ثواب پاتے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیتیں یہودیوں اور بنی اسرائیل کے اولین لوگوں کے مخفی

علوم اور بھیدوں کو ظاہر کرتی ہیں، جنھیں یہودی علما کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ انھوں نے ان آیتوں میں تحریف اور تبدیلی کر دی تھی۔ اللہ نے قرآن میں اس کو ظاہر کر دیا۔

دلائلِ نبوت:

جس کو اللہ نے فطرتِ سلیم دی ہے، وہ جانتا ہے کہ جو، کسی بشر سے سیکھنے کے بغیر، رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں، سچی باتیں ہیں،[1] کیوں کہ رسول اللہ ﷺ ان کے نزدیک اُمی تھے، مگر جو بات ان کی کتاب کے حوالے سے کہتے تھے، ٹھیک کہتے تھے۔ جب ان کو یہ بات یاد دلائی کہ تم سے میری مدد کرنے اور مجھ پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا ہے تو کہنے لگے کہ واللہ! ہم سے اس بارے میں کوئی عہد نہیں لیا گیا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ان کی یہی عادت ہے کہ آج عہد کیا اور کل توڑ دیا۔

جس پیغمبر کی صفت ان کی کتاب میں درج ہے، اس کو جھٹلاتے ہیں، حالانکہ اس کی پیروی اور مدد کا اقرار ہو چکا تھا، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ ﴾ [الأعراف: ١٥٧] ”(یعنی) وہ لوگ جو اس رسول اُمی نبی (محمد ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔“ اس جگہ فرمایا کہ انھوں نے اللہ کی کتاب تورات کو ایسا الگ کر دیا کہ گویا اس کو جانتے پہچانتے ہی نہیں اور اس کے بدلے جادو سیکھنا اور کرنا اختیار کیا۔ چناں چہ لبید بن اعصم یہودی ملعون نے رسولِ مقبول ﷺ پر بھی جادو کیا تھا، اللہ نے آپ کو آگاہ کر دیا اور جادو سے شفا بخشی۔ یہ قصہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے تفصیل کے ساتھ صحیحین (بخاری و مسلم) میں آیا ہے۔[2]

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ آئے تو یہودیوں نے ان کا مقابلہ تورات سے کیا۔ تورات کو قرآن کے موافق پایا تو ناچار اس کو چھوڑ کر آصف اور ہاروت و ماروت کے جادو والی کتاب کو لیا۔ وہ کتاب اور جادو قرآن کے موافق نہ تھا۔ اس لیے اللہ نے کہا کہ گویا وہ کچھ نہیں جانتے، بڑے بھولے بھالے ہیں، یعنی جان بوجھ کر وہ کام کیا۔[3]

جادو کی سلیمان علیہ السلام کی طرف نسبت کی وجہ:

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب سلیمان علیہ السلام کی بادشاہت جاتی رہی تو جنوں اور انسانوں میں سے کچھ لوگ مرتد ہو کر اپنی شہوات کے تابع ہو گئے، پھر جب اللہ نے ان کی بادشاہت لوٹا دی اور لوگ دین پر پہلے کی طرح

---

(1) تفسیر الطبري (٢/ ٣٩٧) (2) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٤٣٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢١٨٩)

(3) تفسیر الطبري (٢/ ٤٠٤)

قائم ہوگئے تو سلیمان علیہ السلام نے ان کی کتابیں لے کر اپنی کرسی کے نیچے گاڑ دیں۔ اسی زمانے کے قریب سلیمان علیہ السلام کا انتقال ہوگیا۔ انسانوں اور جنوں نے ان کتابوں کو نکال کر کہا کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے سلیمان پر اُتری تھی اور انھوں نے اس کو ہم سے چھپایا تھا، پھر اس کو اپنا دین ٹھہرایا اور شیطانوں نے جو شہوات نکالی تھیں، جیسے: باجا، کھیل تماشا، اس کو اختیار کیا۔[1]

آصف سلیمان علیہ السلام کا کاتب تھا اور اسمِ اعظم جانتا تھا، وہ سلیمان علیہ السلام کی زبان سے ہر ایک چیز کا حکم لکھتا پڑھتا تھا، پھر اس کو ان کی کرسی کے نیچے دفن کر دیتا۔ جب سلیمان علیہ السلام کا انتقال ہوگیا تو شیطانوں نے اس کتاب کو نکال کر اس کے درمیان جادو اور کفر لکھ دیا اور لوگوں سے کہا کہ سلیمان اس پر عمل کرتے تھے۔ جاہل لوگوں نے سلیمان علیہ السلام کو کافر کہنا اور گالیاں دینا شروع کر دیں۔ علما خاموش تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ سلیمان تو کفر سے بَری ہیں۔ کافر وہی شیطان تھے۔

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی دوسری روایت اس طرح ہے کہ سلیمان علیہ السلام جب قضائے حاجت کو جاتے یا کسی بی بی کے پاس رہتے تو اپنی انگوٹھی جرادہ نامی بی بی کو دے جاتے۔ جب اللہ نے ان کی آزمایش کرنا چاہی تو ایک دن جب وہ اپنی انگوٹھی جرادہ کو دے کر گئے تو ایک شیطان ان کی صورت بن کر آیا اور جرادہ سے انگوٹھی لے کر پہن لی۔ سارے شیاطین جن اور انسان اس کے تابع ہوگئے۔ جب سلیمان علیہ السلام نے آکر انگوٹھی مانگی تو جرادہ نے کہا کہ تو سلیمان نہیں ہے۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ میں آزمایش میں ڈالا گیا ہوں۔ شیاطین نے ان دنوں میں کفر اور جادو لکھ کر ان کی کرسی کے نیچے گاڑ دیا، پھر اُن کی وفات کے بعد نکال کر یہ ظاہر کیا کہ سلیمان انہی کتابوں کی وجہ سے سب پر غالب تھے۔ لوگوں نے سلیمان علیہ السلام کو کافر کہا اور بے زاری ظاہر کی۔

سلیمان کی کفر سے براءت:

ان کتابوں کو یہودیوں نے حاصل کر لیا تھا، یہاں تک کہ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا اور یہ آیت ان پر اُتاری: ﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا﴾ [البقرة: ۱۰۲] ''اور سلیمان نے کفر نہیں کیا تھا، بلکہ شیطانوں نے کفر کیا تھا۔''[2] امام ابن اسحاق رحمہ اللہ سے اس طرح مروی ہے کہ شیطانوں نے سلیمان علیہ السلام کی موت معلوم کر کے طرح طرح کے جادو لکھ ڈالے کہ جو کوئی ایسا کرنا چاہے تو وہ یوں کرے، ویسا کرنا چاہے تو یہ کرے، پھر اس پر سلیمان کی انگوٹھی کے نقش کی طرح کی مہر لگادی اور اس کے شروع میں یہ لکھ دیا: ''هٰذَا مَا كَتَبَ آصِفُ بْنُ بَرْخِيَا الصِّدِّيْقُ لِلْمَلِكِ سُلَيْمٰنَ بْنِ دَاوٗدَ مِنْ ذَخَائِرِ كُنُوْزِ الْعِلْمِ'' ''یہ وہ چیز ہے، جو آصف بن برخیا صدیق نے بادشاہ سلیمان بن داود علیہما السلام کے لیے علم کے خزانوں کے ذخیروں میں سے لکھی ہے۔'' پھر اس کو کرسی کے نیچے دفن کر دیا۔ اس

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۸۵۔ ۱۸۶) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ [2] تفسیر الطبري (۲/ ٤١٤) اس کی سند حسن ہے۔

کے بعد باقی بنی اسرائیل نے اس کو نکال کر لوگوں میں پھیلا دیا اور کہا کہ سلیمان علیہ السلام نے اسی کی بدولت یہ بادشاہت پائی تھی۔ اس کو سب سے زیادہ انہی یہودیوں نے سیکھا۔[1] لَعَنَهُمُ اللّٰهُ تَعَالیٰ.

شیاطین کی تلاوت:

اس بارے میں اور بھی روایتیں ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس چیز کی شیطان تلاوت کرتے تھے، اس کا ایک تہائی شعر و شاعری، ایک تہائی جادو اور ایک تہائی کہانت تھی۔[2] معلوم ہوا کہ برا شعر اور بری نظم جادو اور کہانت کے حکم میں ہوتے ہیں، جیسے وہ اشعار جو شراب، عشق پرستی، زنا کاری، سماع و گانے، کفر و فسق اور معشوق کے اعضا کی تعریف میں ہوں۔ یہ جادو سلیمان علیہ السلام کے زمانے سے پہلے بھی تھا، کیوں کہ موسیٰ علیہ السلام ان سے پہلے آئے تھے اور ان کا جادوگروں سے مقابلہ ہوا تھا۔ اسی طرح صالح علیہ السلام کی قوم نے صالح علیہ السلام سے کہا تھا: ﴿ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ﴾ [الشعراء: ١٥٣] ''انھوں نے کہا: بس تو سحر زدہ لوگوں میں سے ہے۔'' یہ صالح علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام سے بھی پہلے تھے۔ معلوم ہوا کہ جادو کی اصل اور حقیقت ہے۔ یہ بات نہیں کہ بے اصل ہو۔ یہی آیت اس بات کا قطعی ثبوت ہے، اگرچہ جادو کا سیکھنا سکھانا کفر اور گناہ ہے۔

لفظ ''ما'' اور ''ملکین'' کی بحث:

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ مَاۤ اُنْزِلَ ﴾ میں ''ما'' نافیہ ہے۔[3] یعنی نہ سلیمان نے کفر کیا نہ فرشتوں پر جادو اترا، لیکن شیطان بابل میں لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ ''مَلِکَیْن'' سے داود اور سلیمان علیہما السلام مراد ہیں۔ یہاں لام مکسور ہے۔ مگر ابن جریر رحمہ اللہ نے حرف ''ما'' کے نافیہ ہونے کا انکار کیا ہے۔ ''ما'' کو ''الذي'' کے معنی میں ٹھہرایا ہے اور ''مَلَکَین'' سے ہاروت و ماروت مراد لیے ہیں۔[4] پھر کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو زمین پر اُتارا اور جادو کی تعلیم دینے کی اجازت دی کہ بندوں کا امتحان لینا منظور تھا۔ یہ دونوں فرشتے اس تعلیم میں حکم کے تابع تھے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابن جریر رحمہ اللہ کا یہ مسلک نہایت غریب ہے۔ اس سے زیادہ غریب وہ بات ہے جسے ابن حزم رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ ہاروت اور ماروت جنوں کے دو قبیلے تھے۔[5] اکثر سلف کا یہ مذہب ہے کہ یہ دونوں فرشتے آسمان سے اُتر کر زمین پر آئے تھے۔

ہاروت و ماروت کا واقعہ:

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ جب آدم زمین پر اُتارے گئے تو فرشتوں نے

---

[1] تفسیر الطبري (٢/ ٤٠٧، ٤٠٨) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٨٥) [3] تفسیر القرطبي (٢/ ٥٠)
[4] تفسیر الطبري (٢/ ٤٢٤) [5] تفسیر ابن کثیر (١/ ١٨٣)

کہا: اے رب! تو زمین پر ایسے مفسد اور سفاک کو بھیجتا ہے، جبکہ ہم تیری تسبیح وتحمید کرتے ہیں۔ فرمایا: جو مجھے معلوم ہے، وہ تم کو معلوم نہیں۔ کہا کہ ہم بنی آدم سے زیادہ مطیع ہیں۔ فرمایا کہ تم میں سے دو فرشتے آئیں، میں انھیں زمین پر بھیجتا ہوں، دیکھوں وہ کیا کرتے ہیں۔ کہا کہ ہاروت و ماروت حاضر ہیں۔ ان کو زمین پر اُتارا۔ زہرہ کو ایک بہت ہی اچھی صورت میں ان کے لیے ظاہر کیا۔ انھوں نے اس سے زنا کرنا چاہا۔ اس نے کہا کہ شرک کرو۔ انھوں نے نہ مانا، پھر اس نے کہا کہ اس بچے کو قتل کرو (انھوں نے نہ مانا) پھر اس نے کہا کہ یہ شراب کا پیالہ پی لو۔ انھوں نے اس کو پی لیا اور نشے میں آکر دونوں نے اس سے زنا بھی کیا اور بچے کو بھی جان سے مارا۔ جب ہوش میں آئے تو عورت نے کہا کہ لو، میں نے تم سے سب کام کرالیے، جو تم مانتے نہیں تھے۔ پھر ان کو اختیار دیا گیا کہ دنیا کا عذاب لے لو یا آخرت کا۔ انھوں نے دنیا کا عذاب اختیار کیا۔ اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس حدیث کے تمام طرق نقل کر کے اس کی سند کے متصل اور مرفوع ہونے کے بارے میں بڑی اچھی گفتگو کی ہے۔ اس کے شروع میں یہ لکھا کہ ”ذِكْرُ الْحَدِيثِ الْوَارِدِ فِي ذٰلِكَ إِنْ صَحَّ سَنَدُهُ وَ رَفْعُهُ“ ”اس حدیث کا ذکر جو اس بارے میں وارد ہے، اگر اس کی سند کا مرفوع اور صحیح ہونا ثابت ہو۔“ پھر مختلف طرق ذکر کرنے کے بعد یہ کہا ہے کہ ”دَارُ الْحَدِيثُ إِلٰى نَقْلِ كَعْبِ الْأَحْبَارِ عَنْ كُتُبِ بَنِي إِسْرَائِيلَ“ ”اس حدیث کا دار و مدار اور مرجع بنی اسرائیل کی کتابیں ہیں اور یہ کعب احبار کی روایت سے منقول ہے۔“

پھر اس بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین کے جو آثار آئے ہیں، ان کا ذکر کیا ہے۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ زہرہ اہلِ فارس کی ایک خوبصورت عورت تھی، جس کے جال میں ہاروت اور ماروت پھنس گئے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ زہرہ کو ایک پارسی عورت کی شکل میں ان کے پاس اُتارا اور وہ اس کے عشق میں مبتلا ہوگئے۔ زہرہ کو ’بیذخت‘ (زہرہ ستارہ) کہتے ہیں۔[3] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بھی یہی قول ہے۔[4] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ زہرہ کا خوبصورت عورت کے روپ میں اترنا سخت غریب ہے۔ اس سے تو وہ قول قریب تر معلوم ہوتا ہے جو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ قصہ ادریس علیہ السلام کے زمانے میں واقع ہوا تھا۔ اس زمانے میں ایک نہایت حسین وجمیل عورت تھی، جیسے ستاروں میں زہرہ ہے۔ یہ شراب پی کر اس کے عشق میں مبتلا ہوگئے: ”فَهٰذَا أَقْرَبُ مَا رُوِيَ فِي شَانِ الزُّهَرَةِ“ ”جو کچھ زہرہ کے بارے میں مروی ہے، اس سب میں سے یہ بات صحت کے قریب ہوسکتی ہے۔“ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ایک عورت تھی اور اپنے شوہر سے جھگڑا کر کے آئی

[1] مسند أحمد (٢/ ١٣٤) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٧٠) [2] تفسير الطبري (٢/ ٤٢٩)

[3] تفسير الطبري (٢/ ٤٢٨) اس کی سند میں ”علی بن زید بن جدعان“ ضعیف راوی ہے۔

[4] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٩٠۔ ١٩١) اس کی سند حسن ہے۔

تھی۔ یہ اُس کے حسن پر کھو گئے۔ اس کا نام عربی میں ''زہرہ''، نبطی میں ''بیذخت'' اور فارسی میں ''اناہیذ'' تھا۔ وہ اسمِ اعظم سیکھ کر آسمان پر اڑ گئی اور تارا بن کر رہ گئی۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما جب اس لال تارے کو دیکھتے تو لعنت کرتے اور کہتے اسی نے ہاروت و ماروت کو فتنے میں ڈالا۔ ①

ہاروت و ماروت کے واقعے پر تبصرہ:

حاصلِ کلام یہ ہے کہ ہاروت و ماروت کا قصہ تابعین کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ اگلے پچھلے مفسرین نے اس کی بڑی تفصیل لکھی ہے۔ ان سب کا مرجع بنی اسرائیل کی خبریں ہیں۔ اس سلسلے میں کوئی حدیث صحیح مرفوع متصل الاسناد صادق مصدوق ﷺ سے نہیں آئی ہے۔ قرآن پاک کا ظاہر سیاق اجمالی قصہ ہے، جس میں کوئی تفصیل نہیں، اس لیے جس قدر قرآنِ مجید میں آیا ہے، اس پر ہم اللہ کی منشا کے مطابق ایمان لاتے ہیں۔ باقی اللہ جانے اور اس کا علم۔ ② فتح البیان میں بھی اس بارے میں مفسرین کے اقوال کو جمع کیا گیا ہے۔ اس میں زہرہ کا مسخ ہو کر تارا بن جانا اور ہاروت و ماروت کا بہ طور آزمایش کے آنا اور پھر مصیبت میں گرفتار ہو جانا ثابت کیا ہے۔ پھر کہا ہے کہ یہ سب اُمور اللہ تعالیٰ کی طاقت میں ہیں۔ اس میں کسی تردد کی گنجایش نہیں۔ ③ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی سند سے ایک عورت کا قصہ ذکر کیا ہے، جو عائشہ رضی اللہ عنہا کے نزدیک بابل سے جادو سیکھ کر اور ایمان گنوا کر آئی تھی۔ ④ وہ قصہ تفسیر ابن کثیر میں موجود ہے۔

جادو کی اصلیت:

پھر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اثر مذکور سے یہ دلیل لی ہے کہ جادوگر کو اپنے ماننے والوں کے دلوں پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔ دوسروں نے کہا ہے کہ نہیں، یہ صرف ایک خیال ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ سَحَرُوْۤا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴾ [الأعراف: ۱۱٦] ''تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور انھیں (لاٹھیوں اور رسیوں کے سانپوں سے) ڈرایا، اور وہ بہت بڑا جادو لائے تھے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴾ [طٰه: ٦٦] ''یہ خیال گزرنے لگا کہ ان کی رسیاں اور اُن کی لاٹھیاں بلاشبہہ دوڑ رہی ہیں۔''

بَابِل سے مراد:

اس سے یہ بھی دلیل لی ہے کہ وہ بابل جس کا ذکر قرآنِ مجید میں ہے، وہ بابلِ عراق ہے، نہ کہ بابلِ نہاوند۔ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے، بلکہ مرفوع حدیث کے حوالے سے بابل کو ملعون کہا گیا ہے۔ وہاں نمازِ عصر کا وقت

---

① یہ قول امام قتادہ رحمہ اللہ کے بجائے امام سدی رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ دیکھیں: تفسیر الطبري (۲/ ٤٣١)

② تفسیر ابن کثیر (۱/ ۱۸۵۔ ۱۸۸) ③ فتح البیان (۱/ ۲۳۸۔ ۲۳۹) ④ تفسیر الطبري (۲/ ٤٣٩، ٤٤٠)

آ گیا تھا اور وہاں نہ پڑھی، بلکہ علاحدہ ہو کر پڑھی۔[1]

معلوم ہوا جس طرح ثمود کی بستیوں میں بغیر روتے ہوئے جانے سے منع کیا ہے،[2] اسی طرح بابل کی سرزمین پر نماز پڑھنے کو مکروہ فرمایا ہے۔ ہیئت دان کہتے ہیں کہ بابل اقلیم عراق سے ہے۔ اس کا فاصلہ بحرِ محیط سے، جس کو اوقیانوس کہتے ہیں، ستر درجے ہے۔ یہ تو بابل کا طول ہے، رہا عرض تو وہ بابل سے جنوب کی جانب سے اس کے وسط تک خطِ استوا میں بتیس درجے ہے۔[3] فتح البیان میں لکھا ہے کہ بابل عراق میں ایک زمین یا شہر کا یا ارضِ کوفہ کا نام ہے۔ یہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔[4] کسی نے کہا ہے کہ یہ داوند یا نہاوند یا نصیبین یا مغرب کا پہاڑ ہے۔ بابل کا نام بابل اس لیے ہوا کہ اس جگہ "تبلبل الألسنة" ہوا تھا، یعنی لوگوں کی زبانوں میں فرق اور اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔[5]

جادو سیکھنا سکھانا شیطانی کام اور کفر ہے:

اہلِ علم نے اس سے اس بات پر دلیل لی ہے کہ جادو کا سیکھنا کفر ہے۔ سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ جو کوئی کسی جادوگر کے یا کاہن کے پاس آیا اور اس کی بات کی تصدیق کی، اس نے قرآن کے ساتھ کفر کیا۔ اس کو بزار رحمہ اللہ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا اور امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے۔[6] وہ جادو سیکھ کر میاں بیوی میں جدائی ڈال دیتے، حالاں کہ یہ رشتہ اختلاط اور اُلفت کا ہے، سو یہ کام شیطانوں کا ہوتا ہے۔

صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ شیطان اپنا تخت پانی پر رکھ کر اپنا لشکر بنی آدم کو ورغلانے کے لیے بھیجتا ہے۔ اس کے نزدیک مرتبے میں سب سے قریب اور فتنہ انگیزی میں سب سے بڑھ کر وہ ہوتا ہے، جو آ کر کہتا ہے کہ میں نے فلاں کو نہ چھوڑا، یہاں تک کہ اس کو اس کی بیوی سے جدا کر دیا۔ شیطان اس کو پاس بلا کر گلے لگاتا اور کہتا ہے کہ تو بہت اچھا ہے۔[7] (الحدیث)

سحرِ تفریق:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان تفریق کا سبب وہ خیال ہوتا ہے، جو انھیں ایک

---

(1) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٠) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٨٩) اس کی سند ضعیف ہے، کیوں کہ سند منقطع ہے، تابعی اور صحابی کے درمیان انقطاع ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو ضعیف کہا ہے۔ دیکھیں: فتح الباري (١/ ٥٣٠) نیز یہ اثر سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً بھی مروی ہے اور اس کی سند حسن ہے۔ دیکھیں: تغليق التعليق (٢/ ٢٣١)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٨٠)

(3) تفسير ابن كثير (١/ ١٨٣۔ ١٩٠)

(4) اللباب في علوم الكتاب (٢/ ٣٤٠)

(5) فتح البيان (١/ ٢٣٦)

(6) مسند البزار (٥/ ٢٥٦) مستدرك الحاكم (١/ ٤٩) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه البزار و رجاله رجال الصحيح" مجمع الزوائد (٥/ ٢٠٣)

(7) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨١٣)

دوسرے کی بدصورتی، بدخلقی یا اور اس طرح کی باتوں کے بارے میں آتا ہے یا دوسرے نکاح یا کسی اور دشمنی سے پیدا ہوتا ہے۔[1] فتح البیان میں ہے کہ اللہ نے تفریق کو جادوگروں کی طرف منسوب کیا ہے اور جادو کو علاحدگی کا سبب ٹھہرایا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دلوں پر جادو کا اثر حسد و بغض، یکجہتی و علاحدگی، قربت اور دوری کے ساتھ ہوتا ہے۔

جادوگر کے اختیارات:

ایک گروہ نے کہا ہے کہ جادوگر کو صرف اسی تفرقے پر قدرت ہوتی ہے، کیوں کہ اللہ نے اتنا ہی فرمایا ہے اور اگر زیادہ قدرت ہوتی تو جادو کی مذمت کرتے ہوئے اس کا ذکر بھی فرماتا۔ دوسرے گروہ نے کہا ہے کہ نہیں، بلکہ اس سے زیادہ قدرت ہوتی ہے، یہاں فقط زیادہ غالب تاثیر کا ذکر کیا ہے۔ پھر کہا ہے کہ جادو کے سیکھنے میں جادوگر کے نقصان کے سوا کوئی بھی فائدہ نہیں۔ ابو السعود رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس چیز کی آفات سے امن نہ ہو، اس سے بچنا بہتر ہے، جیسے علمِ فلسفہ کا سیکھنا کہ اس کا انجام یہ ہے کہ وہ گمراہ کر دیتا ہے۔[2]

اللہ کا فیصلہ غالب ہے:

یہ بات کہ جادوگر کسی کو اللہ کے اذن کے بغیر نقصان نہیں پہنچا سکتا، امام حسن بصری رحمہ اللہ نے اس سے یوں مطلب لیا ہے کہ جس پر اللہ چاہے جادو مسلط کر دے، جس پر نہ چاہے نہ کرے۔ کیا مجال ہے کہ اللہ کے اِذن کے سوا وہ کسی کا کچھ کر سکیں۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی اللہ کے حکم سے۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی جب اللہ اس کو جادوگر کے ارادے کے سپرد کر دے۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد و سدی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ خلاق کے معنی نصیب ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خلاق کے معنی دین ہیں، یعنی جادوگر بے نصیب اور بد دین ہوتا ہے۔[4] اس لفظ سے ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا﴾ [البقرة: ١٠٣] ''اور بے شک اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے۔'' ساحر کے کافر ہونے کی دلیل لی گئی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ اور سلف کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ کافر نہیں ہوتا، لیکن اس جادوگر کی حد یہ ہے کہ اس کی گردن مار دیں۔ یہ قول امام شافعی رحمہ اللہ سے منقول ہے۔[5]

معتزلہ کی تردید:

امام رازی رحمہ اللہ نے معتزلہ سے نقل کیا ہے کہ وہ جادو کے وجود کے منکر ہیں، بلکہ جادو کے وجود کا عقیدہ رکھنے والے کو کافر کہہ دیتے ہیں۔[6] ہاں، اہلِ سنت کے نزدیک جادوگر کا ہوا میں اُڑ کر جانا، آدمی کو گدھا اور گدھے کو انسان کر

---

[1] تفسير ابن كثير (١/ ١٩١)
[2] تفسير أبي السعود (١/ ١٤٠) فتح البيان (١/ ٢٤١، ٢٤٢)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٩٣، ١٩٤)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٩٥)
[5] تفسير ابن كثير (١/ ١٩١)
[6] تفسير الرازي (٣/ ١٨٧)

دکھانا جائز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس وقت جادوگر اپنا منتر پڑھتا ہے اور مقررہ کلمات کہتا ہے، اس وقت اللہ اس چیز کو پیدا کر دیتا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ اس کام میں آسمانوں یا ستاروں پر کوئی اثر ہو جاتا ہے۔ جس طرح کہ فلسفی، نجومی اور صابئین کہتے ہیں۔ پھر اِن الفاظ سے: ﴿ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: ١٠٢] ''اور وہ اس جادو سے اللہ کے حکم کے سوا کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔'' اس بات پر دلیل ہے کہ جادو اللہ کے پیدا کرنے سے واقع ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا گیا تھا۔[1] ایک جادوگر عورت بابل سے عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی تھی۔[2] اس کے سوا بھی جادو کی اور بہت سی حکایات ہیں۔

جادوگر کے کافر ہونے اور جادو سیکھنے کے بارے میں فقہا کے اقوال:

پھر امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سحر کا سیکھنا کچھ برا نہیں۔ یہ ایک شریف علم ہے۔ یہ علم نہ ہو تو معجزہ اور جادو میں فرق کیسے سمجھا جائے۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بہ خوبی اس قول کا رد کیا ہے۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جو کوئی کاہن یا عراف (نجومی) کے پاس گیا وہ کافر ہوا۔[4] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام رحمہم اللہ اور سارے ائمہ مسلمین جنھیں جادو کا علم نہیں آتا تھا، وہ معجزات کو بہ خوبی جانتے اور پہچانتے تھے، پھر ابو عبداللہ رازی رحمہ اللہ سے کتاب ''سر مکتوم'' کے حوالے سے جادو کی آٹھ قسمیں نقل کی ہیں اور ان میں کلام کیا ہے۔ اس کے بعد وزیر ابن ہبیرہ رحمہ اللہ کی تالیف کردہ کتاب ''الإشراف علی مذهب الأشراف'' سے یہ روایت کی ہے کہ اس بات پر سب کا اجماع ہے کہ جادو کی حقیقت ہے، مگر ابو حنیفہ رحمہ اللہ جادو کو بے حقیقت کہتے ہیں۔

رہا جادو کا سیکھنا تو امام ابو حنیفہ، مالک اور احمد رحمہم اللہ کا مذہب ہے کہ جادوگر کافر ہو جاتا ہے، پھر امام مالک اور احمد رحمہما اللہ کے نزدیک کوئی صرف جادو کرنے یا اس کے استعمال سے واجب القتل ہو جاتا ہے۔ امام شافعی اور احمد رحمہما اللہ کے نزدیک اسے فوری طور پر قتل کرنے کی ضرورت نہیں، جب وہ دوبارہ اور تیسری بار یہ کام کرے تو مارا جائے۔

جادوگر کی توبہ:

رہی یہ بات کہ جادوگر کی توبہ قبول ہوتی ہے کہ نہیں، تو شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قبول نہیں ہوتی۔ باقی تین ائمہ کے نزدیک قبول ہوتی ہے۔

جادو کا علاج:

امام قرطبی رحمہ اللہ نے وہب رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ جس مرد کو کسی جادوگر نے عورت سے باندھ دیا ہو تو بیری

---

[1] دیکھیں: صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٤٣٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢١٨٩)

[2] تفسیر الطبري (٢/ ٤٣٩۔ ٤٤٠) المستدرك (٤/ ١٧١) اس کی سند صحیح ہے۔

[3] تفسیر الرازي (٣/ ١٩٤)

[4] مستدرك الحاكم (١/ ٤٩)

کے سات پتے لے کر دو پتھروں میں کوٹ کر آیت الکرسی پڑھ کے مسحور کو اس کے تین گھونٹ پلا کر باقی پانی سے نہلا دیں، إِنْ شَاءَ اللّٰهُ، اس جادو کا اثر جاتا رہے گا۔ اس بارے میں یہ اچھا عمل ہے۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جادو دور کرنے کا سب سے زیادہ فائدہ اُس میں ہے، جو اللہ نے اپنے رسول ﷺ پر خاص اسی کو دور کرنے کے لیے اُتارا ہے اور وہ معوذتین (آخری دو قل) ہیں۔ حدیث میں مروی ہے کہ ان دو سورتوں سے زیادہ بہتر کسی اور سے پناہ نہیں پکڑی جا سکتی۔[2] نیز یہ بھی حدیث میں آتا ہے کہ آیت الکرسی شیطان کو دور کر دیتی ہے۔[3]

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم (نبی سے یہ) نہ کہو: [رَاعِنَا] بلکہ یہ کہو: [اُنْظُرْنَا] اور تم غور سے سنو اور کافروں کے لیے بہت دردناک عذاب ہے (104) اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کیا وہ نہیں چاہتے اور نہ مشرکین ہی چاہتے ہیں کہ تم پر تمھارے رب کی طرف سے کوئی خیر نازل کی جائے اور اللہ اس کے لیے اپنی رحمت خاص کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور اللہ فضلِ عظیم کا مالک ہے (105)

الفاظ کے انتخاب میں ادب کو ملحوظ خاطر رکھنا:

یہودی پیغمبر ﷺ کی مجلس میں بیٹھتے اور جب آپ ﷺ کلام فرماتے تو جو بات وہ سن نہ پاتے، اس کی تحقیق کے لیے کہتے: ﴿رٰعِنَا﴾ یعنی ہماری طرف بھی متوجہ ہوں۔ ان سے سیکھ کر مسلمان بھی کسی وقت یہ لفظ کہہ دیتے۔ اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا کہ تم یہ لفظ نہ کہو۔ اگر کہنا ہو تو ﴿اُنْظُرْنَا﴾ کہو۔ اس کے معنی بھی یہی ہیں اور آگے سے سنتے رہو، تاکہ پوچھنا ہی نہ پڑے۔ یہودیوں کے اس لفظ کے کہنے میں دھوکا تھا، اس کو زبان دبا کر کہتے تو "رَاعِيْنَا" ہو جاتا، یعنی ہمارا چرواہا اور ان کی زبان میں ﴿رٰعِنَا﴾ احمق کو بھی کہتے تھے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ

---

(1) تفسير القرطبي (٢/ ٤٩۔ ٥٠)

(2) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٤٣٠) نیز معوذتین کی فضیلت میں اور بھی بے شمار احادیث مروی ہیں۔

(3) تفسير ابن كثير (١/ ١٩٢۔ ١٩٧)

نے اپنے ایمان والے بندوں کو قول اور فعل میں کفار کی مشابہت سے منع فرمایا ہے۔ یہود ایسی بات بولتے جس میں ''توریہ'' ہوتا۔ وہ یہ کام حقارت کے لیے کرتے اور ''اِسْمَعْ لَنَا'' کی جگہ تکبر سے ﴿ رَاعِنَا ﴾ کہتے۔

بے ادبی یہود کا شیوہ ہے:

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّ رَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴾ [النساء: ٤٦]

''یہودیوں میں سے کچھ لوگ الفاظ کو ان کے موقع محل سے پھیر دیتے ہیں اور پھر اپنی زبانوں کو توڑ موڑ کر سچے دین کے خلاف طعنہ زنی کرتے ہوئے (نبی ﷺ سے) کہتے ہیں: ''ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی'' اور کہتے ہیں: ''سنو! اگرچہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمھیں کچھ سنا جائے۔'' اور آپ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں: [رَاعِنَا] یعنی ''اے ہمارے چرواہے!'' اور بے شک اگر وہ کہتے: ''ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی، اور ہماری بات سنیے اور ہماری طرف نظر کیجیے'' تو ان کے لیے بہتر اور نہایت مناسب ہوتا، لیکن اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی، چناں چہ وہ سوائے چند لوگوں کے ایمان نہیں لاتے۔''

اسی طرح احادیث میں آیا ہے کہ یہود جب سلام کرنا چاہتے تو ''اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ'' کہتے۔ سام کے معنی موت ہیں۔ اس لیے ہم کو یہ حکم ہوا کہ ہم ان کے جواب میں ''وَعَلَيْكُمْ'' کہیں، یعنی یہ موت تم ہی پر پڑے، ہم میں کوئی اس بد دعا سے نہ مرے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیث میں مروی ہے کہ «مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ» (رواہ أحمد) یعنی ''جس نے کسی قوم کی مشابہت پیدا کی، وہ انہی میں سے ہے۔'' اس کو ابو داود نے بھی روایت کیا ہے۔[2]

کفار کی مشابہت سے ممانعت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حدیث میں کفار کے اقوال، افعال، لباس، عادات وعبادات وغیرہ، جو ہمارے لیے مشروع نہیں ہوئے، ان کی ممانعت پر اور ان کی مشابہت اختیار کرنے پر سخت وعید کی دلیل ہے۔[3] میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کی جیسی تشریح شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کتاب ''اقتضاء الصراط المستقيم لمخالفة أصحاب الجحيم'' میں لکھی ہے،[4] ویسی کسی اور کتاب میں دیکھی گئی ہے نہ سنی گئی۔ یہ حدیث اسلام میں ایک بڑی اصل ہے۔ مسلمانوں نے اس زمانے میں بالخصوص اس حدیث پر عمل کرنا چھوڑ دیا، گویا ان کے خیال میں یہ منسوخ ہو گئی ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ...!

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٦٥) تفسير ابن كثير (١/ ١٩٧)

[2] مسند أحمد (٢/ ٥٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٣١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١٤٩)

[3] تفسير ابن كثير (١/ ١٩٧) [4] اقتضاء الصراط المستقيم (١/ ١٢)

ایک آدمی سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ مجھے کوئی نصیحت کریں؟ کہا: جب تو سنے کہ اللہ تعالیٰ ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ فرماتا ہے تو تُو اس پر کان رکھ، وہ کسی خیر کا حکم کرتا ہے یا کسی شر سے منع فرماتا ہے۔[1] خیثمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ ہے، تورات میں وہاں "یَا أَیُّهَا الْمَسَاكِیْنُ" ہے۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لفظ ﴿ رَاعِنَا ﴾ انصار کہتے تھے تو اللہ نے اس لفظ سے منع کر دیا۔[2] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ٹھیک بات یہ ہے کہ اللہ نے مومنین کو اس لفظ کے کہنے سے منع فرمایا ہے، یہ کلمہ اللہ کو مکروہ یا ناپسند آیا ہے۔ یہ ویسی ہی بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ تم انگور کو "کَرْمٌ" نہ کہو، "حَبْلَة" کہو۔[3] اور غلام کو "عَبْدِيْ" نہ کہو "فَتَايَ" کہو۔[4]

نقص کا احتمال رکھنے والے الفاظ کی ممانعت:

اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ جن الفاظ میں کسی گالی یا نقص کا احتمال ہو، ان کے بولنے سے بچنا چاہیے، اگرچہ کہنے والے کا ارادہ گالی یا نقص کا نہ ہو۔ اس میں ذریعے کا بند کرنا، وسیلے کا دور کرنا اور مادۂ فساد کو کاٹنا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کافروں کی دشمنی کی شدت کا، خواہ وہ اہلِ کتاب ہوں یا مشرک، بیان اس لیے فرمایا ہے کہ ان میں اور مومنین میں دوستی ختم ہونی چاہیے، کسی طرح کا باہم میل جول نہ ہو۔ اس جگہ رحمت سے مراد قرآن و اسلام ہے یا نبوت یا جنسِ رحمت۔ غیر متعلق لوگوں کو جو دنیا اور دین کی بھلائی ملی ہے، وہ کسی استحقاق کے بغیر صرف اللہ کے فضل و انعام سے حاصل ہوئی ہے، سو وہی بڑا فضل والا ہے۔ وہ جس کو چاہے اور جس رحمت و نعمت کو چاہے، عطا کرے۔ یہودیوں اور مشرکین کا مومنوں پر اس خیر و برکت پر حسد کرنا، صحیح نہیں ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾

جو آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اسے بھلوا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی کی مثل ہی لے آتے ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے؟ (106) کیا آپ نہیں جانتے کہ بے شک اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی، اور تمھارے لیے اللہ

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۹٦) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۹٦- ۱۹۷)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۲٤۸)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲٤۱٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۲٤۹) تفسیر الطبري (۲/ ٤٦۳)

کے سوا نہ کوئی حمایتی ہے اور نہ کوئی مددگار؟ (107)

نسخ کی تعریف:

یہ بھی یہودیوں کا طعن تھا کہ تمھاری کتاب میں بعض آیتیں منسوخ ہوتی ہیں۔ اگر یہ اللہ کی طرف سے تھیں تو پھر ان میں کیا عیب دیکھا کہ انھیں موقوف کر دیا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عیب نہ پہلی آیت میں تھا نہ پچھلی میں، لیکن حاکم ہر وقت جو چاہے سو حکم کرے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نسخ سے اس جگہ مراد تبدیل کرنا ہے۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کو مٹا دینا مراد ہے۔ امام قرظی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بھلا دینا مراد ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ترک کر دینا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قبض کرنا، یعنی اُٹھا لینا ہے، جیسے: یہ آیت ''اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا الْبَتَّةَ'' ''شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت جب زنا کرے تو تم ان کو سنگسار کر دو۔'' یا یہ قول ''لَوْ كَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِيَانِ مِنْ ذَهَبٍ لَّابْتَغٰى لَهُمَا ثَالِثًا'' ''اگر ابن آدم کے قبضے میں دو وادیاں سونے کی بھری ہوں تو وہ تیسری کی جستجو کرے۔''[2]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نسخ سے مراد آیت کو دوسری جگہ منتقل کرنا ہے، جیسے: حلال کو حرام یا حرام کو حلال، مباح کو محظور (منع) اور محظور کو مباح کر دینا۔ یہ تبدیلی اور تغیر اسی امر، نہی، حظر، اطلاق، ممانعت و اباحت (جائز ہونے) میں ہوتا ہے نہ کہ اخبار (خبر دینے) میں۔ خواہ یہ منسوخی حکماً یا خطاً (لکھنے میں) ہو۔[3]

نسخ کے باقی احکام، شرطیں اور اس کی قسمیں اُصولِ فقہ کی کتابوں میں مفصل بیان کی گئی ہیں، یہاں ان کے ذکر کی ضرورت نہیں۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کو ایک سورت پڑھائی تھی اور وہ اس کو پڑھا کرتے تھے۔ ایک رات نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو ایک حرف بھی نہ پڑھ سکے۔ صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ منسوخ ہوگئی یا بھلا دی گئی ہے، اب تم اس کو چھوڑ دو۔ (رواه الطبراني) اس کی سند میں سلیمان بن ارقم ضعیف ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ اسی روایت کی وجہ سے ﴿ نُنْسِهَا ﴾ بضم نون خفیفہ پڑھا کرتے تھے۔[4] جس نے ''نَنْسَاهَا'' بفتح نون پڑھا ہے، اس کے معنی تاخیر کے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ بلکہ ترک و تبدیل کے ہیں۔[5] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم اس کو خط میں ثابت رکھتے ہیں اور

---

(1) تفسیر الطبري (٢/ ٤٧٣) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحیح المسبور (١/ ٤٦۔ ٤٩)

(2) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ١٩٩، ٢٠٠) (3) تفسیر الطبري (٢/ ٤٧١، ٤٧٢)

(4) المعجم الکبیر (١٢/ ٢٨٨) اس کی سند میں ''سلیمان بن ارقم'' راوی سخت ضعیف ہے۔

(5) تفسیر الطبري (٢/ ٤٧٦) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٠١) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحیح المسبور (١/ ٤٦۔ ٤٩)

حکم میں بدل دیتے ہیں۔ جس نے بضم نون پڑھا ہے، اس نے اس لفظ کو نسیان سے لیا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض قرآن پڑھتے، پھر اس کو بھول جاتے۔[1]

منسوخ سے بہتر یا برابر آیت لانے سے مراد:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ رات کو وحی اترتی، دن کو فراموش ہو جاتی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری۔[2] یہ بات کہ ''جس آیت کو ہم منسوخ کرتے ہیں، اس سے بہتر یا اس کے برابر دوسری آیت لاتے ہیں۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوسری آیت جلد نفع کے لیے یا ایک مدت کے نفع کے لحاظ سے یا ایک نفع میں ان دونفعوں میں سے زیادہ ہوتی ہے یا مثل اس کے نہ کہ زیادہ ہے۔ یہ بات ناسخ منسوخ میں غور وفکر کرنے سے حاصل ہوتی ہے، کیوں کہ کبھی ناسخ زیادہ ہلکا ہوتا ہے، مگر اس کا نفع عاجل (دنیا) میں زیادہ ہوتا ہے۔ کبھی وہ بوجھل ہوتا ہے تو اس کا ثواب ایک مقررہ مدت کے بعد زیادہ ہوتا ہے۔ کبھی دونوں یکساں ہوتے ہیں تو نفع میں برابر ٹھہرتے ہیں۔

قرآن کا سنت سے منسوخ ہونا:

امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ قرآن سنتِ متواترہ سے منسوخ نہیں ہوتا، اس آیت کی رو سے صحیح نہیں ہے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ کتاب کا سنت سے منسوخ ہو جانا جائز ہے۔

اس ارشاد سے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، یہ نکلا کہ منسوخ کرنا بھی اللہ کے دوسرے اختیارات کی طرح ہے۔ نسخ کا انکار کرنا، اللہ کی قدرت کا انکار کرنا ہے۔ اس میں نسخ کے جائز ہونے کی دلیل ہے۔

نسخ کے صحیح ہونے اور یہود کے اعتراض کا رد:

دوسرے ارشاد میں کہ آسمان و زمین میں اسی کی سلطنت ہے، یہودیوں کی تکذیب ہے، جو نسخ کے منکر ہیں۔ سارے اہلِ اسلام شروع سے لے کر آخر تک اس بات پر متفق ہیں کہ نسخ عقلاً ثابت و جائز ہے اور سمعاً واقع ہوا ہے۔ کسی ایک شخص نے بھی اس میں اختلاف نہیں کیا۔ ہاں یہودی نسخ کے منکر ہیں، لہٰذا تورات ان پر حجت ہے، کیوں کہ اس سے نسخ کا ہونا ثابت ہے۔ جب نوح علیہ السلام کشتی سے باہر نکلے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا تھا کہ میں نے ہر چلنے والے جانور کو تیرے اور تیری اولاد کے لیے غذا مقرر کیا ہے سوائے خون کے، سو تو اس کو نہ کھانا۔ پھر موسیٰ اور بنی اسرائیل پر بہت سے حیوانات حرام کر دیے تھے۔ یہ بھی تورات ہی سے ثابت ہے کہ آدم علیہ السلام بہن کا بیاہ بھائی سے کر دیتے تھے، پھر اللہ نے اس کو موسیٰ علیہ السلام وغیرہ پر حرام کر دیا۔

---

[1] تفسیر الطبري (٢/ ٤٧٣۔ ٤٧٤)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٠٠) اس کی سند میں ''حجاج بن تمیم جزری'' ضعیف راوی ہے۔

یہ بھی تورات میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو پہلے حکم دیا کہ تم اپنے بیٹے کو ذبح کرو، پھر فرمایا کہ ذبح نہ کرو۔ اسی طرح موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا تھا کہ جنھوں نے بچھڑا پوجا ہے، ان کو قتل کرو، پھر کہا کہ اب تلوار اُٹھا لو۔ اسی طرح سنیچر (ہفتے) کے دن کام کرنا حرام کیا تھا، حالاں کہ ان کے پہلے لوگوں پر حرام نہ تھا۔ تورات میں اس طرح کے بہت سے احکام موجود ہیں۔ قرآن عظیم نے ساری پہلی شریعتوں اور پرانی کتابوں، مثلاً: تورات، انجیل وغیرہ کو منسوخ کر دیا۔ نسخ آیت کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس کی قراءت یا حکم یا دونوں پر عمل ختم ہو چکا ہے۔

منسوخ آیات اور احادیث کی تعداد:

بعض علما نے کہا ہے کہ پانچ سو آیات منسوخ ہیں، لیکن محققین کے نزدیک پانچ آیتوں سے زیادہ منسوخ نہیں ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا یہی قول ''الفوز الکبیر'' میں ہے۔[1] لیکن ان پانچ میں بھی نظر ہے۔ رہی حدیث تو ابن جوزی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اکیس حدیثیں منسوخ ہیں۔ ابن القیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہیں، بلکہ دس احادیث سے بھی کم ہیں، بلکہ اس کے نصف سے بھی کم۔[2] امام زرقانی رحمہ اللہ نے ''شرح موطا'' میں لکھا ہے کہ محدثین، اصولیین اور فقہا کا مذہب یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو جمع کرنا واجب ہے۔[3] صاحب "دراسات اللبیب" نے ایک مستقل رسالہ نسخِ اجتہادی کے بطلان میں لکھا ہے، پھر کہا ہے کہ یہ دعویٰ اکثر فقہا، خصوصاً حنفیہ کا ہے۔ متقدمین کے نزدیک معتبر نسخ وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع ہوتا ہے، جو غیر تک پہنچتا ہے، وہ شریعت کی پیروی سے زیادتی اور تجاوز کرتا ہے۔

خلق و امر اللہ ہی کا ہے:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیتِ شریفہ میں اللہ پاک نے اپنے بندوں کو یہ ارشاد فرمایا ہے کہ مخلوق میں تصرف رکھنے والا وہی اکیلا اللہ ہے، خلق و امر اسی کا ہے۔ جس کو جس طرح چاہا بنایا۔ جس کو چاہا نیک بخت کیا اور جس کو چاہا بد بخت ٹھہرایا۔ کسی کو تندرست رکھا، کسی کو بیمار کر ڈالا۔ کسی کو توفیق دی، کسی کو بے مدد چھوڑا۔ اسی طرح جس چیز کو چاہا حلال کیا، جسے چاہا حرام کیا۔ جسے چاہا مباح فرمایا، جسے چاہا پر خطر ٹھہرایا۔ اللہ سے کون سوال کر سکتا ہے؟ بلکہ اللہ ہی اپنے بندوں سے سوال کر سکتا ہے، اس کا کسی شے کے بارے میں حکم کرنا کسی مصلحت سے ہوتا ہے، جس کو وہی جانتا ہے۔ اسی طرح منع کرنے کی مصلحت بھی اسی کو معلوم ہوتی ہے۔ ہم پر تو یہ فرض ہے کہ ہم اس کی پوری اطاعت کریں، اس کا حکم بجا لائیں اور رسول کی تصدیق و پیروی کرتے رہیں۔ پھر یہ کہا ہے کہ اس مقام میں یہود کے کفر کا رد اور اس بارے میں بلاغت سے پُر بیان ہے۔ یہودیوں کا نسخ محال اور ناممکن ہونے کے بارے میں دعویٰ عقلاً جہالت و کفر ہے اور نقلاً افترا و تہمت ہے۔[4]

---

[1] الفوز الكبير (١/ ٩٣) [2] إعلام الموقعين (٤/ ٢٣٥) [3] شرح الزرقاني (١/ ٢٨٣)

[4] تفسير ابن كثير (١/ ٢٠٠)

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہودیوں نے احکام تورات کی منسوخی کا انکار کیا، اسی لیے عیسیٰ اور محمد ﷺ کی نبوت کو نہ مانا، کیوں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے تورات کے بعض احکام کو منسوخ کیا تھا اور محمد ﷺ نے تورات و انجیل دونوں کے احکام کو بدل دیا۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں فقط ایک ابو مسلم اصفہانی رحمہ اللہ نے یہ کہا ہے کہ قرآن میں نسخ نہیں ہے، اس کا یہ قول ضعیف، مردود اور مرذول ہے اور آیاتِ منسوخہ کے اس نے جو جواب دیے ہیں، وہ سب نامقبول ہیں۔[2]

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿١٠٨﴾

(اے مسلمانو!) کیا تم چاہتے ہو کہ تم اپنے رسول سے سوال کرو جیسے اس سے پہلے موسیٰ سے سوال کیے گئے تھے؟ اور جس نے ایمان کے بدلے کفر اختیار کیا تو بے شک وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا ﴿108﴾

کثرتِ سوال سے ممانعت:

یعنی یہودیوں کے بہکانے سے تم اپنے نبی کے پاس شبہات نہ لاؤ، جیسے وہ اپنے نبی کے پاس لاتے تھے۔ شبہات وارد کرنا گویا یقین کر ترک کر کے انکار کو پکڑنا ہے۔ اس آیت میں مومنین کو کثرتِ سوال سے منع کیا ہے کہ کسی چیز کے ہونے سے پہلے اس کے بارے میں سوال نہ کیا کرو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿١٠١﴾ ﴾ [المائدۃ: ۱۰۱] ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایسی باتوں کے بارے میں سوال نہ کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمھیں بری لگیں اور اگر تم ان کے متعلق سوال کرو گے جب کہ قرآن نازل کیا جا رہا ہو تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں گے، اللہ نے (تمھاری) اس حرکت کو معاف کر دیا ہے اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت حوصلے والا ہے۔“ یعنی اگر نزول کے بعد تفصیل پوچھو گے تو بتا دی جائے گی، لیکن جو شے ابھی نہیں ہوئی ہے، اگر اس کا سوال کیا تو کہیں وہ چیز اس پوچھ پاچھ سے حرام نہ ہو جائے۔ اسی لیے صحیح حدیث میں آیا ہے کہ مسلمانوں میں بڑا مجرم وہ ہے، جس کے سوال کرنے سے جو شے حرام نہ تھی، وہ حرام ہوگئی۔[3]

رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص کسی مرد کو اپنی بیوی کے پاس پائے تو کیا کرے، اگر کچھ کہتا ہے تو بڑا بول منہ سے نکالتا ہے اور اگر چپ رہتا ہے تو بڑی بات پر چپ رہتا ہے؟ آپ نے ان مسائل کو مکروہ اور عیب دار جانا، پھر اللہ نے آیتِ ملاعنہ نازل فرما دی۔[4] اس سوال کا نتیجہ یہ ہوا۔ صحیحین میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ قیل و قال (فضول گفتگو)، اضاعتِ مال (مال ضائع کرنا) اور کثرتِ سوال سے منع فرما دیا گیا ہے۔[5]

---

[1] تفسیر الطبري (۲/ ۴۸۸) [2] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۰۱)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۶۸۵۹) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۳۵۸) [4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۴۹۳)

[5] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۴۰۷) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۹۳)

نیز صحیح مسلم میں ہے کہ تم مجھ کو چھوڑ دو، جب تک کہ میں تم کو چھوڑے رہوں۔ تم سے پہلے لوگ اسی کثرتِ سوال اور اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہوگئے، میں جس بات کا تمھیں حکم دوں، وہ جہاں تک ہو سکے بجا لاؤ اور جس کام سے منع کروں، اس سے بچتے رہو۔[1] یہ حدیث اس وقت فرمائی تھی جب اللہ نے حج فرض کر دیا تھا۔ ایک شخص نے کہا کہ کیا ہر سال فرض ہے؟ آپ ﷺ چپ رہے۔ تیسری بار فرمایا: نہیں، اگر ہاں کہتا تو واجب ہو جاتا اور اگر واجب ہوتا تو تم سے نہ ہوتا۔

اسی لیے سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم سوال کرنے سے منع کیے گئے تھے۔ ہم کو یہ بات پسند آتی تھی کہ کوئی گنوار صحرائی آدمی آئے اور کچھ پوچھے اور ہم سنیں۔[2] سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ پر ایک سال گزر جاتا تھا، میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا، مگر دہشت و ہیبت سے پوچھ نہ سکتا تھا۔ یہ تمنا کرتا تھا کہ کوئی اعرابی آ جائے۔[3] (رواه أبو يعلى)
سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے اَصحابِ رسول اللہ ﷺ سے بہتر کوئی قوم نہیں دیکھی۔ انھوں نے صرف بارہ مسئلوں کے بارے میں سوال کیا اور وہ سب قرآن میں موجود ہیں، جیسے: ﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ﴾ [البقرة: ٢١٩] ''(اے نبی!) لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔'' ﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ ﴾ [البقرة: ٢١٧] ''(اے نبی!) لوگ آپ سے حرمت والے مہینے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔'' ﴿ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ﴾ [البقرة: ٢٢٠] ''اور لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔'' اور اس جیسے اور۔[4]

''اَمْ'' یہ ''بَلْ'' کے معنی میں ہے یا استفہامِ انکاری ہے۔ یہ آیت مومنین اور کافرین سب کو شامل ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ سب ہی کی طرف مبعوث ہوئے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ﴾ [النساء: ١٥٣] ''(اے نبی!) اہلِ کتاب آپ سے تقاضا کرتے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے ایک کتاب اُتار لائیں، چناں چہ ان لوگوں نے موسیٰ سے اس سے بھی بڑا تقاضا کیا تھا، انھوں نے کہا تھا: (اے موسیٰ!) ہمیں اللہ بالکل آنکھوں کے سامنے دکھا، پھر ان کے ظلم کی وجہ سے کڑاکے کی بجلی ان پر آ پڑی۔''

قریش کے سوالات:

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ رافع بن خزیمہ اور وہب بن زید نے کہا تھا کہ اے محمد! (ﷺ) ہم پر

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٣٧) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢)

[3] تفسير ابن كثير (١/ ٢٠٢) جامع العلوم والحكم (١/ ٩١)

[4] مسند البزار (١١/ ٢٧٤) المعجم الكبير (١١/ ٤٥٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رواه الطبراني في الكبير وفيه عطاء بن السائب وهو ثقة ولكنه اختلط، وبقية رجاله ثقات'' مجمع الزوائد (١/ ٣٩٣)

آسمان سے کوئی کتاب اتروا، جسے ہم پڑھیں اور ہمارے لیے نہریں چلوا، تاکہ ہم تجھ کو سچا سمجھیں اور تیرے کہے پر چلیں، اس پر یہ آیت اتری: ﴿ اَمْ تُرِيْدُوْنَ ﴾۔[1] ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک آدمی نے سوال کیا تھا کہ ہمارے کفارات (گناہوں کے بدلے) بھی بنی اسرائیل کے کفارات کی طرح ہوتے تو کیا اچھا ہوتا! فرمایا: اے اللہ! میں یہ نہیں چاہتا، پھر کہا کہ جو تم کو دیا گیا ہے، وہ اُن سے کہیں بہتر ہے۔ اُن سے جب کوئی خطا ہوتی تو وہ اسے اس کے کفارے کے ساتھ اپنے گھر کے دروازے پر لکھا ہوا پاتے۔ اگر کفارہ دیتے تو دنیا میں رسوا ہوتے، نہ دیتے تو آخرت میں بدنام ہوتے تو یہ کہا: ﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [النساء: ۱۱۰] ''اور جو شخص برا عمل کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر وہ اللہ سے بخشش مانگے تو وہ اللہ کو بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا پائے گا۔''

پھر فرمایا: نمازِ پنج گانہ جمعہ سے جمعہ تک درمیان کا کفارہ ہیں، جس نے بدی کا ارادہ کیا، مگر نہ کی، وہ گناہ اس پر نہ لکھا گیا اور جس نے بدی کی، تو ایک ہی گناہ لکھا گیا۔ جس نے نیکی کا ارادہ کیا، مگر نہ کی تو ایک نیکی لکھی گئی۔ اگر وہ نیکی کرلی تو دس گنا لکھی گئی۔ ہلاک نہیں ہوتا کوئی مگر ہلاک ہونے والا، پھر اللہ نے یہ مذکورہ بالا آیت اتاری۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ ہمیں اللہ کھلم کھلا دکھلا دو۔ قریش نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال کیا تھا کہ کوہِ صفا کو سونا کر دو۔ فرمایا مگر یہ بنی اسرائیل کے حق میں نازل کیے جانے والے دسترخوان کے مثل ہوگا۔ اس پر وہ باز رہے۔ یہی بات امام سدی اور قتادہ رحمہما اللہ نے بھی کہی ہے۔[2] حاصل یہ ہے کہ اللہ نے ان لوگوں کی مذمت فرمائی ہے، جو رسول اللہ ﷺ سے کسی چیز کا سوال عیب جوئی کی خاطر یا بے مقصد کیا کرتے تھے، جس طرح کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے ان کو جھٹلانے اور دشمنی کے لیے سوال کیا تھا۔ سیدھی راہ سے مراد صراطِ مستقیم ہے اور اس راہ سے نکلنا جہالت و گمراہی میں جا پڑنا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں کا یہی حال ہے، جو انبیا کی تصدیق، اتباع اور اطاعت سے پھر گئے ہیں اور ضرورت کے بغیر کفر اور عیب جوئی کی خاطر سوال کر کے مخالفت اور تکذیب میں پڑ گئے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴾ [إبراهيم: ۲۸۔ ۲۹] ''کیا آپ نے ان لوگوں کو دیکھا نہیں جنھوں نے اللہ کی نعمت (ایمان) کو کفر سے بدل ڈالا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں لے جا اُتارا؟ (یعنی) جہنم میں، وہ اس میں داخل ہوں گے اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔''[3]

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نرمی کے بدلے سختی لی۔[4]

---

[1] تفسير الطبري (۲/ ۴۹۰) تفسير ابن أبي حاتم (۱/ ۲۰۲) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحيح المسبور (۱/ ۳۷۔ ۴۵)
[2] تفسير الطبري (۲/ ۴۹۰۔ ۴۹۱) [3] تفسير ابن كثير (۱/ ۲۰۳) [4] تفسير الطبري (۲/ ۴۹۵)

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ إِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۖۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهٖ ۗ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٠٩﴾

اہلِ کتاب میں سے بہت سے یہ چاہتے ہیں کاش کہ وہ تمھارے ایمان لانے کے بعد تمھیں پھیر کر کافر بنا دیں، اپنے دِلوں میں حسد کرتے ہوئے، اس کے بعد کہ ان کے سامنے حق واضح ہو چکا، پس معاف کر دو اور جانے دو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے، بے شک اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ﴿109﴾

اہلِ کتاب کی مشابہت سے ممانعت:

آخر کار آپ ﷺ کو حکم پہنچا، جس کی وجہ سے یہودیوں کو مدینے کے آس پاس سے باہر نکال دیا گیا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو اس بات سے ڈرایا ہے کہ تم اہلِ کتاب کی چال نہ چلو، وہ تم سے ظاہر و باطن میں عداوت رکھتے ہیں، اس بات کو جاننے کے باوجود کہ تم اور تمھارے نبی صاحبِ فضل ہیں، تم پر حسد کرتے ہیں، سو تم اللہ کی مدد اور فتح کا حکم آنے تک خاموش رہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ آیت حیی بن اخطب اور ابو یاسر بن اخطب یہودی کے بارے میں اُتری۔ جو حسد ان کو تھا، وہ کسی اور کو نہ تھا۔ ان سے جہاں تک ہوتا، لوگوں کو اسلام سے پھیرتے۔[1]

امام زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت کعب بن اشرف کے بارے میں اُتری ہے۔ یہ یہودی شاعر تھا اور رسول اللہ ﷺ کی ہجو کیا کرتا تھا۔ یہ آیت: ﴿ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا ﴾ [البقرة: ١٠٩] ”پس معاف کر دو اور جانے دو۔“[2] اس آیت کی طرح ہے: ﴿ لَتُبْلَوُنَّ فِيْ أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ۫ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ أَشْرَكُوْا أَذًى كَثِيْرًا ۚ وَإِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَإِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ ﴿186﴾ ﴾ [آل عمران: ١٨٦] ”البتہ تمھیں تمھارے مالوں اور تمھاری جانوں کے بارے میں ضرور آزمایا جائے گا اور تم ان لوگوں سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور ان لوگوں سے جنھوں نے شرک کیا، ضرور تکلیف دینے والی باتیں سنو گے اور اگر تم صبر کرو اور پرہیز گاری اختیار کرو تو بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔“

---

1. تفسير الطبري (٢/ ٤٩٩) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٠٤) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحيح المسبور (١/ ٣٧۔ ٤٥)
2. تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٠٤۔ ٢٠٥) تفسير ابن كثير (١/ ٢٠٣)

عفو اور درگزر کا نسخ:

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیتِ عفو اور صفح منسوخ ہے اور اس کی ناسخ یہ آیت ہے: ﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ﴾ [التوبة: ٥] ''تو تم مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ قتل کر دو۔'' نیز اللہ کا فرمان: ﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ [التوبة: ٢٩] ''ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اس چیز کو حرام نہیں ٹھہراتے جسے اللہ نے اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے اور دینِ حق کو قبول نہیں کرتے، وہ جو اہلِ کتاب میں سے ہیں، (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔''

ایک جماعتِ سلف کا یہی قول ہے کہ یہ آیت، آیتِ سیف (جس آیت میں لڑائی کا حکم ہے) سے منسوخ ہے۔ چناں چہ لفظ ﴿ حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ﴾ ''یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے۔'' سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس حکم کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ، مشرکین اور اہلِ کتاب سے درگزر کرتے۔ انھیں معاف فرماتے، اُن کی ایذا دہی اور ستانے پر صبر کرتے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے قتل کی اجازت فرمائی۔ تب بڑے بڑے قریش جان سے مارے گئے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کو امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے اور اس کی اسناد صحیح ہے، مگر صحاح ستہ میں اس کو نہیں دیکھا، البتہ اس کی اصل صحیحین میں ہے۔[1]

عہدِ نبوت کے اہلِ کتاب اور آج کے اہلِ کتاب کی ایک ہی تمنا:

جس طرح زمانۂ نبوی میں اہلِ کتاب یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اسلام کو چھوڑ کر کتابی (یہودی و نصاریٰ) مشرک بن جائیں اور اُن کی دولت و عزت جاتی رہے، اسی طرح اس زمانے میں وہ لوگ اسی فکر میں رہتے ہیں کہ سارے اہلِ اسلام کتابی ہو کر دینِ حق سے پھر جائیں۔ دنیا اور دین کے بارے میں ان سے مزاحمت کرنے والا روئے زمین پر کوئی باقی نہ رہے۔ سو ابتدائے اسلام میں، جس طرح صحابہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ایذا پر صبر کیا تھا، اسی طرح آج غربائے اسلام (اسلام کی خاطر رنج و محن میں بسنے والے) صابر ہیں، صدہا تکالیف ان کے ہاتھ سے پاتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں، لہٰذا جس طرح اللہ نے ایک مدت کے بعد اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے قتل کا حکم دیا تھا، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے یہ وعدہ کیا ہے کہ مہدی علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں تم ان کو قتل کرو گے، سو سارے مسلمان اسی انتظار میں خاموش ہیں۔ ﴿ حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ... ﴾

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٠٦) تفسير ابن كثير (١/ ٢٠٤) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٩٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٩٨)

اگر چہ وعدہ نبوی کے مطابق اہلِ اسلام کا ایک نہ ایک گروہ کسی نہ کسی جگہ ہمیشہ غالب رہتا ہے، مخالف اس کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے، مگر اسلام کی موجودہ غربت ِ عمومی، مہدیِ موعود فاطمی کے ظہور اور عیسیٰ روح اللہ علیہما السلام کے نزول کے بغیر دور ہوتی نظر نہیں آتی۔ اس آیت پر پارہ ''الٓمٓ'' کا ثلث (تہائی) مکمل ہوا۔

وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

اور تم نماز قائم کرو اور زکات دو، اور تم اپنے لیے جو بھی بھلائی آگے بھیجو گے اسے اللہ کے ہاں پاؤ گے، بے شک تم جو عمل کرتے ہو اللہ اسے خوب دیکھنے والا ہے ﴿۱۱۰﴾

نیک اعمال کی ترغیب:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ تم اس کام میں مشغول ہو جاؤ جو تم کو فائدہ بخشے، عاقبت کو درست کر دے، دنیا میں فتح و نصرت حاصل ہو، آخرت میں گواہ حاضر ہوں، جس دن ظالموں کا کوئی عذر قبول نہ کیا جائے گا، بلکہ ان پر لعنت ہوگی اور برا انجام ہوگا، اسی لیے یہ فرمایا کہ ہم تمھارا کام دیکھتے ہیں، یعنی تمھارے کرتوت سے ہم غافل نہیں، اچھا ہو یا برا، ہر عامل کو اس کے کیے کی جزا سزا ضرور ملے گی۔

گرامر کی رو سے یہ آیت اگر چہ کسی بات کی خبر سے خالی ہے، مگر اس میں وعدہ و وعید، حکم اور آگاہی سب کچھ ہے۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا ﴾ [المزمل: ۲۰] ''اور تم اپنے آپ کے لیے جو نیکی آگے بھیجو گے تو اسے اللہ کے ہاں بہتر اور زیادہ اجر والی پاؤ گے۔'' گویا سب کو جتا دیا کہ تم اطاعت کرو، ثواب لو، نافرمانی سے بچو اور عذاب سے نجات حاصل کر لو۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

اور انھوں نے کہا: جنت میں صرف وہی جائے گا جو یہودی یا نصرانی ہوگا۔ یہ ان کی (باطل) آرزوئیں ہیں، (اے نبی!) کہہ دیجیے: لاؤ تم اپنی دلیل، اگر تم سچے ہو ﴿۱۱۱﴾ کیوں نہیں! بلکہ جس نے اپنا چہرہ اللہ کے لیے جھکا دیا، اس حال میں کہ وہ نیکی کرنے والا ہے، تو اس کے لیے اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے اور انھیں کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۱۱۲﴾

اہلِ کتاب کی تمنائیں:

اللہ نے اس آیت میں اہلِ کتاب کا غرور ذکر کیا ہے کہ ان دونوں میں ہر گروہ اس بات کا مدعی ہے کہ جنت میں وہی شخص جائے گا، جو ان کی ملت پر ہوگا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدہ میں فرمایا: ﴿ وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبّٰٓؤُهٗ ﴾ [المائدۃ: ۱۸] ''اور یہودیوں اور عیسائیوں نے کہا: ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔'' لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ جھوٹے اور دغا باز ہیں۔ یہ ان کی محض تمنائیں ہیں۔ وہ اپنے گناہوں کا عذاب پائیں گے اور جہنم کی سیر کریں گے۔ اگر وہ سچے ہوتے تو انھیں عذاب نہ ہوتا۔

ان کا یہ دعویٰ ویسا ہی ہے، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کہ ﴿ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ﴾ [البقرۃ: ۸۰] ''آگ ہمیں گنتی کے چند دنوں کے سوا ہرگز نہیں چھوئے گی۔'' سو جس طرح اللہ نے ان کے دعوے کی اس جگہ تردید کی تھی، اسی طرح اس جگہ بھی رد فرمایا ہے کہ ان کا یہ دعویٰ دلیل و حجت کے بغیر ہے۔ ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کی اللہ پر یہ تمنا ناحق ہے،[1] اسی لیے ان سے سند طلب کی گئی ہے کہ تم اپنی حجت پیش کرو اور گواہ لاؤ۔ پھر یہ فرمایا کہ جس نے اپنا منہ اللہ کو سونپا، یعنی اپنا دین خالص کیا اور وہ محسن ہے، یعنی متبع رسول تو اس کا انجام بہ خیر ہے۔

مقبولِ عمل کی شرائط:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عملِ مقبول کے لیے دو شرطیں ہیں: ایک یہ کہ خالص اللہ ہی کے لیے ہو اور دوسرے یہ کہ صواب، یعنی سنتِ مطہرہ کے مطابق ہو۔ اگر عمل خالص ہوا، مگر صواب نہ ہوا تو قبول نہ ہوگا۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، جس نے ایسا کام کیا، جس پر ہمارا حکم نہیں تو وہ مردود ہے۔[2] (رواہ مسلم من حدیث عائشة)

اس لیے درویشوں اور ان لوگوں کا عمل جو اُن کی طرح ہیں، گو فرض کیا جائے کہ وہ اس میں مخلص ہیں، لیکن اس وقت تک مقبول نہیں، جب تک رسول اللہ ﷺ کی پیروی میں نہ ہو۔ کون سے رسول؟ جو ساری مخلوق کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ انھی جیسے لوگوں کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ۝ ﴾ [الفرقان: ۲۳] ''اور انھوں نے جو (بظاہر نیک) عمل کیے ہوں گے، ہم ان کی طرف متوجہ ہو کر ان کو اڑتا ہوا پراگندہ گرد و غبار بنا دیں گے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۚ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا ﴾ [النور: ۳۹] ''اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال چٹیل میدان

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۰۷)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۵۵۰) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷۱۸) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۰۵)

میں ریت کی طرح ہیں، پیاسا اس (ریت) کو پانی سمجھتا رہا، حتی کہ جب وہ اس کے پاس پہنچا تو اس نے وہاں کچھ بھی نہ پایا۔‘‘

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ خَاشِعَةٌ ۝ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ۝ ﴾ [الغاشية: ٢۔٥] ’’اس دن کئی چہرے ذلیل ہوں گے۔ سخت محنت کرنے والے تھکے ماندے ہوں گے۔ دہکتی آگ میں داخل ہوں گے۔ انھیں گرم کھولتے چشمے کا پانی پلایا جائے گا۔‘‘

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر رہبان (تارکینِ دنیا) کے ساتھ کی ہے۔[1]

ریا کاری عمل ضائع کرنے کا سبب ہے:

رہی یہ بات کہ عمل ظاہری طور پر شریعت کے مطابق ہو، لیکن خالص اللہ کے لیے نہ ہو تو ایسا عمل بھی مردود ہوتا ہے۔ کالائے بد بریش خاوند۔ (خراب مال مالک ہی کا ہوگا) یہ ریا کاروں اور منافقوں کا حال ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ ﴾ [النساء: ١٤٢] ’’بے شک منافقین اللہ کو دھوکا دیتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں دل سے نہ چاہتے ہوئے، لوگوں کو دکھانے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور وہ اللہ کو بس تھوڑا ہی یاد کرتے ہیں۔‘‘ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝ ﴾ [الماعون: ٤۔٧] ’’چنانچہ تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں۔ وہ جو دکھاوا کرتے ہیں۔ اور (لوگوں کو) استعمال کی معمولی چیزیں بھی دینے سے انکار کرتے ہیں۔‘‘ اسی لیے یہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝ ﴾ [الكهف: ١١٠] ’’پھر جو شخص کہ اپنے رب کی ملاقات کی اُمید رکھتا ہو تو وہ عمل کرے نیک عمل اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ ٹھہرائے۔‘‘

نیز اس جگہ یہ فرمایا: ﴿ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ ﴾ [البقرة: ١١٢] ’’کیوں نہیں! بلکہ جس نے اپنا چہرہ اللہ کے لیے جھکا دیا، اس حال میں کہ وہ نیکی کرنے والا ہے۔‘‘ دونوں آیتوں کا مطلب ایک جیسا ہے۔ پھر اس اخلاص اور صحیح عمل پر یہ اقرار کیا ہے کہ نہ کسی گذشتہ اَمر پر غم ہوگا اور نہ کسی آیندہ اَمر پر کچھ خوف ہوگا۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہ مرتے وقت کچھ غم اور نہ آخرت میں کچھ ڈر ہوگا۔[2]

---

[1] تفسير ابن كثير (١/ ٢٠٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٠٨)

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور یہودیوں نے کہا: عیسائی کسی چیز پر نہیں اور عیسائیوں نے کہا: یہودی کسی چیز پر نہیں، حالاں کہ وہ دونوں (اپنی اپنی) کتاب پڑھتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ علم نہیں رکھتے، انھوں نے بھی ان کے قول سے ملتی جلتی بات کہی، پھر قیامت کے دن اللہ ان کے درمیان اس چیز کا فیصلہ فرمائے گا، جس میں وہ اختلاف کرتے تھے ﴿113﴾

یہود و نصاریٰ کا ایک دوسرے کو لا مذہب قرار دینا:

اس آیتِ شریفہ میں اللہ پاک نے اہلِ کتاب کی آپس کی ضد، بغض، عداوت اور عناد بیان فرمایا ہے، یعنی ان کی آپس میں بڑی ضد، بغض، عداوت اور دشمنی ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب نجران کے عیسائی رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو یہودی علما بھی حاضر ہوئے۔ ان کا آپس میں جھگڑا ہوا۔ رافع بن حریملہ نے کہا کہ تم کچھ چیز نہیں ہو اور عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کا انکار کیا۔ ایک نجرانی عیسائی نے جواب دیا کہ تم بھی کچھ شے نہیں اور موسیٰ علیہ السلام و تورات کا انکار کیا۔ اس پر اللہ نے یہ آیت اُتاری اور فرمایا کہ یہ دونوں کتاب پڑھنے والے اپنی اپنی کتاب میں ایک دوسرے کی تصدیق پاتے ہیں۔[1] یہودیوں کا عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کرنا بالکل غلط ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے تورات میں موسیٰ علیہ السلام کی زبان پر ان سے عہد لیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرنا، اسی طرح انجیل میں موسیٰ علیہ السلام اور تورات کی تصدیق ہے، پھر ایک کا دوسرے کو کافر کہنا کیسا ہے؟!

امام مجاہد و قتادہ رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ پہلے یہود و نصاریٰ اصل راہ پر تھے۔ لیکن اس آیت میں مراد وہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھے۔ انھوں نے بدعات نکالیں اور متفرق ہوگئے۔[2] مگر صحیح یہ ہے کہ سارے اگلے پچھلے مراد ہیں۔ ایک نے دوسرے کا انکار کر کے دشمنی اور کفر کر کے اور فساد در فساد کر کے مقابلہ کیا۔

﴿ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ سے مراد نصاریٰ ہیں، جنھوں نے یہودیوں سے یہ بات چیت کی۔ یہ قول قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔

---

(1) تفسیر الطبري (۲/ ۵۱۳۔ ۵۱٤) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۰۸) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحیح المسبور (۱/ ۳۷۔ ٤٥)

(2) تفسیر الطبري (۲/ ۵۱۵)

عطا ﷫ نے کہا ہے کہ یہ وہ اُمتیں ہیں جو یہود و نصاریٰ سے پہلے اور تورات اور انجیل کے اُترنے سے پہلے تھیں۔[1] جیسے قومِ نوح، ہود، صالح، لوط اور شعیب ﷩ کہ ان سب نے اپنے انبیا کے حق میں یہ بات کہی کہ وہ کسی راہ پر نہیں ہیں۔ امام سدی ﷫ نے کہا ہے کہ مراد عرب ہیں، جنھوں نے کہا کہ محمد ﷺ کسی راہ پر نہیں ہیں۔[2]

موضح قرآن میں تحریر ہے کہ جن کے پاس علم نہیں ہے، وہ عرب کے لوگ ہیں، حضرت ابراہیم کا دین رکھتے تھے، آخر بہک کر بت پوجنے لگے۔ ایسے شخص کو مشرک کہیے کہ وہ اپنی ہی راہ بتاتے تھے۔ امام ابن جریر ﷫ نے کہا ہے کہ آیت عام ہے، سب کو شامل ہے، کسی خاص گروہ کی تعیین کے لیے کوئی قطعی دلیل نہیں ہے، اس لیے اس کا اطلاق تمام گروہوں پر کرنا زیادہ مناسب ہے۔[3] واللہ أعلم.

بدعتی فرقوں کا ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق کرنا:

میں بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ آیت صرف سابقہ اُمتوں یا پہلے عرب لوگوں کے بارے میں خاص نہیں ہے، بلکہ ہر زمانے کے بے علم لوگ قرآن پڑھنے کے باوجود اسی طرح کی گفتگو اپنے اپنے وقت میں کیا کرتے ہیں۔ روافض کو دیکھو کہ خوارج، نواصب کو "لَا عَلٰی شَیْءٍ" "وہ کسی چیز پر نہیں" کہتے اور انھیں کافر سمجھتے ہیں۔ خوارج، روافض کو کافر کہتے ہیں۔ اسلام میں تہتّر (۷۳) فرقے ہوں گے۔[4] ایسے بہت فرقے نکلے کہ جن کا ایک دوسرے کو کافر کہنے کا سلسلہ جاری رہا یا اب تک جاری ہے۔ یہی حال مذاہب کے مقلدین کا ہے کہ ہر ایک مقلد دوسرے کو گمراہ، اسلام سے دور، بلکہ کافر کہتا ہے۔ ہاں، اللہ تعالیٰ نے ایک گروہ، یعنی اہلِ سنت و جماعت کو اس بلا سے بچا لیا ہے کہ وہ کسی مسلمان کو کافر لاشيء نہیں کہتے اور نہ وہ اس کو کافر کہتے ہیں، جب تک کفرِ صریح موجود نہ ہو، اس پر اللہ ہی کی تعریف ہے اور یہ اسی کا احسان ہے۔ امام رازی ﷫ نے کہا ہے کہ یہ واقعہ یقیناً اس امت میں واقع ہوا ہے کہ ہر گروہ دوسرے گروہ کی تکفیر کرتا ہے، باوجودیکہ قرآنِ مجید کی تلاوت پر سب کا اتفاق ہے۔[5]

فیصلے کا دن:

یہ جو فرمایا ہے کہ ان کا فیصلہ روزِ قیامت ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دن عدل جاری ہوگا۔ کسی پر ذرہ برابر ظلم روا نہیں رکھا جائے گا، جس طرح سورۃ الحج میں فرمایا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ﴾ [الحج: ١٧] "بے شک جو لوگ ایمان لائے، اور جو یہودی ہوئے، اور صابی (بے دین) اور نصاریٰ اور

---

[1] تفسیر الطبري (٢/ ٥١٦۔ ٥١٧)
[2] تفسیر الطبري (٢/ ٥١٧)
[3] تفسیر الطبري (٢/ ٥١٧)
[4] دیکھیں: سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٥٩٦)
[5] تفسیر الرازي (٤/ ٨)

مجوسی اور وہ لوگ جنھوں نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، بے شک اللہ ان کے مابین یومِ قیامت فیصلہ کرے گا، یقیناً اللہ ہر شے پر شاہد ہے۔'' یہ چھے گروہ ہوئے، جن کا اس دن فیصلہ کیا جائے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيمُ ﴿٢٦﴾﴾ [سبا: ٢٦] ''کہہ دیجیے: ہمارا رب ہم سب کو جمع کرے گا، پھر وہ ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور وہی بہتر فیصلہ کرنے والا، خوب جاننے والا ہے۔''

فتح سے اس جگہ فیصلہ اور حکم مراد ہے۔ آدم سے لے کر اس دم تک جتنی اُمتیں گزری ہیں اور مخلوق کے درمیان جتنے اختلافات ہوئے ہیں، ان سب کا واجبی فیصلہ قیامت کے دن پروردگارِ عالم کے روبرو ہونے والا ہے۔ تم بھی منتظر رہو، ہم بھی منتظر ہیں۔ وہاں معلوم ہو جائے گا کہ حق پر کون تھا اور باطل پر کون ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسَاجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا ۚ أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١١٤﴾

اور اس سے زیادہ ظالم کون ہوسکتا ہے جس نے لوگوں کو اس بات سے روکا کہ اللہ کی مسجدوں میں اللہ کا نام ذکر کیا جائے اور انھیں اجاڑنے کی کوشش کی، ان (روکنے والوں) کے لائق تو یہ تھا کہ ان میں ڈرتے ہوئے داخل ہوں۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے ﴿١١٤﴾

مساجد سے روکنے والوں کا ظلم اور اُن سے مراد:

نصاریٰ نبی اکرم ﷺ کو انصاف پسند تصور کرتے تھے اور یہودیوں کو ظالم، کیوں کہ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے دشمنی کی اور مسلمانوں نے ان کو مانا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب نصاریٰ نے غلبہ پایا تو مسجد بیت المقدس کو تباہ کیا اور یہودیوں کی ضد سے ان کی مسجدیں ویران کیں۔ یہ کیا انصاف ہے کہ آدمیوں کی ضد سے اللہ کی مسجدیں ویران کریں؟ پھر فرمایا کہ وہ اس لائق بھی نہیں ہیں کہ وہ اس ملک میں حاکم رہیں۔ آخر اللہ نے وہ ملکِ شام مسلمانوں کے ہاتھ لگایا۔ جب سے اب تک بحمدہٖ تعالیٰ قبضۂ اسلام میں ہے، چند روز کے لیے نکل گیا تھا، پھر واپس آ گیا۔ اب ترکوں کے ہاتھ میں ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ ان مانعینِ مساجد سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ نصاریٰ ہیں۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ بیت المقدس میں ایذا رسانی والی چیزیں پھینکتے اور لوگوں کو نماز پڑھنے سے روکتے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خرابی کرنے والوں سے مراد بخت نصر

[1] تفسیر الطبري (٢/ ٥٢٠) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

ہے۔ اس کے لشکریوں نے بیت المقدس کو اُجاڑا اور نصاریٰ نے اس کی مدد کی، انھوں نے یہ کام یہودیوں کی دشمنی پر کیا، یہ بخت نصر بابلی مجوسی تھا۔[1]

لیکن اس قول میں اتنی بات ہے کہ اہلِ سیرت اس بات پر متفق ہیں کہ بخت نصر کا عہد مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے تھا اور نصاریٰ مسیح علیہ السلام کے بعد ہوئے، پھر کیوں کر اس کے مددگار ہو سکتے ہیں؟ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ روم نے بختِ نصر کی مدد کی اور مسجد میں مردار لا کر ڈال دیے، کیوں کہ بنی اسرائیل نے یحییٰ بن زکریا علیہ السلام کو قتل کیا تھا۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔[2] دوسرا قول یہ ہے کہ مانعین سے وہ مشرک مراد ہیں، جو حدیبیہ کے دن رسول اللہ اور مکہ معظمہ کے درمیان حائل ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذی طوی میں قربانی کر کے چلے آئے۔ ان سے کتنا ہی کہا کہ کبھی کسی نے کسی کو اس گھر سے نہیں روکا، بلکہ آدمی اپنے باپ بھائی کے قاتل کو بھی دیکھ کر منع نہیں کرتا تھا۔ انھوں نے ایک نہ مانی اور کہا کہ جنھوں نے ہمارے آبا کو بدر کے دن قتل کیا ہے، وہ ہرگز ہمارے شہر میں داخل نہیں ہو سکتے، ہم زندہ ہوں اور وہ آئیں، یہ نہیں ہو سکتا۔

بربادی کی کوشش سے کیا مراد ہے؟

خراب کرنے کی سعی سے یہ مراد ہے کہ جو کوئی مسجد الحرام میں ذکر کرتا اور حج عمرے کے لیے آتا تو اس کو آنے نہ دیتے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ کے نزدیک نماز پڑھنے سے منع کر دیا تھا، اس پر یہ آیت اتری۔[3] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے پہلا قول اختیار کیا ہے اور وہ اس دلیل سے کہ قریش نے کعبہ کی ویرانی کے لیے کوئی کوشش نہیں کی، جبکہ روم نے بیت المقدس میں تخریب کی کوشش کی تھی۔[4]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دوسرا قول زیادہ مناسب ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جس وقت نصاریٰ نے یہودیوں کو بیت المقدس میں نماز سے روکا تھا، اس وقت نصاریٰ کا دین یہود کے دین کی نسبت زیادہ تر قائم اور مضبوط تھا اور یہی لوگ حق کے زیادہ قریب تھے۔ یہود کا ذکر کرنا، اس وقت مقبول نہ تھا، کیوں کہ وہ اس سے پہلے داود علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی زبان پر ملعون ہو چکے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ کی مذمت بیان فرما چکا تھا تو مشرکین کی مذمت کی طرف توجہ فرمائی، جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا تھا اور مسجد الحرام میں نماز ادا کرنے سے روک دیا تھا۔

رہی یہ بات کہ قریش نے کعبہ کی ویرانی کے لیے کوئی سعی نہیں کی تو اس سے زیادہ اور کیا خرابی ہوگی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] تفسیر الطبري (٢/ ٥٢٠) [2] تفسیر الطبري (٢/ ٥٢١) تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٠٦)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢١٠) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحیح المسبور (١/ ٣٧۔ ٤٥)

[4] تفسیر الطبري (٢/ ٥٢١)

اور صحابہ کرام ﷺ کو نکال دیا، اپنے بتوں کو لے کر کعبہ پر قابض بن بیٹھے، اپنے شرک اور بتوں کو رواج دیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ ۚ إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴾ [الأنفال: ٣٤] ''اور (اب) ان کے لیے کونسی وجہ ہے کہ اللہ انھیں عذاب نہ دے، جبکہ وہ (لوگوں کو) مسجد حرام سے روکتے ہیں، حالاں کہ وہ اس کے متولی نہیں، اس کے متولی تو متقی لوگ ہی ہیں اور لیکن ان میں سے اکثر (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسَاجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۚ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ ۞ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ ۖ فَعَسَىٰ أُولَٰئِكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ﴾ [التوبة: ١٧۔ ١٨] ''مشرکین اس لائق نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں، جب کہ وہ اپنے آپ پر کفر کی گواہی دے رہے ہوں۔ انہی لوگوں کے (سب) اعمال برباد ہوگئے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ اللہ کی مسجدیں تو صرف وہ آباد کرتا ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا اور اس نے نماز قائم کی اور زکات دی اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرا، لٰہذا امید ہے کہ یہی لوگ ہدایت یافتہ لوگوں میں سے ہوں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوفًا أَنْ يَبْلُغَ مَحِلَّهُ ۚ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُؤْمِنَاتٌ لَمْ تَعْلَمُوهُمْ أَنْ تَطَئُوهُمْ فَتُصِيبَكُمْ مِنْهُمْ مَعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ لِيُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴾ [الفتح: ٢٥] ''یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور تمھیں مسجد حرام سے روکا اور قربانی کے جانوروں کو بھی اپنی قربان گاہ تک پہنچنے سے روکے رکھا اور اگر (مکہ میں کچھ) مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتے جن (کے ایمان) کو تم نہیں جانتے، (اگر یہ خطرہ نہ ہوتا) کہ تم انھیں روند ڈالو گے، پھر بے خبری میں ان (کے قتل) کی وجہ سے تمھیں تکلیف پہنچتی (تو تمھیں لڑنے کی اجازت دے دی جاتی لیکن ایسا نہیں کیا گیا) تاکہ اللہ جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے۔ اگر وہ (مومن اور کافر) الگ الگ ہوتے تو ان میں جو کافر تھے، ہم انھیں نہایت دردناک عذاب دیتے۔'' سو جب ایسے لوگ وہاں سے نکالے اور بھگائے گئے، جو مومن نمازی اور زکات ادا کرنے والے تھے تو اس سے بڑھ کر کعبہ کی اور کیا ویرانی ہوسکتی ہے۔[1]

عمارت سے یہ مراد نہیں کہ اس کی اچھی صورت تیار کریں۔ اسے آراستہ پیراستہ کریں اور نقش و نگار بنائیں، بلکہ اس کی عمارت اور آبادی یہی ہے کہ اس میں اللہ کا ذکر ہو۔ شریعت قائم کی جائے، کفریہ حرکات اور شرک کی نجاست سے پاک صاف رہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٠٧)

غلبۂ اسلام کی بشارت:

اس جملے کا مطلب کہ ''نہ داخل ہوں مسجد میں، مگر ڈرتے ہوئے۔'' یہ ہے کہ اے مسلمانو! جب تمھیں قدرت حاصل ہو تو تم ان ظالموں کو نہ آنے دو، مگر صلح کی خاطر یا جزیہ دینے کے لیے، اسی لیے جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح کیا تو اگلے سال، یعنی نویں برس یہ حکم دیا کہ میدانِ منیٰ میں یہ اعلان کر دو کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کو نہ آئے اور نہ کوئی برہنہ اس گھر کا طواف ہی کرے اور جس کے لیے کوئی مدت ٹھہر چکی ہے، وہ اپنی مدت پوری کرے۔ یہ اس آیت کی تصدیق اور اس پر عمل ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ﴾ [التوبۃ: ۲۸] ''اے ایمان والو! بلاشبہ مشرک تو ہیں ہی پلید، لہٰذا وہ اپنے اس برس کے بعد مسجد حرام کے قریب نہ آنے پائیں۔''

بعض نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ وہ مسجد میں نہ آئیں، مگر ہیبت زدہ کانپتے ہوئے کہ کہیں مومنین ان کو پکڑ نہ لیں، چہ جائیکہ وہ مسجد پر غالب ہوں اور مومنین کو مسجد میں داخل ہونے سے منع کریں، یعنی حق واجب تو اس طرح ہی ہے کہ اگر کفار وغیرہ کا ظلم وستم نہ ہو تو پھر خوف کی کوئی بات نہیں۔

کسی نے کہا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے مسلمانوں کو اس بات کی بشارت ہے کہ وہ عن قریب مسجدِ حرام اور ساری مسجدوں پر غالب آجائیں گے اور مشرک اس قدر ذلیل ہوں گے کہ کوئی بے خوف ہو کر مسجد میں نہ آسکے گا۔ ہر کسی کو یہ ڈر ہوگا کہ اگر وہ اسلام نہ لایا تو کہیں اس کو پکڑ کر سزا نہ دیں یا قتل نہ کر ڈالیں۔ سو اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا اور مشرکوں کو مسجد الحرام میں داخل ہونے سے روک دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے وصیت فرمائی کہ جزیرۂ عرب میں دو دین رہنے نہ پائیں اور یہود و نصاریٰ وہاں سے نکال دیے جائیں۔ اللہ کے لیے تمام تعریفیں ہیں اور اسی کے احسانات ہیں۔ دیکھیے اس مسجد الحرام کے اطراف و اکناف اور رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے کی جگہ کی پاکی اور بزرگی کو کس قدر ملحوظ رکھا گیا ہے اور مشرکوں کی رسوائی کا سامان ہوا ہے، جیسا انھوں نے کیا تھا، ویسی ہی انھیں جزا ملی۔ جس طرح انھوں نے مسلمانوں کو مسجدِ حرام سے روکا تھا، اسی طرح وہ خود روکے گئے۔ جس طرح ان کو مکہ معظّمہ سے نکالا، اسی طرح وہ بھی نکلے۔ آخرت میں بیت اللہ کی ہتک، وہاں بت نصب کرنا، غیر اللہ کو پکارنا اور عریاں طواف کرنا، جیسے اعمال پر علاحدہ عذابِ عظیم ہوگا۔

جس نے مسجد کی تفسیر بیت المقدس کے ساتھ کی ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب نصاریٰ اس پر غالب آئے اور اس کو ویران کر دیا تو اللہ نے محمد ﷺ کو بھیجا اور ان پر یہ آیت اُتاری، لہٰذا زمین پر کوئی نصرانی نہیں ہے، جو بیت المقدس میں آئے، مگر ڈرتا ہوا آتا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوئی رومی نہیں

ہے، مگر اس کو یہ ڈر ہے کہ کہیں وہاں اس کی گردن نہ ماری جائے یا اس سے جزیہ نہ لیا جائے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نہیں آتے مساجد میں مگر چوری سے۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ بات بھی آیت کی عمومیت میں داخل ہے۔ کیوں کہ جب نصاریٰ نے بیت المقدس پر ظلم کیا اور جس قبۂ صخرہ کی طرف یہودی نماز پڑھتے تھے، اسے خوار و حقیر کر دیا تو شرعاً وقدراً اس کا انجام ذلت ہوا، مگر بعض اوقات ذلت سے بچے، جب کہ انھی لوگوں سے وہ جگہ بھر گئی تھی، کیوں کہ سب ایک جیسے تھے۔ اسی طرح یہودیوں نے جب وہاں اللہ کی نافرمانی کی، بلکہ نافرمانی میں نصاریٰ سے بھی آگے بڑھ گئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں سزا جزا بھی بہت بڑی دی۔[2]

دنیا کی ذلت سے مراد:

اسی لیے ان لوگوں نے دنیا کی ذلت کو مہدی علیہ السلام کے ظاہر ہونے کے ساتھ ہونا کہا ہے۔ سدی، عکرمہ اور وائل بن داود رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس رسوائی سے مراد یہ ہے کہ ذلیل ہو کر آئیں اور اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔[3] مگر صحیح یہ ہے کہ دنیا کی ذلت مراد لینا، ان سب اقوال سے زیادہ جامع ہے۔ حدیث میں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا اور آخرت کی رسوائی سے پناہ مانگی ہے۔ بُسر بن ارطاۃ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کیا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ أَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِي الْأُمُوْرِ كُلِّهَا وَأَجِرْنَا مِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا وَعَذَابِ الْآخِرَةِ» (رواه أحمد) ”اے اللہ! تمام کاموں میں ہمارا انجام نیک کر اور دنیا کی رسوائی اور عذابِ آخرت سے پناہ دے۔“ یہ حدیث حسن ہے۔[4] اگرچہ یہ صحاح ستہ میں نہیں ہے۔ ان سے فقط یہی ایک حدیث یا یہ حدیث «لَا تُقْطَعُ الْأَيْدِيْ فِيْ الْغَزْوِ» ”جنگ میں ہاتھوں کو نہ کاٹا جائے۔“[5] مروی ہے۔ ان کو ابن ابی ارطاۃ بھی کہتے ہیں۔

مساجد کی ویرانی سے مراد:

فتح البیان میں ہے کہ مساجد کی ویرانی سے مراد یہ ہے کہ انھیں گرا دیں یا ان عبادات سے ان کو معطل کر دیا جائے جن کے لیے وہ بنائی گئی ہیں، جیسے علم کا سیکھنا سکھانا، اعتکاف کے لیے بیٹھنا، نماز کا انتظار کرنا۔ لہٰذا کسی حال میں بھی مانعین وہاں نہ آئیں، مگر خوف کی حالت میں ڈرتے کانپتے اور لرزتے ہوئے، کیوں کہ بیت المقدس نصاریٰ کے حج و زیارت کی جگہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ خوف سے مراد ذمی سے جزیہ لینا اور جنگجو کا قتل کرنا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد فتح قسطنطنیہ، رومیہ اور عموریہ ہے۔ مگر پہلا قول زیادہ قابلِ قبول ہے۔

اس آیت میں بندوں کو یہ ارشاد ہے کہ مسجدوں کو کافروں کے لیے ممنوع رکھیں۔ کوئی سی مسجد اور کسی طرح کا

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۱۱) [2] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۰۸) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۱۱)

[4] مسند أحمد (٤/ ۱۸۱) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”ورجال أحمد و أحد أسانید الطبراني ثقات“ مجمع الزوائد (۱۰/ ۲۸۲)

[5] سنن الترمذي، رقم الحدیث (۱٤٥۰) سنن النسائي، رقم الحدیث (٤۹۷۹)

کافر کیوں نہ ہو، کیوں کہ لفظ عام ہے، گو سبب خاص ہو۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے، یعنی ذلت، قتل، گرفتاری، جزیہ اور قید وغیرہ اور آخرت میں عذابِ عظیم، یعنی دوزخ کی آگ ہے۔[1]

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿١١٥﴾

اور مشرق و مغرب اللہ ہی کے لیے ہیں، لہٰذا تم جس طرف بھی منہ کرو گے وہیں ہے اللہ کا چہرہ، بے شک اللہ وسعت والا، خوب جاننے والا ہے ﴿115﴾

کون سا قبلہ سب سے بہتر ہے؟

یہود و نصاریٰ کا ایک یہ بھی جھگڑا تھا کہ ہر کوئی اپنے قبلے کو بہتر بتاتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ ایک طرف مخصوص نہیں ہے، جس طرف بھی منہ کرو، وہ متوجہ ہے۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تسلی دی ہے، جنھیں کافروں نے مکے سے نکال دیا تھا اور مسجد و مصلیٰ سے الگ کر دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ مکہ معظمہ میں کعبہ کے سامنے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ جب مدینہ میں آئے تو سولہ یا سترہ مہینے تک اُدھر ہی نماز پڑھی، پھر اللہ نے کعبہ کی طرف پھیر دیا اور یہ آیت اُتاری۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سب سے پہلے جو قرآن میں سے منسوخ ہوا، وہ یہی قبلے کا حکم تھا۔[2] منسوخ کرنے والی آیت یہ ہے: ﴿ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ﴾ [البقرة: ١٥٠] ''اور آپ جہاں سے بھی نکلیں، اپنا منہ مسجد حرام کی جانب پھیر لیں۔ اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں بھی ہو، اپنے منہ اسی کی جانب پھیر لو۔'' پھر کہا کہ وجہ اللہ سے مراد قبلۃ اللہ ہے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم جہاں کہیں ہو، منہ قبلے کی طرف کرو، یعنی کعبے کی طرف رکھو۔[3] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کا نزول کعبے کی طرف منہ کرنے کی فرضیت کے بعد ہوا ہے، یعنی مشرق اور مغرب اللہ کی ٹھہری تو کوئی جگہ اس سے خالی نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ﴾ [المجادلة: ٧] ''اور نہ اس سے کم اور نہ زیادہ، مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے، جہاں کہیں بھی وہ ہوں۔'' تو جس سمت کو تمھارا منہ ہوگا، وہ اللہ کی طرف ہوا، پھر جب مسجد الحرام کی طرف توجہ فرض ہوئی تو ہر سمت کا حکم منسوخ ہوگیا۔[4] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ بات کہ کوئی جگہ اللہ تعالیٰ سے خالی نہیں ہے، اگر اس سے مراد اللہ کا علم ہے

---

[1] فتح البيان (١/ ٢٥٧۔ ٢٥٨)

[2] تفسير الطبري (٢/ ٥٢٧) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحيح المسبور (١/ ٤٦۔ ٤٩)

[3] تفسير الطبري (٢/ ٥٣٤) [4] تفسير الطبري (٢/ ٥٢٨)

تو صحیح ہے، کیوں کہ تمام معلومات کو اس کا علم محیط ہے۔ رہی اس کی ذات تو ساری مخلوق میں سے کسی چیز میں محصور نہیں ہو سکتی، بلکہ عرش پر مستوی ہے۔ تَعَالٰی عَنْ ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيْرًا [1] ''وہ ذات پاک اس بات سے بہت بلند ہے۔''

سفر میں نفل نماز میں قبلہ رخ ہونے کا مسئلہ:

پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ سے یہ نقل کیا ہے کہ بعض کے نزدیک اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو اجازت دی گئی ہے کہ نفل نماز سیر وسفر، سختی وخوف اور حالتِ جنگ میں مشرق ومغرب میں سے جدھر چاہیں منہ کر کے نماز پڑھ لیں۔[2] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ یوں ہی کرتے تھے۔ سواری جدھر چاہے جائے، آپ ﷺ نماز پڑھتے تھے۔ اس حدیث کی اصل صحیحین اور سنن میں ہے۔[3] بخاری میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اگر خوف زیادہ ہو تو تم پیادہ یا سوار ہو کر قبلہ کی طرف یا غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھ لو۔ نافع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس بات کو رسول اللہ ﷺ سے ذکر کرتے تھے۔[4]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ شافعی نے سفرِ مسافت اور سفرِ عدوی (دشمن والے سفر) کے درمیان کچھ فرق نہیں کیا۔ سب میں نفل نماز سواری پر پڑھی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ اور مالکیہ اس کے خلاف کہتے ہیں۔ ابو یوسف اور ابوسعید اصطخری رحمہ اللہ نے یہ اختیار کیا ہے کہ سواری پر نفل نہ شہر میں پڑھے نہ سفر میں، یہی قول انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ نے بھی اسے اختیار کیا ہے۔[5] بعض نے کہا ہے کہ اس آیت کا نزول ایک قوم کے حق میں ہوا تھا کہ جن کو قبلہ معلوم نہیں تھا اور ہر کسی نے ایک طرف نماز پڑھی۔

قبلہ کے احکام ومسائل:

اللہ نے انھیں آگاہ کر دیا کہ یہ نماز جو تم نے پوری جستجو کے بعد پڑھی، اگرچہ قبلہ رو نہ تھی، لیکن ہو گئی ہے۔ عبیداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہم ایک اندھیری رات میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ لوگوں نے پتھر جمع کر کے مسجد بنا کر نماز پڑھی۔ صبح کو معلوم ہوا کہ اُدھر قبلہ نہ تھا۔ آپ ﷺ سے کہا کہ آج کی رات ہم نے نماز غیر قبلہ کی طرف پڑھی ہے؟ اس پر یہ آیت اتری۔ اس کو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی سند سے لکھا ہے، لیکن اس کی سند میں ضعفا ہیں۔ اسی کے لگ بھگ اور حدیثیں مختلف الفاظ سے آئی ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گو اُن میں ضعف ہے، مگر بعض بعض کو تقویت دیتی ہیں۔ رہی یہ بات کہ جو نماز قبلے کی طرف نہیں پڑھی، اس کی قضا کرے یا نہیں تو اس میں دو قول

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۰۹)
[2] تفسیر الطبري (۲/ ۵۳۰)
[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۰۰) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۹۵۸) سنن النسائي، رقم الحدیث (۴۹۰)
[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۴۲۶۱)
[5] تفسیر الطبري (۲/ ۵۳۳) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۰۹)

ہیں اور یہ روایات قضا نہ کرنے کے دلائل ہیں۔[1]

کسی نے کہا ہے کہ یہ آیت نجاشی کے حق میں اتری ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے نجاشی کی موت کی خبر دے کر نماز پڑھنی چاہی تو لوگوں نے کہا کہ وہ قبلہ کی طرف نماز نہیں پڑھتا تھا، اس پر یہ آیت اتری۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ بیت المقدس کی طرف پڑھتا تھا۔ اس کو منسوخی کی اطلاع نہیں پہنچی تھی۔ قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غائب پر یہ نماز پڑھنا درست ہے۔ پھر کہا ہے کہ یہ نماز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص تھی۔[2]

مَیں کہتا ہوں کہ خصوصیت کی کوئی قابلِ قبول دلیل نہیں ہے۔ جب نہیں ہے تو ہر غائب کی نمازِ جنازہ پڑھنا مسنون ہوا۔ یہی بات ٹھیک ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اہلِ مدینہ، اہلِ شام اور اہلِ عراق کا قبلہ مشرق و مغرب کے درمیان ہے۔ (رواہ ابن مردویہ) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حدیث کو اس جگہ سے ایک مناسبت ہے۔ اس کو ترمذی نے بھی مختصراً روایت کیا ہے اور حسن صحیح کہا ہے۔ پھر یہ کہا ہے کہ کئی اصحاب رضی اللہ عنہم سے یہی آیا ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ جب تو مغرب کو دائیں طرف اور مشرق کو بائیں طرف کرے گا تو قبلہ درمیان میں ہوگا۔ اس کو دارقطنی و بیہقی رحمہما اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔[3] مدینہ کے لوگ جنوب کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ ہند کے لوگ مغرب کی طرف منہ کرتے ہیں، جبکہ مکہ کے لوگ مسجد الحرام میں ہر چہار طرف منہ کرتے ہیں۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ایک یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ یہ آیت دعا کے حق میں اُتری ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب یہ آیت: ﴿ اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ [المؤمن: ٦٠] ''تم مجھے پکارو، میں تمھاری (دعائیں) قبول کروں گا۔'' اتری تو لوگوں نے کہا کہ ہم کدھر منہ کریں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ﴾ [البقرۃ: ١١٥][4] ''لہٰذا تم جس طرف بھی منہ کرو گے وہیں ہے اللہ کا چہرہ۔'' معلوم ہوا کہ دعا ہر طرف درست ہے، اگرچہ قبلہ رو ہو کر مانگنا افضل و اولیٰ ہو۔

واسع وہ ہے، جو بندوں پر ان کے دین میں گنجایش بخشے۔ جو بات ان کی طاقت سے باہر ہے، اس کی تکلیف نہ دے اور اس کا علم سب کو سما لے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴾ [طٰہٰ: ٩٨] ''اس نے

---

(1) تفسیر ابن کثیر (١/ ٢١٠)   (2) تفسیر القرطبي (٢/ ٨١۔ ٨٢)

(3) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٤٢) سنن الدارقطني (١/ ٢٧٠) سنن البیهقي (٢/ ٩) تفسیر ابن کثیر (١/ ٢١١)

(4) تفسیر الطبري (٢/ ٥٣٤)

ہر چیز کو اپنے علم سے گھیر رکھا ہے۔'' فراء (ایک نحوی ہے) نے کہا ہے کہ واسع وہ ہے جس کی بخشش اور سخاوت ہر شے کو سمالے۔[1] علیم وہ ہے جس کو ہر چیز کا علم ہو اور کوئی چیز اس کے علم سے غائب نہ ہو سکے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

اور انھوں نے کہا: اللہ نے اولاد بنا لی ہے۔ وہ اس سے پاک ہے، بلکہ اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اسی کے فرماں بردار ہیں ﴿116﴾ (وہ) آسمانوں اور زمین کا انوکھا موجد ہے اور جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے متعلق یہی کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے ﴿117﴾

اللہ کی اولاد قرار دینے والوں کا رد:

اس آیت اور اس کے بعد والی آیت میں عیسائیوں، یہودیوں، مشرکوں، فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دینے والوں اور ان جیسے دیگر مشرکوں کا رد ہے۔ اللہ نے ان سب کو جھٹلایا اور اُن کے دعوے کا بطلان کیا ہے۔ پھر اپنی تقدیس کے بعد یہ ارشاد فرمایا ہے: جو کچھ آسمان اور زمین کے درمیان ہے، سب میں اسی کا تصرف ہے۔ سب کا وہی ایک خالق، رازق، تقدیر مقرر کرنے والا، تسخیر کرنے والا، آسانی پیدا کرنے والا اور پورا اختیار رکھنے والا ہے۔ وہ جو چاہے، سو کرے، سب اس کے بندے ہیں اور اس کی ملکیت ہیں، پھر کوئی ان میں سے اِس کی اولاد کیسے ہو سکتا ہے؟ جب اولاد ہوگی تو وہ اسی تناسب سے ہوگی۔ اللہ کی کوئی نظیر نہیں ہے، جو اس کی عظمت یا کبریائی میں شریک ہو سکے۔ وہ بیوی نہیں رکھتا تو بچہ کہاں سے آئے گا؟ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾ ﴾ [الأنعام: ۱۰۱] ''وہی آسمانوں اور زمین کا موجد ہے، اس کی اولاد کیسے ہو سکتی ہے جب کہ اس کی کوئی بیوی نہیں؟ اور اسی نے ہر چیز کو پیدا کیا اور وہی ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ﴿۸۹﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿۹۴﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾ ﴾ [مریم: ۸۸۔ ۹۵] ''اور انھوں نے کہا: رحمٰن اولاد رکھتا ہے۔ البتہ یقیناً تم ایک بہت بھاری بات (گناہ) تک آپہنچے ہو۔ قریب ہیں کہ آسمان اس (بات) سے پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے، اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر پڑیں۔ اس

[1] فتح القدير (۱/ ۲۵۸)

(بات) پر کہ انھوں نے رحمٰن کے لیے اولاد کا دعویٰ کیا۔ اور رحمٰن کے لائق نہیں کہ وہ کسی کو اولاد بنائے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہیں، وہ سب رحمٰن کے پاس غلام بن کر آئیں گے۔ بلاشبہ یقیناً اس (رحمٰن) نے ان کا شمار کر رکھا ہے اور انھیں خوب گن رکھا ہے۔ اور وہ سب یوم قیامت اللہ کے پاس تنہا تنہا آئیں گے۔" نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴾ [الإخلاص: ١۔ ٤]
"(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے: وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ اس نے (کسی کو) نہیں جنا اور نہ وہ (خود) جنا گیا۔ اور کوئی ایک ہی اس کا ہمسر نہیں۔"

ان آیتوں میں اللہ پاک نے یہ تقریر فرمائی ہے کہ وہی ایک ذات سید عظیم ہے، جس کا کوئی نظیر و شبیہ نہیں ہے۔ اس کے سوا ساری چیزیں اسی کی مخلوق اور اسی کی پروردہ ہیں، پھر اس کے لیے اولاد کہاں سے ہو سکتی ہے۔ اسی لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھ کو بنی آدم نے جھٹلایا اور یہ اس کو لائق نہ تھا۔ اس نے مجھے گالی دی اور یہ اس کو چاہیے نہ تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانا یہ ہے کہ وہ گمان کرتا ہے کہ میں اس کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میری اولاد ہے۔ سو میں تو اس بات سے ماورا ہوں کہ بیوی بچے اختیار کروں۔[1] بخاری اس حدیث کے اس طریق میں منفرد ہیں۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یہ الفاظ بھی مروی ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابن آدم نے میری تکذیب کی اور یہ اس کو لائق نہ تھا۔ اس نے مجھے گالی دی اور یہ اس کو چاہیے نہ تھا۔ تکذیب یہ کی کہ میں اسے دوبارہ زندہ نہیں کروں گا کہ جس طرح اس کو پہلی بار بنایا، حالاں کہ پہلی دفعہ پیدا کرنا، دوبارہ پیدا کرنے سے زیادہ آسان نہیں ہے۔ گالی اس طرح دی کہ یوں کہا کہ اللہ اولاد رکھتا ہے، حالانکہ میں ایک اکیلا معبود ہوں۔ کسی کا محتاج نہیں۔ نہ کسی کو میں نے جنا نہ کسی نے مجھ کو جنا اور میرا کوئی ہمسر بھی نہیں۔[2] اس کو ابن مردویہ رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ صحیحین میں مرفوعاً مروی ہے کہ تکلیف دہ باتیں سننے پر اللہ تعالیٰ سے زیادہ صابر کوئی نہیں، وہ تو اس کے لیے اولاد ٹھہراتے ہیں اور اللہ انھیں رزق و تندرستی دیتا ہے۔[3] اولاد ٹھہرانے والے یہود و نصاریٰ ہیں کہ یہود نے عزیر کو اللہ کا بیٹا کہا، جبکہ نصاریٰ نے مسیح کو اللہ کا بیٹا ٹھہرایا اور کفارِ عرب نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ "قَانِتٌ" کے معنی نمازی ہیں۔[4] عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "قَانِتٌ" وہ ہے جو اپنی بندگی کا اقرار کرے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قنوت کے معنی اخلاص ہیں۔ ربیع بن انس رحمہ اللہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢١٢) [2] صحيح ابن حبان (١/ ٥٠٠)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٤٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٠٤)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢١٤) اس کی سند میں "عطية العوفي" ضعیف راوی ہے۔

نے کہا ہے کہ "قَانِتٌ" کہتے ہیں: قیامت کے دن کھڑا ہونے والے کو۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے یعنی جو روزِ حشر کو مطیع ہو۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تابع فرمان، یعنی جب کہا کہ انسان بن جا، تو ہو گیا۔ دوسرا قول مجاہد کا یہ ہے کہ کافر کی طاعت یہ ہے کہ اس کا سایہ سجدہ کرتا ہے اور وہ جی میں ناخوش ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[1] اس کے اندر سارے قول آ جاتے ہیں، کیوں کہ قنوت، طاعت اور استکانت الی اللہ (مسکینی اور فروتنی) شرعی و قدری ہوتی ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴾ [الرعد: ١٥] "اور اللہ ہی کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے، خوشی سے اور ناخوشی سے، اور ان کے سائے بھی صبح اور شام (سجدہ کرتے ہیں)۔"

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث میں مروی ہے کہ قرآن میں جہاں قنوت کا ذکر ہے، اس سے مراد طاعت ہے۔ (رواہ ابن أبي حاتم) امام احمد رحمہ اللہ سے بھی اس جیسی روایت منقول ہے،[2] لیکن اس کی سند ضعیف ہے اور لائقِ اعتماد نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی صحابی یا تابعی وغیرہ کا کلام ہو۔ تفاسیر میں اس قسم کی سندیں بہت آتی ہیں، ان میں سے اکثر منکر ہوتی ہیں، ان سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے، کیوں کہ سند ضعیف ہوتی ہے۔

بدیع کی تفسیر:

بدیع وہ ہے جو نمونے کے بغیر کسی چیز کو بنائے۔ یعنی بالکل نئی ایجاد کرے۔ امام مجاہد و سدی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ یہی معنی لغت کا تقاضا ہے۔ اسی لیے نو ایجاد چیز اور احداث کو بدعت کہتے ہیں،[3] جس طرح صحیح مسلم میں آیا ہے کہ « إِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ »[4] "تحقیق ہر نیا کام بدعت ہے۔"

بدعت اور اس کی تقسیم:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بدعت دو طرح پر ہوتی ہے: ایک بدعتِ شرعیہ، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول: «كُلُّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ» "ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔" دوسری بدعتِ لغویہ، جیسے تراویح کے حق میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قول "نِعْمَتِ الْبِدْعَةُ هٰذِهٖ" "یہ نیا کام اچھا ہے۔" سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سب کو اس نماز پر جمع کر کے اس کو مستقل کیا تھا اور اس پر یہ کلمہ کہا۔[5]

---

[1] تفسیر الطبري (٢/ ٥٣٨۔ ٥٣٩) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢١٣۔ ٢١٤)

[2] مسند أحمد (٣/ ٧٥) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢١٣) اس کی سند "دراج عن أبي الهيثم" راوی کی وجہ سے ضعیف ہے۔

[3] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢١٣)

[4] ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت صحیح مسلم کے بجائے مسند احمد میں مروی ہے، البتہ صحیح مسلم کے الفاظ ہیں: « كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ » "ہر بدعت گمراہی ہے۔" تفصیل کے لیے دیکھیں: مسند أحمد (٤/ ١٢٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٦٧)

[5] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢١٣)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کی اس تقریر سے یہ بات نکلی کہ ہر بدعت شرعی گمراہی ہوتی ہے۔ تقسیم اچھی اور بُری کی نہیں ہے، تقسیم اگر ہے تو اسی شرعی ولغوی کی ہے بس۔ اس لیے یہی بات صحیح اور درست ہے، کیوں کہ مرفوع حدیث میں کہیں بھی بدعت کی تقسیم کا اَتا پتا نہیں چلتا۔ یہ کلمہ قیامت تک کے لیے اپنے جملہ افراد کو لاگو ہے۔ جن علما اور فقہا نے بدعت کو پانچ یا اس سے کم وبیش عدد پر تقسیم کیا ہے، وہ صرف ان کی رائے اور قیاس ہے، لہٰذا یہ دونوں حجت نہیں ہیں۔ اس تقسیم کی مثال میں ایسی چیزیں بھی ذکر کر دی ہیں، جو سرے ہی سے خارج از بدعت ہیں۔ نہ شرعی بدعت ہو سکتی ہے اور نہ لغوی، جیسے کتابتِ علم وغیرہ کہ جس کا ثبوت خود کتاب وسنت سے ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ جو حسنہ اور سیئہ کے قائل ہیں، وہ بھی یہ بات کہتے ہیں کہ ادنیٰ سنت بدعتِ حسنہ سے بہتر ہوتی ہے، مثلاً: آدابِ سنت کے مطابق استنجا کرنا، رباط، مدرسہ اور خانقاہ کے بنانے سے بہتر ہے۔ اس مثال کو ملا علی قاری حنفی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہما اللہ نے مشکات کے ترجمے اور شرح میں لکھا ہے۔[1] بدعت سے دل کا تاریک ہو جانا، دل پر زنگ لگ جانا، مہر لگنا، جبکہ سنت سے دل کا روشن ہو جانا نور کا بڑھنا بیان کیا ہے۔ یہ جگہ بدعت کے زیادہ تفصیلی بیان کے لیے نہیں ہے۔

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بدیع مبدع کے معنی میں ہے۔ مبدع وہ ہے جو ایسی چیز بنائے یا نکالے، جس جیسی کسی اور نے نہ بنائی اور نہ نکالی ہو۔ پھر کہا ہے کہ اسی وجہ سے مبتدع فی الدین کو مبتدع کہتے ہیں کہ جو چیز کسی اور نے نکالی نہ تھی، وہ اس نے نئی نکالی۔ اسی لیے ہر محدث قول یا فعل کو، جس جیسا اس سے پہلے موجود نہ ہو، لغت میں مبتدع کہتے ہیں۔ پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یہ لکھا ہے کہ اس آیتِ شریف کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ اس بات سے پاک ہے کہ اس کی اولاد ہو، وہ تو سارے آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔ یہ اس کی وحدانیت کی گواہی دیتے ہیں۔ طاعت کا اقرار کرتے ہیں۔ وہ ان سب کا خالق، باری اور موجد ہے۔ اس نے ان کو کسی اصل ومثال کے بغیر بنایا۔ اس میں بندوں کو اس بات پر آگاہ کرنا ہے کہ وہ مسیح، جس کو یہ اللہ کا بیٹا کہتے ہیں، وہ خود اسی بات کی گواہی دیتا ہے۔ لہٰذا جس نے آسمان وزمین کو بغیر کسی سابقہ اصلیت اور پہلی مثال کے بنایا ہے، اس نے مسیح کو بھی اپنی قدرت سے بغیر باپ کے پیدا اور ایجاد کیا ہے۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام ابن جریر رحمہ اللہ کا یہ کلام نہایت عمدہ اور ان کی عبارت صحیح ہے۔[3]

اللہ کی عظیم قدرت کلمہ ''کُنْ'' کے کمالات:

اس ارشاد میں کہ ''جب ہم کوئی حکم کرتے ہیں تو صرف کلمہ ''کُنْ'' کہنے سے وہ شے موجود ہو جاتی ہے۔'' اپنی قدرت اور سلطانِ عظیم کے کمال کو بیان فرمایا ہے کہ ایک دفعہ کا ''کُنْ'' کہہ دینا اس چیز کے اللہ کے ارادے کے

---

[1] مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح (١/ ٤٩٠) أشعة اللمعات (١/ ١٣٥)

[2] تفسير الطبري (٢/ ٥٤٠_٥٤١) [3] تفسير ابن كثير (١/ ٢١٣)

مطابق بن کر تیار ہو جانے کے لیے کافی ہو جاتا ہے، جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ [یٰسین: ۸۲] ''جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو بس اس کا حکم صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے کہتا ہے: ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَاۤ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ [النحل: ۴۰] ''جب ہم کسی چیز کا ارادہ کر لیں تو اس کے لیے ہمارا صرف یہی قول ہوتا ہے کہ ہم اس سے کہتے ہیں: ہو جا! تو وہ ہو جاتی ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَمْرُنَاۤ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ﴾ [القمر: ۵۰] ''اور ہمارا حکم تو آنکھ جھپکنے کی طرح ایک (کلمہ) ہی ہوتا ہے۔'' ایک شاعر نے کہا ہے:

إِذَا مَا أَرَادَ اللّٰهُ أَمْرًا فَإِنَّمَا ... يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ قَوْلَةً فَيَكُوْنُ

''جب اللہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے: ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔''

اس سے یہ بھی نکلا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدایش بھی اسی کلمے ﴿ كُنْ ﴾ سے ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ [آل عمران: ۵۹] ''بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے، اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا، پھر اس سے کہا کہ ہو جا، تو وہ ہو گیا۔'' اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ سچ مچ بھی حرفِ ﴿ كُنْ ﴾ ارشاد ہوتا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ یہ مجاز ہو، حقیقت نہ ہو، کیوں کہ کسی اَمر کو کسی پر محمول کرنے سے اس کے حقیقی معنوں سے انکار نہیں ہوتا، نہ اس بات کی کوئی دلیل ہے، پھر بیضاوی رحمہ اللہ وغیرہ کا یہ کہنا کہ اس آیت میں کوئی قول مراد نہیں ہے، بلکہ قضا کو اس لفظ سے تعبیر کیا ہے،[1] یہ ایک فلسفیانہ خیال کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اے اللہ! ہماری حفاظت فرما۔

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴾ ۱۱۸

اور ان لوگوں نے کہا جو علم نہیں رکھتے: اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ اسی طرح، ان کے قول سے ملتی جلتی بات ان لوگوں نے بھی کہی تھی جو ان سے پہلے تھے، ان کے دل یکساں ہو گئے، تحقیق ہم نے یقین کرنے والوں کے لیے نشانیاں بیان کر دی ہیں (۱۱۸)

مشرکوں کے اہلِ کتاب جیسے مطالبات:

یعنی پہلی اُمت جو یہود تھی، وہ بھی اپنے نبی سے یہی کہتی تھی، جو آج کے لوگ کہنے لگے ہیں۔ سیدنا

[1] تفسير البيضاوي (۱/ ۳۹۰۔ ۳۹۱)

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ رافع بن حریملہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا کہ اے محمد! (ﷺ) اگر تم اللہ کے رسول ہو، جیسا کہ تم کہتے ہو تو تم اللہ سے کہو کہ وہ ہم سے باتیں کرے، ہم اس کا کلام سنیں۔ اس پر یہ آیت اُتری۔[1] مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول نصاریٰ کا تھا۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔[2] کیوں کہ آیت کا سیاق انھی کے حق میں ہے۔ لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس پر اعتراض ہے۔[3] قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی یہ ہیں کہ اے محمد! (ﷺ) اللہ تمھاری نبوت کے متعلق ہمیں مخاطب کیوں نہیں کرتا۔ آیت کا ظاہر سیاق یہی ہے۔[4] واللہ أعلم

امام ابو العالیہ، ربیع بن انس، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول تو کفارِ عرب کا تھا،[5] مگر ان سے مراد پہلے یہود و نصاریٰ ہیں۔ اس کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿ وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ﴾ [الأنعام: ١٢٤] ''اور جب ان کے پاس نشانی آتی ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، حتی کہ ایسی ہی چیز خود ہمیں دی جائے جیسی رسولوں کو دی گئی۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓىِٕكَةِ قَبِيْلًا ۝ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ ﴾ [بني إسرائيل: ٩٠۔ ٩٣] ''اور وہ بولے: ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، حتی کہ تو ہمارے لیے زمین سے چشمہ جاری کر دے۔ یا تیرے لیے کھجوروں اور انگور کا ایک باغ ہو، پھر تو اس (باغ) کے درمیان (جگہ جگہ) نہریں جاری کر دے۔ یا تو آسمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دے جیسے تو کہا کرتا ہے، یا اللہ کو اور فرشتوں کے سامنے لے آ۔ یا تیرے لیے سونے کا گھر ہو، یا تو آسمان میں چڑھ جائے، اور ہم تیرے چڑھنے پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، حتی کہ تو ہم پر ایک کتاب اُتار لائے جسے ہم پڑھیں۔ کہیے: میرا رب پاک ہے، میں تو بس ایک بشر رسول ہوں۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ﴾ [الفرقان: ٢١] ''اور ان لوگوں نے کہا: جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے: ہم پر فرشتے کیوں نہیں نازل کیے گئے یا ہم اپنے رب کو دیکھتے؟'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۝ ﴾ [المدثر: ٥٢] ''بلکہ ان میں سے ہر آدمی چاہتا ہے کہ اسے کھلے صحیفے دیے جائیں۔''

اس طرح کی اور بہت سی آیتیں ہیں، جو مشرکینِ عرب کے کفر اور عناد اور بے جا سوال پر دلالت کرتی ہیں۔ ان

---

[1] تفسير الطبري (٢/ ٥٥١) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢١٥) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحیح المسبور (١/ ٣٧۔ ٤٥)
[2] تفسير الطبري (٢/ ٥٥١۔ ٥٥٢)
[3] تفسير ابن كثير (١/ ٢١٤)
[4] تفسير القرطبي (٢/ ٩٢)
[5] تفسير الطبري (٢/ ٥٥١۔ ٥٥٢) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢١٥)

کا یہ کہنا یہود و نصاریٰ کے قول کی طرح تھا، جو وہ کفر اور عناد کے لیے کہتے تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً ﴾ [النساء: ١٥٣] ''(اے نبی!) اہلِ کتاب آپ سے تقاضا کرتے ہیں کہ آپ ان پر آسمان سے ایک کتاب اُتار لائیں، چناں چہ ان لوگوں نے موسیٰ سے اس سے بھی بڑا تقاضا کیا تھا، انھوں نے کہا تھا: (اے موسیٰ!) ہمیں اللہ بالکل آنکھوں کے سامنے دکھا۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً ﴾ [البقرة: ٥٥] ''اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے، یہاں تک کہ ہم اللہ کو سامنے (علانیہ) نہ دیکھ لیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝ اَتَوَاصَوْا بِهٖ ﴾ [الذاريات: ٥٢۔ ٥٣] ''اسی طرح ان سے پہلے لوگوں کے پاس جو بھی رسول آیا تو انھوں نے بس یہی کہا کہ (یہ) جادوگر ہے یا دیوانہ۔ کیا وہ ایک دوسرے کو اس بات کی وصیت کرتے آئے ہیں؟'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ﴾ [البقرة: ١١٨] ''ان کے دل یکساں ہوگئے۔''

اس کے بعد یہ فرمایا ہے کہ ہم نے رسولوں کی سچائی پر تمام دلالتیں کھول کر بیان کر دی ہیں۔ اب کسی اور سوال یا اعتراض کی ضرورت نہیں، یعنی اس شخص کے لیے جو ایمان لایا ہے، نبی کو اس نے سچا جانا اور رسول کی پیروی کی ہے اور اللہ کی باتوں کو سمجھتا ہے۔ ورنہ وہ لوگ جن کے دل اور کان پر اللہ نے مہر لگا دی اور آنکھ پر پردہ ڈال دیا، ان کے حق میں فرما دیا ہے: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝ ﴾ [يونس: ٩٦، ٩٧] ''بے شک جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا حکم (عذاب) صادر ہو چکا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آ جائیں، حتیٰ کہ وہ دردناک عذاب (بھی) دیکھ لیں۔''

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ۝١١٩

بے شک ہم نے آپ کو حق کے ساتھ خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور دوزخیوں کے بارے میں آپ سے سوال نہیں کیا جائے گا ⑪⑨

رسول کی ذمے داریاں:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوع روایت میں ہے کہ اس سے مراد جنت کی خوشخبری دینے والا اور دوزخ کی آگ سے ڈرانے والا ہے۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم) عدمِ سوال کا یہ مطلب ہے کہ کافر کے کفر کی باز پرس تجھ

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢١٦) اس کی سند میں ''عبدالرحمن بن محمد فزاری'' ضعیف راوی ہے۔

سے نہیں کی جائے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴾ [الرعد: ٤٠] ''آپ کے ذمے تو صرف پہنچا دینا ہی ہے اور ہمارے ذمے حساب لینا ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَذَكِّرْ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ﴾ [الغاشية: ٢١۔ ٢٢] ''چنانچہ آپ نصیحت کیجیے، آپ تو صرف نصیحت کرنے والے ہیں۔ آپ ان پر کوئی فوج دار نہیں۔'' نیز جیسے اس ذاتِ باری تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ نَّحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ ۖ وَمَآ أَنتَ عَلَيْهِم بِجَبَّارٍ ۖ فَذَكِّرْ بِالْقُرْءَانِ مَن يَخَافُ وَعِيدِ ﴾ [ق: ٤٥] ''ہم اسے خوب جانتے ہیں جو وہ (مشرکین) کہتے ہیں، اور آپ ان پر زبردستی کرنے والے نہیں، لہٰذا آپ اس قرآن کے ذریعے سے اس شخص کو نصیحت کرتے رہیں، جو میری وعید سے ڈرتا ہے۔'' اس جیسی اور بھی آیتیں ہیں، یہ معنی تب ہیں جب ﴿ تُسْـَٔلُ ﴾ کی تا مضموم ہو اور اگر اس پر زبر پڑھی جائے گی تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ تو ان کا کچھ حال نہ پوچھ۔

رسول کریم ﷺ کے والدین کے ایمان کا مسئلہ:

جس طرح عبدالرزاق رحمہ اللہ نے محمد قرظی رحمہ اللہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کہا تھا کہ کاش میں جانتا کہ میرے ماں باپ نے کیا کیا؟ یعنی ان کا انجام کیسا ہوا۔ اس پر یہ آیت اُتری، پھر کبھی آپ نے وفات تک ان کا ذکر نہ کیا۔[1] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ویسی بات ہے جیسے کہتے ہیں کہ فلاں شخص کا حال کیا پوچھتا ہے مت پوچھ، یعنی وہ تیرے گمان سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ پھر کہا ہے کہ ہم نے (اپنی کتاب) ''التذكرة في أحوال الموتىٰ و أمور الآخرة'' میں یہ بات ذکر کی ہے کہ اللہ نے آپ کے ماں باپ کو زندہ کر دیا تھا اور وہ ایمان لے آئے تھے، نیز اس حدیث کا جواب دیا ہے کہ میرا باپ اور تیرا باپ آگ میں ہیں۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جو حدیث رسول اللہ ﷺ کے والدین کو زندہ کرنے کے بارے میں مروی ہے، وہ صحاح ستہ میں سے کسی کتاب میں نہیں ہے اور نہ صحاح ستہ کے علاوہ کسی دوسری کتاب ہی میں ہے۔ اس کی اسناد ضعیف ہے۔[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سچ کہا کہ یہ حدیث بلکہ جو دیگر حدیثیں اس بارے میں آئی ہیں، جن کو امام سیوطی رحمہ اللہ وغیرہ نے اختیار کیا ہے، سب اسی طرح پر بے اصل یا منکر یا شاذ یا موضوع ہیں۔ اس میں کچھ شک وشبہہ نہیں ہے کہ والدین کے غیر مومن ہونے سے رسالت کے پاک دامن پر کسی نقص کا کوئی احتمال نہیں، پھر زید وعمرو کا رسول اللہ ﷺ کے والدین کے ایمان کو ثابت کرنے کے لیے اس قدر شور وغوغا کیوں ہے؟ حافظ ابن جریر رحمہ اللہ نے قرظی رحمہ اللہ کے قول کا اس بنا پر رد کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا اپنے ماں باپ کے معاملے میں شک کرنا محال ہے،[4] اس لیے پہلی قراءت ہی ٹھیک ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کا رد کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ بات اپنے والدین کے لیے

---

① تفسير الصنعاني (١/ ٥٩) یہ روایت مرسل ہے۔ نیز اس روایت کی سند میں ''موسیٰ بن عبیدہ'' ضعیف راوی ہے۔
② تفسير القرطبي (٢/ ٩٣) ③ تفسير ابن كثير (١/ ٢١٥) ④ تفسير الطبري (٢/ ٥٦٠)

استغفار کرنے کے وقت ہو، جبکہ آپ ﷺ کو ان کا حال معلوم نہیں تھا۔ جب معلوم ہوا تو ان دونوں سے بیزاری کا اظہار کیا اور یہ خبر دی کہ وہ اہلِ نار سے ہیں، جس طرح صحیح مسلم میں مروی ہے۔[1] اس کی بھی بہت سی مثالیں ہیں۔ ابن جریر رحمہ اللہ کا قول کچھ وزن نہیں رکھتا۔[2]

اس تحریر سے معلوم ہوا کہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسی بات کو اختیار کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ماں باپ کفر پر فوت ہوئے ہیں۔ زندگی میں یا فوت ہونے کے بعد ایمان نہیں لائے۔ صحیح مسلم کی حدیث کے مطابق تمام مسلمانوں کا یہی عقیدہ ہے۔ اس عقیدے کا مخالف صحیح حدیث کا مخالف ہے،[3] بلکہ ہمارے نزدیک تو یہ بات بہتر ہے کہ ایسے مسائل میں سرے سے غور کرنا ہی شریعتِ برحق کے مقصد کے خلاف ہے۔ ہم کو تو قرآن میں یہ بتلایا گیا ہے: ﴿ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴾ [البقرة: ١٣٤] "یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی۔ اسی کے لیے ہے جو اس نے کمایا اور تمھارے لیے ہے، جو تم نے کمایا، اور جو عمل وہ کرتے تھے تم سے ان کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔" لہٰذا ہم کو اسی قاعدے پر ڈٹے رہنا چاہیے، لایعنی باتوں سے بچنا ہی اسلام کی خوبی ہے۔ بے جا غور وفکر کرنے میں وقت کا ضیاع اور ایمان کی تباہی ہے۔

تورات میں رسول اللہ ﷺ کی صفات:

امام عطا بن یسار رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے پوچھا تھا کہ تورات میں رسول اللہ ﷺ کی کیا صفت مذکور ہے؟ انھوں نے کہا کہ اللہ کی قسم! تورات میں بھی ان کی وہی صفت دی گئی ہے، جو قرآن میں آئی ہے:

"يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وحِرْزًا لِّلْأُمِّيِّينَ وَأَنْتَ عَبْدِي وَرَسُولِي، سَمَّيْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ لَا فَظٌّ وَلَا غَلِيظٌ وَلَا سَخَّابٌ فِي الْأَسْوَاقِ، وَلَا يَدْفَعُ بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ وَلٰكِنْ يَعْفُو وَيَغْفِرُ، وَلَنْ يَّقْبِضَهُ حَتّٰى يُقِيمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ بِأَنْ يَّقُولُوا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ فَيَفْتَحُ بِهِ أَعْيُنًا عُمْيًا وَآذَانًا صُمًّا وَقُلُوبًا غُلْفًا" (رواه أحمد و انفرد بإخراجه البخاري)[4]

یعنی اے نبی! ہم نے تم کو گواہ بنا کر، خوش خبری دینے والا، ڈرانے والا اور اَن پڑھوں کی پناہ بنا کر بھیجا ہے، تو میرا بندہ اور رسول ہے۔ میں نے تیرا نام متوکل رکھا۔ نہ بد مزاج ہے، نہ سخت دل، نہ بازاروں میں شور شرابا کرنے والا، نہ بدی کو بدی سے دور کرنے، بلکہ وہ معاف فرما دے گا اور بخش دے گا۔ اللہ! اس کو موت نہ دے گا، یہاں تک کہ اس کے ذریعے ٹیڑھی ملت کو اس طرح سیدھا کر دے گا کہ وہ کلمہ طیبہ پڑھ لیں۔ اس کلمے سے وہ اندھی آنکھوں، بہرے کانوں! اور بند دلوں کو کھول دے گا۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۰۳)
[2] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۱۵)
[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۰۳)
[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۰۱۸) مسند أحمد (۲/ ۱۷٤)

اس حدیث کو امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے مگر اتنا اضافہ کیا ہے کہ عطا نے کہا: پھر میں کعب احبار رحمہ اللہ سے ملا اور ان سے بھی یہی سوال کیا تو انھوں نے مذکورہ روایت میں چند الفاظ کے سوا کسی قسم کا اختلاف نہیں کیا تھا، جو یوں ہیں: "أَعْيُنًا عُمُومٰى وَآذَانًا صُمُومٰى وَقُلُوبًا غُلُوفًا، "آنکھیں اندھی، کان بہرے اور دل غافل ہیں۔"[1]

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿١٢٠﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٢١﴾

اور یہودی اور عیسائی آپ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے یہاں تک کہ آپ ان کی ملت کی پیروی کریں، کہہ دیجیے: بے شک اللہ کی ہدایت ہی حقیقی ہدایت ہے اور آپ کے پاس جو علم آ گیا اس کے بعد اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو آپ کو اللہ (کی پکڑ) سے (بچانے والا) نہ کوئی حمایتی ہوگا اور نہ کوئی مددگار﴿120﴾ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جس طرح اس کی تلاوت کا حق ہے، وہی لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو کوئی اس کا انکار کرتا ہے تو وہی ہیں خسارہ پانے والے﴿121﴾

یہود و نصاریٰ کی رضا جوئی کی ممانعت:

یہود میں کچھ لوگ انصاف پسند بھی تھے، مگر وہ بہت کم تھے جو اپنی کتاب کو سمجھ کر پڑھتے تھے، وہ اس قرآن پر ایمان لے آئے تھے۔ ان کے ایک عالم عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ تھے، جو ایمان لائے اور اُن کے ساتھ اور بھی کئی لوگ مسلمان ہوئے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر! یہ دونوں فریق تم سے کبھی راضی اور خوش نہیں ہوں گے، سو تم ان کی رضا مندی اور موافقت کو چھوڑ کر ان کو اس حق کی طرف بلانے میں، جو اللہ نے بھیجا ہے، اللہ کی رضا مندی طلب کرو، جو راہ اللہ تعالیٰ نے تم کو دکھا دی ہے، وہی صحیح کامل دینِ مستقیم ہے۔[2] قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مباحثہ کرنے کا ایک طریقہ ہے جو اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے اصحاب رضی اللہ عنہم

[1] تفسير ابن كثير (١/ ٢١٥) [2] تفسير الطبري (٢/ ٥٦٢)

کو سکھایا ہے کہ تم گمراہوں سے اس طرح پیش آیا کرو۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مجھ کو یہ حدیث مبارک پہنچی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر لڑے گا اور غالب رہے گا، جو کوئی اس کے خلاف ہوگا، وہ اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گا، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ جائے۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے صحیح بخاری میں مروی ہے۔[2] اس ارشاد میں کہ اگر تو نے اہلِ کتاب کا اتباع کیا تو پھر تیرا کوئی حامی و ناصر نہیں ہے، اُمت کو ایک بڑی تنبیہ اور سخت وعید ہے کہ کہیں وہ قرآن و سنت معلوم کر لینے کے بعد یہود و نصاریٰ کے طریقوں کی پیروی نہ کرتے رہیں۔ یہ خطاب اگرچہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، مگر حکم اُمت کو ہے۔

اہلِ بدعت کے ساتھ مصالحت سے ممانعت:

فتح البیان میں ہے کہ اس آیت میں ایسی سخت وعید ہے کہ جس سے دل کانپتے اور جی بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے علما جو اللہ کی حجتوں کو پکڑے ہوئے اور شریعت کے احکام پر قائم ہیں، ان پر اس آیت نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے ساتھ کسی طرح کی مصالحت نہ کریں، جو اہلِ بدعت یا مذاہبِ سو کے پیروکار ہیں اور کتاب وسنت پر عمل نہیں کرتے، بلکہ محض اپنی رائے کو قرآن و حدیث پر ترجیح دیتے ہیں۔ کیوں کہ یہ لوگ اگرچہ بہ ظاہر حق کو قبول کرنے کا اظہار کرتے ہیں اور نرم اخلاق سے پیش آتے ہیں، لیکن انھیں بدعات کی اتباع اور گمراہی کے اندھیروں میں داخل ہونے کے سوا کوئی بات پسند نہیں۔ لہٰذا جو کوئی شخص کتاب وسنت کا عالم ہو کر اور ان کی بدعت وتقلید کو معلوم کر کے ان سے نرمی کرنا نہیں چھوڑے گا تو سمجھ لو کہ اس کے لیے اللہ کی طرف سے نہ کوئی دوست ہے اور نہ مددگار۔[3]

کفر ایک ہی ملت ہے:

اکثر فقہا نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ سارا کفر ایک ملت ہوتا ہے، کیوں کہ آیت میں ملت کا لفظ مفرد آیا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝ ﴾ [الكافرون: ٦] ''تمھارے لیے تمھارا دین اور میرے لیے میرا دین۔'' اس بنا پر مسلمان اور کافر ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے، بلکہ ہر ایک کافر اپنے ساتھی کا وارث ہوتا ہے۔ خواہ ہم مذہب ہو یا نہ ہو، کیوں کہ سب کے سب ایک ہی ملت ہیں۔ امام شافعی، ابو حنیفہ اور احمد رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ احمد رحمہ اللہ کا دوسرا قول مالک رحمہ اللہ کے مطابق ہے کہ دو مختلف مذاہب کے لوگ، ایک دوسرے کے

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢١٧)

[2] ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کے بجائے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ البتہ صحیح مسلم میں ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٤)

[3] فتح البيان (١/ ٢٦٧۔ ٢٦٨)

وارث نہیں ہوسکتے، جس طرح حدیث میں آیا ہے۔[1] واللہ أعلم. ان لوگوں سے، جن کو کتاب دی گئی ہے، یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ ابن زید رحمہ اللہ کا یہی قول ہے اور ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ کتاب سے مراد اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔[2]

حقِ تلاوت کیا ہے؟

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ حقِ تلاوت کا مطلب یہ ہے کہ جب جنت کا ذکر آئے تو جنت کا سوال کرتے ہیں اور جب آگ کا ذکر آئے تو آگ سے پناہ مانگتے ہیں۔[3] یہ بات مرفوعاً بھی مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آیتِ رحمت پر گزرتے تو رحمت کا سوال کرتے اور جب آیتِ عذاب پڑھتے تو پناہ مانگتے۔[4] سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ حقِ تلاوت یہ ہے کہ اس کے حلال کو حلال جانے اور حرام کو حرام۔ جیسا کہ وہ اُترا ہے، اسی طرح اس کو پڑھے۔ یہ نہ کرے کہ کلمات کو ان کی جگہ سے بدل دے یا کسی شے کا وہ مطلب نکال لے، جو قرآن کا مطلب نہیں ہے۔ یہی بات سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی منقول ہے۔[5]

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ محکم پر عمل کرے، متشابہ پر ایمان لائے، جو مشکل ہو، اس کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے۔ یہ بھی سیدنا عبداللہ بن عباس اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کا قول ہے کہ حقِ تلاوت سے مراد پورا پورا اتباع کرنا ہے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَالْقَمَرِ إِذَا تَلٰهَا ۝ ﴾ [الشمس: ۲] ''اور چاند کی جب وہ اس کے پیچھے آتا ہے۔''[6] یعنی ''اِتَّبَعَهَا'' اسی طرح امام عکرمہ اور مجاہد رحمہ اللہ وغیرہما سے مروی ہے،[7] بلکہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس مطلب کو مرفوعاً روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿ يَتْلُونَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ﴾ [البقرة: ۱۲۱] ''وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں، جس طرح اس کی تلاوت کا حق ہے۔'' کے بارے میں یہ فرمایا: «يَتَّبِعُونَهُ حَقَّ إِتِّبَاعِهِ» ''وہ اس کا اتباع کرتا ہے، جیسا کہ اس کے اتباع کا حق ہے۔'' اس کی سند اگرچہ سخت ضعیف ہے، مگر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معنی صحیح ہیں۔[8] سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جو قرآن کا اتباع کرتا ہے، وہ اس کے سبب ریاض (جنت) میں اُتارا جاتا ہے۔[9]

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦١٤) تفسير ابن كثير (١/ ٢١٦)

(2) تفسير الطبري (/ ٥٦٤۔ ٥٦٥)

(3) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢١٨) اس کی سند میں انقطاع ہے۔

(4) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٧٢) سنن النسائي، رقم الحديث (١٠٠٨)

(5) تفسير الطبري (٢/ ٥٦٦۔ ٥٦٧)

(6) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢١٨) اس کی سند صحیح ہے۔

(7) تفسير الطبري (٢/ ٥٦٦۔ ٥٦٧) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢١٨)

(8) تفسير القرطبي (٢/ ٩٥) تفسير ابن كثير (١/ ٢١٦)

(9) مصنف ابن أبي شيبة (٦/ ١٣٦) سنن الدارمي (٢/ ٥٢٦) اس کی سند صحیح ہے۔

تورات و انجیل پر کما حقہ ایمان کا تقاضا:

یہ ارشاد کہ کتاب پڑھنے والے ہی یقین لاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی نازل کی ہوئی کتابوں کو ماننے والا، اگر اس کتاب کو کما حقہ قائم کرتا ہے تو وہ اے پیغمبر! تم پر بھی ایمان لاتا ہے۔ جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ﴾ [المائدة: ٦٦] ''اور اگر یقیناً وہ تورات اور انجیل اور اپنے رب کی طرف سے نازل کی گئی (دوسری) کتابوں کے احکام پر ٹھیک ٹھیک عمل کرتے تو وہ اپنے اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے (وافر رزق) کھاتے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ [المائدة: ٦٨] ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: اے اہلِ کتاب! تم ہرگز اصل دین پر کاربند نہیں ہوسکتے، یہاں تک کہ تم تورات و انجیل اور جو تمھاری طرف تمھارے رب کی طرف سے نازل کی گئی (دوسری) کتابوں کے احکام پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنے لگو۔''

یعنی جب تم تورات و انجیل کو پورا پورا قائم کرو گے، ان پر کما حقہ ایمان لاؤ گے اور جو خبریں رسول اللہ ﷺ کی بعثت، تعریف اور صفات کے بارے میں دی گئی ہیں اور اُن کی فرمانبرداری کے حکم کی تصدیق کرو گے تو یہ بات تمھیں حق کی طرف کھینچ کرلے جائے گی اور تم دونوں جہانوں میں خیر کی اتباع کرنے لگو گے۔ جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ﴾ [الأعراف: ١٥٧] ''(یعنی) وہ لوگ جو اس رسول اُمی نبی (محمد ﷺ) کی پیروی کرتے ہیں جس کا ذکر وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔''

انصاف پسند اہلِ کتاب کا رویہ:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ﴿١٠٧﴾ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿١٠٨﴾ ﴾ [بني إسرائيل: ١٠٧۔ ١٠٨] ''کہہ دیجیے: اس پر ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ، بلاشبہ جنھیں اس سے پہلے علم دیا گیا، جب ان پر تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں: پاک ہے ہمارا رب، بے شک ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہونا ہے۔'' یعنی محمد ﷺ کے جس حال کا ہم سے وعدہ کیا تھا وہ واقع ہوا۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ ﴿٥٣﴾ اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿٥٤﴾ ﴾ [القصص: ٥٢۔ ٥٤] ''وہ لوگ جنھیں ہم نے اس (قرآن) سے پہلے کتاب دی تھی، وہی اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب ان پر (قرآن) تلاوت کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اس پر

ایمان لائے، بے شک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے، بلاشبہ ہم تو اس سے پہلے ہی مسلمان تھے۔ ان لوگوں کو ان کا دو بار اجر دیا جائے گا، کیوں کہ انھوں نے صبر کیا اور وہ بھلائی کے ساتھ برائی کو دور کرتے ہیں اور جو ہم نے انھیں رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔‘‘

نجات کا دارومدار رسول اللہ ﷺ پر ایمان میں ہے:

ارشادِ ربانی ہے: ﴿ وَ قُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴾ [آل عمران: ۲۰] ’’اور ان اہلِ کتاب اور ان پڑھ لوگوں سے پوچھیں: کیا تم اسلام لاتے ہو؟ پھر اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر منہ موڑیں تو آپ کے ذمے صرف پیغام پہنچانا ہے، اور اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھ رہا ہے۔‘‘ اسی لیے اس کے بعد یہ فرما دیا کہ جو کوئی اس سے منکر ہوگا تو اسی کو نقصان ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ﴾ [هود: ۱۷] ’’اور ان گروہوں میں سے جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کا ٹھکانا آگ ہی ہے۔‘‘

صحیح حدیث میں ہے کہ قسم ہے اللہ کی کہ اس امت کا کوئی یہودی اور نصرانی جو مجھے سنے گا، پھر مجھ پر ایمان نہیں لائے گا تو وہ دوزخ میں جائے گا۔[1]

یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ
عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۝۱۲۲ وَ اتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّ لَا
یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ۝۱۲۳

اے بنی اسرائیل! تم میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تم پر انعام کی اور بے شک میں نے تمھیں سارے جہانوں پر فضیلت دی تھی (122) اور اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص کسی شخص کے کچھ بھی کام نہیں آئے گا اور نہ اس سے کوئی بدل قبول کیا جائے گا اور نہ اسے کوئی سفارش نفع دے گی اور نہ ان کی مدد ہی کی جائے گی (123)

بنی اسرائیل کو تکرار کے ساتھ احسانات یاد کروانے کا مقصد:

اس طرح کی آیت اس سورت کے شروع میں بھی گزر چکی ہے، اس جگہ دوبارہ اس لیے آئی ہے کہ اس رسول نبی اُمی کی پیروی کی تاکید ہے، جس کی صفاتِ جمیلہ کا ذکر ان کی کتابوں میں موجود ہے اور یہ لوگ اس کی تعریف،

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۵۳)

نام، حکم اور اس کی اُمت کے حال سے بہ خوبی آگاہ ہیں۔ اس لیے ان کو اس بات سے ڈرایا ہے کہ تم ان دینی اور دنیوی نعمتوں کو یاد کرو، جو تم پر ہوئی ہیں۔ عربوں پر، جو تمھارے چچا زاد ہیں، اس بنا پر حسد نہ کرو کہ اللہ نے خاتم الرسل ﷺ کو ان میں سے مبعوث کیوں فرمایا ہے۔ تمھارا یہ حسد نبی اُمی کی مخالفت و تکذیب کا سبب نہ بنے۔

فتح البیان میں ہے کہ اس عام سے خاص مراد ہے، جیسا کہ یہ فرمان ہے: ﴿ يَوْمَىِٕذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ ﴾ [طٰہٰ: ۱۰۹] ''اس دن سفارش کوئی نفع نہ دے گی، مگر صرف اس کی جسے رحمٰن اجازت دے گا۔'' یعنی جب کسی شخص کے لیے عذاب واجب ہوتا ہے اور عذاب کے سوا وہ کسی چیز کا مستحق نہیں رہتا تو اس وقت کسی کی سفارش اور کوشش اس کے حق میں کارآمد نہیں ہوتی۔[1]

﴿ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۲۴ ﴾

اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند کلمات کے ساتھ آزمایا تو اس نے انھیں پورا کر دیا۔ اللہ نے کہا: بے شک میں تجھے سب لوگوں کے لیے امام بنانے والا ہوں۔ اس (ابراہیم) نے کہا: اور میری اولاد میں سے بھی، اللہ نے کہا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا ﴿۱۲۴﴾

حضرت ابراہیم کی عظمت و امامت کا ذکر:

بنی اسرائیل اس بات پر بہت مغرور تھے کہ ہم اولادِ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو وعدہ دیا تھا کہ نبوت اور بزرگی تیرے گھر میں رہے گی۔ ہم ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں اور اس کا دین ہر کوئی مانتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ ان کو سمجھاتا ہے کہ اللہ کا وعدہ ابراہیم علیہ السلام کی اس اولاد سے ہے، جو نیک راہ پر چلیں، لہٰذا ابراہیم علیہ السلام کے دونوں بیٹے پیغمبر تھے۔ ایک مدت تک بزرگی اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں رہی۔ اب اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں پہنچی ہے اور ابراہیم علیہ السلام کی دعا دونوں کے حق میں تھی۔ دینِ اسلام ہمیشہ سے ایک ہے۔ سب پیغمبر سب اُمتیں اسی پر گزریں اور وہ یہ ہے کہ اللہ جو حکم پیغمبر کے ہاتھ بھیجے، اس کو قبول کرنا۔ اب مسلمان اسی راہ پر ہیں اور تم اس راہ سے پھر گئے ہو۔ اس آیتِ شریفہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل ابراہیم علیہ السلام کے شرف سے آگاہ کیا ہے کہ ہم نے ان کو توحید اور دینِ اسلام کا امام اور پیشوا ٹھہرایا تھا۔

ابراہیم علیہ السلام کی اطاعت گزاری اور مذہب:

یہ بزرگی اسے اس لیے دی تھی کہ وہ ہمارے امر و نہی کو بجا لایا، گویا رسول اللہ ﷺ کو خطاب ہے کہ تم ان

[1] فتح البیان (۱/ ۲۶۹)

مشرکین اور اہلِ کتاب کو یہ یاد دہانی کراؤ کہ تم ملتِ ابراہیمی کے مدعی ہو، مگر اس پر قائم نہیں ہو، بلکہ جس راہ پر میں اور مومنین ہیں، یہی راہ ابراہیم علیہ السلام کی تھی۔ ابراہیم علیہ السلام آزمائش میں پورے نکلے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤی ۝۳۷ ﴾ [النجم: ۳۷] ''اور ابراہیم جس نے (صحیفوں میں جو باتیں تھیں، انھیں) ٹھیک ٹھیک پہنچا دیا۔'' یعنی ساری شریعت پر عمل بجا لا کر پورا کیا۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا ؕ وَلَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝۱۲۰ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝۱۲۱ وَاٰتَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝۱۲۲ ثُمَّ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝۱۲۳ ﴾ [النحل: ۱۲۰۔ ۱۲۳] ''بلاشبہ ابراہیم ایک امت تھا، اللہ کا فرماں بردار اور اس کی طرف یکسو، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر کرنے والا تھا، اس (اللہ) نے اسے چن لیا اور اس کو صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دی۔ اور ہم نے اسے دنیا میں بھلائی دی، اور بلاشبہ وہ آخرت میں ضرور صالحین میں سے ہوگا۔ (اے نبی!) پھر ہم نے آپ کی طرف وحی کی کہ ملتِ ابراہیم کی اتباع کریں جو (اللہ کی طرف) یکسو تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَا كَانَ اِبْرٰهِیْمُ یَهُوْدِیًّا وَّلَا نَصْرَانِیًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝۶۷ اِنَّ اَوْلَی النَّاسِ بِاِبْرٰهِیْمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝۶۸ ﴾ [آل عمران: ۶۷۔ ۶۸] ''ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی، بلکہ وہ صرف حق پرست، فرماں بردار تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔ بے شک ابراہیم سے قریب تر وہی لوگ ہیں جنھوں نے ان کی پیروی کی، اور یہ نبی اور مومن لوگ۔ اور اللہ مومنوں کا دوست ہے۔''

کلمات کا مطلب و مفہوم:

کلمات سے مراد شریعت اور اوامر و نواہی ہیں۔ کیوں کہ کلمات بول کر کبھی تو کلمات قدریہ (تکوینی کلمات) مراد لیے جاتے ہیں، جس طرح مریم علیہا السلام سے نقل فرمایا ہے: ﴿ وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ ۝۱۲ ﴾ [التحریم: ۱۲] ''اور اس نے اپنے رب کے کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ فرمانبرداروں میں سے تھی۔'' کبھی کلماتِ شرعیہ مراد ہوتے ہیں، جیسے اللہ نے فرمایا: ﴿ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝۱۱۵ ﴾ [الأنعام: ۱۱۵] ''اور آپ کے رب کی بات صدق اور عدل میں مکمل ہے، اس کی باتوں کو تبدیل کرنے والا کوئی نہیں، اور وہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔'' سو وہ کبھی سچی خبر ہوتی ہے اور کبھی طلب عدل، اگر وہ امر یا نہی ہے۔ اسی طرح کی زیرِ تفسیر یہ آیت ہے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا تو اس

نے ہماری باتوں کو پورا کر دکھایا۔ ان کو امام بنانا، گویا یہ جزائے عمل ہے۔ جس طرح تم نے اوامر کو قائم کیا اور نافرمانیوں کو چھوڑا، اسی طرح لوگ تمھارے پیچھے چلیں گے اور تمھاری پیروی کریں گے، تم ان کے پیشوا ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ کلمات عبادات کے طریقے تھے۔[1]

ابراہیم علیہ السلام کی سنتیں:

ان سے دوسری روایت ہے کہ پانچ طرح کی طہارت سر میں اور پانچ قسم کی طہارت بدن میں تھی: سر میں، مونچھوں کا کترانا، کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، مسواک کرنا، مانگ نکالنا یا سر منڈانا تھا، جب کہ بدن میں طہارت سے مراد ہے: ناخن کترنا، زیرِ ناف بال مونڈنا، بغل کے بال دور کرنا اور بول و براز کے اثر کو پانی سے دھونا۔ یہی قول سعید بن مسیب، مجاہد، شعبی و نخعی رحمہم اللہ وغیرہم سے بھی منقول ہے۔[2] اسی کے قریب یہ حدیث سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دس چیزیں فطرت سے ہیں: مونچھوں کا کترنا، ڈاڑھی پوری رکھنا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن کترانا، انگلیوں کے جوڑوں کا دھونا، بغل کے بالوں کا دور کرنا، زیرِ ناف بالوں کو مونڈنا، پانی سے استنجا کرنا۔ مصعب (راوی) نے کہا ہے کہ دسویں چیز میں بھول گیا ہوں، شاید مضمضمہ (کلی کرنا) ہوگا۔[3] (رواہ مسلم)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں یوں روایت ہے کہ فطرت پانچ چیزیں ہیں: ختنہ کرنا، استرا لینا (زیرِ ناف بال اُتارنا)، مونچھیں کترانا، ناخن کترانا اور بغل کے بال اُکھاڑنا۔ یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔[4] یہ بھی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ دس باتیں ہیں، چھے انسان میں اور چار مشاعر، یعنی مناسکِ حج میں۔ انسان میں زیرِ ناف بال مونڈنا، بغل کے بال اُکھاڑنا، ختنہ کرنا۔ امام ابن ہبیرہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تینوں درحقیقت ایک چیز ہیں، چہارم: ناخن تراشنا، پنجم: مونچھیں کاٹنا، ششم: مسواک اور غسل جمعہ کرنا، مشاعر میں، طواف، صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنا، رمی جمار (کنکریاں مارنا) طوافِ زیارت کرنا۔[5] پھر یہ فرمایا کہ جس نے اس دین کو قائم کیا ہو، وہ آزمائش میں نہیں پڑا، سوائے ابراہیم علیہ السلام کے۔

اسلام کے حصے:

ان سے دوسری روایت یہ ہے کہ اسلام کے تیس حصے ہیں، دس سورت براءت میں ہیں: ﴿ اَلتَّآىِٕبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآىِٕحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ

---

① تفسیر الطبري (۳/ ۱۳) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۲۱) اس کی سند حسن ہے۔

② تفسیر الطبري (۳/ ۹) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۱۹) اس کی سند حسن ہے۔ ③ صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲٦۱)

④ صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۵۷)

⑤ تفسیر الطبري (۲/ ۱۰) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۲۰۔ ۲۲۱) اس کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔

لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ ﴾ [التوبة: ١١٢] ''وہ (مومن) توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم کرنے والے اور برائی سے روکنے والے اور اللہ کی حدوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، اور (اے نبی!) مومنوں کو خوش خبری سنا دیجیے۔''

سورت مومنون کی پہلی دس آیات ہیں: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ﴿۲﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ﴿۳﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ﴿۴﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ﴿۵﴾ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ﴿۶﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ﴿۷﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ﴿۸﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۘ﴿۹﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۙ﴿۱۰﴾ ﴾ [المؤمنون: ١] ''مومن یقیناً فلاح پا گئے۔ وہ جو اپنی نماز میں عاجزی کرنے والے ہیں۔ اور وہ جو لغو باتوں سے اعراض کرنے والے ہیں۔ اور وہ جو زکات ادا کرنے والے ہیں۔ اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں یا ان (کنیزوں) کے جن کے مالک ہوئے ان کے دائیں ہاتھ، تو بلاشبہ (ان کی بابت) ان پر کوئی ملامت نہیں۔ پھر جو شخص ان کے علاوہ (راستہ) تلاش کرے تو ایسے لوگ ہی حد سے گزرنے والے ہیں۔ اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اور وہ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ وارث ہیں۔''

نیز دس آیات سورت احزاب میں ہیں: ﴿ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾ ﴾ [الأحزاب: ٣٥] ''بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں، سچے مرد اور سچی عورتیں، صابر مرد اور صابر عورتیں، عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں، صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کا بکثرت ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں، ان سب کے لیے اللہ نے مغفرت اور بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔'' ابراہیم علیہ السلام نے ان سب کو پورا کیا تو اللہ نے ان کے لیے براءت لکھی۔[1]

ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش:

تیسری روایت یہ ہے کہ ان کلمات سے مراد ایک تو اللہ کی راہ میں قوم سے علاحدگی ہے اور جب حکم ہوا کہ ان

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٢٠) اس کی سند حسن ہے۔

کو چھوڑ دو تو فی الفور قوم سے جدا ہو گئے۔ دوسرے نمرود سے اللہ کی راہ میں حجت قائم کرنا ہے۔ تیسرے آگ میں گرنے پر صبر کرنا ہے۔ چوتھے وطن اور شہر سے ہجرت کرنا، پانچویں مہمان نوازی کرنا ہے۔ چھٹے بیٹے کو ذبح کرنے میں تیار ہو جانا ہے۔[1] حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ آزمائش یہ تھی کہ ستارے، چاند، سورج، آگ، ہجرت، ختنے اور بیٹے کو ذبح کرنے میں مبتلا کیا جانا۔ چناں چہ وہ ہر حال میں اللہ سے راضی رہے اور پکے نکلے۔

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ آزمائش یہ تھی کہ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ مجھ کو لوگوں کا پیشوا بنا، کہا: اچھا، کہا کہ میری اولاد میں بھی امامت مقرر کر، فرمایا کہ میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا، کہا کہ اس گھر کو مرجعِ خلائق بنا، کہا: اچھا، کہا کہ امن کی جگہ کر، فرمایا کہ اچھا، کہا کہ ہم کو اور ہماری اولاد کو مسلمان بنائے رکھ، فرمایا کہ اچھا، کہا کہ ان میں جو ایمان دار ہوں، ان کو رزق دے، فرمایا کہ اچھا۔[2] امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ کلمات یہ تھے: ﴿ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ﴾ [البقرة: ١٢٤] ”بے شک میں تجھے سب لوگوں کے لیے امام بنانے والا ہوں۔“ ﴿ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ﴾ [البقرة: ١٢٥] ”اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے بار بار لوٹ کر آنے کی اور امن کی جگہ بنایا۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ﴾ [البقرة: ١٢٥] ”اور (حکم دیا کہ) تم مقامِ ابراہیم کو جائے نماز بناؤ۔“ نیز اس کا فرمان ہے: ﴿ وَعَهِدْنَاۤ اِلٰۤی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ ﴾ [البقرة: ١٢٥] ”اور ہم نے حکم دیا ابراہیم اور اسماعیل کو کہ تم دونوں میرا گھر پاک کرو۔“ نیز اس کا فرمان ہے: ﴿ وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۲۷﴾ ﴾ [البقرة: ١٢٧] ”اور (یاد کرو) جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے (اور دعا کر رہے تھے:) اے ہمارے رب! تو ہم سے (یہ نیکی) قبول کر لے، بے شک تو ہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔“ یہ سب انہی کلمات میں سے ہیں جن کے ساتھ آزمائش کی گئی تھی۔[3]

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ کلمے یہ تھے: ﴿ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَیْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَیْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۲۹﴾ ﴾ [البقرة: ١٢٧۔ ١٢٩] ”اے ہمارے رب! تو ہم سے (یہ نیکی) قبول کر لے، بے شک تو ہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب! اور ہم دونوں کو اپنا فرماں بردار بنا اور ہماری اولاد میں سے ایک جماعت کو بھی اپنا فرماں بردار (بنا) اور ہمیں ہماری عبادت کے طریقے سکھا اور ہم پر توجہ فرما، بے شک تو ہی بہت توبہ قبول کرنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔ اے ہمارے رب! اور ان لوگوں کے لیے انہی میں سے ایک رسول بھیج، وہ ان کے سامنے تیری آیتیں تلاوت کرے، اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، اور انھیں پاک کرے، بے شک تو

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٢٠) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٢١) [3] تفسیر الطبري (٣/ ١٢)

ہی غالب، خوب حکمت والا ہے۔''[1]

امام سعید بن مسیب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے جس نے ختنہ کیا، مہمان کو کھلایا، ناخن کترے، مونچھیں کم کیں اور بوڑھے ہوئے، وہ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ انھوں نے سفید بال دیکھ کر کہا کہ یہ کیا ہے؟ فرمایا کہ وقار ہے، کہا: ''يَا رَبِّ زِدْنِيْ وَقَارًا''[2] ''اے رب! اس عزت و وقار کو بڑھا۔'' کسی نے کہا ہے کہ سب سے پہلے منبر پر خطبہ انھیں نے پڑھا تھا۔ ڈاک کی چوکی مقرر کی، تلوار چلائی، مسواک کی، پانی سے استنجا کیا اور ازار پہنی۔

کلمات کے مفہوم پر تبصرہ:

امام ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جائز ہے کہ کلمے سے مراد یہ تمام یا بعض امور ہوں، مگر کسی اَمر کی تخصیص حدیث یا اجماع کی تائید کے بغیر جائز نہیں کہ فلاں بات تھی۔ لہٰذا اس باب میں کسی ایک راوی یا جماعت سے ایسی کوئی حدیث مروی نہیں جس کا ماننا واجب ہو۔ پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام مجاہد اور ربیع بن انس رحمہما اللہ کا قول زیادہ صحیح ہے۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے قوی تو وہی بات تھی کہ لفظِ کلمات تمام بیان کردہ چیزوں کو شامل ہے، کیوں کہ سیاق کے علاوہ مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ کے قول سے یہی معلوم ہوتا ہے۔[4]

فتح البیان میں کلمات کے متعلق اہلِ علم کے اقوال میں پائے جانے والے اختلافات کا ذکر کرنے کے بعد یہی لکھا ہے کہ حق یہ ہے کہ جب اس باب میں نہ تو کوئی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوئی ہے اور نہ کسی اور طریقے سے کلمات کا تعین ہوا ہے تو اب فقط اتنی ہی بات رہ گئی ہے کہ یا تو وہ اس کے قائل ہوں، جو اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿ إِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ﴾ [البقرة: ١٢٤] ''بے شک میں تجھے سب لوگوں کے لیے امام بنانے والا ہوں۔'' اور اس کو کلمات کی تفسیر قرار دیں۔ یا سکوت اختیار کریں اور اللہ پر چھوڑ دیں۔ نیز سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعینِ عظام رحمہم اللہ سے کلمات کے تعین کے سلسلے میں جو کچھ مروی ہے، اول تو وہ اقوالِ صحابہ ہیں جو حجت نہیں۔ اسی طرح تابعین رحمہم اللہ کے اقوال ہیں۔

پھر اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ اس میں اجتہاد کا دخل نہیں ہے، بلکہ وہ مرفوع کے حکم میں ہی آتے ہیں تو بھی کلمات کے تعین میں اتنا بڑا اختلاف ہے، جو بعض پر عمل کرنے سے منع کرتا ہے، پھر کس بات پر عمل کریں، کس پر نہ کریں؟ بلکہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جیسے صحابی سے بھی مختلف روایات آئی ہیں۔ یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جو کوئی عموم کی طرف گیا ہے اور اُس نے یہ بات کہی ہے کہ یہ کلمات جملہ کلمات مذکورات ہیں، اس کا قول ضعیف

[1] تفسير الطبري (٣/ ١٥)

[2] الموطأ (٢/ ٩٢٢) الأدب المفرد، رقم الحديث (١٢٥٠) یہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے موقوفاً بھی صحیح سند سے مروی ہے۔

[3] تفسير الطبري (٣/ ١٥۔ ١٧) [4] تفسير ابن كثير (١/ ٢٢٠)

ہے، کیوں کہ اس قول سے یہ بات لازم آتی ہے کہ قرآن پاک کی تفسیر ضعیف اور باہم مختلف اقوال سے کی گئی ہے، جو حجت لینے کے لائق نہیں۔

آزمایش نبوت سے پہلے تھی یا بعد میں؟

پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ وہ آزمایش نبوت سے پہلے تھی یا بعد میں؟ جس نے کہا ہے کہ پہلے تھی، اس کی دلیل یہ ہے کہ ان کو اس کے بعد امام بنایا، یہ ابتلاء امامت کا سبب بنی۔ سبب مسبب پر مقدم ہوتا ہے۔ جس نے کہا کہ نبوت کے بعد تھی، اس کی دلیل یہ ہے کہ تکلیف وحیِ الٰہی کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتی، بلکہ تکلیف نبوت کے بعد ہوا کرتی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ آزمایش سے مراد ستارے چاند اور سورج کے ساتھ آزمایش ہے تو وہ نبوت سے پہلے تھی اور اگر شریعت کے ساتھ آزمایش ہے تو پھر نبوت کے بعد تھی۔[1]

میں کہتا ہوں کہ اس غور وخوض کی بھی کچھ ضرورت نہیں۔ ہمارے لیے اتنا سمجھ لینا ہی کافی ہے کہ اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا، جب کبھی آزمایا ہو اور جس کسی امر میں بھی آزمایا ہو، وہ اس آزمایش پر بڑے ثابت قدم اور مضبوط حوصلے والے نکلے کہ جس پر اللہ نے ان کو سارے جہاں کا پیشوا بنایا اور اُن کے بعد جو پیغمبر آیا، وہ انھی کی نسل میں سے تھا اور انھی کی اتباع پر مامور تھا۔ ابراہیم علیہ السلام وہ شخص ہیں، جن کو دنیا بھر کے اگلے پچھلے سب لوگ مانتے ہیں۔ یہود ونصاریٰ ان کے شرف وفضل کے اقراری ہیں اور اُن کی طرف یا اُن کی اولاد کی طرف منسوب ہونے کو اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ دوسروں پر اس بات کا فخر کرتے ہیں کہ ہم ان کی اولاد میں سے ہیں۔ حرم کے رہنے والے خانہ کعبہ کے خادم ہیں۔ جب اسلام آیا تو اللہ نے وہ امور نقل کیے، جن کا مشرکین اور اہلِ کتاب پر قبول کرنا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرنا اور دینِ اسلام کی عزت کرنا، شرعی لحاظ سے واجب ہوتا ہے۔ کیوں کہ جو باتیں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام پر واجب کی تھیں، وہ دینِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات ہیں۔ اس میں یہود ونصاریٰ اور مشرکینِ عرب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت وتکریم اور اُن پر ایمان لانے اور تصدیق کرنے کے لیے حجت قائم کی گئی ہے۔

امامت کا معیار:

اللہ تعالیٰ نے جب ابراہیم علیہ السلام کو عالی مرتبہ امام بنا دیا تو انھوں نے اللہ سے یہ سوال کیا کہ میرے بعد جو امام ہوں، وہ میری ہی اولاد سے ہوں، اللہ نے ان کی یہ دعا قبول کرلی، مگر یہ بھی سنا دیا کہ تمھاری اولاد میں ظالم بھی ہوں گے، لہٰذا یہ عہد اُن کو نہیں پہنچے گا۔ یہ منصب ان کو نہیں ملے گا اور وہ امام مقتدیٰ نہ ہوں گے۔ اس بات کی دلیل کہ وہ دعا قبول ہوگئی تھی، سورۃ العنکبوت کی یہ آیت ہے: ﴿ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ ﴾ [العنکبوت: ٢٧]

---

[1] فتح البیان (١/ ٢٧٢۔ ٢٧٣)

''اور ہم نے اس کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھ دی۔'' لہٰذا ابراہیم علیہ السلام کے بعد جو نبی آیا اور جو کتاب بھی اتری، وہ انھی کی اولاد پر اتری تھی۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت سے یہ نکلا کہ تمھاری اولاد میں بے انصاف لوگ بھی ہوں گے، لہٰذا ظالم آدمی امام نہیں ہوسکتا، ہم ظالم کو مقتدیٰ (پیشوا) نہیں بنا سکتے، ہاں جو ان میں نیک ہوگا، اس کو ہم امام بنائیں گے۔[1]

امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ مشرک امام نہیں ہوگا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد آخرت ہے۔ رہی دنیا تو دنیا میں کبھی ظالم بھی امام بن جاتا ہے۔ یہی قول امام نخعی، عطا، حسن اور عکرمہ رحمہم اللہ کا بھی ہے۔[2] امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بندوں کی طرف اللہ کا عہد اس کا دین ہے، یعنی یہ دین ظالموں کو نہیں ملتا، ظالم بے دین رہتا ہے۔ دیکھو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰۤى اِسْحٰقَ ؕ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ۝۱۱۳ ﴾ [الصّافات: ۱۱۳] ''اور ہم نے اس پر اور اسحاق پر برکت نازل کی، اور ان دونوں کی اولاد میں سے کوئی نیکی کرنے والا اور کوئی اپنے آپ پر کھلا ظلم کرنے والا ہے۔'' یعنی اے ابراہیم! تمھاری ساری اولاد حق پر نہ ہوگی۔ امام ابو العالیہ، عطا اور ابن حیان رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ ضحاک نے کہا کہ مراد یہ ہے کہ میری اطاعت میرے کسی دشمن کو، جو نافرمان ہے، نہیں پہنچے گی، بلکہ جو میرا فرمانبردار اور مطیع ہوگا، اس کو ملے گی۔[3] اس آیت کی تفسیر میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث میں اس طرح مروی ہے کہ نہیں ہے طاعت مگر معروف میں۔[4] (رواه ابن مردويه)

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ عہد سے مراد نبوت ہے۔[5] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ مفسرینِ سلف کے الفاظ ہیں، جنھیں ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ نے نقل کیا ہے۔ پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یہ اختیار کیا ہے کہ اگرچہ یہ آیت بہ ظاہر اس بات کی اطلاع ہے کہ وہ عہد ظالموں کو نہیں ملے گا، مگر اس میں ابراہیم علیہ السلام کو یہ بات جتلائی گئی ہے کہ تمھاری نسل میں ظالم لنفسہٖ (اپنی جان پر زیادتی کرنے والے) بھی ہوں گے۔[6] مگر اس تقریر میں کچھ فائدہ نہیں ہے۔ اگر امام ابن جریر رحمہ اللہ یوں کہتے کہ یہ خبر اُمر کی جگہ ہے تو بہتر ہوتا۔ یہ مطلب ٹھہرتا کہ بندوں کو یہ چاہیے کہ شرعی امور میں کسی ظالم کو والی نہ بنائیں۔ یہ بات ہم نے اس لیے کہی ہے کہ اللہ کی خبر غلط نہیں ہوتی، حالاں کہ ہمیں معلوم ہے کہ امامت کا عہد بہت سے ظالموں کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ امام ابن خویز منداد مالکی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظالم اس لائق نہیں ہے کہ خلیفہ ہو یا حاکم یا مفتی یا شاہد یا راوی ہو۔[7]

فتح البیان میں لکھا ہے کہ علما کی ایک جماعت نے اس آیت سے اس بات کی دلیل لی ہے کہ امام کا اہلِ عدل

---

[1] تفسير الطبري (٣/ ٢١) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٢٣) [2] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٢٤) تفسير ابن كثير (١/ ٢٢١)

[3] تفسير الطبري (٣/ ٢٣) تفسير ابن كثير (١/ ٢٢١)

[4] دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٧٢٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٤٠)

[5] تفسير الطبري (٣/ ٢٠) [6] تفسير ابن كثير (١/ ٢٢٢) [7] تفسير ابن كثير (١/ ٢٢٢)

اور عامل بالشرع ہونا ضروری ہے۔ کیوں کہ جب اس عدل و عمل سے دور ہوگا تو ظالم ٹھہرے گا، بلکہ آیت زیرِ تفسیر میں عہد کی اضافت اس بات کی متقاضی ہے کہ دین کے جتنے کام ہیں، ان سب میں امام ظلم کے وصف سے پاک ہو۔[1] یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ جملہ یا تو دعائیہ ہو یا بہ طورِ سوال جس کے جواب میں بعض اولاد کا ظالم ہونا ارشاد فرمایا۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ

اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے بار بار لوٹ کر آنے کی اور امن کی جگہ بنایا اور (حکم دیا کہ) تم مقامِ ابراہیم کو جائے نماز بناؤ۔

بیت اللہ کی فضیلت:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ لوگ جب اس گھر سے حاجت پوری کر کے واپس اپنے اہل و عیال کو جاتے ہیں تو پھر اس گھر کو آتے ہیں،[2] یعنی دوبارہ سہ بارہ یہاں جمع ہوتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت نے یہی بات کہی ہے کہ جو کوئی یہاں سے پھر کر گھر کو جاتا ہے، اس کو یہاں آنے کا شوق لگا رہتا ہے، ہر شہر اور ملک کے لوگ دوڑ دوڑ کر یہاں آتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے:

جَعَلَ الْبَيْتَ مَثَابًا لَّهُمْ لَيْسَ مِنْهُ الدَّهْرَ يَقْضُوْنَ الْوَطَرَ

''لوگوں کے لیے بیت اللہ کو اجتماع گاہ بنا دیا ہے، وہ سال بھر اس سے (آتشِ شوق کی) حاجت پوری نہیں کر پاتے۔''

یعنی یک بار دیدم و بار دِگر ہوس دارم۔

''یعنی میں نے ایک بار دیکھا اور دوسری مرتبہ دیدار کی خواہش رکھتا ہوں۔''

دوبارہ می طلبم طواف کعبہ اے نواب خدا دہد بہ پروبال من ہوائے دگر

''اے نواب! میں کعبہ کی سیر کا دوبارہ خواہش مند ہوں۔ اللہ میرے دل میں اس کا نیا ولولہ واشتیاق پیدا کر دے۔''

عکرمہ و قتادہ و عطاء رحمہم اللہ وغیرہم نے مثابہ کے معنی یہ کیے ہیں کہ اس سے مراد مجمع ہے۔[3]

نہ پوچھو اہلِ موقف ہم سے دیوانوں کی بے تابی یہاں مجمع سنا یاں بھی تلاشِ یار میں آئی

---

[1] فتح البیان (۱/ ۲۷٤)

[2] تفسیر الطبري (۳/ ۲۷) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ البتہ اسی کے ہم معنی روایت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے تفسیر ابن ابی حاتم میں حسن سند کے ساتھ مروی ہے۔ دیکھیں: تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۲۵)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۲۵)

امن سے مراد:

امن سے یہ مراد ہے کہ یہاں لوگ بے کھٹکے رہتے ہیں اور اللہ کی پناہ میں ہوتے ہیں۔ ابوالعالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی دشمن سے اور ہتھیار اُٹھانے سے امن میں ہیں۔ جاہلیت میں اردگرد سے لوگوں کو اُٹھا لیتے تھے، مگر حرم والوں کو کوئی نہ پکڑتا تھا اور نہ ستاتا تھا، بلکہ یہ چین و آرام میں تھے۔ مجاہد، عطا، سدی اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم کا یہ قول ہے کہ جو اس جگہ آیا، وہ امن میں ہوا۔[1] اہلِ علم کی ایک جماعت نے اس آیت سے اس بات کی دلیل لی ہے کہ جو کوئی حرم کی طرف ملتجی ہو، اس پر کوئی حد قائم نہ کی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ﴾ [آل عمران: ٩٧] ''اور جو اس میں داخل ہو جائے، وہ امن والا ہو جاتا ہے۔'' بھی اسی کی تائید میں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حکم منسوخ ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ محکم ہے، اس کو یہاں تک تنگ کریں کہ وہ باہر آئے، پھر اس کو پکڑ کر سزا و جزا دیں۔ اسی لیے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ امن سے مراد جائے پناہ ہے۔[2]

حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خانہ کعبہ کا شرف بیان کیا اور اس کی شرعاً وقدراً جو صفت تھی، وہ ذکر فرمائی کہ یہ ایسی جگہ ہے، جس کا شوق روحوں کو ہے۔ اگر کوئی ہر سال یہاں آیا کرے تو بھی اس کا جی نہیں بھرتا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول کی اور وہ دعا یہ تھی: ﴿ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْۤ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ ؕ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ ۝ رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۖۗ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ۝ ﴾ [إبراهيم: ٣٧۔ ٤٠] ''چناں چہ تو بعض لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہونے والے کر دے اور انھیں ہر قسم کے پھلوں سے رزق دے، تاکہ وہ (تیرا) شکر کریں۔ اے ہمارے رب! بے شک تو سب جانتا ہے جو کچھ ہم چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ اور زمین اور آسمان میں کوئی چیز اللہ سے مخفی نہیں۔ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے، بے شک میرا رب دعا خوب سننے والا ہے۔ اے میرے رب! مجھے اور میری اولاد کو بھی نماز قائم کرنے والا بنا۔ اے ہمارے رب! اور تو میری دعا قبول فرما۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ وہ جگہ ہے کہ کوئی کچھ ہی کیوں نہ کرے، جب اس جگہ آ جاتا ہے تو اس کو پناہ مل جاتی ہے۔ امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آدمی اپنے باپ بھائی کے قاتل کو دیکھتا، مگر تعرض نہ کر سکتا (بدلہ نہ لیتا)[3] جیسا کہ اللہ نے سورت مائدہ میں فرمایا: ﴿ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ ﴾ [المائدة: ٩٧] ''اللہ نے حرمت والے گھر کعبہ کو لوگوں کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔'' یعنی اس گھر کی تعظیم کے سبب سے بدی دور کی جاتی ہے۔

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٢٥)
(2) تفسير الطبري (٣/ ٢٩۔ ٣٠) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٢٥)
(3) تفسير الطبري (٣/ ٢٩)

اسی لیے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اگر لوگ اس گھر کا حج نہ کریں تو اللہ آسمان کو زمین پر گرا کر ایک طبق کر دے۔ لہٰذا یہ شرف اس گھر کو اس کے بانی مبانی کے شرف سے حاصل ہوا ہے اور وہ بانی خلیل الرحمٰن علیہ السلام ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا ﴾ [الحج: ٢٦] ''اور (یاد کریں) جب ہم نے ابراہیم کے لیے بیت اللہ کی جگہ مقرر کر دی (اور اسے حکم دیا) کہ تو میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کر۔'' نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ﴾ [آل عمران: ٩٦۔ ٩٧] ''بے شک (اللہ کا) پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے۔ وہ تمام دنیا کے لیے بڑی برکت اور ہدایت والا ہے۔ اس میں واضح نشانیاں ہیں (اور) مقامِ ابراہیم ہے اور جو اس میں داخل ہو جائے، وہ امن والا ہو جاتا ہے۔''[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ یہ وہ شہر ہے جسے اللہ نے آسمان اور زمین پیدا کرنے کے دن سے محترم قرار دے دیا، لہٰذا یہ قیامت تک اللہ کے عطا کیے ہوئے احترام کی وجہ سے محترم ہے۔ مجھ سے پہلے کسی شخص کے لیے یہاں جنگ کرنا حلال نہیں ہوا۔ میرے لیے بھی ایک گھڑی سے زیادہ حلال نہیں ہوا، اب وہ قیامت تک حرام ہے۔ نہ یہاں کا کانٹا کاٹا جائے نہ شکار بھڑکایا جائے، نہ گری پڑی چیز اُٹھائی جائے، مگر جو شخص اس کا اعلان کرے، اور نہ گھاس اُکھاڑی جائے۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مگر اِذخر کہ یہ لوہاروں اور گھروں کے لیے کام آتی ہے۔ فرمایا کہ مگر اِذخر [گھاس]۔[2] (أخرجه الشيخان) اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اجتہاد کرنا درست تھا، آپ کا اجتہاد وحی کے حکم میں تھا۔

مقام ابراہیم کی عظمت:

اس آیتِ کریمہ میں مقامِ ابراہیم کی نشاندہی فرما کر حکم دیا کہ اس کے پاس نماز پڑھا کرو۔ مفسرین کا اختلاف ہے کہ اس مقام سے کونسی جگہ یا چیز مراد ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سارا حرم مقامِ ابراہیم ہے۔[3] یہی بات مجاہد اور عطا رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔ امام عطا رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ سارا حج مقامِ ابراہیم ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مقامِ ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر وہ کھڑے ہوتے اور اسماعیل علیہ السلام ان کو پتھر اُٹھا کر دیتے تھے، اللہ نے اس پتھر کو رحمت ٹھہرایا ہے۔[4] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس پتھر کو زوجۂ اسماعیل نے اُٹھا کر ابراہیم علیہ السلام کے قدم کے نیچے رکھ کر ان کا سر دھویا تھا۔[5] اس کو امام قرطبی رحمہ اللہ نے ضعیف[6] اور دوسروں نے راجح کہا ہے۔ امام

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٢٢) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٣٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٥٣)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٢٦) اس کی سند میں ''عبداللہ بن عیسیٰ'' ضعیف راوی ہے۔

[4] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٢٦) [5] تفسير الطبري (٣/ ٣٥) [6] تفسير القرطبي (٢/ ١١٣)

رازی رحمہ اللہ نے اس کو امام حسن بصری، قتادہ اور ربیع بن انس رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے۔[1] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حج میں طواف کیا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ ہمارے باپ کا مقام ہے؟ فرمایا: ہاں۔ کہا: کیا ہم اس کو مصلیٰ (جائے نماز) نہ بنالیں؟ اس پر یہ آیت اتری۔[2] (رواه ابن أبي حاتم)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی موافقات:

یہ وحی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی رائے کے موافق آئی۔ اسی طرح بہت جگہ پر وحی نے ان کی رائے سے موافقت کی ہے۔ یہ سب اٹھارہ جگہ ہیں۔ جن کو سیوطی نے ایک علاحدہ رسالے میں جمع کیا ہے۔[3] اس حدیث کو ابن ابی شیبہ اور ابن مردویہ رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔[4] اس میں لفظ کا فرق ہے، مگر معنی ایک ہیں۔

بخاری شریف میں آیا ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں تین باتوں میں اپنے رب سے موافق ہوا یا مجھ سے میرا رب موافق ہوا۔ میں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! کاش آپ اس مقامِ ابراہیم کو اختیار کرتے۔ اس پر یہ آیت اُتری۔ میں نے کہا کہ آپ کے پاس نیک و بد سب طرح کے لوگ آتے ہیں۔ کاش آپ اُمہات المومنین رضی اللہ عنہن کو پردے کا حکم دیتے۔ اس پر آیتِ حجاب نازل ہوئی۔ میں نے سنا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بعض بیویوں پر خفا ہوئے میں نے آکر کہا کہ تم باز رہو، ورنہ اللہ اپنے رسول کو تم سے بہتر عورتیں بدل دے گا۔ اس پر یہ آیت اُتری: ﴿ عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝ ﴾ [التحريم: ٥] ''اگر وہ (نبی) تمھیں طلاق دے دے تو شاید اس کا رب اس کو تم سے بہتر بیویاں بدلے میں دے دے، مسلمان، مومن، فرمانبردار، توبہ کرنے والی، عبادت گار، روزہ دار، شوہر دیدہ اور کنواری عورتیں۔''

اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے اور ترمذی نے حسن صحیح بتایا ہے۔ یہ حدیث صحیح مسلم میں بھی آئی ہے،[5] اور علی بن المدینی اس کو صحیح کہتے ہیں۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی روایت میں تیسری بات یہ آئی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن اُبی کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے منع کیا تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ مانا۔ اس پر یہ آیت اُتری: ﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ﴾ [التوبة: ٨٤] ''اور (اے نبی!) ان میں سے جو مر جائے آپ اس کی نماز (جنازہ) ہرگز نہ پڑھیں اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہوں۔''[6] یہ اسناد صحیح ہے۔ ان میں کچھ تعارض نہیں، یہ بھی ہوا اور وہ بھی ہوا۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٤٢٦) اس کی سند حسن ہے۔
[2] تفسير الرازي (٤/ ٤٤۔ ٤٥)
[3] اس کا نام ''قطف الثمر في موافقاتِ عمر'' ہے۔
[4] حلية الأولياء (٤/ ١٤٥) تفسير ابن كثير (١/ ٢٢٣)
[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٩٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٦٠) مسند أحمد (١/ ٢٣)
[6] تفسير ابن أبي حاتم (٦/ ١٨٥٧) اس کی سند صحیح ہے۔

مقامِ ابراہیم کی منتقلی:

رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں پہلے یہ پتھر کعبہ کی دیوار میں لگا تھا۔ سب سے پہلے عمر رضی اللہ عنہ نے اسے منتقل کیا، یعنی اس جگہ سے اُکھاڑ کر اس جگہ، جہاں اب تک موجود ہے، رکھ دیا۔ اس کو امام بیہقی رحمہ اللہ نے صحیح سند سے روایت کیا ہے۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس کو خلیفہ مہدی راشد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس جگہ رکھا ہے اور ہمیں حکم ہے کہ ان کا اتباع کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «اِقْتَدُوْا بِاللَّذَيْنِ مِنْ بَعْدِيْ أَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ»[2] ”میرے بعد دو شخصوں ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی پیروی کرو۔“ یہ وہ شخص ہیں جن کی رائے سے قرآن نے اس جگہ نماز پڑھنے میں موافقت کی، اس لیے کسی صحابی نے ان کا انکار نہیں کیا۔ یہ زمانۂ قدیم سے کعبہ کی دیوار میں تھا۔ اس کی جگہ معروف ہے۔ یہ بابِ حجرِ اسود کے متصل دائیں جانب تھا۔ ابراہیم علیہ السلام جب کعبہ بنا چکے تو اس کو دیوار کے پاس یا جہاں بنیاد ختم ہوئی، وہاں رکھ کر چھوڑ دیا تھا، لہٰذا یہ حکم ہوا کہ طواف کے بعد اس جگہ نماز پڑھو اور یہی مناسب بھی تھا کہ مقامِ ابراہیم اسی جگہ پر ہو، جہاں کعبہ کی بنیاد پوری ہوتی ہے، مگر عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی جگہ بدل دی۔[3]

مقامِ ابراہیم کے پیچھے نماز کا حکم:

کہتے ہیں کہ اس پتھر پر ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کی انگلیوں کے نشان تھے، جو کثرتِ مسح سے جاتے رہے۔ اس کے پاس نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چاروں سمتوں میں سے کسی بھی طرف سے کیوں نہ پڑھو، لیکن مقام کے پیچھے نماز کی تخصیص رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فعل کی اتباع میں کی گئی ہے۔ اس کو چھونے یا آگے رکھنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے مقام کے بیان کی ابتدا میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک طویل اثر لکھا ہے۔[4] ترمذی کی حدیث میں مروی ہے کہ رکن اور مقام، جنت کے دو یاقوت ہیں، اللہ نے ان کی چمک کو مٹا دیا۔[5] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تین شوط (چکر) میں دوڑ کر چلے، پھر چار شوط میں معمول کی چال چلے اور جب طواف سے فارغ ہوئے تو مقامِ ابراہیم کے پیچھے آ کر دو رکعتیں پڑھیں، پھر یہ آیت پڑھی۔[6] امام ابن جریر رحمہ اللہ کی روایت میں اتنا مزید آیا ہے کہ مقام کو اپنے اور خانہ کعبہ کے درمیان میں کر کے دو رکعت پڑھیں۔[7]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۲۵)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۶۶۲) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۹۷) وقال الترمذي: هذا حديث حسن. السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۱۲۳۳)

[3] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۲۵)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۱۸٤)

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (۸۷۸) صحيح الجامع، رقم الحديث (۱٦۳۳)

[6] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۲۱۸)

[7] تفسير الطبري (۳/ ۳٦)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اس طویل حدیث کا ایک ٹکڑا ہے، جو حاتم بن اسماعیل سے صحیح مسلم میں آئی ہے۔ بخاری میں عمرو بن دینار رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ آئے، پھر سات بار طواف کیا، پھر مقامِ ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھی۔[1] یہ حدیثیں اس بات کی دلیل ہیں کہ مقام سے وہی پتھر مراد ہے جس پر ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہو کر کعبہ تعمیر کرتے تھے، جب دیوار اونچی ہوگئی تو اسماعیل علیہ السلام اس پتھر کو اٹھا کر لائے اور اسے ان کے لیے رکھا، وہ اس پر کھڑے ہو کر تعمیر کرنے لگے اور اسماعیل علیہ السلام انھیں پتھر پکڑا رہے تھے، جب ایک طرف کی دیوار بن جاتی تو دوسرے رخ کی بناتے۔ وہ پتھر ہر طرف جاتا اور وہ اس پر کھڑے ہوتے، یہاں تک کہ کعبہ کی چاروں دیواریں بن گئیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بخاری میں یہ قصہ مفصل آیا ہے۔[2] اس میں نقشِ قدم ظاہر تھے، اس کا کچھ نشان مسلمانوں نے بھی پایا تھا۔[3]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے مقام کو دیکھا، اس میں انگلیوں اور تلوے کا نشان تھا، لوگوں کے ہاتھوں نے مسح کر کر کے ان نقشوں کو کھو دیا۔[4] قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ نماز پڑھنے کا حکم ہے، چھونے کا نہیں، جو تکلف اگلی اُمتوں نے کیا تھا، وہی تکلف اس اُمت نے بھی برتا، جس نے ایڑی اور انگلیوں کا نشان دیکھا تھا، اس نے ہمیں بتایا، لیکن اس اُمت کے چھونے نے اس کو پرانا کر ڈالا۔[5]

امام ابن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کے مقام کو تبدیل کرنے کے بعد ایک دفعہ سیلاب آیا تھا اور وہ مقام کو بہا کر لے گیا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے دوبارہ اس کو لا کر رکھا۔ امام سفیان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہمیں نہیں معلوم کہ پتھر کی پہلی تنصیب اور اُس کی تحویل کے درمیان کتنی مدت گزری ہے اور نہ یہ معلوم ہے کہ مقامِ ابراہیم کعبہ کی دیوار سے چپکا ہوا تھا یا نہیں،[6] مگر امام مجاہد رحمہ اللہ سے ایک روایت میں ایسے آیا ہے کہ اس کی جگہ خود رسول اللہ ﷺ نے بدلی ہے،[7] مگر پہلا قول صحیح ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٧) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٨٤)

[3] تفسير ابن كثير (١/ ٢٢٥)

[4] أخبار مكة للفاكهي (١/ ٤٥٠) اس کی سند میں ''ہارون بن موسیٰ بن طریف'' کا ترجمہ نہیں ملا ہے۔

[5] تفسير الطبري (٣/ ٣٥) [6] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٢٦۔ ٢٢٧)

[7] الدر المنثور (١/ ٢٩٠)

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ
وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝١٢٥ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا
بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ
اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝١٢٦ وَاِذْ يَرْفَعُ
اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ
اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝١٢٧ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ
اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ
الرَّحِيْمُ ۝١٢٨

اور ہم نے حکم دیا ابراہیم اور اسماعیل کو کہ تم دونوں میرا گھر پاک کرو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے (125) اور جب ابراہیم نے کہا: اے میرے رب! اس (جگہ) کو امن والا شہر بنا اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے، انھیں پھلوں سے رزق دے۔ اللہ نے کہا: اور جس نے کفر کیا تو میں اسے تھوڑا سا فائدہ دوں گا، پھر میں اسے آگ کے عذاب کی طرف مجبور کر دوں گا اور وہ لوٹنے کی بری جگہ ہے (126) اور (یاد کرو) جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے (اور دعا کر رہے تھے:) اے ہمارے رب! تو ہم سے (یہ نیکی) قبول کر لے، بے شک تو ہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (127) اے ہمارے رب! اور ہم دونوں کو اپنا فرماں بردار بنا اور ہماری اولاد میں سے ایک جماعت کو بھی اپنا فرماں بردار (بنا) اور ہمیں ہماری عبادت کے طریقے سکھا اور ہم پر توجہ فرما، بے شک تو ہی بہت توبہ قبول کرنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے (128)

بیت اللہ کی تطہیر کا حکم اور اس سے مراد:

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پاک کرنے سے مراد یہ ہے کہ وہاں ایذا اور نجاست کی کوئی چیز نہ ہو۔[1]

---

(1) تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٢٦)

عہد کے معنی ہیں: حکم اور وحی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یعنی بتوں سے پاک کرو۔[1] مجاہد رحمہ اللہ نے یہ اضافہ کیا ہے کہ بے حیائی اور جھوٹی بات اور ناپاکی سے پاک رکھو۔ ابو العالیہ، عطا اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ یعنی ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' کہہ کر شرک سے پاک صاف رکھو۔[2]

طواف کے معنی ہیں: ارد گرد گھومنا، اس کو سب جانتے پہچانتے ہیں، اس جگہ طائف سے مراد وہ شخص ہے جو مسافر بن کر آیا ہے۔ عاکف سے وہ شخص مراد ہے، جو مکے میں رہتا ہے۔ امام قتادہ اور ربیع بن انس رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ شخص مراد ہے جو دوسرے شہروں سے آ کر یہاں ٹھہرا ہے اور کہتا ہے کہ میں مجاور ہوں اور تم عاکف ہو۔[3] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب مکہ نشین ہوا تو عاکفین میں سے ہو گیا۔[4]

صحیح بخاری میں مروی ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سوتے تھے اور وہ کنوارے (بغیر عورت کے) تھے۔[5] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جو وہاں نماز پڑھتا ہے، وہ رکوع اور سجدہ کرنے والوں میں سے ہے۔[6] پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ان دونوں باتوں کو ضعیف کہا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلی بات صحیح ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ نے ان باپ بیٹے کو یہ حکم دیا تھا کہ تم اس گھر کو خاص اللہ وحدہ لاشریک لہ کے نام پر بنانا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآىِٕفِيْنَ وَالْقَآىِٕمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ [الحج: ٢٦] ''اور (یاد کریں) جب ہم نے ابراہیم کے لیے بیت اللہ کی جگہ مقرر کر دی (اور اسے حکم دیا) کہ تو میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہ کر اور طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع، سجدے کرنے والوں کے لیے میرا گھر پاک رکھ۔''

کعبے میں نماز پڑھنا افضل ہے یا کعبہ کا طواف کرنا؟:

فقہا کا اختلاف ہے کہ کعبہ میں نماز افضل ہے یا کعبہ کا طواف؟ امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ باہر سے آنے والوں کے لیے طواف افضل ہے۔ جمہور نے کہا ہے کہ بلکہ نماز مطلقاً افضل ہے۔ ہر ایک قول کی توجیہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ''كتاب الأحكام'' میں ذکر کی ہے۔[7] اس آیت سے ان مشرکوں کا رد کرنا مقصود ہے، جو کعبہ کے پاس شرک کیا کرتے تھے، پھر مومنوں کو وہاں آنے سے روکتے تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ

---

① تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٢٧) اس کی سند میں ''عبداللہ بن ہرمز'' ضعیف راوی ہے۔

② تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٢٧_ ٢٢٨) ③ تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٢٨_ ٢٢٩)

④ تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٢٨) اس کی سند میں ''ابوبکر ہذلی'' سخت ضعیف راوی ہے۔

⑤ صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٩) ⑥ تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٢٩) اس کی سند میں ''ابوبکر ہذلی'' ضعیف راوی ہے۔

⑦ تفسیر ابن كثير (١/ ٢٢٧)

سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ؕ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [الحج: ۲۵] ''بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ (لوگوں کو) اللہ کی راہ اور مسجد حرام سے روکتے ہیں، جسے ہم نے (سب) لوگوں کے لیے بنایا ہے، اس میں مقیم اور بادیہ نشین (باہر سے آنے والے) برابر ہیں اور جو اس میں ظلم کے ساتھ کج روی کا ارادہ کرے، ہم اسے نہایت، دردناک عذاب چکھائیں گے۔''

پھر یہ ذکر کیا کہ یہ گھر اس لیے بنایا گیا ہے کہ یہاں طواف یا نماز کے ذریعے صرف اللہ کی عبادت کی جائے۔ سورت حج میں نماز کے تینوں ارکان، یعنی قیام، رکوع اور سجدے کا ذکر فرمایا ہے۔ عاکفین کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ پہلے ہو چکا تھا۔ اس آیت میں طائفین اور عاکفین کا ذکر کیا ہے۔ رکوع اور سجدے کا ذکر فرمایا اور قیام کو چھوڑ دیا، کیوں کہ یہ بات معلوم ہے کہ رکوع و سجود قیام کے بعد ہی ہوتا ہے۔

یہود و نصاریٰ کا رد جو حج نہیں کرتے:

اس آیت میں ان یہود و نصاریٰ کا بھی رد ہے، جو اس گھر کا حج نہیں کرتے، کیوں کہ وہ ابراہیم خلیل اور اسماعیل علیہما السلام کی فضیلت کا اعتقاد رکھتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ انھوں نے یہ گھر حج و عمرے میں اسی طواف اور اعتکاف و نماز کے لیے بنایا ہے، حالاں کہ اہلِ کتاب ان کاموں میں سے کوئی کام بھی نہیں کرتے، تو پھر کس طرح یہ خلیل علیہ السلام کے پیروکار ہو سکتے ہیں، جب کہ ان کے جاری کردہ کام ان سے ادا نہیں ہوتے۔ موسیٰ بن عمران وغیرہ انبیا علیہم السلام نے اس گھر کا حج کیا تھا، جس طرح نبی معصوم علیہ السلام نے خبر دی ہے۔[1]

مساجد کی تعمیر کا جواز:

مساجد کی تعمیر اسی آیتِ شریفہ سے لی گئی ہے اور اس آیت سے بھی ماخوذ ہے: ﴿ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴾ [النور: ۳۶] ''یہ (چراغ اور قندیلیں) ان گھروں میں ہیں (جن کی بابت) اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کو بلند کیا جائے اور ان میں اللہ کا نام ذکر کیا جائے (اور) وہ وہاں صبح و شام اس کی تسبیح کرتے ہیں۔'' رہی سنتِ مطہرہ تو بہت سی حدیثوں میں مساجد کی تطہیر و تطییب اور انھیں نجاست اور اس جیسی چیزوں سے بچانے کا حکم آیا ہے۔ اسی لیے یہ فرمایا ہے: « إِنَّمَا بُنِيَتِ الْمَسَاجِدُ لِمَا بُنِيَتْ لَهُ » ''مساجد جس غرض کے لیے بنائی گئی ہیں، اسی کے لیے بنائی گئی ہیں۔''[2] یعنی ذکر اور نماز کے لیے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اس سلسلے میں ایک علاحدہ رسالہ لکھا ہے۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ.

---

[1] دیکھیں: المعجم الكبير (١٢٢٨٣) صحيح الترغيب والترهيب (١١٢٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٦٩)

کعبۃ اللہ کا بانیِ اول کون؟

اس میں اختلاف ہے کہ سب سے پہلے کعبہ کو کس نے بنایا؟ امام محمد باقر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ملائکہ نے بنایا تھا۔ یہ قول غریب ہے۔ عطا اور سعید بن المسیب رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام نے اس کو پانچ پہاڑوں حرا، طورِ سینا، طورِ زیتا، جبلِ لبنان اور جودی سے بنایا۔ یہ روایت بھی غریب ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، کعب احبار اور قتادہ رحمہما اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ سب سے پہلے شیث علیہ السلام نے بنایا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس مسئلے میں اکثر جو ذکر کیا جاتا ہے، وہ اہلِ کتاب سے لیا گیا ہے۔ یہ کتابیں ایسی ہیں کہ ان کی تصدیق کی جا سکتی ہے نہ تکذیب اور نہ ان پر کچھ اعتماد ہے، البتہ اگر کوئی صحیح حدیث اس بارے میں آ جائے تو سر آنکھوں پر۔[1]

حرمتِ حرمین شریفین:

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کو حرام اور با اَمن قرار دیا۔ میں نے مدینہ کو، یعنی دو پہاڑوں کے درمیان جگہ کو حرام ٹھہرایا ہے، نہ اس کا شکار مارا جائے، نہ وہاں کا خاردار درخت کاٹا جائے۔ اس کو ابن جریر و نسائی و مسلم رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔[2] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے یہ مضمون کئی سندوں سے آیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ اللہ نے مکہ کو محترم قرار دیا، جس دن آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، لہٰذا یہ قیامت تک کے لیے محترم ہے۔ سنن ابن ماجہ میں یہ حدیث صفیہ بنت شیبہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔[3] اس باب میں اور بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے، کیوں کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں کو یہ بات پہنچا دی کہ اللہ نے اس کو حرام کیا اور یہ ہمیشہ سے حرمت اور اَمن والا تھا تو ابراہیم علیہ السلام کی طرف تحریم کی نسبت عزت افزائی کے اظہار کی خاطر فرمائی ہے کہ انھوں نے اس حکمِ الٰہی کو ظاہر کیا۔ حقیقت میں اللہ پاک ہی حرام کرنے والا ہے۔ اس تطبیق اور توجیہ کو امام ابن عطیہ اور امام ابن کثیر رحمہما اللہ نے اختیار کیا ہے۔[4] ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ پہلے ہی سے حرام تھا، لیکن اللہ نے مخلوق کو عبادت کا حکم نہیں دیا تھا۔ ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا، تب اس کو حرام کیا اور عبادت کا حکم دیا۔[5] یہ توجیہ بھی اچھی ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٢٨)

[2] تفسیر الطبري (٣/ ٤٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٣٦٢) سنن النسائي الکبریٰ (٢/ ٤٨٧)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٧٣٧) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٣٥٣) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٣١٠٩)

[4] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٣٠)

[5] تفسیر الطبري (٣/ ٥٠)

رسول اللہ ﷺ کا مدینہ کو حرمت والا قرار دینا اور اس کے لیے دعا کرنا:

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اللہ کے بندے اور خلیل تھے اور میں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں۔ انھوں نے مکہ مکرمہ کو حرام کیا اور میں نے مدینہ منورہ کو دونوں پہاڑوں کے درمیان حرام کیا، یہاں کا خار (کانٹا) اور شکار حرام ہے۔ یہاں لڑائی کے لیے ہتھیار نہ اُٹھانا چاہیے اور نہ یہاں کا کوئی درخت کاٹا جائے، مگر اونٹوں کے چارے کے لیے کاٹ سکتے ہیں۔ اس کو ابن جریر رحمہ اللہ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس طریق کو غریب ٹھہرا کر یہ لکھا ہے کہ یہ حدیث صحاح ستہ میں نہیں ہے، لیکن اس کی اصل صحیح میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے آئی ہے کہ لوگ جب پہلا پھل دیکھتے تو رسول اللہ ﷺ کے پاس لاتے، آپ ﷺ اس کو لے کر فرماتے: اے اللہ! ہمارے پھل، ہمارے شہر، ہمارے صاع و مد (تولنے کے پیمانے) میں برکت دے۔ اے اللہ! بے شک ابراہیم علیہ السلام تیرے بندے، خلیل اور نبی تھے۔ میں بھی تیرا بندہ اور نبی ہوں، انھوں نے تجھ سے مکہ کے لیے دعا کی تھی اور میں تجھ سے مدینہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ ویسی ہی دعا اور اس جیسی اور دعا اس کے ساتھ، یعنی اس سے دُگنی۔ پھر کسی چھوٹی عمر کے بچے کو بلا کر وہ پھل دیتے۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ برکت ہمراہ برکت کے عطا فرما۔ پھر جو بہت چھوٹا بچہ موجود ہوتا، اس کو مرحمت فرماتے۔ یہ مسلم کے الفاظ ہیں۔[2]

سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرام کیا اور میں دونوں پہاڑوں کے درمیان مدینہ کو حرام کرتا ہوں۔[3] (رواہ ابن جریر و مسلم) صحیحین میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اے اللہ! میں مدینہ کے دونوں پہاڑوں کے درمیان کو حرام کرتا ہوں، جیسے ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرام کیا۔ اے اللہ! برکت دے ان کے مد اور صاع میں۔ اے اللہ! برکت دے مکیال سیر و پنسیری میں۔ امام بخاری نے کہا ہے کہ مراد اہلِ مدینہ ہیں۔[4] سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اے اللہ! برکت دے مدینہ کو اس سے دو چند، جتنی کہ مکہ کو دی ہے۔[5] (رواہ الشیخان) سیدنا عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرام کیا اور اس کے لیے دعا کی، میں نے مدینہ کو ویسے ہی حرام کیا۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام نے مکے کو حرام کیا، میں نے مدینہ کے مد اور صاع کے لیے دعا کی، جیسے ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے لیے دعا کی تھی۔[6] (رواہ البخاري)

---

① تفسیر الطبري (٣/ ٤٨) ② صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٣٧٣) تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٢٨)

③ تفسیر الطبري (٣/ ٤٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٣٦١)

④ صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٠٠٢، ٦٩٠٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٣٦٥)

⑤ صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٧٨٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٣٦٩)

⑥ صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٠٢٢)

صحیح مسلم کے الفاظ یہ ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرام کیا اور مکے والوں کے لیے دعا کی اور مَیں نے مدینہ حرام کیا، جیسے ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرام کیا تھا۔ میں نے مدینہ کے سیر اور پنسیری کے لیے اس سے دُگنی دعا کی، جو ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کے واسطے کی تھی۔[1] سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں کہ اے اللہ! ابراہیم علیہ السلام نے مکہ کو حرام ٹھہرایا، مَیں مدینہ کو دونوں پہاڑوں کے درمیان حرام کرتا ہوں، یہاں نہ کوئی خون بہایا جائے نہ ہتھیار اُٹھایا جائے اور نہ درخت کے پتے جھاڑے جائیں، سوائے چارے کے لیے۔ اے اللہ! برکت دے، ہمارے شہر، ہمارے، ہماری پنسیری اور ہمارے سیر میں۔ اے اللہ! ایک برکت کے ساتھ دو برکتیں دے۔[2] (رواہ مسلم)

ایک بزرگ نے ایک سبزی فروش کو مدینہ منورہ میں دیکھا کہ وہ بازار میں ساگ بیچتا تھا، اور ساتھ یہ کہتا تھا: ”يَا بَرَكَةَ النَّبِيِّ تَعَالِيْ وَانْزِلِيْ ثُمَّ لَا تَرْتَحِلِيْ“ ”اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی (دعا کی) برکت! تو آ اور اُتر اور پھر نہ جا۔“ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تحریمِ مدینہ (اسے محترم قرار دینے کے بارے) میں بہت حدیثیں آئی ہیں۔ اس جگہ وہی بیان کی گئی ہیں، جن کا ابراہیم علیہ السلام کے مکہ کو حرام قرار دینے سے تعلق تھا، کیوں کہ اس میں آیتِ کریمہ سے مطابقت ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مکہ کی حرمت ابراہیم علیہ السلام کی زبان پر ہوئی اور بعض نے کہا ہے کہ جب سے زمین پیدا ہوئی، تب ہی سے یہ حرمت بھی ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہی زیادہ ظاہر اور قوی بات ہے۔ احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی پیدایش سے قبل ہی مکے کو حرام کر دیا تھا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو اس دن حرام کیا تھا جس دن آسمان و زمین پیدا کیے، لہٰذا یہ اللہ کے حرام کرنے کی وجہ سے قیامت تک حرام رہے گا۔[3] (رواہ مسلم)

ابو شریح عدوی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دوسرے دن کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد یہ فرمایا تھا کہ مکہ کو اللہ نے حرام کیا ہے، لوگوں نے حرام نہیں کیا۔ کسی شخص کے لیے، جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے، حلال نہیں کہ وہاں خون بہائے یا درخت کاٹے اور اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قتال کرنے کے لیے دی گئی رخصت سے حجت پکڑے تو تم اس کو یہ کہہ دو کہ اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت دی تھی، تمھیں تو نہیں دی ہے۔ وہ اجازت بھی دن کی ایک گھڑی کے لیے دی تھی، پھر اس کی حرمت اسی طرح ہوگئی، جس طرح پہلے تھی۔ چاہیے کہ حاضر آدمی یہ بات غائب کو پہنچا دے۔ یہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔[4]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٦٠)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٧٤)
[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٥٣) تفسير ابن كثير (١/ ٢٢٩)
[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٥٤)

معلوم ہوا کہ اس جگہ کی حرمت ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کرنے سے پہلے کی ہے، جس طرح محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پہلے سے خاتم النبیین لکھے ہوئے تھے، حالاں کہ آدم ہنوز مٹی کے پتلے تھے۔ اس کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا بھی کی تھی کہ اے رب! ان میں ایک رسول انہی میں سے اٹھا۔ اللہ نے اپنے سابق علم و قدرت کے مطابق اس دعا کو قبول فرمایا، اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ جب آپ ﷺ سے کہا گیا کہ اپنے ابتدائے امر کے بارے میں بتائیں؟ تو فرمایا کہ میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی بشارت ہوں۔ میری ماں نے دیکھا کہ اس سے ایک نور نکلا، جس سے شام کے محلات چمک اُٹھے۔[1]

پیغامِ خدا نخست آدم آورد انجام بشارت ابن مریم آورد
با جملہ رسل نامۂ بے خاتم بود احمد برما نامۂ خاتم آورد

”سب سے پہلے اللہ کا پیغام آدم لائے، آخر کار عیسیٰ آپ ﷺ کی خوش خبری لائے، تمام رسول بغیر مہر کے کھلا خط لائے، احمد ﷺ ہمارے لیے مہر زدہ خط لائے۔“

مکہ افضل ہے کہ مدینہ؟

رہی یہ بات کہ مکہ افضل ہے یا مدینہ؟ تو جمہور کے نزدیک مکہ افضل ہے، جب کہ مالک رحمہ اللہ اور مالکیہ کے نزدیک مدینہ افضل ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم دوسری جگہ دلیلوں کے ساتھ اس کا ذکر کریں گے۔[2] میں کہتا ہوں کہ ایسے مسائل میں سرے سے غور کرنا ہی بے فائدہ ہے، کیوں کہ حرمین شریفین کے فضائل جدا جدا آئے ہیں۔ جو جس کی فضیلت ہے، وہ بجائے خود ثابت ہے۔ ایک کی دوسرے پر فضیلت کے بارے میں کوئی مرفوع حدیث نہیں آئی ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ مکہ معظّمہ میں اگر اللہ کا گھر ہے تو مدینہ میں اللہ کے رسول کا گھر ہے۔ سب سے بڑا اللہ ہے، پھر رسول اللہ ﷺ ہیں۔

زہے سعادتِ آن بندہ کہ کرد نزول گہے بہ بیتِ خدا و گہے بہ بیتِ رسول

”اس شخص کی نیک بختی کے کیا کہنے جو کبھی تو خانۂ کعبہ میں اور کبھی خانۂ رسول ﷺ میں قدم رنجہ فرماتا ہے۔“

مدینہ کو رسول اللہ ﷺ نے مکہ کے برابر حرم محترم ٹھہرایا، بلکہ اس سے دُگنا بتایا۔ ہمارے لیے اس حکم کو ماننا واجب ہے۔ اسی طرح اپنی مسجد کا ذکر مسجدِ مکہ اور بیت المقدس کے ساتھ کیا اور ہر ایک کی فضیلت بیان فرمائی۔ ہمیں چاہیے کہ ہم فضیلتِ مذکورہ کو نگاہ میں رکھیں اور حج و عمرے کے بعد مکہ معظّمہ سے مسجدِ نبوی کا سفر کریں۔ وہاں پہنچ کر مسجدِ نبوی کی زیارت سے مشرف ہوں۔ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا.

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٢٦٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٥٤٦)
[2] تفسير ابن كثير (١/ ٢٣٠)

امن کے لیے دعا:

ابراہیم علیہ السلام کا یہ کہنا کہ اے رب! اس شہر کو امن والا کر دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کو خوف اور رُعب سے محفوظ رکھ، چناں چہ اللہ تعالیٰ نے شرعاً و قدراً یوں ہی کیا۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ﴾ [آل عمران: ٩٧] ''اور جو اس میں داخل ہو جائے، وہ امن والا ہو جاتا ہے۔'' نیز اس کا فرمان ہے: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ﴾ [العنكبوت: ٦٧] ''کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ بے شک ہم نے حرم (مکہ) کو پُرامن بنایا ہے، جبکہ لوگ اس کے اِردگرد سے اُچک لیے جاتے ہیں۔'' حرمتِ قتال کی حدیثیں اوپر گزر چکی ہیں۔ صحیح مسلم میں جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ کسی شخص کے لیے حلال نہیں کہ مکہ میں ہتھیار اُٹھائے۔[1] یعنی اس لیے کہ یہ کام امن کے خلاف ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے مکہ کو اَمن والا ٹھہرایا ہے۔ یہاں کوئی ایسا کام کرنا حرام ہے، جس سے مکہ اور اہلِ مکہ کو خوف اور دہشت دامن گیر ہو۔

اس سورت میں یوں فرمایا ہے: ﴿ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا ﴾ [البقرة: ١٢٦] ''اے میرے رب! اس (جگہ) کو امن والا شہر بنا۔'' بلد سے مراد جگہ یا بقعہ ہے، یعنی اس خطے کو با اَمن رکھنا۔ یہاں یہی مناسب ہے، کیوں کہ یہ دعا بنائے کعبہ سے پہلے تھی۔ سورت ابراہیم میں یوں ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا ﴾ [إبراهيم: ٣٥] ''اور جب ابراہیم نے کہا: اے میرے رب! اس شہر (مکہ) کو امن والا بنا دے۔'' وہاں یہی مناسب ہے، کیوں کہ یہ دعا دوسری بار تعمیرِ کعبہ کے بعد اور اہلِ مکہ کے استقرار کے لیے تھی، جبکہ اسحاق علیہ السلام پیدا ہو چکے تھے۔ وہ اسماعیل سے تیرہ برس چھوٹے تھے، اسی لیے دعا کے آخر میں یوں کہا ہے: ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَسَمِيْعُ الدُّعَاۗءِ ۝ ﴾ [إبراهيم: ٣٩] ''تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے، بے شک میرا رب دعا خوب سننے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ منکروں کو بھی نوازتا ہے:

سیدنا اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ لفظ: ﴿ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ﴾ (زیرِ تفسیر آیت) اللہ پاک کا قول ہے۔[2] یہی بات مجاہد و عکرمہ رحمہما اللہ نے کہی ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو صحیح ٹھہرایا ہے،[3] جب کہ ان کے علاوہ دوسروں نے کہا ہے کہ یہ تمام ابراہیم علیہ السلام ہی کی دعا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اسی طرف گئے ہیں اور کہا ہے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کا قول ہے اور وہ اللہ سے یہ سوال کر رہے ہیں کہ جو کوئی منکر ہو، اس کو بھی کچھ فائدہ دے۔[4]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٥٦) [2] تفسير الطبري (٣/ ٥٣) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٣٠) اس کی سند حسن ہے۔
[3] تفسير الطبري (٣/ ٥٤) تفسير ابن كثير (١/ ٢٣٠) [4] تفسير الطبري (٣/ ٥٤) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٣٠) اس کی سند حسن ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس دعا کو مومنین ہی پر ختم کیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں، جو کوئی کافر ہو، میں اس کو بھی رزق دوں گا۔ اللہ پاک نے کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں ایک مخلوق پیدا کروں اور اس کو رزق نہ دوں۔ تھوڑے دن فائدہ دوں گا، پھر اس کو آگ کے عذاب میں مبتلا کروں گا۔

پھر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ آیت پڑھی: ﴿ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝ ﴾ [بني إسرائيل: ٢٠] ''ہم ہر ایک کو آپ کے رب کی عطا سے نوازتے ہیں، اُن کو بھی اور اِن کو بھی، اور تیرے رب کی عطا (کسی سے) روکی ہوئی نہیں۔'' یہی بات عکرمہ اور مجاہد رحمہ اللہ سے بھی مروی ہے۔[1]

یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۝ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝ ﴾ [يونس: ٦٩۔ ٧٠] ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: بلاشبہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، وہ فلاح نہیں پائیں گے۔ دنیا میں تھوڑا سا فائدہ اُٹھانا ہے، پھر انھیں ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، پھر ان کے کفر کرنے کی وجہ سے ہم انھیں شدید عذاب (کا مزہ) چکھائیں گے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ۚ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝ ﴾ [لقمان: ٢٣۔ ٢٤] ''اور (اے نبی!) جس کسی نے کفر کیا تو اس کا کفر آپ کو غم میں نہ ڈالے، (بالآخر) ہماری ہی طرف ان کی واپسی ہے، چناں چہ ہم انھیں بتائیں گے جو کچھ انھوں نے کیا ہوگا، بے شک اللہ سینوں کے راز خوب جانتا ہے۔ ہم انھیں تھوڑا سا فائدہ دیتے ہیں، پھر ہم انھیں سخت عذاب کی طرف مجبور کر دیں گے۔''

نیز اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ۝ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ۝ وَزُخْرُفًا ۚ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ ﴾ [الزخرف: ٣٣۔ ٣٥] ''اور اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تمام لوگ ایک ہی گروہ (کافر) ہو جائیں گے تو ہم ان لوگوں کے لیے جو رحمٰن کے ساتھ کفر کرتے ہیں، ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے اور سیڑھیاں بھی، جن پر وہ چڑھتے۔ اور اُن کے گھروں کے دروازے اور تخت بھی (چاندی کے بنا دیتے) جن پر وہ تکیے لگا کر بیٹھتے۔ اور سونے کے بھی، اور یہ سب کچھ تو بس دنیاوی زندگی کا سازو سامان ہے اور آخرت آپ کے رب کے نزدیک متقین کے لیے ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ ﴾ [آل عمران: ١٩٦۔ ١٩٧]

---

[1] المعجم الكبير (١٢/ ٣٨) تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٣١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه الطبراني و رجاله رجال الصحيح" مجمع الزوائد (٧/ ٢٨)

''جن لوگوں نے کفر کیا، ان کا شہروں میں چلنا پھرنا آپ کو دھوکے میں نہ ڈال دے۔ یہ تھوڑا سا فائدہ ہے، پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔''

یہ ارشاد کہ ''پھر ہم اس کو قید کر کے بلائیں گے، اس کو عذاب دوزخ اور بری جگہ کی طرف بلائیں گے۔'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب کافر نے دنیا میں چند روز فائدہ اُٹھا لیا تو اب چار و ناچار اس کو آگ کا عذاب بھگتنا پڑے گا، یعنی ان کو تھوڑی مدت تک مہلت و تاخیر دیتا ہے، پھر اچانک انھیں سخت گرفت میں لے لے گا، جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَكَاَيِّنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اَمۡلَيۡتُ لَهَا وَهِىَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذۡتُهَا ۚ وَاِلَىَّ الۡمَصِيۡرُ ﴾ [الحج: ٤٨] ''اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ میں نے انھیں ڈھیل دی جب کہ وہ ظالم تھیں، پھر میں نے انھیں پکڑ لیا اور میری ہی طرف (سب کی) واپسی ہے۔'' صحیحین میں ہے کہ اللہ سے زیادہ ایذا پر صبر کرنے والا کوئی نہیں، وہ تو اللہ کی اولاد ٹھہراتے ہیں اور اللہ ان کو روزی اور تندرستی دیے جاتا ہے۔[1] یہ بھی صحیح میں آیا ہے کہ اللہ ظالم کو مہلت دیتا ہے، یہاں تک کہ جب پکڑ لیتا ہے تو پھر نہیں چھوڑتا، پھر یہ آیتِ شریفہ پڑھی: ﴿ وَكَذٰلِكَ اَخۡذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الۡقُرٰى وَهِىَ ظٰلِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخۡذَهٗۤ اَلِيۡمٌ شَدِيۡدٌ ﴾ [هود: ١٠٢] ''اور (اے نبی!) آپ کے رب کی پکڑ ایسی ہی ہے، جب وہ بستیوں کو پکڑتا ہے، جب کہ وہ ظالم ہوتی ہیں۔ بے شک اس کی پکڑ نہایت دردناک (اور) شدید ہے۔''[2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے اس آیت کو ابراہیم علیہ السلام کی پوری دعا قرار دیا ہے، اس نے ﴿ قَالَ ﴾ کی ضمیر کو ان کی طرف لوٹایا ہے، لیکن یہ قراءت ساتوں قراءتوں کے خلاف ہے۔ آیت کے سیاق کی ترکیب بھی اس کے برعکس ہے اور یہ فصاحتِ کلام کے بھی مخالف ہے۔[3] واللہ أعلم.

بنیادیں اُٹھاتے وقت قبولیت کی دعا:

''قواعد'' یہ قاعدہ کی جمع ہے۔ قاعدہ کہتے ہیں: ستون اور بنیاد کو۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ تم اپنی قوم کو یاد دلاؤ کہ جب ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے اس گھر کی بنیاد ڈالی تھی یا اس کے ستون کھڑے کیے تھے تو اس وقت اللہ سے دعا کی تھی کہ تو اس عمل کو ہم سے قبول فرما۔ قرطبی رحمہ اللہ وغیرہ نے سیدنا اُبی اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے بیان کیا ہے کہ وہ اس آیت کو یوں پڑھتے تھے: ''وَيَقُوْلَانِ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْم'' ''وہ دونوں دعا کرتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار! قبول کر ہم سے تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کا یہ قول اس کے بعد: ﴿ رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبۡ عَلَيۡنَا ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴾ [البقرة: ١٢٨] ''اے ہمارے رب! اور ہم دونوں کو اپنا فرماں بردار بنا اور ہماری اولاد میں سے ایک جماعت کو بھی اپنا فرماں بردار (بنا) اور ہمیں

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٠٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٣)

[3] تفسير ابن كثير (١/ ٢٣١)

ہماری عبادت کے طریقے سکھا اور ہم پر توجہ فرما، بے شک تو ہی بہت توبہ قبول کرنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔'' اس بات پر دلیل ہے کہ وہ دونوں بزرگ اس عملِ صالح میں مشغول تھے اور اللہ تعالیٰ سے اس نیک عمل کی قبولیت کا سوال کر رہے تھے۔[1] وہیب بن ورد رحمہ اللہ جب اس آیت کو پڑھتے تو روتے اور کہتے: اے خلیل الرحمٰن! تم رحمٰن کا گھر بناتے ہو اور عدمِ قبولیت سے ڈر رہے ہو![2] یہ ویسی بات ہے، جیسے اللہ نے مومنین مخلصین کا حال ذکر کیا ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ ﴾ [المؤمنون: ٦٠] ''اور جو لوگ (اللہ کی راہ میں) دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں، تو اس طرح کہ ان کے دل خوف زدہ ہوتے ہیں۔'' یعنی صدقات، نفقات اور قربات دیتے ہیں، مگر دل اس بات سے خوف زدہ ہو رہے ہیں کہ کہیں یہ ان کا نیک کام مسترد نہ ہو جائے۔ اس بارے میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک صحیح حدیث بھی آئی ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ قواعد (بنیادوں کو) اُٹھانے والے ابراہیم علیہ السلام تھے اور دعا کرنے والے اسماعیل علیہ السلام تھے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ دونوں ہی اُٹھانے والے اور دعا کرنے والے تھے۔

اسماعیل کو بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑنا:

بخاری شریف میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اسماعیل علیہ السلام کی والدہ ہاجرہ علیہا السلام کو شیر خوار بچے اسماعیل علیہ السلام کے ہمراہ لائے اور کعبہ کے پاس آبِ زم زم کے نزدیک مسجدِ حرام کے بلند حصے کے پاس ایک درخت کے نیچے ان کو چھوڑ دیا۔ اس وقت مکہ میں نہ کوئی آبادی تھی نہ پانی۔ انھوں نے تھیلی میں کچھ کھجوریں اور ایک مشک میں کچھ پانی رکھ دیا اور واپس چلے گئے۔ اسماعیل علیہ السلام کی ماں ان کے پیچھے چلیں اور کہا: اے ابراہیم! تم کہاں جا رہے ہو، ہمیں اس جنگل میں چھوڑ کر جا رہے ہو، جہاں نہ کوئی ہمدرد ہے اور نہ کوئی چیز؟ کئی بار یہی بات کہی۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بالکل توجہ نہ کی۔ آخر یہ کہا کہ کیا اللہ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے؟ کہا کہ ہاں، کہا تو اب وہ ہم کو ضائع نہ کرے گا۔ یہ کہہ کر لوٹ آئیں۔

ابراہیم علیہ السلام جب گھاٹی کے نزدیک پہنچے، جہاں کوئی ان کو نہ دیکھے تو گھر کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ اُٹھا کر یہ دعائیں مانگیں: ﴿ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴾ [إبراهيم: ٣٧] ''اے ہمارے رب! بے شک میں نے اپنی کچھ اولاد ایک بے زراعت وادی میں بسائی ہے، تیرے محترم گھر (کعبے) کے پاس، اے ہمارے رب! تاکہ وہ نماز قائم کریں، چناں چہ تو بعض لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہونے والے کر دے اور انھیں ہر قسم کے پھلوں سے رزق دے، تاکہ وہ (تیرا) شکر کریں۔''

---

[1] تفسير القرطبي (٢/ ١٢٦) تفسير ابن كثير (١/ ٢٣١)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٣٣)
[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٧٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٩٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٦٢)

زم زم کا پھوٹنا:

اسماعیل کی ماں اسماعیل کو دودھ پلاتیں اور خود پانی پیتیں۔ جب پانی ختم ہو گیا تو آپ بھی پیاسی ہوئیں اور بچہ بھی پیاسا ہوا، سو دیکھا کہ اس کی زبان خشک ہوئی جاتی ہے، ان سے رہا نہ گیا، صفا کا پہاڑ زیادہ قریب تھا، اس پر کھڑے ہو کر جنگل کی طرف منہ کیا کہ کوئی نظر آئے، کسی کو نہ دیکھا، جب وہاں سے اُتر کر وادی میں پہنچیں تو قمیص کا دامن اُٹھا کر خوب تیز آدمی کی طرح دوڑیں اور وادی سے آگے بڑھ کر مروہ کے اوپر کھڑے ہو کر دیکھا کہ کوئی نظر آئے، مگر کوئی نظر نہ آیا۔ سات بار یہی کام کیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسی لیے لوگ ان دونوں پہاڑوں کے بیچ میں دوڑتے ہیں۔

جب مروہ پر چڑھ گئیں تو ایک آواز سنی، اپنے جی سے کہا: ٹھہر جا، پھر دوبارہ سنی، کہا: اے آواز والے! تیرے پاس کچھ فریاد رسی ہے؟ دیکھا تو زم زم کی جگہ پر ایک فرشتہ ہے، اس نے اپنی ایڑی لگائی یا بازو سے کریدا تو وہاں سے پانی نکلا۔ یہ اس کو حوض کی طرح روکنے لگیں اور ہاتھ سے سمیٹنے لگیں۔ نیز اپنی مشک میں چلو بھر بھر کے ڈالنے لگیں۔ وہ اسی طرح جوش مار رہا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ رحم کرے اُمِ اسماعیل پر! اگر وہ زم زم کو چھوڑ دیتیں یا یوں فرمایا کہ چلو بھر بھر کر پانی نہ لیتیں تو یہ زم زم ایک صاف پانی کا چشمہ ہو جاتا۔ غرضیکہ انھوں نے پانی پیا اور اپنے بچے کو دودھ پلایا۔ فرشتے نے ان سے کہا کہ تو ضائع ہونے کا خوف نہ کر، اس جگہ اللہ کا ایک گھر ہوگا، جس کو یہ بچہ اور اس کا باپ بنائے گا، اللہ اس گھر والوں کو ضائع نہیں کرے گا۔ یہ گھر زمین سے ایک ٹیلے کی مانند اونچا تھا۔ وہاں سیلاب آتے تو دائیں بائیں نکل جاتے۔ وہ جگہ یوں ہی رہی۔

بنو جرہم کا ورود اور سکونت:

یہاں تک کہ وہاں جرہم کی ایک جماعت یا جرہم کے ایک گھرانے کا گزر ہوا۔ وہ کدا کے راستے سے اُدھر آئے اور مکہ کے نچلے حصے میں اُترے۔ ایک پرندہ اُڑتا ہوا دیکھا تو کہا یہ پانی کے گرد چکر لگاتا ہے۔ ہم تو اس جنگل میں بارہا آئے، لیکن کبھی پانی نہیں دیکھا۔ کسی کو بھیجا دیکھا تو پانی موجود ہے۔ وہ پانی پر آئے۔ وہاں اسماعیل کی ماں موجود تھیں۔ انھوں نے کہا کہ تم ہمیں اجازت دیتی ہو کہ ہم تمھارے پاس اُتریں؟ کہا کہ ہاں، لیکن اس پانی میں تمھارا کچھ حقِ ملکیت نہیں۔ کہا: بہتر ہے۔

اسماعیل کی بنو جرہم میں شادی، طلاق اور شادی:

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسماعیل کی ماں کوئی ہمسایہ چاہتی تھیں۔ وہ لوگ وہاں اُتر پڑے، اپنے گھر والوں کو بھی بلا بھیجا، جب کئی گھر والے جمع ہو گئے اور اُدھر یہ بچہ بھی جوان ہو گیا اور اُن سے

عربی زبان سیکھ لی اور اُن کو بہت پسند آیا تو جوان ہونے کے بعد ایک عورت سے نکاح کر دیا۔ اس دوران میں اُمِ اسماعیل کا انتقال ہوگیا۔ اسماعیل علیہ السلام کی شادی کے بعد ابراہیم علیہ السلام آئے، تاکہ بیوی بچے کو دیکھیں۔ اسماعیل موجود نہ تھے۔ ان کی بیوی سے ان کا حال پوچھا تو اس نے کہا کہ باہر ہمارے لیے کچھ لینے کو گئے ہیں۔ گزر اوقات کا حال پوچھا کہ کس طرح بسر ہوتی ہے؟ کہا کہ ہم نہایت تنگی ترشی میں ہیں۔

اس عورت نے گزران کی شکایت کی۔ فرمایا کہ جب تیرا شوہر آئے تو میرا اس کو سلام کہنا اور یہ بھی کہنا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل دے۔ جب اسماعیل علیہ السلام آئے تو ان کو کسی کے آنے کا احساس ہوا تو پوچھا: تمھارے پاس کوئی آیا تھا؟ کہا کہ ہاں ایک بوڑھا اس شکل کا آیا تھا، اس نے ہم سے تمھارا حال پوچھا۔ ہم نے بتا دیا، پھر ہم سے گزر اوقات کا دریافت کیا۔ ہم نے یہ کہا کہ ہم بڑی تنگی ترشی میں ہیں۔ کہا کہ تجھے کوئی وصیت کر گئے ہیں؟ کہا کہ ہاں تم کو سلام کہہ گئے ہیں اور یہ بات کہ تم اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل دو۔ کہا کہ وہ میرے باپ تھے اور مجھے حکم دے گئے ہیں کہ میں تجھ کو جدا کر دوں، لہٰذا تو اپنے گھر والوں کے پاس چلی جا۔ انھوں نے اسے طلاق دے دی اور قبیلہ جرہم کی دوسری عورت سے نکاح کر لیا۔

ابراہیم علیہ السلام جب تک کہ اللہ نے چاہا، اپنے (بیٹے کی) بیوی اور بچے کے پاس نہ آئے۔ ایک دن پھر اُن کے پاس آئے اور اسماعیل علیہ السلام کو نہ پایا۔ ان کی بیوی سے ان کا حال دریافت کیا۔ بیوی نے کہا کہ ہمارے لیے کچھ لینے گئے ہیں۔ کہا: تم کیسے ہو، تمھاری گزران کیسے ہوتی ہے؟ اس نے کہا کہ ہم خیر و عافیت سے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ تمھارا کھانا پینا کیا ہے؟ اس نے کہا: گوشت کھاتے ہیں اور پانی پیتے ہیں۔ فرمایا کہ اے اللہ! ان کے گوشت اور پانی میں برکت دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس دن کوئی غلہ ان کے پاس نہ تھا، ورنہ اسی کے لیے دعا کرتے اور کہا کہ یہ دونوں چیزیں مکہ کے علاوہ نہ تو کسی کو کفایت کرتی ہیں اور نہ موافق پڑتی ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ جب تیرا خاوند آئے تو اس سے میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ تم اپنے گھر کی چوکھٹ قائم رکھو۔ جب اسماعیل علیہ السلام آئے اور پوچھا کہ تمھارے پاس کوئی شخص آیا تھا؟ کہا کہ ہاں ایک اچھی شکل کا بوڑھا شخص آیا تھا۔ اس عورت نے ان کی تعریف و توصیف بیان کی۔ کہا کہ تمھارا حال دریافت کیا، پھر پوچھا تھا کہ تمھاری گزر اُوقات کس طرح ہوتی ہے؟ میں نے کہا کہ بہت اچھی ہو رہی ہے۔ پوچھا: کیا کچھ کہہ گئے ہیں؟ کہا: ہاں، یہ کہا ہے کہ تمھیں سلام کہوں اور یہ کہ تم اپنے گھر کی چوکھٹ ثابت رکھو۔ کہا کہ وہ میرے باپ تھے اور تو میرے گھر کی چوکھٹ ہے۔ وہ یہ حکم دے گئے ہیں کہ تجھ کو اپنے پاس رکھوں۔

بیت اللہ کی تعمیر اور ابراہیم علیہ السلام کی واپسی:

پھر ابراہیم علیہ السلام چند روز تک جب تک کہ اللہ نے چاہا نہ آئے، پھر آئے تو دیکھا کہ اسماعیل علیہ السلام بیٹھے، اس درخت کے نیچے جو زم زم کے پاس تھا، تیر بنا رہے ہیں۔ جب باپ کو دیکھا تو کھڑے ہوگئے اور جو کام باپ بیٹے سے اور بیٹا باپ سے کرتا ہے، وہ کیا، یعنی ادب و تعظیم سے پیش آئے، فرمایا: اے اسماعیل! اللہ نے مجھے ایک کام کا حکم دیا ہے۔ کہا کہ جو حکم آپ کو دیا ہے، وہ کریں۔ فرمایا: کیا تو میری مدد کرے گا؟ کہا کہ ہاں، فرمایا کہ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس جگہ ایک گھر بناؤں۔ ایک اُونچے ٹیلے کی طرف اشارہ کیا۔ اس وقت ان دونوں نے گھر کی بنیاد اونچی کی۔ اسماعیل علیہ السلام پتھر لاتے اور ابراہیم علیہ السلام گھر بناتے۔ جب بنیاد اونچی ہو چکی تو اس پتھر کو لاکر رکھا اور ابراہیم علیہ السلام اس پر کھڑے ہو کر گھر بناتے رہے، اسماعیل علیہ السلام پتھر اُٹھا اُٹھا کر دیتے جاتے تھے۔ دونوں بزرگ یہ کہتے جاتے تھے: ﴿ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ ۖ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴾ [البقرة: ١٢٧] ''اے ہمارے رب! تو ہم سے (یہ نیکی) قبول کر لے، بے شک تو ہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔'' غرض کہ اس تعمیر کے وقت گھر کے گرد پھرتے اور یہ دعا کرتے رہتے۔[1]

امام عبدالرزاق نے اس حدیث کو تفصیل کے ساتھ اور ابن ابی حاتم و ابن جریر رحمہم اللہ نے اختصار کے ساتھ روایت کیا ہے۔[2] امام ابن مردویہ رحمہ اللہ بھی اس کے ناقل ہیں، پھر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس حدیث کو بخاری شریف سے دوسرے طریق سے روایت کر کے یہ کہا ہے کہ بخاری نے اس کو "كتاب الأنبياء" میں ان دو اسانید سے روایت کیا ہے۔[3] امام حاکم رحمہ اللہ پر بڑا تعجب ہے کہ اس نے اس حدیث کو مستدرک میں روایت کر کے یہ کہا ہے کہ "صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه" ''یہ صحیح ہے اور بخاری و مسلم کی شرط پر ہے، لیکن انھوں نے اسے روایت نہیں کیا۔''[4] حالاں کہ بخاری نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ ہاں اس میں اختصار کی وجہ سے ذبح کا ذکر نہیں آیا، اگرچہ صحیح میں دوسری جگہ آیا ہے کہ اس مینڈھے کے سینگ کعبہ میں لٹکے تھے۔[5] یہ بھی آیا ہے کہ ابراہیم اپنے اہل کو دیکھنے ملنے کے لیے براق پر تیز رفتاری سے آتے جاتے تھے، پھر بلادِ مقدسہ کو لوٹ جاتے۔[6] واللہ أعلم.

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بیت اللہ کی تعمیر کا جو قصہ اپنی سند سے سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے،[7] اس سے یہ

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٨٤)

② مصنف عبد الرزاق (٥/ ١٠٥) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٣٢) تفسير الطبري (٣/ ٦٧)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٨٤، ٣١٨٥)

④ مستدرك الحاكم (٢/ ٦٠١)

⑤ یہ روایت مسند احمد (٤/ ٦٨) میں صحیح سند سے مروی ہے۔

⑥ تفسير ابن كثير (١/ ٢٣٤)

⑦ تفسير الطبري (٣/ ٦٨)

بات نکلتی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ ہاجر و اسماعیل کی جدائی سے پہلے بنایا تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ اس جگہ احاطہ اور حجرہ تعمیر کر رکھا ہو اور جب اسماعیل بڑے ہوئے تو پھر مل کر وہاں گھر بنایا، جیسے اللہ نے فرمایا۔ پھر امام سدی رحمہ اللہ سے بیت اللہ کی تعمیر کا قصہ روایت کر کے یہ کہا ہے کہ اس ترتیب سے یہ نکلتا ہے کہ گھر کی بنیادیں ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کی بنی ہوئی تھیں، فقط اتنی بات ہوئی کہ اللہ نے ان کو یہ جگہ بتا دی۔ بہت سے لوگ اس طرف گئے ہیں، جیسے: سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔[1]

بیت اللہ کی تعمیر کی تاریخ:

عطا بن ابی رباح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلے اس گھر کو آدم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ حجرِ اسود جنت کا ایک یاقوت ہے، پھر اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ سے اس گھر کی ترمیم کرائی۔[2] اس بارے میں کئی روایات آئی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ نے دنیا کی پیدائش سے دو ہزار برس پہلے اس گھر کو چار ستونوں پر پانی کے اوپر رکھا تھا، پھر زمین کو گھر کے نیچے سے پھیلایا۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس گھر کے ستون ساتویں زمین میں ہیں۔[3] ازرقی رحمہ اللہ نے اپنی تاریخِ مکہ معظّمہ میں ذکر کیا ہے کہ ذوالقرنین نے ابراہیم علیہ السلام کے ہمراہ طواف کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کا زمانہ بہت پہلے کا ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو نہیں دیکھتی کہ تیری قوم نے جب اس گھر کو بنایا تو ابراہیم علیہ السلام کی مقرر کردہ بنیادوں سے گھٹا دیا۔ انھوں نے کہا کہ پھر آپ ویسا ہی کیوں نہیں کر دیتے؟ فرمایا کہ اگر تیری قوم کفر سے قریب نہ ہوتی تو مَیں اس کو ویسا ہی بنا دیتا۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں خیال کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجرِ اسود سے متصل دونوں رکن کا استلام شاید اسی لیے چھوڑ دیا تھا کہ بیت اللہ ابراہیم علیہ السلام کی مقرر کردہ بنیادوں پر مکمل نہ ہوا۔[4] (رواہ البخاري و مسلم)
سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ الفاظ مروی ہیں کہ اگر تیری قوم عہدِ جاہلیت و کفر سے تازہ تازہ اسلام میں نہ آئی ہوتی تو مَیں کعبہ کا خزانہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتا اور اس کا دروازہ زمین پر رکھتا اور حطیم کو اس میں داخل کر دیتا۔[5] بخاری میں آیا ہے کہ پھر عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ عنہما نے اسی حدیث کی بنیاد پر کعبہ کے دو دروازے بنائے، ایک اندر جانے کا دوسرا باہر نکلنے کا۔[6]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث کو کئی طریق سے نقل کیا ہے۔ اس کے بعد قریش کا کعبے کو ابراہیم علیہ السلام کے بعد تعمیر کرنے کا ذکر کیا اور کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے مدت دراز کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پانچ برس پہلے انھوں نے کعبہ کو تعمیر کیا۔ ان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی پینتیس سال کی عمر میں پتھر منتقل

---

(1) تفسیر الطبري (۳/ ۵۸) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۳۵۔ ۲۳۶) (2) تفسیر الطبري (۳/ ۵۷۔ ۵۸)
(3) تفسیر الطبري (۳/ ۶۱۔ ۶۳) (4) صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۵۰۶) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۳۳۳)
(5) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۳۳۳) (6) صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۲۶)

کرتے تھے، پھر حجرِ اسود کو ایک کپڑے میں رکھ کر ہر قبیلے نے اٹھایا۔ جب اس کی جگہ پر اُسے پہنچایا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے اس کو جما دیا۔

ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عہدِ نبوی میں کعبہ اٹھارہ گز تھا، اس کو قباطی (مصری چادر) پہنائی گئی۔ سب سے پہلے دیباج (ریشم) حجاج بن یوسف نے پہنایا، پھر ساٹھ (۶۰) ہجری کے بعد ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی امارت کے شروع میں قریش کی بنیاد پر اور پھر یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کی ولایت کے اُخیر میں جب ابن زبیر رضی اللہ عنہما کا محاصرہ کیا گیا تو اس کی عمارت جل گئی۔ اس وقت ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے زمین تک توڑ کر ابراہیم علیہ السلام کی مقرر کردہ بنیادوں پر بنایا اور حطیم کو کعبے میں داخل کیا اور مشرق و مغرب کی جانب دو دروازے رکھے۔ جس طرح کہ اپنی خالہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سنا تھا، ویسا بنا دیا۔ جب تک وہ امیر رہے، کعبہ بھی اسی صورت پر رہا۔ جب حجاج نے ان کو قتل کیا تو پھر کعبہ کو عبدالملک بن مروان کے حکم سے اسی پہلی وضع پر بنا دیا۔ اس قصے کو مسلم و نسائی رحمہما اللہ نے ذکر کیا ہے۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سنت یہ تھی کہ جو کام ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے کیا تھا، اس کو برقرار رکھتے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ اسی کو پسند فرماتے تھے، لیکن اس ڈر سے کہ لوگ اسلام میں نئے ہیں اور کفر کے زمانے کے قریب ہیں، کہیں ان کے دل انکار نہ کر دیں، اس لیے اس کو موقوف رکھا۔ مگر یہ سنت عبدالملک پر پوشیدہ رہی، اسی لیے جب یہ بات اس کے سامنے واضح ہوگئی کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس حدیث کو رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے تو کہا: ”وَدِدْتُ أَنِّي تَرَكْتُهُ وَمَا تَحَمَّلَ“ ”کاش! میں اُنھیں (ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو) اور جس کام کی ذمے داری انھوں نے اٹھائی، اسے چھوڑ دیتا۔“[2] (رواہ مسلم) پھر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حدیثِ مذکور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بہت سے صحیح طریق سے ثابت ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے جو کام کیا تھا، وہ بالکل ٹھیک اور اچھا تھا۔ اگر کعبہ اسی شکل پر چھوڑ دیا جاتا تو بہت بہتر ہوتا، لیکن جب صورتِ حال قائم ہوگئی تو اب بعض علما کے نزدیک اس کا بدلنا مکروہ ہے۔

کہتے ہیں کہ ہارون الرشید نے امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا تھا کہ ہم کعبہ کو گرا کر ابن زبیر رضی اللہ عنہما کے فعل کے مطابق بنا دیں؟ مالک رحمہ اللہ نے کہا کہ اے امیر المومنین! تم کعبۃ اللہ کو بادشاہوں کا کھیل تماشا نہ بناؤ کہ جو کوئی چاہے، اسے گرا کر بناتا رہے۔ اس پر ہارون الرشید نے اس کو بنانے کا خیال چھوڑ دیا۔ اس بات کو قاضی عیاض اور نووی رحمہما اللہ نے ذکر کیا ہے۔[3]

قربِ قیامت میں کعبہ کو تباہ کیا جائے گا:

سو یہ گھر اسی طرح اخیر زمانے تک رہے گا، یہاں تک کہ دو سوکھی پنڈلیوں والا حبشی اس کو ڈھائے گا۔ جس

① صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٣٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٩٠١) تفسير ابن كثير (١/ ٢٣٨۔ ٢٤٠)

② صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٣٣) تفسير ابن كثير (١/ ٢٤٠۔ ٢٤١)

③ دیکھیں: شرح صحيح مسلم للنووي (٩/ ٨٩)

طرح کہ صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے: «يُخَرِّبُ الْكَعْبَةَ ذُو السُّوَيْقَتَيْنِ مِنَ الْحَبَشَةِ» یعنی کعبے کو دو سوکھی پنڈلیوں والا حبشی ڈھائے گا۔[1] یہ ماجرا یاجوج ماجوج کے نکلنے کے بعد ہوگا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ بخاری میں سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ ان کے خروج کے بعد بیت اللہ کا حج اور عمرہ نہ ہوگا۔[2]

مَیں کہتا ہوں کہ قسطلانی نے ذکر کیا ہے کہ کعبہ دس بار بنایا گیا ہے: ایک بار فرشتوں نے بنایا، دوسری بار آدم علیہ السلام نے، تیسری بار شیث علیہ السلام نے، یہ مٹی اور پتھر کا تھا اور طوفان میں ڈوب گیا تھا۔ چوتھی بار ابراہیم علیہ السلام نے، پانچویں بار عمالقہ نے۔ چھٹی بار جرہم نے، اس کا نام حارث بن مضاض تھا۔ ساتویں بار قصی نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پانچواں دادا تھا۔ آٹھویں بار قریش نے۔ نویں بار ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے اوائل ۶۴ھ میں اور دسویں بار حجاج نے بنایا تھا۔[3] سلیمان جمل نے کہا ہے کہ اس کے بعد ایک بادشاہ نے ۱۰۳۹ھ میں بنایا ہے۔[4]

امام رازی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ مسجد بنانا نیکی کا کام ہے اور نیک عمل کی قبولیت کی دعا مانگنا مستحب ہے۔ یہ دعا، کہ ہم کو مسلمان بنا، حج کے دستور سکھا، اس کا مطلب ہے کہ ہمیں اپنا فرماں بردار بنا، ہم تیری اطاعت اور عبادت میں کسی کو شریک نہ کریں۔ کسی نے کہا ہے کہ یعنی اپنا مخلص بنا اور کسی نے کہا کہ مسلمان تو وہ تھے، مگر ثابت قدم رہنا مانگا۔ عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے اس دعا پر فرمایا کہ میں نے ایسا ہی کیا۔[5]

ذریتِ ابراہیمی سے مراد:

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ ذریت سے مراد عرب ہیں۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ درست بات یہ ہے کہ ذریت عام ہے۔ عرب اور غیر عرب سب کو شامل ہے، اس لیے کہ بنی اسرائیل بھی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴾ [الأعراف: ۱۵۹] ”اور موسیٰ کی قوم میں سے ایک گروہ (ایسا) ہے جو حق کے ساتھ راہنمائی کرتے ہیں اور اسی (حق) کے ساتھ عدل کرتے ہیں۔“[6]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابن جریر رحمہ اللہ کا قول امام سدی رحمہ اللہ کے قول کی نفی نہیں کرتا، کیوں کہ عرب کی تخصیص، عرب کے علاوہ کی نفی نہیں ہے۔ آیت کا سیاق عرب ہی کے حق میں ہے، اسی لیے اس کے بعد عرب میں سے بعثتِ رسول کی دعا کی ہے۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جو عرب میں مبعوث ہوئے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾ [الجمعة: ۲] ”وہی ہے جس نے اَن پڑھوں میں ایک رسول بھیجا انھی میں سے۔“ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تمام بنی نوعِ انسان کی طرف ہونے کی نفی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۵۱٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۹۰۹)

[2] تفسير ابن كثير (۱/ ۲٤۱) صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۵۱٦) [3] إرشاد الساري للقسطلاني (۳/ ۱٤۳۔ ۱٤٤)

[4] حاشية الجمل على الجلالين (۱/ ۱۱٤) [5] تفسير ابن أبي حاتم (۱/ ۲۳٤) [6] تفسير الطبري (۳/ ۷٤)

نہیں ہے۔ ﴿ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ﴾ [الأعراف: ١٥٨] ''کہہ دیجیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔'' اس کے سوا اور بہت سی قطعی دلیلیں موجود ہیں۔

نیک اولاد کی دعا:

ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی یہ دعا ویسی ہی ہے، جیسے اللہ نے متقین کے متعلق خبر دی ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۝۷۴ ﴾ [الفرقان: ٧٤] ''اور وہ جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا کر اور ہمیں متقیوں کا امام بنا۔'' اتنی دعا شرعی لحاظ سے پسندیدہ ہے، کیوں کہ اللہ کی عبادت کی پوری محبت یہی ہے کہ یہ بات چاہے کہ اس کی پشت سے ایسے آدمی پیدا ہوں، جو اللہ وحدہ لا شریک لہ کی خالص اور خاص عبادت کریں۔ اسی لیے جب اللہ نے ابراہیم علیہ السلام سے یہ کہا تھا کہ میں تم کو سب لوگوں کا پیشوا کروں گا تو انھوں نے کہا کہ میری اولاد میں بھی کرنا۔ فرمایا: میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچتا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: ﴿ وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ۝۳۵ ﴾ [إبراهيم: ٣٥] ''اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچائے رکھنا۔''

نیک اولاد صدقہ جاریہ ہے:

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں ہے کہ جب آدمی مرجاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے، مگر تین کام جاری رہتے ہیں: ایک صدقۂ جاریہ، دوسرا علم جس سے نفع ہو، تیسری نیک اولاد، جو اس کے لیے دعا کرے۔[1]

مناسکِ حج:

حج کے طریقے سے مراد یہ ہے کہ جس قاعدے سے حج کیا جاتا ہے، وہ ہم کو سکھا دے۔ یہ عطاء رحمہ اللہ کا قول ہے۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی ہم کو ذبح کی جگہ بتا دے۔ قتادہ رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب ابراہیم علیہ السلام کو مناسک کا حکم ہوا اور سعی میں شیطان سامنے آیا تو یہ اس پر غلبہ حاصل کر گئے، پھر جبریل علیہ السلام ان کو لے کر منیٰ میں آئے اور کہا کہ یہ لوگوں کے مناخ (اونٹ بٹھانے) کی جگہ ہے۔ جب جمرۂ عقبہ کے پاس گئے تو پھر شیطان سامنے آیا۔ اس کو سات کنکریاں ماریں، پھر جمرۂ وسطیٰ پر آئے تو یہاں بھی وہ آگے آیا، پھر وہی سات کنکریاں ماریں، پھر جمرۂ قصویٰ پر آئے تو یہاں بھی شیطان سامنے آیا، اس کو سات کنکریاں ماریں، تب وہاں سے ہٹا۔ پھر جبریل علیہ السلام مزدلفہ پر ان کو لائے اور کہا کہ یہ مشعر ہے۔ پھر عرفات میں لائے اور کہا کہ یہ عرفہ ہے، پھر کہا کہ اب تو تم نے پہچان لیا۔ اس کو ابوداود طیالسی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔[3]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٣١) تفسير ابن كثير (١/ ٢٤٢)

[2] تفسير الطبري (٣/ ٧٨۔ ٧٩) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٣٤۔ ٢٣٥)

[3] مسند أبي داود الطيالسي (١/ ٣٥١) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٣٤۔ ٢٣٥) اس کی سند صحیح ہے۔

معلوم ہوا کہ آج ملتِ اسلام میں جو مناسکِ حج مقرر ہیں، یہ سب جبریل علیہ السلام کے سکھائے ہوئے ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے ابراہیم علیہ السلام کو سکھائے اور ابراہیم علیہ السلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اس امت میں آئے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

اے ہمارے رب! اور ان لوگوں کے لیے انھی میں سے ایک رسول بھیج، وہ ان کے سامنے تیری آیتیں تلاوت کرے، اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے، اور انھیں پاک کرے، بے شک تو ہی غالب، خوب حکمت والا ہے (129)

بعثتِ نبوی کے لیے دعائے خلیل:

اللہ پاک نے اس آیت میں ابراہیم علیہ السلام کی اہلِ حرم کے لیے باقی ماندہ دعا ذکر فرمائی ہے۔ وہ دعا یہ تھی کہ میری اولاد میں سے ایک رسول ان میں بھیج دے۔ ان کی یہ دعا اللہ تعالیٰ کی پہلے سے مقرر تقدیر کے موافق ہوگئی اور وہ تقدیر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اُمیوں، بلکہ سارے عجمیوں اور ساری مخلوقِ جن وانس کی طرف بھیجنے کے لیے تھی۔ جس طرح عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اللہ کے نزدیک اس وقت خاتم النبیین تھا کہ جب آدم ابھی مٹی کے پتلے ہی تھے۔ میں تم کو اس کام کی ابتدا بتا دوں کہ میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا، عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت اور اپنی ماں کا خواب ہوں۔ اسی طرح خواب سب پیغمبروں کی مائیں دیکھا کرتی تھیں۔[1] (رواه أحمد)

مراد یہ ہے کہ سب سے پہلے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں میں مشہور کیا اور آپ کا ذکر شریف کیا، وہ ابراہیم علیہ السلام ہیں، آپ کے ذکر شریف کی دھوم دھام لوگوں میں لگاتار لگی رہی۔

عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت:

یہاں تک کہ بنی اسرائیل کے آخری نبی عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں کھڑے ہوکر آپ کے نام مبارک کا یہ خطبہ پڑھا:

﴿ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ﴾ [الصف: ٦] ”بے شک میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس (کتاب) تورات کی جو مجھ سے پہلے ہے اور ایک رسول کی بشارت دینے والا ہوں، وہ میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا۔“

اسی لیے حدیثِ مذکور میں یہ فرمایا ہے کہ میں دعوتِ ابراہیم اور بشارتِ عیسیٰ ہوں۔ رہے آپ کی ماں کے

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١٢٧) علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آخری جملے کے علاوہ یہ روایت صحیح ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٠٨٥)

خواب، تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ خواب انھوں نے زمانۂ حمل میں دیکھے تھے اور ان کا ذکر اپنی قوم سے کیا تھا۔ اس دن سے سب میں آپ کی شہرت ہو گئی تھی اور آپ کی نبوت کی ایک تمہید قائم ہو گئی تھی۔ ملکِ شام کی تخصیص اس لیے ہے کہ شام میں آپ کی نبوت و دین کا استقرار ہوگا، اسی لیے آخر زمانے میں شام اسلام کی منڈی ٹھہرے گا۔ عیسیٰ علیہ السلام بھی وہیں دمشق کی مشرقی جانب میں سفید منار سے نازل ہوں گے۔[1] صحیحین میں مرفوعاً آیا ہے کہ اس اُمت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر غالب رہے گا۔ جو کوئی اس کا مددگار نہ ہوگا، وہ اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گا اور نہ کوئی اور مخالف، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آئے اور وہ گروہ اسی حال پر ہو۔[2] امام بخاری نے کہا ہے کہ یہ گروہ شام میں ہوگا۔ مَیں کہتا ہوں اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ گروہ شام ہی میں ہوا کرے گا اور کسی دوسری جگہ نہ ہوگا، بلکہ شام میں زیادہ واقع ہوگا، ورنہ زمین کے دوسرے کناروں میں بھی ایسے لوگ ہو چکے ہیں اور ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔

غلبۂ اسلام کی بشارت:

اس حدیث میں ایک اشارہ یہ بھی ہے کہ اسلام قیامت قائم ہونے تک رہے گا۔ ایسا نہیں ہوگا کہ کوئی مخالف یا دشمن اس کو روئے زمین سے مٹا دے، اگرچہ اسلام غربت ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو، بلکہ سب جگہ اسلام غریب بھی نہ ہوگا۔ ایک نہ ایک گروہ کو کسی جگہ شام یا کسی اور جگہ ایک طرح کا مکمل غلبہ رہے گا۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔ اس حدیث میں گروہ کا لفظ عام ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ فرقہ جو ہمیشہ حق پر غالب رہے گا، اس میں اہلِ علم اور اہلِ حکومت دونوں شامل ہوں گے۔ چناں چہ اسی سبب سے علمائے کتاب و سنت ہمیشہ اہلِ بدعت و رائے اور اصحابِ قیاس پر غالب رہتے ہیں۔ نیز جو بادشاہ اور سردار دین دار ہیں، وہ فاسقوں، فاجروں اور شر پسندوں پر غلبہ رکھتے ہیں۔

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا کی کہ رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوں تو ان سے کہہ دیا گیا کہ تمھاری یہ دعا قبول کی جاتی ہے۔ رسولِ مذکور آخر زمانے میں ہوگا۔ امام سدی و قتادہ رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

کتاب و حکمت کی تفسیر:

کتاب سے مراد قرآن ہے اور حکمت سے مراد سنت، یعنی حدیثِ رسول اللہ ﷺ ہے۔ حسن، قتادہ، مقاتل بن حیان اور ابو مالک وغیرہم رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ بلکہ حکمت سے دین کا فہم مراد ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان اقوال میں اختلاف نہیں۔[4] کسی نے حکمت سے حق و باطل کے درمیان تمیز کرنا مراد لیا ہے۔ ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد علم و عمل ہے۔ آدمی حکیم نہیں ہوتا، جب تک دونوں اس میں نہ ہوں۔ ابن درید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو بات تجھ کو نصیحت کرے، کسی اچھے کام کی طرف بلائے اور برے کام سے

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۹۳۷) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۶۴۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۹۲۰)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۳۶۔ ۲۳۷) [4] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۴۳)

روکے، وہی بات حکمت ہے۔[1]

مَیں کہتا ہوں کہ یہ سارے امور سنتِ مطہرہ میں موجود اور داخل ہیں۔ جس نے قرآن و حدیث کو پکڑا، وہی بڑا حکیم اور صاحبِ فہم وعمل ہوا۔ قرآن پاک میں جہاں کہیں حکمت کا لفظ آیا ہے، اس سے یہی سنت مراد ہے۔ قرآن شریف عمل بالسنہ کی خبر دیتا ہے اور سنت تمسک بالقرآن پر آمادہ کرتی ہے۔ دین کے اصول یہی دو چیزیں ہیں، ایک کتاب اللہ اور دوسری سنتِ رسول اللہ ﷺ۔ اجماع کا ثبوت نہایت ہی مشکل ہے، جب کہ قیاس کسی شرعی حجت کے بغیر نہ علم کہلانے کے قابل ہے اور نہ عمل کرنے کے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ پاک کرنے، سنوارنے سے اللہ کی فرماں برداری اور اخلاص مراد ہے۔[2] محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت کے یہ معنی ہیں کہ ان کو خیر سکھاتا ہے، تاکہ وہ اسے کریں اور شر کی خبر دیتا ہے، تاکہ اس سے بچیں اور انھیں اس بات کی خبر دیتا ہے کہ اگر وہ اس کی اطاعت کریں گے اور اُس کی نافرمانی سے دور رہیں گے تو اللہ اُن سے راضی ہوگا۔[3]

عزیز و حکیم کی شرح:

عزیز اس کو کہتے ہیں، جس کو کوئی چیز عاجز نہ کر سکے، وہ ہر چیز پر توانا ہو۔ حکیم اس کو کہتے ہیں جس کے قول و فعل میں پختگی ہو، اپنے علم و عدل سے ہر چیز کو اس کی جگہ میں رکھے۔ امام کسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عزیز، غالب کو اور حکیم، عالم کو کہتے ہیں۔[4] معلوم ہوا کہ حکیم وہ ہے جو سنتِ مطہرہ اور کتابِ عزیز کا عالم ہے نہ کہ وہ جو فنونِ یونان کا دانش مند ہے۔ حکمت بڑی قسمت والوں کو ملتی ہے۔ یہ ہر صاحبِ رائے و قیاس کو نہیں ملتی۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٣٠﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٣١﴾ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٣٢﴾ۭ

اور کون بے رغبتی کر سکتا ہے ملتِ ابراہیم سے سوائے اس کے جس نے اپنے نفس کو احمق بنا لیا اور بے شک ہم نے ابراہیم کو دنیا میں چن لیا اور یقیناً وہ آخرت میں ضرور نیکو کاروں میں سے

[1] تفسیر البغوي (١/ ١٥٢)
[2] تفسیر الطبري (٣/ ٨٨) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٣٧) اس کی سند حسن ہے۔
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٣٧)
[4] تفسیر القرطبي (٢/ ١٣١) فتح البیان (١/ ٢٨٥)

ہوگا (130) اور جب ابراہیم سے اس کے رب نے کہا: فرمانبردار ہو جا! تو اس نے کہا: میں رب العالمین کا فرماں بردار ہو گیا (131) ابراہیم نے اور یعقوب نے بھی اپنے بیٹوں کو اسی (کلمۂ حق) کی وصیت کی: اے میرے بیٹو! بے شک اللہ نے تمھارے لیے یہ دین چن لیا ہے، پس تمھیں ہرگز موت نہ آئے، مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو (132)

ابراہیم علیہ السلام کی شرک سے بے زاری:

اللہ تعالیٰ نے کافروں کی تردید فرمائی ہے کہ یہ جو تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا ہے، یہ ملتِ ابراہیم علیہ السلام کے مخالف ہے۔ وہ سارے موحدوں کے امام تھے، کیوں کہ انھوں نے خالص اللہ کی توحید اختیار کی تھی اور کسی غیر کا داؤ نہیں چلنے دیا اور نہ ایک پلک جھپکنے کے برابر کبھی شرک کیا، بلکہ اللہ کے سوا ہر معبود سے بیزار ہوئے، اپنی ساری قوم کے مخالف ہوئے، یہاں تک کہ اپنے باپ سے بھی الگ تھلگ ہو گئے۔ کہا: ﴿ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ ﴾ [الأنعام: ۷۸۔ ۷۹] ”اے میری قوم! بے شک جنھیں تم شریک ٹھہراتے ہو، میں ان سے بے زار ہوں۔ بے شک میں نے اپنا چہرہ اس ذات کی طرف متوجہ کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، میں اسی (اللہ) کا پرستار ہوں اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔“

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ۝ ﴾ [الزخرف: ۲۶۔ ۲۷] ”اور جب ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا: بلاشبہہ میں ان (بتوں) سے بَری الذمہ ہوں، جن کی تم عبادت کرتے ہو۔ سوائے اس (اللہ) کے جس نے مجھے پیدا کیا، تو بے شک وہی جلد میری راہنمائی فرمائے گا۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝ ﴾ [التوبة: ۱۱۴] ”اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش کی دعا کرنا بس ایک وعدے کے باعث تھا، جو وعدہ انھوں نے اس سے کیا تھا، پھر جب ابراہیم پر واضح ہو گیا کہ یقیناً وہ اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے بے زار ہو گئے۔ بے شک ابراہیم بڑے نرم دل، بہت تحمل والے تھے۔“

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ۭ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ۭ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ ﴾ [النحل: ۱۲۰۔ ۱۲۲] ”بلاشبہہ ابراہیم ایک امت تھا، اللہ کا فرماں بردار اور اس کی طرف یکسو، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ وہ اللہ کی نعمتوں کا شکر کرنے والا تھا، اس (اللہ) نے اسے چن لیا اور اس کو صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دی۔ اور ہم نے اسے دنیا میں بھلائی دی، اور بلاشبہہ وہ آخرت میں ضرور صالحین میں سے ہوگا۔“

دینِ ابراہیم سے پھرنے والا احمق ہے:

اسی لیے اس جگہ یہ فرمایا کہ دینِ ابراہیم سے صرف وہی شخص پھرتا ہے، جو احمق ہے، جس نے اپنی حماقت اور بری تدبیر سے حق کو چھوڑ کر گمراہی اختیار کر کے ظلم کیا، کیوں کہ جس شخص کو اللہ نے دنیا میں کم عمری ہی سے ہدایت اور ارشاد کے لیے چن لیا تھا، پھر اس کو اپنا خلیل، یعنی جگری دوست ٹھہرایا اور آخرت میں اہلِ صلاح و سعادت سے ہے، اس کے طریقے اور مسلک کو چھوڑ کر گمراہی کے راستے پر چلنا، بہت بڑا ظلم اور بے وقوفی ہوگی۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ [لقمان: ١٣] ''بے شک شرک تو بہت بڑا ظلم ہے۔''

امام ابو العالیہ اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے حق میں اُتری ہے۔ انھوں نے ایک ایسا طریقہ نکالا تھا جو اللہ کی طرف سے نہیں تھا، ان لوگوں نے ملتِ ابراہیم کو چھوڑ کر نئی نئی باتیں اور بدعات اختیار کر لی تھیں۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس بات پر گواہ ہے: ﴿ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۞ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۞ ﴾ [آل عمران: ٦٧۔ ٦٨] ''ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی، بلکہ وہ صرف حق پرست، فرماں بردار تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔ بے شک ابراہیم سے قریب تر وہی لوگ ہیں جنھوں نے ان کی پیروی کی، اور یہ نبی اور مومن لوگ۔ اور اللہ مومنوں کا دوست ہے۔''[1]

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہود و نصاریٰ ملتِ ابراہیم علیہ السلام سے پھر گئے اور یہودیت و نصرانیت کی بدعت نکالی، جو چنداں اللہ کی طرف سے نہیں تھی۔ وہ ملتِ خلیل علیہ السلام کو چھوڑ بیٹھے تو اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا۔[2] قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے پھر جاتا ہے، جو عین دعوتِ ابراہیم ہے، وہی ملتِ ابراہیم سے بھی پھرا ہوا ہے۔ معلوم ہوا جو بات منسوخ نہیں ہوئی، اس میں ملتِ ابراہیمی کا اتباع ضروری ہے۔ جب اللہ نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا کہ تم مخلص اور خالص فرماں بردار ہو جاؤ تو انھوں نے فوراً شرعاً و قدراً مان لیا۔

ابو السعود رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو جو رتبہ ملا، وہ اس بات پر ملا کہ صرف حکم ملنے پر سچے دل سے مخلص بن گئے اور بجا لانے پر تیار ہو گئے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ نے یہ اَمر ان کو اس وقت دیا تھا، جب وہ تہ خانے سے باہر آئے تھے اور ستاروں کے غائب ہو جانے کا حال معلوم کر کے توحید پر ثابت قدم ہو گئے تھے اور یہ سمجھ لیا تھا کہ یہ چاند ستارے کسی ایسی ہستی کے محتاج ہیں، جو مدبر الامر ہے۔[4] لہٰذا جس کی طرف سب محتاج

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٤٢) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٣٨) [3] تفسیر أبي السعود (١/ ١٦٣)
[4] تفسیر الخازن (١/ ١١٣)

ہیں، وہی ان کا بنانے والا ہے، صرف اسی کو ماننا چاہیے، باقی سب کو چھوڑنا چاہیے۔

خلیلِ کعبہ ملکِ یقین گشت مُقِرِّ لا احب الآفلین گشت

''بیت اللہ سے سچی محبت کرنے والا (ابراہیم علیہ السلام) یقین کی دنیا کا بادشاہ بن گیا، اسی لیے وہ اس بات کا اقراری ہوگیا کہ میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں کرتا۔''

ابراہیم علیہ السلام کی وصیت:

پھر ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کو بھی اسی حکم برداری کی وصیت کی، یعنی ملتِ اسلام کی یا اس کلمے کی کہ ﴿ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴾ [البقرۃ: ۱۳۱] ''میں رب العالمین کا فرماں بردار ہوگیا۔'' کیوں کہ ان کو اس ملت یا کلمے کی بڑی فکر اور محبت تھی اور مرتے دم تک اس کی محافظت کرتے رہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد کلمہ ہے، کیوں کہ یہی قریب ہے۔ یعنی یوں کہو کہ ہم مسلمان ہوئے۔[1] لیکن راجح یہ ہے کہ مراد ملتِ حنیفیہ ہے۔ کیوں کہ بعد میں آنے والوں سے ملت کی پیروی کا تقاضا ہے اور محض زبانی اسلام کا دعویٰ نہیں۔ چناں چہ ابراہیم علیہ السلام کے لیے صرف ملت کی پیروی کی وصیت کرنا مناسب تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ سب آٹھ بیٹے تھے، ان میں ایک اسماعیل علیہ السلام بھی ہیں۔ یہ سب میں بڑے تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ چودہ بیٹے تھے۔ واللہ أعلم.

کیا یعقوب علیہ السلام خلیل علیہ السلام کی زندگی میں پیدا ہوگئے تھے؟

پھر ان کے بیٹے اپنے بعد اپنی اولاد کو بھی یہ وصیت کر گئے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ ﴾ [الزخرف: ۲۸] ''اور ابراہیم اسی (کلمۂ توحید) کو (اپنی اولاد میں) اپنے پیچھے ایک پائندہ و تابندہ بات بنا گئے۔'' بعض سلف نے لفظِ یعقوب کو منصوب پڑھا ہے اور لفظ ﴿ بَنِيْهِ ﴾ پر معطوف ٹھہرایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد اور اپنے پوتے یعقوب بن اسحاق علیہما السلام کو یہ وصیت کی تھی، جو اس وقت حاضر تھے۔ امام قشیری رحمہ اللہ کا یہ کہنا کہ ''یعقوب علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کے بعد پیدا ہوئے تھے'' صحیح دلیل کا محتاج ہے، اس لیے کہ ظاہر یہی ہے کہ اسحاق علیہ السلام کے گھر ابراہیم علیہ السلام اور سارۂ علیہا السلام کی زندگی کے دوران میں پیدا ہوئے تھے، کیوں کہ دونوں کی بشارت ایک ہی ساتھ دی گئی تھی: ﴿ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ﴾ [ھود: ۷۱] ''پھر ہم نے اس اسحاق کی خوش خبری دی اور اسحاق کے بعد یعقوب (پوتے) کی۔'' اس لیے اگر اس وقت یعقوب علیہ السلام موجود نہ ہوتے تو من جملہ ذریت اسحاق علیہ السلام کے ان کا ذکر کرنا کچھ مفید نہ تھا۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے سورۃ العنکبوت میں فرمایا ہے: ﴿ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ ﴾ [العنکبوت: ۲۷] ''اور ہم نے اسے

---

[1] تفسیر القرطبي (۲/ ۱۳۵)

اسحاق اور یعقوب دیے اور اس کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھ دی۔'' دوسری آیت میں یوں کہا ہے: ﴿ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ﴾ [الانبیاء: ۷۲] ''اور ہم نے اسے اسحاق بخشا، اور یعقوب مزید (دیا)۔'' یہ دونوں آیتیں اس بات کی مقتضی ہیں کہ یعقوب علیہ السلام خلیل علیہ السلام کی زندگی میں موجود تھے۔

مرتے دم تک اسلام پر قائم رہنا:

یہ کہنا کہ ''تم نہ مرنا مگر مسلمان''، اس کا مطلب ہے کہ اس کو حالتِ حیات میں اچھی طرح قائم رکھو، پکے مسلمان اور سچے تابع فرمان بنے رہو۔ اس بات کو ایسا پکڑو کہ اللہ تم کو اسی کلمے پر مارے، کیوں کہ آدمی غالباً اسی حالت پر مرتا ہے جس میں وہ مصروف رہتا ہے، پھر اسی حالت پر وہ مبعوث بھی ہوگا۔ اللہ کی عادتِ کریمہ یوں ہی جاری ہے کہ جو کوئی خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ اس کو خیر کی توفیق دیتا ہے اور خیر اس کے لیے آسان کر دیتا ہے، لہٰذا جس نے کسی نیک عمل کی نیت کی تو وہ اس پر ثابت رہے گا۔ رہی یہ بات کہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ کوئی آدمی اہلِ جنت کا سا کام کرتا ہے، یہاں تک کہ اس آدمی اور جنت کے درمیان ایک یا دو ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر اس پر کتاب سبقت لے جاتی ہے تو وہ اہلِ نار کا سا کام کرنے لگتا ہے اور آگ میں چلا جاتا ہے اور کوئی آدمی اہلِ نار کا سا کام کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور آگ کے درمیان ایک یا دو ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے کہ پھر تقدیر سبقت لے جاتی ہے تو وہ اہلِ جنت کا سا کام کرنے لگتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔[1]

سو یہ حدیث آیتِ زیرِ تفسیر سے نہیں ٹکراتی، کیوں کہ اس حدیث کی بعض روایات میں ایسے آیا ہے کہ اہلِ جنت یا اہلِ نار کا سا عمل بظاہر لوگوں کی نظر میں کرتا ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝ ﴾ [اللیل: ۵۔ ۱۰] ''پھر جس نے (اللہ کی راہ میں) دیا اور ڈرتا رہا۔ اور اس نے نیک بات کی تصدیق کی۔ تو یقیناً اسے عن قریب ہم آسان (راہ) کی توفیق دیں گے۔ اور لیکن جس نے کنجوسی کی اور پروا نہ کی۔ اور اس نے نیک بات کو جھٹلایا۔ تو اسے عن قریب ہم تنگی کی (راہ کی) سہولت دیں گے۔''

فضیل بن عیاض رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مسلمان مرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے متعلق نیک گمان رکھو۔[2]

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے تین دن پہلے یہ فرمایا کہ کوئی شخص نہ مرے، مگر وہ اپنے رب سے نیک گمان رکھتا ہو۔[3]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۷۰۱٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲٦٤۳)

[2] الدر المنثور (۱/ ۳۳٦)
[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۸۷۷)

أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي قَالُوا نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ اٰبَآئِكَ إِبْرٰهِمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ إِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿١٣٣﴾ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٤﴾

کیا جب یعقوب کو موت آئی اس وقت تم موجود تھے؟ جب اس نے اپنے بیٹوں سے کہا: میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ انھوں نے کہا: ہم تیرے معبود اور تیرے باپ دادا ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے جو ایک معبود ہے اور ہم اُسی کے فرماں بردار ہیں (133) یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی۔ اسی کے لیے ہے جو اس نے کمایا اور تمھارے لیے ہے، جو تم نے کمایا، اور جو عمل وہ کرتے تھے تم سے ان کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا (134)

یعقوب علیہ السلام کا اپنی موت کے وقت اپنے بیٹوں سے عہد:

اللہ پاک نے اس آیت میں عرب پر، جو اولادِ اسماعیل ہیں، حجت قائم کی ہے اور کفارِ بنی اسرائیل پر اس طرح حجت قائم کی ہے کہ جب یعقوب علیہ السلام کی موت آئی تو انھوں نے یہی وصیت کی تھی کہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کو پوجنا اور اسی کی عبادت و اطاعت کرنا۔ اسماعیل علیہ السلام کو آبا (باپ دادا) میں شمار کرنا، بطور تغلیب ہے، کیوں کہ اسماعیل علیہ السلام یعقوب علیہ السلام کے باپ نہیں، بلکہ چچا تھے۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب چچا کو باپ بولتے ہیں اور خالہ کو ماں کہتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے: «عَمُّ الرَّجُلِ صِنْوُ أَبِيهِ» یعنی چچا باپ کے برابر ہوتا ہے۔[1] «وَالْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْأُمِّ» اور خالہ ماں کے قائم مقام ہوتی ہے۔[2]

دادا کے ہوتے ہوئے بھائیوں کی وراثت کا مسئلہ:

اسی آیت سے بعض نے دادا کو باپ ٹھہرا کر بھائیوں کو (وراثت سے) محروم رکھا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صدیق رضی اللہ عنہ کا یہی قول ہے۔[3] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، امام حسن بصری، طاوس، عطا اور ابو حنیفہ رحمہم اللہ اور بہت سے اگلے پچھلے اسی طرف گئے ہیں۔ امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ بھائی بھی اپنا حصہ لیں گے۔ عمر، عثمان، علی، ابن مسعود، زید بن ثابت رضی اللہ عنہم، سلف و خلف کی ایک جماعت، ابو یوسف اور محمد رحمہما اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔[4]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٨٣)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٢)
[3] صحيح البخاري (٦/ ٢٤٧٧)
[4] تفسير ابن كثير (١/ ٢٤٥)

خطاب یہود و نصاریٰ سے ہے، یہ اپنے آپ کو ابراہیم علیہ السلام اور اُن کی اولاد کی طرف منسوب کرتے اور یوں کہتے تھے کہ ان کا دین یہی یہودیت اور نصرانیت ہے۔ اللہ نے ان کا رد کیا اور فرمایا کہ تم مفتری ہو۔ ان کا دین یہی دینِ اسلام تھا جس میں توحید و اخلاص ہے۔ یعقوب علیہ السلام اور عیص جڑواں پیدا ہوئے تھے۔ ولادت میں پہلے عیص پیدا ہوئے۔ ان کے پیچھے یعقوب پیدا ہوئے، اس لیے ان کا یہ نام بعد میں پیدا ہونے کی مناسبت سے رکھا گیا۔ ان کے بارہ بیٹے تھے۔ اسماعیل علیہ السلام کا نام اسحاق علیہ السلام سے پہلے لیا، کیوں کہ یہ ان سے چودہ برس بڑے تھے۔ ہمارے رسول اللہ ﷺ کے جدِ اعلیٰ ہیں۔ ایک رب کہہ کر جو یہ کہا کہ ہم اسی کے حکم پر ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم توحیدِ الوہیت کے قائل ہیں اور اللہ کے لیے مطیع اور عاجز ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَیْهِ یُرْجَعُوْنَ ﴾ [آل عمران: ٨٣] ''حالاں کہ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے وہ چاہتے اور نہ چاہتے ہوئے بھی اللہ کا فرماں بردار ہے اور اسی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے۔''

اسلام تمام انبیا کی ملت ہے:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اسلام تمام انبیا علیہم السلام کی ملت ہے، اگرچہ ان کی شریعتیں طرح طرح کی اور راستے الگ الگ تھے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْۤ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [الأنبياء: ٢٥] ''اور آپ سے پہلے ہم نے جو بھی رسول بھیجا اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ بے شک میرے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو۔'' اس باب میں بہت سی آیتیں ہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ہم گروہِ انبیا علاتی بھائی ہیں اور ہمارا دین ایک ہے۔[1]

پچھلی آیت کا مطلب یہ ہوا کہ تمھارے آبا و اسلاف جو انبیا و صلحا تھے اور تم اپنے آپ کو اُن کی طرف منسوب کرتے ہو، لہٰذا اُن کی طرف تمھارا یہ انتساب تمھارے کچھ کام نہیں آ سکتا، جب تک تم خود اچھا کام نہ کرو۔ ان کے اعمال ان کے ساتھ گئے اور تمھارے اعمال تمھارے ساتھ ہیں۔ تم سے ان کے اعمال کی کچھ باز پرس نہ ہوگی، بلکہ تم سے تمھارے اعمال پر مؤاخذہ ہوگا۔ امام ابو العالیہ اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اس اُمت سے مراد ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام اور اُن کی اولاد ہیں۔[2]

اللہ کے ہاں حسب ونسب کام نہیں آئے گا:

فتح البیان میں ہے کہ اس آیتِ شریفہ میں ان لوگوں کا رد ہے جو اپنے اسلاف کے اعمال پر توکل کر کے باطل تمنا سے اپنا جی خوش کر لیتے ہیں۔ اسی لیے حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس کو اس کے عمل نے پیچھے کر دیا، اس کو اس

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٥٩) تفسير ابن كثير (١/ ٢٤٥۔ ٢٤٦) [2] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٤١)

کا نسب آگے لے کر نہیں جائے گا۔[1] یعنی ان کی نیکیاں تمھارے کام نہ آئیں گی اور نہ ان کی برائیوں کا تم سے مؤاخذہ ہوگا۔ اس میں اس شخص کے مذہب کا باطل ہونا قرار پاتا ہے، جو مشرکین کی اولاد کا عذاب دیا جانا، اس وجہ سے جائز سمجھتا ہے کہ وہ مشرکوں کی اولاد ہیں۔ ابن فارس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس میں بندے کے کسب کا ہونا ثابت ہوتا ہے، یعنی بندہ کاسب (کمانے والا) ہے اور اسی کسب وعمل کی وجہ سے وہ لائقِ ثواب یا لائقِ عذاب ہوگا۔[2]

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٣٥﴾

اور انھوں نے کہا: تم یہودی یا عیسائی ہو جاؤ تو تم ہدایت پا جاؤ گے۔ (اے نبی!) کہہ دیجیے: (نہیں) بلکہ ہم تو ملتِ ابراہیم کی پیروی کرتے ہیں جو سب کو چھوڑ کر ایک اللہ کا ہو گیا اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا (135)

مذاہبِ تقلید اور اُن کی مذمت:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ عبداللہ بن صوریا اعور یہودی نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا کہ ہدایت صرف وہ ہے جس پر ہم ہیں، لہٰذا آپ ہماری پیروی کریں گے تو ہدایت پائیں گے۔ اسی طرح نصاریٰ نے کہا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری۔[3] دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ یہ آیت یہودیوں کے سرداروں، جیسے: کعب بن اشرف، مالک بن صیف، وہب بن یہوذا اور نجران کے نصاریٰ، جیسے: سید، عاقب اور اُن کے ساتھیوں کے حق میں اُتری ہے۔ وہ لوگ مومنوں سے دین کے بارے میں جھگڑتے تھے۔ ہر ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ ہمارا دین حق ہے۔ ہم ہی اللہ کے دین کے زیادہ مستحق ہیں۔[4] اسی طرح آج کل مختلف مذاہب کے مقلدین، اہلِ سنت سے کہتے ہیں کہ ہمارا مذہب حق ہے۔ تم بھی اسی خاص مذہب کے مقلد ہو جاؤ، راہ پر آ جاؤ گے۔

ان کا جواب بھی وہی ہے، جو جواب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولِ مقبول ﷺ کو سکھایا ہے کہ یہودیت ونصرانیت کہ جس کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو، اس کی طرف ہم نہیں آنا چاہتے، بلکہ ہم ملتِ ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ اپنے دین میں یکسو اور مستقیم تھے۔ یہی ہمارا جواب اہلِ تقلید کو ہے کہ ہم بھی کسی امام کی طرف آنا، کسی مذہب کی تقلید کرنا، بندوں کے بندے بننا نہیں چاہتے۔ ہم تو رسول اللہ ﷺ کے متبع ہیں۔ جن پر قرآن اُترا تھا اور اس قرآن میں تقلید کی مذمت آئی ہے۔ تقلید کی طرف بلانا بعینہٖ ویسا ہی ہے، جیسا یہودیت اور نصرانیت کی طرف بلانا، کیوں کہ اصل تقلید مذہبِ یہود سے نکلی ہے۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٩٩)
[2] فتح البيان (١/ ٢٨٩)
[3] تفسير الطبري (٣/ ١٠١۔ ١٠٢) اس کی سند حسن ہے۔
[4] تفسير البغوي (١/ ١٥٥)

تقلید کے بانی اور اس کا حکم:

قرآن پاک میں تقلید کی حکایت دو ہی فرقوں سے بیان کی گئی ہے: ایک اہلِ کتاب سے اور دوسرے مشرکین سے۔ اسی وجہ سے علماے اسلام نے تقلید کو شرک کہا اور حرام بتایا ہے۔ یہ تقلید اگر اصولِ ایمان میں ہے تو شرک باللہ ہے، اگر فروعِ احکام میں ہے تو شرک فی الرسالت ہے۔ جس طرح کوئی مشرک دنیا میں اللہ تعالیٰ کا قدر شناس، محبت کرنے والا اور مخلص نہیں ہے، اسی طرح دنیا بھر میں کوئی مقلد رسول اللہ ﷺ کی کما حقہ تعظیم اور آپ سے محبت کرنے والا نہیں ہے۔ مشرکین نے اللہ تعالیٰ کی یہ قدر کی کہ اس کو چھوڑ کر ہر کسی عاجز مخلوق یا مصنوعی معبود سے التجا کرنے لگے اور غیر اللہ کی عبادت اختیار کر لی۔ معبودِ برحق اور ربِ مطلق تو کوئی اور تھا، یہ کسی اور کے بندے بن گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ ﴾ [الأنعام: ٩١] ''اور انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جس طرح اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔'' مقلدوں نے رسول اللہ ﷺ کی یہ قدر کی کہ ان کے اقوال و افعال کو پسِ پشت ڈال کر اقوال و آرائے رجال کو سند پکڑا۔ اُمت تو رسول اللہ ﷺ کی تھی، مگر غلام بن گئی یہ عام اُمتیوں کی۔

بندۂ بندگان درگاہیم

''ہم اس درگاہ کے غلاموں کے غلام ہیں۔'' لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ.

حنیف کی تفسیر:

امام قرظی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حنیف مستقیم کو کہتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حنیف مخلص کو کہتے ہیں۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ حاجی کو کہتے ہیں۔[2] امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حنیف وہ ہے جو نماز قبلے کی طرف پڑھتا ہے اور حج کو واجب جانتا ہے۔ ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حنیف متبع کو کہتے ہیں۔ ابو قلابہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حنیف وہ ہے جو اللہ کے سارے رسولوں پر ایمان لاتا ہے، اگلے ہوں یا پچھلے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حنیفیت یہ ہے کہ ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' کی گواہی دے۔ اس میں ماؤں، بیٹیوں، خالاؤں اور پھوپھیوں کی حرمت داخل ہے۔ نیز جو چیزیں اللہ نے حرام کی ہیں، وہ سب شامل ہیں۔[3] فتح البیان میں ہے کہ حنیف وہ ہے جو دینِ باطل سے دینِ حق کی طرف مائل ہو۔[4]

امام بخاری نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ''الأدب المفرد'' میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کہا گیا کہ کون سا دین اللہ کو زیادہ محبوب ہے؟ فرمایا حنیفیت سمجھ لو۔[5] (وأخرجه أحمد و ابن منذر أيضاً) یعنی ملتِ ابراہیم علیہ السلام، جس میں کسی طرح کے شرک و بدعت کا لگاؤ اور ملاوٹ نہیں ہے، بلکہ خالص توحید کا اتباع ہے۔ اس

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٤١۔ ٢٤٢) تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٤٦)

[2] تفسیر الطبري (٣/ ١٠٦) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٤١) اس کی سند حسن ہے۔ [3] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٤١۔ ٢٤٢)

[4] فتح البیان (١/ ٢٨٩) [5] الأدب المفرد (١/ ١٠٨) مسند أحمد (١/ ٢٣٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٨٨١)

ارشاد میں کہ ابراہیم علیہ السلام مشرکین میں سے نہیں تھے، یہودیوں سے تعریض ہے، کیوں کہ ان کا قول یہ تھا کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں۔ اسی طرح نصاریٰ مسیح کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں۔ اس لیے اللہ نے فرمایا کہ ابراہیم اس حالت پر نہیں تھے، جو تمھاری حالت ہے، یعنی شرک باللہ کرنا۔

قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ
وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَاۤ اُوْتِيَ
النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

تم کہو: ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر (ایمان لائے) جو ہماری طرف نازل کیا گیا اور جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف نازل کیا گیا، اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اور جو نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا، ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں (136)

تمام انبیا اور تمام نازل شدہ کتابوں پر مجمل ایمان، جزوِ ایمان ہے:

اللہ پاک نے اس آیت میں مومنوں کو یہ ارشاد فرمایا ہے کہ تم پر جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اُترا ہے، اس پر مفصلاً ایمان لاؤ اور جو پہلے انبیا پر اُترا ہے، اس پر مجملاً ایمان لاؤ، پھر بعض رسول جو بڑے بڑے تھے، ان کے نام لیے اور باقی انبیا کا مجمل ذکر کیا اور فرمایا کسی میں فرق نہ کرو، سب پر برابر ایمان لاؤ، ان لوگوں کی طرح نہ ہو، جن کے حق میں یہ ارشاد کیا ہے: ﴿ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ﴾ [النساء: ۱۵۰۔ ۱۵۱] ''اور چاہتے ہیں کہ وہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور وہ کہتے ہیں: ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کوئی راہ اختیار کریں۔ وہی لوگ حقیقی کافر ہیں۔''

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اہلِ کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھ کر اہلِ اسلام کے لیے عربی زبان میں تفسیر کرتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم ان کو سچا کہو نہ جھوٹا، یوں کہو: ﴿ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا ﴾ ''ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر (ایمان لائے) جو ہماری طرف نازل کیا گیا۔''[1] (رواہ البخاري)۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثر فجر کی دو رکعت سنت میں یہی آیت پڑھتے: ﴿ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ ...الخ ﴾۔ دوسری رکعت میں آیت: ﴿ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴾[2] پڑھتے تھے۔ (رواہ مسلم و أبو داود و النسائي)

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٢١٥)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٧٢٧) سنن أبي داود، رقم الحدیث (١٢٥٩) سنن النسائي، رقم الحدیث (٩٤٤)

اسباط کا مفہوم:

امام ابو العالیہ، ربیع اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اَسباط سے مراد یعقوب علیہ السلام کے بیٹے ہیں۔ یہ بارہ آدمی تھے۔ ان میں ہر ایک شخص سے آدمیوں کا ایک گروہ پیدا ہوا، جو اَسباط کہلائے۔① خلیل بن احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسباط بنی اسرائیل میں قبائل بنی اسماعیل کی طرح تھے۔② امام زمخشری رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ اسباط یعقوب علیہ السلام کے پوتے یعنی ان کے بارہ بیٹوں کی اولاد ہیں۔③ امام رازی رحمہ اللہ نے بھی اسی کو مانا ہے اور کوئی اعتراض نہیں کیا۔④ بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ اسباط بنی اسرائیل کے قبائل تھے۔⑤ اس سے یہ معلوم ہوا کہ یہاں اسباط سے مراد بنی اسرائیل کے قبیلے ہیں۔ ان میں جو نبی ہوئے، ان پر اللہ نے وحی اُتاری، جس طرح کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: ﴿اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا﴾ [المائدة: ٢٠] ''اللہ کی نعمت یاد کرو جو اس نے تم پر کی، جب اس نے تم میں سے نبی بنائے اور تمھیں بادشاہ بنایا۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا﴾ [الأعراف: ١٦٠] ''اور ہم نے ان (بنی اسرائیل) کو بارہ قبیلوں کے لحاظ سے (بارہ) گروہوں میں بانٹ دیا تھا۔''

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسباط ''سِبْط'' سے (بسکون بائے موحدہ) سے مشتق ہے اور سبط کسی کام کے جاری رکھنے کو کہتے ہیں، لہٰذا یہ اسباط جماعتیں تھیں، جو مسلسل آتی رہیں۔ یا یہ ''سَبَط'' سے ماخوذ ہے۔ سبط درخت کو کہتے ہیں، یعنی کثرت میں درختوں کی طرح تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ دس کے سوا سارے انبیا بنی اسرائیل میں ہوئے۔ وہ دس یہ تھے: نوح، ہود، صالح، شعیب، لوط، ابراہیم، اسحٰق، یعقوب، اسماعیل اور محمد علیہم السلام۔⑥ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سبط اس جماعت یا قبیلے کو کہتے ہیں جو ایک اصل کی طرف رجوع کریں۔⑦ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے حکم دیا کہ سب مومنین اللہ پر ایمان لائیں، نیز اللہ کی سب کتابوں اور رسولوں کی تصدیق کریں۔ سلیمان بن حبیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہمیں صرف اتنا حکم ہے کہ ہم تورات و انجیل کو مانیں، یہ حکم نہیں کہ ان پر عمل بھی کریں۔⑧

سابقہ کتابوں پر ایمان اور عمل صرف قرآن و سنت کے لیے ہے:

معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان لاؤ تورات، زبور اور انجیل پر، لیکن عمل کے لیے تمھیں قرآن ہی کافی ہے۔ اس کو ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے۔⑨ یعنی عمل صرف

① تفسير الطبري (٣/ ١١١۔ ١١٢) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٤٣) ② تفسير ابن كثير (١/ ٢٤٧)
③ تفسير الكشاف (١/ ٢٢١) ④ تفسير الرازي (٤/ ٧٥) ⑤ صحيح البخاري (٤/ ١٦٩٧)
⑥ المعجم الكبير (١١/ ٢٧٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رواه الطبراني موقوفاً و رجاله ثقات'' مجمع الزوائد (٨/ ٣٨٦)
⑦ تفسير القرطبي (٢/ ١٤١) ⑧ تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٤٣)
⑨ تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٤٣) امام ابن حبان فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں ''عبید اللہ بن ابی حمید ہذلی'' راوی متروک ہے۔ (المجروحين: ٢/ ٦٥)

قرآن ہی پر کرو، کسی اور کتاب پر نہیں۔ یہی بات سارے اہلِ سنت تمام اہلِ بدعت اور اصحابِ تقلید سے کہتے چلے آئے ہیں کہ تم سب علما و اولیاے اسلام و ائمۂ دین کو مانو، یعنی ان کو اللہ کا مخلص ومقبول بندہ سمجھو، مگر قرآن و حدیث کے سوا کسی کی بات کو سند نہ پکڑو، سند کے لیے یہی دو چیزیں ہیں، ایک کتابِ عزیز اور دوسری سنتِ مطہرہ۔

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣٧﴾ صِبْغَةَ اللَّهِ ۖ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ ﴿١٣٨﴾

پھر اگر وہ (اہلِ کتاب) اس چیز پر ایمان لے آئیں، جس پر تم ایمان لائے ہو تو بے شک وہ ہدایت پا جائیں گے اور اگر وہ منہ موڑیں تو پھر وہی ہیں مخالفت میں، سو ان کے مقابلے میں آپ کو اللہ کافی ہے اور وہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (137) (اے نبی! کہہ دیجیے:) اللہ کا رنگ (اختیار کرو) اور رنگ کے لحاظ سے اللہ سے زیادہ اچھا کون ہے؟ اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں (138)

نصاریٰ کا دستور تھا کہ جس کو اپنے دین میں داخل کرتے، اس کو زرد رنگ کا بپتسمہ دیتے۔ اس کے کپڑے بھی رنگ کر اس پر ڈال دیتے۔ چناں چہ ان کے مقابلے میں یہ فرمایا۔

صحابہ کا ایمان معیار ہے:

اس آیت میں یہ کہا ہے کہ اگر اہلِ کتاب وغیرہ اور کفار تمھاری طرح سب کتب و انبیا پر بلا تفریق ایمان لے آئیں تو سمجھو کہ وہ راہ پر آگئے اور حق کو پاگئے، لیکن اگر وہ قیامِ حجت کے باوجود باطل سے حق کی طرف نہ آئیں تو سمجھ لو کہ وہ ضد پر ہیں۔ اللہ ان کو سمجھ لے گا اور تم کو فتح دے گا۔ یہی حال بعینہٖ مقلدین کا ہے کہ اگر وہ اہلِ سنت کی طرح قرآن و حدیث کو مان لیں تو سمجھو کہ راہ پر آگئے اور اگر نہ مانیں تو جان لو کہ اپنی ضد پر جمے ہوئے ہیں اور تم بھی جمے رہو، اللہ متبعین کو کفایت کرتا ہے۔

لفظِ شقاق شق سے مشتق ہے، یہ جانب کے معنی میں ہے، کیوں کہ ہر جھگڑنے والا فریق دوسرے مخالف فریق کی ایک جانب ہوتا ہے یا یہ صعوبت سے ماخوذ ہے، کیوں کہ ہر فریق ایسا کام کرتا ہے جو دوسرے فریق پر شاق اور دشوار گزرتا ہے۔ آیتِ شریفہ کو دونوں معانی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے شقاق کے معنی فراق کے کیے ہیں۔[1] کسی نے مخالفت و تنازع لکھے ہیں۔ کسی نے دشمنی اور جنگ، جب کہ کسی نے گمراہی بتائے ہیں۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہے کہ جو خبر اللہ تعالیٰ کے کفایت کرنے کے بارے میں بہ طورِ غیب دی گئی تھی، وہ پوری ہوئی۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٤٤)

اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور رسول اللہ ﷺ کو بنی قریظہ، بنی نضیر اور بنی قینقاع پر فتح و نصرت بخشی اور یہود و نصاریٰ کو ذلیل و خوار کر دیا۔ وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ. امام نافع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے وقت ان کا خون اسی آیت شریف پر گرا تھا۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم)

اللہ کے رنگ سے مراد:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ کے رنگ سے مراد اللہ کا دین ہے۔[2] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ پاکیزگی مراد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ ایمان ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ کی فطرت جس پر اس نے بندوں کو پیدا کیا ہے۔ نصاریٰ کے گھر جب اولاد پیدا ہوتی تو وہ پانی میں اس کو رنگتے، اس کو معمودیہ کہتے ہیں اور اس کو اولاد کی تطہیر قرار دیتے تھے۔ جب وہ کام ہو جاتا تو کہتے کہ اب یہ سچ مچ نصرانی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کیا اور فرمایا کہ اللہ کا رنگ، یعنی دینِ اسلام ہے، جس کو نوح علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک سارے پیغمبر لائے ہیں، یہ سب سے بہتر رنگ ہے اور اس رنگ سے بڑھ کر کسی میں تطہیر و طہارت نہیں ہے۔ یہ رنگ اللہ کا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل نے کہا کہ اے موسیٰ! کیا تیرا اللہ رنگتا بھی ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اللہ سے ڈرو۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو پکار کر فرمایا کہ تو کہہ: ہاں، میں سرخ، سیاہ اور سفید رنگ رنگتا ہوں۔ یہ سارے رنگ میرے ہی رنگ ہیں، پھر رسول اللہ ﷺ پر یہ آیت اتاری۔ اس کو ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے موقوفاً اور ابن مردویہ رحمہ اللہ نے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے موقوف کو بشرطِ صحتِ اسناد اَشبہ بتایا ہے۔[3] کسی نے کہا ہے کہ رنگ سے مراد ختنہ ہے، کیوں کہ ختنہ کرتے ہوئے خون نکلتا ہے اور ختنے والا اس میں رنگ جاتا ہے، مگر پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۗ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ۗ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

(اے نبی!) کہہ دیجیے: کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو؟ حالاں کہ وہ ہمارا بھی

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲٤٤۔ ۲٤٥)

[2] تفسیر الطبري (۳/ ۱۱۹) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲٤٥) پہلی سند مسلسل بالضعفاء ہے اور دوسری سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲٤٥) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲٤۷۔ ۲٤۸) اس کی سند حسن ہے۔

رب ہے اور تمھارا بھی رب ہے اور ہمارے لیے ہمارے عمل ہیں اور تمھارے لیے تمھارے عمل اور ہم خالص اسی کے لیے عمل کرنے والے ہیں (139) کیا تم کہتے ہو کہ بے شک ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور (ان کی) اولاد یہودی یا عیسائی تھے؟ کہہ دیجیے: کیا تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ؟ اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے وہ گواہی چھپائی جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس ہے؟ اور اللہ اس سے غافل نہیں جو تم عمل کرتے ہو (140) یہ ایک جماعت تھی، جو گزر گئی، اسی کے لیے ہے جو اس نے کمایا اور تمھارے لیے ہے جو تم نے کمایا۔ اور تم سے ان کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا جو وہ عمل کرتے تھے (141)

مشرکوں سے بحث کا اسلوب:

اللہ پاک نے اس جگہ اپنے رسول ﷺ کو یہ بات بتائی کہ تم ان مشرکوں کے جھگڑے کو دور کرو، ان سے یہ کہہ دو کہ کیا تم مجھ سے توحید، اخلاص، اطاعت، اتباعِ اَوامر اور برائیوں کے چھوڑنے کے بارے میں مناظرہ کرتے ہو، حالاں کہ ہمارے اور تمھارے درمیان تمام اختیارات کا مالک اور خالص عبادت کا مستحق وہی ایک رب ہے، جو وحدہ لاشریک لہ ہے، ہم تمھارے کام سے بری اور تم ہمارے کام سے بیزار۔ جیسے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـــُٔوْنَ مِمَّاۤ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ (41) ﴾ [یونس: ۴۱] ''اور اگر وہ آپ کو جھٹلائیں تو کہہ دیجیے: میرے لیے میرا عمل ہے اور تمھارے لیے تمھارا عمل۔ تم اس سے بَری ہو جو میں عمل کرتا ہوں اور میں اس سے بَری ہوں جو تم عمل کرتے ہو۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۗ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۚ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ (20) ﴾ [آل عمران: ۲۰] ''(اے نبی!) پھر اگر وہ آپ سے جھگڑا کریں تو کہہ دیجیے: میں نے اپنا سر اللہ کے آگے جھکا دیا ہے اور میرا اتباع کرنے والوں نے بھی، اور ان اہلِ کتاب اور اَن پڑھ لوگوں سے پوچھیں: کیا تم اسلام لاتے ہو؟ پھر اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر منہ موڑیں تو آپ کے ذمے صرف پیغام پہنچانا ہے، اور اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھ رہا ہے۔''

فرمایا: ﴿ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ ﴾ [الأنعام: ۸۰] ''اس (ابراہیم) نے کہا: کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہو؟'' یہ ابراہیم علیہ السلام نے جھگڑے کے وقت اپنی قوم سے کہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۗ قَالَ

اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [البقرۃ: ۲۵۸] ''کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا، جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں اس لیے جھگڑا کیا کہ اللہ نے اسے بادشاہی دے رکھی تھی؟ جب ابراہیم نے کہا: میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ اس (نمرود) نے کہا: میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا: بے شک اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال کر دکھا، چناں چہ وہ ہکا بکا رہ گیا جس نے کفر کیا تھا اور اللہ ان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا جو ظالم ہیں۔''

اسی طرح آیت زیرِ تفسیر میں یہ ارشاد کیا ہے کہ ہم تم سے بَری، تم ہم سے بَری، ہم تو اسی ایک اکیلے اللہ کے پوجنے والے ہیں۔

ابراہیم اور دیگر انبیا علیہم السلام کا مذہب:

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دعوے کی تردید کی ہے کہ ابراہیم وغیرہ انبیا و اسباطِ ملت، یہودیت و نصرانیت پر تھے۔ یہ کہا کہ کیا تمھیں اللہ سے بھی زیادہ خبر ہے، جو تم ایسا دعویٰ کرتے ہو، حالاں کہ اللہ نے یہ خبر دی ہے کہ وہ نہ یہودی تھے اور نہ نصاریٰ؟ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ [آل عمران: ٦٧] ''ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی، بلکہ وہ صرف حق پرست، فرماں بردار تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔'' امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ اس کتاب میں، جو اُن کے پاس آئی تھی، یہ بات پڑھتے تھے کہ بے شک دین یہی اسلام ہے، محمد اللہ کے رسول ہیں۔ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام اور اسباط یہودیت اور نصرانیت سے بیزار اور بَری اور الگ تھلگ تھے۔ گویا انھوں نے از خود اس بات کا اقرار کر لیا تھا، لیکن وقت پر اس گواہی کو چھپا گئے، اللہ نے کہا کہ چھپا جاؤ، ہم تمھارے کام سے بے خبر نہیں ہیں۔[1]

اس میں سخت سرزنش اور وعید ہے، یعنی جب اللہ کے علم نے ہر چیز کو گھیر رکھا ہے تو وہ تم کو ضرور ہی تمھارے اس عمل کی سزا و جزا دے گا۔ پھر فرمایا کہ تمھارا ان کی طرف اتباع کے بغیر انتساب کچھ کام نہیں آئے گا، تم صرف اس نسبت پر پھولے نہ رہنا اور نہ اس پر اترانا، کیوں کہ جس نے ایک نبی کا انکار کیا، اس نے گویا تمام انبیا کا انکار کیا، خصوصاً جو سید الانبیا، خاتم الرسل، رسولِ رب العالمین کا منکر ہوا۔

اس آیتِ شریفہ پر قرآنِ مجید کا ایک پارہ آج ۲۲ رمضان شریف ۱۳۰۲ھ کو ختم ہوا۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ.

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٤٦)

سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا
عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى
النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ
الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى
عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا
كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

جلد ہی بے وقوف لوگ (یہ) کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے اس قبلے سے کس چیز نے پھیر دیا جس پر یہ تھے؟ (اے نبی!) کہہ دیجیے: مشرق اور مغرب اللہ ہی کے لیے ہیں، وہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی طرف ہدایت دیتا ہے (142) اور (جیسے تمھیں ہدایت دی) اسی طرح ہم نے تمھیں افضل اُمت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔ اور (اے نبی!) جس قبلے (بیت المقدس) پر آپ پہلے تھے، اسے تو ہم نے صرف یہ جاننے کے لیے مقرر کیا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاتا ہے اور بے شک یہ (قبلے کی تبدیلی) بہت بھاری ہے (کافروں پر) مگر اُن لوگوں پر (نہیں) جنھیں اللہ نے ہدایت دی اور اللہ ایسا نہیں کہ تمھارا ایمان ضائع کر دے، بے شک اللہ لوگوں پر بہت نرمی کرنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے (143)

تحویلِ قبلہ:

رسول اللہ ﷺ جب مکہ سے مدینہ آئے تو سوا برس تک نماز بیت المقدس کی طرف پڑھی۔ پھر حکم آیا کہ کعبہ کی طرف پڑھو۔ تب یہودی اور بعض کچے مسلمان ان کے بہکانے سے شبہہ ڈالنے لگے کہ وہ قبلہ سب نبیوں کا تھا، اس کا چھوڑنا نبی کی علامت نہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ بے وقوف لوگوں سے مراد زجاج رحمہ اللہ کے بقول مشرکینِ عرب ہیں۔ مجاہد رحمہ اللہ کے قول کے مطابق علمائے یہود ہیں۔ سدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ منافقین مراد ہیں،[1] مگر آیت ان سب کو شامل ہے۔[2]

---

[1] تفسیر الطبري (٣/ ١٣٠)   [2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٤٩)

امام بخاری رحمہ اللہ نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کی طرف سولہ یا سترہ مہینے نماز پڑھی، مگر آپ کے دل کی خوشی اس میں تھی کہ قبلہ کعبہ کی طرف ہو۔ چناں چہ سب سے پہلے جو نماز کعبہ کی طرف پڑھی گئی، وہ عصر کی نماز تھی۔ آپ کے ساتھ ایک قوم نے بھی پڑھی۔ ان میں سے ایک آدمی مسجدِ قبا والوں پر گزرا تو وہ لوگ رکوع میں تھے۔ اس نے کہا کہ میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کعبہ کی طرف نماز پڑھی ہے۔ وہ سب لوگ کعبہ کی طرف پھر گئے۔ کچھ لوگ جو کعبہ کے قبلہ ہونے سے پہلے مر گئے تھے، ہم ان کے حق میں کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری کہ اللہ تمھاری وہ نمازیں برباد نہیں کرے گا۔ امام بخاری رحمہ اللہ اس طریقے پر روایت کرنے والے اکیلے ہیں۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے اس کو اور طرح سے روایت کیا ہے۔[1]

اس سلسلے میں بہت سی حدیثیں مروی ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت المقدس کے گنبد کی طرف منہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ مکہ میں دونوں رکنوں کے درمیان اس طرح کھڑے ہو کر نماز پڑھتے کہ سامنے کعبہ ہوتا اور منہ بیت المقدس کی طرف بھی ہو جاتا۔ جب مدینے میں آئے تو دونوں قبلوں کا ایک ہی طرف ہونا ممکن نہ رہا، لہٰذا مشکل پیش آئی تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ منہ بیت المقدس ہی کی طرف کرو۔ یہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور جمہور کا قول ہے۔ پھر اختلاف ہوا کہ یہ حکم قرآن میں آیا ہے یا کسی اور طرح سے ثابت ہے۔ اس میں دو قول ہیں۔ قرطبی رحمہ اللہ نے عکرمہ، امام ابو العالیہ اور حسن بصری رحمہم اللہ سے نقل کیا ہے کہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد تھا۔[2]

مطلب یہ ہے کہ مدینے میں آنے کے تقریباً دس ماہ بعد تک نماز میں بیت المقدس ہی کی طرف منہ کیا جاتا رہا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے لیے اللہ تعالیٰ سے بہت دعا اور عاجزی کیا کرتے تھے کہ کعبہ کی طرف منہ کرنے کی اجازت ملے، کیوں کہ کعبہ ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے۔ اللہ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور حکم دیا کہ بیت العتیق کی طرف منہ کر لیں۔

تحویل کے بعد پہلی نماز:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ پڑھا اور لوگوں کو یہ بات بتلائی۔ پہلی نماز جو اس طرف پڑھی، وہ عصر کی نماز تھی، جیسے اوپر صحیحین کے حوالے سے گزر چکا ہے۔ امام نسائی رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید بن معلیٰ رضی اللہ عنہ سے اس طرح روایت کیا ہے کہ وہ ظہر کی نماز تھی۔ کہا کہ سب سے پہلے میں نے اور میرے صاحب نے کعبہ کی طرف نماز پڑھی۔[3] بہت سے مفسرین کا بھی یہی قول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تحویلِ قبلہ کا حکم اُترا تو آپ دو رکعت نمازِ ظہر پڑھ چکے تھے۔ یہ حکم مسجد بنی سلمہ میں آیا تھا۔ اس لیے اس کا نام مسجد قبلتین ہو گیا۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٥) [2] تفسير القرطبي (٢/ ١٥٠)

[3] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٢٩١) اس کی سند میں ''مروان بن عثمان'' ضعیف راوی ہے۔

نویلہ بنت مسلم رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب یہ خبر ان کو ملی تو وہ نمازِ ظہر میں تھے۔ لوگ اسی وقت پھر گئے۔ مرد عورتوں کی جگہ اور عورتیں مردوں کی جگہ کھڑی ہوگئیں۔ اس کو ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔[1] رہے اہلِ قبا تو ان کو یہ خبر دوسرے دن صبح کی نماز تک نہ پہنچی۔ جس طرح صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے آیا ہے کہ لوگ قبا میں نماز پڑھ رہے تھے۔ اتنے میں ایک آنے والے نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن اُترا ہے اور اُن کو کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم آیا ہے۔ وہ لوگ کعبہ کی طرف ہوگئے۔ ان کے منہ شام کی طرف تھے، گھوم کر کعبہ کی طرف منہ کرلیا۔[2]

ایک اصولی مسئلہ:

اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ منسوخ کرنے والے کا حکم اس وقت تک لازم نہیں آتا، جب تک اس کا علم نہ ہو جائے، اگرچہ وہ حکم پہلے نازل ہو چکا ہو یا پہنچایا جا چکا ہو، کیوں کہ قبا والوں کو یہ حکم نہیں ہوا تھا کہ وہ عصر، مغرب اور عشا کی نمازوں کو دُہرائیں اور دوبارہ پڑھیں۔ واللہ أعلم.

یہود کا اعتراض اور اللہ کا جواب:

جب قبلے میں یہ تبدیلی ہوئی تو بعض یہودی لوگوں کو جن کے دلوں میں منافقت اور کفر تھا، شک اور کجی پیدا ہوئی۔ وہ مخبوط الحواس ہو کر اور احکامِ الٰہی کو خلط ملط کر کے یہ کہنے لگے کہ ان مسلمانوں کو کیا ہوا، کبھی اُدھر نماز پڑھتے ہیں کبھی اِدھر۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا جواب اُتارا کہ مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کا ہے، یعنی سب جگہ اسی کا حکم اور قبضہ ہے، تم جدھر منہ کرو گے اُدھر ہی اللہ ہے۔ نیکی اس بات پر موقوف نہیں ہے کہ منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرو۔ نیکی تو یہ ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ، یعنی اس کا حکم مانو، لہٰذا جس طرف اللہ تعالیٰ نے ہمارا منہ پھیرا، ہم اُدھر پھر گئے اور اگر ہر دن وہ ہمارا منہ کئی بار کئی طرف پھیرے تو ہم اس کے بندے، خادم اور غلام ہیں۔ ہم اس کے قبضے اور حکم میں ہیں۔ وہ جدھر کہے گا، ہم اسی طرف منہ کرلیں گے۔

اہلِ کتاب کا حسد:

اللہ تعالیٰ کی اپنے بندے اور رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت پر بڑی عنایت ہے کہ ان کو ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ کعبہ بتایا کہ جس کعبے کی تعمیر اللہ وحدہ لاشریک لہ کے پاک نام پر ہوئی تھی اور وہ ساری زمین کے گھروں سے اشرف ہے، اس کی طرف ہمارا منہ پھیر دیا۔ یہ وہ گھر ہے، جسے ابراہیم خلیل اللہ نے بنایا ہے۔ اسی لیے اللہ نے یہ فرمایا کہ اللہ جسے چاہتا ہے، سیدھی راہ پر چلاتا ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ کتاب

---

[1] التمهيد (١٧/ ٤٦) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٦٥٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٦)

کے حق میں فرمایا ہے کہ وہ کسی چیز پر ہم پر اتنا حسد نہیں کرتے، جتنا حسد ہم پر جمعے کے دن، قبلے اور آمین خلف الامام کہنے پر کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہم کو ان چیزوں کی طرف راہ دکھائی اور اُن کو اِن باتوں سے گمراہ کر دیا۔[1] (رواه أحمد)

امتِ محمدیہ کی فضیلت:

اس اُمت کو جو اُمتِ معتدل ٹھہرایا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے تم کو ابراہیم علیہ السلام کے قبلے کی طرف پھیر دیا۔ اس قبلے کو تمھارے لیے پسند کیا، کیوں کہ تم بہترین اُمت ہو اور تا کہ قیامت کے دن اور اُمتوں پر گواہی دو، کیوں کہ سب تمھارے فضل کے معترف ہیں۔ اس جگہ وسط کے معنی بہترین اور سب سے زیادہ سخی کے ہیں۔ محاورے میں یوں کہا جاتا ہے کہ قریش نسب اور دار میں وسطِ عرب ہیں، یعنی قوم و خاندان میں وہ سب سے بہتر، افضل، اشرف اور اعلیٰ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم میں وسط تھے، یعنی نسب میں سب سے زیادہ شریف تھے۔ اسی وجہ سے نمازِ عصر کو صلاۃِ وسطیٰ کہتے ہیں کہ وہ افضل نماز ہے۔ لہٰذا جب اللہ نے اس اُمت کو وسط ٹھہرایا تو اس کو سب سے زیادہ مکمل شریعت، تمام عبادات کے طریقوں سے زیادہ مضبوط طریقوں اور سب سے زیادہ واضح مذہب کے ساتھ خاص کیا، جس طرح فرمایا ہے: ﴿هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ [الحج: ٧٨] ''اس نے تمھیں (اپنے دین کے لیے) چن لیا ہے اور اس نے دین میں تمھارے لیے کوئی تنگی نہیں رکھی، اپنے باپ ابراہیم کے دین کی (اتباع کرو)، اسی (اللہ) نے پہلے بھی تمھارا نام مسلمان رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمھارا یہی نام ہے) تا کہ رسول تم پر شہادت دینے والا ہو اور تم لوگوں پر شہادت دینے والے ہو۔''

قیامت کے دن اُمتِ محمدیہ کی گواہی:

سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن نوح کو بلایا جائے گا، پھر اُن سے کہا جائے گا کہ تم نے پیغام پہنچا دیا؟ کہیں گے: ہاں، ان کی قوم بلائی جائے گی، ان سے کہا جائے گا، تم کو نوح نے ہمارا حکم پہنچا دیا تھا؟ وہ لوگ کہیں گے کہ ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، ایک بھی تو نہیں آیا۔ نوح علیہ السلام سے کہیں گے کہ تمھارا گواہ کون ہے؟ وہ کہیں گے: محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی اُمت۔ فرمایا یہ مطلب ہے اس آیت کا: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ (آیت زیرِ تفسیر)۔ پھر فرمایا کہ وسط عدل کو کہتے ہیں، یعنی معتدل کو، لہٰذا تم بلائے جاؤ گے اور نوح کے لیے اللہ کا حکم پہنچانے کی گواہی دو گے اور میں تم پر گواہی دوں گا۔[2] (رواه أحمد والبخاري والنسائي وابن ماجه)

---

[1] مسند أحمد (٦/ ١٣٤) امام البانی رحمہ اللہ "السلسلة الصحيحة" (رقم الحديث: ٦٩١) میں بحث کرتے ہوئے مذکورہ روایت کو ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "وهذا إسناد جيد رجاله ثقات"

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٦١) مسند أحمد (٣/ ٣٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٢٩٢) سنن ابن ماجه (٤٢٨٤)

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے دوسرے الفاظ اس طرح مرفوعاً مروی ہیں کہ قیامت کے دن ایک نبی آئے گا، اس کے ساتھ دو یا زیادہ آدمی ہوں گے، پھر اس کی قوم کو بلا کر کہا جائے گا کہ کیا اس نے تم کو ہمارا حکم پہنچا دیا تھا؟ وہ کہیں گے: نہیں، پھر اس سے کہیں گے: کیا تم نے قوم کو حکم پہنچا دیا تھا؟ وہ کہیں گے: ہاں، پھر پوچھا جائے گا: تمھارا گواہ کون شخص ہے؟ وہ کہے گا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی امت ہیں۔ اس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی اُمت بلائی جائے گی، ان سے کہیں گے کہ کیا اس نبی نے اپنی قوم کو ہمارا حکم پہنچا دیا تھا؟ وہ کہیں گے: ہاں، پہنچا دیا تھا۔ ان سے کہا جائے گا: تمھیں کیسے معلوم ہوا؟ وہ کہیں گے کہ ہمارے نبی آئے، انھوں نے ہمیں خبر دی کہ رسولوں کو جو حکم ملا تھا، وہ انھوں نے پہنچا دیا تھا۔ اللہ پاک کے اس فرمان: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ﴾ کا یہی مطلب ہے۔[1] (رواہ أحمد)

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ ہم اور ہماری اُمت قیامت کے دن ایک ٹیلے کے اوپر سے جھانکتی ہوگی۔ ہر آدمی یہ چاہے گا کہ وہ ہمارے گروہ میں سے ہوتا۔ کوئی نبی نہ ہوگا، جس کو اس کی قوم نے نہ جھٹلایا ہو، مگر ہم گواہی دیں گے کہ اس نے اپنے رب کی رسالت پہنچا دی۔[2] (رواہ ابن مردویه و ابن أبي حاتم)

لوگوں کی گواہی:

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی سلمہ کے ایک جنازے پر آئے اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا۔ بعض نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ کیا اچھا آدمی اور نیک مسلمان تھا۔ اس کی اچھی تعریف کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تو اس بات کا ذمے دار ہے؟ اس نے کہا کہ پوشیدہ حال اللہ ہی جانتا ہے، ہمیں جو ظاہر معلوم تھا، ہم نے وہ حال بتایا۔ فرمایا: جنت واجب ہوگئی۔ پھر ایک دوسرے جنازے پر بنی حارثہ میں آئے، وہاں بھی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا، کسی نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! یہ کیا برا آدمی تھا، بدمزاج، سخت طبیعت والا۔ اس کی برائی کی۔ فرمایا: تو اس بات کا ذمے دار ہے؟ اس نے کہا کہ چھپا حال تو اللہ جانے، جو ہمیں ظاہر ہوا، وہ تو یہی حال تھا۔ فرمایا: دوزخ واجب ہوگئی۔ امام مصعب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ محمد قرظی رحمہ اللہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)۔ حاکم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔ اس کو شیخین نے روایت نہیں کیا۔[3]

ابو الاسود رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں مدینے میں آیا۔ وہاں بیماری تھی۔ لوگ لگا تار مر رہے تھے۔ میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک جنازہ گزرا۔ لوگوں نے اس کو اچھا کہا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ واجب ہوگئی۔ پھر دوسرا

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٥٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٤٤٨)

[2] تفسیر الطبري (٣/ ١٤٧) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔

[3] مستدرك الحاكم (٢/ ٢٩٤) تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٥١) و تعقبه الذهبي بقوله: "فيه مصعب بن ثابت ليس بالقوي"

جنازہ گزرا تو اس کو برا کہا گیا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ واجب ہوگئی۔ میں نے کہا کہ اے امیر المومنین! کیا چیز واجب ہوگئی؟ کہا کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا، وہی بات میں نے کہی، جس مسلمان کے لیے چار شخص بھلائی کی گواہی دیتے ہیں، اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ میں نے کہا اور تین؟ کہا کہ تین بھی۔ میں نے کہا کہ دو بھی؟ کہا کہ دو بھی، پھر میں نے ایک کی گواہی کا حال نہیں پوچھا۔[1] (رواه أحمد وكذا رواه البخاري والترمذي والنسائي) سیدنا ابوزہیر ثقفی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو سنا، آپ ﷺ فرماتے تھے کہ قریب ہے کہ تم اپنے نیکوں کو بدوں سے جان لو گے؟ کہا کہ ایسا کیوں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اچھی اور بُری تعریف سے کہ تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔[2] (رواه ابن مردويه و ابن ماجه و أحمد)

شہادتِ امم میں لفظ "علی" کو "ناس" پر موخر کیا، جب کہ شہادتِ رسول میں مقدم فرمایا۔ یہ اس لیے کہ پہلی ترتیب میں اُمتِ اسلام کی شہادت کا ثبوت دوسری اُمتوں پر دینا ہے اور دوسری ترتیب میں اُمتِ اسلام کی شہادت کو خاص رسول اللہ ﷺ کی شہادت کے ساتھ کرنا ہے۔ اسی کے مثل یہ آیت ہے: ﴿ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ﴿٤١﴾ ﴾ [النساء: ٤١] "پھر ان کا کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور آپ (ﷺ) کو اس امت پر گواہ بنائیں گے؟"

موضح قرآن میں اُمتِ وسط اور ذکرِ شہادت کے نیچے یہ فائدہ لکھا ہے کہ جس طرح ان دونوں باتوں میں دیکھا کہ تمھارے پاس پوری بات ہے اور مخالفوں کے پاس ناقص، ایک یہ کہ تم سب نبیوں کو مانتے ہو، یہود و نصاریٰ کسی کو مانتے ہیں، کسی کو نہیں مانتے۔ دوسرے یہ کہ تمھارا قبلہ کعبہ ہے، جو ابراہیم کے وقت سے مقرر ہوا ہے اور سب کا ابراہیم پیشوا ہے، یہود و نصاریٰ کا قبلہ بعد میں ثابت ہوا۔ اسی طرح ہر بات میں تم پورے ہو اور دوسری اُمتیں ناقص ہیں، ان کو حاجت ہے کہ تم بتاؤ، تم کو حاجت نہیں کہ تمھیں کوئی اُمت بتائے، مگر تمھارا نبی ہی۔

تحویلِ قبلہ کی مصلحت:

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تبدیلِ قبلہ کی مصلحت بیان فرمائی کہ ہم نے جو پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کرنا مشروع کیا، پھر اس کو کعبے کی طرف پھیر دیا، یہ اس لیے کیا، تاکہ مطیع اور فرماں بردار کا حال نافرمان اور مرتد کے حال سے واضح ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ کون تمھاری پیروی کر کے کعبہ کی طرف منہ کرتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پھر کر دین سے برگشتہ ہو جاتا ہے۔ قبلے کی یہ تبدیلی اگرچہ بھاری معلوم ہوتی ہے، لیکن جن کے دل کو اللہ نے ہدایت کی ہے اور وہ رسول کی تصدیق کا یقین رکھتے ہیں اور جو کچھ رسول لایا ہے، اسے حق جانتے ہیں، یہ اُن پر کچھ بھاری نہیں

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٠) مسند أحمد (١/ ٢١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٥٩) سنن النسائي (١٩٣٤)
[2] سنن ابن ماجه (٤٢٢١) مسند أحمد (٣/ ٤١٦) مستدرك الحاكم (١/ ٢٠٨) امام حاکم اور ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

ہے، کیوں کہ وہ یہ بات جان چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو چاہے سو کرے۔ اس کو تکلیف دینے (حکم دینے) اور منسوخ کرنے کا اختیار ہے۔ اس کی حکمت تمام اور اس کی حجت غالب ہے۔ جن کے دل میں بیماری ہے، ان کا حال دوسرا ہے کہ جب کوئی نیا حکم آتا ہے تو ان کے دل میں بھی نیا شک پیدا ہوتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿١٢٤﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿١٢٥﴾ ﴾ [التوبة: ١٢٤۔ ١٢٥] ''اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو ان (منافقین) میں سے بعض ایسے ہیں جو (طنزاً) کہتے ہیں: تم میں سے کس کو اس (سورت) نے ایمان میں زیادہ کیا ہے؟ چناں چہ جو لوگ ایمان لائے ہیں، اس (سورت) نے ان کو ایمان میں زیادہ کیا ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے دلوں میں روگ ہے، تو اس (سورت) نے ان کی (پہلی) پلیدی پر مزید پلیدی کا اضافہ کر دیا اور وہ مرتے دم تک کافر ہی رہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ۭ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ﴾ [حم السجدة: ٤٤] ''کہہ دیجیے: وہ ان کے لیے، جو ایمان لائے، ہدایت اور شفا ہے اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور وہ اُن کے حق میں اندھاپن ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿٨٢﴾ ﴾ [بني إسرائيل: ٨٢] ''اور ہم قرآن میں سے جو نازل کرتے ہیں وہ مومنوں کے لیے شفا اور رحمت ہے، اور وہ ظالموں کو خسارے ہی میں زیادہ کرتا ہے۔''

اسی لیے جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرتے رہے اور ان کی اتباع کرتے رہے اور جدھر اللہ نے حکم دیا تھا، بغیر شک وشبے کے اس طرف منہ کیا، وہ ساداتِ صحابہ رضی اللہ عنہم ٹھہرے۔ بعض علما نے کہا ہے کہ سابقین اولین نے، خواہ مہاجرین تھے یا انصار، انھوں نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی ہے۔ بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ لوگ قبا میں صبح کی نماز پڑھ رہے تھے کہ اتنے میں ایک آدمی نے آکر یہ کہا کہ رسول اللہ ﷺ پر قرآن اُترا ہے اور یہ حکم ہوا ہے کہ کعبہ کی طرف منہ کرو۔ وہ اسی طرح کعبے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اس کو مسلم نے بھی روایت کیا مگر اور طرح سے۔[1] سنن ترمذی کے الفاظ یہ ہیں کہ وہ رکوع میں تھے۔ اسی حالت میں کعبے کی طرف مڑ گئے۔ اسی طرح مسلم نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔[2]

تحویلِ قبلہ سے پہلے کی نمازیں ضائع نہیں:

اس جگہ ایمان سے مراد نماز ہے، یعنی جو نماز قبلے کی تبدیلی سے پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کرکے پڑھی

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٩٥) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٢٦)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٢٧) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٤١)

تھی، اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس نماز کا ثواب ضائع نہیں ہوگا۔ صحیح میں آیا ہے کہ ایک قوم جو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتی تھی، مرگئی، تو لوگوں نے کہا کہ ان کا کیا حال ہوگا؟ اس پر یہ آیت اُتری: ﴿ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''اور اللہ ایسا نہیں کہ تمھارا ایمان ضائع کر دے۔''[1] (رواه الترمذي عن ابن عباس وصححه) موضح قرآن میں لکھا ہے کہ یعنی تمھارا قبلہ ابراہیم کے وقت سے کعبہ مقرر ہے، چند روز کے لیے بیت المقدس ٹھہرایا تھا، ایمان آزمانے کے لیے، اس میں جو لوگ ایمان پر قائم رہے، ان کا بڑا درجہ ہے۔

نماز کا نام ایمان:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں نماز کا نام ایمان رکھا۔ معلوم ہوا کہ جو مسلمان نمازی ہوتا ہے، وہی مومن ہوتا ہے، جو مسلمان کہلا کر نماز نہیں پڑھتا یا بے قاعدہ پڑھتا ہے یا کبھی پڑھتا ہے اور کبھی نہیں پڑھتا، وہ مومن نہیں ہے۔ اسی لیے صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جس نے عمداً نماز ترک کی، اس نے کفر کیا۔[2] اہلِ حدیث کے نزدیک یہی قول قوی اور راجح ہے۔ نماز کو ایمان اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں نیت، قول اور عمل سب کچھ جمع ہیں اور ایمان کی بھی یہی صفت ہے۔ واللہ أعلم.

منکرینِ نسخ کی تردید اور اجماع کی حجیت:

اس آیت میں منکرینِ نسخ کا رد ہے اور قرآن پاک سے سنت کے منسوخ ہونے پر دلیل ہے، کیوں کہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنا سنتِ فعلیہ سے ثابت ہوا تھا، قرآن کریم سے نہیں۔ اُمتِ وسط سے یہ بھی نکلا کہ اجماعِ امت حجت ہے، کیوں کہ جس پر ساری اُمت اتفاق کرے، اگر وہ اَمر باطل ہو تو اُمت کے صحیح ہونے پر دھبا لگ جائے گا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ اُمت ساری اُمتوں پر فضیلت رکھتی ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٤٤﴾

ہم آپ کے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا دیکھ رہے ہیں، تو ہم ضرور آپ کو اس قبلے کی طرف پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں، پھر آپ اپنا منہ مسجدِ حرام کی طرف پھیر لیں، اور جہاں کہیں بھی تم ہو اپنے منہ اس کی طرف پھیر لو اور بے شک وہ لوگ جنھیں کتاب

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٦٤)

[2] دیکھیں: التلخيص الحبير (٢/ ١٤٨)

دی گئی، وہ ضرور جانتے ہیں کہ بے شک یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ اس سے غافل نہیں جو وہ عمل کرتے ہیں ﴿144﴾

اسلام کا سب سے پہلا منسوخ حکم:

جب تک بیت المقدس کی طرف نماز کا حکم تھا تو رسول اللہ ﷺ کا دل کعبہ کو چاہتا تھا۔ آپ ﷺ نماز میں آسمان کی طرف نگاہ کرتے کہ شاید فرشتہ کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم لاتا ہو، پھر یہ آیت اتری۔ اس وقت سے بیت اللہ قبلہ مقرر ہوا۔ اس سے باشارۃ النص اللہ کا بلند اور آسمان، یعنی عرش پر مستوی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلی چیز جو منسوخ ہوئی، وہ یہی قبلہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ میں آئے تو یہاں کے باشندے اکثر یہودی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تم بیت المقدس کی طرف منہ کرو۔ یہود خوش ہو گئے، چند ماہ تک یہی حال رہا۔ رسول اللہ ﷺ قبلۂ ابراہیم علیہ السلام کو پسند کرتے تھے۔ اللہ سے دعا مانگتے اور آسمان کی طرف دیکھا کرتے۔ اس پر یہ آیت اُتری۔[1] یہودی شک کرنے لگے کہ یہ کیوں ہوا؟ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں، یعنی اس میں تمھارا کیا اختیار ہے، جدھر چاہا، حکم دے دیا۔

کیا قبلہ عین کعبہ ہے یا جہتِ کعبہ؟

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ منہ پھیرنے سے مراد مسجد الحرام کی طرف منہ پھیرنا ہے۔[2] یہی بات دوسروں نے بھی کہی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک قول بھی اسی کے موافق ہے، یعنی غرض یہ ہے کہ مکہ میں توجہ عین کعبہ کی طرف ہو۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد توجہ کرنے کی جگہ ہے۔ اکثر لوگ اسی طرف گئے ہیں۔ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ، امام ابو العالیہ، مجاہد، عکرمہ، قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا کہ طرف سے مراد کعبہ کا سامنا ہے۔[3] حدیث میں آیا ہے کہ اہلِ مدینہ کے لیے مشرق اور مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔[4] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ بیت اللہ اہلِ مسجد کا قبلہ ہے، مسجد اہلِ حرم کا قبلہ ہے، حرم سارے اہلِ زمین کا قبلہ ہے، میری امت خواہ مشرق میں ہو یا مغرب میں۔[5] (رواہ ابن جریر)

---

① تفسیر الطبري (٣/ ١٧٤) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٥٣) اس کی سند حسن ہے۔

② تفسیر الطبري (٣/ ١٧٦) اس کی سند حسن ہے۔

③ تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٥٣) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٥٤)

④ سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٤٤) سنن النسائي، رقم الحدیث (٢٢٤٣) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٠١١) امام البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ إرواء الغلیل (١/ ٣٢٣)

⑤ سنن البیهقي الکبریٰ (٢/ ٩) اس روایت کی سند میں ”عمر بن حفص المکی“ ضعیف راوی ہے۔ السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (٤٣٥١)

ابو سعید بن معلی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں صبح سویرے مسجد کی طرف جاتے تھے اور وہاں نماز پڑھتے تھے۔ ایک دن جو وہاں گزر ہوا تو دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ منبر پر بیٹھے ہیں۔ ہم نے کہا کہ کوئی نیا حکم آیا ہے، چناں چہ ہم بھی بیٹھ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)۔ جب پڑھ چکے، میں نے اپنے رفیق سے کہا: آؤ، دو رکعتیں پڑھ لیں، اس سے پہلے کہ رسول اللہ ﷺ منبر سے اتریں، تاکہ ہم اول نماز پڑھنے والے ہوں، پھر ہم نے چھپ کر نماز پڑھی۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اُتر کر لوگوں کو ظہر کی نماز پڑھائی۔[1] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی اس نماز کو ظہر بتلاتے تھے اور صلاۃِ وسطی کہتے تھے۔ مگر مشہور یہ ہے کہ وہ عصر کی نماز تھی۔ اسی نماز کا نام صحیحین میں وسطی آیا ہے۔[2] یہی وجہ تھی کہ اہلِ قبا کو خبر دیر سے صبح کی نماز کے وقت پہنچی۔[3] نویلہ بنت مسلم رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ وہ ظہر یا عصر کی نماز تھی کہ جب بنی حارثہ کی مسجد والوں نے کعبہ کی طرف منہ کر لیا اور یہ خبر جب آنحضرت ﷺ کو پہنچی تو فرمایا: «أُولٰئِكَ رِجَالٌ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ» ''یہ وہ لوگ ہیں، جو غیب کے ساتھ ایمان لاتے ہیں۔''[4] (رواہ ابن مردویہ)

قبلہ رخ ہونے کی شرط اور استثناء:

اللہ تعالیٰ نے آیت زیرِ تفسیر میں کعبے کی طرف منہ کرنے کا عام حکم دیا ہے کہ ساری زمین والے، خواہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، جنوب میں ہوں یا شمال میں، کہیں بھی ہوں، منہ کعبہ ہی کی طرف کریں، سوائے حالتِ سفر میں نفل نماز کے کہ اس کو اسی طرف پورا کرے، جس طرف جسم ہو، مگر دل کعبے ہی کی طرف متوجہ ہو۔ اسی طرح جنگ کی حالت میں جدھر ممکن ہو، نماز پڑھ سکتا ہے اور اسی طرح جس نے کوشش کر کے نماز پڑھی، مگر قبلے کی سمت میں نہ پڑھ سکا تو اس کی نماز ہوگئی۔ اللہ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

مالکیہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ نمازی نماز میں امام کی طرف دیکھے، سجدے کی جگہ نہ دیکھے۔ امام شافعی، احمد اور ابو حنیفہ رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے۔ مالکیہ کہتے ہیں کہ اگر سجدے کی جگہ کو دیکھے گا تو ایک طرح کا انحناء (جھکاؤ) کرنا پڑے گا، یہ کمالِ قیام کے منافی ہے۔ بعض اہلِ علم نے یوں کہا ہے کہ حالتِ قیام میں سینے کی طرف دیکھے۔ قاضی شریک نے کہا ہے کہ نہیں، بلکہ سجدے کی جگہ پر نظر رکھے۔ جمہور علما کا یہی قول ہے، کیوں کہ اس میں

---

[1] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٢٩١) اس کی سند میں ''مروان بن عثمان'' ضعیف راوی ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٠٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٢٧)

[3] تفسير ابن كثير (١/ ٢٠٤)

[4] المعجم الكبير (٢٥/ ٤٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه إسحاق بن إدريس الأسواري وهو ضعيف متروك" مجمع الزوائد (٢/ ١٢١)

خضوع وخشوع اچھی طرح بنتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک حدیث بھی آئی ہے کہ جب رکوع کرے تو دونوں پاؤں کی جگہ کو دیکھے۔ جب سجدہ کرے تو موضع بنی (ناک کی جگہ) کو دیکھے، جب قعدے میں ہو تو ایک جانب نظر رکھے۔[1]

یہودیوں کو تحویلِ قبلہ کا علم تھا:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہودی جو تمھارے کعبے کی طرف منہ کرنے کو نہیں مانتے اور بیت المقدس سے پھر جانے پر شک کرتے ہیں، ان کو یہ خوب معلوم ہے کہ اللہ اپنے رسول (ﷺ) کو کعبے ہی کی طرف منہ کرنے کا حکم دے گا۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنے انبیا سے اپنی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کی تعریفیں اور صفات کے بارے میں اور اسلام کی امامت اور اس اُمتِ مرحومہ کی خصوصیتوں کے حالات اور آپ ﷺ کی بزرگی اور شریعتِ کاملہ وعظیمہ کے بارے میں اور اس دین میں نسخ کے واقع ہونے کے بارے میں سن لیا ہے، لیکن حسد، کفر اور عناد کی وجہ سے اس حق کو چھپاتے ہیں۔ اسی لیے اللہ نے ان کو یہ دھمکی دی ہے کہ اللہ تمھارے عمل سے غافل نہیں ہے، تم کو تمھارے اس حسد، کفر اور عناد کی سزا ضرور دے گا۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ
وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۭ وَلَئِنِ
اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ
الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٤٥﴾

اور (اے نبی!) اگر آپ ان لوگوں کے پاس ہر قسم کی نشانی لے آئیں جنھیں کتاب دی گئی تو بھی وہ آپ کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے، اور نہ آپ ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے ہیں اور ان میں سے کوئی گروہ دوسرے گروہ کے قبلے کی پیروی کرنے والا نہیں اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی، اس علم کے بعد جو آپ کے پاس آچکا ہے تو یقیناً اس وقت آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے (145)

یہودیوں کا انکار اور عناد:

اس آیت میں اس بات کی خبر دی ہے کہ یہ یہودی بڑے کافر، دشمن اور مخالف ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو پہچان کر بھی انکار کرتے ہیں۔ ان کے پاس اگر دینِ اسلام کی سچائی اور حقیقت کی ہزاروں دلیلیں بھی لے آؤ تو بھی یہ ان کو مانیں گے نہ اپنی خواہشات کی پیروی ہی چھوڑیں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٥٤، ٢٥٥)

رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٩٦﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿٩٧﴾ [یونس: ۹۶، ۹۷] ”بے شک جن لوگوں کے بارے میں آپ کے رب کا حکم (عذاب) صادر ہو چکا، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آ جائیں، حتی کہ وہ دردناک عذاب (بھی) دیکھ لیں۔“ اسی لیے اس جگہ یوں فرمایا ہے کہ اگر تو ان کے پاس ساری نشانیاں لے آئے تو بھی یہ تیرے قبلے پر نہیں چلیں گے اور نہ تو ان کے قبلے پر چلے گا۔ اس میں یہ خبر دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم کے نہایت درجہ تابع ہیں۔ جس طرح اہلِ کتاب اپنی آرا اور خواہشات کو پکڑے ہوئے ہیں، اسی طرح رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے احکام، اس کی فرماں برداری، اطاعت اور رضا مندی پر جمے ہوئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے کسی حال میں بھی ان کی خواہشات کی پیروی نہیں ہوگی، خواہ قبلے کا معاملہ ہو یا اور کچھ۔

اہلِ کتاب کا اپنا اپنا قبلہ مقرر کرنا اجتہاد پر مبنی تھا:

آیت زیرِ تفسیر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہلِ کتاب آپس میں بھی ایک دوسرے سے متفق اور موافق نہیں ہیں، اگرچہ رسول کی پیروی پر حرص ظاہر کرتے ہیں۔ یہی ایک قبلے کے مسئلے کو لے لو۔ یہودی تو بیت المقدس کی طرف منہ کرتے ہیں اور نصاریٰ مشرق کی طرف کرتے ہیں۔ امام ابن القیم رحمہ اللہ نے ”بدائع الفوائد“ میں لکھا ہے کہ اہلِ کتاب کا قبلہ کسی وحی یا اللہ کے مقرر کرنے سے نہیں ہے، بلکہ یہ ان کے مشورے اور اجتہاد سے مقرر ہوا تھا۔ نصاریٰ کو تو انجیل میں یقیناً کوئی حکم مشرق کو قبلہ مقرر کرنے کا نہیں دیا گیا، وہ خود اس بات کے اقراری ہیں کہ مسیح علیہ السلام کا قبلہ بھی بنی اسرائیل ہی کا قبلہ تھا، یعنی بیت المقدس کا گنبد (صخرہ) تھا۔ ان کے بڑے بوڑھوں نے یہ قبلہ تجویز کیا تھا۔ لہٰذا نصاریٰ اس بات پر یہود کے ساتھ متفق ہیں کہ اللہ نے کبھی اپنے رسول کو بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم نہیں دیا اور نہ یہ قبلہ ان کے لیے مشروع کیا۔ ان کی اس بات پر مسلمان بھی گواہ ہیں۔ تورات میں کسی جگہ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم نہیں ہے۔ تابوت کو رکھ کر نماز پڑھتے تھے۔ جب صخرہ پر آتے تو تابوت کو رکھ دیتے۔ تابوت کے اٹھائے جانے کے بعد صخرہ کو قبلہ ٹھہرا لیا تھا۔[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے عالم کو، جس کو بے علم کے مقابلے میں زیادہ حجت قائم ہوتی ہے، اس بات سے ڈرایا ہے کہ جس حق کو وہ جان چکا ہے، اس کی مخالفت نہ کرے۔

تقلید کی مذمت:

اسی لیے رسول اللہ ﷺ اور اُمت کو خطاب میں یہ کہا گیا کہ اگر ایسا کرو گے تو تم ظالم ٹھہرو گے۔ فتح البیان میں اس جگہ اہلِ بدعت و ہویٰ کی تردید میں ایک بہت اچھی تقریر کی گئی ہے۔[2] حدیث میں آیا ہے کہ علم تین چیزیں ہیں:

---

[1] بدائع الفوائد (۴/ ۹۷۸)   [2] فتح البیان (۱/ ۳۰۹)

ایک آیتِ محکمہ، یعنی قرآن، دوسری سنتِ قائمہ، یعنی حدیث، تیسری فریضۂ عادلہ، یعنی وراثت کے احکام۔ پھر فرمایا کہ جو کچھ ان کے سوا ہے، وہ فضول ہے، یعنی زائد ہے۔[1] معلوم ہوا کہ تقلیدِ مذاہب دائرہ علم سے باہر ہے۔ جو شخص تقلید کا قائل اور فاعل ہے، وہ لوگوں کی آرا و خواہشات کا پیروکار ہے، لہٰذا یہ تقلید جب علم کے بعد ہوگی تو مقلد ظالمین میں سے ہو جائے گا۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٤٦﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿١٤٧﴾

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس (رسول) کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ اور بے شک ان میں سے ایک گروہ ضرور حق کو چھپاتا ہے، حالاں کہ وہ جانتے ہیں (146) یہ حق ہے تمھارے رب کی طرف سے، لہٰذا (اس کے متعلق) تم ہرگز شک میں نہ پڑنا (147)

یہودیوں کا رسول اللہ ﷺ کو پہچاننا اور حق چھپانا:

عرب لوگ کسی شے کی صحت کے لیے یہ مثل بولتے تھے، جس طرح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص سے، جس کے ساتھ ایک چھوٹا بچہ تھا، پوچھا: کیا یہ تیرا بیٹا ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں، آپ گواہ رہیں۔ فرمایا کہ تمھارا تمھارے بیٹے پر اور تمھارے بیٹے کا تم پر کوئی معاملہ بھی پوشیدہ نہیں ہے[2] (یعنی نسبی تعلق ایک دوسرے کا بہتر جانتے ہو)۔ امام قرطبی نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے کہا کہ تم محمد ﷺ کو ویسے ہی پہچانتے ہو، جیسے اپنے بیٹے کو؟ کہا کہ ہاں، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ آسمان کا امین زمین کے امین پر ان کی تعریف لے کر اُترا۔ میں نے ان کو پہچان لیا، مگر بیٹے کے بارے میں یقین کے ساتھ میں نہیں جانتا کہ اس کی ماں کون ہے، ممکن ہے اس نے خیانت کر لی ہو۔[3]

یا یہ مراد ہے کہ جس طرح آدمی اپنے بیٹے کو دوسروں کے بیٹوں میں سے پہچان لیتا ہے اور کسی طرح کا شک نہیں کرتا، اسی طرح اہلِ کتاب نبی اکرم ﷺ کی تعریف اور صفت کو بلاشک وشبہہ بہ خوبی پہچانتے ہیں، مگر اس تحقیق

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٨٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٤) اس کی سند میں ''عبدالرحمٰن بن رافع تنوخی'' ضعیف راوی ہے۔ ضعيف الجامع، رقم الحديث (٣٨٧١)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٩٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٨٣٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٦٧١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٧٤٩، ٩٩٠)

[3] تفسير القرطبي (٢/ ١٦٣)

اورعلمی اتفاق کے باوجود اپنی ہٹ دھرمی سے حق کو، جو ان کی کتابوں میں ہے، لوگوں سے چھپاتے ہیں۔ اس پر اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو تسلی دی کہ یہ لوگ اگر جان پہچان کر حق کو چھپاتے ہیں تو چھپاتے رہیں، لیکن تم کسی طرح کا شک نہ کرو۔ حق یہی ہے جو تمھارے رب کی طرف سے تمھیں سکھایا اور بتایا گیا ہے۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾

اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ منہ پھیرتا ہے، لہٰذا تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔ تم جہاں کہیں بھی ہو گے، اللہ تم سب کو لے آئے گا، بے شک اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے (148)

ہر اُمت کا ایک قبلہ ہے:

یعنی یہ ضد ہے کہ ہمارا قبلہ بہتر ہے اور تمھارا عبث ہے۔ بہتری اسی میں ہے، جو نیکیوں میں زیادہ ہے۔ ہر اُمت کو ایک ایک قبلے کا حکم ہوا تھا، آخر سب کو ایک جگہ جمع ہونا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی الفاظ یہ ہیں کہ مراد اہلِ ادیان ہیں۔ ہر قبیلے نے ایک قبلہ پسند کر لیا تھا۔ اللہ کا منہ اسی طرف ہے، جدھر مومنوں کا منہ ہے۔[1] امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہودی ایک طرف منہ کرتے ہیں اور نصرانی ایک طرف۔ تم کو اللہ تعالیٰ نے قبلہ بتا دیا کہ تم اُدھر منہ کیا کرو۔ یہی بات مجاہد، عطا، ضحاک، ربیع اور سدی رحمہم اللہ نے بھی کہی ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر قوم کو یہی حکم تھا کہ وہ کعبے کی طرف نماز پڑھا کریں۔[2] یہ آیت اس آیت کے مشابہ ہے: ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا﴾ [المائدة: ٤٨] ”ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک دستور اور طریقہ بنایا اور اگر اللہ چاہتا تو تمھیں ضرور ایک امت بنا دیتا، لیکن وہ چاہتا ہے کہ تمھیں اس (کتاب) کے بارے میں آزمائے جو اس نے تمھیں دی ہے، چناں چہ تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو، تم سب نے اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔“ مطلب یہ کہ اللہ زمین میں سے سب کو جمع کرنے پر قادر ہے، اگرچہ بدن جدا ہو گئے ہوں اور مردے خاک بن گئے ہوں۔

فتح البیان میں لکھا ہے کہ آیت زیرِ تفسیر کا مطلب یہ ہے کہ ہر صاحبِ ملت کا ایک قبلہ ہے اور وہ اس طرف منہ کرتا ہے۔ مسلمانوں کا قبلہ کعبہ ہے۔ یہودیوں کا بیت المقدس اور نصاریٰ کا (مشرق) ہے۔ اے امتِ محمد ﷺ! تم

---

(1) تفسیر الطبري (٣/ ١٩٢۔ ١٩٣) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٥٦) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

(2) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٥٦، ٢٥٧)

میں سے ہر ایک کے لیے ایک قبلہ ہے، جدھر وہ نماز پڑھتا ہے، مشرق یا مغرب، جنوب یا شمال، یہ معنی اس بنیاد پر ہیں کہ خطاب اہلِ اسلام کو ہو۔

اول وقت میں نماز کا استحباب:

لہٰذا تم اے مسلمانو! بیت الحرام کی طرف منہ کرنے کے لیے جلدی کرو، یعنی نماز کو اول وقت پڑھا کرو کہ یہ افضل ہے، کیوں کہ ظاہر صیغۂ امر وجوب ہوتا ہے۔ جب وجوب ثابت نہ ہو تو استحباب کا ادنیٰ درجہ ہے۔ یہ آیت مذہبِ شافعی کی دلیل ہے، کیونکہ وہ اول وقت کی نماز کی افضلیت کے قائل ہیں۔ اول وقت میں یہی سبق ہے کہ کسی شے کے پاس اول اول پہنچ جائے۔ کام میں جلدی کرے، دیر نہ ہونے دے۔

قیامت کے دن اُٹھانا:

تم دنیا کے مختلف کناروں میں کسی طرف ہی کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمھیں جزا کے لیے اکٹھا کرے گا۔ اس میں اطاعت گزاروں کے لیے ثواب کا وعدہ ہے اور نافرمانوں کے لیے عذاب کی وعید ہے۔ یا تمھاری نمازوں کو جو مختلف سمتوں میں ادا کی گئیں، ایک سمت کی طرح کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ جب ہر چیز پر قادر ہوا تو اس پر بھی قادر ہے کہ موت کے بعد تمھیں دوبارہ زندہ کر کے لوٹا دے۔[1]

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٩﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٠﴾

اور (اے نبی!) آپ جہاں سے بھی نکلیں، اپنا منہ مسجدِ حرام کی جانب پھیر لیں اور بے شک وہ آپ کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ اس سے غافل نہیں جو تم عمل کرتے ہو (149) اور آپ جہاں سے بھی نکلیں، اپنا منہ مسجدِ حرام کی جانب پھیر لیں۔ اور (اے مسلمانو!) تم جہاں کہیں بھی ہو، اپنے منہ اسی کی جانب پھیر لو، تاکہ تمھارے خلاف لوگوں کے لیے کوئی حجت نہ رہے۔ ہاں، ان میں سے جنھوں نے ظلم کیا (وہ باتیں کرتے رہیں گے)، پس تم ان سے مت ڈرو اور

[1] فتح البیان (۱/ ۳۱۱۔ ۳۱۲)

صرف مجھ سے ڈرو، تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کروں اور شاید کہ تم ہدایت پاؤ ﴿150﴾

منسوخیِ قبلہ کے تین مرتبہ ذکر کی وجہ:

مسجد الحرام مکے کی مسجد کو کہتے ہیں۔ حرام کے معنی کسی جگہ بند رہنا ہے۔ اس جگہ کئی باتیں منع ہیں، جیسے: آدمی کو مارنا، جانور کو ستانا، درخت کا کاٹنا، گھاس کا اُکھاڑنا، گرا پڑا مال اُٹھانا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں تیسرا حکم زمین کے تمام کناروں کو چھوڑ کر مسجد الحرام کی طرف منہ کرنے کا ہے۔ اس حکم کو دہرانے کی حکمت میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ تاکید کے لیے ہے، کیوں کہ قرآن مجید میں سب سے پہلے منسوخی کا حکم یہی قبلے کا مسئلہ ہے جو اسلام میں واقع ہوا ہے۔ اور کسی نے کہا ہے کہ پہلا حکم اس کے لیے ہے جو کعبہ کو دیکھ رہا ہے اور دوسرا حکم اس کو ہے جو مکہ میں موجود ہے، مگر کعبہ سے غائب ہے اور تیسرا حکم اس کو ہے جو باقی شہروں میں رہتا ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے اسی کو لائقِ توجہ قرار دیا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قابلِ ترجیح یہ بات ہے کہ پہلا حکم اس کے لیے ہے جو مکہ میں ہے، دوسرا حکم اس کے لیے ہے جو باقی جگہوں میں ہو اور تیسرا اس کو ہے جو سفر میں ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ وغیرہ نے اس کے علاوہ اور بھی حکمتیں ذکر کی ہیں۔[1]

یہود کے اعتراضات:

اس ارشاد سے کہ لوگوں کو تم پر کوئی اعتراض نہ رہے، اہلِ کتاب مراد ہیں، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اس اُمت کی جملہ صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ ان کا قبلہ کعبہ ہوگا۔ لٰہذا جب یہ اس طرف منہ نہ کریں گے تو ان کو مسلمانوں پر حجت کرنے کا ایک موقع ملے گا۔ یا وہ یہ حجت پیش کریں گے کہ مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کے سلسلے میں ہمارے موافق ہیں۔ اس کو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے زیادہ بہتر قرار دیا ہے۔[2] امام ابو العالیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبے کی طرف متوجہ ہوئے تو اہلِ کتاب نے کہا کہ اس شخص کو اپنے باپ کے گھر اور اپنی قوم کے دین کا شوق ہے۔ پہلے جب بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے تو یوں کہتے تھے کہ عن قریب یہ شخص ہمارے دین میں آجائے گا، جس طرح ہمارے قبلے کو مانتا ہے۔ امام مجاہد، عطا، ضحاک، ربیع، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ انھوں نے اس جگہ ظالموں سے مراد مشرکینِ قریش لیے ہیں،[3] جنھوں نے یہ بات کہی تھی کہ آخر ہمارے ہی قبلے کی طرف رجوع کیا۔

اتمامِ نعمت کا مطلب ہے کہ ہم نے تم کو ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ بتا دیا۔ ملتِ حنیفیہ کو تمھارے لیے تمام کر دیا، یا مراد دینِ اسلام پر مرنا ہے، یا جنت میں داخل ہونا، یا اللہ تعالیٰ کا حشر میں دیکھنا مراد ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٥٦) تفسیر الرازي (٤/ ١٢٥، ١٢٦) تفسیر القرطبي (٢/ ١٦٨)

[2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٥٦، ٢٥٧) [3] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٥٨، ٢٥٩)

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿151﴾ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿152﴾

جیسے ہم نے تمھارے لیے تمھی میں سے ایک رسول بھیجا، وہ تم پر ہماری آیتیں تلاوت کرتا ہے اور تمھیں پاک کرتا ہے اور تمھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمھیں وہ (باتیں) سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے ﴿151﴾ چناں چہ تم مجھے یاد کرو، میں تمھیں یاد کروں گا اور تم میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو ﴿152﴾

بعثتِ نبوی نعمتِ عظمیٰ ہے:

اللہ پاک نے اس آیت میں مومنین کو اپنی نعمت یاد دلائی ہے کہ دیکھو ہم نے رسول (محمد ﷺ) بھیجا، جو اللہ کی آیاتِ بینات تم کو سناتا ہے، اخلاقِ رذیلہ اور زمانۂ جاہلیت کے لوگوں کے افعال کی گندگی سے تم کو پاک کرتا ہے، اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد سنت، یعنی حدیث ہے۔ جو بات جاہلیت میں نہیں جانتے تھے اور جو بے وقوفی کی بات کیا کرتے تھے۔ رسالت کی برکت سے یہ ہوا کہ حالت اولیا جیسی اور خصلتیں علما جیسی ہوگئیں۔ جاہل سے عالم، احمق سے عقل مند، ظالم سے عادل اور فاسق سے صالح بن گئے۔ لوگوں کے مقابلے میں علم میں گہرے، دل میں بڑے نیک اور پاک، تکلف میں سب سے کم اور لہجے میں سب سے زیادہ سچے ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿164﴾﴾ [آل عمران: ١٦٤] ''بے شک اللہ نے مومنوں پر احسان کیا، جب ان میں انھی میں سے ایک رسول بھیجا، وہ انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور بے شک وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔'' راہِ سنت کے بارے میں کہا گیا ہے ؎

گر نہ ہوتی ذات پاک انبیا حق سے باطل کس طرح ہوتا جدا

کفرانِ نعمت کی مذمت اور شکر گزاری کا طریقہ:

پھر ان لوگوں کی مذمت فرمائی جو اس نعمت کی قدر نہیں پہچانتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿28﴾﴾ [ابراھیم: ٢٨] ''کیا آپ نے ان لوگوں کو دیکھا نہیں جنھوں نے

اللہ کی نعمت (ایمان) کو کفر سے بدل ڈالا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں لے جا اُتارا؟'' سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت سے مراد اس جگہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اسی لیے اللہ نے مومنوں سے یہ کہا ہے کہ تم اس نعمت کا اقرار کرو اور اس نعمت کے مقابلے میں ذکر وشکر سے پیش آو۔[1] قرآن پاک میں، جہاں کہیں لفظِ کتاب و حکمت اکٹھا آیا ہے، اس کا ترجمہ سلف نے قرآن و حدیث کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا ذکر وشکر یہی ہے کہ ان دونوں کو پکڑے رہیں، جو لوگ ایسا نہیں کرتے، وہ ناشکرے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان لا کر، مسلمان بن کر اللہ کی بات نہ سنیں، اس کی کتاب پر نہ چلیں، رسول کی سنت کو نہ مانیں اور اس پر عمل نہ کریں۔ زید وعمرو کے کہنے اور سننے کو سند پکڑیں، اللہ اور پیغمبر کا مقابلہ علما و اولیا سے کریں۔ مخلوق کو خالق کے مقابلے میں اور اُمت کو رسول ﷺ کے روبرو لے آئیں۔ اس سے زیادہ اور کیا ناشکری ہوگی۔

زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ اے رب! میں تیرا شکر کس طرح کروں؟ فرمایا: تو مجھے یاد رکھ بھول مت، یہی تیرا شکر ہے۔ جب تو مجھ کو بھول جائے گا تو پھر ناشکرا ہو جائے گا۔ حسن بصری، ابو العالیہ، سدی، ربیع رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ اس کو یاد کرتا ہے، جو اسے یاد کرے۔ اس کو بڑھاتا ہے، جو اس کا شکر بجا لائے۔ اس کو عذاب کرتا ہے، جو ناشکری کرتا ہے۔[2] بعض سلف نے ﴿ اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ﴾ [آل عمران: ۱۰۲] ''اللہ سے اس طرح ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے۔'' کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ اللہ کی اطاعت کی جائے، نافرمانی نہ ہو۔ اس کا ذکر کیا جائے، اس کو نہ بھولے، شکر بجا لائے، کفرانِ نعمت نہ کرے۔

جنید سے کسی نے پوچھا تھا کہ شکرِ نعمت کیسے ہوتا ہے؟ کہا کہ جو نعمت اللہ دے، اس کو اللہ کی مرضی کے خلاف خرچ نہ کرے۔ یہی اس نعمت کا شکر ہے۔ امام مکحول اَزدی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا تھا کہ کیا قاتلِ نفس، شراب پینے والا، چوری کرنے والا اور زانی اللہ کا ذکر کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: ﴿ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''لہٰذا تم یاد رکھو مجھے میں یاد رکھوں کا تمھیں۔'' کہا کہ ہاں جب یہ لوگ اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو اللہ بھی ان کا ذکر لعنت کے ساتھ کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ خاموش ہو جائیں۔[3]

اللہ کو یاد کرنے والے کو اللہ کا یاد کرنا:

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم مجھ کو فرائض میں یاد کرو، مَیں تم کو اس کام میں یاد کروں گا، جو مَیں نے

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۵۷) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۶۰، ۲۶۱)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۶۰) اس کی سند حسن ہے۔

اپنے نفس پر واجب کیا ہے۔ امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تم مجھ کو فرماں برداری میں یاد کرو، مَیں تم کو بخشش یا رحمت سے یاد کروں گا۔① سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تمھیں اللہ پاک یاد کرے، یہ اس سے بہت بڑی چیز ہے کہ تم اس کو یاد کرو۔② صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جس نے مجھے اپنے جی میں یاد کیا، اس کو میں بھی اپنے جی میں یاد کرتا ہوں۔ جو مجھ کو مجمع میں یاد کرتا ہے، میں اس کو اس سے بہتر مجمع میں یاد کرتا ہوں۔③ امام احمد رحمہ اللہ نے انس رضی اللہ عنہ سے یوں مرفوعاً روایت کیا ہے کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے: اے ابن آدم! تو اگر مجھے اپنے جی میں یاد کرے گا تو میں تجھے اپنے جی میں یاد کروں گا، اور اگر تو مجھ کو مجمع میں یاد کرے گا تو میں تجھ کو فرشتوں کے مجمع میں یا تیرے مجمع سے بہتر مجمع میں یاد کروں گا، تو اگر ایک بالشت میرے نزدیک ہوگا تو مَیں ایک گز تیرے نزدیک ہوں گا، اور تو اگر مجھ سے ایک گز نزدیک ہوگا تو میں تجھ سے ایک باع (دونوں ہاتھ کے پھیلاؤ کے برابر) نزدیک ہوں گا، تو اگر میرے پاس چل کر آئے گا تو میں تیرے پاس دوڑ کر آؤں گا۔④ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے، اس کو بخاری نے بھی حدیثِ قتادہ سے روایت کیا ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ رحمت کے ساتھ قریب تر ہے۔

ذکر کی اقسام اور ذکر و شکر کا تعلق:

ذکر تین طرح سے ہوتا ہے: ایک زبان سے، جیسے: تسبیح، تحمید اور تہلیل وغیرہ، یعنی اذکارِ ماثورہ کا پڑھنا۔ دوسرا دل سے کہ اللہ کی پیدا کی ہوئی مخلوقات اور عجیب مصنوعات میں غور و فکر کرنا، ان کو وحدانیت کی دلیل سمجھنا۔ تیسرا اپنے جوارح، یعنی اعضا سے جن کاموں کا حکم ہے، ان کو بجا لانا، جیسے: نماز وغیرہ ادا کرنا۔

اس آیتِ شریفہ میں ذکر کے بیان کے بعد شکر کا ذکر کیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے شکر کا حکم کیا اور شکر پر خیر کی زیادتی کا وعدہ فرمایا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ﴾ [إبراهيم: ٧] ”اور جب تمھارے رب نے آگاہ کر دیا کہ اگر تم شکر کرو گے تو یقیناً میں تمھیں مزید دوں گا اور اگر تم کفر کرو گے تو بلاشبہہ میرا عذاب بہت شدید ہے۔“ معلوم ہوا کہ شکر کرنے پر مزید عطا کا وعدہ ہے۔ عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے، کہتے ہیں کہ جس کسی پر اللہ انعام کرتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اپنی مخلوق یا بندے پر اس نعمت کا اثر دیکھے۔⑤ (رواه أحمد)

---

① تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٦٠۔ ٢٦١) ② تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٦٠) اس کی سند میں ”عطیہ عوفی“ ضعیف راوی ہے۔

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٥)

④ صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٩٨) مسند أحمد (٣/ ١٣٨)

⑤ مسند أحمد (٤/ ٤٣٨) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”ورجال أحمد ثقات“ مجمع الزوائد (٥/ ٢٣٢)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (153) اور جو اللہ کی راہ میں قتل کر دیے جائیں، انھیں تم مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تم شعور نہیں رکھتے (154)

صبر اور نماز کی فضیلت، نیز صبر کا مفہوم اور اقسام:

اللہ نے شکر کے بیان کے بعد صبر کا بیان کیا، کیوں کہ بندہ یا تو نعمت میں ہوتا ہے تو اس پر شکر واجب آتا ہے یا کسی تکلیف میں ہوتا ہے تو اس پر صبر کرنا لازم ہے۔ حدیث میں ہے کہ مومن کی بھی عجب حالت ہے، اللہ اس کے لیے کوئی بھی حکم کرتا ہے تو وہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے۔ اگر خوشی پہنچی اور شکر کیا تو اچھا ہوا اور اگر نقصان پہنچا اور صبر کیا تو بھی بہتر ہوا۔[1] غرض کہ مصیبتوں پر تحمل، صبر اور نماز کے ذریعے سے مدد طلب کرنا بڑا ہی عمدہ عمل ہے۔ پہلے پارے میں گزر چکا ہے: ﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ ﴾ [البقرة: ٤٥] ''اور تم صبر اور نماز کے ذریعے سے اللہ کی مدد طلب کرو، اور بے شک یہ بہت بھاری ہے، مگر عاجزی کرنے والوں پر (بھاری نہیں)۔'' حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی غم ستاتا تو نماز پڑھنے لگتے۔[2]

رہا صبر تو وہ دو طرح کا ہوتا ہے: ایک صبر حرام کی ہوئی چیزوں اور گناہ کے کاموں کو ترک کر دینا اور دوسرا صبر اطاعتِ الٰہی اور اللہ کا قرب حاصل کرنے والے کاموں پر ہے۔ دوسرے صبر کا ثواب زیادہ ہے، کیوں کہ مقصود یہی صبر ہے۔ تیسرا صبر مصیبتوں، صعوبتوں اور تکالیف پر ہوتا ہے۔ یہ صبر بھی واجب ہے، جیسے: عیوب سے استغفار کرنا۔ عبدالرحمٰن بن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صبر دو چیزوں میں ہے: ایک صبر اللہ کے لیے اس اَمر پر، جس کو وہ محبوب رکھتا ہے، گو وہ جان اور بدن پر بھاری ہو۔ دوسرا صبر اس چیز سے، جس کو وہ ناخوش رکھتا ہے، گو دل اسی طرف مائل ہو، لہٰذا جو شخص اس طرح ہوتا ہے، وہی ان صابرین میں سے ہے، جو ان شاء اللہ صحیح سالم رہیں گے۔[3]

امام زین العابدین رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب اللہ سارے اگلے پچھلے لوگوں کو جمع کرے گا تو ایک منادی پکارے گا کہ صبر کرنے والے کدھر ہیں، وہ حساب سے پہلے جنت میں جائیں۔ لوگوں کا ایک گروہ اُٹھ کھڑا ہوگا، فرشتے آگے

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٩٩) [2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٣١٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٧٠٣)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٦٢)

بڑھ کر ان سے ملاقات کریں گے اور کہیں گے: کدھر چلے ہو؟ وہ کہیں گے: جنت کو۔ یہ کہیں گے: حساب سے پہلے؟ وہ کہیں گے: جی ہاں، ہم صابرین ہیں۔ یہ کہیں گے: تمھارا کیا صبر تھا؟ وہ کہیں گے کہ اللہ کی اطاعت پر اور اس کی معصیت سے صبر کیا، یہاں تک کہ ہم کو موت آئی۔ یہ کہیں گے کہ تم ایسے ہی ہو، جو تم نے کہا، آؤ جنت میں جاؤ، عمل کرنے والوں کا اجر بہت اچھا ہے۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت اس روایت کی گواہ ہے: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [الزمر: ۱۰] ''بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ان کا پورا پورا اجر بے حساب دیا جائے گا۔'' سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بندے کا مصیبت پر اپنی غلطی کا اعتراف کرنا اور اللہ سے ثواب کی امید رکھنا صبر ہے۔ آدمی کبھی قوی دل ہوتا ہے، جزع کرتا ہے، مگر صبر نہیں چھوڑتا۔[2]

صبر است علاجِ دلِ بیمار، تو واقف　　　افسوس کہ کم داری و بسیار ضرور ست

''بیماروں کا علاج صبر ہے تو بھی اس حقیقت کو جانتا ہے۔ افسوس کہ تو یہ (صبر) کم رکھتا ہے اور اس کا بہت زیادہ ہونا ضروری ہے۔''

شہدا کی زندگی اور فضیلت:

اس کے بعد اللہ پاک نے جہاد اور مجاہدین کی فضیلت بیان فرمائی۔ یہاں سے یہ اشارہ کیا کہ تم جہاد میں محنت کرو، مضبوطی اختیار کرو، شہید لوگ عالم برزخ میں زندہ ہیں اور رزق پاتے ہیں۔ جس طرح کہ صحیح مسلم کی حدیث میں آیا ہے کہ شہیدوں کی جان سبز چڑیوں کے پوٹے میں ہے، یہ پرندے جنت میں جہاں چاہتے ہیں، چرتے پھرتے ہیں، پھر شام کو ان قندیلوں کے اندر آ کر بسیرا کرتے ہیں، جو عرش کے نیچے لٹکتی ہیں۔ تیرے رب نے ان کو جھانک کر پوچھا: تم کیا چاہتے ہو؟ کہا: اے رب! ہم کیا چاہیں گے؟ جو تو نے ہم کو دیا ہے، وہ کسی مخلوق کو نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ پھر یہی پوچھے گا، جب وہ دیکھیں گے کہ بغیر جواب دیے گزارہ نہیں تو کہیں گے: ہم کو پھر دنیا میں بھیج دے۔ ہم تیری راہ میں لڑیں اور دوبارہ مارے جائیں۔ یہ بات شہادت کا ثواب دیکھ کر کہیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں نے لکھ رکھا ہے کہ وہ پھر دنیا میں لوٹ کر نہیں جائیں گے۔[3]

سیدنا کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ مومن کی جان ایک پرندہ ہے، جو جنت کے سبزہ زار میں چرا کرتا ہے، یہاں تک کہ اللہ اس کو حشر کے دن اس کے بدن کی طرف پھیرے گا۔[4] (رواه أحمد)

---

① تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۶۱، ۲۶۲) اس کی سند میں ''ابوحمزہ ثمالی'' ضعیف ہے۔

② تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۱۰۲) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۵۹)　③ صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۸۸۷)

④ مسند أحمد (۳/ ۴۵۵) امام البانی رحمہ اللہ ''السلسلة الصحيحة'' (رقم الحدیث: ۹۹۵) میں بحث کرتے ہوئے مذکورہ روایت کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''وهذا إسناد صحيح على شرط الشيخين''

یہ حدیث تمام مومنین کے لیے ہے، اگرچہ قرآن پاک میں شہدا کا ذکر خاص طور پر ان کی بزرگی، عزت اور عظمت کی غرض سے کیا ہے۔ یہ آیت شہداے بدر کے حق میں اُتری ہے۔ یہ چودہ آدمی تھے، چھے مہاجر اور آٹھ انصاری۔ تفسیر خازن میں ان کے نام بھی لکھے ہیں۔ لوگ کہنے لگے کہ فلاں مرگیا، اس سے دنیا کا چین گیا، اس پر یہ آیت اُتری۔ کسی نے کہا ہے کہ کفار کہتے تھے کہ لوگ ناحق محمد ﷺ کی رضا مندی کے لیے اپنی جان ظلم سے کھوتے ہیں۔ اس میں کوئی بھی فائدہ نہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1] اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ یہ تمھارا ایک خام خیال ہے۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں، وہ برزخ اور قبر میں تم سے زیادہ ناز ونعمت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جنت کی سیر ہی بہتر ہے اور وہ بہتر رزق ہے۔ تمھارے نہ جاننے سے کیا ہوتا ہے؟!

قبر کے عذاب اور ثواب کی دلیل:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ نافرمانوں کے لیے قبر کا عذاب اور فرماں برداروں کے لیے قبر کا ثواب ثابت ہے۔ اس بارے میں بہت سی صحیح حدیثیں آئی ہیں، جو تواتر معنوی کے درجے کو پہنچی ہیں۔ اسی طرح کی ایک آیتِ شریفہ ہے: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ١٦٩﴾ [آل عمران: ١٦٩] ''ان لوگوں کو مردہ خیال نہ کرو جو اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں، انھیں ان کے رب کے ہاں رزق دیا جاتا ہے۔''[2]

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ١٥٥ۙ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ١٥٦ۭ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ١٥٧

اور ہم تمھیں کسی قدر خوف اور بھوک سے مالوں، جانوں اور پھلوں میں کمی کر کے ضرور آزمائیں گے اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دے دیجیے (155) وہ لوگ کہ جب انھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں: بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں (156) یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے رب کی طرف سے بخشش اور رحمت ہے اور یہی ہدایت یافتہ ہیں (157)

مومنوں کی آزمایش، ان کا صبر اور ان کی جزا:

اس آیتِ شریفہ میں اللہ پاک نے خبر دی ہے کہ ہم کبھی اپنے بعض بندوں کا امتحان لیتے اور ان کی آزمایش

[1] دیکھیں: تفسیر الخازن (١/ ١٢٧)
[2] فتح البیان (١/ ٣١٨)

کرتے ہیں، جیسے ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ وَنَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ﴾ [محمد: ۳۱] ''اور ہم تمھیں ضرور آزمائیں گے، حتی کہ تم میں سے مجاہدین کو اور صبر کرنے والوں کو جان لیں، اور ہم تمھارے حالات جانچ لیں۔'' لہٰذا یہ امتحان کبھی خوشی کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی نقصان کے ساتھ، جیسے ڈر یا بھوک۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ﴾ [النحل: ۱۱۲] ''تو اللہ نے انھیں ان کے کرتوتوں کی وجہ سے بھوک چکھائی اور خوف کا لباس (پہنایا)۔'' کیوں کہ بھوک اور ڈر ایسی چیزیں ہیں کہ بھوکے اور ڈر والے پر ظاہر ہو جاتی ہیں۔

اسی لیے وہاں جوع و خوف کا لباس کہا، جب کہ یہاں کچھ خوف اور جوع فرمایا، یعنی تھوڑا سا ڈر، ذرا سی بھوک۔ مال کا نقصان یہ ہے کہ کچھ مال برباد ہو جائے۔ جان کا نقصان یہ ہے کہ یار دوست، اقارب و احباب مر جائیں۔ میووں کا نقصان یہ ہے کہ باغوں، کھیتوں میں پیداوار نہ ہو یا معمول سے کم میوہ اور غلہ نکلے۔ بعض سلف نے کہا ہے کہ کھجور کے بعض درخت ایک ہی بار پھلتے تھے۔ لہٰذا یہ سب باتیں اللہ کی طرف سے بہ طور آزمائش ہوا کرتی ہیں۔ جس نے ان نقصانات پر صبر کیا، اس نے ثواب پایا، جس نے نہ کیا وہ ناامید ہوا اور اس پر عذاب اترا۔ اسی لیے یہ فرمایا کہ صابروں کو خوش خبری سنا دو۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس جگہ خوف سے مراد اللہ کا ڈر ہے۔ بھوک سے رمضان کا روزہ مراد ہے۔ نقصانِ مال سے زکات، نقصانِ جان سے بیماری اور پھل کی کمی سے اولاد مراد ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس تفسیر پر اعتراض ہے۔[1] بے شک قرآن پاک کا لفظ عام ہے۔ اس کو اور اس کے سوا نقصان کی تمام قسموں کو شامل ہے۔ مقصد کسی خاص قسم کو مخصوص و متعین کرنا نہیں ہے۔ فتح البیان میں قولِ مذکور کو امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔[2] سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ دونوں عدل (برابر، برابر) علاوہ (زائد) کیا اچھے ہیں، صلات و رحمت تو دو عدل ہوئے۔ جب کہ ﴿ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾ علاوہ (زائد) ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علاوہ وہ چیز ہے جو دو عدل کے درمیان میں رکھتے ہیں۔ یہ ایک زیادہ ہے۔ اسی طرح ان کو صبر و استرجاع کا ثواب الگ ملا، اس پر ہدایت یافتہ ہونا اور زیادہ ہوا۔[3]

مصیبت کے وقت اِنّا للّٰہ... کہنے کی فضیلت:

إنا للّٰہ... الخ کے کہنے پر جو ثواب ملتا ہے، اس میں بہت سی احادیث آئی ہیں۔ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے ایک بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تو میرا جی بہت خوش ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی مسلمان کو کوئی مصیبت

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۵۹) [2] فتح البیان (۱/ ۳۱۹)

[3] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۶۰) اس کو ایک مثال سے یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جیسے کسی جانور گدھے وغیرہ پر خوراک کی دو بوریاں دائیں اور بائیں برابر وزن کی رکھی جائیں تو یہ ''عدل'' (برابر) ہے اور اس کے درمیان میں ایک تیسری بوری رکھ دی جائے تو یہ ''علاوہ'' (زائد) ہے۔

نہیں پہنچتی، پھر وہ إنا للہ... الخ پڑھ کر یہ کہتا ہے: «اَللّٰھُمَّ أجُرْنِي فِي مُصِيبَتِي هٰذَا وَأَخْلِفْ لِي خَيْرًا مِنْهَا» ''اے اللہ مجھ کو اس مصیبت کا اجر دے اور اس کے عوض میں اس سے بہتر دے۔'' مگر اس کے ساتھ یہی معاملہ کیا جاتا ہے۔[1] (الحدیث رواہ أحمد) سیدنا حسین رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جس کسی مسلمان مرد یا عورت کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے، وہ اس کو یاد کر کے، گو مدت دراز ہو چکی ہو، ''إنا للہ...'' آخر تک، کہے تو اللہ اس کو اتنا ہی اجر دیتا ہے، جتنا مصیبت کے دن دیا تھا۔[2] (رواہ أحمد)

ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کہتا ہے کہ ملک الموت تو نے میرے بندے کے بچے کو قبض کر لیا، اس کی آنکھ کی ٹھنڈک لے لی، دل کا پھل چھین لیا؟ وہ کہتا ہے کہ ہاں۔ اللہ فرماتا ہے کہ پھر اس نے کیا کہا؟ فرشتہ کہتا ہے کہ تیری حمد کی اور ''إنا للہ... الخ'' پڑھا۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بناؤ اور اس کا نام ''بیت الحمد'' رکھو۔ (رواہ أحمد) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔[3] مصیبت زدہ اور صبر کرنے والوں کے اجر کے بارے میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔ سب کا ذکر اس جگہ مشکل ہے۔ اس کے متعلق کچھ احادیث رسالہ ''عاقبة المتقين'' (نواب صاحب کی ایک تالیف) میں لکھی گئی ہیں۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾

بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، پس جو شخص بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے اور جو شخص خوشی سے کوئی نیکی کرے تو بے شک اللہ قدر کرنے والا، خوب جاننے والا ہے (158)

صفا اور مروہ کے طواف سے گناہ کی نفی کا مفہوم:

صفا و مروہ مکہ کے شہر میں دو پہاڑ ہیں۔ عرب کے لوگ ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے ہمیشہ حج کرتے رہے ہیں، لیکن کفر کے وقت میں اکثر غلطیاں پڑ گئیں تھیں۔ ان دو پہاڑوں پر دو بت پڑے تھے۔ حج میں وہاں بھی طواف کرتے تھے۔ جب لوگ مسلمان ہوئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ یہ بھی کفر کی غلطی تھی۔ اب وہاں نہیں جانا چاہیے،

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩١٨) مسند أحمد (٤/ ٢٧)

[2] مسند أحمد (١/ ٢٠١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''فيه هشام بن زياد أبو المقدام وهو ضعيف'' (مجمع الزوائد: ٣/ ٧٧)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٢١) مسند أحمد (٤/ ٤١٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٤٠٨)

اس پر یہ آیت اُتری۔ عروہ رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو صفا و مروہ کا طواف نہ کرے، اس پر کچھ گناہ نہیں ہے؟ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اے بھانجے! تو نے یہ بہت بری بات کہی۔ اگر اس آیت کا یہی مطلب ہوتا جو تو نے کہا تو یہ آیت یوں ہوتی "فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا" "ان کا طواف نہ کرے تو اس پر کچھ حرج نہیں۔" لیکن یہ آیت اس طرح اُتری ہے کہ انصار مسلمان ہونے سے پہلے مناۃ نامی بت کے لیے احرام باندھتے تھے اور مشلل کے قریب اس کی پوجا کرتے تھے۔ جو کوئی اس کا حج کرتا، وہ صفا و مروہ کے طواف سے رک جاتا، جب رسول اللہ ﷺ سے صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کا کہا گیا تو یہ آیت اُتری۔

پھر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں پہاڑوں کا طواف کیا ہے۔ کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان کا طواف کرنا چھوڑ دے۔ یہ حدیث صحیحین میں ہے۔[1] امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صفا پر اساف نامی بت تھا اور مروہ پر نائلہ نامی بت تھا۔ وہ ان کو بوسہ دیتے تھے۔ جب اسلام آیا تو لوگ اُن کے درمیان طواف کرنے کو حرج جانتے تھے۔ اس پر یہ آیت اُتری۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ اساف اور نائلہ دو انسان تھے۔ انھوں نے کعبہ کے اندر زنا کیا اور مسخ ہو کر پتھر بن گئے۔ قریش نے ان دونوں کو کعبہ کے سامنے رکھ دیا تھا کہ لوگ عبرت پکڑیں۔ ایک مدتِ دراز کے بعد وہ معبود ٹھہر گئے اور کعبہ سے اُٹھا کر صفا و مروہ پر لے جا کر رکھ دیے گئے اور جو صفا و مروہ کا طواف کرتا، وہ ان کا بھی استلام کرتا۔[2]

سعی کی اصل اور اس کا حکم:

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب بیت اللہ کے طواف سے فارغ ہوتے تو رکن کا استلام کر کے بابِ صفا سے نکلتے ہوئے یوں کہتے: ﴿ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) "بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔" پھر فرماتے: «أَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ» (رواه مسلم) "میں شروع کرتا ہوں اس چیز سے، جس سے اللہ نے شروع کیا۔" نسائی کے الفاظ یہ ہیں: «اِبْدَؤُا بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ»[3] "شروع کرو، جہاں سے اللہ نے شروع کیا۔" حبیبہ بنت ابی تجراۃ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، آپ ﷺ صفا و مروہ کے درمیان طواف کر رہے تھے۔ لوگ آگے تھے اور آپ ان کے پیچھے دوڑ رہے تھے، یہاں تک کہ میں دیکھتی تھی کہ تیز دوڑنے کی وجہ سے آپ ﷺ کی ازار آپ ﷺ کے دونوں زانوؤں کو لپٹتی تھی۔ آپ ﷺ فرماتے تھے کہ دوڑو، اللہ نے تم پر دوڑنا لکھا ہے۔[4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٧٧) [2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٦١)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٩٦٢)

[4] مسند أحمد (٦/ ٤٢١) اس کی سند صحیح ہے۔ إرواء الغليل (٤/ ٢٦٨)

یہ حدیث امام شافعی، احمد اور مالک رحمہم اللہ کی دلیل ہے، اس بات پر کہ صفا و مروہ کے درمیان سعی حج کا ایک رکن ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ واجب ہے، رکن نہیں ہے، اگر عمداً یا سہواً چھوٹ گیا تو دم دینا چاہیے۔ ایک روایت میں امام احمد رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ اسی طرف ایک جماعت بھی گئی ہے۔ امام ابوحنیفہ، ثوری، شعبی اور ابن سیرین رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ مستحب ہے۔[1] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کی یہ دلیل ہے: ﴿ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ﴾ (آیت زیر تفسیر) ''اور جو شخص خوشی سے کوئی نیکی کرے۔'' مگر پہلا قول زیادہ ترجیح کے لائق ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ طواف کیا ہے اور فرمایا: «لِتَأْخُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ»[2] ''مجھ سے اپنے حج کے کام اخذ کرو۔'' سو جو کام آپ نے حج میں کیے ہیں، وہ سب واجب ہیں، سوائے اس کام کے جو کسی دلیل سے باہر ہو گیا ہے۔[3] واللہ أعلم۔ اگلی حدیث کے الفاظ یہ تھے: «اِسْعَوْا فَإِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ السَّعْيَ»[4] ''دوڑو اس لیے کہ اللہ نے یہ دوڑنا تم پر لکھا ہے۔'' یہ سعی کے واجب ہونے کی صریح دلیل ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔[5] بہر حال اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ بیان فرمایا ہے کہ صفا و مروہ کے درمیان طواف من جملہ ان شرائع کے ہیں، جو اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو مناسکِ حج میں بتائے تھے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ اس طواف کی اصل ہاجرہ علیہا السلام کا طواف ہے کہ وہ پانی کی تلاش میں دوڑتی پھرتی تھیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے زم زم نکال دیا کہ جس کا پینا کھانے کا نعم البدل اور بیماری کے لیے شفا ہے۔ لہٰذا جس طرح ہاجرہ عجز و انکساری اور خوف و بے قراری سے فقیرانہ انداز میں دوڑی تھیں، اسی طرح حاجی کو چاہیے کہ اپنا فقر اور ذلت اللہ کے حضور پیش کر کے اپنی اصلاح، دلی حالات کی بہتری اور گناہوں کی بخشش کی اُمید کے ساتھ دوڑے۔ اللہ سے یہ چاہے کہ اللہ اس کو مرتے دم تک صراطِ مستقیم پر قائم و دائم رکھے۔ جو اس کے موجودہ حالات ہیں اور جن گناہوں میں وہ گرفتار ہے، اس سے پھیر کر حالِ کمال، بخشش، قول و فعل کی درستی اور استقامتِ دین کی طرف لے جائے۔ جس طرح ہاجرہ علیہا السلام کے ساتھ کیا تھا۔

تطوع سے یہ مراد ہے کہ جو اس طواف کو قدرِ واجب سے زیادہ کرے اور نفل کے طور پر دوبارہ ادا کرے تو بہتر ہے، کچھ منع نہیں۔ اللہ تھوڑے عمل پر بھی زیادہ ثواب دیتا ہے۔ ذرہ برابر کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ ﴿ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ [النساء: ٤٠] ''اور اگر (کسی کی) کوئی نیکی ہو تو وہ اسے دُگنی کر دیتا ہے اور اپنی طرف سے بہت بڑا اجر دیتا ہے۔'' کسی نے کہا ہے کہ تطوع سے مراد یہ ہے کہ نفلی حج و عمرہ کی کوشش کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ کثرت سے ساری عبادات کرے۔ اس کو امام رازی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٦٢) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٢٩٧) [3] تفسیر القرطبي (٢/ ١٨٣)
[4] مسند أحمد (٦/ ٤٢١) [5] فتح القدیر (١/ ٣٠٠، ٣٠١)

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ
مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ﴿١٥٩﴾
إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ
الرَّحِيمُ ﴿١٦٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ
لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١٦١﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا
يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿١٦٢﴾

بے شک جو لوگ ہمارے نازل کردہ صریح دلائل اور ہدایت کی باتوں کو چھپاتے ہیں اس کے بعد کہ ہم نے لوگوں کے لیے ان کو کتاب میں کھول کر بیان کر دیا ہے، وہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور سب لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں (159) مگر وہ لوگ کہ جنھوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی اور (حق کو) کھول کر بیان کیا تو وہی لوگ ہیں جن کی میں توبہ قبول کرتا ہوں اور میں بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا، بہت رحم کرنے والا ہوں (160) بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اس حال میں مر گئے کہ وہ کافر ہی تھے تو وہی لوگ ہیں جن پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے (161) وہ اس (لعنت) میں ہمیشہ رہیں گے، نہ تو ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انھیں مہلت ہی دی جائے گی (162)

دینی احکام کو چھپانا دائمی لعنت کا موجب:

یہ آیتِ مبارکہ اس شخص کے لیے سخت وعید ہے، جس نے واضح دلائل، صحیح مقاصد اور دلوں کو نفع دینے والی ہدایت کو چھپایا تھا، جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے اپنی کتابوں میں ان دلائل کو واضح کر دیا تھا، لیکن انھوں نے پھر بھی چھپایا تھا۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اہلِ کتاب کے حق میں اُتری، جنھوں نے احکامِ تورات اور صفتِ نبوی کو چھپایا، ان پر ہر شے کی لعنت ہے، یعنی جس طرح عالم کے لیے ہر شے یہاں تک کہ پانی میں مچھلی، ہوا میں پرندہ استغفار کیا کرتا ہے، اسی طرح ان پر ہر شے لعنت کیا کرتی ہے۔[1] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ جس سے کسی علم کا سوال کیا گیا اور اس نے چھپایا تو قیامت کے دن اس کو آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔[2]

(1) تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٦٣)

(2) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٥٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٦٦) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٢٨)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس مسند حدیث کے بعض طرق بعض کو تقویت دیتے ہیں۔ بخاری و مسلم میں تو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یوں مروی ہے کہ اگر کتاب اللہ میں دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں کسی سے بھی کوئی حدیث بیان نہ کرتا۔ پھر یہ دو آیات پڑھیں: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ اُولٰٓىِٕكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓىِٕكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ ﴾ [البقرة: ۱۵۹۔ ۱۶۰] ”بے شک جو لوگ ہمارے نازل کردہ صریح دلائل اور ہدایت کی باتوں کو چھپاتے ہیں اس کے بعد کہ ہم نے لوگوں کے لیے ان کو کتاب میں کھول کر بیان کر دیا ہے، وہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور سب لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔ مگر وہ لوگ کہ جنھوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی اور (حق کو) کھول کر بیان کیا تو وہی لوگ ہیں جن کی میں توبہ قبول کرتا ہوں اور میں بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا، بہت رحم کرنے والا ہوں۔“[1] رہی یہ بات کہ علومِ دین بیان کرنا، فرضِ کفایہ ہے یا فرضِ عین؟ تو اس میں اختلاف ہے۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ جب اس کو بعض لوگوں پر ظاہر کر دیا، جس کے پاس ہر کوئی پہنچ سکتا ہے تو اب وہ چھپا ہوا نہ رہا۔ کسی نے کہا ہے کہ جب عالم سے پوچھیں تو اس پر اظہار واجب ہے اور اگر نہیں تو پھر واجب نہیں۔

خبرِ واحد کے قبول کی دلیل:

آیت میں خبرِ واحد کو قبول کرنے کے واجب ہونے کی دلیل ہے، کیوں کہ اگر اس کی بات کا ماننا واجب نہ ٹھہرتا تو اس پر بیان کرنا بھی واجب نہ ہوتا۔ بینات و ہدیٰ کی قید سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غیر بینات و ہدیٰ کا چھپانا جائز ہے۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ کافر پر موت کے بعد لعنت کرنا منع نہیں ہے۔ چھپانے والوں سے اس جگہ احبارِ یہود اور رہبانِ نصاریٰ مراد ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ہر ”کَاتِم“ یعنی چھپانے والا، واجب بیان کو چھوڑنے والا ہے۔ اس کو امام شوکانی رحمہ اللہ نے ترجیح دی ہے، کیوں کہ اعتبار تو لفظ کی عمومیت کا ہے نہ کہ سبب کی خصوصیت کا۔[2]

فرشتوں اور جانوروں کی لعنت:

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک جنازے میں شریک تھے۔ فرمایا کہ فرشتے کافر کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایسی چوٹ لگاتے ہیں، جس کو انسانوں اور جنوں کے سوا ہر جاندار سنتا ہے، ہر سننے والا جانور اس کو لعنت کرتا ہے۔ یہ اس آیت کا مطلب ہے، یعنی لعنت کرنے والوں سے زمین پر چلنے والے

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحديث (۱۱۸) صحیح مسلم، رقم الحديث (۲۴۹۳) تفسير ابن كثير (۱/ ۲۶۳)

[2] فتح القدير (۱/ ۳۰۲)

مراد ہیں۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم و ابن ماجه) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب خشک سالی ہوتی ہے تو جانور کہتے ہیں کہ یہ قحط بنی آدم کے نافرمانوں کی وجہ سے ہوا ہے، اللہ ان نافرمان آدمیوں پر لعنت کرے۔ امام ابو العالیہ، قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ لعنت کرنے والے فرشتے اور مومنین ہیں۔[2] حدیث میں آیا ہے کہ عالم کے لیے ہر شے مغفرت چاہتی ہے، یہاں تک کہ دریا میں مچھلی بھی۔[3] اس آیت میں یہ آیا ہے کہ علم کو چھپانے والے پر اللہ، فرشتے اور سب آدمی لعنت کرتے ہیں، یعنی ہر فصیح اور اعجمی، خواہ یہ لعنت زبانِ قال سے ہو یا زبانِ حال سے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس حکم سے توبہ کرنے والوں، اصلاح کرنے والوں اور چھپائی گئی باتوں کو بیان کرنے والوں کو اس لعنت سے مستثنیٰ کر لیا اور کہا کہ ہم ان کی توبہ قبول کر لیتے ہیں۔

بدعتی کی توبہ:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ جو کوئی بدعت یا کفر کی طرف بلاتا ہے، پھر وہ پشیمان ہو کر توبہ کرلے گا تو اللہ بھی اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔ پہلی اُمتوں میں اس قسم کے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی تھی۔ یہ بات خاص اسی شریعتِ حقہ اور اُمتِ مرحومہ کے لیے ہے۔ جس کو نبی الرحمہ، نبی التوبہ لائے ہیں۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ جو کفر پر یہاں تک جما رہا کہ اس کو موت آ گئی تو وہ بھی ملعون ہے۔ اللہ، ملائکہ اور سارے آدمی اس پر لعنت کرتے ہیں۔ وہ قیامت تک لگاتار اسی دائرۂ لعنت میں پڑا رہے گا، پھر جہنم کی سیر کرے گا۔ نہ عذاب کم ہوگا اور نہ دم بھر کی فرصت ملے گی۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ۔[4] امام ابو العالیہ اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ کافر کو قیامت کے دن کھڑا کیا جائے گا، اس پر اللہ لعنت کرے گا، پھر ملائکہ، پھر سب لوگ اور پھر ساری مخلوق لعنت کرے گی۔[5]

کافر پر لعنت بھیجنے کا جواز:

مسئلہ: کافر پر لعنت کرنا جائز ہے، اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور پچھلے ائمہ قنوت وغیرہ میں کفار پر لعنت کرتے تھے۔ رہا کافر معین، تو علما کی ایک جماعت کا مذہب ہے کہ اس پر لعنت نہ کریں، کیوں کہ خاتمے کا حال معلوم نہیں۔ زیرِ تفسیر آیت سے اس مدعا پر استدلال کیا گیا ہے۔ کیوں کہ اس میں غیر معین پر لعنت آئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ایک قومِ معین پر لعنت کی تھی، تو ان کو وحی سے جو معلوم ہوتا تھا، وہ دوسرے کو معلوم نہیں ہو

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲٦۹) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٢١) اس کی سند میں ''لیث بن ابی سلیم'' ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲٦۹)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (۳٦٤۱، ۲٦۸۲) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۲۳) صحيح الترغيب والترهيب (۱/ ۱۷)

[4] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲٦۳)

[5] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۷۱)

سکتا۔ دوسرے گروہ نے کہا ہے کہ کافر معین پر بھی لعنت کرنا جائز ہے۔ ابن العربی مالکی رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے، لیکن جس حدیث سے انھوں نے حجت پکڑی ہے، وہ ضعیف ہے۔

دوسروں کا استدلال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس شرابی کو لاتے، اس پر حد جاری کی جاتی، ایک آدمی نے کہا کہ "لَعْنَةُ اللّٰهِ مَا أَكْثَرَ مَا يُؤْتٰى بِهٖ" یعنی اللہ کی لعنت اس پر، کیسے یہ شخص بار بار لایا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا تَلْعَنُهُ فَإِنَّهُ يُحِبُّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهُ» [1] "تم اس پر لعنت نہ کرو، وہ تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہے۔" اس سے معلوم ہوا کہ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا محب نہیں، اس پر لعنت ہو سکتی ہے۔ [2] مگر فتح البیان میں ابن العربی مالکی رحمہ اللہ سے معین گناہ گار کو لعنت کرنے کا عدمِ جواز نقل کیا گیا ہے۔ اسی حدیث کی دلیل سے کہ ایک شرابی کو بار بار لائے تو بعض حاضرین نے کہا: "لَعْنَةُ اللّٰهِ مَا أَكْثَرَ مَا يَشْرَبُهٗ" "اللہ اس پر لعنت کرے کہ کس کثرت سے یہ شراب پیتا ہے۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَا تَكُوْنُوْا عَوْنًا لِّلشَّيْطَانِ عَلٰى أَخِيْكُمْ» [3] "اپنے بھائی پر شیطان کے مددگار نہ بنو۔" یہ حدیث صحیحین میں ہے۔ ابن العربی کے نزدیک حاصل یہ ٹھہرتا ہے کہ کافر معین پر لعنت درست ہے، مگر فاسق معین پر درست نہیں۔ [4]

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿١٦٣﴾

اور تمھارا معبود ایک ہی ہے، اس کے سوا کوئی (سچا) معبود نہیں، وہ نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے (163)

اللہ پاک نے اس آیتِ شریفہ میں یہ خبر دی ہے کہ میں اکیلا ایک الٰہ اور معبود ہوں۔ میرا کوئی شریک و عدیل نہیں ہے۔ میں واحد، اَحد، فرد اور صمد ہوں۔ سیدہ اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں ہے کہ اللہ کا اسمِ اعظم ان دو آیتوں میں ہے کہ ایک تو یہی آیت، دوسری آیت: ﴿الٓمّٓ ۞ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ﴿٢﴾﴾ [آل عمران: ١۔ ٢] "الٓمّٓ۔ وہ اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے، سب کو سنبھالنے والا ہے۔" [5] (أخرجه ابن أبي شيبة و أحمد و الدارمي و أبو داود و الترمذي و صححه و ابن ماجه) مگر اس حدیث کی سند میں شہر بن حوشب ضعیف ہے۔ امام دیلمی رحمہ اللہ نے اس سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ کوئی شے سرکش جنوں پر ان دو آیتوں سے، جو سورۃ البقرہ میں ہیں،

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٩٨)
(2) تفسير ابن كثير (١/ ٢٦٣، ٢٦٤)
(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٩٩)
(4) فتح البيان (١/ ٣٢٦)
(5) مصنف ابن أبي شيبة (٦/ ٤٧) سنن الدارمي (٢/ ٥٤٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٩٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٧٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٥٥) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٣٠)

سخت تر نہیں ہے: ﴿ وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''اور تمھارا معبود ایک ہی ہے، اس کے سوا کوئی (سچا) معبود نہیں، وہ نہایت مہربان، بہت رحم کرنے والا ہے۔''[1] اور دوسری آلِ عمران کی آیت جو اُوپر ذکر کی گئی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد الوہیت کے ساتھ متفرد ہونا اور زمین و آسمان کی پیدائش وغیرہ بھی اکیلے ہی کرنے کا بیان فرمایا اور اس بات کو اپنی وحدانیت کی دلیل ٹھہرایا۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے بدل بدل کر آنے جانے میں اور ان کشتیوں میں جو سمندر میں ان چیزوں کو لیے چلتی ہیں جو لوگوں کو نفع دیتی ہیں اور اللہ کے نازل کردہ آسمانی پانی میں کہ پھر اس کے ذریعے سے زمین کو جو مردہ ہو چکی تھی زندہ کیا اور ان ہر قسم کے جانوروں میں جو اس نے زمین میں پھیلائے ہیں اور ہواؤں کے پھیرنے میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان پابند کر دیے گئے ہیں، (ان سب میں) ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں ﴿164﴾

آٹھ چیزوں میں توحید کے دلائل:

توحید کے بیان کے بعد اس آیت میں آٹھ چیزیں ذکر کی گئی ہیں۔ یہ وہ مصنوعات ہیں جو کافروں کے کسی معبود سے نہیں بن سکتیں۔ سب کہاں وہ تو بعض کو بھی مہیا نہیں کر سکتے۔ پہلا آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا، دوسرا رات اور دن کا اختلاف، تیسرا کشتی کا دریا میں چلانا، چوتھا پانی کا آسمان سے برسانا، پانچواں زمین کا زندہ کرنا، چھٹا اس میں جانوروں کو بکھیرنا، ساتواں ہواؤں کا ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف پھیرنا، آٹھواں بادل کو قابو میں رکھنا کہ جدھر کو حکم ہو، وہاں جا کر برسے، جہاں کا حکم نہ ہو، وہاں نہ برسے۔ جو شخص ان امور میں سے کسی ایک میں بھی غور و فکر کرے گا، اس کا ذہن تصورات سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ جائے گا، اس کو اس بات کی تصدیق کیے بغیر چارہ نہیں

---

[1] الفردوس للديلمي (٣/ ٣٨٥)

رہے گا کہ کوئی اس کا صانع اور کارساز ہے۔ آسمانوں کو جمع کے صیغے سے اس لیے ذکر کیا کہ ہر آسمان دوسری جنس کا ہے، بخلاف زمین کے کہ ساری زمین ایک ہی طرح کی ہے یعنی مٹی کی۔ آسمان میں یہ نمونہ ہے کہ بغیر ستون اور بغیر کسی متعین علاقے کے اونچا بلند کھڑا ہے۔ چاند، سورج، تارے اس میں تیر رہے ہیں۔ کوئی سیارہ ہے، کوئی ثابت ستارہ ہے، اس وسعت و لطافت کا کیا ٹھکانا ہے، ہر فلک علاحدہ چکر کھا رہا ہے۔

رات دن گردش میں ہیں ہفت آسمان ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

زمین میں یہ نشانی ہے کہ وہ غلیظ، موٹی اور پست ہے۔ پہاڑ، دریا، جنگل، ٹیلے، آبادی، معدنیات، جواہر، پھل، نباتات، درخت وغیرہ منافع اپنے اندر رکھتی ہے۔ رات دن کا بدلنا یہ ہے کہ ایک جاتا ہے، دوسرا اس کے پیچھے آتا ہے۔ ایک دم کی دیر نہیں ہوتی، ذرہ برابر فرق نہیں پڑتا: ﴿ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾ [یٰسین: ٤٠] ”نہ سورج کے یہ لائق ہے کہ وہ چاند کو پالے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور ہر ایک (اپنے اپنے) مدار میں تیرتا پھرتا ہے۔“ پھر کبھی دن بڑا ہوتا ہے تو رات گھٹ جاتی ہے، کبھی رات چھوٹی ہوتی ہے تو دن بڑھ جاتا ہے، ان کا باہم معاوضہ ہوتا رہتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ﴾ [الحدید: ٦] ”وہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔“ یعنی رات سے کچھ لے کر دن میں زیادہ کر دیا، دن سے لے کر رات میں کچھ بڑھا دیا۔

اوقات اور موسم کی تشکیل:

امام ابن الخطیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رات دن جس طرح زمان میں مختلف ہیں، اسی طرح مکان میں بھی مختلف ہیں۔ رات اور دن میں سے، جس کے بھی نزدیک زمین کر دی جاتی ہے، اس کے مطابق وقت مقرر ہو جاتا ہے۔ اگر ایک جگہ زمین میں صبح ہے تو دوسری جگہ ظہر، کسی جگہ عصر ہے تو کسی جگہ مغرب اور کہیں عشا، اسی طرح اندازہ لگاتے جاؤ۔ لیکن یہ اس وقت ہے کہ ہم مختلف شہروں کا اعتبار طول میں کریں۔ اگر شہروں کا اعتبار زمین کی چوڑائی میں کریں گے تو جس شہر کا عرض شمال میں زیادہ تر ہوگا، وہاں گرمی کے دن بڑے اور جاڑے کے چھوٹے ہوں گے۔ لہٰذا یہ رات دن کی مختلف حالتیں شہروں کے طول و عرض کے کم و بیش ہونے کی وجہ سے ہیں۔[1]

رات اور دن میں قدرت کی نشانیاں:

رات کا ذکر پہلے اس لیے کیا ہے کہ اندھیرا پہلے ہے اور نور بعد میں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۚۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴾ [یٰسین: ٣٧] ”اور ان کے لیے ایک نشانی رات ہے، ہم اس سے دن کو

[1] اللباب في علوم الكتاب (٣/ ١١٩)

کھینچ نکالتے ہیں، پھر (دن ختم ہونے پر) یکایک وہ اندھیرے میں ڈوب جاتے ہیں۔" صحیح تر یہی قول ہے۔ رات دن میں قدرت کی نشانی یہ ہے کہ دن کھانے کمانے، چلنے پھرنے، بندوبست کرنے، ہر چیز کے اُٹھانے، رکھنے، بنانے اور سنوارنے کے لیے ہے۔ رات سونے، راحت کرنے، چین کرنے اور آرام پانے کے لیے ہے۔ غرض کہ ان کے اختلاف میں بندوں کے لیے مصلحتیں ہیں۔ سورج ڈوبنے سے سورج نکلنے تک ساری رات ہے۔ سورج نکلنے سے سورج ڈوبنے تک سارا وقت دن ہے۔ جو وقت طلوعِ فجر سے سورج نکلنے تک ہے، وہ رات دن کے درمیان مشترک ہے، کیوں کہ اس وقت کچھ رات کا اندھیرا کچھ دن کا اُجالا باقی رہتا ہے۔ لیکن یہ بات اہلِ لغت کی اصطلاح کے لحاظ سے ہے، شریعت کا کوئی مسئلہ نہیں۔

خورشید کا ماہ کا نکلنا دیکھو　　تاروں کا ہجوم کر کے چلنا دیکھو
ہے دن کو سفید شب کو پوشاک سیاہ　　گردوں کا ذرا رنگ بدلنا دیکھو

کشتی کے چلنے میں قدرت کی نشانی:

ناؤ (کشتی) کے چلنے میں یہ نمونہ ہے کہ وہ پانی کے اوپر وزن لادے ہوئے لوگوں کو سوار کیے ہوئے چل رہی ہے۔ پانی کی تہہ میں نہیں بیٹھتی۔ ہوا کے زور سے چلتی پھرتی، آتی جاتی ہے۔ باوجود غالب قوت اور سمندر کے پانی اور ہیجان خیزی کے اس (سامان) کو اپنے اوپر لادے ہوئے ہے۔ اللہ کے سوا کون ہے، جو اِس سے نجات دے۔ لوگوں کو فائدہ یہ ہے کہ ناؤ پر چڑھ کر ایک ملک سے دوسرے ملک تجارت کرتے پھرتے ہیں۔ وہاں کا مال یہاں اور یہاں کا مال وہاں لاد کر لے جاتے ہیں اور فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اللہ اگر ان کشتی والوں کا دل مضبوط نہ کرتا تو ان کا مقصد، یعنی نفع کمانا کبھی پورا نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے ہر حصے کو ایک مقرر چیز کے ساتھ خاص کیا ہے۔ ایک کو دوسرے کا محتاج بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سمندر کے خوف کے باوجود لوگ کشتی کا سفر اختیار کرتے ہیں۔ سفر کرنے والے اور جن کی طرف سفر کیا جاتا ہے، ان دونوں کو نفع ملتا ہے۔

پانی برسنے میں نشانی:

پانی برسنے میں یہ نشانی ہے کہ کائنات زندہ ہو جاتی ہے۔ روئیدگی پیدا ہوتی ہے۔ مخلوق کا رزق نکلتا ہے۔ زمین کا حسن و جمال ظاہر ہوتا ہے۔ زمین کے سوکھ جانے کو مجازاً موت فرمایا ہے۔ صرف ایک زمین ہی تروتازہ نہیں ہوتی، بلکہ اس میں قدرت کی بڑی نشانی یہ ہے کہ سارے جاندار اور نباتات جی اُٹھتے ہیں۔ پانی وقت پر برستا ہے۔ ضرورت کے وقت فائدے کی مقدار کے مطابق ملتا ہے، پھر کسی جگہ برسا، کہیں نہ برسا۔ جہاں نہیں برسا، وہاں دعا مانگی اور نمازِ استسقا ادا کی تو پھر برسنے لگا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ اٰیَۃٌ لَّھُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَۃُ اَحْیَیْنٰھَا وَ اَخْرَجْنَا مِنْھَا حَبًّا

فَمِنْهُ يَأْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ﴿۳۴﴾ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ؕ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۵﴾ سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾ ﴾ [یٰسین: ۳۳۔ ۳۶] ''اور ان کے لیے مردہ زمین ایک (عظیم) نشانی ہے، ہم نے اسے زندہ کیا اور ہم نے اس سے (اناج کا) دانہ نکالا، پھر وہ اسی سے کھاتے ہیں۔ اور ہم نے اس (زمین) میں کھجوروں اور انگوروں کے باغات پیدا کیے اور ہم نے ان میں چشمے جاری کیے۔ تاکہ وہ اس کے پھلوں سے کھائیں اور وہ (پھل) ان کے ہاتھوں نے نہیں بنائے، پھر کیا وہ شکر نہیں کرتے؟ پاک ہے وہ ذات جس نے سب کے سب جوڑے پیدا کیے، ان چیزوں کے بھی جنھیں زمین اُگاتی ہے اور خود ان (انسانوں) کے اپنے بھی اور اُن کے بھی جنھیں وہ نہیں جانتے۔''

جانوروں کو پھیلانے میں قدرت کی نشانی:

جانوروں کے بکھیرنے اور پھیلانے میں یہ نمونہ ہے کہ انسان کا رجوع تو صرف ایک ہی اصل کی طرف ہے، یعنی آدم علیہ السلام کی طرف، مگر صورت شکل، رنگ، زبان، طبیعت، اخلاق، اوصاف وغیرہ سب کے الگ الگ ہیں۔ ایک کی حالت اور لہجہ دوسرے شخص سے نہیں ملتا، پھر بنی آدم پر سارے حیوانات کو قیاس کر لو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ساری مخلوق سے جو چیز زمین پر رینگتی ہے، انسان ہو یا اور کچھ، وہ دابہ ہے۔ کوئی بڑا کوئی چھوٹا، اللہ تعالیٰ ان سب کو جانتا ہے، سب کو رزق دیتا ہے، کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶﴾ ﴾ [ھود: ۶] ''اور زمین پر چلنے والے ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمے ہے، اور وہ جانتا ہے اس کی قرار گاہ اور اس کے دفن ہونے کی جگہ کو۔ ہر چیز واضح کتاب میں (تحریر) ہے۔''

ہواؤں کے پھیرنے میں قدرت کی نشانی:

ہواؤں کے پھیر پھار میں یہ نشانی ہے کہ کبھی ہوا رحمت لاتی ہے، کبھی عذاب، کبھی بادل کے آنے کی بشارت دیتی ہے، کبھی ابر کو ہانکتی ہے، کبھی جمع کرتی ہے، کبھی جدا، کبھی جنوب کی طرف چلتی ہے، اس کو شامیہ کہتے ہیں۔ کبھی یمن کی جانب سے آتی ہے۔ کبھی مشرق سے آکر کعبہ کے منہ پر جھونکا مارتی ہے، اس کو صبا کہتے ہیں۔ کبھی مغرب کی طرف سے آتی ہے، اس کو دبور بولتے ہیں، اس لیے کہ دُبر کی جانب، یعنی پشتِ کعبہ سے چلتی ہے۔ ہواؤں کا فرق اور نام کعبہ کے اطراف پر رکھا گیا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لوگوں نے پانی، ہوا اور ستاروں کے علم میں کتابیں لکھی ہیں۔ لغات و احکام، ہواؤں، بارش اور انواء کا ذکر کیا ہے، یہاں ان کو تحریر کرنا طوالت کا باعث ہے۔[1] فتح البیان میں بیان کیا ہے کہ کوئی ہوا

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲٦٤)

عقیم بانجھ ہوتی ہے کوئی باردار، کوئی صرصر آندھی، کوئی نصر، کوئی ہلاک، کوئی تیز و گرم، کوئی ٹھنڈی و نرم، کوئی آندھی، کوئی بگولا، کوئی جنوبی، کوئی شمالی، کوئی دبور، کوئی قبول، کوئی صبا، کوئی نکباء (بے رخ ہوا)، پھر ہر چھوٹے بڑے جہاز کو اتنی ہی ہوا لگتی ہے، جس کا وہ متحمل ہوسکتا ہے۔ حدیث میں ہواؤں کو دُشنام دہی کرنے کی ممانعت آئی ہے۔[1] ریح ایک جسم لطیف ہے کہ نہ ہاتھ میں آئے نہ دکھائی دے، مگر اس کو ایسی قوت حاصل ہے کہ درخت اور پتھر کو جڑ سے اُکھیڑ دیتی ہے۔ گھروں کو گرا کر ویران کر دیتی ہے۔ ہر وجود والی چیز کی زندگی ہوا سے وابستہ ہے۔ اگر ہوا دم بھر کے لیے رک جائے تو ہر جان دار مر جائے، جو کچھ روئے زمین پر ہے، وہ سب کا سب سڑ جائے۔

بادل میں نشانی:

بادل کو دیکھو کہ آسمان اور زمین کے بیچ میں کیسا مطیع ہو کر بے ستون اور بغیر تعلق کھڑا رہتا ہے۔ اس کو تسخیر کہتے ہیں۔ ہر بادل میں اتنا پانی بھرا ہوتا ہے، جس سے جنگل کے جنگل سیراب ہو جائیں۔ مگر کیا مجال کہ اس کے بوجھ سے گر پڑے، نہیں بلکہ اسی طرح بے ستون قائم رہتا ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آتا جاتا چلتا پھرتا ہے۔[2]

اہلِ عقل کے لیے نشانیاں:

اس کے علاوہ اس کے اندر اور بہت سی نشانیاں ہیں، جو پوشیدہ نہیں۔ اسی لیے اللہ نے یہ فرمایا کہ ان میں اہلِ عقل کے لیے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی نشانیاں اور دلیلیں ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ ﴾ [آل عمران: ١٩٠۔ ١٩١] ''بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش، اور رات اور دن کے اختلاف میں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ جو لوگ کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں سوچ بچار کرتے ہیں۔ (وہ کہتے ہیں:) اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بے فائدہ پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے، پس تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔''

فتح البیان میں ہے کہ ان آٹھوں چیزوں میں اللہ قادرِ مطلق، مختارِ کل کے وجود اور اس بات کی بڑی دلیل ہے کہ وہ صانع اپنے ملک میں وحدہ لاشریک لہ ہے، کوئی اس کا نظیر نہیں۔ ''آیات'' کا لفظ بصیغہ جمع اس لیے کہا ہے کہ ان آٹھ قسم کی چیزوں میں سے ہر قسم میں بہت سی نشانیاں ہیں، جو اس بات کی دلیل ہیں کہ اس کے لیے کوئی خالق اور تدبیر کرنے والا اور مختار ہے۔[3]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٥٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٢٣٠۔ ٢٣٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٢٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٧٥٦)

[2] فتح البيان (١/ ٣٣٠) [3] فتح البيان (١/ ٣٣٠)

آیت کا شانِ نزول:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر یہ بات کہی کہ تم اللہ سے دعا کرو کہ کوہِ صفا سونے کا ہو جائے اور ہم گھوڑے اور ہتھیار خرید لیں، پھر ہم تم پر ایمان لا کر تمھارے ساتھ ہو کر لڑیں۔ فرمایا کہ بہتر یہ ہے کہ تم عہد کرو کہ اللہ اگر صفا کو سونے کا کر دے گا تو تم ایمان لے آؤ گے۔ سب نے اقرار کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی، جبریل علیہ السلام آئے، کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم صفا کو اِن کے لیے سونے کا کیے دیتے ہیں، لیکن اگر وہ پھر تم پر ایمان نہ لائے تو پھر ہم ان کو ایسا عذاب کریں گے، جو سارے جہان میں کسی کو نہ کیا ہوگا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اے رب! نہیں، مجھ کو اور میری قوم کو چھوڑ دے۔ میں ان کو دن رات اسلام کی دعوت دیتا رہوں گا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری۔ اس کو امام ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم رحمہ اللہ وغیرہما نے روایت کیا ہے۔[1] کسی نے تفصیل کے ساتھ اور کسی نے مختصر۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

اور بعض لوگ وہ ہیں جو اللہ کے سوا، دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں، وہ ان سے یوں محبت کرتے ہیں جیسے اللہ سے محبت (کرنی چاہیے) اور ایمان والے اللہ کی محبت میں زیادہ سخت ہیں، اور جن لوگوں نے ظلم کیا، اگر وہ (اس وقت کو دنیا ہی میں) دیکھ لیں جب وہ عذاب دیکھیں گے (تو یہ جان لیں کہ) بے شک ساری کی ساری قوت اللہ ہی کے لیے ہے اور یہ کہ بے شک اللہ شدید عذاب والا ہے (165) جب وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی تھی، ان لوگوں سے

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۷۳) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲٦٥) اس کی سند حسن ہے۔ نیز یہ واقعہ آیت کے ذکر کے بغیر مسند احمد اور دیگر کتب میں مروی ہے۔ دیکھیں: مسند أحمد (۱/ ۲٤۲) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۳۳۸۸)

بے زار ہو جائیں گے جنھوں نے پیروی کی تھی اور وہ عذاب دیکھیں گے اور ان کے تمام تعلقات کٹ جائیں گے ﴿166﴾ اور جن لوگوں نے پیروی کی تھی، وہ کہیں گے: کاش کہ ہمارے لیے ایک بار (دنیا میں) واپسی ہو تو ہم بھی ان لوگوں سے اسی طرح بے زار ہو جائیں جس طرح وہ ہم سے بے زار ہو گئے ہیں۔ اسی طرح اللہ ان کے اعمال کو ناکام خواہش بنا کر ان کے سامنے دکھائے گا اور وہ آگ کے عذاب سے نکلنے والے نہیں ہوں گے ﴿167﴾

مشرکوں کے احوال اور اُن کے آقاؤں کا ان سے بے زاری کا اظہار کرنا:

جن کو لوگ اللہ کے سوا پوجتے ہیں، وہ اس روز پوجنے والوں کو جواب دیں گے۔ ان کی اُمید سب طرف سے ٹوٹ جائے گی اور وہ افسوس کریں گے، لیکن اس وقت افسوس کرنے کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اس آیت سے بُت پرستوں کے احوال شروع ہو رہے ہیں۔ انداد یہ ''ند'' کی جمع ہے۔ ''ند'' مثل ونظیر کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مشرک اللہ کے برابر اوروں کو ٹھہرا کر پوجتے ہیں، جیسی محبت ان کو اللہ سے چاہیے تھی، وہ محبت غیر اللہ سے کرتے ہیں، حالاں کہ اللہ کا کوئی شریک، ضد اور ند نہیں ہے۔ صحیحین میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ میں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا: یہ کہ تو کسی کو اللہ کے برابر کرے، حالاں کہ اللہ نے تجھ کو بنایا ہے۔[1] ایمان والوں کو جو اللہ کی محبت سب سے زیادہ ہے تو اسی سبب سے کہ وہ اللہ کو پہچاننے والے، اس کے قدر شناس اور موحد ہیں۔ وہ کسی شے کو اس کے ساتھ شریک نہیں کرتے۔ اکیلے ایک اللہ کو پوجتے ہیں۔ اسی پر بھروسا کرتے ہیں۔ سارے کاموں میں اسی سے التجا کرتے ہیں۔ اسی کو اپنا کارساز، نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا سمجھتے ہیں۔ خالق کے مقابلے میں کسی مخلوق کا کچھ بھی اعتبار نہیں کرتے۔

پھر اللہ نے مشرکوں ظالموں کو یہ وعید سنائی کہ اگر وہ اللہ کے عذاب کو دیکھ لیں تو ان کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ سارا زور اللہ ہی کا ہے نہ کہ کسی اور کا۔ اسی ایک لاشریک لہ کا حکم جاری وساری ہے۔ ساری کائنات اس کے حکم کے آگے بے بس اور مغلوب ہے اور اس کا عذاب سخت ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهُۥٓ أَحَدٌ ﴿25﴾ وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُۥٓ أَحَدٌ ﴿26﴾ ﴾ [الفجر: ٢٥۔ ٢٦] ''چنانچہ اس دن اس جیسا عذاب دینے والا اور کوئی نہیں ہوگا۔ اور اس جیسا جکڑنے والا بھی اور کوئی نہیں ہوگا۔'' یعنی اگر ان ظالموں مشرکوں کو معلوم ہو جائے کہ وہاں کیا بلا ان کے سر آئے گی، اس شرک، کفر اور ظلم کے طفیل وہ کس قسم کے سخت اور ذلیل کرنے والے عذاب میں مبتلا ہوں گے، تو

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٢٠٧) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٦)

وہ جس گمراہی میں پھنسے ہوئے ہیں، اس سے باز رہیں۔

پھر یہ خبر دی کہ وہ اپنے بتوں سے آپ بیزار ہو جائیں گے۔ جن کی پیروی کی جاتی ہے، وہ پیروی کرنے والوں سے اظہارِ لاتعلقی کریں گے، مثلاً: جن فرشتوں کو وہ اپنے زعم میں پوجتے تھے، وہ اس دن یہ کہیں گے: ﴿ تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ ۝ ﴾ [القصص: ٦٣] ”ہم تیرے سامنے اظہارِ براءت کرتے ہیں کہ وہ ہماری عبادت کیا ہی نہیں کرتے تھے۔“ پھر یوں گزارش کریں گے: ﴿ سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾ [سبا: ٤١] ”وہ کہیں گے: تو پاک ہے، تو ہی ان کے ماسوا ہمارا کارساز ہے، بلکہ وہ تو جنوں کی عبادت کرتے تھے، ان کے اکثر انھی پر ایمان رکھتے تھے۔“ اسی طرح اور الٰہ بھی ان سے بے زار ہو کر ان کی پوجا پاٹ سے اپنی علاحدگی ظاہر کریں گے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ۝ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ۝ ﴾ [الأحقاف: ٥۔ ٦] ”اور اس سے زیادہ گمراہ کون شخص ہے، جو اللہ کے سوا اس کو پکارتا ہے جو اُسے قیامت تک جواب نہیں دے سکتا؟ جبکہ وہ ان کی پکار ہی سے غافل ہیں۔ اور جب لوگ اکٹھے کیے جائیں گے تو وہ (جھوٹے معبود) ان کے دشمن ہوں گے، اور وہ ان کی عبادت کے منکر ہوں گے۔“

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۝ كَلَّا ۚ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ۝ ﴾ [مریم: ٨١۔ ٨٢] ”اور انھوں نے اللہ کے سوا معبود بنا لیے ہیں، تاکہ وہ ان کے مددگار ہوں۔ ہرگز نہیں! عن قریب وہ خود ان کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور ان کے مخالف ہو جائیں گے۔“ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: ﴿ وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۡ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ ﴾ [العنكبوت: ٢٥] ”اور ابراہیم نے کہا: تم نے اللہ کے سوا جن بتوں کو معبود ٹھہرا لیا ہے، تو یہ محض تمھاری آپس کی دنیا کی دوستی کی وجہ سے ہے، پھر روزِ قیامت تم میں سے ایک دوسرے کا انکار کرے گا اور تم میں سے ایک دوسرے پر لعنت بھیجے گا اور تمھارا ٹھکانا آگ ہے، اور تمھارے لیے کوئی مدد کرنے والے نہ ہوں گے۔“

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ښ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ۝ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَاۗءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ

اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ؕ وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْۤ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۳۳﴾ ﴾ [سبا: ۳۱۔ ۳۳] ''اور جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے کہا: ہم اس (قرآن) پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے اور نہ ان (کتابوں) پر جو اس سے پہلے آئیں، اور (اے نبی!) کاش آپ دیکھیں! جب ظالم لوگ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے، جبکہ ان کا بعض بعض کی بات رد کر رہا ہوگا تو جو لوگ (دنیا میں) کمزور سمجھے جاتے تھے، وہ ان لوگوں سے کہیں گے جو تکبر کرتے تھے: اگر تم نہ ہوتے تو یقیناً ہم مومن ہوتے۔ وہ لوگ جو تکبر کرتے تھے ان لوگوں سے کہیں گے جو کمزور سمجھے جاتے تھے: کیا ہم نے تمھیں ہدایت سے روکا تھا جب وہ تمھارے پاس آ گئی تھی؟ بلکہ تم (خود ہی) مجرم تھے۔ اور وہ لوگ جو کمزور سمجھے جاتے تھے ان لوگوں سے کہیں گے جو تکبر کرتے تھے: (نہیں!) بلکہ (تمھاری) رات اور دن کی چالوں ہی نے (ہمیں روکا تھا) جب تم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اللہ کے ساتھ کفر کریں اور اس کے لیے شریک ٹھہرائیں اور وہ (سب دل میں) ندامت چھپائیں گے جب عذاب دیکھیں گے، اور ہم ان لوگوں کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے جنھوں نے کفر کیا، انھیں صرف اسی کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ عمل کرتے تھے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالَ الشَّیْطٰنُ لَمَّا قُضِیَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ مَاۤ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِیَّ ؕ اِنِّیْ كَفَرْتُ بِمَاۤ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ؕ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۲۲﴾ ﴾ [إبرھیم: ۲۲] ''اور جب (جنت یا جہنم کے) معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے گا تو شیطان کہے گا: بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا، اس کی میں نے خلاف ورزی کی اور میرا تم پر کوئی زور نہ تھا، مگر یہ کہ میں نے تمھیں دعوت دی تو تم نے میری بات مان لی، چناں چہ تم مجھے ملامت نہ کرو اور اپنے آپ کو ملامت کرو۔ میں تمھارا فریاد رس نہیں اور نہ تم میرے فریاد رس ہو۔ بلاشبہ میں تو اس کا انکار کرتا ہوں جو تم اس سے پہلے مجھے (اللہ کا) شریک ٹھہراتے تھے۔ بے شک ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے۔'' تعلقات سے اس جگہ حیلے مراد ہیں، یا خلوص اور محبت کے رشتے۔

ان کا یہ کہنا کہ اگر ہم دوبارہ زندہ ہوں تو پھر ہرگز ان شرکا کو نہ پوجیں، بلکہ فقط اللہ کی عبادت کریں، غلط ہے، بلکہ جس طرح اللہ نے خبر دی ہے، وہ دنیا میں پھیرے بھی جائیں، تب بھی وہی پہلے والے کام کریں گے: ﴿ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ ﴾ [الأنعام: ۲۸] ''اور اگر انھیں واپس (دنیا میں) بھیج دیا جائے تو بھی وہ وہی کام کریں گے جن سے انھیں روکا گیا تھا۔'' اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ ہم ان کو افسوس دلانے کے لیے ان کے عمل دکھا دیں گے، یعنی وہ

سارے عمل برباد اور ضائع ہو کر رہ جائیں گے اور کچھ کار آمد نہیں ہوں گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴾ [الفرقان: ۲۳] ''اور انھوں نے جو (بظاہر نیک) عمل کیے ہوں گے، ہم ان کی طرف متوجہ ہو کر ان کو اڑتا ہوا پراگندہ گرد و غبار بنا دیں گے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴾ [إبراهيم: ۱۸] ''جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا ان کے (نیک) اعمال کی مثال راکھ کی سی ہے، جس پر آندھی کے دن زور کی ہوا چلی۔ جو کچھ انھوں نے کمایا، وہ اس پر کوئی قدرت نہیں رکھیں گے۔ یہی پرلے درجے کی گمراہی ہے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴾ [النور: ۳۹] ''اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال چٹیل میدان میں ریت کی طرح ہیں، پیاسا اس (ریت) کو پانی سمجھتا رہا، حتی کہ جب وہ اس کے پاس پہنچا تو اس نے وہاں کچھ بھی نہ پایا اور اللہ کو اپنے پاس پایا، پھر اللہ نے اس کا حساب پورا پورا چکا دیا اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔'' اسی مناسبت سے پھر یہ فرما دیا کہ وہ آگ سے باہر نکلنے والے نہیں ہیں۔

جنت اور جہنم دونوں دائمی ہیں:

معلوم ہوا کہ کافروں کو جہنم میں ہمیشہ رہنے والی ابد الآباد تک کی زندگی ملے گی، جس میں کوئی وقفہ نہیں ہوگا۔ جس طرح اہلِ جنت کو بھی جنت میں اس طرح کی ہمیشہ کی زندگی نصیب ہوگی۔ یہ بات نہیں ہے کہ جنت تو ہمیشہ کے لیے رہے اور دوزخ ایک مدت دراز کے بعد اپنے اہل کے ساتھ فنا ہو جائے، جس طرح بعض سلف و خلف کا مذہب ہے۔ قرآنِ مجید کی آیات اور صحیح احادیث سے جو بات قطعی طور پر ظاہر ہوتی ہے، وہ یہی ہمیشگی ہے اور دونوں فریق کا جنت اور آگ میں ہمیشہ بغیر وقفے کے رہنا ہے۔

تقلید کی مذمت:

اس آیت سے اہلِ علم کی ایک جماعت نے حدیث اور پرانے اقوال کی رو سے تقلید کی مذمت پر دلیل لی ہے اور اس بات پر استدلال کیا ہے کہ جس طرح اہلِ شرک کے متبوعین اپنے پیچھے چلنے والوں سے بے زاری ظاہر کریں گے، اسی طرح ائمہ مجتہدین اپنے مقلدوں سے سخت ناراض اور بیزار ہوں گے، کیوں کہ چاروں امام رحمہم اللہ اپنی اور دوسروں کی تقلید سے منع کر گئے ہیں۔ لہٰذا جس کام سے انھوں نے اُمت کو دنیا میں منع کیا تھا، وہ اس کام پر آخرت میں ان سے ضرور خفا ہوں گے، اپنے مقلدوں کی اس سرکشی اور حکم عدولی کو ہرگز پسند نہیں کریں گے۔ إن شاء اللہ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿168﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿169﴾

اے لوگو! تم ان چیزوں میں سے کھاؤ جو زمین میں حلال اور پاکیزہ ہیں اور مت پیروی کرو شیطان کے قدموں کی، بے شک وہ تمھارا کھلا دشمن ہے ﴿168﴾ بس وہ تو تمھیں صرف برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور یہ کہ تم اللہ کے بارے میں وہ باتیں کہو جو تم نہیں جانتے ﴿169﴾

حلال کھانے اور شیطان کی پیروی نہ کرنے کا حکم:

جب یہ بات بیان ہو چکی کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، مستقل خالق وہی وحدہ لا شریک لہ ہے تو اب یہ بیان فرمایا کہ ساری مخلوق کا رازق بھی وہی ایک اللہ ہے۔ اس جگہ یہ احسان جتلایا کہ ہم نے ان کے لیے جو کچھ زمین میں ہے، سب مباح کر دیا ہے، بشرطیکہ ہماری طرف سے حلال طیب ہو۔ طیب ہونے کا یہ مطلب ہے کہ بدن وعقل کو کسی طرح کا نقصان نہ دے۔ پھر شیطان کے طور طریقوں کی پیروی کرنے سے منع کیا، جس طرح اس نے جاہلیت والوں کو بحیرہ، سائبہ، وصیلہ (اونٹنیوں اور جانوروں کے خود ساختہ نام) کو حرام کر کے بہکا دیا تھا۔ سیدنا عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ فرماتا ہے: جو مال میں نے اپنے بندوں کو دیا، وہ ان کے لیے حلال ہے۔ میں نے اپنے بندوں کو حنیف بنایا، یعنی موحد۔ شیطانوں نے آ کر ان کو دین سے بہکا دیا اور جو میں نے حلال کیا تھا، اس کو ان پر حرام کر دیا۔ الحدیث (رواہ مسلم)[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پڑھی گئی تو سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! اللہ سے دعا کریں کہ وہ مجھے مستجاب الدعوات کر دے۔ فرمایا کہ اے سعد! اپنے کھانے کو پاک اور حلال کر، تیری دعا قبول ہوگی۔ اللہ کی قسم ہے کہ آدمی اپنے پیٹ میں ایک حرام کا لقمہ ڈالتا ہے تو چالیس دن تک اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ جس بندے کا گوشت حرام اور سود سے پرورش پایا ہے، اس کے لائق یہی دوزخ ہے۔ (رواہ ابن مردویہ)[2]

آیت کا شانِ نزول:

یہ آیت ثقیف، خزاعہ، عامر اور بنی مدلج وغیرہم کے حق میں اُتری ہے۔ انھوں نے حرث و انعام (کھیتی اور

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٨٦٥)

[2] المعجم الأوسط (٦/ ٣١٠) اس کی سند میں ''حسن بن عبدالرحمٰن احتیاطی'' ضعیف راوی ہے۔ السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٨١٢)

جانوروں) کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے یہی کہا ہے۔[1] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس قوم کے لیے اتری ہے، جنھوں نے اچھے کھانے اور اچھے کپڑے کو اپنی جانوں پر حرام ٹھہرا لیا تھا۔[2] امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول مرجوح ہے۔ لیکن امام شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ لفظ کی عمومیت کا اعتبار ہے، سبب کی خصوصیت کا نہیں۔[3]

موضح قرآن میں ہے: ''عرب کے لوگوں نے دینِ ابراہیمی علیہ السلام کو کئی طرح بگاڑا تھا۔ اول غیر اللہ کو پوجنے لگے، ان کی نیاز میں جانور ذبح کرنے لگے کہ وہ مردار ہوتا ہے اور کفر ہے۔ مویشی میں سے کئی چیزیں حرام ٹھہرا لیں، جن کا بیان سورۃ المائدہ اور سورۃ الانعام میں آیا ہے کہ خنزیر کے گوشت کو حلال سمجھا۔ ان باتوں پر اللہ ان کو الزام دیتا ہے۔'' حلال کو حلال اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں کسی طرح کا خطرہ نہیں رہتا۔ طیب سے وہ مراد ہے، جو مزیدار ہو۔

کھانے پینے والی چیزوں میں اصل اباحت ہے:

اس آیت میں یہ ذکر ہوا ہے کہ ان میں اصل حلت (حلال ہونا) ہے، یہاں تک کہ کوئی ایسی دلیل آئے جو اس کو حرام ٹھہرائے۔ مزید دلیل کے طور پر یہ آیت ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ [البقرة: ٢٩] ''وہی ہے (اللہ) جس نے تمھارے لیے پیدا کیا سب کا سب جو کچھ زمین میں ہے۔''

شیطان کے قدموں سے مراد:

امام قتادہ اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو بھی اللہ کی نافرمانی ہے، وہ شیطان کے قدم ہیں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خطوات سے مراد شیطان کا ورغلانا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شیطان کے قدم یا اس کی خطائیں مراد ہیں۔ ابومجلز نے کہا ہے کہ گناہ کے کاموں کی نذریں ہیں۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک آدمی نے نذر مانی تھی کہ اپنے بیٹے کو حلال کرے گا۔ مسروق رحمہ اللہ نے اس کو فتویٰ دیا کہ بکرا ذبح کر دے اور یہ کہا کہ تیری نذر خطواتِ شیطان میں سے ہے۔[4] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ضرع (ایک قسم کی سبزی) اور نمک لائے گئے، وہ اس کو کھانے لگے۔ ایک آدمی الگ جا بیٹھا، انھوں نے کہا کہ اس کو بھی دو۔ اس نے کہا کہ میں نہیں لیتا۔ پوچھا کہ کیا روزے دار ہو؟ کہا کہ نہیں، پوچھا کہ پھر کیا سبب ہے؟ کہا کہ میں نے ضرع کو اپنے اوپر ہمیشہ کے لیے حرام کر لیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ خطواتِ شیطان میں سے ہے اور قسم کا کفارہ دے۔[5] (رواه ابن أبي حاتم)

ابورافع رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں ایک دن اپنی بیوی پر خفا ہوا، اس نے کہا کہ میں ایک دن یہودیہ ہوں، ایک دن

---

(1) تفسیر القرطبي (٢/ ٢٠٧) (2) تفسیر البیضاوي (١/ ٤٤٤، ٤٤٥) (3) فتح القدیر (١/ ٣١٠)

(4) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٨٠، ٢٨١) (5) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٨٠) اس کی سند حسن ہے۔

نصرانیہ، میرے سارے لونڈی و غلام آزاد ہیں، اگر تو مجھ کو طلاق نہ دے۔ انھوں نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ "إِنَّمَا هٰذَا مِنْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ" ''ایسی باتیں یقیناً شیطان کے قدموں پر چلنے کی ہیں۔'' یہی بات زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہی۔ یہ مدینہ میں بڑی فقیہہ تھیں۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جو قسم یا نذر غصے میں ہوتی ہے، وہ خطواتِ شیطان ہے۔ اس کا کفارہ وہی قسم کا کفارہ ہے۔[2] غرض کہ خطوات سے مراد شیطان کا حکم، طریقہ اور تزئین وعمل ہے اور وہ چیز جو شرع میں نہیں آئی اور وہ شیطان کی طرف منسوب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ خطوات سے مراد حقیر گناہ ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ آرائشِ شیطان ہے، لیکن زیادہ بہتر یہ ہے کہ لفظ کو عام رکھا جائے، کسی فرد یا قسم کے ساتھ خاص نہ کریں۔

شیطان کی دشمنی:

یہ کہنا کہ شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے، اس کی اتباع کی ممانعت کی دلیل ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ [القصص: ١٥] ''بلاشبہ وہ گمراہ کرنے والا کھلم کھلا دشمن ہے۔'' نیز اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ ﴾ [الفاطر: ٦] ''بے شک شیطان تمھارا دشمن ہے، لہٰذا تم اسے دشمن ہی جانو، بس وہ تو اپنے گروہ کو اس لیے بلاتا ہے کہ وہ جہنم والوں میں سے ہو جائیں۔'' اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کے ساتھ اس شیطان کی عداوت آدم علیہ السلام کے سامنے اسے سجدہ کرنے کا حکم دے کر واضح کر دی تھی کہ یہ شیطان آدم علیہ السلام اور اُن کی اولاد کا دشمن ہے۔ نیز فرمایا: ﴿ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝ ﴾ [الكهف: ٥٠] ''کیا پھر (بھی) تم مجھے چھوڑ کر اسے اور اس کی اولاد کو دوست بناتے ہو، جبکہ وہ تمھارے دشمن ہیں؟ وہ (شیطان) ظالموں کے لیے بطور بدل برا ہے۔'' پھر فرمایا کہ شیطان تم کو برے اعمال کا حکم دیا کرتا ہے۔ سب سے بدتر یہ ہے کہ زنا وغیرہ کرنا سکھاتا ہے۔ اس سے زیادہ بدتر یہ ہے کہ تم بغیر جانے کوئی بات اللہ پر جوڑ دو۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں ہر کافر اور مبتدع (بدعتی) داخل ہے۔[3]

موضح قرآن کے الفاظ یہ ہیں: یعنی مسئلہ اپنی طرف سے بنالو، جیسے اب بھی بہت غلط العام ٹھہر رہے ہیں۔ فتح البیان میں اس طرح ہے: جیسے بغیر علم کے یہ کہنا کہ یہ حلال ہے، یہ حرام ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت ہر اُس بات پر صادق آتی ہے، جو شریعت میں بغیر علم کے کہی گئی ہے۔ پس یہ آیت تمام مذاہبِ فاسدہ، آرائے کاسدہ (کھوٹی رائیں) قیاساتِ باردہ اور اجتہاداتِ جامدہ کو شامل ہوگی جن کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٨٠) [2] الدر المنثور (١/ ٤٠٤) [3] تفسير ابن كثير (١/ ٢٦٧)

سے اس کی کوئی دلیل آئی۔ شیطان کا وسوسہ اور حکم دراصل وہی خیالات ہیں، جو آدمی کے دل میں گزرتے رہتے ہیں۔ ان خیالات کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے، شیطان تو بہ طورِ عرض ہے۔ حدیث میں مروی ہے کہ شیطان ابن آدم کے اندر اس طرح چلتا پھرتا ہے، جس طرح رگوں میں خون چلتا ہے۔[1]

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس (قرآن) کی پیروی کرو، جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں: (نہیں) بلکہ ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ کیا (وہ پیروی کریں گے) اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ نہ سمجھتے ہوں اور نہ انھوں نے راہِ ہدایت ہی پائی ہو؟ ﴿170﴾

تقلیدی روش کی ابتدا اور اُس کی مذمت:

یعنی جب معلوم ہو گیا کہ باپ دادا کی رسم اللہ کے حکم کے خلاف ہے تو پھر اس پر کیا چلنا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے حق میں اُتری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اسلام کی طرف بلایا تھا، انھوں نے کہا کہ ہم تو باپ دادا کی راہ پر رہیں گے۔[2] ابو السعود رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ یہ آیت مشرکین کے حق میں اُتری ہے، ان کو حکم ہوا تھا کہ وہ قرآن پر چلیں اور جو کچھ اللہ کی طرف سے اُترا ہے، جو واضح دلیلیں ہیں، ان کی پیروی کریں۔ انھوں نے وہ تو نہ کیا، تقلید کی طرف جھکے۔[3] یہ ابو السعود رحمہ اللہ حنفی مذہب کے مفسر تھے۔ اُن کے بیان سے ظاہر ہوا کہ تقلید اہلِ شرک سے آئی ہے۔ جس طرح سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اصل تقلید یہود سے نکلی ہے۔ غرض کہ خواہ یہ تقلید اہلِ شرک کا شیوہ ہو یا یہودیوں کا طریقہ ہو، اس آیتِ شریفہ میں اس کی مذمت مقلدین کی جہالت کو ظاہر کرتی ہے۔

اسی طرح کی دوسری آیت ہے: ﴿وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا﴾ [المائدة: ۱۰۴] ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل کی ہے اور (آؤ) رسول کی طرف تو وہ کہتے ہیں: ہمیں وہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔'' یعنی ہم تو اسی کو حلال حرام سمجھیں گے، جس پر ہم نے اپنے آبا واجداد کو پایا ہے، جو اللہ و رسول کہتے ہیں، اس کی پیروی ہم سے نہ ہوگی۔

---

[1] فتح البيان (۱/ ۳۳۶) صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۹۳۳) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۱۷٤)

[2] تفسير الطبري (۳/ ۳۰۵) تفسير ابن أبي حاتم (۱/ ۲۸۱) اس کی سند حسن ہے۔

[3] تفسير أبي السعود (۱/ ۱۸۸)

یہی مقلدینِ مذاہب کا مقولہ ہے کہ جو ہمارے ائمہ اور علماے فقہ نے کہا ہے اور اصطلاحات، فتاوی اور آرا کی کتابوں میں لکھ گئے ہیں، ہم اس کو مانیں گے اور جو قرآن و حدیث میں آیا ہے، اس پر ہرگز نہیں چلیں گے۔

فتح البیان میں لکھا ہے کہ اس آیت میں تقلید کی قباحت اور ممانعت کی دلیل ہے، پھر اس جگہ امام رازی رحمہ اللہ سے ردِ تقلید پر ایک عمدہ تقریر نقل کی ہے، پھر کہا ہے کہ امام رازی رحمہ اللہ نے یوں کہا ہے کہ اس آیت کو شیطانی قدموں کی پیروی سے منع کرنے کے بعد یہ تنبیہ کرنے کے لیے لائے ہیں کہ شیطانی وسوسوں کی پیروی اور تقلید کی پیروی میں کچھ فرق نہیں ہے۔[1]

یہ آیت اس بات پر ایک مضبوط دلیل ہے کہ جو بات دلیل کے بغیر پیش کی جائے اس پر غور و فکر کرنا اور دلیل طلب کرنا واجب ہے۔ یا کوئی غیر اگر کوئی بات کہے تو اس پر بغیر دلیل کے اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ کتاب ''الدین الخالص'' (نواب صاحب کی تالیف) میں تقریباً تیس (۳۰) آیات تقلید کے رد میں لکھی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں کتاب ''أدب الطلب''، رسالہ ''القول المفید'' اور ''فتاوی اعلام الموقعین'' وغیرہ، جو ائمۂ دین کی تالیفات ہیں، کافی، وافی، شافی اور صافی ہیں۔

امام بیضاوی رحمہ اللہ نے آیت زیرِ تفسیر کے تحت لکھا ہے کہ یہ آیت تقلید کی ممانعت پر اس شخص کے لیے دلیل ہے، جو نظر و اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو۔[2] امام بیضاوی رحمہ اللہ کی یہ بات کچھ ٹھیک نہیں، کیوں کہ ہر شخص نظر و اجتہاد کی قدرت نہیں رکھتا، جب نہیں رکھتا تو کیا اب اس کو تقلید کرنا چاہیے؟! حالاں کہ اہلِ اسلام کا، خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، کسی حالت میں بھی فروع و احکام میں تقلید کرنا صحیح نہیں۔ یہ تو عالم کی شان ہی کے لائق نہیں کہ وہ علم حاصل کر کے جاہلوں میں (بذریعہ تقلید) جا ملے۔ ﴿ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴾ [البقرة: ٦٧] ''میں اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ میں جاہلوں میں شامل ہو جاؤں۔'' اور جو جاہل ہے، اس کو اتنا کافی ہے کہ کتاب و سنت کے عالم سے ہر مسئلہ و حکم کا حال اس طرح دریافت کر لیا کرے کہ اس مسئلے میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا ارشاد اور حکم ہے؟ اس آیتِ شریفہ کے یہی معنی ہیں: ﴿ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [النحل: ٤٣] ''لہٰذا تم اہلِ ذکر (اہلِ کتاب) سے پوچھ لو، اگر تم علم نہیں رکھتے۔'' ذکر قرآن کا نام ہے۔ اہلِ ذکر سے علماے کتاب اللہ مراد ہیں۔ کتاب کا عالم وہی ہوتا ہے، جو علومِ سنتِ مطہرہ پر عبور رکھتا ہے۔ ایسا شخص قیامت تک ہر مسئلے کا جواب قرآن و حدیث کی نصِ صریح یا کلیات یا عمومی احکامات سے دے سکتا ہے، وہ نہ تو کسی کی فقہ اور رائے کا محتاج ہے اور نہ قیاس کا آرزومند۔

بقول مصطفیٰ زائر ز رائے دیگران ماندم شہود یار مانع گردد از اغیار عاشق را

---

[1] تفسیر الرازي (٥/ ٧) [2] تفسیر البیضاوي (١/ ٤٤٧) فتح البیان (١/ ٣٣٧، ٣٣٨)

''محمد مصطفیٰ ﷺ کے قول کی وجہ سے میں دوسروں کی رائے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، کیوں کہ یار کا وصل و ملاقات عاشق کو غیروں کی جانب دیکھنے سے بے نیاز کرتا اور روک دیتا ہے۔''

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

اور جن لوگوں نے کفر کیا، ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اس (جانور) کو پکارتا ہے جو پکارنے اور چلانے کے سوا کچھ نہیں سنتا۔ وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، اس لیے وہ عقل نہیں رکھتے ﴿۱۷۱﴾

کافروں کی مثال:

یعنی ان کافروں کو سمجھانا ایسا ہے، جیسے کوئی جنگلی جانوروں کو بلائے کہ وہ سوائے آواز کے کچھ نہیں سمجھتے۔ یہی حال اس شخص کا ہے، جو خود علم نہیں رکھتا اور علم والے کی بات قبول نہیں کرتا۔ یہ ایک مثال ہے جو اللہ تعالیٰ نے مقلدین کی مذمت کے لیے بیان فرمائی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ﴾ [النحل: ٦٠] ''جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، ان کے لیے بری مثال ہے۔'' آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس سرکشی، گمراہی، جہالت اور تقلید میں یہ کافر گرفتار ہیں، ان کی مثال جانوروں کی مثال ہے کہ آواز تو سنتے ہیں، مگر بات نہیں سمجھتے۔ یہی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، ابو العالیہ، مجاہد، عکرمہ، عطا، حسن، قتادہ اور ربیع بن انس رحمہ اللہ کا قول ہے۔[1]

اسلام میں تقلید نہیں ہے:

معلوم ہوا کہ اسلام میں تقلید نہیں ہے۔ یہ تقلید اہلِ کتاب، اہلِ شرک اور اہلِ کفر سے نکل کر اس دین میں بھی پھیل گئی ہے، اسی لیے علمائے دین نے تقلید کو شرک و حرام کہا ہے اور منحوس بتایا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ ان کے بتوں کو پکارنے کی مثال ہے جو نہ سنتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں اور نہ کچھ سمجھتے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کو ذکر کیا ہے۔[2] لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے پہلی بات کو زیادہ بہتر بتایا ہے، کیوں کہ بت مطلقاً کچھ نہیں سنتے، نہ سمجھتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں، نہ پکڑتے ہیں اور نہ اُن میں حیات ہے۔[3] جنگل کے جانور پکارنا اور بلانا تو سنتے ہیں، گو بات نہیں سمجھتے، چناں چہ اسی طرح مقلدین کا حال ہے کہ جانوروں کی طرح توحید و سنت کی طرف بلانے والوں کی آواز تو سنتے ہیں، مگر ان کی بات ان کے گلے سے نہیں اُترتی۔ حق سننے، یعنی اس کو قبول کرنے سے بہرے، حق کہنے سے گونگے، راہِ حق دیکھنے سے اندھے اور حق سمجھنے سے بے شعور ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ﴾

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٨٢) [2] تفسیر الطبري (٣/ ٣١٢) [3] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٦٨)

مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۹﴾ [الأنعام: ۳۹] ''اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہ اندھیروں میں بہرے اور گونگے ہیں، اللہ جسے چاہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہے سیدھی راہ پر لے آتا ہے۔''

مشرک جانور کی طرح ہوتا ہے:

فتح البیان میں یہ لکھا ہے کہ اس آیت میں کافروں کے واعظ اور اُنھیں دعوتِ اسلام دینے والے، یعنی محمد ﷺ کو راعی (چرواہے) کے ساتھ تشبیہ دی ہے کہ جس طرح وہ اُونٹ یا بکری کو پکارتا ہے، مگر سوائے آواز کے، وہ کچھ نہیں سنتے، ایسا ہی حال ان کافروں کا ہے، جن کو رسول اللہ ﷺ اسلام کی طرف بلاتے ہیں۔ سلف کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہوا کہ کافر تقلید میں اپنے انہماک کی وجہ سے اپنا ذہن اس پر نہیں جماتے، جو اُن پر پڑھا جاتا ہے۔ یہ جانوروں کی طرح ہیں کہ آواز سنیں، مگر بات نہ سمجھیں۔[1] امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت یہود کے لیے اُتری ہے۔[2]

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تمھیں رزق کے طور پر دی ہیں اور اللہ کا شکر کرو، اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو (172) اللہ نے تو تم پر صرف مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ چیز حرام کی ہے جس پر اللہ کے سوا کسی کا نام پکارا جائے، پھر جو شخص مجبور ہو جائے، جب کہ وہ سرکشی کرنے والا اور حد سے گزرنے والا نہ ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے (173)

حلال کھانے کا حکم اور حرام چیزوں کا بیان:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے مومن بندوں کو حکم دیا کہ وہ پاک رزق کھائیں اور اللہ کا شکر ادا کریں، اگر اس کے بندے ہیں۔ حلال کا کھانا دعا و عبادت کے قبول ہونے کا سبب ہوتا ہے، جیسے کہ حرام کھانا دعا و عبادت کی قبولیت میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اے لوگو! اللہ پاک ہے اور نہیں قبول کرتا،

---

[1] تفسیر البیضاوي (۱/ ٤٤٨) [2] تفسیر الطبري (۳/ ۳۱۵) فتح البیان (۱/ ۳۳۹، ۳٤۰)

مگر پاک۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو اسی بات کا حکم دیا ہے جو رسولوں کو حکم دیا ہے، رسولوں کو فرمایا: اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو، میں تمھارے کاموں کو جانتا ہوں۔ اسی طرح یہ کہا کہ اے ایمان لانے والو! کھاؤ پاکیزہ چیزیں، جو ہم نے تم کو دی ہیں۔ پھر ایک آدمی کا ذکر کیا کہ وہ لمبا سفر کرتا ہے، پریشان حال، بال گرد آلودہ اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر یا رب! یا رب! کہتا ہے، حالاں کہ اس کا کھانا حرام ہے، پینا حرام ہے، لباس حرام ہے اور حرام سے پلا ہے۔ کہو! اس کی دعا کہاں سے قبول ہو؟ [1] (رواہ أحمد و مسلم و الترمذي) معلوم ہوا کہ عبادات اور دعا کی قبولیت کے لیے اصل چیز اَکلِ حلال ہے۔ اس کے ساتھ اگر صدقِ مقال (سچ بولنا) بھی ہوتا ہے تو آدمی سراپائے مقبول ٹھہر جاتا ہے۔

سارے تصوف کا گر یہی دو حرف ہیں۔ جب یہ فرما دیا کہ رزقِ حلال کھاؤ تو اب رزقِ حرام سے منع کر دیا، پھر حرام چیزوں کے نام لے کر بتا دیا۔ مردار وہ جانور ہے، جو آپ ہی آپ مر جائے، کوئی اس کو حلال نہ کرے، یعنی ذبح نہ کیا جائے، خواہ گلا گھونٹا ہوا ہو، یا پہاڑ پر سے گرا ہوا ہو، یا سینگ کا مارا ہوا، یا درندے کا پھاڑا ہوا ہو، لیکن جمہور نے دریا کے مردار کو اس سے مستثنیٰ کیا ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ ﴾ [المائدة: ٩٦] ”تمھارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کیا گیا ہے۔“ اور عنبر (ایک مچھلی ہے) سے متعلق مروی حدیث ہے، جو بخاری، مسند احمد، موطا اور سنن میں آئی ہے۔ [2] رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق « هُوَ الطَّهُوْرُ مَاؤُهُ وَالْحِلُّ مَيْتَتُهٗ » یعنی دریا کا پانی پاک اور اس کا مردار حلال ہے۔ [3] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ ہمارے لیے دو مردار حلال ہوئے اور دو خون: مچھلی، ٹڈی، جگر اور طحال (تلی)۔ [4] اس سلسلے میں تفصیل سورۃ المائدہ میں آئے گی۔

امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کے نزدیک مردار کا دودھ اور اس کے جسم سے ملا ہوا انڈا نجس ہے، کیوں کہ یہ اس مردار کا جزو ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے ایک روایت میں پاک بتایا ہے، مگر ہمسائیگی کے سبب نجس ہوتا ہے، اسی طرح نفحۂ میتہ (مردار کی بدبو) میں اختلاف ہے۔ صحابہ نے مجوس کا پنیر کھایا ہے۔ [5] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ کچھ تھوڑے سے دودھ میں ملا ہوتا ہے۔ جب پتلی چیز زیادہ ہو تو تھوڑی نجاست معاف ہوتی ہے۔ [6] سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا ہے

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠١٥) مسند أحمد (٢/ ٣٢٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٨٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٠٣) الموطأ (٢/ ٩٣٠) مسند أحمد (٣/ ٣٠٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٤٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٣٥٢)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٨٠)

[4] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣١٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١١١٨)

[5] تفسير ابن كثير (١/ ٢٦٩) [6] تفسير القرطبي (٢/ ٢٢١)

کہ رسول اللہ ﷺ سے گھی، پنیر اور بال دار چمڑے کے متعلق پوچھا گیا کہ اس کا کیا حکم ہے؟ فرمایا کہ حلال وہ ہے، جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں حلال کیا ہے اور حرام وہ ہے، جو اللہ نے اپنی کتاب میں حرام کیا اور جس چیز سے سکوت فرمایا، وہ معاف ہے۔ (رواہ ابن ماجه)[1] اسی طرح بہتا خون حرام ہے، اگرچہ نجس نہ ہو۔ یہی خنزیر کے گوشت کا حکم ہے، خواہ اس کو ذبح کیا ہو یا وہ خود مر گیا ہو۔ سور کی چربی بھی اس کے گوشت کی طرح حرام ہے، تغلیباً یا اس لیے کہ گوشت میں چربی بھی شامل ہے یا قیاس کی وجہ سے حرام ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو جانور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہے، کسی آستانے پر یا کسی بت پر یا کسی پانسے پر اور اس کی مثل ذبح کیا جائے، جس کی مثل جاہلیت والے ذبح کیا کرتے تھے تو وہ حرام ہے۔[2] امام حسن بصری رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ ایک عورت نے اپنے کھیل تماشے کے لیے ایک شادی منائی ہے اور اس میں ایک اونٹ حلال کیا ہے؟ کہا: اس کو نہ کھاؤ، وہ تو بت کے لیے ذبح کیا گیا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ یہ جو عجمی لوگ اپنی عیدوں میں جانور ذبح کرتے ہیں، پھر مسلمانوں کو اس میں سے تحفہ بھیجتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟ کہا: جو جانور اس دن کے لیے ذبح کیا جائے، اس کو نہ کھاؤ، ان (عجمی لوگوں) کے درختوں کا پھل کھاؤ۔[3] مطلب یہ ہوا کہ جو جانور کسی بت یا آستانے کے لیے یا اسلام کے طریقے کے خلاف کسی جلسے یا جشن میں ذبح کیا گیا ہے، اس کا کھانا حرام ہے۔

لغت میں اِہلال کے معنی آواز کا بلند کرنا ہے، لہٰذا جس جانور پر کسی طاغوت یا بت کا نام پکارا گیا ہے، وہ جانور اس کی طرف منسوب ہوا اور اس کی نذر و نیاز کے لیے رکھا گیا تو وہ حرام ہو چکا ہے، خواہ ذبح کے وقت اس پر اس بت یا طاغوت کا نام لیا جائے یا اللہ ہی کے نام سے حلال کیا جائے، وہ کسی طرح حلال نہیں ہوتا۔ مفسرینِ سلف وَخلف نے اِہلال کے معنی میں جو لفظِ ذبح ذکر کیا ہے، وہ اس لیے کہ جاہلیت والے جس جانور کو غیر اللہ کے نام پر مقرر کرتے تھے، اسے ذبح کرتے وقت بھی اسی غیر کا نام لیتے تھے، اللہ کا نام نہیں لیتے تھے۔ اللہ نے ان کے کام کا رد کیا اور فرمایا کہ جس پر غیر اللہ کا نام لیا جائے، وہ سور، خون اور مردار کی طرح حرام ہے۔

اہلِ تفسیر نے شانِ نزول پر خیال کر کے لفظِ ذبح کو اختیار کر لیا، لیکن لغوی معنی پر خیال نہ کیا، حالاں کہ لغت مقدم ہوتی ہے۔ قرآن پاک کی بلاغت کو تو دیکھو کہ آیت کا نزول جاہلیت کے زمانے کے طرزِ ذبح کے سلسلے میں ہوا، مگر وحی میں وہ لفظ بولا گیا، جو ذبح اور صرف آواز بلند کرنا، دونوں کو شامل ہے، تاکہ یہ نہ ہو کہ اگر کسی غیر اللہ کے نام نذر و نیاز کیے گئے جانور پر ذبح کے وقت اللہ کا نام لے دیں تو اسے جاہل مسلمان حلال طیب سمجھ کر نوش جاں کر

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣٦٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣١٩٥)

[2] تفسير ابن كثير (١/ ٢٦٩) [3] تفسير القرطبي (٢/ ٢٢٤)

جائیں، بلکہ یہ بتلا دیا کہ اس جگہ اصل اعتبار نیت کا ہے، جب نذر و نیاز کرنے والے کی نیت غیر اللہ کے لیے ہوئی تو اب ذبح کے وقت خواہ اللہ کا نام لیا جائے، خواہ غیر اللہ کا، برابر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نام لینے سے وہ جانور حلال نہیں ہو جاتا، بلکہ یہ آیت نہایت درجہ عام ہے، جو ذبح حیوان وغیرہ اور غیر اللہ کی نذروں سب کو شامل ہے۔ کیوں کہ عربی زبان میں لفظ "مَا" اعم العام کا صیغہ ہے۔ معلوم ہوا کہ کسی چیز پر جب غیر اللہ کا نام لگے گا، وہ جانور ہو یا کچھ اور تو وہ چیز حرام ہو جائے گی، کھانے کی چیز ہو تو کھانا، پہننے کی ہو تو اس کا پہننا۔ نیز کسی اور استعمال کی ہے تو اس کا استعمال حرام ہوگا، کیوں کہ عمومِ لفظ کا اعتبار ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا، مگر جس چیز کو دلیل نے خاص کر دیا ہو تو اور بات ہے۔

مُردوں اور قبروں کے نام پر ذبح کا حکم:

فتح البیان میں تحریر ہے کہ یہ ذبح، جو اس قسم کا عقیدہ رکھنے والے قبروں پر کرتے ہیں، یہ ﴿وَمَآ أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ میں داخل ہے۔ اس ذبح میں اور جو بت کے لیے ذبح ہوتا ہے، کچھ فرق نہیں۔ نظام رحمہ اللہ نے تفسیر نیسا پوری میں لکھا ہے کہ علما نے کہا ہے، اگر کسی مسلمان نے کوئی جانور ذبح کیا اور اس ذبح سے اس کا مقصد غیر اللہ کا تقرب حاصل کرنا ہے تو وہ ذبح کرنے والا مرتد ہو گیا اور وہ ذبیحہ ایک مرتد کا ذبیحہ ہے۔[1]

صاحبِ روض نے کہا ہے کہ جب مسلمان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ذبح کیا تو وہ بھی کافر ہو گیا۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب ذبح سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہو تو اہلِ علم کے نزدیک کفر ہے تو دیگر اموات کے لیے کیوں کر درست ہو سکتا ہے؟ امام عطا و مکحول و حسن و شعبی رحمہم اللہ کے نزدیک نصاریٰ کا مسیح کے نام پر ذبح کیا ہوا اس آیت کی دلیل سے جائز ہوا کہ ﴿وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ﴾ [المائدة: ٥] "اور اہلِ کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے۔" مگر امام مالک، شافعی اور ابو حنیفہ رحمہم اللہ اس کو حلال نہیں کہتے۔ ان کی یہ دلیل ہے کہ جب انھوں نے ذبح پر مسیح کا نام لیا تو یہ ﴿وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ ہو گیا اور یہ جب ہو گیا تو حرام ہو گیا۔

سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب تم یہود و نصاریٰ کو سنو کہ وہ اہلال لغیر اللہ کرتے ہیں (غیر اللہ کے نام پر پکارتے ہیں) تو نہ کھاؤ اور جب نہ سنو تو کھاؤ، کیوں کہ اللہ نے ان کے ذبح کیے ہوئے جانور حلال کیے ہیں۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔[2] حاصل کلام یہ ہوا کہ اگرچہ لفظِ طعام عام ہے، مگر آیتِ اہلال عام کو خاص کرنے والی ہے، معنی یہ ہوئے کہ یہود و نصاریٰ کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے، مگر وہ کھانا جس پر غیر اللہ کا نام لگا ہو۔ خواہ کوئی جانور ہو، جس کو عیسیٰ علیہ السلام کے نام پر ذبح کیا گیا ہو، یا اور کوئی چیز ہو، وہ حلال نہیں۔

---

[1] تفسير النيسابوري (١/ ٤٧١)

[2] تفسير الرازي (٥/ ١٩) فتح البيان (١/ ٣٤٣)

مجبوری کی حالت میں حرام کھانے کا جواز:

پھر جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حرام کر دیا ہے، انھیں چیزوں کو ناچارگی، حاجت اور ضرورت کے وقت، جب کوئی کھانا نہ ملے، فقط یہی چیزیں ملیں تو کھانے کی اجازت دی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ باغی و عادی (نافرمانی کرنے والا یا حد سے بڑھنے والا) نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ راہ زن نہ ہو، امام سے جدا نہ ہو۔ اللہ کی معصیت میں گھر سے باہر نہ نکلا ہو تو ایسے شخص کو ان چیزوں کا کھانا درست ہے۔ ورنہ اگرچہ ناچار ہو، اس کو یہ رخصت نہیں ہے۔ یہی امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔ مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ باغی نہ ہو، یعنی اس کو حلال نہ سمجھے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی شہوت کے لیے نہ کھائے۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی مردار کے کباب بنا کر خوب مزیدار پکا کر نہ کھائے، بلکہ سادہ طور پر کھائے، پھر جب حلال ملے تو اس حرام کو پھینک دے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ پیٹ بھر کر نہ کھائے کہ یہ زیادتی ہے اور بغیر حاجت کے مردار کو نہ کھائے کہ یہ بغاوت ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی حلال ملتے ہوئے حرام کی طرف نہ دوڑے۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مضطر وہ ہے، جو مجبور کیا گیا ہو اور اس کا بس نہ چلے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مضطر کو اگر مردار ملا اور دوسرا کھانا بھی، جس میں مجبوری اور اذیت نہیں ہے تو وہ مردار نہ کھائے، بلکہ دوسرا کھانا کھا لے، اس میں کوئی اختلاف نہیں۔[2] رہی یہ بات کہ اس طعام کا ضمان لازم ہے یا نہیں؟ اس میں مالک رحمہ اللہ کے دو قول ہیں۔

سیدنا عباد بن شرحبیل رضی اللہ عنہ نے بھوک کے مارے ایک شخص کے باغ سے ایک بالی توڑ کر دانے نکال کر کھا لیے تھے اور کچھ اپنی چادر میں رکھ لیے، باغ کے مالک نے ان کو مارا اور کپڑا چھین لیا۔ انھوں نے آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے شخص! تو نے اس کو جو بھوکا تھا اور بلا ضرورت لینے والا نہیں تھا، کیوں نہ کھلایا؟ اگر اُسے مسئلے کا علم نہیں تھا تو کیوں نہ اسے بتلایا؟ پھر ان کا کپڑا واپس کرا دیا اور ایک وسق (ساٹھ صاع) یا نصف وسق طعام اس کو دلوا دیا۔ اس کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس حدیث کی سند صحیح، قوی اور جید بتائی ہے۔ اس کے بہت سے شواہد ہیں، چناں چہ حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ جو پھل لٹکتا ہو، اس کا کیا حکم ہے؟ فرمایا کہ اگر حاجت والے نے کچھ اپنے منہ میں لے لیا اور جھولی نہ بھری تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے۔[4] الحدیث۔

مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت مضطر کے حق میں ہے، جس نے اضطرار کی حالت میں کھا لیا ہے۔

---

① تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٨٣۔ ٢٨٥) ② تفسير القرطبي (٢/ ٢٢٥، ٢٢٩)

③ سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٩٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٥٣)

④ سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٨٩) امام البانی رحمہ اللہ نے "السلسلة الصحيحة" (رقم الحديث: ٣١٢١) میں بحث کرتے ہوئے مذکورہ روایت کو ذکر کر کے فرماتے ہیں: "وهذا إسناد متصل حسن"

ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ تین لقمے سے زیادہ نہ کھائے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ غفور ہے کہ جو حرام کھایا، اس کو معاف کر دے گا اور رحیم ہے کہ حرام کو مضطر کے لیے حلال کر دیا ہے۔[1] مسروق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے اضطرار میں نہ کھایا نہ پیا، پھر مر گیا تو دوزخ میں گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مردار کا کھانا مضطر کے لیے عزیمت ہے نہ کہ رخصت۔ الکیا ہراسی رفیقِ غزالی نے کہا ہے کہ ہمارے نزدیک یہی صحیح ہے، جیسے بیمار کے لیے روزہ افطار کرنا لازم ہے۔[2]

فتح البیان کے الفاظ ہیں کہ مضطر وہ ہے جس کو مر جانے کا ڈر ہو اور اگر مجبور ہے تو اس کو مجبوری دور ہونے تک محرمات کا کھانا جائز ہے۔ اگر بھوکا ہے اور ہمیشہ اسی مخمصے میں مبتلا رہتا ہے تو پیٹ بھر کر کھایا کرے، اگر یہ مخمصہ کبھی کبھی ہوتا ہے تو امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اتنا کھا لے، جتنا سدِ رمق (جان کے سسکنے کو دور کرنے) کے لیے ضروری ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ پیٹ بھر کر کھائے۔[3]

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۖۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَاۤ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾

بے شک جو لوگ اللہ کی نازل کی گئی کتاب میں سے کچھ (باتیں) چھپاتے ہیں اور اس کے بدلے تھوڑا سا مول لیتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا کچھ نہیں بھرتے اور قیامت کے دن اللہ ان سے کلام نہیں کرے گا اور نہ انھیں پاک ہی کرے گا اور ان کے لیے بہت دردناک عذاب ہے ﴿174﴾ وہی لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی اور بخشش کے بدلے عذاب خریدا، چناں چہ وہ آگ پر کس قدر صبر کرنے والے ہیں؟ ﴿175﴾ یہ اس لیے کہ بے شک اللہ نے حق کے ساتھ کتاب نازل فرمائی اور بے شک جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف کیا، وہ مخالفت میں بہت دور تک چلے گئے ہیں ﴿176﴾

اللہ کی نازل کردہ آیات کو چھپانے پر یہودیوں کی مذمت:

یہودیوں نے اپنی کتاب میں پیغمبر آخر الزمان کی صفت چھپا ڈالی۔ بہت سی آیتوں کے معانی بدل ڈالے۔ دنیا

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٨٥) [2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٧٠) [3] فتح البیان (١/ ٣٤٤)

کی غرض کے لیے کہ کہیں اُن کی ریاست نہ جاتی رہے۔ وہ لوگ عرب سے ہدیہ تحفہ لیتے تھے اور ڈر گئے کہ اگر ہم صفتِ مذکورہ ظاہر کریں گے تو لوگ ہم کو چھوڑ کر پیغمبر کے تابع ہو جائیں گے اور آمدنی بند ہو جائے گی۔ اس لیے اس تھوڑی آمدنی پر رسول اللہ ﷺ کی تعریف کو چھپا ڈالا اور اپنی جانوں کو ہدایت، اتباعِ حق، تصدیقِ رسول اور ایمان باللہ کے بدلے اس بے حقیقت آمدنی پر بیچ دیا۔ دنیا و آخرت دونوں کا نقصان کیا۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر اپنے رسول ﷺ کی سچائی ظاہر کر دی۔ اپنے رسول کو آیاتِ ظاہرات اور قطعی دلائل عطا فرما کر اُن لوگوں پر، جن کو اس بات کا دھڑکا تھا، غضب پر غضب کیا۔ اللہ نے کتاب اللہ میں کئی جگہ ان کی مذمت کی ہے، جس طرح اس آیت میں فرمایا ہے کہ انھوں نے وہ تھوڑا مول نہیں لیا، بلکہ آگ سے پیٹ بھرا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴾ [النساء: ۱۰] ''بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ظلم کے ساتھ کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور وہ جلد دہکتی آگ میں داخل ہوں گے۔'' صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص سونے چاندی کے برتن میں کھاتا ہے، وہ اپنے پیٹ میں غٹ غٹ دوزخ کی آگ اُتارتا ہے۔[1] اسی جگہ سے اُردو کے محاورے میں پیٹ کو دوزخ کہتے ہیں، لہٰذا ایسے ہی پیٹ دوزخ ہوتے ہیں کہ جن میں حرام کا کھانا جاتا ہے، ورنہ حلال مال پیٹ میں جا کر نور بن جاتا ہے، جب کہ مال حرام آگ ہو جاتا ہے۔

اللہ پاک کا ان سے بات نہ کرنا، اس وجہ سے ہوگا کہ انھوں نے حق بات چھپائی اور جان بوجھ کر مکر گئے، اس لیے غضب کے مستحق ٹھہرے۔ گناہوں سے پاک نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کو اُن کے گناہ سے بَری نہیں کرے گا، بلکہ گناہ پر مار دے گا۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث میں مروی ہے کہ تین آدمی ہیں، جن سے اللہ بات نہ کرے گا، نہ ان کو پاک صاف کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا: ایک بوڑھا زناکار، دوسرا جھوٹ بولنے والا حکمران، تیسرا بھوکا متکبر۔[2] (رواہ ابن أبي حاتم) آگ پر صبر کرنے کا یہ مطلب ہے کہ جو کوئی ان کو دیکھے گا، وہ تعجب کرے گا کہ انھوں نے اس سخت عذاب کو اپنے لیے کیسے گوارا کیا، ان کو اس عذاب، بیڑیوں اور طوقوں پر کس طرح صبر آیا؟! کسی نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ گناہ کرنے پر خوب ہی جمے ہوئے ہیں، اس کا انجام ان کے لیے دوزخ ہوگا۔

یہ عذاب اس بات پر ٹھہرا کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں پر کتابیں اُتاریں، جن میں حق کو تسلیم کرنا اور باطل کا انکار کرنا ہے، انھوں نے ان آیات کو ہنسی مذاق میں اُڑا دیا۔ کتاب تو یہ کہتی تھی کہ تم علم کو ظاہر کرو اور عام کرو، لیکن انھوں نے اس کے برخلاف اس کی تکذیب کی اور اُس علم کو چھپایا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو اللہ کی طرف بلایا، نیکی کا حکم دیا، بدی سے منع کیا۔ یہ ان کو جھٹلانے لگے، انکار کرنے لگے اور اُن کی صفات کو چھپانے لگے۔ اس طرح وہ عذاب

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣١١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٦٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٧) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٨٦)

اور جکڑے جانے کے مستحق ہوئے۔ یہ صفت کا چھپانا اس طرح تھا کہ تورات میں خاتم رسل ﷺ کی نبوت کے جو اوصاف اور ظاہر ہونے کا وقت لکھا تھا، ان کو یہودی علما نے دبا دیا یا اس کا مطلب اور طرح بیان کیا۔ یہ آیت اگرچہ یہودیوں کے حق میں ہے، لیکن الفاظ کی عمومیت کے پیشِ نظر اور آیت کے خاص سبب کو چھوڑتے ہوئے، اب علمائے اسلام میں جو کوئی ایسا کرتا ہے کہ دنیا کے طمع سے قرآن کے احکام کو چھپا ڈالتا ہے اور دیدہ و دانستہ قرآن وسنت کے خلاف زید اور عمرو کے قول سے فتویٰ دیتا ہے، اس کا حکم بھی وہی یہودیوں کا حکم ہے۔ جو سزا ان کی اس جگہ بیان فرمائی ہے، وہی سزا اس اُمت کے عالم کے لیے بھی ہے۔ جس کتاب میں اختلاف کیا، اس سے مراد تورات ہے۔ نصاریٰ نے کہا کہ اس میں عیسیٰ علیہ السلام کی تعریف ہے، جس کا یہودیوں نے انکار کیا۔ یا قرآن مراد ہے، جس میں کفارِ قریش نے اختلاف کیا۔ کسی نے کہا ہے کہ جادو اور کہانت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ پہلے قصے کہانیاں ہیں۔ اس آیت پر پارہ سیقول کا ربع اول ختم ہوا۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ.

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿١٧٧﴾

نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو، بلکہ نیکی تو اس شخص کی ہے جو اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، (آسمانی) کتابوں پر اور نبیوں پر ایمان لائے اور مال سے محبت کے باوجود اُسے رشتے داروں میں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوال کرنے والوں اور گردنیں چھڑانے کے لیے خرچ کرے، اور نماز قائم کرے اور زکات دے اور (نیکی ان کی بھی ہے جو) جب عہد کر لیں تو اپنا عہد پورا کریں اور تنگ دستی اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت صبر کریں، وہی لوگ سچے اور وہی پرہیز گار ہیں ﴿177﴾

جامع نیکیاں:

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں بڑے جامع جملے، عام قاعدے اور مضبوط عقیدے ہیں۔

ابو ذر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا کہ ایمان کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھ کر سنائی۔ انھوں نے پھر یہی سوال کیا، آپ ﷺ نے پھر اسی آیت کو پڑھا، پھر پوچھا تو فرمایا کہ جب تو نیکی کرے تو تیرا دل اس کو دوست رکھے اور جب تو برا کام کرے تو تیرا دل اس کو دشمن رکھے۔ لیکن اس کی سند منقطع ہے۔ اسی کے قریب قریب ابنِ مردویہ نے بھی ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مطولاً ذکر کیا ہے، مگر وہ روایت بھی منقطع ہے۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے مومنین کو یہ حکم دیا تھا کہ منہ بیت المقدس کی طرف کیا کریں، پھر اُن کو کعبے کی طرف پھیر دیا۔ یہ بات اہلِ کتاب کے ایک گروہ اور بعض مسلمانوں پر شاق گزری۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے تحویلِ قبلہ کی حکمت بیان کی کہ اصل بات اللہ عزوجل کی اطاعت اور اُس کے حکم کی بجا آوری ہے۔ جدھر کا وہ حکم دے، اُدھر ہی کا رخ کرنا چاہیے۔ بڑی نیکی، تقویٰ اور ایمان یہی اتباعِ شریعت ہے۔ صرف ایک طرف، یعنی مشرق یا مغرب کی جانب منہ کرنا ہی نیکی نہیں ہے، اگر وہ اللہ کے حکم کے بغیر ہو۔ یہ ویسی ہی بات ہے، جیسے قربانی کے سلسلے میں فرمایا ہے: ﴿ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ﴾ [الحج: ۳۷] ''اللہ تک ان (قربانی کے جانوروں) کا گوشت ہرگز نہیں پہنچتا اور نہ ان کا خون، لیکن اس تک تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔''[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نماز پڑھو اور عمل نہ کرو۔ جب یہ آیت اُتری کہ کعبہ تبدیل کر دیا گیا ہے اور فرائض و حدود نازل ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ فرائض بجا لاؤ۔[3] یہی امام ضحاک اور مقاتل رحمہ اللہ کا قول بھی ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہود کا قبلہ مغرب تھا اور نصاریٰ کا مشرق۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یہ کچھ نہیں، بلکہ ایمان اور عمل کی حقیقت وہ ہے جو اس آیت میں ہے۔ یہی بات حسن اور ربیع رحمہ اللہ نے بھی کہی ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ساری اقسام نیکیوں کی یہی ہیں، جو اس آیت میں مذکور ہیں۔[4]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سچ ہے، کیوں کہ جو شخص اس آیت میں بیان کردہ صفتوں کا حامل ہے، وہ بالکل دائرۂ اسلام میں داخل ہے۔ اس نے ساری خیر حاصل کر لی اور اللہ پر ایمان لایا۔ ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه'' کا قائل ہوا، فرشتوں کے وجود کا، جو اللہ اور رسولوں کے درمیان سفیر ہیں، تصدیق کرنے والا ٹھہرا۔ اللہ کی جو کتابیں آسمان سے انبیا پر اُتریں، ان سب کو مانا، کیوں کہ کتاب کا لفظ اسم جنس ہے اور سب کتابوں کو شامل ہے، خصوصاً اس کتاب کو جو خاتم اور اشرف کتب ہے، یعنی قرآن۔ ہر خیر کی اس پر انتہا ہوئی ہے، دین و دنیا کی سعادت اس کے اندر ہے۔ اس نے سب کتابوں کو منسوخ کر دیا ہے، پھر سارے پیغمبروں پر ایمان لایا، جن کے خاتم محمد ﷺ ہیں۔[5] یہ اصولِ عقائد کا

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۸۷) امام مجاہد رحمہ اللہ اور سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کے درمیان انقطاع ہے۔ [2] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۷۱، ۲۷۲)
[3] تفسیر الطبري (۳/ ۳۳٦۔ ۳۳۷) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۸۷) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔
[4] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۸۷، ۲۸۸) [5] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۷۲)

بیان ہے، رہے فروع تو ان کا بیان اس کے بعد کیا ہے۔

مال دینے کا یہ مطلب ہوا کہ مال سے محبت تھی، مال میں رغبت تھی، مگر اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ اس کا یہی مطلب سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ وغیرہ سلف و خلف نے بیان کیا ہے۔[1] صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ افضل یہ ہے کہ تو صدقہ نکالے اور تو تندرست و بخیل ہو، تونگری کی اُمید رکھتا ہو، محتاجی سے ڈرتا ہو۔[2] حاکم کے الفاظ مستدرک میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس طرح مروی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ تو صدقہ دے اور تو صحیح اور تندرست ہو، زندگی کی اُمید رکھنے والا اور فقیری سے ڈرتا ہو۔ پھر کہا ہے کہ یہ حدیث شرطِ شیخین پر صحیح ہے، اگرچہ انھوں نے اس کو روایت نہیں کیا۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ موقوف ہے۔[4]

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ ﴾ [الدهر: ٨۔ ٩] ”اور وہ کھانا، اس کی محبت کے باوجود، مسکینوں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں۔ (اور کہتے ہیں:) بس ہم تو تمھیں اللہ کی خاطر کھانا کھلاتے ہیں، ہم تم سے جزا اور شکر گزاری نہیں چاہتے۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ﴾ [آل عمران: ٩٢] ”تم ہرگز بھلائی نہ پا سکو گے جب تک ان چیزوں میں سے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو جنھیں تم پسند کرتے ہو۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ [الحشر: ٩] ”اور اپنی ذات پر (ان کو) ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ خود انھیں سخت ضرورت ہو۔“

اول آیت میں یہ تھا کہ انھوں نے باوجود مال کی محبت کے مال دیا اور کھانا کھلایا۔ اس آیت میں یہ ہے کہ جس مال کے خود محتاج تھے، اس پر دوسروں کو ترجیح دی۔ اپنی تنگی ترشی کا کچھ خیال نہ کیا۔ یہ رُتبہ ہر رُتبے سے بڑھا ہوا ہے۔ ناتے داروں سے مراد رشتے دار ہیں۔ ان کو صدقہ دینا بہتر ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ مساکین پر صدقہ کرنا، ایک صدقہ ہے اور رحم والوں (رشتے داروں) پر صدقہ بھی ہے اور صلہ بھی ہے۔[5] تیرے نیکی کرنے یا تیرے دینے کے لیے زیادہ بہتر تیرے رشتے دار ہیں۔ یعنی ”اول خویش بعدہ درویش“ (پہلے اقربا کو اور پھر فقیر کو) قرآن پاک میں

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٨٨) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٣٥٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٣٢)

[3] مستدرك الحاکم (٢/ ٢٩٩) یہ روایت مستدرک میں موقوفاً مروی ہے اور امام حاکم رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ نیز امام ذہبی رحمہ اللہ نے بھی ان کی موافقت کی ہے۔ [4] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٧٢)

[5] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٦٥٨) سنن النسائي، رقم الحدیث (٢٥٨٢) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٨٤٤) صحیح الترغیب والترهیب (١/ ٢١٧)

کئی جگہ یہی حکم آیا ہے کہ قرابت والوں سے احسان کرو۔ یتیم وہ ہے جس کے لیے کوئی کمانے والا نہ ہو۔ اس کے باپ دادا مر گئے ہوں۔ وہ خود ضعیف، ناتواں، کمزور اور نابالغ ہو، خود کمانہ سکتا ہو۔ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ بلوغت کے بعد یتیمی نہیں ہے۔ [1] (رواہ عبدالرزاق)

مساکین وہ ہیں جن کے پاس کھانے، پہننے اور رہنے کو بقدرِ کفایت نہیں ہے۔ ان کو اتنا دے جس سے ان کا کام نکل جائے اور حاجت رفع ہو۔ صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ وہ شخص مسکین نہیں ہے، جو گلی کوچے میں پھرتا رہتا ہے، ایک دو کھجوریں یا ایک دو لقمے اس کو پھیر دیتے ہیں، بلکہ مسکین وہ ہے جو اتنا نہیں پاتا کہ آسودہ ہو، نہ کسی کو اس کی مسکینی کا علم ہوتا ہے کہ کچھ صدقہ اس کو دے۔ [2]

ابن السبیل سے وہ مسافر مراد ہے جس کے پاس خرچ نہ رہا۔ اس کو اتنا دے کہ اپنے شہر پہنچ جائے۔ اسی طرح وہ شخص جو کسی اطاعت کے لیے سفر کرنا چاہتا ہے، اس کو آنے جانے کے اندازے سے دے۔ اس میں مہمان بھی داخل ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ابن السبیل وہ مہمان ہے جو مسلمانوں کے پاس آ کر اُترتا ہے۔ [3] تابعین کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ سائلین وہ لوگ ہیں جو مانگتے پھرتے ہیں۔ ان کو زکات وصدقات سے کچھ دے دے۔ سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ سائل کا حق ہے اگرچہ گھوڑے پر چڑھ کر آئے۔ [4] (رواه أحمد و أبو داود) **اس حدیث کو اگرچہ بعض محدثین نے سخت ضعیف کہا ہے، مگر یہ محض بے اصل نہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کو نقل کیا ہے، مگر کچھ کلام نہیں کیا۔** [5] گردن چھڑانے کا یہ مطلب ہے کہ مکاتبین کو دے، جن کے پاس اتنی قدرت نہیں کہ وہ اپنا زرِ کتابت ادا کر سکیں۔ سورت براءت میں نیکی کی ان اقسام پر آیتِ صدقات کے تحت مفصل بیان آئے گا۔ إن شاء اللہ تعالیٰ.

سیدہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا مال میں زکات کے علاوہ بھی حق ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی۔ [6] (رواه ابن أبي حاتم و ابن مردويه و ابن ماجه والترمذي) **اقامتِ صلات کا یہ مدعا ہے کہ نماز کے کاموں کو پورا پورا اوقاتِ معینہ پر رکوع وسجود، اطمینان اور خشوع وخضوع کے ساتھ شرعی حکم کے مطابق ادا کیا**

---

(1) مصنف عبد الرزاق (٦/ ٤١٦) یہ روایت صحیح ہے۔ [إرواء الغليل: ٥/ ٧٩]

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣٩)

(3) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٨٩) اس کی سند حسن ہے۔

(4) مسند أحمد (١/ ٢٠١) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٦٥) اس روایت کی سند میں ''یعلی بن ابی یحییٰ'' مجہول راوی ہے۔ السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٣٧٨)

(5) تفسير ابن كثير (١/ ٢٧٣)

(6) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٨٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٨٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٥٩) اس کی سند میں ''ابوحمزہ'' ضعیف ہے۔ السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٣٨٣)

جائے۔ زکات سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مال میں ایک سال گزرنے کے بعد، جس حساب سے جو حق مقرر کیا ہے، وہ نکالا جائے یا یہ کہ جان کو برے اخلاق اور کمینی خصلتوں سے پاک صاف رکھا جائے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ ﴾ [الشمس: ۹۔ ۱۰] ''یقیناً فلاح پا گیا جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور یقیناً نامراد ہوا جس نے اسے آلودہ کیا۔''

موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے کہا تھا: ﴿ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى ۝ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝ ﴾ [النازعات: ۱۸۔ ۱۹] ''پھر (اسے) کہو: کیا تجھے اس بات کی کوئی رغبت ہے کہ تو پاک ہو جائے؟ اور میں تیرے رب کی طرف تیری راہنمائی کروں کہ تو ڈر جائے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ ﴾ [حٰم السجدة: ٦۔ ٧] ''اور مشرکین کے لیے ہلاکت ہے۔ جو زکات نہیں دیتے۔'' حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہ معنی لکھے ہیں کہ اگرچہ بجائے خود صحیح و درست ہیں، لیکن اگلے معنی اس جگہ زیادہ چسپاں ہیں، اسی لیے پھر یہ کہا ہے کہ یا مراد مال کی زکات ہوگی۔ یہی سعید بن جبیر اور مقاتل بن حیان رحمہما اللہ کا قول ہے۔[1] ان اقسام کا دینا اور اُن لوگوں کو دینا بہ طورِ مستحب، نیکی اور صلہ رحمی ہوتا ہے، جیسے فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں گزر چکا ہے کہ « إِنَّ فِي الْمَالِ حَقًّا سِوَى الزَّكَاةِ »[2] ''تحقیق زکات کے سوا مال میں اور بھی حق ہے۔''

وفائے عہد کا ذکر اور جگہ بھی قرآن پاک میں آیا ہے، جیسے فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝ ﴾ [الرعد: ۲۰] ''وہ جو اللہ کا عہد پورا کرتے ہیں اور پختہ وعدہ نہیں توڑتے۔'' اس کے برعکس صفتِ نفاق ہے۔ جس طرح حدیث میں آیا ہے کہ منافق کی تین علامتیں ہیں: جب بات کہے جھوٹ بولے، جب وعدہ دے تو اس کے خلاف کرے، جب امانت دار بنے تو خیانت کرے۔[3] دوسری حدیث میں یوں مروی ہے کہ جب عہد کرے تو توڑ ڈالے، جب جھگڑے تو گالی بکے۔[4] صبر کرنے سے مراد سختی میں صبر کرنا ہے کہ حالتِ محتاجی میں، جس کو ''باساء'' کہتے ہیں، صابر رہے۔ مرض اور اسقام میں اس کو ''ضراء'' کہتے ہیں، دشمنوں سے جنگ اور آمنے سامنے ہونے کی حالت میں، جس کو ''حِيْنَ الْبَأْسِ'' کہتے ہیں، حوصلہ رکھے، یعنی ثابت قدم رہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۹۰)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۸۸) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۱۷۸۹) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٦٥۹) اس کی سند میں ''ابوحمزہ'' ضعیف ہے۔ السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (٤٣٨٣)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥۹)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٨)

یہ تینوں حالتیں بہت سخت ہوتی ہیں، اس لیے ان جگہوں میں خاص کر صبر کرنے کا فرمایا ہے۔ پھر یہ کہا ہے کہ جن لوگوں میں یہ صفتیں پائی جاتی ہیں، سچ پوچھو تو ایمان کے سچے اور قول وفعل کے پکے یہی لوگ ہیں۔ انھوں نے اللہ سے ڈر کر محارم کو چھوڑا اور اطاعت بجا لائے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ حرف ''واؤ'' جو اُن اوصاف کے درمیان آئے ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہیں کہ نیکی کی شرائط میں یہ بات ہے کہ ان تمام اوصاف کو مکمل اور جمع کرے۔ اگر صرف ایک وصف حاصل کیا ہے تو ''بِرّ'' کی صفت کا مستحق نہیں ہوگا۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ انبیا کا خاصہ ہے۔ اس لیے کہ کسی دوسرے میں ساری صفات جمع نہیں ہوسکتیں اور کسی نے کہا ہے کہ بلکہ سارے مومنین میں عام ہے۔ فتح البیان میں اسی کو زیادہ بہتر کہا گیا ہے۔ اس لیے کہ تخصیص پر کوئی دلیل نہیں ہے۔[1] اول آیت میں پانچ چیزوں پر ایمان لانا بیان کیا ہے، پھر چھے جگہوں میں مال خرچ کرنے کا ذکر فرمایا، پھر نماز، زکات، عہد اور صبر کا نام لیا۔ صبر کی تین جگہیں بتائیں، یہ سب پندرہ وصف ہوئے یا اٹھارہ کہ اگر صبر کے مواضع کو علاحدہ گنا جائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! قتل ہو جانے والوں (کے معاملے) میں تمھارے لیے برابر کا بدلہ لینا فرض کر دیا گیا ہے۔ آزاد، آزاد کے بدلے، غلام، غلام کے بدلے اور عورت، عورت کے بدلے، پھر جس (قاتل) کو اس کا بھائی (مقتول کا ولی) کچھ (قصاص) معاف کر دے تو معروف طریقے سے اتباع (دیت کا مطالبہ) ہو اور اچھے طریقے سے (دیت کی) ادائیگی ہو۔ یہ تمھارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے، پھر اس کے بعد جس شخص نے زیادتی کی اس کے لیے درد ناک عذاب ہے (178) اور اے عقل والو! تمھارے لیے برابر کا بدلہ لینے ہی میں زندگی ہے، تاکہ تم (قتل و غارت سے) بچو (179)

قصاص کا حکم اور اس کی حکمت کا بیان:

یعنی ہر مرد دوسرے مرد کے برابر ہے اور ہر غلام دوسرے غلام کے برابر ہے۔ اشرف اور کم ذات کا فرق نہیں۔

---

[1] فتح البیان (۱/ ۳۵۱)

دولت مند اور فقیر کا تفاوت نہیں، جیسے کفر میں عام معمول تھا۔ جس کو معاف ہوا، اس سے مراد ہے کہ مقتول کے وارث اگر قصاص چھوڑ کر مال پر راضی ہوں تو قاتل کو چاہیے کہ ان کو راضی کرے اور منت اُٹھا کر خون بہا پہنچا دے۔ یہ آسانی ہوئی، کیوں کہ پہلی اُمتوں پر صرف قصاص ہی مقرر تھا۔ اس اُمت پر معاف کرنا یا مال پر صلح کرنا بھی جائز ٹھہرا، پھر جو دیت کا روپیہ لے کر صلح کرنے کے بعد مارنے کا قصد کرے تو اس کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ پھر فرمایا کہ تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے، اے عقلمندو! شاید تم بچتے رہو۔ یعنی حاکموں کو چاہیے کہ قصاص دلانے میں قصور نہ کریں، تاکہ آیندہ کے لیے خون ریزی بند ہو جائے۔

شانِ نزول:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت بنو قریظہ اور بنو نضیر کے بارے میں اُتری ہے۔ بنو نضیر جاہلیت میں بنو قریظہ سے بڑے تھے۔ جب کوئی نضری کسی قرظی کو مار ڈالتا تو اس کے عوض مارا نہ جاتا، بلکہ سو وسق کھجور دے کر بچ جاتا اور جب کوئی قرظی کسی نضری کو مار ڈالتا تو اس کے عوض مارا جاتا، اگر فدیہ دیتا تو دو سو وسق کھجور کے دیتا، یعنی قرظی سے دوگنی دیت دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ قصاص میں برابری رکھو۔[1] یہی طریقۂ جاہلیت آج کل اکثر جگہ جاری ہے۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسلام سے کچھ پہلے عرب کے دو قبائل جاہلیت میں باہم لڑے تھے۔ ان کی آپس میں مار کٹائی ہوئی۔ کوئی مرا کوئی زخمی ہوا، یہاں تک کہ غلام اور عورتیں ماری گئیں۔ بعض نے بعض سے بدلہ نہ لیا تھا کہ اتنے میں مسلمان ہوگئے۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے پر مال و اسباب میں دست درازی کرتا، اس پر قسم کھائی کہ جب تک اُن کا آزاد ہمارے غلام کے بدلے نہ مارا جائے گا، تب تک ہم راضی نہیں ہوں گے۔ اس پر یہ آیت اُتری کہ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت ہے، پھر آیت: ﴿ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ﴾ نے اس آیت کو منسوخ کر دیا۔[2]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) کی تفسیر میں کہا ہے کہ وہ مرد کو عورت کے عوض نہیں مارتے تھے، بلکہ مرد کو مرد کے عوض اور عورت کو عورت کے عوض قتل کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: ﴿ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ ﴾ [المائدة: ٤٥] ''بے شک جان کے بدلے جان ہے اور آنکھ کے بدلے آنکھ۔'' آزاد لوگ قصاصِ عمد میں برابر کر دیے گئے، خواہ مرد ہوں یا عورتیں، اسی طرح غلاموں کو بھی آقا کے برابر کر دیا۔[3] مالک کا بھی یہی قول ہے کہ آیت زیرِ تفسیر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ﴾ سے منسوخ ہے۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٩٣۔ ٢٩٤)
[2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٧٤)
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٩٤) اس کی سند حسن ہے۔

مسئلہ: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہ مذہب ہے کہ غلام کے عوض آزاد مرد مارا جائے گا، کیوں کہ آیتِ سورۃ المائدہ عام ہے۔ یہی ثوری، ابن ابی لیلیٰ، داود، علی، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، سعید بن المسیب، ابراہیم نخعی، قتادہ اور حکم رحمہم اللہ کا مذہب ہے۔ بخاری اور علی بن المدینی رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ غلام کے عوض آزاد سردار قتل کیا جائے گا، کیوں کہ سمرہ رضی اللہ عنہ سے جو حدیث حسن رحمہ اللہ نے روایت کی ہے، وہ عام ہے: «مَنْ قَتَلَ عَبْدَهٗ قَتَلْنَاهُ وَمَنْ جَدَعَ عَبْدَهٗ جَدَعْنَاهُ وَمَنْ خَصَاهُ خَصَيْنَاهُ»[1] ''جو اپنے غلام کو قتل کرے گا، ہم اس کو قتل کریں گے اور جو اپنے غلام کی ناک کاٹے گا، ہم اس کی ناک کاٹیں گے اور جو اس کو خصی کرے گا، ہم اسے خصی کریں گے۔''

جمہور کہتے ہیں کہ آزاد غلام کے عوض نہیں مارا جائے گا، کیوں کہ غلام ایک سامان ہے، اگر خطا سے قتل ہوگیا تو اس میں دیت واجب نہیں آتی اور جو واجب آتی ہے، وہ اس کی قیمت ہی ہے۔ جب اس کا قود (قصاص) اطراف (اعضا) میں نہیں لیا جاتا تو جان میں بہ طریقِ اولیٰ نہیں لیا جائے گا۔ اسی طرح جمہور کا قول یہ ہے کہ مسلمان کافر کے بدلے قتل نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ بخاری شریف میں سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: «لَا يُقْتَلُ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ»[2] ''مسلم کو کافر کے بدلے نہ قتل کیا جائے۔'' اب کوئی حدیث یا تاویل اس کے مخالف صحیح نہیں ہوگی۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں کہ مسلمان کافر کے عوض مارا جائے گا، کیوں کہ سورۃ المائدہ کی آیت عام ہے۔[3] مانا کہ یہ عام ہے، لیکن اس صحیح حدیث سے اس عموم کی تخصیص ہوسکتی ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ صحیح حدیث مہمل چھوڑ دی جائے۔ غالباً امام صاحب کو یہ حدیث نہیں پہنچی، ورنہ وہ اس کے خلاف ہرگز نہ کہتے۔

مسئلہ: امام حسن اور عطا رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اسی آیت کی دلیل سے مرد کو عورت کے عوض مارا نہیں جائے گا۔ جمہور نے اس کے خلاف کہا ہے کہ سورۃ المائدہ کی آیت کی دلیل سے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی دلیل سے «اَلْمُسْلِمُوْنَ تَتَكَافَأُ دِمَاءُهُمْ»[4] ''سب مسلمانوں کے خون ایک دوسرے کے برابر ہیں۔'' امام لیث رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر شوہر نے اپنی بیوی کو مار ڈالا تو خاص اس وجہ سے اس کا قتل نہیں کیا جائے گا۔ ائمہ اربعہ اور جمہور کا مذہب یہ ہے کہ ایک شخص کے عوض ایک جماعت قتل کی جائے گی۔ ایک لڑکی کو سات شخصوں نے قتل کیا تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر سارے اہلِ صنعاء اس کے مارنے پر جھکتے یا ہاتھ اُٹھاتے تو میں سب کو قتل کرتا۔ ان کے عہد میں کوئی صحابی ان کے اس مسئلے کا مخالف معلوم نہیں ہوا۔ گویا یہ حکم اجماع کی طرح ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت میں آیا ہے کہ

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥١٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤١٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٧٣٦) اس کی سند منقطع ہے۔ حسن رحمہ اللہ کا سماع سیدنا سمرۃ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١١) [3] تفسير ابن كثير (١/ ٢٧٤، ٢٧٥)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٥١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٦٨٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٧١٢)

جماعت کا قتل ایک شخص کے بدلے میں نہیں ہوگا، ایک جان کے عوض ایک ہی جان ماری جائے گی۔ ابن المنذر رحمہ اللہ نے سیدنا معاذ، ابن زبیر رضی اللہ عنہم، امام عبدالملک بن مروان، زہری، ابن سیرین و حبیب بن ابی ثابت رحمہم اللہ سے اس کی روایت کر کے یہ کہا ہے کہ زیادہ صحیح یہی ہے اور جس کسی نے جماعت کا قتل جائز قرار دیا ہے، اس کے پاس کوئی حجت نہیں ہے اور جب ابن زبیر رضی اللہ عنہما سے یہ قول ثابت ہو گیا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف غور وفکر کے لائق ٹھہرے گا۔[1]

قصاص اور دیت کے احکام:

قصاص، قتل و دیت اور جراحت میں برابری و یکساں کرنے کو کہتے ہیں، اس لیے امام مالک و شافعی رحمہما اللہ کے نزدیک قاتل کو اسی طرح کی چیز سے قتل کرنا چاہیے، جس سے اس نے قتل کیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ امام ابوحنیفہ اور احمد رحمہما اللہ کے نزدیک صرف تلوار سے مارنا چاہیے، کسی اور چیز سے نہیں، یہی مذہب قوی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ بھائی کا معاف کرنا یہ ہے کہ قتلِ عمد میں استحقاقِ دم کے بعد دیت لے لے۔[2]

تابعین کی ایک جماعت کا یہی قول ہے، دینے والا پوری دیت ادا کرے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے الفاظ یہ ہیں کہ احسان کے ساتھ دیا جائے، کا مطلب یہ ہے کہ معاف کرنے کو احسان سمجھے۔ تابعین کے ایک گروہ کا یہی قول ہے۔ ائمہ اربعہ کہتے ہیں کہ دم کے ولی کو یہ حق نہیں کہ دیت پر خون معاف کر دے، مگر قاتل کی رضا پر ایسا کر سکتا ہے۔ اہلِ علم کہتے ہیں کہ ایسا معاف کرنا جائز ہے، اگرچہ قاتل راضی نہ ہو۔ سلف کے ایک گروہ کا یہ مذہب ہے کہ عورت کو معاف کرنے کا حق نہیں پہنچتا، جب کہ دوسروں نے کہا ہے کہ پہنچتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے جو قتلِ عمد میں دیت کا لینا تجویز کیا ہے، یہ تمھارے لیے تخفیف اور رحمت ہے، ورنہ اگلی اُمتوں پر قتل یا عفو واجب تھا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اللہ نے بنی اسرائیل پر مقتولین کا قصاص فرض کیا تھا، ان میں عفو نہیں تھا۔ اس اُمت پر عفو کے طور پر قتلِ عمد پر دیت قبول کرنے کی اجازت دے کر سہولت پیدا کر دی۔[3] قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت پر رحم کیا کہ ان کو دیت کا مال کھلایا، جو اُن سے پہلے کسی کے لیے حلال نہ تھا۔ تورات والوں میں قصاص یا عفو تھا، ان میں ارش، یعنی دیت نہ تھی۔ انجیل والوں میں صرف معاف کرنا تھا، اسی کا ان کو حکم ہوا تھا۔ اس اُمت کے لیے قصاص، عفو اور دیت سب کچھ مقرر کر دیا۔[4] ایک جماعت تابعین کا بھی یہی قول ہے۔ پھر جس نے دیت قبول کر کے لے لی اور پھر قتل کیا، وہ سخت عذاب کا مستحق ہوگا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، عکرمہ، حسن اور ربیع رحمہم اللہ وغیرہم کا یہی قول ہے۔[5]

---

① تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٧٥) ② تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٩٥) اس کی سند میں "بشر بن عمارہ" ضعیف راوی ہے۔

③ سنن سعید بن منصور (٢/ ٦٥٢) اس کی سند صحیح ہے۔ ④ تفسیر ابن أبي حاتم (٢٩٦)

⑤ تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٩٦، ٢٩٧)

مرفوع حدیث میں مروی ہے کہ جو مارا گیا یا زخمی ہوا، اس کو تین باتوں کا اختیار ہے: قصاص لے یا معاف کر دے یا دیت لے۔ اگر کوئی چوتھی بات کرنا چاہے تو اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لو، یعنی وہ چوتھا کام اس کو نہ کرنے دو۔ پھر جس نے اس کے بعد زیادتی کی، وہ ہمیشہ کے لیے جہنم کی آگ میں گیا۔[1] (رواہ أحمد) امام حسن رحمہ اللہ کے الفاظ سمرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس آدمی کو معاف نہیں کرتا، جس نے دیت لینے کے بعد قتل کیا۔ یعنی اب میں اس کی دیت قبول نہیں کروں گا، اس کو قتل ہی کی سزا دوں گا۔[2]

قصاص کی حکمت:

قصاص کے مقرر ہونے میں بڑی حکمت ہے۔ وہ حکمت یہ ہے کہ اور جانیں بچتی ہیں۔ قاتل کو جب یہ معلوم ہوگا کہ وہ مارا جائے گا تو وہ ضرور اس کام سے حتی الامکان باز رہے گا۔ جب باز آیا تو جانیں بچ گئیں۔ پہلی کتابوں میں لکھا ہے کہ "اَلْقَتْلُ أَنْفیٰ لِلْقَتْلِ" یعنی قتل کرنے سے قتل کا رواج خوب دور ہوتا ہے۔ قرآنِ مجید میں یہ عبارت نہایت فصاحت و بلاغت اور اختصار کے ساتھ آئی ہے: ﴿ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قصاص کو حیات ٹھہرایا۔ بہت سے آدمی قتل کرنا چاہتے ہیں، پھر اس ڈر سے کہ وہ بھی قتل کیے جائیں گے، رُکے رہتے ہیں۔ سلف کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔[3] اہلِ عقل کو اس لیے مخاطب فرمایا کہ اس حکمت کا بغیر عقل کے سمجھنا مشکل ہے۔ عقل ہی حرام کردہ چیزوں اور گناہ کے کاموں سے باز رکھتی ہے۔ تقویٰ ایک ایسا لفظ ہے، جو اطاعت کے کاموں کے کرنے اور نافرمانی کے کاموں سے بچنے پر مشتمل ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٨٢﴾

تم پر فرض کر دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے، اگر وہ مال چھوڑے جا رہا ہو تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے معروف طریقے سے وصیت کرے، یہ متقیوں پر لازم ہے (180)

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٣١) اس روایت کی سند میں "سفیان بن ابی العوجاء" ضعیف راوی ہے۔ ضعیف الجامع، رقم الحدیث (٥٤٣٣)

[2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٧٦) الدر المنثور (١/ ٤٢١) اس کی سند منقطع ہے۔ حسن رحمہ اللہ کا سماع سیدنا سمرہ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٩٧)

پھر جو شخص اس (وصیت) کو سن لینے کے بعد بدل دے تو اس کا گناہ انھی لوگوں پر ہوگا جو اسے بدلیں گے، بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (181) پھر اگر کسی کو وصیت کرنے والے کی طرف سے حق تلفی یا کسی گناہ کا ڈر ہو اور وہ ان میں صلح کروا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے (182)

والدین اور رشتے داروں کے لیے وصیت کا حکم اور منسوخی:

کفر کی رسم میں میت کے وارث اولاد کے سوا کوئی نہیں تھے اور اولاد میں بھی فقط بیٹا۔ چناں چہ اللہ پاک نے پہلے درجے پر اولاد ہی کو وارث رکھا، مگر میت کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ماں باپ اور ناتے والوں کو اُن کی حاجت کے مطابق اپنے روبرو دلوا جائے۔ اگر میت نے کہہ دیا تھا، مگر دینے والوں نے نہ دیا تو میت پر کچھ گناہ نہیں۔ گناہ گار وہی ہیں۔ پھر کسی نے دیکھا کہ فوت ہونے والا بے انصافی سے دلوا گیا ہے اور اولاد کے لیے بہت تھوڑا بچا تو اوروں کو سمجھا کر صلح کرا دی، ایسا بدلنا گناہ نہیں ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے یہی حکم فرمایا تھا، پھر سورت نساء میں وارثوں کے حصے آپ ہی مقرر کر دیے۔ اب فوت ہونے والے کا دلوانا موقوف ہو چکا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت اس بات پر مشتمل ہے کہ والدین اور قریبی رشتے داروں کے لیے وصیت کرنی چاہیے۔ لہٰذا یہ بات وراثت کی آیت اُترنے سے پہلے اصح القولین پر (صحیح ترین قول کے مطابق) واجب تھی۔ جب اللہ نے فرائض اُتارے تو یہ حکم منسوخ ہو گیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ وراثت کے حصے فرض ہو گئے۔ وارث وہ حصے بغیر وصیت کے وجوباً لے سکتے ہیں۔ وصیت کرنے والے کا احسان اُٹھانا ضروری نہیں۔ اسی لیے سیدنا عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے میں فرمایا کہ اللہ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا، اب وارث کو وصیت کی حاجت نہیں ہے۔[1] (رواه أهل السنن)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ایک دن بیٹھے ہوئے سورۃ البقرہ پڑھ رہے تھے۔ جب اس آیت پر پہنچے تو کہا کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے۔[2] ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ماں باپ کے ہوتے ہوئے کوئی اور وارث نہیں ہوتا تھا سوائے اس صورت کے کہ فوت ہونے والا اقربین کے لیے وصیت کر جائے، اس پر اللہ تعالیٰ نے آیتِ میراث اُتاری، ماں باپ کی میراث کو بیان کیا اور اقربین (رشتے دار) کی وصیت کو مقرر رکھا، یعنی تہائی مال میں۔[3] ان کا تیسرا قول یہ

---

(1) تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٧٦) دیکھیں: سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٢١) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٦٤١) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٧٢٠)

(2) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٠٠) تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٧٦) امام حاکم اور ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

(3) تفسیر الطبري (٣/ ٣٨٩، ٣٩٠) اس کی سند حسن ہے۔

ہے کہ منسوخ کرنے والی آیت یہ ہے: ﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴾ [النساء: ۷] ''مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جائیں، اور عورتوں کے لیے بھی حصہ ہے، اس مال میں جو ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑ جائیں، (یہ چھوڑا ہوا مال) تھوڑا ہو یا زیادہ، اس میں ہر ایک کا مقرر کیا ہوا حصہ ہے۔''[1]

سلف کی ایک بڑی جماعت نے، جن کے نام حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھے ہیں، یہی کہا ہے کہ یہ آیت مذکورہ بالا آیت کو منسوخ کرتی ہے۔[2] امام رازی رحمہ اللہ پر تعجب ہے کہ انھوں نے ابو مسلم اصفہانی رحمہ اللہ سے حکایت کیا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں، بلکہ وراثت کی آیت اس کی تفسیر ہے، یعنی تم پر فرض ہے جو اللہ نے والدین اور اقربین کی وراثت کے بارے میں وصیت کی ہے اور وہ وصیت یہ ہے: ﴿ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ﴾ [النساء: ۱۱] ''اللہ تمھیں تمھاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے۔'' پھر کہا ہے کہ اکثر مفسرین اور فقہائے معتبرین کا یہی قول ہے۔ ہاں بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت وارث کے حق میں منسوخ اور غیر وارث کے حق میں ثابت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حسن، مسروق، طاؤس اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم کا یہی مذہب ہے۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سعید بن جبیر، ربیع، قتادہ اور مقاتل بن حیان رحمہ اللہ کا یہی قول ہے، لیکن ان کے قول پر اس کا نام ہماری پچھلی دی گئی اصطلاح پر منسوخ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ آیتِ مواریث نے بعض افراد سے، جن کو آیت کی عمومیت کی دلیل لے کر وصیت میں شامل کر لیا گیا تھا، یہ حکم اُٹھا لیا ہے، ساری آیت منسوخ نہیں ہوئی، کیوں کہ اَقربین کا لفظ وارث اور غیر وارث دونوں کے لیے عام ہے۔ وارث کا حکم اُٹھ گیا، کیوں کہ اس کا حصہ مقرر ہو چکا ہے، غیر وارث، جس پر پہلی آیت دلیل ہے، باقی رہ گیا۔

لیکن یہ بات اس شخص کے قول پر حاصل ہوتی ہے، جو یہ کہتا ہے کہ وصیت ابتدائے اسلام میں مستحب تھی، پھر منسوخ ہو گئی اور جو اِس بات کا قائل ہے کہ واجب تھی، چنانچہ سیاقِ آیت سے بھی ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے تو پھر اس آیت کا آیتِ مواریث سے منسوخ ہونا متعین ہو جائے گا۔ اکثر مفسرین اور فقہائے معتبرین کا یہی قول ہے، کیوں کہ والدین اور اقربین وارثوں کے لیے وصیت کا وجوب بالاجماع منسوخ ہے، بلکہ حدیث درج ذیل کی دلیل سے ممنوع ہے: « إِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَعْطٰى كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ فَلَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ »[4] ''تحقیق اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے، یعنی بتا دیا ہے، لہٰذا کسی وارث کے لیے وصیت نہیں۔'' پس آیتِ میراث ایک مستقل حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ فروض (جن کے حصے متعین ہیں) اور لواحقین کے لیے اس کو واجب کر دیا ہے اور آیت زیرِ تفسیر کا حکم بالکل اُٹھا دیا۔ رہے وہ قریبی رشتے دار، جن کے لیے کچھ وراثت نہیں ہے، تو فوت ہونے والے کے لیے مستحب ہے کہ ثلث (ایک تہائی) میں سے کچھ اُن کو بھی دلوا جائے، تاکہ آیتِ وصیت اور اس کے شمول سے اُنسیت باقی رہے۔[5]

---

(1) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۲۹۹) (2) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۷۷) (3) تفسیر الرازي (۵/ ۵۳، ۵٤)
(4) زیرِ تفسیر آیت میں اس کی تخریج گزر چکی ہے۔ (5) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۷۷)

صحیحین میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ کسی مسلمان کو جس کے پاس کوئی چیز وصیت کرنے کے لائق ہو، یہ شایاں نہیں کہ وہ دو رات اس حالت میں بسر کرے کہ اس کی وصیت لکھی ہوئی اس کے پاس موجود نہ ہو۔ پھر سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب سے میں نے اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، اس وقت سے ایک رات بھی نہیں گزری، مگر میرے پاس میری وصیت موجود ہے۔[1] اپنے عزیز و اقارب سے احسان کرنے کے بارے میں بہت سی آیات اور احادیث آئی ہیں۔

لفظِ خیر کی تفسیر:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس آیت میں لفظِ خیر سے مراد مال ہے۔ سلف کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔[2] مال کا نام جو خیر رکھا تو اس سے یہ مطلب نکلا کہ پاک مال میں وصیت کرنا مستحب ہے، خواہ مال زیادہ ہو یا تھوڑا۔ بعض نے کہا ہے کہ نہیں، جب زیادہ مال ہو، تب وصیت کرے، پھر زیادہ مقدار میں اختلاف ہوا۔ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ قریش میں فلاں شخص مر گیا ہے، تین سو یا چار سو دینار چھوڑ کر مرا ہے، کچھ وصیت نہیں کر گیا۔ کہا یہ کچھ چیز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے کہ خیر چھوڑ جائے، یعنی مالِ کثیر۔[3] اسی طرح علی رضی اللہ عنہ ایک ہم قوم آدمی کی عیادت کو گئے تھے۔ اس نے کہا کہ میں وصیت کروں؟ انھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ترکِ خیر کا ذکر کیا ہے، جب کہ تو نے ذرا سا مال چھوڑا ہے۔ اسے اولاد کو دے جا۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جس نے ساٹھ (٦٠) دینار چھوڑے، اس نے کچھ چیز نہ چھوڑی۔[5] طاؤس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس نے اسّی دینار نہ چھوڑے، اس نے کچھ مال نہ چھوڑا۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک ہزار دینار یا ہزار سے اوپر مال ہوتا ہے۔[6] کسی نے کہا ہے کہ سات سو دینار اور کسی نے کہا کہ پانچ سو دینار۔

غرض کہ اکثر کا قول یہی ہے کہ خیر مالِ کثیر کو کہتے ہیں نہ کہ مالِ قلیل کو۔ لہٰذا جس کے پاس تھوڑا مال ہے، اس پر وصیت واجب نہیں ہے، بلکہ بڑے مال دار پر واجب ہے۔ پھر جس شخص پر کسی کا قرض آتا ہے یا اس کے پاس کسی کی کوئی امانت رکھی ہوئی ہے تو باتفاق اہلِ علم اس پر وصیت کرنا واجب اور جس شخص کا یہ حال نہیں تو اکثر کے نزدیک، فقیر ہو یا غنی، اس پر وصیت کرنا واجب نہیں۔ مگر ایک گروہ کے نزدیک واجب ہے۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث، جو اُوپر گزری ہے، اسی کی تائید کرتی ہے۔

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٨٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢٧)

② تفسير الطبري (٣/ ٣٩٣) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٩٩) اس کی سند حسن ہے۔

③ تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٩٩) اس کی سند صحیح ہے۔

④ تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٩٨۔ ٢٩٩) اس کی سند حسن ہے۔

⑤ تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٩٩) اس کی سند میں ''حفص بن عمر عدنی'' ضعیف راوی ہے۔

⑥ تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٢٩٩) تفسير ابن كثير (١/ ٢٧٨)

وصیت کی حد:

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معروف سے مراد یہ ہے کہ اقربا کے لیے ایسی وصیت کرے، جو ورثا کے لیے نقصان دہ نہ ہو، نہ فضول خرچی ہو اور نہ بخیلی۔[1] جس طرح صحیحین میں آیا ہے کہ سعد رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ میرے پاس مال ہے، مگر ایک بیٹی کے سوا میرا کوئی وارث نہیں ہے۔ میں دو تہائی مال کی وصیت کر جاؤں؟ فرمایا کہ نہیں۔ کہا کہ آدھے مال کی؟ فرمایا کہ نہیں۔ کہا کہ ایک تہائی کی؟ فرمایا: ہاں، ایک تہائی بہت ہے، تیرا اپنے وارثوں کو آسودہ چھوڑ جانا، اس سے بہتر ہے کہ تو ان کو محتاج چھوڑ کر جائے، وہ لوگوں سے ایک ایک مٹھی مانگتے پھریں۔[2]

یہ بھی صحیح بخاری میں ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اگر لوگ تہائی سے چوتھائی پر آنکھ بند کر لیں تو کیا اچھا ہو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ثُلث دے اور ثُلث بہت ہے۔[3] حنظلہ بن جذیم بن حنیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے دادا حنیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک یتیم کو پالا تھا اور اس کے لیے سو اُونٹ کی وصیت کی۔ یہ بات ان کے بیٹوں کو ناگوار گزری۔ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا تو حنیفہ نے کہا کہ ہاں، میں نے سو اُونٹ کی وصیت اس یتیم کے لیے کی ہے، جن کو مطیہ کہتے ہیں، یعنی شتر سواری۔ فرمایا کہ نہیں، نہیں، نہیں، صدقہ پانچواں حصہ ہوتا ہے، ورنہ دسواں، ورنہ پندرھواں، ورنہ بیسواں، ورنہ پچیسواں، ورنہ تیسواں، ورنہ پینتیسواں، اگر اس سے زیادہ دے تو چالیسواں۔[4] (رواہ أحمد)

وصیت میں تبدیلی کا گناہ:

جس نے وصیت کو بدل ڈالا اور اس میں کچھ بڑھایا یا گھٹایا تو یہ گناہ انھی پر ہے، جنھوں نے اس کو بدلا، وصیت کرنے والے پر نہیں۔ اس تبدیلی میں وصیت کو چھپانا بھی بہ طریقِ اولیٰ داخل ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ نے کہا ہے کہ میت کا اجر اللہ پر واقع ہوا اور گناہ کا تعلق بدلنے والوں سے رہا۔[5] اللہ جانتا ہے، جو میت نے وصیت کی اور جس نے اس کو بدلا، اس کی بھی اسے خبر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام ابو العالیہ، مجاہد، ضحاک، ربیع اور سدی رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ ﴿جَنَفًا﴾ سے مراد خطا ہے۔[6] یہ لفظ ہر قسم کی خطا کو شامل ہے، جیسے کسی میراث کو کسی

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٢٩٨) تفسير ابن كثير (١/ ٢٧٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٩٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢٩)

[4] مسند أحمد (٥/ ٦٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٩٥٥)

[5] تفسير الطبري (٣/ ٣٩٧) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٠٠۔٣٠١) اس کی سند حسن ہے۔

[6] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٠٢)

واسطے یا وسیلے سے زیادہ کر دینا، مثلاً: یوں کہا کہ فلاں چیز میں نے اس کے ہاتھ فروخت کر دی ہے یا میرے نواسے کو اتنا اتنا دینا یا اور وسائل اس طرح کے کر جانا۔ یہ خطا بغیر عمل کے ہو، طبیعت وقوت مشقت کی راہ سے بغیر نقصان یا بلا ارادہ گناہ کے ہو تو ایسی حالت میں وصی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اصلاح کر دے اور انصاف برتے۔ وصیت کو تو وجہ شرعی پر رکھے، باقی جو بات اس کی وصیت کے قریب تر اور اُس سے زیادہ ملتی جلتی ہو، اس کو عمل میں لائے، تاکہ وصیت کرنے والے کا مقصد اور وجہ شرعی دونوں حاصل ہوں۔

اس طرح کی اصلاح اور شریعت کی موافقت حاصل کرنا تبدیلی میں داخل نہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے کہ "جنف" وصیت میں من جملہ کبائر سے ہے۔[1] (رواہ ابن مردویہ) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں مگر اس کے مرفوع ہونے پر اعتراض ہے۔[2] اس بارے میں جو سب سے بہتر حدیث آئی ہے، وہ یہ ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آدمی ستر برس تک اہلِ خیر کا سا کام کرتا ہے۔ جب وصیت کرتا ہے تو اس میں حیف یعنی ظلم کر جاتا ہے۔ اس کا خاتمہ عملِ بد پر ہوتا ہے۔ اس لیے دوزخ میں جاتا ہے۔ کوئی آدمی ستر برس اہلِ شر کا سا کام کرتا ہے، پھر وصیت میں انصاف کر جاتا ہے اور وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تمھارا جی چاہے تو تم یہ آیت پڑھ لو: ﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿13﴾ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿14﴾ ﴾ [البقرة: ٢٢٩] "یہ اللہ کی حدیں ہیں، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرے گا، اسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی حدوں سے آگے نکلے گا تو اللہ اسے آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔"[3] (رواہ عبدالرزاق) وصیت اور احکامِ وصیت کے بارے میں ابو النصر میر علی حسن خان (سلمہ اللہ تعالیٰ) نے رسالہ "تخریج الوصایا" بہت خوب جمع کیا ہے۔

فتح البیان میں لکھا ہے کہ ان آیتوں میں اس شخص کے لیے وعید ہے جو حق کے مطابق کی گئی وصیت کو، جس میں کسی طرح کی غلطی نہیں ہے، بگاڑ ڈالے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر ایسی وصیت کی ہے جو جائز نہیں، جیسے: شراب یا سور یا کسی اور معصیت کی تو اس کا بدل دینا جائز ہے، جاری کرنا جائز نہیں۔ جس طرح تہائی سے زیادہ دینا

---

[1] سنن البیهقي الکبریٰ (٦/ ٢٧١) امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس روایت کے موقوف ہونے کو صحیح اور مرفوع ہونے کو ضعیف کہا ہے۔

[2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٧٨)

[3] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢٨٦٧) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢١١٧) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٢٧٠٤) مصنف عبد الرزاق (٩/ ٨٨) اس کی سند حسن ہے۔ سنن ابی داود اور سنن ترمذی میں "ستر" کے بجائے "ساٹھ" کے الفاظ ہیں۔

جائز نہیں۔ یہ ابو عمرو کا قول ہے۔[1] پھر کہا ہے کہ بدلنے والے یا تو وصی ہوں گے کہ جنھوں نے ایسی وصیت کا انکار کیا اور اس کی کتابت یا تقسیمِ حقوق یا شہود میں اس کو بدل ڈالا، مثلاً: گواہی پوشیدہ رکھی یا بدل دی۔ یا بدلنے والے غیر وصی ہوں گے۔ اس جگہ ایک اشکال ہے۔ وہ یہ کہ پہلا کلام، جس میں والدین اور اقربین کے لیے وصیت کا ذکر تھا، منسوخ ٹھہرا اور وصیت تبدیل کرنے کا مضمون آخر آیت تک برقرار رہا۔ اب تک اسی پر عمل درآمد ہے۔

اس صورت میں آیتِ محکمہ کی ضمیر آیتِ منسوخہ پر کس طرح عائد ہو سکے گی؟ سلیمان جمل رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بات غور وفکر کرنے کے قابل ہے۔ میں نے نہیں دیکھا کہ کسی مفسر نے اس اشکال کے بارے میں ذکر کیا ہو، لیکن یہ اشکال اس شخص کے قول پر لازم آتا ہے، جو مذکورہ بالا وصیت کے نسخ کا قائل ہے، حالاں کہ اوپر گزر چکا ہے کہ ایک جماعت آیتِ مذکور کو محکم بتاتی ہے۔ جب محکم ٹھہری تو اب نہ کچھ جگہ تامل کی ہے اور نہ تنبیہ کی۔ اسی طرح فتح البیان میں ہے۔[2] لیکن قوی قول یہی تھا کہ آیتِ مذکورہ بالا منسوخ ہے، نہ کہ محکم۔ اس صورت میں کوئی اَمر اس بات سے مانع نہیں ہو سکتا کہ نصف آیت منسوخ اور نصف محکم ہو۔ جس طرح بعض آیتیں حکماً منسوخ ہیں، تلاوتاً نہیں یا اس کے برعکس ہے۔ واللہ أعلم.

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٨٣﴾ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٤﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر روزہ رکھنا اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم متقی بن جاؤ (183) (روزے) گنتی کے چند دن ہیں، پھر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دِنوں سے گنتی پوری کر لے اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو اس کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے، پھر اگر کوئی اپنی خوشی سے (زیادہ) نیکی کرے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے اور تمھارا روزہ رکھنا تمھارے لیے کہیں بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو (184)

روزے کی فرضیت، کیفیت اور حکمت:

موضح قرآن میں ہے کہ پہلے یہی حکم اُترا تھا کہ بیمار اور مسافر اگر چاہیں تو پھر قضا کر لیں۔ جن کو طاقت ہے

[1] تفسير القرطبي (٢/ ٢٦٩) [2] فتح البيان (١/ ٣٦٠)

یعنی بے عذر ہیں، وہ چاہیں کہ پھر قضا کریں تو ہر روزے کے بدلے ایک فقیر کو کھانا کھلا دیں اور بہتر یہی ہے کہ روزہ ہی رکھیں، پھر اس کے بعد جو آیت اُتری، اس میں فقط بیمار اور مسافر کو قضا کی رخصت ملی اور کسی کو نہیں ملی تھی۔

اس آیتِ شریفہ میں اللہ پاک نے مومنوں کو یہ حکم دیا ہے کہ تم روزہ رکھا کرو، یعنی کھانے، پینے اور جماع کرنے سے خالص اللہ کی نیت سے رک جاؤ۔ روزے میں برے اخلاق و عادات سے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ یہ روزہ صرف تمھیں پر انوکھا فرض نہیں ہوا، بلکہ جو اُمتیں تم سے پہلے تھیں، ان پر بھی فرض تھا۔ تمھیں اس نیک کام میں ان کی پیروی کرنی چاہیے، بلکہ اس فرض کے ادا کرنے میں تم ان کی نسبت زیادہ کشش محسوس کرو اور کوشش کرو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۚ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ﴾ [المائدة: ٤٨] ”ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک دستور اور طریقہ بنایا اور اگر اللہ چاہتا تو تمھیں ضرور ایک امت بنا دیتا، لیکن وہ چاہتا ہے کہ تمھیں اس (کتاب) کے بارے میں آزمائے جو اس نے تمھیں دی ہے، چناں چہ تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔“

یہاں ﴿ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ اس لیے کہا کہ روزے سے مقصود بدن کا پاک کرنا اور شیطان کے راستوں کا بند کرنا ہے۔ اسی لیے صحیحین میں آیا ہے کہ اے نوجوانو کے گروہ! جو کوئی تم میں سے نکاح کر سکے، وہ کرے اور جو نہ کر سکے، وہ روزے رکھے۔ یہ روزہ اس کے لیے خصی ہونا[1] (شہوانی جذبات کو کم کرنے والا) ہے۔ پھر یہ فرمایا کہ روزہ ہر دن مقرر نہیں ہے کہ جی پر شاق گزرے، اس کے ادا کرنے اور بجا لانے میں ضعف پیدا ہو، بلکہ کچھ گنتی کے دن ہیں۔ شروع اسلام میں ہر مہینے میں تین دن روزہ رکھتے تھے، پھر صومِ رمضان سے وہ حکم منسوخ ہوگیا۔ سیدنا معاذ، ابن مسعود، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام عطا، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ نوح علیہ السلام کے زمانے سے اب تک یہی دستور تھا کہ ہر مہینے میں تین روزے ہوتے، اللہ نے وہ حکم روزۂ رمضان سے اُٹھا دیا۔ مگر حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ واللہ! پہلی ہر اُمت پر یہی ایک ماہ کامل کے روزے فرض تھے، جس طرح ہم پر فرض ہیں۔ ایامِ معدودات سے مراد عددِ معلوم ہے۔[2] سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ رمضان کے روزے اللہ تعالیٰ نے اگلی اُمتوں پر فرض کیے تھے۔[3] (رواه ابن أبي حاتم)

یہ بھی سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ پہلی اُمتوں پر یہ فرض تھا کہ رات کی نماز پڑھ کر سو جائیں تو اگلی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠٠)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٠٤۔ ٣٠٥) تفسير ابن كثير (١/ ٢٧٩)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣٠٤) اس کی سند میں ”ابو الربیع“ مجہول راوی ہے۔

رات تک ان پر کھانا پینا اور عورتوں سے ملنا حرام ہو جاتا تھا۔[1] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ پہلے لوگوں سے اس جگہ اہلِ کتاب مراد ہیں۔ یہی بات شعبی، سدی اور عطا خراسانی رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے۔[2] پھر اللہ تعالیٰ نے ابتداے اسلام کا ذکر کیا کہ اس زمانے میں مرض اور سفر میں قضا کرنا درست تھا۔ مقیم صحیح، جس کو طاقت تھی، اس کو یہ اختیار دیا گیا کہ چاہے روزہ رکھے، چاہے افطار کرے اور افطار کے بدلے ہر روز ایک فقیر کو کھانا کھلا دیا کرے یا ایک سے زیادہ کو، اور جو روزہ رکھے تو افضل ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور طاؤس رحمہم اللہ وغیرہ خلف کا یہی قول ہے۔[3]

امام احمد رحمہ اللہ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نماز اور روزے نے تین پلٹے کھائے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آئے تو سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے رہے، پھر اللہ تعالیٰ نے کعبہ کا حکم دیا۔ یہ ایک پلٹا ہوا۔ دوسرا پلٹا یہ تھا کہ جب نماز کے لیے جمع ہوتے تو ایک دوسرے کو پکارتے، یہاں تک کہ ناقوس بجانا طے پایا تھا کہ اتنے میں عبداللہ بن عبد ربہ نے خواب میں اذان سنی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جاری کر دیا۔ اسی طرح کے دوسرے خواب عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے دیکھے تھے۔ یہ دو پلٹے ہوئے۔ تیسرا پلٹا یہ تھا کہ جب نماز کو آتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض رکعات پڑھ چکے ہوتے تو ایک نمازی دوسرے نمازی سے اشارتاً پوچھتا کہ کتنی رکعتیں ہو چکی ہیں؟ وہ کہتا ایک یا دو۔ اس پر وہ شخص اتنی نماز پڑھ کر پھر جماعت میں داخل ہوتا۔ معاذ رضی اللہ عنہ آئے، انھوں نے کہا کہ ایسے نہیں ہوگا، ہم جس حال پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پائیں گے، وہی کریں گے، پھر جو نماز ہم سے پہلے ہو چکی، اس کو پورا کریں گے۔ چناں چہ ایسا ہی کیا۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ سنت تمھارے لیے معاذ نے نکالی ہے، سو تم ایسا ہی کیا کرو۔ یہ نماز کے تین حال ہوئے۔

رہا روزہ تو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آئے تو ہر ماہ میں تین تین روزے اور ایک روزہ عاشوراء کا رکھتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے (آیت زیرِ تفسیر) اُتاری، اس پر یہ ٹھہرا کہ جس کا جی چاہے، وہ روزہ رکھے اور جو نہ رکھے، وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ اس کے بعد اگلی آیت نازل ہوئی: ﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ [البقرة: ١٨٥] ''رمضان کا مہینا وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت کی واضح اور حق کو باطل سے جدا کرنے والی دلیلیں ہیں، پھر تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے تو اسے چاہیے کہ اس کے روزے رکھے۔'' اس پر ہر مقیم اور صحیح پر ایک ماہ کے روزے ثابت ہوئے۔ مریض اور مسافر کو رخصت ملی۔ بوڑھے کو، جسے روزہ رکھنے کی طاقت نہیں ہے، کھانا دینا ٹھہرا، یہ دو پلٹے ہوئے۔ تیسرا یہ تھا کہ جب تک رات کو نہ سوتے کھاتے پیتے اور عورتوں کے پاس

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٣٠٥) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٣٠٥)
[3] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٨٠)

جاتے۔ جب سو گئے تو پھر کھا سکتے تھے نہ بیوی کے پاس جا سکتے تھے۔

ایک انصاری شخص، جس کا نام صرمہ تھا، روزے بھی رکھتا اور مزدوری بھی کرتا، ایک رات گھر آیا تو نمازِ عشا پڑھ کر سو گیا۔ نہ کچھ کھایا نہ پیا اور صبح کو روزہ دار اُٹھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو سخت تکلیف میں دیکھ کر حال پوچھا تو اس نے یہ قصہ بتایا۔ اُدھر تو یہ ہوا، اِدھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سونے کے بعد جماع کر بیٹھے، پھر رسول اللہ ﷺ سے اپنا حال بیان کیا۔ اس پر یہ آیت اُتری: ﴿ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ﴾ [البقرة: ۱۸۷] ''تمھارے لیے روزے کی رات کو اپنی عورتوں کے ساتھ صحبت کرنا حلال کر دیا گیا ہے، وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ اللہ نے جان لیا کہ بے شک تم اپنے آپ سے خیانت کرتے تھے، چناں چہ اس نے تم پر توجہ فرمائی اور تمھیں معاف کر دیا، اس لیے اب تم ان سے ہم بستری کر سکتے ہو اور اللہ نے تمھارے لیے جو لکھ رکھا ہے وہ تلاش کرو، اور کھاؤ اور پیو، حتی کہ تمھارے لیے صبح کی سفید دھاری کالی دھاری سے واضح (روشن) ہو جائے، پھر تم روزے کو رات تک پورا کرو۔'' اس حدیث کو ابو داود نے سنن میں اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے۔[1]

صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے آیا ہے کہ جب رمضان فرض ہوا، اس وقت عاشورے کا روزہ مقرر تھا۔ اب جس کا جی چاہتا، وہ رکھتا ہے، جس کا جی نہ چاہے، وہ نہ رکھے۔ اس کو بخاری نے سیدنا ابن عمر و اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے بھی روایت کیا ہے۔[2] سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ شروع میں جو چاہتا، روزہ رکھتا اور اگر نہ رکھتا تو ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلا دیتا۔[3] بخاری نے سیدنا سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے اتنا اور زیادہ روایت کیا ہے کہ پھر اس کے بعد والی آیت اُتری، اس نے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔[4] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا بھی یہی قول ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ اسی طرح عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بھی کہا ہے کہ آیت: ﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ [البقرة: ۱۸۵] ''پھر تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے تو اسے چاہیے کہ اس کے روزے رکھے۔'' اس کی ناسخ ہے۔[5]

بوڑھے مرد و عورت اور روزہ نہ رکھ سکنے والوں کے لیے فدیہ دینے کا حکم:

ہاں بخاری میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے، بلکہ بوڑھے مرد و عورت کے لیے

[1] مسند أحمد (۵/ ۲۴۶) سنن أبي داود، رقم الحديث (۵۰۶۔ ۵۰۷) مستدرك الحاكم (۲/ ۳۰۱) امام البانی رحمہ اللہ نے ''صحیح أبي داود'' (رقم الحديث: ۵۲۴) میں مفصل بحث کرتے ہوئے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۴۲۳۱۔ ۴۲۳۳)

[3] مسند أحمد (۵/ ۲۴۶)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (۴۲۳۶، ۴۲۳۷)

[5] تفسير ابن كثير (۱/ ۲۸۱)

ہے، جن کو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں ہے، وہ ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔[1] یہ روایت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کئی طریق سے آئی ہے۔ ابن ابی لیلیٰ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں عطا رحمہ اللہ کے پاس رمضان میں گیا اور وہ کھا رہے تھے۔ مجھ سے کہا کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اُتری تو اس نے پہلی آیت کو منسوخ کر دیا، مگر بوڑھا فانی اگر چاہے تو ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلائے اور خود افطار کرے۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حاصل امر یہ ہوا کہ صحت مند مقیم کے حق میں اس آیت کا منسوخ ہونا ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ [البقرة: ١٨٥] ''پھر تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے تو اسے چاہیے کہ اس کے روزے رکھے۔'' اور اس پر روزہ رکھنا واجب ہے۔ رہا فانی بوڑھا، جو روزہ نہیں رکھ سکتا، وہ افطار کرے، اس پر قضا نہیں، کیوں کہ اس کو ایسا وقت کہاں آئے گا کہ وہ اس وقت میں قضا کر سکے، وہ تو دن بہ دن کمزور ہوتا جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ جب اس نے افطار کیا تو ہر روز اگر وہ طاقت رکھتا ہے، ایک مسکین کا کھلانا واجب ہے یا نہیں؟ اس میں علما کے دو قول ہیں۔ صحیح قول جس پر اکثر اہلِ علم ہیں، یہی ہے کہ ہر دن کے عوض فدیہ دینا واجب ہے۔ جس طرح سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما وغیرہ سلف نے ﴿ يُطِيقُوْنَهٗ ﴾ کی تفسیر لفظِ ''يَتَجَشَّمُوْنَهٗ'' (تکلیف محسوس کرتے ہیں) کے ساتھ کی ہے۔[3]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے۔ اسی کو امام بخاری نے بھی اختیار کیا ہے۔ امام بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ جو شیخ کبیر (بہت بوڑھا) روزے کی طاقت نہ رکھتا ہو، وہ کھانا کھلا دے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ جب بوڑھے ہوگئے تو ایک یا دو سال تک روزانہ ایک مسکین کو گوشت روٹی کھلائی اور خود افطار کیا۔[4] یہ بات جس پر بخاری رحمہ اللہ ہیں، اس کو حافظ ابو یعلی موصلی رحمہ اللہ نے مسند میں ذکر کیا ہے، یعنی ایوب بن ابی تمیمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ انس رضی اللہ عنہ روزہ رکھنے سے ضعف کی وجہ سے عاجز ہوگئے تو انھوں نے ایک بڑا طباق (تھال) ثرید کا تیار کر کے تیس مسکینوں کو بلا کر کھلا دیا۔[5] سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت کئی طرق سے آئی ہے۔ اسی حکم میں حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو بھی رکھا گیا ہے کہ جب اس کو اپنی یا بچے کی جان کا ڈر ہو تو افطار کرے، فدیہ دے یا قضا رکھے۔ بعض کا یہ قول ہے کہ صرف فدیہ دیں، قضا نہ رکھیں اور بعض نے کہا ہے کہ بلکہ قضا بغیر فدیہ واجب ہے اور کسی نے کہا ہے کہ صرف افطار ہے، نہ فدیہ اور نہ قضا ہے۔[6]

روزے کی تاریخ:

روزہ ایک قدیم عبادت ہے، جو آدم علیہ السلام سے لے کر اس دم تک یکساں فرض رہی۔ اللہ تعالیٰ نے کسی اُمت کو

---

1. صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٣٥)
2. تفسير ابن كثير (١/ ٢٨١)
3. تفسير الطبري (٣/ ٤٣١) اس کی سند حسن ہے۔
4. صحيح البخاري (٤/ ١٦٣٧)
5. مسند أبي يعلى (٧/ ٢٠٤) اس کی سند منقطع ہے۔ ایوب بن ابی تمیمہ رحمہ اللہ کا سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔
6. تفسير ابن كثير (١/ ٢٨١، ٢٨٢)

روزے کی فرضیت سے خالی نہیں چھوڑا۔ یہ بات نہیں ہے کہ صرف مسلمانوں ہی پر فرض کیا ہو۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ صوم کے انداز اور وقت میں اختلاف ہو۔ اہلِ کتاب پر تو یہی رمضان کا روزہ فرض تھا، مگر انھوں نے بدل ڈالا۔ دغفل بن حنظلہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے، کہتے ہیں کہ نصاریٰ پر رمضان کے روزے فرض تھے۔ اتفاقاً ان کا بادشاہ بیمار ہوا تو انھوں نے کہا کہ اگر اللہ ان کو شفا دے گا تو ہم دس روزے زیادہ رکھا کریں گے۔ پھر دوسرا شخص بادشاہ ہوا، اس نے گوشت کھایا تو منہ دُکھنے لگا۔ اس نے کہا کہ اگر مجھ کو شفا ہوگئی تو سات روزے اور رکھوں گا۔ پھر تیسرا بادشاہ ہوا، اس نے کہا کہ ان تین دن کو بھی پورا کرنا چاہیے، ہم ربیع میں روزہ رکھیں گے۔ سو ایسا ہی کیا تو اس طرح پچاس روزے ہوگئے۔[1]

بیماری اور سفر کی حالت میں روزے کا حکم:

بیمار کو اگر روزہ رکھنے کی طاقت نہیں تو افطار عزیمت ہوگا اور اگر طاقت ہے، مگر مشکل کے ساتھ تو افطار رخصت ہے۔ جمہور کا یہی قول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس سفر میں افطار کی اجازت ہے، وہ اتنا سفر ہوتا ہے جس پر نماز قصر کی جاتی ہے۔ سفر کی مقدار میں جو اختلاف ہے، وہ معروف ہے۔ پھر بعض نے ایسی مقداریں بیان کی ہیں، جن پر کوئی دلیل قائم نہیں ہے۔ حق یہ ہے کہ جس پر سفر کا نام صادق آتا ہے، وہی سفر افطار کرنے کو مباح قرار دیتا ہے، اسی طرح جس پر مرض کا نام صادق آتا ہے، اس میں افطار کرے۔ اطاعت کے سفر میں افطار کرنے پر تو اجماع ہے، لیکن سفرِ مباح میں افطار کرنے کے بارے میں اختلاف ہے۔ حق یہ ہے کہ سفرِ مباح میں بھی افطار کی رخصت ثابت ہے، سفرِ معصیت مختلف فیہ ہے۔

فدیے کی تفصیل:

لفظ ﴿ يُطِيْقُوْنَهٗ ﴾ کو مخفف و مشدد دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ مخفف کی بنیاد پر آیت منسوخ ہے، جبکہ تشدیدِ واؤ کی بنیاد پر محکم ہے، کیوں کو تشدید کے معنی تکلیف و مشقت کے ہوتے ہیں۔ اگر بابِ افعال کا ہمزہ اس جگہ سلب کے واسطے ٹھہرایا جائے تو بھی یہ ہوسکتا ہے۔ اس صورت میں حرف لائے نفی (لا) لانے کی بھی حاجت نہیں ہوگی۔ آیت بھی محکم رہے گی، ورنہ منسوخ ٹھہرے گی۔ فدیے کی مقدار میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ گیہوں ہر دن نصف صاع۔ گندم کے علاوہ ایک صاع۔ بعض نے کہا ہے کہ صرف ایک مد (تقریباً دس چھٹانک) شہر کی عام غذا میں سے دے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہر مسکین کو صبح و شام کا کھانا دے۔ انھوں نے اپنی اُم ولد سے کہا تھا کہ تو انہی کے حکم میں ہے، جن کو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں، تو کھانا دے اور روزہ نہ رکھ۔ وہ حاملہ تھیں یا دودھ پلانے والی تھیں۔[2]

---

[1] المعجم الأوسط (٨/ ١٣٤) اس کی سند منقطع ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ کا سماع دغفل رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

[2] تفسیر الطبري (٣/ ٤٢٨) سنن الدارقطني (٢/ ٢٠٦) امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک بیٹی نے سوال کیا کہ کیا میں رمضان کے روزے رکھوں؟ وہ حاملہ تھیں۔ کہا: افطار کر اور ہر روز ایک مسکین کو کھانا کھلا۔[1] تابعین کی ایک جماعت سے اسی طرح مروی ہے۔ غرضیکہ حاملہ اور دودھ پلانے والی، بوڑھا فانی، بڑھیا فانیہ فدیہ دے کر افطار کر سکتے ہیں اور قضا سے بھی بچ سکتے ہیں۔ اسی طرح سفر، بیماری، حیض اور نفاس افطار کرنے کے لیے عذر ہیں، لیکن ان پر قضا واجب ہے، فدیے کی اجازت نہیں۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ١٨٥

رمضان کا مہینا وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت کی واضح اور حق کو باطل سے جدا کرنے والی دلیلیں ہیں، پھر تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے تو اسے چاہیے کہ اس کے روزے رکھے اور جو شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمھارے لیے تنگی نہیں چاہتا اور تاکہ تم گنتی پوری کرو اور اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمھیں ہدایت دی اور تاکہ تم شکر کرو (185)

رمضان کی فضیلت اور اس میں قرآن کا نزول:

موضح قرآن میں ہے: ”اس سے معلوم ہوا کہ رمضان کا مہینا اسی لیے مقرر ہوا ہے کہ اس میں قرآن اُترا ہے۔ پس قرآن کی خدمت اس مہینے میں پہلے چاہیے، اسی سبب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح کو ماہِ رمضان میں مقرر فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند روز تراویح کی جماعت کرا کے پھر نہ کرائی کہ قرآن میں صریح اشارے ہیں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقل عمل کو فرض قرار دینے کے)۔ کہیں یہ نماز اُمت پر فرض نہ ہو جائے۔“

اللہ پاک نے اس آیت میں سب مہینوں کو چھوڑ کر رمضان کی تعریف فرمائی اور اس مہینے کو قرآن اُتارنے کے لیے پسند کیا۔ حدیث میں آیا ہے کہ یہ وہ مہینا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کی کتابیں پیغمبروں پر اُترا کرتی ہیں۔ امام

---

[1] الدر المنثور (١/ ٤٣٤)

احمد رحمہ اللہ نے واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان کی پہلی رات کو اُترے، تورات چھٹی رمضان کو، انجیل تیرھویں رمضان کو اور قرآن چوبیسویں رمضان کو نازل ہوا۔[1]

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یوں آیا ہے کہ زبور بارھویں رمضان کو، انجیل اٹھارویں رمضان کو اُتری اور باقی کتابیں اسی طرح جیسے پہلے بیان ہوا۔ اس کو ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔[2] یہ سارے صحیفے اور تینوں کتابیں جس کسی نبی پر اتریں، یک دم اتریں، رہا قرآن تو سب کا سب ایک ہی دفعہ آسمانِ دنیا پر بیت العزت میں اترا۔ یہ ماجرا ماہِ رمضان میں شبِ قدر کو پیش کیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ ﴾ [القدر: ۱] ”بے شک ہم نے اس (قرآن) کو لیلۃ القدر میں نازل کیا۔“ نیز فرمایا: ﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ﴾ [الدخان: ۳] ”بلاشبہ ہم نے اسے ایک بابرکت رات میں نازل کیا۔“ پھر تھوڑا تھوڑا واقعات اور حادثات کے مطابق الگ الگ اُترتا رہا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طرح کئی طرق سے مروی ہے۔[3] اس آیت کا یہی مطلب ہے: ﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ۝ ﴾ [الفرقان: ۳۲۔ ۳۳] ”اور کافروں نے کہا: اس پر یہ قرآن ایک ہی بار اکٹھا کیوں نہیں نازل کیا گیا؟ اسی طرح (ہم نے نازل کیا) ہے، تاکہ ہم اس سے آپ کا دل مضبوط کریں اور ہم نے اسے خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھ سنایا ہے۔ اور وہ (کافر) جب آپ کے پاس کوئی مثال (اعتراض) لے کر آئیں تو ہم (جواب میں) آپ کو حق اور (اس کی) بہت اچھی توجیہ و تفسیر بتا دیتے ہیں۔“ غرضیکہ جب مشرکین کوئی جھگڑا لاتے تو اللہ ان کا جواب دیتا، اس لیے وقتاً فوقتاً نازل ہوتا رہا۔

قرآن کی فضیلت:

رمضان کی تعریف کے بعد قرآن کی تعریف بیان فرمائی ہے کہ یہ وہ چیز ہے جس سے بندوں کے دلوں کو ہدایت ہوتی ہے۔ وہ بندے، جو اس پر ایمان لائے ہیں، اس کی تصدیق کرتے ہیں اور اس کے تابع ہیں۔ نشانیوں سے مراد کھلی کھلی دلیلیں اور حجتیں ہیں، جو ضلالت کے منافی ہدایت پر اور سرکشی کے مخالف رُشد پر صاف صاف دلالت کرتی ہیں۔ نیز حق کو باطل سے اور حرام کو حلال سے جدا کرتی ہیں۔ بعض سلف کا یہ قول ہے کہ اس مہینے کو صرف رمضان نہ کہو، ماہِ رمضان یا رمضان کا مہینا کہو۔ لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے۔ کیوں کہ اس سلسلے میں جو حدیث سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١٠٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٥٧٥)

[2] مسند أبي يعلىٰ (٤/ ١٣٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”وفيه سفيان بن وكيع وهو ضعيف“ (مجمع الزوائد: ١/ ٤٦٥)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٠١، ٣١١) مستدرك الحاكم (٢/ ٢٤٢) امام حاکم اور ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

سے مروی ہے، وہ ضعیف و منکر ہے۔ بخاری کی صحیح حدیث میں یوں آیا ہے: «مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ»[1] ''جو کوئی ایمان سے اور طلبِ ثواب کی نیت سے رمضان کے روزے رکھے تو اس کے پہلے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔'' معلوم ہوا کہ دونوں طرح بولنا درست ہے۔

رمضان کے روزے کی فرضیت:

یہ آیتِ شریفہ اس شخص کے لیے روزے کے فرض ہونے کی دلیل ہے، جس نے صحت کی حالت میں اپنے شہر یا مستقر پر رمضان کا چاند پایا۔ اس آیت نے افطار اور فدیے کی اس اجازت کو جو پہلی آیت میں تھی، منسوخ کر دیا، مگر مریض اور مسافر کو رخصت ہے کہ وہ جتنے دن افطار کرے، اتنے دن پھر قضا رکھ لے۔ اللہ تعالیٰ کو آسانی منظور ہے نہ کہ مشکل۔

سفر میں روزے کے مسائل:

1. امام ابن حزم رحمہ اللہ نے ''المحلیٰ'' میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے کہ جو شخص مہینے کے شروع میں مقیم تھا، پھر درمیان ماہ میں مسافر ہوا تو یہ سفر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی روشنی میں: ﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''پھر تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پائے تو اسے چاہیے کہ اس کے روزے رکھے۔'' اس کے افطار کے لیے عذر نہیں ہے۔[2] افطار کرنے کی اس مسافر کو اجازت ہے، جس نے راہ میں چاند دیکھا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ قول غریب ہے، اس حکایت پر اعتراض ہے، اس لیے کہ سنتِ صحیحہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ماہِ رمضان میں غزوۂ فتح مکہ کے لیے نکلے تو کدید میں پہنچ کر افطار کیا اور سب کو افطار کرنے کا حکم دیا۔ یہ حدیث صحیحین میں ہے۔[3]
2. صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے کہ اللہ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ ''تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔'' سفر میں افطار کرنا واجب ہے۔ مگر صحیح قول جمہور کا ہے کہ یہ مستحب ہے، فرض نہیں۔ کیوں کہ حدیث میں آیا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ سفر پر رمضان میں نکلتے تو کوئی روزہ دار ہوتا، کوئی بغیر روزے کے ہوتا، ایک دوسرے پر عیب نہ لگاتا۔[4] اگر افطار واجب ہوتا تو ضرور صوم کا انکار کیا جاتا، بلکہ ایسی حالت میں خود رسول اللہ ﷺ کے فعل سے روزہ دار ہونا ثابت ہے۔

سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ماہِ رمضان میں نکلے گرمی بہت سخت تھی، لوگ گرمی

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨) [2] المحلیٰ (٦/ ٢٤٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١١٣) تفسير ابن كثير (١/ ٢٨٣)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١١٨)

کے مارے ہاتھ سر پر رکھتے، ہم میں سوائے رسول اللہ ﷺ اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے کوئی روزے دار نہ تھا۔ یہ حدیث صحیحین میں ہے۔[1]

3 ایک گروہ نے، جن میں امام شافعی رحمہ اللہ بھی ہیں، یہ کہا ہے کہ سفر میں روزہ افطار سے افضل ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے سفر میں روزہ رکھا ہے۔ دوسرے گروہ نے کہا ہے کہ بلکہ افطار صوم سے افضل ہے۔ انھوں نے رخصت کو اختیار کیا، کیوں کہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے سفر میں روزہ رکھنے کے بارے میں پوچھا گیا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے افطار کیا، اس نے اچھا کیا اور جس نے روزہ رکھا، اس پر کچھ گناہ نہیں۔[2] دوسری حدیث میں یوں فرمایا ہے کہ تم اللہ کی رخصت کو پکڑو کہ جس کی اجازت تم کو دی ہے۔[3] تیسرے گروہ نے کہا ہے کہ دونوں صورتیں برابر ہیں۔ کیوں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ حمزہ اسلمی رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ اے اللہ کے رسول! میں بہت روزے رکھتا ہوں، کیا سفر میں بھی رکھوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: چاہے رکھ، چاہے نہ رکھ۔ یہ حدیث صحیحین میں ہے۔[4] چوتھے گروہ نے کہا ہے کہ اگر روزہ مشکل ہو تو افطار افضل ہے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی دلیل سے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرد کو دیکھا جس پر چھتری لگائی گئی ہے۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ کہا کہ روزے دار ہے۔ فرمایا کہ سفر میں روزے کا رکھنا نیکی نہیں ہے۔ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[5]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہاں، اگر سنت سے منہ پھیرے اور افطار کرنے کو مکروہ سمجھے تو اس پر افطار کرنا لازمی اور روزہ رکھنا حرام ہوگا، کیوں کہ مسند احمد میں سیدنا عبداللہ بن عمر اور سیدنا جابر رضی اللہ عنہم وغیرہما سے آیا ہے: «مَنْ لَّمْ يَقْبَلْ رُخْصَةَ اللّٰهِ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْإِثْمِ مِثْلُ جِبَالِ عَرَفَةَ»[6] یعنی ''جس نے اللہ کی رخصت کو منظور نہ کیا، اس پر عرفات کے پہاڑ کے برابر گناہ ہے۔''

گر طمع خواہد زمن سلطان دیں   خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

''اگر دین کا بادشاہ مجھ سے طمع چاہتا ہو تو ایسے میں قناعت کے سر پر خاک ڈالیے۔''

4 روزے کی قضا لگاتار رکھے یا الگ الگ؟ اس میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ لگاتار رکھے، کیوں کہ قضا فرض ادا کرنے

---

1. صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٢٢)
2. صحيح مسلم (١١٢١)
3. سنن النسائي (٢٢٥٨) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٢٥٥)
4. صحيح البخاري (١٨٤١) صحيح مسلم (١١٢١)
5. صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١١٥)
6. مسند أحمد (٢/ ٧١) اس روایت کی سند میں ''ابن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔ السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٩٤٩) تفسير ابن كثير (١/ ٢٨٤)

کے لیے ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ چاہے الگ الگ رکھے، چاہے لگا تار۔ جمہور سلف اور خلف اسی طرف گئے ہیں۔ دلیلیں بھی اسی بات پر ثابت ہیں، کیوں کہ رمضان میں لگا تار رکھنا فرض ہونے کی وجہ سے تھا کہ مہینا پورا ہو جائے، جب رمضان نہ رہا تو اب مقصود صرف روزہ رہ گیا، بس گنتی پوری کر لے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''تو دوسرے دِنوں میں گنتی پوری کرے۔''

دین کی خصوصیت؛ آسانی:

پھر یہ فرمایا ہے کہ مراد آسانی ہے نہ کہ دشواری۔ ابو قتادہ رحمہ اللہ ایک اعرابی سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، وہ فرما رہے تھے: « إِنَّ خَيْرَ دِيْنِكُمْ أَيْسَرُهُ، إِنَّ خَيْرَ دِيْنِكُمْ أَيْسَرُهُ »[1] (رواہ أحمد) ''بے شک تمھارا بہترین دین وہ ہے، جو زیادہ آسان ہے، یقیناً تمھارا بہترین دین وہ ہے، جو زیادہ آسان ہے۔'' سیدنا عروہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے منتظر تھے کہ اتنے میں آپ آئے، سر سے وضو یا غسل کی وجہ سے پانی ٹپک رہا تھا۔ آپ ﷺ نے نماز پڑھی، لوگوں نے پوچھنا شروع کیا کہ اس کام میں ہم پر کچھ حرج ہے؟ آپ ﷺ نے تین بار فرمایا: « إِنَّ دِيْنَ اللّٰهِ يُسْرٌ » یعنی ''اللہ کا دین آسان ہے۔'' اس کو احمد اور ابن مردویہ رحمہما اللہ نے اسی آیت کی تفسیر میں روایت کیا ہے۔[2] سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے الفاظ یوں ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: « يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا، وَسَكِّنُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا »[3] (رواہ أحمد و الشیخان) ''آسانی کرو اور تنگی مت کرو اور تسکین دو اور نفرت مت دلاؤ۔'' صحیحین میں آیا ہے کہ جب آپ ﷺ نے معاذ اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہما کو یمن کی طرف بھیجا تو یہ کہا: « بَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا، يَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَتَطَاوَعَا وَلَا تَخْتَلِفَا »[4] ''خوش خبری دو اور نفرت مت دلاؤ، آسانی پیدا کرو، تنگی مت کرو اور اتفاق کرو اور اختلاف مت کرو۔''

نیز مسانید میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: « بُعِثْتُ بِالْحَنِيْفِيَّةِ السَّمْحَةِ »[5] ''میں دینِ خالص اور آسانی کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔'' محجن بن ادرع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ نماز پڑھ رہا ہے، تھوڑی دیر تک اس کو دیکھتے رہے، پھر فرمایا: کیا یہ سچے دل سے پڑھ رہا ہے؟ انھوں نے کہا کہ مدینے والوں میں سے سب سے زیادہ نمازی یہی شخص ہے۔ فرمایا کہ اس کو یہ بات نہ سناؤ کہ وہ ہلاک ہو جائے گا۔ پھر فرمایا: « إِنَّ اللّٰهَ إِنَّمَا

---

[1] مسند أحمد (۳/ ۴۷۹) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رجاله رجال الصحیح'' (مجمع الزوائد: ۱/ ۲۲۸)

[2] مسند أحمد (۵/ ۶۹) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ فتح الباري (۱/ ۹۴)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۷۷۴) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷۳۴) مسند أحمد (۳/ ۱۳۱)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۸۷۳) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷۳۳)

[5] مسند أحمد (۵/ ۲۶۶) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۲۹۲۴)

أَرَادَ بِهٰذِهِ الْأُمَّةِ الْيُسْرَ وَلَمْ يُرِدْ بِهِمُ الْعُسْرَ ﴾[1] (رواه أبو بكر بن مردويه) ''تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس امت پر آسانی چاہی اور تنگی نہ چاہی۔'' معلوم ہوا کہ اس شخص کے عبادت میں زیادہ انہاک کو ''یسر'' کے خلاف سمجھا، کیوں کہ ہر بات کا اختیار کرنا آسان ہے، نباہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ جتنا نباہ سکے، اتنی ہی عبادت کرے۔ مشکل میں نہ پڑے۔

عبادت کے اختتام کے بعد اللہ کی بڑائی کا حکم:

اللہ تعالیٰ کی بڑائی کرنے کا یہ مطلب ہے کہ جب عبادت کر چکے تو اللہ کا ذکر کرے اور تکبیر کہے، جیسے رمضان کے ختم ہونے کے بعد نمازِ عید کو جاتے ہوئے اللہ اکبر وغیرہ ذکر کیا کرتے ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ﴾ [البقرة: ٢٠٠] ''پھر جب تم اپنے حج کے ارکان پورے کر چکو تو اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح تم اپنے باپ دادا کو یاد کیا کرتے تھے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر (اللہ کو یاد کرو)۔'' نیز فرمایا: ﴿ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ [الجمعة: ١٠] ''پھر جب نماز پوری ہو جائے، تو تم زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، شاید تم فلاح پاؤ۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ﴿٣٩﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴿٤٠﴾ ﴾ [ق: ٣٩۔ ٤٠] ''اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کریں، طلوع آفتاب سے پہلے اور غروبِ آفتاب سے پہلے۔ اور رات کے کچھ حصے میں پھر آپ اس کی تسبیح کریں، اور سجود (نمازوں) کے بعد بھی۔'' اسی لیے حدیث شریف میں فرض نماز کے بعد ''سُبْحَانَ اللّٰهِ''، ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' اور ''اَللّٰهُ أَكْبَرُ'' کا ورد کرنے کو مستحب کہا گیا ہے۔[2]

عید الفطر میں تکبیر کا مسئلہ:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ عید الفطر میں تکبیر کہنی چاہیے۔ ان کی دلیل یہی آیت ہے: ﴿ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ﴾ [الحج: ٣٧] ''تاکہ تم اس پر اللہ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمھیں ہدایت دی۔'' یہاں تک کہ داود بن علی اصفہانی ظاہری رحمہ اللہ اس طرف گئے ہیں کہ عید الفطر میں تکبیر کہنا واجب ہے، کیوں کہ ظاہر وجوب کا حکم ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کے مقابلے میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب ہے کہ عید الفطر میں تکبیر کہنا ہی مشروع نہیں۔ باقی لوگ مستحب بتلاتے ہیں۔

احسان ماننے کا مطلب یہ ہے کہ جب تم نے اللہ کی اطاعت کے لیے فرائض ادا کیے، محارم چھوڑے، اللہ کی حدود کا تحفظ کیا تو اب تم شکر کرنے والوں اور احسان ماننے والوں میں داخل ہو سکتے ہو۔[3]

---

[1] المعجم الکبير (٢٠/ ٢٩٨) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رجاله رجال الصحيح'' (مجمع الزوائد: ٣/ ٦٨٩)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٥٩٧) [3] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٨٥)

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾

اور (اے نبی!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں، جب بھی وہ مجھ سے دعا کرے، پس چاہیے کہ وہ بھی میرے حکموں کو مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ وہ ہدایت پائیں (186)

اللہ قریب ہے اور بندوں کی دعا سنتا ہے:

اوپر کی آیت میں فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی کرو، یعنی عید کے دن بلند آواز سے تکبیریں کہو۔ دوسری آیت میں فرمایا کہ اللہ دور نہیں، بلند آواز سے اسے پکارنا تمھارے فائدے کے لیے ہے۔ معاویہ قشیری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ ہمارا رب نزدیک ہو تو ہم چپکے سے بات کریں، دور ہو تو پکاریں، رسول اللہ ﷺ خاموش رہے تو اس پر یہ آیت اُتری۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم) امام ابن جریر اور ابن مردویہ رحمہما اللہ نے حسن رحمہ اللہ کی سند سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ اصحابِ رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ ہمارا رب کہاں ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری۔[2] امام عطاء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب یہ آیت اُتری: ﴿ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ﴾ [المؤمن: ٦٠] ''اور تمھارے رب نے کہا ہے: تم مجھے پکارو، میں تمھاری (دعائیں) قبول کروں گا۔'' لوگوں نے کہا کہ اگر ہمیں دعا کی گھڑی معلوم ہو تو دعا کریں۔ اس پر آیت زیرِ تفسیر نازل ہوئی۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مدینے کے یہودی کہتے ہیں کہ اے محمد (ﷺ)! ہمارا رب کیوں کر ہماری دعا سنے گا، تم تو یہ خیال رکھتے ہو کہ ہمارے اور آسمان کے بیچ میں پانچ سو برس کا فاصلہ ہے، ہر آسمان کا موٹاپا بھی اتنا ہی ہے؟ اس پر یہ آیت آئی۔[4] سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہم ایک لڑائی میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ ہم کسی اونچی نیچی جگہ پر بلند آواز سے تکبیر کہے بغیر اُترتے چڑھتے نہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے پاس آ کر فرمایا: اے لوگو! اپنی جانوں کو تھامو، تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکارتے، تم تو سننے والے دیکھنے والے کو پکارتے ہو، جس کو تم پکارتے ہو، وہ تمھاری اس سواری کی گردن سے بھی زیادہ تم سے نزدیک ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا عبداللہ بن قیس رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے عبداللہ بن قیس! میں تجھے جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ نہ سکھا دوں

---

① تفسیر الطبري (٣/ ٤٨٠) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٣١٤) اس کی سند پر علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ نے مفصل بحث کرتے ہوئے اس کو ''ضعیف جداً'' کہا ہے۔

② تفسیر الطبري (٣/ ٤٨١) یہ روایت مرسل ہے۔ ③ تفسیر الطبري (٣/ ٤٨٢) ④ تفسیر البغوي (١/ ٢٠٤)

اور پڑھا: ﴿لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ﴾[1] (أخرجه الشيخان وبقية الجماعة و أحمد) ''اللہ کی توفیق کے بغیر گناہ سے پھرنے اور نیکی کرنے کی کوئی طاقت نہیں ہے۔''

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوں، میں اس کے پاس ہوتا ہوں، جب وہ مجھے پکارتا ہے۔[2] (رواه أحمد) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میں اپنے بندے کے ہمراہ ہوں، جب وہ مجھ کو یاد کرتا ہے اور اس کے دونوں ہونٹ میرے ذکر سے ہلتے ہیں۔[3] (رواه أحمد) امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اس آیت کے مثل ہے: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴾ [النحل: ١٢٨] ''بلاشبہ اللہ ان کے ساتھ ہے جنھوں نے پرہیز گاری کی اور وہ احسان کرتے ہوں۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ اِنَّنِيْ مَعَكُمَاۤ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴾ [طٰهٰ: ٤٦] ''بلاشبہ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، میں سنتا اور دیکھتا ہوں۔'' یہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو خطاب ہے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پکارنے والے کی پکار کو برباد نہیں کرتا، نہ کوئی چیز اسے دعا کے سننے سے باز رکھتی ہے، بلکہ وہ سمیع الدعاء ہے۔

دعا کی ترغیب، بقا اور آداب:

اس آیت میں اس بات کی ترغیب ہے کہ تم دعا کرو، ہم سنیں گے۔ تمھاری دعا ضائع نہیں کی جائے گی۔[4] جس طرح سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے شرماتا ہے کہ بندہ اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف پھیلائے، خیر کا سوال کرے اور وہ ان کو نامراد لوٹا دے۔ (رواه أحمد و أهل السنن) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔[5] امام مزی رحمہ اللہ نے اطراف میں اس کا ایک متابع ذکر کیا ہے۔[6] ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یہ الفاظ مروی ہیں کہ کوئی مسلمان ایسی دعا نہیں کرتا، جس میں کوئی گناہ یا قطع رحمی نہ ہو، مگر اللہ اس کو تین چیزوں میں سے ایک دیتا ہے: یا تو جلدی اس کی دعا قبول کر لیتا ہے، یا آخرت کے لیے جمع کر رکھتا ہے، یا اس کے مثل کوئی برائی دور کر دیتا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ اب ہم کثرت سے دعا کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ اس سے بھی زیادہ عطا کرنے والا ہے۔[7] (رواه أحمد)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٣٦) مسند أحمد (٤/ ٤٠٢)

[2] مسند أحمد (٣/ ٢١٠) امام البانی رحمہ اللہ ''السلسلة الصحيحة'' (رقم الحديث: ٢٠١٢) میں بحث کرتے ہوئے مذکورہ روایت کو ذکر کر کے فرماتے ہیں: ''سند صحيح على شرط مسلم''

[3] صحيح البخاري (٦/ ٢٧٣٥) مسند أحمد (٢/ ٥٤٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٧٥٧)

[4] تفسير ابن كثير (١/ ٢٨٦)

[5] مسند أحمد (٥/ ٤٣٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٨٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٥٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٦٥)

[6] تحفة الأشراف (٤/ ٢٩)

[7] مسند أحمد (٣/ ١٨) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٢٨)

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ روئے زمین پر کوئی مسلمان اللہ کو کسی دعا میں نہیں پکارتا، مگر اللہ یا تو اس کو دے دیتا ہے یا اس جیسی کوئی برائی روکتا ہے، جب تک کہ وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہیں کرتا۔ (رواہ أحمد) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔[1] امام مالک رحمہ اللہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ تم میں سے ہر ایک کی دعا قبول ہوتی ہے، جب تک کہ جلدی نہ کرے، ایسے نہ کہے کہ میں نے دعا کی میری دعا قبول نہ ہوئی، پھر تھک کر بیٹھ رہے، دعا کرنا چھوڑ دے۔[2] سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یہ الفاظ مروی ہیں کہ بندہ ہمیشہ خیریت سے رہتا ہے، جب تک کہ جلدی نہ کرے۔ الحدیث۔[3] (رواہ أحمد)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ دل یاد رکھنے والے ہیں۔ بعض دل بعض دل سے زیادہ یاد رکھتا ہے، اس لیے جب تم اللہ سے مانگو تو قبولیت کا یقین رکھ کر مانگو، کیوں کہ اللہ تعالیٰ غافل دل سے دعا کو قبول نہیں کرتا۔[4] (رواہ أحمد) ابن ابی نافع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیٹھے تھے، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا: ﴿ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں، جب بھی وہ مجھ سے دعا کرے۔'' فرمایا: ''اے رب! یہ عائشہ کا مسئلہ ہے۔'' جبریل علیہ السلام اترے، کہا کہ اللہ نے تم کو سلام کہا ہے اور کہا کہ یہ میرا نیک بندہ ہے، جو سچی نیت اور پاک دل سے کہتا ہے: اے رب! میں کہتا ہوں: لبیک، پھر میں اس کا کام کر دیتا ہوں۔ (رواہ ابن مردویہ) یہ حدیث غریب ہے۔[5]

دعا اور روزے کا تعلق:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو احکامِ صیام کے درمیان اس لیے ذکر فرمایا کہ ماہِ رمضان کے پورے ہونے کے وقت یا ہر افطار کے نزدیک دعا میں کوشش کرنا چاہیے، جس طرح کہ سیدنا ابن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ روزے دار کی دعا افطار کے وقت قبول ہوتی ہے۔ سیدنا ابن عمرو رضی اللہ عنہما جب افطار کرتے تو اہل وعیال کو بلا کر دعا کیا کرتے۔[6] (رواہ أبو داود الطیالسي) امام ابن ماجہ رحمہ اللہ کے نزدیک ان سے دوسرے الفاظ اس طرح مروی ہیں کہ روزے دار کی افطار کے وقت دعا مردود نہیں ہوتی۔ سیدنا ابن عمرو رضی اللہ عنہما افطار کے وقت یہ دعا کرتے: «اَللّٰھُمَّ اِنِّيْ

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٣٢٩) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٥٧٣) صحیح الترغیب والترھیب (٢/ ١٢٨)

[2] الموطأ (١/ ٢١٣) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٩٨١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٧٣٥)

[3] مسند أحمد (٣/ ١٩٣) صحیح الترغیب والترھیب (٢/ ١٣٢)

[4] مسند أحمد (٢/ ١٧٧) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وإسنادہ حسن'' (مجمع الزوائد: ١٠/ ٢٢٢)

[5] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٨٧) اس کی سند میں ''اسحاق بن ابراہیم'' سخت ضعیف راوی ہے۔

[6] مسند الطیالسي (١/ ٢٩٩) اس کی سند میں ''ابو محمد ملیکی'' غیر معروف راوی ہے۔ امام البانی رحمہ اللہ نے بھی ''إرواء الغلیل'' (٤/ ٤٤) میں مذکورہ روایت نقل کرنے کے بعد اس راوی کے متعلق فرمایا ہے: ''أبو محمد الملیکي لم أعرفه'' (ضعیف الجامع، رقم الحدیث: ٤٧٤٧)

أَسْأَلُكَ بِرَحْمَتِكَ الَّتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ أَنْ تَغْفِرَ لِي ﴾[1] ''اے اللہ! میں تیری رحمت کا، جو ہر چیز کو شامل اور واسع ہے، واسطہ ڈال کر تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو مجھ کو بخش دے۔'' سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تین شخص ایسے ہیں جن کی دعا پھیری نہیں جاتی: ایک امام عادل، دوسرا روزے دار کہ جب تک افطار نہ کرے، تیسرا مظلوم کہ اس کی دعا کو اللہ بادل کے اوپر اُٹھا لیتا ہے۔ آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور اللہ فرماتا ہے: مجھ کو قسم ہے اپنی عزت کی! میں تیری مدد کروں گا، اگرچہ ایک مدت کے بعد ہو۔[2] (رواه أحمد و أهل السنن)

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن — اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

آتش سوزان نکند با سپند — آنچہ کند دودِ دلِ دردمند

''مظلوموں کی آہ سے ڈر کہ دعا کرتے وقت اللہ کی طرف سے قبولیت اس کے استقبال کو آتی ہے۔ جلتی آگ ململ کے ساتھ وہ سلوک نہیں کرتی، جو کسی دردمند کی آہ کام کرتی ہے۔''

بہر حال جب بندہ اپنے رب سے کوئی چیز مانگتا ہے تو اللہ اس بندے سے قریب ہوتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس آیت میں رب کے نزدیک اور دور ہونے کے متعلق سوال تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ دعا کی قبولیت کے متعلق تھا۔ بدلیل ﴿ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ ﴾ لیکن سابقہ روایات سے قطع نظر کرتے ہوئے ظاہر یہ ہے کہ سوال دونوں ہی امور کے متعلق تھا۔ پھر کسی نے کہا ہے کہ یہ قرب قبولیت کا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ علم کا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ یہ قرب انعام کا ہے۔ کشاف میں ہے کہ یہ قرب در اصل قبولیت کی آسانی سے عبارت ہے۔[3] اس لیے کہ محسوس ہونے والا قرب ممکن نہیں ہے۔ لیکن سچی بات اور حق اور سچ مسئلہ یہ ہے کہ قرب قریب مجیب کی ایک صفت ہے، ہم کو اس پر ایمان لانا چاہیے اور تاویل سے کچھ غرض نہیں رکھنی چاہیے۔

اجابتِ دعا اور استجابتِ دعا:

آیت زیرِ تفسیر کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ میں پکارنے والے کی پکار کو قبول کرتا ہوں، جس طرح حدیث میں آیا ہے کہ دعا عبادت ہے۔[4] (أخرجه أبوداود وغيره من حديث النعمان بن بشير) مگر ظاہر ہے کہ اس جگہ اجابت اپنے لغوی معنی پر ہے۔ دعا کے عبادت ہونے سے یہ بات لازم نہیں آتی۔ اجابت کا مطلب دعا کا قبول ہونا ہے۔ کیوں کہ اجابت اور چیز ہے اور اس عبادت کا قبول ہونا اور بات ہے۔ مطلب صرف اتنا ہے کہ اللہ جس طرح چاہتا ہے،

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٥٣) امام بوصیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وإسناده صحيح" [إتحاف الخيرة: ٣/ ١٠٢]

[2] مسند أحمد (٢/ ٣٠٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٩٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٥٢) اس کی سند میں ابو مدلہ مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٣٥٨)

[3] تفسير الكشاف (١/ ٢٥٥)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٧٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٦٩) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٤٥٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٢٨) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٢٧)

اجابت فرماتا ہے۔ کبھی مطلب جلد حاصل ہو جاتا ہے، یعنی عن قریب اور کبھی دیر میں، یعنی بعید۔ کبھی کوئی بلا دعا کرنے والے کے سر سے ٹل جاتی ہے کہ جو اس کو معلوم بھی نہیں ہوتی۔ پھر فرمایا کہ جب تم مجھے پکارو تو پہلے ایمان اور فرماں برداری کی طرف میری دعوت کو تو مان لو۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ کے امر و نہی پر قائم ہو کر دعا مانگتے ہیں اور اجابت کے امیدوار ہیں۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہاں استجابت کے یہ معنی ہیں کہ تم میری اطاعت کرو۔[1] لغت میں اجابت کے معنی یہ ہیں کہ بندے کی طرف سے اطاعت ہو اور اللہ کی طرف سے عطا ہو۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٨٧﴾

تمھارے لیے روزے کی رات کو اپنی عورتوں کے ساتھ صحبت کرنا حلال کر دیا گیا ہے، وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ اللہ نے جان لیا کہ بے شک تم اپنے آپ سے خیانت کرتے تھے، چناں چہ اس نے تم پر توجہ فرمائی اور تمھیں معاف کر دیا، اس لیے اب تم ان سے ہم بستری کر سکتے ہو اور اللہ نے تمھارے لیے جو لکھ رکھا ہے وہ تلاش کرو، اور کھاؤ اور پیو، حتی کہ تمھارے لیے صبح کی سفید دھاری کالی دھاری سے واضح (روشن) ہو جائے، پھر تم روزے کو رات تک پورا کرو اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھو تو اپنی عورتوں سے ہم بستری نہ کرو، یہ اللہ کی حدیں ہیں، لہٰذا تم ان کے قریب مت جاؤ، اللہ لوگوں کے لیے اپنی آیتیں اسی طرح بیان فرماتا ہے، تاکہ وہ متقی بنیں (187)

رمضان کی راتوں میں کھانے پینے اور بیوی سے مقاربت کی اجازت:

جب روزہ فرض ہوا تو مسلمان سارا رمضان عورت کے پاس نہ جاتے اور پہلی اُمت کی طرح رات کو سو کر پھر نہ کھاتے، اس دوران میں بعض شخص نہ رہ سکے اور رسول اللہ ﷺ سے عرض کی۔ تب یہ آیت اُتری، یعنی تم اپنی چوری

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣١٥)

کرتے تھے۔ اللہ نے کھانا منع نہیں کیا، صبح تک رخصت ہے۔ جب سفید دھاری پڑے، وہی صبح صادق ہے، جب تک روشنی ستون سے اونچی رہے، وہ صبح کاذب ہے، مگر اعتکاف میں رات دن عورت کے پاس نہ جائے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے رخصت ہے، ابتدائے اسلام میں افطار کے بعد عشا تک کھانا پینا، صحبت کرنا حلال تھا۔ جب نماز پڑھ لی یا سو گیا تو یہ سب کام حرام ہو گئے، جب تک کہ دوسری رات آئے۔ اس میں ان کو بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ بے پردہ ہونے سے مراد اس جگہ جماع کرنا ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور تابعین عظام رحمہم اللہ وغیرہم کی ایک کثیر جماعت کا یہی قول ہے۔ لباس ہونے کا یہ مطلب ہے کہ تم ان کے پاس چین پاتے ہو۔ وہ تمھارے پاس چین پاتی ہیں، صحابہ و تابعین کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی تم ان کا لحاف ہو اور وہ تمھارا لحاف ہیں۔[2] حاصل یہ کہ ہر ایک مرد عورت ایک دوسرے سے خلط ملط ہوتے ہیں اور باہم اُٹھتے بیٹھتے ہیں، اس لیے مناسب نظر آیا کہ ان کو رمضان کی رات میں جماع کی اور ایک دوسرے کو چھونے کی اجازت دے دی جائے، تاکہ اس روک ٹوک سے ان پر کوئی حرج یا تنگی نہ ہو۔

آیت کا شانِ نزول:

آیت کے سببِ نزول کے بارے میں پہلے قیس بن صرمہ رضی اللہ عنہ کا قصہ گزر چکا ہے کہ وہ ایک رات بھوکے سو گئے، دوسرے دن دوپہر کو غش آ گیا، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی، سب کو بہت خوشی ہوئی۔[3] (رواہ أبو إسحاق عن البراء بن عازب بطوله) اسی طرح سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے شبِ رمضان میں جماع واقع ہو گیا تھا، اس پر یہ آیت اُتری۔ یہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔[4] یہ دونوں قصے کئی طُرق سے مروی ہیں۔

اللہ کے لکھے ہوئے کو طلب کرنے کی تفسیر:

صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اللہ کے لکھے ہوئے کو طلب کرنے سے مراد یہ ہے کہ اولاد طلب کرو۔ کسی نے کہا ہے کہ بلکہ مراد جماع ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ لیلۃ القدر مراد ہے۔[5] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو اللہ نے رخصت دی ہے، اس کو لو۔[6] کسی نے کہا ہے کہ قرآن کی مباح کی ہوئی چیزوں کو چاہو اور کسی نے کہا ہے کہ بیبیاں اور لونڈیاں رکھو۔ لیکن قرآن کریم کا انداز اِن میں سے کسی ایک خاص بات

---

(1) تفسير ابن كثير (١/ ٢٨٨)
(2) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣١٥، ٣١٦)
(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨١٦)
(4) تفسير الطبري (٣/ ٤٩٦) اس کی سند حسن ہے۔
(5) تفسير الطبري (٣/ ٥٠٧) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣١٧) اس کی سند حسن ہے۔
(6) تفسير الصنعاني (١/ ٧١) تفسير الطبري (٣/ ٥٠٨)

کے لیے تائید نہیں کرتا، نہ ان پر کوئی اور دلیل قائم ہے۔ اسی لیے ابن جریر رحمہ اللہ نے اس آیت کا ان تمام امور کے لیے عام ہونا اختیار کیا ہے۔[1] امام حسن بصری رحمہ اللہ نے ”اِتَّبِعُوْا“ (عین کے ساتھ) پڑھا ہے، یعنی پیروی کرو۔[2]

سفید دھاگے کا کالے دھاگے سے واضح ہونا اور فہم صحابہ:

بخاری شریف میں سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت اُتری اور لفظ ﴿مِنَ الْفَجْرِ﴾ نہ آیا تو کچھ روزہ دار لوگ پاؤں میں سفید اور سیاہ دھاگا باندھ کر سو جاتے اور جب تک وہ نظر نہ آتے کھاتے پیتے تھے، جب لفظ مذکورہ اُترا تو سمجھے کہ سفید اور سیاہ سے مراد دن اور رات ہے۔[3] یہی کام عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے کیا تھا، صبح پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا تو آپ نے بہ طور مزاح فرمایا: ﴿إِنَّ وِسَادَكَ إِذًا لَعَرِيْضٌ﴾ یعنی تیرا تکیہ بڑا وسیع ہوگا، جس میں سفید دھاگہ یعنی صبح صادق جو آسمان کے کناروں پر دکھائی دیتی ہے، سما گئی ہے۔[4] اس سے مراد رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی ہے، سیاہ اور سفید دو دھاگے مراد نہیں۔ دوسری روایت میں یوں ہے کہ سیدنا عدی رضی اللہ عنہ نے دھاگے تکیے کے نیچے رکھے تھے، اس پر یہ فرمایا کہ تمھارا تکیہ بہت چوڑا چکلا ہے۔[5] (رواہ الشیخان) بعض روایات میں ﴿إِنَّكَ لَعَرِيْضُ الْقَفَا﴾ یعنی تو بڑی گردن والا ہوگا، جو ایسے تکیے پر رکھی جاتی ہے، جس میں صبح صادق سما گئی ہے۔[6] بعض میں ہے: ﴿إِنَّكَ لَعَرِيْضُ الْعَقْلِ﴾ یعنی تو بڑی وسیع عقل والا ہے۔[7] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بعض نے اس کے یہ معنی کیے ہیں کہ تم کند ذھن ہو، مگر یہ معنی ضعیف ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب تمھارا تکیہ اتنا لمبا چوڑا ٹھہرا تو تمھاری پشت یا عقل بھی عریض ہوگی۔[8] لیکن ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ کی روایت میں ایسے ہے کہ جب سیدنا عدی رضی اللہ عنہ نے حال مذکور عرض کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے۔[9] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد ان کا نہ سمجھنا ہے۔ واللّٰہ أعلم.

سحری کا وقت اور فضیلت:

پھر جب اللہ پاک نے صبح تک کھانا مباح کر دیا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سحری کرنا مستحب ہے۔ اس

---

[1] تفسير الطبري (٣/ ٥٠٨۔ ٥٠٩) [2] فتح القدير (١/ ٣٣٩)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨١٨) [4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٣٩)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٣٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٩٠)

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٤٠)

[7] یہ الفاظ کہیں سے بھی نہیں ملے۔ البتہ ان الفاظ کو نواب صاحب نے اپنی کتاب ”فتح البیان“ میں بخاری وغیرہ سے نقل کیا ہے تو احتمال ہے کہ سہواً یا کتابت کی غلطی کی وجہ سے ”القفا“ ”العقل“ ہوگیا ہو۔ واللّٰہ أعلم بالصواب.

[8] تفسير ابن كثير (١/ ٢٩٠)

[9] تفسير الطبري (٣/ ٥١٢) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣١٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٤٩) امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”إسناده على شرط الشيخين“ (صحيح أبي داود: ٧/ ١١٤)

لیے کہ یہ کھانا بطور رخصت ٹھہرا اور رخصت کا لینا محبوب ہوتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ سے سحری کھانے کی ترغیب دینا ثابت ہوا ہے، سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ تم سحری کھایا کرو، سحری میں برکت ہے۔[1] (رواه الشيخان) صحیح مسلم میں عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے کہ ہمارے اور اہلِ کتاب کے روزوں میں فرق سحری کا کھانا ہے۔[2] امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ کے مرفوع الفاظ یہ ہیں کہ سحری برکت کا لقمہ ہے۔ تم اس کو نہ چھوڑو، اگرچہ ایک گھونٹ پانی ہی کیوں نہ ہو۔ سحری کرنے والوں پر اللہ اور فرشتے درود بھیجتے ہیں۔[3] سحری کی ترغیب میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں، یہاں تک کہ پانی ہی پی کر کھانے والوں کی طرح ہو جاؤ۔ سحری کو فجر کے طلوع ہونے تک موخر کرنا مستحب ہے۔ جس طرح کہ صحیحین میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سحری کی، پھر نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ بھلا سحری اور اذان میں کتنا فاصلہ تھا؟ کہا کہ پچاس آیات جتنا۔[4] سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ میری امت ہمیشہ خیر سے رہے گی، جب تک افطار کرنے میں جلدی کرے گی اور سحری میں دیر کرے گی۔[5] (رواه أحمد)

بہت سی حدیثوں میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سحری کا نام غدائے مبارک (بابرکت ناشتہ) رکھا ہے۔[6]
سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ مروی ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سحری کی۔ اس وقت جب دن نکل آیا تھا، مگر سورج نہ نکلا تھا۔ اس حدیث کو امام احمد، نسائی اور ابن ماجہ رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔[7] امام نسائی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے ساتھ عاصم بن ابی النجود متفرد (اکیلے) ہیں۔ یہ حدیث دن کے قریب ہونے پر محمول ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ﴾ [الطلاق: ٢] ''پھر جب وہ اپنی عدت (ختم ہونے) کو پہنچیں تو تم انھیں معروف طریقے سے (اپنے پاس بحیثیت بیوی) روک لو یا انھیں معروف طریقے سے جدا کر دو۔'' اس جگہ بلوغ سے مراد عدت کا ختم ہونا ہے۔

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٢٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٩٥)

② صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٩٦)

③ مسند أحمد (٣/ ١٢) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٢٥٨)

④ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٩٧)

⑤ مسند أحمد (٥/ ١٤٧) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه سليمان بن أبي عثمان، قال: أبو حاتم مجهول" (مجمع الزوائد: ٣/ ٣٦٧) البتہ اسی کی تایید میں سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں روایت موجود ہے۔ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٢٠۔ ١٨٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٩٨)

⑥ سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٤٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٢١٦٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٩٨٣)

⑦ مسند أحمد (٥/ ٤٠٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٢١٥٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٦٩٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ صحيح ابن ماجه (١/ ٢٨٣)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حدیث اسی معنی پر محمول ہے، یعنی ایسے وقت سحری کی کہ طلوعِ فجر کا یقین نہ تھا، گو بعض کو طلوع کا گمان ہوا ہو۔ سلف کی ایک کثیر جماعت سے مروی ہے کہ انھوں نے سحری کے لیے فجر کے قریب ہونے میں سستی کا مظاہرہ کیا ہے۔ سیدنا ابوبکر، عمر، علی، ابن مسعود، حذیفہ، ابوہریرہ، ابن عمرو، ابن عباس اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم سے ایسے ہی مروی ہے۔ اسی طرح تابعین کا ایک بڑا گروہ بھی اسی طرف گیا ہے۔ جن کا نام حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لے کر اپنی کتاب "کتاب الصیام" میں ان کے حوالے دیے ہیں، پھر کہا ہے کہ ابن جریر رحمہ اللہ نے بعض علما سے نقل کیا ہے کہ کھانے پینے سے رُکنا طلوعِ شمس سے واجب ہوتا ہے کہ جس طرح افطار کرنا غروب پر جائز ہے۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں گمان نہیں کرتا کہ کسی عالم کا قدم اس بات پر جم سکے، کیوں کہ یہ قول قرآنِ مجید کے صریح حکم کے خلاف ہے: ﴿ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) "اور کھاؤ اور پیو، حتی کہ تمھارے لیے صبح کی سفید دھاری کالی دھاری سے واضح (روشن) ہو جائے، پھر تم روزے کو رات تک پورا کرو۔"[2]

ہاں صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً آیا ہے کہ تمھیں بلال کی اذان سحری سے نہ روکے، کیوں کہ وہ رات کے وقت اذان دیتا ہے، تم کھاتے رہو، جب تک کہ ابن اُم مکتوم اذان نہ دے، کیوں کہ وہ اس وقت اذان دیتا ہے، جب فجر نکل آتی ہے۔ یہ صحیح بخاری کے الفاظ ہیں۔[3] سیدنا طلق رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ جو اُفق میں لمبی چلی جاتی ہے، وہ فجر نہیں ہے، لیکن فجر وہ ہوتی ہے، جو چوڑی چکلی اور لال ہوتی ہے۔[4] (رواه أحمد والترمذي) ترمذی کے الفاظ یہ ہیں کہ کھاؤ پیو، تم کو یہ چمکنے اور چڑھنے والی سفیدی نہ روکے، یہاں تک کہ تمھارے لیے سرخی چوڑی نہ ہو۔[5] سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یہ الفاظ مروی ہیں کہ تم کو بلال کا پکارنا دھوکا نہ دے اور یہ سفیدی جب تک کہ فجر نہ پھٹے یا نہ نکلے۔[6] (رواه ابن جرير بسنده)

سمرہ رضی اللہ عنہ سے دوسرے الفاظ اس طرح مروی ہیں کہ تم کو تمھاری سحریوں سے بلال کی اذان نہ روکے اور نہ لمبی فجر، لیکن وہ فجر جو آسمان کے کنارے میں پھیلتی ہے۔[7] ان سے تیسری روایت اس طرح ہے کہ بلال کی اذان تمھیں دھوکے میں نہ رکھے اور نہ یہ سفیدی، جو صبح کا ستون ہے، یہاں تک کہ یہ سفیدی اُڑے۔ اسی کے قریب قریب صحیح

---

① تفسیر الطبري (٣/ ٥٣٠، ٥٣١) ② تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٩١)

③ صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٨١٩، ٥٩٦) ④ مسند أحمد (٤/ ٣٣) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٥٣٧٨)

⑤ سنن الترمذي، رقم الحدیث (٧٠٥) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٢٠٣١)

⑥ صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٩٤) تفسیر الطبري (٣/ ٥١٦)

⑦ تفسیر الطبري (٣/ ٥١٥) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٧٠٦) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (إرواء الغلیل: ٤/ ٣٠)

مسلم میں بھی آیا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ فجر دو ہوتی ہیں: ایک جو آسمان پر چمکتی ہے، وہ کسی چیز کو حلال حرام نہیں کرتی، لیکن وہ فجر جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر روشن ہوتی ہے، وہ کھانے پینے کو حرام کر دیتی ہے۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آسمان پر بلند اور چمکنے والی وہ فجر ہے جو لمبی جاتی ہے، اس سے نہ روزے دار پر کھانا پینا حرام ہوتا ہے نہ نماز اور نہ حج فوت ہوتا ہے، لیکن جب وہ پہاڑوں پر پھیل جاتی ہے تو روزے دار کا کھانا پینا حرام اور حاجی کا حج فوت ہو جاتا ہے۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس اثر کی اسناد صحیح ہے۔ بہت سے سلف کا یہی قول ہے۔[3]

جنابت کی حالت میں روزہ رکھنے کا حکم:

مسئلہ: اللہ پاک نے روزہ رکھنے کا ارادہ رکھنے والے کے لیے انتہائے فجر کو جماع اور کھانے پینے کی غایتِ اباحت کے لیے مقرر کیا ہے۔ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ جس نے حالتِ جنابت میں صبح کی، وہ غسل کر لے اور روزہ پورا کرے، اس پر کچھ حرج نہیں ہے۔ ائمہ اربعہ اور جمہور علما کا سلفاً و خلفاً یہی مذہب ہے، کیوں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں ہے، جو شیخین نے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں صبح کرتے تھے کہ وہ احتلام کے بغیر جماع سے جنبی ہوتے تھے، پھر غسل فرماتے اور روزہ رکھتے۔ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ یہ ہیں کہ پھر افطار نہ کرتے اور نہ قضا رکھتے۔[4] صحیح مسلم میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے آیا ہے کہ ایک آدمی نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے نماز پا لیتی ہے اور میں جنبی ہوتا ہوں، کیا میں روزہ رکھوں؟ فرمایا: یہی حال میرا ہے، میں تو روزہ رکھ لیتا ہوں۔ اس نے کہا کہ آپ میری طرح نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیے ہیں۔ فرمایا: واللہ! میں اُمید کرتا ہوں کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور تم سب سے بڑھ کر بچنے کی چیز کو جانتا ہوں۔[5]

مگر سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث میں مروی ہے کہ جب صبح کی اذان ہو جائے اور تم میں سے کوئی جنبی ہو تو اس دن روزہ نہ رکھے۔ (رواه أحمد) یہ حدیث جید الاسناد ہے اور شیخین کی شرط پر ہے، نیز صحیحین اور سنن نسائی میں بھی آئی ہے۔[6] لیکن بعض علما نے اسے غیر مرفوع ہونے کی وجہ سے معلول کہا ہے اور بعض اسی کی طرف گئے ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور تابعین کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔ بعض نے اس میں یوں فرق کیا ہے کہ اگر سو گیا اور صبح ہو گئی تو کچھ مضایقہ نہیں ہے، یعنی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث کے سبب سے اور اگر یہ کام اپنے اختیار سے کیا تو پھر روزہ نہیں ہوا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی اسی حدیث کی دلیل سے امام عروہ، طاؤس اور حسن رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٩٤)
[2] مصنف عبد الرزاق (٣/ ٥٤) اس کی سند صحیح ہے۔
[3] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٩٢)
[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٨٣٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١١٠٩)
[5] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١١١٠)
[6] مسند أحمد (٢/ ٣١٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١١٠٩) سنن النسائي الکبریٰ (٢/ ١٧٩)

بعض نے کہا ہے کہ اگر روزہ فرض ہے تو تمام کر کے قضا رکھے اور اگر نفل ہے تو کچھ ضرر نہیں۔ امام ابراہیم نخعی اور حسن بصری رحمہ اللہ نے ایسے ہی کہا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سیدہ عائشہ اور اُم سلمہ رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث سے منسوخ ہوگئی ہے، لیکن تاریخ تو معلوم ہی نہیں ہے۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حدیث، مذکورہ بالا آیت سے منسوخ ہے، لیکن یہ بھی بعید ہے، کیوں کہ تاریخ معلوم نہیں، بلکہ تاریخ سے اس کا خلاف ظاہر ہے۔ بعض نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کو نفیِ کمال پر محمول کیا ہے۔ پس سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث کے مطابق جو جواز کی دلیل ہے، روزہ ہوگا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی مسلک تمام اقوال سے زیادہ قریب ہے۔[1]

افطار کا وقت:

اس ارشاد سے کہ روزے کو رات تک تمام کرو، یہ نکلا کہ غروبِ آفتاب کے نزدیک افطار کرنا شرعی حکم ہے، جس طرح صحیحین میں سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جب اُدھر سے رات آئے اور اِدھر سے دن جائے تو روزہ دار افطار کرے۔[2] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھ کو بندوں میں سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو جلدی سے روزہ افطار کرتا ہے۔ (رواه أحمد) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔[3] سیدنا بشیر بن خصاصیہ رضی اللہ عنہ کی بیوی نے چاہا تھا کہ دو روزے ملا کر رکھے، بشیر رضی اللہ عنہ نے منع کر دیا اور یہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مواصلت (بغیر کھائے پیے مسلسل روزے رکھنا) سے منع فرمایا ہے اور کہا ہے کہ یہ کام نصاریٰ کرتے ہیں، تم اسی طرح روزہ رکھو، جس طرح تمھیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ ﴿ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) جب رات ہو تو روزہ کھول ڈالو۔[4]

روزے کو اگلے روزے کے ساتھ ملانے کی ممانعت:

اسی لیے احادیثِ صحیحہ میں وصالِ صوم سے منع کیا ہے۔ وصال یہ ہے کہ روزے پر روزہ رکھے اور درمیان میں کچھ نہ کھائے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم وصال نہ کرو، کہا: آپ تو کرتے ہیں؟ فرمایا کہ میں تمھاری طرح نہیں ہوں، میں رات بسر کرتا ہوں، مجھ کو میرا رب کھلاتا پلاتا ہے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٩٢) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٠٠)

[3] مسند أحمد (٢/ ٢٣٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٠٠، ٧٠١) اس کی سند میں "قرہ بن عبد الرحمٰن" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٤٠٤١) البتہ افطاری جلدی کرنے کے حوالہ سے زیرِ تفسیر آیت میں صحیح احادیث گزر چکی ہیں۔

[4] مسند أحمد (٥/ ٢٢٥) اس کی سند صحیح ہے۔ (فتح الباري: ٤/ ٢٠٢)

لوگ وصال سے باز نہ آئے تو نبی کریم ﷺ نے ان کے ساتھ دو رات دن وصال کیا، پھر چاند دیکھ لیا۔ فرمایا کہ اگر چاند طلوع نہ ہوتا تو میں تمھارے ساتھ زیادہ وصال کرتا۔ یہ بات ناراضی اور غصے کے طور پر فرمائی۔ (رواہ أحمد) یہ حدیث صحیحین میں بھی آئی ہے۔[1]

یہ بھی ثابت ہوا کہ وصال رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت سے تھا۔ آپ کو وصال کی طاقت تھی اور مدد ملتی تھی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ طعام و شراب جس کا ذکر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، ظاہر یہ ہے کہ معنوی تھا نہ کہ حسی، ورنہ حسی کے ساتھ وصال نہ ٹھہرتا۔ جس طرح کسی شاعر نے کہا:

لَهَا أَحَادِيثُ مِنْ ذِكْرَاكَ تُشْغِلُهَا ۔۔۔ عَنِ الشَّرَابِ وَتُلْهِيهَا عَنِ الزَّادِ

''وہ تیرے ذکر اذکار میں ایسی باتیں کرتی رہتی ہے، جو اُس کو پینے سے مشغول اور توشے سے غافل کر دیتی ہیں۔''

ہاں جس کو یہ بات پسند ہو کہ غروبِ آفتاب سے وقتِ سحر تک رُکا رہے تو یہ ہو سکتا ہے۔[2] کیوں کہ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ وصال نہ کرو، جو کوئی وصال کرنا چاہے، وہ سحر تک کر لے۔ کہا: آپ جو وصال کرتے ہیں؟ فرمایا کہ میں تمھاری طرح نہیں ہوں، میں جو رات بسر کرتا ہوں تو ایک کھانا کھلانے والا اور پلانے والا مجھ کو کھلاتا پلاتا ہے۔[3] (رواہ الشیخان) رسول اللہ ﷺ نے حاطب رضی اللہ عنہ کی اُم ولد سے فرمایا کہ تو آلِ محمد کے وصال سے کہاں ہے، ان کا وصال سحری سے سحری تک رہتا ہے۔[4] (رواہ ابن جریر) سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سحر سے سحر تک وصال کرتے تھے۔[5] (رواہ أحمد) سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما وغیرہ سلف چند روز بطورِ ریاضتِ نفس وصال کرتے تھے، بطریق عبادت نہیں، جبکہ نہی واصل بہ طریقِ عبادت سے ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ انھوں نے اس نہی سے یہ سمجھا ہے کہ یہ ارشاد از راہِ شفقت ہے، جس طرح سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ یہ ممانعت از راہِ رحمت تھی۔[6] اس لیے سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما اور اُن کے بیٹے عامر وغیرہ اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے، وہ یہ کام کرتے تھے، ان کو ایسا کرنے کی قوت تھی۔ کہتے ہیں کہ سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہما لگاتار سات دن روزہ رکھتے اور ساتویں روز اچھے خاصے مضبوط نظر آتے تھے۔

---

① مسند أحمد (٢/ ٢٨١) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٦٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٠٣)

② تفسير ابن كثير (١/ ٢٩٣) ③ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٦٢)

④ تفسير الطبري (٣/ ٥٣٧۔ ٥٣٨) اس کی سند میں ''ابو اسرائیل عبسی'' ضعیف راوی ہے۔

⑤ مسند أحمد (١/ ١٤١) اس روایت کی سند میں ''عبدالاعلیٰ ثعلبی'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ ''المعجم الأوسط'' (٤/ ١١٧) میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے یہی الفاظ مروی ہیں۔ امام ہیثمی رحمہ اللہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں: ''وهو حديث حسن'' (مجمع الزوائد: ٣/ ٣٧٤)

⑥ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٦٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٠٥)

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دن کا روزہ فرض کیا ہے، جب رات آجائے تو جس کا جی چاہے، کھائے، جس کا جی نہ چاہے وہ نہ کھائے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ حالتِ اعتکاف میں جو مباشرت کی ممانعت ہے، وہ اس شخص کے لیے ہے، جو رمضان یا غیر رمضان میں مسجد کے اندر معتکف ہوا ہے۔ اس پر اعتکاف کے ختم ہو جانے تک عورتوں سے رات اور دن کو وطی کرنا حرام کیا ہے۔[2] امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مسجد ہو یا غیر مسجد کسی بھی جگہ حالتِ اعتکاف میں جماع کی اجازت نہیں ہے۔[3] مجاہد و قتادہ رحمہما اللہ وغیرہما کا یہی قول ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے اور اسی پر علما کا اتفاق ہے کہ جو شخص مسجد میں معتکف ہوا، اس پر عورتیں حرام ہیں۔ اگر کسی ضروری حاجت کے لیے گھر آئے تو حاجت سے زیادہ نہ ٹھہرے۔ پیشاب پاخانے یا کھانے پینے، جس کے لیے آیا ہو کر کے جلد اُٹھ کھڑا ہو۔ بیوی کا نہ بوسہ لے نہ اس کو گلے لگائے اور نہ اس کی بیمار پرسی کرے، ہاں راہ چلتے حال پوچھ لے۔[4]

اعتکاف کا حکم اور مسائل:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ شریعت میں اعتکاف کا مطلب ہے ملازمت اور مخصوص شرط پر مخصوص اطاعت۔ اس پر اجماع ہے کہ اعتکاف واجب نہیں ہے اور مسجد کے علاوہ کسی اور جگہ نہیں ہوتا۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ اعتکاف مساجدِ ثلاثہ (مسجد الحرام۔ مسجد الاقصی اور مسجدِ نبوی) یا ایسی مسجد، جس میں نماز باجماعت ادا کی جاتی ہو، اس کے علاوہ کسی اور جگہ اعتکاف نہیں ہو سکتا۔[5] (رواہ سعید بن منصور) عورت اگر اعتکاف کرے تو اس کو گھر کی مسجد کافی ہے۔ امام مالک کے سوا تینوں اماموں کے نزدیک گھر کی مسجد وہ جگہ ہے، جس کو زنان خانے میں عورتوں نے نماز پڑھنے کے لیے مخصوص کر رکھا ہے اور اگر مسجد میں پردہ کر کے یا خیمہ لگا کر اعتکاف کرے تو سب سے بہتر ہے۔[6] کیوں کہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے مسجدِ نبوی میں بوریے کا حجرہ بنا کر اعتکاف کیا ہے۔ واللہ أعلم۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے "کتاب الصیام" میں اعتکاف کے متفق اور مختلف مسائل لکھے ہیں۔

فقہائے مصنفین جو "کتاب الاعتکاف" کو "کتاب الصیام" کے بعد لکھتے ہیں تو یہ قرآنِ عظیم کی پیروی

---

① تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۹۳، ۲۹۴) ② تفسیر الطبري (۳/ ۵٤٠) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۳۱۹) اس کی سند حسن ہے۔
③ تفسیر الطبري (۳/ ۵٤۱) ④ تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۹٤)
⑤ فتح البیان (۱/ ۳۷۸) سنن البیهقي الکبریٰ (٤/ ۳۱٦) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۲۷۸٦)
⑥ یہ بہتر ہی نہیں، بلکہ یہی طریقہ مسنون ہے۔ گھر میں عورت کا اعتکاف بیٹھنا غیر مسنون ہے۔ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے اعتکاف مسجد ہی میں کیا ہے، گھر میں نہیں۔ عورت گھر میں رہ کر عبادت (نوافل، تلاوت، ذکر اذکار، توبہ و استغفار اور دعا و مناجات) کا خصوصی اہتمام کرے۔ اعتکاف میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے، لیکن اس کو اعتکاف نہ کہا جاتا ہے اور نہ کہا جا سکتا ہے۔ [ص۔ ي]

ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے صوم کے ذکر کے بعد اعتکاف کا ذکر فرمایا ہے۔ اس ترتیب میں یہ ارشاد بھی ہے کہ تم صوم میں اعتکاف بھی کیا کرو اور رمضان کے مہینے کے آخر میں اعتکاف کیا کرو، جس طرح رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوا ہے کہ آپ آخر دم تک رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کرتے رہے، پھر آپ ﷺ کے بعد آپ کی بیویوں نے اعتکاف کیا۔ یہ حدیث صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی آئی ہے۔[1]

صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کو دیکھنے کے لیے آیا کرتیں۔ جب کہ آپ اعتکاف میں ہوتے، تو آپ ﷺ سے دم بھر بات چیت کر کے چلی جاتیں۔ ایک رات وہ رخصت ہو کر واپس اپنے گھر جا رہی تھیں (ان کا گھر مدینے کی ایک طرف اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کے گھر میں تھا) اور رسول اللہ ﷺ ان کو گھر پہنچانے کے لیے ان کے ساتھ ہو گئے۔ راستے میں دو انصاری ملے۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر شرم محسوس کی اور اُن سے چھپنے لگے، کیوں کہ آپ ﷺ کے ساتھ آپ کی بیوی تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ٹھہرو، جلدی سے بھاگے نہ جاؤ، یہ صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ "سُبْحَانَ اللّٰهِ" اے اللہ کے رسول! کیا آپ پر بھی شک ہو سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ شیطان خون کی طرح آدمی کی رگوں میں چلتا ہے، میں ڈرا کہ کہیں تمھارے دل میں کچھ اور خیال نہ آ جائے۔[2] (رواہ الشیخان) امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ چاہا کہ اپنی امت کو تہمت کی جگہ سے بچنے کی تعلیم دیں، تاکہ کسی کے خوف کی جگہ میں نہ گریں، وگرنہ وہ دونوں انصاری اللہ کے متقی تھے۔ وہ کبھی بھی کسی طرح کا غلط گمان رسول اللہ ﷺ کے بارے میں نہ کرتے۔

مباشرت سے مراد:

رہی یہ بات کہ اس آیتِ شریفہ میں لفظِ مباشرت سے کیا مراد ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد جماع یا ایسے کام ہیں جو جماع کے لیے اُبھاریں، مثلاً: بوسہ لینا یا گلے لگانا اور اس سے ملتے جلتے اور کام۔ باقی رہا چیز کا اُٹھانا، رکھنا یا کوئی اور کام کرنا، تو یہ منع نہیں ہے،[3] کیوں کہ صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنا سر مبارک ان کے نزدیک کر دیتے اور یہ سر میں کنگھی کر دیتیں، حالاں کہ خود حیض سے ہوتیں۔ رسول اللہ ﷺ بغیر انسانی حاجت کے حالتِ اعتکاف میں گھر نہ آتے۔[4] غرضیکہ روزے کی رخصت، ارادے، حرمت، اجازت اور غایت کے بارے میں جو احکام اس جگہ بیان فرمائے ہیں، یہ اللہ کی حدیں اور شرعی احکام ہیں، ان کے پاس بھی نہیں پھٹکنا چاہیے۔ جس طرح اس آیتِ شریفہ میں روزے کے احکام بیان کیے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ تمام قسم کے احکام

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٧٢)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٧٥)
[3] تفسير ابن كثير (١/ ٢٩٤) [4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٧)

رسول اللہ ﷺ کی زبانِ صدق ترجمان پر لوگوں کے لیے بیان فرماتا ہے، شاید کہ وہ لوگ راہِ راست پر آ جائیں اور فرماں برداری اختیار کر لیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [الحديد: ۹] ''وہی تو ہے جو اپنے بندے پر واضح آیات نازل کرتا ہے، تاکہ وہ تمھیں اندھیروں سے اُجالے کی طرف نکالے، اور بلاشبہ اللہ تم پر نہایت شفیق، خوب رحم کرنے والا ہے۔''

وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَاۤ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۟۱۸۸

اور تم اپنے مال آپس میں ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ اور انھیں حاکموں کے پاس نہ لے جاؤ، تاکہ تم لوگوں کے مالوں میں سے کچھ مال گناہ کے ساتھ کھاؤ، حالاں کہ تم جانتے ہو (188)

قاضی کا فیصلہ حرام کو حلال نہیں کر سکتا:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ آیت اس شخص کے حق میں آئی ہے جس نے کسی کا مال دینا ہو، مگر کوئی گواہ نہیں، یہ شخص اس مال کا انکار کر کے حاکم کے سامنے جھگڑتا ہے، حالاں کہ جانتا ہے کہ وہ اس پر ثابت ہے، وہ اس مال کو حرام کے طور پر کھاتا ہے۔[1] تابعین کی ایک جماعت نے یہی بات کہی ہے، پھر یہ کہا کہ یہ جانتے ہوئے کہ تو ظالم ہے تو نہ جھگڑ۔[2] اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے صحیحین میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم سن رکھو کہ میں بشر ہوں، میرے پاس جب کوئی جھگڑا آتا ہے تو شاید تمھارے بعض لوگ بات چیت میں دوسروں سے تیز ہوں، میں اس کے مطابق فیصلہ کر دیتا ہوں تو جس کو میں نے کسی دوسرے مسلمان کا حق دلوا دیا تو وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے، اب چاہے تو وہ اس ٹکڑے کو اُٹھا لے یا چھوڑ دے۔[3]

پس اس آیتِ کریمہ اور اس صحیح حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ حاکم کا فیصلہ کسی معاملے کی حقیقت کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ اس لیے کوئی حرام چیز حقیقت میں حلال نہیں ہو سکتی اور نہ حلال چیز حرام ہو سکتی ہے، بلکہ فقط ظاہر چیز پر ہی فیصلہ ہوا۔ حاکم کو اَجر ملے گا اور حیلہ گر کو گناہ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم کو اپنے دعوے کا غلط ہونا معلوم ہے، جس کو تم باتیں بنا کر ثابت کرنا چاہتے ہو۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اے لوگو! قاضی کا فیصلہ نہ کسی حرام کو حلال کر سکتا ہے نہ کسی باطل کو حق۔ قاضی جو دیکھتا ہے یا جس کی لوگ گواہی دیتے ہیں، اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے، وہ بشر ہے، اس

---

[1] تفسير الطبري (۳/ ۵۵۰) تفسير ابن أبي حاتم (۱/ ۳۲۱) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسير ابن أبي حاتم (۱/ ۳۲۱)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۳۲۶) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۷۱۳)

سے خطا بھی ہوتی ہے اور ٹھیک بات بھی کہتا ہے۔ لہٰذا جس کسی کے لیے کوئی غلط فیصلہ دیا گیا تو وہ جھگڑا ابھی ختم نہیں ہوا، قیامت کے دن اللہ اُن کو اکٹھا کر کے دونوں کے درمیان فیصلہ کرے گا۔ یہ فیصلہ اس فیصلے سے زیادہ درست اور صحیح ہوگا، جو دنیا میں باطل والے کے حق میں کیا گیا تھا۔[1]

ناحق مال کھانے کی حرمت:

یہ آیت ساری اُمت اور سارے مال پر لاگو ہے۔ کوئی بھی چیز اس عام حکم سے باہر نہیں نکل سکتی، سوائے اس کے جس کے لیے کوئی شرعی دلیل آچکی ہو کہ فلاں مال کا لینا جائز ہے، کیوں کہ اس وقت اس مال کا لینا حق ہوگا، باطل نہیں ہوگا اور اس مال کا کھانا حلال ہوگا، گناہ نہیں ہوگا، اگرچہ مال والا ناخوش ہی کیوں نہ ہو، جیسے: قرض کا دلوانا، جبکہ قرض دار نہ دے یا زکات کا لینا، جو اللہ تعالیٰ نے واجب کی ہے یا جس کسی کا نفقہ شرع میں واجب ہے۔ حاصل یہ ٹھہرا کہ جس مال کو اس کے مالک سے لینے کی شریعت نے اجازت نہیں دی، وہ مال باطل طریقے سے حاصل کیا ہوا مال ہے، اگرچہ اس کے مالک کا دل خوش ہو، جیسے: زبردستی کا مہر، یعنی کسی کی خرچی، یا کسی کاہن کی اُجرت، یعنی غیب کی باتیں بتانے والے کا نذرانہ، یا شراب کی قیمت، یا ناچ گانے کی اُجرت، یا جُوا، رشوت یا جھوٹی گواہی، یا امانت میں خیانت، یا ظلم و غارت گری اور راہ زنی و چوری سے مال لے کر کھانا۔ یہ سب باطل طریقے سے مال کو کھانے کی شکلیں ہیں۔ یعنی یہ نہ کرو کہ اُدھر تو باطل طریقے سے مال حاصل کرو، اُدھر حاکموں تک جھوٹی بات بنا کر پہنچاؤ۔ حاکم خواہ مال میں حکم دے یا فروج میں، جب وہ حکم کسی جھوٹی گواہی یا جھوٹی قسم پر جاری ہوگا تو اس مال کا کھانا کسی طرح حلال نہیں ہوسکتا، اسی کا نام ”أکل بالباطل“ (حرام طریقے سے کھانا) ہے۔

اسی طرح جب کسی حاکم نے رشوت لے کر کوئی حکم دیا تو وہ مال باطل طریقے سے لیا۔ امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حاکم کے فیصلے سے اباحت ہو جاتی ہے، یعنی ایسا مال لینا جائز ہو جاتا ہے۔ سو یہ روایت یا تو اُن سے ثابت نہ ہوگی اور اگر ثابت ہے تو کتاب وسنت کی نص سے مردود ہے۔ یعنی وہ سنتِ صحیحہ جو اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی اوپر گزر چکی ہے۔[2] کسی نے کہا ہے کہ اس آیت سے یہ مراد ہے کہ تم حاکموں کا نام لے کر لوگوں کا مال نہ کھاؤ، لیکن پہلے معنی زیادہ صحیح ہیں۔ قاضی شریح رحمہ اللہ کہا کرتے تھے کہ میں تیرے موافق فیصلہ کرتا ہوں اور میں خیال کرتا ہوں کہ تو ظالم ہے، لیکن میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ ان ظاہر دلیلوں کے سوا جو حاضر ہیں، کوئی اور فیصلہ کروں، مگر میرا فیصلہ تیرے لیے کسی حرام کو حلال نہیں کر سکتا۔[3]

---

[1] تفسیر الطبري (۳/ ۵۵۰) [2] فتح القدير (۱/ ۳٤۲) [3] تفسیر البغوي (۱/ ۲۱۱)

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿189﴾

(اے نبی!) آپ سے چاند (کے احوال) کے متعلق سوال کرتے ہیں کہہ دیجیے: وہ لوگوں کے لیے اور حج کے لیے اوقات مقررہ ہیں اور نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے گھروں میں ان کے پچھواڑوں کی طرف سے آؤ، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی پرہیز گاری اختیار کرے، اور تم اپنے گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ، اور تم اللہ سے ڈرو، تاکہ تم فلاح پاؤ ﴿189﴾

نئے چاند کے بارے میں سوال:

لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا کہ کیا سبب ہے کہ چاند ایک حالت پر نہیں رہتا؟ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ اس پر بدلتے حال رکھے گئے ہیں، تاکہ مہینے کی حد ٹھہرے، پھر مہینوں سے سال ٹھہریں، پھر اس پر مخلوق کے معاملات اور اللہ کی عبادت کا وقت مقرر ہو۔ یعنی عبادت جو سال کے بعد مقرر ہے، ایک روزہ ہے، جس کا حکم اُوپر مذکور ہوا۔ دوسری حج ہے، اس کا حکم آگے شروع ہوتا ہے۔ کفر کی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ جب گھر سے نکل کر حج کا احرام باندھ لیا، پھر کچھ گھر میں جانے کی ضرورت ہوئی تو دروازے سے نہ جاتے، بلکہ چھت پر چڑھ کر آتے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے غلط کہا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مواقیت سے مراد یہ ہے کہ لوگ چاند سے قرض کی میعاد، عورتوں کی عدت اور حج کا وقت معلوم کرتے ہیں۔[1] امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ وقت ہیں مسلمانوں کے روزہ رکھنے اور افطار کرنے اور عورتوں کی عدت معلوم کرنے کے۔ عطا، ضحاک، قتادہ، سدی اور ربیع رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہلال کو وقت مقرر کیا ہے کہ تم روزہ رکھو ہلال دیکھ کر اور کھولو ہلال دیکھ کر، اگر تم پر اَبر ہو تو تیس دن پورے کرلو۔ (رواہ عبد الرزاق) امام حاکم رحمہ اللہ نے بھی اس کو ابن ابی رواد سے مروی حدیث سے نقل کیا ہے، پھر یہ کہا ہے کہ وہ ثقہ، عابد، مجتہد اور شریف النسب تھا۔ اس حدیث کی اسناد صحیح

---

[1] تفسیر الطبري (٣/ ٥٥٤) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٣٢٢) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٣٢٢)

ہے۔ شیخین نے اس کو روایت نہیں کیا۔[1] حدیثِ طلق میں بھی یہی مضمون مرفوعاً آیا ہے۔[2] یہ مضمون ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے[3] اور سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے کلام سے بھی مروی ہے۔

شرعی احکام کے اوقات اور چاند:

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ معاذ بن جبل اور ثعلبہ بن عتمہ انصاری رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ چاند کا کیا حال ہے کہ پہلے تو ایک دھاگے کی طرح باریک نکلتا ہے، پھر بڑھتا جاتا ہے، پھر پورا برابر ہو کر گھٹنا شروع ہو جاتا ہے اور باریک پڑ جاتا ہے، پھر اسی طرح نکلتا ہے؟ اس کا یہ جواب ملا کہ یہ بہت سے کاموں کے وقت ہیں، جیسے: قرض کو ادا کرنا، روزہ رکھنے اور کھولنے کے متعلق، حج اور اجارہ داری کے اوقات، حیض کے اوقات، قسموں اور نذروں کو ادا کرنے کی شروط اور اس کے علاوہ دوسرے معاملات کے لیے اوقات ہیں۔[4] کیوں کہ اس کی چال اور سورج کی چال میں فرق ہے۔ وہ ایک حال پر رہتا ہے اور اس کا حال بدلتا رہتا ہے۔

امام خازن اور ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جواب سوال کے مطابق ہے، اس سے ماہ و سال کا حساب درست رہتا ہے، اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَلِتَعۡلَمُوا عَدَدَ السِّنِيۡنَ وَالۡحِسَابَ ﴾ [بني إسرائيل: ١٢] ''اور تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب جان لو۔'' کسی نے کہا ہے کہ یہ جواب اور طرح پر دیا ہے، اس میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ تم چاند کی مختلف حالتوں کے اسباب کے متعلق کیا پوچھتے ہو، وہ تو ایک غیب کی بات ہے، تم کو اس سے کچھ غرض نہیں، یہ پوچھو، جو ہم نے بتایا ہے۔ اس طرح کے جواب کو اسلوبِ حکیم کہتے ہیں۔[5]

نیکی کا مدار تقویٰ ہے:

صحیح بخاری میں براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جاہلیت میں جب احرام باندھتے تو گھر کے پچھواڑے سے آتے، اس پر یہ آیت اُتری کہ گھر میں دروازے سے آؤ۔[6] امام ابو داود رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ انصار جب سفر سے آتے تو گھر کے دروازے سے داخل نہ ہوتے۔[7] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ قریش کو حمس (سخت اور کٹڑ مذہبی) کہتے تھے۔

---

① مصنف عبد الرزاق (٤/ ١٥٦) مستدرك الحاكم (١/ ٥٨٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٠٩٣)

② مسند أحمد (٤/ ٢٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه محمد بن جابر اليمامي وهو صدوق ولكنه ضاعت كتبه وقبل التلقين" (مجمع الزوائد: ٣/ ٣٤٩)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٨١)

④ تاريخ دمشق (١/ ٢٥) اس کی سند ضعیف ہے۔ الدر المنثور (١/ ٤٩٠)

⑤ تفسير الخازن (١/ ١٦٦۔ ١٦٧) تفسير أبي السعود (١/ ٢٠٣) فتح البيان (١/ ٣٨٢۔ ٣٨٣)

⑥ صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٤٢)

⑦ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠٢٦) مسند الطيالسي (١/ ٩٨)

وہ احرام میں دروازوں سے آتے تھے، جب کہ انصار اور سارے عرب پشت کی طرف سے آتے۔ ایک روز رسول اللہ ﷺ باغ میں تھے، دروازے سے باہر آئے، قطبہ بن عامر انصاری رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے، لوگوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! یہ شخص نافرمان ہے، آپ کے ساتھ دروازے سے باہر آیا ہے۔ اس سے کہا کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ اس نے کہا کہ جو تم کو کرتے دیکھا، وہی میں نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم تو حمس ہیں، اس نے کہا کہ میرا دین وہی ہے، جو تمھارا دین ہے، اس پر یہ آیت اُتری۔[1] (رواه ابن أبي حاتم)

اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کی ایک جماعت سے بھی مروی ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو سفر کے ارادے سے نکلتا اور نہ جاتا تو وہ گھر کے پچھواڑے سے گھر میں آتا اور دروازے سے نہ آتا۔ محمد بن کعب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب کوئی اعتکاف کرتا تو دروازے سے گھر میں نہ آتا۔ امام عطا بن رباح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ مدینہ جب عید سے واپس آتے تو گھروں میں پچھواڑے سے آتے اور اس کو اچھا کام سمجھتے۔[2] امام ابوعبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ ایک ضرب المثل ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ جاہلوں سے سوال کرنا کوئی اچھی بات نہیں، اچھی بات تقویٰ ہے اور سوال اہلِ علم سے کرو۔[3] کسی نے کہا ہے کہ اس مثال کے یہ معنی ہیں کہ عورتوں کی دُبر میں جماع نہ کرو، قُبل میں کرو، اللہ سے ڈرو، جو تم کو حکم دیا ہے، وہ بجا لاؤ، جس سے منع کیا ہے، اس کے پاس نہ جاؤ۔ شاید جس دن تم کو اللہ اپنے سامنے کھڑا کر کے جزا دے گا، اس دن تم اس کی پکڑ سے چھوٹ کر اپنی مراد کو پہنچ جاؤ۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝١٩٠ وَاقْتُلُوْھُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ وَاَخْرِجُوْھُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْھُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْھُمْ ۭ كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝١٩١ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝١٩٢ وَقٰتِلُوْھُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَي الظّٰلِمِيْنَ ۝١٩٣

اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو (جہاد کرو) جو تم سے لڑتے ہیں اور تم زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا (190) اور تم انھیں جہاں بھی پاؤ ان کو قتل کر دو

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٢٣) مستدرك الحاكم (١/ ٦٥٧) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسناده على شرط مسلم" (فتح الباري: ٣/ ٦٢١) [2] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٢٣، ٣٢٤) [3] فتح القدير (١/ ٣٤٤)

اور تم انھیں نکال دو جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت (گناہ) ہے اور تم ان سے مسجدِ حرام کے پاس نہ لڑو، یہاں تک کہ وہ اس میں تم سے لڑیں، پھر اگر وہ تم سے لڑیں تو تم انھیں قتل کرو، ایسے کافروں کی یہی سزا ہے ﴿191﴾ پھر اگر وہ باز آ جائیں تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے ﴿192﴾ اور ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو جائے، پھر اگر وہ باز آ جائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی جائز نہیں ﴿193﴾

جہاد و قتال کے احکام و آداب:

حج کے ساتھ یہ بھی مذکور ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے مکہ شہر جاے امان ہے۔ اگر یہاں دشمن کو دشمن پاتا تو بھی کچھ نہ کہتا۔ حج کے اول و آخر تین مہینے یعنی ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم اور چوتھا مہینا رجب کہ وہ زیارت کا وقت تھا۔ یہ چار مہینے امن کے مہینے تھے۔ ان میں ملکِ عرب میں راہیں جاری رہتیں اور لڑائی بند رہتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ جہاد اور قتال کا حکم دیا ہے اور اس کے آداب سکھائے ہیں۔ یہ جو فرمایا ہے کہ جو تم سے لڑیں، ان سے لڑو اور زیادتی نہ کرو، اس کے معنی یہ ہیں کہ لڑائی میں بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو جان بوجھ کر نہ مارا جائے، بلکہ صرف لڑنے والوں کو مارو۔ پھر یہ بتایا کہ مکہ امن کی جگہ ہے، لیکن جب انھوں نے ابتدا کی اور تم پر ظلم کیا، ایمان لانے پر ستانے لگے کہ یہ مار ڈالنے سے زیادہ برا ہے تو اب ان کو امان نہ رہا، لہٰذا انھیں جہاں پاؤ مارو۔ آخر جب مکہ فتح ہوا تو نبی کریم ﷺ نے بھی یہ حکم دیا کہ جو ہتھیار سامنے کرے، اسی کو مارو، باقی سب کو امن دو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اگر سب کے سب بھی مسلمان ہوں تو توبہ قبول ہے۔ پھر یہ فرمایا کہ کافروں سے اسی لیے لڑائی ہے کہ ظلم کا دور ختم ہو اور وہ اللہ کے دین سے گمراہ نہ کر سکیں اور اللہ کا حکم جاری رہے۔ اگر تابع ہو کر رہیں تو لڑائی کی ضرورت نہیں، ایمان تو دل پر موقوف ہے، زبردستی مسلمان کرنے سے کیا حاصل؟!

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ پہلی آیت ہے جو جنگ کے بارے میں مدینے میں نازل ہوئی، اس کے اُترنے پر جو کوئی لڑتا، اس سے رسول اللہ ﷺ بھی لڑتے اور جو نہ لڑتا، اس سے نہ لڑتے، یہاں تک کہ سورت براءت اُتری۔[1] ابن زید رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ اس کو منسوخ کرنے والی یہ آیت ہے: ﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوهُمْ ﴾ [التوبة: ٥] ''تو تم مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ قتل کر دو۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس پر اعتراض ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اُن دشمنوں پر بھڑکاتا ہے، جن کا ارادہ اہلِ اسلام کے ساتھ جنگ کا تھا: ﴿ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) یعنی جس طرح وہ تم سے

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٣٢٥) یہ روایت مرسل ہے۔

لڑتے ہیں، تم بھی ان سے لڑو۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَآفَّةً ﴾ [التوبة: ٣٦] ’’اور تمام مشرکین سے لڑو جیسے وہ سارے تم سے لڑتے ہیں۔‘‘ اسی لیے اس آیت میں فرمایا: ﴿ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُم مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ ۖ فَإِن قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ ۗ كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ﴿١٩١﴾ ﴾ (آیت زیر تفسیر) ’’اور تم انھیں جہاں بھی پاؤ ان کو قتل کر دو اور تم انھیں نکال دو جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا اور فتنہ قتل سے زیادہ سخت (گناہ) ہے اور تم ان سے مسجد حرام کے پاس نہ لڑو، یہاں تک کہ وہ اس میں تم سے لڑیں، پھر اگر وہ تم سے لڑیں تو تم انھیں قتل کرو، ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔‘‘

زیادتی کی ممانعت اور لڑائی کے آداب:

یعنی لڑنے پر تمھاری ہمت ویسی ہی آمادہ اور بلند رہے، جیسی ان کی ہمت چست ہے۔ تم سے لڑنے اور تمھیں تمھارے شہروں سے نکالنے پر۔ یہ برابر کا بدلہ ہے، زیادتی سے منع کیا، یعنی ایسی چیزوں کا ارتکاب نہ کریں، جس سے منع کیا گیا ہے، جیسے مثلہ کرنا، خیانت کرنا، عورتوں بچوں اور بوڑھوں کو قتل کرنا، جن کو نہ کچھ عقل ہو نہ جنگ کی ہمت رکھتے ہوں یا راہبوں اور پادریوں کو قتل کرنا، درختوں کو جلا دینا، حیوانوں کا بغیر مصلحت کے مار ڈالنا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، عمر بن عبدالعزیز اور مقاتل بن حیان رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔[1] اسی لیے صحیح مسلم میں بریدہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ جاؤ اللہ کے راستے میں لڑو، ان کو مارو، جو اللہ کے منکر ہیں، خیانت نہ کرو، غدر نہ کرو، مثلہ نہ کرو، بچوں کو اور مندر والوں کو نہ مارو۔[2] (رواه أحمد أيضاً) سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ الفاظ مروی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی لشکر بھیجتے تو فرماتے اللہ کے نام کے ساتھ نکلو اللہ کی راہ میں، کافروں سے زیادتی نہ کرو، خیانت نہ کرو، مثلہ نہ کرو، بچوں کو اور عبادت گاہ والوں کو نہ مارو۔[3] (رواه أحمد) اسی طرح امام ابو داود رحمہ اللہ نے بھی انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔[4] صحیحین میں سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ کسی غزوے میں ایک مقتول عورت ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا۔[5] سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے

---

① تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٩٧)

② صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧٣١) مسند أحمد (٥/ ٣٥٢) اس روایت میں حدیث کا آخری جملہ ’’اور مندر والوں‘‘ مذکور نہیں ہے۔

③ مسند أحمد (١/ ٣٠٠) اس کی سند میں ’’داود بن الحصین عن عکرمہ‘‘ کے بارے میں امام ابو داود رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’أحاديثه عن عكرمة مناكير‘‘ علی بن مدینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’ما روى عن عكرمة فمنكر الحديث‘‘ مزید دیکھیں: تهذيب الكمال (٨/ ٣٧٩) البتہ پچھلی روایت اس کی تائید کرتی ہے۔

④ سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦١٤) اس کی سند میں ’’خالد بن الفزر‘‘ متکلم فیہ راوی ہے۔

⑤ صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٤٤)

کہاوتیں بیان فرمائیں۔ ایک، تین، پانچ، سات، نو اور گیارہ۔ ان میں سے ایک مثل بیان کی، باقی چھوڑ دیں۔ فرمایا ایک کمزور اور محتاج قوم تھی، ان سے زبردست دشمن لڑے، اللہ تعالیٰ نے کمزوروں کو اُن پر غلبہ دیا۔ انھوں نے اپنے دشمنوں کو کام کاج پر لگایا، ان پر مسلط ہو گئے، اللہ تعالیٰ کو قیامت کے دن اپنے اوپر ناراض کر لیا۔[1] (رواہ أحمد)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن الاسناد ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ جب ان کمزوروں نے ان طاقتور لوگوں پر غلبہ پا لیا تو بے جا زیادتی کی۔ جو کام ان کے لائق نہ تھا، وہ ان سے لینا شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ اس زیادتی کی وجہ سے ان پر ناخوش ہو گیا۔ اس باب میں بہت احادیث اور آثار ہیں۔[2] جہاد میں جان کا چلے جانا، لوگوں کا قتل ہونا ہوتا ہے، اس لیے اللہ پاک نے آگاہ فرما دیا کہ ان کا کفر و شرک کے ساتھ ساتھ اللہ کی راہ سے روکنا، کہیں زیادہ سخت اور بڑا قتل ہے۔ امام ابو العالیہ، مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، حسن، قتادہ، ضحاک اور ربیع رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ شرک قتل سے زیادہ سخت ہے۔[3] اس جگہ فتنے سے مراد شرک ہے۔

حرم میں لڑائی کی حرمت اور حملہ آور کو روکنے کا جواز:

پھر فرمایا کہ مسجد الحرام کے پاس نہ لڑو۔ صحیحین میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو اس دن سے حرام کیا، جس دن آسمان اور زمین کو پیدا کیا۔ لہٰذا یہ شہر اللہ کی حرمت سے روزِ قیامت تک حرام کیا۔ اس کا درخت نہ کاٹا جائے، نہ اس کا کانٹا اُکھیڑا جائے۔ اگر کوئی رسول اللہ ﷺ کی لڑائی سے رخصت نکالے تو تم کہہ دو کہ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو اجازت دی تھی، تم کو اجازت نہیں دی ہے۔[4] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لڑنے سے مراد آپ ﷺ کا فتح مکہ کے دن لڑنا تھا۔ اس کو رسول اللہ ﷺ نے لڑ کر لیا تھا۔ کچھ لوگ خندمہ (مکے کے نزدیک ایک پہاڑ) کے نزدیک مارے گئے۔ کسی نے کہا ہے کہ صلح سے فتح کیا تھا۔ اس دلیل سے کہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ جس نے اپنا دروازہ بند کر لیا، وہ امن میں ہے۔ جو مسجد میں داخل ہو گیا، وہ امن میں ہے اور جو ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے گھر میں گھس گیا، وہ امن میں ہے۔[5]

پھر اللہ تعالیٰ نے مسجد الحرام کے قریب جنگ کرنے سے روک دیا۔ سوائے اس صورت کے کہ ابتدا انھی کی طرف سے ہو، گویا حملہ آور کو دفع کرنا ہے۔ جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے دن درخت کے نیچے جنگ پر بیعت لی تھی، جبکہ قریش اور ثقیف نے حملہ کیا تھا، مگر اس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے جنگ سے روک دیا تھا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِیْ كَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَیْهِمْ ﴾ [الفتح: ٢٤]

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٤٠٧) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه الأجلح الكندي وهو ثقة وقد ضُعف و بقية رجاله ثقات" (مجمع الزوائد: ٥/ ٤١٨) [2] تفسير ابن كثير (١/ ٢٩٧) [3] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٢٦)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠١٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٥٣، ١٣٥٤)

[5] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٨٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٠٢٢) تفسير ابن كثير (١/ ٢٩٧)

''اور وہ (اللہ) ہی تو ہے جس نے وادیٔ مکہ میں ان (کفار) کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے روک دیے بعد اس کے کہ اس نے تمھیں ان پر کامیابی دی تھی۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَـُٔوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴾ [الفتح: ٢٥] ''اور اگر (مکہ میں کچھ) مومن مرد اور مومن عورتیں نہ ہوتے جن (کے ایمان) کو تم نہیں جانتے، (اگر یہ خطرہ نہ ہوتا) کہ تم انھیں روند ڈالو گے، پھر بے خبری میں ان (کے قتل) کی وجہ سے تمھیں تکلیف پہنچتی (تو تمھیں لڑنے کی اجازت دے دی جاتی لیکن ایسا نہیں کیا گیا) تاکہ اللہ جسے چاہے اپنی رحمت میں داخل کرے۔ اگر وہ (مومن اور کافر) الگ الگ ہوتے تو ان میں جو کافر تھے، ہم انھیں نہایت دردناک عذاب دیتے۔''

پھر یہ ارشاد فرمایا کہ اگر وہ لوگ حرم میں نہ لڑیں اور توبہ کر کے مسلمان ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ان کے گناہ بخش دے گا۔ گو مسلمانوں کو انھوں نے اللہ کے حرم میں قتل ہی کیوں نہ کیا ہو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے آگے کوئی گناہ اتنا بڑا نہیں ہے کہ توبہ کرنے سے بھی بخشا نہ جائے۔

لڑائی کی غایت اور فتنے سے مراد:

پھر فرمایا کہ کافروں سے اتنا لڑو کہ فتنہ، یعنی شرک باقی نہ رہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے کہ اللہ کا دین سب دینوں سے اونچا اور غالب ہو جائے۔ جس طرح سیدنا ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی صحیحین میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کوئی آدمی شجاعت کے لیے، کوئی حمیت کے لیے اور کوئی ریاکاری کے لیے لڑتا ہے، ان میں سے کون سا لڑنا اللہ کی راہ میں ہے؟ فرمایا کہ جو اس لیے لڑے کہ اللہ کے دین کا بول بالا ہو، وہ اللہ کی راہ میں ہے۔[1] یہ بھی صحیحین میں ہے کہ مجھ کو حکم ہے کہ میں لوگوں سے یہاں تک لڑوں کہ وہ سب ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' کے قائل ہوں۔ جب وہ اس کے قائل ہو جائیں گے تو اپنے خون، اپنے مال مجھ سے بچا لیں گے۔ مگر حق ان سے لیا ہی جائے گا اور اُن کا حساب اللہ پر ہے۔[2] پھر اگر وہ شرک اور مومنین سے جنگ کرنے سے باز رہیں تو پھر ان کے باز رہنے کے بعد کوئی ان سے لڑے گا تو وہی ظالم اور حد سے بڑھنے والا ہے۔

عدوان سے مراد:

عدوان سے مراد اس جگہ آپس کی عقوبت اور جنگ ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ﴾ [البقرة: ١٩٤] ''پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو تم اس کے برابر اس پر زیادتی کرو جو زیادتی اس نے تم پر کی۔'' نیز اس کا فرمان ہے: ﴿ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ﴾ [الشوریٰ: ٤٠]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٢٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٠٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠)

''اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔'' نیز اس کا فرمان ہے: ﴿ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ﴾ [النحل: ۱۲۶] ''اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی ہو۔'' امام عکرمہ اور قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ظالم وہ ہے جس نے ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' کہنے سے انکار کیا۔[1]

بخاری میں ہے کہ فتنۂ ابن زبیر میں دو آدمی سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آئے اور کہا کہ لوگ ضائع ہو گئے، تم سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہو، تم کو نکلنے میں کون سا اَمر مانع ہے؟ انھوں نے کہا کہ یہ مانع ہے کہ اللہ نے میرے بھائی کا خون حرام کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اللہ نے یہ بھی تو فرمایا ہے: ﴿ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''اور ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔'' سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ہم نے جنگ کی، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہا، دین اللہ کا ہو گیا، تم یہ چاہتے ہو کہ لڑو، یہاں تک کہ پھر فتنہ قائم ہو جائے۔

دوسری روایت میں اس طرح آیا ہے کہ ایک آدمی نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا کہ کیا سبب ہے کہ تم ایک سال حج کرتے ہو، ایک سال گھر رہتے ہو، اللہ کی راہ میں جہاد کرنا تم نے چھوڑ دیا، حالاں کہ تم جانتے ہو کہ اللہ نے جہاد کے لیے کیسی ترغیب دی ہے؟ کہا کہ اے بھتیجے! اسلام کی پانچ بنیادیں ہیں۔ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا، نمازِ پنج گانہ پڑھنا، رمضان میں روزے رکھنا، زکات ادا کرنا اور حج کرنا۔

پھر کہا کہ تم نہیں سنتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کہا: ﴿ وَاِنْ طَآىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ [الحجرات: ۹] ''اور اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر (ان) دونوں میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے، تو تم اس سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے، حتی کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔'' ﴿ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''اور ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔'' انھوں نے کہا کہ ہم یہ کام عہدِ رسالت میں کر چکے ہیں، جب اسلام کم تھا، آدمی فتنۂ دین میں پھنس جاتا تھا یا مارا جاتا تھا یا عذاب کیا جاتا ہے۔ جب اسلام پھیل گیا تو کوئی فتنہ نہ رہا۔ کہا: بھلا علی اور عثمان رضی اللہ عنہما کے حق میں کیا کہتے ہو؟ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے عثمان رضی اللہ عنہ کو معاف کیا، مگر تم کو معاف کرنا اچھا نہیں لگتا۔ رہے علی رضی اللہ عنہ تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے بیٹے اور داماد ہیں، پھر ہاتھ سے اشارہ کیا کہ یہ ان کا گھر ہے، جسے تم دیکھ رہے ہو۔[2]

قتال کی ممانعت اور اجازت:

فتح البیان میں یہ الفاظ ہیں کہ ہجرت سے پہلے تمام اہلِ علم کے نزدیک متفقہ طور پر قتال منع تھا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ﴾ [المائدة: ۱۳] ''چناں چہ آپ انھیں معاف کر دیں اور ان سے

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٢٧) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٤٣)

درگزر کریں۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ﴾ [المزمل: ١٠] ''اور اُنھیں اچھے طریقے سے چھوڑ دیجیے۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴾ [الغاشية: ٢٢] ''آپ ان پر کوئی فوج دار نہیں۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ [حم السجدة: ٣٤] ''آپ (برائی کو) ایسی بات سے ٹالیے جو احسن ہو۔'' وغیرہ آیات جو مکے میں اُتری ہیں۔ پھر جب مدینے کو ہجرت ہوئی، لڑائی کا حکم ہوا تو آیت زیرِ تفسیر نازل ہوئی۔

کسی نے کہا ہے کہ جنگ کی اجازت کی پہلی آیت یہ ہے: ﴿ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ﴾ [الحج: ٣٩] ''جن لوگوں سے لڑائی کی جاتی ہے، انھیں (جہاد کی) اجازت دی گئی ہے، اس لیے کہ ان پر ظلم ہوا۔'' یہاں تک کہ یہ آیت آئی: ﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ﴾ [التوبة: ٥] ''تو تم مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ قتل کر دو۔'' نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً ﴾ [التوبة: ٣٦] ''اور تمام مشرکین سے لڑو۔'' کہتے ہیں کہ اس آیت سے ستر آیتیں منسوخ ہوئیں۔

سلف کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ ﴿ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) سے مراد عورتوں، بچوں، بوڑھوں، بیماروں، درویشوں، دیوانوں، اپاہجوں، لنگڑوں، لولوں اور معذوروں کے سوا دوسرے لوگ ہیں اور انھوں نے اس آیت کو محکم غیر منسوخ ٹھہرایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت میں جہاد کا حکم اس شرط سے دیا تھا کہ اگر کفار پیش قدمی کریں تو تم بھی کرو۔ دوسری آیت میں یہ کہا ہے کہ خواہ وہ لڑیں یا نہ لڑیں تم لڑو، مگر مسجد الحرام اس سے مستثنیٰ ہے۔ فتح مکہ کے وقت جو کوئی مسلمان نہ ہوا، اس کو رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے حکم: ﴿ اَخْرِجُوْهُمْ ﴾ ''تم انھیں نکال دو۔'' کے مطابق شہر سے نکال دیا۔

فتنے سے مراد ایک وہ آفت بھی ہے جو آدمی کی جان پر یا اہل و مال پر یا آبرو پر آتی ہے، وہ بھی قتل سے بڑھ کر ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ مراد دین میں فتنہ ہے۔ وہ کسی بھی سبب سے ہو یا کسی بھی صورت پر ہو۔ اسی لیے اس کو اشد (زیادہ سخت) ٹھہرایا ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ آیت محکم ہے، یعنی حرم میں قتال کرنا حرام ہے، مگر جب کوئی زیادتی اور ظلم کے طور پر جنگ کر بیٹھے تو اس کی مدافعت لڑائی سے جائز ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حق یہی ہے، جس نے کہا کہ یہ آیت منسوخ ہے، اس نے کہا کہ اس طرح جمع ممکن ہے کہ جہاں مشرک پاؤ، مگر حرم میں، یعنی عام کی بنیاد خاص پر رکھی۔ وہ حدیث جس میں ایک گھڑی کے لیے مسجد الحرام میں قتال کو حلال کیا گیا،[1] اسی کی تائید کرتی ہے۔ آیت کی منسوخی کے قائل کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ابن خطل کو قتل کیا، حالانکہ وہ کعبہ کے پردے سے لٹکا

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

ہوا تھا۔[1] اس کا جواب یہ ہے کہ اسی حلال کی ہوئی گھڑی میں یہ واقعہ ہوا تھا۔[2] اب یہی حکم ہے کہ مشرکوں کو قتل کرنا چاہیے، گو حرم میں ہوں، مگر ابتدا بھی ان کی طرف سے ہو۔[3]

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

(تم پر) ماہِ حرام (کی پابندی اُن کی طرف سے) ماہِ حرام (کی پابندی) کے بدلے میں ہے اور حرمتیں بدلے کی چیزیں ہیں، پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو تم اس کے برابر اس پر زیادتی کرو جو زیادتی اس نے تم پر کی، اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے ﴿194﴾

حرمت والے مہینوں میں قتال کی ممانعت:

یعنی اگر کوئی کافر ماہِ حرام کا احترام کرے اور اس مہینے میں تم سے نہ لڑے تو تم بھی اس سے نہ لڑو۔ مکہ کے لوگ اسی مہینے میں مسلمانوں پر ظلم کرتے رہے، پھر مسلمان ان سے کیوں رعایت کریں، بلکہ سفرِ حدیبیہ میں ذوالقعدہ کا مہینا تھا۔ رسول اللہ ﷺ عمرے کی غرض سے گئے، کافر لڑنے کے لیے تیار ہوگئے۔ یہ آیت اس لیے اُتری کہ مسلمان خیال کرتے تھے کہ اگر کافر ماہِ حرام میں لڑنے لگے تو ہم کیا کریں گے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، ضحاک، قتادہ، سدی، مقسم، ربیع اور عطا رحمہ اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کے چھٹے سال عمرے کے لیے گئے تو مشرکوں نے آپ ﷺ کو اور آپ کے سارے ہمراہیوں کو شہر میں اور بیت اللہ میں جانے سے روک دیا۔ یہ ذوالقعدہ کا مہینا تھا، حالاں کہ یہ حرمت والا مہینا تھا۔ آخر آیندہ سال آنے پر صلح کر لی، چناں چہ آپ ﷺ اگلے سال مسلمانوں کے ساتھ داخل ہوئے۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔[4]

اللہ تعالیٰ نے اس قصے کا ذکر کیا اور یہ آیت اُتاری۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حرمت والے مہینے میں جنگ نہیں کرتے ہیں، مگر آپ سے کوئی لڑتا تو پھر اُس سے لڑتے۔ حرمت والا مہینا آتا تو رُک جاتے، یہاں تک کہ وہ گزر جاتا۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اسے بروایت صحیح تحریر کیا ہے۔[5] یہ بات اس طرح ہوئی کہ نبی مکرم ﷺ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٥٧)
[2] فتح القدير (١/ ٣٤٦)
[3] فتح البيان (١/ ٣٨٤_ ٣٨٧)
[4] تفسير ابن كثير (١/ ٢٩٩)
[5] مسند أحمد (٣/ ٣٣٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ورجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٦/ ٨٤)

حدیبیہ میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ اتنے میں یہ خبر آئی کہ عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ ان کو آپ ﷺ نے اپنا سفیر بنا کر مشرکین کے پاس بھیجا تھا۔ یہاں پر نبیِ اکرم ﷺ نے درخت کے نیچے ایک ہزار چار سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشرکین کے ساتھ جنگ کرنے کی بیعت لی تھی۔ جب معلوم ہوا کہ عثمان رضی اللہ عنہ زندہ ہیں تو رک گئے اور مصالحت کر لی، پھر جو کچھ ہوا سو ہوا۔

اسی طرح جب ہوازن سے حنین کے دن جنگ ہوئی، فارغ ہوئے تو طائف کا محاصرہ فرمایا، اتنے میں ذوالقعدہ کا مہینا آ گیا۔ اس محاصرے میں منجنیق باری ہوتی تھی۔ چالیس دن تک یہ محاصرہ رہا۔ صحیحین میں مروی ہے کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم مارے جانے لگے تو آپ ﷺ وہاں سے بغیر فتح لوٹ آئے اور مکے کی طرف پھرے، جِعرّانہ سے عمرہ کیا، جہاں آپ ﷺ نے حنین کا مالِ غنیمت تقسیم کیا تھا۔ یہ عمرۂ جعرانہ بھی ذوالقعدہ کے مہینے میں پڑا تھا اور سال آٹھ ہجری تھا۔[1]

مشرکوں کے درمیان بھی عدل کا حکم:

اس آیت میں عدل کا حکم فرمایا ہے، یہاں تک کہ مشرکین میں بھی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ﴾ [النحل: ۱۲۶] ''اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی ہو۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ﴾ [الشوریٰ: ۴۰] ''اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔'' سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ یہ آیت مکے میں اُتری ہے، جہاں نہ جہاد تھا نہ کوئی خار۔ پھر آیتِ قتال نے، جو مدینے میں اُتری، اس کو منسوخ کر دیا۔[2] امام ابن جریر رحمہ اللہ اس قول کا رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نہیں، بلکہ یہ آیت مدنی ہے، حدیبیہ کے عمرے کے بعد اُتری ہے اور اس قول کو امام مجاہد کی طرف منسوب کیا ہے۔[3]

اللہ کی معیت اور قرب کی تفسیر:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے، یعنی دنیا اور آخرت میں نصرت و تائید سے۔[4] اگلے پچھلے تمام مفسرین نے آیتِ استوا کو چھوڑ کر باقی آیات، جو معیت و قربِ الٰہی اور احاطے کے بارے میں ہیں، ان کی مناسب مقام کے مطابق تاویل کی ہے۔ اس بارے میں مذاہبِ اربعہ والوں کی ایک ہی روش ہے۔ انھوں نے یہ اس لیے کیا ہے کہ علو وفوق اور ذاتِ استوا سے جو سمجھا گیا ہے، وہ اپنے حال پر قائم ہے، یعنی آیاتِ متشابہ، محکم آیات کے موافق ہو جائیں۔ لیکن محققین اہلِ حدیث کا یہ طریقہ ہے کہ وہ قرب و معیت وغیرہما پر ایمان لاتے ہیں، عون و

---

[1] اس روایت کے ہم معنی روایت صحیح مسلم میں ہے۔ صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۰۵۹)

[2] تفسیر الطبري (۳/ ۵۸۰) تفسیر ابن أبي حاتم (۱/ ۳۲۸) اس کی سند حسن ہے۔

[3] تفسیر الطبري (۳/ ۵۸۰، ۵۸۱) [4] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۹۹)

نصر وغیرہما کے ساتھ تاویل نہیں کرتے۔ اس معیت وقرب وغیرہما کی کیفیت کو اللہ مستوی علی العرش کے حوالے کرتے ہیں کہ وہی جانے کہ یہ معیت کیسی ہے اور یہ قرب کیسا ہے؟

ہاں صفتِ استوا کے ثبوت کے سبب، جس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی ذات پاک سارے عالم میں الگ تھلگ ہے، عرش جو تمام مخلوق کی انتہا اور تمام کائنات کا اُخیر ہے اور اس کے اوپر اور کوئی مخلوق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اس عرش کے اوپر ہے۔ ہاں، جس جگہ پر اللہ تعالیٰ نے خود علم وغیرہ کی قید لگا دی ہے، جیسے ہر شے کا احاطہ کرنے میں، وہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ احاطۂ علمی ہے۔ اہلِ تاویل وتفسیر نے قرب اور معیت کے ساتھ بھی کسی مناسب مقام کی قید لگا دی ہے۔ اگرچہ یہ تفسیر شریعت کے مقصد کے خلاف نہیں ہے، مگر اس میں غور وخوض نہ کرنا زیادہ بہتر اور مناسب ہے۔

حرم میں قتال کرنا:

فتح البیان میں ہے کہ شہرِ حرام (حرمت والے مہینے) میں بہ طورِ مکافات ومجازات لڑنا منع نہیں ہے۔ یہ آیت اس بات میں صریح ہے کہ ان سے سالِ حدیبیہ میں جنگ ہوئی اور وہ اس طرح تھی کہ تھوڑی سی اُکھاڑ پچھاڑ، تیر اندازی اور سنگ باری ہوئی۔ کسی نے کہا ہے کہ بدلہ لینا ابتداے اسلام میں تھا، پھر اس آیت سے منسوخ ہوگیا۔ کسی نے کہا ہے کہ نہیں، بلکہ اب بھی اُمتِ اسلامیہ باقی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کے مال، بدن یا آبرو پر ظلم وزیادتی کرے تو وہ بھی اسی طرح کا بدلہ لے سکتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔ دوسروں نے کہا ہے کہ قصاص کے امور حکام کے لیے مخصوص ہیں۔ یہی حکم اموال کے بارے میں ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو امانت ادا کر اور اس کی خیانت نہ کر، جس نے تیری خیانت کی ہے۔[1] (أخرجه الدار قطني وغيره)

امام ابو حنیفہ وغیرہ یہی کہتے ہیں اور جمہور مالکیہ اور عطا رحمہ اللہ اسی طرف گئے ہیں۔ لیکن پہلا قول زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔ ابن منذر رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ ابن عربی اور قرطبی رحمہما اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے، بلکہ امام داودی رحمہ اللہ نے اس کو مالک رحمہ اللہ سے بھی روایت کیا ہے۔ نبی مکرم ﷺ نے ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی سے فرما دیا تھا کہ تو اس کے مال سے اپنی اور اپنی اولاد کی کفایت کے مطابق لے لیا کر۔[2] یہ صحیح حدیث اسی کی تائید کرتی ہے۔[3]

اس سے زیادہ واضح آیت زیرِ تفسیر ہے: ﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۱۹۴﴾ ''پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تو تم اس کے برابر اس پر زیادتی کرو جو زیادتی اس نے تم پر کی، اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔'' یہ

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٣٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٦٤) سنن الدارقطني (٣/ ٣٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٢٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٩٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٤) [3] تفسير القرطبي (٢/ ٣٥٥)

جملہ گویا پہلے جملے کی تائید ہے: ﴿ اَلْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ﴾ ''حرمتیں بدلے کی چیزیں ہیں۔'' یعنی ہر حرمت کی پامالی میں بدلہ ہے، مگر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہے: ﴿ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا ﴾ [بني إسرائيل: ۳۳] ''اور جو ظلم سے قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے وارث کو غلبہ دیا ہے۔''

یعنی مقتول کا مددگار حکمران ہے، وہ قاتل سے قتل کا بدلہ لے گا اور جس نے خود ہی بدلہ لے لیا، حاکم کو نہ پوچھا تو وہ گناہ گار اور زیادتی کرنے والا ہے۔ اس نے جاہلیت کا سا کام کیا اور اللہ کا حکم نہ مانا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ سلطان سے مراد قاتل پر مقتول کے ولی کا تسلط ہے۔ اسی لیے قتل میں زیادتی سے منع کیا ہے اور اگر آیت کے یہی معنی ہوں، جو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمائے ہیں تو یہ آیت فقط قتل کو خاص کرے گی، آیاتِ مذکورہ کی عمومیت کے برعکس، اس کو منسوخ کرنے والی نہیں ہوگی۔ کیوں کہ اس آیت میں فقط قتل کا خصوصی تذکرہ فرمایا ہے اور دوسری ذکر کی گئی آیات قتل وغیرہ کو بھی شامل ہیں۔ عرب کی لغت سے، جس پر تفسیر کا دارومدار ہے، یہی بات معلوم ہوتی ہے۔[1]

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۚۛ وَاَحْسِنُوْا ۚۛ
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾

اور تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھ ہلاکت (کے کام) میں نہ ڈالو اور تم نیکی کرو، یقیناً اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے (195)

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم اور تہلکہ کی تفسیر:

یعنی جہاد چھوڑ کر نہ بیٹھو، اس میں تمھاری ہلاکت ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت نفقے کے حق میں اُتری ہے۔[2] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ ابو عمران رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مہاجرین کے ایک آدمی نے قسطنطنیہ میں دشمن کی صف پر حملہ کیا اور صف کو چیرتا ہوا اندر گھس گیا۔ ہمارے ساتھ ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تھے، لوگوں نے کہا کہ دیکھو اس نے اپنے ہاتھ سے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا۔ سیدنا ابو ایوب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس آیت کو میں خوب جانتا ہوں۔ یہ ہمارے حق میں اُتری ہے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مل کر لڑے۔ جب اسلام پھیل گیا اور غالب ہوا تو ہم سب انصاری لوگ جمع ہوئے۔ یہ طے پایا کہ اب تو لڑائی بند ہو گئی ہے۔ اب اہل و عیال میں رہ کر کچھ گھر کا دھندا کریں۔ اس پر یہ آیت اُتری۔ چناں چہ ''تهلكة'' یہی ہے کہ اہل و مال میں قیام کرے اور جہاد چھوڑ دے۔ اس کو اہلِ سنن

[1] فتح البیان (۱/ ۳۸۹۔ ۳۹۰)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٤٤)

نے اور عبد بن حمید، ابن ابی حاتم، ابن جریر، ابن مردویہ، ابویعلیٰ، ابن حبان اور حاکم رحمہم اللہ سب نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے حسن صحیح غریب کہا ہے اور حاکم رحمہ اللہ نے شرطِ شیخین پر بتایا ہے۔ امام ابو داود رحمہ اللہ نے اسے دوسرے طریق اور الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے۔[1]

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے پوچھا کہ اگر میں اکیلا ہی دشمن پر حملہ کروں اور وہ مجھ کو مار ڈالیں تو کیا میں خود ہلاکت میں پڑا؟ کہا کہ نہیں، اللہ نے اپنے رسول ﷺ سے کہا: ﴿ فَقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ ﴾ [النساء: ٨٤] ''چناں چہ (اے نبی!) آپ اللہ کی راہ میں لڑیں، آپ کو اپنی ذات کے سوا کسی کا ذمے دار نہیں بنایا گیا۔'' یہ آیت تو نفقے کے حق میں آئی ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے اس کو شیخین کی شرط پر کہا ہے۔

اور اتنا زیادہ کیا ہے کہ ''تهلكة'' یہ ہے کہ آدمی سے گناہ ہو اور وہ توبہ نہ کرے۔[2] مگر عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دمشق کے محاصرے سے اسی آیت کی بنیاد پر واپس بلا لیا کہ اس نے اکیلے ہی دشمن کا محاصرہ کر لیا تھا۔ وہ شخص ازدِ شنوءہ کا تھا۔[3] البتہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ یہ آیت جنگ کے حق میں نہیں، بلکہ نفقے کے بارے میں ہے کہ ہاتھ کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے نہ روکے کہ ''تهلكة'' میں پڑے۔[4] امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انصار خیرات و صدقات کیا کرتے تھے۔ ایک سال قحط پڑا تو انھوں نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ اس پر یہ آیت اُتری۔[5]

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''تهلكة'' سے بخل مراد ہے۔[6] سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ''تهلكة'' یہ ہے کہ آدمی گناہ کرے، پھر کہے کہ میری بخشش نہیں ہوگی۔ امام عبیدہ، حسن اور ابن سیرین رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے، یعنی نا اُمیدی کی بنیاد پر زیادہ گناہ کر کے ہلاک ہو جائے۔[7] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ''تهلكة'' سے مراد اللہ کا عذاب ہے۔[8] امام زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا تھا کہ ''تهلكة'' یہ ہے کہ آدمی بھوکا پیاسا راہ چلنے سے مر جائے۔[9]

فتح البیان میں ہے کہ حق یہ ہے کہ سبب کی خصوصیت کے بجائے لفظ کی عمومیت کا اعتبار کرنا چاہیے، پس جس بات پر یہ صادق آئے کہ وہ دین و دنیا میں ''تهلكة'' ہے، وہ اس آیت میں داخل ہے۔ سیدنا ابن جریر رحمہ اللہ کا بھی

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥١٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٧٢) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٢٩، ٣٣٠) تفسير الطبري (٣/ ٥٩٠) صحيح ابن حبان (١١/ ٩) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٠٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٣)

[2] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٠٢) تفسير ابن كثير (١/ ٣٠٠) امام حاکم اور ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[3] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٣١)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٣٠) تفسير ابن كثير (١/ ٣٠٠)

[5] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٣١)

[6] شعب الإيمان (٧/ ٤٤١)

[7] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٣١)

[8] تفسير الطبري (٣/ ٥٩٣۔ ٥٩٤) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٣١) اس کی سند حسن ہے۔

[9] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٣٠)

یہی قول ہے۔[1] اسی آیت میں وہ شخص بھی داخل ہے، جو لڑائی میں لشکر پر اکیلا حملہ کر دے اور اپنے بچاؤ کی قدرت نہ رکھتا ہو اور مجاہدین کو، اس سے کچھ نفع حاصل نہ ہو۔[2] اس آیت میں اللہ کے راستے سے مراد اللہ کا قرب حاصل کرنے کے تمام ذرائع ہیں، خصوصاً دشمنوں کے ساتھ جنگ کے لیے اور مسلمانوں کی قوت بڑھانے کے لیے مال کا خرچ کرنا ہے، کیوں کہ اس کا ترک کرنا ہلاکت ہے۔ اس کے بعد احسان کا حکم کیا کہ یہ مقامِ اطاعت کا اعلیٰ درجہ ہے۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ
الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ
كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ
اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ٙ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ
فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ
وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ
اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ
الْعِقَابِ ۧ ﴿١٩٦﴾

اور تم حج اور عمرہ اللہ کے لیے پورا کرو، پھر اگر تمھیں (راستے میں) روک دیا جائے تو قربانی کے لیے جو میسر ہو (وہ قربان کر دو) اور اپنے سر نہ منڈاؤ حتی کہ قربانی اپنے حلال ہونے کی جگہ پہنچ جائے، پھر اگر کوئی شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو (اور وہ سر منڈوالے) تو فدیے میں روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے، پھر جب تمھیں امن مل جائے (اور تم حج سے پہلے مکے پہنچ جاؤ) تو تم میں سے جس نے حج (کے احرام) تک عمرے کا فائدہ اٹھایا، وہ (احرام کھول کر) جو میسر ہو قربانی کرے، پھر جو شخص (قربانی) نہ پائے تو وہ تین روزے حج کے دنوں میں رکھے اور سات اس وقت جب تم گھر لوٹ آؤ، یہ پورے دس (روزے) ہیں۔ یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجد حرام کے پاس نہ رہتے ہوں اور تم اللہ سے ڈرو اور جان لو بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے ﴿196﴾

حج وعمرہ کا طریقہ اور ان کے احکام:

یہاں سے حج کے احکام بیان کیے ہیں۔ حج کا طریقہ یہ ہے کہ احرام باندھے، پھر عرفہ کے دن عرفات میں

[1] تفسير الطبري (٣/ ٥٩٣) [2] فتح البيان (١/ ٣٩٢)

حاضر ہو، پھر وہاں سے چلے اور رات کو مشعر الحرام میں رہے، پھر عید کی صبح منیٰ میں پہنچ کر کنکریاں پھینکے اور حجامت کر کے احرام اُتارے۔ پھر مکہ میں جا کر طوافِ زیارت کرے، پھر صفا اور مروہ کے درمیان دوڑے، پھر آدمی منیٰ میں تین دن رہے، ہر روز کنکریاں پھینکے، پھر مکہ جا کر طوافِ رخصت کرے اور چلا جائے۔

عمرے کا طریقہ یہ ہے کہ جن دنوں میں چاہے احرام باندھے، طوافِ کعبہ کرے، صفا و مروہ کے درمیان دوڑے، پھر حجامت کر کے احرام اُتارے۔ حج (مفرد) اور عمرے میں قربانی ضروری نہیں ہے، مگر کسی وجہ سے ضروری ہوتی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے تین وجوہ بیان فرمائی ہیں: ایک یہ کہ احرام باندھ کر مرض یا دشمن کے ہاتھوں روکا گیا تو کسی کے ہاتھ قربانی بھیج دے۔ جب مکہ میں قربانی ذبح ہو، تب یہ احرام سے نکلے، اس سے پہلے حجامت نہ کرے۔ دوسرا یہ کہ بیماری سے یا سر کے بالوں سے عاجز ہو کر احرام میں حجامت کرے تو اس کا بدلہ ہے کہ قربانی کرے یا تین روزے رکھے یا چھ محتاجوں کو کھانا کھلائے۔

تیسرا یہ کہ حج اور عمرہ علاحدہ علاحدہ نہ کرے، ایک ہی سفر میں دونوں ادا کرے تو قربانی ضروری ہے۔ پھر قربانی نہ ہو تو دس روزے رکھے، تین حج کے دنوں میں اور سات بعد میں۔ قربانی کم سے کم ایک بکرا ایک شخص کو اور ایک گائے یا اونٹ سات آدمیوں کے لیے کافی ہے۔ حج اور عمرہ اکٹھا کرنے سے جو قربانی لازم آتی ہے، وہ مکہ کے رہنے والوں پر نہیں۔ یہ فائدہ موضح قرآن کا ہے۔ باقی احکام مفصل حج اور عمرے کے فضائل کے ساتھ رسالہ "إيضاح المحجة" (تالیف نواب صاحب) میں لکھے گئے ہیں۔

حج وعمرہ پورا کرنے کا حکم:

اللہ پاک نے احکامِ صیام کے بعد جہاد کا ذکر کیا تھا، اب حج کا بیان فرمایا اور یہ حکم دیا کہ حج اور عمرے کو پورا کرو۔ ظاہر صورت یہ ہے کہ جب حج اور عمرے کے افعال شروع کر دیے تو ان کو پورا کرے، ادھورا نہ چھوڑے۔ اسی لیے رُک جانے کی صورت بھی بیان کر دی کہ اگر تمام نہ کر سکو تو پھر یوں کرو۔ علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حج وعمرہ شروع کرنے سے ضروری ہو جاتا ہے، خواہ عمرے کو واجب کہیں یا مستحب۔ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ پورا کرنا یہ ہے کہ احرام گھر سے باندھ کر چلے۔[1] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، سعید بن جبیر اور طاؤس رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے۔[2] سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پورا کرنا یہ ہے کہ گھر سے احرام باندھے، حج وعمرے کے علاوہ کوئی اور ارادہ نہ ہو، میقات سے اہلال (نیت) کرے، یہ نہ ہو کہ تجارت یا کسی اور غرض سے نکلے اور مکہ کے پاس پہنچ کر کہے کہ حج یا عمرہ کرتا چلوں۔ اگرچہ یہ کافی ہے، لیکن پورا کرنا وہی ہے کہ اسی کے ارادے سے نکلے، نہ کہ کسی اور کام کے لیے۔[3] امام مکحول رحمہ اللہ نے

---

[1] تفسير الطبري (٤/ ٨) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٣٢) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٣٢)

[3] تفسير الطبري (٤/ ١٠)

کہا ہے کہ پورا کرنا یہ ہے کہ ان دونوں کو میقات سے شروع کرے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اِتمام یہ ہے کہ حج و عمرہ الگ الگ کرے اور حج کے مہینوں سے علاحدہ عمرہ بجا لائے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ﴾ [البقرة: ١٩٧] ''حج کے مہینے معلوم و مقرر ہیں۔''[1] قاسم بن محمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عمرہ حج کے مہینوں میں پورا نہیں ہوتا۔ کسی نے پوچھا کہ اگر ماہِ محرم میں عمرہ کرے تو کیسا ہے؟ کہا کہ ہاں اس کو پورا جانتے تھے۔ اسی طرح قتادہ رحمہ اللہ سے بھی آیا ہے۔[2] مگر اس پر اعتراض ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کیے اور وہ چاروں ذوالقعدہ میں تھے: عمرۂ حدیبیہ ٦ھ میں، عمرۂ قضا ٧ھ میں، عمرۂ جعرانہ ٨ھ میں، عمرے اور حج ان دونوں کا احرام ایک تھا، جو ١٠ھ میں ذوالقعدہ کے مہینے میں باندھا۔ ان کے سوا ہجرت کے بعد پھر کوئی عمرہ نہیں کیا، لیکن اُمِ ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فرمایا کہ رمضان میں عمرہ کرنا، میرے ساتھ حج کرنے کے برابر ہے۔ یہ اس لیے فرمایا تھا کہ انھوں نے آپ کے ہمراہ حج کا ارادہ کیا تھا، لیکن سواری نہ ملنے کی وجہ سے رہ گئیں۔

یہ قصہ بخاری میں مفصل آیا ہے۔[3] مگر سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ ان کے خصائص میں سے تھا۔[4] امام سدی رحمہ اللہ کا یہ قول ہے کہ اتمام سے مراد یہ ہے کہ حج اور عمرہ قائم کرو۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اتمام یہ ہے کہ جس کسی نے حج یا عمرے کا احرام باندھا ہو، اس کے لیے یہ بات درست نہیں کہ جب تک حج اور عمرہ پورا نہ کرلے، احرام کھول ڈالے۔ حج کا پورا ہونا اس طرح ہے کہ قربانی کے دن جمرے کو کنکریاں مارے، کعبے کا طواف کرے، صفا و مروہ میں دوڑے، اب احرام اُتار ڈالے۔[5] دوسرا قول ان کا یہ ہے کہ حج عرفہ ہے اور عمرہ طواف ہے۔[6] سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اس آیت کو یوں پڑھا ہے: ''أَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ إِلَى الْبَيْتِ'' یعنی عمرے میں بیت سے تجاوز نہ کرے۔ امام علقمہ رحمہ اللہ نے بجائے ''أَتِمُّوا'' کے ''أَقِيمُوا'' پڑھا ہے۔[7] امام شعبی رحمہ اللہ نے لفظ ''وَالْعُمْرَةُ'' کو مرفوع پڑھا ہے، یعنی عمرہ واجب نہیں ہے۔[8]

افضل حج، حجِ تمتع ہے:

بہت سی حدیثوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے کئی طریق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٣٢، ٣٣٣) [2] تفسير الطبري (٤/ ٩، ١٠)

[3] یہ واقعہ صحیح بخاری میں ام ہانی رضی اللہ عنہا کے بجائے ام سنان رضی اللہ عنہا کا ہے۔ دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٩٠، ١٧٦٤)

[4] تفسير ابن كثير (١/ ٣٠٢) [5] تفسير الطبري (٤/ ٧) اس کی سند حسن ہے۔

[6] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٣٣) اس کی سند صحیح ہے۔ [7] تفسير الطبري (٤/ ٧) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٣٣)

[8] تفسير الطبري (٤/ ١٠)

رسول اللہ ﷺ نے حج اور عمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھا تھا۔ صحیح میں آیا ہے کہ صحابہ سے فرمایا کہ جو کوئی قربانی لایا ہو، وہ دونوں کا اہلال کرے (تلبیہ کہے)۔[1] یہ بھی صحیح میں ہے کہ روزِ قیامت تک عمرہ حج میں داخل ہو گیا۔[2] اس سے معلوم ہوا کہ افضل قسم حج کی حجِ تمتع ہے، اگرچہ کسی نے قِران کو اور کسی نے افراد کو افضل بتایا ہے۔ صحیحین میں آیا ہے کہ جعرانہ مقام پر ایک شخص نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ ایک شخص نے عمرے کا احرام باندھا ہے۔ وہ جبہ پہنے ہوئے ہے اور خوشبو لگائے ہوئے ہے؟ آپ ﷺ خاموش رہے، پھر وحی آئی تو سر اُٹھا کر کہا کہ سائل کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ میں حاضر ہوں، فرمایا کہ جبے کو اُتار دے، خوشبو کو دھو ڈال، پھر جو کام تو حج میں کرتا ہے وہی عمرے میں کر۔[3] فضائلِ حج و عمرہ میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں، یہ اُن کے لکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ اس بارے میں ایک کتاب "أربعون حديثا" (چہل حدیث) علاحدہ لکھی گئی ہے۔ "طراز الخمرة" اور "إيضاح المحجة" میں بھی فضائلِ عمرہ و حج بیان ہوئے ہیں۔

حج اور عمرے کا حکم:

اُمت کا اتفاق ہے کہ قدرت رکھنے والے پر حج کرنا واجب ہے اور اس آیت سے کچھ نے عمرے کا وجوب بھی سمجھا ہے۔ اس طرح کہ اتمام کا حکم گویا امر ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔ امام شافعی اور احمد رحمہما اللہ وغیرہما بھی اسی طرف گئے ہیں۔ امام مالک، نخعی رحمہما اللہ اور اصحاب الرائے کے نزدیک عمرہ سنت ہے نہ کہ واجب۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے وجوب کا قول مروی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود اور جابر رضی اللہ عنہما بھی عمرے کو سنت کہتے تھے۔ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ حج اور عمرہ دو فرض ہیں، تیرا کچھ نقصان نہیں، جس کو چاہے پہلے شروع کر۔[4] (أخرجه الدار قطني والحاكم) سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں یوں آیا ہے کہ حج جہاد ہے اور عمرہ تطوع، یعنی نفل۔[5] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اس طرح مروی ہے کہ ایک آدمی نے کہا کہ کیا عمرہ واجب ہے؟ فرمایا کہ نہیں، لیکن اگر تم عمرہ کرو تو تمھارے لیے بہتر ہوگا۔[6] امام شوکانی رحمہ اللہ اسی کے

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٢١١) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٢٤١)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٦٩٧) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١١٨٠)

[4] سنن الدارقطني (٢/ ٢٨٤) مستدرك الحاكم (١/ ٦٤٣) امام حاکم رحمہ اللہ نے اس کے موقوف ہونے کو صحیح کہا ہے۔ نیز امام البانی رحمہ اللہ نے بھی ایسے ہی کہتے ہوئے اس کے مرفوع ہونے کو ضعیف کہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٣٥٢٠)

[5] سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٢٩٨٩) اس کی سند میں "عمر بن قیس" متروک راوی ہے۔ السلسلة الضعيفة، رقم الحدیث (٢٠٠)

[6] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٩٣١) سنن البیهقي الکبریٰ (٤/ ٣٤٩) امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کے موقوف ہونے کو صحیح اور مرفوع ہونے کو ضعیف کہا ہے۔ نیز اس کی سند میں "حجاج بن أرطاۃ" مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ (فتح الباري: ٣/ ٥٩٧)

قائل نہیں کہ عمرہ سنت ہے نہ کہ واجب۔ آیت اور حدیث کا یہ جواب ہے کہ جب عمرے کے افعال شروع کر دیے تو اب عمرے کا پورا کرنا، بغیر کسی اختلاف کے واجب ہوا۔[1] اس سے مختلف روایات جمع ہو جاتی ہیں۔

حج وعمرہ کے ارکان:

حج کے ارکان پانچ ہیں: ایک احرام، دوسرا عرفہ میں کھڑا ہونا، تیسرا طواف، چوتھا سعی، پانچواں سر کے بال منڈوانا یا کتروانا۔ عمرے کے ارکان چار ہیں: احرام، طواف، سعی، حلق یا تقصیر۔ جب یہ ارکان کر لیے تو حج اور عمرہ تمام ہو گیا۔

حصر کی تفسیر اور محصور کا حکم:

رہا حصر تو اہلِ علم نے کہا ہے کہ یہ آیتِ حصر ۶ ھ حدیبیہ میں اُتری ہے، جب مشرکوں نے رسول اللہ ﷺ کو مکہ نہ جانے دیا۔ اللہ تعالیٰ نے پوری سورت فتح اُتاری اور اصحاب رضی اللہ عنہم کو رخصت دی کہ جو قربانی کا جانور وہ لائے ہیں، اس کو ذبح کر دیں۔ یہ ستر اونٹ تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس کے منسوخ ہونے کے انتظار میں سر منڈوایا نہ احرام کھولا۔ آخر رسول اللہ ﷺ نے نکل کر اپنا سر منڈوایا۔ تب اکثر لوگ بھی سر منڈوا کر احرام سے باہر نکل آئے۔ بعض نے صرف بال کتروائے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ سر منڈوانے والوں پر رحم کرے، پھر لوگوں کے بار بار سوال کرنے پر تیسری بار بال کتروانے والوں کو بھی دعاے مذکور میں شامل کر لیا۔[2]

اس ہدی میں ایک اونٹ میں سات سات آدمی شریک تھے۔ سب ایک ہزار چار سو صحابی تھے۔ یہ لوگ حدیبیہ میں حرم سے باہر اُترے تھے۔ بعض نے کہا ہے کہ نہیں، بلکہ حرم کے کنارے پر تھے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ حصر دشمن کا ہے اور جو کوئی بیمار ہو گیا یا کسی اور دُکھ درد میں مبتلا ہوا یا راستہ بھول جانے میں پھنس گیا تو اس پر کچھ نہیں ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا: ﴿ فَإِذَآ أَمِنتُمْ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''پھر جب تمھیں امن مل جائے۔'' پس یہی حصر ٹھہرا۔[3] دوسرا قول یہ ہے کہ حصر کچھ دشمن پر موقوف نہیں ہے، بلکہ دشمن اور مرض اور راستہ بھول جانے سب کو شامل ہے۔[4] حجاج انصاری رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ لنگڑا ہو گیا یا کوئی ہڈی ٹوٹ گئی یا کسی درد میں مبتلا ہو گیا، وہ احرام سے نکل گیا، وہ آیندہ سال حج کرے۔ سیدنا ابن عباس اور سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نے اس حدیث کی تصدیق کی۔ (رواہ أحمد) اس حدیث کو ابو داود اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔[5]

صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے کہ حصر دشمن، مرض اور کسر (ہڈی ٹوٹ جانے)

---

[1] فتح القدير (١/ ٣٥١، ٣٥٢) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٤٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٠١)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٣٥) اس کی سند حسن ہے۔ [4] تفسير ابن كثير (١/ ٣٠٣)

[5] مسند أحمد (٣/ ٤٥٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٠٧٧) صحيح الجامع (٦٥٢١)

سب سے ہوتا ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ احصار ہر موذی چیز سے ہوسکتا ہے۔[1] غرضیکہ حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ محصر وہ شخص ہے، جو احرام باندھنے کے بعد بیماری یا دشمن کے سبب سے مکہ جانے سے روک دیا گیا۔ شافعیہ اور اہلِ مدینہ کہتے ہیں کہ حصر صرف دشمن سے ہوتا ہے۔ اس جگہ حنفیہ کا مذہب قوی اور صریح حدیث کے مطابق ہے۔ صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے آیا ہے کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم زبیر رضی اللہ عنہ کی بیٹی ضباعہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! میں حج کرنا چاہتی ہوں، مگر بیمار ہوں؟ فرمایا تو حج کر اور یہ شرط کر لے کہ میرے حلال ہونے کی جگہ وہی ہے، جہاں اللہ مجھ کو روک دے۔ اس کو مسلم نے بھی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔[2] بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ یہ شرط اسی حدیث کی دلیل سے صحیح ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر یہ حدیث ثابت ہو جائے تو میں بھی اسی کا قائل ہوں۔ امام بیہقی رحمہ اللہ وغیرہ حفاظ نے کہا ہے کہ یہ حدیث ثابت ہوگئی ہے۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔[3] جمہور علما نے کہا ہے کہ جب کوئی محصر ہو جائے تو اسی جگہ جہاں محصر ہو گیا ہے احرام اُتار ڈالے، اگر قربانی کا جانور ساتھ لایا ہو تو اسے ذبح کر دے، سر کے بال منڈوا ڈالے، جس طرح نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے حدیبیہ میں کیا۔

ہدی سے مراد:

سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اس جگہ ہدی سے مراد بکری ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نہیں، بلکہ اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری سب ہدی ہیں۔ تابعین کی ایک جماعت اور چاروں اماموں کا یہی مذہب ہے کہ اس جگہ ہدی بکری ہے۔ مگر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فقط اونٹ اور گائے کو ہدی کہتے ہیں، کچھ تابعی اس طرف بھی گئے ہیں۔[4] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ظاہر یہی ہے کہ ان لوگوں کی سند وہی حدیبیہ کا قصہ ہے کہ وہاں جب احرام سے باہر نکلے تو بکری نہیں تھی، اونٹ اور گائے تھیں۔[5] صحیحین میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ ہمیں نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہم اونٹ اور گائے میں شریک ہو جائیں، سات سات آدمی ایک ایک اونٹ اور گائے میں۔[6] میسر ہونے کا مطلب سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بیان کیا کہ بقدرِ مقدور کام کرے۔[7] یعنی اگر آسودہ ہے تو اونٹ حلال کرے، ورنہ گائے، ورنہ بکری۔ عروہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات ارزانی یا گرانی پر موقوف ہے۔[8] جمہور کا قول یوں صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ جو قربانی میسر آئے، وہ کرو۔ اس لیے محصر کو بکری ذبح کرنا کافی ہوسکتا ہے۔ ہدی اونٹ، گائے، بکری کا نام ہے۔ ترجمان القرآن سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی قول ہے۔[9] صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٣٤)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٠١) صحيح مسلم (١٢٠٧_ ١٢٠٨)
[3] تفسير ابن كثير (١/ ٣٠٣)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٣٥)
[5] تفسير ابن كثير (١/ ٣٠٣، ٣٠٤)
[6] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣١٨)
[7] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٣٦) اس کی سند صحیح ہے۔
[8] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٣٦)
[9] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٣٥)

سے مروی ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے بکری بہ طورِ ہدی بھیجی۔[1] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ اعلیٰ ہدی بدنہ (اونٹ) ہے، وسط بقرہ (گائے) اور ادنیٰ شاۃ (بکری) ہے۔[2]

حالتِ امن میں سر منڈوانے کا وقت:

رسول اللہ ﷺ نے حدیبیہ کے سال سر کا منڈوانا اور قربانی حرم سے باہر ہی کی تھی، کیوں کہ کفارِ قریش نے انھیں روک دیا تھا۔ رہا حالتِ امن میں کہ حرم تک پہنچ جائے تو جب تک ہدی (قربانی کا جانور) اپنے ٹھکانے سے نہ جا لگے اور حاجی اور معتمر (عمرہ کرنے والا) حج اور عمرے کے کاموں سے فارغ نہ ہو۔ اگر قارن (حج قران کرنے والا) ہے، یا صرف حج نہ کر چکے اگر مفرد ہو، یا متمتع (حج تمتع کرنے والا) ہو، تب تک سر نہ منڈوائے، جس طرح حفصہ رضی اللہ عنہا سے صحیحین میں مروی ہے کہ انھوں نے نبی مکرم ﷺ سے کہا کہ لوگوں کا کیا حال ہے کہ وہ عمرے سے باہر آ گئے اور آپ اب تک حلال نہیں ہوئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اپنے سر کو گوند لگایا ہے اور ہدی کو قلادہ پہنایا ہے۔ اس لیے جب تک ہدی کو نحر نہیں کر لوں گا، حلال نہیں ہوں گا، یعنی احرام نہیں کھولوں گا۔[3] غرضیکہ ﴿ وَلَا تَحْلِقُوْا ﴾ کا عطف ﴿ اَتِمُّوا ﴾ پر ہے نہ کہ ﴿ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ ﴾ پر، جس طرح کہ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے خیال کیا ہے۔ فتح البیان کا بیان یوں ہے کہ یہ خطاب، کیا محصر کیا غیر محصر، ساری اُمت کو ہے۔ اہلِ علم کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ بلکہ یہ خطاب محصرین کو ہے کہ جب تک تمھاری قربانی ٹھکانے نہ لگے، تم احرام سے نہ نکلو، پھر ٹھکانے میں اختلاف ہے۔ امام مالک اور شافعی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اقتدا کے لیے اس سے حصر کی جگہ مراد ہے، کیوں کہ آپ حدیبیہ میں محصر ہو گئے تھے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حرم ہے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے دلیل لی ہے: ﴿ ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴾ [الحج: ٣٣] ''پھر ان کے حلال (ذبح) ہونے کی جگہ قدیم گھر (بیت اللہ) کے پاس ہے۔'' مگر جواب یہ ہے کہ یہ آیت صاحبِ امن کے حق میں ہے، جو بیت اللہ تک پہنچ سکتا ہے۔ حنفیہ نے حدیبیہ کا یہ جواب دیا ہے کہ نچلی جانب سے حدیبیہ حرم میں داخل ہے۔ مگر یہ جواب مردود ہے۔ کیوں کہ وہاں جس جگہ پر قربانی ہوئی، وہ جگہ حرم میں نہ تھی۔[4]

احرام کی حالت میں سر منڈوانے والے کا فدیہ:

سیدنا کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے جایا گیا۔ میرے سر سے جوئیں میرے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٢١)
[2] تفسير القرطبي (٢/ ٣٧٨)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٩١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٢٩)
[4] فتح القدير (١/ ٣٥٣) فتح البيان (١/ ٣٩٦، ٣٩٧)

منہ پر جھڑ رہی تھیں، فرمایا کہ مجھے خیال نہیں تھا کہ تیری تکلیف اس حد کو پہنچے گی۔ کیا تجھے کوئی بکری نہیں ملتی؟ میں نے کہا کہ نہیں، فرمایا: تین روزے رکھ یا چھے مسکینوں کو کھانا کھلا، ہر مسکین کو آدھا صاع دے اور سر منڈوا ڈال۔ اس پر یہ آیت خاص میرے حق میں نازل ہوئی، لیکن تم سب کو شامل ہے۔ (رواہ البخاري) یہ حدیث امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ کے نزدیک کئی طرح سے آئی ہے۔[1] سب کا ایک ہی مطلب ہے۔

امام مجاہد، عکرمہ، عطا، طاؤس، حسن، نخعی، ضحاک، ائمہ اربعہ اور عام علمائے کرام رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے کہ ایسے شخص کو اختیار ہے، چاہے روزہ رکھے، چاہے صدقہ دے، نصف صاع، یعنی دو مد۔ تین صاع کا ایک فرق ہوتا ہے۔ چاہے بکری ذبح کر کے فقرا کو بانٹ دے۔ غرضیکہ ان تین کاموں میں، جو کرے گا، وہ کافی ہوگا۔ قرآن پاک میں اس جگہ آسان سے آسان الفاظ آئے ہیں کہ فدیہ صیام ہو یا صدقہ یا نسک (قربانی) اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کعب بن عجرہ کو پہلے بکری ذبح کرنے کا حکم دیا، پھر صدقے کا، پھر روزے کا اور وہ افضل سے افضل بات بتائی، سو ہر ایک حکم بجائے خود بہت خوب ہے۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ.[2]

ابراہیم رحمہ اللہ نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے اس آیت کا مطلب پوچھا تو کہا کہ طعام دے یا بکری مول لے کر ذبح کرے۔ اگر نہ ہو سکے تو بکری کے دام مقرر کر کے اتنا کھانا صدقہ کرے، ورنہ روزہ رکھے اور ہر دن آدھا صاع دے۔ ابراہیم رحمہ اللہ نے کہا کہ میں نے علقمہ رحمہ اللہ سے ایسے ہی سنا ہے۔ جب ابراہیم چل دیے تو سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ کون شخص تھا، بڑا خوش طبع ہے؟ میں نے کہا کہ ابراہیم رحمہ اللہ ہیں۔ کہا کہ بڑے ظریف آدمی ہیں اور ہمارے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ جب میں نے اس بات کا ذکر ابراہیم رحمہ اللہ سے کیا تو اس لفظ پر کہ ہمارے پاس بیٹھا کرتے تھے، ذرا گھٹ گئے۔[3] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محرم (احرام باندھنے والے) کے سر میں جب کوئی ایذا ہو تو سر منڈوا لے اور اُن تین کاموں میں سے ایک کام کرے: دس روزے رکھے یا دس مساکین کو کھانا کھلائے۔ ہر مسکین کو دو مکوک (تین صاع) دے۔ ایک مکوک کھجور اور ایک مکوک گیہوں یا بکری ذبح کرے۔[4]

مگر یہ اقوال غریب ہیں، ٹھیک بات وہی ہے جو کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں گزری ہے کہ تین روزے یا چھے مسکینوں کا کھانا یا ایک بکری کا فدیہ ہوتا ہے، پس یہی کافی ہے اور یہ فدیہ بھی اختیار پر ہے۔ قرآن پاک کا سیاق اسی پر دلالت کرتا ہے اور یہ ترتیب شکار کے قتل میں معروف ہے۔ قرآن نے اس پر نص بیان کی ہے۔ فقہا کا اس پر اتفاق ہے کہ یہاں وہ ترتیب نہیں ہے۔

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ مرض سے مراد وہ چیز ہے جس پر بیماری کا نام چسپاں ہوتا ہے۔ اذیٰ سے مراد یہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٧٢١) مسند أحمد (٤/ ٢٤٢)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٣٨) تفسير ابن كثير (١/ ٣٠٥)
[3] تفسير الطبري (٤/ ٧٤)
[4] تفسير الطبري (٤/ ٧٢، ٧٣)

ہے کہ جوئیں ہوں یا دردِ سر یا زخم یا اس کے مثل اور کچھ۔ اس صورت میں سر منڈوا کر فدیہ دے۔ فدیہ وہی ہے جو کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں گزر چکا ہے۔[1] ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بات میں علما کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس جگہ نسک سے مراد بکری ہے۔[2] جمہور کا یہی مذہب ہے کہ تین روزے رکھے یا چھے مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ مالکیہ شافعیہ اور حنفیہ رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مد سے دو مد کھانا دے۔ ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ گیہوں دے تو آدھا صاع اور کچھ دے تو ایک صاع۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ بھی اس کے موافق کہتے ہیں۔ مگر امام ابن منذر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ غلط ہے۔ کیوں کہ بعض احادیث میں کعب رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ تین صاع کھجور چھے مسکینوں کو دو۔[3] امام احمد رحمہ اللہ کے دو قول ہیں: ایک امام مالک اور شافعی رحمہما اللہ کے موافق، دوسرا یہ کہ گیہوں ہوں تو ہر مسکین کو ایک مد دے، کھجور ہو تو نصف صاع۔

فدیہ کہاں دینا ہے؟

یہ فدیہ کس جگہ دے؟ عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب دم دے تو مکہ ہی میں دے۔ طعام اور روزے جہاں چاہے ادا کرے۔[4] اصحاب الرائے کا بھی یہی قول ہے۔ امام طاؤس، مجاہد، حسن اور شافعی رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ دم اور طعام مکہ میں دے اور صیام کا اختیار ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تینوں کا اختیار ہے۔ جہاں چاہے ادا کرے۔ فتح البیان میں کہا گیا ہے کہ حق یہی ہے۔ کیوں کہ جگہ کے تعین کے سلسلے میں کوئی دلیل نہیں۔ یہ خون، خونِ تخییر و تقدیر ہے۔[5] جس طرح کہ قربانی کا خون ترتیب و تعدیل کا خون تھا۔ ابو اسماء رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علی و حسین رضی اللہ عنہما، عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کو آئے تھے، حسین رضی اللہ عنہ کے سر میں تکلیف تھی۔ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے ان کا سر منڈوا دیا اور ایک اونٹ ذبح کیا۔[6] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر یہ اونٹ سر منڈوانے کے عوض تھا تو مکہ سے باہر ذبح ہوا اور اگر حلال ہونے کے عوض تھا تو بات واضح ہے۔

حجِ تمتّع کا بیان:

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب تم کو خاطر جمع ہو، یعنی بیماری یا دشمن کے ڈر سے تو جس نے عمرے کو حج سے ملایا ہو، یعنی عمرے کا احرام باندھ کر مکہ میں آیا، پھر عمرے کے بعد احرام کھول کر یہاں مقیم رہا، یہاں تک کہ پھر حج کا احرام باندھا تو اب اس کے لیے ہر وہ چیز جو محرم کے لیے مباح نہیں تھی درست ہوگی، یہی تمتع کے معنی ہیں۔

---

[1] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔
[2] التمهيد لابن عبد البر (٢/ ٢٣٧)
[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٠١)
[4] تفسير الطبري (٤/ ٨١)
[5] فتح القدير (١/ ٣٥٣، ٣٥٤) فتح البيان (١/ ٣٩٧، ٣٩٨)
[6] تفسير الطبري (٤/ ٧٩)

اس کے جائز ہونے میں علما کے درمیان میں کوئی اختلاف نہیں ہے، بلکہ محققین کے نزدیک تمتع حج کی افضل قسم ہے۔
حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ تمتع کا لفظ اس شخص کو شامل ہے، جس نے دونوں کا احرام باندھا یا صرف عمرے کا احرام باندھا، پھر اس سے فارغ ہو کر حج کا احرام باندھا۔ فقہا کے کلام میں یہ تمتع خاص ہے اور یہی معروف تمتع ہے۔ تمتع کی دوسری قسم تمتع عام ہے اور وہ دونوں قسموں کو شامل ہے۔ صحاح کی احادیث اس پر دلیل ہیں، کیوں کہ بعض راوی اس طرح کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا تھا اور بعض کہتے ہیں کہ آپ قارن (حج وعمرہ ملانے والے) تھے۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ آپ نے ہدی (قربانی کا جانور) روانہ کی تھی۔[1] بہر حال اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ جس نے تمتع کیا ہے، اس کو جو ہدی میسر آئے، وہ ذبح کرے۔ کم سے کم قربانی ایک بکری ہے۔ اگر گائے ذبح کرے تو بھی درست ہے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کی طرف سے ایک گائے ذبح کی تھی۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کی جانب سے گائے ذبح کی اور وہ سب حج تمتع کرنے والیاں تھیں۔[2] (رواہ ابن مردویہ) تمتع کی مشروعیت پر یہ دلیل ہے۔

حجِ تمتع کے بارے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا موقف:

جس طرح کہ صحیحین میں سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے آیا ہے کہ آیتِ متعہ کتاب اللہ میں اُتری اور ہم نے نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ متعہ (حج تمتع) کیا، پھر کوئی آیت ایسی نہیں تھی جو اس کو حرام کرتی یا اس سے منع کرتی، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگیا۔ ایک آدمی نے اپنی رائے سے جو چاہا کہہ دیا۔[3] امام بخاری کہتے ہیں کہ یہ آدمی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ قول امام بخاری رحمہ اللہ کا صراحتاً بھی آیا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو تمتع کرنے سے منع کر دیا تھا۔ کہتے تھے کہ اگر ہم کتاب اللہ کو پکڑیں تو اللہ تعالیٰ نے اتمام کا حکم دیا ہے، یعنی ﴿ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''اور تم حج اور عمرہ اللہ کے لیے پورا کرو۔''[4] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حقیقت میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے تمتع سے بہ طور تحریم (حرمت کے طور پر) منع نہیں کیا تھا، بلکہ یہ نہی اس لیے کی تھی کہ لوگ کثرت سے حج اور عمرے کے لیے بیت اللہ کا قصد کریں، چنانچہ انھوں نے خود ہی اس بات کی تصریح بھی کر دی تھی۔[5]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۳۰٦)

[2] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس جیسی روایت "سنن أبي داود" (رقم الحدیث: ۱۷۵۱) اور "سنن ابن ماجه" (رقم الحدیث: ۳۱۳۳) میں مروی ہے۔ امام البانی رحمہ اللہ نے "صحیح أبي داود" (۵/ ٤۳۱) میں اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤۲٤٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۲۲٦)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱٤۸٤)

[5] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۳۰٦)

تمتع میں قربانی:

ہدیِ تمتع وہ بکری ہے جس کو نحر کے دن ذبح کرتے ہیں۔ اگر یوم النحر سے پہلے اور احرامِ حج کے بعد ذبح کر دیا ہے تو بھی امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک کافی ہے، اگرچہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ کافی نہیں۔ یہ دم، دمِ ترتیب و تقدیر ہے۔ اس آیت شریف میں تین قسم کے دم ذکر کیے گئے ہیں، جو نسک (قربانی) میں واجب ہیں۔ چوتھا دم سورۃ المائدہ میں اس آیت کے تحت آئے گا: ﴿ لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ﴾ [المائدۃ: ۹۵] ''جب تم احرام کی حالت میں ہو تو شکار نہ مارو۔'' سو وہ دم، دمِ تخییر و تعدیل ہے جو دو چیزوں میں واجب ہوتا ہے: ایک صید (شکار) دوسرے ذبح۔ فقہا نے بہت سے ایسے دم نکالے ہیں جن کی کوئی اصل کتاب و سنت سے معلوم نہیں ہوتی۔ نہ ان پر کوئی صحیح صریح دلیل ہی قائم ہے، کیوں کہ دماء میں انھی خونوں پر اکتفا کرنا چاہیے، جو قرآن یا حدیث میں آئے ہیں اور دوسری کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

قربانی نہ پانے کی صورت میں دس روزوں کا حکم:

پھر جو کوئی ہدی نہ پائے، یعنی بسبب عدمِ مال یا عدمِ حیوان تو وہ زمانۂ حج اور ایامِ مناسک میں تین روزے رکھے، یعنی شروع احرام سے یوم النحر تک۔ یہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔[1] علما نے کہا ہے کہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ عرفہ سے پہلے عشرہ ذوالحجہ میں رکھ لے۔ امام عطاء رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اول شوال سے بھی رکھنا جائز ہے۔ امام طاؤس اور مجاہد رحمہما اللہ وغیرہما اسی کے قائل ہیں۔[2] امام شعبی رحمہ اللہ کے نزدیک عرفہ کے دن یا اس سے دو دن پہلے بھی رکھنا درست ہے۔ امام مجاہد، سعید بن جبیر، سدی، عطاء، طاؤس، حاکم، حسن اور حماد رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ عرفہ سے پہلے رکھے۔ تیسرا روزہ اگر عرفہ کو پڑے تو بھی صوم پورا ہو گیا، جب گھر جائے تو سات روزے اور رکھ لے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یومِ ترویہ (آٹھ ذوالحجہ) سے ایک دن پہلے رکھے، دوسرا ترویہ کے دن اور تیسرا عرفہ کے دن۔[5] پھر اگر سب یا بعض عید سے پہلے نہیں رکھے تو امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ایامِ تشریق میں رکھ لے، کیوں کہ صحیح بخاری میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایامِ تشریق میں صیام کی رخصت نہیں ہے، سوائے اس شخص کے کہ جس کے پاس قربانی کا جانور نہیں ہے۔[6]

سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔[7] امام شافعی رحمہ اللہ کا قولِ جدید یہ ہے کہ ایامِ تشریق میں روزہ رکھنا جائز نہیں، کیوں کہ نبیشہ ہذلی رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں مروی ہے کہ ایامِ تشریق کھانے پینے اور اللہ کا ذکر کرنے کے دن ہیں۔[8] (رواہ مسلم) پھر جب حج کے بعد اپنے گھر اور اہل و عیال کے پاس

---

[1] تفسیر الطبري (٤/ ٩٤) اس کی سند میں ''داود بن حصین عن عکرمہ'' ضعیف راوی ہے۔ [2] تفسیر الطبري (٤/ ٩٦)

[3] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٠٦) [4] تفسیر الطبري (٤/ ٩٧) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

[5] تفسیر الطبري (٤/ ٩٩) اس کی سند میں ''سفیان بن وکیع'' ضعیف راوی ہے۔ [6] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٨٩٤)

[7] تفسیر الطبري (١/ ٩٨) [8] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١١٤١) تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٠٦، ٣٠٧)

جائے تو سات روزے رکھے۔ امام عطا اور مجاہد ﷭ نے کہا ہے کہ چاہے راستے میں رکھ لے، اس لیے کہ یہ رخصت ہے۔[1] امام احمد اور اسحق ﷭ بھی اسی طرف گئے ہیں، یعنی وجوب وطن پہنچنے کے بعد ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عمر ﷠ نے کہا ہے کہ گھر پہنچ کر رکھے۔ تابعین کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔[3] امام ابن جریر ﷫ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عمر ﷠ سے طویل مرفوع حدیث کے تحت مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ حج سے لوٹ کر مکہ میں آئے تو فرمایا: جس نے قربانی نہ پائی ہو، وہ ایامِ حج میں تین دن روزہ رکھے اور جب گھر پہنچے تو سات روزے رکھے۔[5] الحدیث۔

یہی قول قوی ہے۔ امام مالک ﷫ نے کہا ہے کہ منیٰ سے واپس آ کر اگر رکھے تو بھی کچھ حرج نہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس ﷠ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جب اعمالِ حج سے فارغ ہو کر اپنے شہر کو لوٹے تب رکھ لے۔[6] امام ابوحنیفہ ﷫ کا یہی قول ہے، مگر پہلا قول زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔[7]

یہ جو فرمایا کہ یہ پورے دس روزے ہو گئے، یہ اس لیے فرمایا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ تین یا سات میں اختیار ہے، ورنہ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ تین اور سات دس ہوتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ بلکہ یہ تاکید ہے۔ ابن جریر ﷫ نے کہا ہے کہ کامل کا یہ مطلب ہے کہ قربانی کا بدل ہو گیا اور کسی نے کہا ہے کہ نہیں، بلکہ یہ تاکید پر تاکید ہے کہ اس عدد سے کم نہ کرے۔ یہ اجر و ثواب میں قربانی کے برابر ہے۔[8]

اہلِ مکہ کے لیے حجِ تمتع نہیں:

اس میں اختلاف ہے کہ حاضرین مسجد الحرام سے کون لوگ مراد ہیں؟ کیوں کہ مسجد الحرام کے حاضرین پر متعہ (حجِ تمتع) جائز نہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ خاص اہلِ حرم مراد ہیں نہ کہ کوئی اور۔ سیدنا عبداللہ بن عباس ﷠ اور طاؤس ﷫ اسی طرف گئے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس ﷠ نے کہا ہے کہ اے مکہ والو! تمھارے لیے متعہ (حج تمتع) نہیں، یہ تو باہر سے آنے والوں کے لیے حلال کیا گیا ہے۔ تم پر حرام ہے۔ تم تو ایک جنگل پار کر کے وہاں سے اہلال (احرام) عمرہ کر لیا کرو۔ امام طاؤس ﷫ نے کہا ہے کہ تمتع ان لوگوں کے لیے ہے جن کے گھر والے حرم میں نہیں رہتے نہ کہ مکے والوں کے لیے۔[9] کسی نے کہا ہے کہ وہ لوگ مراد ہیں جو حرم اور میقات کے درمیان بستے ہیں، یہ تمتع نہ کریں۔ عطا ﷫ کا یہی قول ہے، یعنی اُن سے عرفہ، مزدلفہ، عرنہ اور رجیع کے رہنے والے مراد ہیں۔ زہری ﷫ نے کہا ہے کہ جس کے گھر والے ایک دن کی راہ پر ہوں، وہ تمتع کریں، جب کہ دوسرے قول میں دو دن بتائے ہیں۔

امام ابن جریر ﷫ نے اس جگہ امام شافعی ﷫ کا مذہب اختیار کیا ہے کہ اہلِ حرم مراد ہیں اور وہ لوگ جو اِتنے

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٤٢) [2] فتح القدير (١/ ٣٥٥) [3] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٤٢)
[4] تفسير الطبري (٤/ ١٠٧) [5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٢٧)
[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٩٧) [7] فتح القدير (١/ ٣٥٥) [8] تفسير الطبري (٤/ ١٠٨، ١٠٩)
[9] تفسير الطبري (٤/ ١١٠، ١١١)

فاصلے پر ہوں کہ وہاں نماز قصر نہیں کی جاتی، کیوں کہ اتنی دور کا آدمی حاضر سمجھا جاتا ہے نہ کہ مسافر۔[1]

حاصل یہ ہے کہ ﴿ ذٰلِكَ ﴾ کا اشارہ یا تو تمتع کی طرف ہے تو مسجدِ حرام کے نزدیک رہایشی پر متعہ (حج تمتع) نہیں ہے، جس طرح امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر تمتع کرے گا تو دم آئے گا، یہ دمِ جنایت ہے، یعنی قصور وار ہونے پر ہے۔ اس میں سے خود نہ کھائے۔ یا حکم کی طرف ہے، یعنی قربانی یا صیام کا وجوب متمتع پر ہے تو پھر حاضر مسجد پر متعہ واجب نہیں ہوگا۔

اہلِ مکہ سے مراد:

جس طرح امام شافعی رحمہ اللہ اور شافعیہ نے کہا ہے کہ حاضر سے مراد یہ ہے کہ مکہ کا یا میقات کا یا میقات سے اندر کا رہنے والا نہ ہو۔[2] امام مالک رحمہ اللہ نے کہا کہ اہلِ مکہ مراد ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا کہ میقات والے ہیں۔ میقات سے مراد ذوالحلیفہ، جحفہ، قرنِ منازل، یلملم اور ذاتِ عرق ہے۔ مکہ معظّمہ کے پانچ اطراف سے یہ پانچ میقات ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ مراد ہیں جن پر نمازِ جمعہ لازم ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہل سے مراد خود محرم کی ذات ہے،[3] یعنی احرام والا حاضر مسجد نہ ہو۔ مگر پھر اس قول کو نامعقول کہا ہے اور طبری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہل سے مراد بیوی بچے ہیں نہ کہ باپ بھائی۔ کچھ بھی ہو، اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد یہ فرمایا کہ تم اللہ سے ڈرو، یعنی اس کے امر و نہی بجا لاؤ، ورنہ وہ اپنے حکم کی مخالفت کرنے والے اور اس کی منع کی ہوئی چیزوں کا ارتکاب کرنے والے کو سخت عذاب کرے گا۔ کوئی بھی ہو اور کہیں بھی ہو یا اس سے مراد یہ ہے کہ عام طور پر تقوے کا حکم دیا ہے۔[4]

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾

حج کے مہینے معلوم ومقرر ہیں، چناں چہ جس شخص نے ان (مہینوں) میں حج کو لازم کر لیا تو حج کے دوران میں وہ جنسی باتیں نہ کرے، اللہ کی نافرمانی نہ کرے اور کسی سے جھگڑا نہ کرے اور جو نیک کام تم کرتے ہو اللہ اسے جانتا ہے اور (حج کے لیے) زادِ راہ لے لو، بے شک بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے اور اے عقل مندو! تم مجھ سے ڈرو ﴿197﴾

حج کا احرام باندھنے کا وقت:

حج کے لیے احرام باندھنے کا وقت غُرّہ (شروع) شوال سے عید قربان کی شب تک ہے۔ اس سے پہلے حج کا

---

[1] تفسير الطبري (٤/ ١١١-١١٣) [2] فتح القدير (١/ ٣٥٥) [3] تفسير الجلالين (١/ ٣٨) [4] فتح البيان (١/ ٤٠٠)

احرام باندھنا بہتر نہیں۔ حج اور عمرہ احرام باندھ لینے سے لازم ہو جاتا ہے۔ احرام یہ ہے کہ حج یا عمرہ کرنے کی زبان سے نیت کرے، اور تلبیہ کہے، پھر جب احرام میں داخل ہو جائے تو مرد عورت کی صحبت سے اور ہر گناہ اور آپس کے جھگڑے، بدن کے بال اُتارنے، ناخن تراشنے اور خوشبو لگانے اور شکار کرنے سے پرہیز کرے۔ مرد بدن پر سلے ہوئے کپڑے نہ پہنے اور نہ سر ڈھانکے۔ ہاں عورت کپڑے پہنے اور سر ڈھانکے، لیکن منہ پر کپڑا نہ ڈالے۔ [1]

کفر کی ایک غلطی یہ تھی کہ بغیر خرچ کے حج کو جانا ثواب جانتے تھے، توکل کرتے تھے اور قدرت ہوتے ہوئے بھی اپنے ساتھ خرچ نہ لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مقدور ہو تو خرچ لے کر جاؤ، جس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ سوال نہ کرو گے، بھیک نہ مانگو گے۔

اس آیت کے ایک معنی یہ ہیں کہ حج یہی حج ہے معلوم مہینوں میں۔ اسی بنیاد پر ان مہینوں میں احرام باندھنا، دوسرے مہینوں میں احرام باندھنے سے زیادہ مکمل ہوگا۔ اگرچہ ان مہینوں میں بھی صحیح ہو۔ یہ قول کہ حج کا احرام پورے سال باندھنا صحیح ہے، یہ امام مالک، ابو حنیفہ، احمد، اسحق، نخعی، ثوری اور لیث رحمہم اللہ کا مذہب ہے۔ ان کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ﴾ [البقرة: ١٨٩] ''وہ لوگوں کے لیے اور حج کے لیے اوقات مقررہ ہیں۔'' اس سے معلوم ہوا کہ سارے ہلال مواقیتِ حج ہیں اور ان تین مہینوں کی کچھ خصوصیت نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت عام ہے اور آیت زیرِ تفسیر خاص ہے اور خاص عام پر مقدم ہوتا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ حج دو نسک میں سے ایک نسک ہے۔ اس لیے عمرے کی طرح اس کا احرام سارا سال درست ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حج کا عمرے پر قیاس ہے۔ ایسا قیاس جو نصِ قرانی کے خلاف ہو، وہ باطل ہوتا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حج کا احرام حج کے مہینوں کے علاوہ درست نہیں، اگر پہلے باندھ لیا تو وہ کالعدم ہوگا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس، جابر رضی اللہ عنہم، امام عطا، طاؤس اور مجاہد رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ ان کی دلیل یہی آیت: ﴿ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ﴾ ہے۔ عمرے میں دو قول ہیں۔ آیت زیرِ تفسیر کا دوسرا مقصد یہ ہے: ''إِنَّ وَقْتَ الْحَجِّ أَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ''، ''وقتِ حج کے مہینے معلوم ہیں۔'' نحوی لوگ اسی طرف گئے ہیں۔ اس میں حج کے مہینوں کو تمام سال کے مہینوں سے خاص کر لیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان مہینوں سے قبل حج کا احرام باندھنا صحیح نہیں ہے۔ یہ مہینے اوقاتِ نماز کے مثل ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ کسی کو لائق نہیں ہے کہ حج کے مہینوں کے علاوہ کسی اور مہینے میں حج کا احرام باندھے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ حج کے مہینے معلوم ہیں۔ [2] ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ سنت یہ

---

[1] بشرطیکہ مردوں کا سامنا نہ ہو، ورنہ منہ ڈھانپنا ضروری ہوگا۔ [ص۔ ی]

[2] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٤٤)

ہے کہ کوئی حج کا احرام نہ باندھے، مگر حج کے مہینوں میں۔[1] اس کو امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ صحابی کا قول "مِنَ السُّنَّةِ كَذَا" "فلاں امر سنت سے ہے۔" اکثر اہل علم کے نزدیک حکماً مرفوع ہوتا ہے، خصوصاً سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما ترجمان القرآن کا قول۔ اس کے علاوہ اس سلسلے میں ایک مرفوع حدیث میں مروی ہے کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا: «لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ أَنْ يُحْرِمَ بِالْحَجِّ إِلَّا فِي أَشْهُرِ الْحَجِّ» (رواه ابن مردويه) "کسی کو لائق نہیں کہ حج کا احرام باندھے، مگر حج کے مہینوں میں۔" حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ "وَإِسْنَادُهُ لَا بَأْسَ بِهِ" "اس کی سند میں کوئی حرج نہیں۔" لیکن امام شافعی اور بیہقی رحمہما اللہ نے اس کو سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے موقوفاً روایت کیا ہے۔[2] موقوف روایت مرفوع سے زیادہ صحیح اور زیادہ ثابت ہے۔ اس صورت میں مذہب صحابی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول سے تقویت پا جائے گا کہ "مِنَ السُّنَّةِ أَنْ لَّا يُحْرِمَ بِالْحَجِّ إِلَّا فِي أَشْهُرِهِ"[3] "یہ بات سنت سے ہے کہ حج کا احرام نہ باندھا جائے، مگر حج کے مہینوں میں۔"

حج کے مہینے:

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ ﴿ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ﴾ سے شوال، ذوالقعدہ اور عشرۂ ذوالحجہ مراد ہے۔ اس کو امام بخاری نے صیغۂ جزم کے ساتھ تعلیق (شروع سند سے حذف کر کے بیان) کیا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اسناد صحیح ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شرط شیخین پر ہے۔[4] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت، تابعین، شافعی، ابوحنیفہ، احمد، ابو یوسف اور ابوثور رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[5] جمع کا اطلاق دو ماہ دس دن پر بہ طورِ تغلیب ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک شوال، ذوالقعدہ اور پورا ذوالحجہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہی قول ہے۔[6] امام طاؤس، مجاہد، عروہ، ربیع اور قتادہ رحمہم اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ اس بارے میں ایک مرفوع حدیث بھی آئی ہے، مگر موضوع ہے۔

اس مذہب کا فائدہ یہ ہے کہ جب سارا ذوالحجہ حج کا مہینا ٹھہرا تو بقیہ ذوالحجہ میں عمرہ مکروہ ہوگا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ قربانی کی رات کے بعد بھی حج درست ہے۔ عبداللہ رضی اللہ عنہ سے باسناد صحیح آیا ہے کہ ان مہینوں میں عمرہ نہیں ہے۔[7] امام ابن سیرین رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کسی اہل علم کو اس بات میں شک نہیں ہے کہ عمرہ حج کے مہینوں کے علاوہ دوسرے مہینوں میں کرنا زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ قاسم بن محمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان مہینوں میں عمرہ کو تمام نہیں

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٥٦٤) صحيح ابن خزيمة (٤/ ١٦٢) [2] مسند الشافعي (١/ ١٢١) سنن البيهقي الكبرىٰ (٤/ ٣٤٣)

[3] تفسير ابن كثير (١/ ٣٠٨، ٣٠٩) [4] صحيح البخاري (٢/ ٥٦٤) تفسير الطبري (٤/ ١١٦) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٠٣)

[5] تفسير الطبري (٤/ ١٢٠) [6] تفسير الطبري (٤/ ١١٧) [7] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٤٤) اس کی سند صحیح ہے۔

سمجھتے تھے۔[1] سیدنا عمر اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہما حج کے مہینوں کے علاوہ دوسرے مہینوں میں عمرہ کرنا محبوب سمجھتے تھے اور اُن مہینوں میں عمرہ کرنے سے منع کرتے تھے۔[2]

یہ کہنے سے کہ جس نے ان مہینوں میں حج فرض کیا، یہ بات معلوم ہوئی کہ احرام باندھنے سے حج کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بات پر اہلِ علم کا اجماع ہے کہ اس جگہ فرض سے مراد ایجاب اور لزوم ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جس نے حج یا عمرہ فرض کر لیا۔ عطا رحمہ اللہ نے کہا کہ فرض سے مراد احرام ہے۔ ابراہیم اور ضحاک رحمہما اللہ وغیرہما کا یہی قول ہے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت یہ ہے کہ حج کا تلبیہ کر کے پھر اس زمین پر نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔ قاسم بن محمد نے کہا کہ فرض کرنا یہ ہے کہ لبیک کہہ لے۔[5] امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حج کا لازم کرنا یہ ہے کہ تلبیہ کر لے یا قربانی کے جانور کے گلے میں قلادہ ڈالے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ احرام میں فقط حج کی نیت کافی ہے۔[6]

رفث کا مفہوم اور حج میں اس سے ممانعت:

﴿ رَفَثَ ﴾ سے مراد جماع ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ﴾ [البقرة: ۱۸۷] ”تمھارے لیے روزے کی رات کو اپنی عورتوں کے ساتھ صحبت کرنا حلال کر دیا گیا ہے۔“ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام سُدّی، قتادہ، عکرمہ، زہری، مجاہد اور مالک رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔[7] اس لیے جس طرح رفث حرام ہے، اسی طرح مباشرت کے لیے اُکسانے والے افعال، مثلاً: بوسہ اور شہوت سے چھونا وغیرہ بھی حرام ہیں، بلکہ عورتوں کے سامنے اس طرح کا ذکر بھی نہ کرے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿رَفَثَ﴾ یہ ہے کہ عورت کے پاس جائے، یا مرد عورت باہم اس قسم کی گفتگو کریں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما راستے میں چلتے ہوئے اشعار اور غزل کہتے تھے، کسی نے کہا کہ تم احرام میں رفث کرتے ہو، انھوں نے کہا کہ رفث وہ بات ہے جو عورتوں کے سامنے کہی جائے، پھر کہا کہ رفث عورت سے در پردہ جماع کا ذکر کرنا ہے۔

امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ رَفَثَ ﴾ جماع ہے یا فحش بات کہنا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عرابت، یعنی تعریضِ جماع (اشاروں سے شہوت کی باتیں کرنا) کو حالتِ احرام میں مکروہ جانتے تھے۔ طاؤس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ رَفَثَ ﴾ یہ ہے کہ عورت سے، مثلاً: یوں کہے کہ جب تم حلال ہو جاؤ گی تو میں تم سے ملوں گا۔ ابو العالیہ رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔

---

[1] تفسیر الطبري (٤/ ١١٩) [2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٠٩، ٣١٠) [3] تفسیر الطبري (٤/ ١٢١)
[4] تفسیر الطبري (٤/ ١٢٣، ١٢٤) [5] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٣٤٥) [6] فتح القدير (١/ ٣٥٩)
[7] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٣٤٥)

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے یہ بھی کہا ہے کہ ﴿ رَفَثَ ﴾ یہ ہے کہ عورت سے چمٹے، لپٹے، بوسہ لے، غمز کرے اور شہوت کو اُبھارنے والی بات کہے۔[1] تابعینِ عظام رحمہم اللہ وغیرہم کی ایک کثیر جماعت نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔

فسوق کا مفہوم اور اس سے ممانعت:

﴿ فُسُوْقَ ﴾ سے مراد گناہ ہیں۔ یہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا قول ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ﴿ فُسُوْقَ ﴾ گناہ ہیں، شکار ہو یا اور کچھ۔ حرم میں جو بھی اللہ کی نافرمانی ہوگی، وہ ﴿ فُسُوْقَ ﴾ ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، سدی، نخعی اور حسن رحمہم اللہ نے کہا کہ ﴿ فُسُوْقَ ﴾ سے مراد گالی دینا ہے۔ ان کی دلیل یہ صحیح حدیث ہے: « سِبَابُ الْمُؤْمِنِ[3] فُسُوْقٌ وَقِتَالُهٗ كُفْرٌ »[4] (رواه ابن أبي حاتم عن ابن مسعود) ''مومن کو گالی دینا فسق ہے اور اس کو قتل کرنا کفر ہے۔'' امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ فسوق بتوں کے نام پر ذبح کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ﴾ [الأنعام: ١٤٥] ''یا وہ فسق ہو کہ (ذبح کرتے وقت) اس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو۔'' امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہاں ﴿ فُسُوْقَ ﴾ سے مراد بُرا لقب رکھنا ہے۔[5]

ظاہر یہ ہے کہ اس آیت میں فسوق کوئی خاص گناہ نہیں ہے۔ اگر کسی جگہ یہ لفظ کسی خاص گناہ کے لیے بولا گیا ہے تو اس سے لازماً وہ اس خاص گناہ کے لیے مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ انھی لوگوں کی بات صحیح ہے جو اس جگہ ﴿ فُسُوْقَ ﴾ سے سب قسم کے گناہ مراد لیتے ہیں۔ دیکھو اللہ تعالیٰ نے حرمت والے مہینوں میں ظلم سے منع فرمایا ہے، اگرچہ ظلم پورا سال ممنوع ہے، ہاں حرمت والے مہینوں میں اس کی ممانعت زیادہ تاکید کے ساتھ سمجھی گئی ہے۔ اسی لیے فرمایا: ﴿ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ۬ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ ﴾ [التوبة: ٣٦] ''ان میں سے چار (مہینے) حرمت والے ہیں، یہی سیدھا دین ہے، چناں چہ تم ان (مہینوں) میں اپنے آپ پر ظلم نہ کرو۔'' حرم کے حق میں فرمایا: ﴿ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۭ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ [الحج: ٢٥] ''اور جو اس میں ظلم کے ساتھ کج روی کا ارادہ کرے، ہم اسے نہایت دردناک عذاب چکھائیں گے۔'' امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس جگہ یہ اختیار کیا ہے کہ فسوق سے مراد حرم میں ہر ممنوع کام کا ارتکاب ہے،[6] جیسے: شکار کا قتل کرنا، سر کا منڈوانا، ناخن کترانا اور اس جیسے دوسرے کام، مگر زیادہ صحیح وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث

---

[1] تفسیر الطبري (٤/ ١٢٦۔ ١٢٩) [2] تفسیر الطبري (٤/ ١٣٨) [3] بخاری میں ''سِبَابُ الْمُسْلِمِ'' آتا ہے۔

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٤) تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٣٤٦)

[5] تفسیر الطبري (٤/ ١٣٩) [6] تفسیر الطبري (٤/ ١٣٩، ١٤٠)

میں مرفوعاً مروی ہے کہ جس نے بیت اللہ کا حج کیا، پھر نہ رفث کیا نہ فسق، وہ اپنے گناہوں سے ایسے نکلا، جیسے آج اس کی ماں نے اسے جنا ہو۔[1] (رواه الشيخان)

جدال کا مفہوم اور اس سے ممانعت:

جدال میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ حج کے مناسک ادا کرتے ہوئے کسی سے نہ جھگڑے۔ اس کو اللہ پاک نے خوب کھول کر بیان کیا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حج کے مہینے بیان کر دیے ہیں۔ ان میں لوگوں کو آپس میں لڑنا جھگڑنا نہیں چاہیے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حج مقرر ہو گیا، اب کس چیز کا جھگڑا ہے؟[2] یعنی مشرک لوگ "نَسِیْئ" کرتے تھے، یعنی مہینے بدل ڈالتے تھے اور آگے پیچھے کر دیتے تھے، اب اللہ تعالیٰ نے مہینے مقرر کر دیے ہیں، کوئی اُلجھن باقی نہیں رہی۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مراد حج میں جھگڑنا ہے۔[3] امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حج میں لڑنا جھگڑنا مراد ہے۔[4] والله أعلم.

وجہ یہ تھی کہ قریش مشعرِ حرام کے نزدیک مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور دیگر عرب عرفہ میں ٹھہرتے۔ باہم یہ جھگڑا ہوتا کہ ہم سیدھی راہ پر ہیں۔ وہ کہتے نہیں، بلکہ صحیح طریقے پر ہم ہیں، تم نہیں ہو۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مختلف جگہوں میں وقوف کرتے، ہر ایک یہی کہتا کہ ابراہیم علیہ السلام کا موقف یہی ہے کہ جہاں ہم کھڑے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مناسک بیان کر کے یہ جھگڑا ختم کر دیا۔ محمد بن کعب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قریش جب منیٰ سے جمع ہوتے تو کہتے ہمارا حج تمھارے حج سے بہتر اور مکمل ہے، وہ کہتے نہیں، بلکہ مکمل ہمارا حج ہے۔ قاسم بن محمد رحمہ اللہ نے کہا کہ جدال یہ ہے کہ کوئی کہے کہ حج کل ہے، کوئی کہے آج ہے۔[5] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس بات کو اختیار کیا ہے کہ آیت کا مقصد مناسکِ حج میں اس تنازع کو ختم کرنا ہے۔[6] والله أعلم.

دوسرا قول یہ ہے کہ اس جگہ جدال سے مراد باہم لڑائی اور دشمنی ہے۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جدال یہ ہے کہ تو اپنے ساتھی سے جھگڑے اور اس کو غصہ دلائے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی قول مروی ہے۔ امام ابو العالیہ، عطا، مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، جابر، مکحول، سدی، مقاتل، عمرو بن دینار، ضحاک، ربیع، نخعی، حسن اور قتادہ رحمہم اللہ وغیرہ سب اسی طرف گئے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تو اپنے ساتھی سے بحث اور مجادلہ وغیرہ نہ کر کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے۔ امام نخعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جدال کو مکروہ جانتے تھے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٥٠) تفسير ابن كثير (١/ ٣١١)
[2] تفسير الطبري (٤/ ١٤٦_ ١٤٧) [3] تفسير الطبري (٤/ ١٤٨) [4] تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٤٨)
[5] تفسير الطبري.(٤/ ١٤٥، ١٤٦) [6] تفسير الطبري (٤/ ١٥٣)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جدال سے گالی دینا اور جھگڑنا مراد ہے۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ مراد بحث وتمحیص اور جھگڑے ہیں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جدال سے مراد غصہ ہے کہ کسی مسلمان کو تو خفا کر دے، ہاں غلام پر کسی قصور کی بنا پر خفا ہونا یا اس کا خفا کرنا، بشرطیکہ اسے مارے نہیں، جائز ہے۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بلکہ اگر مار بیٹھے تو جائز ہے۔ کیوں کہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ کے غلام نے بار برداری والا اونٹ گم کر دیا، جس پر ان کا اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سامان تھا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ اسے مارنے لگے۔ یہ واقعہ حج کے سفر کے دوران مقامِ عرج میں پیش آیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرما کر صرف اتنا کہا کہ اس محرم کو دیکھو، یہ کیا کام کرتا ہے۔[2] (رواه أحمد و أبو داود و ابن ماجه) بعض سلف نے کہا ہے کہ پورا حج یہ ہے کہ جمّال (اونٹوں والے) کو مارے، مگر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ایک لطیف انکار نکل رہا ہے۔ اس لیے زیادہ بہتر یہ ہے کہ نہ مارے۔ اسی لیے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ جس نے اپنا نسک (حج) پورا کیا اور مسلمان اس کی زبان اور ہاتھ سے محفوظ رہے، اس کے اگلے گناہ بخش دیے گئے۔[3] (رواه عبد بن حميد)

اچھائی کرنے اور زادِ راہ لینے کی ترغیب:

جب قبیح (برے) قول وفعل سے منع کر دیا تو اچھے عمل پر آمادہ کیا، شر کے بعد خیر کا ذکر، نافرمانی کے بعد اطاعت وفرماں برداری کا ذکر فرمایا۔ کہا کہ رفث کی جگہ اچھی بات کہو، فسق وفجور کی جگہ نیکی اور تقویٰ اختیار کرو، جدال کے عوض اتفاق اور اخلاقِ جمیلہ سے پیش آؤ۔ کیوں کہ تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے۔ وہ تمھارے عمل کی جزا دے گا۔ برا ہوگا تو بری جزا، اچھا ہوگا تو اچھی جزا، پھر تقوے کو بہتر زادِ راہ ٹھہرایا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ کچھ لوگ اپنے گھروں سے بغیر خرچ کے نکلتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم بیت اللہ کے حج کو جاتے ہیں، کیا اللہ ہمیں کھانے کو نہیں دے گا؟ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تم خرچ لے کر نکلو اور اپنی آبرو بچاؤ۔[4]

دوسرے الفاظ ان سے اس طرح مروی ہیں کہ اہلِ یمن حج کو بغیر زادِ راہ کے آتے اور اپنے آپ کو متوکل ٹھہراتے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ زادِ راہ لے کر آؤ۔[5] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے الفاظ یہ ہیں کہ کچھ لوگ ایسے تھے، جب احرام باندھتے تو جو زادِ راہ پاس ہوتا، اس کو پھینک دیتے اور نیا زادِ راہ لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو منع فرمایا اور کہا

---

[1] تفسير الطبري (٤/ ١٤١۔ ١٤٥)

[2] مسند أحمد (٦/ ٣٤٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨١٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٩٣٣) امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "حديث حسن" (صحيح أبي داود: ٦/ ٨٢۔ ٨٣)

[3] مسند عبد بن حميد (١/ ٣٤٨) اس روایت کی سند میں "موسیٰ بن عبیدہ" ضعیف راوی ہے۔ السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٢٨١) تفسير ابن كثير (١/ ٣١٢، ٣١٣)

[4] تفسير الطبري (٤/ ١٥٩) تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٤٨) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ [5] صحيح البخاري (١٤٥١)

کہ تم آٹا، ستو، خشک روٹی رکھو۔[1] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ آدمی کی بزرگی یہ ہے کہ اس کا زادِ راہ پاک ہو۔ اگر کوئی ان کے ہمراہ ہوتا تو اس سے یہ شرط کر لیتے کہ مال حلال لے کر حج کو آئے ہو تو میرے ہم راہ چلو۔

سفرِ آخرت کا زادِ راہ:

پھر اللہ تعالیٰ نے جس طرح ان کو دنیا کے سفر میں زادِ راہ کا حکم دیا، اسی طرح یہ بھی حکم دیا کہ زادِ آخرت تقویٰ ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ﴾ [الأعراف: ٢٦] ''اور زینت کا باعث ہے، اور پرہیز گاری کا لباس بہت بہتر ہے۔'' یعنی لباس حسی کے بعد لباس معنوی کا راستہ دکھا دیا کہ وہ خضوع و اطاعت اور تقویٰ ہے، پھر آخرت کے زاد اور لباس کو بہتر اور فائدہ مند کہا۔ عطا خراسانی رحمہ اللہ نے کہا کہ خیر الزاد سے مراد زادِ آخرت ہے۔[2] سیدنا عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث میں مروی ہے کہ جو شخص دنیا میں زادِ راہ لیتا ہے، وہ اس کو آخرت میں فائدہ دیتا ہے۔[3] (رواه الطبراني) امام مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب یہ آیت اُتری تو فقرائے مسلمین میں سے ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا کہ اے اللہ کے رسول! ہم کو زادِ راہ نہیں ملتا؟ فرمایا: زادِ راہ لے اور آبرو کو لوگوں سے بچا، بہتر زاد تقویٰ ہے۔[4] (رواه ابن أبي حاتم)

آخر آیت میں یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اے عقل مندو! میرے عذاب اور پھٹکار سے ڈرو، جو میرے حکم کے خلاف کرتا ہے، اس کو سزا ملے گی۔ معلوم ہوا کہ اللہ سے وہی ڈرتے ہیں جو عقل رکھتے ہیں، جاہل بے عقل کو اللہ کا خوف نہیں ہوتا۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّاۗلِّيْنَ ﴿١٩٨﴾

تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم (حج کے دوران میں) اپنے رب کا فضل تلاش کرو، پھر جب تم عرفات سے لوٹو تو مشعر الحرام کے پاس اللہ کو یاد کرو اور تم اسے اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تمھیں ہدایت دی اور یقیناً اس سے پہلے تم گمراہوں میں سے تھے ﴿198﴾

---

[1] تفسیر الطبري (٤/ ١٥٦) [2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣١٣)

[3] المعجم الکبیر (٢/ ٣٠٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ١٠/ ٥٥٩)

[4] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٣٥٠) یہ روایت معضل ہے۔ معضل ایسی روایت کو کہتے ہیں کہ جس میں تبع تابعی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرے اور یہ ضعیف حدیث کی اقسام میں سے ہے۔

حج میں تجارت:

یعنی حج میں روزی کمانے کی خاطر اگر مالِ تجارت بھی لے جاؤ تو اس میں کوئی ممانعت نہیں۔ لوگوں نے اس میں یہ شبہہ کیا تھا کہ شاید حج قبول نہ ہو، اس لیے یہ شبہہ دور فرمایا۔ امام بخاری نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز جاہلیت کے بازار تھے۔ لوگوں نے حج کے موسم میں تجارت کرنے کو گناہ سمجھا۔ اس پر یہ آیت اُتری۔ [1] بعض نے کہا ہے کہ جب اسلام آیا تو لوگوں نے تجارت کو گناہ سمجھ کر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دوسری روایت یہ ہے کہ لوگ موسمِ حج میں خرید و فروخت، لین دین اور تجارت سے بچتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس میں کچھ گناہ نہیں ہے، تم خوشی سے رزق تلاش کرو۔ [2] یعنی جیسے احرام سے پہلے سوداگری اور خرید و فروخت درست ہے، ویسے ہی احرام کے بعد بھی درست ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت اور تابعین رحمہم اللہ نے یہی کہا ہے کہ مراد موسمِ حج ہے۔

ابو اُمامہ تیمی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ ہم کرائے پر لین دین کرتے ہیں، ہمارا حج ہوتا ہے؟ کہا: کیا تم طواف نہیں کرتے، عرفہ میں نہیں آتے، رمیِ جمار (جمرات کو کنکر مارنا) نہیں کرتے، سر نہیں منڈواتے؟ کہا: ہاں یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ کہا یہی بات ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہ دیا، پھر جبریل علیہ السلام اس آیت کو لے کر آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بلا کر فرمایا: "أَنْتُمْ حُجَّاجٌ" "(اے کرائے پر لین دین کرنے والو!) تم حاجی ہو۔" [3] (رواہ أحمد) یہ حدیث کئی طرق سے مروی ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے غلام ابو صالح نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ کیا تم حج میں تجارت کرتے تھے؟ کہا کہ ان کی روزی تو اسی حج میں تھی۔ [4]

غرض کہ آیت شریفہ میں حاجی کو تجارت کرنے کی رخصت تھی۔ اسی طرح اور اعمال کا حکم ہے کہ جن میں رزق ملے۔ لفظِ فضل سے اس جگہ یہی مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ﴾ [الجمعة: ١٠] "تو تم زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔" فتح البیان میں ہے کہ حق یہ ہے کہ اس آیت میں خرید و فروخت کی اجازت رخصت کے طور پر ہے اور اس کو ترک کرنا اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق زیادہ بہتر ہے: ﴿ وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ [البينة: ٥] "حالانکہ انھیں یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ بندگی کو اللہ کے لیے خالص کر کے، یکسو ہو کر، اس کی عبادت کریں۔" اخلاص یہی ہے کہ کام کرنے والا ہر کام کو صرف اللہ کی رضا کے لیے کرے، گویا وہ عبادت کر رہا ہے۔ [5]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٤٧) [2] تفسير الطبري (٤/ ١٦٨)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٣٣) مسند أحمد (٢/ ١٥٥) امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسناده صحيح" صحيح أبي داود (٥/ ٤١٤، ٤١٥) [4] تفسير الطبري (٤/ ١٦٨، ١٦٩) [5] فتح البيان (١/ ٤٠٦)

عرفات میں وقوف:

عرفہ اس جگہ کا نام ہے جہاں حج میں کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ کھڑا ہونا حج کا ایک بنیادی فعل ہے۔ عبدالرحمٰن دیلمی رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ حج عرفات ہے۔ جس نے فجر سے پہلے عرفہ میں ٹھہرنا پایا، اس نے حج پایا۔ ایام رمی کے تین دن ہیں، جس نے جلدی کی دو دن میں، اس پر کچھ گناہ نہیں، جس نے دیر کی اس پر بھی کچھ گناہ نہیں۔[1] (رواه أحمد) وقوف کا وقت زوال یومِ عرفہ سے لے کر یومِ نحر کے دوسرے دن کی فجر تک ہوتا ہے، کیوں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع میں نمازِ ظہر ادا کرنے کے بعد غروبِ آفتاب تک کھڑے رہے اور یہ فرمایا: « خُذُوْا عَنِّيْ مَنَاسِكَكُمْ »[2] یعنی تم اپنے حج کے طریقے مجھ سے سیکھ لو۔

یہ بات کہ جس نے عرفہ کو طلوعِ فجر سے پہلے پا لیا، اس نے حج پایا، یہ ائمہ ثلاثہ کا مذہب ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ وقوف کا وقت یومِ عرفہ کے اول سے شروع ہوتا ہے۔ ان کی دلیل حدیثِ عروہ رضی اللہ عنہ ہے کہ انھوں نے مزدلفہ میں نماز کے لیے نکلتے ہوئے دیکھ کر کہا: اے اللہ کے رسول! میں طی کے دو پہاڑوں سے اپنی سواری کو تھکا کر اپنی جان کو تکلیف دے کر آیا ہوں، واللہ! میں نے کوئی پہاڑ بغیر وقوف کے نہیں چھوڑا، میرا حج ہوا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہماری اس نماز میں حاضر ہوا، ہمارے ساتھ کھڑا رہا، یہاں تک کہ ہم چلیں اور اس سے پہلے عرفہ میں رات یا دن میں کھڑا ہو چکا ہو، اس کا حج پورا ہوا اور اس کا میل کچیل دور ہوا۔[3] (رواه أحمد و أهل السنن وصححه الترمذي)

عرفات کی وجہ تسمیہ:

عرفات کو عرفات اس لیے کہتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام نے ابراہیم علیہ السلام کو حج کرایا تو عرفہ میں پہنچ کر کہا کہ "عَرَفْتَ"، یعنی تو نے حج کرنے کا طریقہ پہچان لیا۔ یہ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ امام عطا رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ جبریل علیہ السلام جو بھی نسک ادا کرتے تو کہتے: "عَرَفْتَ، عَرَفْتَ"۔[4] کسی نے کہا ہے کہ یہاں آدم اور حوا علیہما السلام کا باہم تعارف ہوا تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ لوگوں کا آپس میں تعارف ہوتا ہے، اس لیے یہ نام ہوا اور کسی نے کہا ہے کہ یہ عرفات کا اصلی نام ہے۔ جو پہاڑ اس وادی کے درمیان میں ہے، اس کو جبلِ رحمت کہتے ہیں۔

---

(1) مسند أحمد (٤/ ٣٣٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣١٧٢)

(2) سنن البيهقي الكبرىٰ (٥/ ١٢٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٨٨٢)

(3) مسند أحمد (٤/ ١٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٩٥٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٩١) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٠٤١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٠١٦) امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسناده صحيح" صحيح أبي داود (٦/ ١٩٦)

(4) تفسير الطبري (٤/ ١٧٣، ١٧٤)

عرفات اور مزدلفے سے لوٹنے کا وقت:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جاہلیت والے عرفہ میں کھڑے رہتے۔ جب سورج پہاڑوں پر چمکتا، گویا پہاڑوں کے سر پر پگڑی ہے تو وہاں سے چلتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیر لگائی، جب سورج ڈوب گیا تو عرفہ سے چلے۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم) امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے اتنا زیادہ کیا ہے کہ پھر مزدلفے میں آ کر ٹھہرے اور صبح کی نماز پڑھی۔ جب ہر چیز سفید ہوگئی اور آخیر وقت ہوا تو وہاں سے روانہ ہوئے۔ اس اسناد کو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے حسن بتایا ہے۔[2]

مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرفات میں ہم کو خطبہ سنایا، اللہ کی حمد و ثنا کر کے اما بعد فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ پڑھتے اما بعد کہتے۔ اس خطبے میں یہ ارشاد فرمایا کہ آج کا دن بڑے حج کا دن ہے، تم سن رکھو کہ مشرک اور بت پرست آج کے دن یہاں سے سورج ڈوبنے سے پہلے، جبکہ سورج پہاڑوں کے سر پر ہوتا تھا، گویا عمائم رجال (لوگوں کی پگڑیاں) ہیں، تب چلتے تھے اور ہم غروبِ آفتاب کے بعد چلیں گے۔ وہ لوگ مشعرِ حرام سے سورج نکلنے کے بعد، جبکہ وہ پہاڑوں کے سر پر چمکتا تھا، گویا مردوں کے سروں پر عمامے بندھے ہیں، روانہ ہوتے تھے اور ہم طلوعِ آفتاب سے پہلے روانہ ہوں گے۔ ہمارا طریقہ اہلِ شرک کے طریقے کے خلاف ہے۔ (رواہ ابن مردویہ) حاکم نے کہا کہ یہ حدیث شرطِ شیخین پر صحیح ہے۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مسور رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سماع ثابت ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہی ہو اور اُن سے سماع نہ کیا ہو۔ جس طرح ہمارے بعض نادان لوگ وہم کرتے ہیں۔[4]

معلوم ہوا کہ سنتِ صحیحہ یہ ہے کہ عرفے سے غروبِ آفتاب کے بعد اور مزدلفہ سے طلوعِ آفتاب سے پہلے چلے، لیکن یہ سنت ایک مدت سے متروک ہے۔ اکثر لوگ اس کے خلاف جاہلیت کے طریقے کے مطابق عرفات سے غروبِ آفتاب سے پہلے اور مزدلفے سے آفتاب کے طلوع کے بعد چلتے ہیں، پھر مشعرِ حرام پر ٹھہر کر دعا نہیں کرتے، حالاں کہ اس جگہ ذکر کرنا نصِ قرآنی سے ثابت ہے۔ إِنَّا لِلّٰهِ...

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی طویل حدیث میں ہے کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم عرفات میں کھڑے رہے، یہاں تک کہ سورج ڈوب گیا اور کچھ زردی چھا گئی، پھر سورج کی ٹکیہ کے غائب ہونے کے بعد اُسامہ رضی اللہ عنہ کو اپنے پیچھے سوار کر کے چلے اور قصوا اونٹنی کی باگ یہاں تک کھینچی کہ پالان سے جا لگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے ہاتھ سے اشارہ فرماتے تھے کہ اے لوگو! آہستہ آہستہ چلو۔ جب پہاڑ پر آتے تو اونٹنی کی باگ ذرا ڈھیلی کر دیتے، تاکہ پہاڑ پر چڑھ جائے، یہاں تک کہ مزدلفہ پہنچ کر مغرب اور عشا کی نمازیں ایک اذان اور دو اقامت سے پڑھیں اور درمیان میں کوئی نوافل ادا نہیں

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (١/ ٣٥١) اس کی سند میں ''زمعۃ بن صالح'' ضعیف راوی ہے۔ [2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣١٦)

[3] مستدرك الحاکم (٣/ ٦٠١) المعجم الکبیر (٢٠/ ٢٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رجاله رجال الصحیح'' (مجمع الزوائد: ٣/ ٥٦٥)

[4] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣١٦)

کیے۔ پھر لیٹ گئے (آرام کیا) جب فجر ہوگئی تو ایک اذان اور اقامت کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی، پھر قصوا (اونٹنی کا نام) پر سوار ہو کر مشعر الحرام میں آئے۔ یہاں قبلہ رو ہو کر دعا، تکبیر اور تہلیل و توحید کرتے رہے، جب تک کہ خوب روشنی ہوگئی، آپ ﷺ کھڑے رہے، پھر سورج نکلنے سے پہلے آگے چلے۔[1] (رواہ مسلم) صحیحین میں اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ کسی نے ان سے پوچھا: نبیِ مکرم ﷺ کی سواری کی کیا چال تھی؟ کہا کہ درمیانی چال، جب کوئی کشادہ راہ پاتے تو ذرا تیز چلتے۔[2]

سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشعر الحرام کے پاس ذکر سے مراد یہی دو نمازیں ہیں۔[3] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مشعرِ حرام یہی سارا مزدلفہ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہی نے کہا کہ مشعر یہی پہاڑ ہے اور جو کچھ اس کے اردگرد ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو دیکھا کہ قزح پر ازدحام کرتے ہیں تو کہا کہ یہ ساری جگہ ہی تو مشعر ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ مشعر دونوں پہاڑوں کے درمیان میں ہے۔[4]

مشاعر ظاہری نشانات کو کہتے ہیں۔ مزدلفہ کا نام مشعر الحرام اس لیے ہوا کہ وہ حرم میں داخل ہے۔ سلف کے ایک گروہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے بعض اصحاب، جیسے: قفال اور ابن خزیمہ رحمہ اللہ کا یہ مذہب ہے کہ یہاں کا وقوف حج کا رکن ہے اور اس کے بغیر حج نہیں ہوتا، ان کی دلیل وہی عروہ رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے۔[5] دوسرا قول یہ ہے کہ واجب ہے نہ کہ رکن، البتہ ترک سے دم لازم آتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک قول یہی ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ مستحب ہے، واجب اور رکن نہیں اور ترک سے کوئی شے بھی لازم نہیں آتی۔ اس بارے میں اہلِ علم کے یہ تین اقوال ہیں۔[6] زید بن اسلم رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ سارا عرفہ موقف ہے۔ بطنِ عرنہ سے بلندی کی طرف سارا علاقہ، یعنی مزدلفہ وقوف کی جگہ ہے، سوائے مُحَسِّر (وادی کا نام) کے۔[7] یہ حدیث مرسل ہے۔ اہلِ علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ سنت یہ ہے کہ دونوں کام کرے، یعنی مزدلفہ میں نمازِ مغرب وعشا جمع کرے اور مَشْعَرِ حرام میں ذکر یا دعا اور تہلیل میں مشغول ہو۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تم کو سکھایا ہے، اسی طرح اس کو یاد کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے احسان و انعام سے آگاہ فرمایا ہے اور کہا ہے کہ اس نے تم کو وہی مشاعرِ حج بتائے اور سکھائے ہیں، جو ابراہیم خلیل علیہ السلام کرتے تھے۔ ورنہ تم اس کے بتانے سے پہلے یا اس قرآن کے نازل ہونے اور رسول اللہ ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے گمراہ تھے۔ یہ سب معنی ایک دوسرے کے قریب، لازم اور صحیح ہیں۔[8]

---

① صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١٨) ② صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٨٣) صحيح مسلم، رقم (١٢٨٦)

③ تفسير ابن أبي حاتم (١/ ٣٥١) تفسير ابن كثير (١/ ٣١٧) ④ تفسير الطبري (٤/ ١٧٦۔ ١٧٨)

⑤ اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ ⑥ تفسير ابن كثير (١/ ٣١٧)

⑦ تفسير الطبري (٤/ ١٧٩) یہ حدیث مرسل ہے۔ البتہ اس کی اصل صحیح مسلم (رقم الحدیث: ١٢١٨) میں ہے۔

⑧ تفسير ابن كثير (١/ ٣١٧)

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾

پھر جہاں سے سب لوگ لوٹیں وہیں سے تم بھی لوٹو اور اللہ سے بخشش مانگو، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے ﴿199﴾

عرفہ میں وقوف کا حکم اور اہلِ جاہلیت کی پیروی سے ممانعت:

یہ بھی کفر کی ایک غلطی تھی کہ مکہ کے رہنے والے عرفات تک نہیں جاتے تھے کہ عرفات حرم سے باہر ہے، بلکہ حرم کی حد پر کھڑے رہتے، لہٰذا فرمایا کہ جہاں سے سب لوگ چلیں، تم بھی چلو اور پہلے قصور پر تم کو نادم ہونا چاہیے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ گویا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ حکم دیا ہے کہ جو عرفہ میں کھڑا ہوا ہے، وہ مزدلفہ کو جائے۔ مشعرِ حرام کے پاس اللہ کا ذکر کرے۔ عرفات میں اس کا وقوف اسی جگہ ہو، جہاں سب کے سب کھڑے ہوں نہ کہ وہاں جہاں قریش کھڑے ہوتے تھے، زمینِ حرم کے کنارے پر اور زمین حل کے نزدیک اور کہتے تھے کہ ہم اللہ کے شہر والے اور اللہ کے گھر میں رہنے والے ہیں، اس وجہ سے عرفات میں نہیں جاتے۔

صحیح بخاری میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ قریش اور اُن کے ہم مذہب لوگ مزدلفہ میں کھڑے ہوتے۔ ان کو حمس کہتے تھے، جبکہ باقی سارے عرب عرفات میں آ کر وقوف کرتے، جب اسلام آیا تو اللہ تعالیٰ نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ تم عرفات میں جا کر وقوف کرو اور پھر وہاں سے قاعدے کے مطابق لوٹو۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، عطا، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم کا یہی قول ہے۔[2] اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے اور اس پر اجماع نقل کیا ہے۔[3] سیدنا جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرا اونٹ کھو گیا تھا۔ میں اس کی تلاش میں عرفات آیا، دیکھتا کیا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہیں۔ میں نے اپنے جی میں کہا کہ یہ تو حمس میں سے ہیں، اس جگہ کیسے کھڑے ہیں۔[4] (رواه أحمد والشيخان) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی بخاری کی روایت کا تقاضا ہے کہ اس جگہ چلنے سے مراد یہ ہے کہ مزدلفہ سے چل کر منیٰ میں کنکر مارنے کے لیے آؤ۔[5] امام ابن جریر رحمہ اللہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٤٨) تفسير ابن كثير (١/ ٣١٧، ٣١٨) [2] تفسير الطبري (٤/ ١٨٦، ١٨٧)

[3] تفسير الطبري (٤/ ١٩٠)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٨١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٢٠) مسند أحمد (٤/ ٨٠)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٤٩)

نے امام ضحاک رحمہ اللہ سے ذکر کیا ہے کہ اس جگہ لفظِ ناس سے مراد ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ کسی نے کہا کہ مراد امام ہیں۔ ابن جریر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اگر اجماع اس کے خلاف نہ ہوتا تو یہی قول زیادہ قابلِ ترجیح ٹھہرتا۔[1]

عبادات کی تکمیل کے بعد استغفار کا حکم اور کچھ استغفار کی دعائیں:

اللہ پاک نے اکثر عبادات کے پورا ہونے کے بعد اپنے ذکر کا حکم فرمایا ہے۔ صحیح مسلم میں آیا ہے کہ نبی مکرم ﷺ جب نماز سے فارغ ہوتے تو تین بار "أستغفر اللّٰه" کہتے۔[2] صحیحین میں ہے کہ آپ ﷺ نے نماز کے بعد تینتیس تینتیس بار تسبیح، تحمید اور تکبیر کہنے کی ترغیب دی ہے۔[3] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عباس بن مرداس سلمی رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے عرفہ کے دن تیسرے پہر اپنی اُمت کے لیے استغفار کی۔[4] بخاری میں شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ سید الاستغفار یہ ہے: « اَللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبِّيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ خَلَقْتَنِيْ وَأَنَا عَبْدُكَ... الخ » جس نے اس کو رات میں پڑھا، پھر اس رات مرگیا تو بہشت میں گیا، جس نے اس کو دن میں پڑھا، پھر مرگیا تو جنت میں داخل ہوا۔[5] صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے آیا ہے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی دعا سکھا دیں، جسے میں نماز میں پڑھا کروں؟ فرمایا: کہو: « اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ ظُلْمًا كَثِيْرًا وَّلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ فَاغْفِرْلِيْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِيْ إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ »[6] "اے اللہ! میں نے اپنی جان پر بہت ظلم کیا ہے اور تیرے سوا کوئی گناہوں کو نہیں بخشتا، پس مجھ پر اپنی خاص بخشش فرما اور رحم کر تحقیق تو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔"

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ استغفار میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔[7] یہ حدیثیں رسالہ "محو الحوبة بإيثار الاستغفار والتوبة" (نواب صاحب کی تالیف) میں لکھی ہیں۔ اسی طرح بہت سی حدیثیں اہلِ عرفہ کی مغفرت اور اُن پر نزولِ رحمت اور اجابتِ دعا میں آئی ہیں۔ اس جگہ استغفار کا حکم اس لیے ہوا کہ وہ رحمت برسنے اور قبولیتِ دعا کی جگہ ہے۔ نیز اللہ کی اجابتِ دعا کا موقع اور فرض عبادت کی جگہ ہے، یہاں سارے گناہوں کی معافی طلب کرے اور توبۂ نصوح کرے۔

---

① تفسير الطبري (٤/ ١٨٩، ١٩٠) ② صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩١)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٠٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٩٥، ٥٩٧)

④ تفسير الطبري (٤/ ١٩٢) اس کی سند میں "عبداللہ بن کنانہ" مجہول راوی ہے۔ مزید اس روایت پر علامہ احمد شاکر کا کلام دیکھیں۔

⑤ صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٤٧) ⑥ صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٠٥)

⑦ تفسير ابن كثير (١/ ٣١٨)

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾

پھر جب تم اپنے حج کے ارکان پورے کر چکو تو اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح تم اپنے باپ دادا کو یاد کیا کرتے تھے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر (اللہ کو یاد کرو) چناں چہ کچھ لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں دنیا ہی میں (سب کچھ) دے دے، ایسے شخص کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں (200) اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا (201) انہی لوگوں کے لیے ان کی کمائی کا حصہ ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے (202)

ارکانِ حج پورے کرنے کے بعد کثرتِ ذکر اور دنیا و آخرت کی بھلائی طلب کرنے کا حکم:

اس آیتِ شریفہ میں اللہ پاک نے یہ حکم دیا ہے کہ مناسک ادا کرنے کے بعد اور حج سے فارغ ہونے کے بعد کثرت سے اللہ کا ذکر کرو۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی جس طرح بچہ ابا ابا کہتا ہے، بار بار ماں باپ کو پکارتا ہے۔[1] اسی طرح تم حج ادا کرنے کے بعد اللہ کے ذکر میں گھسے رہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ لوگ جاہلیت کے زمانے میں موسمِ حج میں کھڑے ہوتے تو کوئی کہتا کہ میرا باپ بہت کھانا کھلاتا تھا، لوگوں کا بار اُٹھاتا تھا اور دیت دیتا تھا۔ ان لوگوں کو اپنے باپ دادا کے ذکر کے علاوہ اور کوئی ذکر نہیں سوجھتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری۔[2]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت بھی اسی طرف گئی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے ایک جماعت سے اسے روایت کیا ہے۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان کا نام لیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کے ذکر پر آمادہ کیا جائے۔[4] ﴿ اَوْ ﴾ ''بلکہ'' اس جگہ تحقیق اور تاکید کے لیے ہے نہ کہ شک کے لیے۔ پھر کثرتِ ذکر کے بعد یہ

---

[1] تفسير الطبري (٤/ ١٩٩)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٣٥٥۔ ٣٥٦) اس کی سند حسن ہے۔
[3] تفسير الطبري (٤/ ١٩٦۔ ١٩٨)
[4] تفسير ابن كثير (١/ ٣١٨، ٣١٩)

ارشاد فرمایا کہ دعا کرو کہ یہ جگہ قبولیت کا مقام ہے۔ نیز ان کی مذمت فرمائی، جو صرف دنیا طلب کرتے ہیں اور آخرت سے کچھ غرض نہیں رکھتے۔ اس مذمت میں نفرت دلائی ہے ان لوگوں کی مشابہت اختیار کرنے سے، جو اپنے آبا و اجداد کا ذکر کرتے تھے اور صرف دنیا طلب کرنے کی دعا کرتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ایک قوم اعراب کی موافقت میں ان کے کھڑے ہونے کی جگہ پر آ کر یوں کہتی کہ اے اللہ! اس سال کو پانی کا سال کر، سرسبزی اور کھیتی کا سال کر، اچھی پیداوار اور اچھی ولادت کا سال کر اور آخرت کا کچھ ذکر نہ کرتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری۔[1] اس میں ان لوگوں کی تعریف کی جو دنیا اور آخرت دونوں مانگتے ہیں۔

جامع دعا:

یہ دعا بہت ہی جامع ہے۔ اس میں ہر خیر شامل ہے اور اس میں ہر شر سے بچاؤ آ جاتا ہے۔ دنیا کی ہر خوبی اس میں شامل ہے۔ ہر دنیاوی مطلب، جیسے: تندرستی، گھر کی کشادگی، نیک بیوی، وسیع رزق، علمِ نافع، عملِ صالح، اچھی سواری اور اچھی شہرت وغیرہ امور، جن پر مفسرین کی عبارت مشتمل ہے، اس میں آ جاتے ہیں۔ ان عبارتوں میں کچھ تضاد نہیں، کیوں کہ سب حسنۂ دنیا میں شامل ہیں۔ رہا حسنۂ آخرت تو سب سے اعلیٰ جنت میں داخل ہونا، جنت میں بڑی پریشانیوں سے امن میں ہونا۔ نیز قیامت میں حساب کی آسانی وغیرہ امورِ صالحہ ہیں۔ رہی دوزخ سے نجات تو اس سلسلے میں یہ دعا کہ وہ امور جو نجات کا ذریعہ ہیں، ان کا آسان ہونا، جیسے: حرام کردہ چیزوں سے بچنے کے لیے، گناہوں سے بچنے کے لیے، اسی طرح شبہات اور حرام کاموں اور شہوات سے بچنے کی دعا کرنا ہے۔

امام قاسم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس کو شکر کرنے والا دل، ذکر کرنے والی زبان اور صبر کرنے والا جسم ملا، اس کو دنیا اور آخرت دونوں کی خوبی مل گئی اور وہ آگ کے عذاب سے بچ گیا۔[2] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اکثر اہلِ علم اسی بات پر ہیں کہ اس آیت میں دونوں جہانوں کی خوبی سے مراد دنیا اور آخرت کی نعمتیں ہیں، پھر کہا ہے کہ یہی قول صحیح ہے۔ کیوں کہ لفظِ حسنہ نکرہ ہے۔ نفی کے ذکر میں یہ سب کو شامل ہے۔[3] اسی لیے حدیث میں اس دعا کو پڑھنے کی ترغیب آئی ہے۔ بخاری نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس دعا کو پڑھا کرتے تھے: "اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا... الخ"[4] (آیت زیرِ تفسیر) امام احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام قتادہ رحمہ اللہ نے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کون سی دعا زیادہ مانگتے تھے؟ کہا: یہی دعا مانگتے تھے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی عادت یہ تھی کہ جب کوئی دعا کرتے تو اس دعا کو بھی ضرور اس کے ساتھ مانگتے۔ صحیح مسلم میں

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ۳۵۷) اس کی سند حسن ہے۔
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ۳۵۹)
[3] تفسیر القرطبي (۲/ ٤۳۲)
[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤۲٥۰)

بھی ایسے ہی آیا ہے۔[1] ابو طالوت رحمہ اللہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے پاس تھے۔ ثابت رحمہ اللہ نے کہا کہ تمھارے بھائی چاہتے ہیں کہ تم ان کے لیے دعا کرو، کہا: ''اَللّٰھُمَّ آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً... الخ'' ''اے ہمارے رب! ہم کو دنیا میں خوبی اور آخرت میں خوبی عطا کر اور ہم کو آتش کے عذاب سے بچا۔'' پھر ذرا باتیں کر کے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ثابت رحمہ اللہ نے کہا کہ تمھارے بھائی جاتے ہیں کہ اب ان کے لیے کچھ دعا کرو، کہا کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں ان پر مشکل ڈالوں، جب تم میں سے کسی کو دنیا اور آخرت کی خوبی مل گئی اور وہ آگ کے عذاب سے بچ گیا تو ساری خیر اس کو مل گئی، یعنی اب اور کیا چاہتے ہو؟![2]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کی عیادت کی، وہ سوکھ کر دُبلا ہوگیا تھا۔ فرمایا: کیا تو نے اللہ سے کچھ مانگا ہے یا مانگتا ہے؟ اس نے کہا کہ میں یہ کہتا تھا: ''اَللّٰھُمَّ مَا كُنْتَ مُعَاقِبِي بِهٖ فِي الْآخِرَةِ فَعَجِّلْهُ لِي فِي الدُّنْيَا'' یعنی اے اللہ! جو سزا تو مجھ کو آخرت میں دینا چاہتا ہے، وہ یہیں اس دنیا میں دے دے، آخرت کا مواخذہ نہ رکھ، جو کچھ عقاب ہونا ہو، وہ یہیں ہو جائے۔ فرمایا: سبحان اللہ! تجھ کو اس کے عقاب کی کہاں طاقت ہے، تو نے یہ کیوں نہ کہا: ﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً... الخ﴾ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس نے یہی دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو شفا بخشی۔[3] یہ حدیث صرف صحیح مسلم میں ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے سیدنا ابن ابی السائب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم رُکنِ بنی جمح (یمانی) اور رُکنِ اسود کے درمیان یہی دعا کرتے تھے۔[4] اسی جیسی امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے بھی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، مگر اس کی سند ضعیف ہے۔[5] ابن مردویہ میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ میں کسی رُکن پر نہیں گزرا، مگر میں نے وہاں ایک فرشتہ دیکھا جو آمین کہہ رہا ہے، لہٰذا جب تم وہاں سے گزرا کرو تو یہی دعا مانگا کرو۔[6] ایک شخص نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا تھا کہ میں نے ایک قوم سے جانوروں کی کچھ اُجرت طے کی کہ اتنی اُجرت پر دیتے ہیں، اگر وہ مجھ کو لاد کر لے چلیں تو میں اُن کے ہمراہ حج کروں گا اور اس میں سے اتنی اُجرت کم کروں گا، کیا یہ بات ٹھیک ہے یا نہیں؟ انھوں نے کہا کہ تو اُن لوگوں میں ہے جن کے حق میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے: ﴿أُولَٰئِكَ

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۶۹۰) مسند أحمد (۳/ ۱۰۱)
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ۳۵۹) اس کی سند صحیح ہے۔
[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۶۸۸)
[4] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۱۸۹۲) سنن النسائي الکبریٰ (۲/ ۴۰۳) مسند الشافعي (۱/ ۱۲۷) امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''حدیث حسن'' (صحیح أبي داود: ۶/ ۱۴۱۔ ۱۴۲)
[5] سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۲۹۵۷) اس روایت کی سند میں ''حمید بن ابی سویہ'' مجہول راوی ہے۔ (ضعیف الترغیب والترھیب: ۱/ ۱۸۱)
[6] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۳۲۰) اس کی سند میں ''عبداللہ بن ہرمز'' ضعیف راوی ہے۔

لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ’’انہی لوگوں کے لیے ان کی کمائی کا حصہ ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔‘‘ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث شرطِ شیخین پر ہے۔[1] اس آیت پر دوسرا نصف پارہ ختم ہوا۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ.

وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ
فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَن تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَاتَّقُوا
اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٢٠٣﴾

اور گنتی کے چند دنوں میں تم اللہ کو یاد کرو، پھر جس نے دو دِنوں (منیٰ سے مکے کی طرف واپسی) میں جلدی کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور جس نے (ایک دن کی) تاخیر کی تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں (بشرطیکہ) وہ تقویٰ اختیار کرے اور تم اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک تمھیں اسی کے حضور اکٹھا کیا جائے گا (203)

ایامِ تشریق میں ذکر:

ان آیتوں میں فرمایا کہ کفر کے وقت دستور تھا کہ اس وقت کے لوگ حج سے فارغ ہو کر عید کے بعد تین روز خوشی کرتے، بازار لگاتے اور باپ دادا کی بڑائی بیان کرتے۔ اب اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے تین دن ٹھہرنا مقرر کیا کہ اللہ کو ان دنوں میں یاد کرو۔ وہ دوپہر کو کنکریاں پھینکتے ہیں اور ہر نماز کے بعد تکبیر کہتے ہیں۔ نماز کے علاوہ ہر وقت بھی تکبیر کہتے ہیں۔ پھر اگر کوئی چاہے تو دوسرے دن رہ کر رخصت ہو جائے اور اگر تین دن رہے تو بہتر ہے۔ نیز فرمایا کہ جن کو صرف دنیا کی رغبت ہے، وہ آخرت سے محروم ہیں۔ اب حج کا ذکر مکمل ہو چکا۔

ایامِ تشریق کے آداب اور ان کی تعداد:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ایامِ معدودات سے ایامِ تشریق مراد ہیں[2] اور ایامِ معلومات سے ایامِ عشر۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی ایامِ تشریق میں فرض نماز کے بعد تکبیر کہو: ’’الله أكبر الله أكبر ... الخ‘‘[3] سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ یومِ عرفہ، یومِ نحر اور ایامِ تشریق ہم مسلمانوں کی عید ہے اور یہ کھانے پینے کے دن ہیں۔[4] (رواہ أحمد) سیدنا نبیشہ ہذلی رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت مروی ہے کہ ایامِ تشریق کھانے پینے اور اللہ کا

[1] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٠٥) امام حاکم اور ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔
[2] تفسير الطبري (٤/ ٢٠٩) اس کی سند حسن ہے۔

ذکر کرنے کے دن ہیں۔[1] (رواہ أحمد و مسلم) ان کی دوسری روایت یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ابن حذافہ رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ تم منیٰ میں پھر کر سب کو کہہ دو کہ روزہ نہ رکھیں کہ یہ دن کھانے پینے اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کے ہیں۔[2] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایامِ تشریق میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا اور کہا کہ یہ اَکْلٌ وشُرْب (کھانے پینے) اور اللہ کو یاد کرنے کے دن ہیں۔[3]

ایک روایت میں یوں مروی ہے کہ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے خچر پر سوار ہو کر شعبِ انصار پر آئے اور کہا کہ اے لوگو! یہ دن روزے کے نہیں ہیں، بلکہ کھانے پینے اور اللہ کا ذکر کرنے کے ہیں۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تشریق کے دن چار ہیں، ایک یومِ نحر اور تین دن اس کے بعد۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ تین دن ہیں، ایک نحر (قربانی) کا دن اور دو دن اس کے بعد۔ جس دن چاہو ذبح کرو اور افضل پہلا دن ہے۔[5] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ پہلا قول مشہور ہے، ظاہر آیتِ کریمہ بھی اسی پر دلیل ہے، کیوں کہ یہ فرمایا کہ جس نے جلدی کی دو دن میں، اس پر کچھ گناہ نہیں، جس نے دیر کی اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، اس میں نحر کے بعد تین دن کی دلیل ہے۔ اسی ذکر سے متعلق قربانی پر اللہ کا ذکر بھی ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ راجح مذہب شافعی کا ہے کہ قربانی کا وقت یومِ نحر سے آخر ایامِ تشریق تک ہوتا ہے۔ اسی ذکر سے وہ مقررہ ذکر بھی مراد ہے جو نمازوں کے بعد ہوتا ہے۔ نیز وہ عام ذکر جو سارے حالات میں کیا جاتا ہے۔ اس بارے میں علما کے کئی قول ہیں، زیادہ مشہور جس پر عمل ہے، وہ یہ ہے کہ یومِ عرفہ کو نمازِ فجر کے بعد نمازِ عصر ایامِ تشریق تک ذکر کرے، یہ تیسرے دن کوچ کرنے کا آخر ہے۔ اس میں دارقطنی رحمہ اللہ کے نزدیک ایک حدیث بھی آئی ہے، لیکن بہ طور مرفوع صحت کو نہیں پہنچی۔[6] ہاں سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ثابت ہوا ہے کہ وہ اپنے قبے میں تکبیر کہتے اور ان کی تکبیر پر بازار والے بھی تکبیر کہتے، یہاں تک کہ سارا منیٰ تکبیر سے گونج اُٹھتا۔[7] پھر ایامِ معدودات کے ذکر سے وہ ذکر بھی متعلق ہے جو ایامِ تشریق میں روزانہ کنکریاں مارتے وقت کیا جاتا ہے۔ امام ابو داود رحمہ اللہ وغیرہ

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۱۴۱) مسند أحمد (۵/ ۷۵)

[2] مسند أحمد (۲/ ۵۱۳) اس روایت کی سند میں ''صالح بن ابی الأخضر'' ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسیر الطبري (٤/ ۲۱۲) علامہ احمد شاکر نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

[4] تفسیر الطبري (٤/ ۲۱۳) مسند أحمد (۱/ ۹۲) اس کی سند حسن ہے۔

[5] تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ۳٦۰، ۳٦۱)

[6] سنن الدار قطني (۲/ ٤۹) اس کی سند میں ''جابر جعفی، عمرو بن شمر'' سخت ضعیف راوی ہیں۔

[7] صحیح البخاري (۱/ ۳۲۹) سنن البیهقي الکبریٰ (۳/ ۳۱۲)

کے نزدیک حدیث شریف میں آیا ہے کہ بیت اللہ کا طواف، سعی صفا و مروہ اور رمیِ جمار، اسی اللہ کے ذکر کو قائم کرنے کے لیے ہیں۔[1] پھر جب اللہ تعالیٰ نے موسمِ حج میں لوگوں کے متفرق ہو کر پہلی اور دوسری بار نکلنے کا اور زمین کے اطراف سے آ کر مشاعرِ حج اور مواقفِ حج کا بیان فرما دیا تو پھر ارشاد کیا کہ تم ڈرو اور جان لو کہ جس نے تم کو زمین میں پھیلایا ہے، تم اسی کے پاس اکٹھے ہو گے۔[2]

ایامِ معدودات سے مراد:

فتح البیان میں اس طرح ہے کہ قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علما کے درمیان اس بات میں اختلاف نہیں ہے کہ اس آیت میں ایامِ معدودات سے مراد یہی ایامِ منیٰ ہیں، جن کو ایامِ تشریق کہتے ہیں۔[3] یہ تین دن ہیں۔ انھیں دنوں میں کنکریاں مارتے ہیں۔ پہلا دن گیارھویں ذی الحجہ کا ہے۔ اس طرف امام شافعی رحمہ اللہ، سیدنا عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، حسن، عطا، مجاہد اور قتادہ رحمہم اللہ گئے ہیں۔ امام ابراہیم رحمہ اللہ نے کہا کہ ایامِ معدودات سے مراد ایامِ عشر اور ایامِ معلومات سے مراد ایامِ نحر ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ صحیح نہیں، کیوں کہ اگلی بات پر ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اجماع نقل کیا ہے۔[4] امام ابو یوسف اور محمد رحمہما اللہ نے ایامِ معلومات ایامِ نحر کو قرار دیا ہے۔ ایک قربانی کا دن اور دو دن اس کے بعد، گویا ان کے نزدیک معلومات اور معدودات میں کچھ فرق نہیں ہے، کیوں کہ قرآن پاک میں بغیر اختلاف کے معدودات سے وہی ایامِ تشریق مراد ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چار دن، ایک دن نحر کا اور تین دن اس کے بعد، ان سب کو شامل ہیں، کیوں کہ یومِ نحر معلوم ہے، معدود نہیں۔

اس کے بعد جو دو دن ہیں وہ معلوم و معدود ہیں اور چوتھا دن معدود ہے نہ کہ معلوم۔ پھر جس نے تکبیر کا وقت عرفہ کی صبح سے لے کر ایامِ تشریق کے آخر تک بتایا ہے، اس کے حساب سے تیئیس نمازیں ہوتی ہیں۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، مکحول، ابو یوسف اور محمد رحمہما اللہ کا یہی قول ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ عرفے کی صبح سے لے کر قربانی کے آخری دن کی نمازِ عصر۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ اسی طرف گئے ہیں۔ اس حساب سے آٹھ نمازیں ہوتی ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ یومِ نحر کو ظہر سے لے آخر تک ایامِ تشریق تک۔ امام مالک اور شافعی رحمہما اللہ اسی کے قائل ہیں۔ اس حساب سے پندرہ نمازیں ہوتی ہیں، سیدنا ابن عباس اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک تکبیر کے لفظ اللہ اکبر کو تین بار یکساں کہے۔ اہلِ عراق کے نزدیک دو ہی بار کہے۔ آیتِ کریمہ سے ثابت ہوا کہ عجلت اور تاخیر دونوں جائز ہیں، یہ عجلت اور تاخیر کرنے کا اختیار اور اس پر کوئی گناہ نہ ہونا، اس شخص کے لیے ہے جو متقی ہے، کیوں کہ تقویٰ والا ہی ہر شک و شبہے کی چیز سے بچتا ہے، اس لیے اس حکم کی تخصیص کا مستحق وہی ٹھہرے گا۔[5]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۸۸۸) اس کی سند میں ''عبیداللہ بن زیاد'' متکلم فیہ راوی ہے۔ [2] تفسير ابن كثير (۱/ ۳۲۱)

[3] تفسير القرطبي (۳/ ۱) [4] تفسير القرطبي (۳/ ۱) [5] فتح القدير (۱/ ۳۶۶، ۳۶۷) فتح البيان (۱/ ۴۱۲۔ ۴۱۴)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى
مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ
لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا
قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ
الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ
رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

اور (اے نبی!) لوگوں میں کوئی تو ایسا ہے کہ آپ کو اس کی بات دنیا کی زندگی میں بہت بھلی لگتی ہے اور جو کچھ اس کے دل میں ہے اس پر وہ اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہے، حالاں کہ وہ سخت جھگڑالو ہے (204) اور جب وہ پلٹتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے، کھیتوں اور نسل کو تباہ کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا (205) اور جب اس سے کہا جاتا ہے: تو اللہ سے ڈر، تو اس کا غرور اسے گناہ پر اُبھارتا ہے، چناں چہ ایسے شخص کے لیے جہنم کافی ہے اور یقیناً وہ برا ٹھکانا ہے (206) اور لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو (اس کے ہاتھ) بیچ ڈالتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر بہت شفیق ہے (207)

منافقوں کی حالت کا بیان:

یہ حال منافق کا ہے کہ ظاہر میں خوشامد کرتا اور اللہ کو گواہ بناتا ہے کہ میرے دل میں تمھاری محبت ہے، لیکن جھگڑے کے وقت کچھ کمی نہیں کرتا۔ اگر طاقت میسر آئے تو لوٹ مار مچاتا ہے اور ضد میں آکر گناہ میں اضافہ کرتا ہے۔ ایک شخص اخنس بن شریق تھا۔ اس نے نبی اکرم ﷺ سے اسی قسم کے سلوک کیے تھے۔ اس کے بعد صاحبِ ایمان کا حال بیان کیا کہ اللہ کی رضا پر اپنی جان تک دے دیتا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اخنس بن شریق ثقفی کے حق میں اُتری ہے۔ وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا اور اسلام ظاہر کیا، لیکن باطن میں مخالف تھا۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ آیت منافقین کے چند لوگوں کے حق میں اُتری ہے کہ جنھوں نے خبیب رضی اللہ عنہ اور اِن کے ساتھیوں کے بارے میں گفتگو کی تھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی اور خبیب رضی اللہ عنہ اور اِن کے ساتھیوں کی تعریف فرمائی۔[2] کسی نے کہا ہے کہ نہیں، بلکہ یہ آیت سارے منافقین اور سارے مومنین کے حق

[1] تفسیر الطبري (٤/ ٢٢٩۔ ٢٣٠) [2] تفسیر الطبري (٤/ ٢٣٠۔ ٢٣١) تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٣٦٣) اس کی سند حسن ہے۔

میں ہے۔ امام مجاہد، قتادہ اور ربیع رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم کا یہی قول ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو صحیح کہا ہے۔[1] یعنی لفظ کی عمومیت، خصوصیتِ سبب سے زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔

ابن جریر رحمہ اللہ نے نوف بکالی رحمہ اللہ، جو اہلِ کتاب میں سے تھے، سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا: میں اس اُمت کے کچھ لوگوں کا حال اللہ کی اُتاری ہوئی کتاب میں پاتا ہوں۔ وہ حال یہ ہے کہ ایک قوم ایسی ہوگی جو دنیا پر دین کا دعویٰ کرے گی۔ ان کی زبان شہد سے میٹھی ہوگی اور دل ایلوے سے کڑوے ہوں گے۔ لوگوں کو دکھانے کے لیے بکریوں کا پوست پہنے ہوں گے، مگر دل بھیڑیوں جیسے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کہے گا: کیا یہ مجھ پر جرأت کرتے ہیں یا مجھ پر مغرور ہیں؟ میں نے اپنی جان کی قسم کھائی ہے کہ ان پر ایسا فتنہ برپا کروں گا کہ جس میں بردبار آدمی بھی حیران ہو کر رہ جائے گا۔ قرظی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے قرآن میں تدبر کیا، دیکھا تو ایسی قوم یہی منافقین ہیں۔ وہ آیت جس میں ان کا حال پایا، یہی آیت زیرِ تفسیر ہے۔

سعید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض کتب میں مروی ہے کہ اللہ کے بعض بندے ایسے ہیں جن کی زبان شہد سے زیادہ میٹھی اور دل ایلوے سے زیادہ کڑوے ہیں... الخ۔ قرظی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات کتاب اللہ میں ہے۔ سعید رحمہ اللہ نے کہا کہ کہاں ہے؟ کہا کہ اس آیت میں: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ۝۲۰۴ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ”اور (اے نبی!) لوگوں میں کوئی تو ایسا ہے کہ آپ کو اس کی بات دنیا کی زندگی میں بہت بھلی لگتی ہے اور جو کچھ اس کے دل میں ہے اس پر وہ اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہے، حالاں کہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔“ امام سعید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں جانتا ہوں جس کے حق میں یہ آیت اُتری ہے۔ امام قرظی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہاں آیت ایک آدمی کے حق میں اُتری تھی، مگر پھر وہ عام ہے، یعنی خصوصیتِ سبب کا اعتبار نہیں ہوتا، لفظ کی عمومیت بہتر ہوتی ہے۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ قرظی رحمہ اللہ کا یہ کہنا بہت اچھا اور درست ہے۔[3]

﴿ يُشْهِدُ اللّٰهَ ﴾ کا معنی:

﴿ يُشْهِدُ اللّٰهَ ﴾ کے لفظ کو دو طرح سے پڑھا گیا ہے؛ ایک یائے تحتیہ پر زبر اور اللہ کے اسم مبارک پر پیش ”يَشْهَدُ اللّٰهُ“، اس کے یہ معنی ہیں کہ اگرچہ وہ آدمی تمھارے سامنے میٹھی میٹھی باتیں بناتا ہے، لیکن اللہ کو معلوم ہے کہ اس کے دل میں بدی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ۝۱ ﴾ [المنافقون: ۱] ”(اے نبی!) جب

[1] تفسير ابن كثير (١/ ٣٢٢) [2] تفسير الطبري (٤/ ٢٣٢) [3] تفسير ابن كثير (١/ ٣٢٢)

منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو وہ کہتے ہیں: ہم شہادت دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک آپ اس کے رسول ہیں۔ اور اللہ شہادت دیتا ہے کہ یقیناً منافق البتہ جھوٹے ہیں۔''

دوسری قراءت بضم یائے تحتیہ اور اسم مبارک اللہ پر زبر کے ساتھ ہے۔ ﴿ يُشْهِدُ اللّٰهَ ﴾ جمہور کی قراءت یہی ہے، اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ لوگوں پر تو اسلام ظاہر کرتا ہے، مگر دل کے کفر و نفاق سے اللہ تعالیٰ کا مقابلہ کرتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴾ [النساء: ۱۰۸] ''وہ لوگوں سے (تو اپنی حرکتیں) چھپا سکتے ہیں، مگر اللہ سے نہیں چھپا سکتے اور وہ اس وقت بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ رات کو چھپ کر ایسا مشورہ کرتے ہیں جو اللہ کو پسند نہیں اور وہ جو بھی عمل کرتے ہیں اللہ اسے گھیرے ہوئے ہے۔'' یہی معنی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کیے ہیں۔[1] تیسرے معنی یہ ہیں کہ جب لوگوں پر اسلام کا اظہار کرتا ہے تو قسم کھاتا ہے کہ اللہ اس پر گواہ ہے کہ اس کا دل اس کی زبان کے موافق ہے۔ یہ معنی بھی صحیح ہیں۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، ابن زید اور مجاہد رحمہ اللہ وغیرہما اسی طرف گئے ہیں۔[2] ٹیڑھی طبیعت والے کو ''اَلَدّ'' کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴾ [مریم: ۹۷] ''اور اس کے ساتھ جھگڑالو قوم کو ڈرائیں۔''

یہی منافق کا حال ہے کہ جھگڑا کرتے وقت جھوٹ بولتا ہے۔ سیدھی بات پر جمتا نہیں۔ بہتان طرازی کرتا ہے اور واہی تباہی باتیں بناتا ہے۔ جس طرح صحیحین میں مرفوعاً مروی ہے کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب عہد کرے تو توڑ ڈالے اور جب جھگڑا کرے تو گالی گلوچ بکے۔[3] صحیح بخاری میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس شخص سے بڑی دشمنی ہے، جو ٹیڑھی طبیعت کا اور جھگڑالو ہے۔ اس کو عبدالرزاق نے بھی روایت کیا ہے۔[4]

''سعی'' سے اس جگہ قصد مراد ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ﴾ [النازعات: ۲۲] ''پھر وہ پلٹا (فساد کی) کوشش کرتا ہوا۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ [الجمعة: ۹] ''تو تم اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو۔'' کیوں کہ سنتِ صحیحہ میں نماز کے لیے حسی سعی (ظاہری دوڑنے) کی ممانعت آئی ہے۔ فرمایا کہ جب تم نماز کے لیے آؤ تو دوڑتے ہوئے نہ آؤ، آہستہ آہستہ آؤ اور وقار سے آؤ۔[5] منافق کا ارادہ یہی ہوتا ہے کہ زمین

---

[1] تفسير الطبري (٤/ ٢٣٠) [2] تفسير الطبري (٤/ ٢٣٣، ٢٣٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٨)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٢٥) تفسير الصنعاني (١/ ٨١)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٠٢)

میں فساد کرے، کھیتی کو، پھلوں کو اور نسل کو ہلاک کرے۔ غرض کہ قول وہ ہے، فعل یہ ہے۔ اور امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زمین میں فساد کرنے سے اللہ پانی نہیں برساتا۔ ①

منافق نصیحت کو قبول نہیں کرتا:

اللہ تعالیٰ اس صفت کے آدمی کو دوست نہیں رکھتا۔ پھر جب ایسے فاجر و فاسق کو وعظ کرو اور اللہ کا ڈر بتاؤ تو اپنی عزت کے گھمنڈ میں آ کر ضد سے اور زیادہ گناہ کرنے لگتا ہے۔ یہ آیت اس آیت سے ملتی جلتی ہے: ﴿ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴾ [الحج: ۷۲] ''اور جب ان پر ہماری کھلی آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں، تو آپ ان کافروں کے چہروں پر ناگواری پہچانتے ہیں، لگتا ہے کہ وہ ان لوگوں پر حملہ کر دیں گے جو ان پر ہماری آیتیں پڑھتے ہیں، کہہ دیجیے: کیا پھر میں تمھیں اس سے زیادہ بدتر کی خبر دوں؟ (وہ) آگ ہے، جس کا اللہ نے کافروں سے وعدہ کر رکھا ہے، اور بری ہے وہ لوٹنے کی جگہ۔'' اسی لیے آیت زیرِ تفسیر میں فرمایا ہے کہ کافی ہے اس کو جہنم اور وہ بُرا بچھونا ہے۔

مخلص مومن کی صفت اللہ کی رضا جوئی کو ترجیح:

سیدنا عبداللہ بن عباس، انس رضی اللہ عنہم، ابن المسیب، ابو عثمان نہدی اور عکرمہ رحمہم اللہ اور اہلِ علم کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ یہ آیت: ﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''اور لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو (اس کے ہاتھ) بیچ ڈالتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر بہت شفیق ہے۔'' سیدنا صہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی۔ یہ مکہ میں مسلمان ہوگئے تھے۔ انھوں نے چاہا کہ ہجرت کریں۔ لوگوں نے کہا کہ تم اپنا مال لے کر نہیں جا سکتے۔ مال چھوڑ جانا ہو تو چلے جاؤ۔ انھوں نے مال چھوڑ کر ہجرت کی اور سارا مال روکنے والوں کو دے دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے ان کو مدینہ کے سنگستان (پتھریلا علاقہ) پر آ کر لیا اور کہا کہ تمھاری تجارت میں نفع ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمھاری تجارت میں بھی نقصان نہ دے، بات کیا ہے؟ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت تمھارے لیے اُتاری ہے۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « رَبِحَ بَيْعُ صُهَيْبٍ » ''صہیب کی تجارت میں نفع ہوا۔'' ابن مردویہ رحمہ اللہ نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ دو دفعہ فرمائے: « رَبِحَ صُهَيْبٌ رَبِحَ صُهَيْبٌ » ② حافظ رحمہ اللہ نے کیا اچھا کہا ہے:

① تفسیر الطبري (٤/ ٢٤٠) ② تفسیر الطبري (٤/ ٢٤٨) تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٢٣، ٣٢٤)

حسن زبصرہ بلال زحبش صہیب ز روم زخاک مکہ ابوجہل این چہ بو العجبیست

''بصرے سے حسن، حبشے سے بلال اور روم سے صہیب (مسلمان ہوئے) مکہ کی سرزمین سے ابوجہل (مسلمان نہ ہوا) یہ کتنی عجیب بات ہے؟''

اکثر اہلِ علم کہتے ہیں کہ یہ آیت اللہ کے راستے کے ہر مجاہد کے حق میں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ١ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ١۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ١ؕ وَ مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ١ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۝ ﴾ [التوبة: ۱۱۱] ''بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے بدلے میں خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، پھر وہ قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، یہ اللہ کے ذمے سچا وعدہ ہے تورات اور انجیل اور قرآن میں اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے؟ لہٰذا تم اپنے اس سودے پر خوش ہو جاؤ جو تم نے اس (اللہ) سے کیا، اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔'' ہشام بن عامر رضی اللہ عنہ نے کفار کی دو صفوں کے درمیان حملہ کیا تھا، بعض لوگوں نے ان پر انکار کیا، سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ وغیرہما نے ان پر رد کیا اور یہ آیت پڑھی: ﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''اور لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو (اس کے ہاتھ) بیچ ڈالتا ہے۔''[1]

فتح البیان میں ہے کہ مومنین کے ذکر کے بعد منافقین کا ذکر فرمایا۔ جو شخص دل میں کفر اور نفاق اور کذب کو چھپائے ہوئے ہے اور زبان سے اپنے ضمیر میں چھپائی ہوئی چیزوں کے خلاف اظہار کرتا ہے، وہ اس آیت میں داخل ہے۔ اَلَدُّ الْخِصَام وہ شخص ہے جو باطل کے لیے سخت جھگڑالو، زبان کا جھوٹا اور نافرمانی میں سخت دل، بات دانائی کی کرتا ہے، مگر کام بُرا کرتا ہے۔ سعی سے یا تو یہ مراد ہے کہ فساد کے لیے ڈورتا ہے، جیسے: راہزنی کرنا، قطع رحمی کرنا، مسلمانوں سے لڑنا، خون ریزی کرنا یا یہ مراد ہے کہ فساد کا کام کرتا ہے، گو پاؤں سے نہ دوڑے، مثلاً: ایسی تدبیر کرتا ہے جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے، ہر کام جس کو انسان اعضا یا حواس سے کرتا ہے، اس کو سعی کہتے ہیں۔ آیتِ شریفہ سے یہی معنی ظاہر ہوتے ہیں کہ فساد کا لفظ خون ریزی اور غارت گری سب کو شامل ہے۔ حرث سے مراد کھیتی ہے، نسل سے مراد اولاد ہے۔ یا حرث سے مراد عورتیں ہیں اور نسل سے مراد مرد۔ لفظ ﴿ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴾ سے معتزلہ نے اس بات پر دلیل پکڑی ہے کہ محبت ارادے سے عبارت ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ارادہ اور چیز ہے، محبت اور چیز ہے، کبھی آدمی ایک شے کا ارادہ کرتا ہے، مگر اس کو پسند نہیں کرتا، جیسے: کڑوی دوا کہ اس کو پی لیتا ہے، مگر پسند نہیں کرتا۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ

[1] تفسير الطبري (٤/ ٢٤٩)

نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے مسلمان بھائی سے کہے کہ اللہ سے ڈر، وہ کہے تم ڈرو، مجھ کو کیا کہتے ہو۔[1] ایک شخص نے مالک بن مغول سے کہا تھا: اللہ سے ڈر، انھوں نے اپنا رخسار زمین پر خاکساری کے طور پر رکھ دیا، یعنی اسی وقت اس پر عمل پیرا ہو گئے۔[2]

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۲۰۸ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۰۹

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور تم شیطان کے قدموں کی پیروی مت کرو، بے شک شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے (208) پھر اگر تمھارے پاس واضح دلائل آ جانے کے بعد تم پھسل جاؤ تو جان لو کہ بے شک اللہ غالب خوب حکمت والا ہے (209)

پورے اسلام کو لینا لازم ہے:

اس آیتِ کریمہ میں اللہ پاک نے مومنین کو یہ حکم دیا ہے کہ تم پورے اسلام، یعنی شریعت پر چلو، جہاں تک ہو سکے سارے احکام بجا لاؤ اور تمام ممنوعہ چیزوں سے بچو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، طاؤس، ضحاک، عکرمہ، قتادہ، سدی اور ابن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ ''سِلم'' سے اسلام مراد ہے۔[3] امام ابو العالیہ اور ربیع رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اطاعت مراد ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موادعت (صلح پسندی) مراد ہے۔[4] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ آیت چند یہودیوں کے حق میں اُتری ہے، جو مسلمان ہو گئے ہیں، جیسے: عبداللہ بن سلام، اسد بن عبید اور ثعلبہ رضی اللہ عنہم۔ ایک گروہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ اجازت چاہی کہ وہ سنیچر (ہفتے کے دن کو) مانیں اور رات کو تورات پڑھا کریں، اللہ تعالیٰ نے کہا کہ بلکہ شعائرِ اسلام کو قائم کرو اور اسلام کے سوا کسی چیز میں مشغول نہ ہو۔[5]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مومنینِ اہلِ کتاب مراد ہیں۔ یہ لوگ ایمان لانے کے باوجود بعض اُمور میں تورات کو پکڑے ہوئے تھے۔ ان کو حکم ہوا کہ تم دینِ اسلام کو پکڑو، اسلام کی کوئی شے نہ چھوڑو، تورات پر فقط تمھارا ایمان لانا کافی ہے۔[6]

---

[1] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٢١٣) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٩٣٩)

[2] المعجم الصغير (١/ ١٤٦) شعب الإيمان (٦/ ٣٠١) فتح البيان (١/ ٤١٥، ٤١٧)

[3] تفسير الطبري (٤/ ٢٥٢) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٣٧٠) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٣٧٠)

[5] تفسير الطبري (٤/ ٢٥٥، ٢٥٦) تفسير ابن كثير (١/ ٣٢٤)

[6] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٣٦٩، ٣٧٠) اس کی سند میں ''محمد بن عون'' ضعیف راوی ہے۔

شیطان کی پیروی سے ممانعت:

شیطان کی چال پر نہ چلو، وہ تو جب بھی حکم کرے گا، برائی اور بے حیائی ہی کا کام بتائے گا، اس کا گروہ تم کو دوزخی بنانا چاہتا ہے۔ امام مطرف رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے اللہ کے بندوں کے لیے سب سے زیادہ دغا باز یہی شیطان ہے۔[1] آیت میں ان لوگوں کے لیے سخت وعید ہے جن کے دل میں شک اور نفاق ہے یا وہ دین میں کوئی شبہہ رکھتے ہیں۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿٢١٠﴾

کیا اب وہ اس انتظار میں ہیں کہ اللہ بادلوں کے سائے میں ان کے سامنے چلا آئے اور فرشتے بھی اور (ان کے) معاملے کا فیصلہ ہی کر ڈالا جائے؟ آخر سارے معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں (210)

ایمان میں تاخیر نہ کرنے کی ترغیب:

یعنی پیغمبر اور قرآن پر یقین نہیں لاتے تو اَب منتظر ہیں کہ اللہ آپ آئے اور ہر کسی کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے۔ اس آیتِ شریفہ میں اللہ نے منکرینِ رسول اللہ ﷺ کو دھمکایا ہے کہ کیا یہ لوگ چاہتے ہیں کہ قیامت قائم ہو اور اللہ سب اولین اور آخرین کا فیصلہ کرے اور ہر عملِ خیر و شر کی جزا و سزا دے؟ جس طرح دوسری آیت میں فرمایا: ﴿ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ﴾ [الأنعام: ١٥٨] ''کیا وہ صرف اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں، یا آپ کا رب آئے، یا آپ کے رب کی بعض نشانیاں آئیں؟

ابن جریر رحمہ اللہ نے اس جگہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صور والی طویل حدیث نقل کی ہے۔ یہ حدیث مرفوع اور مشہور ہے۔ بہت سے اَصحابِ مسانید وغیرہم نے اس کو روایت کیا ہے۔[2]

قیامت کے روز اَبر کے سائے میں اللہ کا اترنا:

اس میں یہ مضمون ہے کہ لوگ جب موقف میں کھڑے کھڑے تنگ ہو جائیں گے تو انبیا کو اللہ کی جناب میں

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٣٧١)

[2] تفسیر الطبري (٤/ ٢٦٦۔ ٢٦٧) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے، جس کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے علامہ احمد شاکر کا مفصل کلام دیکھیں۔

سفارش کے لیے لانا چاہیں گے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک ایک ایک سے سفارش کی درخواست کریں گے۔ ہر ایک نبی پہلو تہی کرے گا، یہاں تک کہ نوبت نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک آ پہنچے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے کہ ہاں ہاں، میں شفاعت کروں گا۔ پھر جا کر عرش کے نیچے سجدہ کریں گے اور اللہ سے عرض کریں گے کہ فیصلے کرنے کے لیے آنا چاہیے، اللہ پاک اس سفارش کو منظور فرما کر ابر کے سائبانوں میں آئے گا۔ یہ آنا آسمانِ دنیا کے پھٹ جانے کے بعد ہوگا۔ پھر پہلے آسمانِ دنیا کے فرشتے، پھر دوسرے تیسرے اور ساتوں آسمانوں تک کے فرشتے نازل ہوں گے، عرش اُترے گا، فرشتے اُتریں گے اور تسبیح کرتے ہوئے یوں کہیں گے: «سُبْحَانَ ذِي الْمُلْكِ وَالْمَلَكُوتِ، سُبْحَانَ ذِي الْعِزَّةِ وَالْجَبَرُوتِ، سُبْحَانَ الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ، سُبْحَانَ ذِي السُّلْطَانِ وَالْعَظَمَةِ، سُبْحَانَهُ سُبْحَانَهُ أَبَداً أَبَداً» ”پاک ہے وہ ذات صاحبِ ملک وملکوت، پاک ہے وہ ذات صاحبِ عزت وغلبہ، پاک ہے وہ زندہ جو نہیں مرتا، پاک ہے وہ ذات صاحبِ سلطنت وعظمت، پاک ہے وہ پاک ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ۔“

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے اس جگہ کچھ ایسی احادیث لکھی ہیں، جن میں غرابت ہے۔ ازاں جملہ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک یہ مرفوع حدیث ہے کہ اللہ اولین اور آخرین کو قیامت کے روز وقتِ مقرر پر جمع کرے گا۔ وہ سب کھڑے ہوئے، آنکھیں پھاڑے ہوئے آسمان کو دیکھتے ہوں گے، معاملوں میں فیصلے کے منتظر ہوں گے کہ اتنے میں اللہ ابر کے سائے میں عرش سے کرسی پر اُترے گا۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب اللہ اُترے گا تو خالق ومخلوق کے درمیان ستر ہزار پردے ہوں گے۔ کچھ نور کے، کچھ اندھیرے کے، کچھ پانی کے۔ اس تاریکی میں پانی کی آواز سے دل ہل جائیں گے۔[2] (رواه ابن أبي حاتم)

زہیر بن محمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس ابر کے سائبان میں یاقوت، جواہر اور زبرجد جڑے ہوں گے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ دنیا کا سا ابر نہیں ہوگا، اس طرح کا ابر کبھی نہیں ہوا، مگر بنی اسرائیل پر ہوا تھا کہ جب وہ میدانِ تیہ میں سرگرداں تھے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ فرشتے ابر کے سائبان میں آئیں گے، اللہ تعالیٰ جس شے میں چاہے گا، آئے گا۔ بعض قراءات میں اس طرح آیا ہے: ”إِلَّآ أَنْ يَّأْتِيَهُمُ اللّٰهُ وَالْمَلَائِكَةُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ“ اسی طرح کی یہ آیت ہے: ﴿وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا﴾ [الفرقان: ٢٥][3] ”اور جس دن آسمان بادلوں کے ساتھ پھٹ جائے گا اور فرشتے لگا تار اُتارے جائیں گے۔“

---

[1] المعجم الكبير (٩/ ٣٥٧) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٢٢٧)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٣٧٢) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ سلمہ بن دینار ابو حازم رحمہ اللہ کا سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے سماع ثابت نہیں ہے۔

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٣٧٣)

آیاتِ صفات کے بارے میں دو موقف:

یہ آیتِ شریفہ آیاتِ صفات میں سے ہے۔ اس بارے میں علما کے دو مذہب ہیں: ایک ایمان، تسلیم اور ظاہر صورت کے مطابق اعتقاد کا واجب ہونا اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو مشابہت، مثال دینے، تحریف، تبدیلی اور معطّل سے پاک سمجھنا۔ سلفِ امت اور ائمہ ملت اسی طرف گئے ہیں۔ کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی تفسیر نہیں کی جاتی۔ امام ابن عیینہ، زہری، اوزاعی، مالک، ابن مبارک، لیث، امام احمد اور ابن راہویہ رحمہم اللہ کا یہ قول ہے کہ آیاتِ صفات کو جس طرح آئی ہیں، اسی طرح بغیر کسی کیفیت، تشبیہ اور تاویل و تعطیل کے جاری کرنا چاہیے۔ اہلِ سنت کے تمام اَعلام (بڑے بڑے علمائے کرام) اسی کے معتقد ہیں۔

دوسرا مذہب یہ ہے کہ ہر مقام کی مناسبت سے ایسی تاویل کرنی چاہیے، جس سے باری تعالیٰ کی پاکیزگی ثابت ہو۔ جمہور علمائے متکلمین اور اَصحابِ نظر کا یہی مسلک ہے۔ مثلاً: آیت زیرِ تفسیر کے بارے میں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے آنے سے اللہ کی آیات یا امر یا عذاب کا آنا مراد ہے۔ لیکن یہ مذہب سلفِ امت اور ائمہ ملت کے مذہب کے خلاف ہے، اس کی وضاحت رسالہ ''انتقادِ رجیح'' اور رسالہ ''فتح الباب'' میں کی گئی ہے۔[1] جب ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ﴾ [الشوریٰ: ۱۱] صحیح اعتقاد ٹھہرا تو اب کسی تشبیہ اور تمثیل کا لازم آنا ظاہر عبارت میں کوئی نقصان نہیں کرسکتا۔ یہ اجمالی کلمہ، تشبیہ و تمثیل کے توڑ کے لیے کافی اور شافی ہے۔ اس عقیدے کی نفی میں یہ کلمہ: ﴿ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ ﴾ [طٰهٰ: ۵] ''وہ رحمٰن ہے، عرش پر مستوی ہے۔'' ہی کافی ہے۔

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ ؕ وَمَنْ يُّبَدِّلْ
نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۲۱۱ زُيِّنَ
لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ
وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ
حِسَابٍ ۝۲۱۲

پوچھیے بنی اسرائیل سے! ہم نے انھیں کتنی واضح نشانیاں دیں اور جو کوئی اللہ کی نعمت پا لینے کے بعد اسے بدل دیتا ہے تو بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے (211) جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لیے دنیا کی زندگی سجا دی گئی ہے اور وہ ان لوگوں سے مذاق کرتے ہیں جو ایمان لائے ہیں

[1] یہ دونوں رسالے نواب صاحب ہی کے تالیف کردہ ہیں۔

اور جو لوگ متقی ہیں وہ قیامت کے دن ان سے بلند مرتبہ ہوں گے اور اللہ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے (212)

اللہ کی نعمتوں کو تبدیل کرنے اور مومنوں سے مذاق کرنے کی سزا:

اس آیتِ کریمہ میں یہ خبر دی ہے کہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ بہت سی نشانیاں دیکھی تھیں، جو اُن کی سچائی پر قطعی حجت تھیں، جیسے ہاتھ کا سفید ہو جانا، دریا کا پھٹ جانا، پتھر کو مارنے سے اس میں سے چشموں کا پھوٹ پڑنا، بادل کا سایہ کرنا، من وسلویٰ کا اُترنا وغیرہ، ان معجزوں کا دیکھنا ایک فاعلِ مختار کے وجود کی واضح دلیل تھی، لیکن اس کے باوجود اُن میں سے اکثر لوگ ان سے پھر گئے اور ایمان کو کفر سے بدل ڈالا۔ اس بدلنے کی سزا سخت عذاب ہوگا، جس طرح اللہ تعالیٰ نے کفارِ قریش کے حال سے آگاہ فرمایا ہے: ﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿28﴾ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا ؕ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿29﴾ ﴾ [إبراهيم: ۲۸۔ ۲۹] ''کیا آپ نے ان لوگوں کو دیکھا نہیں جنھوں نے اللہ کی نعمت (ایمان) کو کفر سے بدل ڈالا اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں لے جا اُتارا؟ (یعنی) جہنم میں، وہ اس میں داخل ہوں گے اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔'' اس جگہ نعمت سے مراد ایمان ہے، سچے ایمان سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہوتی۔ ع

ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ ہے

پھر فرمایا کہ ہم نے دنیا کو کافروں کی نظر میں ایک پُر بہار چیز بنا دیا ہے۔ وہ یہاں کی زندگی پر راضی اور خاطر جمع کر کے مال جمع کرتے ہیں۔ اللہ کی مرضی کے مطابق جہاں چاہیے، وہاں مال کو خرچ نہیں کرتے، بلکہ غریب ایمانداروں کے ساتھ ہنسی مذاق اور دل لگی کرتے ہیں، ان کو دیکھ کر مسخرا بنا لیتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ اگرچہ آج تم بڑے ہو، وہ چھوٹے ہیں، لیکن کل قیامت کو وہ اوپر اور تم نیچے ہوگے۔ ان کو سعادت کا وافر حصہ ملے گا۔ نیز حشر نشر، اور ٹھکانے میں وہ بلند درجات پر فائز ہوں گے۔ اعلیٰ علیین میں جگہ پائیں گے، جب کہ تمھاری جگہ اسفل سافلین میں ہوگی۔ ہیرے جواہرات اگر فنا ہونے والی چیز ہیں تو وہ مٹی اور پتھر کی طرح ہے اور اگر ایک خاک کا پتلا ہے اور باقی رہنے والا ہے تو وہ ہیرے جواہرات سے بہتر ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم جسے چاہتے ہیں بے حساب رزق دیتے ہیں، یعنی کافروں کو دنیا میں، مومنوں کو آخرت میں اور مسلمانوں کو دونوں جگہ عطا کرتے ہیں۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی فضیلت:

حدیث شریف میں مروی ہے کہ اے ابن آدم! تو خرچ کر، تجھ پر خرچ کیا جائے گا۔[1] یعنی جتنا تو اللہ کی راہ میں

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٠٧) صحيح ابن حبان (٢/ ٤٢٢)

اللہ کی مرضی سے خرچ کرے گا، اتنا ہی تجھے اللہ تعالیٰ زیادہ دے گا۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو خرچ کر اور صاحبِ عرش سے کمی کا ڈر نہ کر۔① اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ﴾ [سبا: ۳۹] ''اور تم کوئی چیز بھی خرچ کرتے ہو تو وہ اس کا عوض دیتا ہے۔'' حدیث میں آیا ہے کہ ہر دن صبح دو فرشتے آسمان سے اُترتے ہیں، ایک کہتا ہے کہ اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کا بدل دے۔ دوسرا کہتا ہے روکنے والے کو تلف کر۔② صحیح میں ہے کہ ابن آدم کہتا ہے: میرا مال، میرا مال۔ حالاں کہ تیرا مال اتنا ہی ہے، جو تو نے کھا کر فنا کر دیا، پہن کر پرانا کر دیا اور جو صدقہ دیا، وہ جاری ہوا، اس کے سوا جو کچھ ہے، وہ جانے والا ہے اور لوگوں کے لیے چھوڑ جانا ہے۔③ مسند امام احمد میں مرفوعاً مروی ہے کہ دنیا اس کا گھر ہے، جس کے لیے کوئی گھر نہیں اور اس کا مال ہے جس کے لیے کوئی مال نہیں۔④

عمومی تفسیر:

اس آیت میں سوال کرنے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے یا ہر شخص کو؟ یہ سوال بہ طورِ ملامت کے ہے، جن سے سوال کیا گیا، وہ مدینے کے یہودی ہیں۔ آیت سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے معجزے یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے اور روشن دلائل ہیں۔ نعمت سے مراد یا آیاتِ موسوی ہیں یا اسلام و ایمان۔ ظاہر یہ ہے کہ نعمت کا لفظ اللہ کے ہر اس انعام کے لیے ہے جو اس نے اپنے بندے پر کیا ہے، وہ خواہ کوئی ہو اور کہیں ہو۔ جب بندے نے اس کو بدل ڈالا، شکر ادا نہ کیا تو یہ کفر ہوا۔ لفظ کے سبب کی خصوصیت کی بہ نسبت اس کی عمومیت کا اعتبار ہوتا ہے۔

دنیا کی زندگی کو زینت دینے والا یا تو شیطان ہے کہ دن رات وسوسے ڈال کر جھوٹی تمناؤں میں رکھتا ہے۔ یا اللہ پاک ہے کہ جس نے یہ ساری عجیب و غریب چیزیں بنائی ہیں اور اُن پر قدرت بخشی ہے، کیوں کہ ہر شے کا خالق وہی ہے۔ کفار سے مراد رؤسائے قریش ہیں یا ہر کافر۔ کفار کے ساتھ اس زینت کو اس لیے خاص کیا ہے کہ اگرچہ دنیا کی زندگی کافر و مسلم دونوں کی نظر میں رونق دار اور پُر بہار ہے، لیکن دنیا کے فتنے میں خاص کر کفار ہی زیادہ گرفتار ہوتے ہیں۔ ان کو آخرت سے کچھ سروکار نہیں ہے۔ مسلمان لوٹ پھر کر آخرت ہی پر گرتا ہے، اس کھیل تماشے اور فانی دنیا پر دل نہیں جماتا۔

---

① المعجم الكبير (١/ ٣٤٠) السلسلة الصحيحة (٢٦٦١)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٧٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠١٠)

③ صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٥٩)

④ مسند أحمد (٦/ ٧١) اس روایت کی سند میں ''ابو اسحاق'' مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٩٣٣)

فوقیت سے مراد یہ ہے کہ مومنین کا درجہ جنت میں بلند ہوگا، کافر آگ میں ہوں گے۔ یا فوق سے مراد مکان ہے، کیوں کہ جنت آسمان پر ہے اور دوزخ زمین کی تہہ میں ہے۔ یا مومنین دنیا میں غالب ہیں، اسلام ظاہر ہو گیا، کفر گر گیا، کافر مارے گئے، قید ہوئے، جزیہ دینے لگے۔ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ یہ فوقیت ان کو تقوے کے طفیل ملی ہے۔ اس میں گویا اس اَمر پر آمادہ کرنا ہے کہ تم تقویٰ اختیار کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مردار تم کو جنابِ قدس سے دور کر دے۔ حارثہ بن وہب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا نہ بتاؤں میں تم کو کہ جنت والے لوگوں میں ہر ضعیف اور مستضعف (جسے کمزور تصور کیا جاتا ہے) ہے۔ اگر وہ اللہ پر قسم کھا بیٹھے تو اللہ تعالیٰ اس کو سچا کر دے۔ کیا خبر نہ دوں میں تم کو دوزخ والوں کی، جس میں ہر شریر، بدخو، ظالم اور متکبر ہے۔[1] (رواه الشيخان)

اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ مَیں جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا تو اس میں داخل ہونے والے یہی مساکین تھے اور مال دار لوگ رہ گئے۔ اَصحابِ نار کے لیے نار کا حکم ہوا، میں دوزخ کے دروازے پر کھڑا ہوا، دوزخ میں جانے والوں میں اکثریت عورتوں کی تھی۔[2] (أخرجه البخاري و مسلم) معلوم ہوا کہ وسعتِ رزق یا کثرتِ مال اس بات کی دلیل نہیں کہ اللہ مال دار آدمی سے راضی ہوتا ہے اور محتاج سے ناخوش رہتا ہے، بلکہ یہ مال آزمانے کو دیا ہے اور یہ محتاجی رتبہ بڑھانے کو بخشی ہے۔

مرا بر مسند جم می نشانند — الٰہی بر سرآں گوشہ نشینم

”مجھے وہ لوگ جمشید کی کرسی پر بٹھاتے ہیں۔ اے اللہ! میں ایک کونے میں آ کر بیٹھا ہوں۔“

بغیر حساب کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے، جہاں کا کچھ گمان نہ ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ﴾ [الطلاق: ٣] ”اور وہ اسے رزق دیتا ہے، جہاں سے اسے گمان تک نہیں ہوتا۔“ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ پر کوئی نگہبان نہیں ہے اور نہ محاسب۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رب کا محاسبہ نہیں کیا جا سکتا۔[3] یا دنیا میں رزق دیتا ہے، آخرت میں اس کا حساب نہیں لیتا۔ یا بغیر استحقاق دیتا ہے۔ خزانے کے ختم ہو جانے کا کچھ ڈر نہیں ہے کہ حساب سمجھنے کی حاجت ہو۔ یا حاجت مند کو کم غیر حاجت مند کو زیادہ دیتا ہے۔ واللّٰه أعلم.

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٥٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٠٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٣٦)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٣٧٥)

فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۖ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ ۗ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿٢١٣﴾

لوگ (پہلے) ایک ہی اُمت تھے (پھر ان میں اختلافات پیدا ہوگئے) تو اللہ نے نبی بھیجے، خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے اور ان کے ساتھ اس نے برحق کتاب نازل کی، تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کرے جن میں انھوں نے اختلاف کیا اور اس میں اختلاف انہی لوگوں نے آپس کی ضد سے کیا، جنھیں کتاب دی گئی تھی، حالاں کہ ان کے پاس واضح دلیلیں آ گئی تھیں، پھر جو ایمان لے آئے انھیں اللہ نے اپنے حکم سے اس حق کا راستہ دکھا دیا، جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا اور اللہ جسے چاہتا ہے، سیدھا راستہ دکھا دیتا ہے ﴿213﴾

افتراقِ اُمم اور انبیا کی بعثت:

یعنی اللہ نے کتابیں اور متعدد نبی بھیجے، لیکن اس لیے نہیں کہ ہر فرقے کو الگ راہ پر لگائے، بلکہ اللہ کے نزدیک سب مخلوق کو ایک ہی راہ پر چلنے کا حکم ہے، جس وقت اس راہ سے ہٹ کر کسی اور طرف چلے ہیں، تب ہی اللہ نے نبی بھیجا کہ سمجھا دے اور کتاب بھیجی کہ اس پر چلتے جائیں۔ پھر جب ایک کتاب والے کتاب سے ہٹ گئے، تب دوسری کتاب کی ضرورت ہوئی۔ سب نبی اور سب کتابیں اسی ایک راہ پر قائم کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ تندرستی ایک ہے، مرض بے شمار، جب ایک مرض پیدا ہوا، اس کے موافق ایک دوا اور پرہیز بتایا۔ جب دوسرا مرض پیدا ہوا تو دوسری دوا اور پرہیز اس کے موافق فرمایا۔ اب آخری کتاب میں ایسی راہ فرمائی کہ اس میں ہر مرض سے بچاؤ ہے، یہ سب کے بدلے کافی ہوئی ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نوح اور آدم علیہما السلام کے درمیان دس صدیاں گزریں اور وہ سب کے سب شریعتِ حق پر تھے، پھر اُن میں اختلاف پیدا ہوا تو اللہ نے نبی بھیجے، انھوں نے خوش خبری دی اور ڈرایا۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ایسے ہے: "كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا" "لوگ ایک اُمت، یعنی ایک ملت پر تھے، پس مختلف ہوگئے۔" اس کو حاکم نے صحیح الاسناد کہا ہے۔[1] یہی قراءت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کی بھی تھی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے

[1] تفسير الطبري (٤/ ٢٧٥) مستدرك الحاكم (٢/ ٥٩٦) امام حاکم اور ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

کہا ہے کہ سارے لوگ ہدایت پر تھے۔ جب مختلف ہو گئے تو اللہ نے پیغمبر بھیجے۔ سب سے پہلے نوح علیہ السلام آئے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی قول ہے۔ ان سے دوسری روایت یہ ہے کہ سب کے سب کافر تھے۔ اللہ نے انبیا کو بھیجا،[1] لیکن پہلا قول سند اور معنی کے لحاظ سے صحیح تر ہے۔ اس لیے کہ لوگ ایک ملتِ آدم پر تھے، یہاں تک کہ بت پرستی ہونے لگی، تب اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا۔ یہ اہلِ زمین کی طرف بھیجے جانے والے پہلے رسول ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے انبیا علیہم السلام کے ہمراہ کتابیں بھیجیں، لیکن ان لوگوں نے ایک دوسرے پر بغاوت کی اور اس کتاب کو نہ مانا۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو ہدایت فرما کر اس اختلاف سے بچا دیا۔

اُمتِ مسلمہ کو اختلاف میں راہِ حق کی ہدایت:

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ ہم آئے تو بعد میں ہیں، مگر قیامت کے دن پہلے ہوں گے، ہم سب سے پہلے جنت میں جائیں گے۔ فقط اتنی بات ہے کہ ان کو کتاب ہم سے پہلے دی گئی اور ہم کو بعد میں ملی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں راستہ سجھا دیا، وہ اختلاف میں پڑے رہے۔ آج وہ دن ہے، یعنی جمعہ، جس میں انھوں نے اختلاف کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس کی راہ دکھا دی اور لوگ ہمارے پیچھے ہیں۔ کل یہود ہیں، پرسوں نصاریٰ ہیں۔[2] (رواہ عبدالرزاق)

معلوم ہوا کہ قیامت کے دن کی ترتیب دنیا کی ترتیب کے خلاف ہوگی۔ اس میں فائدہ یہ ہے کہ جو لوگ جنت کے مستحق ہیں، وہ کفار (اہلِ جہنم) کا فیصلہ ہونے تک موقف (قیامت کے دن فیصلے کے انتظار میں کھڑے ہونے کی جگہ) میں رہ کر جنت میں اتنی دیر تک داخلے سے محروم نہ رہیں۔ بغیر وجہ انتظار کی تکلیف نہ اُٹھائیں، کیوں کہ وہ دن پچاس ہزار سال کا ہوگا۔ اگر اُمتوں کا حساب کتاب پہلی اُمت سے ترتیب وار کیا جاتا تو اہلِ ایمان کی باری ایک مدت دراز کے بعد آتی اور وہ ناحق ایک طویل مدت تک محشر کی سختیوں میں گرفتار رہتے۔ اس لیے ان کا فیصلہ پہلے ہوگا، اگرچہ وہ دنیا میں بعد میں آئے تھے۔ وہ اہلِ نار کے مقابلے میں تھوڑے بھی ہوں گے، ان کا پہلے حساب لے لینا اللہ تعالیٰ کی رحمت و شفقت کا تقاضا، مصلحت اور حکمت بھی ہے اور اُس کی عنایت و کرامت کا مقصد بھی۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ.

پھر تمام اُمتوں کے کفار ہیں اور ان کا حساب کتاب ہے، وہ جتنی دیر بعد میں جہنم میں جائیں گے، ان کے لیے وہی غنیمتِ کبریٰ ہے۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انھوں نے جمعے میں اختلاف کیا تھا۔ یہود نے سنیچر (ہفتہ) کا دن لیا، جب کہ نصاریٰ نے اتوار کا دن پکڑا۔ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو جمعے کا دن بتا دیا، جو اُن پر مخفی رہا تھا۔ پھر قبلے میں اختلاف ہوگیا، نصاریٰ نے مشرق کی طرف منہ کیا، یہودیوں نے بیت المقدس کی جانب اور اس

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٣٧٦) تفسير ابن كثير (١/ ٣٢٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٥٥) تفسير الصنعاني (١/ ٨٢، ٨٣)

اُمت نے کعبے کو پا لیا۔ پھر نماز میں ان کا اختلاف ہوا، کوئی رکوع کے بغیر سجدے کرتا، کوئی سجدہ بغیر رکوع کے کرتا، کوئی نماز میں کلام کرتا، کوئی چلتا پھرتا، اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو راہِ حق بتا دی۔ پھر روزے میں اختلاف کیا، کوئی دن کے کچھ حصے کا روزہ رکھتا، کوئی بعض کھانوں کا روزہ رکھتا، جو بات حق تھی، وہ اللہ نے اس اُمت کو بخشی۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام میں اختلاف ہوا، یہود نے کہا کہ وہ یہودی تھے، نصاریٰ نے کہا کہ نصرانی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ وہ کچھ بھی نہ تھے، بلکہ پکے یکسو مسلمان تھے اور حق بات اس اُمت کو سمجھا دی۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام میں اختلاف ہوا، یہودیوں نے ان کو جھٹلایا، ان کی ماں پر ایک بڑا بہتان دھر دیا۔ نصاریٰ نے ان کو اللہ اور اللہ کا بیٹا ٹھہرایا، حالاں کہ وہ اللہ کی روح اور کلمہ تھے۔ جو حق بات تھی، وہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو بتا دی۔[1]

علم کے بعد اختلاف تباہی اور گمراہی کا راستہ ہے:

معلوم ہوا کہ دین میں اختلاف بہت بُری چیز ہے۔ اگلی اُمتیں اسی کی بدولت گمراہ ہوگئیں۔ یہ بلا جس دین میں گھستی ہے تو اُسے برباد کر کے اُٹھتی ہے۔ اس اُمتِ اسلام میں پہلے ایسا اختلاف نہ تھا، بلکہ تمام اسلاف کتاب و سنت کے تابع تھے۔ جب سے دین میں اہلِ کتاب کی اتباع میں تقلید کی بلا آئی، بہت اختلاف پیدا ہوگیا۔ رائے، قیاس اور اجتہاد نے اسلام کی جڑ کاٹ دی۔ اہلِ حدیث وقرآن کے علاوہ کوئی بھی ایسا نہیں، جو کسی مذہبِ معین کا پیروکار ہو اور اختلاف اور فرقہ بندی میں گرفتار نہ ہوا ہو۔ یہ حدیث کہ «اِخْتِلَافُ أُمَّتِيْ رَحْمَةٌ» ''میری اُمت کا اختلاف رحمت ہے۔'' حجت پکڑنے کے لائق نہیں ہے، کیوں کہ یہ سخت ضعیف ہے اور اس کے ثبوت میں محققینِ اہلِ حدیث کو اعتراض ہے۔[2] صحیح حدیث میں جو بات آئی ہے، وہ تو یہ ہے: «مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ، تَمَسَّكُوْا بِهَا وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ، وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ فَإِنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»[3] ''تم میں جو میرے بعد زندہ رہے گا تو وہ عن قریب ہی بہت اختلاف دیکھے گا، سو تم میرے اور میرے خلفاے راشدین کے طریقے کو اپنے اُوپر لازم کر لینا اور اُس سے تمسک کرنا اور اُس کو ڈاڑھوں کے ساتھ، یعنی خوب مضبوطی سے پکڑنا اور نئے نئے کاموں سے بچنا، اس لیے کہ ہر نیا کام گمراہی ہے۔''

دوسری صحیح حدیث میں یہ خبر بھی دی ہے کہ تم ذرا ذرا سی بات میں اگلی اُمتوں کی پیروی کرو گے۔[4] لہٰذا جو اختلاف اہلِ کتاب میں تھا، وہی اختلاف اب اس آخری اُمت میں بھی آ گھسا۔ إنا للّٰہ۔ اب ان کی بھی وہی گت

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ۳۷۸)   [2] یہ روایت موضوع ہے۔ السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (۵۷)

[3] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٦٠٧) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٦٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٤٢) صحیح الترغیب والترهیب (۱/ ۱۰)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٢٦٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٦٩)

بنتی نظر آتی ہے، جو پہلی اُمتوں کی بنی تھی۔ ہاں جو شخص سنت کو لازم پکڑنے والا ہے، قرآن و حدیث کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے، نئی نئی باتوں اور بدعات سے بچتا ہے، وہ نجات پالے تو کچھ دور نہیں، کیوں کہ فرقۂ ناجیہ کی یہی صفت حدیث میں آئی ہے: «مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي»[1] ''جس پر میں اور میرے اصحاب ہیں۔'' لو بات کیا تھی اور ہم کہاں پہنچے۔

اختلاف کے وقت راہِ حق کی تلاش:

امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے زیرِ تفسیر آیت کے بارے میں یوں کہا ہے کہ اللہ نے ایمان والوں کو اختلاف کے وقت راہِ حق کی نشاندہی فرما دی، یعنی جس طرح وہ لوگ جو اختلاف سے پہلے اسی راہ پر تھے، جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں، اخلاص پر جمے تھے۔ کسی کو اللہ کی عبادت میں شریک نہیں کرتے تھے۔ نماز، روزہ اور زکات پر قائم تھے۔ اگلی پرانی چال ڈھال پر چلے جاتے تھے۔ اختلاف سے الگ تھلگ تھے۔ اسی طرح اب یہ اُمت اس اَمرِ اول پر قائم ہے، جو اختلاف سے پہلے تھا، اس امت کے لوگ قیامت کے دن لوگوں پر گواہ ہوں گے، قومِ نوح، قومِ ہود، قومِ صالح، قومِ شعیب اور آلِ فرعون پر اس بات کی گواہی دیں گے کہ ان کے رسولوں نے ان کو اللہ کے احکام پہنچا دیے تھے، مگر انھوں نے رسولوں کو جھٹلایا اور اُن کا کہنا نہ مانا۔ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت یوں ہے: ''لِيَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ''[2] ''تاکہ وہ لوگوں پر قیامت کے دن گواہ ہوں اور اللہ جسے چاہتا ہے، سیدھے راستے پر چلاتا ہے۔''

صحیح بخاری میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو نماز کے لیے اُٹھتے تو یوں کہتے: ''اَللّٰهُمَّ رَبَّ جِبْرَائِيْلَ وَمِيْكَائِيْلَ وَإِسْرَافِيْلَ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ أَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ، إِهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِكَ إِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ''[3] ''اے اللہ! جبرائیل، میکائیل و اسرافیل کے رب! آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے اور غیب اور حاضر کو جاننے والے تو ہی بندوں کے معاملات کا فیصلہ کرے گا، جس میں وہ اختلاف کرتے تھے، مجھ کو اپنے اِذن کے ساتھ اس اختلاف میں سے حق بات پر چلا، تحقیق تو جسے چاہتا ہے، سیدھے راستے پر چلاتا ہے۔'' حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ دعاے ماثور میں آیا ہے: ''اَللّٰهُمَّ أَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اتِّبَاعَهُ وَأَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَهُ وَلَا تَجْعَلْهُ مُلْتَبِسًا عَلَيْنَا فَنَضِلَّ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا''[4] ''اے اللہ!

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٣٤٣)
[2] تفسير الطبري (٤/ ٢٨٥)
[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٧٠)
[4] تفسير ابن كثير (١/ ٣٢٨)

ہمیں حق کو حق کر دکھا اور اس کی پیروی نصیب کر اور باطل کو باطل کر دکھا اور اس سے بچنا نصیب کر اور اُس کو ہم پر مشتبہ نہ کر کہ ہم گمراہ ہو جائیں اور ہم کو پرہیز گاروں کا پیشوا بنا۔‘‘

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ یہ جو فرمایا ہے کہ لوگ ایک دین پر تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام پر تھے، پھر مختلف ہوگئے، یعنی جب اللہ نے آدم علیہ السلام کی ذُریت کو ان کی پشت سے نکالا۔ سیدنا اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جب ذُریت کو آدم علیہ السلام پر پیش کیا تھا، اس وقت وہ سب فطرتِ اسلام پر تھے۔ سب نے اقرارِ عبودیت کیا تھا، پھر آدم کے بعد مختلف ہوگئے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لوگوں سے فقط آدم علیہ السلام مراد ہیں۔[1] ان کو ناس (لوگ) اس لیے کہا کہ یہ سارے ناس (لوگوں) کی اصل ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد آدم اور حوا ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد دس قرن ہیں، جو آدم اور نوح علیہ السلام کے درمیان گزرے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد نوح علیہ السلام اور وہ لوگ ہیں، جو سفینے میں تھے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد عرب ہیں، جو دینِ ابراہیم علیہ السلام پر تھے، پھر عمرو بن لحی نے اس کو بدل دیا اور کسی نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام کی وفات سے لے کر نوح علیہ السلام کے زمانے تک سب کفر پر تھے، مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

امام ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کے نظم وضبط کے مطابق پہلا ہی قول ہے۔[2] لیکن آیتِ شریفہ میں اس بات پر کوئی دلیل نہیں کہ وہ ایمان پر تھے یا کفر پر، یہ بات خارجی دلیل پر موقوف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ سب لوگ ایک جنس سے شریعت سے خالی اور حقائق سے ناواقف تھے، اگر اللہ تعالیٰ رسولوں کو بھیج کر ان پر احسان نہ فرماتا۔ کہتے ہیں کہ سب انبیا جن کو اللہ نے بھیجا، ایک لاکھ چوبیس ہزار تھے، ان میں سے تین سو تیرہ رسول ہوئے۔ ان میں سے قرآن شریف میں اٹھارہ نبیوں کا نام لیا ہے۔ کتاب سے مراد یا تو کتاب تورات ہے یا یہ کہ ہر ایک کو ایک کتاب دی تھی، ساری کتابیں، جو آسمان سے اُتریں، ایک سو چار کتابیں ہیں۔

بینات سے وہ واضح دلیلیں مراد ہیں، جو خاتم الرسل کی نبوت کی صحت پر دلیل ہیں یا وہ ظاہری حجتیں ہیں جو توحید پر دلالت کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک بھیج کر پہلے اختلاف کو بیان کر دیا، تا کہ اُمتِ مسلمہ کو یہ ہدایت معلوم ہو کہ اُس نے اگلے لوگوں کے برعکس ساری کتاب کی تصدیق کی، جب کہ اگلے لوگوں نے بعض کتابوں کو جھٹلایا تھا۔ اِذن سے مراد امر اور ارادہ ہے، علم مراد نہیں۔[3]

---

[1] تفسير الطبري (٤/ ٢٧٧۔ ٢٧٨) [2] تفسير أبي السعود (١/ ٢١٤)

[3] فتح البيان (١/ ٤٢٧۔ ٤٢٩)

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿٢١٤﴾

(پھر) کیا تمھارا خیال ہے کہ تم یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ حالاں کہ ابھی تک تمھیں ان لوگوں کے مانند (مشکلیں) پیش نہیں آئیں جو تم سے پہلے گزرے، ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور وہ ہلا ڈالے گئے، یہاں تک کہ رسول اور وہ لوگ جو ان پر ایمان لائے تھے، کہنے لگے: اللہ کی مدد کب (آئے گی؟) آگاہ رہو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے ﴿214﴾

نصرت اور جنت میں داخلہ آزمایش سے مشروط ہے:

یعنی ابتلا اور آزمایش سے پہلے جنت نہیں ملتی۔ باساء وضراء سے مراد بیماریاں، تکالیف اور مصیبتیں ہیں۔ سیدنا ابن مسعود، ابن عباس رضی اللہ عنہم، ابوالعالیہ، مجاہد، سعید بن جبیر، مرہ ہمدانی، حسن، قتادہ، ضحاک، ربیع، سدی اور مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ باساء فقیری اور محتاجی ہے، ضراء دُکھ اور بیماری ہے۔[1] پھر دشمنوں کے ہاتھوں سخت آزمایش ہوئی۔ خباب بن ارت رضی اللہ عنہ سے صحیح حدیث میں آیا ہے کہ ہم نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ ہمارے لیے مدد نہیں مانگتے، اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں کرتے؟ فرمایا: جو لوگ تم سے پہلے تھے، ان میں کسی کے سر پر آرہ رکھ کر سر سے پاؤں تک چیر دیا جاتا، وہ اس پر بھی اپنے دین سے نہ پھرتا، کسی کو گوشت اور ہڈی کے بیچ میں لوہے کی کنگھی کرتے، وہ اپنا دین نہ چھوڑتا۔ پھر فرمایا: اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ اس کام کو پورا کرے گا، یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک چلا جائے گا، کسی سے نہیں ڈرے گا، مگر اللہ سے، یا بکری پر بھیڑیے کے حملے سے، لیکن تم ایک جلد باز قوم ہو۔[2]

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ الٓمّٓ ﴿١﴾ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ﴿٢﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٣﴾ ﴾ [العنکبوت: ۱۔ ۳] ''الٓمّٓ، کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ صرف یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انھیں آزمایا نہیں جائے گا۔ اور البتہ تحقیق ہم نے ان لوگوں کو آزمایا ہے جو ان سے پہلے تھے، چناں چہ اللہ ان لوگوں کو ضرور ظاہر کرے گا جنھوں نے سچ بولا، اور وہ ضرور ظاہر کرے گا ان کو جو جھوٹے ہیں۔''

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ۳۸۰)
[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳٤١٦)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر اسی قسم کا ایک سخت معاملہ احزاب کے دن پڑا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ۝ وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ ﴾ [الأحزاب: ۱۰۔ ۱۲] ''جب دشمن تم پر تمھارے اوپر (کی طرف) سے اور تمھارے نیچے (کی طرف) سے چڑھ آئے اور جب آنکھیں (خوف و ہراس کی وجہ سے اصل جگہ سے) ہٹ گئیں اور کلیجے حلقوں کو پہنچ گئے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ وہاں مومن آزمائے گئے اور شدت سے ہلا مارے گئے۔ اور جب منافق اور جن لوگوں کے دلوں میں مرض تھا، کہہ رہے تھے: اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے نہیں وعدہ کیا مگر دھوکے فریب کا۔''

ہرقل نے ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا کہ تم اس سے لڑے بھی ہو؟ کہا کہ ہاں۔ کہا کہ تمھارے اور اُس کے درمیان لڑائی کی کیا صورت تھی؟ کہا کہ کبھی وہ ہم پر غالب، کبھی ہم اس پر غالب۔ ہرقل نے کہا کہ رسول اسی طرح مبتلا ہوتے ہیں، پھر انجام انھیں کے لیے ہوتا ہے۔[1] اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مدد کے قریب ہونے کا ذکر فرمایا ہے، جس طرح کہا: ﴿ فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ ﴾ [الإنشرح: ٥۔ ٦] ''پھر بے شک ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔'' جس طرح کی سختی آتی ہے، اسی طرح کی مدد بھی اُترتی ہے۔ ابو رزین رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی نا اُمیدی سے تعجب کرتا ہے کہ پانی برسنا قریب ہے، ان کو نا امید دیکھ کر ہنستا ہے، جانتا ہے کہ کشائش نزدیک ہے۔[2] الحدیث۔

زلزلہ کسی چیز کے زور سے ہلانے کو کہتے ہیں کہ یہ حرکت اشخاص اور اقوال دونوں میں ہوتی ہے۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت احزاب کے دن غزوۂ خندق کے متعلق اُتری ہے۔ اس دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب رضی اللہ عنہم کو سخت بلا اور محاصرے نے گھیرا تھا۔[3] کسی نے کہا ہے کہ غزوۂ اُحد میں نازل ہوئی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ نے یہ خبر دی ہے کہ دنیا بلا کا گھر ہے اور اللہ ان کو دنیا میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ بات نئی نہیں ہے۔ پہلے نبیوں اور چیدہ لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو چکا ہے۔[4] لہٰذا جس طرح وہ اپنے دین پر ثابت قدم رہے، تم بھی اے مسلمانو! ثابت قدم رہو، اللہ کی مدد کو کچھ زیادہ دیر نہیں، وہ تو جلد آنے والی ہے۔

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۷۸۲)

② سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۸۱) تفسير ابن كثير (۱/ ۳۲۹) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۲۸۱۰)

③ تفسير الطبري (٤/ ۲۸۹)

④ تفسير ابن أبي حاتم (۲/ ۳۷۹) اس کی سند حسن ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿٢١٥﴾

(اے نبی!) لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے: تم اپنے مال میں سے جو بھی خرچ کرو، تو اپنے والدین، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے (خرچ کرو)، اورتم جو بھلائی بھی کرو گے، بے شک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے (215)

کس پر خرچ کیا جائے؟

لوگوں نے پوچھا تھا کہ مال میں سے کس مال کا خرچ کرنا بہت ثواب ہے؟ فرمایا کہ مال کوئی بھی ہو، لیکن جس قدر بھی ٹھکانے پر خرچ ہو، ثواب زیادہ ہے۔ مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت نفقۂ تطوع، یعنی نفلی خرچ کے بارے میں اُتری ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کو زکات نے منسوخ کر دیا، مگر اس پر اعتراض ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس میں خرچ کرنے کی جگہ بتائی ہے۔ حدیث میں مروی ہے کہ اپنے ماں باپ، بہن بھائی کو دو، پھر جو جتنا نزدیک ہو۔[2] میمون بن مہران رحمہ اللہ نے اس آیت کو پڑھ کر کہا کہ یہ خرچ کرنے کی جگہیں ہیں، اس میں طبلہ، بانسری، لکڑی کے مجسمے اور در و دیوار کے لباس کا ذکر نہیں فرمایا۔[3]

معلوم ہوا کہ جو مال زائد از حاجت مکان کی تعمیر یا گھر کی آرایش یا کھیل کود کے آلات میں خرچ ہوتا ہے، وہ نفقۂ باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ان خرچوں کا سارا حال معلوم ہے، بندہ جو نیکی کرے گا، اللہ اس کو اس کا پورا بدلہ دے گا، ذرہ برابر ظلم نہیں ہوگا۔ خرچ کرنے کے بارے میں یہ سوال اہلِ ایمان نے کیا تھا اور خرچ کی مقدار اور قسم کے متعلق پوچھا تھا، اس پر جواب ملا کہ خرچ کرنے کی جگہیں یہ ہیں، جو تم کو بتائی جاتی ہیں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت محکم ہے۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نفلی خرچ کے بارے میں آئی ہے۔ آیت کے ظاہر کا بھی یہی تقاضا ہے، جس کسی کو اللہ کا تقرب حاصل کرنا ہو، وہ ان بتلائی گئی جگہوں میں خرچ کرے، جس کا مقام پہلے ہو، اس کو پہلے دے۔[4] اس آیت میں سائلین اور گردنوں کے آزاد کرنے کا ذکر نہیں ہے، جس طرح دوسری آیت میں کیا تھا یا اسی کو کافی سمجھا یا آیت کی عمومیت کو، کیوں کہ ظاہر الفاظ ہر خیر کو شامل ہیں، کسی بھی جگہ خرچ کیوں نہ ہو۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٣٨١)
[2] سنن النسائي، رقم الحدیث (٢٥٣٢) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٨٠٦٧)
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٣٨١)
[4] تفسیر الطبري (٤/ ٢٩٤) تفسیر الخازن (١/ ٢٠٣)

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

تم پر جہاد فرض کر دیا گیا ہے اور وہ تمھارے لیے ناگوار ہے اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمھارے لیے بہتر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے لیے بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ﴿216﴾

جہاد کی فرضیت:

اس آیتِ شریفہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جہاد فرض کیا، فرمایا کہ دشمنوں کے شر کو اسلام کے نزدیک آنے سے روکو۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جہاد ہر ایک پر فرض ہے، لڑے یا بیٹھا رہے۔ جو گھر میں بیٹھا ہے، اس پر واجب ہے کہ جب مدد کے لیے بلایا جائے تو مدد دے۔ جو مدد کے لیے پکارے تو اس کی فریاد کو پہنچے، جب پکارا جائے تو نکلے اگر حاجت نہ ہو تو بیٹھا رہے۔[1] اسی لیے حدیث میں مروی ہے کہ جو شخص مر گیا اور اُس نے جہاد کیا نہ دل میں جہاد کا ارادہ ہی رکھا، وہ جاہلیت کی طرح مرا۔[2] نبی مکرم ﷺ نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ فتح کے بعد ہجرت نہیں ہے، لیکن جہاد اور نیت ہے، جب تم بلائے جاؤ تو نکلو۔[3] لڑائی اس لیے بُری لگتی ہے کہ اس میں مارا جانا، زخمی ہونا، سفر کی تکلیفیں اُٹھانا، دشمن کے مقابل میں بہادری کرنا ہوتا ہے، لیکن لڑائی کے بعد مدد، کامیابی، دشمنوں پر غلبہ، ملک و مال پر قبضہ اور اولاد کے لیے نفع حاصل ہوتا ہے۔ یہ انجام بہتر ہے۔

یہ ارشاد کہ بعض شے محبوب ہوتی ہے، مگر وہ بُری لگتی ہے، سب امور کو شامل ہے، جن کو آدمی دوست رکھتا ہے اور اُن میں کچھ بھلائی اور بہتری نہیں ہوتی، جیسے اللہ کے راستے میں لڑائی سے جان چھڑا کر بیٹھ رہنا، یہ دل کو اچھا لگتا ہے، مگر اس کا انجام ذلت اور خواری ہے۔ لڑنا اگرچہ دل کو برا لگتا ہے، مگر انجام کے لحاظ سے دشمنوں اور اُن کے شہروں پر قبضہ ہو جاتا ہے۔ اسلام میں جب تک جہاد رہا، مسلمان غالب رہے، جب سے جہاد بند ہوا، ہر طرح کی ذلت نے آ گھیرا۔ اللہ تعالیٰ ہر شے کے انجام کو جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ۳۸۲، ۳۸۳)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۹۱۰) صحیح مسلم میں ''جاہلیت'' کی جگہ ''نفاق'' کے الفاظ ہیں۔ البتہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ''جاہلیت'' کے الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ تفسیر ابن کثیر (۱/ ۳۲۹)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۷۳۷) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۳۵۳)

جہاد کا فرض کرنا، ایک طرح کا امتحان ہے، اس جگہ کافروں سے لڑائی کرنا مراد ہے، جہاد اس لیے ناپسندیدہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مال خرچ ہوتا ہے، اہل وعیال سے جدائی ہوتی ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث میں مروی ہے کہ تم پر ہر امیر کے ساتھ جہاد فرض ہے، نیک ہو یا بد ہو۔[1] (أخرجه أبو داود) کسی نے کہا ہے کہ جہاد نفل ہے اور آیت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں، کوئی دوسرا مراد نہیں۔ امام ثوری اور اوزاعی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں، مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ جمہور یہ کہتے ہیں کہ فرضِ کفایہ ہے کہ جب بعض لوگ لڑنے کے لیے کھڑے ہو جائیں تو باقی لوگوں سے ساقط ہو جاتا ہے۔ بعض کا یہ قول ہے کہ نہیں، بلکہ فرضِ عین ہے، جس وقت کہ دشمن ہمارے گھر میں گھس آئیں اور فرضِ کفایہ اس وقت ہے کہ وہ اپنے ملک میں ہوں۔

یہ آیت محکم ہے، اس نے مشرکین سے عفو کرنے کے حکم کو منسوخ کر دیا۔ کسی نے کہا ہے کہ بلکہ منسوخ ہے، اس لیے کہ اس میں سب پر جہاد کو فرض کر دیا گیا ہے۔ ناسخ یہ قول ہے: ﴿وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَآفَّةً﴾ [التوبة: ١٢٢] ”اور مومنوں کے لیے مناسب نہیں کہ وہ سب ہی نکل کھڑے ہوں۔“ بعض نے کہا ہے کہ ایک طرح سے ناسخ اور دوسری طرح سے منسوخ ہے۔ ناسخ اس طرح ہے کہ جہاد مشرکوں پر منع کرنے کے بعد واجب کیا گیا، منسوخ اس طرح کہ جہاد سب پر واجب ہے۔ جہاد کی فضیلت میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں جو صحاح ستہ وغیرہ کتب میں موجود ہیں۔ ”کتاب العبرة“ (نواب صاحب، مولف تفسیر ہذا کی کتاب) میں اکثر احادیث اور احکام کو جمع کیا گیا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ
وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ
اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا
يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ
وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ
اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ﴿٢١٧﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢١٨﴾

(اے نبی!) لوگ آپ سے حرمت والے مہینے کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس میں لڑائی کیسی ہے؟ کہہ دیجیے: اس میں لڑائی کرنا بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٣٣) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ مکحول رحمہ اللہ کا سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔

روکنا اور اللہ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے (روکنا) اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا (گناہ) ہے اور فتنہ انگیزی قتل سے کہیں بڑا گناہ ہے۔ اور وہ (کافر) تو ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ اگر ان کا بس چلے تو وہ تمھیں تمھارے دین سے پھیر دیں اور تم میں سے جو شخص اپنے دین سے پھر جائے، پھر وہ حالتِ کفر ہی پر مر جائے تو انھی لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت (دونوں) میں برباد ہو گئے اور وہ لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے (217) بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہی لوگ اللہ کی رحمت کی اُمید رکھتے ہیں اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت رحم کرنے والا ہے (218)

سریہ نخلہ اور حرمت والے مہینوں میں لڑائی کا حکم:

نبی اکرم ﷺ نے جہاد پر ایک فوج بھیجی تھی، انھوں نے کافروں کو مارا اور لوٹا۔ مسلمانوں کو یہ خیال رہا کہ وہ جمادی الاخری کا دن ہے، حالاں کہ وہ رجب کا چاند تھا، کافروں نے اس بات پر بہت طعن و تشنیع کی۔ مسلمانوں کو شبہہ پڑا، اس پر یہ آیت اُتری، یعنی ان مہینوں میں ناحق کی لڑائی بہت بڑا گناہ ہے، لیکن جن کافروں نے مسلمانوں سے ان مہینوں میں لڑائی کی، ان سے لڑنا منع نہیں ہے۔ جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک جماعت کو بھیجا، ان پر ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ امیر تھے، جب یہ چلنے لگے تو آپ ﷺ کی جدائی سے رونے لگے، آپ نے ان کو روک دیا، ان کی جگہ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور اُن کو ایک خط لکھ کر دے دیا اور یہ کہہ دیا کہ جب تک فلاں فلاں جگہ نہ پہنچو، اس خط کو نہ پڑھنا اور فرما دیا کہ زبردستی کسی کو اپنے ساتھ نہ لے جانا، جب کتاب پڑھی "إنا لله" کہا، لوگوں کو خبر دی تو دو آدمی واپس آ گئے اور باقی ان کے ساتھ رہے۔ ابن الحضرمی سے لڑے، اس کو قتل کیا، ان کو معلوم نہ ہوا کہ آج رجب ہے یا جمادی الاُخریٰ۔ مشرکوں نے مسلمانوں سے کہا کہ تم نے حرمت والے مہینے میں قتل کیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری۔ اس کو ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے۔[1] امام سدی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اسی طرح نقل کیا ہے۔

اس لشکر میں سات شخص تھے۔ خط میں یہ لکھا تھا کہ تم جا کر بطنِ نخلہ میں اُترو، انھوں نے اپنے ہمراہیوں سے کہا کہ جس کو مرنا ہو، وہ چلے اور وصیت کرے، میں وصیت کرتا ہوں اور جاتا ہوں۔ یہ بطنِ نخلہ کی طرف گئے، وہاں لڑائی

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٣٨٤) اس کی سند حسن ہے۔

ہوئی، عمرو کو مارا، وہ طائف سے آ رہا تھا، وہ آخر شب جمادی الاخری اور رجب کی پہلی شب تھی۔ ان کو دھوکا ہوا، جب مشرکینِ مکہ نے طعنہ دیا کہ تم نے حرمت والے مہینے میں ہمارے آدمی کو مار ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے مشرکو! جو کام تم نے کیا ہے، وہ اس قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔ تم نے اللہ کے ساتھ کفر کیا اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کفر کیا اور لوگوں کو مسجد الحرام سے روکا اور انھیں وہاں سے نکال دیا۔[1] یہ قصہ کئی طرح اسی طرز پر آیا ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس لڑائی کا مفصل حال دلائل نبوت نامی کتاب میں لکھا ہے۔[2] جب عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو اس لغزش کی طرف سے اطمینان ہوا تو انھوں نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ ہمیں یہ لالچ ہے کہ ہم کسی جنگ میں مجاہدین کا اجر پائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جن کو یہ اُمید ہے، اللہ ان کے لیے غفور رحیم ہے۔

حرمت والے مہینے سے مراد جنس ہے، یعنی تمام حرمت والے مہینے اس میں شامل ہیں۔ کفار ان مہینوں میں خون ریزی کرتے نہ دشمن پر حملہ کرتے۔ یہ چار مہینے ہیں: ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم، یہ تین تو لگاتار ہیں، چوتھا رجب یہ اکیلا ہے۔ یہ آیت محکم ہے۔ ان مہینوں میں لڑنا جائز نہیں، مگر دفاع کے لیے۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے منسوخ ہے: ﴿ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ﴾ [التوبة: ٥] ''تو تم مشرکوں کو جہاں کہیں پاؤ قتل کر دو۔'' نیز اللہ پاک کا فرمان ہے: ﴿ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً ﴾ [التوبة: ٣٦] ''اور تمام مشرکین سے لڑو۔'' جمہور اسی کے قائل ہیں۔ اہلِ مسجد الحرام سے مراد رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب ہیں۔ کافروں نے ان کو اتنا ستایا کہ آخر مکہ چھوڑنا پڑا۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے، شہرِ حرام میں قتال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سورت براءۃ کی آیت اس کی ناسخ ہے۔[3]

مرتد کے اعمال ضائع ہوجاتے ہیں:

اس آیت میں اس بات کی جو دلیل ہے کہ مرتد ہونے والے کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں، وہ اس صورت میں ہے کہ وہ حالتِ کفر میں مرجائے اور اگر مرتد ہونے کے بعد پھر مسلمان ہو گیا تو اس پر ارتداد کا حکم لاگو نہیں ہوگا۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی قول ہے کہ مرتد ہونے پر عمل ضائع نہیں ہوتے، جب تک اسی ارتداد پر نہ مرے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ارتداد سے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں، اگرچہ بعد میں مسلمان ہو جائے۔ حبط کے معنی ہیں کہ وہ کام بگڑ گیا اور اکارت گیا۔ جن آیتوں میں صرف مرتد ہونے پر اعمال کے ضائع ہونے کا ذکر آیا ہے، وہ آیتیں اس آیت پر مقید محمول ہیں۔ علمِ اصول کا قاعدہ ہے کہ مطلق کو مقید پر سمجھتے ہیں۔ ہجرت ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر رہنے کو کہتے ہیں۔ اس جگہ ہجرت سے مراد یہ ہے کہ دار الکفر سے نکل کر دار الاسلام میں جا بسے۔

---

[1] تفسیر الطبري (٤/ ٣٠٥، ٣٠٦)　[2] دلائل النبوة (٣/ ١٧)　[3] الدر المنثور (١/ ٦٠٥)

اُمید وخوف کی کیفیت:

امیدِ رحمت کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ کسی کو یہ بات معلوم نہیں کہ وہ جنت میں جائے گا، اگرچہ بڑا فرماں بردار ہی کیوں نہ ہو۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر اُمید کے ساتھ خوف ہوتا ہے، جس طرح ہر خوف کے ساتھ اُمید ہوتی ہے،[1] یعنی ایمان خوف اور امید کے درمیان میں ہے۔ اسی لیے یہ آیا ہے کہ نا اُمیدی کفر ہے، جس طرح کہ امن کفر ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی اچھی تعریف کی ہے کہ وہ لوگ بہترین اُمت ہیں، ان کو اہلِ رجا (امید رکھنے والا) بنایا۔ اُمیدوار طلب کرنے والا ہوتا ہے اور خوف کھانے والا بھاگنے والا ہوتا ہے۔[2]

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلِ الْعَفْوَ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝219 فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝220

(اے نبی!) لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں؟ کہہ دیجیے: دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے (کچھ) فائدہ بھی ہے اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے بہت بڑا ہے اور وہ آپ سے پوچھتے ہیں: کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے: جو ضرورت سے زائد ہو۔ اللہ تمھارے لیے اپنے احکام اسی طرح بیان کرتا ہے، تاکہ تم غور وفکر کرو 219 دنیا اور آخرت دونوں کی بابت۔ اور لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دیجیے: ان کی اصلاح کرنا ان کے لیے بہت بہتر ہے اور اگر تم اپنا اور ان کا خرچ اور رہن سہن اکٹھا رکھو تو وہ تمھارے بھائی ہی ہیں اور اللہ اصلاح کرنے والے سے فسادی کو جانتا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تمھیں تکلیف میں ڈال دیتا، بے شک اللہ بہت زبردست، خوب حکمت والا ہے 220

تدریجاً شراب کی حرمت:

اس آیت میں تین سوالوں کا جواب ہے: ایک سوال یہ تھا کہ شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ اس کا جواب یہ

[1] المحرر الوجيز- لابن عطية (١/ ٢٩٢) [2] تفسير الطبري (٤/ ٣٢٠)

ملا کہ ان کے نفع سے ان کا گناہ بڑا ہے۔ اس بارے میں کئی آیتیں اُتری ہیں، ہر ایک میں شراب اور جوئے کی برائی ہے۔ بالآخر سورۃ المائدہ کی آیت اُتری، اس میں شراب صاف حرام ہوگئی۔ جو چیز نشہ دینے والی ہے، وہ سب حرام ہے، جو شرط لگائی جائے اور اس پر مال لیا جائے، وہ سب بھی حرام ہے۔ کوئی بھی چیز جو مسکر (نشہ دینے والی) ہو، کسی بات پر شرط ہو، جس کا حکم شریعت میں آیا ہے، وہ سب حرام ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ نے ابو میسرہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ جب شراب کی حرمت اُتری تو عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے اللہ! شراب کے بارے میں ہمارے لیے مفصل بیان فرما، اس پر یہ آیت اُتری۔ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بلا کر یہ آیت سنائی، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے پھر وہی کہا: "اَللّٰهُمَّ بَيِّنْ لَنَا فِي الْخَمْرِ بَيَانًا شَافِيًا" "اے اللہ! ہم کو شراب کے بارے میں بیانِ شافی دے۔" اس پر سورۃ النساء کی آیت اتری: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى ﴾ [النساء: ٤٣] "اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اس وقت نماز کے قریب نہ جاؤ جب تم نشے میں ہو۔" نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا منادی اقامتِ نماز کے وقت پکار دیتا کہ کوئی مست نماز کے پاس نہ آئے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بلا کر یہ آیت پڑھی، انھوں نے پھر وہی کہا، جو پہلے کہا تھا، اس پر سورۃ المائدہ کی آیت اُتری۔ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر پڑھی گئی اور لفظ ﴿ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴾ [المائدۃ: ٩١] تک سنی تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ "اِنْتَهَيْنَا اِنْتَهَيْنَا" یعنی ہم نے یہ حکم مانا، ہم باز رہے۔ اس حدیث کو ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ رحمہم اللہ نے بھی کئی طریقوں سے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے صحیح کہا ہے۔ علی بن المدینی رحمہ اللہ نے اس کی اسناد کو صحیح صالح بتایا ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے "انتهينا" کے بعد یہ بھی زیادہ کیا ہے کہ وہ مال و عقل کو کھو دیتی ہے۔[1] سچ ہے ؎

ز بادہ ہیچت ایں نہ بس کہ ترا   دمے ز وسوسۂ عقل بے خبر دارد

"شراب کی کم سے کم خرابی یہ ہے کہ وہ تیری زندگی کو عقل کے وسوسوں سے بے خبر رکھتی ہے۔"

سورۃ المائدہ کی آیت سے یہ آیت مراد ہے: ﴿ اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ [المائدۃ: ٩٠] "بے شک شراب اور جوا، آستانے اور فال نکالنے کے تیر، سب گندے کام ہیں اور شیطان کے عمل سے ہیں، پس تم ان سے بچو، تا کہ تم فلاح پاؤ۔" معلوم ہوا کہ شرابی اور جواری کا ایک ہی حکم ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جو چیز عقل کو گڑ بڑ کر دے، وہی خمر ہے۔[2] میسر کہتے ہیں قمار (جوئے) کو، ان دونوں کا گناہ دین میں بیان ہوا ہے۔ نفع دنیا میں، یعنی بدن کو نفع دیتی ہے، کھانا ہضم کرتی

[1] مسند أحمد (١/ ٥٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٧٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٤٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٥٤٠) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٣٨٨، ٣٨٩) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٠٥) امام حاکم اور ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٣٨٩) اس کی سند حسن ہے۔

ہے، فضلات کو نکالتی ہے، بعض ذہنوں کو تیزی بخشتی ہے، طبیعت کو سرور دیتی ہے، مگر ع

سرور ہو کے ہم آئے خمار ہو کے چلے　　　بڑی قیمت میں بکتی ہے قیمت اچھی اُٹھتی ہے

لوگ جو کچھ جوئے میں پیدا کرتے ہیں، وہ اپنی جان اور اہل و عیال پر خرچ کرتے ہیں، لیکن یہ اچھائیاں ان کے نقصانات اور فسادات کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، کیوں کہ ان کا تعلق عقل و دین سے ہے۔ اس آیت میں صرف تحریم کی تمہید ہے، حرمت کی صراحت نہیں ہے، اس لیے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بار بار بیانِ شافی کا مطالبہ کیا، پھر آیتِ مائدہ آئی، اس میں کھول کر حرمت بیان کر دی گئی: ﴿ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴾ [المائدۃ: ۹۱] ”بے شک شیطان چاہتا ہے کہ تمھارے درمیان شراب اور جوئے کے ذریعے سے دشمنی اور بغض ڈال دے، اور تمھیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے، پھر کیا تم ان (شیطانی کاموں) سے باز آتے ہو؟“ اس کا بیان وہیں سورۃ المائدہ میں۔ إن شاء اللّٰہ تعالیٰ۔ آئے گا۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما، شعبی، مجاہد، قتادہ اور ربیع بن زید رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ پہلی آیت ہے جو شراب کے بارے میں اُتری ہے، پھر سورۃ النساء کی آیت اور پھر سورۃ المائدہ کی آیت آئی، اس پر شراب کھلم کھلا حرام ٹھہر گئی۔[1]

شراب کی تعریف، حکم اور نقصانات:

خمر کہتے ہیں انگور کے رس کو، جبکہ جوش مار کر پھین (جھاگ) لے آئے۔ اس کے سوا جو عقل کو کھو دے، وہ خمر کے حکم میں ہے، جمہور کا یہی مذہب ہے۔ امام ابو حنیفہ، ثوری، ابن ابی لیلیٰ اور ابن شبرمہ رحمہم اللہ اور ایک جماعت نے کوفے کے فقہا کا یہ مذہب بیان کیا ہے کہ شراب انگوری کے سوا، جس چیز کے زیادہ پینے سے نشہ آئے، وہ حلال ہے، یعنی اس مقدار سے کم پینا جائز ہے، جس سے نشہ نہ آئے۔ پکانے سے جب دو تہائی گھٹ جائے تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک حلال ہے۔[2] اس مذہب میں بڑی گفتگو ہوئی ہے۔ ”مسك الختام شرح بلوغ المرام“ (نواب صاحب کی تالیف) میں سارا کلام نقل کیا گیا ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے ”نيل الأوطار“ میں پورا رد فرمایا ہے۔[3] حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے ”حادي الأرواح“ میں شراب کی بڑی مذمت لکھی ہے۔ محققین اطبا بھی اس کے نقصان دہ انجام کے قائل ہوئے ہیں اور نقصانات اور خرابیوں سے قطع نظر یہ کیا کم ہے کہ عقل ماری جاتی اور عمر کم ہوتی ہے۔ حدیث میں مروی ہے کہ شراب کا عادی جب اللہ سے ملے گا تو وہ بت پرست کے حکم میں ہوگا۔[4] رسالہ ”بشارة الفساق“ (نواب صاحب کی تالیف) میں شراب کی مذمت کی احادیث دی گئی ہیں۔

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٣٨٩) تفسير ابن كثير (١/ ٣٣٤)　[2] فتح القدير (١/ ٣٨٧)
[3] نيل الأوطار (٩/ ٤٣-٥٠)　[4] صحيح ابن حبان (١٢/ ١٦٧) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٢٩٩)

اصل مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کے متعلق چار آیتیں اُتاری ہیں، ایک مکہ میں اُتری: ﴿ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا ﴾ [النحل: ٦٧] ''اور کھجوروں اور انگوروں کے کچھ پھل وہ ہیں جن سے تم نشہ (آور شراب) حاصل کرتے ہو۔'' مسلمان اس کو شروع اسلام میں پیتے تھے، ان کے لیے حلال تھی، پھر مدینے میں معاذ اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کے جواب میں یہ آیت اُتری: ﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى ﴾ [النساء: ٤٣] ''تم اس وقت نماز کے قریب نہ جاؤ جب تم نشے میں ہو۔'' بعض لوگوں نے نماز کے وقت شراب کا پینا چھوڑ دیا، باقی اوقات میں پیتے رہے، پھر آیتِ مائدہ آئی، یہ آیت غزوۂ احزاب کے چند روز بعد آئی۔ خمر کا لفظ مذکر و مونث دونوں طرح آیا ہے، شاید اس لیے کہ فاسق مرد و عورت دونوں اس کو پیتے ہیں۔ ''اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا'' ''اے اللہ! ہماری حفاظت فرما۔''

جوئے کی تعریف اور اس کا نقصان:

سلف کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ جس چیز میں کوئی شرط لگائی جائے، نرد ہو یا شطرنج یا اور کچھ، وہ جوا ہے، یہاں تک کہ بچوں کا اخروٹ وغیرہ سے کھیلنے تک کو جوا کہا گیا ہے۔ ہاں حق کو واضح کرنے کے لیے گھوڑ دوڑ اور قرعہ ڈالنا مباح ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جوا دو طرح کا ہوتا ہے: ایک لہو، جیسے: نرد، شطرنج، سارے ملاہی (کھیل کود کا سامان) دوسرا قمار، جس پر لوگ شرطیں لگائیں۔[1] سو ہر وہ چیز جس پر شرط لگائی جائے، وہ میسر ہے۔ اس کی باقی تفصیل۔إن شاء اللہ تعالیٰ۔ سورۃ المائدہ میں آئے گی۔ جوئے میں نقصان یہ ہے کہ مال جاتا ہے، محتاجی آتی ہے، آپس میں دشمنی پیدا ہوتی ہے اور سینے میں کینہ آتا ہے۔ نفع یہ ہے کہ مفت کا مال بغیر محنت و مشقت کے ہاتھ لگتا ہے، بازی جیت لینے سے دل کو عجیب خوشی حاصل ہوتی ہے، قمار میں گیارہ پاسے ہوتے ہیں، ہر ایک کا الگ الگ نام ہے۔

مال خرچ کرنے کی مقدار:

دوسرا سوال یہ تھا کہ مال کس قدر خرچ کریں؟ حکم ہوا کہ جو تمھاری حاجت سے زیادہ ہو، وہ خرچ کرو، جب اس سے بھی زیادہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ جیسے آخرت کی فکر ضروری ہے، دنیا کی فکر بھی ضروری ہے، سارا مال خرچ کر دو گے تو دنیا کی حاجت میں عاجز رہو گے۔ ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ معاذ بن جبل اور ثعلبہ رضی اللہ عنہما نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہمارے پاس لونڈی غلام ہمارے مال سے ہیں، اس پر یہ آیت اُتری۔[2] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ عفو سے مراد اہل سے زائد اور فالتو ہے،[3] یہی تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ سب نے یہی کہا ہے کہ عفو بمعنی زائد

[1] تفسير القرطبي (٣/ ٥٢۔ ٥٣)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٣٩٣) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ کا سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔

[3] تفسير الطبري (٤/ ٣٣٧) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٢٩٣) اس کی سند حسن ہے۔

ہے۔ طاؤس رحمہ اللہ نے کہا کہ عفو تھوڑی چیز کو کہتے ہیں۔ ربیع نے کہا کہ افضل اور اطیب مال کو کہتے ہیں۔ اس کا مرجع یہی ہے کہ حاجت سے زیادہ مراد ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عفو سے مراد ہے کہ تھوڑا مال خرچ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر خالی ہاتھ ہو کر لوگوں سے مانگتے پھرو۔[1] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ ایک آدمی نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! میرے پاس ایک دینار ہے؟ فرمایا: اپنی جان پر خرچ کر، کہا کہ اور بھی ہے؟ فرمایا: گھر والوں پر خرچ کر، کہا کہ اور ہے؟ فرمایا: اولاد پر خرچ کر، کہا اور ہے؟ فرمایا اب تو ہی خوب دیکھ سکتا ہے، یعنی جہاں مناسب ہو، وہاں خرچ کر۔[2] (رواہ ابن جریر و مسلم)

صحیح مسلم میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی سے فرمایا کہ اگر تیرے پاس مال ہو تو اپنی جان سے شروع کر، پہلے اسی پر خرچ کر، پھر اگر کچھ بچ جائے تو اہل پر صَرف کر، اگر اہل سے زیادہ ہو تو قرابت والوں کو دے، پھر بڑھے تو اِدھر اُدھر خرچ کر۔[3] دوسری روایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح ہے کہ بہتر صدقہ وہ ہے جو آسودگی سے ہو، اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے، پہلے عیال سے شروع کر۔[4] (رواہ مسلم) ان حدیثوں میں خرچوں کی ترتیب بتائی ہے، جس کسی کے پاس مال ہو اور اللہ اس کو آسودگی بخشے تو اس کو چاہیے کہ اسی ترتیب کے مطابق خرچ کرے۔ اپنی عقل کے مطابق خرچ نہ کرے۔ یہ بھی حدیث میں مروی ہے کہ اے ابن آدم! تو اگر زائد مال کو خرچ کرے گا تو وہ تیرے لیے بہتر ہے اور اگر روکے گا تو تیرے لیے برا ہے۔ کفاف (ضرورت کے موافق نہ کہ زائد) پر کچھ ملامت نہیں۔[5]

پھر کسی نے کہا ہے کہ آیت زیرِ تفسیر زکات والی آیت سے منسوخ ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عطاء خراسانی اور سدی رحمہ اللہ بھی یہی کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ آیتِ زکات اس آیت کی وضاحت کرتی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ کا یہی قول ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اسی کو زیادہ بہتر کہا ہے۔[6] فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ عفو اس کو کہتے ہیں جو آسانی کے ساتھ میسر ہو اور دل پر گراں نہ گزرے، یا وہ جو اہل و عیال کے خرچ سے بچ جائے۔ جمہور نے کہا ہے کہ یہ نفلی اخراجات کا بیان ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت محکم ہے، کیوں کہ مال میں زکات کے علاوہ بھی حق ہے۔[7]

یہ ارشاد کہ شاید تم دنیا اور آخرت میں کچھ سوچو، سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ دنیا کے زوال و فنا میں اور آخرت کے اقبال و بقا میں فکر کرو۔[8] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس کے لیے جو

---

[1] تفسیر الطبري (٤/ ٣٣٨۔ ٣٣٩) تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٣٩٣)

[2] تفسیر الطبري (٤/ ٣٤٠) ان الفاظ کے بجائے اس کے ہم معنی روایت صحیح مسلم (رقم الحدیث: ٩٩٧) میں مروی ہے۔

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٩٩٧)

[4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٣٤)

[5] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٣٦)

[6] تفسیر الطبري (٤/ ٣٤٤) تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٣٥)

[7] فتح البیان (١/ ٤٤٢)

[8] تفسیر الطبري (٤/ ٣٤٨) تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٣٩٤) اس کی سند حسن ہے۔

صاحبِ غور وفکر ہے، اس کو یہ بات معلوم ہوسکتی ہے کہ دنیا آزمائشوں کا گھر ہے اور پھر فنا ہونے والی ہے اور آخرت دارِ جزا ہے، پھر باقی رہنے والا گھر ہے۔ یہی بات قتادہ اور ابن جریج ؒ نے بھی کہی ہے۔[1] معلوم ہوا کہ آخرت کو دنیا پر فضیلت ہے، پس پچھلے گھر کو پہلے گھر پر اختیار کرنا چاہیے۔

یتیموں کے ساتھ برتاؤ اور ان کے اموال کی اصلاح:

تیسرا سوال یہ تھا کہ یتیموں سے کیا برتاؤ کرنا چاہیے، لہٰذا یتیموں کے حق میں پہلے یہ حکم اُترا تھا کہ جو ان کا مال کھائے گا، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرے گا، اس پر جو یتیموں کو رکھنے والے تھے، وہ ان کا مال اور کھانے اور پہننے وغیرہ کا خرچ الگ رکھنے لگے کہ کہیں ہمارے خرچ میں کوئی چیز نہ آجائے، پھر سخت مشکل پیدا ہوگئی کہ ایک چیز یتیم کے لیے تیار کی، اس کے کام نہ آئی تو ضائع ہوگئی۔ تب یہ حکم اُترا کہ اپنا اور اُن کا خرچ ملا کر رکھو تو کوئی مضایقہ نہیں کہ ایک وقت اُن کی چیز آپ خرچ کرلے تو دوسرے وقت اپنی چیز اُن کے کام میں لگائے، لیکن نیت یتیم کے ساتھ بھلائی کی ہونی چاہیے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نیت دیکھتا ہے۔ ابن جریر ؒ نے سیدنا ابن عباس ؓ سے اس آیت کا یہی شانِ نزول بیان کیا ہے۔[2] صحابہ ؓ کی اور تابعین ؒ کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔ سیدہ عائشہ ؓ نے کہا ہے کہ میں یتیم کا مال اپنے پاس رکھنا پسند نہیں کرتی، کہیں اس کا کھانا پینا میرے کھانے پینے سے مل نہ جائے،[3] یعنی باوجود رخصت کے احتیاط بہتر ہے۔ ؏

چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

''عاقل وہ کام کیوں کرے کہ بعد میں شرمندگی اٹھانی پڑے۔''

یتیموں کے اموال میں تصرف کی صورتیں:

اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ ولیوں اور وصیوں کو یتیموں کے مال میں بہ طورِ بیع، مضاربت اور اجارہ وغیرہ تصرف کرنا درست ہے، اپنا کھانا چاہے ان کو کھلا دے، مگر ان کا کھانا آپ نہ کھائے اور نہ ان کے مال پر کوئی اُجرت یا اس کی بہتری کا کوئی عوض لے۔ مخالطت سے مراد یہ ہے کہ کھانے، پینے، پہننے میں میل جول رکھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ لفظ اس سے پہلے لفظ کا ناسخ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد برتاؤ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد رشتے داری ہے، جیسے داماد بنانا، مگر زیادہ بہتر یہ ہے کہ میل جول کسی خاص نوعیت پر نہ کرے، بلکہ آیت میں شامل ہر قسم کی مخالطت سمجھے۔ مذکورہ جملۂ شرطیہ سے یہی بات سمجھی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم پر تنگی کر دیتا، حرج اور مشقت میں

---

[1] تفسیر الطبري (٤/ ٣٤٨، ٣٤٩) تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٣٩٤)

[2] تفسیر الطبري (٤/ ٣٥٠) سنن أبي داود، رقم (٢٨٧١) مستدرك الحاكم (٢/ ١١٣) امام حاکم اور ذہبی ؒ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[3] تفسیر الطبري (٤/ ٣٥٥) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابراہیم نخعی ؒ کا سیدہ عائشہ ؓ سے سماع ثابت نہیں ہے۔

ڈال دیتا، مگر تم پر تخفیف کی اور میل جول کو جائز کر دیا، اب تم کو بھی چاہیے کہ اچھی طرح کا برتاؤ کرو، یتیموں کے حال اور مال کی اصلاح کی کوشش کرتے رہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ [الأنعام: ١٥٢] ''اور تم یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، مگر اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہو۔'' بلکہ ضرورت مند ولی کے لیے، اس کے مال میں سے دستور کے موافق کھانا جائز کر دیا ہے، اس شرط پر کہ جب آسودگی ہو تو اس کا بدلہ دینے کا ضامن ہو اور اگر مفت میں کھایا ہے تو اس کا بیان سورۃ النساء میں آئے گا۔ إن شاء اللہ تعالیٰ.

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٢١﴾

اور تم مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں، البتہ ایک ایمان والی لونڈی مشرک عورت سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمھیں بھلی ہی لگے، اور تم (مسلمان عورتیں) مشرک مردوں کے نکاح میں نہ دو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں، البتہ مومن غلام مشرک مرد سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمھیں بھلا ہی لگے۔ یہ (مشرک لوگ) دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے حکم سے تمھیں جنت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے اور وہ لوگوں کے لیے اپنی آیتیں بیان کرتا ہے، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ﴿221﴾

مشرک مردوں اور عورتوں سے نکاح کی حرمت:

پہلے مسلمان اور کافر میں رشتہ ناتا جائز تھا، اس آیت نے حرام قرار دے دیا گیا۔ اگر مرد نے یا عورت نے شرک کیا تو ان کا نکاح ٹوٹ گیا۔ شرک یہ کہ اللہ کی صفت کسی اور میں جانے، مثلاً: کسی کو سمجھے کہ اسے ہر بات معلوم ہے، یا وہ جو چاہے سو کرتا ہے، یا ہمارا برا یا بھلا کرنا اس کے اختیار میں ہے، یا اللہ کی جو تعظیم کرنی چاہیے وہ کسی اور کے لیے کرے، مثلاً: کسی چیز کو سجدہ کرے، یا اس کو مختار جان کر اس سے حاجت مانگے۔ باقی یہود و نصاریٰ اور مجوس کی عورتوں سے نکاح درست ہے، اگرچہ ان کو بھی مشرک فرمایا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ تحریم اللہ کی طرف سے مومنوں پر اس بات کے لیے ہے کہ وہ بت پرستوں کی عورتوں سے نکاح نہ کریں۔ پھر اگر اس آیت سے عموم مراد ہے، جس میں ہر مشرکہ، بت پرست اور اہل کتاب عورت

شامل ہے تو اہلِ کتاب کی عورتیں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی دلیل سے اس سے مستثنیٰ ہوں گی: ﴿ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ﴾ [المائدة: ٥] ''اور ان لوگوں کی پاک دامن عورتیں حلال ہیں، جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی، جب کہ تم انھیں ان کے مہر دے دو، نیز انھیں نکاح کی قید میں لانے والے بنو نہ کہ بدکاری کرنے والے۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اہلِ کتاب کی عورتوں کو اللہ تعالیٰ نے اس حکم سے مستثنیٰ فرمایا ہے۔[1] امام مجاہد، عکرمہ، مکحول، حسن، ضحاک اور ربیع رحمہ اللہ وغیرہم کا یہی قول ہے۔[2] مجوس اہلِ کتاب کے حکم میں ہیں، اس لیے مجوسیات بھی مستثنیٰ ٹھہریں گی۔ بعض نے کہا ہے کہ فقط بت پرست مراد ہیں، اس جگہ اہلِ کتاب کا بالکل ارادہ نہیں کیا گیا۔ یہ معنی اول معنی کے قریب ہیں۔[3]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مومنات مہاجرات کے علاوہ ہر قسم کی عورتوں سے منع فرمایا اور سوائے دینِ اسلام کے ہر دین والے کو حرام کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ﴿ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ﴾ [المائدة: ٥] ''اور جو ایمان سے انکار کرے گا تو اس کا عمل یقیناً برباد ہو گیا۔'' طلحہ بن عبیداللہ نے ایک یہودیہ سے اور حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے ایک نصرانیہ سے نکاح کیا تھا تو سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بہت غصہ کیا، یہاں تک کہ ان دونوں پر حملہ کرنا چاہا، انھوں نے کہا کہ آپ غصہ نہ کریں، ہم طلاق دیے دیتے ہیں۔ کہا کہ اگر ان کو طلاق دینا حلال ہے تو ان سے نکاح کرنا بھی حلال ہے، لیکن میں ان کو تم سے چھین لیتا ہوں اور انھیں ذلیل کروں گا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث اور اثر دونوں غریب ہیں۔[4] پھر امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اہلِ کتاب عورتوں سے نکاح کے مباح ہونے پر اجماع نقل کر کے یہ کہا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کام اس لیے کیا کہ لوگ مومنات میں بے رغبتی نہ کریں، یا کسی اور سبب سے ایسا کیا ہوگا۔

اہلِ کتاب کی عورتوں کا حکم:

شقیق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک یہودیہ سے نکاح کیا، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو لکھا کہ تم اس کو چھوڑ دو، جواب میں انھوں نے لکھا کہ آپ سمجھتے ہیں کہ وہ حرام ہے، جو میں اس کو نکال دوں؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں حرام خیال نہیں کرتا، لیکن میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ان کے سبب سے تم مومنات کو معطل نہ کرو۔ یہ اسناد صحیح ہے۔ یہ بھی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ مسلمان نصرانیہ سے نکاح کر سکتا ہے، نصرانی مسلمہ سے نکاح نہیں کر سکتا۔[5] یہ اسناد پہلی

[1] تفسیر الطبري (٤/ ٣٦٢) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٣٩٧) اس کی سند حسن ہے۔

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٣٩٧)

[3] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٣٦)

[4] تفسیر الطبري (٤/ ٣٦٤، ٣٦٥) تفسير ابن کثیر (١/ ٣٣٦) اس کی سند میں ''شہر بن حوشب'' متکلم فیہ راوی ہے۔

[5] تفسیر الطبري (٤/ ٢٦٦۔ ٣٦٧) ان دونوں کی اسناد صحیح ہے۔

اسناد سے بھی زیادہ صحیح ہے۔

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اہلِ کتاب کی عورتیں مسلمانوں کے نکاح میں آ سکتی ہیں، جب کہ اہلِ کتاب ہماری عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے۔[1] ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگرچہ اس حدیث کی سند میں ضعف ہے، لیکن اُمت کا اجماع اسی بات پر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی اہلِ کتاب سے نکاح کو مکروہ جانتے تھے۔ وہ اس آیت کی کہ ''مشرکات سے نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لائیں''، تاویل کرتے تھے۔[2] امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ کہتے تھے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا شرک ہوگا کہ وہ کہے عیسیٰ علیہ السلام میرے رب ہیں۔[3] امام احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ مشرکات سے مراد مشرکاتِ عرب ہیں، جو بت پوجتے تھے۔[4]

نکاح کا معیار:

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے پاس ایک کالی لونڈی تھی، انھوں نے غصے میں آ کر ایک طمانچہ مارا، پھر گھبرا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور حال بیان کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اس کا کیا حال ہے؟ کہا روزہ رکھتی ہے، نماز پڑھتی ہے، اچھی طرح وضو کرتی ہے، ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ'' (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں) کی گواہی دیتی ہے، فرمایا کہ وہ تو مومنہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ واللہ! میں اس کو آزاد کر کے اب اس سے نکاح کر لوں گا۔ جب ایسا کیا تو لوگوں نے طعن کیا کہ لونڈی سے نکاح کیا ہے۔ وہ لوگ مشرکوں سے ان کے حسب و نسب کی وجہ سے رشتہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری کہ مومن لونڈی مشرکہ سے بہتر ہے، گو وہ مشرکہ تم کو اچھی لگے۔[5] سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ تم عورتوں سے اُن کے حسن کی وجہ سے نکاح نہ کرو، قریب ہے کہ ان کا حسن ان کو ہلاک کر دے اور اُن سے اُن کی مال داری کی وجہ سے نکاح نہ کرو، قریب ہے کہ ان کا مال انھیں بہکا دے۔ ان سے دین کی وجہ سے نکاح کرو، دین دار کالی لونڈی بہتر ہے۔[6] (رواہ عبد بن حمید) اس کی سند میں افریقی ضعیف ہے۔ صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ عورت کو چار سبب سے نکاح میں لایا جاتا ہے: مال، حسب، جمال اور دین۔ سو دین والی کو لے، تجھ پر خاک پڑے۔

---

① تفسير الطبري (٤/ ٣٦٧) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ کا سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے سماع ثابت نہیں ہے۔ نیز اس میں ''اشعث بن سوار'' ضعیف راوی ہے۔

② تفسير الطبري (٤/ ٣٦٥۔ ٣٦٧) ③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٨١) ④ تفسير ابن كثير (١/ ٣٣٧)

⑤ تفسير الطبري (٤/ ٣٦٨، ٣٦٩) أسباب النزول۔ للواحدي (١/ ٤٥) اس کی سند حسن ہے۔

⑥ سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٥٩) مسند عبد بن حميد (١/ ١٣٣) اس کی سند میں ''افریقی'' ضعیف ہے۔ السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٠٦٠)

اسی طرح کی روایت صحیح مسلم میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔[1] پھر سیدنا ابن عمرو رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ دنیا برتنے کی چیز (متاع) ہے اور دنیا کا بہتر برتاؤ (متاع) نیک عورت ہے۔[2]

پھر فرمایا کہ مشرک مردوں سے مومنہ عورتوں کا نکاح نہ کرو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ﴾ [الممتحنة: ۱۰] ''نہ وہ (عورتیں) ان (کفار) کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ (کافر) ان (عورتوں) کے لیے حلال ہیں۔'' مومن اگر حبشی غلام ہو تو رئیس و سردار مشرک سے بہتر ہے، کیوں کہ ان کی معاشرت اور مخالطت سے دنیا کی محبت اور فتنہ مقصود ہے اور دنیا کو آخرت کے بدلے اختیار کرنا ہے، اس کا انجام بہت برا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو بلاتا ہے تو جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے، یہ مرتبہ امر و نہی کے اتباع سے ملتا ہے۔ مسئلے کا خلاصہ یہ ٹھہرا کہ مسلمان کا نکاح مشرکہ سے اور مومنہ کا نکاح مشرک سے جائز نہیں، گو وہ مشرکہ و مشرک عزت دار، مال دار اور سردار ہی کیوں نہ ہوں اور یہ مومنہ اور مومن غریب مفلس ہوں۔ پھر مومنات میں عورت دین دار تلاش کر کے نکاح کرے، مال، جمال اور حسب پر نہ گر پڑے۔ اس بارے میں رسالہ ''صلاح ذات البین'' (نواب صاحب کی تالیف) عمدہ کتاب ہے۔

اس آیتِ شریفہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صرف حسب و نسب کوئی چیز نہیں ہے۔ معتبر یہی کفاءتِ (برابری) اسلام ہے۔ امامِ مالک رحمہ اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ یہی قول زیادہ قابلِ ترجیح بھی ہے۔ اصل شرافت دین کی ہوتی ہے۔ بڑا شریف وہ ہے، جو دینِ اسلام پر زیادہ قائم ہے، گو نسب میں کم تر ہو۔ بڑا رذیل وہ ہے، جو بد دین ہے، اگرچہ کسی عالم یا مجتہد کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ نسب ذات کو کہتے ہیں، حسب صفت کو کہتے ہیں، مثلاً: قریشی ہاشمی ہونا نسب ہے۔ امیر رئیس ہونا حسب ہے۔ شریعت میں مال، جمال، حسب کا اعتبار نہیں کیا گیا، صرف دین کو معتبر رکھا گیا ہے۔ پھر اگر دین کے ساتھ ساتھ علم کی بزرگی اور ذات بھی جمع ہو جائے تو سب سے بہتر، ورنہ دین سب پر مقدم ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اگر تم ایسا نہ کرو گے، یعنی دین کو مقدم نہ رکھو گے، ذات پات دیکھو گے تو زمین میں ایک بڑا فتنہ اور فساد ہوگا۔ اس حدیث کو اہلِ سنن نے روایت کیا ہے۔[3]

یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہے کہ جیسا انجام فرمایا تھا ویسا ہی ہوا۔ جب سے اہلِ اسلام نے اسلام کی رعایت کو چھوڑ کر نرے باپ دادا کے حسب و نسب پر قناعت کی ہے، تب ہی سے شرفاء میں کمینوں کی خصلتیں آ گئی ہیں اور علم و فضل جاتا رہا ہے۔ ہر طرف سے ذلت و خواری نے منہ دکھلایا ہے، جیسا کیا تھا، ویسا پایا۔ إنا للہ۔ حسب و نسب سے بدتر فتنہ مال و جمال کا ہے۔ جمال ایک گھوڑے کا سبزہ ہوتا ہے اور مال ہاتھ کی میل ہے۔ ایک رات میں مال کو

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٠٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٦٦، ٧١٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٦٧)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٨٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٦٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٢٢)

چور، ڈاکو اور راہ زن لے جاتے ہیں، ایک دن کے بخار اور بیماری میں ساری خوبصورتی خاک میں مل جاتی ہے، وہ چیز جس کو بقا ہے، یہی دین ہے کہ ہر حال میں شریکِ حال رہتا ہے، دنیا میں عزت اور آخرت میں بخشش کا سبب بنتا ہے۔ اسلام و دین کے طفیل سیکڑوں غلام اور نومسلم اُمت کے امام ہو گئے، جنت کے بادشاہ بن گئے، ہزاروں امیر اور شریف دین کو چھوڑنے کے سبب سے دنیا میں ذلیل اور جہنم کے فقیر ہو گئے، نہ نسب کام آیا نہ حسب!

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۭ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَاۗءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّـوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝۲۲۲ نِسَاۗؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۡ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲۲۳

اور (اے نبی!) لوگ آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دیجیے: وہ تو گندگی ہے۔ تم حیض (کی حالت) میں عورتوں سے الگ رہو اور ان سے ہم بستری نہ کرو، یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں، پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے، بے شک اللہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے ﴿222﴾ تمھاری عورتیں تمھاری کھیتی ہیں، پس تم جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں آؤ اور تم اپنی ذات کے لیے (نیک عمل) آگے بھیجو اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک (ایک دن) تمھیں اس سے ملنا ہے اور مومنوں کو خوش خبری سنا دیجیے ﴿223﴾

حیض کی حالت میں عورتوں سے دور رہنے کا حکم اور ان سے مستفید ہونے کی صورت:

حیض اس خون کو کہتے ہیں جو عورتوں کی عادت ہے اور جو خلافِ عادت آئے، وہ بیماری ہے۔ حکم ہوا کہ اس وقت عورت سے الگ رہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ازار (تہ بند) سے آگے نہ بڑھے، پھر جب پاک ہوں تو جہاں سے حکم دیا ہے، وہاں سے جاؤ، یعنی دوسری جگہ جو ناپاک ہے، اس کا حکم تو کبھی نہیں فرمایا۔ پھر فرمایا جس طرح سے چاہو جاؤ، لیکن کھیتی ہی میں۔ کھیتی وہی ہے جہاں بیج ڈالے تو اُگے۔ اس کے بعد کی تدبیر کرو، یعنی اس صحبت میں نیت اولاد کی ہو، تاکہ ثواب ہو۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہودیوں میں جب کوئی عورت حیض سے ہوتی تو وہ اس

کے ساتھ نہ کھاتے پیتے اور نہ ایک گھر میں رہتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو اس پر یہ آیت اُتری۔ فرمایا کہ سب کام کرو، مگر صحبت نہ کرو۔[1] (الحديث رواه أحمد و مسلم)

معلوم ہوا کہ الگ رہنے سے مراد صحبت ترک کرنا ہے۔ اکثر علما کا یہی مذہب ہے کہ سوائے شرم گاہ کے حائضہ سے مباشرت جائز ہے۔ امام ابو داود رحمہ اللہ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے روایت کیا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حائضہ سے کسی چیز کا ارادہ کرتے تو اس کی شرم گاہ پر کچھ کپڑا ڈال دیتے۔[2] عمارہ رحمہ اللہ کی پھوپھی نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ ہم میں سے کسی کو حیض آتا ہے۔ میاں بیوی میں ایک ہی بچھونا ہوتا ہے، وہ کیا کریں؟ کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گھر کی مسجد میں آئے، میں سو گئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سردی لگی، مجھ سے فرمایا کہ میرے پاس آ، میں نے کہا کہ میں حیض سے ہوں، فرمایا کہ اپنی ران کھول دے، میں نے کھول دی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا رُخسار اور سینہ میری ران پر رکھ دیا، میں اُن پر جھک پڑی، یہاں تک کہ گرم ہو کر سو گئے۔ اس کو ابو داود نے روایت کیا ہے۔[3]

امام مسروق رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ مرد کے لیے عورت سے کیا جائز ہے، جبکہ وہ حائض ہو؟ کہا کہ سب کچھ، مگر شرم گاہ سے بچے۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ جماع نہ کرے۔ (رواہ ابن جریر) تیسری روایت یہ ہے کہ جو اِزار (تہبند) سے اوپر ہے، اس کا اختیار ہے۔[4] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، مجاہد، حسن اور عکرمہ رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم بستر ہونا اور ساتھ کھانا بلاخلاف حلال ہے۔[5] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سر دھوتی اور حائض ہوتی، وہ میری گود میں تکیہ لگاتے، قرآن پڑھتے اور میں حیض سے ہوتی۔[6] صحیح بخاری میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں گوشت کی ہڈی نوچتی اور حائض ہوتی، پھر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتی، آپ اسی جگہ سے اس کو کھاتے، جس جگہ میں نے اپنا منہ لگایا ہوتا۔ پانی پی کر دیتی، اسی جگہ منہ رکھ کر پیتے، جہاں سے میں نے پیا تھا۔[7]

سنن ابو داود میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ کہتی ہیں کہ میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک کپڑے میں ہوتے اور میں حائض ہوتی، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ لگ جاتا تو اس جگہ کو دھو کر نماز پڑھتے۔[8] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک روایت میں یوں آیا ہے کہ جب مجھ کو حیض آتا، میں چارپائی سے اُتر کر چٹائی پر بیٹھ جاتی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠٢) مسند أحمد (٣/ ١٣٢)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٦٦٣)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٠) اس کی سند ضعیف ہے کہ اس میں ''عبدالرحمن بن زیاد افریقی'' ضعیف ہے اور ''عمارہ بن غراب'' مجہول ہے۔

[4] تفسير الطبري (٤/ ٣٧٧۔ ٣٨١)

[5] تفسير ابن كثير (١/ ٣٣٨)

[6] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٧، ٣٠١)

[7] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠٠)

[8] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٩) امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وهذا إسناد صحيح'' (صحيح أبي داود: ٢/ ٢٨)

جاتی، جب تک کہ پاک نہ ہو لیتی۔ اس کو ابو داود نے روایت کیا ہے۔[1] یہ حدیث پاکیزگی اور احتیاط کو ظاہر کرتی ہے۔ میمونہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ جب نبی مکرم ﷺ کسی بیوی سے مباشرت کا ارادہ کرتے اور وہ حائض ہوتی تو فرماتے کہ اِزار پہن لے۔[2] (رواه البخاري) یعنی ازار سے نیچے کو چھوڑ کر باقی مباشرت کرنا حلال ہے۔ عبداللہ بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ مرد کو اپنی بیوی سے جب کہ وہ حائض ہو، کیا درست ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: «مَا فَوْقَ الْإِزَارِ»[3] ''جو کچھ اس کے ازار کے اوپر اوپر ہے۔'' (رواه أحمد و أهل السنن إلا النسائي) یہی مضمون مرفوعاً معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے سوال کے جواب میں فرمایا تھا، لیکن اس میں اتنا اور فرمایا کہ بچنا اس سے افضل ہے۔[4] (رواه أبو داود) یہ حدیثیں اس شخص کی دلیل ہیں جو مافوق الازار کو حلال کہتا ہے، یہی امام شافعی رحمہ اللہ کا قول بھی ہے کہ جس کو بہت سے اہلِ عراق وغیرہم نے ترجیح دی ہے۔ ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ مافوق الازار حلال نہیں۔ ان کا ماخذ یہ ہے کہ مافوق الازار حریمِ فرج ہے، اس لیے اس کی مباشرت حرام ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ صحبت کر بیٹھے۔

حالتِ حیض میں جماع کرنے کا کفارہ:

اللہ تعالیٰ نے اس حال میں صحبت کو حرام کیا ہے، پھر اگر کسی نے ایسا کیا تو توبہ و استغفار کرے۔ کفارے میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ اہلِ سنن نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جو شخص حائض کے پاس گیا، وہ ایک دینار یا آدھا دینار صدقہ دے۔[5] ترمذی کے الفاظ یہ ہیں کہ اگر خون سرخ ہو تو ایک دینار دے اور اگر زرد ہو تو آدھا دینار۔[6] امام احمد رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ حیض والی عورت سے وطی کرنے کا کفارہ ایک دینار ہے، اگر شروع حیض میں کی ہے، لیکن اگر خون کے آخری وقت میں کی ہے اور وہ ابھی تک نہائی نہیں ہے تو آدھا دینار ہے۔[7] امام شافعی رحمہ اللہ کا

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧١) اس کی سند میں ''ابو الیمان'' مجہول راوی ہے۔ امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسناده ضعيف و الحديث منكر" (ضعيف أبي داود: ١/ ١١٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٧)

[3] مسند أحمد (٤/ ٣٤٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٥١) امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسناده صحيح" (صحيح أبي داود: ١/ ٣٨٤)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٣) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عبدالرحمٰن بن عائذ رحمہ اللہ کا سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ مزید دیکھیں: ضعيف أبي داود۔ للألباني (١/ ٧٢۔ ٧٤)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٨٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٤٠) امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسناده صحيح" (صحيح أبي داود: ٢/ ١٥)

[6] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٧)

[7] مسند أحمد (١/ ٣٦٧) اس روایت اور گذشتہ روایت کی سند میں ''عبدالکریم بن ابی المخارق'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ امام البانی رحمہ اللہ نے اس کے موقوف ہونے کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: صحيح أبي داود (٢/ ٢٠)

دوسرا قول جدید یہ ہے کہ استغفار کرے اور کچھ نہیں۔ جمہور بھی اسی طرف گئے ہیں، اس لیے کہ ان کے نزدیک اس حدیث کا مرفوع ہونا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اکثر ائمۂ حدیث کے نزدیک اس حدیث کا موقوف ہونا صحیح ہے۔

کیا مجامعت کے لیے صرف حیض سے پاک ہونا ضروری ہے یا غسل بھی؟

اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ تم ان کے نزدیک نہ جاؤ، جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں، اس قول کی تفسیر ہے کہ تم حیض میں کنارہ کش رہو۔ نزدیک نہ جانے کا مطلب یہ ہے کہ جماع کے پاس نہ جاؤ، جب تک کہ حیض موجود ہے۔ اس سے یہ سمجھا گیا کہ جب حیض منقطع ہو جائے تو عورت کے پاس جانا حلال ہوگا۔ طہر قریب جانے کی دلیل ہے۔ سیدہ میمونہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا نے جو یہ کہا ہے کہ جب ہم میں سے کوئی پاک ہوتی تو وہ اُزار پہن کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے میں گھس جاتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جماع کا ارادہ فرماتے، یعنی غسل سے قبل۔ مگر تطہر (یعنی غسل کر لینا) اچھا ہے اور اس بات کا ارشاد ہے کہ غسل کر لینے کے بعد غشیان (بیوی کو جماع کے لیے ڈھانپنا) اچھا ہوتا ہے۔ امام ابن حزم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر حیض کے بعد جماع واجب ہے، اس کی دلیل یہ آیت ہے: ﴿ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ ﴾ [البقرة: ٢٢٢] ''پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ۔'' مگر یہ کوئی دلیل نہیں ہے، اس لیے کہ حظر (منع) کے بعد امر ہے۔ (یعنی اس کا مطلب، جواز ہے نہ کہ فرض و واجب) علمائے اُصول کا اس میں اختلاف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ صرف وجوب کے لیے ہے، یہ لوگ امام ابن حزم رحمہ اللہ کے جواب کے محتاج ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ جواز کے لیے ہے، کیوں کہ نہی متقدم کو قرینہ صارفہ کہتے ہیں، مگر اس میں اعتراض ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس بات پر دلیل قائم ہوتی ہے، وہ یہ بات ہے کہ حکم کو اس حالت پر لوٹائیں، جو ممانعت سے پہلے تھا، اگر واجب تھا تو واجب ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ ﴾ [التوبة: ٥] ''پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو تم مشرکوں کو قتل کر دو۔'' اور اگر مباح تھا تو مباح ہے، جیسے اس کا فرمان ہے: ﴿ وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا ﴾ [المائدة: ٢] ''اور جب تم احرام کھول دو تو شکار کر سکتے ہو۔'' ﴿ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوا فِي ﴾ [الجمعة: ١٠] ''پھر جب نماز ہو چکے تو پھیل جاؤ زمین میں۔'' اس قول پر بہت سے دلائل جمع ہو سکتے ہیں۔ اس کو امام غزالی رحمہ اللہ وغیرہ نے حکایت کیا ہے۔ بعض ائمۂ متاخرین نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو صحیح کہا ہے۔ علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عورت کا حیض جب منقطع ہو جائے تو وہ جب تک نہا نہ لے یا اگر نہانا مشکل ہے تو تیمّم نہ کر لے، تب تک وہ حلال نہیں ہوتی، مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب حیض کی اکثر مدت، یعنی دس دن پورے ہو جائیں تو وہ صرف خون کے انقطاع سے حلال ہو جاتی ہے اور غسل کی محتاج نہیں رہتی۔[1]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٣٩)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ طہر سے مراد خون سے پاکیزگی ہے اور تطہر سے مراد نہانا ہے۔ امام مجاہد، عکرمہ، حسن، مقاتل بن حیان اور لیث بن سعد رحمہم اللہ وغیرہم کا یہی قول ہے۔[1] لفظ ﴿ حَيْثُ ﴾ کے معنی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمہ اللہ کے نزدیک فرج کے ہیں، یعنی فرج سے تجاوز نہ کرے اور دوسری طرف نہ جائے، جس نے تجاوز کیا، اس نے زیادتی کی۔[2] اس میں دُبر میں وطی کی حرمت کی دلیل ہے۔ اس بارے میں تقریر عن قریب آنے والی ہے۔ إن شاء اللہ تعالیٰ۔ ابو رزین، عکرمہ اور ضحاک رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جب حیض سے پاک ہو جائیں، تب اُن کے پاس جاؤ،[3] اسی لیے یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو چاہتا ہے، اگرچہ مقررِ عشیان کیا ہو۔ اور ستھرائی والوں کو دوست رکھتا ہے، جو گندگی اور گھن کی چیز سے پاک صاف رہتے ہیں، یا بے موقع جگہ میں نہیں جاتے۔

جماع کی جگہ اور مختلف آسن:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: ﴿ حَرْثٌ ﴾ سے مراد ولادت کی جگہ ہے۔[4] یہ جو فرمایا کہ جس طرح چاہو جاؤ، اس کا مطلب یہ ہے کہ آگے پیچھے سے جاؤ، مگر یہ جانا ایک ہی سوراخ میں ہو، جس طرح احادیث میں مروی ہے۔ صحیح بخاری میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہود کہتے تھے کہ جب جماع عورت کے پیچھے کی طرف سے کیا جائے تو بچہ ''أحول'' (بھینگا) پیدا ہوتا ہے، اس پر آیت زیرِ تفسیر اُتری۔ اس کو مسلم اور ابو داود نے بھی روایت کیا ہے۔[5] امام ابن جریج رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سامنے سے ہو یا پیچھے سے، جبکہ فرج ہی میں ہو۔[6] سیدنا معاویہ قشیری رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ ہم اپنی عورتوں سے کس چیز کو لیں، کس کو چھوڑیں؟ فرمایا کہ وہ تیری کھیتی ہے، جدھر سے چاہے، مگر اس کے منہ پر نہ مار نہ اس کو بدصورت کہہ نہ اس کو جدا کر، مگر گھر میں۔[7] الحدیث۔ (رواہ أحمد و أهل السنن) امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ حمیر کے کچھ لوگ آئے اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! ہم لوگ عورتوں کو چاہتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرماتے ہیں؟ اس پر یہ آیت اُتری۔[8] امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک ان کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ یہ آیت انصار کے حق میں اُتری ہے، انھوں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کے پاس ہر حالت میں آؤ، اگر وہ آنا فرج میں ہو۔[9]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٤٠٢) [2] تفسیر الطبري (٤/ ٣٨٨، ٣٨٩)

[3] تفسیر الطبري (٤/ ٣٩١، ٣٩٢) [4] تفسیر الطبري (٤/ ٣٩٧۔ ٣٩٨) اس کی سند حسن ہے۔

[5] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٢٥٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٣٥) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢١٦٣)

[6] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٤٠٤، ٤٠٥) اس کی سند حسن ہے۔

[7] مسند أحمد (٥/ ٣) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢١٤٣) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٦٨٧)

[8] تفسیر الطبري (٤/ ٤١٣) تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٤٠٤) اس کی سند حسن ہے۔

[9] مسند أحمد (١/ ٢٦٨) اس کی سند میں ''رشدین بن سعد'' ضعیف راوی ہے۔

امام ابوجعفر طحاوی نے "مشکل الآثار" میں سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے دُبر میں صحبت کی تو لوگوں نے اس پر انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اس کو ابن جریر اور ابو یعلیٰ رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔[1] اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ جب مہاجرین مدینہ میں آئے، انصار کی عورتوں سے نکاح کیا اور عورتوں کے پاس پشت کی جانب سے گئے تو انصاریہ نے انکار کیا۔ نبی مکرم ﷺ سے پوچھا تو اس پر یہ آیت اُتری اور فرمایا: «أَنَّىٰ شِئْتُمْ صِمَامًا وَّاحِداً» یعنی جیسے تم چاہو اور سوراخ ایک ہی ہو۔ (رواہ أحمد) امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔[2] حفصہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ ایک عورت آئی، اس نے کہا کہ میرا شوہر میرے پاس پشت کی طرف سے آتا ہے، میں اس بات کو مکروہ جانتی ہوں۔ نبی مکرم ﷺ کو خبر ہوئی، آپ ﷺ نے فرمایا: «لَا بَأْسَ إِذَا كَانَ فِيْ صِمَامٍ وَّاحِدٍ» یعنی اگر ایک ہی سوراخ میں آتا ہے تو کوئی ڈر نہیں۔[3] (رواہ ابن کثیر من طریق حماد بن أبي حنیفة)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے آ کر کہا کہ اے اللہ کے رسول! میں تو ہلاک ہو گیا۔ فرمایا: کیا ہوا؟ کہا: رات کو میں نے اپنی بیوی کو پھیر دیا، یعنی پشت کی طرف سے صحبت کی؟ رسول اللہ ﷺ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اللہ نے یہ آیت بھیجی، یعنی آگے پیچھے سے آؤ، لیکن دُبر اور حیض سے بچو۔ اس کو احمد نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے حسن غریب کہا ہے۔[4] سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اپنی بیوی سے پشت کی طرف سے صحبت کی، لوگوں نے کہا کہ دیکھو، اس نے یہ کام کیا ہے۔ اس پر یہ آیت اُتری۔[5] (رواہ أبو یعلیٰ) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اہلِ کتاب عورتوں کے پاس ایک ہی طرف سے آتے تھے۔ اس میں عورت کا بڑا پردہ رہتا تھا۔ انصار کے ایک قبیلے نے ان سے اس بات کو لیا، جب کہ قریش عورتوں کو بری طرح لتاڑتے تھے۔ آگے پیچھے اور سامنے سے لذت اُٹھاتے تھے۔ جب مدینے میں آئے تو ایک قریشی نے انصاریہ سے نکاح کیا اور اس سے اسی وضع پر ملے۔ اس نے انکار کیا اور کہا کہ ہمارے پاس ایک ہی طرف سے آؤ، ورنہ الگ رہو۔ یہ بات نبی مکرم ﷺ تک پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری، یعنی جس طرح چاہو، آگے پیچھے سامنے سے آؤ، مگر صرف بچے کی جگہ میں۔[6] ابو داود اس حدیث کو بیان کرنے میں متفرد ہیں۔

---

[1] مشکل الآثار، للطحاوي (١٥/ ٤١٠) تفسیر الطبري (٤/ ٤٠٨) مسند أبي یعلیٰ (٢/ ٣٥٤) اس کی سند میں "ہشام بن سعد" متکلم فیہ راوی ہے۔

[2] مسند أحمد (٦/ ٣٠٥) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٩٧٩) امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسناده صحیح علی شرط مسلم" (آداب الزفاف: ١/ ٣٠)

[3] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٤١) اس کی سند میں "حماد بن ابی حنیفہ" ضعیف راوی ہے۔

[4] سنن الترمذي، رقم (٢٩٨٠) مسند أحمد (١/ ٢٩٧) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله ثقات" (مجمع الزوائد: ٧/ ٣٦)

[5] اس کی تخریج زیرِ تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔

[6] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢١٦٤) مستدرك الحاکم (٢/ ٢١٢) امام حاکم اور ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

عورتوں کی دُبر میں مجامعت کی حرمت:

اگلی حدیثیں صحت میں اس کی شاہد ہیں، خصوصاً اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت، جو اِسی سلسلے میں ہے اور اس حدیث سے ملتی جلتی ہے۔ طبرانی رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اسی طوالت کے ساتھ روایت کیا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت وطی فی الدبر کے متعلق آئی ہے، یعنی دبر کی طرف سے آنے میں نہ کہ دُبر میں۔ خود سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے نسائی میں نافع رحمہ اللہ سے مروی حدیث میں تصریح کی ہے۔[2] یہ اسناد صحیح ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح روایت یہی ہے کہ دُبر میں جماع جائز اور حلال نہیں ہے، اگرچہ یہ قول مدینے کے فقہا کے ایک گروہ کی طرف منسوب ہے اور بعض نے اس کو "کتاب السر" میں امام مالک رحمہ اللہ کی طرف نسبت کیا ہے۔ اکثر لوگ امام مالک رحمہ اللہ سے اس روایت کو صحیح نہیں سمجھتے۔[3]

متعدد طریقوں سے مروی احادیث میں اس فعل کی مذمت آئی ہے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم شرم کرتے ہو اور اللہ حق بات سے نہیں شرماتا۔ یہ بات حلال نہیں ہے کہ تم عورتوں کے پاس ان کی دُبر سے آؤ۔[4] (رواه حسن بن عرفه) سیدنا خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دُبر میں آنے سے منع فرمایا ہے۔ (رواه أحمد) اس کو نسائی اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔[5] مگر ان کی اسناد میں بڑا اختلاف ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مرد کی طرف نظر نہیں کرتا، جو عورت کی دُبر میں آتا ہے۔ (رواه النسائي) امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن غریب ہے، اس کو ابن حبان اور ابن حزم رحمہما اللہ نے بھی روایت کیا ہے،[6] لیکن نسائی کی روایت موقوفاً آئی ہے۔ ایک آدمی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ عورت کی دُبر میں آنے کا کیا حکم ہے؟ کہا کہ تو مجھ سے کفر کا سوال کرتا ہے۔[7] (رواه عبد بن حميد)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اسناد صحیح ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ایک شخص نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ میں اپنی بیوی کے پاس دُبر میں جاتا ہوں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ اَنّٰى شِئْتُمْ ﴾ میں نے گمان

---

① المعجم الكبير (۱۱/ ۷۷) مستدرك الحاكم (۲/ ۲۱۲) امام حاکم اور ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

② سنن النسائي الكبرىٰ (۵/ ۳۱۵) اس کی سند حسن ہے۔ ③ تفسير ابن كثير (۱/ ۳٤۲)

④ حسن بن عرفہ رحمہ اللہ کی سند سے امام الدارقطنی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ دیکھیں: سنن الدارقطني (۳/ ۲۸۸) صحيح الترغيب والترهيب (۲/ ۳۱۳)

⑤ مسند أحمد (۵/ ۲۱۵) سنن النسائي الكبرىٰ (۵/ ۳۱٦) سنن ابن ماجه، رقم: (۱۹۲٤) صحيح الترغيب والترهيب (۲/ ۳۱۲)

⑥ سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۱٦۵) سنن النسائي، الكبرىٰ (۵/ ۳۲۰) صحيح ابن حبان (۹/ ۵۱۷) صحيح الجامع (۷۸۰۱)

⑦ سنن النسائي الكبرىٰ (۵/ ۳۲۱) مصنف عبد الرزاق (۱۱/ ٤٤۲) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسناده قوي" (تلخيص الحبير: ۳/ ۱۸۱)

کیا کہ یہ کام حلال ہے۔ کہا: اے احمق! اس سے مراد یہ ہے کہ کھڑے، بیٹھے، آگے، پیچھے سے جاؤ، مگر سامنے سے اور دوسری طرف تجاوز نہ کرو۔[1] (رواه عبد بن حميد) حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ رضی اللہ عنہ میں مرفوعاً مروی ہے کہ جو کوئی عورت کی دُبر میں آتا ہے تو یہ لواطتِ صغریٰ ہے۔ (رواه أحمد) سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ کام نہیں کرتا، مگر کافر۔[2] سیدنا علی بن طلق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع کیا کہ عورتوں کی دُبر میں صحبت کی جائے، پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ حق بات سے شرم نہیں کرتا۔ (رواه أحمد) ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔[3] بعض نے اس حدیث کو مسند علی بن ابی طالب میں لکھ دیا ہے، جس طرح کہ مسند احمد میں بھی ایسا ہی واقع ہوا، مگر صحیح علی بن طلق ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ مرفوع روایت مروی ہے کہ جو کوئی عورت کی دُبر میں آتا ہے، اللہ اس کی طرف نہ دیکھے گا۔[4] (رواه أحمد) دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ اس مرد کی طرف نظر نہیں کرتا، جو عورت کی دُبر میں جماع کرتا ہے۔[5] (رواه أحمد و ابن ماجه) تیسری روایت یہ ہے کہ وہ شخص ملعون ہے، جو عورت کی دُبر میں آتا ہے۔[6] (رواه أحمد و أبو داود والنسائي) چوتھی روایت یہ ہے کہ جو حائضہ کے پاس آیا یا عورت کی دُبر میں یا کاہن کے پاس آیا، وہ اس کا کافر ہوا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اُترا۔ (رواه أحمد و أهل السنن) ترمذی نے کہا ہے کہ بخاری نے اس حدیث کو ضعیف بتایا ہے۔[7] لیکن بخاری نے یہ بات حکیم ترمذی کے حق میں کہی ہے نہ کہ حکیم اثرم کے حق میں۔ لہٰذا اس حدیث میں حکیم اثرم ابو تمیمہ سے روایت کرتے ہیں نہ کہ حکیم ترمذی۔

پانچویں روایت یہ ہے کہ اللہ سے شرماؤ پوری طرح شرمانا، عورتوں کی دُبر میں نہ آؤ۔[8] اس طریق کے ساتھ نسائی متفرد ہیں۔ حمزہ بن محمد کنانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث ابو سلمہ اور سعید، جو اِس کی سند میں ہیں، کی وجہ سے منکر اور باطل ہے۔ عبد المالک نے اگر اس حدیث کو سعید سے سنا ہے تو اختلاط کے بعد سنا ہوگا۔ ہاں ترمذی رحمہ اللہ نے ابو سلمہ

---

(1) تفسير ابن كثير (١/ ٣٤٣) الدر المنثور (١/ ٦٣١)

(2) مسند أحمد (٢/ ٢١٠) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣١٢)

(3) ہمارے پاس مسند احمد (٥/ ٢١٣) کے مطبوع نسخے میں یہ روایت ''علی بن طلق رضی اللہ عنہ'' کے بجائے خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ'' سے مروی ہے، البتہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کو أطراف المسند میں ''علی بن طلق رضی اللہ عنہ'' سے ذکر کیا ہے۔ دیکھیں: أطراف المسند (٤/ ٣٨٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٦٤) اس کی سند حسن ہے۔

(4) مسند أحمد (٢/ ٢٧٢) شعب الإيمان (٤/ ٣٥٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٦٩١)

(5) مسند أحمد (٢/ ٣٤٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٢٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٨٠٢)

(6) مسند أحمد (٢/ ٤٤٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٦٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٣٢٣) صحيح الجامع (٥٨٨٩)

(7) مسند أحمد (٢/ ٤٧٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٠٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٣٢٣) سنن ابن ماجه، رقم: (٦٣٩) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣١٤)

(8) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٣٢٢)

سے روایت کیا ہے کہ وہ اس کام سے منع کرتے تھے، لیکن سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یہ حدیث نہیں آئی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بہت اچھی تنقید ہے، لیکن عبدالملک کا مختلط ہونا حمزہ کے سوا کسی نے ذکر نہیں کیا، وہ ثقہ ہے، دحیم اور ابو حاتم رحمہ اللہ نے اس میں کلام کیا ہے۔ ابن حبان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے ساتھ حجت لینا جائز نہیں ہے۔ یہ حدیث اور بھی دو طریق سے سیدنا ابوسلمہ سے آئی ہے، مگر کوئی صحیح نہیں۔[1] چھٹی موقوف روایت یہ ہے کہ مردوں کا عورتوں کی دُبر میں آنا کفر ہے۔[2] (رواه النسائي) ساتویں موقوف روایت یہ ہے کہ جو کوئی مردوں اور عورتوں کے پاس اُن کی دُبر میں آیا، وہ کافر ہوا۔[3] (رواه النسائي) سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ عورتوں کے پاس ان کی دُبر میں مت آؤ۔[4] (رواه النسائي) یہ بھی موقوف ہے۔ طلق بن یزید یا یزید بن طلق سے مرفوع روایت مروی ہے کہ اللہ حق سے نہیں شرماتا، تم عورتوں کی دُبر میں نہ آؤ۔[5] (رواه أحمد)

کسی حدیث میں لفظِ حشوش آیا ہے، کسی میں محاش، کسی میں اَعجاز، کسی میں اَستاہ، جب کہ اکثر میں اَدبار ہے۔ یہ سب قریب المفہوم ہیں (یعنی پیٹھ میں نہ آؤ)۔ اثرم کی سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت اس طرح ہے کہ عورتوں کے محاش حرام ہیں،[6] مگر اس روایت کے موقوف ہونے کو زیادہ صحیح کہا ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ اَعجازِ نساء میں نہ آؤ۔ اس کو امام ابن عدی رحمہ اللہ نے مرفوعاً روایت کیا ہے،[7] مگر اس کی سند میں محمد جزری اور جزری کے شیخ ضعیف ہیں۔ ایک آدمی نے سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے یہی مسئلہ پوچھا تھا؟ کہا: تو نیچے گرا، اللہ تجھ کو نیچے گرائے۔ کیا تو نے اللہ کا یہ فرمان نہیں سنا: ﴿ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الأعراف: ٨٠] ''بے شک تم ایسی فحاشی (بدکاری) پر اُتر آئے ہو، جو تم سے پہلے جہانوں میں سے کسی نے بھی نہیں کی۔''[8] (رواه الثوري) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پہلے سیدنا ابن مسعود، ابو الدرداء، ابو ہریرہ، ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کا وطی فی الدبر کی حرمت کے بارے میں قول گزر چکا ہے، وہی قول سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی بلاشک وشبہہ ثابت ہے کہ وہ اس کام کو حرام کہتے تھے۔[9]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٤٤)
[2] سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٣٢٣)
[3] سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٣٢٤)
[4] سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٣٢١).
[5] مسند احمد میں ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت ''طلق بن یزید'' یا ''یزید بن طلق'' کے بجائے ''خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ'' سے مروی ہے۔ دیکھیں: مسند أحمد (٥/ ٢١٤) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣١٢)
[6] مذکورہ روایت الاثرم کی سند کے علاوہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ''سنن الدارمي'' (١/ ٢٧٦) اور ''سنن البيهقي الكبرىٰ'' (٧/ ١٩٩) میں مروی ہے۔ اس کی سند حسن ہے۔
[7] الكامل لابن عدي (٣/ ٢٠٥)
[8] مذکورہ روایت سفیان الثوری رحمہ اللہ کی سند سے سنن بیہقی میں مروی ہے۔ دیکھیں: سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ١٩٨)
[9] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٤٥)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور فقہائے مدینہ کا موقف:

امام دارمی نے سعید بن یسار رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے یہ مسئلہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا تھا اور اس کو تحمیض کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا تھا۔ کہا کہ بھلا کوئی مسلمان ایسا کام کرتا ہے؟[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ اسناد صحیح ہے۔ یہ تحریم پر نصِ صریح ہے، پس جو کچھ بہ طورِ احتمال اس کے خلاف سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ اس محکم روایت کے سامنے مردود ہے۔ معمر بن عیسیٰ رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ یہ کام حرام ہے۔ اسرائیل بن روح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے امام مالک رحمہ اللہ سے پوچھا کہ دُبر میں آنے کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ کہا کہ تم لوگ گنوار ہو، بھلا کہیں کھیتی بھی بغیر کھیت کے ہوتی ہے؟ فرج سے تجاوز نہ کرو۔ میں نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ اس کے قائل ہیں؟ انھوں نے دوبارہ جواب دیا کہ وہ مجھ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔[2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ سے یہی ثابت ہے۔ امام ابو حنیفہ، شافعی، احمد رحمہم اللہ اور اُن کے اصحاب کا یہی قول ہے، یقیناً اسی طرف سعید بن مسیّب، ابوسلمہ، عکرمہ، طاؤس، عطا، سعید بن جبیر، عروہ بن زبیر، مجاہد، حسن رحمہم اللہ وغیرہ سلف گئے ہیں، سب نے اس کام پر سخت انکار کیا ہے۔ بعض نے ایسا کرنے والے پر کفر کا اطلاق کیا ہے۔ جمہور علما کا یہی مذہب ہے۔ اس بارے میں جو بعض فقہائے مدینہ اور مالک رحمہ اللہ سے بیان کیا گیا ہے، اس پر اعتراض ہے۔ عبدالرحمٰن بن قاسم رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے کسی مقتدائے دین کو اس کے حلال ہونے میں شک کرتے ہوئے نہیں پایا، یعنی سب نے حرام ہی کہا ہے، پھر آیت پڑھ کر کہا کہ اس سے زیادہ اور کیا بیان ہوگا۔ (رواہ الطحاوي)

امام حاکم، دارقطنی اور خطیب بغدادی نے امام مالک رحمہ اللہ سے کئی روایات اس کے مباح ہونے کے بارے میں نقل کی ہیں، لیکن ان کی اسانید سخت ضعیف اور کمزور ہیں۔ ہمارے شیخ حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اس بارے میں ایک جز جمع کیا ہے، پھر امام طحاوی رحمہ اللہ نے ابن عبدالحکم سے روایت کیا ہے کہ اس نے امام شافعی رحمہ اللہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ نبی مکرم ﷺ سے اس کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں کوئی بات صحت کو نہیں پہنچی، قیاس یہ ہے کہ حلال ہو۔ امام ربیع رحمہ اللہ نے قسم کھا کر کہا: ”قسم ہے اللہ کی! جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ ابن عبدالحکم نے امام شافعی رحمہ اللہ پر جھوٹ باندھا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے تو چھے کتابوں میں اس کے حرام ہونے کی صراحت کی ہے۔[3] واللہ أعلم.

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں اس بارے میں واضح بیان ہے کہ لفظ ﴿ حَرْثٌ ﴾ سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ سوائے فرج کے اور کسی جگہ کی اجازت واقع نہیں ہوئی، جو آگے کی طرف ہے، کیوں کہ پیداوار کی جگہ وہی ہے۔ عورت کی شرم گاہ کو

---

[1] سنن الدارمي (١/ ٢٧٧) [2] إرشاد الساري (٧/ ٣٥) تفسير ابن كثير (١/ ٣٤٦) [3] تفسير ابن كثير (١/ ٣٤٦)

زمین، نطفے کو بیج اور بچے کو کھیتی سے مشابہت دی ہے۔ ﴿ اَنّٰى شِئْتُمْ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح چاہو آگے، پیچھے، سامنے لٹا کر، بٹھا کر، اُٹھا کر سامنے، پسِ پشت سے آؤ، مگر حرث (کھیتی) کی جگہ میں آؤ۔ سیبویہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ ﴿ اَنّٰى ﴾ بمعنی کیف ہے۔ سارے سلف اور خلف صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین و ائمہ دین و مجتہدین شرع مبین اسی طرف گئے ہیں کہ دُبر میں آنا حرام ہے۔ سارے ماہرین و مشائخ مالکیہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتے کہ "کتاب السر" امام مالک کی کتاب ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا رُتبہ اس سے بہت بلند ہے کہ وہ ایسی کتاب تالیف کریں۔ ابن شعبان نے کتاب "جماع النسوان" میں اس کو صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کی ایک کثیر جماعت کی طرف منسوب کیا ہے، جسے ابن العربی نے ذکر کیا ہے۔ مگر وہ اقوال صحیح نہیں ہیں۔ جو بات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ سے مرفوعاً اور موقوفاً آئی ہے، وہ یہی ہے کہ وطی فی الدبر قطعی حرام ہے۔ جن سے اس حرام کا جواز مروی ہے، انھوں نے اس جواز کی کوئی دلیل بیان نہیں کی، پھر اُن کے اقوال پر چلنا کس طرح صحیح ہوسکتا ہے؟ اگر جواز کو مذکورہ آیتِ شریفہ سے سمجھا ہے تو ان کی سمجھ میں غلطی ہوئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ہمارے لیے قرآن کی جو تفسیر کر دی ہے، وہی ہمیں کافی ہے۔ ان سے زیادہ قرآن کو اور کون سمجھے گا؟ جس نے یہ سمجھا کہ آیت کے نزول کا سبب بھی یہی تھا کہ کسی شخص نے ایسا کام کیا تھا تو بھی آیت میں اس کے حلال ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ جس نے یہ گمان کیا کہ آیت میں اس کے حلال ہونے کی دلیل ہے، اس نے خطا کی۔ آیت تو اس کے حرام ہونے کی دلیل ہے۔ نزول کے سبب سے یہ بات لازمی نہیں کہ آیت اس حرام کام کو حلال کرنے کے لیے اُتری ہے، کیوں کہ آیات کا نزول کبھی کسی چیز کو حلال کرنے کے لیے ہوتا ہے اور کبھی حرام کرنے کے لیے۔ مانا کہ اس آیت کا سببِ نزول یہی ہو، مگر جواب میں ﴿ حَرْثٌ ﴾ کا ذکر کر کے اس سے منع کر دیا کہ اس طرح سے جائز ہے۔ اس طرح سے نہیں کہ جس طرح تو نے کیا۔[1]

یہ جو فرمایا کہ آگے بھیجو، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اطاعت بجا لاؤ، منع کی ہوئی چیزوں سے بچو، حرام کی ہوئی چیزوں کو چھوڑ دو، اسی لیے یہ فرمایا کہ اللہ سے ڈرو، تم کو اس سے ملنا ہے، یعنی وہ تمھارے اعمال کا حساب لے گا۔ پھر کہا کہ مومنوں کو بشارت ہے، یعنی ان کو جو حکم دو، اطاعت کرنے والے اور ممنوع کو چھوڑنے والے ہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس تقدیم سے مراد یہ ہے کہ جماع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لے۔[2] صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ تم میں سے جب کوئی اپنی بیوی کے پاس جائے تو کہے: «بِسْمِ اللّٰهِ اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا»[3] "شروع کرتا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ، اے اللہ! بچا ہم کو شیطان سے اور بچا شیطان سے اس کو جو تو ہم کو دے" یعنی اولاد۔ تو اگر بچہ مقدر میں ہوگا تو شیطان اس کو کبھی نقصان نہ پہنچا سکے گا۔ کسی نے کہا ہے کہ تقدیم سے مراد اولاد چاہنا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ پارسا عورتوں سے نکاح کرنا ہے۔

---

[1] فتح البیان (١/ ٤٤٩۔ ٣٥٢) [2] تفسیر الطبري (٤/ ٤١٧) [3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٤١)

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْۤ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾

اور تم اللہ کا نام اپنی قسموں کے لیے استعمال نہ کرو، یہ کہ تم نیکی (نہیں) کرو گے اور تقویٰ (نہیں) اپناؤ گے اور لوگوں کے درمیان صلح (نہیں) کراؤ گے اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (224) اللہ تمھاری لغو قسموں پر تمھیں نہیں پکڑے گا، لیکن وہ ان قسموں پر تمھیں ضرور پکڑے گا جن کا تمھارے دلوں نے ارادہ کیا، اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت حوصلے والا ہے (225)

یعنی اللہ کی قسم اچھا کام چھوڑنے پر نہ کھائے، مثلاً: ماں باپ سے نہیں بولوں گا، یا اس فقیر کو نہیں دوں گا، اگر ایسی قسم کھا بیٹھے تو توڑ دے اور کفارہ دے۔ لغو قسم وہ ہے جو منہ سے نکلے، مگر دل کو خبر نہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم اللہ کی قسموں کو صلہ رحمی کرنے سے مانع نہ ٹھہراؤ، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْۤا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ﴾ [النور: ۲۲] ”اور تم میں سے فضل اور وسعت والے، قرابت داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (مالی مدد) دینے سے قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھاری مغفرت فرمائے۔“[1]

قسم پر اڑ جانا گناہ ہے، اس گناہ سے نکلنا کفارے سے ہوتا ہے۔ صحیحین اور دوسری احادیث میں مروی ہے کہ جس نے قسم کھائی، پھر دیکھا کہ دوسری شے بہتر ہے تو وہ اس بہتر کام کو کرے اور قسم کا کفارہ دے دے۔[2] دوسری روایت میں فرمایا ہے کہ میں ایسا ہی کرتا ہوں۔[3] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت ہے کہ جس نے قطع رحمی یا کسی معصیت پر قسم کھائی، اس کا سچ کرنا ایسے ہی ہوتا ہے کہ اس قسم کو توڑ ڈالے اور اس سوگند (قول وقسم) سے رجوع کرے۔[4] (رواہ ابن ماجہ) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کو اپنی قسم کا نشانہ نہ بناؤ کہ اچھا کام نہ کرو گے۔[5] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کی ایک کثیر جماعت کا یہی قول ہے کہ جن کے نام حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھے ہیں۔ ایسی قسم کا توڑنا اور کفارہ دینا بہت صحیح احادیث میں آیا ہے۔[6]

---

(1) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۳۴۷) (2) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۶۵۰)

(3) صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۹۶۴) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۶۴۹)

(4) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۲۱۱۰) تفسیر الطبري (۴/ ۴۴۲) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۲۳۳۴)

(5) تفسیر الطبري (۴/ ۴۲۲) تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ۴۰۷) اس کی سند حسن ہے۔ (6) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۳۴۷)

لغوقسم:

لغوقسم وہ ہے کہ جس کاقسم اُٹھانے والے نے ارادہ نہ کیا ہو، بے ساختہ، حسبِ عادت زبان پر جاری ہوگئی ہو، اس سے کوئی تاکید مقصود نہ ہو۔ صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جس نے اسلام میں لات وعزیٰ کی قسم کھائی، اس کو چاہیے کہ "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" کہے۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم ایک ایسی قوم کو دیا تھا، جو عہدِ جاہلیت سے نئی نئی اسلام میں داخل ہوئی تھی، جن کی زبان کو اس طرح کی قسم کی عادت پڑی ہوئی تھی اور اُن کے منہ سے بلا ارادہ یہ الفاظ نکل آتے تھے۔ اس لیے حکم دیا کہ کلمۂ اخلاص پڑھو کہ اس کا بدل ہو جائے۔ "هٰذِهٖ بِهٰذِهٖ"" یہ اس کے بدلے ہے۔" اللہ تعالیٰ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ پکڑ دل کے ارادے پر ہے نہ کہ زبان کی سبقت پر۔ جس طرح دوسری آیت میں ارشاد ہے: ﴿بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ﴾ [المائدة: ٨٩] "جو قسمیں تم نے مضبوط باندھ لیں۔" سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ لغوقسم سے مراد وہ ہے جو آدمی اپنے گھر میں بات چیت کے اندر كَلَّا وَاللّٰهِ، بَلٰى وَاللّٰهِ کہتا ہے۔[2] (رواہ أبو داود)

یہ حدیث کئی طریق سے آئی ہے، مگر ہر طریق میں موقوف ہے۔ پھر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ یہ لغو ہنسی اور دل لگی میں ہوتا ہے، جیسے: لَا وَاللّٰهِ، بَلٰى وَاللّٰهِ، اس کا کچھ کفارہ نہیں، کفارہ اس کا ہے جس پر دل جم گیا ہے کہ اس کام کو کریں گے، پھر نہ کیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔[3] امام مروزی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عام علما کا اسی قول پر اتفاق ہے اور احادیث بھی اسی پر دلیل ہیں۔[4] امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔[5]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے دوسری روایت یہ ہے کہ لغوقسم سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص کسی بات کو سچ سمجھ کر قسم کھائے اور وہ سچ نہ ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کا ایک گروہ اس طرف بھی گیا ہے۔[6] امام ابو حنیفہ اور مالک رحمہما اللہ کا قول بھی یہی ہے۔ امام حسن بن ابو الحسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک قوم پر گزرے، جو تیر لگا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک آدمی تھا۔ اس قوم میں سے ایک آدمی نے کہا کہ واللہ! تیر ٹھیک لگا، واللہ! خطا کی، اس شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ قسم توڑنے والا ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، تیر اندازوں کی قسم لغو ہوتی ہے، اس میں نہ کفارہ ہے نہ کچھ سزا۔[7] (رواہ ابن جریر)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن مرسل ہے اور اس کے راوی حسن بصری تابعی ہیں۔ امام

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٥٧٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٤٧)

[2] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٣٢٥٤) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو "صحیح" کہا ہے۔ [إرواء الغلیل: ٨/ ٢٩٠]

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٤٠٨) تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٤٨)

[4] تفسیر القرطبي (٣/ ٩٩)

[5] الأم (٧/ ١١٠)

[6] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٤٠٨)

[7] تفسیر الطبري (٤/ ٤٤٤) یہ روایت مرسل ہے۔

ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے دونوں قول سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیے ہیں۔ ابراہیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لغو یہ ہے کہ کسی چیز پر قسم کھا کر بھول جائے۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لغو یہ ہے کہ یوں کہے کہ اللہ مجھے اندھا کر دے، اگر میں وہ کام نہ کروں۔ اگر کل میں تیرے پاس نہ آؤں تو اللہ مجھے مفلس کر دے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ لغو یہ ہے کہ غصے میں قسم کھائے یا حلال کو حرام کر لے۔ ایسی قسم میں کفارہ نہیں ہوتا۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے اسی طرح کہا ہے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ لغو یہ ہے کہ معصیت پر قسم کھائے، مثلاً: کہے: شراب پیوں گا، قطع رحمی کروں گا۔ یا یوں کہے کہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو وہ یہودی و مشرک ہو۔ یا کوئی کہے: واللہ! میں اتنی قیمت پر فروخت نہیں کروں گا، دوسرا کہے کہ واللہ! میں اتنی قیمت پر مول نہیں لوں گا۔

اللہ تعالیٰ دل کی بات کو پکڑتا ہے۔ اس کا مطلب سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے یہ کہا ہے کہ کسی چیز پر دیدہ و دانستہ جھوٹ سمجھ کر قسم کھائی۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اس آیت کے مثل ہے: ﴿ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ﴾ [المائدۃ: ۸۹] ”لیکن ان قسموں پر ضرور پکڑے گا جو تم نے مضبوط باندھ لیں۔“ یعنی یمین مقصودہ (پختہ قسم) پر مواخذہ ہے۔ یہ اللہ کا حلم ہے کہ اس نے لغو قسم پر نہ مواخذہ رکھا اور نہ کفارہ ہی مقرر کیا۔[2]

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۲۶ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۲۷

جو لوگ اپنی عورتوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیتے ہیں انھیں چاہیے کہ چار ماہ انتظار کریں، پھر اگر وہ رجوع کر لیں تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا، بڑا رحم والا ہے (226) اور اگر انھوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی ہو تو بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (227)

ایلا اور اس کا حکم:

یعنی جس نے قسم کھائی کہ اپنی عورت کے پاس نہیں جائے گا تو چار مہینے میں جائے اور قسم کا کفارہ دے، وگرنہ طلاق ہو جائے گی۔[3] ایلا قسم کھانے کو کہتے ہیں۔ اگر چار ماہ سے کم مدت کی قسم کھائی ہے تو مدت پوری ہونے کا انتظار کرے، پھر صحبت کرے۔ عورت پر صبر کرنا ضروری ہے۔ عورت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ شوہر سے اس مدت کے اندر

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ۴۰۸۔ ۴۱۰) [2] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۳۴۹)

[3] از خود طلاق نہیں ہوگی، بلکہ چار مہینے گزرنے کے بعد اگر وہ تعلق بحال نہیں کرے گا تو اس سے کہا جائے گا کہ اگر تو اس کو رکھنا نہیں چاہتا تو طلاق دے، حاکم اس کو اس پر مجبور کرے گا۔ آگے فاضل مفسر رحمہ اللہ نے اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔ (ص۔ ی)

رجوع کی درخواست کرے۔ جس طرح سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیحین میں آیا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں سے ایک ماہ کا ایلا کیا، پھر اُنتیس تاریخ آ گئی، فرمایا: مہینا اُنتیس دن کا بھی ہوتا ہے۔[1] اسی طرح کی روایت شیخین نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے بھی بیان کی ہے۔[2] اگر ایلا کی مدت چار ماہ سے زیادہ ہے تو بیوی چار ماہ گزرنے کے بعد خاوند سے یہ کہہ سکتی ہے کہ یا مل جاؤ یا چھوڑ دو۔ حاکم شوہر سے اس بارے میں باز پرس کر سکتا ہے، تاکہ عورت کو ضرر نہ پہنچے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایلا بیویوں کے ساتھ خاص ہے، لونڈیوں کے ساتھ نہیں، کیوں کہ لفظِ نساء فرمایا ہے۔ جمہور کا مذہب یہی ہے۔ چار ماہ کی گنتی قسم اُٹھانے کے وقت سے ہوتی ہے۔ پھر ٹھہر کر فیئ یا طلاق کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ فیئ سے مراد جماع ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مسروق، شعبی اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ وغیرہ نے ایسا ہی کہا ہے۔[3] اللہ اس قصور کو، جو اس قسم کی وجہ سے بیویوں کے حق میں ہوا، بخش دیتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بخشنے کے یہ معنی ہیں کہ جب ایلا کرنے والے نے چار ماہ بعد رجوع کر لیا تو اس پر کچھ کفارہ نہیں۔ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مروی حدیث اسی پر دلالت کرتی ہے۔ اس حدیث کے مرفوع الفاظ یہ ہیں کہ جس نے قسم کھائی، پھر دوسری شے کو بہتر دیکھا تو اس کا کفارہ یہی ہے کہ اس کام کو نہ کرے اور چھوڑ دے۔[4] (رواہ أحمد و أبو داود و الترمذي)

جمہور کا مذہب اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قول جدید یہ ہے کہ اس پر کفارہ دینا ضروری ہے، کیوں کہ کفارہ ہر قسم اُٹھانے والے پر واجب ہے۔ جس طرح احادیثِ صحاح سے اوپر گزر چکا ہے۔ یہ آیتِ شریفہ اس بات پر دلیل ہے کہ صرف چار ماہ گزرنے پر طلاق نہیں پڑتی۔ جمہور متاخرین کا یہی قول ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ ایک طلاق پڑ جاتی ہے۔ یہ قول صحیح سندوں سے خلفائے اربعہ اور صحابہ کرام اور تابعینِ عظام وغیرہم کی ایک جماعت سے مروی ہے، پھر اس ایک طلاق کو ایک جماعت نے رجعی کہا ہے، جبکہ دوسری جماعت نے بائن ٹھہرایا ہے۔ حنفیہ اور سلف کی ایک جماعت کہتی ہے کہ جب یہ طلاق پڑی تو اب عدت بھی واجب ہوئی، مگر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اگر تین حیض آ چکے ہیں تو عدت نہیں رہتی۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ جمہور متاخرین کہتے ہیں، بلکہ اس کو روک کر مطالبہ کریں گے کہ مل جائے یا چھوڑ دے۔ صرف مدت پوری ہو جانے پر طلاق نہیں پڑے گی۔ اسی بات کو امام مالک رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے۔[5] سلیمان بن یسار رحمہ اللہ نے کہا کہ میں نے دس سے کچھ

---

[1] صحیحین میں ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بجائے سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨١١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٨٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٧٩) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤١٣)

[4] مسند أحمد (٢/ ١٨٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٧٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٣٠) سنن ترمذی میں یہ روایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ امام البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو ''منکر'' کہا ہے۔ دیکھیں: السلسلة الصحيحة (١٣٦٥)

[5] الموطأ (٢/ ٥٥٦) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٨٥)

اوپر اصحابِ رسول ﷺ کو پایا، سب کا یہی قول تھا کہ ایلا کرنے والے کوٹھہرایا جائے گا۔

امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کم سے کم تیرہ صحابی رضی اللہ عنہم ہوں گے۔[1] امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسے ٹھہرائے جانے کے قائل ہیں۔ یہی بات سیدنا عمر، ابن عمر، عائشہ، عثمان اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کے قول کے موافق ہے۔ ابو صالح رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے بارہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا، سب نے یہی کہا کہ ایلا کرنے والے پر جب تک چار ماہ نہ گزریں، کچھ مواخذہ نہیں، پھر اس کوٹھہرایا جائے گا کہ رجوع کر یا طلاق دے۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا عمر، عثمان، علی، ابو الدرداء، عائشہ، ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کا یہی مذہب ہے۔ تابعین کی ایک جماعت بھی اسی کی قائل ہے۔ امام مالک، شافعی رحمہما اللہ اور اُن کے اصحاب کا یہی مذہب ہے، اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ لیث، ابن راہویہ، ابوعبید، ابوثور اور داود رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ سب نے کہا ہے کہ اگر رجوع نہ کرے تو طلاق لازم کریں گے۔ اگر طلاق نہ دے تو حاکم طلاق دے دے۔ یہ طلاق رجعی ہوگی، اگر چاہے تو عدت میں رجوع کر لے۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ اس رجعت کو ناجائز کہتے ہیں، جب تک کہ عدت میں مجامعت نہ کرے۔ ان کا یہ قول سخت غریب ہے۔ فقہا وغیرہم نے اس مسئلے کی مناسبت سے امام مالک کی موطا میں عبداللہ بن دینار سے ایک اثر نقل کیا ہے کہ ایک رات سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ باہر نکلے تو ایک عورت کو سنا کہ وہ یہ شعر پڑھ رہی تھی ؎

تَطَاوَلَ هٰذَا وَاسْوَدَّ جَانِبُهُ وَأَرَّقَنِي أَنْ لَّا خَلِيْلَ أُلَاعِبُهُ
فَوَاللّٰهِ لَوْلَا اللّٰهُ أَنِّي أُرَاقِبُهُ لَحُرِّكَ مِنْ هٰذَا السَّرِيْرِ جَوَانِبُهُ

”یہ رات بہت گزر گئی اور اس کے سب اطراف میں اندھیرا چھا گیا۔ مجھ کو اس بات نے بے خواب کیا کہ میرا پیارا دوست (خاوند) موجود نہیں ہے کہ اس سے ملاعبت، یعنی صحبت کرتی۔ پس قسم ہے اللہ کی! اگر مجھ کو اللہ کا مراقبہ، یعنی اس سے ڈرنے کا دھیان نہ ہوتا تو اس چارپائی کی جانبیں ہلائی جاتیں، (یعنی فعل حرام سے)۔“

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ عورت کتنا صبر کر سکتی ہے؟ کہا: چھے یا چار ماہ، فرمایا کہ اس سے زیادہ کسی لشکری کو باہر نہیں روکوں گا۔[3] یہ اثر کئی طریق سے آیا ہے اور بہت مشہور ہے۔

فتح البیان میں لکھا ہے کہ لفظِ نساء آزاد اور غلام دونوں عورتوں کو شامل ہے۔ اسی طرح لفظ ﴿ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ ﴾ میں غلام داخل ہیں۔ امام احمد، شافعی اور ابوثور رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ غلام کا ایلا آزاد کے مثل ہے۔ امام مالک، زہری، عطاء، ابوحنیفہ اور اسحٰق رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ بلکہ دو ماہ ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لونڈی کا ایلا آزاد عورت کے ایلا کا نصف ہے۔[4] یہ مدت اللہ نے عورت کے ضرر کو دور کرنے کے لیے رکھی ہے، ورنہ جاہلیت والے ایک ایک دو دو سال

---

[1] مسند الشافعي (١/ ١٥١)
[2] تفسير الطبري (٤/ ٤٩٣) تفسير ابن كثير (١/ ٣٥٠)
[3] تفسير ابن كثير (١/ ٣٥١)
[4] تفسير القرطبي (٣/ ١٠٧)

تک، بلکہ اس سے بھی زیادہ ایلا کرتے تھے، ان کا مقصد عورتوں کو ستانا تھا۔ فیٔ کے معنی لغت میں رجوع کے ہیں، یعنی اس جگہ یہ معنی مراد ہیں۔ امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جن سے علم سیکھا گیا ہے، ان سب کا اس بات پر اجماع ہے کہ فیٔ سے مراد جماع ہے۔ اگر شوہر مریض ہے یا اسیر تو وہ اس کی عورت ہے، یہاں تک کہ عذر دور ہو۔ عذر دور ہونے کے بعد جماع نہ کیا تو مدت گزر جانے کے بعد دونوں میں تفریق کر دی جائے گی۔ امام مالک رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ ایک گروہ نے کہا ہے کہ اگر عذر کی حالت میں دل سے رجوع کر لیا ہے تو یہ بھی کافی ہے۔ امام حسن، عکرمہ، نخعی، اوزاعی اور احمد رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ جمہور نے کہا ہے کہ جب ایلا کرنے والے نے جماع کے ساتھ رجوع کیا تو اب اس پر کفارہ واجب ہے۔ امام حسن اور نخعی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ کچھ کفارہ نہیں ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں، جو ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، ٹھیک بات وہی ہے، جو آیتِ کریمہ میں مذکور ہے۔

ہر مذہب والے نے اس آیت کی تفسیر اپنے مذہب کے مطابق کی ہے اور بہت تکلف سے آیت کے معنی کسی لفظی یا دوسری دلیل کے بغیر کیے ہیں۔ حالاں کہ آیت پاک کے معنی واضح اور ظاہر ہیں۔ یعنی اللہ نے ایلا کرنے والے، یعنی قسم اُٹھانے والے کے لیے چار ماہ کی مدت مقرر کر دی ہے، پھر اُس مدت کے بعد حکم دیا ہے کہ اگر زوجیت اور نکاح کو برقرار رکھنے کے لیے رجوع کرے گا تو اللہ غفور رحیم ہے۔ اس قسم پر مواخذہ نہیں کرے گا اور اگر طلاق دینے کا ارادہ کر لیا ہے تو اللہ سمیع علیم ہے۔ یہ اس آیت کے معنی ہوئے، اس میں کوئی شک وشبہہ نہیں ہے۔ پھر جس نے قسم کھائی کہ عورت سے نہیں ملے گا، مدت کی کچھ قید نہ کی یا چار ماہ سے زیادہ کی قید لگائی تو ہمیں چاہیے کہ ہم چار مہینے کی اس کو مہلت دیں۔ جب وہ مدت گزر جائے تو اس کو اختیار ہے کہ رجوع کرے یا کفارہ دے۔ وہ عورت اسی طرح اس کی بیوی ہے، جس طرح اس مدت سے پہلے تھی۔ یا طلاق دے دے، یہ طلاق ابتدائی ہوگی اور اگر چار ماہ سے کم مدت مقرر کی ہے اور قسم کو سچا کرنا چاہتا ہے تو اس مدت تک عورت سے الگ رہے، یعنی کنارہ کش رہے، جس طرح رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا اور اگر اسی چار ماہ سے کم مدت میں صحبت کرنا چاہے تو قسم توڑنے والا نہیں ہوگا، جس سے کفارہ لازم آئے گا اور اس حدیث پر عمل کرنے والا ہوگا: «مَنْ حَلَفَ عَلٰی یَمِیْنٍ فَرَأٰی غَیْرَھَا خَیْرًا مِّنْھَا فَلْیَأْتِ الَّذِیْ ھُوَ خَیْرٌ وَلْیُکَفِّرْ عَنْ یَمِیْنِہٖ» [1] ”جو کوئی کسی چیز پر قسم کھائے، پھر اس کے خلاف دوسری چیز کو بہتر دیکھے تو بہتر کو کرے اور قسم کا کفارہ دے۔“

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٥٠) فتح البیان (٢/ ١٠۔ ١٣)

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

اور مطلقہ عورتیں تین حیض تک اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں اور ان کے لیے جائز نہیں کہ اللہ نے ان کے پیٹ میں جو کچھ پیدا کیا ہے اسے چھپائیں، اگر وہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتی ہیں (تو ایسا ہرگز نہ کریں) اور ان کے خاوند اگر اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں تو وہ زیادہ حق دار ہیں کہ انھیں اس (مدت) میں لوٹا لیں، اور دستور کے مطابق عورتوں کے لیے مردوں پر ویسے ہی حقوق ہیں، جیسے مردوں کے لیے عورتوں پر ہیں اور مردوں کے لیے ان پر ایک فضیلت ہے اور اللہ غالب، خوب حکمت والا ہے (228)

مطلقہ کی عدت کا بیان:

جب مرد نے عورت کو طلاق دی تو اس عورت کے لیے اور نکاح جائز نہیں، جب تک تین بار حیض نہ آئے اور اگر حمل ہو تو معلوم ہو جائے کہ کہیں کسی کا بیٹا بچہ کسی اور کو نہ لگ جائے۔ اس لیے عورت پر فرض ہے کہ اس وقت حمل ہو تو ظاہر کر دے۔ اس مدت کا نام عدت ہے۔ اس عدت تک (بشرطیکہ یہ پہلی یا دوسری طلاق ہو، جیسا کہ آگے وضاحت ہے) مرد چاہے تو پھر عورت کو رکھ لے، اگرچہ عورت کی خوشی نہ ہو، اس لیے فرمایا کہ عورتوں کے بھی حق مرد پر بہت ہیں، لیکن اس جگہ مرد ہی کو درجہ دیا۔

ائمۂ اربعہ نے لونڈی کو اس عموم سے الگ رکھا ہے کہ طلاق کے بعد اس کی عدت دو حیض ہے، یعنی آزاد سے آدھی۔ کیوں کہ دوسرے یا تیسرے حیض کے ٹکڑے نہیں ہو سکتے، اس لیے دو حیض مقرر ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ لونڈی کی دو طلاقیں ہیں اور عدت دو حیض ہیں۔[1] (رواه أبو داود و ابن ماجه) لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کا راوی مظاہر بالکل ضعیف ہے۔ حافظ دارقطنی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۱۸۹) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۰۸۰) اس کی سند میں ''مظاہر بن اسلم'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعیف الجامع: ۱/ ۸۰۹)

کہ یہ قاسم بن محمد کا قول ہے، مگر ابن ماجہ نے اس کو سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔[1] امام دارقطنی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صحیح وہ ہے جو سالم اور نافع رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے نہ کہ یہ جس کے راوی عطیہ عوفی ہیں۔[2] یہ روایت سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے بھی آئی ہے۔[3] اس بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بعض سلف نے کہا ہے کہ لونڈی کی عدت آزاد عورت کی عدت کے مثل ہے۔ کیوں کہ آیت عام ہے اور یہ اَمر جبلّی ہے۔ اس میں بیوی اور لونڈی برابر ہے۔ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اس کو محمد بن سیرین اور بعض اہلِ ظاہر سے روایت کیا ہے، پھر ضعیف ٹھہرایا۔[4] امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسماء بنت یزید بن السکن انصاریہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ مجھ کو عہدِ رسالت میں طلاق ہوئی، اس وقت مطلقہ کے لیے کوئی عدت مقرر نہیں تھی، اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری۔ سب سے پہلے یہ آیت طلاق کی عدت کے متعلق ان کے حق میں اُتری ہے۔[5] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مگر یہ حدیث اس طریق سے غریب ہے۔[6]

لفظِ ''قروء'' کا معنی:

لفظ قروء کے بارے میں سلف و خلف اور ائمہ کا اختلاف ہے کہ اس سے مراد حیض ہے یا پاکی۔ امام مالک رحمہ اللہ نے موطا میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے اطہار (پاکی) نقل کیا ہے۔ پھر ابوبکر بن عبدالرحمن سے نقل کیا ہے کہ میں نے اپنے فقہا میں سے کسی کو بھی قروء کا مطلب اطہار کے علاوہ کچھ اور کرتے ہوئے نہیں پایا۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہی قول ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔[7] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک کثیر تعداد بھی اسی طرف گئی ہے۔ ساتوں فقہا اور امام شافعی اور داود رحمہم اللہ کا یہی مذہب ہے اور امام احمد رحمہ اللہ کا بھی ایک قول ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ ﴾ [الطلاق: ۱] یعنی اس جگہ عدت سے مراد اطہار ہے اور وہ اطہار، جس میں طلاق ہوئی ہے، جب گِنا گیا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان تین قروء میں سے وہ ایک قرء ہے کہ جن کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی لیے ان لوگوں نے کہا ہے کہ جب تیرا حیض شروع ہوا تو عدت بھگت گئی، بیوی شوہر سے الگ ہوگئی۔ سب سے قلیل مدت، جس پر یہ بات سچی ہو کہ عدت ہو چکی، بتیس دن اور دو لحظے ہیں۔

---

[1] سنن ابن ماجه (۲۰۷۹) اس کی سند میں ''عطیہ عوفی'' اور ''عمر بن شبیب'' ضعیف راوی ہیں۔ دیکھیں: تلخیص الحبیر (۳/ ۲۱۲۔ ۲۱۳)

[2] سنن الدارقطني (٤/ ۳۹)

[3] سنن البيهقي الكبرىٰ (۷/ ٤۲٥) امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وهذا إسناد صحيح'' [إرواء الغليل: ۷/ ۱٥۰]

[4] الاستذكار (٦/ ۲۱۹)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۲۸۱) تفسير ابن أبي حاتم (۲/ ٤١٤) امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''إسناده حسن'' (صحيح أبي داود: ۷/ ٥۰)

[6] تفسير ابن كثير (۱/ ۳٥۲) [7] الموطأ (۲/ ٥۷٦۔ ٥۷۸)

دوسرا قول یہ ہے کہ قروء سے مراد حیض ہے، اس صورت میں جب تک تیسرے حیض سے پاک نہ ہو، عدت پوری نہیں گزرتی۔ کسی نے یہ بھی زیادہ کیا ہے کہ نہا بھی لے تو اس عدت کی قلیل ترین مدت تینتیس دن اور لحظہ ہوتا ہے۔ امام علقمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس تھے کہ ایک عورت نے آ کر کہا کہ میرے شوہر نے مجھ کو ایک یا دو طلاق دے کر جدا کر دیا تھا، پھر میرے پاس آیا، جب میں نے دروازے بند کر کے نہانے کے لیے کپڑے اُتارے تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کی عورت ہے، جب تک کہ اس کو نماز پڑھنا درست نہ ہو۔ انھوں نے کہا کہ میں بھی اسی کا قائل ہوں۔[1] یہی قول خلفاے اربعہ اور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام کی ایک کثیر جماعت سے بھی مروی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اُن کے اصحاب کا یہی مذہب ہے۔ صحیح روایت سے امام احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اکابر صحابہ یہی کہتے تھے کہ اقراء حیض ہے۔ فاطمہ بنت حبیش رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا تھا کہ «دَعِيُ الصَّلَاةَ أَيَّامَ أَقْرَاءِكِ»[2] یعنی ''زمانہ حیض میں تو نماز نہ پڑھ۔'' (رواه أبو داود و النسائي)

پس اگر یہ حدیث صحت کو پہنچ جائے تو اس بات پر صریح دلیل ہے کہ اقراء حیض ہے، لیکن اس کی سند میں منذر کو ابو حاتم نے مجہول غیر مشہور کہا ہے، مگر ابن حبان رحمہ اللہ نے اس کا ذکر ثقات میں کیا ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کلامِ عرب میں اقراء کسی معتاد اور معمول کے مطابق چیز کے معینہ اوقات میں آنے جانے کو کہتے ہیں۔[3] اس عبارت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ لفظ ان دونوں معنوں کے درمیان مشترک ہے، اسی لیے بعض اہلِ اصول اسی طرف گئے ہیں۔ اصمعی رحمہ اللہ کا قول بھی یہی ہے کہ قرء بمعنی وقت ہے۔ ابو عمرو ابن العلا نے کہا ہے کہ عرب حیض کو بھی قرء کہتے ہیں، جب کہ طہر کو بھی قرء بولتے ہیں اور دونوں کو ایک ساتھ بھی قرء کہتے ہیں۔[4] امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عرب زبان کے علما اور فقہا کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قرء سے حیض و طہر مراد ہوتے ہیں۔ اختلاف اس میں ہے کہ آیتِ شریفہ میں قرء سے کیا مراد ہے؟ اس میں دو قول ہیں۔[5]

فتح البیان میں دونوں اقوال نقل کر کے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اہلِ کوفہ قرء کو حیض بتاتے ہیں اور اہلِ حجاز اطہار ٹھہرا لیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لفظ مشترک ہے۔ پھر فریقین کی دلیلوں میں تنقیدی نظر ڈالنے کے بعد یہ کہا ہے کہ شاید ایسے کہا جائے کہ عدت کی تکمیل تین طہر یا تین حیض سے ہوتی ہے، کیوں کہ اہلِ علم کی ایک جماعت نے مشترک لفظ کو دونوں معنوں پر محمول کرنا جائز رکھا ہے۔ اس صورت میں دونوں طرف کی دلیلوں میں مطابقت ہو جائے گی اور مخالفت و نزاع دور ہو جائے گا۔[6]

---

[1] تفسیر الطبري (٤/ ٥٠٢۔ ٥٠٣) اس کی سند صحیح ہے۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٢١١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٣٦٣)

[3] تفسير الطبري (٤/ ٥١١) [4] تفسير القرطبي (٣/ ١١٣) [5] التمهيد (١٥/ ٨٦۔ ٩٢) [6] فتح البيان (٢/ ١٤۔ ١٦)

حیض اور طہر کے معاملے میں عورتوں کی بات ہی معتبر ہے:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جو پیٹ میں ہو، اس کو نہ چھپائیں، یعنی حمل یا حیض۔[1] تابعین کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد حمل اور حیض دونوں ہیں۔ چھپانے سے اس لیے منع کیا کہ بعض احوال میں خاوند کا نقصان اور اس کی حق تلفی ہو جاتی ہے، مثلاً: اگر عورت نے کہا کہ میں حیض سے ہوں اور وہ حائض نہ تھی تو شوہر کا رجوع کرنے کا حق ضائع ہو گیا۔ یا حائض تھی اور کہہ دیا کہ میں غیر حائض ہوں تو اس کے ذمے غیر لازمی نفقہ لگا دیا، اسی طرح حمل کو مخفی رکھنے میں شوہر کا رجوع کا حق ختم کیا گیا یا حمل کا دعویٰ کرنے سے نان ونفقہ کا ایجاب کیا گیا۔ غرض کہ اس طرح کے مقاصد کے لیے جو شوہر کے نقصان یا تکلیف کا باعث ہو، پیٹ میں جو کچھ ہے، اس کو چھپانے سے منع فرمایا ہے، پھر اس ممانعت کو اور شدید بنانے کے لیے ایمان کے ضائع ہونے کی وعید دی گئی ہے۔ یہ شرط مقید کرنے کے لیے نہیں ہے، کیوں کہ اگر مومنات نہ ہوں گی تو بھی عدت لازم ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ عورتوں کو خلافِ حق کرنے پر سرزنش کی گئی ہے۔ اس سے یہ بھی نکلا کہ اس سزا یا وعید کا مرجع انھی کی طرف ہے، کیوں کہ یہ بات ان کے بتائے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی۔ غالباً کوئی حکمِ صریح اس پر قائم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس امر کا دارومدار انھی پر رکھا اور حقیقت چھپانے پر وعید فرمائی، تا کہ جو بات ٹھیک ہو، وہ کہہ دیں اور حق کے خلاف ظاہر نہ کریں۔[2]

پھر یہ کہا کہ خاوند زیادہ حق دار ہے ان کو پھیر لینے کا، یعنی اس سے رجوع کرنے کا کہ جس سے رجوع کرنا جائز ہے۔ گویا یہ آیت اللہ تعالیٰ کے عمومیت کے حامل درج ذیل فرمان کو خاص کرنے والی ہے: ﴿ وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''اور مطلقہ عورتیں تین حیض تک اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں۔'' اس لیے کہ یہ مثلثات (تین مرتبہ طلاق یافتہ خواتین) وغیرہا کو شامل ہے۔

صیغہ افعل التفضیل (تفضیل کا صیغہ) سے یہ فائدہ معلوم ہوا کہ اگر مرد رجوع کرنا چاہے اور بیوی نہ مانے تو مرد ہی کا قول اختیار کیا جائے گا، یہ مطلب نہیں کہ رجعت میں عورت کا بھی کچھ حق ہے۔ خاوند کا یہ حق عدت کی مدت کے اندر ہے۔ اگر یہ مدت گزر گئی تو پھر بیوی کو اپنی جان کا اختیار ہے، تاہم وہ نئے نکاح اور ولی اور گواہوں اور نئے سرے سے حق مہر کے تقرر کے بغیر حلال نہیں ہو سکتی۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

رجعت کبھی الفاظ سے ہو جاتی ہے اور کبھی وطی (جماع) سے۔ رجوع کرنے والے کو احکامِ نکاح میں سے کوئی چیز لازم نہیں آتی اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ رجعت اس وقت صحیح ہوگی، جبکہ ارادہ اصلاحِ حال کا ہوگا، اگر تکلیف دینے کے ارادے سے ہوگی تو حرام ہوگی، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ﴾ [البقرۃ: ۲۳۱] ''اور انھیں ستانے کے لیے نہ روکو، تا کہ تم زیادتی کرو۔'' بعض نے کہا ہے کہ رجعت تو ہو جائے گی، مگر

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ۴۰۵۔ ۴۱۶)
[2] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۳۵۳)

شوہر حرام کا مرتکب اور ظالم ٹھہرے گا۔ اس صورت میں آیت میاں بیوی کو اصلاح کی ترغیب دینے کے لیے ہے اور رجعت کے صحیح ہونے کے لیے شرط کے طور پر نہیں۔

طلاقِ بائن میں رجعت نہیں:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ان مطلقہ عورتوں کے حق میں ہے جن سے رجوع کیا جاسکتا ہے، ان کے حق میں نہیں ہے کہ جنھیں طلاقِ بائن دی جا چکی ہو، کیوں کہ اس آیت کے نزول کے وقت کوئی مطلقہ بائنہ نہیں تھی۔ جس وقت یہ آیت اُتری تھی، اس وقت مرد کو رجعت کا حق تھا، اگرچہ سو بار طلاق دی ہو، پھر جب اس کے بعد طلاق کی تعداد تین مقرر کر دی گئی تو طلاقِ بائن اور غیر بائن سب ہونے لگیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض اہلِ اصول نے مسئلہ عودِ ضمیر پر اس آیت سے جو دلیل پکڑی ہے، وہ مسلک ضعیف ہے، کیوں کہ اس کے ساتھ مثال دینا درست نہیں۔[1]

میاں بیوی کے حقوق:

پھر یہ فرمایا کہ عورت کا حق بھی مرد پر ویسا ہی ہے، جیسا حق مرد کا عورت پر ہے تو ہر ایک کو چاہیے کہ دستور کے موافق دوسرے کا حق ادا کرے۔ جس طرح صحیح مسلم میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع میں فرمایا تھا کہ عورتوں کے حق میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، تم نے ان کو اللہ کی امانت سے لیا ہے۔ اللہ کے حکم سے ان کے ستر کو حلال کیا ہے۔ تمھارا حق اُن پر یہ ہے کہ وہ تمھارے فرش پر کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں، جس سے تم ناخوش ہو۔ اگر ایسا کریں تو ان کو مارو، ایسی مار جس سے ہڈی نہ ٹوٹے۔ ان کا حق یہ ہے کہ ان کو دستور کے مطابق روٹی اور کپڑا دو۔[2]

سیدنا معاویہ قشیری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! ہم پر ہماری بیوی کا کیا حق ہے؟ فرمایا کہ اس کو کھلا جب تو کھائے اور اس کو پہنا جب تو پہنے۔ اس کے منہ پر نہ مار، اس کو برا نہ کہہ، اس کو جدا نہ کر، مگر شب خوابی میں۔[3] (یعنی رات کو تنبیہ کے طور پر اس کے ساتھ سونا چھوڑ دے) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ میں عورت کے لیے بننے سنورنے کو پسند کرتا ہوں، جس طرح یہ چاہتا ہوں کہ وہ میرے لیے بنے سنورے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِىْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''اور دستور کے مطابق عورتوں کے لیے مردوں پر ویسے ہی حقوق ہیں، جیسے مردوں کے لیے عورتوں پر ہیں۔'' اس کو امام ابن جریر اور ابن ابی حاتم رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے۔[4]

---

[1] تفسير ابن كثير (١/ ٣٥٣۔ ٣٥٤) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١٨)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٤٢) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٢٤٠)

[4] تفسير الطبري (٤/ ٥٣٢) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤١٧) اس کی سند صحیح ہے۔

یہ استدلال بہت صاف اور ستھرا ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ برابری حکم کے واجب ہونے میں ہے نہ کہ جنس میں۔ عورت اگر مرد کے کپڑے دھوئے یا روٹی پکا کر کھلائے تو مرد کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ بھی ایسا ہی کرے۔ کسی نے کہا کہ یہ برابری صرف واجب ہونے میں ہے، افراد کی تعداد یا صفتِ وجوب میں نہیں۔[1]

مردوں کو عورتوں پر فضیلت:

مردوں کو عورتوں پر درجہ حاصل ہے، یعنی وہ پیدائش اور اخلاق میں فضیلت رکھتے ہیں۔ مقام و فرماں برداری، حکومت، خرچ اور مصلحتوں کو سمجھنے اور قائم رکھنے میں بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ اہلِ جہاد اور عقل و قوت والے ہیں، ان کا وراثت میں حصہ دوگنا ہے، ان کی فرماں برداری عورت پر واجب ہے۔ عورت کو ان کی رضا مندی کے مطابق رہنے سہنے کا پابند کیا گیا ہے۔ مرد گواہی دینے، ولی ہونے، امامت کرانے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت میں بھی فوقیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک عورت پر دوسری تیسری چوتھی بیوی اور بے شمار لونڈیاں لا سکتے ہیں۔ عورت دوسرا شوہر ان کی موجودگی میں نہیں کر سکتی۔ طلاق دینا اور رجوع کرنا بھی مرد کے ہاتھ میں ہے نہ کہ عورت کے۔ اگر مرد کو عورت پر کوئی اور فضیلت نہ ہوتی تو کیا یہ کم بزرگی ہے کہ عورت مرد سے پیدا ہوئی ہے، کیوں کہ حوا کا آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا ہونا ثابت ہو چکا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو کہتا کہ کسی کو سجدہ کرو تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کیا کرے۔ اس کو امام بغوی رحمہ اللہ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے۔ یہ بات سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آئی ہے۔[2] مرد کو عورت پر یہ فضیلت دنیا اور آخرت دونوں جگہوں میں ثابت ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَاۤ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ﴾ [النساء: ٣٤] ''مرد عورتوں پر اس وجہ سے حاکم ہیں کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ وہ اپنے مالوں میں سے خرچ کرتے ہیں۔'' فضیلت کا اطلاق مفید عموم ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ

---

[1] فتح البيان (٢/ ١٨)

[2] تفسير البغوي (١/ ٢٦٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٥٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٢٩٥)

حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿229﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ
مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ
عَلَیْهِمَاۤ اَنْ یَّتَرَاجَعَاۤ اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ
اللّٰهِ یُبَیِّنُهَا لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ﴿230﴾

طلاق (رجعی) دو مرتبہ ہے، پھر یا تو (عورت کو) دستور کے مطابق روک لیا جائے یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دیا جائے اور تمھارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم انھیں جو دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لو الا یہ کہ دونوں کو ڈر ہو کہ وہ اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکیں گے۔ پس اگر تمھیں ڈر ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ عورت فدیے میں وہ مال دے (کر خلع حاصل کر لے۔) یہ اللہ کی حدیں ہیں، سو تم ان سے آگے نہ بڑھو، اور جو لوگ اللہ کی حدوں سے تجاوز کرتے ہیں، وہی ظالم ہیں ﴿229﴾ پھر اگر وہ (خاوند) اسے (تیسری) طلاق دے دے تو اس کے بعد وہ (عورت) اس کے لیے حلال نہیں یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور خاوند سے نکاح کرے، پھر اگر وہ بھی اسے طلاق دے دے تو ان دونوں (سابقہ میاں بیوی) پر کوئی گناہ نہیں کہ آپس میں رجوع کر لیں، اگر وہ دونوں خیال کریں کہ اللہ کی حدیں قائم رکھ سکیں گے اور یہ اللہ کی حدیں ہیں، وہ انھیں ان لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے جو علم رکھتے ہیں ﴿230﴾

تین طلاقوں کی تحدید اور رجعی اور بائن کا بیان:

اس آیتِ شریفہ میں تین مسئلے ارشاد فرمائے، ایک طلاق کا، دوسرا خلع کا اور تیسرا حلالے کا۔ موضح قرآن میں لکھا ہے کہ عدت تک مرد چاہے تو عورت کو پھر رکھ لے۔ یہ بات پہلی اور دوسری طلاق میں ہے۔ اس کے بعد نہیں پھر سکے گی۔ اگر شرع کے مطابق اس کے حقوق ادا کر سکے تو رکھے کہ پھر قضیہ (مسئلہ پیدا) نہ ہو۔ نہ رکھ سکے تو رخصت کرے، اس نیت سے روک کر نہ رکھے کہ عاجز ہو کر جو میں نے دیا تھا، وہ لوٹا دے۔ یہ اس وقت مناسب ہے کہ ناچاری ہو، کسی طرح دونوں کی عادتیں نہ ملیں، مرد کی طرف سے ادائے حق میں قصور نہ ہو، اس وقت سب لوگ مل کر عورت سے مرد کو کچھ دلوا کر مرد کو راضی کر کے طلاق دلوا دیں، اس کو خلع کہتے ہیں۔ تیسری طلاق کے بعد پھر نہیں سکتی، بلکہ دونوں اگر راضی ہوں، پھر بھی دوبارہ نکاح نہیں ہو سکتا، جب تک کہ بیچ میں دوسرے خاوند کی صحبت نہ ہو چکے، اس کو حلالہ (یعنی شرعی حلالہ نہ کہ مروجہ لعنتی حلالہ) کہتے ہیں۔ ؎

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت نے شروع اسلام کے دستور کو اُٹھا دیا ہے۔ وہ دستور یہ تھا کہ مرد کو سو طلاق دے، جب تک عورت عدت میں ہے، تب تک رجعت کا حق دار رہتا تھا، اس میں عورتوں کا نقصان ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تین طلاق کی حد مقرر کر دی، ایک یا دو طلاق تک رجعت کی اجازت دی، تیسری طلاق کے بعد بالکل جدا کر دیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس آیت نے اگلی آیت کو منسوخ کر دیا۔[1] (رواہ أبو داد و النسائي)

امام عروہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ میں کبھی تجھ کو طلاق نہیں دوں گا اور نہ تیرے پاس ہی رہوں گا۔ اس نے کہا: یہ کیسے ہوگا؟ اس نے کہا کہ طلاق دوں گا، جب عدت پوری ہونے لگے گی، رجوع کر لوں گا۔ اس نے آ کر یہ بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہی تو اس پر یہ آیت اُتری کہ طلاق دو بار تک ہوتی ہے (یعنی جس میں رجوع ہوسکتا ہے)۔ (رواہ ابن أبي حاتم) اس کو امام ابن جریر اور عبد بن حمید رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ اس آیت کے اُترنے پر لوگوں نے، جس نے دی تھی یا نہ دی تھی، طلاق کی درستی شروع کر دی۔

امام ابن مردویہ، ترمذی اور حاکم رحمہ اللہ کے نزدیک یہ حدیث کئی طریق سے آئی ہے، امام حاکم رحمہ اللہ نے اس کو صحیح الاسناد کہا ہے۔[2] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ پہلے طلاق کا کوئی وقت نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے وقت مقرر کر دیا کہ تیسری طلاق کے بعد رجوع نہیں ہوسکتا، جب تک کہ دوسرا خاوند نہ کر لے۔ یہی قول امام قتادہ، سدی اور ابن زید رحمہ اللہ کا ہے۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[3] حاصل یہ ہوا کہ اس طلاق کی تعداد، جس کے بعد رجوع ہوسکتا ہے، دو ہے۔ لفظ "مَرَّتَانِ" سے یہ نکلا ہے کہ طلاق ایک کے بعد ایک ہو، نہ کہ ایک ہی دفعہ میں دو طلاق۔ مفسرین کی ایک جماعت اسی طرف گئی ہے۔ پھر اگر ایک طلاق دی یا دو بار میں دو طلاق تو عدت باقی رہنے تک اختیار ہے، چاہے اصلاح اور احسان کی نیت سے پھیر لے یا چھوڑ رکھے۔ عدت گزر جانے پر وہ جدا ہو جائے گی۔ یہ جدائی بھلائی کے ساتھ چاہیے، اس کا کوئی حق ضائع کرے نہ اس کو نقصان پہنچائے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب مرد نے عورت کو دو بار طلاق دے دی تو اب تیسری طلاق پر اللہ سے ڈرے، یا تو دستور کے مطابق روک کر اچھا برتاؤ کرے یا احسان کے ساتھ بغیر کسی زیادتی کے رخصت کر دے، یعنی ستائے نہیں۔[4] ابو رزین رحمہ اللہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ رخصت کرنا ہی تیسری طلاق ہے۔[5]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٩٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٥٥٤) امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسناده حسن صحيح" (صحيح أبي داود: ٦/ ٣٩٨)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤١٨) تفسير الطبري (٤/ ٥٣٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٩٢) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٠٧)

[3] تفسير الطبري (٤/ ٥٤٠، ٥٤٤) تفسير ابن كثير (١/ ٣٥٤، ٣٥٥)

[4] تفسير الطبري (٤/ ٥٤٨) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤١٩) اس کی سند حسن ہے۔

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤١٩) مصنف ابن أبي شيبة (٤/ ١٩٠) یہ روایت مرسل ہے۔

(رواه ابن أبي حاتم و عبد بن حمید و أحمد وغیرهم) کسی نے کہا ہے کہ إمساک سے مراد دوسری طلاق کے بعد رجوع ہے۔ تسریح سے مراد تیسری طلاق کے بعد ترکِ رجعت ہے، اس وقت تک کہ عدت گزر جائے، لیکن زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد بغیر تکلیف دینے کے تیسری طلاق دینا ہے۔ ابو عمرو رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بات پر علما کا اجماع ہے کہ تسریح سے مراد دو طلاق کے بعد تیسری طلاق دینا ہے۔ اس ارشاد کا یہی مطلب ہے: ﴿فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰی تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ ؕ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۤ اَنۡ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنۡ ظَنَّاۤ اَنۡ يُّقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۳۰﴾﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ”پھر اگر وہ (خاوند) اسے (تیسری) طلاق دے دے تو اس کے بعد وہ (عورت) اس کے لیے حلال نہیں یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور خاوند سے نکاح کرے، پھر اگر وہ بھی اسے طلاق دے دے تو ان دونوں (سابقہ میاں بیوی) پر کوئی گناہ نہیں کہ آپس میں رجوع کر لیں، اگر وہ دونوں خیال کریں کہ اللہ کی حدیں قائم رکھ سکیں گے اور یہ اللہ کی حدیں ہیں، وہ انھیں ان لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے جو علم رکھتے ہیں۔“[1]

یکبارگی تین طلاقیں دینے کا مسئلہ:

اس میں اختلاف ہے کہ تینوں طلاق کا ایک بار دینا کیسا ہے؟ وہ تین ہوں گی یا ایک؟ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ تین ہوں گی۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ، ان کے شاگرد حافظ ابن القیم رحمہ اللہ، قاضی محمد بن علی شوکانی رحمہ اللہ اور محققین کی ایک جماعت کا یہ مذہب ہے کہ وہ ایک ہی طلاق ہوئی اور یہی حق ہے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کسی مصلحت سے ایسی طلاق کو تین طلاق ٹھہرا دیا تھا، ورنہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عہد نبوت میں وہ ایک ہی طلاق سمجھی جاتی تھی۔ اس مسئلے میں بہت زیادہ اختلاف ہے، اس بارے میں مستقل کتابیں اور رسالے ہیں اور بڑی لمبی چوڑی بحث ہے۔ مشہور ائمہ اربعہ کا مذہب جمہور کے مذہب کے مطابق ہے، لیکن ہر ایک مذہب کے بعض محققین اسی طرف گئے ہیں، جو شیخ الاسلام نے اختیار کیا ہے، حتی کہ بعض حنفیہ بھی، جیسے ”أعلام الموقعین“ وغیرہ میں حکایت کیا گیا ہے۔[2]

مہر واپس لینے سے ممانعت:

یہ آیتِ شریفہ اس بات پر بھی دلیل ہے کہ طلاق دینے پر عورت سے کوئی چیز تنگ کر کے واپس نہ لے۔ بہت ہو یا کم، جو دیا سو دیا۔ لفظ شے کی تنکیر سے یہ نکلا کہ کچھ بھی نہ لے۔ جب ذرا سا لینا بھی جائز نہ ہوا تو بہت لینا تو اور زیادہ ناجائز ٹھہرے گا۔ پھر جب مہر کا واپس کرنا حلال نہ ہوا تو جو مال خاص اس عورت کی ملکیت ہے، اس کا لینا تو کسی طرح مناسب نہیں۔ یہ ازواج کو خطاب ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ حکام کو ہے۔ پہلا قول ٹھیک ہے۔ یہ آیت اس آیت جیسی ہے: ﴿وَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ لِتَذۡهَبُوۡا بِبَعۡضِ مَاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ﴾ [النساء: ١٩]

---

[1] الاستذکار (٦/ ٢٠٤) [2] مجموع الفتاویٰ (٣٣/ ٨٢۔ ٨٧) إعلام الموقعین (٣/ ٣٠۔ ٣٨) نیل الأوطار (٧/ ٥۔ ١١)

''اور تم انھیں (اس مقصد سے) نہ روک رکھو کہ تم نے انھیں جو مہر دیا ہو، اس کا کچھ حصہ واپس لے لو، مگر اس صورت میں (انھیں روکنا جائز ہے) اگر وہ کھلی بے حیائی کا کام کریں۔'' ہاں اگر عورت اپنی خوشی سے کچھ دے دے تو پھر جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓــًٔا مَّرِيْٓــًٔا ۝ ﴾ [النساء: ٤] ''پھر اگر وہ اپنی مرضی سے تمھیں کچھ مہر چھوڑ دیں تو تم اسے شوق سے کھا سکتے ہو۔'' یہاں تک مسئلہ طلاق کا بیان تھا۔

خلع کا مسئلہ:

دوسرا مسئلہ خلع کا بیان فرمایا کہ جب میاں بیوی کے درمیان شقاق و نفاق (نافرمانی اور منافقت) ہو، عورت مرد کے حقوق ادا نہ کرے، بلکہ اس کو دشمن سمجھے، اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کر سکے تو جو مال شوہر نے دیا تھا، وہ اپنی جان چھڑانے میں دے کر الگ ہو جائے۔ اس طرح مال کے دینے پر نہ عورت پر کوئی حرج ہے اور نہ اس مال کے لینے میں خاوند پر کوئی حرج آتا ہے۔ جمہور کا مذہب یہی ہے کہ بیوی کو خلع کرنا جائز ہے، اگر وہ ڈرے کہ اللہ کے قاعدے قائم نہیں رہ سکتے تو لے دے کر پیچھا چھڑا لے۔ قرآن پاک نے اسی امر کی تصریح فرمائی ہے۔

بعض اہل علم کا یہ قول کہ شوہر کو اپنا دیا ہوا مال واپس لینا حلال نہیں اور جو لے لیا تو اس پر مجبور نہ کیا جائے، نہایت ساقط ہے۔ بخاری میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیا ہے کہ سیدنا ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی جمیلہ رضی اللہ عنہا نے آ کر کہا کہ میں ثابت سے کسی اخلاقی یا دینی کمی کی وجہ سے روٹھی نہیں ہوں، لیکن بغض سے مجھے اس کو دیکھنے کی تاب و طاقت نہیں، میں کفر کو اسلام میں مکروہ سمجھتی ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تو اس کا باغ اسے واپس کرتی ہے؟ کہا کہ ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ باغ لے لے اور ایک طلاق دے دے۔[1] سنن ابن ماجہ کے الفاظ یہ ہیں کہ ثابت کو حکم دیا کہ باغ لے لے، زیادہ نہ لے۔[2]

اس بارے میں بہت سی احادیث آئی ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ حکم لازمی تھا، راہنمائی کے طور پر نہیں تھا۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ جو دیا ہو، اس سے زیادہ نہ لے کہ اس میں عورت کا نقصان ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ قرآن کے ظاہری الفاظ سے زیادہ لینے کا جواز نکلتا ہے، اس لیے کہ کسی معین مقدار کی قید نہیں لگائی گئی۔ امام مالک، شافعی اور ابوثور رحمہم اللہ اسی طرف گئے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت سے بھی یوں ہی مروی ہے۔ امام طاؤس، عطاء، اوزاعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ زیادہ لینا جائز نہیں ہے، کیوں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوع حدیث میں مروی ہے: «أَمَرَهُ أَنْ يَّأْخُذَ مَا سَاقَ وَلَا يَزْدَادَ»[3] ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حکم دیا کہ جو دیا تھا لے لو اور زیادہ نہ لے۔'' (رواہ ابن بطة و ابن مردویه و ابن ماجه) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابن ماجہ کی اسناد جید اور صحیح ہے۔[4]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٩٧١)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٢٠٥٦) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو ''صحیح'' کہا ہے۔ (إرواء الغلیل: ٧/ ١٠١)

[3] اس کی تخریج زیر تفسیر آیت میں گزر چکی ہے۔ [4] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٥٨)

بلا ضرورت خلع مانگنے کی مذمت:

اس سے یہ بھی نکلا کہ خلع اسی صورت میں جائز ہے کہ جب کسی طرح نباہ نہ ہو سکے، ایک کو دوسرے کی صورت بُری لگے، کفر کا خوف ہو۔ اور اگر اس لیے ہے کہ دوسرے یار اور آشنا سے مل کر مزے اڑائیں گے، اگرچہ خاوند بے قصور ہے اور نہ اس کی طرف سے کسی حق میں کمی ہے تو ایسا خلع منافقت کی دلیل ہے، بلکہ موجبِ لعنت ہے۔ خلع لینے والی عورتوں کی مذمت میں بہت حدیثیں آئی ہیں۔ سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس عورت نے اپنے شوہر سے کسی ڈر خوف کے یا عذر کے بغیر طلاق مانگی تو اس پر جنت کی ہوا حرام ہے۔ خلع کرنے والیاں منافقات ہیں۔ (رواہ ابن جریر) ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا کہ صحیح ہے۔[1] (رواه أحمد و أبو داود و ابن ماجه و البيهقي أيضاً) سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں کہ خلع کرنے والیاں الگ تھلگ ہونے والیاں منافقات ہیں۔ (رواہ ابن جریر) اس کی سند ضعیف ہے۔ اس کو امام احمد رحمہ اللہ نے بھی سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔[2] ابن ماجہ کے نزدیک سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت اس طرح ہے کہ نہیں مانگتی کوئی عورت طلاق اپنے شوہر سے بغیر کسی گناہ کے، پھر وہ جنت کی ہوا بھی پائے، حالاں کہ جنت کی ہوا چالیس برس کی راہ سے پائی جاتی ہے۔[3]

سلف کی ایک جماعت اور ائمۂ خلف نے یہ کہا ہے کہ خلع جائز نہیں، جب تک کہ عورت کی طرف سے نافرمانی اور بدخوئی نہ ہو۔ جب ہو تو مرد کو جائز ہے کہ فدیہ لے کر عورت کو چھوڑ دے بدلیل ﴿ اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''الا یہ کہ دونوں کو ڈر ہو کہ وہ اللہ کی حدیں قائم نہ رکھ سکیں گے۔'' معلوم ہوا کہ اس حالت کے سوا خلع درست نہیں، کسی اور حالت میں دلیل کے بغیر خلع نہ کرے اور دلیل موجود نہیں ہے۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام طاؤس، ابراہیم، عطا، حسن رحمہم اللہ اور جمہور کا مذہب ہے۔ یہاں تک کہ مالک رحمہ اللہ اور امام اوزاعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر شوہر نے اس سے کچھ لے لیا ہے اور عورت کا نقصان ہوتا ہے تو اس کا لوٹا دینا واجب ہے۔ یہ طلاق رجعی ٹھہرے گی۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم نے لوگوں کو اسی بات پر پایا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نہیں، بلکہ خلع جب حالتِ شقاق (نافرمانی) میں جائز ہوا تو حالتِ اتفاق میں تو بالاولیٰ جائز ٹھہرے گا۔

---

[1] تفسير الطبري (٤/ ٥٦٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٨٧) مستدرك الحاكم (٢/ ٢١٨) مسند أحمد (٥/ ٢٧٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٢٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٥٥) سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ٣١٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٧٠٦)

[2] تفسير الطبري (٤/ ٥٦٨، ٥٦٩) مسند أحمد (٢/ ٤١٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٦٣٢)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٥٤) اس کی سند میں ''عمارہ بن ثوبان'' مستور راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم: ٦٢١٩)

خلع کا جواز اور ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کا واقعہ:

یہی تمام اَصحابِ شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے۔ مگر پہلی بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ امام مزنی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خلع اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے تحت منسوخ ہے ﴿ وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ﴾[النساء: ٢٠] ''اور تم نے ان میں سے کسی کو بہت سا مال دیا ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو'' حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول ضعیف ہے اور یہ ماخذ کہنے والے کی طرف مردود ہے۔[1] امام شوکانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول اجماع سے خارج ہے اور دونوں آیتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔[2] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت سیدنا ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے حق میں اُتری ہے اور کئی طریق سے آئی ہے۔ ان کی بیوی کا نام حبیبہ بنت عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔[3] بخاری میں آیا ہے کہ اس کا نام جمیلہ تھا۔[4] موطا میں حبیبہ بنت سہل انصاری ہے۔[5] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت یہ ہے کہ ثابت نے اس کو مارا تھا، اس کے جسم کا بعض حصہ ٹوٹ گیا، اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت کو بلایا اور فرمایا کہ کچھ مال لے کر اس کو جُدا کر دے۔ کہا: کیا یہ ہوسکتا ہے؟ فرمایا: ہاں! اس نے کہا کہ میں نے اس کو دو باغ دیے ہیں، وہ اس کے ہاتھ میں ہیں۔ فرمایا کہ دونوں لے لے اور اس کو چھوڑ دے، اس نے یہی کیا۔[6] (رواه ابن جرير وهٰذا لفظه، و أبو داود)

امام ابن جریر رحمہ اللہ کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ جمیلہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ تو اس سے کس بات پر ناخوش ہے؟ کہا: نہ دین پر نہ اخلاق پر، مگر مجھ کو اس کی بدصورتی بُری لگتی ہے۔ فرمایا: تو اس کا باغ واپس کر دے گی؟ کہا: ہاں! اس نے باغ لوٹا دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں میں تفریق کرا دی۔[7] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلے یہی خلع ہوا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! کوئی شے کبھی اس کے اور میرے سر کو یکجا نہ کرے گی، میں نے خیمے کی ایک جانب سے اس کو دیکھا کہ وہ کچھ لوگوں کے ساتھ آ رہا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ کالا، سب سے زیادہ قد میں چھوٹا اور سب سے زیادہ بدصورت میرا شوہر تھا، لہٰذا ہم اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ شوہر نے کہا کہ میں نے اس کو اپنا بہترین مال، جو میرا باغ تھا، دیا ہے، یہ اس کو واپس کر دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو کیا کہتی ہے؟ کہا کہ ہاں، اگر اور کچھ چاہے تو وہ بھی دوں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کے درمیان جدائی کرا دی۔[8] (رواه ابن جرير)

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٥٧) [2] فتح القدیر (١/ ٤١٦) [3] تفسیر الطبري (٤/ ٥٥٦، ٥٥٧)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٩٧٣) [5] الموطأ (٢/ ٥٦٤)

[6] تفسیر الطبري (٤/ ٥٥٣) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢٢٢٨) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو ''صحیح'' کہا ہے۔ (صحیح أبي داود: ٦/ ٤٦٧)

[7] تفسیر الطبري (٤/ ٥٥٦) اس کی سند صحیح ہے۔ [8] تفسیر الطبري (٤/ ٥٥٢، ٥٥٣) اس کی سند صحیح ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ امر ہدایت کے طور پر نہیں، بلکہ لازمی تھا۔ یہ بھی ثابت ہوا کہ زیادہ دینے کا وعدہ عورت نے اپنی طرف سے کیا تھا، آپ ﷺ نے اس کو نہیں فرمایا، نبی اکرم ﷺ نے تو صرف اسی باغ کی واپسی کرائی۔ پھر یہ بھی ثابت نہیں ہوا کہ اس نے کچھ زیادہ دیا ہو اور آپ ﷺ نے اس کو مقرر رکھا ہو، بلکہ حدیثِ اول میں زیادہ لینے سے صاف منع فرمایا ہے۔ آیتِ شریفہ کا اطلاق اس حدیثِ مذکور کے ساتھ مقید ہے۔ جمہور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان عام ہے: ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ عورت فدیے میں وہ مال دے (کر خلع حاصل کر لے۔)'' لیکن یہ کچھ آیت زیرِ تفسیر کے خلاف نہیں کہ حجت ہو سکے۔ بلکہ ربیع بن انس رحمہ اللہ کی قراءت یوں ہے: ''فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ مِنْهُ''[1] اسی لیے اس کے بعد یہ فرمایا ہے کہ تم اللہ کی حدوں سے آگے نہ بڑھو، اگر بڑھو گے تو ظالم ہو گے۔ سنن ابن ماجہ میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے یوں مروی ہے کہ سیدنا ثابت رضی اللہ عنہ ایک بدشکل آدمی تھے۔ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! واللہ! اگر اللہ کا ڈر نہ ہوتا تو جب وہ میرے پاس آتا تو میں اس کے منہ پر تھوک دیتی۔[2] الحدیث۔ اس حدیث میں بھی یہ الفاظ آئے ہیں۔

حق مہر سے زیادہ لینا جائز ہے کہ نہیں؟

معلوم ہوا کہ یہ علاحدگی رسول اللہ ﷺ کے حکم سے ہوئی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ائمہ کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ مرد کو اپنے دیے ہوئے مال کی مقدار سے زیادہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ جمہور کہتے ہیں کہ جائز ہے۔ سیدنا ابن عمر، ابن عباس رضی اللہ عنہم، امام مجاہد، عکرمہ، ابراہیم نخعی، قبیصہ، حسن بن صالح اور عثمان بتی رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ امام مالک، لیث، شافعی اور ابوثور رحمہم اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔[3] اصحابِ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا کہ تکلیف پہنچانا، اگر بیوی کی طرف سے ہو تو جتنا دیا ہے، اتنا ہی لے لے، زیادہ لینا درست نہیں، اگر زیادہ لیا ہے تو بدلے میں جائز ہے اور اگر تنگ کرنا شوہر کی طرف سے ہو تو کچھ بھی نہ لے، اگر لے لیا ہے تو قضا میں جائز ہے۔ امام احمد، ابوعبید اور ابن راہویہ رحمہم اللہ کا یہ قول ہے کہ جتنا دیا ہے، اس سے زیادہ لینا درست نہیں ہے۔ تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت بھی اسی طرف گئی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا خیال بھی اسی طرف ہے۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے دیے گئے مال سے زیادہ لینے کو مکروہ رکھا ہے۔[4]

کیا خلع طلاق ہے؟

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جس شخص نے اپنی عورت کو دو طلاقیں دیں، پھر اس عورت نے اس مرد

---

[1] تفسیر الطبري (٤/ ٥٧٣)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٥٧) اس کی سند میں ''حجاج بن ارطاۃ'' مدلس راوی ہے۔ (إرواء الغليل: ٧/ ١٠٣)

[3] تفسیر الطبري (٤/ ٥٨٠، ٥٨١)

[4] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٥٨، ٣٥٩) یہ روایت مرسل ہے۔

سے خلع کیا تو وہ مرد اگر چاہے تو پھر اس سے نکاح کر لے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ طلاق دو بار ہوتی ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر شے جس کو مال دے کر جائز کیا گیا، وہ طلاق نہیں ہے۔[1] ابراہیم بن سعد بن ابی وقاص رحمہ اللہ نے یہی مسئلہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ خلع طلاق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے طلاق کا ذکر آیت کے شروع اور آخر میں کیا ہے، خلع کا درمیان میں، خلع کوئی چیز نہیں ہے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''طلاق (رجعی) دو مرتبہ ہے، پھر یا تو (عورت کو) دستور کے مطابق روک لیا جائے یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دیا جائے۔'' پھر یہ پڑھا: ﴿ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''پھر اگر وہ (خاوند) اسے (تیسری) طلاق دے دے تو اس کے بعد وہ (عورت) اس کے لیے حلال نہیں یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور خاوند سے نکاح کرے۔''[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ مذہب ہے کہ خلع طلاق نہیں ہے، بلکہ فسخ ہے۔ سیدنا عثمان، ابن عمر رضی اللہ عنہم، امام طاؤس، عکرمہ، احمد، ابن راہویہ، ابوثور، داود ظاہری اور شافعی رحمہم اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ آیتِ کریمہ کا ظاہری مطلب بھی یہی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ خلع طلاقِ بائن ہے، مگر یہ کہ زیادہ کی نیت کرلے۔ یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت، امام مالک، ابوحنیفہ کا قول ہے اور شافعی رحمہ اللہ کا قولِ جدید بھی۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر نیت ایک یا دو طلاق کی کی ہے یا چھوڑ دیا ہے تو یہ ایک ہی طلاقِ بائنہ ہوئی اور جو تین کی نیت کی ہے تو تین طلاقیں ہوئیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا تیسرا قول یہ ہے کہ جب خلع طلاق کے لفظ کے ساتھ نہیں ہوگا اور نیت سے عاری ہوگا تو وہ بالکل کچھ چیز نہیں ہے۔[3] امام شوکانی رحمہ اللہ پہلے اس بات کے قائل تھے کہ خلع طلاق ہے، پھر اس کو فسخ ٹھہرایا ہے۔[4]

خلع لینے والی کی عدت:

ائمۂ اربعہ اور ابن راہویہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ خلع لینے والی عورت کی عدت مطلقہ کی عدت کی طرح تین حیض ہیں، اگر حیض آتا ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک بڑی جماعت اسی طرف ہی گئی ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اکثر اہلِ علم کا یہی قول مروی ہے، ان کا ماخذ یہ ہے کہ جب خلع طلاق ٹھہری تو اب ساری مطلقات کی طرح عدت کرنا چاہیے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ خلع لینے والی کی عدت ایک حیض ہے، اس میں رحم کی پاکی ظاہر ہو جاتی ہے۔ سیدنا عثمان، ابن عمر، ابن عباس رضی اللہ عنہم، امام عکرمہ رحمہ اللہ اور وہ لوگ جو خلع کو فسخ

---

[1] الأم للشافعي (٥/ ١٦٤) ان دونوں کی اسناد ''صحیح'' ہے۔ [2] مصنف عبد الرزاق (٦/ ٤٨٧) سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ٣١٦)
[3] تفسير ابن كثير (١/ ٣٥٩، ٣٦٠) [4] نيل الأوطار (٧/ ٢٣)

کہتے ہیں، سب اسی طرف گئے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی عورت کو ایک ہی حیض کی عدت کا حکم دیا تھا۔ اس کو ابو داود نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے حسن غریب کہا ہے۔[1] ترمذی کی دوسری روایت یہ ہے کہ ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا نے عہدِ نبوت میں خلع کیا۔ اس کو نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ وہ ایک حیض کی عدت کرے یا وہ حکم دی گئی۔ صحیح یہ ہے کہ وہ حکم کی گئی۔[2]

سنن ابن ماجہ کی روایت کے الفاظ ہیں کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے ربیع رضی اللہ عنہا مذکورہ سے کہا کہ تجھ پر کچھ عدت نہیں ہے، مگر یہ ہے کہ اگر تو حال ہی میں خاوند کے پاس گئی ہو تو ایک حیض تک اس کے پاس رہو۔ ربیع نے کہا کہ عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ حکم رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کی اتباع میں دیا۔ یعنی نبی مکرم ﷺ نے مریم مغالیہ کو جو سیدنا ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے تحت تھی اور اس نے خلع کیا تھا، یوں ہی حکم فرمایا تھا۔[3] ربیع رضی اللہ عنہا کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو سنا کہ انھوں نے سیدنا ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی کو خلع کے وقت یہ حکم دیا کہ ایک حیض کی عدت کرے۔[4] فتح البیان میں بھی اسی کو ترجیح دی گئی ہے اور کہا ہے کہ حق یہی ہے۔ سنتِ صحیحہ نے قرآن کی عمومیت کو اس قسم کے مقدمے کے لیے خاص کیا ہے۔[5]

خلع لینے کے ساتھ عدت میں رجوع کا مسئلہ:

خلع دینے والے کے لیے خلع لینے والی کی طرف دورانِ عدت میں اس کی رضامندی کے بغیر رجوع کرنا جائز نہیں ہے۔ ائمۂ اربعہ اور جمہور علما اسی طرف گئے ہیں، کیوں کہ وہ مال خرچ کر کے اپنی جان کی مالک ہو چکی ہے۔ ابن ابی اوفی اور ماہان حنفی نے کہا ہے کہ اگر مال لوٹا دے تو عدت کے دوران میں بغیر رضا مندی کے بھی رجوع درست ہوگا۔ اسی کو امام ابو ثور رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر خلع طلاق کے لفظ کے بغیر ہوا ہے تو یہ علاحدگی ہوئی، شوہر کو اس کی طرف کوئی راستہ نہیں ہے اور اگر طلاق کے لفظ کے ساتھ ہوا ہے تو وہ عدت تک رجعت کا اختیار رکھتا ہے۔ داود ظاہری رحمہ اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ خلع دینے والے کو خلع لینے والی سے عدت کے دوران میں نکاح جائز ہے، ایک گروہ نے کہا جائز نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ قول شاذ اور مردود ہے۔[6]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٢٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٨٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (صحيح أبي داود: ٦/ ٤٢٨)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٨٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو "صحیح" کہا ہے۔ (صحيح أبي داود: ٦/ ٣١)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٥٨) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسناده جيد" (فتح الباري: ٩/ ٣٩٩)

[4] سنن الدارقطني (٣/ ٢٥٦) اس کی سند میں "عبداللہ بن لہیعہ" ضعیف راوی ہے۔

[5] فتح البيان (٢/ ٢٤) [6] تفسير ابن كثير (١/ ٣٦١)

خلع لینے والی کو دورانِ عدت میں دوسری طلاق دینے کا مسئلہ:

رہی یہ بات کہ خلع دینے والا عدت میں اس کو دوسری طلاق بھی دے سکتا ہے یا نہیں؟ اس میں علما کے تین قول ہیں: ایک یہ کہ نہیں، اس لیے کہ وہ اپنی جان کی مالک ہوگئی ہے اور اس سے چھوٹ گئی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم، امام عکرمہ، جابر بن زید، حسن بصری، شافعی، احمد بن راہویہ اور ابوثور رحمہم اللہ اسی کے قائل ہیں۔ دوسرا قول امام مالک رحمہ اللہ کا یہ ہے کہ اگر خلع کے ساتھ ہی طلاق بھی کہہ دی ہے اور دونوں کے درمیان سکوت نہیں کیا تو طلاق پڑے گی اور اگر سکوت کیا ہے تو نہ پڑے گی۔ امام ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ عثمان رضی اللہ عنہ سے اسی طرح مروی ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ طلاق ہر حال میں پڑ جائے گی، جب تک کہ عدت میں ہے۔ امام ابوحنیفہ وحنفیہ وثوری واوزاعی و ابن مسعود و ابو الدرداء رضی اللہ عنہما وغیرہم اسی کے قائل ہیں، مگر ابن عبدالبر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان دونوں صحابیوں سے یہ قول ثابت نہیں ہے۔[1]

اللہ کی حدود سے تجاوز کرنا ظلم ہے:

پھر اللہ پاک نے اس کے بعد یہ فرمایا ہے کہ یہ شرائع جو بیان کیے گئے ہیں، اللہ کے قواعد (حدیں) ہیں، ان سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ صحیح حدیث میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حدیں باندھی ہیں، تم ان سے آگے نہ بڑھو، اللہ نے فرائض مقرر کیے ہیں، تم ان کو برباد نہ کرو، اللہ نے محارم ٹھہرائے ہیں، تم ان کی رسوائی نہ کرو، کچھ چیزوں سے سکوت کیا ہے بغیر نسیان کے، تم ان کو مت پوچھو۔[2] اس آیت سے بعض نے یہ استدلال کیا ہے کہ تین طلاق کو ایک کلمے میں جمع کرنا حرام ہے۔ مالکیہ اور جو لوگ ان کے موافق ہیں اسی طرف گئے ہیں۔ ان کے نزدیک سنت یہ ہے کہ ایک طلاق دے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ”طلاق (رجعی) دو مرتبہ ہے۔“ پھر فرمایا: ﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ”یہ اللہ کی حدیں ہیں، سو تم ان سے آگے نہ بڑھو، اور جو لوگ اللہ کی حدوں سے تجاوز کرتے ہیں، وہی ظالم ہیں۔“

اکٹھی تین طلاقیں دینا حرام ہے:

پھر اس قول کو سیدنا محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے تائید دی گئی ہے، جو امام نسائی کے نزدیک ان الفاظ سے آئی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دی ہیں، آپ نہایت

---

[1] الاستذکار (٦/ ٨٢) تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٦١)

[2] مستدرك الحاكم (٤/ ١٢٩) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ مکحول رحمہ اللہ کا سیدنا ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ١٥٩٧)

غضب ناک ہوئے اور کھڑے ہو کر فرمایا، کیا اللہ کی کتاب کو کھیل تماشا بنا لیا گیا ہے اور میں تمھارے درمیان موجود ہوں؟! یہاں تک کہ ایک آدمی نے کہا کہ اگر حکم ہو تو میں اس کو مار ڈالوں۔[1] مگر اس کی سند میں انقطاع ہے۔

تیسری طلاق کے بعد شرعاً حلال ہونے کا مسئلہ:

تیسرا مسئلہ تحلیل کا ہے کہ جب کوئی مرد اپنی بیوی کو تیسری بار طلاق دے دے، اس کے بعد کہ دو طلاق پہلے دے چکا ہو تو وہ عورت اس پر حرام ہو جاتی ہے، جب تک دوسرا خاوند نہ کر لے اور وہ اس سے صحبت نہ کر لے، یعنی صحیح نکاح کے ساتھ، کیوں کہ اگر بغیر نکاح کے لونڈی کی حیثیت سے وطی کی ہے تو پہلے مرد کے لیے حلال نہیں ہوگی، کیوں کہ یہ اس کا شوہر نہ ہوا۔ اسی طرح اگر نکاح کر لیا، لیکن مدخولہ نہ ہوئی تو بھی پہلے خاوند کے لیے حلال نہیں ہوگی۔ بہت سے فقہا میں یہ مشہور ہے کہ سعید بن مسیّب رحمہ اللہ کا یہ قول ہے کہ دوسرے خاوند کے ساتھ صرف نکاح سے حلال ہونے کا مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس قول کی صحت میں اختلاف ہے، اگرچہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے ''الاستذکار'' میں اس کا ذکر کیا ہے،[2] کیوں کہ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بہ طریقِ سعید بن مسیّب رحمہ اللہ مرفوعاً روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ پہلے شوہر کو نہیں مل سکتی، جب تک کہ دوسرے شوہر کا شہد نہ چکھ لے۔[3]

امام ابن جریر رحمہ اللہ کے الفاظ ابن مسیّب رحمہ اللہ سے حدیثِ مذکور میں مرفوعاً اس طرح ہیں: ((قَالَ: لَا حَتّٰی تَذُوْقَ عُسَیْلَتَهٗ وَیَذُوْقَ عُسَیْلَتَهَا)) ''فرمایا کہ نہیں (حلال ہے) یہاں تک کہ عورت مرد کا شہد چکھ لے اور مرد عورت کا'' (یعنی لذتِ جماع حاصل کر لیں)۔ اس کو نسائی اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔[4] سو یہ حدیث حکایتِ مذکورہ کے مخالف ہے، یہ بات بعید ہے کہ راوی کسی مستند روایت کے خلاف کوئی بات کرے۔ احمد اور نسائی رحمہما اللہ نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کو اِن دوسرے الفاظ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں، اس نے دوسرے مرد سے نکاح کیا، اس نے دروازہ بند کر کے پردہ چھوڑا، پھر طلاق دی اور دخول نہ کیا۔ کیا زوجِ اول کے لیے حلال ہوگی؟ فرمایا کہ اول پر حلال نہیں، جب تک کہ اس دوسرے کا شہد نہ چکھ لے۔[5] یہ الفاظ احمد کے ہیں۔

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤٠١) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو ''صحیح'' کہا ہے۔ (غاية المرام: ١/ ١٦٤)

[2] الاستذكار (٥/ ٤٤٧)

[3] مسند أحمد (٢/ ٨٥) اس کی سند میں ''سالم بن رزین'' مجہول راوی ہے۔ البتہ اس کی اصل صحیحین میں مروی ہے۔

[4] تفسير الطبري (٤/ ٥٩٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤١٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٣٣) اس کی سند میں ''سالم بن رزین'' مجہول راوی ہے۔

[5] مسند أحمد (٢/ ٢٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤١٥) اس کی سند میں ''رزین بن سلیمان'' مجہول راوی ہے۔

ان کی تیسری روایت میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے یوں مروی ہے:« قَالَ: لَا حَتّٰی یَکُوْنَ الْآخَرُ قَدْ ذَاقَ مِنْ عُسَیْلَتِهَا وَذَاقَتْ مِنْ عُسَیْلَتِهٖ » ① ”فرمایا کہ نہیں یہاں تک کہ دوسرا خاوند اس کا شہد (مزا) چکھ لے اور وہ اس کا۔“ امام ابن جریر رحمہ اللہ کے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً الفاظ یوں مروی ہیں:« حَتّٰی یَذُوْقَ الْآخَرُ عُسَیْلَتَهَا » ② ”یہاں تک کہ دوسرا اس کا شہد چکھ لے۔“ امام ابن جریر رحمہ اللہ کے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی یہ الفاظ ہیں:« لَا، حَتّٰی یَذُوْقَ مِنْ عُسَیْلَتِهَا كَمَا ذَاقَ الْأَوَّلُ » ”نہیں، یہاں تک کہ دوسرا اس کا شہد چکھ لے، جیسا کہ پہلے نے چکھا۔“ اس کو شیخین اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے۔③ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان کی تیسری روایت اس طرح ہے:« قَالَ: لَا تَحِلُّ لِزَوْجِهَا الْأَوَّلِ حَتّٰی یَذُوْقَ الْآخَرُ عُسَیْلَتَهَا وَتَذُوْقَ عُسَیْلَتَهٗ » ”فرمایا کہ نہیں حلال وہ عورت پہلے خاوند کے لیے یہاں تک کہ دوسرا خاوند اس کا شہد چکھ لے اور وہ عورت اس کا۔“ اس کو ابو داود نے بھی روایت کیا ہے۔④

صحیحین میں یہ حدیث کئی طریق سے آئی ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ رفاعہ قرظی نے ایک عورت سے نکاح کیا، پھر طلاق دی، اس عورت نے دوسرا بیاہ کیا، پھر آ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ وہ میرے پاس نہیں آتا ہے، اس کے پاس کچھ نہیں، مگر مثل ایک کپڑے کے پلّو کے، یعنی نامرد ہے۔ فرمایا:« لَا، حَتّٰی تَذُوْقِيْ عُسَیْلَتَهٗ وَیَذُوْقَ عُسَیْلَتَكِ » ⑤ ”نہیں، یہاں تک کہ تو اس کا شہد چکھے اور وہ تیرا۔“ امام احمد رحمہ اللہ کی روایت میں آیا ہے کہ یہ شکایت عبدالرحمٰن بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں تھی، یعنی وہ جماع پر قادر نہیں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تو چاہتی ہے کہ رفاعہ کے پاس پھر جائے؟ یہ نہیں ہوسکتا، جب تک کہ تو کچھ شہد اس کا اور وہ کچھ شہد تیرا نہ چکھ لے۔ اس کو شیخین اور نسائی رحمہم اللہ نے روایت کیا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ وغیرہ کے نزدیک یہ قصہ کئی طرح سے آیا ہے۔⑥

نتیجہ یہ نکلا کہ صرف خلوت ہی کافی نہیں، بلکہ زوجِ ثانی سے صحبت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ عورت میں راغب ہو اور نکاح مستقل گھر بسانے کے لیے کرے۔ کیوں کہ شرعی نکاح میں یہی بات لازم ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے یہ بھی شرط عائد کی ہے کہ مباح طریقے سے جماع ہو، ایسا نہ ہو کہ خاوند محرم ہو کر وطی کرے یا وہ عورت

---

① مسند أحمد (٣/ ٢٨٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رجاله رجال الصحيح خلا محمد بن دينار الطاحي وقد وثقه أبو حاتم و أبو زرعة و ابن حبان وفيه كلام لا يضر“ (مجمع الزوائد: ٤/ ٦٢٥)

② تفسير الطبري (٤/ ٥٩٣) اس کی سند میں ”ابو حارث غفاری“ مجہول راوی ہے۔

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٦١) تفسير الطبري (٤/ ٥٩٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤١٢)

④ تفسير الطبري (٤/ ٥٨٩) سنن أبي داود (٢٣٠٩) امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”إسناده صحيح“ (صحيح أبي داود: ٧/ ٧٧)

⑤ صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠١١)

⑥ صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٣٣) مسند أحمد (٦/ ٣٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢٨٣) الموطأ (٢/ ٥٣١)

صائمہ ہو یا معتکفہ یا حائض یا نفاس والی ہو یا زوجِ ثانی صائم یا معتکف ہو، ان صورتوں میں وہ پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر دوسرا خاوند ذمی ہو تو اس کے ساتھ نکاح کرنے سے پہلے مسلم شوہر کے لیے حلال نہیں ہوسکتی، کیوں کہ امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک کفار کے نکاح باطل ہیں۔ حسن بصری رحمہ اللہ نے یہ شرط بھی زائد کی ہے کہ دوسرے خاوند کو انزال بھی ہو جائے، یہ بات شاید لفظ «عُسَيْلَه» سے سمجھی ہے، مگر اس بنیاد پر یہ بھی لازم آتا ہے کہ عورت کو بھی انزال ہو، مگر «عسیله» سے مراد منی نہیں ہے، اس لیے کہ امام احمد و نسائی رحمہما اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً روایت کیا ہے: «أَلَا إِنَّ الْعُسَيْلَةَ الْجِمَاعُ»[1] یعنی شہد سے مراد صحبت ہے، نہ کہ انزال۔

حلالہ کرنے اور کروانے والے پر لعنت:

پھر اگر زوجِ ثانی نے وہ نکاح اس قصد کے لیے کیا ہے کہ پہلے شوہر کے لیے حلال ہو جائے تو وہ محلل ٹھہرا۔ احادیث میں محلل کی مذمت اور اس پر لعنت آئی ہے۔ نکاح کے وقت اگر اس اَمر کی تصریح کرے گا تو جمہور ائمہ کے نزدیک سرے سے نکاح ہی نہ بندھے گا اور باطل ہوگا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ محلل اور محلل لہ پر لعنت ہے۔ (رواہ أحمد و النسائي) ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے، اس پر اہلِ علم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل ہے، ان میں سیدنا عمر و عثمان و ابن عمر رضی اللہ عنہم ہیں۔ فقہائے تابعین رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔[2] سیدنا علی، ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم سے یہی مروی ہے۔[3] سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ» ”لعنت کرے اللہ محلل اور محلل لہ دونوں پر“[4] محلل (حلالہ کرنے والا) سے دوسرا شوہر اور محلل لہ (جس کے لیے حلالہ کیا جائے) سے پہلا شوہر مراد ہے۔ ان کی تیسری مرفوع روایت یہ ہے کہ محلل اور محلل لہ نبی اکرم ﷺ کی زبان پر قیامت تک ملعون ہیں۔[5] (رواہ أحمد و النسائي) سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: کیا میں تم کو تیس مستعار (عاریتاً لیے ہوئے سانڈ) کے بارے میں خبر نہ دوں؟ کہا کہ ہاں، فرمایا کہ وہ محلل ہے، اللہ لعنت کرے محلل اور محلل لہ پر۔[6] (رواہ ابن ماجه)

---

① مسند أحمد (٦/ ٦٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤١٢٩) سنن النسائی میں ان الفاظ کے ساتھ روایت نہیں مل سکی۔ تفسیر ابن كثير (١/ ٣٦٤)

② مسند أحمد (١/ ٤٤٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٢٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤١٦) صحيح الجامع (٥١٠١)

③ سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٣٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٢٠)

④ ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ سے مروی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٧٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٣٦) مصنف ابن أبي شيبة (٧/ ٢٩٢) سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ٢٠٨) امام البانی رحمہ اللہ نے ان روایات کو صحیح کہا ہے۔ [إرواء الغليل: ٦/ ٣٠٧]

⑤ مسند أحمد (١/ ٤٠٩) سنن النسائي (٥١٠٢) مصنف عبد الرزاق (٦/ ٢٦٩) اس کی سند میں ”حارث اعور“ ضعیف راوی ہے۔

⑥ سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٣٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٥٩٦)

سنن ابن ماجہ میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے دوسری روایت اس طرح ہے: «لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ»[1] "رسول اللہ ﷺ نے حلالہ کرنے والے اور کروانے والے دونوں پر لعنت کی۔" اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ہم اس کو عہدِ رسالت میں زنا گنتے تھے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ اسناد صحیح ہے۔[3] سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ محلل اور محلل لہ میرے پاس آئے گا تو میں اُن کو رجم کروں گا۔[4] (رواه الأثرم و ابن أبي شيبة) ایک آدمی نے حلالہ کیا، یعنی زوجِ اول پر حلال کرنے کے لیے، سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے دونوں میں تفریق کرا دی۔[5] اسی طرح سیدنا علی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم وغیرہما سے بھی مروی ہے۔ اس باب میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں، سات حدیثیں تو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھی ہیں۔[6] امام ابن القیم رحمہ اللہ نے "إعلام الموقعين" اور "إغاثة اللهفان" میں اس بارے میں بہت ہی زوردار انداز پر لکھا ہے اور اسے نہایت لعنتی فعل ثابت کیا ہے۔[7]

تین طلاقوں والی عورت کب پہلے خاوند کے لیے حلال ہوتی ہے؟

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر دوسرے خاوند نے دخول کے بعد طلاق دی ہے تو پھر دونوں پر کچھ گناہ نہیں ہے، اگر وہ جانتے اور گمان کرتے ہیں کہ باہم اچھا برتاؤ رہے گا اور اگر اس بات پر یقین نہیں ہے کہ اللہ کے حدود قائم رہیں گے، یا میاں بیوی میں سے ایک کو یا دونوں کو تردد ہے تو پھر اس نکاح میں پھنسنا گناہ اور حرام میں گرفتار ہونا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تفصیلات ہیں، جو جاننے والوں کے لیے بیان کی گئی ہیں۔

پہلے خاوند کے پاس دوبارہ شادی کرنے کی صورت میں طلاق کا حق:

ایک آدمی نے ایک یا دو طلاق دے کر عورت کو چھوڑ دیا، عدت گزر گئی، اس نے دوسرے سے نکاح کر لیا، اس نے دخول کے بعد اس کو طلاق دے دی، عدت پوری ہوئی، پھر پہلے خاوند نے اس سے نکاح کر لیا تو وہ عورت اس کو مع ایک باقی طلاق کے مل سکتی ہے یا کیا ہوگا؟ اس میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ امام مالک، امام شافعی، احمد رحمہم اللہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ ہاں یہ واپسی ایک طلاق کے ساتھ باقی ہوگی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ زوجِ ثانی نے تو سابقہ طلاق کو ختم کر دیا۔ اب جو پہلے کو ملی ہے تو تینوں طلاق سمیت ملے گی۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ دوسرا شوہر جب تینوں طلاق کو گرا دیتا ہے تو پھر تین سے کم کو تو بطریقِ اولیٰ

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٣٤) اس کی سند میں "زمعہ بن صالح" ضعیف راوی ہے۔
[2] مسند أحمد (٢/ ٣٢٣) اس کی سند حسن ہے۔
[3] مستدرك الحاكم (٢/ ٢١٧) امام حاکم اور ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔
[4] مصنف ابن أبي شيبة (٧/ ٢٩٢)
[5] سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ٢٠٨)
[6] تفسير ابن كثير (١/ ٣٦٤_ ٣٦٦)
[7] إعلام الموقعين (٣/ ٤١_ ٥٠) إغاثة اللهفان (١/ ٢٦٨_ ٢٨٢)

ڈھا دے گا۔[1] واللہ أعلم. امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب کسی آزاد مرد نے تین طلاقیں دیں، عدت گزر گئی، اس نے دوسرا خاوند کر لیا، پھر اس دوسرے نے بعد دخول طلاق دے دی، پھر اس سے اگلے خاوند نے نکاح کیا تو وہ عورت اس کے پاس تین طلاق پر ہی رہے گی، یعنی پہلی کالعدم ہوں گی، اب اسے نئے سرے سے تین طلاق کا حق ہوگا۔[2]

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ
اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ
ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۡ
وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ
وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيْمٌ ۧ ﴿۲۳۱﴾

اور جب تم عورتوں کو (پہلی یا دوسری) طلاق دو، پھر ان کی عدت پوری ہونے کو ہو تو انھیں دستور کے مطابق روک لو یا انھیں دستور کے مطابق چھوڑ دو اور انھیں ستانے کے لیے نہ روکو، تاکہ تم زیادتی کرو اور جو کوئی ایسا کرے گا وہ یقیناً اپنے آپ ہی پر ظلم کرے گا اور تم اللہ کی آیتوں کو ہنسی مذاق نہ بناؤ اور اللہ کی طرف سے تم پر جو انعام ہوا اسے یاد کرو اور اس کتاب اور حکمت کو بھی یاد کرو جو اس نے تم پر نازل کی، وہ تمھیں اس کی نصیحت کرتا ہے اور تم اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے ﴿231﴾

مطلقہ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم:

اللہ پاک نے اس آیت میں یہ حکم دیا ہے کہ جب کوئی شخص کسی عورت کو ایسی طلاق دے، جس میں رجوع ہو سکتا ہے تو اس کو چاہیے کہ اچھا معاملہ کرے، یعنی جب عدت اتنی باقی رہ جائے جس میں رجوع ہو سکے تو اس عورت کو نکاح ہی میں دستور کے مطابق واپس لے لے۔ دستور سے یہ مراد ہے کہ رجوع پر گواہ کر لے، اچھے برتاؤ کی نیت رکھے۔ اگر ایسا نہ کرے تو پھر اس کو چھوڑ دے، یہاں تک کہ مدت گزر جائے، پھر اس کو اپنے گھر سے عزت کے ساتھ رخصت کرے نہ کہ سختی، دشمنی اور قباحت کے ساتھ۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، مسروق، حسن، قتادہ، ضحاک اور ربیع رحمہم اللہ

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۳٦٦) [2] فتح القدیر (۱/ ٤١٦)

وغیرہم نے کہا ہے کہ کوئی اپنی بیوی کو طلاق دیتا تو جب اس کی عدت گزرنے کے قریب ہوتی تو اس سے رجوع کر لیتا۔ ایسا اسے تکلیف دینے کے لیے کرتا، تا کہ وہ دوسرے مرد سے شادی نہ کر لے۔ پھر طلاق دیتا، وہ عدت گزارتی، جب عدت گزرنے کو ہوتی، پھر طلاق دیتا، یہ اس لیے کہ عدت کی مدت لمبی ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس حرکت سے منع کیا۔ یہ وعید سنائی کہ ایسا آدمی اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے اور اللہ کے حکم کے خلاف کام کرتا ہے۔[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اشعریین پر خفا ہوئے، میں نے کہا کہ آپ کیوں خفا ہیں؟ فرمایا کہ تم میں لوگ اِدھر طلاق دیتے ہیں، اُدھر رجوع کر لیتے ہیں، یہ کچھ مسلمانوں کی طلاق نہیں ہے، عورت کو عدت کے آغاز میں طلاق دو۔ اس پر یہ آیت اُتری کہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو ہنسی نہ ٹھہراؤ۔[2] امام مسروق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ وہ شخص ہے، جو بے گناہ طلاق دے کر عورت کو ستاتا ہے، پھر رجوع کرتا ہے اور عدت کو بڑھانا چاہتا ہے۔ امام حسن، قتادہ، ربیع، مقاتل اور عطا خراسانی رحمہم اللہ کا یہ قول ہے کہ اس سے وہ شخص مراد ہے، جو طلاق دے کر کہتا ہے کہ میں تو ہنستا تھا۔ یا آزاد کرتا یا نکاح کرتا ہے، پھر اپنے آپ کو کھیلنے والا بتاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص پر طلاق کو لازم کر دیا، فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے ساتھ مذاق نہ کرو۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ آیت اس کے حق میں ہے، جو بلا ارادہ طلاق کھیل تماشے کے طور پر طلاق دیتا ہے۔ اس لیے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے گلے میں طلاق باندھ دی کہ تو اب ہنسی ٹھٹھا کر۔ سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ کوئی آدمی کسی سے کہتا ہے کہ میں نے اپنی دُختر کو تیرے نکاح میں دیا، پھر کہتا ہے، میں تو ہنستا تھا یا کہتا کہ میں نے تجھ کو آزاد کیا، پھر اس کو ہنسی پر ٹالتا ہے، تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔[4] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث میں مروی ہے کہ تین چیزیں ہیں کہ ہنسی مذاق میں یا بے ہنسی ہو جاتی ہیں: نکاح، طلاق اور رجوع۔ اس کو ابوداود اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے حسن غریب بتایا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔[5]

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ احسان رکھا کہ دیکھو ہم نے تم پر کتاب وسنت کو اُتارا ہے، تم اس نعمت کو نہ بھولو۔ اس جگہ کتاب سے مراد قرآنِ پاک ہے۔ حکمت سے مراد سنت ہے کہ جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری فرمایا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن اُتارا ہے، اسی طرح حدیث بھی اُتاری ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ قرآن متلو ہے (یعنی جس کی تلاوت کی جاتی ہے) اور حدیث متلو نہیں ہے۔ باقی وحی اور

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٤٢٥) [2] تفسیر الطبري (٥/ ١٤) علامہ احمد شاکر نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٤٢٥، ٤٢٦) [4] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٦٧، ٣٦٨) الدر المنثور (١/ ٦٨٣)

[5] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢١٩٤) سنن الترمذي، رقم الحدیث (١١٨٤) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٢٠٣٩) مستدرك الحاكم (٢/ ٢١٦) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٣٠٢٧)

حجت ہونے میں دونوں برابر ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ ﴾ [النجم: ۳۔ ٤] ''اور وہ (اپنی) خواہش سے نہیں بولتا۔ وحی ہی تو ہے جو (اس کی طرف) بھیجی جاتی ہے۔'' حدیث شریف میں مروی ہے: «أُوتِيتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ»[1] ''میں قرآن اور اُس کے ساتھ اس جیسا بھی دیا گیا ہوں'' (یعنی حدیث)۔ اس سے ثابت ہوا کہ منکرِ حدیث کا حکم ویسا ہی ہے، جیسا منکرِ قرآن کا۔ جن لوگوں کو قرآن و حدیث پہنچ گیا ہے اور وہ مذاہب اور اقوالِ رجال کے مقابلے میں اس کو نہیں مانتے، ان پر کفر کا خوف ہے، اگر وہ ضد اور عداوت کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں اور تاویل کرنے والے نہیں۔ واللہ أعلم۔ اس آیت پر پارہ دوم کا ربع ثالث ختم ہوا۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۳۲

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پھر وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو تم انھیں اس بات سے مت روکو کہ وہ اپنے (پہلے) خاوندوں سے نکاح کریں جبکہ وہ دستور کے مطابق آپس میں راضی ہوں۔ یہ اس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو تم میں سے اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے۔ تمھارے لیے بہت سلجھا ہوا اور زیادہ پاکیزہ طریقہ یہی ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے (232)

ولی کو اپنے طلاق دینے والے خاوند کے ساتھ عورت کو نکاح کرنے سے روکنے کی ممانعت:

یہ عورتوں کے ولیوں کو حکم ہے کہ اس کے نکاح میں اسی کی خوشی کا خیال رکھیں۔ جہاں وہ راضی ہوں، وہاں کر دیں، اگرچہ اپنی نظر میں اور جگہ بہتر معلوم ہو۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ آیت اس شخص کے حق میں اُتری ہے، جس نے اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاقیں دیں، عدت ہو چکی، پھر یہ مناسب جانا کہ اس سے نکاح کر لے اور رجوع کر لے۔ عورت بھی اسی بات کو چاہتی ہے تو عورت کے ولیوں کو اس سے منع نہیں کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے۔[2] امام مسروق، نخعی، زہری اور ضحاک رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔[3]

ولی کے بغیر نکاح نہیں:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت سے یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی نکلا کہ عورت اپنا

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٤) مسند أحمد (٤/ ١٤٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٦٤٣)

[2] تفسير الطبري (٥/ ٢٢) اس کی سند حسن ہے۔ [3] تفسير الطبري (٥/ ٢٢۔ ٢٣)

نکاح آپ نہیں کر سکتی، نکاح کے لیے ولی کا ہونا ضروری ہے۔[1] ترمذی اور ابن جریر رحمہ اللہ نے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ کوئی عورت کسی عورت کا بیاہ نہ کرے اور نہ کوئی عورت اپنا بیاہ کرے۔ زانیہ وہی ہے، جو اپنا بیاہ آپ کرتی ہے۔[2] دوسرے اثر میں آیا ہے کہ ولی مرشد اور دو عادل گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔[3] اس مسئلے میں علما کے درمیان اختلاف ہے۔ اس کی جگہ فروع کی کتابیں ہیں۔

آیت کا شانِ نزول:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے "کتاب الأحکام" میں اس کو بیان کیا ہے۔ بخاری شریف میں آیا ہے کہ یہ آیت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ اور ان کی بہن کے حق میں اُتری ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کی بہن کو اُن کے شوہر نے طلاق دے دی تھی، عدت گزرنے کے بعد پھر اس سے نکاح کرنا چاہا تو سیدنا معقل رضی اللہ عنہ نے انکار کیا، اس پر یہ آیت اُتری۔ اس کو ابو داود و ابن ماجہ و ابن ابی حاتم و ابن جریر و ابن مردویہ رحمہم اللہ نے بھی کئی طریق سے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے صحیح بتایا ہے۔[4] امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ عورت جمیل دخترِ یسار تھی اور ابو البداح رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھی۔ ابو اسحاق سبیعی رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ فاطمہ بنت یسار تھی۔[5] اکثر سلف اس آیت کا نزول معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کے حق میں بتاتے ہیں۔ سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما اور ان کی چچا زاد کے حق میں اُتری ہے۔[6] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ پہلی بات صحیح ہے۔[7]

فتح البیان میں کہا گیا ہے کہ اس آیت میں اولیا کو خطاب ہے۔ طلاق کی نسبت ان کی طرف اس لیے کی گئی کہ وہ مطلقات کے نکاح کا سبب ہیں یا یہ خطاب خاوندوں کو ہے، یعنی جب تم طلاق دے چکے اور عدت بھی ہو چکی تو اب وہ جس سے چاہے نکاح کرے، تم منع کرنے والے کون ہو۔ یہ ممانعت جاہلیت کی غیرت ہے، جس طرح اکثر رئیس، امیر یا بادشاہ اس بات پر غیرت کرتے ہیں کہ جو عورتیں ان کے نیچے تھیں، اب وہ کسی دوسرے کے نیچے جائیں،

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۳۶۸)

[2] مذکورہ الفاظ کے ساتھ یہ روایت سنن ترمذی اور تفسیر طبری کے بجائے سنن ابن ماجہ اور دیگر کتابوں میں مروی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۱۸۸۲) سنن الدارقطني (۳/ ۲۲۷) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے اور روایت کے آخری حصے کے موقوف ہونے کو صحیح کہا ہے۔ (إرواء الغلیل: ٦/ ۲۴۸۔ ۲۴۹)

[3] سنن البیهقي الکبریٰ (۷/ ۱۱۲) امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کو دوسری جگہ مرفوع بیان کرتے ہوئے خود وضاحت فرما دی کہ اس کا مرفوع ہونا ضعیف اور موقوف ہونا صحیح ہے۔ (سنن البیهقي الکبریٰ: ۷/ ۱۲۴)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٥٢٩) سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۰۸۷) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۹۸۱) تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ٤٢٦۔ ٤٢٧) تفسیر الطبري (٥/ ۱۸)

[5] تفسیر الطبري (٥/ ۲۰۔ ۲۱) [6] تفسیر الطبري (٥/ ۲۱۔ ۲۲) [7] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۳٦۹)

کیوں کہ اپنی عزت و جاہ، مقام و ریاست و تکبر کی وجہ سے ان کو یہ خیال دامن گیر رہتا ہے کہ وہ جنس بنی آدم سے نہیں ہیں، مگر جس کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ اور عاجزی دے کر بچا لیا۔[1]

وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَیْنِ كَامِلَیْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۗ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْۤا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّاۤ اٰتَیْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۲۳۳﴾

اور مائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال دودھ پلائیں، (یہ حکم) اس شخص کے لیے ہے جو دودھ پلانے کی مدت پوری کرنا چاہے (اس صورت میں) باپ کے ذمے ہے کہ ان (ماؤں) کو دستور کے مطابق کھانا اور کپڑا دے، کسی جان پر اس کی گنجایش سے بڑھ کر بوجھ نہ ڈالا جائے، نہ ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف دی جائے اور نہ باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے (تنگ کیا جائے) اور (اگر باپ مر جائے تو) اس کے وارث کا یہی ذمہ ہے، پھر اگر دونوں (ماں باپ) آپس کی رضا مندی اور مشورے سے دودھ چھڑانے کا ارادہ کریں تو ان دونوں پر کچھ گناہ نہیں اور اگر تم ارادہ کرو کہ اپنی اولاد کو کسی اور عورت سے دودھ پلواؤ تو تم پر کوئی گناہ نہیں، جب کہ تم اس معاوضے کی ادائیگی کر دو، جو تم نے دستور کے مطابق دینا طے کیا ہو اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ تمھارے ہر عمل پر کڑی نگاہ رکھتا ہے جو تم کرتے ہو ﴿233﴾

رضاعت صرف مدتِ رضاعت میں ثابت ہوتی ہے:

یعنی اگر مرد عورت میں طلاق ہوئی، بچہ دودھ پیتا رہا تو ماں دو برس تک اس کو دودھ پلانے کی پابند رہی تو باپ اس کا خرچ اُٹھائے گا، اگر باپ مر گیا تو لڑکے کے وارث اس کا خرچ اُٹھائیں اور اگر اپنی خوشی سے دو برس سے کم مدت میں بچے کا دودھ چھڑا دیں تو بھی مناسب ہے۔ باپ دودھ کسی اور سے پلوا لے، ماں کو پابند نہ رکھے تو بھی

[1] فتح البیان (۲/ ۳۰)

جائز ہے، لیکن اس کے بدلے میں ماں کا کچھ حق نہ کاٹ رکھے۔

اس آیتِ شریفہ میں اللہ تعالیٰ نے ماؤں کو یہ ارشاد کیا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو دو برس کامل دودھ پلائیں، اس کے بعد رضاعت کا کچھ اعتبار نہیں۔ اسی لیے یہ فرمایا کہ جو رضاعت کو پورا کرنا چاہے، وہ ایسا کرے۔ اکثر ائمہ اسی طرف گئے ہیں کہ رضاعتِ محرمہ وہی ہے جو دو سال کے اندر ہو۔ اگر دو سال سے زیادہ عمر کے بچے نے دودھ پیا تو وہ محرم نہ ہوگا۔ ترمذی رحمہ اللہ نے اس کے لیے ایک علاحدہ باب مقرر کیا ہے۔ اس میں اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ رضاعت سے وہی حرام ہے، جو چھاتی میں سے نکل کر آنتوں کو پھاڑے اور دودھ چھڑانے سے پہلے ہو۔ پھر کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اسی پر اکثر اہلِ علم کا عمل ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہ مروی ہے کہ حرام کرنے والی رضاعت وہی ہے جو دو برس ختم ہونے سے پہلے ہو اور جو دو برس کامل ہونے کے بعد ہے، وہ کسی شے کو حرام نہیں کرتی۔[1]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ترمذی اس حدیث کے ساتھ منفرد (اکیلے) ہیں۔ اس حدیث کے رجال شرطِ صحیحین پر ہیں۔ چھاتی سے مراد دودھ کی جگہ ہے، جس طرح براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم کا انتقال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا بیٹا ابراہیم چھاتی کے اندر مرا، یعنی مدتِ رضاعت میں۔ بہشت میں اس کی ایک دایہ ہے۔ احمد اور بخاری رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے۔[2] یہ اس لیے فرمایا کہ وہ ایک سال دس ماہ کے ہو کر فوت ہوئے تھے، دو ماہ جو باقی رہے، ان کو جنت کی دودھ پلانے والی پورا کرے گی۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ رضاعت دودھ سے جدا کرنے کے بعد نہیں ہے اور یتیمی احتلام، یعنی بالغ ہونے کے بعد نہیں۔[3] (رواه أبو داود الطيالسي) اس حدیث کی پوری دلیل اس آیت میں ہے: ﴿وَفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ﴾ [لقمان: ١٤] ”اور اس کا دودھ دو سال میں چھڑانا ہوتا ہے۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾ [الأحقاف: ١٥] ”اور اس کا حمل اور دودھ چھڑانا تیس ماہ (کی مدت) ہے۔“

رضاعت کا دورانیہ:

یہ قول کہ دو سال کے بعد رضاعت حرام نہیں کرتی، سیدنا علی، ابن عباس، ابن مسعود، جابر، ابو ہریرہ، ابن عمر، ام سلمہ رضی اللہ عنہم، ابن مسیب، عطا رحمہ اللہ اور جمہور سے مروی ہے۔ امام شافعی، احمد، اسحاق، ثوری، مالک، ابو یوسف اور محمد رحمہ اللہ اسی طرف گئے ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ سے ایک روایت یہ ہے کہ رضاعت کی مدت دو سال دو ماہ یا تین ماہ

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٥٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٦٣٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣١٦) مسند أحمد (٤/ ٣٠٠)

[3] مسند الطيالسي (١/ ٢٤٣) اس کی سند میں ”خارجہ بن مصعب“ متروک راوی ہے، البتہ امام البانی رحمہ اللہ نے اس کے طرق اور شواہد ذکر کرتے ہوئے اس کو صحیح کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ٥/ ٧٩۔ ٨٣)

ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دو سال چھے ماہ ہے۔ امام زفر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب تک دودھ پیتا رہے، تین برس تک۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ سے بھی یہی روایت ہے۔ امام مالک اور اوزاعی رحمہما اللہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر دو برس سے کم میں دودھ چھڑا لیا، پھر کسی عورت نے فصال کے بعد دودھ پلا دیا تو اس سے حرام نہیں ہوگا، کیوں کہ وہ دودھ بہ منزلہ طعام کے ہے۔ سیدنا عمر اور علی رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ''فصال کے بعد رضاعت نہیں'' شاید اس سے مراد دو سال ہیں، جس طرح جمہور نے کہا ہے کہ خواہ دودھ چھوڑ دے یا نہ چھوڑے۔ یا مراد فعل ہے، جس طرح امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے۔[1] واللہ أعلم.

بڑے کی رضاعت:

صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ بڑے کو دودھ پلانے کو حرمت کے لیے موثر سمجھتی تھیں۔ عطا اور لیث رحمہما اللہ کا یہی قول ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جن مردوں کے سامنے آنا پسند کرتیں تو بعض عورتوں سے کہہ دیتیں کہ ان کو دودھ پلا دو۔ ان کی حجت سالم مولی ابی حذیفہ رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیوی سے فرما دیا تھا کہ سالم کو دودھ پلا دے (وہ بڑی عمر کا تھا) اس رضاعت کی وجہ سے ان کے گھر میں آتا جاتا تھا۔ مگر دیگر عورتوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہ حکم انھی کے لیے خاص تھا۔[2] جمہور کا قول بھی یہی ہے۔ ان کی حجت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیحین میں مروی حدیث ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عورتو! تم دیکھو کہ تمھارے بھائی کون ہیں؟ رضاعت تو بھوک سے ہوتی ہے۔[3] جمہور ائمہ سے مراد ائمہ اربعہ، فقہائے سبعہ، اکابر صحابہ اور تمام ازواجِ مطہرات ہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ اس مسئلے پر مزید کلام آیتِ رضاعت کے تحت آئے گا، یعنی جہاں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ وَأُمَّهَٰتُكُمُ ٱلَّٰتِيٓ أَرۡضَعۡنَكُمۡ ﴾ [النساء: ٢٣] ''اور تمھاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہو۔''[4] امام شوکانی رحمہ اللہ اس بارے میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قول سے متفق ہیں، کہتے ہیں کہ بڑے کو دودھ پلانا، اگرچہ وہ ڈاڑھی والا ہی کیوں نہ ہو، [اس لیے پلانا جائز ہے کہ اس کی طرف نظر کرنا یا اس کا دیکھنا جائز ہو جائے]۔[5] واللہ أعلم.

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نکاح اور طلاق کے بعد رضاعت کا ذکر کیا ہے، کیوں کہ کبھی میاں بیوی میں علاحدگی ہو جاتی ہے اور دونوں کے درمیان بچہ ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت طلاق یافتہ عورتوں کے لیے خاص ہے۔ بعض نے کہا کہ عام ہے۔ لفظ ﴿ حَوۡلَيۡنِ كَامِلَيۡنِ ﴾ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور زفر رحمہ اللہ کا رد ہے۔ ''اتمامِ رضاعت کے ارادے سے'' معلوم ہوا کہ دو برس کا پورا کرنا واجب نہیں، بلکہ حد تمام ہے۔ اگر دو برس سے کم پلا دیں تو بھی جائز ہے، اس کمی کی کچھ حد مقرر نہیں، جس مقدار میں بچے کی اصلاح اور زندگی ہو، وہ کافی ہے۔[6]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٧٠) [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٥٣) مسند أحمد (٦/ ٢٧٠)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٥٠٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٥٥) [4] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٧٠)

[5] نیل الأوطار (٧/ ٧٠-٧٢) [6] فتح البیان (٢/ ٣٢)

رضاعت کا خرچہ:

لڑکے کے باپ پر بچے کی ماں کا روٹی کپڑے کا انتظام اہلِ شہر کی عادت اور دستور کے مطابق واجب ہے۔ اس میں نہ فضول خرچی کرے اور نہ کنجوسی، یعنی تنگی ترشی، بلکہ اپنی طاقت کے مطابق دے، جس طرح اللہ پاک نے فرمایا ہے: ﴿ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّاۤ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا ؕ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۝۷ ﴾ [الطلاق: ۷] ”پس لازم ہے کہ وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے، اور جس پر اس کا رزق تنگ کیا گیا ہو تو وہ اسی میں سے خرچ کرے جو اسے اللہ نے دیا۔ اللہ کسی شخص پر اتنی ہی ذمے داری ڈالتا ہے جتنا اس نے اسے دیا۔ اللہ تنگی کے بعد جلد آسانی فرما دے گا۔“ ضحاک رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔[1] لفظ مولود لہ ارشاد کیا اور والد نہ کہا، اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ اولاد باپ کی ہوتی ہے نہ کہ ماں کی۔ اس لیے باپ کی طرف نسبت کرتے ہیں نہ کہ ماں کی طرف۔ گویا ماؤں نے وہ اولاد باپوں کے لیے جنی ہے۔

فتح البیان میں کہا گیا ہے کہ دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کا خرچ باپ پر ان مطلقہ بائنہ کے لیے واجب کیا گیا ہے، جو مطلقات نہیں ہیں، کیوں کہ ان کا کھانا اور پہنانا خاوندوں پر اولاد کی رضاعت کے علاوہ بھی فرض ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ زیادہ ظاہر یہ ہے کہ آیت ان بیویوں کے حق میں ہے جو نکاح میں باقی ہیں، کیوں کہ وہ نان و نفقہ کی مستحق ہیں، خواہ دودھ پلائیں نہ پلائیں۔ یہ روٹی کپڑا ان کی تمکین، یعنی صحبت کے عوض ہے، لہٰذا جب وہ دودھ پلانے میں مشغول ہوگی تو اس سے کامل نفع حاصل نہیں ہوگا۔ اس پر شاید کسی کو یہ وہم ہوتا ہے کہ وہ نان و نفقہ دودھ پلانے کی حالت میں جاتا رہا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس وہم کو دور کر دیا اور فرما دیا کہ یوں نہیں ہے، بلکہ اب بھی اس کا روٹی کپڑا اسی طرح واجب ہے، جیسے رضاعت سے پہلے واجب تھا۔[2]

بچے کا خرچہ باپ پر ہے:

پھر امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ بچے کا نفقہ والد پر واجب ہے، کیوں کہ بچہ عاجز و ضعیف ہے، اللہ نے اس کی جو نسبت ماں کی طرف کی ہے، وہ اس لیے کہ بچے کو حالتِ رضاعت میں غذا ماں ہی کے ذریعے سے پہنچتی ہے۔ علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ اولاد اور اطفال، جو مال نہیں رکھتے، ان کا خرچ باپ پر واجب ہے۔[3]

نہ نقصان لو نہ نقصان دو:

ماں کو نہیں چاہیے کہ بچے کو اس لیے اپنے سے دور کرے، تاکہ باپ کو اس کی پرورش کرنا مشکل ہو، ہاں دودھ

---

[1] تفسير الطبري (٥/ ٤٤) [2] تفسير القرطبي (٣/ ١٦٠) [3] تفسير القرطبي (٣/ ١٦٣) فتح البيان (٢/ ٣٣)

پلا دینے کے بعد، جس کے بغیر بچہ زندہ نہیں رہ سکتا، ماں کو اختیار ہے، چاہے رکھے یا نہ رکھے، لیکن اگر اس وقت بھی باپ کو تکلیف ہو تو بھی اس کا دور نہ کرنا، درست نہیں ٹھہرے گا، جس طرح ماں کو ستانے کے لیے باپ کے لیے درست نہیں کہ بچہ چھین لے، اسی لیے یہ فرمایا: ﴿ وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''اور نہ باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے (تنگ کیا جائے)۔'' یعنی باپ بھی بچے کو ماں سے لینے کا اُسے ستانے کے لیے ارادہ نہ کرے۔ یہی قول امام مجاہد، قتادہ، ضحاک، زہری، سدی، ثوری اور ابن زید رحمہم اللہ وغیرہ کا ہے۔[1] وارث پر بھی واجب ہے کہ اپنے قریب کو ضرر نہ دے۔ یہ مجاہد، شعبی اور ضحاک رحمہم اللہ کا قول ہے۔[2] بعض نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جس کا باپ نہ ہو تو وارث اس پر خرچ کرے، وہ بچے کی ماں کے حقوق کو پورا کرے اور کسی طرح اس کو تکلیف نہ دے۔ جمہور نے یوں ہی کہا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس کا مفصل بیان کیا ہے۔[3]

حنفیہ و حنابلہ نے اس آیت سے اس بات پر دلیل لی ہے کہ بعض اقارب کا نفقہ بعض پر واجب ہے۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، امام ابو حنیفہ اور احمد رحمہم اللہ اور جمہور سے اسی طرح مروی ہے۔ سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث بروایت حسن آئی ہے، وہ بھی اسی کی تائید کرتی ہے کہ جو کوئی کسی ذی رحم کا محرم ہوتا ہے تو اس پر آزاد ہو جاتا ہے۔[4] دو سال کے بعد کی رضاعت کبھی بچے کو اس کے بدن اور عقل میں نقصان پہنچاتی ہے۔ علقمہ نے ایک عورت کو دیکھا کہ دو برس کے بعد بھی بچے کو دودھ پلاتی تھی، اس کو منع کیا کہ مت پلا۔[5] کسی نے کہا کہ وارث سے مراد خود بچہ ہے، یعنی جب وہ باپ کا وارث ہوا، اس کو مال ملا تو اس پر اپنے مال سے اپنا ارضاع (دودھ پلانا) واجب ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مراد والدین ہیں۔ ان میں سے ایک کے مرنے کے بعد ایک باقی رہ گیا، اگر باپ مر گیا تو ماں بچے کی کفیل ہوگی، اگر بچہ مال دار نہیں ہے۔ امام ثوری رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[6] کسی نے کہا ہے کہ مراد دودھ پلانے والی وارث ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مثلیت سے مراد عدمِ اضرار ہے نہ کہ دودھ پلانا اور نان ونفقہ، ورنہ ''مِثْلُ ذٰلِكَ'' کے بجائے ''مِثْلُ هٰؤُلَاءِ'' ارشاد ہوتا۔ سارے مفسرین اسی طرف گئے ہیں،[7] مگر یہ قول نہایت فضول ہے۔ کیوں کہ اسم اشارہ جس طرح ایک کے لیے مناسب ہے، اسی طرح متعدد کے لیے بھی مناسب ہے۔ پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

رضا مندی سے دو سال سے پہلے دودھ چھڑوانا:

پھر اگر بچے کے ماں باپ اس میں مصلحت دیکھیں کہ دو برس سے پہلے دودھ چھڑا دیں تو ان پر کچھ گناہ نہیں۔

---

[1] تفسير الطبري (٥/ ٤٩ـ ٥٠) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٣٣) [3] تفسير الطبري (٥/ ٥٤ـ ٦٦)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٤٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٦٥) سنن النسائي (٣/ ١٧٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٥٢٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٥٥٧)

[5] تفسير الطبري (٥/ ٣٦) تفسير ابن كثير (١/ ٣٧١) [6] تفسير القرطبي (٣/ ١٦٨) [7] تفسير القرطبي (٣/ ١٧٠)

معلوم ہوا کہ والدین میں سے صرف ایک کی رائے کافی نہیں ہوتی، نہ ہی اس ایک کو بغیر مشورے کے اپنی بات پر ڈٹ جانا چاہیے، جب تک کہ دوسرے کا مشورہ نہ ہو۔ امام ثوری رحمہ اللہ کا یہی قول ہے[1] کہ اس میں بچے کے لیے احتیاط ہے، تاکہ اس کے بارے میں خوب غور کر لیں۔ یہ بندوں پر اللہ کی ایک رحمت ہے کہ اس نے بچوں کی تربیت کو والدین کے ذمے رکھا ہے اور یہ فرمایا کہ جس کام میں مصلحت ہو، وہ کام کرو، جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الطلاق میں فرمایا: ﴿ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى ﴾ [الطلاق: ٦] ”پھر اگر وہ (بچے کو) تمھارے لیے دودھ پلائیں تو تم انھیں ان کی اُجرت دو، اور (یہ) آپس میں دستور کے مطابق مشورے سے (طے) کرو، اور اگر تم باہم ضد پکڑ لو تو اسے کوئی اور عورت دودھ پلائے۔“ یا مشورے سے مراد اہلِ علم ہیں اور اگر یہ مشورہ نہ ہو تو دودھ نہ چھڑائیں، پھر اگر ماں باپ کی یہ صلاح ہوئی کہ بچے کو دایہ دودھ پلائے تو ماں نے جتنے دن دودھ پلایا ہے، اتنے دن کی اُجرت اس کو دے دے۔ امام ثوری اور مجاہد رحمہما اللہ کا یہی قول ہے۔[2] اللہ دیکھتا ہے کہ تم نے والدہ اور اولاد کو دودھ پلانے والی کے حقوق ادا کیے یا نہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٣٤﴾

اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو وہ چار ماہ دس دن اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں، پھر جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو تم پر کوئی گناہ نہیں، وہ اپنی ذات کے معاملے میں دستور کے مطابق جو چاہیں کریں (انھیں اختیار ہے) اور اللہ تمھارے ہر عمل سے خوب خبردار ہے جو تم کرتے ہو ﴿234﴾

بیوہ کی عدت:

طلاق کی عدت تین حیض فرمائی، موت کی عدت چار مہینے دس دن بتائی، دونوں اس وقت ہیں جب حمل معلوم نہ ہو، اگر حمل معلوم ہو تو عدت وضع حمل ہے۔ نکاح، طلاق اور رضاعت کے ذکر کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ جن عورتوں کے شوہر مر گئے، ان کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔ یہ حکم تمام بیویوں کو شامل ہے، خواہ وہ مدخولہ ہوں یا غیر مدخولہ۔ مستند لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ غیر مدخولہ کو بھی اس حکم میں شامل کرنا آیتِ کریمہ کی عمومیت کی وجہ سے ہے۔ اس کی تائید عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ کسی نے ان سے پوچھا کہ آدمی شادی

[1] تفسير الطبري (٥/ ٦٩) [2] تفسير الطبري (٥/ ٧٣)

کر کے دخول سے پہلے مرگیا، کچھ مہر مقرر نہیں کیا تھا، انھوں نے کہا کہ میں اس بارے میں اپنی رائے سے کہتا ہوں، اگر میری بات ٹھیک ہوئی تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر خطا ہوئی تو میری اور شیطان کی طرف سے ہوگی، اللہ اور رسول ﷺ اس سے بری ہیں۔ اس عورت کو پورا مہر ملنا چاہیے۔ دوسری روایت اس طرح ہے کہ مہر مثل دینا چاہیے نہ زیادہ نہ کم، اس پر عدت ہے اور اسے میراث ملے گی۔ معقل بن یسار اشجعی نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے سنا، آپ ﷺ نے بروع بنت واشق رضی اللہ عنہا کے حق میں یہی حکم دیا تھا۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نہایت درجہ خوش ہوئے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ اشجع کے کچھ لوگ تھے، انھوں نے کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی بروع بنت واشق رضی اللہ عنہا کے حق میں یہی حکم دیا تھا۔ اس حدیث کو امام احمد اور اہلِ سنن نے روایت کیا ہے، ترمذی نے صحیح کہا ہے۔[1] یہ خوشی اس بات پر ہوئی کہ ان کا فتویٰ رسول اللہ ﷺ کے فتوے کے موافق ہوا۔ اس حکم سے وہ عورت خارج ہے، جو خاوند کی وفات کے وقت حاملہ ہو، کیوں کہ اس کی عدت وضع حمل ہے، اگرچہ وفات سے ایک لمحے بعد ہی وضع کرے۔ اس آیت کی عمومیت اسی پر دلالت کرتی ہے: ﴿ وَاُولٰتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ﴾ [الطلاق: ٤] ''اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل تک ہے۔'' سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اس پر واجب ہے کہ دونوں مدتوں میں سے زیادہ لمبی مدت کا انتظار کرے۔ وضع حمل یا چار ماہ دس دن تک، تاکہ دونوں آیتوں پر عمل ہو جائے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ جید ماخذ اور قوی مسلک ہے، اگر سبیعہ اسلمیہ رضی اللہ عنہا والی حدیث نہ ہوتی۔[2] صحیحین میں آیا ہے کہ اس کا خاوند سعد بن خولہ رضی اللہ عنہ مرگیا، وہ حاملہ تھی، وفات کے بعد بغیر تاخیر کے وضع حمل ہوا۔ دوسری روایت میں یوں ہے کہ چند شب کے بعد اس نے بچہ جنا، جب نفاس سے پاک ہوئی تو پیغام کرنے والوں کے لیے بنی ٹھنی۔ ابو السنابل بن بعکک رضی اللہ عنہ آئے، کہا کہ میں تجھ کو آراستہ پیراستہ دیکھتا ہوں، شاید تیرا نکاح کرنے کا ارادہ ہے، واللہ! تو نکاح نہیں کر سکتی، جب تک کہ چار ماہ دس دن نہ گزریں۔ سبیعہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب میں نے یہ بات سنی، شام کو اپنے کپڑے پہن کر نبی اکرم ﷺ کے پاس آئی، مسئلہ پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو عدت سے نکل گئی، جب بچہ ہوگیا اور مجھ کو حکم دیا کہ اگر میں مناسب سمجھوں تو نکاح کرلوں۔[3] امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب یہ حجت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کہی گئی تو انھوں نے رجوع کرلیا۔ اس رجوع کی صحت کی دلیل یہ ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اصحاب سبیعہ رضی اللہ عنہا والی حدیث کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔[4] سارے اہلِ علم کا یہی قول ہے۔

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٢٧٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١١٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٤٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٣٥٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٩١) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ٦/ ٣٥٧۔ ٣٥٨)

[2] تفسير ابن كثير (١/ ٣٧٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٨٤) مسند إسحاق بن راهويه (٥/ ١٨٨)

[4] الاستذكار (٦/ ٢١٣)

اسی طرح اس حکم سے وہ زوجہ مستثنیٰ ہے جو لونڈی ہے کہ اس کی عدت آزاد عورت کی عدت سے نصف ہوگی، یعنی دو ماہ پانچ دن۔ جمہور کا یہی قول ہے، کیوں کہ جب اس کی حد آزاد عورت کی حد سے آدھی ٹھہری تو عدت بھی آدھی ہونی چاہیے۔ ہاں ابن سیرین اور بعض ظاہریہ آزاد عورتوں اور لونڈیوں کو اس حکم میں برابر بتلاتے ہیں۔ اس کی دلیل آیتِ شریفہ کی عمومیت ہے اور یہ بات کہ عدت ایک جبلی اَمر ہے، اس میں پیدائش کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔

اس عدت کی حکمت:

امام سعید بن مسیب اور ابن عالیہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ چار ماہ دس شب کی یہ مدت اس لیے ہے کہ اگر حمل ہو تو ظاہر ہو جائے، جس طرح سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ تمھاری خلقت ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک نطفہ رہتی ہے، پھر چالیس دن علقہ، پھر چالیس دن مضغہ، پھر فرشتہ آکر روح پھونک جاتا ہے۔[1] یہ تین چلّے چار ماہ ہوئے، مزید دس دن بطورِ احتیاط رکھے گئے، کیوں کہ بعض مہینے کم ہوتے ہیں، اس مدت میں روح پھونکے جانے کی وجہ سے بچے کی حرکت ظاہر ہو جائے گی۔ واللہ أعلم.

یہی حکمت ابن مسیّب اور ابن عالیہ رحمہما اللہ نے بھی بیان کی ہے۔[2] اسی لیے امام احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اُمِ ولد کی عدت اس جگہ آزاد عورت کی طرح ہوگی، کیوں کہ وہ آزاد عورت کی طرح صاحبِ فراش ہوگئی ہے۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بھی اسی پر دلیل ہے، انھوں نے کہا ہے کہ ہم پر ہمارے نبی کی سنت مشتبہ نہ کرو۔ اُمِ ولد کی عدت، جبکہ اس کا سید مر جائے، چار ماہ دس روز ہے۔[3] (رواہ أحمد و أبو داود و ابن ماجه) امام احمد رحمہ اللہ سے اس حدیث کا انکار بھی منقول ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ قبیصہ کا عمرو سے سماع ثابت نہیں ہے، مگر سلف کا ایک گروہ اسی حدیث کی طرف گیا ہے۔

امام طاؤس اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اُمِ ولد کی عدت آزاد عورت کی عدت سے نصف ہے، یعنی دو ماہ پانچ شب۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تین حیض عدت کرے۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ کے نزدیک ایک حیض کافی ہے۔ تابعین کی ایک جماعت بھی اسی طرف گئی ہے۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام لیث رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر وفات کے وقت حائض تھی تو وہی حیض عدت کو کافی ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر حیض نہیں آتا تو تین مہینے عدت کرے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور جمہور نے کہا ہے کہ ایک ماہ تین دن بہتر ہیں۔[4] فتح البیان میں کہا گیا ہے کہ یہ آیت بعد والی آیت کی ناسخ ہے، جس میں ایک سال کی عدت آئی ہے، اگرچہ تلاوت کے لحاظ سے یہ پہلے ہے۔ جمہور کا اس پر اجماع ہے۔[5]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٣) [2] تفسير الطبري (٥/ ٩٢)

[3] مسند أحمد (٤/ ٢٠٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٠٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٨٣) امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "هذا إسناد رجاله ثقات" (إرواء الغليل: ٧/ ٢١٥)

[4] تفسير ابن كثير (١/ ٣٧٢، ٣٧٣) [5] فتح البيان (٢/ ٤٠)

شوہر پر سوگ واجب ہے:

﴿ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''پھر جب ان کی عدت پوری ہو جائے۔'' سے یہ سمجھا گیا ہے کہ عدت کی مدت تک متوفی شوہر پر سوگ کرنا واجب ہے۔ اُم حبیبہ اور زینب بنت جحش رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی عورت کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے، یہ حلال نہیں کہ کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے، مگر خاوند پر چار ماہ دس دن سوگ کرے۔[1] (رواہ الشیخان) اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے صحیحین میں آیا ہے کہ میری بیٹی کا شوہر مر گیا، اس کی آنکھ دُکھنے کو آئی، میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کیا میں اس کو سرمہ لگا دوں؟ دو یا تین بار یہی فرمایا کہ نہیں، عدت چار ماہ دس روز کی ہے، جاہلیت میں تو ایک سال تک ہوتی تھی۔ زینب بنت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ عورت کا شوہر جب مر جاتا تو وہ ایک بُری جگہ بیٹھتی، برے سے برے کپڑے پہنتی، خوشبو نہ لگاتی، جب تک کہ سال نہ گزر جاتا۔ پھر سال کے بعد نکل کر ایک مینگنی پھینکتی، پھر ایک گدھا یا بکری یا چڑیا لاتی، اس کو اپنے بدن سے رگڑتی، وہ جانور مر جاتا۔[2] اسی لیے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ آیت اگلی آیت کی ناسخ ہے۔[3] مطلب یہ ٹھہرا کہ سوگ ترکِ زینت کو کہتے ہیں، یعنی خوشبو نہ لگائے، زیور نہ پہنے، اچھا کپڑا زیبِ تن نہ کرے، یہ بات وفات کی عدت کے دوران میں واجب ہے، سب کا ایک ہی قول ہے۔ عدتِ رجعی میں واجب نہیں ہے، یہ بھی ایک ہی قول ہے۔ عدتِ بائن میں دو قول ہیں۔ سوگ کے واجب ہونے میں چھوٹی، بڑی، آزاد، لونڈی، مسلمہ اور کافرہ سب برابر ہیں، کیوں کہ آیتِ کریمہ عام ہے۔

امام ثوری اور ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ کافرہ پر سوگ نہیں۔ اشہب اور ابن نافع مالکی رحمہ اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ ان کی دلیل یہ حدیث ہے کہ کسی مومنہ عورت کو سوائے خاوند کے کسی کے لیے تین دن سے زیادہ سوگ کرنا حلال نہیں ہے۔ اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا سے مروی یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے۔[4] اس میں ایمان کی قید ہے، یہ کافرہ کے ساتھ حکمِ تعبدی ہے۔ امام ابوحنیفہ اور ثوری رحمہ اللہ نے صغیرہ کو تکلیف نہ ہونے کے سبب سے اور مسلمان لونڈی کو نقصان ہونے کے سبب سے ملا دیا ہے۔

عدت پوری ہونے کے بعد نکاح کی اباحت:

اس جگہ اَجل کو پہنچنے سے مراد عدت کا پورا ہونا ہے۔ امام ضحاک اور ربیع رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔[5] ﴿ عَلَيْكُمْ ﴾ سے مراد عورت کے ولی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب عورت کو طلاق دے دی یا اس کا خاوند مر گیا اور عدت پوری ہو چکی تو پھر اس عورت پر نکاح کرنے کی غرض سے زینت کرنے اور بننے سنورنے پر کوئی گناہ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٨٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٢٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٨٨ـ ١٤٨٩)

[3] تفسير الطبري (٥/ ٢٥٥) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٥٢) اس کی سند حسن ہے۔

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٢١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٨٦)

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٣٧)

نہیں ہوتا۔[1] مقاتل بن حیان رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ معروف سے مراد حلال طیب نکاح ہے۔ امام حسن بصری، زہری اور سدی رحمہم اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔[2] امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت سے یہ نکلا کہ بغیر ولی کے نکاح جائز ہے، کیوں کہ فعل کی فاعل کی طرف اضافت مباشرت پر محمول ہوتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خطاب ولیوں کو ہے، اگر بغیر ولی کے نکاح صحیح ہوتا تو ولیوں کو خطاب نہ کیا جاتا۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٣٥﴾

اور اس بات میں تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم عورتوں کی عدت کے دوران میں انھیں اشارے کنائے میں نکاح کا پیغام دو یا تم اپنا ارادہ اپنے دلوں میں چھپائے رکھو۔ اللہ جانتا ہے کہ بے شک تم ان عورتوں کا ذکر ضرور کرو گے، لیکن ان سے نکاح کا خفیہ وعدہ نہ کرو، مگر یہی کہ دستور کے مطابق بات کہو، اور عقدِ نکاح کا پختہ ارادہ مت کرو، یہاں تک کہ عدت پوری ہو جائے اور جان لو! بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے، پس تم اس سے ڈرو اور جان لو کہ بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت بردبار ہے (235)

عدت کے دوران میں تعریض کی اجازت اور تصریح کی ممانعت:

یعنی عورت ایک خاوند سے آزاد ہوئی ہے اور عدت میں ہے، تب تک کسی اور کو جائز نہیں کہ اس سے نکاح باندھ لے یا صاف وعدہ کر رکھے، مگر دل میں نیت رکھے کہ یہ فارغ ہوگی تو میں نکاح کروں گا یا اس کو پردے میں سنا رکھے، تاکہ اس سے پہلے کوئی اور نہ کر بیٹھے۔ پردہ یہ کہ رواج کی ایک بات کہہ دے، مثلاً: عورت کو کہے کہ تجھ کو ہر کوئی عزیز کر لے گا یا یہ کہ میرا نکاح کا ارادہ ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ عدت کے دوران میں صراحت کے علاوہ نکاح کی پیش کش کرنا جائز ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تعریض یہ ہے کہ مثلاً یوں کہے کہ میرا ارادہ بیاہ کا ہے، یا میں عورت کو چاہتا ہوں، یا اللہ سے چاہتا ہوں کہ کوئی عورت مجھے مل جائے۔[3]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٤٣٧) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٤٣٨) [3] تفسیر الطبري (٥/ ٩٥۔ ٩٦)

دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ میں تیرے سوا دوسری عورت سے نکاح نہیں کرنا چاہتا، یا میں چاہتا ہوں کہ کوئی نیک عورت ملے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو تعلیقاً روایت کیا ہے۔[1] سلف کی ایک جماعت اور ائمہ کا یہی قول ہے کہ تعریض جائز ہے، تصریح جائز نہیں۔ مطلقہ مبتوتہ کے متعلق بھی یہی حکم ہے کہ اس کو بھی تعریض جائز ہے، تصریح نہیں۔ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کو اس کے شوہر ابو عمر بن حفص نے تین طلاقیں دے دی تھیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ وہ ابن اُمِ مکتوم رضی اللہ عنہا کے گھر میں عدت گزارے، پھر فرمایا کہ جب تیری عدت پوری ہو جائے تو مجھے خبر کر دینا، جب عدت پوری ہوئی تو اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا پیغام بھیج کر ان سے نکاح کر دیا۔[2] رہی مطلقہ رجعیہ تو اس سے شوہر کے سوا نہ تعریض جائز ہے نہ تصریح، اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔

پھر یہ فرمایا کہ اگر تم نے اس بات کو اپنے جی میں بھی چھپایا ہے، تصریح نہیں کی ہے تو تم پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ اس جگہ حرف ﴿ اَوْ ﴾ مخاطب پر اِباحت یا تخییر یا تفصیل یا اِبہام کے لیے ہے۔ اِکنان تستر اور اخفا، یعنی پوشیدہ رکھنے کو کہتے ہیں۔ ﴿ اَكْنَنْتُمْ ﴾ کے معنی "أَضْمَرْتُمْ" ہیں، جیسے یہ آیت ہے: ﴿ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴾ [النمل: ٧٤] "اور بلاشبہ آپ کا رب (وہ باتیں) جانتا ہے جو ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں۔" نیز جیسے یہ فرمان ہے: ﴿ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَاۤ اَخْفَيْتُمْ وَمَاۤ اَعْلَنْتُمْ ﴾ [الممتحنة: ١] "اور میں خوب جانتا ہوں جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو۔" اسی لیے یہ فرمایا ہے کہ اللہ جانتا ہے کہ تم ان کا ذکر کرو گے، یعنی اپنے دل میں۔ کشاف میں ہے کہ اس میں ایک طرح کی ڈانٹ ہے، جیسے فرمایا تھا: ﴿ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ ﴾ [البقرة: ١٨٧] "اللہ نے جان لیا کہ بے شک تم اپنے آپ سے خیانت کرتے تھے۔"[3]

وعدۂ پنہاں کا مفہوم:

سلف کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ وعدۂ پنہاں سے اس جگہ زنا مراد ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی قول ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، یعنی یوں نہ کہے کہ میں تیرا عاشق ہوں تو مجھ سے قرار کر کہ میرے سوا کسی اور سے نکاح نہیں کرے گی۔ سلف کی ایک جماعت سے یہی قول مروی ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یوں نہ کہے کہ تو مجھے نظر انداز نہ کر، میں تجھ سے نکاح کروں گا۔ قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے اس بات کا عہد نہ لے کہ اس کے سوا کسی دوسرے سے بیاہ نہ کرے۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ عدت میں چپکے سے بیاہ کر لے، پھر جب عدت پوری ہو تو ظاہر کرے۔[4] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ آیت ان

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥/ ١٩٦٨) تفسير الطبري (٥/ ٩٦)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٨٠)
[3] الكشاف (١/ ٣١١)
[4] تفسير الطبري (٥/ ١٠٧۔ ١١٠)

سب معنوں میں عام ہو، اسی لیے یہ فرمایا ہے کہ اگر کچھ کہو تو معروف بات کہو، جیسے یہ کہنا کہ مجھے تجھ سے رغبت ہے۔ امام عبیدہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قولِ معروف سے یہ مراد ہے کہ اس کے ولی سے یہ بات کہہ دے کہ تم اس کے بیاہنے میں جلدی نہ کرنا، جب تک کہ مجھ سے نہ کہہ دو۔[1]

جمہور نے کہا ہے کہ "سرّ" سے اس جگہ نکاح مراد ہے، یعنی عدت والی سے یہ نہ کہے کہ تو مجھ سے نکاح کر لے، بلکہ تعریض کرے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد جماع ہے، یعنی یوں نہ کہے کہ میں کثیر الجماع ہوں، تا کہ اس کو نکاح میں رغبت پیدا ہو۔ امام شافعی رحمہ اللہ اسی طرف گئے ہیں۔[2] امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اُمت کا اس بات پر اجماع ہے کہ عدت والی سے بے شرمی اور بے پردگی کی بات نہ کرے، جیسے ذکرِ جماع وغیرہ، نہ اس پر حرص دلائے، کیوں کہ اسے گفتگو جائز نہیں ہے۔ بلکہ اس پر بھی اجماع ہے کہ عدت میں عورت کو وعدہ دینا یا باپ سے کنواری لڑکی کے لیے یا کسی سے لونڈی کے بارے میں وعدہ کرنا مکروہ ہے۔[3]

عدت کے دوران میں نکاح کرنا حرام ہے:

کتاب سے اس جگہ حد وقدر، یعنی مدتِ معین مراد ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ [النساء: ١٠٣] "بے شک مومنوں پر مقررہ وقتوں میں نماز فرض ہے۔" یہ حکم کہ عدت میں نکاح باندھنا حرام ہے، اس پر سب کا اتفاق ہے۔ "اجل" سے عدت کی مدت کا اخیر مراد ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ جب تک عدت نہ ہو چکے، تب تک نکاح نہ باندھو۔[4] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ عدت کی مدت میں عقد کرنا صحیح نہیں ہے، اگر کسی نے کر لیا ہے، پھر دخول بھی کیا ہو تو دونوں میں تفریق کرا دی جائے گی۔ پھر وہ ہمیشہ کے لیے اس پر حرام ہے یا نہیں؟ اس میں دو قول ہیں: جمہور نے کہا ہے کہ وہ حرام نہیں ہوئی، عدت پوری کرنے کے بعد اگر چاہے تو نکاح کرے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا کہ وہ اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو چکی۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جس عورت نے اپنا نکاح عدت کے اندر کیا، اگر اُس شوہر نے دخول نہیں کیا تو دونوں میں علاحدگی ہو جائے گی، وہ باقی عدت پوری کرے۔ یہ شخص نکاح کے دوسرے امیدواروں کی طرح ایک اُمیدوار ٹھہرے گا اور اگر دخول کر چکا ہے تو علاحدگی کے بعد وہ اگلی عدت پوری کرنے کے بعد اب دوسری عدت پوری کرے، پھر وہ عورت کبھی اس شخص کی بیوی نہیں بن سکے گی۔[5]

اہلِ علم نے کہا ہے کہ اس حکم کا ماخذ یہ ہے کہ اس شوہر ثانی نے جلدی کی، اللہ کی مقرر کردہ مدت پر قائم نہ رہا تو اب سزا بھی اس کے ارادے کے خلاف ملی کہ وہ اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ٹھہری، جس طرح قاتل میراث سے

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٤٤١) تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٧٤، ٣٧٥) [2] فتح القدیر (١/ ٤٣٤)
[3] المحرر الوجیز (١/ ٣٠٥۔ ٣٠٧) [4] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٤٤١) [5] مصنف عبد الرزاق (٦/ ٢١٠)

محروم ہو جاتا ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس اثر کو مالک سے روایت کیا ہے۔[1] امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کا قول قدیم بھی یہی تھا، مگر پھر اس سے رجوع کیا، بقول سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کہ وہ اس کے لیے حلال ہے۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اثرِ مذکور منقطع بھی ہے، بلکہ مسروق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ خود سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے رجوع کر لیا تھا۔ دونوں کا جمع ہونا اور مہر کا ٹھہرانا جائز رکھا ہے۔[3]

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٣٦﴾

تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دے دو جب کہ تم نے انھیں ہاتھ نہ لگایا ہو اور نہ ان کے لیے کچھ مہر مقرر کیا ہو اور انھیں کچھ مال و متاع دے دو، وسعت والے آدمی پر اس کی حیثیت کے مطابق ہے اور تنگ دست پر اس کی حیثیت کے مطابق، فائدہ پہنچانا ہے معروف طریقے سے، (یہ) نیکی کرنے والوں پر لازم ہے (236)

دخول سے پہلے طلاق:

یعنی اگر نکاح کے وقت مہر مقرر نہ کیا تو بھی نکاح درست ہے، مہر بعد میں مقرر ہو جائے گا۔ پھر اگر بغیر ہاتھ لگائے عورت کو طلاق دے دی جائے تو اس سے مہر لازم نہیں ہوتا، لیکن کچھ خرچ دینا ضروری ہے۔ خرچ کیا ہے؟ وہ ہے ایک جوڑا کپڑوں کا اپنی طاقت کے مطابق۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عقد کے بعد اور دخول سے پہلے طلاق کو جائز قرار دیا ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام طاؤس، ابراہیم اور حسن بصری رحمہم اللہ نے مَس، یعنی ہاتھ لگانے سے جماع مراد لیا ہے۔[4] بلکہ اگر وہ مفوضہ ہے تو بھی دخول اور مہر مقرر کرنے سے پہلے اس کو طلاق دینا جائز ہے، اگرچہ اس میں دل شکنی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے عوض کا حکم دیا ہے کہ کچھ دے کر رخصت کر دو، خالی ہاتھ نہ نکالو۔

طلاق کا متعہ (عوضانہ):

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ طلاق کا اعلیٰ عوض خادم ہے، اس سے کم چاندی اور اس سے کم کپڑا۔ یعنی، تو ایک لونڈی یا غلام دے، یا کچھ روپے یا کوئی جوڑا کپڑے کا۔ یعنی آسودہ ہو تو خادم روپیہ دے، مفلس ہو تو تین

[1] مسند الشافعي (١/ ٣٠١) [2] سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ٢١٩)

[3] سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ٢١٩) تفسير ابن كثير (١/ ٣٧٥)

[4] تفسير الطبري (٥/ ١١٨) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٤٢)

کپڑے حوالے کرے۔[1] امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اوسط یہ ہے کہ ایک درع (قمیص)، ایک اوڑھنی، ایک ملحفہ (لحاف) ایک جلباب (چادر) دے۔ شریح رحمہ اللہ پانچ سو درہم دیتے تھے۔[2] امام ابن سیرین رحمہ اللہ غلام یا نفقہ یا کپڑے دیتے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے بیس ہزار درہم دیے۔ ایک عورت نے کہا۔ ع

مَتَاعٌ قَلِيْلٌ مِنْ حَبِيْبٍ مُفَارِقٍ[3]

''جدائی اختیار کرنے والے دوست کی طرف سے یہ تھوڑا سا سامان۔''

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب عوض کی مقدار کے متعلق دونوں میں جھگڑا ہو تو آدھا مہرِ مثل دے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا قولِ جدید یہ ہے کہ ہمیں متعہ کی مقدار معلوم نہیں، مستحسن یہ ہے کہ تیس درہم دے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہی قول ہے۔[4] بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ ہر مطلقہ کو کچھ متعہ دینا واجب ہے، کیوں کہ آیت: ﴿ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴾ [البقرة: ٢٤١] ''اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو انھیں بھی دستور کے مطابق کچھ دے دلا کر رخصت کیا جائے، (یہ) متقی لوگوں پر لازم ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴾ [الأحزاب: ٢٨] ''اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے: اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمھیں کچھ (دنیوی) فائدہ دوں اور تمھیں اچھے طریقے سے رخصت کر دوں۔'' یہ دونوں آیات عام ہیں، یہ سب بیویاں مدخولہ تھیں، ان کے مہر مقرر تھے۔ امام سعید بن جبیر، ابو العالیہ، حسن بصری اور شافعی رحمہم اللہ کا قولِ قدیم اور بعض کے نزدیک جدید بھی یہی ہے۔[5]

بعض نے کہا ہے کہ متعہ اسی کے لیے واجب ہے، جس کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دی ہو، گو اس کا مہر مقرر ہو چکا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴾ [الأحزاب: ٤٩] ''اے ایمان والو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو، پھر انھیں چھونے سے پہلے ان کو طلاق دے دو تو تمھاری طرف سے ان پر کوئی عدت نہیں کہ تم اس (عدت) کو شمار کرو، لہٰذا تم انھیں کوئی فائدہ دو اور اچھے طریقے سے رخصت کر دو۔'' ابن مسیّب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سورۃ الاحزاب کی اس آیت کو اس آیت نے منسوخ کر دیا، جو سورۃ البقرہ میں ہے۔[6] سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمیمہ بنت شراحیل رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا، جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجی گئی اور آپ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے مکروہ جانا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو اُسید رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اس کو کچھ سامان دے دو اور دو رنگین کپڑے حوالے کر دو۔[7] (رواه البخاري)

---

[1] تفسير الطبري (٥/ ١٢١) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٤٢۔ ٤٤٣) اس کی سند حسن ہے۔
[2] تفسير الطبري (٥/ ١٢١۔ ١٢٢)
[3] مصنف عبد الرزاق (٧/ ٧٣)
[4] مصنف عبد الرزاق (٧/ ٧٤)
[5] تفسير الطبري (٥/ ١٢٥)
[6] تفسير الطبري (٥/ ١٢٦، ١٢٧)
[7] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٥٧)

بعض نے کہا ہے کہ متعہ اس مطلقہ کے لیے ہے جو مدخولہ مفروضہ نہیں ہے، اگر مدخولہ ہے اور مہر مقرر ہو چکا ہے تو اس کا ادا کرنا واجب ہوگا اور اگر مہر مقرر ہو جانے کے بعد دخول سے پہلے طلاق دی ہے تو آدھا مہر مقررہ ادا کرنا ضروری ہوگا، پھر اگر دخول کیا تو سارا مہر لازم ٹھہرا، یہ متعے کے بدلے ہوگا۔ مصیبت زدہ تو وہ بیچاری ہے، جس کا نہ تو مہر مقرر ہوا اور نہ اس سے صحبت کی۔ یہ آیت اسی کے متعے کے واجب ہونے کی دلیل ہے۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔[1] بعض علما متعے کو ہر مطلقہ کے لیے مستحب کہتے ہیں، سوائے اس کے جس کا مہر مقرر ہو چکا ہو اور اسے دخول سے پہلے طلاق دی گئی ہو۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ بات کچھ غلط نہیں ہے، سورۃ الاحزاب کی آیتِ تخییر اسی پر محمول ہوگی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آسودہ حال اور مفلس پر ان کی طاقت کے مطابق متعہ مقرر کیا ہے۔ فرمایا: ﴿ وَلِلْمُطَلَّقَٰتِ مَتَٰعٌۢ بِٱلْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى ٱلْمُتَّقِينَ ﴿٢٤١﴾ ﴾ [البقرة: ٢٤١] ''اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو انھیں بھی دستور کے مطابق کچھ دے دلا کر رخصت کیا جائے، (یہ) متقی لوگوں پر لازم ہے۔'' بعض علما نے کہا ہے کہ بلکہ متعہ سب کے لیے مطلقاً مستحب ہے۔ شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ متعہ اگر واجب ہوتا تو قاضی لوگوں کو قید کرتے۔[2]

مطلقات کی اقسام:

فتح البیان میں ہے کہ مطلقات چار قسم کی ہیں: ایک وہ جس کا مہر مقرر ہے اور دخول بھی کیا ہے، اس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے کہ شوہر کو اس کو دیا ہوا واپس نہیں لینا چاہیے، وہ تین حیض تک عدت گزارے۔ دوسری وہ کہ نہ اس کا مہر مقرر کیا ہے نہ دخول کیا ہے، اس کا حکم اس آیت میں ہے کہ اس کو مہر نہیں ملے گا، بلکہ یہی متعہ ہے جو دیا گیا، بلکہ سورۃ الاحزاب میں فرمایا گیا ہے کہ غیر مدخولہ پر طلاق کے بعد عدت بھی نہیں ہے۔ تیسری مطلقہ وہ کہ مہر تو مقرر ہے، مگر دخول نہیں ہوا۔ اس کا ذکر مابعد والی آیت میں ہے: ﴿ وَإِن طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ ﴾ [البقرة: ٢٣٧] ''اور اگر تم انھیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو جب کہ تم ان کے لیے مہر مقرر کر چکے ہو تو اس (مہر) کا نصف ادا کرنا ہوگا جو تم نے مقرر کیا ہو۔'' چوتھی وہ ہے کہ دخول تو ہوا، مگر کچھ مہر مقرر نہیں ہوا تھا۔ اس کا ذکر اس آیت میں ہے: ﴿ فَمَا ٱسْتَمْتَعْتُم بِهِۦ مِنْهُنَّ فَـَٔاتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً ﴾ [النساء: ٢٤] ''پھر جن سے مہر کے عوض تم فائدہ اٹھاؤ، انھیں ان کے مقرر کیے ہوئے مہر دے دو۔''[3] اس جگہ فریضہ سے مراد مہرِ معین اور مقرر ہے۔ مفروضہ وہ ہے جس کا مہر مقرر ہو چکا ہو۔ مفوضہ وہ ہے جس کو مہر مل چکا ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (٥/ ١٢٦، ١٢٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٤٣) تفسير ابن كثير (١/ ٣٧٦)

[3] چوتھی قسم کی مطلقہ کے حق مہر کا اس آیت سے استدلال محلِ نظر ہے۔ اس لیے کہ اس میں مطلقاً حق مہر کی ادائیگی کا حکم ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ مطلقاتِ اربعہ میں سے کون سی مطلقہ ہے؟ اس چوتھی قسم کی مطلقہ کا حکم یہ ہے کہ اس کو مہر مثل دیا جائے گا۔ (تفسیر أحسن البیان، زیرِ تحت سورۃ البقرۃ: ٢٣٦۔ ٢٣٧) نواب صاحب نے آگے خود بھی یہ صورت اور اس میں مہر مثل ہی کا ذکر ←

امام اوزاعی و ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لونڈی کے لیے متعہ نہیں ہے، کیوں کہ وہ متعہ اس کے مالک کا ہو جائے گا۔ وہ لونڈی سید کی اپنی مملوکہ کی ایذا رسانی کے مقابلے میں کسی مال کے مستحق نہیں ہوتی ہے، متعہ تو اس مطلقہ کے لیے مشروع ہے، جس کو مہر مقرر ہونے سے اور دخول سے قبل طلاق دی گئی ہے، کیوں کہ وہ طلاق سے ایذا پاتی ہے۔ جمہور کہتے ہیں کہ متعہ صرف آزاد عورت ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ لونڈی کے لیے بھی ہے۔ [1]

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

اور اگر تم انھیں ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو جب کہ تم ان کے لیے مہر مقرر کر چکے ہو تو اس (مہر) کا نصف ادا کرنا ہوگا جو تم نے مقرر کیا ہو۔ ہاں! وہ عورتیں چاہیں تو (مہر) معاف کر سکتی ہیں یا وہ شخص معاف کر سکتا ہے جس کے ہاتھ میں عقدِ نکاح ہے اور تم معاف کر دو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور تم آپس میں بھلائی اور احسان کا برتاؤ کرنا مت بھولو، بے شک اللہ تمھارے ہر عمل پر نگاہ رکھتا ہے جو تم کرتے ہو ﴿237﴾

مہر اگر مقرر ہو تو دخول سے پہلے طلاق کی صورت میں آدھا مہر لازم ہے:

یعنی اگر مہر مقرر ہو چکا تھا، پھر بغیر ہاتھ لگائے طلاق دے دی تو آدھا مہر لازم ہوا، مگر عورتیں چھوڑ دیں اور بالکل نہ لیں یا وہ مرد درگزر کرے، جو نکاح رکھنے اور توڑنے کا اختیار رکھتا تھا، پورا مہر حوالے کر دے۔ پھر فرمایا کہ مرد درگزر کرے تو بہتر ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بڑائی دی ہے اور اس کو نکاح رکھنے یا توڑنے کا اختیار دیا ہے تو اس کو چاہیے کہ اپنی بڑائی رکھے۔ چار صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یہاں دو کا حکم فرمایا: ایک یہ کہ مہر مقرر نہیں ہوا تھا اور ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دی۔ دوسری یہ کہ مہر مقرر ہو چکا تھا، مگر ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دی۔ دو صورتیں باقی رہیں: ایک یہ کہ مہر مقرر ہو چکا تھا، ہاتھ لگا کر طلاق دے دی تو پورا مہر لازم ہوا، یہ سورت بقرہ (آیت: ۲۲۹) میں مذکور ہے۔ دوسری یہ کہ مہر نہ ٹھہرا تھا، مگر ہاتھ لگا کر طلاق دی۔ اس میں مہر مثل پورا چاہیے، یعنی جو اُس عورت کی قوم میں رواج ہے۔

← کیا ہے۔ دراصل غالباً سب سے پہلے یہ سہو امام شوکانی کو ہوا۔ نواب صاحب نے بھی "فتح القدیر" سے اس کو نقل کر دیا اور انہی کی متابعت میں بعض اردو مفسرین نے بھی یہ بات لکھ دی۔ غفر اللہ لھم۔ (ص۔ ی)

[1] فتح القدیر (۱/ ۴۳۷) فتح البیان (۲/ ۴۵۔ ۴۷)

موضح قرآن میں اس کے بعد یوں کہا گیا ہے کہ جب خلوت ہو چکی تو گویا ہاتھ لگایا۔ یہ حنفیہ کا مسلک ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ اعتبار ہاتھ لگانے کا ہے نہ کہ صرف خلوت کا، گو ہزار پردے لٹکائے ہوں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ متعہ اسی حالت کے ساتھ مختص ہے، جس کا ذکر پہلی آیت میں ہو چکا ہے، کیوں کہ اس آیت میں مقررہ مہر کا آدھا واجب کیا ہے، جبکہ خاوند نے دخول سے پہلے طلاق دی ہو، اگر وہاں کوئی اور متعہ واجب ہوتا تو اس کا بیان آتا، خصوصاً جب کہ اس آیت کو اس سے پہلی آیت (جس میں متعے کو ایسی عورت کے ساتھ مختص کیا گیا تھا) کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ واللہ أعلم.

ایسی حالت میں مہر کا نصف کرنا علما کے درمیان متفقہ امر ہے، کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے۔ جب مہر مقرر ہو چکا، پھر دخول سے پہلے علاحدگی ہوئی تو اب مقررہ مہر کا نصف واجب ہوا۔ البتہ اگر ہر سہ طلاق میں خلوت کی ہے، اگرچہ دخول نہ کیا ہو تو سارا مہر لازم آئے گا۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا قدیم مذہب یہی ہے۔ خلفاے راشدین نے بھی یہی حکم دیا ہے، مگر سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اگر ایک شخص نے بیاہ کر کے خلوت میں مَس نہیں کیا، پھر طلاق دے دی تو اس کو آیت زیرِ تفسیر کی دلیل کی رو سے آدھا ہی مہر ملے گا۔[1] امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم اسی کو اختیار کرتے ہیں، ظاہر کتاب یہی ہے۔[2]

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اس آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ اس مطلقہ کے لیے متعہ واجب نہیں ہے، کیوں کہ وہ مطلقہ مفروضہ غیر مدخولہ کے مقابلے میں واقع ہوئی ہے، جو متعے کی مستحق ہے۔

دخول سے پہلے خاوند کی موت کی صورت میں حق مہر اور عدت کا مسئلہ:

اس بات پر اتفاق ہے کہ خاوند نے جس عورت سے دخول نہ کیا اور مر گیا، مگر مہر مقرر ہو چکا تھا تو وہ موت کی وجہ سے پورے مہر کی مستحق ہوگی، میراث لے گی اور عدت گزارے گی۔ خلوت مین اختلاف ہے کہ یہ دخول کے قائم مقام ہے یا نہیں؟ مہر پورا لے گی یا نہیں؟ پہلا مالک رحمہ اللہ اور کوفے والوں کا اور خلفاے اربعہ اور جمہور اہلِ علم کا مذہب ہے۔ ان کے نزدیک کامل مہر کے ساتھ عدت بھی واجب ہے۔ دوسرا مذہب نصف مہر کو واجب قرار دیتا ہے، ظاہر آیت بھی یہی ہے، کیوں کہ ''مسیس'' سے مراد جماع ہوتا ہے۔ اس صورت میں عدت واجب نہیں ہوگی۔ سلف کی ایک جماعت اس طرف بھی گئی ہے۔[3] یہ اور بات ہے کہ عورت اپنا واجب حق معاف کر دے، اس صورت میں شوہر پر کچھ دینا لازم نہیں آتا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یعنی ثیبہ (بیوہ) اپنا حق ترک کر دے۔ تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔[4]

---

[1] مسند الشافعي (۱/ ۲۹۸) سنن البیهقي الکبریٰ (۷/ ۲۵٤) اس کی سند میں ''لیث بن ابی سلیم'' ضعیف راوی ہے۔
[2] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۳۷۷) [3] فتح البیان (۲/ ٤۹) [4] تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ٤٤٤)

کس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے؟

اس میں اختلاف ہے کہ ﴿ الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔'' سے کون مراد ہے؟ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ عقدۂ نکاح کا ولی زوج (شوہر) ہے۔ (رواہ ابن أبي حاتم و ابن مردویة و ابن جریر) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک کثیر جماعت کا یہی قول ہے۔ اسی طرف امام ابوحنیفہ، ثوری، اوزاعی اور محمد بن قرظی رحمہم اللہ بھی گئے ہیں۔ اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔[1] یعنی جس طرح ولی کو جائز نہیں کہ وہ مولیہ غیر کے مال میں سے کچھ دے، اسی طرح صداق کا بھی اس کو اختیار نہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اس سے مراد عورت کا باپ، بھائی یا وہ رشتہ دار ہے جس کی اجازت کے بغیر نکاح نہیں ہو سکتا، یعنی مراد ولی ہے۔ تابعینِ عظام رحمہم اللہ کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے۔[2] امام مالک کا مذہب بھی یہی ہے۔ اس کا ماخذ یہ ہے کہ یہ مہر اس عورت کو اسی ولی نے دلایا ہے تو اب اس کو اس مہر میں تصرف کا حق ہے، تاہم باقی مال میں نہیں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے معاف کرنے کی اجازت دی ہے، جس عورت نے معاف کیا، وہ معاف ہو گیا، اگر نہ کیا، بخل کیا اور ولی نے معاف کر دیا تو بھی جائز ہے۔[3] اس سے معلوم ہوا کہ ولی کا معاف کر دینا صحیح ہے، اگرچہ عورت خود سمجھ دار ہوشیار ہے۔ امام شریح رحمہ اللہ کا یہی قول ہے، مگر امام شعبی رحمہ اللہ نے جب ان پر انکار کیا تو انھوں نے رجوع کر کے کہا کہ مراد شوہر ہے، ولی نہیں، بلکہ وہ اس پر مباہلہ کرنے پر تیار تھے۔[4] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ اَنْ تَعْفُوْٓا ﴾ کا خطاب مرد و عورت سب کو ہے۔

تقوے کا تقاضا:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ تقوے کے زیادہ قریب وہ ہے جو عفو کرے۔[5] امام شعبی رحمہ اللہ سے بھی یہی قول مروی ہے۔ امام مجاہد، نخعی، ضحاک، مقاتل بن حیان، ربیع اور ثوری رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ فضل یہ ہے کہ عورت آدھا چھوڑ دے یا مرد پورا دے دے۔[6] اسی لیے یہ فرمایا ہے کہ تم آپس کے فضل کو نہ بھولو، بلکہ باہر اس کا برتاؤ کرو۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ مومن اپنے ہاتھ کو دانت سے کاٹے گا، فضل کو بھول جائے گا، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم آپس میں فضل کو نہ بھولو۔ الحدیث۔[7] (رواہ ابن مردویہ)

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٤٤٥) تفسیر الطبري (٥/ ١٥٧۔ ١٥٨) المعجم الأوسط (٦/ ٢٦٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وفیہ ابن لهيعة وفيه ضعف'' (مجمع الزوائد: ٧/ ٣٧)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٤٤٥) اس کی سند حسن ہے۔ [3] تفسیر الطبري (٥/ ١٥٠)

[4] تفسیر الطبري (٥/ ١٤٨) تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٧٨) [5] تفسیر الطبري (٥/ ١٦٢) [6] تفسیر الطبري (٥/ ١٦٥۔ ١٦٦)

[7] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٧٨) اس کی سند میں ''عبیداللہ بن ولید وصافی'' ضعیف راوی ہے اور سند میں انقطاع بھی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٢٠٧٦)

عون بن عبداللہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں دولت مندوں کے پاس اُٹھا بیٹھا کرتا تھا، سخت غم میں رہتا، ان کو دیکھتا کہ بہت اچھے کپڑے پہنتے ہیں، عمدہ خوشبو ملتے ہیں، اچھی سواری پر چڑھتے ہیں، پھر جب فقیروں کے پاس بیٹھا تو بہت چین ملا۔ تم فضل کو آپس میں فراموش نہ کرو، جب کوئی سائل آئے اور تمھارے پاس کچھ دینے کو نہ ہو تو اس کو دعا ہی دے دو۔[1] (رواه ابن أبي حاتم) فتح البیان میں اسی کو قابلِ ترجیح کہا ہے کہ ﴿ الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ﴾ سے مراد زوج (خاوند) ہے نہ کہ ولی۔[2]

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝۲۳۸ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۳۹

اور تم سب نمازوں اور خاص طور پر درمیان والی نماز کی حفاظت کرو اور اللہ کے سامنے عاجزی کرنے والے بن کر کھڑے ہو (238) پھر اگر تم خوف کی حالت میں ہو تو پیدل یا سوار ہی (نماز پڑھ لو)، پھر جب تم امن میں ہو جاؤ تو اللہ کو یاد کرو جس طرح اس نے تمھیں وہ سکھایا جو تم نہیں جانتے تھے (239)

نمازوں کی حفاظت کا بیان اور نمازِ وسطیٰ کی تفسیر:

درمیان والی نمازِ عصر ہے کہ دن اور رات کے درمیان میں ہوتی ہے، اس کو طلاق کے حکموں کے ساتھ مقید کیا کہ دنیا کے معاملے میں غرق ہو کر بندگی نہ بھول جاؤ، اسی لیے عصر کا تقید زیادہ ہے کہ اس وقت میں دنیا کی زیادہ مشغولیت ہوتی ہے۔ یہ کہنے سے، کہ ادب سے کھڑے رہو، یہ بھی معلوم ہوا کہ جس حرکت سے یہ ثابت ہو کہ آدمی نماز میں نہیں ہے، اس سے نماز ٹوٹتی ہے، جیسے: کھانا پینا، کسی سے باتیں کرنا یا اس کے علاوہ کوئی اور حرکت۔ پھر یہ فرمایا کہ لڑائی کا وقت ہو تو ناچار سواری پر یا پیادہ اور اشارے سے نماز پڑھ لینا جائز ہے، اگرچہ قبلے کی طرف بھی نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیتِ کریمہ میں نمازوں کی محافظت کا حکم فرمایا کہ نماز کو اس کے وقت پر ادا کرو، اس کی حفاظت رکھو، جس طرح صحیحین میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کون سا عمل افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز وقت پر ادا کرنا۔ میں نے کہا کہ پھر کون سا عمل؟ فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔ میں نے کہا: پھر کون سا عمل؟ فرمایا: ماں باپ سے نیکی کرنا۔ اگر میں کچھ اور پوچھتا تو آپ اور زیادہ فرماتے۔[3]

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٤٧) [2] فتح البيان (٢/ ٥٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٣٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٥)

سیدہ اُم فروہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اعمال کا ذکر فرمایا، پھر فرمایا کہ اللہ کو تمام اعمال سے زیادہ پیارا عمل نماز کو اول وقت میں ادا کرنا ہے۔ (رواہ أحمد) اس کو ابو داود اور ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔ ترمذی نے کہا ہے کہ ہم اس حدیث کو عبداللہ بن عمر العمری رحمہ اللہ کے طریق سے پہچانتے ہیں۔ اہلِ حدیث کے نزدیک وہ قوی نہیں ہے۔[1]

پھر سب نمازوں میں زیادہ تاکید درمیانی نماز کی فرمائی۔ سلف و خلف کا اس بات میں اختلاف ہے کہ وہ کون سی نماز ہے؟ سیدنا علی اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ صبح کی نماز ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔[2] امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں، کیوں کہ قنوت اسی نماز میں ہوتی ہے۔ وسطیٰ اس لیے ٹھہری کہ اس میں قصر نہیں ہوتا۔ یہ دو چار چار رکعتوں والی نمازوں کے درمیان میں ہے، جن میں قصر ہوتا ہے، یعنی عشا اور ظہر کے درمیان، یا کیوں کہ دو جہری اور دو سرّی نمازوں کے درمیان میں ہے۔ بعض نے کہا کہ ظہر کی نماز مراد ہے۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قول یہی ہے کہ نبی اکرم ﷺ اس کو دوپہر کے وقت پڑھتے تھے، یعنی یہ دن کا درمیان ہے، اس سے زیادہ اصحاب پر کوئی نماز سخت نہ تھی۔[3] اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ نمازِ ظہر ہے، نبی مکرم ﷺ دوپہر کے وقت پڑھتے تھے، آپ کے پیچھے ایک یا دو صفیں ہوتیں، لوگ قیلولے اور تجارت میں ہوتے۔[4] بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔

نمازِ وسطیٰ کی نمازِ عصر کے ساتھ تفسیر کے دلائل:

بعض نے کہا ہے کہ وہ عصر کی نماز ہے۔ ترمذی و بغوی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اکثر علماے صحابہ رضی اللہ عنہم وغیرہم کا یہی قول ہے۔[5] امام ماوردی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جمہور تابعین کا یہی قول ہے۔ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اکثر اہلِ اثر کا یہی قول ہے۔[6] امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جمہور کا یہی قول ہے۔[7] حافظ دمیاطی نے کتاب ”کشف الغطاء“ میں اسی پر نص ذکر کی ہے۔ انھوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک کثیر جماعت سے، جن کے نام حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لیے ہیں، اسی طرح نقل کیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ ماوردی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ بھی اسی طرف ہیں۔ ابن منذر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی صحیح ہے۔ ابن حبیب مالکی رحمہ اللہ نے اسی کو امام ابو حنیفہ، ابو یوسف اور محمد رحمہم اللہ سے اختیار کیا ہے، اس پر دلیل نقل کی ہے کہ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ

---

[1] مسند أحمد (٦/ ٣٧٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٠) اس کی سند میں ”عبداللہ بن عمر العمری“ ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٨٣٢) البتہ گزشتہ روایت اس سے مستغنی کرتی ہے۔

[2] تفسير الطبري (٥/ ٢١٥) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٤٨)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١١) سنن النسائي الكبرىٰ (١/ ١٥٢) امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”إسناده صحيح“ (صحيح أبي داود: ٢/ ٢٨٠)

[4] مسند أحمد (٥/ ٢٠٦) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ زبرقان بن عمرو رحمہ اللہ کا سماع سیدنا اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے ثابت نہیں ہے۔

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨٢) تفسير البغوي (١/ ٢٨٨) [6] الاستذكار (٢/ ١٩١) [7] المحرر الوجيز (١/ ٣١٥)

نبی مکرم ﷺ نے احزاب کے دن فرمایا کہ انھوں نے ہم کو صلاۃِ وسطی نمازِ عصر سے باز رکھا، اللہ اُن کے دلوں اور گھروں کو آگ سے بھر دے۔ پھر اس کو مغرب اور عشا کے درمیان پڑھا۔[1] (رواه أحمد و أخرجه الشيخان و أبو داود و الترمذي و النسائي وغير واحد من أصحاب المسانيد و السنن و الصحاح من طرق يطول ذكرها) ''اس حدیث کو احمد، بخاری، مسلم، ابو داود، ترمذی، نسائی اور بہت سے مسندوں اور سنن اور صحاح والوں نے بہت طرق سے، جن کا ذکر باعثِ طوالت ہے، روایت کیا ہے۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس بارے میں احادیثِ صحیحہ اور حسنہ کی ایک مناسب مقدار کا ذکر کر کے کہا ہے کہ یہ احادیث اس مسئلے میں نص ہیں۔ ان میں کسی اور چیز کا احتمال نہیں ہے۔ محافظت کرنے کا حکم اسی نماز کی تاکید کرتا ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ جس کی عصر کی نماز گئی، گویا اس کے اہل و مال لٹ گئے۔[3] دوسری صحیح روایت سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح ہے کہ ابر کے دن نماز جلد پڑھو، جس نے عصر کی نماز کو ترک کیا اس کے عمل اکارت گئے۔[4] ابو بصرہ غفاری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے وادیِ مخمص میں ہمیں نمازِ عصر پڑھائی، پھر فرمایا کہ یہ نماز تم سے پہلے لوگوں پر پیش کی گئی تھی، انھوں نے اس کو ضائع کیا، سن رکھو، جو کوئی اس نماز کو پڑھے گا، اس کو دُوہرا اَجر ملے گا، اس کے بعد اور کوئی نماز نہیں، جب تک کہ تم شاہد (ایک ستارہ) کو دیکھو۔[5] (رواه أحمد و مسلم)

ابو یونس (سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے غلام) نے کہا ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے مجھ کو حکم دیا کہ میں ان کے لیے ایک مصحف لکھوں۔ مجھ سے کہا کہ جب تو اس آیت پر پہنچے: ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾ تو مجھے خبر کر دینا۔ جب میں اس مقام تک پہنچا، میں نے خبر کی تو مجھ کو لفظِ وسطی کے بعد لکھوایا: ''وَصَلَاةِ الْعَصْرِ'' پھر کہا کہ میں نے اس لفظ کو نبی اکرم ﷺ سے سنا ہے۔ اس کو امام احمد و مسلم رحمہما اللہ نے روایت کیا ہے۔[6] امام عروہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مصحفِ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا میں اسی طرح تھا۔[7] امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ اسی طرح پڑھتے تھے۔[8] امام مالک رحمہ اللہ نے اسی طرح کا کتابتِ مصحف کا قصہ حفصہ رضی اللہ عنہا زوج نبی اکرم ﷺ سے بھی روایت کیا ہے۔[9] نافع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں نے اس مصحف کو پڑھا اس میں ''واؤ'' پایا۔[10] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازِ عصر نمازِ وسطی کے علاوہ ہے، کیوں کہ ''واؤ'' اس بات کا مقتضی ہے کہ وہ کوئی دوسری ہو۔ مگر اس کے بہت سے جواب دیتے ہیں، ایک یہ کہ واؤ زاید

---

(1) مسند أحمد (١/ ١١٣) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٢٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٨٤) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٧١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٨٤)

(2) تفسير ابن كثير (١/ ٣٨٢) (3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٢٦)

(4) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٨) (5) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٣٠) مسند أحمد (٦/ ٣٩٦)

(6) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٢٩) مسند أحمد (٦/ ٧٣) (7) تفسير الطبري (٥/ ١٧٥)

(8) تفسير ابن كثير (١/ ٣٨٢) (9) الموطأ (١/ ١٣٩) (10) تفسير الطبري (٥/ ٢٠٩)

ہے، جس طرح اس آیت میں فرمایا: ﴿ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٥٥]
''اور ہم اسی طرح آیات کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں، تاکہ مجرموں کا راستہ بالکل واضح ہو جائے۔''

نیز آیت ہے: ﴿ وَكَذٰلِكَ نُرِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ﴾ [الأنعام: ٧٥]
''اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی دکھاتے تھے اور تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔'' یا صفات کے عطف کے لیے ہیں نہ کہ ذات کے واسطے، جیسے: ﴿ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ﴾ [الأحزاب: ٤٠] ''اور لیکن وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔'' نیز آیت: ﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝ وَالَّذِيْۤ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ﴾ [الأعلى: ١۔ ٤] ''آپ اپنے سب سے بلند رب کے نام کی تسبیح کریں۔ جس نے پیدا کیا پھر ٹھیک ٹھاک بنایا۔ اور جس نے اندازہ کیا، پھر ہدایت دی۔ اور جس نے (زمین سے) چارا نکالا۔'' اس طرح کا ''واؤ'' عرب کے شعروں میں بھی مروی ہے۔ پھر اس لفظ کی تلاوت منسوخ ہوگئی، جس طرح کہ صحیح مسلم میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔[1]

امام شوکانی رحمہ اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں کہ نمازِ وسطیٰ سے نمازِ عصر مراد ہے اور اسی کو بڑی پُرزور تقریر سے ثابت کیا ہے۔[2] قبیصہ بن ذویب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد نمازِ مغرب ہے،[3] کیوں کہ یہ رباعی (چار رکعت والی نماز) اور ثنائی کے درمیان ہے، وتر مفروضات میں ہے، اس کی فضیلت آئی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ عشا کی نماز مراد ہے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ پانچوں نمازوں میں سے ایک نماز ہے، معین نہیں کہ کون سی ہے، جس طرح شبِ قدر مبہم ہے کہ کس سال کس ماہ اور کس دھائی میں ہوتی ہے،[4] اسی طرح یہ نماز بھی مبہم ہے۔ بعض سلف اسی طرف گئے ہیں، جیسے: امام ابن مسیب، قاضی شریح اور نافع مولی ابن عمر رحمہم اللہ۔ امام الحرمین جوینی رحمہ اللہ نے کتاب ''نہایہ'' میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ ابن عبدالبر امام ماوراء البحر نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[5]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مگر یہ اختیار کرنا ایک بڑی مصیبت ہے، کیوں کہ انھوں نے باوجود حفظ و اطلاع ایسی بات کو اختیار کیا ہے، جس پر کتاب و سنت اور اثر سے کوئی دلیل بھی قائم نہیں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ نمازِ عشا یا نمازِ فجر مراد ہے۔ کسی نے کہا کہ نماز باجماعت مراد ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نمازِ جمعہ ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نمازِ خوف ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نمازِ عیدالفطر۔ کسی نے کہا ہے کہ نمازِ عید قربان ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نمازِ وتر ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ نمازِ چاشت ہے۔ بعض نے توقف اختیار کیا ہے، کیوں کہ ان اقوال میں آپس میں ٹکراؤ ہے اور کسی کو ترجیح دینے کے لیے کوئی وجہ ظاہر نہیں، کیوں کہ کسی ایک قول پر اجماع نہیں ہوا، بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے سے لے کر اب

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٣٠) [2] فتح القدیر (١/ ٤٤٢۔ ٤٤٥) [3] تفسیر الطبري (٥/ ٢١٤)
[4] شبِ قدر کی ہر طرح کی تعیین (سال، ماہ، دہائی) صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ [5] الاستذکار (٢/ ١٩٣)

تک اختلاف باقی ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی مکرم ﷺ کے زمانے میں اصحاب میں اس معاملے میں اختلاف تھا۔[1] یہ سب اقوال اس سے پہلے قول کی نسبت ضعیف ہیں، اس نزاع کا معرکہ اور مرکز صبح اور عصر کی نماز میں ہے۔[2] سنت سے ثابت ہوا کہ وہ نماز یہی نمازِ عصر ہے، اس لیے یہی متعین ہے۔

صحیح حدیث اور ائمہ کا مذہب:

امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب فضائلِ شافعی میں امام شافعی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے: "كُلُّ مَا قُلْتُ فَكَانَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ بِخِلَافِ قَوْلِي مِمَّا يَصِحُّ فَحَدِيْثُ النَّبِيِّ ﷺ أَوْلٰى فَلَا تُقَلِّدُوْنِي" "جو کچھ میں نے کہا ہے، پس نبی مکرم ﷺ سے اس کے خلاف صحیح سند سے منقول ہو تو نبی مکرم ﷺ کی حدیث لو اور میری تقلید مت کرو۔" اسی طرح امام ربیع، زعفرانی اور احمد رحمہم اللہ بھی امام شافعی رحمہ اللہ سے راوی ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ سے ابن ابی الجاروت کی روایت یہ ہے: "إِذَا صَحَّ الْحَدِيْثُ فَقُلْتُ قَوْلًا فَأَنَا رَاجِعٌ عَنْ قَوْلِي وَقَائِلٌ بِذٰلِكَ" "جب حدیث صحیح ہو جائے اور میں نے کوئی قول کہا ہو تو میں اپنے اس قول سے رجوع کرنے والا ہوں اور اسی کا قائل ہوں۔" حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: "فَهٰذَا مِنْ سِيَادَتِهِ وَ أَمَانَتِهِ وَهٰذَا نَفَسُ إِخْوَانِهِ مِنَ الْأَئِمَّةِ رحمہم اللہ" "پس امام شافعی رحمہ اللہ کی یہ عین سیادت اور امانت ہے اور یہی حال ہے اس کے بھائیوں، اماموں کا، اللہ اُن سب پر رحمت نازل فرمائے۔"

اسی جگہ سے امام ماوردی رحمہ اللہ نے قطعاً یہ بات کہی ہے کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ نمازِ وسطیٰ یہی نمازِ عصر ہے، اگرچہ قولِ جدید وغیرہ میں اس بات پر نص کی ہے کہ اس سے مراد نمازِ صبح ہے، کیوں کہ احادیث میں نمازِ عصر کا نمازِ وسطیٰ ہونا ثابت ہوا ہے۔ محدثین کی ایک جماعت ان کے مذہب کے موافق ہے۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ.

بعض فقہا نے اس بات کا انکار کیا ہے کہ مذہبِ شافعی یہ ہو کہ وہ نمازِ عصر ہے، بلکہ نمازِ صبح پر پختہ رائے دی ہے کہ ان کا یہی ایک قول ہے۔ امام ماوردی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض نے اس مسئلے میں دو قول حکایت کیے ہیں۔ مختلف بیانات اور اُن کے جوابات دینے کے لیے یہ جگہ نہیں ہے، کوئی اور جگہ ہے، ہم نے اس کو علاحدہ تحریر کیا ہے۔ جس طرح امام شافعی رحمہ اللہ نے یہ فرمایا ہے کہ حدیث کے مقابلے میں ہماری بات نہ مانو، اسی طرح ائمہ ثلاثہ سے بھی مروی ہے۔ ائمہ مجتہدین کے نصوص ہمارے رسالہ "جلب المنفعة" میں لکھے گئے ہیں۔ اس بنیاد پر حدیث کے موافق ہر مسئلے کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ یہی ائمہ اربعہ کا قول ہے، اگرچہ اہل الرائے و مقلدین اس بات کو پسند نہ کریں۔[3]

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ صلوات سے مراد نمازِ پنج گانہ ہے۔ محافظت سے مراد یہ ہے کہ نماز کو تمام شرائط، حدود اور

[1] تفسیر الطبري (٥/ ٢٢١) [2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٨٤) [3] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٨٤۔ ٣٨٥)

ارکان کے ساتھ وقت پر ادا کیا جائے۔ وسطیٰ یہ اوسط کا مونث ہے۔ اوسط یا وسط کہتے ہیں عمدہ چیز کو، جیسے: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ﴾ [البقرة: ۱۴۳] ''اور (جیسے تمھیں ہدایت دی) اسی طرح ہم نے تمھیں افضل اُمت بنایا۔'' یہ اس وسط سے مشتق نہیں، جس کے معنی متوسط ہونا ہے، دو چیزوں کے درمیان، بلکہ وسط بمعنی عدل و خیار ہے۔ یہ نماز اگرچہ پنج گانہ نماز میں شامل ہے، مگر اس کی عظمت کے لیے اس کو علاحدہ ذکر کیا۔ اس نماز کے متعین کرنے میں اٹھارہ قول ہیں، جن کو علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے شرح ''منتقی'' میں ذکر کیا ہے، ہر قول کا مرجع بیان کر کے یہ کہا ہے کہ زیادہ قابلِ ترجیح اور صحیح اقوال وہی ہیں، جدھر جمہور گئے ہیں کہ وہ نمازِ عصر ہے۔[1]

پھر تفسیر ''فتح البیان'' میں بعض صحیح اور حسن احادیث ذکر فرما کر یہ لکھا گیا ہے کہ ان حدیثوں میں اس بات کی تصریح ہے کہ مراد نمازِ عصر ہے، اس بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی بہت سے آثار آئے ہیں، مگر جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوگیا تو اب کسی اور کی ضرورت نہیں۔ جو آثارِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مرفوع احادیث کے خلاف آئے ہیں، وہ حجت نہیں ہوسکتے۔ قراءتِ « صلاة العصر » جو مقتضی مغایرت ہے، عروہ کی روایت اس کی معارض ہے، وہ کہتے ہیں کہ مصحفِ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا میں اس طرح تھا: ''وَهِيَ صَلَاةُ الْعَصْرِ'' ''اور وہ نمازِ عصر ہے۔''

اس کو ابن جریر رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے،[2] حالانکہ اگلی قراءت کا منسوخ ہونا ثابت ہو چکا ہے،[3] جس کو سیدہ عائشہ، حفصہ اور اُم سلمہ رضی اللہ عنہن نے نقل کیا ہے۔ الغرض جو بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوئی ہے، وہ تو باہمی جھگڑے کے گدلے پن سے بالکل پاک صاف ہے، اس کو مضبوطی سے پکڑنا چاہیے، باقی اقوال محض رائے ہیں۔ وہ کسی طرح حجت کے لائق نہیں ہوسکتے۔ یہ عدمِ حجیت اس صورت میں بھی ہے کہ کوئی مخالفت موجود نہ ہوتی، پھر جب کہ اس کے خلاف دلیل موجود ہے اور وہ بھی اعلیٰ درجے کی، جو صحیح، قوی اور ثابت ہے تو کسی طرح یہ الفاظ کہ فلاں فلاں نماز فرض یا فلاں فلاں نماز نفل مراد ہے، قابلِ توجہ نہیں ہوسکتے۔ خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تمام اقوال میں سے زیادہ صحیح یہی قول ہے کہ صلاۃِ وسطیٰ نمازِ عصر ہے، کیوں کہ اس بارے میں صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں۔[4]

نماز میں خاموشی اختیار کرنے کا حکم:

قنوت کے معنی ہیں: خشوع، ذلت، مسکینی، خواری و عاجزی۔ یہ اس بات کو لازمی قرار دیتا ہے کہ نماز میں بات نہیں کرنی چاہیے، کیوں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے سلام کا جواب نہ دیا تو یہ عذر کیا: «إِنَّ فِي الصَّلَاةِ لَشُغْلًا» ''تحقیق نماز میں البتہ (اللہ ہی کے ساتھ) شغل ہے۔''[5] صحیح مسلم میں مروی ہے کہ

---

[1] نيل الأوطار (١/ ٣٩٣۔ ٤٠١) [2] تفسير الطبري (٥/ ١٧٥)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٣٠) [4] تفسير الخازن (١/ ١٤٦) فتح البيان (٢/ ٥٢۔ ٥٦)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٤١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٢٣)

معاویہ بن حکم سلمی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ یہ نماز ہے، اس میں کسی سے بات چیت کرنا جائز نہیں، یہ تو اللہ کا ذکر اور تسبیح ہے۔[1] زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں نماز کے اندر اپنے ساتھی سے بات چیت کرتے تھے، کام کاج کے بارے میں کہتے، یہاں تک کہ یہ آیت اُتری تو ہم کو حکم ہوا کہ خاموش کھڑے ہوں۔[2] (رواہ أحمد و الجماعة سوی ابن ماجه)۔

علما کی ایک جماعت پر یہ حدیث مشکل ہوگئی ہے، اس لیے کہ نماز میں کلام کی ممانعت مکہ میں ہوئی تھی، اس وقت تک مدینے کی طرف ہجرت نہیں ہوئی تھی، ارضِ حبشہ کی طرف ہجرت ہو چکی تھی، جس طرح کہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ ہم حبشے کی طرف ہجرت سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں ہوتے تو ہم کو جواب دیتے۔ پھر جب ہم واپس آئے، سلام کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہ دیا، ہمارا خیال اِدھر اُدھر ہوگیا، جب سلام پھیرا، فرمایا کہ میں نے اس لیے جواب نہ دیا کہ میں نماز میں تھا، اللہ تعالیٰ جو نیا حکم چاہتا ہے دیتا ہے۔ ان تمام احکام کے علاوہ ایک حکم یہ ہے کہ نماز میں بات نہ کرو۔[3] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پرانے مسلمان اور مہاجرِ حبشہ تھے، پھر وہاں سے مکہ میں آئے۔ مکہ سے مدینے کو ہجرت کی اور یہ آیت کہ ﴿ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴾ جو بلاخلاف مدنی ہے، اس لیے یہ کہا ہے کہ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے کلام کی کسی قسم کی توضیح نہ دے کر اپنی سمجھ کے مطابق اس آیت سے کلام کے حرام ہونے پر استدلال کیا ہے۔ واللّٰہ أعلم.

بعض نے کہا ہے کہ سیدنا زید رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ ہے کہ نماز میں کلام کی حرمت ہجرت کے بعد ہوئی، گویا دو بار کلام کرنے کی اجازت ہوئی اور دو بار حرام ٹھہرا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہمارے اصحاب میں سے ایک قوم نے اسی کو اختیار کیا ہے، مگر پہلی بات زیادہ ظاہر ہے۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ والی حدیث کو، جس میں مدینے میں سلام کے جواب دینے کا ذکر ہے، امام ابویعلی رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔[4] اہلِ علم نے کہا ہے کہ قنوت کے تیرہ معنی ہیں۔ ان معنوں کو امام شوکانی رحمہ اللہ نے "نیل الأوطار" میں بیان کیا ہے۔[5] یہ مسک الختام شرح بلوغ المرام میں بھی درج ہیں۔ یہاں حدیثِ مذکور کی دلیل سے قنوت کے لیے سکوت کے معنی متعین ہیں۔ وہ قنوت اور ہے، جو صبح کی نماز یا وتر میں پڑھی جاتی ہے۔ اس کے متعلق مختلف احادیث مروی ہیں۔ کسی میں رکوع سے پہلے، کسی میں رکوع کے بعد، کسی

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٧)

[2] مسند أحمد (٤/ ٣٦٨) صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٤٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٣٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٤٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٠٥) سنن النسائي، رقم الحديث (١٢١٩)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٢٤) سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٢١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٧٧٣)

[4] مسند أبي يعلىٰ (٩/ ١١٩) المعجم الكبير (١٠/ ١١٢) تفسير ابن كثير (١/ ٣٨٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٨٩٢)

[5] نيل الأوطار (٢/ ٣٦٠)

میں سب نمازوں میں، کسی میں بعض نمازوں میں، کسی میں بالخصوص سختیوں کے لیے، کسی میں بغیر کسی تخصیص کے قنوت پڑھنے کا ذکر آیا ہے۔ قابلِ ترجیح یہ بات ہے کہ قنوت پڑھنا نوازل (سختیوں) کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کی بحث ''شرح المنتقی'' میں تفصیل کے ساتھ دی گئی ہے۔[1]

حالتِ خوف میں نماز ادا کرنے کا حکم:

فرض نماز ادا کرنے کی تاکید کے بعد حالتِ شغل میں ادا کرنے کا حکم فرمایا کہ جب جنگ کے دوران میں ایسی حالت ہو جائے کہ دشمن میں مڈبھیڑ اور لڑائی کی شدت کی وجہ سے نماز ادا نہ ہو سکے تو پھر جس حال پر ہو سکے، پڑھ لے، یعنی سواری پر ہو، پیدل ہو، منہ قبلے کی طرف ہو یا غیر قبلے کی طرف، نماز پڑھ لے۔ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایسے ہی کہا ہے۔ نافع رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ بات سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔[2] (رواه الشيخان) صحیح مسلم کی دوسری روایت یہ ہے کہ اگر خوف سخت ہو تو سوار اور پیدل اشارے سے پڑھ لے۔[3] جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن انیس جہنی رضی اللہ عنہ کو خالد بن سفیان کے قتل کے لیے بھیجا اور وہ عرنہ (وادی کا نام) یا عرفات کی طرف تھا اور عصر کی نماز کا وقت آ گیا تو یہ کہتے ہیں کہ میں نماز فوت ہونے کے ڈر سے اشارے سے نماز پڑھتا تھا۔[4] (رواه أحمد و أبو داود بإسناد جيد)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اللہ کی رخصت ہے، جو اُس نے اپنے بندوں کو دی ہے۔ ان پر سے دورِ جہالت کے بوجھوں اور طوقوں کو اُتار دیا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ سوار اپنی سواری پر اور پیادہ اپنے دونوں پاؤں پر پڑھے۔ امام حسن، مجاہد، مکحول، سدی، حکم، مالک، اوزاعی اور ثوری رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ اتنا زیادہ کہا ہے کہ جدھر منہ کرے، اُدھر سے اشارہ کرتا جائے۔[5] امام احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض اوقات میں نمازِ خوف ایک ہی رکعت ہوتی ہے، جبکہ دو لشکروں کا سامنا ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کا یہی مطلب ہے، جس کو مسلم، اہلِ سنن اور ابن جریر رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے پیغمبر کی زبان پر نماز کو فرض کیا ہے۔ حضر میں چار رکعت، سفر میں دو رکعت اور خوف میں ایک رکعت۔ امام حسن بصری، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ وغیرہم کا یہی قول ہے۔[6]

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بھی اسی طرف گئے ہیں، اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[7] اس نماز کو

---

[1] نيل الأوطار (٢/ ٣٩٣۔ ٤٠٠) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٦١) [3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٣٩)

[4] سنن أبي داود، رقم: (١٢٤٩) مسند أحمد (٣/ ٤٩٦) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ (فتح الباري: ٢/ ٤٣٧)

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٥٠)

[6] صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٨٧) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٢٤٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٥٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٠٦٨) مسند أحمد (١/ ٢٤٣) تفسير الطبري (٥/ ٢٤٧) تفسير ابن كثير (١/ ٣٨٦)

[7] تفسير الطبري (٥/ ٢٤٣، ٢٤٧)

نمازِ مسایفہ کہتے ہیں، یعنی وہ نماز جو سیف (تلوار) کے چلنے کے وقت پڑھی جائے۔ بخاری کے الفاظ یہ ہیں: ”بَابُ الصَّلَاةِ عِنْدَ مُنَاهَضَةِ الْحُصُوْنِ وَلِقَاءِ الْعَدُوِّ“ یعنی وہ نماز جو قلعہ گیری اور دشمن سے ملاقات کے وقت پڑھی جاتی ہے۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر فتح تیار اور قریب ہے، مگر نماز نہیں پڑھ سکتے تو ہر آدمی الگ الگ اشارے سے نماز پڑھ لے۔ اگر یہ بھی نہ بن سکے تو لڑائی کے کھل جانے تک تاخیر کرے، پھر امن میں ہوکر دو رکعت پڑھے، ورنہ ایک رکعت دو سجدے کرے۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو نری تکبیر کافی نہ ہوگی، دیر کر کے امن ہونے کے بعد ادا کرے۔ امام مکحول رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ہم نے فجر کے وقت ایک قلعے پر چڑھائی کی، لڑائی گرم ہوئی، نماز نہ پڑھ سکے، یہاں تک کہ دن چڑھ گیا۔ ہم سیدنا ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تھے، مجھ کو اس نماز کے بدلے دنیا و مافیہا کی کچھ خوشی نہ تھی۔ یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔[1] پھر اس پر یومِ خندق کو جنگ کی وجہ سے نمازِ عصر میں غروبِ آفتاب تک تاخیر ہو جانے کی صورت میں حدیث میں اس کو عذر ٹھہرایا ہے۔ اسی طرح وہ حدیث، جس میں یہ مروی ہے کہ آدمیوں کو بنی قریظہ کی طرف بھیجا، راستے میں نمازِ عصر کا وقت آیا، ایک نے پڑھی، دوسرے نے غروبِ آفتاب تک نہ پڑھی، نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں پر ملامت نہ کی۔[2] اس سے معلوم ہوا کہ بخاری نے اسی قول کو اختیار کیا ہے کہ جمہور اس کے خلاف ہیں۔ وہ یوں کہتے ہیں کہ جس طریقے سے نمازِ خوف سورۃ النساء اور حدیثوں میں آئی ہے، اس طرح غزوۂ خندق میں مشروع نہیں ہوئی تھی، بلکہ اس کے بعد ہوئی۔ جس طرح سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث میں صراحت کے ساتھ مروی ہے۔

امام بخاری، اوزاعی اور مکحول رحمہم اللہ کا جواب یہ ہے کہ نمازِ خوف کی غزوۂ مذکورہ کے بعد مشروعیت اس سے پہلے اس کے جواز کی ممانعت نہیں کرتی، جب نہیں ہے تو جائز ٹھہرے گی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں شہر تستر کی فتح کے وقت ایسا ہی کیا تھا۔ یہ بات مشہور ہے اور کسی نے اس کا انکار نہیں کیا۔[3] فتح البیان میں لکھا ہے کہ اس آیت سے یہ نکلا کہ عبادت ہر حال میں ممکن حد تک لازم ہے۔ یہ نماز دو طرح ہے: ایک قتال کے وقت، یہاں یہی نماز مراد ہے، دوسری غیر قتال کے وقت، اس کا ذکر سورۃ النساء میں آئے گا۔[4]

پھر فرمایا کہ جب تم حالتِ امن میں ہو تو پھر اس نماز کو اسی طرح پڑھو، جس طرح تمھیں حکم دیا گیا، یعنی رکوع، سجود، قیام، قعود، تشہد و درود پورا ادا کرو، کوئی کسر نہ چھوڑو۔ اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاؤ، اس کا ذکر کرو، جس طرح نمازِ خوف کے بیان کے بعد ارشاد فرمایا ہے: ﴿ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴾ [النساء: ۱۰۳] ”پھر جب تم نماز ادا کر چکو تو کھڑے ہوئے، بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے رہو، پھر جب تمھیں اطمینان ہو جائے تو

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٣٢٠)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٠٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٧٠)
[3] تفسير ابن كثير (١/ ٣٨٦ـ ٣٨٧)
[4] فتح البيان (٢/ ٥٨ـ ٥٩)

(پوری) نماز پڑھو، بے شک مومنوں پر مقررہ وقتوں میں نماز فرض ہے۔'' جو حدیثیں نمازِ خوف کی صورتوں کے بیان میں آئی ہیں، ان کا ذکر سورۃ النساء کی اس آیت کے ذیل میں آئے گا: ﴿ وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْۤا اَسْلِحَتَهُمْ١ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآىِٕكُمْ١۪ وَلْتَاْتِ طَآىِٕفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ١ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً١ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَنْ تَضَعُوْۤا اَسْلِحَتَكُمْ١ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ١ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا۰۰۱۰۲ ﴾ [النساء: ۱۰۲] ''اور (اے نبی!) جب آپ مومنوں کے درمیان ہوں، پھر انھیں نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوں تو ان میں سے ایک گروہ اپنے ہتھیار لگائے ہوئے آپ کے ساتھ جماعت میں کھڑا ہو، پھر جب وہ سجدہ کر لے تو پیچھے چلا جائے اور دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی، وہ آپ کے ساتھ نماز ادا کرے اور اپنا بچاؤ ساتھ لے اور اپنے ہتھیار (لگائے رکھے۔) کافر چاہتے ہیں کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان کی طرف سے ذرا غافل ہو جاؤ تو وہ تم پر یکبارگی دھاوا بول دیں۔ اور اگر تمھیں بارش سے تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اپنے ہتھیار (ایک طرف) رکھ دو، اور اپنا بچاؤ ساتھ لو۔ بے شک اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کر دینے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا١ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ
مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ١ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ١ؕ وَاللّٰهُ
عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۰۰۲۴۰ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ١ؕ حَقًّا عَلَى
الْمُتَّقِيْنَ۰۰۲۴۱ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَؒ۰۰۲۴۲

اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، ان پر اپنی بیویوں کے حق میں وصیت کرنا (لازم) ہے کہ انھیں خرچ دیا جائے اور ان کو ایک سال تک گھر سے نہ نکالا جائے، پھر اگر وہ خود چلی جائیں تو تم پر اس بارے میں کوئی گناہ نہیں جو وہ دستور کے مطابق اپنی ذات کے معاملے میں کریں اور اللہ غالب ہے، خوب حکمت والا (240) اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو انھیں بھی دستور کے مطابق کچھ دے دلا کر رخصت کیا جائے، (یہ) متقی لوگوں پر لازم ہے (241) اللہ اسی طرح تمھارے لیے اپنی آیتیں بیان فرماتا ہے، تاکہ تم سمجھو (242)

یہ حکم اس وقت تھا، جب وارثوں کو حصہ دلوانا مرد کے اختیار میں رکھا تھا، اب چوں کہ اللہ پاک نے حصے مقرر

کر دیے ہیں، عورت کا بھی حصہ ٹھہرا دیا تو اب مردے کا حصہ دلوانا موقوف ہو گیا۔ پہلے طلاق والی ان عورتوں کو جن کا نہ مہر مقرر ہوا ہو اور نہ انھیں ہاتھ لگایا ہو، خرچ دینا، یعنی جوڑا دینا فرمایا تھا، یہاں فرمایا کہ سب طلاق والیوں کو جوڑا دینا بہتر ہے اور اس پہلی کو (جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) ضرور ہے۔ اس جگہ طلاق اور نکاح کے احکام مکمل ہوئے۔

بیوہ کے لیے ایک سال تک انتظار کے حکم کی منسوخی:

اکثر علما نے کہا ہے کہ یہ آیت پہلی آیت سے منسوخ ہے، جو یہ ہے: ﴿ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا ﴾ [البقرة: ٢٣٤] ''تو وہ چار ماہ دس دن اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں۔'' ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ جب یہ آیت منسوخ ہوگئی ہے تو اب اس کا لکھنا کیا ضروری ہے، اس کو کیوں چھوڑ نہیں دیتے؟ کہا: اے بھتیجے! میں کسی چیز کو اس کی جگہ سے نہیں بدلوں گا، یعنی مصحف میں، جس جگہ اس کو لکھا پایا، وہیں رہنے دیا۔[1] (رواه البخاري) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جس عورت کا شوہر مر جاتا، اس کو ایک سال کا خرچ اور رہائش دی جاتی، آیتِ وراثت نے اس کو منسوخ کر کے شوہر کے ترکے میں آٹھواں یا چوتھا حصہ قائم رکھا۔[2] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعینِ عظام رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا یہی قول ہے، یعنی بیوی سے اولاد ہے تو آٹھواں حصہ ملے گا، نہیں تو چوتھا حصہ ملے گا۔ وصیت اور خرچ کا حکم باقی نہ رہا، چار ماہ دس دن نے اس کو منسوخ کر دیا۔

امام ابن مسیب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ناسخ یہ آیت ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ﴾ [الأحزاب: ٤٩] ''اے ایمان والو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو۔'' امام مقاتل اور قتادہ رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ بلکہ ناسخ میراث کی آیت ہے۔[3] بخاری رحمہ اللہ نے مجاہد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پورے سال میں سات ماہ اور بیس شب کو وصیت ٹھہرایا، چاہے رہے، چاہے نکل جائے۔ یہی لفظِ غیر اخراج کا مطلب ہے کہ اگر نکل گئی تو کچھ گناہ نہیں، غرض کہ عدت بدستور واجب رہی۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس آیت نے مرنے والے کے اہل کے پاس عدت کو منسوخ کر دیا، اب جہاں چاہے عدت کرے، غیر اخراج کا یہ مقصد ہے۔ امام عطا رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چاہے اپنے اہل کے پاس عدت گزارے، اس کے گھر میں رہے، چاہے کہیں اور نکل جائے۔ میراث نے آ کر سکونت کو منسوخ کر دیا، کہیں جا رہے سکنٰی (رہائش) نہیں۔[4] یعنی اس آیت میں ایک سالہ عدت پر دلیل نہیں ہے، جس طرح جمہور نے کہا ہے کہ چار ماہ دس شب اس کے ناسخ ہیں، بلکہ یہ تو اس بات پر دلیل ہے کہ شوہر خود وصیت کر جائے کہ اگر بیویوں کی مرضی ہو تو ان کو گھروں میں ایک سال کامل تک رہنے دیا جائے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٣٦)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٥١)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٥١۔ ٤٥٢)
[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٣٧)

اسی لیے یہ فرمایا ہے: ﴿ وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِمْ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''اپنی بیویوں کے لیے وصیت کرنا'' یعنی اللہ تم کو اس بات کی وصیت کرتا ہے، جیسے اس کا فرمان ہے: ﴿ يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ﴾ [النساء: ۱۱] نیز اس کا فرمان: ﴿ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ ﴾ [النساء: ۱۲] یا یہ مطلب ہے کہ تم ان کو وصیت کر جاؤ۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لفظِ ﴿ وَصِيَّةً ﴾ مرفوع ہے، یعنی یہ وصیت تم پر فرض ہے،[1] ان کو اس اَمر سے روکا نہ جائے، بدلیل غیر اخراج، پھر جب چار ماہ دس دن گزر جائیں یا حمل وضع ہو اور وہ اس گھر سے باہر نکلنا چاہیں تو ان کو منع نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق: ﴿ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ مِن مَّعْرُوفٍ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''پھر اگر وہ خود چلی جائیں تو تم پر اس بارے میں کوئی گناہ نہیں جو وہ دستور کے مطابق اپنی ذات کے معاملے میں کریں اور اللہ غالب ہے، خوب حکمت والا۔'' امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ اس قول میں (کہ یہ وصیت کے باب سے ہے فرض نہیں) ایک اتجاہ (پہلو نکلتا) ہے اور یہ لفظ بھی اس مفہوم کی معاونت کرتا ہے، اسی لیے ایک جماعت نے اس کو اختیار کیا ہے۔ من جملہ ان کے امام ابو العباس ابن تیمیہ رحمہ اللہ ہیں۔ دوسروں نے اس کا رد کیا ہے اور اُن میں ایک ابن عبدالبر رحمہ اللہ ہیں۔ عطا رحمہ اللہ کا یہ قول ہے کہ آیتِ میراث سے یہ آیت منسوخ ہے،[2] اگر اس سے مراد چار ماہ دس روز سے زیادہ پر ہے تو ٹھیک ہے اور اگر مراد یہ ہے کہ ترکہ میت میں اتنی مدت کی سکونت واجب نہیں ہے تو اس بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے دونوں باتیں کہی ہیں، یہ بات کہ شوہر کے گھر میں تا عدت رہنا واجب ہے، اس کی دلیل فریعہ بنت مالک رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث ہے کہ ان کا شوہر مر گیا نہ گھر چھوڑا نہ نفقہ۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسی گھر میں رہو، یعنی جس گھر میں موت کی خبر سنی ہے، جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے۔ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے سن کر اسی پر عمل کیا۔ (رواه مالك و أهل السنن) امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔[3]

مطلقہ کو کچھ نہ کچھ دینے کا وجوب:

ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب اگلی آیت اُتری، جس میں ہے: ﴿ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴾ [البقرة: ۲۳۶] ''(یہ) نیکی کرنے والوں پر لازم ہے۔'' تو ایک آدمی نے کہا کہ چاہوں احسان کروں، چاہوں نہ کروں۔ اس پر یہ آیت اُتری: ﴿ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴾ [البقرة: ۲۴۱][4] ''(یہ) متقی لوگوں پر لازم ہے۔'' بعض علما نے اس آیت کو اس

---

[1] تفسير الطبري (٥/ ٢٥١) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٥١)

[3] الموطأ (٢/ ٥٩١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٠٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٠٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٢٠٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٣١) اس کی سند صحیح ہے۔

[4] تفسير الطبري (٥/ ٢٦٤)

بات پر دلیل ٹھہرایا ہے کہ ہر مطلقہ کے لیے نان ونفقہ دینا واجب ہے، خواہ اس کا حق مہر ادا کر دیا گیا ہو یا مقرر کیا گیا ہو، مگر دیا نہ گیا ہو، خواہ اس مطلقہ کو ہاتھ لگایا گیا ہو یا وہ غیر مدخولہ ہو۔ امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ سلف کا یہی قول ہے اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[1] جو اہلِ علم نان ونفقہ کے وجوب کے بالکل قائل نہیں ہیں، وہ کہتے ہیں کہ متعہ (نان ونفقہ) اسی کے لیے ہے، جس کا ذکر آیت ﴿حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ﴾ [البقرة: ٢٣٦] میں گزر چکا ہے۔ اگلوں نے جواب دیا کہ وہ آیت اس طرح کی ہے کہ جس میں بعض افرادِ عموم کا ذکر کیا ہے، کسی کی تخصیص نہیں ہے۔[2] مشہور اور منصور مذہب یہی ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس آیت میں واجب نان ونفقہ یا غیر واجب نان ونفقہ دونوں شامل ہیں۔ واجب اس کے لیے جس کو مہر مقرر کرنے اور جماع سے پہلے طلاق دی تھی، مستحب اس کے لیے جو باقی قسم کی مطلقات ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ اس جگہ متعہ سے مراد نفقہ ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٢٤٣﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٤٤﴾ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ أَضْعَافًا كَثِيْرَةً وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٤٥﴾

(اے نبی!) کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے گھروں سے موت کے ڈر سے نکلے اور وہ کئی ہزار تھے، پس اللہ نے ان سے کہا: تم مر جاؤ! پھر اس نے ان کو زندہ کر دیا، بے شک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے (243) اور تم اللہ کی راہ میں لڑو اور جان لو کہ بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (244) کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے؟ پھر اللہ وہ مال اس کے لیے کئی گناہ بڑھا دے اور اللہ ہی تنگی کرتا اور فراخی کرتا ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے (245)

دنیا میں مر کر اُٹھنے والوں کا واقعہ:

یہ پہلی اُمت میں ہوا ہے کہ کئی ہزار لوگ اہل وعیال کو لے کر اپنے وطن کو چھوڑ کر نکلے، ان کو دشمن کا ڈر ہوا اور

[1] تفسیر الطبري (٥/ ٢٦٤) [2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٨٨۔ ٣٨٩)

لڑنے سے جی چرایا یا کسی وبا کا ڈر ہوا اور تقدیر پر یقین نہ ہوا، پھر ایک منزل پر پہنچ کر سارے مر گئے۔ پھر سات دن کے بعد پیغمبر کی دعا سے زندہ ہوئے کہ آگے کو توبہ کریں۔ یہ اس لیے فرمایا کہ جہاد سے جی چرانا فضول ہے، موت کسی کو بھی نہیں چھوڑتی۔ اللہ تعالیٰ کو قرض دینا یہ ہے کہ جہاد میں خرچ کرے اور تنگی سے نہ ڈرے کہ اللہ کے ہاتھ کشایش ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ چار ہزار یا آٹھ ہزار یا چالیس ہزار آدمی تھے۔ ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نو ہزار تھے۔ وہب بن منبہ اور ابو مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تیس ہزار سے کچھ اوپر تھے۔ ان کے گاؤں کا نام داوردان تھا۔ یہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ واسط کی طرف کے تھے۔[1] سعید بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اذرعات کے تھے۔ علی بن عاصم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ واسط سے ایک فرسخ پر تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ طاعون سے بھاگے تھے۔ کہا کہ ایسی جگہ جائیں، جہاں موت نہ ہو، جب فلاں جگہ پہنچے مر گئے۔ ایک نبی کا گزر ہوا، ان کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے زندہ کر دیا۔[2]

بہت سے سلف نے کہا ہے کہ یہ قوم زمانہ بنی اسرائیل میں ایک شہر والی تھی، اپنی زمین کی آب و ہوا ناپسند کی کہ وہاں ان پر سخت وبا آئی تھی، شہر سے وبا کے خوف سے جنگل کی طرف نکل بھاگے۔ ایک وادی افیح میں جا کر اُترے۔ اس کے دونوں کنارے ان سے بھر گئے۔ اللہ نے دو فرشتے بھیجے، ایک نے وادی کی بلندی کی طرف سے اور دوسرے نے پستی کی طرف سے ایک ایسی چیخ ماری کہ سب کے سب مر گئے، جیسے کوئی ایک شخص مر جاتا ہے۔ ان کو باڑوں میں بند کر کے دیواریں کھڑی کر دی گئیں اور وہ سب گل سڑ کر فنا ہو گئے۔ ایک زمانے کے بعد بنی اسرائیل کے انبیا میں سے ایک نبی کا اُدھر سے گزر ہوا، ان کو حزقیل کہتے تھے کہ انھوں نے اللہ سے دعا کی کہ میرے ہاتھ پر اُن کو زندہ کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی، کہا کہ تم یوں کہو: اے بوسیدہ ہڈیو! اللہ تم کو حکم کرتا ہے کہ تم سب اکٹھی ہو جاؤ۔ ہر جسم کی ہڈیاں ایک دوسرے سے مل گئیں، پھر فرمایا کہ ان کو پکار کر کہو: اے ہڈیو! اللہ حکم فرماتا ہے کہ تم گوشت پوست رگ پٹھے پہن لو، چنانچہ ایسا ہی ہوا، پھر فرمایا کہ اب پکار دو کہ روحو! اللہ حکم دیتا ہے کہ تم اپنے اپنے بدن میں جاؤ، جن کو آباد رکھا تھا۔ سب کے سب زندہ ہو کر دیکھنے لگے، ایک لمبے اور تکلیف دہ خواب کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کر دیا، وہ کہنے لگے: ”سُبْحَانَكَ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ“ ”تو پاک ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔“ ان کے زندہ کرنے میں بڑی نصیحت اور دلیل ہے کہ یہ جسم قیامت کے دن پھر لوٹایا جائے گا۔

وبا والی زمین میں جانے کے متعلق شرعی حکم:

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ کا لوگوں پر فضل ہے کہ وہ ان کو اپنی واضح نشانیاں، حجتیں اور روشن دلیلیں

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٤٥٥۔ ٤٥٦) [2] تفسیر الطبري (٥/ ٢٦٦۔ ٢٦٧)

دکھلاتا ہے، مگر اکثر لوگ ناشکرے ہیں۔ اللہ نے ان کو دین و دنیا میں جو نعمت بخشی ہے، اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔ اس قصے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ کے عذاب اور تقدیر سے کوئی نہیں بچا سکتا، سوائے اللہ کے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ وہ لوگ وبا سے بھاگ کر لمبی زندگی کی طلب میں باہر نکلے تھے، ان کے ارادے کے خلاف، ان سے برتاؤ ہوا کہ آنِ واحد میں موت نے آ کر پکڑ لیا۔ اسی قبیل کی یہ حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب کسی زمین میں وبا ہو اور تم وہاں ہو تو وہاں سے نہ بھاگو اور جب کسی زمین میں سنو تو وہاں نہ جاؤ۔(رواہ أحمد و أخرجاہ في الصحیحین بطریق أخری)

''اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا اور امام بخاری و امام مسلم نے دوسرے طریق سے روایت کیا ہے۔''[1]

فتح البیان میں لکھا ہے کہ آٹھ دن یا اس سے زیادہ دنوں کے بعد وہ جی اُٹھے۔ یہ اَمر تکوین وتحویل (تقدیر میں) تھا۔ ایک مدت تک زندہ رہے۔ ان پر موت کا اثر معلوم ہوتا تھا۔ جو کپڑا پہنتے وہ کفن کی طرح ہو جاتا، یہ علامت مدت تک ان کی اولاد میں رہی۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ پیغمبر حزقیل علیہ السلام تھے، ان کو ابن العجوز اور ذوالکفل بھی بولتے ہیں۔ یہ بنی اسرائیل میں تیسرے خلیفہ تھے، کیوں کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد یوشع ہوئے، پھر کالب پھر حزقیل۔ محدثین اور مفسرین نے اس قصے کو طرح طرح سے بیان کیا ہے۔ اس کے ذکر میں کچھ خاص فائدہ نہیں ہے، جتنا بیان کر دیا گیا ہے، وہی حاصل تھا۔[2] اس قصے میں دونوں کے لیے عبرت ہے، یعنی جو مر کر جیے اور جنھوں نے اس کو سنا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر بھی بعض مردے جی اُٹھے تھے، اس پر نصاریٰ نے ان کو اللہ یا اللہ کا بیٹا سمجھ لیا، اتنا خیال نہ کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے تو تین چار ہی مردے اللہ کے حکم سے زندہ کیے تھے، یہاں تو حزقیل علیہ السلام نے چار ہزار، بلکہ بے شمار زندہ کرا دیے۔ سو وہ معجزہ بڑا ہوا یا یہ معجزہ، مگر ان کو کسی نے نہ اللہ کہا نہ اللہ کا بیٹا۔

جہاد سے بھاگنا موت کو دور یا نزدیک نہیں کر سکتا:

بہرحال اللہ پاک نے اس جگہ یہ عبرت ناک حکایت بیان فرما کر یہ سمجھایا کہ جس طرح تدبیر تقدیر سے نہیں بچاتی، اسی طرح جہاد کرنے سے نہ کسی کی موت جلدی آئے گی نہ دیر سے، بلکہ اجل کا ایک حتمی وقت ہے اور ہر شخص کی قسمت کا رزق بھی مقرر ہے، نہ اس سے بڑھے نہ گھٹے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴾ [آل عمران: ١٦٨] ''یہ وہی لوگ ہیں جو خود تو پیچھے بیٹھے رہے اور اپنے بھائیوں سے (جو لڑائی میں مارے گئے) کہنے لگے: اگر وہ ہماری بات مانتے تو قتل نہ ہوتے۔ ان سے کہہ دیجیے: اگر تم اس بات میں سچے ہو تو اپنی موت آنے پر اسے ٹال کر دکھانا۔'' نیز

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٢٨٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٢١٩) مسند أحمد (١/ ١٩٤) تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٩٠)

[2] فتح البیان (٢/ ٦٣۔ ٦٤)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ؕ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَّالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿٧٧﴾ اَيْنَمَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ﴾ [النساء: ٧٧۔ ٧٨] ''اور وہ کہنے لگے: اے ہمارے رب! تو نے ہم پر جنگ فرض کیوں کی؟ تو نے ہمیں کچھ مدت تک مہلت کیوں نہ دی؟ کہہ دیجیے: دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے اور آخرت بہتر ہے اس شخص کے لیے جس نے پرہیز گاری اختیار کی اور تم پر کھجور کی گٹھلی کے دھاگے کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ تم جہاں کہیں بھی ہو گے، موت تمھیں پا لے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سپہ سالارِ اسلام، دین کے حامی، اللہ کی تلوارِ بے نیام ابوسلیمان خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے اپنے مرض الموت کی حالت میں کہا کہ میں فلاں فلاں جگہ میں حاضر ہوا، میرا کوئی عضو ایسا نہیں کہ جس میں کوئی تیر، نیزہ یا تلوار کا زخم نہ لگا ہو، اب میں بستر پر اس طرح مر رہا ہوں، جیسے کوئی گدھا مرتا ہو۔ اللہ کرے نامردوں کی آنکھوں کو نیند نہ آئے، یعنی انھوں نے اس بات پر افسوس کیا کہ ہائے! کسی جنگ میں کیوں نہ مارا گیا، اپنی بستر پر موت پر ماتم کیا اور رنج فرمایا۔[1]

چوں خوردنی ست کاسۂ زہری کہ قسمت است باجبہۂ کشادہ ننوشد کسے چرا؟

''جب زہر کا پیالہ پینا ہی ہے کہ یہ قسمت میں لکھا ہے، تو پھر کوئی خندہ پیشانی سے کیوں نہ پی لے؟''

قرضِ حسن اور اس کا ثواب:

پھر اللہ نے اپنے بندوں کو قرضِ حسن دینے پر آمادہ کیا اور کہا کہ اس کے بدلے کئی گنا زیادہ ملے گا۔ اس قرض سے مراد اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے، جہاد ہو یا اور کچھ، مگر جہاد میں سب سے بہتر ہے۔ یہ آیت قرآن پاک میں کئی جگہ آئی ہے۔ شانِ نزول میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کون قرض دیتا ہے کہ نہ محتاج ہو نہ مظلوم۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اُتری تو ابوالدحداح انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا اللہ ہم سے قرض لینا چاہتا ہے؟ فرمایا کہ ہاں، کہا: ذرا اپنا ہاتھ تو مجھے دکھائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ دیا، کہا میں نے اپنا چار دیواری والا باغ اپنے رب عزوجل کو قرض میں دیا۔ اس باغ میں کھجور کے چھے سو درخت تھے، اُم الدحداح وہیں رہتی تھیں، ان کے عیال بھی اسی جگہ تھے، انھوں نے ان کو باہر آنے کو کہا: اے ام الدحداح! کہا کہ لبیک، ابوالدحداح نے کہا کہ نکلو، میں نے یہ باغ اپنے ربِ عزوجل کو قرض دے دیا ہے۔[2] (رواه ابن أبي حاتم و ابن مردويه عن عمرو مرفوعاً نحوه)

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٩١)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٤٦٠) اس کی سند میں ''حمید اعرج'' ضعیف راوی ہے، البتہ اس کے شواہد حدیثِ انس اور عمر رضی اللہ عنہما سے موجود ہیں۔ دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٩٦٤)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ سلف نے کہا ہے کہ اس جگہ قرضِ حسن سے مراد اللہ کے راستے میں خرچ کرنا ہے۔[1] بعض نے کہا ہے کہ اپنے عیال پر خرچ کرنا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ مراد اللہ کی تسبیح و تقدیس ہے۔ یہ فرمانا کہ اس قرض کا اجر کئی گنا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے: ﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴾ [البقرة: ٢٦١] ''ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، اس دانے کی سی ہے، جس میں سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کے لیے چاہے (اجر) بڑھا دیتا ہے اور اللہ وسعت والا، خوب جاننے والا ہے۔'' سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکی کو دو لاکھ گنا تک کر دیتا ہے۔[2] (رواہ ابن أبي حاتم)

ترمذی میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ جو شخص کسی بازار میں گیا، پھر اس نے یہ کہا: « لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ » ''نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لیے سب تعریف ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔'' اللہ تعالیٰ اس کے لیے دس لاکھ نیکی لکھ لیتا ہے اور دس لاکھ بدی مٹا دیتا ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ ﴾ [البقرة: ٢٦١] تو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! میری اُمت کو زیادہ دے، تب یہ آیت اتری۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اللہ! میری اُمت کو زیادہ کر، اس وقت یہ آیت اتری: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [الزمر: ١٠] ''بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ان کا پورا پورا اجر بے حساب دیا جائے گا۔''[4] کعب احبار رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کثیر جب اللہ کی طرف سے ہو تو اس کا کچھ شمار نہیں ہے۔[5] پھر یہ فرمایا کہ تم تو خرچ کرو، پروا نہ کرو۔ اللہ رزاق ہے، جسے چاہے کم دے، جسے چاہے زیادہ دے، اس کی حکمت وہی جانے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بنی آدم کے دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، جیسے ایک دل ہوتا ہے، وہ جدھر چاہے، ان کو پھیرے۔ پھر فرمایا کہ اے اللہ! دلوں کے پھیرنے والے! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت پر ثابت رکھ۔[6] (رواہ مسلم)

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٤٦٠)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٤٦١) اس کی سند میں ''زیاد بن ابی زیاد'' سخت ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة: ٣٩٧٥)

[3] ''سنن الترمذي'' (رقم الحديث: ٣٤٢٩) میں مذکورہ روایت کے الفاظ کچھ یوں ہیں: ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ ... وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَهُوَ... قَدِيْرٌ'' البتہ یہ الفاظ ''المعجم الكبير'' (١٢/ ٣٠٠) میں مروی ہیں۔ صحیح الجامع، رقم الحديث (٦٢٣١)

[4] صحيح ابن حبان (١٠/ ٥٠٥) المعجم الأوسط (٦/ ١٠) اس کی سند میں ''عیسیٰ بن مسیب'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ١/ ١٩٨)

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٦٢) [6] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٤)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾

(اے نبی!) کیا آپ نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت نہیں دیکھی؟ جب انھوں نے اپنے نبی سے کہا: آپ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیں، تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں۔ اس نے کہا: ممکن ہے کہ اگر تم پر جہاد فرض کر دیا گیا تو تم جہاد نہ کرو، انھوں نے کہا: آخر ہمیں کیا ہوا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں، جب کہ ہمیں اپنے گھروں اور اپنے بیٹوں سے نکال دیا گیا ہے، پھر جب ان پر لڑنا فرض کر دیا گیا تو ان میں سے تھوڑے سے لوگوں کے سوا سب پھر گئے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے (246)

جہاد کے لیے بادشاہ مقرر کرنے کی یہودیوں کی درخواست کا واقعہ:

موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک مدت تک بنی اسرائیل کا کام بنا رہا، پھر جب اُن کی نیت بُری ہوگئی تو ان پر دشمن مسلط ہوگیا۔ کافر بادشاہ جالوت نے ان کے اطراف کے شہر چھین لیے، انھیں لوٹ لیا اور قیدی بنا کر لے گیا۔ وہاں کے لوگ بھاگ کر شہر بیت المقدس میں جمع ہوئے، شمویئل پیغمبر علیہ السلام سے درخواست کی کہ کوئی با اقبال بادشاہ مقرر کر دیں، کیوں کہ ہم سردارِ با اقبال کے بغیر لڑ نہیں سکتے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ نبی یوشع بن نون علیہ السلام تھے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یعنی افرائیم بن یوسف بن یعقوب تھے۔[1] مگر یہ قول بہت بعید ہے، کیوں کہ وہ نبی موسیٰ علیہ السلام کے ایک زمانۂ دراز کے بعد ہوئے تھے، یہ ماجرا زمانۂ داود علیہ السلام میں ہوا، جس طرح قصے میں اس کی صراحت ہو چکی ہے۔ داود اور موسیٰ علیہما السلام کے درمیان ایک ہزار برس سے زیادہ فاصلہ ہے۔ سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ شمعون علیہ السلام تھے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ شمویئل علیہ السلام تھے۔[2] وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک زمانے تک بنی اسرائیل طریقِ استقامت پر تھے، پھر انھوں نے بدعات نکالیں اور بعض نے بتوں کو پوجا۔

---

[1] تفسیر الطبري (۵/ ۲۹۳) [2] تفسیر الطبري (۵/ ۲۹۲، ۲۹۳)

ان میں ہمیشہ انبیا ہوتے تھے، امر بالمعروف، نہی عن المنکر کرتے، تورات پر انھیں قائم رکھتے، یہاں تک کہ جو کچھ کیا سو کیا۔ تو اللہ نے ان پر دشمنوں کو غالب کر دیا۔ دشمنوں نے قتلِ عظیم کیا۔ ایک خلقت کو قیدی بنا لیا اور بہت سے شہر چھین لیے، ورنہ پہلے جس سے لڑتے، اس پر غالب آتے تھے، کیوں کہ ان کے پاس تورات اور تابوت تھا، جو زمانۂ قدیم سے وراثت میں چلا آ رہا تھا، جب گمراہی میں بڑھ گئے تو بعض بادشاہوں نے بعض جنگوں میں ان سے وہ تابوت چھین لیا، تورات علاحدہ لے لی اور تورات کا کوئی حافظ باقی نہ رہا، اسباط (اولاد یعقوب علیہ السلام) سے نبوت بھی جاتی رہی۔ سبط لاوی، جن میں انبیا ہوتے تھے، میں سوائے ایک عورت حاملہ کے کوئی باقی نہ رہا، اس عورت کو لے کر حفاظت سے ایک گھر میں رکھا کہ شاید اللہ بیٹا دے اور وہ نبی ہو، وہ عورت بھی ہمیشہ اللہ سے دعا مانگتی تھی کہ اس کو بیٹا ملے، اللہ نے اس کا پکارنا سن لیا، ایک لڑکا دیا، اس کا نام اس نے شموئیل رکھا، یعنی اللہ نے میری دعا سن لی۔

بعض نے کہا کہ شمعون علیہ السلام نام رکھا، دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ اس لڑکے نے ان کے درمیان نشو و نما پائی۔ اللہ نے اچھی طرح اس کو اُٹھایا اور بڑا کیا۔ جب انبیا کی عمر کو پہنچا، اللہ نے وحی کی اور حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو اللہ کی توحید کی طرف بلاؤ۔ جب انھوں نے بلایا تو انھوں نے کہا کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کرو کہ اس کے ساتھ ہو کر وہ لڑیں۔ ان میں کوئی بادشاہ نہ تھا۔ نبی کریم علیہ السلام نے کہا کہ اگر اللہ نے بادشاہ مقرر کیا اور تم نہ لڑے تو پھر کیا ہوگا؟ کہا کہ بھلا ہم کس طرح نہ لڑیں گے، ہمارے شہر ہاتھ سے نکل گئے ہیں، ہمیں نکال دیا گیا اور ہماری اولاد قید ہوگئی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب ہم نے ان پر جنگ کو فرض کر دیا تو سب پھر گئے مگر تھوڑے،[1] جو پھر گئے وہ ستر ہزار تھے، ان کے سوا بہت تھوڑے تھے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ۭ
قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ
وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۭ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ
وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ
وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٤٧﴾

اور ان کے نبی نے ان سے کہا: بے شک اللہ نے تمھارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ انھوں نے کہا: ہم پر اس کی بادشاہی کیسے ہو سکتی ہے، جب کہ ہم بادشاہی کے اس سے زیادہ حق دار ہیں؟ اور اسے مال کی وسعت نہیں ملی۔ اس نے کہا: بے شک اللہ نے اسے تم پر چن لیا

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٩٢۔ ٣٩٣)

ہے اور اسے علم اور جسم (دونوں) میں زیادہ کشادگی دی ہے، اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنا ملک عطا کرتا ہے اور اللہ بڑا وسعت والا، خوب جاننے والا ہے ﴿۲۴۷﴾

طالوت کا بطور بادشاہ تقرر اور اس کی صفات:

طالوت کی قوم میں پہلے سے سلطنت نہ تھی۔ اس کا پیشہ ان کی نظر میں حقیر تھا۔ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ سلطنت کسی کا حق نہیں ہے، بڑی لیاقت عقل ہے۔ اور بدن کی کشائش یہ تھی کہ اللہ نے پیغمبر کو ایک عصا بتایا کہ جس کا قد اس کے برابر ہو، سلطنت اس کو ملے گی۔ اس کے برابر قد اسی کا آیا تھا۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے نبی سے یہ فرمایش کی کہ کوئی بادشاہ مقرر کر دو تو انھوں نے طالوت کو مقرر کیا۔ یہ ایک فوجی آدمی تھا، شاہی خاندان میں سے نہیں تھا، کیوں کہ بادشاہی یہوذا کی اولاد میں چلی آ رہی تھی اور یہ اس اولاد میں سے نہیں تھا، اس لیے انھوں نے انکار کیا کہ ایک تو حکمران خاندان سے نہیں ہے، دوسرا فقیر اور محتاج آدمی ہے، یہ کس طرح بادشاہ بن سکتا ہے؟ کسی نے کہا ہے کہ طالوت سقا (بہشتی) تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ دیگر تھا۔ ان کو پیغمبر کی فرماں برداری کرنی چاہیے تھی، نہ کہ سرکشی۔ پیغمبر علیہ السلام نے کہا کہ اس کو اللہ نے مقرر کیا ہے، میں نے اپنی طرف سے پسند نہیں کیا، اس کے علاوہ وہ علم و شکل اور قوت میں تم سے زیادہ ہے اور جنگ آزمودہ ہے۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ کو عالم، حسین، قوی، زبردست اور عالی ہمت ہونا چاہیے۔ پھر کہا کہ اللہ حاکم ہے، جو چاہے سو کرے، اس کو کوئی پوچھ نہیں سکتا، وہ جس سے چاہے پوچھے، وہ علیم، حکیم اور مخلوق پر رؤف رحیم ہے۔[1] فتح البیان میں ہے کہ طالوت اعجمی نام ہے۔ کسی نے کہا کہ چرواہا تھا اور کسی نے کہا کہ کرایہ دار تھا۔ عبرانی میں اس کا نام شاول بن قیس ہے۔ وہ بنیامین بن یعقوب کی نسل سے تھا۔ اس آیت میں شیعہ کے قول کے باطل ہونے کی دلیل ہے، جو امامت کو موروثی بتاتے ہیں۔[2]

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾

اور ان کے نبی نے ان سے کہا: بے شک اس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ تمھارے پاس وہ

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۳۹۳) [2] فتح البیان (۲/ ۷۱۔ ۷۲)

صندوق آئے گا جس میں تمھارے رب کی طرف سے تسکین اور وہ بقیہ چیزیں ہوں گی، جنھیں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون چھوڑ گئے تھے، اسے فرشتے اُٹھا کر لائیں گے۔ بے شک اس میں تمھارے لیے ایک عظیم نشانی ہے اگر تم مومن ہو (248)

طالوت کی بادشاہت کی علامت، تابوتِ سکینہ:

بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آتا تھا، اس میں موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے تبرکات تھے،لڑائی کے وقت اس صندوق کو سردار کے آگے لے چلتے اور دشمن پر حملہ کرتے تو اس کو آگے دھر لیتے، اللہ فتح دیتا۔ جب وہ بدنیت ہوگئے تو وہ صندوق ان سے چھن گیا اور دشمن کے ہاتھ لگا۔ جب طالوت بادشاہ ہوا تو وہ صندوق خود بہ خود رات کے وقت اس کے گھر کے سامنے پہنچا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ وہ دشمن کے شہر میں جہاں رکھا تھا، ان پر مصیبت پڑی، پانچ شہر ویران ہوئے، تب مجبوراً انھوں نے دو بیلوں پر لاد کر انھیں ہانک دیا، پھر فرشتے بیلوں کو ہانک کر یہاں لے آئے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے ان سے کہا کہ تم پر طالوت کی برکت کی علامت یہ ہے کہ جو تابوتِ سکینہ تم سے چھن گیا تھا، وہ تم کو واپس مل جائے گا۔

تابوتِ سکینہ کی تفسیر:

سکینہ کے معنی وقار اور بزرگی کے ہیں۔ قتادہ رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ ربیع رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مراد رحمت ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی قول ہے۔حسن اور عطا رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ مراد اللہ کی آیتیں ہیں، جن سے خاطر جمعی حاصل ہو۔کسی نے کہا ہے کہ سکینہ ایک طشت تھا، جس میں پیغمبروں کے دل دھوئے جاتے تھے۔ اللہ نے وہ طشت موسیٰ علیہ السلام کو دیا، انھوں نے اس میں تورات کی تختیوں کو رکھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ بھی ہے۔ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ سکینہ کا منہ انسان کی طرح ہے، وہ ایک حرکت کرنے والی روح ہے۔

دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ وہ ایک متحرک ہوا ہے، جس کے دو سر تھے۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ دو بازو اور ایک دُم ہے۔ وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بلی کا ایک سر تھا، جب وہ تابوت کے اندر بلی کی آواز نکالتا تو ان کو فتح نصیب ہوتی۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ تابوت میں آثارِ انبیا میں سے کچھ بہتر چیزیں تھیں، ان کو دیکھ کر دل تسکین پکڑتے اور ارادے مضبوط ہو جاتے۔[1] امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''فتح القدیر'' میں مذکورہ اقوال تحریر کرنے کے بعد یہ لکھا ہے کہ شاید یہ باہم مختلف تفسیریں یہود کی طرف سے پہنچی ہیں، اللہ ان کو غارت کرے، انھوں نے یہ باتیں اہلِ اسلام کے ساتھ کھیل کے طور پر اور مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کے لیے بنائی ہیں۔تم دیکھو

[1] تفسير الطبري (٥/ ٣٢٦۔ ٣٢٩) تفسير ابن كثير (١/ ٣٩٣، ٣٩٤)

کبھی سکینہ کو کوئی حیوان بتاتا ہے، کبھی جمادات میں سے کچھ بتاتا ہے، کبھی کوئی بے عقل چیز ٹھہراتا ہے۔ بنی اسرائیل کی ساری منقولات کا یہی حال ہے کہ وہ باہم ٹکراتی ہیں اور ایسے امور پر مشتمل ہیں، جو عقل سے باہر ہیں۔ یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتی کہ یہ باہم مختلف تفسیریں نبی اکرم ﷺ سے مروی ہوں نہ کسی قائل کی رائے معلوم ہوتی ہے۔ ان لوگوں کا مرتبہ اس سے زیادہ بلند تھا کہ وہ تفسیر بالرائے کرتے یا ایسی بات کہتے، جس میں اجتہاد کو بھی کچھ دخل نہیں ہے۔ جب یہ بات طے ہوئی تو اب واجب یہ ہے کہ لغت کی طرف رجوع کیا جائے۔ لغت میں سکینہ کے جو معنی ہیں، وہ مشہور و معروف ہیں۔ ان اختلافی اور ایک دوسرے سے ٹکرانے والے امور کو اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ پاک نے نہ فراخی کی حاجت رکھی ہے نہ تنگی کی۔ اگر سکینہ کی کوئی تفسیر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوتی تو ہم پر وہی کہنا واجب ہوتا، لیکن کسی صحیح طریق سے کوئی تفسیر نہیں آئی۔ یہ سکینہ بعض صحابہ پر تلاوتِ قرآن مجید کے وقت اُترا تھا، جس طرح صحیح مسلم میں براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص سورۃ الکہف پڑھ رہا تھا، اس کے پاس اس کا گھوڑا بندھا تھا۔ ایک بادل نے آکر ڈھانپ لیا۔ وہ گھوڑا بدکنے لگا، سکینہ اس شخص سے نزدیک ہونے لگا۔ جب صبح ہوئی تو نبی اکرم ﷺ کو بتایا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ سکینہ تھا، جو قرآن پڑھنے کے سبب سے نازل ہوا۔ اس حدیث میں صرف اتنا ہے کہ جس چیز کا نام آپ ﷺ نے سکینہ فرمایا، وہ ایک بادل تھا، جو اس قاری کے پاس نازل ہوا۔[1]

باقیات آلِ موسیٰ:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس جگہ بقیہ سے مراد موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور تورات کی تختیوں کے ٹکڑے ہیں۔[2] امام قتادہ، سدی، ربیع اور عکرمہ رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے مراد عصائے موسیٰ علیہ السلام، عصائے ہارون علیہ السلام، دو تختے تورات کے اور کچھ من ہے۔ عطیہ رحمہ اللہ نے یہ زیادہ کیا ہے کہ موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے کپڑے بھی تھے۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کے سوا دو جوتے بھی۔[3] کسی نے کہا ہے کہ فقط تورات اور علم تھا۔ کسی نے کہا ہے کہ عمامہ بھی تھا۔ یہ تبرکات بنی اسرائیل کے پاس تھے اور قرناً بعد قرن بہ طورِ میراث کے چلے آئے تھے۔ جب انھوں نے اللہ کی نافرمانی کی اور فساد برپا کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر عمالقہ کو مسلط کر دیا۔ انھوں نے وہ تابوت ان سے لے لیا، آلِ موسیٰ علیہ السلام اور آلِ ہارون علیہ السلام سے مراد خود موسیٰ اور ہارون علیہما السلام ہیں یا انبیائے بنی یعقوب علیہ السلام ہیں۔

تابوت کا لانا:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ فرشتوں نے تابوت کو زمین اور آسمان کے درمیان میں اُٹھا کر

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۹۵) فتح القدیر (۱/ ۴۵۸۔ ۴۵۹) [2] تفسیر الطبري (۵/ ۳۳۱) اس کی سند صحیح ہے۔

[3] تفسیر الطبري (۵/ ۳۳۱۔ ۳۳۳)

طالوت کے سامنے رکھ دیا، سب لوگ دیکھ رہے تھے۔[1] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صبح کو طالوت کے گھر رکھا ہوا ملا، سب نے شمعون علیہ السلام کی نبوت کو مان لیا اور طالوت کی اطاعت اختیار کی۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے بعض شیوخ سے نقل کیا ہے کہ فرشتے اس کو ایک بیل پر لاد کر لائے یا دو گائیوں پر۔[2] کسی نے کہا ہے کہ تابوت اریحا میں تھا، مشرکوں نے لے کر اسے اپنے عبادت خانے میں ایک بڑے بت کے نیچے رکھا تھا۔ صبح کو وہ بت کے سر پر آ گیا، پھر اس کو اسی طرح بت کے نیچے رکھا، پھر صبح کو اسی طرح بت کے اوپر ہو گیا، پھر اس کو بت کے نیچے گاڑ دیا، صبح کو بت کے ہاتھ پاؤں ٹوٹے ہوئے اور اس کو اُوندھا پڑا ہوا پایا۔ وہ جان گئے کہ یہ بات اللہ کی طرف سے ہے اور وہ اس امر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مجبوراً اس کو اپنے شہر سے باہر لا کر ایک گاؤں میں رکھ دیا۔ اس گاؤں والوں کی گردنوں میں بیماری لگی، ایک لڑکی نے جو بنی اسرائیل کی قیدیوں میں سے تھی، کہا کہ تم اس کو بنی اسرائیل کو دے دو، تا کہ تم کو اس بیماری سے نجات ملے، انھوں نے دو بیلوں پر لاد کر چھوڑ دیا۔ جو ان کے پاس جاتا، وہ مر جاتا، یہاں تک کہ وہ دو بیل بنی اسرائیل کے شہر کے نزدیک ہو گئے۔ بنی اسرائیل نے آ کر اُن کو لے لیا اور کسی نے کہا ہے کہ داود علیہ السلام نے لیا۔ کسی نے کہا ہے کہ دو جوان شخصوں نے پکڑا۔ واللہ أعلم.

بعض کہتے ہیں کہ تابوت فلسطین کے ایک گاؤں میں تھا جسے ازدہ کہتے تھے۔ ابو صالح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ تابوت میں یہ کلمۂ کشایش تھا: ”لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ الْحَكِيْمُ الْكَرِيْمُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ السَّمَاوَاتِ السَّبْعِ وَرَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ“[3] ”نہیں کوئی الٰہ مگر اللہ وہ حکمت والا اور عزت والا ہے، پاک ہے اللہ جو ساتوں آسمانوں کا رب ہے اور عرشِ عظیم کا رب ہے اور تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جو پروردگار ہے تمام جہانوں کا۔“ امام قتادہ اور کلبی رحمہما اللہ کا قول یہ ہے کہ سکینہ طمانیت کو کہتے ہیں، جس مکان میں وہ تابوت ہوتا، وہاں کے لوگ مطمئن رہتے۔[4] یہ قول صحت کے زیادہ قریب ہے، اس بنیاد پر کہ جس چیز سے دل جمعی ملے، وہی سکینہ ہو سکتی ہے، لیکن جب اس بارے میں کوئی نصِ صریح نہیں آئی تو ایک قول کو صحیح کہنا اور دوسرے کو ضعیف کہنا جائز نہیں، بلکہ لغت کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، جیسے اوپر گزر چکا ہے۔ اس تابوت کے آنے میں نبی موصوف کی سچائی کی دلیل تھی۔ اسی لیے یہ فرمایا کہ اگر تم ایماندار ہو تو طالوت کی اطاعت کرو۔

---

[1] تفسیر الطبري (٥/ ٣٣٥) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا زمانہ نہیں پایا۔ نیز سند میں ”حسین بن داود“ ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر الطبري (٥/ ٣٣٥، ٣٣٦)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٤٧٠)

[4] تفسیر البغوي (١/ ٢٩٩)

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوۡتُ بِالۡجُنُوۡدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبۡتَلِيۡكُمۡ بِنَهَرٍ ۚ
فَمَنۡ شَرِبَ مِنۡهُ فَلَيۡسَ مِنِّىۡ ۚ وَمَنۡ لَّمۡ يَطۡعَمۡهُ فَاِنَّهٗ مِنِّىۡٓ اِلَّا
مَنِ اغۡتَرَفَ غُرۡفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوۡا مِنۡهُ اِلَّا قَلِيۡلًا مِّنۡهُمۡ ؕ فَلَمَّا
جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ ۙ قَالُوۡا لَا طَاقَةَ لَنَا الۡيَوۡمَ
بِجَالُوۡتَ وَجُنُوۡدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيۡنَ يَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمۡ مِّنۡ
فِئَةٍ قَلِيۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً كَثِيۡرَةً ۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۲۴۹﴾

پھر جب طالوت فوجیں لے کر نکلا تو اس نے کہا: بے شک اللہ تمھیں ایک نہر کے ذریعے سے آزمائے گا، پس جس نے اس سے (سیر ہو کر) پانی پیا وہ مجھ سے نہیں اور جس نے اس کا پانی نہ چکھا، تو یقیناً وہ میرا ہے، ہاں! کوئی اپنے ہاتھ سے ایک آدھ چلو بھر لے (تو حرج نہیں) پھر ان میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا سب نے اس (نہر) کا پانی پی لیا، پھر جب طالوت نے وہ نہر پار کر لی اور ان لوگوں نے (بھی) جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے، تو انھوں نے (آپس میں) کہا: آج ہم میں جالوت اور اس کی فوجوں کے خلاف لڑنے کی طاقت نہیں۔ وہ لوگ جو اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ بے شک وہ اللہ سے ملنے والے ہیں، انھوں نے کہا: کئی بار چھوٹی سی جماعت اللہ کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب آئی ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿249﴾

لشکرِ طالوت کی آزمائش:

طالوت کے ساتھ نکلنے کے لیے حرص کی وجہ سے سب تیار ہوئے۔ اس نے پابندی لگائی کہ جو شخص جوان ہو اور فکر سے آزاد ہو، وہی نکلے، اس کے باوجود اسی ہزار افراد نکلے۔ اس نے چاہا کہ ان کو آزمائے۔ ایک منزل پر پانی نہ ملا، اس کے بعد ایک نہر ملی، اس نے بندش لگائی کہ ایک چلو سے زیادہ جو کوئی پیے، وہ میرے ساتھ نہ آئے، تین سو تیرہ آدمی رہ گئے، باقی سب بزدل ہو کر ٹھہر گئے۔

لطیفہ: ایک بزرگ صوفی منش کو ایک امیر کبیر نے بلایا، کہا جو عہدہ مانگو، وہ ملے گا، انھوں نے اس کے جواب میں یہ رُقعہ لکھا:

دنیا بنہر طالوت می مانند — غرفہ ازاں حلال ست باقی حرام

"دنیا طالوت کی نہر کی طرح ہے کہ اس سے چلو بھر پانی لینا حلال ہے، اس کے علاوہ حرام ہے۔"

دراں دیار کہ شاہی بہر گدا بخشند غنیمت است کہ مارا ہمیں بما بخشند

''اس ملک میں کہ جہاں شاہ ہر گدا کو عطا کرتے ہیں، غنیمت ہے کہ ہمیں وہی پانی (شراب) کے ساتھ عطا کرتے ہیں۔''

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جس دن طالوت لشکر لے کر باہر نکلے، اسی ہزار آدمی تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ وہ نہر اُردن اور فلسطین کے درمیان تھی، اس کو نہرِ شریعت کہتے ہیں۔ جس نے چلو سے پانی پیا، وہ سیراب ہوا، جس نے اور طرح پیا، وہ پیاسا رہا۔[1] امام قتادہ اور ابن شوذب رحمہما اللہ کا یہی قول ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ چھہتر (۷۶) ہزار نے پیا، فقط چار ہزار ساتھ رہ گئے۔[2]

نصرت کثرت پر موقوف نہیں:

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم چرچا کرتے تھے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی بدر کے دن تین سو دس سے کچھ اوپر تھے۔ اصحابِ طالوت کے اُن ساتھیوں کے برابر تھے، جو اُن کے ساتھ نہر کے پار ہوئے اور مومن کے سوا کوئی پار نہ ہوا۔ (رواہ ابن جریر) اسی کے لگ بھگ بخاری رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔[3] انھوں نے اپنی جماعت کو تھوڑا دیکھ کر ہمت ہاری کہ ہم تھوڑے ہیں اور وہ بہت۔ علما نے ان کو بہادر بنایا، شجاعت دلائی، کہا کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے تم مت ڈرو، فتح تو اللہ کی طرف سے آتی ہے، کچھ کثرتِ عدد اور دشمن پر موقوف نہیں۔

فتح البیان میں کہا گیا ہے کہ طالوت بیت المقدس کی طرف لڑنے کے لیے نکلے، ان کے ساتھ ستر ہزار یا اسی ہزار یا ایک لاکھ بیس ہزار شخص تھے، سوائے بوڑھے بیمار اور معذور کے کوئی ایسا نہ تھا، جو ساتھ نہ ہوا ہو۔ وہ سخت گرمی میں نکلے تھے۔ پانی کی شکایت ہوئی کہ ہمارے ساتھ جو پانی ہے وہ کافی نہیں ہوسکتا، اللہ سے دعا کرو کہ ہمارے لیے ایک نہر جاری کر دے۔ اُردن بیت المقدس کے پاس ایک ریگستان والی جگہ ہے، وہاں وہ نہر تھی۔ آیت سے معلوم ہوا کہ پانی کو بھی طعام کہتے ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سب ہم راہی تین لاکھ تین ہزار تین سو تیرہ تھے، سب نے پانی پیا مگر تین سو تیرہ نے نہ پیا۔ یہی تعداد بدر کے دن نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کی تھی۔[4] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم سے ذکر ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن اپنے اصحاب سے فرمایا کہ تم اصحابِ طالوت کی تعداد کے برابر ہو، جس

---

① تفسیر الطبري (۵/ ۳۴۰، ۳۴۵) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا زمانہ نہیں پایا۔ نیز سند میں ''حسین بن داود'' ضعیف راوی ہے۔

② تفسیر الطبري (۵/ ۳۴۳۔ ۳۴۴)

③ صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۷۴۱) تفسیر الطبري (۵/ ۳۴۶)

④ تاریخ دمشق (۲۴/ ۴۴۲) اس کی سند میں ''جویبر بن سعید'' سخت ضعیف راوی ہے۔

دن ان کا جالوت سے مقابلہ ہوا تھا۔[1] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جالوت کے لوگ ایک لاکھ ہتھیار بند تھے۔[2] مومنین نے یہ بات نہر عبور کرنے کے بعد کہی، جب اپنے مخالفین کی کثرت دیکھی۔ جو عاصی (نافرمان) تھے، وہ تو سرے سے نہر کے پار ہی نہ گئے تھے اور ان کی کثرت کا حیلہ کیا۔ یہ دوسرا قول ہوا کہ اس کلمے کو کہنے والا کون تھا۔[3]

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٥٠﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٥١﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٢٥٢﴾

اور جب وہ جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابلے پر نکلے تو انھوں نے کہا: اے ہمارے رب! ہم پر صبر ڈال دے اور ہمارے قدم جمائے رکھ اور اس کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما﴿250﴾ پس مومنوں نے اللہ کے حکم سے کافروں کو شکست دی اور داود نے جالوت کو قتل کیا اور اللہ نے داود کو بادشاہی اور حکمت عطا کی اور جو چاہا اسے سکھایا اور اگر اللہ انسانوں کے ایک (گروہ) کو دوسرے (گروہ) کے ذریعے سے ہٹاتا نہ رہتا تو یقیناً ساری زمین کا نظام بگڑ جاتا، لیکن اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے﴿251﴾ یہ اللہ کی آیتیں ہیں، ہم حق کے ساتھ آپ پر ان کی تلاوت کرتے ہیں اور بے شک آپ رسولوں میں سے ہیں﴿252﴾

داود علیہ السلام کا جالوت کو قتل کرنا:

تین سو تیرہ آدمیوں میں داود علیہ السلام کے والد، یہ خود اور اُن کے چھے بھائی تھے۔ ان کو راہ میں تین پتھر ملے، بولے کہ ہم کو اُٹھا لو، جالوت کو ہم ماریں گے۔ جب مقابلہ ہوا، جالوت خود باہر نکلا کہ تم سب کو میں کافی ہوں، میرے سامنے آتے جاؤ۔ پیغمبر نے داود علیہ السلام کے باپ کو بلایا کہ اپنے بیٹے مجھے دکھاؤ، اس نے چھے بیٹے دکھائے، جو قد آور تھے۔ داود علیہ السلام کو نہ دکھایا کہ وہ قد آور نہیں تھے اور بکریاں چرایا کرتے تھے۔ پیغمبر نے ان کو بلوا کر پوچھا: کیا تو جالوت کو مارے گا؟ انھوں نے کہا کہ ماروں گا، پھر اس کے سامنے گئے، وہ تین پتھر فلاخن (گھمانی) میں رکھ کر مارے۔ اس کا ماتھا کھلا تھا اور باقی تمام بدن لوہے میں غرق تھا۔ وہ ماتھے پر لگے اور پیچھے سے نکل گئے۔ اس کے بعد

[1] تفسیر الطبري (۷/ ۱۷۱) یہ روایت مرسل ہے۔ [2] تفسیر القرطبي (۳/ ۲٥٤) [3] فتح البیان (۲/ ۷۷۔ ۷۹)

طالوت نے اپنی بیٹی ان کے ساتھ بیاہ دی اور طالوت کے بعد وہ بادشاہ ہوئے۔ نادان لوگ کہتے ہیں کہ لڑائی کرنا نبیوں کا کام نہیں۔ اس قصے سے معلوم ہوا کہ جہاد ہمیشہ رہا ہے۔ الر جہاد نہ ہوتو مفسد لوگ ملک کو ویران کر دیں۔

اس آیت میں یہ فرمایا کہ جب ایمان والے گروہ کا مقابلہ، جو تھوڑے اور اصحابِ طالوت تھے، جالوت کے اصحاب سے ہوا، جو بہت زیادہ تھے تو ایمان والوں نے وہ دعا کی، جس کا آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ نے ان کی سن لی اور ان تھوڑے لوگوں کو ان کثیر پر فتح بخشی۔

داود علیہ السلام پر اللہ کے احسانات اور ان کی برکت:

کہتے ہیں کہ طالوت نے داود علیہ السلام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر تم جالوت کو مار ڈالو گے تو میں اپنی بیٹی تم کو دوں گا۔ اس وعدے کو پورا کیا، پھر انجام کو سارا ملک انہی کے ہاتھ آ گیا، اس پر طرہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت بھی عطا فرما دی۔ حکمت سے مراد وہی نبوتِ عظیمہ ہے، یہ نبوت ان کو شمویل علیہ السلام کے بعد ملی۔ اس پر اللہ کا ایک کرم اور ہوا کہ بعض علومِ خاصہ بھی مرحمت ہوئے۔ جسے پیا چاہے وہی سہاگن۔ اللہ نے جالوت کو طالوت کے مقابلے میں لا کر داود علیہ السلام کی شجاعت سے رفع دفع کیا، اگر ایسا نہ ہوا کرے تو زمین میں بڑی خرابی واقع ہو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴾ [الحج: ٤٠] ”اور اگر اللہ لوگوں میں سے بعض کو بعض کے ذریعے سے دفع نہ کرتا تو بلاشبہ خانقاہیں اور گرجے اور (یہودی) عبادت خانے اور مسجدیں ڈھا دی جاتیں، جن میں اللہ کا نام بکثرت ذکر کیا جاتا ہے۔“

ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ اللہ ایک صالح مسلمان کی وجہ سے سو گھر والوں سے بلا کو ٹال دیتا ہے، جو اُس کے پڑوس میں رہتے بستے ہیں، پھر اس آیت کو پڑھا، مگر یہ اسناد ضعیف ہے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت یہ ہے کہ اللہ ایک صالح مسلمان کے سبب سے اس کی اولاد اور اولاد کی اولاد اور گھر والوں کو اور جو اُس کے گھر کے اردگرد رہتے ہیں، ان سب کو سنوار دیتا ہے، وہ اللہ کی حفاظت میں ہوتے ہیں، جب تک وہ شخص ان کے درمیان ہے۔ یہ حدیث بھی غریب اور ضعیف ہے۔ اس کو ابن جریر رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔[1]

ثوبان رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً بیان کیا ہے کہ تم میں ہمیشہ سات شخص ہوتے ہیں، جن کے سبب سے تمھیں مدد، پانی اور رزق ملتا ہے، جب تک کہ اللہ کا حکم نہ آئے، یعنی قیامت قائم نہ ہو۔[2] (رواہ ابن مردویہ) ان کی دوسری روایت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً اس طرح مروی ہے کہ میری اُمت میں تیس ابدال شخص ہوتے ہیں، انہی کے سبب سے رزق، بارش اور مدد ملتی

---

[1] تفسیر الطبري (٥/ ٣٧٤، ٣٧٥) مذکورہ دونوں روایتوں کی سند میں یحییٰ بن سعید ضعیف راوی ہے۔

[2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٩٦) اس کی سند میں ”علی بن اسماعیل، محمد بن احمد“ مجہول راوی ہیں۔

ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ میں اُمید کرتا ہوں کہ حسن انھیں ابدال میں سے ہے،[1] لیکن یہ احادیث لائقِ غور اور صحت کی محتاج ہیں۔ واللہ أعلم.

فتح البیان میں ہے کہ داود علیہ السلام کے باپ کا نام ایشا یا زکریا ابن بشوی تھا۔ یہ سبط یہوذا ابن یعقوب سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ملک دیا، نبوت دی، باوجود اس کے کہ وہ چرواہے تھے، سب بھائیوں سے چھوٹے تھے۔ بالغ بھی نہ ہوئے تھے، زرد رنگ تھا اور بکری چرایا کرتے۔ یہ نبوت سے پہلے کا ماجرا ہے۔ جب طالوت چالیس برس جی کر فوت ہو گیا تو داود علیہ السلام نے سات برس سلطنت کی، پھر انتقال فرمایا۔ بڑائی اللہ ہی کے لیے ہے، جس کے ملک کو زوال نہیں۔

مَر اُو را رسد کبریا و منی　　　　که ملکش قدیمست وذاتش غنی

''کبریا اور منّان ہونے کا حق خاص اس کو حاصل ہے کہ اس کی بادشاہت قدیم اور اس کی ذات غنی ہے۔''

مفسرین نے اس قسم کے قصے بہت ذکر کیے ہیں۔ اللہ ہی جانے حکمت سے مراد نبوت ہے یا لوہے سے زرہ بنانا، یا چڑیوں کی بولی سمجھنا، یا بہائم (چوپائیوں) کی آواز بوجھنا، یا وہ زنجیر جس کے پاس آ کر نیاوٗ (انصاف) چاہتے تھے۔ سوا داود علیہ السلام کے کوئی ایسا بادشاہ نہ ہوا کہ جس پر بنی اسرائیل نے اتفاق کیا ہو، ورنہ پہلے نبوت ایک سبط میں، جب کہ ملک ایک سبط میں ہوتا تھا۔ اللہ نے ان کو ملک اور نبوت دونوں بخشیں، پھر ان کے بیٹے سلیمان کو بادشاہ بنایا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اللہ نمازی، حاجی، مزکی (زکات دینے والا) کے سبب سے بے نمازی، بے حج، بے زکات سے بلاؤں کو دور کر دیتا ہے۔[2]

آخر آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو تسلی اور تقویت بخشی کہ تم رسول ہو، جو عجیب عجیب خبریں اور قصے بیان کرتے ہو، یہ وحی ہے، تم نے ان کو کسی کتاب میں نہیں پڑھا نہ کسی سے سنا نہ سیکھا۔ تمھاری رسالت پر یہی دلیل ہے۔[3] اس آیتِ کریمہ پر ''سَیَقُوْلُ'' کا دوسرا پارہ تمام ہوا۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ.

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٣٩٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ اس روایت کی نسبت امام طبرانی رحمہ اللہ کی طرف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "عمرو البزار عن عنبسة الخواص و كلاهما لم أعرفه" (مجمع الزوائد: ١٠/ ٤٥، السلسلة الضعيفة، رقم: ٩٣٦)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٤٨٠)　[3] فتح البیان (٢/ ٨١۔ ٨٣)

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

یہ سب رسول ہیں، ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی، ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور ان میں سے بعض کے درجے بلند کیے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو واضح نشانیاں عطا کیں اور روح القدس (جبریل) کے ساتھ اس کی مدد کی اور اگر اللہ چاہتا تو ان (رسولوں) کے بعد آنے والے لوگ باہم نہ لڑتے، جبکہ ان کے پاس واضح نشانیاں آ چکی تھیں، لیکن انھوں نے (باہم) اختلاف کیا، چناں چہ ان میں سے کچھ وہ ہیں جو ایمان لائے اور کچھ وہ ہیں جنھوں نے کفر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ باہم نہ لڑتے، لیکن اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے ﴿253﴾

انبیا میں درجہ بندی:

اس آیت میں اس بات کی خبر دی گئی ہے کہ ہم نے بعض رسولوں کو بعض پر فضیلت دی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴾ [الإسراء: ٥٥] ''اور یقیناً ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی اور ہم نے داود کو زبور دی۔'' جن سے بات کی وہ تین پیغمبر ہیں: آدم، موسیٰ اور محمد علیہم السلام۔

یہ مضمون صحیح ابن حبان میں ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مروی ہے۔[1] جن کے درجے بڑھائے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شبِ معراج میں آسمانوں پر درجہ بہ درجہ بہ حسبِ منازل دیکھا تھا۔ رہی وہ حدیث جو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور جس میں ایک مسلمان اور ایک یہودی کے درمیان موسیٰ علیہ السلام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کے بارے میں سخت کلامی ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر فرمایا کہ تم مجھ کو انبیا پر فضیلت نہ دو، لوگ قیامت کے دن بے ہوش ہوں گے، میں سب سے پہلے ہوش میں آؤں گا، دیکھوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام عرش کا پایہ پکڑ کر کھڑے ہیں، میں نہیں جانتا کہ مجھ سے پہلے ہوش میں آئے یا طور کی بے ہوشی کی مدت اس بے ہوشی کے دورانیے سے نکال لی گئی۔ دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ تم پیغمبروں کے درمیان تفاضل (ایک دوسرے کی فضیلت کا مقابلہ) نہ کرو۔[2] (رواہ الشیخان)

[1] صحيح ابن حبان (٢/ ٧٦) السلسلة الضعيفة (١٩١٠) [2] صحيح البخاري (٣٢٣٣، ١٠) صحيح مسلم (٢٣٧٣)

اس حدیث کے کئی ایک جواب ہیں، ایک یہ کہ یہ ارشاد فضیلت معلوم ہونے سے پہلے تھا، مگر اس میں نظر ہے۔ دوسرا یہ کہ بہ طورِ کسرِ نفسی اور انکسار فرمایا۔ تیسرا یہ کہ تفضیل صرف رائے یا عصبیت سے نہیں دینی چاہیے۔ چوتھا یہ کہ تفضیل کا اختیار اللہ تعالیٰ کو ہے، ہم کو نہیں۔ ہم پر تو فقط تابع داری کرنا، تسلیم کرنا اور ایمان لانا واجب ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ سارے جواب ضعیف ہیں، درست بات اتنی ہے کہ قرآن پاک میں یہ خبر دی گئی ہے کہ بعض انبیا کو بعض پر فضیلت ہے۔ سنت سے یہ معلوم ہوا کہ انبیا میں باہم فضیلت کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے، آیت و حدیث میں باہم کوئی ٹکراؤ نہیں ہے کہ دونوں کو جمع کرنے کی ضرورت ہو۔[1] واللہ أعلم.

فتح البیان میں ہے کہ اس آیت میں رسولوں سے مراد یا تو سارے رسول ہیں یا وہ جن کا اس سورت میں ذکر آیا ہے یا وہ جن کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی۔ تفضیل سے یہ مراد ہے کہ جو کمال کی خوبیاں ایک کو دیں، وہ دوسرے کی کمال کی خوبیوں سے بڑھ کر تھیں، لہٰذا جس میں وہ کمالات زیادہ ہیں، وہ فاضل ہے، دوسرا مفضول ہے۔ قتادہ نے کہا ہے کہ اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو خلیل کیا، موسیٰ علیہ السلام کو کلیم کیا، عیسیٰ علیہ السلام کو آدم کی طرح مٹی سے بنا کر اپنا بندہ، اپنا کلمہ، اپنی روح ٹھہرایا، داود علیہ السلام کو زبور دی، سلیمان علیہ السلام کو عظیم الشان بادشاہت بخشی، جو اُن کے بعد پھر کسی کو نہ بخشی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اگلے پچھلے سارے گناہ بخش دیے۔[2] امام خازن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اُمت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم افضل الانبیا ہیں، کیوں کہ آپ کی رسالت عام ہے: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ﴾ [سبا: ٢٨] ''اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہی بنا کر بھیجا ہے۔''[3] اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے بلا واسطہ طور پر اور ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شبِ معراج میں کلام کیا۔ حدیث میں مروی ہے کہ آدم علیہ السلام نبیِ مکلم تھے۔[4]

درجات سے مراد اللہ کے پاس عظمت و منزلت ہے، یا صاحبِ درجات سے مراد ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، یا مراد ادریس علیہ السلام ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴾ [مریم: ٥٧] ''اور ہم نے اسے بہت بلند مقام پر اُٹھایا۔'' یا مراد اولوا العزم ہیں، یا ابراہیم علیہ السلام ہیں، لیکن بات یہ ہے کہ اللہ نے اس بعض کو، جس کے درجے بلند رکھے، مبہم رکھا ہے، ہمیں قرآن و سنت کی دلیل کے بغیر اس سے تعرض نہیں کرنا چاہیے، لہٰذا ان دونوں میں کسی خاص کو بلند کرنے کی دلیل نہیں آئی۔ جب نہیں آئی اور ہم نے اس سے تعرض کیا تو یہ تفسیر بالرائے ٹھہری اور ایسی تفسیر پر سخت وعید آئی ہے، ایسی تفسیر فضیلت دینے کے لیے وسیلہ ہے اور فضیلت دینے کی ممانعت ہے۔

فتح القدیر میں کہا ہے کہ بہت سے ائمہ تفسیر نے یقینی انداز میں کہا ہے کہ ''بعض بلند کیے گئے'' سے مراد ہمارے

---

[1] فتح القدير (١/ ٤٦٠۔ ٤٦١)
[2] تفسير الطبري (١٧/ ٤٧٠) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٨٢۔ ٤٨٣)
[3] تفسير الخازن (١/ ٢٦٥)
[4] صحيح ابن حبان (١٤/ ٦٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٦٦٨)

رسول ﷺ ہیں۔ اس کی دلیل یہ دی ہے کہ اللہ نے ان کے معجزات کو کمال کی خوبیاں اور فضیلت کی عادات اور خصلتیں بخشی ہیں۔ مگر یہ دلیل مطلوب پر دلالت نہیں کرتی ہے، بلکہ اس تفسیر میں دو خطرے ہیں: ایک تو تفسیر بالرائے ہونا، دوسرے ذرائع تفضیل میں داخل ہونا۔ مانا کہ یہ واضح تفضیل نہیں ہے، لیکن بلاشک یہ اس کا ایک ذریعہ ہے، کیوں کہ جس کو یہ یقین ہوگا کہ بعض مرفوع، یعنی بلند کیے گئے سے مراد فلاں پیغمبر ہے، وہ انبیا کی تفضیل کی طرف ضرور جائے گا، حالاں کہ ان کا مقابلہ کرنا منع ہے۔ ہمارے نبی مکرم ﷺ کو اللہ نے اس بات سے بے نیاز رکھا ہے، کیوں کہ اور فضائل اور مناقب کیا کم ہیں، جو وہ اس کے محتاج ہوں۔ پھر جس بات سے نبی اکرم ﷺ نے منع کیا ہے، ہم کو اُس میں گھسنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم یہ سمجھ رہے ہوں کہ ہم مطیع اور محسن ہیں، جبکہ درحقیقت ہم گناہ گار اور خطا کار ہوں۔[1]

”بَيِّنٰت“ سے اس جگہ مراد واضح حجتیں اور پختہ دلیلیں ہیں، جو عیسیٰ بن مریم کو دی گئیں، جیسے: مردوں کا زندہ کرنا، بیماروں کو اچھا کرنا۔ روح القدس سے مراد جبرائیل ہیں، وہ ہر جگہ عیسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ رہا کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ نے ان کو ساتویں آسمان پر اُٹھا لیا۔ یہاں اقتتال (لڑائی) سے مراد اختلاف ہے، یعنی اگر اللہ چاہتا تو سب کے سب متفق رہتے، اختلاف نہ ہوتا، لیکن اللہ نے اختلاف چاہا، اس لیے مختلف ہوگئے، کوئی ایمان لایا، کوئی دیدہ و دانستہ کافر ہوا۔ جس طرح نصاریٰ مسیح کے بعد کافر ہوگئے، لیکن ارادہ اللہ کا ہوتا ہے، کسی اور کا نہیں، جسے چاہے توفیق بخشے اور جسے چاہے رسوا کر دے۔

ایک شخص نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قضا و قدر کا مسئلہ پوچھا تو انھوں نے کہا: یہ ایک اندھیرا راستہ ہے تو اس میں نہ چل۔ پھر پوچھا تو کہا کہ یہ ایک گہرا دریا ہے تو اس میں نہ گھس۔ پھر پوچھا تو کہا: یہ اللہ کا ایک بھید ہے، جس کو تجھ سے پوشیدہ رکھا گیا ہے تو اس کی کرید نہ کر۔[2]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۲۵۴

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ہم نے تمھیں جو کچھ دیا اس میں سے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ کوئی دوستی اور نہ سفارش ہی کام آئے گی اور کفر کرنے والے ہی ظالم ہیں (254)

---

[1] فتح القدير (١/ ٤٦٢)

[2] تاريخ دمشق لابن عساكر (٤٢/ ٥١٢۔ ٥١٣) اس کی سند میں ”حارث الاعور“ متروک ہے۔ فتح البيان (٢/ ٨٣۔ ٨٧)

اللہ کی راہ میں خرچ کا وقت:

یعنی عمل کا وقت ابھی ہے، آخرت میں نہ عمل بکتے ہیں نہ کوئی آشنائی سے کچھ دیتا ہے اور نہ کوئی سفارش سے چھڑا سکتا ہے، جب تک پکڑنے والا نہ چھوڑے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ حکم دیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں، اچھے کاموں میں اور ثواب کی باتوں میں اپنا مال خرچ کرو۔ دنیا کی زندگی میں جلدی سے یہ خرچ کرلو، ورنہ قیامت میں نہ مال کام آئے گا نہ دوستی اور نہ حسب ونسب، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ﴾ [المؤمنون: ۱۰۱] ''پھر جب صور میں پھونکا جائے گا تو اس دن نہ ان میں رشتے داریاں رہیں گی اور نہ وہ باہم سوال کریں گے۔'' نہ کسی کی سفارش چلے گی: ﴿ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴾ [المدثر: ۴۸] ''پھر سفارشیوں کی سفارش انھیں نفع نہ دے گی۔'' اس ارشاد کا مطلب کہ ''کافر ظالم ہیں'' یہ ہے کہ اس دن سب سے بڑھ کر وہی شخص ظالم ہوگا، جو اللہ سے کافر ہو کر ملے گا۔ عطا بن دینار رحمہ اللہ کا قول ہے: اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے یوں فرمایا ہے: ''کافر ظالم ہیں'' یوں نہیں فرمایا کہ ''ظالم کافر ہیں۔''[1]

فتح البیان میں ہے کہ بعض کے نزدیک اس جگہ خرچ کرنے سے مراد صدقۂ فطر ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت فرض اور نفلی زکات دونوں کو شامل ہے۔ ابن عطیہ نے کہا کہ یہی صحیح ہے، لیکن قتال کا ذکر جو اوپر گزرا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مراد فی سبیل اللہ خرچ ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس تاویل پر کبھی خرچ کرنا واجب ٹھہرے گا کبھی مستحب۔ یعنی کسی غزوے کے مخصوص ہو جانے پر واجب ہوگا اور جب غزوہ متعین نہیں ہوگا تو مستحب ہوگا۔[2] مگر آیت کا ظاہر وجوب کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس آیت میں شفاعت کی عام نفی فرمائی ہے، مگر جس کے لیے اللہ تعالیٰ اجازت دے گا اس کی شفاعت ہوگی، کیوں کہ اللہ کی اجازت سے مومنین کے درمیان شفاعت اور دوستی کے ثبوت کی دلیلیں نصوص میں موجود ہیں۔ لہٰذا یہ آیت عام مخصوص ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر کافر اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہے، اس میں مانعِ زکات بھی داخل ہے، جبکہ اس منع پر کفر لازم آتا ہے، اسی لیے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعینِ زکات کے خلاف جہاد کیا تھا، خرچ کرنے کے ضمن میں زکات کی مثل بھی شامل ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (٥/ ٣٨٥) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٨٥)

[2] تفسير القرطبي (٣/ ٢٦٦) فتح البيان (٢/ ٨٨)

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ۚ لَا تَاۡخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوۡمٌ ؕ
لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا
بِاِذۡنِهٖ ؕ یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ ۚ وَلَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ
مِّنۡ عِلۡمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرۡسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ ۚ وَلَا
یَـُٔوۡدُهٗ حِفۡظُهُمَا ۚ وَهُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ ﴿۲۵۵﴾

وہ اللہ ہے، اس کے سوا کوئی (سچا) معبود نہیں، زندہ ہے، سب کو سنبھالے ہوئے ہے، اسے اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، سب اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟ وہ جانتا ہے جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کو اپنے احاطے میں نہیں لا سکتے، سوائے اس بات کے جو وہ چاہے۔ اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو گھیر رکھا ہے، اور اسے ان دونوں کی حفاظت تھکاتی نہیں اور وہ بلند تر، نہایت عظمت والا ہے (255)

آیت الکرسی کی فضیلت:

آیت الکرسی کی بڑی شان ہے۔ مرفوع حدیث میں مروی ہے کہ کتاب اللہ میں یہ افضل آیت ہے۔ سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کونسی آیت اللہ کی کتاب میں سب سے زیادہ عظمت والی ہے؟ تو انھوں نے کہا: اللہ اور اس کے رسول کو معلوم ہوگا۔ جب بار بار پوچھا تو انھوں نے کہا: آیت الکرسی۔ فرمایا: تجھ کو علم مبارک ہو۔ اے ابومنذر! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اس آیت کی ایک زبان اور دو منہ ہیں، یہ مالک کی تقدیس کرتی ہے، عرش کی جڑ کے پاس۔ (رواہ أحمد) اس کو مسلم نے بھی روایت کیا ہے۔[1]

عبداللہ بن اُبی بن کعب رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ ان کے والد نے ذکر کیا کہ ان کا ایک کمرہ تھا، جس میں وہ کھجوریں رکھتے تھے، دیکھا وہ کھجوریں کم ہوتی جا رہی ہیں، تو ایک شب اس کی چوکیداری کی تو ایک جوان لڑکے کے برابر ایک جان دار دیکھا، اس کو سلام کیا، اس نے جواب دیا، تو پھر پوچھا: تو انسان ہے یا جن؟ اس نے کہا: جن۔ تو انھوں نے کہا: ذرا ہاتھ دو، تو اس نے ہاتھ دیا، وہ کتے کا سا ہاتھ تھا، اس پر بال تھے۔ تو انھوں نے پوچھا: کیا جن اسی طرح کے ہوتے ہیں؟ تو اس نے کہا: سارے جن جانتے ہیں کہ ان میں مجھ سے زیادہ سخت کوئی نہیں ہے۔ میں نے کہا:

[1] مسند أحمد (٥/ ١٤١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨١٠)

تم نے یہ کام کیوں کیا؟ کہا: میں نے سنا کہ تم صدقے کو دوست رکھتے ہو، اس لیے ہم نے چاہا کہ ہم بھی کچھ تمھارے طعام میں سے لے جائیں۔ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: ہمیں تم سے کون سی چیز پناہ میں رکھ سکتی ہے؟ تو اس نے کہا: یہی آیت الکرسی۔ ابی رضی اللہ عنہ نے صبح جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ذکر کیا، فرمایا: اس خبیث نے سچ کہا۔ (رواہ أبو یعلیٰ) حاکم نے مستدرک میں کہا: یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔ شیخین نے اس کو روایت نہیں کیا۔[1] سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیت الکرسی کو چوتھائی قرآن فرمایا ہے۔[2] (رواہ أحمد بطولہ)

اس آیتِ مبارکہ کا اسمِ اعظم ہونا کئی حدیثوں میں متعدد طرق سے مروی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان کو ذکر کیا ہے۔ ابو ایوب رضی اللہ عنہ کے کمرے سے ایک غول (جن) آ کر غلہ لے جاتا تھا، دو مرتبہ اس کو پکڑا، پھر چھوڑ دیا، تیسری بار اس نے کہا: تم مجھے چھوڑ دو، میں تمھیں ایسی چیز بتاتا ہوں کہ پھر کوئی چیز تمھارے پاس نہیں آئے گی، وہ چیز آیت الکرسی ہے۔ جب نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو فرمایا: اس نے سچ کہا اور وہ خود جھوٹا ہے۔ (رواہ أحمد) امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: "غول" لغتِ عرب میں اس جن کو کہتے ہیں، جو رات کو ظاہر ہو۔[4] اس کو بخاری نے بھی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے کتاب "فضائل القرآن" اور "کتاب الوکالة" میں صفتِ ابلیس کے تحت مکمل طور پر روایت کیا ہے۔[5]

ایک شیطان ان کا کھانا بھی لے جاتا تھا، تیسری بار ان سے کہہ گیا کہ جب تم بستر پر سونے کے لیے جاؤ تو پوری آیۃ الکرسی پڑھو، اللہ کی طرف سے ایک محافظ تم پر رہے گا۔ شیطان تمھارے پاس نہ پھٹکے گا۔ انھوں نے یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « أما إنه صدق وهو كذوب »[6] یعنی "ہے تو وہ جھوٹا، مگر سچ بول گیا۔" اس کو بخاری نے جزم کے لفظ کے ساتھ تعلیقاً ذکر کیا ہے۔ ابن مردویہ بھی اس کے راوی ہیں، مگر ایک اور طریق سے اس میں آخری الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ ذٰلِكَ كَذٰلِكَ » یعنی یہ آیت ویسی ہی ہے، جیسا اس شیطان نے تجھ سے کہا، کیا تم نہیں جانتے۔ اس کو نسائی نے بھی مکمل روایت کیا ہے۔[7] غرض کہ یہ تین واقعات ایک ہی طرح کے ہوئے۔

ابو عبیدہ نے "کتاب الغریب" میں اپنی سند سے ایک چوتھا قصہ ذکر کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایک آدمی نکلا، اس کی ملاقات ایک جن سے ہوئی، جن نے اس سے کہا: اگر تو مجھ کو پچھاڑ دے تو میں تجھ کو ایک ایسی

---

① مستدرك الحاكم (١/ ٧٤٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٢٤٥)

② مسند أحمد (٣/ ٢٢١) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٤٨٤) اس کی سند میں "سلمہ بن وردان" ضعیف ہے۔

③ مسند أحمد (٥/ ٤٢٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٨٠) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٨٩)

④ تفسير ابن كثير (١/ ٤٠٠)

⑤ صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٢٣، ٢١٨٧)

⑥ صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٨٧)

⑦ سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٢٣٨)

آیت سکھاؤں گا کہ جب تو اس کو پڑھ کر گھر میں جائے تو کوئی شیطان اس گھر میں نہیں جا سکے گا۔ کشتی ہوئی، اس آدمی نے اس جن کو پچھاڑ دیا، تو اس آدمی نے کہا تو نحیف وضعیف ہے، تیرے بازو ایسے ہیں، جیسے کتے کے ہوتے ہیں، کیا تم سب جن اسی طرح کے ہوتے ہو یا خاص تمھی ایسے ہو؟ اس جن نے کہا: میں ان سب میں قوی ہوں، پھر لڑو۔ پھر کشتی ہوئی، پھر اس نے اس جن کو پچھاڑ دیا۔ اس پر جن نے کہا: تم آیت الکرسی پڑھا کرو، تمھارے پاس کوئی نہیں پھٹکے گا، جب گھر میں جاؤ گے تو شیطان گدھے کی طرح ہوا خارج کرتا بھاگے گا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا: وہ (جن سے لڑنے والا) آدمی عمر رضی اللہ عنہ ہوں گے؟ کہا: وہ نہیں تو اور کون۔[1]

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ سورت بقرہ میں ایک آیت ہے، جو سب آیتوں کی سردار ہے، وہ جس گھر میں پڑھی جاتی ہے، وہ (جن) وہاں سے نکل بھاگتا ہے۔ وہ آیت الکرسی ہے۔ (رواہ الحاکم) اس کو حاکم نے دو طریق سے روایت کیا ہے اور صحیح الاسناد بتایا ہے۔[2] سنن الترمذی میں ان الفاظ کا اضافہ ہے کہ ہر چیز کی ایک کوہان ہوتی ہے، قرآن کی کوہان سورت بقرہ ہے، اس میں ایک آیت ہے، جو سب آیتوں کی سردار ہے، وہ آیۃ الکرسی ہے، پھر اس کو غریب کہا ہے، اس کی سند میں ''حکیم بن جبیر'' ضعیف ہیں۔[3]

آیت الکرسی میں اسم اعظم:

اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے: ان دو آیتوں: ﴿ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ﴾ (آیت زیر تفسیر) ''اس کے سوا کوئی (سچا) معبود نہیں، وہ زندہ ہے سب کو سنبھالنے والا ہے۔'' اور ﴿ الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۝ ﴾ [آل عمران: ۱۔ ۲] ''الٓمّٓ۔ وہ اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے، سب کو سنبھالنے والا ہے۔'' میں اسم اعظم ہے۔ (رواه أحمد و أهل السنن) ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔[4]

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ اللہ کا اسم اعظم کہ جب اس نام کو لے کر دعا کریں تو دعا قبول ہوگی، تین سورتوں: سورت بقرہ، سورت آل عمران اور سورت طٰہٰ میں ہے۔[5] ابن عمار

---

[1] غريب الحديث (٣/ ٣١٦) الفائق في غريب الحديث (٢/ ٣٢٥)

[2] مستدرك الحاكم (١/ ٧٤٨، ٢/ ٢٨٥) اس کی سند میں ''حکیم بن جبیر اسدی'' ضعیف راوی ہے۔

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٧٨)

[4] مسند أحمد (٦/ ٤٦١) البتہ سنن ابی داود، سنن الترمذی، سنن ابن ماجہ میں صحیح سند کے ساتھ روایت کچھ یوں ہے۔ اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان دو آیتوں میں اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے: ﴿ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۝ ﴾ [البقرة: ١٦٣] اور سورت آل عمران کے شروع میں: ﴿ الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۝ ﴾ سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٩٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٧٨) سنن ابن ماجه (٣٨٥٥) صحيح الجامع (٩٨٠)

[5] المعجم الكبير (٨/ ٢٣٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٩٧٩)

خطیب دمشق نے کہا: سورت بقرہ و آل عمران میں تو وہی ہیں جو اوپر گزرے، طٰہٰ میں یہ ہے: ﴿ وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ﴾ [طٰہٰ: ۱۱۱] ''اور سب چہرے حَی قیوم (اللہ) کے آگے جھک جائیں گے۔'' سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے دوسرے الفاظ اس طرح ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھی تو اس کو جنت میں داخل ہونے میں موت کے سوا کوئی چیز مانع نہیں۔[1] (رواہ ابن مردویه والنسائي في عمل الیوم واللیلة و ابن حبان في صحیحه)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: یہ اسناد شرطِ بخاری پر ہے۔ ابن الجوزی نے اس کو موضوع حدیث سمجھا ہے۔[2] واللہ أعلم. اس روایت کے قریب قریب اس کو امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے بھی علی و مغیرہ و جابر رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے، مگر ہر سند ضعیف ہے۔[3] غرضیکہ آیت الکرسی کی فضیلت میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں، ان سب کو اس جگہ عدمِ صحت اور ضعفِ اسناد کی وجہ سے ذکر نہیں کیا گیا۔

آیت الکرسی دس جملوں پر مشتمل ہے:

اس آیت پاک میں دس جملے مستقل ہیں: ﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ یہ اس بات کی خبر ہے کہ تمام مخلوقات کی الٰہیت کے لائق صرف ایک ہستی ہے اور وہ معبود مطلق رب برحق ہے۔ حی وہ ہے، جو کبھی نہ مرے۔ قیوم وہ ہے، جو دوسروں کو تھامے اور قائم رکھے۔ عمر رضی اللہ عنہ قیوم کے بجائے قیام پڑھتے تھے، ساری مخلوقات اس کی محتاج ہیں، وہ سب سے غنی ہے، کسی چیز کا قوام و قیام اس کے حکم کے بغیر نہیں ہوسکتا، جیسے اس کا فرمان ہے: ﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ﴾ [الروم: ۲۵] ''اور (یہ بھی) اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔'' پوری قیومیت یہ ہے کہ نہ اونگھ آئے نہ نیند پکڑے، یعنی نقص و غفلت اور بھول کا وہاں گزر ہی نہیں ہے، بلکہ وہ ہر شے پر قائم اور ہر نفس جو کماتا ہے، اس پر شاہد ہے۔ کیا مجال ہے کہ کوئی چیز اس کے علم سے چھپ سکے یا کوئی پوشیدہ بات اس پر مخفی رہ جائے۔ اونگھ کے بعد نیند کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ نیند اونگھ سے زیادہ بڑی ہے، یعنی نہ ذرا سی غفلت نہ بہت سی۔

سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے صحیح میں مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے درمیان کھڑے ہو کر چار باتیں فرمائیں، کہا: اللہ سوتا نہیں، اس کو سونا زیب ہی نہیں دیتا۔ قسط، یعنی ترازو کو نیچا اونچا کرتا ہے۔ دن کا عمل رات سے پہلے اور رات کا عمل دن سے پہلے اس کے پاس جاتا ہے۔ اس کا پردہ نور ہے یا نار ہے، اگر وہ اس پردے کو کھول دے تو اس کے منہ کے انوار تا حدِ نگاہ ساری مخلوق کو جلا دیں۔[4]

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے   پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

---

[1] عمل الیوم واللیلة (۱/ ۱۸۲) المعجم الکبیر (۸/ ۱۱۴) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۹۷۲)

[2] الموضوعات (۱/ ۲۴۴) لیکن یہ درست نہیں، بلکہ یہ حدیث صحیح ہے۔

[3] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۴۰۲)

[4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷۹)

﴿ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ (آیت زیر تفسیر) ''اسی کا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔'' میں اس بات کی خبر ہے کہ سب اسی کے بندے ہیں، اسی کی ملکیت ہیں، اسی کے قہر کے نیچے ہیں۔ جیسے اس کا فرمان ہے: ﴿ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۝ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۝ ﴾ [مریم: ۹۳۔ ۹۵] ''آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہیں، وہ سب رحمٰن کے پاس غلام بن کر آئیں گے۔ بلاشبہ یقیناً اس (رحمٰن) نے ان کا شمار کر رکھا ہے اور انھیں خوب گن رکھا ہے۔ اور وہ سب یوم قیامت اللہ کے پاس تنہا تنہا آئیں گے۔'' اس میں بعض ستاروں کی پرستش کرنے والے مشرکین کا رد ہے اور ان مشرکین کا بھی، جو زمینی بتوں کی عبادت کرتے ہیں، یعنی جب یہ سب مخلوق ملکیت ٹھہری تو یہ معبود ہونے کے لائق کب ہو سکتے ہیں۔

تاچند گہ از چوب گہ از سنگ تراشی بگزار خدائے کہ بصد رنگ تراشی

''تو کب تک کبھی لکڑی کبھی پتھر تراشتا رہے گا؟ اس خدا کو چھوڑ دے، جس کو تو نے سو رنگوں سے تراشا ہے۔''

شفاعت کے لیے اذنِ الٰہی:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ﴾ یہ ارشاد کہ کون اس کے پاس شفاعت کر سکتا ہے مگر اس کے اذن سے، اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ۝ ﴾ [النجم: ۲۶] ''اور آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے ہیں، جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں دے گی، مگر بعد ازاں کہ اللہ اجازت دے، جس کے لیے چاہے اور پسند کرے۔'' یہ اللہ کا جلال اور کبریائی ہے کہ کوئی اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش و شفاعت کی جرأت و طاقت نہیں رکھتا، جس طرح حدیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں عرش کے نیچے آ کر سجدے میں گر پڑوں گا، اللہ جب تک چاہے گا، مجھ کو پڑا رہنے دے گا، پھر کہا جائے گا: سر اُٹھاؤ، تمھاری بات سنی جائے گی، تم شفاعت کرو تمھاری شفاعت قبول ہوگی۔ فرمایا: ((فَيَحُدُّ لِيْ حَدًّا)) یعنی میرے لیے ایک حد مقرر ہوگی، میں ان کو بہشت میں لے جاؤں گا۔''[1] شفاعت کی یہ تفصیل حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھی ہے۔[2] معلوم ہوا شفاعت اجازت کے بغیر نہیں ہوگی۔ یہ کسی کو معلوم نہیں کہ اجازت کس کے لیے ہوگی اور کس کے لیے نہیں ہوگی۔ اجمالاً اتنا معلوم ہے کہ اہلِ کبائر کے لیے شفاعت ہوگی۔

بدعقیدہ مسلمانوں کی شفاعت کا مسئلہ:

البتہ یہ کہیں نہیں آیا کہ کفر اور شرک کرنے والوں کی بھی شفاعت ہوگی، بلکہ ان کے لیے تو یہ آیا ہے کہ ان کی شفاعت نہیں ہوگی۔ جو نام کے مسلمان قبر پرستی، پیر پرستی، مجتہد پرستی، رائے پرستی، قیاس پرستی اور اعتقادِ فاسد میں گرفتار

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۶۱۹۷) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۹۳)
[2] تفسیر ابن کثیر (۱/ ٤٠٤)

ہیں، اولیاء اللہ کو زندگی میں اور موت کے بعد بھی متصرف (بااختیار) جانتے ہیں، وہ مشرک ہیں۔ ان کا یہ گھمنڈ کہ ہمیں ہمارے پیر، فقیر، مرشد، دستگیر شفاعت کر کے بخشوا لیں گے، یہ محض ان کی ایک جھوٹی آرزو ہے۔ پیر تو خود شفاعت کے آرزومند اور متلاشی ہوں گے، کجا شفاعت کرنا۔ شفاعت تو محدود طور پر اہلِ معصیت کے لیے ہے، ان بدعقیدہ لوگوں کے لیے نہیں ہے، جو غیر اللہ کو مانتے ہیں، کسی کے نام پر جانور ذبح کرتے ہیں۔ کسی کی نذر لاتے ہیں، کسی کو شفا دینے والا سمجھتے ہیں، کسی کو اولاد دینے والا یا حاجت روا جانتے ہیں۔ اللہ نے پہلے سے یہ خبر دے دی ہے کہ اول تو کسی کی کیا مجال ہے کہ وہ اللہ کی مرضی کے خلاف شفاعت کرے، پھر جس کی شفاعت قابلِ سماعت ہوگی، اس کے لیے اللہ کی اجازت ضروری ہے، اذن اللہ کے اختیار میں ہے نہ کہ سفارش کرنے والے کے اختیار میں۔ پھر اجازت کے بعد ایک حد مقرر ہوگی، کس کی مجال ہے کہ اس حد سے آگے بڑھے۔

فتح البیان میں لکھا ہے کہ اس استفہام (سوال) میں کہ ''کون شخص اللہ سے سفارش کر سکتا ہے، مگر اس کے اذن سے؟'' اس شخص کی تردید ہے، جس کو یہ گمان ہے کہ کوئی بندہ کسی کو نفع پہنچانے کے لیے شفاعت، سفارش اور سعی و کوشش کی قدرت رکھتا ہے۔ اس استفہام میں وہ دھمکی دی گئی ہے، جس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قبروں کی پرستش کرنے والوں کے سینوں میں ایک ایسا دھکا دیا ہے، ان کے منہ پر ایک ایسا طمانچہ مارا ہے، ان کے بازو پر ایک ایسا ٹھونسا جمایا ہے کہ جس کی انتہا نہیں۔

جو بات اس آیت سے سمجھی گئی، وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے جو اس آیت: ﴿ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى ﴾ [الأنبياء: ٢٨] سے ظاہر ہوتی ہے یا اس آیت سے: ﴿ لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ ﴾ [النبأ: ٣٨] ''اس سے صرف وہی کلام کر سکے گا جسے رحمٰن اجازت دے گا۔'' پہلا فائدہ کثیر درجات کی وجہ سے بلند مقام پر ہے۔ صحیح احادیث میں شفاعت کی قسمیں اور کس کس کی شفاعت ہوگی اور کون اذن کے بعد شفاعت کرے گا، ثابت ہے۔[1]

اللہ کا علم:

﴿ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ﴾ اس ارشاد سے کہ ''اللہ کو آگے اور پیچھے کا سب حال معلوم ہے۔'' یہ بات ثابت ہوئی کہ اس کا علم تمام کائنات کو گھیرے ہوئے ہے، وہ ماضی کا زمانہ ہو، حاضر ہو یا مستقبل کا زمانہ ہو، جیسے اس کا قول ہے: ﴿ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴾ [مريم: ٦٤] ''اور ہم (فرشتے) آپ کے رب ہی کے حکم سے نازل ہوتے ہیں، اسی کے لیے ہے جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے، اور جو کچھ اس کے درمیان ہے، اور آپ کا رب کبھی بھولنے والا نہیں۔''

---

[1] فتح البیان (٢/ ٩١)

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: آگے اور پیچھے سے مراد دنیا اور آخرت ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی وہ عمل جو برباد کیے اور وہ عمل جو آگے بھیجے۔[2] اس آیت میں ان فلسفیوں کا رد ہے، جو اللہ تعالیٰ کے علم جزئیات کی نفی کرتے ہیں، حالانکہ علم کی صفت تو تمام صفتوں کی سردار ہے۔ اگر کوئی کالی چیونٹی اندھیری رات میں زمین کی تہہ میں کسی ٹھوس پتھر پر چلتی ہے یا کوئی ذرہ آسمان اور زمین کے درمیان حرکت کرتا ہے یا کوئی پرندہ ہوا میں پَر مارتا ہے تو وہ اس عالم الغیب و الشہادۃ کو معلوم ہے۔ کسی کو کیا طاقت ہے کہ وہ کسی شے کو اللہ کے علم سے گھیر سکے، مگر جتنا اس نے بتا دیا، جتلا دیا اور انبیا اور رسولوں کے ذریعے سے سکھلا دیا اور وہ بھی ان کی نبوت کی دلیل کے لیے نہ کہ اس لیے کہ وہ بات ان کے اختیار اور قدرت میں ہے۔

اللہ کی واجبی صفات میں کسی کو شریک کرنا کفر ہے۔ شرک کی قسمیں کتاب "تقوية الإيمان" (تالیف: شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ) اور کتاب "دینِ خالص" (نواب صاحب کی تالیف) میں یکجا کر کے لکھ دی گئی ہیں۔ شرک جس طرح عبادت میں ہوتا ہے، اسی طرح عادت میں ہوتا ہے۔ شرک بڑا ہو یا چھوٹا، کھلا ہو یا چھپا ہوا، ہرگز بخشا نہ جائے گا۔ شرک علم میں ہو یا اختیار میں یا کسی اور صفت میں۔ یا یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں سے کسی چیز کے علم کے بارے میں اتنی ہی آگاہی رکھتے ہیں، جتنی آگاہی اس نے دی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ﴾ [طٰہٰ: ١١٠] "اور وہ (لوگ) اپنے علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔"

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس جگہ کرسی سے مراد علم ہے،[3] یعنی اس کا علم آسمان و زمین کو شامل ہے۔ یہی قول سعید بن جبیر کا بھی ہے۔ دیگر مفسرین کا قول ہے کہ کرسی دونوں قدموں کی جگہ ہے۔ ابو موسیٰ، سدی، ضحاک اور مسلم بطین اسی طرف گئے ہیں۔[4] نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: کرسی کیا ہے؟ فرمایا: موضع القدمین (دو قدموں کی جگہ) ہے۔ عرش کی مقدار اللہ کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ اس کو امام حاکم رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے موقوفاً روایت کیا ہے۔[5]

امام ابو مالک رحمہ اللہ نے کہا: کرسی عرش کے نیچے ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ آسمان اور زمین کرسی کے اندر ہیں، کرسی عرش کے سامنے ہے۔[6] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اگر ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کو پھیلا کر ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر رکھیں، پھر بھی وہ کرسی کی وسعت کو نہیں پہنچ سکیں گے، وہ ایسے لگیں گے، جیسے کسی جنگل میں ایک حلقہ پڑا ہو۔[7] امام ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ میرے والد کہتے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ساتوں

---

[1] تفسير الطبري (٥/ ٣٩٦) [2] تفسير الطبري (١٨/ ٤١٩) [3] تفسير الطبري (٥/ ٣٩٧) اس کی سند حسن ہے۔
[4] تفسير الطبري (٥/ ٣٩٨) [5] مستدرك الحاكم (٢/ ٣١٠) امام حاکم اور ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔
[6] مستدرك الحاكم (٢/ ٤٩١) [7] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٩١) اس کی سند میں "بشر بن عمارۃ" ضعیف راوی ہے۔

آسمان کرسی کے اندر ایسے ہیں، جیسے ایک ڈھال کے اندر کوئی سات درہم رکھ دے۔[1] (رواہ ابن جریر) سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت یہ ہے کہ عرش میں کرسی اس طرح ہے جیسے لوہے کا ایک چھلہ جنگل میں پڑا ہو، کرسی کے مقابلے میں عرش کی بڑائی ایسے ہے، جیسے جنگل کی اس چھلے پر۔[2] (رواہ ابن مردویہ)

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک عورت نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ اللہ سے دعا کریں کہ مجھے جنت میں لے جائے۔ آپ ﷺ نے اللہ کی عظمت بیان کر کے فرمایا کہ اسی کی کرسی آسمان و زمین کو سمائے ہوئے ہے، وہ کرسی چرچراتی ہے، جیسے نیا پالان بوجھ سے چرچراتا ہے۔[3] (رواہ أبو یعلیٰ و البزار و عبد بن حمید و ابن جریر و الطبراني و ابن أبي عاصم و الضیاء في المختارۃ) پھر کسی نے اس کو موقوفاً اور کسی نے مرسلاً کسی نے کم و بیش روایت کیا ہے۔ اس سے زیادہ غریب وہ حدیث ہے جس کو ابو داود رحمہ اللہ نے صفتِ عرش میں جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے ذکر کیا ہے۔[4] ابن مردویہ رحمہ اللہ کے پاس بریدہ و جابر وغیرہما رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث آئی ہیں، جن میں قیامت کے دن فیصلے کرنے کے لیے کرسی کے رکھے جانے کا ذکر ہے، مگر ظاہر یہ ہے کہ اس حدیث میں وہ کرسی مراد نہیں ہے، وہ اور کرسی ہوگی۔

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ کرسی سے مراد وہ جسم ہے، جس کا ذکر حدیثوں میں مروی ہے۔ معتزلہ کی ایک جماعت نے اس کا انکار کیا ہے، یہ ان کی واضح اور فاش غلطی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ راجح یہ ہے کہ کرسی سے مراد علم ہے، اسی لیے علما کو "کراسی" کہتے ہیں اور کتاب کے حصوں کو جن میں علم ہوتا ہے "کراریس" جمع "کراسہ" بولتے ہیں۔[5] قاموس میں اس طرح ہے کہ کرسی کاف کے پیش کے ساتھ اور زیر کے ساتھ بمعنی سریر (تخت) و علم ہے۔ کسی نے کہا: کرسی اللہ کی قدرت ہے، جو آسمان و زمین کو تھامے ہوئے ہے۔ بعض نے کہا: کرسی سے مراد عرش ہے۔ بعض نے کہا: کرسی عظمت کے بیان کے لیے ایک تصویر ہے، حقیقت نہیں ہے۔ امام تفتازانی رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔[6] امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: وہ تو نری تمثیل ہے۔[7] کسی نے کہا کہ بادشاہ کے ملک سے عبارت ہے، مگر حق بات وہی پہلا قول ہے کہ کرسی جسم ہے، جس کی صفت احادیث میں آئی ہے۔ حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی معنی کی طرف جانا ایک معلول رائے ہے، جو فلسفیوں کے گمراہ کن خیالات سے پیدا ہوئی ہے۔ اللہ ان کو غارت کرے![8]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ بعض مسلمان متکلمین ہیئت دانوں کا خیال ہے کہ کرسی آٹھواں آسمان ہے، جس کو فلکِ ثوابت کہتے ہیں کہ اس کے اوپر فلکِ نہم ہے، جس کو فلکِ اثیر اور فلکِ اطلس کہتے ہیں۔ کچھ نے ان کی تردید

---

① تفسیر الطبري (٥/ ٣٩٩) ② تفسیر الطبري (٥/ ٣٩٩) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (١٠٩)

③ تفسیر الطبري (٥/ ٤٠٠) مسند البزار (١/ ٤٥٧) السنة لابن أبي عاصم (٢/ ٩١) الأحادیث المختارۃ (١/ ٩٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحیح" (مجمع الزوائد: ١/ ٢٥٨)

④ سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٧٢٦) السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (٢٦٣٩) ⑤ تفسیر الطبري (٥/ ٤٠٢)

⑥ القاموس المحیط (١/ ٧٣٥) ⑦ تفسیر البیضاوي (١/ ٥٥٥) ⑧ فتح البیان (٢/ ٩٢۔ ٩٣)

کی ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ کہتے تھے کہ کرسی عرش ہے،[1] مگر صحیح یہ ہے کہ کرسی عرش کے علاوہ ہے، عرش اس سے بڑا ہے، جس طرح اخبار اور آثار میں مروی ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس بارے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث پر اعتماد کیا ہے،[2] مگر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ میرے نزدیک اس کی صحت پر اعتراض ہے۔[3] واللہ أعلم.

﴿ وَلَا يَـُٔودُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴾ پھر یہ فرمایا کہ اللہ کو ان دونوں کی حفاظت کرنا تھکاتا نہیں، یعنی اس کے لیے ان دونوں پر نگاہ رکھنا، یعنی آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سہل اور آسان ہے۔ کچھ ان ہی کی ہستی نہیں، وہ تو ہر نفس کو قائم رکھنے والا، ہر شے کا نگہبان اور محافظ ہے، کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں۔ ساری اشیا اس کے روبرو حقیر، ذلیل وخوار اور خاکسار ہیں، سب اسی کے محتاج اور فقیر ہیں۔ وہ بے نیاز اور تعریف والا ہے، جو چاہے کرے، کوئی پوچھنے والا نہیں، ہر شے پر غالب ہے، ہر چیز کا حساب لینے والا ہے، برتر ہے، بڑا ہے، اس کے سوا نہ کوئی معبود ہے نہ کوئی ربِ مسجود، جیسے اس کا قول ہے: ﴿ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ﴾ [الرعد: ٩] اس سے مراد علوِ قدر و منزلت ہے، یعنی وہ تمام خلق سے اوپر ہے، اس کے اوپر کوئی شے نہیں۔ کسی نے کہا: عالی ہے ملک وسلطنت اور قہر میں، اس سے اعلیٰ تر کوئی نہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ اس سے بہت بلند ہے کہ کوئی صفت بیان کرنے والا، اس کی صفت بیان کر سکے، وہ بزرگی اور رعب والا ہے، اپنی عظمت اور جلالت میں کامل الذات ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ اس کا مکان خلق کے مکانوں سے بہت بلند ہے۔[4] امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ مجسمین کا قول ہے اور نقل کرنے کے قابل نہیں۔[5]

میں کہتا ہوں کہ اہلِ علم کے درمیان مسئلہ اثباتِ جہت میں اختلاف مشہور ہے، اس مسئلے میں سلف اور خلف میں جھگڑا چلا آیا ہے۔ کتاب وسنت اللہ کی ذات کے علو اور فوق کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں، لیکن جو شخص کسی مذہب کے زیرِ سایہ نشو ونما پاتا ہے، وہ دوسروں کی بات کو شریعت سے خارج سمجھتا ہے، دلیلوں پر غور نہیں کرتا، نہ حجتوں کی طرف توجہ دیتا ہے۔ کتاب وسنت ایسی کسوٹی ہے، جس سے حق و باطل الگ الگ پہچان لیا جاتا ہے، صحیح غلط سے علاحدہ اور جدا ظاہر ہو جاتا ہے۔ ﴿ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ﴾ [المؤمنون: ٧١] ''اور اگر حق ان کی خواہشات کی پیروی کرے تو آسمان اور زمین اور جو ان میں ہیں، سب تباہ و برباد ہو جائیں۔''

اس میں شک نہیں کہ لفظ "علي" کا اطلاق قاہر غالب پر بھی ہوتا ہے، جیسے: ﴿ اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ ﴾ [القصص: ٤] ''بے شک فرعون نے زمین (مصر) میں سرکشی کی۔'' نیز لفظ "علي"، علو اور فوقِ مکان پر بھی بولا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے ہر طرح کا علو اور فوق ثابت ہے، جو شخص علو کی سمت کا انکار کرتا ہے، وہ اس مسئلے میں

---

[1] تفسیر الطبري (٥/ ٣٩٩) [2] تفسیر الطبري (٥/ ٤٠٠) [3] تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٠٥)
[4] تفسیر الطبري (٥/ ٤٠٦) [5] المحرر الوجیز (١/ ٣٤٢)

بے جہت لڑتا ہے، ناحق جھک جھک بک بک کرتا ہے۔ سلف کا مذہب تمام صفات کو ان کے ظاہر پر تسلیم کرتا ہے، تاویل کرنے کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں۔ ظاہر نصوص پر ایمان لاکر خاموش بیٹھ رہنا، ان میں غور نہ کرنا، سلامت روی کی چال ہے۔ تاویل کی دلدل میں پھنسنا اپنی جان کو ہلاک کرنا ہے۔

خوش نہ آئی یہ تری چال ہمیں یوں نہ کرنا تھا پامال ہمیں

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے فرمایا ہے: "هٰذِهِ الْأَحَادِيْثُ وَمَا فِيْ مَعْنَاهَا مِنَ الْأَحَادِيْثِ الصِّحَاحِ الْأَجْوَدُ فِيْهَا طَرِيْقَةُ السَّلَفِ الصَّالِحِ أَمِرُّوْهَا كَمَا جَآءَتْ مِنْ غَيْرِ تَكْيِيْفٍ وَلَا تَشْبِيْهٍ" "یہ حدیثیں اور جو ان کے ہم معنی صحیح حدیثیں ہیں، ان میں سلف کا مضبوط طریقہ یہ ہے کہ ان کو اسی طرح جاری کرو، جس طرح یہ وارد ہوئی آئی ہیں، یعنی تکییف وتشبیہ کے بغیر۔"[1] اس بارے میں سارے ائمہ محدثین اور مجتہدین کا یہی قول ہے۔ اس سلسلے میں ہمارا رسالہ "الإحتواء علی مسئلة الإستواء" مختصر ہونے کے باوجود بہت خوب ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۟ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت، گمراہی سے واضح ہو چکی ہے، پھر جو شخص طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے تو یقیناً اس نے ایک مضبوط کڑا تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (256)

دین میں زبردستی نہیں:

جہاد یہ نہیں کہ زبردستی اپنا دعویٰ قبول کرواتے ہیں، بلکہ جس کام کو سب نیک کہتے ہیں، مگر کرتے نہیں، وہی کرواتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے اس آیت میں یہی فرمایا کہ کسی پر دینِ اسلام میں داخل ہونے کے لیے زبردستی نہ کرو، کیوں کہ اسلام ایک کھلی چیز ہے، اس کی دلیلیں واضح اور آشکار ہیں، وہ اس بات کا محتاج نہیں کہ کسی پر اس کے لیے زبردستی کی جائے، بلکہ اللہ جس کو ہدایت دیتا ہے، اس کا سینہ کھول دیتا ہے، اس کی عقل روشن فرماتا ہے، وہ خود ہی سمجھ بوجھ کر مسلمان ہو جاتا ہے۔ جس کا دل اللہ نے اندھا کر دیا، اس کے کان پر مہر لگا دی، آنکھ پردہ ڈال دیا، وہ اگر اسلام میں زور آوری سے داخل ہو بھی جائے تو بھی اس کو کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۴۰۶)

اس آیت کا شانِ نزول:

یہ آیت انصار کی ایک قوم کے حق میں اتری ہے، اگرچہ اس کا حکم عام ہے۔[1] عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: جس عورت کا بچہ زندہ نہ رہتا، وہ یہ منت مانتی کہ اگر وہ زندہ رہے گا تو میں اس کو یہودی بناؤں گی۔ جب بنونضیر نکالے گئے، ان میں انصار کے اس قسم کے بہت سے بچے تھے۔ انھوں نے کہا: ہم اپنے بچوں کو نہیں چھوڑیں گے تو اللہ نے یہ آیت اُتاری۔[2] (رواه ابن جرير و أبو داود و النسائي و ابن أبي حاتم و ابن حبان في صحيحه) مجاہد وسعید بن جبیر و شعبی وحسن بصری وغیرہم کا بھی یہی قول ہے کہ یہ آیت اسی بارے میں اتری ہے۔[3] سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دوسری روایت یہ ہے کہ قبیلہ بنی سالم کا ایک حصین نامی انصاری تھا، اس کے دو بیٹے نصرانی تھے، وہ مسلمان تھا، اس نے نبی مکرم ﷺ سے کہا: بھلا میں ان پر زبردستی کروں، وہ تو صرف نصرانیت کو مانتے ہیں۔ اس پر یہ آیت اتری۔[4] (رواه ابن جرير)

امام سدی رحمہ اللہ کا قول ہے: وہ دونوں لڑکے شام سے آنے والے ان سوداگروں کے ہاتھ پر نصرانی ہوگئے تھے، جو تیل لے کر آتے تھے۔ جب انھوں نے ان کے ساتھ جانے کا ارادہ کیا تو باپ نے چاہا کہ ان کو زبردستی روک لے۔ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا کہ کسی کو بھیج کر ان کو پکڑ لاؤں؟ اس پر اللہ نے یہ آیت اتاری۔[5] سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ایک اسبق نامی نصرانی غلام تھا، وہ جب اس کو مسلمان ہونے کے لیے کہتے تو نہ مانتا۔ سیدنا عمر فرماتے: "لا إكراه في الدين" کہتے: اے اسبق! اگر تو مسلمان ہوجائے تو میں تجھ سے مسلمانوں کے بعض کاموں پر مدد لوں۔[6] علما کے ایک بڑے گروہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اہلِ کتاب اور اس شخص پر محمول ہے، جو حکم کے منسوخ یا تبدیل ہونے سے پہلے ان کے دین میں داخل ہو چکا ہے، جبکہ وہ جزیہ ادا کریں۔ دوسرے مفسرین کا قول ہے کہ یہ آیت، آیتِ قتال سے منسوخ ہے۔

زبردستی کرنے کا مفہوم:

ساری اُمتوں کو دینِ حنیف اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دینا واجب ہے، جو کوئی اس میں داخل نہ ہو، نہ فرماں بردار بنے اور نہ جزیہ دے، اس سے اس وقت تک لڑیں کہ وہ مارا جائے۔ یہ اکراہ کے معنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ﴾ [الفتح: ١٦] "عن قریب تم ایک سخت جنگجو

---

[1] تفسير ابن كثير (١/ ٤٠٦)

[2] تفسير الطبري (٥/ ٤٠٨) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٩٣) صحيح ابن حبان (١/ ٣٥٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٨٢) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٠٤) اس کی سند صحیح ہے۔

[3] تفسير ابن كثير (١/ ٤٠٦)

[4] تفسير الطبري (٥/ ٤٠٩) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحيح المسبور للدكتور حكمت بشير (١/ ٣٧۔ ٤٥)

[5] تفسير الطبري (٥/ ٤١٠) [6] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٩٣)

قوم کی طرف بلائے جاؤ گے، تم ان سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہو جائیں گے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جٰهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ﴾ [التحريم: ٩] ''اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کیجیے اور اُن پر سختی کیجیے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ [التوبة: ١٢٣] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم ان کافروں سے لڑو جو تمھارے قرب و جوار میں ہیں اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ یقیناً اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔''

صحیح بخاری میں مروی ہے کہ اللہ ایک قوم پر تعجب کرتا ہے، جو بیڑیوں میں جنت کی طرف کھینچے جاتے ہیں۔[1] مراد وہ لوگ ہیں جن کو قید کر کے، زنجیریں پہنا کر، گردنوں میں طوق ڈال کر اور مشکیں باندھ کر اسلام کے شہروں میں لاتے ہیں۔ پھر وہ کچھ دنوں کے بعد مسلمان ہو کر عملِ صالح کرنے لگتے ہیں، ان کا باطن اور ظاہر سنور جاتا ہے، وہ اہلِ جنت ہو جاتے ہیں۔ وہ جو سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے کہا: مسلمان ہو جا، اس نے کہا: میرا جی نہیں چاہتا، فرمایا: اگرچہ تیرا دل نہیں چاہتا۔[2] (رواه أحمد) یہ حدیث ثلاثی صحیح ہے (یعنی اس میں راوی اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف تین واسطے ہیں) لیکن اس قبیل سے نہیں ہے، کیوں کہ آپ نے اس شخص پر اسلام لانے کے لیے کچھ زبردستی نہیں کی، بلکہ اس کو صرف اسلام کی طرف بلایا تھا، جب اس نے یہ کہا: میرا دل قبول نہیں کرتا، فرمایا کہ اگرچہ تیرا دل نہیں چاہتا، مگر تو مسلمان ہو جا، اللہ تجھ کو حسنِ نیت و اخلاص عطا کرے گا۔

اکراہ کی تفسیر میں اقوال:

فتح البیان میں یوں مرقوم ہے کہ اس آیت میں کئی قول ہیں: ایک یہ کہ منسوخ ہے، نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کو دینِ اسلام پر مجبور کیا، دینِ اسلام کے بغیر ان سے راضی نہ ہوئے۔ اکثر مفسرین اسی طرف گئے ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت خاص اہلِ کتاب کے حق میں ہے کہ ان پر جزیہ دینے کی صورت میں زبردستی نہ کی جائے، زبردستی بت پرستوں پر ہے کہ ان سے اسلام یا تلوار کے سوا اور کچھ مقبول نہیں۔ امام شعبی، حسن، قتادہ اور ضحاک رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت خاص انصار کے حق میں ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ جو تلوار کے نیچے اسلام لایا، اس کو یہ نہ کہو کہ وہ مجبور کیا گیا ہے۔

پانچواں قول یہ ہے کہ یہ آیت اہلِ کتاب کے قیدیوں کے حق میں اُتری ہے کہ ان پر اسلام کے بارے میں کچھ جبر نہیں کرنا چاہیے۔ چھٹا قول وہ ہے جو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے اور اوپر گزر چکا ہے۔[3] ساتواں قول وہ ہے جو تفسیر کشاف میں ہے کہ اللہ نے یہ حکم جاری نہیں کیا کہ مار مار کر کسی کو مسلمان بناؤ، ہاں جو اپنے اختیار اور اپنی مرضی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٤٨) [2] مسند أحمد (٣/ ١٠٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٤٥٤)

[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا یہ قول پچھلے صفحے پر گزر چکا ہے۔

سے مسلمان ہو، وہ ہو جائے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۚ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴾ [یونس: ۹۹] ''اور اگر آپ کا رب چاہتا تو جو لوگ زمین میں ہیں، سب کے سب، سارے ہی ایمان لے آتے، پھر کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے، حتی کہ وہ مومن ہو جائیں؟''

یعنی اگر اللہ چاہتا تو ان کو ایمان پر مجبور کرتا، لیکن اللہ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ ان کے اختیار پر رکھا۔[1] یہاں یہ بات قابلِ غور اور زیادہ معتبر ہے کہ یہ آیت اپنے سببِ نزول میں محکم ہے، منسوخ نہیں۔ نزول کا سبب وہی عورت کا قصہ ہے، جو اوپر گزرا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اہلِ کتاب پر زبردستی نہیں، جبکہ وہ اپنے ہی دین پر رہنا چاہیں اور جزیہ دیں۔ رہے اہلِ حرب، سو اگرچہ آیت ان کو شامل ہے، کیوں کہ نکرہ نفی کے سیاق میں آیا ہے اور دین معرفہ ہے۔ نیز لفظ کی عمومیت کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ خصوصیتِ سبب کا، لیکن یہ عموم ان آیات کے ساتھ مخصوص ہے، جو اہلِ حرب کے حق میں آئی ہیں۔[2]

طاغوت کی تفسیر:

طاغوت یہ طغیان سے مشتق ہے۔ امام جوہری رحمہ اللہ کا قول ہے کہ کاہن، جادوگر، شیطان اور ہر گمراہی کے سردار اور ہر معبودِ غیر اللہ کو طاغوت کہتے ہیں، مفرد اور جمع دونوں طرح آتا ہے۔[3] مطلب یہ ہوا کہ جس نے شیطان کا یا بتوں کا یا کاہنوں کا یا گمراہی کے سرداروں کا یا ان سب کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا، اس نے ایسی رسی پکڑی جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ جس نے اللہ کے شریکوں، بتوں اور غیر اللہ کی عبادت چھوڑ کر ''لا إله إلا الله'' کی گواہی دی، اللہ کو ایک سمجھ کر اس کی عبادت کی یا اس کا کام ثابت اور مضبوط ہوا اور وہ بہتر طریقے پر جما رہا اور صراطِ مستقیم پر قائم دائم ہوا، اس نے نہ ٹوٹنے والی مضبوط رسی کو تھام لیا۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جبت جادو ہے، طاغوت شیطان ہے۔ بہادری اور بزدلی فطرتِ انسانی ہے، یہ مردوں میں ہوتی ہے۔ شجاع اس آدمی سے لڑتا ہے جس کو پہچانتا نہیں اور بزدل اپنی ماں سے بھاگ جاتا ہے، مرد کی کرامت اس کا دین ہے۔ مرد کا حسب اس کا اخلاق ہے، اگرچہ وہ ایرانی یا نبطی ہو، شرافت دین کی وجہ سے ہے نہ کہ نسب کی وجہ سے، جس کا اخلاق اچھا ہے، وہی شریف ہے، گو نسب میں کم ہو۔

مضبوط رسی کی تفسیر:

امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: مضبوط رسی سے ایمان مراد ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: اسلام ہے۔ سعید بن جبیر اور ضحاک رحمہما اللہ نے کہا: ''لا إله إلا الله'' ہے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: قرآن ہے۔ سالم بن ابی الجعد رحمہ اللہ نے کہا:

---

[1] تفسیر الکشاف (۱/ ۳۳۱) [2] فتح البیان (۲/ ۹۷۔ ۹۹) [3] الصحاح (٦/ ٢٦٣)

"حُبّ في الله و بغض في الله" ہے۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ سب اقوال صحیح ہیں، ان میں کوئی ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہے۔ سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ رسی دخولِ جنت تک نہیں ٹوٹے گی، اس رسی میں دخولِ جنت تک کمزوری نہیں ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے اس آیت کو پڑھ کر یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ﴾ [الرعد: ١١] "بے شک اللہ نہیں بدلتا جو کسی قوم میں ہے، حتی کہ وہ اسے بدل لیں جو اُن کے نفسوں میں ہے۔"[2] امام احمد رحمہ اللہ نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے خواب کا ایک طویل قصہ ذکر کیا ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایک مضبوط رسی پکڑی، جس کی تعبیر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی کہ وہ رسی اسلام ہے، تم اس کو مرتے دم تک پکڑے رکھو۔ مسلم اور نسائی میں یہ طویل حدیث مذکور ہے۔[3]

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٥٧﴾

اللہ ان لوگوں کا دوست ہے جو ایمان لائے، وہ ان کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے اور وہ لوگ جنھوں نے کفر کیا ان کے دوست طاغوت ہیں، وہ انھیں روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں، وہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ﴿257﴾

روشنی اور اندھیروں کی تفسیر:

یعنی کافروں کی ضد توڑنے کے لیے جہاد ہے اور اللہ اس کو ہدایت دیتا ہے، جس کی قسمت میں رکھی ہو، ان کو شبہہ ہوا تو ساتھ ہی اس پر خبردار کر دیا۔ اللہ پاک نے اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ جو شخص اللہ کی مرضی پر چلتا ہے، اس کو اللہ سلامتی کا راستہ دکھاتا ہے۔ ظلمات، کفر و شرک اور شکوک و شبہات سے نکال کر نورِ حق، واضح، جلی، مبین، سہل، اور روشنی کی طرف پہنچا دیتا ہے۔ کافروں کا کارساز شیطان ہے، وہ ان کی نظر میں جہالت اور گمراہی کو زینت بخشتا ہے۔ حق کے راستے سے نکال کر کفر، جھوٹ اور بہتان کی طرف لے جاتا ہے۔ حق ایک ہے، اس لیے نور کا لفظ مفرد آیا ہے۔ کفر کی کئی قسمیں ہیں اور سب باطل اور جھوٹ ہیں، اس لیے ظلمات کو جمع کے صیغے سے ذکر فرمایا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ

[1] تفسير الطبري (٥/ ٤٢١۔ ٤٢٢) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٩٦۔ ٤٩٧) تفسير ابن كثير (١/ ٤٠٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٠٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٨٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٤/ ٣٨٤) مسند أحمد (٥/ ٤٥٢)

وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ [الأنعام: ١٥٣] ''اور یقیناً یہ میرا راستہ سیدھا ہے، لہٰذا تم اسی کی پیروی کرو، اور تم دوسرے راستوں کی پیروی مت کرو، وہ تمھیں اللہ کے راستے سے الگ کر دیں گے۔ اللہ نے تمھیں اس کی تاکید کی ہے، تاکہ تم پرہیزگاری اختیار کرو۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ﴾ [الأنعام: ١] ''اور اندھیروں اور روشنی کو بنایا۔'' اور پھر فرمایا: ﴿ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ ﴾ [النحل: ٤٨] ''دائیں سے اور بائیں سے۔'' اس کے علاوہ اور بہت سی آیتیں ہیں، جن میں حق کے ایک ہونے اور باطل کے منتشر ہونے کی خبر دی ہے۔ حق کا ایک ہونا اور باطل کا گروہ در گروہ ہونا ثابت کیا ہے۔ ایوب بن خالد رحمہ اللہ نے کہا: خواہشات کی پرستش کرنے والے اور فتنوں کو پیدا کرنے والے سر اٹھاتے ہیں، جس کی خواہش ایمان ہو، اس کا فتنہ (آزمائش) روشن ہوتا ہے اور جس کی خواہش کفر ہو، اس کا فتنہ کالا اندھیرا ہوتا ہے۔[1]

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵۸﴾

کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا، جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں اس لیے جھگڑا کیا کہ اللہ نے اسے بادشاہی دے رکھی تھی؟ جب ابراہیم نے کہا: میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ اس (نمرود) نے کہا: میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا: بے شک اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال کر دکھا، چناں چہ وہ ہکا بکا رہ گیا جس نے کفر کیا تھا اور اللہ ان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا جو ظالم ہیں ﴿258﴾

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود سے مناظرہ:

یہ ایک بادشاہ تھا، جو سلطنت کے گھمنڈ پر اپنی ذات کو سجدہ کرواتا تھا۔ ابراہیم علیہ السلام نے اس کو سجدہ نہ کیا، اس نے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ میں اپنے رب ہی کو سجدہ کرتا ہوں۔ اس نے کہا کہ رب تو میں ہوں۔ انھوں نے کہا کہ میں حاکم کو رب نہیں مانتا، رب تو وہ ہے، جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، اس نے دو قیدی منگا لیے، جس کو زندہ رکھنا تھا، اس کو مار ڈالا اور جس کو مارنا تھا، اس کو چھوڑ دیا۔ تب انھوں نے آفتاب کی دلیل سے اس کو لاجواب کر دیا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٩٨)

فرماتے ہیں: وہ بادشاہ، جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حجت کی، وہ بابل کا بادشاہ نمرود بن کنعان بن کوس بن سام بن نوح تھا، اس کو نمرود بن فالخ بن عائذ بن شالخ بن ارفخش بن سام بن نوح بھی کہتے تھے۔ پہلا قول امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ کا ہے۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: مشارق و مغاربِ ارض (پوری زمین) کے بادشاہ چار ہوئے ہیں، جن میں دو مومن تھے اور دو کافر۔ مومن سلیمان بن داود علیہما السلام اور ذوالقرنین۔ کافر نمرود اور بخت نصر۔[2] امام فراء رحمہ اللہ نے کہا: جس نے سب سے پہلے سر پر تاج رکھا، زمین پر جبر و تشدد کیا اور رب ہونے کا دعویٰ کیا، وہ نمرود مردود ہی ہے اور وہ ولد الزنا تھا۔[3]

اس میں پہلی بات کی شہادت ہے کہ کافروں کا دوستدار، مددگار اور کارساز طاغوت ہوتا ہے، اس کا یہ غرور سلطنت کے گھمنڈ پر تھا۔ اس میں اختلاف ہے کہ اس نے یہ جھگڑا کب کیا؟ کسی نے کہا ہے: جب ابراہیم علیہ السلام نے بت کو توڑا۔ کسی نے کہا ہے کہ آگ میں ڈالنے کے بعد یہ مباحثہ ہوا۔ وہ چار سو برس تک حاکم رہا۔ اس کا یہ دعویٰ ویسا ہی ہے جیسے فرعون نے کہا تھا: ﴿ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ﴾ [القصص: ۳۸] ''میں تو اپنے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں جانتا۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دلائل:

اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا: تمھارے پاس رب کے وجود کے کیا دلائل ہیں؟ انھوں نے کہا کہ اللہ کے وجود پر یہی دلیل ہے کہ ان چیزوں کا عدم سے وجود میں آنا اور وجود کے بعد پھر عدم ہو جانا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کاموں کو کرنے والی کوئی با اختیار ہستی ضرور موجود ہے، یہ اشیا خود بہ خود پیدا نہیں ہوسکتیں، کیوں کہ ان کا ایجاد کرنے والا کوئی ہے، وہی موجد ہے، وہی رب ہے، جس کی طرف میں بلاتا ہوں، وہ وحدہ لاشریک لہ ہے، اس پر اس نے کہا: میں بھی تو زندہ کرتا اور مارتا ہوں، پھر دو قیدیوں کو مارا جلایا۔ امام قتادہ، ابن اسحق اور سدی رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ اس کی مراد یہ نہ تھی، کیوں کہ ابراہیم علیہ السلام کی بات کا یہ جواب نہیں تھا، کیوں کہ اس میں کارساز کے وجود کا انکار ہے، بلکہ مراد اس کی یہ تھی کہ میں خود اس مقام کا دعویٰ کرتا ہوں۔ یہ دعویٰ دشمنی اور فضول بحث کے طور پر کر کے اپنے آپ کو فاعل قرار دیا کہ زندہ کرنے والا اور مارنے والا میں ہوں۔ فرعون نے بھی خدائی کا دعویٰ گویا اسی کی پیروی میں کیا تھا۔

میرا ہی مقلد عمل تھا مجنون کے دماغ میں خلل تھا

حضرت ابراہیم نے اس کی بحث کا یوں جواب دیا کہ اگر تو رب ہے تو سورج کو مغرب سے برآمد کر، جس طرح اللہ مشرق سے نکالتا ہے، کیوں کہ جو زندہ کرنے والا اور مارنے والا ہوگا، ضروری ہے کہ وہ خلق کے وجود اور مخلوقات کی تمام قسموں پر ستاروں اور سیاروں کی تسخیر اور حرکت پر اختیار اور قبضہ رکھتا ہو، سورج ایک ایسی چیز ہے، جو ہر روز مشرق

[1] تفسير الطبري (٥/ ٤٣٠) [2] تفسير الطبري (٥/ ٤٣٣)

[3] امام بغوی رحمہ اللہ نے اس قول کی نسبت امام فراء رحمہ اللہ کی طرف کیے بغیر اسے نقل کیا ہے۔ دیکھیں: تفسير البغوي (١/ ٣١٥)

سے نکلتا ہے، تم خدا ہو تو اس کو مغرب سے نکال کر دکھاؤ۔ وہ مردود اس جواب کو سن کر مبہوت اور متحیر ہوگیا، کچھ نہ بنا اور خاموش ہوگیا، اللہ کی حجت اس پر قائم ہوگئی۔ اللہ ظالموں کو حجت سے آگاہ ہی نہیں کرتا، بلکہ اللہ کے سامنے ان کی دلیلیں بالکل بودی اور پھسپھسی ہوتی ہیں۔ ان پر اللہ کا غضب اور دردناک عذاب مقرر ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس انداز میں اس آیت کا نازل ہونا منطقیوں کی اس تقریر سے بہت بہتر ہے، جس میں انھوں نے یہ کہا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا پہلے مقام سے دوسرے مقام کی طرف منتقل ہونا واضح سے زیادہ واضح دلیل کی طرف منتقل ہونا تھا، لیکن ایسا نہیں، بلکہ پہلا مقام دوسرے کے لیے مقدمے کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ دونوں مقامات میں نمرود کے قول کے باطل ہونے کو ثابت کرتا ہے۔ وللہ الحمد والمنة.[1]

فتح البیان میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ اللہ وہ ہے جو جسموں کے اندر موت و حیات پیدا کرتا ہے، کافر کی مراد یہ تھی کہ میں قاتل کو معاف اور غیر قاتل کو قتل کر سکتا ہوں، یہ زندہ کرنا اور مارنا ہے، لہٰذا اس احمق کا یہ جواب اس لائق نہ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کی دلیل میں اس کا ذکر کیا جاتا، کیوں کہ ان کی مراد کچھ اور اس کی مراد کچھ تھی۔[2]

سوال از آسمان جواب از ریسماں

امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مناظرہ ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے درمیان اس وقت ہوا، جب حضرت ابراہیم آگ سے نکلے، بادشاہ سے ان کی ملاقات اس دن سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ملاقات میں یہ مناظرہ ہوگیا۔ زید بن اسلم کا قول ہے کہ نمرود کے پاس غلہ تھا، لوگ اس کے پاس آتے اور غلہ لے جاتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی غلہ لینے کے لیے آئے، جب یہ مناظرہ ہوا تو اس نے ان کو غلہ نہ دیا اور وہ خالی ہاتھ واپس آگئے، جب گھر کے نزدیک پہنچے تو ایک ٹیلے سے مٹی لے کر اپنے کپڑے میں بھر لی، سوچا کہ گھر والوں کو بہلا دوں گا، گھر پہنچ کر خرجی اتاری، تھکے ہوئے تھے، اس لیے سو گئے، سارہ نے اُٹھ کر خرجی کھولی، اس میں بہت اچھا غلہ پایا اور کھانا پکایا، ابراہیم علیہ السلام جب جاگے تو کھانا دیکھ کر پوچھا: یہ تمھارے پاس کہاں سے آیا؟ کہا: وہی ہے جو تم لائے ہو۔ انھیں محسوس ہوا کہ یہ رزق اللہ نے بھیجا ہے۔ ان کو اللہ نے اس جبار بادشاہ کی طرف مبعوث فرمایا تھا کہ اس کو اللہ پر ایمان لانے کا حکم دیں، اس نے ایک بار میں نہ مانا۔ بالآخر دوبارہ اور سہ بارہ اس کو دعوت دی، اس نے انکار کیا اور کہا: تم اپنے لوگ جمع کرو، میں اپنے لوگ جمع کرتا ہوں، سورج نکلتے ہی نمرود کا لشکر جمع ہوگیا، اللہ نے اس لشکر پر مچھروں کا ایک گروہ بھیج دیا، ابھی سورج کو آنکھوں سے نہ دیکھا تھا کہ ان مچھروں نے ان کا سارا گوشت پوست کھا لیا اور خون پی لیا، صرف ہڈیاں رہ گئیں۔ ان میں سے ایک مچھر بادشاہ کی ناک میں بھی گھس گیا اور چار سو برس تک رہا، اللہ نے اس کو عذاب میں گرفتار کر دیا اور اس کے سر پر ہتھوڑا مارا جاتا، یہاں تک کہ اس عذاب ہی میں ہلاک ہوگیا۔[3] اللہ کا یہ ارشاد سچ ہے کہ ظالموں کو ہدایت نہیں ہوتی۔

---

[1] تفسير ابن كثير (١/ ٤٠٩۔ ٤١٠) [2] فتح البيان (٢/ ١٠٢۔ ١٠٣) [3] تفسير الصنعاني (١/ ١٠٥۔ ١٠٦) تفسير ابن كثير (١/ ٤١٠)

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ
اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ
قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ
مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰی
حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا
ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی
كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۵۹﴾

یا اسی طرح اس شخص کو (نہیں دیکھا) جو ایک بستی سے گزرا اور وہ اپنی چھتوں پر گری پڑی تھی؟ اس نے کہا: اللہ اس بستی کو کیسے زندہ کرے گا اس کی موت کے بعد؟ تو اللہ نے اسے ایک سو سال کے لیے موت دے دی، پھر اسے زندہ کیا۔ اللہ نے پوچھا: تو کتنی دیر (یہاں) رہا ہے؟ اس نے کہا: ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ اللہ نے فرمایا: (نہیں!) بلکہ تو (موت کی حالت میں) سو سال رہا، البتہ تو اپنے کھانے اور پینے (کے سامان) کی طرف دیکھ وہ بالکل سڑا بسا نہیں، نیز دیکھ اپنے گدھے (کے ڈھانچے) کو، اور (یہ سب اس لیے ہوا ہے کہ) ہم تجھے لوگوں کے لیے ایک نشانی بنانا چاہتے ہیں اور تو (گدھے کی) ہڈیوں کی طرف دیکھ کہ ہم کیسے انھیں اُبھارتے (اور جوڑتے) ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں، پھر جب اس کے سامنے (یہ سب) واضح ہو گیا تو اس نے کہا: میں جانتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ﴿259﴾

دنیا میں مارنا اور زندہ کرنا:

موضح قرآن میں ہے کہ یہ شخص حضرت عزیر علیہ السلام پیغمبر تھے۔ بخت نصر ایک کافر بادشاہ تھا، جو بنی اسرائیل پر غالب ہوا، اس نے بیت المقدس شہر کو ویران کیا اور تمام لوگ قید کر لیے گئے۔ تب حضرت عزیر علیہ السلام اس شہر سے گزرے تو تعجب کیا کہ شہر پھر کیسے آباد ہوگا! اسی جگہ ان کی روح قبض ہوئی، سو برس کے بعد زندہ ہوئے، ان کا کھانا پینا قریب ہی رکھا تھا، اسی طرح سواری کا گدھا مر کر ہڈیاں بن گیا اور اسی جگہ پڑا رہا، وہ ان کے روبرو زندہ ہوا، اس سو برس میں بنی اسرائیل کو قید سے چھٹکارا ملا، شہر پھر آباد ہوا اور انھوں نے زندہ ہو کر آباد ہی دیکھا۔

پہلے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ تم نے کوئی شخص اس طرح کا جھگڑالو بھی دیکھا ہے، جس نے

ابراہیم علیہ السلام سے رب کے بارے میں بحث کی تھی۔ اب یہ فرمایا کہ تم نے اس گاؤں سے گزرنے والے کو بھی دیکھا کہ اللہ نے کس طرح اس کو راہ بتائی۔ شکوک و شبہات کے اندھیروں سے نکال کر شہادت اور یقین کے نورِ عیاں تک پہنچایا۔ معقول کو محسوس کر دکھایا اور باطن کو ظاہر بنا دیا۔

اس میں اختلاف ہے کہ وہ شخص کون تھا جس کا اس گاؤں سے گزر ہوا؟ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ وہ عزیر بن شرخیا علیہ السلام تھے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما امام حسن، قتادہ، سدی، سلیمان بن بریدہ اور ناجیہ بن کعب رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشہور بات یہی ہے۔ وہب بن منبہ اور ابن عبید رحمہم اللہ نے کہا: ارمیا بن حلقیا تھے، جو ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔

امام وہب رحمہ اللہ کا ایک قول یہ ہے کہ وہ خضر تھے، ارمیا انہی کا نام تھا۔[3] کسی شامی کا ایک قول یہ ہے کہ وہ حزقیل بن بوار تھے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک اسرائیلی شخص تھے۔[4] امام مجاہد رحمہ اللہ کا ایک قول یہ ہے کہ وہ کوئی کافر تھا، اس نے مر کر دوبارہ اٹھنے میں شک کیا تھا،[5] مگر یہ قول بالکل لچر اور بیہودہ ہے، کیوں کہ لفظ ﴿ كَمْ لَبِثْتَ ﴾ میں اس شخص کو خطاب ہے اور اللہ کافر کو مخاطب نہیں کرتا۔ ﴿ لِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ ﴾ کا استعمال بھی کافر کے حق میں نہیں ہوتا۔

غرض کہ اس جگہ اللہ کی مخلوق کو موت کے بعد زندہ کرنے کی قدرت ثابت کرنا ہے نہ کہ کسی شخص کی پہچان کروانا۔ مشہور یہ ہے کہ اس جگہ گاؤں سے مراد بیت المقدس ہے۔ بخت نصر کے اس کو برباد کر دینے کے بعد ان کا اس جگہ سے گزر ہوا تھا، جبکہ وہاں کے لوگ قتل ہو کر مر مٹ چکے تھے۔ کسی نے کہا: قریہ سے مراد اہلِ قریہ ہیں۔ کسی نے کہا: وہ قریہ مراد ہے جس سے ہزاروں آدمی وبا کے خوف سے بھاگ گئے تھے، اس کا قصہ اوپر گزر چکا ہے۔ امام کلبی رحمہ اللہ نے کہا ہے: قریہ سے مراد دیر سابر آباد ہے، یہ جگہ فارس میں تھی۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سلماباد وہ جرجان یا ہمدان کے قریب ایک محلّہ یا بستی تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ دیر ہرقل مراد ہے، وہ بصرہ اور باعزت لشکر کے درمیان میں دجلہ کے کنارے پر تھا۔[6]

فتح البیان میں کہا ہے کہ پہلا قول زیادہ ظاہر اور مشہور ہے۔[7] بہر حال اللہ نے اس شخص کا نام لیا اور نہ بستی کا، صحیح بات وہی جانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ان کا اس جگہ گزر ہوا تو اس کی شکستہ حالی اور ویرانی کو دیکھ کر یہ غور و فکر کیا کہ یہ بستی جو بڑی آباد تھی، اس حالت کو آ گئی ہے تو اب اللہ اس کو کیا آباد کرے گا؟ اللہ نے سو برس تک موت

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٥٠٠) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسیر الطبري (٥/ ٤٣٩) تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٥٠٠)
[3] تفسیر الطبري (٥/ ٤٤٠) [4] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٥٠٠) تفسیر ابن کثیر (١/ ٤١٠)
[5] تفسیر البغوي (١/ ٣١٧) [6] تفسیر البغوي (١/ ٣١٧) تفسیر الخازن (١/ ٢٧٤) [7] فتح البیان (٢/ ١٠٤۔ ١٠٥)

دے کر پھر اُٹھا کھڑا کیا۔ کہتے ہیں: وہ ان کے مرنے کے ستر برس بعد پھر آباد ہوئی۔ تیس برس میں سب لوگ آباد ہوگئے۔ بنو اسرائیل بھی وہاں آ گئے، جب اللہ نے ان کو زندہ کرنا چاہا تو سب سے پہلے ان کی آنکھوں کو کھولا، تاکہ اللہ کی کاری گری کو دیکھے کہ وہ کیوں کر ان کے بدن کو زندہ کرتا ہے، جب وہ زندہ ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے تو اللہ نے ایک فرشتے کے ذریعے پوچھا کہ تو کتنی دیر رہا؟ کہا: ایک دن یا ایک سے کچھ کم۔

یہ اس لیے کہا کیوں کہ وہ دن کے شروع میں مرے تھے اور آخر میں زندہ ہوئے۔ دیکھا سورج باقی ہے تو خیال کیا کہ وہ سورج اسی صبح کا ہے، اسی بنیاد پر یہ کہا کہ ایک دن یا کچھ کم۔ ان کے ساتھ انگور، انجیر اور عصیر (انگور کا شیرہ) تھا، دیکھا کوئی سڑا گلا نہیں، نہ عصیر کی حالت بدلی نہ انجیر کھٹا پڑا اور نہ انگور میں نقصان ہوا، پھر گدھے کو اُن کے سامنے زندہ کیا۔ ان سے کہا: تم موت کے بعد لوٹائے جانے پر نشانی ہو، مخلوق کے دوبارہ اٹھنے پر نشانی ہو۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا: جب وہ شہر میں آئے تو جوتے بنانے والے ایک ہمسائے کو جسے نوجوانی کی حالت میں چھوڑا تھا، اسے بوڑھا کھوسٹ پایا۔[1] کہتے ہیں: جس فرشتے نے ان سے سوال کیا تھا، وہ جبرائیل علیہ السلام یا کوئی اور فرشتہ تھا یا خود اللہ پاک ہی نے پوچھا، یہی بہتر ہے۔ جو انھوں نے جواب دیا کہ ایک دن یا ایک دن سے کم رہا، ایسا ہی اصحابِ کہف نے کہا: ﴿ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ﴾ [الكهف: ١٩] ''وہ بولے: ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے ہیں۔''

ذوالیدین کے واقعے میں اسی سے ملتا جلتا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے: «لَمْ تُقْصَرْ وَلَمْ أَنْسَ» ''نہ نماز کم کی گئی نہ میں بھولا۔''[2] معلوم ہوا سچ وہ ہے جو اعتقاد کے مطابق ہو اور جھوٹ وہ ہے جو اعتقاد کے مخالف ہو۔ کسی نے کہا: وہ گدھا مر کر گل سڑ گیا تھا، جس کو ان کے سامنے پھر گوشت پوست کا لباس پہنایا گیا۔ یہی امام سدی رحمہ اللہ کا قول ہے۔[3] بعض نے کہا: مرا نہیں تھا، بلکہ اسی طرح جہاں بندھا تھا، سو برس تک صحیح و سالم کھڑا رہا۔ پہلے قول کی دلیل یہ الفاظ ہیں: ﴿ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''اور تو (گدھے کی) ہڈیوں کی طرف دیکھ کہ ہم کیسے انھیں اُبھارتے (اور جوڑتے) ہیں۔'' دوسرے قول کی تائید یہ ہے: ﴿ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''اور پینے (کے سامان) کی طرف دیکھ وہ بالکل سڑا بسا نہیں۔'' روح پھونکنے کے بارے میں کچھ تعرض نہیں کیا کہ حکمت کا تقاضا تھا کہ اسے بیان نہ کیا جائے۔ واللہ أعلم.

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٥٠٢۔ ٥٠٣) مستدرك الحاكم (٢/ ٣١٠) امام حاکم اور ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٦٨) [3] تفسير الطبري (٥/ ٤٦٨)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶۰﴾

اور جب ابراہیم نے کہا: اے میرے رب! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ اللہ نے کہا: کیا تو (اس پر) ایمان نہیں لایا؟ ابراہیم نے کہا: کیوں نہیں! (ایمان تو رکھتا ہوں) لیکن میں قلبی اطمینان چاہتا ہوں۔ اللہ نے فرمایا: پھر تو چار پرندے لے اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے، پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ہر پہاڑ پر رکھ دے، پھر ان کو بلا، وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے اور جان لے کہ بے شک اللہ غالب، خوب حکمت والا ہے ﴿260﴾

مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت جاننے کے لیے ابراہیم علیہ السلام کی درخواست اور اس کا سبب:

موضح قرآن میں فرمایا ہے کہ چار جانور لائے: ایک مور، ایک مرغ، ایک کوا اور ایک کبوتر۔ ان کو اپنے ساتھ ہلایا کہ پہچان رہے، پھر ذبح کیا، ایک پہاڑ پر چاروں کے سر رکھے ایک پر ان کے پر، ایک پر دھڑ، اور ایک پر پاؤں۔ پہلے درمیان میں کھڑے ہو کر ایک کو پکارا، اس کا سر اٹھ کر ہوا میں کھڑا ہوا، پھر دھڑ اس کے ساتھ ملا، پھر پَر لگے، پھر پاؤں اور وہ دوڑتا چلا آیا۔ اسی طرح چاروں آئے۔

یہ تین قصے اس بات کو بیان کرنے کے لیے ذکر فرمائے کہ اللہ آپ ہدایت کرنے والا ہے جس کو چاہے، اگر شبہہ پڑے تو ساتھ ہی جواب بھیجے۔ اب آگے پھر جہاد کا ذکر ہے اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا۔

ابراہیم علیہ السلام نے اللہ سے جو وہ سوال کیا تھا، اس کے کئی سبب بتائے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب نمرود سے یہ کہا کہ میرا رب وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے تو پھر ان کا جی چاہا کہ علم الیقین کی طرف سے عین الیقین کی طرف ترقی کروں اور آنکھ سے دیکھ لوں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کی نسبت شک کے زیادہ مستحق ہیں۔[1] (رواہ الشیخان) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس جگہ شک سے مراد وہ نہیں جس کو بے علم لوگ سمجھتے ہیں۔ اس حدیث کے کئی جواب دیے گئے ہیں، مگر تفسیر مذکور میں اس جگہ پر بیاض ہے۔[2] فتح البیان میں کہا گیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو مردوں کو زندہ کرنے میں کسی طرح کا شک نہیں تھا۔ دیکھنے کا مطالبہ اس لیے کیا کہ انسانی جان کی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٩٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥١)
[2] تفسير ابن كثير (١/ ٤١٢)

یہ فطرت ہے کہ جس چیز کے بارے میں سنتا ہے، اس کو دیکھنا چاہتا ہے، جس طرح حدیث میں آیا ہے: « لَيْسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ » ''سنی ہوئی بات دیکھنے کے برابر نہیں۔''[1]

یار کیا بات ہے تیری کہ نہ دیدہ ہو کر مجھے دیدہ نظر آتا ہے شنیدہ ہو کر

اہلِ علم کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ قدرت میں شک پیدا ہوا تھا، جس طرح سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں گزرا۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میرے نزدیک قرآن میں کوئی آیت اس سے زیادہ امید دلانے والی نہیں ہے۔[2] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔[3] امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا: میرے نزدیک یہ ترجیح مردود ہے۔[4] حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اگر ابراہیم علیہ السلام شک کرنے والے ہوتے تو ہم شک کے زیادہ حق دار ہوتے، مگر جب ہم نے شک نہیں کیا تو ابراہیم شک و شبہہ نہ کرنے کے زیادہ لائق ہیں۔ حدیث کی بنیاد ابراہیم علیہ السلام سے شک کی نفی پر ہے۔

رہا سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اللہ پر ناز کر کے یہ چاہا کہ وہ دنیا میں زندہ کر کے دکھا دے، کیوں کہ وہاں کی زندگی تو معلوم ہے، یہاں زندہ کرنے کی عادت نہیں ہے۔ یا یہ معنی ہیں کہ ایمان کافی ہے، ایمان کے ہوتے ہوئے اتنی بحث کی کچھ ضرورت نہیں تو یہ آیت زیادہ امید دلانے والی ہوئی، کیوں کہ نرے ایماندار پر شک کا طاری ہونا بعید ہے تو نبوت اور خلت کا مرتبہ تو اس سے کہیں بلند ہے، وہاں شک آنے کا کیا ذکر ہوسکتا ہے۔ انبیا تو سارے کبیرہ اور صغیرہ گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں۔ آیتِ شریفہ کے الفاظ پر غور کرنے سے کوئی شک بھی ظاہر نہیں ہوتا۔ اس جگہ کی پوری تقریر فتح البیان میں مذکور ہے۔[5]

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے بہت صحیح بات کہی ہے۔ انبیا پر ایسا شک ہونا جائز نہیں، کیوں کہ اس طرح کا شک کفر ہے، سارے انبیا دوبارہ اٹھائے جانے پر متفق ہیں۔ اللہ نے خبر دی ہے کہ شیطان کا زور ہمارے انبیا اور اولیا پر نہیں چلتا۔ ﴿ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَٰنٌ ﴾ [الحجر: ٤٢] ''بے شک میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں۔'' خود اس لعین کا قول بھی اللہ نے نقل فرمایا ہے: ﴿ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴾ [الحجر: ٤٠] ''تیرے ان بندوں کے سوا جو ان میں سے چنے ہوئے ہیں۔'' لہٰذا جب اس رجیم و مردود کو ان پر کچھ قدرت حاصل نہیں تو پھر شک کہاں۔ یہ اور بات ہے کہ اس سوال کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس بات کا مشاہدہ اور ملاحظہ کریں کہ مردوں کے اجزا، یعنی جوڑ، رگیں، پٹھے اور گوشت پوست علاحدہ علاحدہ ہو کر بکھر جانے کے بعد کیسے اکٹھے ہو جائیں گے، کیوں کہ اس سے علمِ یقین عینِ یقین ہو جاتا ہے۔[6] واللہ أعلم.

---

[1] مسند أحمد (١/ ٢١٥) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٥٣٧٤) [2] تفسیر الطبري (٥/ ٤٨٩) اس کی سند میں انقطاع ہے۔
[3] تفسیر الطبري (٥/ ٤٩١) [4] المحرر الوجیز (١/ ٣٤٧) [5] فتح البیان (٢/ ١٠٩) [6] تفسیر القرطبي (٣/ ٢٩٩)

کسی نے کہا ہے کہ پرندے کو اس لیے اختیار کیا ہے کہ حیوان کی قسموں میں سے انسان کے سب سے زیادہ یہی قریب ہوتا ہے، سر گول ہوتا ہے، دو پاؤں سے چلتا ہے۔ یا اس لیے کہ پرندے کی ہمت یہ ہے کہ وہ اوپر اڑتا ہے اور ہمتِ خلیل یہ تھی کہ بلندی پر جائیں۔ اس کے علاوہ اس تخصیص اور تعداد کے بہت سے نکتے بیان کیے ہیں، جو فضول ہیں۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ ان پرندوں کے بارے میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ وہ کون سے پرندے تھے۔ اگرچہ ان کے متعین کرنے میں کچھ فائدہ نہیں ہے، کیونکہ یہ معاملہ اگر اہم ہوتا تو خود اللہ پاک قرآن پاک میں اس کو بیان فرما دیتا۔

پرندوں کی نوعیت اور زندہ ہونے کی کیفیت:

امام مجاہد و عکرمہ رحمہما اللہ کا تو وہی قول ہے، جو موضح قرآن سے نقل ہو چکا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ایک کونج (لمبی گردن والا سفید پرندہ)، ایک مور، ایک مرغ اور ایک کبوتر تھا۔[2] دوسرا قول یہ ہے کہ ایک اوز (آبی بطخ)، ایک رال (شتر مرغ)، ایک مرغ اور ایک مور تھا۔[3] اس میں بھی اختلاف ہے کہ ان کے اجزا اور پہاڑ کتنے تھے، مگر اس کے ذکر سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ سلف کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ ﴿فَصُرْهُنَّ﴾ سے مراد ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا یا باندھنا، یا جمع کرنا یا ہلانا، یا چیرنا یا پھاڑنا ہے۔ غرض یہ کہ کچھ ہو، چار پرندے تھے، جن کو حلال کیا، ان کے پر وغیرہ اُکھاڑ کر، سب نوچ کھسوٹ کر، چیڑ پھاڑ کر، خلط ملط کر کے ایک ایک پہاڑ پر رکھ دیا۔ وہ چار پہاڑ تھے یا سات پہاڑ، پھر ان کے سر اپنے ہاتھ میں لے کر پکارنا شروع کیا، دیکھا کہ پَر پَر سے، خون خون سے، گوشت گوشت سے، ہر جز ہر جز سے اڑ کر مل گیا، ہر پرندہ علاحدہ تیار ہوگیا، ان کے پاس دوڑتا ہوا چلا آیا۔ دوڑتا اس لیے آیا کہ اگر اڑتا ہوا آتا تو شاید کوئی وہم کرنے والا یہ وہم کرتا کہ وہ کوئی اور ہی پرندہ ہے، اس کے پاؤں سلامت نہیں ہیں۔ اس لیے شبہے کو دور کرنے کے لیے پاؤں پاؤں چل کر آئے۔

اس قصے میں ابراہیم خلیل علیہ السلام کی فضیلت اور اُن کے ادبِ سوال کی دلیل ہے کہ جو سوال کیا، وہ فی الحال دیکھ لیا۔ عزیر علیہ السلام کو ان کے سوال کا جواب ایک سو سال بعد ملا۔ ابن المسیب رحمہ اللہ نے کہا: سیدنا عبداللہ بن عباس اور سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم اکٹھے ہوئے، ایک نے دوسرے سے کہا: بھلا بتاؤ! قرآن میں کون سی آیت اس امت کے لیے زیادہ امید آور ہے (خوش کرنے والی)؟ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ

---

[1] فتح البیان (۲/ ۱۰۹۔ ۱۱۲) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ۵۱۱) اس کی سند میں ''عبداللہ بن لہیعہ'' ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ۵۱۰۔ ۵۱۱) اس کی سند میں ''بشر بن عمارہ'' ضعیف راوی ہے۔ تفسیر ابن کثیر (۱/ ۴۱۲)

الرَّحِيْمُ ﴿٥٣﴾ [الزمر: ٥٣] ''آپ کہہ دیجیے: (اللہ فرماتا ہے:) اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم و زیادتی کی ہے! تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک اللہ سب گناہ معاف کر دیتا ہے، یقیناً وہی بڑا بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: تم یوں کہتے ہو، میں یوں کہتا ہوں کہ اس آیت سے زیادہ اس امت کے لیے ابراہیم علیہ السلام کا قول ہے: ﴿ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''اے میرے رب! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ اللہ نے کہا: کیا تو (اس پر) ایمان نہیں لایا؟ ابراہیم نے کہا: کیوں نہیں! (ایمان تو رکھتا ہوں) لیکن میں قلبی اطمینان چاہتا ہوں۔''[1] (رواہ ابن جریر) اس کو امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے، اس کے بعد اتنا بڑھایا ہے: ''فَرَضِيَ مِنْ إِبْرَاهِيْمَ قَوْلَهٗ بَلٰى'' ''پس ابراہیم علیہ السلام سے اس کے قول ''بلٰی'' کو پسند کیا۔''[2] امام حاکم رحمہ اللہ نے اس کو صحیح الاسناد کہا ہے۔[3] مطلب یہ ہوا کہ جب دل اور زبان سے ایمان کا اقرار ہوگیا تو اب نفس کا کوئی وسوسہ مضر نہیں ہوگا۔ سو اس سے بڑھ کر جنابِ باری تعالیٰ سے اور کیا اُمید ہوسکتی ہے۔ واللہ أعلم.

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ
اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ
لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦١﴾

ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں، اس دانے کی سی ہے، جس میں سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جس کے لیے چاہے (اجر) بڑھا دیتا ہے اور اللہ وسعت والا، خوب جاننے والا ہے ﴿261﴾

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی فضیلت:

جو شخص اللہ کی راہ اور مرضی میں اپنا مال خرچ کرتا ہے تو اس کی وہ نیکی دس سے سات سو گنا تک بڑھ جاتی ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس جگہ اللہ کی راہ سے مراد اللہ کی اطاعت ہے۔ امام مکحول رحمہ اللہ کا قول ہے کہ مراد جہاد کے لیے گھوڑے پالنے اور اسلحہ وغیرہ کے حصول کے لیے خرچ کرنا ہے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا:

---

[1] تفسیر الطبري (٥/ ٤٨٩۔ ٤٩٠) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔ [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٥٠٩) اس کی سند حسن ہے۔
[3] مستدرك الحاكم ١٠/ ١٢٨) وتعقبه الذهبي بأن فيه انقطاعاً. [4] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥١٤)

مراد جہاد اور حج ہے کہ ان میں ایک درہم سات سو گنا تک پہنچتا ہے۔[1] اس مثال کا نفس پر اثر صرف سات سو کا عدد کہہ دینے سے زیادہ ہے، کیوں کہ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ بندوں کے اعمالِ صالحہ کی ویسے ہی پرورش کرتا ہے، جس طرح پاکیزہ زمین میں بیج ڈالنے سے کھیتی کی نشوونما ہوتی ہے۔

حدیث میں ایک نیکی کا سات سو نیکی تک بڑھنا آیا ہے۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے اللہ کے راستے میں بہتر خرچ کیا، وہ سات سو گنا ہے۔ جس نے اپنی جان پر اور اپنے گھر والوں پر خرچ کیا اور بیمار کی عیادت کی تو ایک نیکی دس گنا ہے۔ روزہ ڈھال ہے، جب تک کہ اس کو نہ پھاڑے۔ جس کو اللہ نے کسی آزمائش میں مبتلا کیا، وہ اس کے لیے حطہ ہے، یعنی گناہوں کا جھڑنا۔[2] (رواه أحمد و رواه النسائي موقوفا) سیدنا ابو مسعود الانصاری رضی اللہ عنہ نے کہا: ایک آدمی نے ایک نکیل زدہ [ساز و سامان سے لیس] اونٹنی اللہ کی راہ میں دی تھی، نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت میں اس قسم کی سات سو اونٹنیاں آئیں گی۔ (رواه أحمد و مسلم والنسائي) مسلم میں الفاظ اس طرح سے ہیں کہ ایک آدمی نکیل زدہ اونٹنی [ساز و سامان سے لیس] لایا، کہا یہ اللہ کی راہ میں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے عوض قیامت کے دن تجھے سات سو اونٹنیاں ملیں گی۔[3] عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے دوسرے الفاظ یوں ہیں: اللہ نے بنی آدم کی نیکیوں کو دس گنا سے سات سو گنا تک مقرر کیا ہے، مگر روزہ کہ وہ میرے لیے ہے، اس کی جزا میں ہی دوں گا۔

روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں: ایک افطار کے وقت، دوسری قیامت کے دن۔ اللہ کے نزدیک روزہ دار کے منہ کی بو مشک کی خوشبو سے زیادہ پاکیزہ ہے۔[4] (رواه أحمد) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت یہ ہے کہ ابن آدم کا ہر عمل دوگنا ہوتا ہے، نیکی دس گنا سے سات سو گنا تک ہوتی ہے اور جہاں تک اللہ چاہے، مگر روزہ کہ وہ میرے لیے ہے، میں ہی اس کی جزا دوں گا، کیوں کہ بندہ اپنا کھانا پینا میرے واسطے چھوڑتا ہے۔[5] (رواه أحمد و مسلم) سیدنا خریم بن فاتک رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ جس نے اللہ کی راہ میں کوئی نفقہ خرچ کیا، وہ سات سو گنا تک بڑھتا ہے۔[6] (رواه أحمد)

---

① تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ۵۱۵) اس کی سند حسن ہے۔

② مسند أحمد (۱/ ۱۹۵) سنن النسائي، رقم الحديث (۲۲۳۵) اس کی سند حسن ہے۔

③ صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۸۹۲) سنن النسائي، رقم الحديث (۳۱۸۷) مسند أحمد (٤/ ۱۲۱)

④ مسند أحمد (۱/ ٤٤٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”وله أسانيد عند الطبراني وبعض طرقه رجالها رجال الصحيح، وفي إسناد أحمد عمرو بن مجمع وهو ضعيف“ مجمع الزوائد (۳/ ٤١٦) لیکن یہ روایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں مروی ہے۔ دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (۷۰۵٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۱۵۱)

⑤ صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۱۵۱) مسند أحمد (۲/ ٤٤۳)

⑥ مسند أحمد (٤/ ۳٤۵) السلسلة الصحية، رقم الحديث (۲٦۰٤)

سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ نماز، روزہ، ذکر کا اجر دوگنا ہوتا ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ پر سات سو گنا۔[1] (رواہ أبو داود) سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ جس نے اللہ کی راہ میں نفقہ بھیجا اور اپنے گھر میں رہا تو اس کو ہر درہم کے بدلے قیامت کو سات سو درہم ملیں گے، جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور اس کام میں خرچ کیا، اس کے بدلے میں ہر درہم کے سات سو درہم ہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ (آیت زیر تفسیر) ''اور اللہ بڑھاتا ہے، جس کے لیے چاہتا ہے۔''[2] (رواہ ابن أبي حاتم)

یہ حدیث غریب ہے۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ ایک نیکی دو لاکھ تک پہنچتی ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ جب یہ آیت زیر تفسیر اتری تو نبی مکرم ﷺ نے کہا: « رَبِّ زِدْ أُمَّتِي » ''اے پروردگار! میری امت کو زیادہ دے۔'' اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری: ﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾ [البقرة: ٢٤٥] ''کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے؟'' پھر کہا: « رَبِّ زِدْ أُمَّتِي » تو یہ آیت نازل ہوئی: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [الزمر: ١٠] ''بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ان کا پورا پورا اجر بے حساب دیا جائے گا۔''[4]

(رواہ ابن مردویہ و أبو حاتم و ابن حبان)

معلوم ہوا کہ ضِعف کے مراتب ہیں۔ ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ ایک نیکی کی دس نیکیاں ہوتی ہیں، دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ ایک نیکی سات سو گنا ہو جائے، تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ ایک نیکی دو لاکھ گنا ہو جائے، چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ بے حساب اجر ملے۔ یہ مراتب اخلاصِ عمل اور مال کے حلال ہونے کی نسبت سے مختلف ہوتے ہیں۔ اللہ کا فضل بہت فراخ ہے، وہ جانتا ہے کہ کون کس مرتبے کا مستحق ہے۔ کس کا ایک درہم دوسرے کے ایک ہزار درہم سے بڑھ کر ہے۔ صحیح حدیث میں مروی ہے کہ اگر تم اللہ کی راہ میں اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرو تو اس آدھے مد کو بھی نہیں پہنچتا ہے، جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خرچ کیا ہے۔[5] اس کا سبب یہی اخلاصِ عمل، حسنِ نیت، مالِ حلال اور اپنی ضرورت کو پسِ پشت ڈال کر خرچ کرنا ہے۔

---

① سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٤٩٨) اس کی سند میں ''زبان بن فائد'' ضعیف راوی ہے۔

② تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥١٥) اس کی سند میں ''خلیل بن عبداللہ'' مجہول راوی ہے۔

③ مسند أحمد (٢/ ٥٢١) اس حدیث کی سند میں ''علی بن زید بن جدعان'' ضعیف راوی ہے۔

④ تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٤٦١) صحيح ابن حبان (١٠/ ٥٠٥) اس کی سند میں ''عیسیٰ بن مسیب'' ضعیف راوی ہے۔

⑤ صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٤٠)

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ
اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٦٢﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ
اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿٢٦٣﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ
بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ
صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٦٤﴾

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد احسان نہیں جتاتے اور نہ دکھ دیتے ہیں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے، نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے (262) اچھی بات کہنا اور معاف کرنا اس صدقے سے بہتر ہے جس کے بعد دُکھ دیا جائے اور اللہ بے پروا نہایت بردبار ہے (263) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دُکھ دے کر اس شخص کی طرح ضائع نہ کرو جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کی مثال چکنے پتھر کی سی ہے جس پر مٹی پڑی ہو، پھر اس پر زور کی بارش ہو تو (ساری مٹی بہہ جائے اور) صاف چٹان رہ جائے۔ وہ (ریاکار) جو نیکی کرتے ہیں، اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا (264)

صدقہ کر کے احسان جتلانے سے ممانعت:

یعنی مانگنے والے کو نرمی سے جواب دینا اور اس کی بدخوئی سے درگزر کرنا، اس کو دے کر بار بار احسان جتلانے سے بہتر ہے۔ یہ سمجھے کہ میں نے اللہ کو دیا ہے، اس کو کیا پروا، مگر میں تو اپنا بھلا کرتا ہوں۔ اوپر دانے کی مثال فرمائی تھی، جیسے ایک دانہ بویا سات بالیں نکلیں، اس سے سات سو دانے نکلے، یہاں فرمایا کہ نیت شرط ہے۔ اگر دکھاوے کی نیت سے کیا ہے تو جیسے دانا اس پتھر میں بویا، جس پر تھوڑی سی مٹی نظر آتی تھی، جب مینہ پڑا تو وہ صاف ہو گیا، اس میں سے کیا اُگے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان لوگوں کی مدح فرمائی ہے، جو اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر کے خیرات وصدقات کے بعد احسان نہیں رکھتے اور اپنے قول وفعل سے ایذا نہیں پہنچاتے، پھر اچھی جزا کا وعدہ کیا اور ان سے حزن وغم کی نفی کی۔ قولِ معروف سے مراد کلمۂ طیبہ ہے، مثلاً: سائل کو دعا دے یا اس سے اچھی بات کہے۔ مغفرت سے مراد یہ ہے کہ جس نے قولاً یا فعلاً ظلم کیا ہے، اس کو معاف کر دیا۔ عمرو بن دینار رحمہ اللہ نے کہا کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ سے یہ بات پہنچی ہے کہ اللہ کو کوئی صدقہ اچھی بات سے زیادہ محبوب نہیں، پھر یہ آیت پڑھی۔[1]

احادیث میں صدقہ کر کے اس پر احسان جتلانے کی ممانعت آئی ہے۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: تین آدمی ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بات نہیں کرے گا، نہ ان کی طرف دیکھے گا نہ ان کو پاک کرے گا، ان کے لیے تو عذابِ الیم ہوگا: ایک ''منان''، یعنی جو دے کر احسان جتلاتا ہے، دوسرا اپنا تہبند (ٹخنے سے نیچے) لٹکانے والا، تیسرا جھوٹی قسم کھا کر اپنا سامان بیچنے والا۔[2] (رواہ مسلم) سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت یہ ہے کہ عاق، یعنی ماں باپ کا نافرمان، منان، یعنی کچھ دے کر احسان رکھنے والا، ہمیشہ شراب پینے والا اور تقدیر کو جھٹلانے والا؛ یہ سب جنت میں نہیں جائیں گے۔[3] (رواہ ابن مردویه و أحمد و ابن ماجه) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تین اشخاص کی طرف نظر نہ کرے گا: ماں باپ کا نافرمان، مُدمنِ خمر (ہمیشہ شراب پینے والا) اور دے کر احسان جتلانے والا۔[4] (رواہ ابن مردویه و ابن حبان والحاکم)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوع الفاظ یہ ہیں کہ جنت میں داخل نہیں ہوگا مُدمنِ خمر (ہمیشہ شراب پینے والا)، نہ عاق والدین (ماں باپ کا نافرمان) اور نہ منان (دے کر احسان جتلانے والا)۔[5] (رواہ النسائي و ابن أبي حاتم)

اسی لیے اللہ نے خبر دی ہے کہ جس صدقے کے بعد احسان اور ایذا دہی ہوتی ہے، اس کا ثواب اس خطا کی وجہ سے باطل ہو جاتا ہے، جس طرح ریاکار کا خرچ کیا ہوا برباد جاتا ہے۔ وہ ظاہر تو یہ کرتا ہے کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے لیے دیا ہے اور مقصد اس کا یہ ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں۔ مخلوق میں اس کی شہرت ہو کہ فلاں شخص صفاتِ جمیلہ کا مالک ہے یا بڑا سخی اور جواد (فیاض) ہے، اس کو اس معاملے میں اللہ کی مرضی اور اس کے بڑے سوال سے کوئی غرض نہیں ہے۔ یہی دنیا کی نیک نامی مطلوب ہے۔ اسی لیے یہ فرمایا کہ وہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اللہ نے ایک ریاکار خرچ کرنے والے کی ایک مثال بیان فرمائی کہ جس طرح سخت پتھر پر سے مینہ برسنے سے مٹی دھل جاتی ہے اور

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ۵۱٦)
[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۰٦)
[3] مسند أحمد (٦/ ٤٤١) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۳۳۷٦) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٦۷۵)
[4] صحیح ابن حبان (۱٦/ ۳۳٤) مستدرك الحاکم (٤/ ۱٦۳) صحیح الترغیب والترهیب (۲/ ۳۳۳)
[5] سنن النسائي الکبریٰ (۳/ ۱۷٦) تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ۵۱۷) اس کی سند حسن ہے۔

خالی پتھر رہ جاتا ہے، اسی طرح اس ریاکار کا حال ہے کہ عمل برباد گیا، وبال اور عذاب باقی رہ گیا اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔

فتح البیان میں کہا گیا ہے کہ یہ آیت: ﴿ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) سیدنا عثمان بن عفان اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کے حق میں اُتری ہے۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے غزوۂ تبوک میں ایک ہزار اونٹ مع پالان اور جملہ سامان مسلمانوں کو دیے۔ سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے چار ہزار درہم بطورِ صدقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لاکر رکھے۔ ﴿ مَنّ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ اپنے احسان گن کر بتائے کہ میں نے تیرے ساتھ یہ کیا وہ کیا۔ لوگوں سے کہے کہ میں نے فلاں شخص سے ایسا ویسا احسان کیا ہے، یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ ﴿ اَذًى ﴾ یہ ہے کہ زبان درازی کرے، گالی دے اور شکوہ شکایت کرے۔ عبدالرحمٰن بن یزید رحمہ اللہ نے کہا: میرے والد کہتے تھے: جب تو کسی شخص کو کچھ دے اور دیکھے کہ اس پر تیرا اسلام کرنا گراں ہے تو اس کو سلام نہ کر۔ عرب اس شخص کی تعریف کرتے تھے، جو نعمت کو چھپاتا اور احسان نہ رکھتا۔ وہ اظہارِ نعمت کو اور احسان رکھنے کو برا سمجھتے تھے۔[1]

قولِ معروف یہ ہے کہ اچھی بات کہے، جواب نرم دے یا وعدہ کرے یا پسِ پشت دعا دے۔ صحیح مسلم میں مروی ہے کہ کلمۂ طیبہ صدقہ ہے۔[2] من جملہ معروف کے یہ بات ہے کہ تو اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملے۔[3] مغفرت سے یہ مراد ہے کہ محتاج کی خصلتِ بد اور حالتِ بد کو چھپائے۔ سائل اگر آہ و زاری کرے، چم چچڑ ہو جائے تو تنگ نہ ہو، بلکہ معاف کرے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: قولِ معروف یہ ہے کہ سائل کو نہ ڈانٹے، "یَرْحَمُكَ اللّٰهُ، یَرْزُقُكَ اللّٰه" [اللہ تجھ پر رحمت کرے، اللہ تجھ کو رزق دے] کہے اور سخت جواب نہ دے۔[4]

اس آیت میں اس بات کا اشارہ ہے کہ احسان جتلانا، ایذا دینا اور ریاکاری کافروں کی خصلتیں ہیں۔ سیدنا محمود بن لبید رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھ کو تم پر بڑا خوف شرکِ اصغر کا ہے، پوچھا: وہ کیا؟ فرمایا: وہ ریا ہے۔ جس دن بندوں کو ان کے اعمال کی جزا دیں گے، ریاکاروں سے کہیں گے: انھی کے پاس جاؤ، جن کو تم دنیا میں دکھاتے تھے۔ دیکھو ان کے پاس کچھ خیر ہے۔[5] (رواه البغوي) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: اللہ فرماتا ہے، میں بڑا بے پروا ہوں شریکوں میں۔ جس نے کوئی کام کیا، اس میں میرے غیر کو شریک کیا تو میں اس کو اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں۔ یہ حدیث صحیح ہے۔[6]

---

[1] تفسیر الخازن (١/ ٢٨٤) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٨٢٧) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٠٩)

[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٢٦) سنن الترمذي، رقم الحدیث (١٩٧٠) [4] الدر المنثور (٢/ ٤٣)

[5] مسند أحمد (٥/ ٤٢٨، ٤٢٩) تفسیر البغوي (١/ ٣٢٦) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٩٥١)

[6] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٩٨٥) فتح البیان (٢/ ١١٧۔ ١٢١)

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾

اور ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی رضا جوئی اور پوری دلجمعی سے اپنے مال خرچ کرتے ہیں، اس باغ کی سی ہے جو کسی اونچی سطح پر ہو، اس پر زور کی بارش ہو تو وہ دوگنا پھل لائے، پھر اگر اس پر زور کی بارش نہ بھی ہو تو پھوار ہی (کافی ہے) اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اسے خوب دیکھنے والا ہے (265)

حسنِ نیت کا پھل:

مینہ سے مراد زیادہ مال خرچ کرنا ہے اور اوس سے مراد تھوڑا مال۔ لہٰذا اگر نیت درست ہے تو زیادہ خرچ کرنے کا زیادہ ثواب ہے اور تھوڑا بھی کام آتا ہے۔ جیسے خالص زمین پر باغ ہے، جتنا مینہ برسے، اس کو فائدہ ہے، بلکہ اوس بھی کافی ہے۔ نیت درست نہیں تو جتنا زیادہ خرچ کرے، ضائع ہے، کیوں کہ زیادہ مال دینے میں دکھلاوا بھی زیادہ ہے، جیسے پتھر پر جتنے زور کا مینہ برسے وہ یہ نقصان کرتا ہے کہ مٹی دھو دیتا ہے۔

یہ آیتِ شریفہ ان مومنوں کی مثال ہے جو اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان کے دل کو یقین ہے کہ اللہ ان کے خرچ کا ان کو پورا بدلے دے گا، جس طرح صحیح حدیث میں مروی ہے: «مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيْمَاناً وَّاحْتِسَاباً»[1] یعنی یہ جانتا ہے کہ اللہ نے روزے کو مشروع کیا ہے، اس کے ثواب کا اللہ کے پاس یقین رکھتا ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا: ''تثبیت'' کے معنی تصدیق و یقین کے ہیں۔ امام قتادہ اور ابو صالح بن زید رحمہم اللہ کا یہی قول ہے اور اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ امام مجاہد اور حسن رحمہما اللہ نے کہا: ''تثبیت'' کے معنی ہیں کہ سچے اور پکے دل سے صدقات و خیرات کرتے ہیں۔[2] بعض نے کہا ہے: یہ معنی ہیں کہ ان کو ایسی بصیرت حاصل ہے، جو انھیں اللہ کے راستے میں خرچ کرنے اور اطاعتِ الٰہی پر ثابت قدم رکھتی ہے۔ فتح البیان میں اس کو زیادہ قابلِ ترجیح کہا گیا ہے۔[3]

''رَبْوَة'' باغ کو کہتے ہیں۔ جمہور کے نزدیک یہ ٹیلے کو کہتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ زمین سے اونچے اس مقام کو کہتے ہیں، جس میں نہریں جاری ہوں۔[4] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ربوہ پیش، زبر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۸) صحيح مسلم، رقم الحديث (۷٦۰)

[2] تفسير الطبري (۵/ ۵۳۱۔ ۵۳۳) [3] فتح البيان ۲۰/ ۱۲۲)

[4] تفسير ابن كثير (۱/ ٤١٦) البتہ تفسیر طبری میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول میں نہریں جاری ہونے کی نفی کا ذکر ہے۔ دیکھیں: تفسير الطبري (۵/ ۵۳۷) اس کی سند میں ''حسین بن داود'' ضعیف راوی ہے۔

اور زیر تینوں کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔ ضم سے اہلِ مدینہ وحجاز وعراق کی عام قراءت ہے۔ فتح سے بعض اہلِ شام اور بعض اہلِ کوفہ کی قراءت ہے۔ لغتِ تمیم بھی یہی ہے۔ کسرہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی قراءت ہے۔[1] ﴿ وَابِلٌ ﴾ زور کے مینہ کو کہتے ہیں۔ ''اُکُل'' پھل کو کہتے ہیں، یعنی اور باغوں کی نسبت اس میں دوگنا یا چار گنا میوہ آتا ہے۔ ''طَلٌّ'' نرم پانی کو کہتے ہیں، جسے اوس بولتے ہیں۔ ذاذ بھی کہتے ہیں، وطشن وندی بھی بولتے ہیں، یعنی وہ باغ جو اس اونچی جگہ پر ہے، کبھی سوکھا نہیں رہتا۔ اگر اس پر مینہ نہیں برسا تو اوس پڑتی ہے، کچھ بھی ہو، وہ باغ کے لیے کافی وافی ہوتا ہے۔ اسی طرح مومن کے عمل کا حال ہے کہ کبھی برباد نہیں جاتا، بلکہ اللہ اس کو ہر عامل کے حال اور عمل کے مطابق قبول کرتا اور بڑھاتا رہتا ہے۔ اسی لیے یہ فرمایا ہے کہ اللہ پر تمھارا کوئی کام پوشیدہ نہیں ہے۔ اس آیت میں اخلاص کی ترغیب اور ریا سے ترہیب (ڈرانا) ہے۔ اس میں وعدہ اور وعید دونوں موجود ہیں۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢٦٦﴾

کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اس باغ میں اس کے لیے ہر قسم کے پھل ہوں اور اسے بڑھاپا آجائے، جب کہ اس کی اولاد کمزور ہو، پھر (اچانک) اس باغ پر ایسا بگولا آپڑے جس میں آگ ہو اور وہ اسے جلا کر رکھ دے؟ اس طرح اللہ تمھارے لیے آیتیں کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ تم غور وفکر کرو ﴿266﴾

برائیوں کی وجہ سے نیکیوں کے ضائع ہونے کی مثال:

یہ اس احسان رکھنے والے کی مثال بیان فرمائی، جو اپنی اچھائیوں کو ضائع کر دیتا ہے، جیسے جوانی کے وقت اس اُمید سے باغ حاصل کیا کہ بڑی عمر میں کام آئے گا، لیکن وہ عین کام کے وقت جل گیا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا: بتاؤ! یہ آیت کس کے حق میں اتری ہے؟ کہا گیا: اللہ جانے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے غصہ کیا اور کہا: ایک بات کہو کہ ہم جانتے ہیں یا نہیں جانتے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اے امیر المومنین! میرے دل میں اس آیت کے متعلق ایک بات آئی ہے، کہا: اے بھتیجے! کہہ ڈال، اپنے

[1] تفسير الطبري (٥/ ٥٣٦)

آپ کو حقیر نہ سمجھ۔ انھوں نے کہا: یہ عمل کی مثال ہے۔ پوچھا: کون سا عمل؟ کہا: ایک آسودہ شخص نے اللہ کی اطاعت کی، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے شیطان بھیجا، وہ گناہ کرنے لگا، یہاں تک کہ اس کے سارے عمل ڈوب گئے۔[1] یہ روایت افرادِ بخاری سے ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس آیت کی تفسیر کے لیے کافی ہے۔[2]

اس آیت میں اس بات کا بیان ہے کہ ایک شخص نے پہلے اچھے کام کیے، پھر اس کی عادت بدل گئی، نیکیاں برائیاں ہوگئیں، اس نے اپنے پہلے عمل کو پچھلے عمل سے باطل کر ڈالا، جب سخت تنگی کا وقت آیا تو اب پہلے عملوں کا محتاج ہوا، وہ اب کہاں ہاتھ آتے ہیں، وہ تو ہاتھ سے نکل گئے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بڑھاپے میں بچے تھے، اچانک ایک آگ کا بگولا اُٹھا، اس نے پھل اور درخت جلا کر خاک سیاہ کر دیے۔ کہو! اب اس کا حال کیا ہوگا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ نے یہ بہت اچھی مثال بیان فرمائی ہے، اس کی ساری مثالیں اچھی ہوتی ہیں، بڑھاپے میں جب بچے بھی نادان تھے، اس باغ کو ضائع کیا، اب کچھ قوت باقی نہیں رہی کہ اس کو دوبارہ بوئے، نہ اس کے بچے اس لائق کہ کچھ بھلائی کر سکیں، وہ باغ آخر عمر میں جل گیا، اب کچھ نہ رہا۔ اسی طرح کافروں کا قیامت کے دن حال ہوگا کہ جب کافر اللہ کے پاس جائے گا تو کوئی بھلائی اس کے پاس نہیں ہوگی، اگر کوئی بھلا کام کیا بھی تو وہ بھی باقی بچا نہ کچھ کام آیا، جس طرح اس بوڑھے شخص کی اولاد کام نہیں آتی۔ لہٰذا جس طرح وہ شخص اپنے باغ سے محروم ہوگیا، اسی طرح یہ کافر اپنے عملِ خیر سے خالی ہاتھ رہ گیا۔[3]

حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کیا کرتے تھے: «اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ أَوْسَعَ رِزْقِكَ عَلَيَّ عِنْدَ كِبَرِ سِنِّيْ وَانْقِضَاءِ عُمُرِيْ»[4] (رواہ الحاکم) ''اے اللہ! بڑھاپے میں مجھ پر اپنا رزقِ فراخ نازل فرما۔'' اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ یہ مثال تمھیں سمجھانے کے لیے بیان کی گئی ہے، شاید تم کچھ سوچو سمجھو۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ﴾ [العنکبوت: ۴۳] ''اور یہ مثالیں ہم لوگوں (کو سمجھانے) کے لیے بیان کرتے ہیں اور انھیں بس علم والے ہی سمجھتے ہیں۔''

فتح البیان میں ہے کہ یہ آیت اس شخص کی تمثیل ہے، جو عملِ خیر کرتا ہے، پھر اس عمل سے ایسی چیز ملاتا ہے، جو اسے ضائع کر دیتی ہے۔ قیامت میں جب اس کو شدید حاجت ہوگی تو وہ اس عملِ خیر کو بے کار اور غیر نفع بخش پائے گا، جس طرح باغ والے نے آخر عمر میں اس باغ کو ویران پایا۔[5]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٦٤) [2] تفسير ابن كثير (١/ ٤١٧)

[3] تفسير الطبري (٥/ ٥٤٨) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥٢٣۔ ٥٢٤) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

[4] مستدرك الحاكم (١/ ٧٢٦) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٣٨٥) [5] فتح البيان (٢/ ١٢٥)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاۗءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾ ۙ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم ان پاکیزہ چیزوں میں سے خرچ کرو جو تم کماتے ہو اور ان میں سے بھی جو ہم نے تمھارے لیے زمین میں سے نکالی ہیں اور مت ارادہ کرو (اللہ کی راہ میں) ردی اور خراب چیز خرچ کرنے کا، جب کہ تم (خود) تو وہ (چیز) لینا بھی پسند نہیں کرتے، الا یہ کہ اس کی بابت تم چشم پوشی کر جاؤ اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ بے پروا ہے، قابلِ تعریف ہے (267) شیطان تمھیں تنگ دستی سے ڈراتا ہے اور تمھیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اللہ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ وسعت والا، خوب جاننے والا ہے (268) اللہ جسے چاہتا ہے حکمت دیتا ہے اور جس شخص کو حکمت دی گئی تو اسے بہت بھلائی عطا کی گئی اور (ان باتوں سے) عقل مند ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں (269)

اللہ کی راہ میں پاکیزہ مال خرچ کرنے کی ترغیب:

موضح قرآن میں فرمایا ہے: یعنی صدقہ قبول ہونے کی یہ شرط بھی ہے کہ مال حلال کمایا ہو، حرام نہ ہو اور بہتر چیز اللہ کی راہ میں دی جائے۔ یہ نہیں کہ بری چیز خیرات میں دے دی جائے کہ لینے دینے میں خود تو ویسی چیز مجبوری کے بغیر قبول نہ کرے، کیوں کہ اللہ بے پروا ہے، محتاج نہیں، خوبیوں والا ہے، خوب سے خوب چیز پسند کرتا ہے۔ جب دل میں خیال آئے کہ مال خیرات میں دوں تو محتاج مفلس ہو جاؤں گا، لیکن ہمت آئے تو بے حیائی پر خرچ کر ڈالے، لیکن اللہ کی تاکید سن کر بھی راہِ حق میں خرچ نہ کرے تو جان لے کہ یہ خیال شیطان کی طرف سے آیا ہے اور جب یہ خیال آئے کہ خیرات سے گناہ بخشے جائیں گے اور اگر اللہ نے چاہا تو اور دے گا، اس کے ہاں کوئی کمی نہیں ہے تو جان لو! یہ خیال اللہ کی طرف سے آیا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے مومن بندوں کو خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، اس خرچ سے مراد صدقہ

ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی قول ہے۔[1] ﴿طَيِّبٰتِ﴾ سے مراد تجارت ہے، جس کو اللہ نے ان پر آسان کر دیا ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سونا اور چاندی، پھل اور کھیتی مراد ہے، جس کو اللہ نے ان کے لیے زمین سے برآمد کیا ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: ان کو حکم دیا ہے کہ اپنے پاکیزہ، عمدہ اور نفیس مالوں میں سے خرچ کریں۔[3] رذیل، نکمے اور خبیث مال میں سے خرچ کرنے سے منع کیا ہے۔ اللہ پاک ہے اور وہ پاک مال ہی قبول کرتا ہے۔ یہ اس لیے فرمایا ہے کہ گندی چیز دینے کی نیت نہ کرو کہ اگر ویسی خراب اور نکمی چیز کوئی تم کو دے تو تم اس کو کبھی نہ لو، لہٰذا جس چیز کو تم خود نہیں لیتے، اس چیز کو اللہ کی راہ میں دیتے ہو، اللہ اس کو کیوں لے گا؟ خدانخواستہ وہ محتاج نہیں ہے کہ ہر گری پڑی، اچھی بری چیز لے لے۔[4]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے جس طرح تمھارے درمیان رزق تقسیم کیا ہے، اسی طرح اخلاق بھی تقسیم کیے ہیں۔ اللہ جس کو چاہتا ہے دنیا دیتا ہے اور جس کو نہیں چاہتا، نہیں دیتا۔ مگر دین صرف اسی کو دیتا ہے، جس سے محبت کرتا ہے، لہٰذا جس کو اس نے دین دیا ہے، اس سے وہ محبت کرتا ہے۔ اس کی قسم ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! بندہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوتا، جب تک اس کا دل اور زبان سلامت نہ ہو اور اس وقت تک ایمان والا نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا ہمسایہ اس کے ظلم اور اس کی آفتوں سے امن میں نہ ہو۔ بندہ اگر حرام مال کماتا ہے، پھر اس کو خرچ کرتا ہے تو اس میں برکت نہیں ہوتی۔ اس میں سے اگر کوئی صدقہ دیتا ہے تو وہ قبول نہیں ہوتا۔ اس مالِ حرام کو اگر اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے تو وہ آگ کی طرف اس کا زادِ راہ ہوتا ہے، اللہ بدی کو بدی سے نہیں مٹاتا، لیکن بدی کو نیکی سے مٹا دیتا ہے، گندگی گندگی کو دور نہیں کرتی۔[5] (رواہ أحمد)

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ آیت انصار کے حق میں اُتری ہے، جب کھجور کاٹنے کا وقت آتا تو اس کی ایک ڈال [درخت کی بڑی شاخ] لا کر مسجدِ نبوی کے دو ستونوں کے درمیان لٹکا دیتے، فقرائے مہاجرین اس کو کھاتے۔ بعض لوگ نکمی سڑی ہوئی کھجور لا کر اس میں ملا دیتے اور اس کو جائز سمجھتے تو اس پر یہ آیت اتری۔ (رواہ ابن ماجه و ابن جریر و ابن مردویه و الحاکم، وقال: صحیح علی شرطهما، ولم یخرجاہ) اس سببِ نزول کو ابن ابی حاتم اور نسائی اور ترمذی نے بھی روایت کیا ہے اور حسن غریب کہا ہے۔[6] سیدنا عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ

---

[1] تفسیر الطبري (٥/ ٥٥٥) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسیر الطبري (٥/ ٥٥٦۔ ٥٥٧) تفسیر ابن کثیر (١/ ٤١٧)

[3] تفسیر الطبري (٥/ ٥٥٦۔ ٥٥٧) اس کی سند حسن ہے۔ [4] تفسیر ابن کثیر (١/ ٤١٧۔ ٤١٨)

[5] مسند أحمد (١/ ٣٨٧) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ورجال إسنادہ بعضهم مستور، وأکثرهم ثقات" (مجمع الزوائد: ١/ ٢١٣)

[6] سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٨٢٢) تفسیر الطبري (٥/ ٥٥٩۔ ٥٦٠) مستدرك الحاکم (٢/ ٣١٣) تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٥٢٨) سنن النسائي، رقم الحدیث (٢٤٩٢) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٩٨٧) اس کی سند صحیح ہے۔

مسلمان کی کمائی گندی نہیں ہوتی، مگر نکمی چیز، کھوٹا روپیہ پیسہ اور برا مال صدقہ نہ کرے۔[1] کسی نے کہا ہے: اس جگہ طیبات سے مراد حلال مال ہے، یعنی اچھا مال بھی ہو، حرام بھی نہ ہو۔ کسی نے کہا ہے: اس آیت میں کمائی کرنے کے جواز پر دلیل ہے۔ سیدنا مقدام رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے: کسی نے کوئی کھانا اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر نہیں کھایا۔[2] (رواه البخاري) انفاق سے اس جگہ فرض زکات یا نفل صدقہ مراد ہے یا دونوں مقصود ہیں۔ امر کا صیغہ وجوب کا فائدہ دیتا ہے۔

زمین کی پیداوار پر زکات کا مسئلہ:

آیت میں زمین کی ہر پیداوار پر زکات کے وجوب کی دلیل ہے، لیکن جمہور اس عمومی حکم کو خاص کہتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ زکات خاص طور پر اس چیز پر ہے جس کو آدمی خود بوئے اور خود ہی کھائے، اور وہ حدِ نصاب کو پہنچتی ہو۔ کھجور اور انگور اسی میں داخل ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ آیت عام ہے، اس لیے زمین کی ہر پیداوار پر زکات واجب ہے، جیسے میوے، سبزیاں، خربوزے، ککڑی، کھیرے؛ ان سب میں، قلیل ہوں یا زیادہ، دسواں حصہ ہے، مگر پہلا قول صحیح ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: بعض لوگ سستا غلہ خرید کر صدقہ کرتے ہیں، اس پر یہ آیت اُتری تھی۔[3]

شیطان کا فقر کا خوف دلانا:

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ شیطان ابن آدم کی طرف اترتا ہے اور فرشتہ بھی اس کی طرف اترتا ہے۔ شیطان کا اترنا یہ ہے کہ وہ شر کا حکم دیتا ہے اور حق بات کو جھٹلانے کا حکم کرتا ہے، جبکہ فرشتے کا اترنا یہ ہے کہ وہ بھلائی کا حکم دیتا ہے اور حق کی تصدیق کرنے کا حکم دیتا ہے، لہٰذا جو کوئی یہ پائے تو اس کو اللہ کی طرف سے سمجھے، الحمد للہ کہے، جو کوئی وہ پائے تو شیطان سے پناہ مانگے، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴾ [البقرة: ٢٦٨] ''شیطان تمھیں تنگ دستی سے ڈراتا ہے اور تمھیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اللہ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ وسعت والا، خوب جاننے والا ہے۔''[4] (رواه ابن أبي حاتم و الترمذي و النسائي و ابن حبان و أبو يعلى)

امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے، شیطان کے وعدہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تم کو محتاجی

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥٢٧) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٦٦)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥٢٦) اس کی سند حسن ہے۔

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥٢٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٨٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٠٥) صحيح ابن حبان (٣/ ٢٧٨) مسند أبي يعلىٰ (٨/ ٤١٧) اس کی سند حسن ہے۔

سے ڈراتا ہے اور کہتا ہے: جو کچھ تمھارے پاس ہے، اسے روکے رکھو، اللہ کی مرضی میں خرچ نہ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ فقیر ہو کر رہ جاؤ۔ اس کے سوا یہ حکم کرتا ہے کہ تم اللہ کی نافرمانی اور گناہ کے کام اور جن کو حرام کیا گیا ہے، وہ کام کرو، خوب عیش کرو اور مزے اڑاؤ۔ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہم تم سے مغفرت کا وعدہ کرتے ہیں، یعنی جو کچھ تم میری اطاعت، رضا اور راہ میں خرچ کرو گے، اس کے عوض تم کو جنت ملے گی۔ دیکھو دونوں وعدوں کے درمیان کس قدر فرق ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اس آیت میں حکمت سے مراد قرآن کے ناسخ و منسوخ، محکم اور متشابہ، مقدم و موخر، حلال و حرام کا پہچاننا ہے۔[1]

حکمت کی تفہیم:

دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ حکمت قرآن ہے، یعنی اس کی تفسیر ہے، کیوں کہ قرآن کو ہر نیک و بد پڑھتا ہے۔[2] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: حکمت سے مراد ٹھیک بات کہنا ہے، حکمت نبوت تو نہیں ہے، مگر علم اور سمجھ ہے۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ کا ڈر ہے، کیوں کہ اللہ سے ڈرنا ہر حکمت کی اساس ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت یہ ہے کہ حکمت کی اساس اللہ کا خوف ہے۔[4] امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ حکمت کتاب کا فہم ہے۔ امام نخعی رحمہ اللہ نے کہا: فہم ہے۔ امام ابو مالک رحمہ اللہ نے کہا: سنت ہے، یعنی حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ زید بن اسلم رحمہ اللہ نے کہا: عقل ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا: میرے جی میں آتا ہے کہ حکمت اللہ کے دین کا فہم ہے، اللہ اپنے فضل و کرم سے اس کو دلوں میں داخل کرتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک آدمی دنیا کے کام میں ہوشیار ہوتا ہے، دوسرا شخص دنیا کے کام میں ضعیف اور دین کے معاملے میں عالم اور صاحبِ بصیرت ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو دین کی ہوشیاری دی، دنیا سے محروم رکھا، پس حکمت فقہ فی الدین ٹھہری۔ فقہ سے مراد فہم ہے نہ کہ اصطلاحِ عام۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: حکمت نبوت ہے۔[5]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ حکمت نبوت کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ عام ہے۔ اعلیٰ درجے کی حکمت نبوت ہے، رسالت بہت خاص چیز ہے، لیکن انبیا کی پیروی کرنے سے خیر سے ایک حصہ ملتا ہے، جس طرح بعض احادیث میں مروی ہے کہ جس نے قرآن حفظ کرلیا، اس کے دونوں کندھوں کے درمیان نبوت رکھ دی گئی۔ اتنی

---

① تفسیر الطبري (٥/ ٥٧٦) اس کی سند حسن ہے۔ ② تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٢٠)

③ تفسیر الطبري (٥/ ٥٧٧) تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٥٣١)

④ شعب الإیمان (١/ ٤٧٠) اس کی سند میں ''ابو عمار اسدی'' مجہول راوی ہے۔ نیز امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کو موقوفاً بھی روایت کیا ہے۔ دیکھیں: شعب الإیمان (١/ ٤٧٠)

⑤ تفسیر الطبري (٥/ ٥٧٦۔ ٥٧٩) تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٥٣٢)

بات ہے کہ اس کو وحی نہیں آتی۔[1] (رواہ وکیع) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: حسد نہیں کیا جاسکتا، مگر دو آدمیوں پر، ایک وہ شخص، جس کو اللہ نے مال دیا، وہ اس کو حق کے راستے میں خوب خرچ کر رہا ہے۔ دوسرا وہ شخص جس کو حکمت دی اور وہ اس کے مطابق حکم کرتا ہے، اس کو آگے سکھا رہا ہے۔[2] (رواہ أحمد والشیخان والنسائي و ابن ماجه من طریق متعددة)

فتح البیان میں مذکورہ اقوال کے بعد کہا گیا ہے کہ یہ سب اقوال ایک دوسرے کے قریب ہیں۔[3] اگر لفظِ حکمت کو ان تمام اقوال میں شامل یا اس جیسا سمجھیں تو کوئی حرج نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ہر کسی عالم نے اچھی خصلت، اچھے اخلاق، عملِ صالح یا علمِ نافع کو اپنے فہم کے مطابق، حکمت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔ حکمت کی سب سے بہتر تفسیر جس کی طرف اکثر سلف گئے ہیں، یہ ہے کہ حکمت سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، خصوصاً اس جگہ جہاں حکمت کا لفظ کتاب کے ساتھ آیا ہے اور جس جگہ اکیلا آیا ہے، جیسے آیت زیرِ تفسیر میں، وہاں بھی کوئی مانع نہیں یا وہاں قرآن مراد ہے، کیوں کہ قرآن کا ایک نام ذکرِ حکیم بھی ہے۔ پھر جب حکمت قرآن و حدیث ٹھہر چکی تو سارے اقوال اس کے اندر آ گئے۔ قرآن و حدیث دونوں کا حکمت ہونا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کتاب و سنت میں کمال اتحاد ہے، یعنی اس ایک لفظ سے جو مراد ہے تو دوسری چیز بھی اس میں داخل ہے۔ قرآن اتباعِ سنت اور اطاعتِ رسول کا حکم کرتا ہے اور سنت کتاب اللہ کے ساتھ تمسک کرنے کو ارشاد کرتی ہے۔ وللہ الحمد۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ حکمت خواہ قرآن ہو یا سنت، اللہ تعالیٰ نے اس کو خیرِ کثیر فرمایا ہے۔ خیرِ کثیر سے مراد وہ علمِ نافع ہے جو عملِ صالح کی طرف پہنچا دے، جس کا انجام سعادتِ ابدی، رضوانِ سرمدی اور نجاتِ دائمی ہوتا ہے۔ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا.

وَمَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝۲۷۰ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۲۷۱

اور تم کسی قسم کا خرچ کرو یا کوئی بھی نذر مانو تو بے شک اللہ اسے جانتا ہے اور ظالموں کا کوئی

---

[1] مستدرك الحاكم (١/ ٧٣٨) امام البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو سلسلہ ضعیفہ میں ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کا موقوف ہونا صحیح ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥١١٨)

[2] تفسير ابن كثير (١/ ٤٢٠) مسند أحمد (١/ ٤٣٢) صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨١٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٣/ ٤٢٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٠٨)

[3] فتح البيان (٢/ ١٣٠)

مددگار نہیں ﴿270﴾ اگر تم ظاہر کر کے صدقات دو تو یہ اچھی بات ہے اور اگر تم اسے چھپا کر فقیروں کو دو تو وہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے، وہ (اللہ) تم سے تمھارے گناہ دور کر دے گا اور تم جو بھی عمل کرتے ہو، اللہ اس کی خوب خبر رکھتا ہے ﴿271﴾

صدقہ چھپا کر کرنے کی فضیلت:

یعنی منت مانی تو واجب ہوگئی، اب ادا نہ کرے تو گناہ گار ہے۔ نذر اللہ کے سوا کسی کی نہیں ماننی چاہیے۔ اگر یہ کہے کہ اللہ کے لیے فلاں شخص کو دوں گا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اگر نیت دکھلاوے کی نہ ہو تو کھلے عام خیرات بھی بہتر ہے کہ دوسروں کو شوق پیدا ہو۔ چھپی ہوئی خیرات بھی بہتر ہے کہ لینے والا نہ شرمائے۔ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ صدقہ ظاہر کر کے دینے سے چھپا کر دینا افضل ہے، کیوں کہ یہ ریا سے دور تر ہے، لیکن اگر اظہار میں کوئی اور مصلحت ہو تو اس حیثیت سے اظہار افضل ہو جائے گا، مگر اس آیت کا منشا یہی ہے کہ چھپا کر دینا کھلے عام دینے سے بہتر ہوتا ہے۔ صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ سات شخصوں کو اللہ قیامت کے دن اپنے سائے میں رکھے گا، ان میں ایک شخص وہ ہے جس نے کوئی صدقہ چھپا کر دیا، حتی کہ بائیں ہاتھ نے نہ جانا کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا ہے۔[1]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جب اللہ نے زمین کو پیدا کیا تو وہ تھرتھرانے لگی، پہاڑ پیدا کر کے اس پر رکھ دیے تو تھم گئی۔ فرشتوں نے پہاڑوں کی پیدایش پر تعجب کیا، کہا: اے رب! بھلا ان پہاڑوں سے بھی زیادہ سخت تیری کوئی مخلوق ہے؟ فرمایا: ہاں، لوہا ہے۔ کہا: بھلا لوہے سے بھی زیادہ سخت تیری کوئی مخلوق ہے؟ فرمایا: ہاں، آگ ہے۔ پوچھا: آگ سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز ہے؟ فرمایا: ہاں، پانی ہے۔ پوچھا: پانی سے زیادہ سخت کوئی چیز ہے؟ فرمایا: ہاں، ہوا ہے۔ کہا: ہوا سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز ہے؟ فرمایا: ہاں! بنی آدم سید ہے۔ دائیں ہاتھ سے صدقہ دیتا ہے اور اس کو بائیں ہاتھ سے بھی چھپاتا ہے۔[2] (رواہ أحمد) ایک حدیث میں مروی ہے کہ پوشیدہ صدقہ اللہ کے غضب کو بجھا دیتا ہے۔[3]

عامر شعبی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ آیت سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے حق میں اتری ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ آدھا مال لے کر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تھے تو پوچھا: گھر کے لیے کیا چھوڑ آئے؟ کہا: آدھا مال۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سارا مال

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٢٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٣١)

[2] مسند أحمد (٣/ ١٢٤) اس کی سند میں "سلیمان بن ابی سلیمان" متکلم فیہ راوی ہے۔ ضعیف الترغیب والترھیب (١/ ١٣٣)

[3] المعجم الکبیر (١٩/ ٤٢١) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (١٩٠٨)

لے کر آئے، اپنی جان سے بھی گویا چھپایا۔ نبی اکرم ﷺ نے پوچھا: گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ آئے؟ کہا: اللہ اور رسول ﷺ کو۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے رو کر کہا: اے ابوبکر رضی اللہ عنہ! میرے ماں باپ تم پر صدقے، ہم نے بھلائی کے کسی دروازے کی طرف سبقت نہ کی، مگر تم ہی سبقت کر گئے۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم)

یہ حدیث اور طرح بھی آئی ہے، لیکن ہم نے اس جگہ اس کو قولِ شعبی سے اس لیے روایت کیا ہے کہ انھوں نے اس آیت کا نزول ان کے حق میں بتایا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیت اس بارے میں عام ہے کہ صدقہ کو چھپانا بہتر ہے، خواہ فرض ہو یا مستحب۔[2] لیکن امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نفل صدقہ چھپا کر دینے کو علانیہ طور پر دینے پر ستر درجے فضیلت دی ہے اور اس کے برعکس فرض صدقہ علانیہ طور پر دینے کو چھپا کر دینے پر پچیس درجے فضیلت دی ہے۔ سارے فرائض، نوافل اور دیگر اشیا کا یہی حال ہے۔[3]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ بھی ہے کہ اس آیت پر عمل سورت براءت کے نازل ہونے سے پہلے تھا، جب سورت براءت اتری اور اس میں صدقات و فرائض کی تفصیل آئی تو تمام صدقات اسی کے مطابق ہو گئے۔[4] ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ آیت زیرِ تفسیر منسوخ ہے، اسی طرح وہ آیت: ﴿ وَفِيٓ أَمۡوَٰلِهِمۡ حَقّٞ لِّلسَّآئِلِ وَٱلۡمَحۡرُومِ ۝١٩ ﴾ [الذاريات: ١٩] ”اور ان کے مالوں میں سوالی اور محروم (نہ مانگنے والے) شخص کا حق (حصہ) ہوتا تھا۔“ پھر کہا: ہر صدقہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے، اس کو سورت توبہ کی اس آیت نے منسوخ کر دیا: ﴿ إِنَّمَا ٱلصَّدَقَٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ ﴾ [التوبة: ٦٠] ”زکات تو صرف فقیروں کے لیے ہے۔“[5]

نذر کے لیے ضابطہ:

فتح البیان میں ہے کہ آیت زیرِ تفسیر حکمِ کلی ہے، جو ہر صدقہ مقبول و غیر مقبول اور ہر نذر مقبول و غیر مقبول کو شامل ہے۔ اس آیت میں اس شخص کے لیے وعدہ ہے، جس نے کسی ایسی وجہ سے خرچ کیا یا نذر مانی، جو اللہ کے ہاں

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٥٣٦) اس قصے کو مذکورہ آیت کے شانِ نزول میں ذکر کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ عامر شعبی رحمہ اللہ کی ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے ملاقات ثابت نہیں ہے اور اس سند میں ”موسیٰ بن عمیر قرشی“ متروک راوی ہے۔ البتہ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے صدقہ کرنے کا قصہ کتبِ سنن وغیرہ میں مروی ہے۔ نیز امام البانی رحمہ اللہ نے اس قصے کو حسن کہا ہے۔ دیکھیں: سنن أبي داود، رقم الحدیث (١٦٧٨) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٦٧٥)

[2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٢٢) [3] تفسیر الطبري (٥/ ٥٨٣) تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٥٣٦) اس کی سند حسن ہے۔

[4] تفسیر الطبري (٥/ ٦٠٢) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

[5] الدر المنثور (٢/ ٧٨) سورت توبہ کی آیت سے اس کو منسوخ قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ دونوں کے الگ الگ محل ہیں۔ ایک کا تعلق صدقاتِ نافلہ سے ہے، جب کہ سورت توبہ کی آیت میں صدقاتِ واجبہ، یعنی مصارفِ زکات کا بیان ہے۔ [ص۔ ي]

مقبول ہے اور اس شخص کے لیے وعید ہے، جس نے اس کے برعکس کیا۔ حدیث میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے لیے نذر نہیں ہے۔[1] دوسری روایت اس طرح ہے کہ جس نے یہ نذر کی ہو کہ اللہ کی اطاعت کرے گا تو وہ اطاعت کرے، یعنی نذر پوری کرے اور جس نے یہ نذر کی ہو کہ وہ اللہ کی معصیت کرے گا تو وہ معصیت نہ کرے۔[2] تیسری حدیث یہ ہے کہ نذر وہ ہے جس سے اللہ کی رضا مقصود ہو۔[3] نذر کا کفارہ مشہور ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ
خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ
خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُهُمُ
الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْــَٔـلُوْنَ
النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ اَلَّذِيْنَ
يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ
رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

(اے نبی!) لوگوں کو ہدایت دینا آپ کی ذمے داری نہیں، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور تم اپنے مال میں سے جو خرچ کرو، وہ تمھارے اپنے فائدے کے لیے ہے اور تم جو کچھ خرچ کرتے ہو، وہ اللہ کی رضا حاصل کرنے ہی کے لیے کرتے ہو اور تم اپنے مال میں سے جو خرچ کرو گے اس کا تمھیں پورا پورا صلہ دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا (272) (صدقات تو) ان ضرورت مندوں کے لیے ہیں جو اللہ کے کاموں میں ایسے مشغول ہوں کہ (اپنے روزگار کے لیے) زمین میں دوڑ دھوپ نہ کر سکتے ہوں، ناواقف شخص ان کے سوال نہ کرنے کی وجہ سے انھیں مال دار خیال کرے، تم انھیں ان کے چہروں سے پہچان لو گے، وہ لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے اور تم اپنے مال میں سے جو کچھ خرچ کرتے ہو، بے شک اللہ اسے خوب

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤١) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٧٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٢٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٨١٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١٢٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٣٢٢)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٧٣) صحيح الجامع (٧٥٢٢)

جاننے والا ہے﴿273﴾ جو لوگ اپنے مال خرچ کرتے ہیں رات اور دن میں، چھپا کر اور ظاہر، ان کے رب کے ہاں ان کے لیے اجر ہے، نہ انھیں کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے﴿274﴾

دین کے لیے وقف افراد کے لیے صدقہ:

یعنی ان کو دینا بڑا ثواب ہے، جو اللہ کی راہ میں محبوس ہو گئے ہیں، کما نہیں سکتے اور نہ اپنی حاجت ظاہر کرتے ہیں، جیسے نبی مکرم ﷺ کے صحابہ، اہلِ صفہ تھے۔ علم سیکھنے اور جہاد کرنے کے لیے انھوں نے گھر بار چھوڑ کر آپ ﷺ کی صحبت اختیار کی تھی۔ اسی طرح اب بھی جو قرآن حفظ کرے یا علمِ دین میں مشغول ہو تو لوگوں کے لیے اس کی مدد کرنا لازمی ہے۔ یہاں تک خیرات کا بیان تھا، آگے سود کو حرام کیا۔ جب خیرات کا حکم ہے تو قرض دینا کم درجہ رکھتا ہے، قرض پر سود کیوں لیا جائے؟ یعنی نہیں لینا چاہیے۔

مشرکوں کے لیے صدقہ کرنے کا حکم:

امام نسائی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ اپنے ہم نسب مشرکوں کو خیرات دینا مکروہ سمجھتے تھے، اللہ نے رخصت دی اور یہ آیت نازل فرمائی۔[1] ان کی دوسری روایت یہ ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے حکم دیا تھا کہ صدقہ صرف اہلِ اسلام پر کریں، جب یہ آیت اُتری تو حکم دیا خواہ وہ کسی دین سے تعلق رکھتا ہو، جب سوال کرے تو اس کو صدقہ دو۔[2] (رواه ابن أبي حاتم) یہ ارشاد کہ جو خرچ کرو گے، سو اپنے فائدے کے واسطے ہے، اس آیت کے مثل ہے: ﴿ مَنْ عَمِلَ صَٰلِحًا فَلِنَفْسِهِۦ ﴾ [حٰمٓ السجدة: ٤٦] ''جس نے نیک عمل کیا تو اس کے اپنے ہی لیے ہے۔'' اس کی مثالیں قرآن پاک میں بہت ہیں۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا کہ مومن کا خرچ کرنا اپنی جان کے لیے ہے، مومن جو کچھ خرچ کرتا ہے وہ اللہ کی رضا چاہتا ہے۔ امام عطاء خراسانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب تو نے کسی کو اللہ کے لیے دے دیا تو تمھارے لیے یہ جاننا ضروری نہیں کہ وہ لے کر کیا کرے گا۔[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ معنی اچھا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جب صدقہ کرنے والے نے اللہ کی رضا کے لیے صدقہ دیا تو اس کا اجر اللہ پر ثابت ہو گیا۔ دینے والے پر نفس الامر کا مواخذہ نہیں ہے کہ وہ صدقہ کہاں پہنچا، نیک کو پہنچا یا بد کو، مستحق کو یا غیر مستحق کو، اس کو اس کی نیت کا ثواب ملے گا۔ اس آیت کا آخری حصہ ہے: ﴿ وَمَا تُنفِقُوا۟ مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٢﴾ ﴾ ''اور تم اپنے مال میں سے جو خرچ کرو گے اس کا تمھیں پورا پورا صلہ دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''[4]

---

[1] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٠٥) مستدرك الحاكم (٢/ ٣١٣) امام حاکم اور ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥٣٩) اس کی سند حسن ہے۔ [3] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥٣٩) [4] تفسير ابن كثير (١/ ٤٢٣)

صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ایک آدمی نے کہا: آج کی رات میں صدقہ دوں گا۔ جب صدقہ لے کر نکلا تو ایک زانیہ کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ صبح کو لوگ چرچا کرنے لگے کہ کسی نے زانیہ کو صدقہ دیا۔ اس نے کہا: اے اللہ! تیری تعریف ہے زانیہ پر صدقہ ہوگیا ہے! آج کی رات پھر صدقہ دوں گا اور اب کی بار وہ صدقہ ایک غنی کو دے دیا۔ صبح کو لوگوں نے چرچا کیا کہ کسی نے غنی کو صدقہ دیا۔ کہا: اے اللہ! تیری تعریف ہے غنی پر صدقہ ہوگیا ہے۔ آج کی رات پھر صدقہ دوں گا، پھر جب صدقہ لے کر نکلا تو ایک چور کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ صبح ہوئی تو لوگوں نے کہا: کسی نے چور کو صدقہ دیا۔ کہا: "اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ عَلٰى زَانِيَةٍ وَعَلٰى غَنِيٍّ وَعَلٰى سَارِقٍ" "یا اللہ! تیرا شکر ہے صدقے پر جو زانیہ اور غنی اور چور پر (بسبب بے خبری) واقع ہوا۔" اس کے پاس کوئی آنے والا آیا اور اس سے کہا گیا کہ تیرا صدقہ قبول ہوا، اس طرح شاید زانیہ زنا سے بچے، شاید غنی عبرت پکڑے، جو اللہ نے اس کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرے، شاید چور چوری سے باز رہے۔[1] معلوم ہوا کہ جب نیت درست ہوتی ہے اور کام خالص اللہ کے لیے کیا جاتا ہے تو اس کام کی بھول چوک معاف ہے، اس کا اجر باطل نہیں ہوتا، ہاں دیدہ و دانستہ ایسے شخص کو صدقہ نہ دے، جو مال لے کر فسق و فجور میں خرچ کرے کہ یہ گناہ وظلم پر مدد کرنا ہے۔

فقرا کی تفہیم:

اس جگہ فقرا سے مہاجرین مراد ہیں، جو سب سے علاحدہ ہو کر اللہ اور رسول کی طرف آ گئے اور مدینہ میں رہے، نہ ان کے پاس رزق کا کوئی حیلہ تھا اور نہ وہ طلبِ معاش کے سلسلے میں سفر کی طاقت رکھتے تھے۔ ﴿سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ سے اس جگہ جہاد مراد ہے۔ اس آیت میں صدقات کے مصارف کا بیان ہے۔ امام ابن الانباری رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ مدینے میں چار سو شخص تھے، نہ ان کا گھر تھا نہ گھر والے۔ رات کو مسجد کے چبوترے میں آ کر بسر کرتے، رات کو قرآن شریف سیکھتے، جہاد کرنے کے خاص طور پر متمنی رہتے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: وہ لوگ مہاجرینِ قریش تھے، مدینہ میں نبی مکرم ﷺ کے ساتھ رہتے۔ حکم ہوا کہ ان کو صدقہ دو۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ایک قوم تھی، جو اللہ کی راہ میں زخمی ہوئی تھی، ان کے لیے مسلمین کے اموال میں حق مقرر کیا گیا۔[3] بعض نے کہا ہے کہ ہر وہ شخص مراد ہے، جس میں فقر کی صفات ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے ان فقرا کا وصف بیان کیا، جو ان پر رحمت اور شفقت کرنے کا باعث ہے، یعنی وہ لوگ سوال کرنے سے بچتے ہیں، کسی پر اپنی مسکینی ظاہر کر کے کچھ مانگتے نہیں ہیں۔ جاہل لوگ کوئی سوال نہ کرنے کی وجہ سے ان

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٥٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٢٢)

[2] تفسير الماوردي (١/ ٣٤٧) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥٤٠)

کو آسودہ حال سمجھتے ہیں، وہ اپنے حال، گفتگو اور لباس میں پارسا ہیں۔ صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ وہ شخص مسکین نہیں ہے جو پھرا کرتا ہے، ایک دو کھجور یا ایک دو لقمے اس کو پھیر دیتے ہیں۔ مسکین وہ ہے جو اتنا نہیں پاتا جو اس کو کفایت کرے، نہ کوئی اس کو پہچانتا ہے کہ اس کو صدقہ دے نہ وہ کسی سے کچھ سوال کرتا ہے۔ اس کو امام احمد رحمہ اللہ نے بھی سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔[1] اللہ تعالیٰ نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: تم ان کو، یعنی ان کے فقر کو ان کی صورت سے پہچانتے ہو، محتاجی سے کپڑے پرانے پھٹے ہوئے ہیں، بھوک سے رنگ زرد ہو رہا ہے، فقر سے بدن کمزور پڑ گئے ہیں یا ان پر تواضع و خضوع ظاہر ہے۔

پہلا قول زیادہ صحیح ہے یا یہ خطاب ہر صالح کو ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: ان کے حالات و صفات عقل والوں پر ظاہر ہیں، جس طرح فرمایا: ﴿ سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ﴾ [الفتح: ٢٩] ''ان کی خصوصی پہچان ان کے چہروں پر سجدوں کا نشان ہے۔'' اہل سنن کے ہاں حدیث میں مروی ہے کہ تم مومن کی فراست سے بچو، وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔[2] پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ ۝ ﴾ [الحجر: ٧٥] ''بے شک اس میں گہری نظر سے غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''[3] معلوم ہوا کہ سمجھ دار لوگ آدمی کو اس کے چہرے، شکل وصورت، پیشانی، بات چیت سے پہچان لیتے ہیں کہ یہ مومن خالص ہے یا منافق۔ ان فقرا کا ایک وصف یہ بیان فرمایا کہ وہ سوال کرنے میں الحاح نہیں کرتے اور لوگوں کے پیچھے نہیں پڑ جاتے۔ کسی کو اپنے مانگنے سے تکلیف نہیں دیتے، جو شخص آسودگی کے باوجود مانگتا ہے، وہ مانگنے میں اصرار کرنے والا ہے۔

فتح البیان میں لکھا ہے: مطلب یہ ہے کہ نہ پیچھے پڑ کے سوال کرتے ہیں نہ اصرار کے ساتھ مانگتے ہیں۔ امام طبری و زجاج اور جمہور مفسرین رحمہم اللہ کا یہی قول ہے کہ تعفف (سوال سے بچنا) ان کی ایک لازمی صفت ہے، جو اُن سے جدا نہیں ہوتی۔[4] صرف سوال کرنا ہی تعفف کے منافی ہے۔ بعض نے کہا: مراد یہ ہے کہ وہ تلطف کے ساتھ (لطیف پیرائے میں) سوال کرتے ہیں نہ کہ تکلف کے ساتھ، لیکن یہ بات صفتِ تعفف کے منافی ہے۔ اس کے علاوہ جاہل ان کو اسی وقت غنی خیال کرے گا جب وہ سوال نہ کریں۔ سوال کی حرمت میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں، جب کسی طرح چارہ نہ ہو تب مانگے۔[5]

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣٩) مسند أحمد (١/ ٣٨٤، ٢/ ٢٦٠)

(2) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٢٧) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٨٢١) (3) تفسير ابن كثير (١/ ٤٢٣)

(4) تفسير الطبري (٥/ ٥٩٩) تفسير القرطبي (٣/ ٣٤٢۔ ٣٤٣) (5) فتح البيان (٢/ ١٣٦)

مسکین کی تعریف:

صحیح بخاری میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا گیا ہے کہ مسکین وہ نہیں جسکو ایک دو کھجور یا لقمے پھیر دیں، مسکین وہ ہے جو تعفف (سوال سے بچنے کو اختیار) کرتا ہے، تمھارا جی چاہے تو تم اس آیت کو پڑھو: ﴿ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''وہ لوگوں سے چمٹ کر سوال نہیں کرتے۔'' اس کو امام مسلم اور نسائی رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔[1] امام ابنِ ابی حاتم رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ مسکین وہ نہیں ہے جو تمھارے گرد پھرتا ہے، تم اس کو ایک لقمہ دیتے ہو، مسکین وہ متعفف (سوال سے بچنے والا) ہے جو لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتا۔[2]

اس کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اپنی سند سے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تک مرفوعاً ذکر کیا ہے کہ ایک مزنی شخص نے کہا: میری ماں نے مجھ سے کہا کہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر کیوں نہیں مانگتا، جس طرح سب لوگ مانگتے ہیں۔ میں گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے یہ خطبہ پڑھ رہے تھے: « مَنِ اسْتَعَفَّ أَعَفَّهُ اللّٰهُ وَمَنِ اسْتَغْنٰى أَغْنَاهُ اللّٰهُ وَمَنْ سَأَلَ النَّاسَ وَلَهٗ عِدلُ خَمْسِ أَوَاقٍ لَقَدْ سَأَلَ النَّاسَ إِلْحَافًا » ''جو کوئی سوال سے بچتا ہے، اللہ اس کو بچاتا ہے اور جو کوئی بے پروائی کو ظاہر کرتا ہے، اللہ اس کو بے پروا کرتا ہے اور جو کوئی لوگوں سے سوال کرتا ہے اور اس کے پاس بقدر پانچ اوقیہ (دو سو درہم) کے برابر ہوں تو اس نے لوگوں سے لپٹ کر مانگا''، یعنی لپٹنے والوں میں شامل ہوگیا۔ میں نے اپنے جی میں کہا: ایک اونٹنی میرے پاس ہے، ایک میرے غلام کے پاس ہے، یہ پانچ اوقیہ سے بہتر ہے۔ میں واپس چلا آیا اور سوال نہ کیا۔[3] (رواہ أحمد)

دوسری روایت میں یوں مروی ہے: « مَنْ سَأَلَ، وَلَهٗ أُوقِيَةٌ، فَقَدْ أَلْحَفَ » (رواہ النسائي أيضاً)[4] ''جس نے سوال کیا اور اس کے پاس ایک اوقیہ (چالیس درہم) ہیں تو اس نے لپٹ کر مانگا۔'' امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے، جس نے سوال کیا اور اس کے پاس ایک اوقیہ کی قیمت ہے، وہ مُلْحِف (اصرار کرنے والا) ہے، ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے۔[5] دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ اوقیہ ہے یا اوقیہ کے برابر۔[6] (رواہ أحمد) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ جس نے سوال کیا اور اس کے پاس اتنا ہے، جو اس کو بے نیاز

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٧١)

② تفسير ابن أبي حاتم (١/ ١٦١) اس کی سند صحیح ہے۔

③ تفسیر ابن جریر میں اس روایت کے بجائے اس کی ہم معنی روایت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ دیکھیں: (٥/ ٥٩٨) البتہ مسند احمد میں ان الفاظ کے ساتھ روایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بجائے جعفر بن عبداللہ عن رجل من مزینہ سے مروی ہے۔ (٤/ ١٣٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٣١٤)

④ سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٩٥) مسند أحمد (٣/ ٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٠٦٧)

⑤ تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥٤٢) اس کی سند حسن ہے۔ ⑥ مسند أحمد (٤/ ٣٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٧١٩)

کرتا ہے تو اس کا وہ سوال قیامت کے دن اس کے چہرے پر خراش اور زخم کا نشان ہوگا۔ کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! بے نیازی کیا ہے؟ فرمایا: پچاس درہم یا اتنا سونا۔ اس کو امام احمد رحمہ اللہ اور اہلِ سننِ اربعہ نے روایت کیا ہے۔[1] بعض احادیث میں چالیس درہم بھی آئے ہیں۔[2]

ہر حالت میں انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت:

پھر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف کی، جو اپنا مال رات دن کے سب اوقات میں ظاہر اور پوشیدہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر خرچ کرتے ہیں۔ اس میں وہ خرچہ بھی داخل ہے جو آدمی اپنے اہل پر کرتا ہے، جس طرح صحیحین میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فتح مکہ یا حجۃ الوداع کے سال سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ان کی عیادت کے وقت فرمایا کہ تو اللہ کے لیے جو بھی خرچ کرے گا، اس سے تیرا درجہ بڑھے گا، یہاں تک کہ وہ لقمہ جو تو اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتا ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں کہ مسلمان جب اپنے اہل پر کچھ خرچ کرتا ہے اجر کی امید رکھتے ہوئے تو وہ اس کے لیے صدقہ ہوتا ہے۔[4] (أخرجه أحمد) عریب الملیکی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ آیت اصحابِ خیل کے حق میں اتری ہے۔[5] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں گھوڑوں کو دانہ، گھاس اور چارہ کھلاتے ہیں۔[6] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس چار درہم تھے، ایک رات کو ایک دن کو ایک چھپا کر اور ایک علانیہ خرچ کیا، اس پر یہ آیت اُتری،[7] مگر اس کی سند ضعیف ہے۔[8]

فتح البیان میں لکھا ہے کہ اس آیت میں خرچ کرنے پر بڑی رغبت دلائی ہے کہ کسی وقت بھی خرچ کرنا ترک نہ کرے، کیا رات کیا دن، کھلے چھپے دیتا رہے۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ چھپ کر صدقہ دینا علانیہ دینے سے بہتر ہے، کیوں کہ اللہ نے رات کے خرچ کو دن کے خرچ پر اور چھپے ہوئے خرچ کو علانیہ خرچ پر پہلے ذکر کیا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: مراد وہ لوگ ہیں جو اسراف، فضول خرچی اور فساد کے کاموں میں خرچ کرنے کے بجائے اللہ کی راہ میں

---

[1] مسند أحمد (١/ ٣٨٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٢٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٥٠) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٩٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٤٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٩٩)

[2] سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٩٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٢٨٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٣٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٢٨)

[4] مسند احمد میں ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بجائے ابو مسعود الانصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ (٤/ ١٢٠، ١٢٢) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٠٢)

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥٤٢) اس کی سند میں ''سعید بن سنان شامی'' متروک راوی ہے۔

[6] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥٤٣) اس کی سند حسن ہے۔

[7] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥٤٣)

[8] اس روایت کی سند میں ''عبدالوہاب بن مجاہد'' متروک راوی ہیں۔

خرچ کرتے ہیں۔[1] امام ابن المسیب رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیت عبدالرحمن بن عوف اور عثمان رضی اللہ عنہما کے حق میں اُتری ہے، جب انھوں نے تنگی کے وقت لشکر کی تیاری میں مدد دی،[2] لیکن یہ نصیحت عام لوگوں کو ہے (یعنی یہ حکم عام، سب کے لیے ہے)۔[3]

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

جو لوگ سود کھاتے ہیں، وہ (قیامت کے دن) اس شخص کی طرح کھڑے ہوں گے جسے شیطان نے چھو کر بدحواس کر دیا ہو۔ یہ (سزا) اس لیے (ملے گی) کہ وہ کہتے تھے: تجارت بھی سود ہی کی طرح ہے، حالاں کہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام، پھر جس شخص کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آجائے اور وہ (سود کھانے سے) باز رہے تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا سو کھا چکا، اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، اور جو شخص دوبارہ (سودی معاملہ) کرے تو ایسے لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ﴿275﴾

سود خور کی مذمت:

یعنی منع ہونے سے پہلے جو لے لیا، دنیا میں اس کا لوٹانا نہیں بنتا (یعنی دینا ضروری نہیں)۔ آخرت میں اللہ کا اختیار ہے، چاہے تو بخش دے۔ ممانعت کے بعد جو لیتا ہے، وہ دوزخی ہے۔ اللہ کے حکم کے سامنے عقل کی دلیل لانے کی یہی سزا ہے، جو بیان فرمائی گئی ہے۔ اس آیتِ پاک میں ان لوگوں کا ذکر کیا، جو سود کھاتے ہیں، وہ مختلف قسم کے شبہات میں مبتلا ہو کر اموالِ باطل اڑاتے ہیں، قبر سے نکلنے کے وقت سے لے کر اللہ کے سامنے اکٹھے ہونے تک کا ان کا حال بیان فرمایا۔ یعنی قیامت کے دن وہ قبر سے ایسے اُٹھیں گے، جیسے کوئی خبطی، دیوانہ اور پاگل اُٹھتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سود خور قیامت کے دن مجنون ہو کر اُٹھے گا۔[4] امام عوف بن مالک، سعید بن جبیر، سدی، ربیع بن انس، قتادہ اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔[5]

---

[1] تفسير الطبري (٥/ ٦٠١، ٦٠٢) [2] الدر المنثور (٢/ ١٠١) [3] فتح البيان (٢/ ١٣٧)

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥٤٤) اس کی سند حسن ہے۔ [5] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥٤٤)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سود خور سے قیامت کے دن کہا جائے گا ہتھیار باندھ کر لڑنے کے لیے تیار ہو جا، پھر یہ آیت پڑھی اور کہا کہ یہ قبروں سے اُٹھنے کا وقت ہوگا۔[1] سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی رات ایک قوم کے پاس سے گزرے، جن کے پیٹ گھروں کی طرح تھے، ان کا حال پوچھا تو بتایا گیا کہ یہ سود خور ہیں۔[2] (رواه البیهقي) امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ کی روایت یہ ہے کہ ان کے پیٹ میں سانپ بھرے تھے۔[3] سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ آپ ایک نہر پر آئے، جس کا پانی خون کی طرح سرخ تھا، ایک آدمی نہر کے کنارے پر تیر رہا تھا، ایک اور آدمی تھا، اس کے پاس پتھر جمع تھے، جب وہ تیر کر اس کے پاس آتا اور منہ کھول دیتا تو وہ ایک پتھر کا لقمہ اس کے منہ میں ڈال دیتا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ وہ شخص سود خور تھا۔[4]

فتح البیان میں کہا ہے کہ اس وعید سے سود خور ہی مراد نہیں، بلکہ جو سود کا لین دین کرتا ہے، وہ بھی داخل ہے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے، کھلانے، لکھنے والے اور گواہوں پر لعنت کی ہے۔[5] (رواه مسلم) سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت یہ ہے کہ سود کے تہتر دروازے ہیں، سب سے کم یہ ہے کہ کوئی اپنی ماں سے حرام کاری کرے، سب سے زیادہ سود مسلمان کی آبرو (ریزی) ہے۔[6] (رواه البیهقي والحاكم و صححه) یہی مضمون صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے مروی ہے۔ فقط سود کے دروازوں کی تعداد میں اختلاف ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ سب سے اخیر میں جو آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتری، وہ یہی سود کی آیت ہے۔[7]

ممانعت سے پہلے کا سود معاف ہے:

اللہ پاک نے آخر میں یہ فرمایا کہ جس کو یہ بات پہنچ گئی کہ اللہ تعالیٰ نے سود سے منع فرمایا ہے اور اس حکم کو سنتے ہی سود سے باز رہا تو جو پہلا معاملہ تھا، وہ اس کو معاف ہوگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ جاہلیت کا سود میرے پاؤں کے نیچے ہے۔ پہلا سود، جس کو میں چھوڑتا ہوں، وہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کا سود ہے۔[8] پھر یہ حکم نہیں دیا تھا کہ جو سود جاہلیت کے زمانے میں لے چکے ہیں، وہ واپس کریں۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: یعنی جو سود اس

---

(1) تفسیر الطبري (٦/ ٩) اس کی سند حسن ہے۔

(2) دلائل النبوة للبیهقي (٢/ ٣٩٠۔ ٣٩٢) اس کی سند میں ''ابو ہارون عمارہ بن جوین'' متروک راوی ہے۔

(3) ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت تفسیر ابن ابی حاتم کے بجائے سنن ابن ماجہ اور اس کے علاوہ اور کتابوں میں مروی ہیں۔ سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٢٢٧٣) اس کی سند میں ''ابو الصلت'' مجہول اور ''علی بن زید بن جدعان'' ضعیف راوی ہیں۔

(4) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٦٤٠) (5) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٥٩٨)

(6) مستدرك الحاكم (٢/ ٤٣) شعب الإیمان (٤/ ٣٩٤) صحیح الترغیب والترهیب (٢/ ١٧٧) (7) فتح البیان (٢/ ١٣٨۔ ١٣٩)

(8) یہ واقعہ فتح مکہ کے بجائے حجۃ الوداع کے دن کا ہے، جیسا کہ اس کی صراحت ''صحیح مسلم'' (١٢١٨) میں موجود ہے۔

کے حرام ہونے سے پہلے کھا چکے ہیں، وہ معاف ہے۔[1] پھر یہ فرمایا کہ جس نے ممانعت کے بعد سود کھایا، وہ دوزخی ہے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے نزول کے بعد فرمایا: جس نے مخابرہ نہ چھوڑا، وہ اللہ اور رسول سے لڑنے کے لیے تیار ہو۔ (رواہ أبو داود) امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث شرطِ مسلم پر صحیح ہے۔[2] مخابرے میں سود کا مادہ ہے، اس لیے یہ بات فرمائی۔

سود کا شائبہ رکھنے والی اشیا کی خرید و فروخت کی ممانعت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: زمین کی بعض پیداوار کے عوض کھیتی باڑی کرنے کو مخابرہ کہتے ہیں۔ تر میوے کا خشک میوے کے عوض مول لینا، مزابنہ کہلاتا ہے اور سوکھا غلہ دے کر تازہ غلہ درخت پر خریدنے کو محاقلہ کہتے ہیں۔ یہ اشیا اور اس قسم کی دوسری اشیا کا آپس میں تبادلہ کرنا، ربا کے مادہ کو قطع کرنے کے لیے حرام کیا گیا، کیونکہ سوکھنے سے پہلے دونوں چیزوں کا برابر ہونا معلوم نہیں ہو سکتا، اسی لیے فقہا نے کہا ہے کہ جہالت کے ساتھ دو چیزوں کو مساوی قرار دینے سے دراصل ان کی مقدار آپس میں ایک دوسرے پر بڑھنے کی طرح ہوتی ہے، اسی لیے بہت سی اشیا کو جنھیں ربا کا ذریعہ سمجھا گیا، حرام کہا ہے۔ کسی چیز میں بہ ظاہر فرق کا ہونا ہر شخص کے علم کے مطابق ہوتا ہے۔ جس کو اللہ نے جتنا علم دیا، اس نے ویسا سمجھا اور کہا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ﴾ [یوسف: ٧٦] ''اور ہر صاحبِ علم کے اوپر ایک زیادہ علم والا ہے۔''

سود ایک مشکل ترین باب ہے:

اہلِ علم پر ربا کا باب سارے ابواب سے مشکل تر ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں چاہتا تھا کہ تین چیزوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے کچھ قول و قرار کر جاتے: جد (دادا) اور کلالہ (اوتر نکھتر) اور ابوابِ ربا۔[3] اس سے مراد بعض ایسے مسائل ہیں، جن میں ربا کی آمیزش معلوم ہو جاتی ہے، شریعت اس بات کی گواہ ہے کہ جو چیز کسی حرام چیز کا وسیلہ ہے، وہ حرام ہے، جس طرح جس چیز کے بغیر کوئی واجب پورا نہ ہو تو وہ چیز بھی واجب ہوتی ہے۔[4] صحیحین میں سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حلال کھلا ہوا ہے اور حرام کھلا ہوا ہے، دونوں کے بیچ میں شبہے والی چیزیں ہیں، جو اُن سے بچا، اس نے اپنے دین اور آبرو کو بچا لیا، جو کوئی اس میں پڑا، وہ حرام میں پھنسا، جیسے چرواہا جو چراگاہ کے گرد چراتا ہے، قریب ہے کہ اس میں چرنے لگے۔[5]

---

(1) تفسیر الطبري (٦/ ١٤)

(2) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٠٦) مستدرك الحاكم (٢/ ٣١٤) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٩٩٠) البتہ مخابرہ کی نہی صحیحین میں موجود ہے۔ دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٣٦)

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠٣٢) (4) تفسیر ابن كثير (١/ ٤٢٧)

(5) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٩٩)

سنن میں سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جو چیز تجھے شک میں ڈالے، اس کو چھوڑ دے اور جو شک میں نہ ڈالے اس کو اختیار کر لے[1] دوسری حدیث میں ہے: گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور جی میں اس کے بارے میں تردد ہو، تجھے لوگوں کا اس پر مطلع ہونا ناپسند ہو۔[2] تیسری روایت میں ہے کہ اپنے جی سے فتویٰ لے، اگرچہ لوگ تجھ کو فتویٰ دیں۔[3]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: سب سے آخر پر یہی آیتِ ربا اُتری ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا اور وہ اس کی تفسیر نہ کرنے پائے، سو تم ربا اور رِیبہ (شک) کو چھوڑ دو۔[4] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ اس میں سود کھائیں گے۔ پوچھا: کیا سب لوگ؟ فرمایا: جو نہیں کھائے گا تو اس کو اس کا غبار ضرور پہنچے گا۔[5] (رواه أحمد و أهل السنن) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: اسی قبیل سے ان وسائل کو حرام کیا گیا ہے، جو محرمات تک پہنچا دیتے ہیں۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ جب سورت بقرہ کی آخری آیات ربا کے بارے میں اتریں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں جا کر انھیں پڑھا اور شراب کی تجارت کو حرام کیا۔[6] (أخرجه الجماعة سوى الترمذي)

بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ جب رِبا اور اس کے وسائل کو حرام کیا تو شراب کو اور اس کی تجارت کو حرام کیا۔ جس طرح متفق علیہ حدیث میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہودیوں پر لعنت کرے، ان پر چربی حرام ہوئی تو انھوں نے اس کو پگھلا کر بیچا اور اس کی قیمت کھائی۔[7] علما نے کہا ہے کہ سودی کاروبار پر گواہی دینے والے اور اس کو لکھنے والے پر لعنت ہے۔ یہ اس وقت ہے جب اس کو معلوم ہو، اگرچہ وہ ظاہر میں شریعت کے مطابق ہو، لیکن اندر سے فاسد ہو تو اس کے حقیقی معنی کا اعتبار ہوگا نہ کہ ظاہر صورت کا، کیوں کہ اعمال کا اعتبار نیتوں سے ہوتا ہے۔

صحیح مسلم میں مروی ہے کہ اللہ تمھاری صورت اور تمھارے مال کو نہیں دیکھتا، بلکہ تمھارے دل اور عمل کو دیکھتا ہے۔[8] امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: امام علامہ ابو العباس ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ایک کتاب "إبطال التحليل" لکھی ہے، اس میں ان مسائل سے منع کیا ہے، جو باطل کی طرف لے جانے والے ہیں۔ پھر کہا: "وَقَدْ كَفٰى فِيْ ذٰلِكَ وَشَفَا فَرَحِمَهُ اللّٰهُ وَرَضِيَ عَنْهُ" "وہ اس باب میں کافی اور شافی ہے، پس اللہ ان پر رحم کرے اور ان سے راضی ہو۔"[9]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥١٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٧١١) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٥١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٣) مسند أحمد (٤/ ٢٢٨)

[3] مسند أحمد (٤/ ٢٢٨) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٥١)

[4] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٧٦) اس کی سند صحیح ہے۔

[5] مسند أحمد (٢/ ٤٩٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٣١) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٤٥٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٧٨) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ البتہ اس کے ہم معنی روایت "صحيح البخاري" (١٩٥٤) میں مروی ہے۔

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٨٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٩٠) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٠٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣٨٢)

[7] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٨٢)

[8] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٦٤) [9] تفسير ابن كثير (١/ ٤٢٨، ٤٢٩)

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴿٢٧٦﴾ إِنَّ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٧٧﴾

اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے، اور اللہ کسی ناشکرے گناہ گار کو پسند نہیں کرتا ﴿276﴾ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور نماز قائم کی اور وہ زکات ادا کرتے رہے، ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے، نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿277﴾

سود میں برکت نہیں:

یعنی مال دار ہو کر محتاج کو قرض بھی مفت اور سود کے بغیر نہ دے، یہ نعمت کی ناشکری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ ربا کا مال یا تو بالکل جاتا رہتا ہے یا اس کی برکت مٹ جاتی ہے اور دنیا ہی میں معدوم ہو جاتا ہے، اس سے نفع حاصل نہیں ہوتا، آخرت میں اس پر عذاب علاحدہ ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ ۚ ﴾ [المائدة: ١٠٠] ”(اے نبی!) کہہ دیجیے: پاس اور ناپاک برابر نہیں ہو سکتے، اگرچہ ناپاک کی کثرت آپ کو حیرانی میں ڈال دے۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ ۚ ﴾ [الأنفال: ٣٧] ”اور ناپاک (لوگوں) کو (ایک دوسرے پر) اوپر تلے رکھ کر سب کا ڈھیر لگا دے، پھر اسے جہنم میں ڈال دے۔“ نیز فرمایا: ﴿ وَمَا اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ ﴾ [الروم: ٣٩] ”اور تم سود پر جو (قرض) دیتے ہو، تاکہ وہ لوگوں کے مالوں میں (شامل ہو کر) بڑھے، تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا۔“ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی نظیر ہے کہ سود کتنا ہی کیوں نہ بڑھ جائے، اس کا انجام کمی ہی ہے۔[1] (رواه أحمد و ابن ماجه) گویا یہ معاملہ مقصود کے برعکس ہی ہوتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ سود خور سے صدقہ قبول کرتا ہے نہ جہاد اور نہ صلہ رحمی۔[2]

صدقات سے مال میں برکت ہوتی ہے:

صدقات کے بڑھنے کا یہ مطلب ہے کہ یا تو وہ مال بڑھتا ہے جس میں سے صدقہ دیا ہے یا اس کا اجر دوگنا ہوتا ہے یا دونوں باتیں ہوتی ہیں۔ صحیحین وغیرہما میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جس نے ایک کھجور کے

[1] تفسير الطبري (٦/ ١٥) مسند أحمد (١/ ٣٩٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٧٩) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٨٠)

[2] تفسير البغوي (١/ ٣٤٤)

برابر پاک کمائی سے صدقہ دیا، اور اللہ نہیں قبول کرتا مگر پاک کمائی ہی سے، تو اللہ اس صدقے کو اپنے داہنے ہاتھ میں لے کر صدقہ دینے والے کے لیے اس کی پرورش کرتا رہتا ہے، جیسے کوئی تم میں سے اپنے بچھیرے کو پالتا ہے، یہاں تک کہ وہ صدقہ ایک پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔[1] سیدہ عائشہ اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے حدیث میں یہ اضافہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا آیت پڑھی۔[2] امام طبرانی رحمہ اللہ نے سیدنا ابو برزہ الاسلمی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ بندہ روٹی کا ایک ٹکڑا صدقہ دیتا ہے، وہ اللہ کے پاس بڑھ کر اُحد پہاڑ کی طرح ہو جاتا ہے۔[3] اس موضوع کے متعلق اور بھی بہت حدیثیں آئی ہیں، ان حدیثوں سے زیرِ تفسیر آیت کے معنی واضح ہو جاتے ہیں۔

سود خوری ناشکری ہے:

پھر یہ فرمایا کہ اللہ ناشکری کرنے والے دل اور گناہ کی باتوں اور کاموں کو دوست نہیں رکھتا۔ یہ اس لیے ارشاد ہوا کہ جو حلال رزق اللہ تعالیٰ نے سود خور کے لیے رکھا تھا اور جس جائز کمائی کو اس کے لیے جائز کیا تھا، اس نے اس رزق اور کمائی کو کافی نہ سمجھا اور لوگوں کا مال باطل طریقے سے اور ناپاک کمائی کے ذریعے کھانا شروع کیا تو کفرانِ نعمت کی وجہ سے ظالم اور باطل کمائی کی وجہ سے گناہ گار ٹھہرا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی تعریف کی۔ اس جگہ مومنین سے وہ لوگ مراد ہیں جو ربا کے حرام ہونے پر ایمان رکھتے ہیں، لیکن عام مومنین مراد لینا زیادہ بہتر ہے۔ ایمان یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی تصدیق کرے، عملِ صالح، جس کا اس کو حکم ہے، بجا لائے۔ سود کو چھوڑنا انہی میں سے ایک عمل ہے، نماز اور زکات خود دو فریضے ہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٢٧٨﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿٢٧٩﴾ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٨٠﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٨١﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی ہے وہ چھوڑ دو اگر تم مومن ہو (278) پھر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠١٤) [2] تفسير الطبري (٦/ ١٨)

[2] امام ہیثمی رحمہ اللہ نے "مجمع الزوائد" (٣/ ٢٨٦) میں اس روایت کی نسبت امام طبرانی رحمہ اللہ کی طرف کی ہے اور ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ اس کی سند میں "سوار بن مصعب" راوی ضعیف ہے۔

اگر تم نے یہ نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ، اور اگر تم توبہ کر لو تو تمھارے لیے تمھارے اصل مال ہی ہیں، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے ﴿279﴾ اور اگر (تمھارا مقروض) تنگ دست ہو تو آسانی تک اسے مہلت دو اور تمھارا صدقہ کرنا (قرض معاف کر دینا) تو تمھارے لیے بہت بہتر ہے، اگر تم علم رکھتے ہو ﴿280﴾ اور اس دن سے ڈرو جب تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر شخص نے جو کچھ کیا ہوگا اسے اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہوگا ﴿281﴾

سود نہ چھوڑنے پر وعید:

چھوڑنے کا یہ مطلب ہے کہ جو سود کی حرمت آنے سے پہلے لے چکے ہو سو لے چکے ہو، لیکن جو پہلے کا سود ہے وہ اب نہ مانگو۔ پہلے کا سود تمھارے اصل مال سے منہا کر لیا جائے تو یہ تم پر ظلم ہے، لیکن اگر ممانعت کے بعد پہلے سود کا تقاضا کرو تو یہ تمھارا ظلم ہے۔ پھر جب دیکھا کہ سود موقوف ہو گیا ہے تو مفلس سے تقاضا شروع کر دیا، ایسا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اسے مہلت دو اور اگر توفیق ہو تو بخش دو۔

امام زید بن اسلم، ابن جریج، مقاتل بن حیان اور سدی رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیات بنوعمرو اور بنومغیرہ کے حق میں اُتری ہیں۔ پہلی قوم ثقیف میں سے تھی، دوسری بنی مخزوم سے، ان کا آپس میں سود کا لین دَین دورِ جاہلیت میں تھا۔ جب یہ لوگ اسلام میں آ گئے تو ثقیف نے چاہا کہ اپنے سود کا مطالبہ کریں، لہٰذا باہم مشورہ کیا۔ بنومغیرہ نے کہا کہ ہم اسلام میں ربا نہیں دیں گے۔ سیدنا عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ نائبِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھا تو اس پر یہ آیت اتری۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت عتاب رضی اللہ عنہ کو لکھ بھیجی۔[1]

اس آیت میں اس شخص کے لیے سخت وعید اور شدید پیرائے میں تبلیغ ہے جو اللہ کی طرف سے ڈرائے جانے کے بعد بھی سود پر قائم اور دائم ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اس جگہ ایذان کے معنی استیقان کے ہیں،[2] قیامت کے دن سود خور سے کہا جائے گا کہ جنگ کے لیے اپنے ہتھیار اُٹھا۔

سود خور کی سزا:

امام پر فرض ہے کہ جو شخص ربا پر قائم ہو اور اس سے باز نہ رہے تو اس سے توبہ طلب کرے، اگر باز آئے تو بہتر، وگرنہ اس کی گردن مار دے۔[3] امام حسن اور ابن سیرین رحمہما اللہ نے کہا ہے: واللہ! یہ صراف (کرنسی تبدیل کرنے والا)

---

[1] تفسیر الطبري (٦/ ٢٢، ٢٣) تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٣١)

[2] تفسیر الطبري (٦/ ٢٦) اس کی سند میں ''حسین بن داود'' ضعیف راوی ہے۔

[3] تفسیر الطبري (٦/ ٢٥) تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٥٥٠) ان دونوں کی سندیں حسن ہیں۔

سود خور ہیں، اللہ اور رسول سے لڑنے کو تیار ہیں۔ آج اگر کوئی لوگوں پر امام ہوتا تو ان سے توبہ کراتا، اگر توبہ کرتے تو بہتر، ورنہ ان پر ہتھیار چلاتا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے ان سے جنگ کا وعدہ کیا ہے، جس طرح وہ سنتے ہیں، سو تم اس سود کے لین دین سے بچتے رہو۔ اللہ تعالیٰ نے حلال کو تم پر وسیع کر دیا ہے، حلال کو طیب کیا ہے، سو کہیں ایسا نہ ہو کہ فاقہ تم کو نافرمانی کی طرف کھینچے۔[1]

امام ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے: اللہ تعالیٰ نے سود خور کو قتل کی وعید سنائی ہے۔[2] امام سہیلی رحمہ اللہ نے کہا ہے: اسی لیے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کی لونڈی سے عینہ کے مسئلے میں یہ کہا کہ تو زید سے کہہ دے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ اس کا جہاد برباد ہو، اگر توبہ نہ کرے، کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے خلاف ہے: ﴿ فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ (آیت زیر تفسیر) ”تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔“ اس بات کو بہت سے اہل علم نے ذکر کیا ہے، لیکن سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا تک اس کی اسناد ضعیف ہے۔[3] پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اصل مال لو، نہ کم نہ زیادہ۔ سیدنا احوص رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں فرمایا: جاہلیت کا ہر سود موقوف ہے، تمھیں اپنا اصل مال لینا چاہیے نہ تم ظلم کرو نہ تم پر ظلم ہو۔ سب سے پہلے جو سود موقوف کیا گیا، وہ عباس رضی اللہ عنہ کا سود ہے۔[4] (رواه ابن أبي حاتم و ابن مردويه)

قرض دار کو مہلت دینے کی فضیلت:

پھر اللہ پاک نے یہ حکم دیا کہ محتاج کو مہلت دو اور اہل جاہلیت کا سا برتاؤ نہ کرو کہ جب قرض کی میعاد ختم ہو جاتی تو وہ اپنے قرض دار سے کہتے کہ ہمارا قرض ادا کر یا اس پر (مزید) سود باندھ۔ پھر فرمایا: اگر تم مفلس کو سارا اصل مال چھوڑ دو اور کچھ نہ لو تو اور بھی بہتر ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس باب میں کئی سندوں سے بہت سی احادیث مروی ہیں۔ سیدنا اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کو یہ بات اچھی لگے کہ اللہ تعالیٰ اس کو سایہ دے، جس دن اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا تو وہ محتاج پر آسانی کرے یا اس کو چھوڑ دے۔[5] (رواه الطبراني) سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت اس طرح ہے کہ جس نے مفلس کو مہلت دی، اس کو ہر دن اس مال کے برابر ایک صدقہ

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٥٥٠) [2] تفسیر الطبري (٦/ ٢٦) [3] تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٣٢)

[4] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٥٥١) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٧٨٨٠)

[5] المعجم الکبیر (١/ ٣٠٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”عاصم ضعيف ولم يدرك أسعد بن زرارة“ (مجمع الزوائد: ٤/ ٢٤٠) البتہ اس کے ہم معنی روایات دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے صحیح اسانید سے مروی ہیں۔ دیکھیں: صحیح مسلم، رقم الحدیث (٣٠٠٦) سنن الترمذي، رقم الحدیث (١٣٠٦)

بلکہ دو صدقے کا ثواب ملے گا۔[1] (رواہ أحمد)

سیدنا ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جس نے اپنے قرض دار کو مہلت دی یا اس سے قرض کو ساقط کیا، وہ قیامت کے دن عرش کے سائے میں ہوگا۔[2] (رواہ أحمد و مسلم) سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ قیامت کے دن اللہ کے پاس ایک بندے کو لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نے دنیا میں کیا کام کیا؟ وہ کہے گا: اے رب! میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا، جس کی ذرہ برابر مجھے اُمید ہو۔ اللہ فرمائے گا تو نے دنیا میں کیا کام کیا؟ وہ کہے گا: کچھ بھی نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ تین بار اسی طرح پوچھے گا اور وہ وہی کہے گا، پھر آخر میں یہ عرض کرے گا کہ اے رب! تو نے مجھ کو زیادہ مال دیا تھا، میں لوگوں سے لین دین کرتا اور میری درگزر کرنے کی عادت تھی۔ آسودہ پر آسانی کرتا، نادار کو مہلت دیتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں آسانی کرنے کا زیادہ حق رکھتا ہوں، جاؤ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ (رواہ أبو یعلی) شیخین اور ابن ماجہ رحمہ اللہ نے بھی اسی سے ملتی جلتی حدیث بیان کی ہے۔[3]

سیدنا سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے کسی مجاہد فی سبیل اللہ یا غازی کی امداد کی یا قرض دار کی اس کی تنگی میں مدد کی یا مکاتَب (وہ غلام جس نے کچھ دے کر آزادی حاصل کرنے کا معاہدہ کیا ہو) کی گردن آزاد کرانے میں مدد کی، اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو اس دن اپنے سائے میں جگہ دے گا، جس دن اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ حدیث صحیح الاسناد ہے، مگر شیخین نے اس کو روایت نہیں کیا۔[4] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ جو کوئی یہ چاہے کہ اس کی دعا قبول ہو اور اس کی تکلیف دور ہو تو تنگدست سے درگزر کرے۔[5] (رواہ أحمد) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے نکلے اور فرمایا: جس نے نادار کو مہلت دی یا اس کو معاف کیا، اس کو اللہ تعالیٰ جہنم کی بھاپ سے بچالے گا۔[6] (رواہ أحمد) اُن کی دوسری مرفوع روایت یہ ہے کہ جس نے قرض دار کو آسودگی تک مہلت دی، اللہ تعالیٰ اس کے گناہ کو توبہ تک مہلت دے گا۔[7] (رواہ الطبراني)

---

(1) مسند أحمد (٥/ ٣٦٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٨٦)

(2) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٦٣) مسند أحمد (٥/ ٣٠٠)

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٧٢، ٣٢٩٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٦٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٤٢٠)

(4) مستدرك الحاكم (٢/ ٢٣٦) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٤٥٥٥)

(5) مسند أحمد (٢/ ٢٣) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٨٠٨)

(6) مسند أحمد (١/ ٣٢٧) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٧٤١)

(7) المعجم الكبير (١١/ ١٥١) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥١٨٥)

آخری آیت اور دنیا کی بے ثباتی:

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو وعظ کیا کہ دنیا کو زوال ہے، دنیا کے سارے مال وغیرہ فنا ہو جائیں گے، آخرت سر پر چلی آتی ہے، اللہ تعالیٰ سے کام پڑے گا، مخلوق کے اعمال کا حساب کتاب لیا جائے گا، ہر اچھے برے عمل کی سزا و جزا ملے گی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: کہتے ہیں کہ یہ آیت سب سے اخیر میں اُتری۔ یہی سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا قول ہے: "آخِرُ مَا نَزَلَ مِنَ الْقُرْآنِ كُلِّهِ: ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا... الخ﴾" "سارے قرآن کے آخر میں یہ آیت اُتری: ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿281﴾﴾

اس آیت کے نزول اور رسول اللہ ﷺ کی وفات کے درمیان وقفہ:

نبی اکرم ﷺ اس آیت کے نزول کے بعد نو راتیں زندہ رہے، پھر پیر کے دن ربیع الاول کی دو تاریخ کو انتقال فرمایا، اس کو ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔[1] اسی طرح امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے اس کو سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے۔[2] (رواه النسائي أيضاً عنه) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے امام ثوری رحمہ اللہ نے اس طرح روایت کی ہے کہ اس آیت کے نزول اور نبی مکرم ﷺ کی وفات کے درمیان اکتیس دن تھے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ نو راتیں تھیں۔ ہفتہ کو بیمار پڑے اور پیر کو وفات پائی۔ سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ نے کہا: قرآن کی آخری آیت یہی ہے۔[3]

فتح البیان میں ہے کہ آیت زیرِ تفسیر اس بات کی دلیل ہے کہ سود کا لین دَین کرنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ یومِ رجوع الی اللہ سے مراد موت کا دن ہے۔ ایک قوم اسی طرف گئی ہے، جمہور کے نزدیک قیامت کا دن ہے۔ اس آیت میں لوگوں کو اچھی نصیحت، سخت وعید اور بڑی ڈانٹ پلائی گئی ہے۔ امام خفاجی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کا آخری آیت ہونا کتبِ حدیث میں مذکور ہے اور صحیح ہے۔[4] کسی نے کہا ہے: اس کے اکاسی (۸۱) دن بعد آپ ﷺ نے انتقال فرمایا۔ کسی نے سات دن بتائے۔ کسی نے کہا: تین ساعت، کچھ ہو، اس کے بعد پھر قرآن آسمان سے نہیں اترا۔[5]

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ۵۵٤)
[2] سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ۳۰۷) اس کی سند صحیح ہے۔
[3] تفسیر ابن کثیر (۱/ ٤۳۵)
[4] حاشية الشهاب على تفسير البيضاوي (۲/ ۳٤۷، ۳٤۸)
[5] فتح البیان (۲/ ۱٤۳۔ ۱٤۵)

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى
فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ
يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ
وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ
سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ
وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ
وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ
اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ
تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ
لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا
بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪
وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم آپس میں ایک مقررہ مدت کے لیے اُدھار کا لین دین کرو تو اسے لکھ لو اور لکھنے والے کو چاہیے کہ تمھارے درمیان انصاف کے ساتھ تحریر کر دے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے، جیسے اللہ نے اسے سکھایا ہے اسے لکھنا چاہیے، اور وہ شخص لکھوائے جس کے ذمے قرض ہو اور اسے اپنے رب، اللہ سے ڈرنا چاہیے اور (لکھواتے وقت) وہ (مقروض) اس میں سے کوئی چیز کم نہ کرے، لیکن اگر وہ جس کے ذمے قرض ہے نادان یا کمزور ہو یا لکھوا نہ سکتا ہو تو اس کا مختار انصاف کے ساتھ لکھوائے، اور تم اپنے مسلمان مردوں میں سے دو گواہ بنا لو، پھر اگر دو مرد (میسر) نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہی دیں) جنھیں تم گواہوں کے طور پر پسند کرو (یہ اس لیے) کہ ایک عورت اگر بھول جائے تو ان میں سے دوسری اسے یاد دلا دے اور گواہ جب بلائے جائیں تو وہ انکار نہ کریں اور معاملہ چھوٹا ہو یا

بڑا اسے مقررہ مدت کے ساتھ لکھوانے میں سستی نہ کرو۔ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے اور گواہی کے لیے زیادہ درست طریقہ ہے اور (اس طرح) تمھارے شک میں پڑنے کا امکان بھی کم رہ جاتا ہے۔ ہاں، تم آپس میں نقد جو تجارتی لین دین کرو، اسے نہ لکھا جائے تو تم پر کوئی حرج نہیں اور جب تم آپس میں سودا کرو تو گواہ بنا لیا کرو اور کاتب اور گواہ کو ستایا نہ جائے اور اگر تم (ایسا) کرو گے تو یقیناً یہ تمھاری طرف سے نافرمانی ہوگی اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ تمھیں (یہ احکام) سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے (282)

ادھار لین دین کے ضوابط:

موضح قرآن میں کہا ہے کہ اس آیت میں دو چیزوں کی قید لگائی ہے: ایک تو وعدے کے معاملے کو لکھنا کہ اس میں پھر جھگڑا نہ ہو اور کوئی شبہے میں نہ پڑے، شاید کہ دیکھ کر یاد آ جائے۔ دوسرا ہر معاملے پر دو مرد یا ایک مرد دو عورتوں کا، جن کو ہر کوئی پسند کرے، گواہ بنا لینا۔ پھر یہ قید فرمائی کہ لکھنے والا اور گواہ کسی کا نقصان نہ کریں، جو لکھنے میں حق واجبی ہے، وہی ادا کریں، جو دینے والا اپنی زبان سے کہے وہی لکھیں یا اگر اس کو سمجھ نہ ہو تو جو کوئی اس کا بزرگ کہے وہ لکھے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن میں یہ سب سے طویل آیت ہے۔[1] ابن المسیب رحمہ اللہ نے کہا: ہم کو خبر ملی ہے کہ عرش کے ساتھ قرآن کی سب سے نئی (آخری اترنے والی) آیت یہ قرض کی آیت ہی ہے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب یہ آیت اُتری تو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے پہلے جو مکر گیا، وہ آدم علیہ السلام تھے۔ پھر فرمایا کہ آدم نے اپنی عمر میں سے چالیس برس داود علیہ السلام کو دیے تھے۔ جب فرشتے آئے تو کہا: ابھی میری عمر کے چالیس برس باقی ہیں، ان کی عمر ایک ہزار برس تھی۔ فرشتوں نے کہا: آپ نے چالیس برس داود علیہ السلام کو دے دیے ہیں۔ کہا: میں نے تو نہیں دیے، اللہ نے کتاب ظاہر کی اور اس پر فرشتوں کو گواہ کیا۔[3] (الحديث بطوله رواه أحمد) حماد بن سلمہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے داود علیہ السلام کو سو برس اور آدم علیہ السلام کو ہزار برس پورے کر دیے۔[4] (رواه ابن أبي حاتم)

---

[1] تفسير ابن كثير (١/ ٤٣٦) [2] تفسير الطبري (٦/ ٤١)

[3] مسند أحمد (١/ ٢٥١) اس کی سند میں "علی بن زید بن جدعان" ضعیف راوی ہے۔ البتہ اس کی ہم معنی روایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح سند سے مروی ہے۔ دیکھیں: سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٦٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٢٠٩)

[4] حماد بن سلمہ رحمہ اللہ سے ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت "المعجم الكبير" اور "مسند أبي يعلىٰ" میں مروی ہے۔ المعجم الكبير (١٢/ ٢١٤) مسند أبي يعلىٰ (٥/ ٩٩) اس کی سند میں "علی بن زید بن جدعان" ضعیف راوی ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو یہ ارشاد کیا ہے کہ جب تم کوئی معاملہ کسی مدتِ معینہ تک کرو تو اس کو لکھ رکھو، اس میں یہ بات ہے کہ مقدارِ معاملہ اور اس کا وقت اچھی طرح محفوظ رہے گا، گواہ بھی نہ بھولیں بھٹکیں گے، چنانچہ اسی لیے آیت کے اخیر میں یوں فرمایا ہے: ﴿ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے اور گواہی کے لیے زیادہ درست طریقہ ہے اور (اس طرح) تمھارے شک میں پڑنے کا امکان بھی کم رہ جاتا ہے۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہ آیت معینہ مدت کے لیے بیع سَلَم کے بارے میں اُتری ہے۔[1] دوسری روایت یہ ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے سلف کی مدت مقرر فرمائی ہے اور اس کی اجازت دی ہے، پھر آیت زیرِ تفسیر پڑھی۔[2] (رواہ البخاري)

سلف سے سلم مراد ہے۔ جس کو ہندی میں بندھور کہتے ہیں۔ صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آئے تو وہاں کے لوگ پھلوں میں سلف کرتے تھے، اور اس کی مدت ایک سال دو سال یا تین سال تک ہوتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کوئی سلف کرے، وہ معین پیمایش، معین وزن اور معین مدت تک کرے۔[3] لکھنے کا حکم اس لیے فرمایا کہ اس میں بات کی پختگی اور حفاظت ہوتی ہے۔ یہ بات اس حدیث کے خلاف نہیں، جس میں مروی ہے: «اِنَّا أُمَّةٌ أُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ وَلَا نَحْسِبُ»[4] ''ہم اُمی (اَن پڑھ) گروہ ہیں، نہ لکھتے ہیں نہ حساب کرتے ہیں۔'' اس لیے کہ قرآن حفظ ہوتا ہے۔ سنن بھی محفوظ ہیں، ان کے لکھنے کی حاجت نہیں۔ جن چیزوں کے لکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، وہ جزئی چیزیں ہیں، جن میں لوگ پھنستے ہیں، لہٰذا یہ لکھنے کا حکم نصیحتاً دیا گیا ہے، یہ واجب نہیں، جس طرح بعض لوگوں نے سمجھا ہے۔

امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا ہے: جو کسی کو قرض دے تو وہ لکھ لے، جو خرید کرے تو اس پر گواہ کرے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: ابو سلیمان مرعشی رحمہ اللہ نے ہم سے ذکر کیا کہ تم جانتے ہو، وہ کون مظلوم ہے، جس کی دعا قبول نہیں ہوتی؟ لوگوں نے کہا: یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کہا: ایک آدمی نے کوئی سودا ایک مدت تک کیا، نہ کوئی اس کا گواہ بنایا اور نہ اس کو لکھا، جب مدت گزر گئی تو مال والے نے انکار کیا، اس نے اللہ سے دعا کی تو وہ دعا قبول نہ ہوئی، اس لیے کہ اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔ سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ، شعبی، ربیع بن انس، حسن، ابن جریج اور ابن زید رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا ہے کہ پہلے یہ بات واجب تھی، پھر منسوخ ہوگئی۔ اس کی ناسخ یہ آیت ہے: ﴿ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمٰنَتَهٗ ﴾ [البقرة: ۲۸۳] ''اور اگر تم میں سے کوئی دوسرے پر اعتبار کرے تو جس شخص پر

[1] تفسیر الطبري (٦/ ٤٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ [2] تفسیر الطبري (٦/ ٤٥)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢١٢٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٦٠٤)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٨١٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٠٨٠)

اعتبار کیا گیا ہو اسے چاہیے کہ دوسرے کی اَمانت واپس ادا کر دے۔“[1]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے بنی اسرائیل کے دوسرے شخص سے کہا: مجھ کو ایک ہزار دینار اُدھار دو، اس نے کہا: تم گواہ لاؤ، میں ان کو شاہد کرلوں، کہا: ”کَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا“ ”اللہ گواہ کافی ہے۔“ کہا: کفیل لاؤ، کہا: ”کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا“ ”اللہ وکیل کافی ہے۔“ اس نے کہا: تو سچ کہتا ہے، اس نے ایک مدتِ مقررہ تک اس کو ایک ہزار دینار دے دیے۔ (رواہ أحمد) اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں سات جگہ اس کو صیغہ جزم کے ساتھ ذکر کیا ہے۔[2] لہٰذا یہ حدیث بھی آیت کے منسوخ ہونے کی دلیل ہے، کیوں کہ پہلی شریعت کی جو بات ہماری شریعت میں آئی ہے، وہ حجت ہے، اگر اس کا انکار نہ کیا گیا ہو۔

لکھنے کے احکام:

اس حدیث میں تحریر نہ کرنے اور گواہ مقرر نہ کرنے کا انکار نہیں کیا گیا۔ پھر جب لکھنے کا فیصلہ ہو تو دستاویز لکھنے والے کو چاہیے کہ انصاف سے لکھے۔ لکھنے میں کوئی ظلم نہ کرے اور وہی لکھے جس پر وہ اتفاق کرلیں، نہ زیادہ نہ کم۔ جس کو لکھنا آتا ہو اور اس سے کوئی لکھوانا چاہے تو انکار نہ کرے، بلکہ لکھ دے۔ کیوں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو وہ بات سکھائی ہے، جو وہ نہیں جانتا تھا تو اب اس کو بھی یہی زیب دیتا ہے کہ جسے لکھنا نہیں آتا، اس پر صدقہ کرے اور اس کو لکھ دے۔ حدیث میں مروی ہے کہ یہ بھی صدقہ ہے کہ تو کسی کام کرنے والے کی مدد کرے یا کسی اخرق (ناسمجھ) کا کام کر دے۔[3]

دوسری حدیث میں ہے کہ جس نے وہ علم چھپایا جو وہ جانتا ہے، اس کو قیامت کے دن آگ کی لگام منہ میں دی جائے گی۔[4] امام مجاہد اور عطاء رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ کاتب پر لکھ دینا واجب ہے۔[5] قرض دار کے ذمے جو قرض ہے، وہ اس کو کاتب سے لکھوا دے، اللہ سے ڈر کر کمی نہ کرے اور کسی شے کو نہ چھپائے، پھر اگر وہ شخص جس پر حق ہے، فضول خرچی وغیرہ کی وجہ سے مجور علیہ (جس کو اپنے معاملات میں تصرف کرنے سے بذریعہ عدالت روک دیا گیا ہو) ہے یا ضعیف، یعنی کم سن یا مجنون ہے یا خود لکھنے سے عاجز ہے یا ٹھیک بات کو نہیں پہچانتا یا وہ دستاویز کو درست طریقہ سے لکھوانے کی سمجھ نہیں رکھتا تو اس کا کوئی ولی لکھوا دے۔

---

[1] تفسیر الطبري (٦/ ٤٧، ٥٠) تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٣٧)

[2] مسند أحمد (٢/ ٣٤٨) صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٤٢٧، ١٩٥٧، ٢١٦٩، ٢٢٧٤، ٢٢٩٨، ٢٥٨٣، ٥٩٠٦)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٣٨٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٤)

[4] سنن أبي داود، رقم الحدیث (٣٦٥٨) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٦٤٩) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٢٦٤) صحیح الترغیب والترهیب (١/ ٢٨)

[5] تفسیر الطبري (٦/ ٥٢)

مرد و عورت کی گواہی:

دستاویز پر دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ کرے۔ یہ کارروائی مال کے سلسلے میں ہوتی ہے۔ ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کو اس لیے مقرر کیا کہ عورت کی عقل ناقص ہوتی ہے، جس طرح سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے طویل حدیث میں مروی ہے: «أَمَّا نُقْصَانُ عَقْلِهَا فَشَهَادَةُ امْرَأَتَيْنِ تَعْدِلُ شَهَادَةَ رَجُلٍ، فَهٰذَا نُقْصَانُ الْعَقْلِ، وَتَمْكُثُ اللَّيَالِيَ لَا تُصَلِّيْ وَتُفْطِرُ فِيْ رَمَضَانَ، فَهٰذَا نُقْصَانُ الدِّيْنِ»[1] (رواہ مسلم) ''پس اس کی عقل کا نقصان یہ ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے، یہ نقصانِ عقل کی وجہ سے ہے اور ایامِ حیض میں نہ نماز پڑھ سکے اور نہ روزہ رکھ سکے، پس یہ نقصان دین کا ہے۔''

شہادت کے لیے عدالت:

شہادت میں پسندیدگی کی شرط لگائی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ان میں انصاف کا ہونا شرط ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے قرآن میں ہر جگہ ہر مطلق کو اسی مقید پر محمول کیا ہے، جہاں کہیں گواہی دینے کا حکم بغیر شرط کے آیا ہے، یعنی کسی بھی مقدمے کے گواہ کیوں نہ ہوں، ان کا عادل ہونا ضروری ہے۔[2] صرف مال کے لین دَین کے معاملے ہی میں یہ شرط نہیں ہے۔ جس نے کسی ناواقف شخص کی گواہی کو رد کیا ہے، اس کی دلیل یہی آیت ہے کہ اس میں گواہ کا عادل اور پسندیدہ ہونا آیا ہے اور ناواقف شخص عادل اور پسندیدہ نہیں ہوتا۔ پھر یہ فرمایا کہ جب ایک عورت بھول جائے تو دوسری عورت کے یاد دلانے سے اس کو وہ گواہی یاد آ سکتی ہے۔ جس نے یہ کہا کہ دونوں کی گواہی مل کر ایک مرد کی گواہی کی جگہ ہوگی، اس نے موٹی بات کہی، صحیح بات وہ پہلی ہی بات ہے۔

گواہی دینا واجب ہے:

پھر فرمایا کہ جب گواہوں کو گواہی کے لیے بلائیں تو ان کو چاہیے کہ وہ آئیں اور گواہی ادا کریں، ان پر شہادت پر جانے کی دعوت قبول کرنا واجب ہے۔ امام ابو قتادہ اور ربیع رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ جس طرح یہ فرمایا تھا کہ کاتب لکھنے سے انکار نہ کرے، بلکہ لکھ دے، یہاں سے یہ بات نکلی کہ گواہ بننا فرضِ کفایہ ہے۔ جمہور کا یہی مذہب ہے، یعنی جب شہادت متعین نہ ہو، ورنہ پھر اس خاص شخص پر جو شہادت کا حامل ہے، اس پر شہادت ادا کرنا واجب ہوگا۔ واللہ أعلم۔[3]

امام مجاہد و ابو مجلز رحمہ اللہ اور بہت سے لوگوں نے کہا ہے کہ جب تجھے گواہ بننے کے لیے بلائیں تو تجھ کو اختیار ہے اور جب تو گواہ ہو اور پھر بلایا گیا تو اب گواہی دینا چاہیے۔[4] سیدنا زید بن خالد رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۹)
[2] تفسیر ابن کثیر (۱/ ٤٣٨)
[3] تفسیر ابن کثیر (۱/ ٤٣٨)
[4] تفسیر الطبري (٦/ ٧١)

فرمایا: کیا نہ بتاؤں میں کہ کون سے گواہ بہتر ہیں، وہ جو سوال سے پہلے گواہی دیتا ہے۔[1] (أخرجه مسلم و أهل السنن) اور وہ جو دوسری حدیث میں شیخین کے نزدیک مروی ہے کہ بدترین گواہ وہ ہیں، جو گواہی طلب کیے جانے سے قبل گواہی دیتے ہیں اور فرمایا: پھر ایک ایسی قوم آئے گی، جن کی قسم ان کی گواہی سے پہلے ہوگی اور گواہی قسم سے آگے بڑھ جائے گی یا ایسی قوم آئے گی، جو بغیر طلب کیے گواہی دے گی۔[2] سوان سے مراد جھوٹے گواہ ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیت دونوں حالتوں کو شامل ہے، گواہ بننے اور گواہی دینے کو۔[3] پھر یہ ارشاد فرمایا کہ تم حق بات تحریر کرنے سے جی نہ چراؤ، خواہ وہ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ ایک معینہ مدت کے لیے کرنا، اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے۔ جب قلم سے لکھ دیا تو گواہی مضبوط ہوگئی، گواہ جب اس کو دیکھے گا تو اپنی گواہی کو یاد کرلے گا، کیوں کہ نہ لکھنے میں یہ امکان تھا کہ شاید بھول جائے۔ چناں چہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لکھنے کے بعد کسی قسم کا دھوکا باقی نہیں رہتا۔ اختلاف کے وقت وہ لکھا ہوا کام آتا ہے، اس کی رو سے معاملے کا فیصلہ بغیر کسی روک ٹوک کے ہو جاتا ہے۔ ہاں اگر معاملہ دست بہ دست ہو تو نہ لکھنے کا کچھ ڈر نہیں۔

خرید وفروخت پر گواہ بنانا:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب تم لین دَین کرو تو گواہ کرلو، یعنی جس پر تمھارا حق ہو، خواہ اس میں مدت ہو یا نہ ہو، تم ہر حال میں اس پر کسی کو گواہ مقرر کرلو۔ یہی سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا قول ہے۔ جابر بن زید، مجاہد، عطاء اور ضحاک رحمہ اللہ سے بھی ایسے ہی مروی ہے۔ امام شعبی اور حسن رحمہ اللہ اس امر کو منسوخ کہتے ہیں،[4] لیکن جمہور کے نزدیک یہ امر مستحب کے طور پر ہے، وجوب کے طور پر نہیں۔ اس پر سیدنا خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث دلیل ہے کہ انھوں نے ایک گھوڑے کی خرید کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے گواہی دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی گواہی کو دو گواہیوں کے برابر رکھا۔[5] (رواه أحمد بطوله و أبو داود)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: لیکن احتیاط یہ ہے کہ گواہ کرلے، کیوں کہ حافظ ابن مردویہ اور حاکم رحمہ اللہ نے سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ تین آدمی ہیں، جو اللہ سے دعا کرتے ہیں، ان کی دعا قبول نہیں ہوتی: ایک وہ مرد جس کی عورت بدخلق ہے اور وہ اس کو طلاق نہیں دیتا۔ دوسرا وہ شخص جس نے یتیم کا مال اس کے بالغ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٩) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٩٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٩٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٣٦٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٥)

[3] تفسير الطبري (٦/ ٧٠) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥٦٣) اس کی سند حسن ہے۔

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥٦٦)

[5] مسند أحمد (٥/ ٢١٥) سنن أبي داود (٣٦٠٧) مستدرك الحاكم (٢/ ٢١) امام حاکم اور ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

ہونے سے پہلے پھیر دیا اور تیسرا وہ شخص جس نے کسی کو کچھ مال قرض دیا، مگر گواہ نہ کیا۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور شرطِ شیخین پر ہے۔[1]

کاتب اور شاہد کو ہدایات:

کاتب اور شاہد کے نقصان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو وہ لکھواتا ہے، کاتب اس کے خلاف لکھ دے یا گواہ نے جو سنا ہے، اس کے خلاف گواہی دی یا بالکل اس کو چھپا جائے۔ امام حسن اور قتادہ رحمہما اللہ کا یہی قول ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: عدمِ اضرار (تکلیف نہ دینا) کے یہ معنی ہیں کہ آدمی کاتب اور شاہد کو گواہی دینے کے لیے بلائے، وہ کہیں کہ ہمیں کام ہے فرصت نہیں تو یہ کہے کہ تم پر آنا واجب ہے، اس طرح ان دونوں کو ستائے۔[2] اسی طرح امام عکرمہ، مجاہد، طاؤس، ابن جبیر، ضحاک، عطیہ، مقاتل بن حیان، ربیع بن انس اور سدی رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے۔[3]

پھر یہ فرمایا کہ اے لوگو! اگر تم اس حکم کے خلاف کرو گے تو فسق تمھارے گلے بندھ جائے گا۔ تم اس سے جدا نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اس کے حکم بجا لاؤ اور اس کی جھڑکیوں سے بچو، اللہ تم کو سکھاتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا ﴾[الأنفال: ٢٩] ”اے ایمان والو! اگر تم اللہ سے ڈرو تو وہ تمھارے لیے نکلنے کی راہ بنا دے گا۔“ نیز اس کا فرمان ہے: ﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيَجْعَلْ لَكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ ﴾ [الحدید: ٢٨] ”اے ایمان والو! تم اللہ سے ڈرو، اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، وہ تمھیں اپنی رحمت سے دو حصے (اجر) دے گا، اور تمھارے لیے ایسا نور بنائے گا کہ تم اس کے ساتھ چلو گے۔“

مدت کی تعیین ضروری ہے:

فتح البیان میں زیرِ تفسیر آیت کے بارے میں یوں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں سود کے بیان کے بعد قرض کا حال بیان فرمایا ہے، خواہ کسی کو قرض دے یا کسی سے قرض لے۔ قرض میں مدتِ معینہ رکھے، مثلاً: ایک سال یا ایک ماہ۔ یہ مدت کی تعیین بیع کی قیمت اور بیع سلم میں ضروری ہے، تاکہ مدت پوری ہونے سے پہلے صاحبِ حق مطالبہ نہ کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غیر معلوم مدت جائز نہیں۔ جمہور رحمہم اللہ نے کہا کہ وقت کا مقرر کرنا ایام، مہینوں اور سالوں میں ہونا چاہیے، کھیتی کاٹنے یا غلہ کو اکٹھا کرنے یا قافلہ کے واپس آنے کی شرط لگانا صحیح نہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے سود حرام کیا تو سلم کو مباح کر دیا۔[4] قرض کو مدت کے ساتھ لکھنا

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٣٩) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٣١) امام حاکم اور ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٥٦٧) اس کی سند میں ”یزید بن ابی زیاد“ ضعیف راوی ہے۔ البتہ معنی درست ہے۔
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٥٦٧)
[4] تفسیر البغوي (١/ ٣٤٨)

چاہیے، خواہ بیع ہو یا سلم یا قرض، کیونکہ یہ اس میں جھگڑے کو دور کرنے کا سبب اور قطع تعلقی کا سد باب ہے۔ لکھنے کا حکم بہ ظاہر وجوب کے لیے ہے۔ امام عطا، شعبی، نخعی رحمہم اللہ وغیرہم اسی طرف گئے ہیں۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔[1] پھر کہا ہے: جب کوئی کاتب نہ ملے اور ایک شخص کو لکھنا آتا ہے تو اس پر واجب ہے کہ اگر کوئی اس سے درخواست کرے تو وہ قرض وغیرہ کی دستاویز لکھ دے، انکار نہ کرے۔ جمہور کہتے ہیں کہ یہ امر استحباب کے لیے ہے۔

گواہی کے مسائل:

لفظ ﴿ رِجَالِكُمْ ﴾ سے معلوم ہوا کہ دونوں گواہ مسلمان ہوں، کافر نہ ہوں۔ رجال میں غلام بھی شامل ہیں۔ امام شریح، عثمان البتی، احمد، اسحاق، ابوثور رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ ائمہ ثلاثہ اور جمہور علما غلام کی شہادت کو جائز نہیں رکھتے۔[2] پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ عورتوں کی گواہی مردوں کے ساتھ درست ہے، تنہا درست نہیں، لیکن ایسے امور جن کی صرف ان کو اطلاع ہوتی ہے، ان میں ان کی تنہا گواہی درست ہے۔ اگر دو عورتوں نے گواہی دی اور مدعا علیہ نے قسم کھائی تو فیصلہ کرنا جائز ہے یا نہیں، جس طرح مرد کی گواہی پر مدعا علیہ کی قسم کے ساتھ فیصلہ کرنا جائز ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔

امام مالک و شافعی رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ جائز ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دو عورتوں کو ایک مرد کے مثل ٹھہرایا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جائز نہیں ہے۔ ان کے اختلاف کی دلیل یہ ہے کہ ایک گواہ مدعا علیہ کی قسم کے ساتھ کافی ہے یا نہیں؟ حق یہ ہے کہ کافی ہے، کیوں کہ اس امر پر دلیل آچکی ہے، یہ زیادتی قرآن پاک کی اس آیت کے خلاف نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا کوئی حکم ایک گواہ اور قسم کو مسترد کرنے کے بارے میں نہیں ہے۔ اس کو ہر سمجھ دار آدمی جانتا ہے۔[3] بہرحال اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اموال کے متعلق امور میں احتیاط کی ترغیب دی ہے، کیوں کہ معاش اور عاقبت کی بہتری انھی اموال سے منسلک ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾

اور اگر تم سفر میں ہو اور تمھیں کوئی لکھنے والا نہ ملے تو کوئی چیز گروی (رہن کے طور پر) قبضے میں دے دی جائے، اور اگر تم میں سے کوئی دوسرے پر اعتبار کرے تو جس شخص پر اعتبار کیا گیا ہو

---

[1] تفسير الطبري (٦/ ٥٣) تفسير الخازن (١/ ٣٠٤۔ ٣٠٥) [2] تفسير القرطبي (٣/ ٣٨٩۔ ٣٩٠)

[3] فتح القدير (١/ ٥٠٨) فتح البيان (٢/ ١٤٦۔ ١٥١)

اسے چاہیے کہ دوسرے کی اَمانت واپس ادا کر دے اور اپنے رب، اللہ سے ڈرے اور تم گواہی نہ چھپاؤ اور جو شخص گواہی چھپائے گا تو بے شک اس کا دل گناہ گار ہے اور جو تم عمل کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے (283)

گروی رکھنے کا بیان:

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ فرمایا ہے کہ اگر تم سفر میں قرض اور اُدھار کا معاملہ کرو اور کاتب میسر نہ آئے یا آئے اور قلم دوات اور کاغذ نہ ملے تو کتابت کے بجائے صاحبِ حق کے ہاتھ میں کچھ رہن رکھ دو۔ لفظِ مقبوض سے یہ نکلا کہ رہن قبضے کے بغیر لازم نہیں آتا۔ امام شافعی اور جمہور رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے۔ دوسروں نے کہا ہے کہ ضروری ہے کہ رہن مرتہن کے ہاتھ میں مقبوض ہو۔ امام احمد اور اہلِ علم کا ایک گروہ اسی طرف گیا ہے۔ سلف کی ایک جماعت نے اس آیت سے یہ سمجھا ہے کہ رہن صرف سفر میں مشروع ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ کا بھی یہی قول ہے۔[1] صحیحین میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا اور آپ کی زِرہ ایک یہودی کے پاس تیس وسق جو پر گروی تھی۔ اس کو اہل وعیال کی روزی کے لیے گروی رکھا تھا۔[2] امام شافعی رحمہ اللہ کی روایت میں یہودی کا نام ابوالشحم مروی ہے۔[3]

دوسری روایت میں ہے کہ یہودِ مدینہ کے پاس رہن رکھا تھا۔[4] امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان مسائل کی تقریر کتاب احکامِ کبیر میں کی ہے۔ سیدنا ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: یہ آیت منسوخ ہے۔[5] امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا ہے: معنی یہ ہیں کہ اگر تم ایک دوسرے کی امانت داری پر اعتماد کرتے ہو تو پھر دستاویز نہ لکھنے اور گواہ مقرر نہ کرنے میں کوئی خوف نہیں۔[6] مؤتمن (یعنی جس کے پاس امانت رکھوائی ہو) کو چاہیے کہ اللہ سے ڈرے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جو کسی نے لیا، وہ اس کے ہاتھ پر ہے، جب تک وہ ادا نہ کرے۔[7] (رواہ أحمد و أھل السنن) پھر گواہی چھپانے سے منع کیا۔

---

[1] تفسير ابن كثير (١/ ٤٤٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٦٣، ٢٧٥٩) صحیح مسلم میں یہ روایت سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٠٣)

[3] مسند الشافعي (١/ ١٣٩)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٦٣) سنن النسائي (٤٦١٠)

[5] تفسير الطبري (٦/ ٥٠) اس کی سند حسن ہے۔

[6] تفسير الطبري (٦/ ٤٩) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥٧٠)

[7] مسند أحمد (٥/ ٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٦١) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٦٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٣/ ٤١١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٤٠٠) مستدرك الحاكم (٢/ ٥٥) امام حاکم اور ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ البتہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "فتح الباري" (٥/ ٢٤١) میں اس روایت کو ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ حسن بصری رحمہ اللہ کا سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے سماع مختلف فیہ ہے۔

جھوٹی گواہی دینا اور گواہی چھپانا جرم ہے:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جھوٹی گواہی کبیرہ گناہوں سے ہے، اسی طرح اس کا چھپانا بھی۔[1] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ ''آثم'' کے معنی فاجر کے ہیں۔ یعنی اس کا دل فاجر ہے۔[2] جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴾ [المائدۃ: ۱۰۶] ''اور ہم اللہ کی گواہی نہیں چھپاتے، اگر ہم ایسا کریں تو ہم گناہ گاروں میں شمار ہوں گے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴾ [النساء: ۱۳۵] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم انصاف کے لیے ڈٹ جانے والے اور اللہ کے لیے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ، خواہ وہ تمھارے اپنے خلاف یا تمھارے والدین اور رشتے داروں کے خلاف ہو، معاملے کا فریق امیر ہو یا غریب، دونوں صورتوں میں تمھاری نسبت اللہ تم سے زیادہ ان کا حق دار ہے۔ پس تم نفسانی خواہش کے پیچھے پڑ کر انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو اور اگر تم نے توڑ مروڑ کر بات کی یا (گواہی دینے سے) منہ موڑا تو بے شک تم جو بھی عمل کرتے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔''

فتح البیان میں ہے کہ جب اللہ نے اموال کی حفاظت اور شکوک وشبہات کو دور کرنے کے لیے قرض کی دستاویز کا لکھنا اور گواہ کرنا مشروع کیا تو اس کے بعد حالتِ سفر میں کاتب کی عدمِ دستیابی کے عذر کا ذکر کیا، کیوں کہ دوسرے عذروں کی طرح یہ بھی ایک عذر ہے اور ہر وہ عذر جو سفر کے عذروں کے قائم مقام ہو، اس کا یہی حکم ہے۔ رہن مقبوضہ کو دستاویز کے تحریر کرنے کے عوض مقرر کیا۔ اہلِ علم نے کہا ہے کہ سفر میں رہن کتاب اللہ سے ثابت ہے۔ مرتہن وہ ہے جو رہن لیتا ہے۔ جو چیز رہن رکھی جاتی ہے، وہ مرہون یا رہین کہلاتی ہے۔ راہن وہ ہے جو رہن رکھتا ہے۔ جمہور کہتے ہیں: رہن رکھنے کا عمل ایجاب وقبول سے صحیح ہو جاتا ہے، اگرچہ قبضہ نہ ہو۔

اللہ سے ڈرنا اس جگہ بھی ہے کہ جب رہن کی مدت پوری ہو جائے تو تاخیر اور انکار کے بغیر حق ادا کر دے، اچھا معاملہ کرے، جیسا راہن نے حسنِ ظن کیا تھا، ویسا ہی اس کے ساتھ برتاؤ ہو۔ آخر آیت میں گواہی چھپانے پر وعید اور ڈراوا ہے۔ اس آیتِ شریفہ کو آیتِ دَین کہتے ہیں۔ سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ ''اس آیت کا ماقبل منسوخ ہے''، صحیح نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس جلیل القدر صحابی سے راضی ہو، یہ آیت جنسِ نسخ سے نہیں ہے، بلکہ مقید بائتمان (امانت رکھوانا) ہے، اس کا ماقبل ثابت محکم ہے، منسوخ نہیں ہوا، وہ عدمِ ائتمان کے ہمراہ ہے۔ بعض اہلِ علم نے کہا کہ ازروئے عہدِ نبوی آیتِ ربا اور یہ آیتِ دَین قرآن کی آخری آیات ہیں۔[3] واللہ أعلم.

---

[1] تفسیر الطبري (۱/ ۱۰۰) تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ۵۷۱) اس کی سند حسن ہے۔ [2] تفسیر الطبري (۶/ ۹۹، ۱۰۰)
[3] فتح البیان (۲/ ۱۵۵۔ ۱۵۷)

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے (سب) اللہ ہی کا ہے اور تمھارے دلوں میں جو کچھ ہے، خواہ اسے ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تم سے اس کا حساب لے گا، پھر جسے وہ چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ﴿284﴾

کیا دل میں چھپائے جانے والے خیالات کا حساب ہوگا؟

موضح قرآن میں کہا ہے کہ یہاں سے معلوم ہوا کہ دل کے خیال پر بھی حساب ہوگا۔ یہ سن کر اصحاب رسول ﷺ نے عرض کی کہ یہ بڑا مشکل ہے۔ فرمایا کہ بنی اسرائیل کی طرح انکار مت کرو، بلکہ قبول رکھو، اللہ تعالیٰ سے مدد چاہو۔ پھر لوگوں نے کہا: ہم ایمان لائے اور قبول کیا۔ اللہ کے ہاں یہ بات پسند ہوئی، تب اگلی دو آیتیں اتریں اور ان میں حکم آیا کہ مقدور سے باہر چیز کی تکلیف نہیں۔ اب جو کوئی دل میں گناہ کا خیال کرے اور عمل میں نہ لائے تو اس کو گناہ نہیں لکھتے۔

اس آیت میں اللہ پاک نے یہ خبر دی ہے کہ جو کچھ آسمان اور زمین کے درمیان ہے، سب اسی کا ہے، اس کو ہر چیز کی خبر ہے، کوئی کھلی چھپی بات اس پر پوشیدہ نہیں ہے، وہ ہر دل کا حال اور ہر جی کا خیال جانتا ہے، گو کتنا ہی باریک اور مخفی کیوں نہ ہو۔ پھر یہ فرمایا کہ جو کچھ ہمارے بندے کرتے ہیں یا دل میں پوشیدہ رکھتے ہیں، اس پر ان کا حساب ہوگا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿29﴾ ﴾ [آل عمران: ۲۹] ”آپ کہہ دیجیے: اگر تم وہ بات چھپاؤ جو تمھارے سینوں میں ہے یا اسے ظاہر کرو، اللہ اسے جانتا ہے اور وہ اسے بھی جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے“ اور فرمایا: ﴿ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰي ﴿7﴾ ﴾ [طٰہٰ: ۷] ”وہ ہر راز اور (اس سے بھی) پوشیدہ تر بات کو جانتا ہے۔“

اس بارے میں بہت آیتیں آئی ہیں، پھر اس آیت میں علم سے زیادہ یہ خبر دی ہے کہ محاسبہ بھی ہوگا، اسی لیے جب یہ آیت اتری تو صحابہ ہر بڑے چھوٹے عمل پر محاسبہ ہونے سے ڈر گئے۔ یہ ڈر ایمان کی پختگی اور کمال یقین کی وجہ سے ہوا۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ جب یہ آیت اتری تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر سخت گزری، نبی اکرم ﷺ کے پاس آ کر گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر عرض کی، جن کاموں کی ہم کو تکلیف دی گئی ہے، جیسے: نماز، روزہ، جہاد، صدقہ اس کی تو ہم طاقت رکھتے ہیں، یہ آیت جو آپ ﷺ پر اتری ہے، اس کی طاقت ہمیں نہیں ہے۔ فرمایا: کیا تم

چاہتے ہو کہ وہی بات کہو، جو اہلِ کتاب نے تم سے پہلے کہی تھیں کہ ﴿ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ﴾ [البقرة: ۹۳] یعنی ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی، بلکہ یوں کہو: ﴿ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴾ [البقرة: ۲۸۵] ''ہم نے (حکم) سنا اور اطاعت کی، اے ہمارے رب! ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔''

جب قوم نے اس بات کا اقرار کیا اور زبان سے اعتراف کیا تو اللہ تعالیٰ نے پچھلی آیت، جو اس کے بعد ہے، اتاری اور پہلی آیت کو منسوخ کر دیا۔[1] (رواہ أحمد) صحیح مسلم کی روایت یہ ہے کہ جب انھوں نے وہ اقرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ [البقرة: ۲۸۶] ''اللہ کسی کو اس کی برداشت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا، کسی شخص نے جو نیکی کمائی اس کا پھل اسی کے لیے ہے اور جو اس نے برائی کی اس کا وبال بھی اسی پر ہے۔ اے ہمارے رب! اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے تو ہماری گرفت نہ کر۔ اے ہمارے رب! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے ہمارے رب! جس بوجھ کو اُٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں، وہ ہم سے نہ اُٹھوا اور ہم سے درگزر فرما اور ہمیں بخش دے، اور ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا کارساز ہے، پس تو کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔''

ہر جملہ پر ''نعم'' فرمایا۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جب یہ آیت اتری تو ان کے دلوں میں ایسا ڈر پیدا ہوا، جو کسی بات سے نہیں ہوا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: تم کہو « سَمِعْنَا، أَطَعْنَا وَسَلَّمْنَا » اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان ڈالا، اس پر آیت: ﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ ﴾ آئی۔ (رواہ أحمد و مسلم) ہر دعائیہ جملہ کے بعد « قَدْ فَعَلْتُ » ''میں نے کر دیا'' فرمایا۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اس وسوسے کی طاقت نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے قول و فعل پر دارومدار رکھا۔[4] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: اس آیت کو بعد والی آیت نے منسوخ کر دیا۔ یہی قول سیدنا علی، ابن مسعود رضی اللہ عنہما، کعب احبار، شعبی، نخعی، قرظی، عکرمہ اور سعید بن جبیر رحمہم اللہ کا ہے۔[5]

ایک جماعت سے کتبِ ستہ میں بطریق قتادہ، زرارہ بن اوفی، سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ نے میری امت سے دل کے خیالات پر درگزر فرمایا، جب تک کہ منہ سے نہ کہے یا عمل نہ کرے۔[6] صحیحین میں

---

[1] مسند أحمد (۲/ ۴۱۲) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۲۵)
[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۲۵)
[3] مسند أحمد (۱/ ۲۳۳) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۲۶)
[4] تفسیر الطبري (۶/ ۱۰۷) اس کی سند صحیح ہے۔
[5] تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ۵۷۴) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۴۴۳)
[6] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۴۹۶۸) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۲۷) سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۲۰۹) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۱۱۸۳) سنن النسائي، رقم الحدیث (۳۴۳۵) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۲۰۴۰)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ نے فرمایا: جب میرا بندہ کسی برائی کا ارادہ کرے تو تم اس کو نہ لکھو، پھر اگر اس برائی کو کر بیٹھے تو ایک برائی لکھو اور جب نیکی کا ارادہ کرے تو اس کو ایک نیکی لکھ لو، پھر اگر وہ نیکی بجا لائے تو اس کو دس نیکیاں لکھ لو۔[1] صحیح مسلم کے الفاظ اس طرح ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب میرے بندے نے نیکی کا ارادہ کیا، پھر وہ نیکی نہ کی تو میں اس کے لیے ایک نیکی لکھتا ہوں، پھر اگر وہ نیکی کر لے تو اس کو دس سے سات سو تک لکھتا ہوں اور جب کسی برے کام کا ارادہ کیا، پھر اس کو نہ کیا تو میں اس کو نہیں لکھتا، پھر اگر وہ کام کر گزرا تو ایک ہی برائی لکھتا ہوں۔[2]

اس باب میں بہت سی حدیثیں کئی طریق سے آئی ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کچھ صحابی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا: ہم اپنے جی میں ایسی بات پاتے ہیں کہ ہمارے لیے اس کو کہنا سخت مشکل ہے۔ فرمایا: کیا ایسی بات تم نے پائی ہے؟ کہا: ہاں! فرمایا: یہ تو کھلا ہوا ایمان ہے۔[3] (رواہ مسلم) دوسری روایت یہ ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وسوسے کا حال پوچھا تو فرمایا: «تِلْكَ صَرِيْحُ الْإِيْمَانِ»[4] (رواہ مسلم عن أبي هريرة) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سب کو جمع کرے گا تو فرمائے گا: میں تم کو اس بات کی خبر دیتا ہوں، جو تم نے اپنے جی میں چھپائی تھی، جس پر میرے فرشتوں کو اطلاع نہیں ہے۔ پھر مومنوں کو خبر دے کر ان کے دل کے وسوسوں کو بخش دے گا۔ ﴿يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ سے یہی خبر مراد ہے۔ شکوک و شبہات میں مبتلا رہنے والوں کو ان کے پوشیدہ طور پر جھٹلانے کی خبر دے کر مواخذہ فرمائے گا۔[5]

اسی طرح امام مجاہد اور ضحاک رحمہما اللہ سے بھی مروی ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے: یہ آیت محکم ہے، منسوخ نہیں ہے۔[6] اسی کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے اور کہا: محاسبہ سے عذاب لازم نہیں آتا۔[7] اللہ تعالیٰ کبھی حساب لے کر بخش دیتا ہے، کبھی عذاب کرتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ مومن اللہ کے نزدیک ہوگا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس پر اپنا بازو رکھ دے گا، پھر اس سے اس کے گناہوں کا اقرار لے گا، فرمائے گا: تو اس گناہ کو پہچانتا ہے؟ وہ کہے گا: ہاں، جانتا ہوں، یہاں تک کہ جہاں تک اللہ چاہے گا پہنچ جائے گا، پھر فرمائے گا: میں نے اس گناہ کو تجھ پر دنیا میں چھپایا، آج میں اس کو تیرے لیے بخشتا ہوں، پھر اس کا صحیفہ حسنات یا نامۂ اعمال اس

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٦٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٨) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٢) [4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٣)

[5] تفسير الطبري (٦/ ١١٣) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥٧٢) اس کی سند حسن ہے۔ [6] تفسير الطبري (٦/ ١١٥)

[7] تفسير الطبري (٦/ ١١٨)

کے داہنے ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔ کفار اور منافقین کے لیے سب کے سامنے یہ آواز ہوگی: ﴿ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [هود: ١٨] ”یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب پر جھوٹ گھڑا تھا، سن لو! ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔“ (رواہ ابن جریر) یہ حدیث صحیحین وغیرہما میں بھی بہت سے طریق سے آئی ہے۔[1] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یہی دلیل اختیار کی ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں اقوال:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اس آیت میں اہلِ علم کے کئی اقوال ہیں: ایک یہ کہ اگرچہ یہ آیت عام ہے، مگر شہادت کو چھپانے کے ساتھ مخصوص ہے۔ گواہی کو چھپانے والے کا حساب اس چھپانے کے بارے میں لیا جائے گا خواہ اس نے لوگوں پر اس چھپانے کو ظاہر کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ، شعبی اور مجاہد رحمہم اللہ کا یہی قول ہے، لیکن لفظ کی عمومیت اس قول کو رد کرتی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ مراد وہ امور ہیں جو شک و یقین کے درمیان دل پر طاری ہوتے ہیں۔ یہ امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے، اس میں تخصیص مخصص کے بغیر ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یہ آیت محکم اور عام ہے، لیکن دل کے وسوسوں پر عذاب کفار اور منافقین کے لیے مخصوص ہے۔

امام طبری رحمہ اللہ نے یہی قول ایک جماعت سے بیان کیا ہے۔ مگر یہ بھی تخصیص بغیر مخصص کے ہے، کیوں کہ ﴿ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ”پھر جسے وہ چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا۔“ اس فرمان کو دلیل کے بغیر کسی کے لیے خاص نہیں کیا جا سکتا۔ چوتھا قول یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ صحابہ اور تابعین کی ایک عظیم جماعت اسی طرف گئی ہے۔ یہی قول حق ہے اور صحیح احادیث بھی اسی پر دلیل ہیں۔[2]

ان احادیث کے بعد جن میں ناسخ و منسوخ کی صراحت ہے، مخالفت کی کسی کو مجال نہیں ہو سکتی۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ جو بندہ کسی بدی یا نافرمانی کا ارادہ کرتا ہے اور اپنے دل میں اس کو لاتا ہے تو اللہ اس کا محاسبہ دنیا میں کر لیتا ہے، اس کو خوف، ملال اور شدید غم لگ جاتا ہے، وہاں اس پر کچھ مواخذہ نہیں ہوگا۔ جیسے بدی کا ارادہ کیا، مگر وہ بدی نہ کی۔[3] کسی نے کہا: یہ آیت محکم ہے، جبکہ حدیثِ نفس (دل کے خیال) کو عزم پر محمول کریں، کیوں کہ عزم (پکے ارادے) پر مواخذہ ہے۔[4]

---

[1] تفسیر الطبري (٦/ ١١٩، ١٢٠) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٣٠٩، ٤٤٠٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٧٦٨)

[2] فتح القدیر (١/ ٥١٤) [3] تفسیر الطبري (٦/ ١١٧) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ [4] فتح البیان (٢/ ١٥٧۔ ١٦٠)

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ
بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ
وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا يُكَلِّفُ
اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا
تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا
حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ
لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَاغْفِرْ لَنَا ۥ وَارْحَمْنَا ۥ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا
عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

رسول (ﷺ) اس (ہدایت) پر ایمان لائے ہیں جو ان کے رب کی طرف ان پر نازل کی گئی ہے اور سارے مومن بھی، سب اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ (وہ کہتے ہیں:) ہم اس کے رسولوں میں سے کسی ایک میں بھی فرق نہیں کرتے اور وہ کہتے ہیں: ہم نے (حکم) سنا اور اطاعت کی، اے ہمارے رب! ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے (285) اللہ کسی کو اس کی برداشت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا، کسی شخص نے جو نیکی کمائی اس کا پھل اسی کے لیے ہے اور جو اس نے برائی کی اس کا وبال بھی اسی پر ہے۔ اے ہمارے رب! اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے تو ہماری گرفت نہ کر۔ اے ہمارے رب! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے ہمارے رب! جس بوجھ کو اُٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں، وہ ہم سے نہ اُٹھوا اور ہم سے درگزر فرما اور ہمیں بخش دے، اور ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا کارساز ہے، پس تو کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما (286)

آخری دو آیات کی تفسیر:

موضح قرآن میں کہا ہے کہ یہ دعا اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی تو قبول کے حکم بھی ہم پر بھاری نہیں کیے، دل کا خیال بھی نہیں پکڑا، بھول چوک بھی معاف کی۔ اس سورت میں اللہ پاک نے نماز، زکات، روزہ، حج اور جہاد کا ذکر کیا، حیض وطلاق وایلاء کا بیان فرمایا، انبیاء علیہم السلام کے قصے ذکر کیے، سود اور لین دین کے بارے میں احکام ذکر فرمائے،

پھر نبی مکرم ﷺ اور تمام مومنوں کی ان سب امور کے بارے میں تصدیق کا ذکر فرمایا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت نے نفس اور وسوسے کے متعلق حدیث کو منسوخ کر دیا۔[1] یہ آیت اللہ کی طرف سے بندوں کو تعلیم دیتی ہے کہ اس طرح دعا کیا کریں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نہایت کرم ہے کہ اس نے ہم کو مانگنے کا طریقہ سکھایا ہے، تا کہ اللہ تعالیٰ مطلوبہ چیز عطا فرمائے۔ ﴿ اِصْرًا ﴾ سے اس جگہ سخت تکلیف اور بہت مشکل امور مراد ہیں یا کسی عمل کی شدت، جس طرح بنی اسرائیل پر اپنے آپ کو قتل کرنے اور نجاست کی جگہ والے کپڑے کو کاٹ ڈالنے کا حکم تھا اور وہ مسخ ہو گئے تھے، بندر اور سور ہو کر مٹ گئے تھے۔ ﴿ مِنْ قَبْلِنَا ﴾ سے یہودی مراد ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان پر پچاس نمازیں فرض کی تھیں، مال کا چوتھائی حصہ زکاۃ مقرر کی، کافروں سے عامۃ الکفر مراد ہیں۔ اس میں گویا جہاد برائے اعلائے کلمۃ اللہ کی طرف اشارہ ہے۔ صحیح حدیث میں مروی ہے کہ اللہ پاک نے ان دعوات میں ہر دعا کے پیچھے فرمایا: "قَدْ فَعَلْتُ"، یعنی میں نے ایسا ہی کیا۔ جیسے اس نے کہا۔[2] یہ اس بات پر دلیل ہے کہ بھول چوک پر کچھ پکڑ نہیں۔ نہ اگلوں کا سا بوجھ اس امت پر رکھا گیا ہے نہ ان کی طاقت سے زیادہ ان کو تکلیف دی گئی ہے، بلکہ ان کے ساتھ عفو وغفران و رحمت اور کافروں پر مدد کا معاملہ کیا گیا ہے۔ والحمد للہ رب العالمین.

اے رب! تیرا گناہ گار بندہ ترجمانِ قرآن اس مقام پر تجھ سے نہایت عجز و انکساری اور ندامت کے ساتھ یہ ساری دعائیں جن کو تو نے قبول کیا ہے، صدقِ دل سے دعا مانگتا ہے کہ تو اس کی فریاد رسی کر دینا اور آخرت میں تمام آفات اور مصیبتوں سے بچا۔ تیرے سامنے اس قبولیت بخشنے کی کچھ ہستی نہیں ہے۔ رب اغفرلي (آمین).

سورت بقرہ کی آخری آیات کی فضیلت:

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جس نے کسی رات سورت بقرہ کی آخری دو آیتوں کو پڑھا تو یہ دونوں اس کو کافی ہیں۔[3] (رواہ البخاري و أحمد) سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت اس طرح ہے کہ میں اس خزانے میں سے، جو عرش کے نیچے ہے، خواتیم (آخری آیات) سورت بقرہ دیا گیا ہوں، مجھ سے پہلے یہ کسی نبی کو نہیں ملیں۔[4] (رواہ أحمد) یہ مضمون بہت سی حدیثوں میں مروی ہے، حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان کو اپنی تفسیر میں روایت کیا ہے۔[5] سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی پیدائش سے دو ہزار سال

---

[1] تفسیر الطبري (٦/ ١٠٦۔ ١٠٧) اس کی سند صحیح ہے۔ [2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٢٦)

[3] ان الفاظ کے ساتھ روایت سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا ابو مسعود الانصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ دیکھیں: صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٧٨٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٠٧، ٨٠٨) مسند أحمد (٤/ ١١٨)

[4] مسند أحمد (٥/ ١٨٠) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (١٤٨٢)

[5] تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٤٥، ٤٤٦)

پہلے ایک کتاب لکھی، اس میں سے یہ دو آیتیں اتاریں، جن پر سورت بقرہ کا اختتام ہے۔ کوئی ایسا گھر نہیں جس میں یہ آیات تین رات پڑھی جائیں اور شیطان اس گھر سے نزدیک آئے۔[1] (رواہ الطبراني بسند جید)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے کہ ایک آواز سنی گئی، جبرائیل نے نظر اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا: یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے، جو کبھی نہیں کھولا گیا تھا، اس دروازے سے ایک فرشتہ اترا، جس نے آ کر نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: تم کو دو نور کی بشارت ہو، جو تم کو دیے گئے ہیں، آپ سے پہلے یہ دونوں نور کسی نبی کو نہیں دیے گئے۔ جو شخص بھی فاتحۃ الکتاب اور خواتیم سورت بقرہ کا کوئی حرف پڑھے گا، اسے نور دیا جائے گا۔[2] (أخرجه مسلم والنسائي واللفظ له) سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ جب اس سورت کو پڑھ کر فارغ ہوتے تو آمین کہتے۔[3] (رواہ مسلم) سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ جب یہ آیت اتری تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «حَقٌّ لَهُ أَنْ يُؤْمِنَ» (اس کا حق ہے کہ وہ اس پر ایمان لائے) امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطا اور نسیان اور اس چیز کو جو اس سے زبردستی کرائی گئی ہے، معاف کر دیا۔[5] (رواہ ابن ماجه و ابن حبان في صحيحه) یہ حدیث کئی طرق سے آئی ہے، جس کے بعض طرق بعض کو تقویت دیتے ہیں۔ وللہ الحمد.

اے رب! اس سورت کی تفسیر تحریر کرنے میں یا کسی بھی قول و فعل میں مجھ سے کوئی بھول چوک ہوگئی ہو یا جس کو میں کرنے پر مجبور ہوگیا ہوں تو ان سب امور کو اپنے فضلِ عمیم، کرمِ وسیع اور رحمتِ کاملہ سے بخش دے، میں اس پر اپنے تمام موجودہ و سابقہ گناہوں سے، جو اس دم تک مجھ سے ہوئے ہیں، بصدقِ نیت و خلوصِ دل توبہ کرتا ہوں، تو میری توبہ قبول فرما اور میرے سارے گناہ بخش دے۔ اللھم آمین ثم آمین.

آج بستم (۲۰) شوال ۱۳۰۲ھ روز دوشنبہ (پیر) کو یہ سورتِ مبارکہ مع تفسیر ختم ہوئی۔ والحمد لله الذي بنعمته تتم الصالحات.

---

[1] المعجم الكبير (۷/ ۲۸۵) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه الطبراني ورجاله ثقات" (مجمع الزوائد: ۷/ ۲۳)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (۸۰۶) سنن النسائي، رقم الحديث (۹۱۲)

[3] سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کا یہ عمل صحیح مسلم کے بجائے تفسیر الطبری اور دوسری کتابوں میں مروی ہے۔ دیکھیں: تفسير الطبري (۶/ ۱۴۶) اس کی سند میں انقطاع ہے۔

[4] مستدرك الحاكم (۲/ ۳۱۵) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ کا سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔

[5] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲۰۴۵) صحيح ابن حبان (۱۶/ ۲۰۲) صحيح الجامع، رقم الحديث (۱۸۳۶)

تفسیر سورت آلِ عمران

سورت آلِ عمران کا مقام نزول اور فضیلت:

یہ سورت مدینہ شریف میں اتری ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس ثبات پر اجماع ہے۔[1] اس میں دو سو آیتیں ہیں۔ اس کے مدنی ہونے کی یہ دلیل ہے کہ یہ سورت شروع سے تراسی (۸۳) آیت تک نجران کے وفد کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ وہ لوگ سنہ نو ہجری میں آئے تھے۔ ان کے مدینہ میں آنے کا بیان تفسیر آیتِ مباہلہ کے ذیل میں آئے گا۔ إن شاء اللّٰہ تعالیٰ.

سورت بقرہ اور اس سورت کی فضیلت میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں ۔ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سورت بقرہ اور سورت آلِ عمران کو سیکھو، یہ دونوں قیامت کے دن چمکتی ہیں، اپنے صاحبوں پر سایہ کریں گی، گویا دو چھتریاں ہیں یا پرندوں کے دو جمگھٹ صف باندھے ہوئے ہیں۔[2] (الحدیث رواہ أحمد)

سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تم قرآن پڑھو، وہ اپنے لوگوں کی قیامت کے دن شفاعت کرے گا۔ تم زَہرَاوین (بقرہ اور آلِ عمران) کی تلاوت کرو، یہ دونوں قیامت کے دن دو بادلوں یا دو چھتریوں یا پرندوں کے دو جمگھٹ کی طرح صفیں باندھے ہوئے ہوں گی اور اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے حجت کریں گی۔[3] (رواہ أحمد) سیدنا نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن قرآن کو اور قرآن والوں کو (جو اس پر عمل کرتے تھے) لایا جائے گا، ان کے آگے آگے سورت بقرہ اور سورت آلِ عمران ہوگی۔ (رواہ أحمد و مسلم) امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ حدیث غریب ہے۔[4]

امام ابو عبید رحمہ اللہ کی روایت میں مروی ہے کہ ایک آدمی نے سورت بقرہ اور آلِ عمران پڑھی۔ جب وہ نماز پڑھ چکا تو سیدنا کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تو نے سورت بقرہ اور آلِ عمران پڑھی ہے؟ کہا: ہاں۔ کہا کہ ان دونوں میں اللہ کا وہ نام ہے کہ جب اس نام کو لے کر دعا کی جائے تو قبول ہوتی ہے۔ کہا: مجھ کو بتا دو؟ کہا: واللہ! ہرگز نہیں بتاؤں گا، اگر میں نے بتایا اور تو نے کہیں ایسی دعا کی کہ میں اور تو دونوں ہلاک ہوئے تو پھر کیا ہوگا؟[5] یزید جرشی رحمہ اللہ نے کہا ہے

---

[1] تفسیر القرطبي (٤/ ١)
[2] مسند أحمد (٥/ ٣٦١) صحیح الترغیب والترهیب (٢/ ٨٨)
[3] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٠٤) مسند أحمد (٥/ ٢٥١)
[4] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٠٥) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٨٨٣) مسند أحمد (٤/ ١٨٣)
[5] فضائل القرآن لأبي عبید (١/ ٣٩٧)

کہ جو ان دونوں سورتوں کو دن یا رات میں پڑھے گا، وہ نفاق سے بَری رہے گا۔[1] صحیحین میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ان دونوں سورتوں کو نماز کی ایک رکعت میں پڑھا ہے۔[2] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سورت بقرہ کے آغاز میں اور بھی حدیثیں لکھی ہیں، جن میں انفراداً اور اجتماعاً سورت بقرہ، آل عمران اور سَبْعِ طِوال (سات طویل) سورتوں کی فضیلت آئی ہے۔[3] وللہ الحمد.

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ﴿۱﴾ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ﴿۲﴾ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۳﴾ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴﴾

اللہ کے نام سے (شروع) جو نہایت مہربان بہت رحم کرنے والا ہے۔

الٓمّٓ ① وہ اللہ ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے، سب کو سنبھالنے والا ہے ② اسی نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے اور اسی نے تورات اور انجیل کو نازل کیا ③ اس سے پہلے، لوگوں کی ہدایت کے لیے اور اسی نے فرقان (قرآن) نازل کیا۔ بے شک وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا، ان کے لیے شدید عذاب ہے اور اللہ انتہائی غالب، بدلہ لینے والا ہے ④

قرآنِ مجید کی عظمت:

پہلے یہ حدیث گزر چکی ہے کہ اللہ کا اسم اعظم ان دو آیتوں میں ہے: ﴿اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ اور: ﴿الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝﴾[4] اس جگہ کتاب سے مراد قرآن ہے، یعنی اے محمد ﷺ! ہم نے تم پر سچا قرآن اُتارا ہے، جس میں کسی طرح کا شک و شبہہ نہیں ہے اور یہ اللہ ہی کے پاس سے آیا ہے، فرشتے اس کی گواہی دیتے ہیں، اللہ کی گواہی کافی ہے۔ یہ کتاب ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے، جو اس سے پہلے آسمان سے اللہ کے بندوں اور پیغمبروں پر اتری ہیں۔ یعنی زمانہ قدیم میں جس بات کی خبر اور بشارت دی گئی ہے، یہ کتاب بھی وہی

---

① فضائل القرآن لأبي عبيد (١/ ٤٠٠)
② صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٧٢)
③ تفسير ابن كثير (١/ ٤٨)
④ آیۃ الکرسی کی تفسیر میں یہ حدیث گزر چکی ہے۔

خبر اور بشارت دیتی ہے۔ وہ خبر یہ تھی کہ اللہ محمد ﷺ کو رسول بنا کر بھیجے گا اور بشارت یہ تھی کہ ان پر قرآن اُتارے گا۔ تورات موسیٰ بن عمران علیہ السلام پر اتری تھی۔ انجیل عیسیٰ بن مریم علیہما السلام پر نازل ہوئی تھی۔ ان دونوں کتابوں میں اس زمانے کے لوگوں کے لیے ہدایت تھی۔

اب فرقان آیا ہے، جو ہدایت اور ضلالت اور حق و باطل کے درمیان فرق بتاتا ہے، اس میں اللہ کی کھلی حجتیں، واضح دلیلیں اور قطعی سندیں موجود ہیں، جن سے خیر و شر، نیک و بد، خوب اور ناخوب میں بہ خوبی تمیز کی جاسکتی ہے۔ فرقان کے یہی معنی ہیں۔ امام قتادہ اور ربیع رحمہما اللہ نے کہا ہے: اس جگہ فرقان سے مراد قرآن ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے: اس جگہ فرقان مصدر ہے، اس لیے کہ قرآن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ یعنی لفظ کتاب سے قرآن ہی مراد تھا۔[1] ابو صالح رحمہ اللہ کا یہ قول کہ اس جگہ فرقان سے مراد تورات ہے،[2] ضعیف ہے، کیوں کہ تورات کا ذکر بھی ہو چکا۔ پھر فرمایا کہ جن لوگوں نے اس فرقان یا قرآن کا انکار کیا اور باطل سے اس کو رد کیا، ان کو قیامت کے دن بڑی مار پڑے گی۔ مسلمانوں کے سوا ساری اُمتیں منکر ہیں، اللہ ان سے اس انکار اور رد کا خاطر خواہ بدلہ لے گا۔

فتح البیان میں ہے کہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ لفظ ''الم'' سے کیا مراد ہے۔ ''حي'' کہتے ہیں: ہمیشہ باقی رہنے والے کو جو کبھی نہ مرے۔ ''قیوم'' وہ ہے جو اپنی ذات سے قائم ہو، مخلوق کا بندوبست رکھے، جس امرِ معاش اور معاد میں مخلوق محتاج ہے، اس کی مصلحت کا انتظام کرے۔ لفظِ ''نَزَّلَ'' سے معلوم ہوا کہ اس آیت کے نزول کے وقت قرآن پورا نہیں تھا، کیوں کہ تفعیل کا صیغہ تنجیم پر دلیل ہے، یعنی قرآن پارہ پارہ ہو کر مختلف اوقات میں اترا ہے تورات اور انجیل کے برعکس کہ وہ ایک دفعہ میں اتری ہیں۔ اسی لیے لفظ ''أَنْزَلَ'' فرمایا ہے۔ ان دونوں کتابوں کے یہ نام عبرانی ہیں یا سریانی جیسے زبور۔ بعض نے کہا: مشتق ہیں۔ لیکن پہلا قول زیادہ بہتر ہے۔

لفظِ نَاس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں یا عام لوگ۔ کیوں کہ یہ امت بھی ایسی شریعت کو ماننے والی ہے، جو غیر منسوخ ہے، اسی لیے ابن فورک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نَاس سے مراد متقین ہیں۔[3] قرآن کو فرقان فرمایا، کیوں کہ اس میں حق و باطل میں فرق کرنے کا وصف موجود ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے: قرآن میں حلال و حرام، شرعی حدود اور فرائض اور اوامر و نواہی کا بیان ہے۔[4] یہ قرآن عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں پائے جانے والے اختلاف کا فیصلہ کرتا ہے۔ کسی نے کہا ہے: فرقان سے مراد زبور ہے، کیوں کہ وہ مواعظِ حسنہ پر مشتمل ہے یا اس سے پہلے کے رسولوں پر جو کتابیں اتری ہیں، ان کے احکام اس میں ہیں، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ جو کافر ہوئے، ان سے مراد وہ نصاریٰ ہیں جو نجران سے ایلچی بن کر آئے تھے، انھوں نے قرآن اور نبی اکرم ﷺ کا انکار کیا، لیکن کسی سبب کی خصوصیت

---

[1] تفسير الطبري (٦/ ١٦٣، ١٦٤)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥٨٩)
[3] تفسير القرطبي (٤/ ٦)
[4] تفسير الطبري (٦/ ١٦٣)

لفظ کی عمومیت سے مانع نہیں ہے۔ جب مانع نہیں ہے تو آیت ہر اس شخص کو شامل ہوگی جو اللہ کی آیتوں کا منکر ہے، ان کو اس کفر کی وجہ سے سخت عذاب ہوگا، دنیا میں تلوار سے عذاب ہوگا اور آخرت میں آگ میں ہمیشہ رہنے سے۔ محمد بن جعفر رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ ہر اس کافر سے انتقام لے گا، جس نے جان بوجھ کر اللہ کی آیتوں کو نہیں مانا۔[1]

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰى عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ ۝ هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝

بے شک اللہ سے زمین اور آسمان میں کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ⑤ وہی ہے جو (تمھاری ماؤں کے) پیٹوں میں تمھاری صورتیں جیسی چاہتا ہے بناتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غالب، خوب حکمت والا ہے ⑥

علمِ الٰہی کی وسعت:

اس آیتِ شریفہ میں خبر دی گئی ہے کہ اللہ کو ہر غیب کی بات معلوم ہے، کوئی شے اس پر مخفی نہیں ہے، وہ جزئیات کا عالم ہے۔ ماں کے پیٹ میں نر و مادہ، خوب اور ناخوب، بدبخت اور نیک بخت وہی پیدا کرتا ہے۔ الوہیت کا حق صرف اسی ذات پاک وحدہ لاشریک لہ کو ہے۔ عزت و حکمت سب اسی کے لیے ہے۔ اس آیت میں اس بات کا اشارہ ہے، بلکہ صراحت ہے کہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ایک بندہ اور مخلوق ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ نے سارے بشر ماں کے پیٹ میں بنائے، اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کو ماں کے پیٹ میں بنایا، پھر وہ کس طرح اللہ ہو سکتے ہیں، جیسا کہ نصاریٰ نے خیال کیا ہے، وہ بالکل باطل ہے۔ وہ تو پیٹ کے اندر دل و جگر کے پاس پھرتے رہے اور ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہوتے رہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ یَخْلُقُكُمْ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ﴾ [الزمر: ٦] ”وہ تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں پیدا کرتا ہے، ایک پیدائش (مرحلے) کے بعد دوسری پیدائش میں، تین قسم کے اندھیروں (پردوں) میں۔“

فتح البیان کے الفاظ ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی وسعتِ علم اور احاطۂ معلومات کا بیان ہے کہ اس کو ہر چیز کا جزئی اور کلی علم حاصل ہے۔ حکما کا یہ قول کہ اللہ کلیات کو جانتا ہے، جزئیات کو نہیں، مردود ہے۔ یہ آیت ان کی تردید کرتی ہے۔ معلومات کو ”بِمَا فِي الْأَرْضِ وَالسَّمَاءِ“ سے اس لیے تعبیر کیا ہے کہ بندوں کا علم تمام عالم کو

---

[1] تفسیر الطبري (٦/ ١٦٥) فتح البیان (٢/ ١٧١۔ ١٧٣)

گھیرنے سے قاصر ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے علم کی انتہا نہیں ہے۔ اس کی معلومات میں سے ایک یہ ہے کہ کون مومن ہے اور کون کافر۔ کوئی اس کا انکار نہیں کرسکتا کہ عیسیٰ علیہ السلام ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے، جب ہوئے تو مخلوق ٹھہرے نہ کہ معبود۔ رحم کے اندھیروں میں کیا کیا مختلف صورتیں، طبیعتیں، رنگتیں اچھی بری، کالی گوری، لمبی چھوٹی، کامل ناقص بنائی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس، سیدنا عبداللہ بن مسعود اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ نطفہ (قطرۂ منی) جب رحم میں پڑتا ہے تو سارے بدن میں پھیل جاتا ہے، چالیس دن کے بعد ایک علقہ (جما ہوا خون) ہو کر چالیس دن کے بعد مضغہ (بوٹی) بنتا ہے، پھر چالیس دن کے بعد فرشتہ آ کر اس کی صورت بناتا ہے، دو انگلیوں کے بیچ میں مٹی لا کر اس مضغہ کے اندر ملا دیتا ہے، پھر اس کو گوندھ کر، جیسا حکم ہوتا ہے، نر یا مادہ، بدبخت یا نیک بخت، ویسی شکل کھینچتا ہے، اللہ کے حکم کے مطابق رزق و عمر، اثر اور مصائب لکھ دیتا ہے، جب وہ بدن مرتا ہے تو اسی جگہ دفن ہوتا ہے، جہاں کی وہ مٹی تھی۔[1]

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڤ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ڤ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝

وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی، جس میں کچھ آیات محکم (واضح) ہیں جو اس کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور کچھ دوسری متشابہات (غیر واضح) ہیں، پھر جن لوگوں کے دل میں ٹیڑھ ہے وہ ان میں سے انہی آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جو متشابہ (غیر واضح ہیں)، ان کا مقصد محض فتنے اور تاویل کی تلاش ہوتا ہے، حالاں کہ اللہ کے سوا کوئی بھی ان کی تاویل نہیں جانتا، اور جو لوگ علم میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں: ہمارا ان (متشابہات) پر ایمان ہے، یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں اور نصیحت تو عقل مند ہی حاصل کرتے ہیں⑦ (وہ دعا

[1] تفسیر الطبري (٦/ ١٦٧) اس کی سند پر علامہ احمد شاکر کا کلام دیکھیں: تفسیر الطبري (١/ ١٥٦) فتح البیان (٢/ ١٧٣۔ ١٧٤)

کرتے ہیں:) اے ہمارے رب! ہمیں ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر اور عطا کر ہمیں اپنے پاس سے رحمت، بے شک تو ہی بڑا عطا کرنے والا ہے ⑧ اے ہمارے رب! یقیناً تو لوگوں کو ایک دن جمع کرنے والا ہے جس میں کوئی شک نہیں، بے شک اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا ⑨

محکم اور متشابہ آیات کا بیان:

موضح قرآن میں فرمایا ہے کہ اس سورت میں نصاریٰ کو سمجھانا منظور ہے، وہ مریم علیہا السلام کو اللہ کی بیوی کہتے اور عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا۔ وہ اس وجہ سے بہکتے تھے کہ ان کے حق میں اللہ کی مہربانی کے الفاظ سنتے تھے، اس لیے وہ ان کے لیے بندہ ہونے سے زیادہ کا مرتبہ چاہتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر کلام میں بعض ایسی باتیں رکھی ہیں، جن کے معنی صاف ظاہر نہیں ہوتے، تو جو گمراہ تھے، وہ ان کے معنی اپنی عقل سے لینے لگے۔ جو مضبوط علم رکھتے ہیں، وہ ان کے معنی دوسری آیتوں سے ملا کر سمجھتے ہیں، جو کتاب کی جڑ ہیں، اس کے موافق سمجھ پائے تو سمجھے اور اگر نہ سمجھ پائے تو اللہ پر چھوڑ دے کہ وہی بہتر جانتا ہے، ہمیں ایمان سے کام ہے۔

اللہ پاک نے اس آیتِ مقدسہ میں خبر دی ہے کہ قرآن شریف میں آیاتِ محکمات ہیں، جو اُم الکتاب ہیں، یعنی کھلی ہوئی دلالتیں اور روشن حجتیں ہیں، جن میں کسی طرح کا ابہام نہیں، ہر شخص ان کو بہ خوبی سمجھ سکتا ہے۔ بعض آیات ایسی ہیں جن کی اپنے مفہوم پر دلالت کرنے میں بہت سے یا بعض لوگوں کو اشتباہ ہوتا ہے۔ سو جس نے مشتبہ کو واضح کی طرف پھیرا اور محکم کو متشابہ پر فیصلہ کرنے والا سمجھا، اس نے ہدایت پائی اور جس نے اس کے برعکس کیا، وہ گمراہ ہوا۔ اسی لیے پہلی قسم کی آیات کو اُم الکتاب فرمایا ہے، یعنی وہ اصل ہیں کہ اشتباہ کے وقت ان کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ دوسری آیات متشابہات ہیں، ان کی دلالت کبھی محکم کے مطابق ہوتی ہے اور کبھی لفظ کی ترکیب کی وجہ سے اس کا مطلب کچھ اور بھی ہوسکتا ہے، جو اصل مراد کے برعکس ہوتا ہے۔ اہلِ علم میں محکم اور متشابہ آیات کے بارے میں اختلاف ہے، اس سلسلے میں سلف سے بہت سی عبارتیں آئی ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ محکمات ناسخ، حرام و حلال، حدود و احکام اور اوامر و نواہی ہیں۔[1] دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ محکمات اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے:

﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١٥١] ''کہہ دیجیے: آؤ میں پڑھ کر سناتا ہوں جو

---

[1] تفسیر الطبري (٦/ ١٧٥) تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٥٩٢) اس کی سند حسن ہے۔

کچھ تمھارے رب نے تم پر حرام کیا ہے، یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اور اپنی اولاد کو تنگ دستی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمھیں بھی اور انھیں بھی رزق دیتے ہیں، اور بے حیائی کے کاموں کے قریب نہ جاؤ، خواہ وہ ظاہر ہوں یا چھپے ہوئے ہوں، اور کسی ایسی جان کو قتل مت کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہو، سوائے اس کے جس کا قتل برحق ہو، ان ساری باتوں کی اللہ نے تمھیں تاکید کی ہے، تاکہ تم عقل سے کام لو۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ﴾ [بني إسرائيل: ٢٣] ''اور آپ کے رب نے فیصلہ کر دیا کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔''[1] سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ ابو فاختہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ متشابہات وہ الفاظ ہیں جو سورتوں کے شروع میں آتے ہیں۔ یحییٰ بن یعمر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ محکمات فرائض، امر و نہی اور حلال و حرام ہیں۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: ان کو اُم الکتاب اس لیے فرمایا ہے کہ وہ ساری کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ مقاتل بن حیان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کوئی دین والا ایسا نہیں ہے، جو ان کو پسند نہ کرے۔

متشابہات سے مراد آیاتِ منسوخہ، مقدم، موخر، امثال و اقسام ہیں، جن پر مومن ایمان لاتے ہیں، عمل نہیں کرتے۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بھی ہے۔ مقاتل بن حیان رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ ان سے مراد حروفِ مقطعات ہیں، جو سورتوں کے شروع میں آئے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بعض متشابہات بعض کی تصدیق کرتی ہیں۔[2] یہ بات اللہ کے فرمان: ﴿ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ﴾ [الزمر: ٢٣] کی تفسیر میں کہی ہے۔ بعض نے کہا: متشابہ وہ کلام ہے جو ایک سیاق پر چلے، مثانی وہ ہے جو دو راہ پر چلے (یعنی جن میں دو متضاد باتوں کا ذکر ہو)، جیسے: صفتِ نار و صفتِ جنت یا نیک لوگوں کے حال کا ذکر اور بدلوگوں کے حال کا ذکر اور اس کے مثل۔ مگر یہاں متشابہ سے وہ مراد ہے جو محکم کے مقابلے میں ہو۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بہتر وہی قول ہے جو پہلے گزر چکا ہے۔ اسی قول کو محمد بن اسحاق بن یسار رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے۔ چناں چہ کہا ہے کہ آیاتِ محکمات اللہ کی حجت، بندوں کی عصمت اور جھگڑوں اور باطل کو ختم کرتی ہیں، یہ جس معنی کے لیے وضع کی گئی ہوں، اس سے ان کو پھیرا جا سکتا ہے نہ کوئی دوسرا معنی نکالا جا سکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جن کے دلوں میں زَیغ، یعنی گمراہی اور حق سے باطل کی طرف خروج ہے، وہی ان متشابہات کو لے کر تحریف کرتے اور اپنے مقاصدِ فاسدہ پر اتارتے ہیں، کیوں کہ لفظ محتمل ہوتا ہے، اس کو جدھر چاہیں پھیر دیں۔

رہا محکم تو اس میں ان کو کوئی دلچسپی نہیں ہے، کیوں کہ وہ غلط مقصد کو دور کرتا ہے اور ان پر حجت ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ فتنے کے لیے اس کی جستجو کرتے ہیں، تاکہ اپنے پیروکاروں کو گمراہ کر دیں۔ اپنی بدعت پر قرآن سے حجت لاتے ہیں، حالاں کہ قرآن خود ان پر حجت ہے نہ کہ ان کے حق میں ہے۔ جس طرح نصاریٰ نے کہا کہ

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٣٩٢) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٥٩٢۔ ٥٩٤)

قرآن میں آیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی روح اور کلمہ ہیں، جس کو مریم کی طرف ڈالا گیا اور اس آیت کو چھوڑ دیا جو ان پر حجت ہے: ﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ ﴾ [الزخرف: ٥٩] ''وہ (عیسیٰ) تو صرف ایک بندہ ہے جس پر ہم نے انعام کیا۔'' یا جیسے یہ آیت: ﴿ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ [آل عمران: ٥٩] ''بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے، اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا، پھر اس سے کہا کہ ہو جا، تو وہ ہو گیا۔'' اس کے سوا اور بہت سی آیاتِ محکمات ہیں، جو اس بات پر دلیل ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کی مخلوقات کی طرح ایک مخلوق تھے اور ایک بندے اور اللہ کے دوسرے رسولوں کی طرح ایک رسول تھے۔

تاویل کا تلاش کرنا یہ ہے کہ اس کی اپنے ارادے کے مطابق تحریف کریں۔ مقاتل بن حیان اور سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یہ چاہتے ہیں کہ جو بات ہونے والی ہے اور جو چیزوں کا انجام ہے، وہ قرآن سے معلوم کریں۔[1] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو ﴿ هُوَ الَّذِيْٓ ﴾ سے ﴿ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾ تک پڑھا، پھر فرمایا: جب تم دیکھو ان لوگوں کو جو اس کے بارے میں آپس میں جھگڑا کرتے ہیں تو وہ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے مراد لیا ہے، تم ان سے بچو۔[2] (رواہ أحمد و ابن ماجه و أبو بکر بن المنذر في تفسیره و الترمذي و ابن جریر) اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ نے اسی آیت کی تفسیر میں، امام مسلم رحمہ اللہ نے کتاب القدر میں اور امام ابو داود نے سنن میں روایت کیا ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو پڑھ کر فرمایا کہ جب تم ان لوگوں کو دیکھو، جو قرآن کی متشابہ آیات کے پیچھے پڑے ہیں تو یہ وہی لوگ ہیں، جن کا نام اللہ نے لیا ہے، تم ان سے بچتے رہو۔ یہ بخاری کی روایت ہے۔ ترمذی نے اس کو حسن صحیح کہا ہے۔[3] (رواہ ابن أبي حاتم)

امام ابن جریر اور ابن مردویہ رحمہما اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ ذکر کیے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے بارے میں یوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ڈرایا ہے، اس لیے جب تم ان لوگوں کو دیکھو تو ان سے بچو۔[4] سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ وہ لوگ خوارج ہیں۔ (رواہ أحمد) اسی طرح اس آیت: ﴿ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ﴾ [آل عمران: ١٠٦] ''جس دن کئی چہرے سفید ہوں گے اور کئی چہرے سیاہ ہوں گے۔'' میں کہا ہے کہ سیاہ منہ والے ''هم الخوارج'' ''وہ خوارج ہیں۔''[5] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ موقوف

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٥١)

[2] تفسیر الطبري (٦/ ١٨٨) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٩٩٤) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٤٧) مسند أحمد (٦/ ٤٨)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٥٩٥) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٢٧٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٦٥) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٥٩٨) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٩٩٤)

[4] تفسیر الطبري (٦/ ١٩٢، ١٩٣) اس کی سند صحیح ہے۔ [5] مسند أحمد (٥/ ٢٦٢) اس کی سند حسن ہے۔

ہو، یعنی صحابی کا قول ہو، مگر اس کے معنی صحیح ہیں، کیوں کہ اسلام میں سب سے پہلے جو بدعت واقع ہوئی، وہ یہی خوارج کا فتنہ تھا، ان کا آغاز دنیا طلبی پر ہوا۔

نبی اکرم ﷺ نے جب حنین کے اموالِ غنیمت کو تقسیم فرمایا تو ان کے فاسد ذہنوں میں یہ بات سمائی کہ نبی اکرم ﷺ نے تقسیم میں انصاف نہیں کیا۔ اس بات کو یکا یک منہ سے نکال بیٹھے۔ ذوالخویصرہ نے کہا: عدل کرو، آپ نے عدل نہیں کیا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر میں نے عدل نہیں کیا تو میں برباد ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اہلِ زمین پر امین سمجھا، تم مجھ کو امین نہیں جانتے ہو۔ جب وہ پیٹھ پھیر کر چلا گیا تو سیدنا عمر بن خطاب یا خالد بن ولید رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ہم اس کو قتل کر دیں؟ فرمایا: چھوڑ دو، اس کی نسل سے ایک قوم نکلے گی کہ تم میں ایک آدمی اپنی نماز کو ان کی نماز کے مقابلے میں اور اپنی قراءت کو ان کی قراءت کے مقابلے میں حقیر سمجھے گا۔ وہ قوم دین سے ایسے نکل جائے گی، جیسے ترکش سے تیر نکل جاتا ہے۔ تم کو وہ قوم جہاں کہیں ملے، ان کو قتل کرنا۔ ان کو قتل کرنے میں قاتل کو اجر ملے گا۔

پھر سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں خوارج کا ظہور ہوا، وہ لوگ نہروان میں مارے گئے۔ پھر ان کے خاندان اور قبائل، ان کی آرا، خواہشات، نظریات اور جھوٹے مذاہب بہت پھیل گئے۔ پھر قدریہ اُٹھے، پھر معتزلہ، پھر جہمیہ وغیرہ اہلِ بدعت آئے، [1] جن کی خبر صادق و مصدوق ﷺ نے اس حدیث میں دی تھی: «سَتَفْتَرِقُ هٰذِهِ الْأُمَّةُ عَلٰى ثَلَاثَةٍ وَّسَبْعِيْنَ فِرْقَةً كُلُّهَا فِي النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةً قَالُوْا: وَمَا هُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ؟ قَالَ: مَنْ كَانَ عَلٰى مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِيْ» [2] (رواه الحاكم في مستدركه بهذه الزيادة) سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ میری امت میں ایک قوم ہوگی، جو قرآن کو اس طرح پڑھے گی جیسے سوکھی ردی کھجوریں بکھیرتے ہیں۔ اسی طرح قرآن کو اور معنی پر محمول کرے گی۔ [3] (رواه أبو يعلیٰ)

محکم اور متشابہ کی تعریف میں اقوال:

فتح البیان میں ہے کہ محکمات سے "بَيِّنَاتٌ مُّفَصَّلَاتٌ" مراد ہیں، یعنی ان کی عبارت تاویل اور اشتباہ کے احتمال سے محکم (پاک) ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس میں تصرف کرنے سے روک دیا ہے، کیوں کہ اس کے الفاظ ظاہر اور اس کے معنی واضح ہیں۔ متشابہات کی تفسیر میں کئی قول ہیں۔ کسی نے کہا: محکم وہ ہے جس کی تاویل معروف اور جس کے معنی سمجھ میں آنے والے ہیں۔ متشابہ وہ ہے جس کے معلوم کرنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما، شعبی اور سفیان ثوری رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں، جیسے: سورتوں کے شروع میں حروفِ مقطعات ہیں۔ [4]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ٤٥٢) [2] مستدرك الحاكم (۱/ ۲۱۸) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۲۰٤)

[3] الدر المنثور (۲/ ۱٤۹) امام بوصیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "هذا إسناد رواته ثقات" (إتحاف: ٦/ ۳٤٥)

[4] تفسير القرطبي (٤/ ۹۔ ۱۰)

بعض نے کہا ہے: محکم وہ ہے جس کا ایک ہی مطلب ممکن ہے۔ متشابہ وہ ہے، جس کی توجیہ کئی طرح سے ممکن ہے، جب اس کو ایک وجہ کی طرف پھیریں گے اور باقی وجوہ کو باطل ٹھہرا دیں گے تو وہ متشابہ محکم ہو جائے گا۔ بعض نے کہا: محکم وہ ہے جو بہ نفسہٖ قائم ہے اور اسے غیر کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ متشابہ وہ ہے جس کو غیر کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہو۔ امام نحاس رحمہ اللہ نے کہا: یہ سب سے اچھا قول ہے۔[1] امام قرطبی رحمہ اللہ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔[2] امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔[3]

امام شوکانی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ محکم اس کو کہتے ہیں جس کے معنی واضح ہوں اور جس کی دلالت ظاہر ہو، خواہ اپنے آپ سے یا کسی اور کے توسط سے۔ اور متشابہ وہ ہے جس کے معنی غیر واضح ہوں اور جس کا استدلال دونوں اعتبار سے غیر ظاہر ہو۔ اس سے معلوم ہوا اختلاف مذکور ٹھیک نہیں ہے۔ ہر اہلِ قول نے محکم کی تعریف بعض صفات کے ساتھ کی ہے، پھر متشابہ کو اس کے مدِمقابل ٹھہرایا، پھر سات اقوال ذکر کر کے ہر قول کی کمی کو ذکر کیا۔[4] پھر سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول کہ سورت انعام کی آخری تین آیتیں: ﴿ قُلْ تَعَالَوْا... الخ﴾ یا اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿ وَقَضٰى رَبُّكَ ﴾ [بني إسرائيل: ٢٣] تین آیت تک محکمات میں نقل کر کے کہا ہے، اللہ اُن پر رحم کرے، کیوں کہ اس قول میں کچھ بھی فائدہ نہیں ہے۔ قرآن مجید میں صرف تین یا دس یا سو آیات کو محکم کہنے میں کیا حاصل۔ جمیع اقوال کے مطابق اکثر قرآنِ مجید محکمات ہے، بلکہ خود اُن کے دوسرے قول کے مطابق بھی ایسا ہی ہے، جس میں یہ کہا ہے کہ محکمات سے ناسخ، حلال، حرام، حدود اور فرائض کے متعلق تمام آیات مراد ہیں۔[5]

آیت کے شانِ نزول کا سبب وفدِ نجران:

”زیغ“ کہتے ہیں: حق سے پھرنے کو، جس طرح نجران کا وفد پھر گیا تھا۔ لفظ ”اتباعِ متشابہ“ (یعنی متشابہ آیات کے پیچھے لگنے والے) عام ہے، ہر گروہ جو حق سے خارج ہے، وہ اس میں داخل ہے۔ گو آیت کے نزول کا سبب نجران کے نصاریٰ تھے، وہ متشابہ قرآن کو لے کر اہلِ ایمان کے دلوں میں شک ڈالتے تھے اور اس کو اپنی بدعت پر دلیل ٹھہراتے تھے، جس طرح اہلِ بدعت کے تمام گروہ اللہ کی کتاب کے ساتھ سخت ہنسی مذاق کرتے ہیں، اپنی جہالت کو پھیلانے کے لیے قرآن سے دلیلیں نکالتے ہیں، حالاں کہ اس میں ان کے مطلب کا کوئی استدلال نہیں ہے۔ وہ یہ کام اس لیے کرتے ہیں کہ دین میں فتنہ برپا کریں اور آپس میں فساد ڈالیں۔

کلام اور تاویل کی مذمت:

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے ”إعلام الموقعين“ میں لکھا ہے کہ جب کسی شخص سے کسی آیت یا حدیث کی تفسیر

[1] معاني القرآن الكريم، للنحاس (١/ ٣٤٦) [2] تفسير القرطبي (٤/ ١١) [3] المحرر الوجيز (١/ ٤٠٠)
[4] فتح القدير (١/ ٥٢٧۔ ٥٢٨) [5] فتح القدير (١/ ٥٣٢۔ ٥٣٣)

پوچھی جائے تو اس کو ایسا نہیں چاہیے کہ اس آیت یا سنت کو اس کے ظاہر معنی سے نکال کر اس کی تاویلاتِ فاسدہ کرے اور اپنے مذہب وخواہش کے مطابق اس کو ڈھالے، جو کوئی ایسا کام کرے، اس کو فتویٰ دینے سے روک دینا چاہیے۔ ائمہ کلام نے قدیماً وحدیثاً اسی بات کی تصریح کی ہے۔ امام جوینی رحمہ اللہ نے رسالہ نظامیہ میں لکھا ہے کہ ائمہ سلف کا یہ مذہب ہے کہ تاویل سے باز رہنا چاہیے، ظاہر کو اس کے اصل پر جاری کرنا چاہیے۔ ان کے معنی کو اللہ کے سپرد کرنا چاہیے اور جس رائے کو ہم پسند کرتے ہیں اور جو ہمارا دین ہے، وہ سلفِ امت کا اتباع ہے، صحابہ اور رسول اللہ ﷺ اسی بات پر رہے ہیں کہ معنوں سے تعرض نہ کیا جائے۔

صحابہ وہ لوگ تھے جنھوں نے شریعت کا بوجھ اٹھایا، وہ ملتِ اسلامیہ کے چنے ہوئے لوگ تھے، وہ ہمیشہ اُمت کے قواعد وضوابط کی پابندی کرنے میں کوشاں رہتے تھے اور ایک دوسرے کو ملت کی حفاظت کرنے کی وصیت کرتے رہتے تھے، لوگوں کو جو بات معلوم نہ ہوتی، وہ سکھاتے تھے۔ اگر ظاہر آیات کی تاویل جائز ہوتی یا اچھی سمجھی جاتی تو وہ بے شک شریعت کی جزئیات سے زیادہ اس کا اہتمام کرتے۔ مگر جب ان کا اور تابعین کا زمانہ بغیر تاویل کے گزر گیا تو یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہی بات قابلِ اتباع ہے، اللہ کا ان صفاتِ مخلوقین سے پاک ہونے کا عقیدہ رکھنا، ہر ایماندار پر حق ہے۔ مومن کو متشابہات اور مشکلات کی تاویل میں نہیں پڑنا چاہیے۔ ان کے معنی اللہ کے سپرد کر دینے چاہییں۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو ایمان علم کلام سے حاصل ہوتا ہے، وہ ضعیف ہے۔ ایمانِ راسخ وہی عام لوگوں کا ایمان ہے، جو لڑکپن سے سن سن کر اُن کے دلوں میں آ گیا ہے۔ ائمہ اربعہ کا کلام کی مذمت پر اتفاق ہے۔[1] امام ابن قیم رحمہ اللہ کی یہ تقریر لمبی چوڑی ہے۔ فتح البیان میں اس جگہ سے کسی قدر زیادہ لکھی گئی ہے۔[2] کلام وتاویل کی مذمت میں ہمارا رسالہ ''قصد السبیل'' ایک عمدہ مختصر کتاب ہے۔

﴿ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ﴾ پر وقف کا مسئلہ:

علمائے قراءت کا اس بات پر اختلاف ہے کہ ﴿ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ﴾ پر وقف کرنا چاہیے یا نہیں؟ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ کرنا چاہیے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا، عروہ، ابو الشعثا اور ابونہیک رحمہم اللہ وغیرہم کا بھی یہی قول ہے۔[3] حافظ ابو القاسم رحمہ اللہ نے ''المعجم الکبیر'' میں سیدنا ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ نبیِ مکرم ﷺ نے فرمایا: میں اپنی امت پر تین باتوں کے علاوہ نہیں ڈرتا، ایک یہ کہ ان کے پاس مال زیادہ ہو اور وہ آپس میں حسد کر کے لڑائی کریں۔ دوسری یہ کہ ان کے لیے اللہ کی کتاب کھولی جائے اور مومن اس کو لے کر اس

[1] إعلام الموقعين (٤/ ٢٤٥۔ ٢٤٨) [2] فتح البيان (٢/ ١٧٥۔ ١٨٤)

[3] تفسير الطبري (٦/ ٢٠٢) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥٩٩)

کی تاویل تلاش کریں، حالانکہ اس کی تاویل سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا ہے، جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائے۔ تیسری یہ کہ عالم کو ضائع کریں، اس کی کچھ پروا نہ کریں۔[1] یہ حدیث سخت غریب ہے۔

امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً اس طرح روایت کیا ہے کہ قرآن اس لیے نہیں اترا کہ قرآن کا کچھ حصہ دوسرے حصے کی تکذیب کرے، بلکہ جو تم پہچانو، اس پر عمل کرو اور جو متشابہ ہو، اس پر ایمان لاؤ۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کو یوں پڑھتے تھے: ”وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهُ إِلَّا اللّٰهُ وَيَقُوْلُ الرَّاسِخُوْنَ أَمَنَّا بِهٖ“[3] (رواہ عبدالرزاق و ابن جریر) مالک بن انس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحابہ اس پر ایمان لائے تھے، اس کی تاویل نہیں جانتے تھے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت یوں تھی: ”إِنَّ تَأْوِيْلَهُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالرَّاسِخُوْنَ فِيْ الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ آمَنَّا بِهٖ“ اسی طرح سیدنا اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، اس کو ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔[4] یہی قول حق اور صحیح ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ وقف ”والراسخون في العلم“ پر ہے۔ بہت سے مفسر اور اہلِ اصول اسی طرف گئے ہیں۔ ان کا مقولہ ہے کہ ایسا خطاب جو سمجھ میں نہ آئے، بعید ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ بھی ہے کہ ”میں ان راسخین میں سے ہوں، جو تاویل کو جانتے ہیں۔“[5] یہی بات ربیع بن انس رحمہ اللہ نے بھی کہی ہے،[6] لیکن انھوں نے متشابہات کی تاویل کو محکم کی طرف پھیرا ہے۔ اس سے ان کا عذر ظاہر ہوگیا، باطل دور ہوگیا اور کفر باطل ہوگیا۔ حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو دعا دی ہے کہ «اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِيْ الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيْلَ»[7] ”اے اللہ اس کو دین کی سمجھ عطا فرما اور اس کو تاویل سکھا۔“

بعض علما نے اس جگہ تفصیل کی ہے کہ تاویل کے دو معنی ہیں: ایک حقیقتِ شے اور انجام شے، جس طرح یہ آیت ہے: ﴿ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ﴾ [یوسف: ۱۰۰] ”اے میرے ابا جان! یہ میرے پہلے کے خواب کی تعبیر ہے۔“ نیز اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ۭ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ ﴾ [الأعراف: ۵۳] ”ان لوگوں کو اور کسی بات کا انتظار نہیں، صرف اس کے انجام (قیامت) کا انتظار ہے، جس دن اس کا انجام سامنے آئے

---

① المعجم الکبیر (۳/ ۲۹۳) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”فیه محمد بن إسماعیل بن عیاش عن أبیه ولم یسمع من أبیه“ (مجمع الزوائد: ۱/ ۳۳۸)

② تفسیر ابن کثیر (۱/ ٤٥٣) اس کی سند حسن ہے۔

③ تفسیر القرآن لعبد الرزاق الصنعاني (۱/ ۱۱٦) تفسیر الطبري (٦/ ۲۰۲) اس کی سند حسن ہے۔

④ تفسیر الطبري (٦/ ۲۰۳۔ ۲۰٤)

⑤ تفسیر الطبري (٦/ ۲۰۳) اس کی سند صحیح ہے۔

⑥ تفسیر الطبري (٦/ ۲۰۳)

⑦ مسند أحمد (۱/ ۲٦٦) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (۲۵۸۹)

گا۔'' لہٰذا تاویل سے اس جگہ اگر یہی معنی مراد ہیں تو اسم مبارک ''اللہ'' پر وقف ٹھیک ہے، کیوں کہ معاملات کی حقیقتوں اور اشیا کے ہونے کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا اور اگر دوسرے معنی مراد ہیں، یعنی تفسیر و بیان و تعبیر جیسے: ﴿ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ﴾ [یوسف: ۳٦] تو وقف ﴿ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ ﴾ پر ہوگا، کیوں کہ وہ اس اعتبار سے خطاب کو سمجھتے بوجھتے ہیں، اگرچہ ان کو حقائقِ اشیا کا پورا علم نہ ہو۔

فتح البیان ہے کہ ﴿ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ ﴾ پہلی بات سے الگ بات ہے، اکثر علما کا یہی مقولہ ہے۔ ''واؤ'' جمع کے لیے ہے، پہلا کلام لفظ ﴿ اللّٰهُ ﴾ پر ختم ہو چکا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کی ایک کثیر جماعت کا یہی مذہب ہے۔ کسائی و فراء و اخفش و ابوعبید وغیرہ علمائے نحو بھی اسی طرف گئے ہیں۔ فقط امام مجاہد رحمہ اللہ نے واؤ کو عطف کے لیے سمجھا ہے۔ لہٰذا عام اہلِ علم اور علمِ نحو کے علما کے مقابلے میں صرف امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول زیادہ قابلِ ترجیح نہیں ہوسکتا۔ اگر واؤ اس لیے ہوتا تو ﴿ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ﴾ کا کچھ فائدہ نہ تھا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: امام خطابی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ سوائے مجاہد رحمہ اللہ کے یہ بات کسی نے نہیں کہی ہے۔[1] امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا: "أَقْيَسُ فِي الْعَرَبِيَّةِ وَأَشْبَهُ بِظَاهِرِ الْآيَةِ" یہ بات عربی قواعد کے اعتبار سے زیادہ درست اور آیت کے ظاہر کے زیادہ قریب ہے اور جملہ "راسخون" الگ تھلگ ہے۔[2] اس سے جو پہلے ہے، اس سے معطوف نہیں ہے۔ مگر ابن فورک اور احمد بن عمر (امام قرطبی کے استاذ) وغیرہ محققین اہلِ تفسیر عطف کے قائل ہیں۔[3] امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں: راسخین تاویل نہیں جانتے۔[4] امام شوکانی رحمہ اللہ نے فتح القدیر میں فرمایا ہے: یہ سارا اضطراب، جو اہلِ علم کے مقالات میں واقع ہوا ہے، اس کا بڑا سبب محکم اور متشابہ آیات کے معنی کی تحقیق میں اختلاف ہے، جو بات صحیح تھی، وہ ہم نے پہلے ہی لکھ دی ہے۔ پھر کہا کہ تمام متشابہ کے مصداق میں سے ایک سورتوں کے افتتاحیہ کلمات ہیں، جن کو کوئی عربی لغت کا شناسا نہیں جانتا۔ پھر وہ چیزیں ہیں جن کا علم صرف اللہ کو ہے، کسی دوسرے کو نہیں۔ جیسے روح یا قیامت کا علم یا بارش برسنے کا وقت یا جو عورت کے رحم میں ہے۔

اسی طرح جس کی خبر خود بخود یا کسی اور کی معرفت ظاہر نہیں ہے، وہ بھی متشابہ ہے۔ جیسے ایک چیز میں دو احتمال ہوں، مگر کسی احتمال کو ترجیح نہ دی جا سکے، اس کی مثال وہ مشترک الفاظ ہیں جن کے معنی کو کسی خارجی امر نے متعین نہیں کیا ہے یا دو دلیلیں ایک دوسرے کے متعارض آئی ہیں، ایک کو دوسری پر بہ نفسہٖ ترجیح نہیں دی جاسکتی یا کسی اور وجہ سے نہیں دی جاسکتی اور جس کے معنی خود بخود واضح ہیں، مثلاً: لغتِ عرب یا شریعت میں عام ہیں یا دوسرے اعتبار سے بھی جانے جاتے ہیں، جیسے: وہ امور من جملہ جن کا بیان کسی دوسری آیت یا حدیث میں آیا ہے یا وہ امور جن کی

[1] تفسیر القرطبي (٤/ ١٧) [2] تفسیر البغوي (٢/ ١٠) [3] تفسیر القرطبي (٤/ ١٨) [4] تفسیر الرازي (٢/ ٥)

دلالت باہم متعارض ہے، مگر قرآن و حدیث نے کسی ایک دلالت کو ترجیح دی ہے یا وہ مرجحات جو اہلِ اصول کے نزدیک معروف اور اہلِ انصاف کے نزدیک مقبول ہیں کہ اس قسم کے محکم ہونے میں کچھ شک و شبہہ نہیں ہے۔ جس نے ان کو متشابہ سمجھا ہے، اس پر ان کی حقیقت مشتبہ رہی۔

پھر قرآن میں ایسی آیتیں بھی آئی ہیں، جن سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سارا قرآن محکم ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ﴾ [هود: ١] ''(یہ وہ) کتاب ہے جس کی آیتیں محکم کی گئی ہیں۔'' اور اُس کا فرمان ہے: ﴿ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۝ ﴾ [يونس: ١] ''یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔'' سو اس جگہ محکم سے مراد یہ ہے کہ اس کے الفاظ صحیح اور معنی درست ہیں، فصاحت و بلاغت میں سب کلاموں سے آگے ہے۔ کہیں جگہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ سارا قرآن متشابہ ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا ﴾ [الزمر: ٢٣] ''جو ایک کتاب ہے باہم ملتی جلتی۔'' اس متشابہ کا یہ مطلب ہے کہ قرآن کے بعض حصے کی صحت، وضاحت، حسن اور بلاغت بعض کے مشابہ ہے۔[1]

راسخین فی العلم کی تفسیر:

اس آیتِ شریفہ میں راسخین ان کو ٹھہرایا ہے جو یہ بات کہتے ہیں کہ یہ ساری محکم و متشابہ آیات حق و صداقت میں ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں، کیوں کہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہے، کسی اور کے پاس سے نہیں آیا کہ مختلف اور متضاد ہو، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ ﴾ [النساء: ٨٢] ''کیا پھر وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے؟ اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ یقیناً اس میں بہت کچھ اختلاف پاتے۔'' اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں سمجھتے اس بات کو، مگر وہی لوگ جو عقلِ سلیم اور فہمِ مستقیم رکھتے ہیں۔ عبداللہ بن یزید رحمہ اللہ نے بہت سے صحابہ کو پایا تھا، جیسے: سیدنا انس، سیدنا ابو امامہ، سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہم، وہ مرفوعاً کہتے ہیں: راسخین فی العلم وہ لوگ ہیں جو قسم کے پکے، زبان کے سچے، دل کے سیدھے اور پیٹ اور شرم گاہ کے پارسا ہیں۔[2] (رواه ابن أبي حاتم)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ پہلی کتاب ایک طرح اور ایک حرف پر اترتی تھی۔ قرآن سات حروف پر اترا ہے، زجر، امر، حلال، حرام، محکم، متشابہ اور امثال۔ سو اس کے حلال کو حلال، اس کے حرام کو حرام سمجھو۔ امر پر چلو اور نہی سے بچو۔ امثال سے عبرت پکڑو، محکم پر عمل کرو، متشابہ پر ایمان لاؤ۔ کہو ہم ایمان لائے اس

---

[1] فتح القدير (١/ ٥٣١) فتح البيان (٢/ ١٨٤۔ ١٨٨)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٥٩٩) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''عبد الله بن يزيد ضعيف'' (مجمع الزوائد: ٧/ ٤٥)

پر، یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔[1] (رواه ابن جرير والحاكم وصححه) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت یہ ہے کہ قرآن سات حروف پر اترا ہے۔ قرآن میں جھگڑنا کفر ہے، جو تم پہچانو اس پر عمل کرو، جو نہ سمجھو، اس کو اس کے جاننے والے کی طرف پھیر دو۔[2] (رواه ابن جرير و ابن المنذر) اس کی اسناد صحیح ہیں۔

ضبیع نامی ایک آدمی مدینہ میں آیا، جو لوگوں سے متشابہ قرآن کا سوال کرتا تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو کھجور کی شاخ سے ایسا پیٹا کہ اس کا سر لہولہان ہو گیا، کہا: بس کرو جو بات میرے دماغ میں تھی نکل گئی ہے۔ اس قصے کو دارمی، نصر مقدسی اور ابن عساکر رحمہ اللہ وغیرہ ایک جماعت نے کئی طرق اور الفاظ سے روایت کیا ہے۔[3] پھر اللہ تعالیٰ نے ذکر کیا کہ جو لوگ علم میں راسخ ہیں، ان کی یہ دعا ہے کہ وہ اپنا قیام ہدایت پر مانگتے ہیں اور رحمت کے طالب رہتے ہیں۔ سیدہ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا کرتے تھے: «يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ» [اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھنا] پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا ﴾.[4] (رواه ابن أبي حاتم)

سیدہ اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعاے مذکور کو "اللهم" کے لفظ کے ساتھ بہت کرتے تھے۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا دل پلٹ جاتا ہے؟ فرمایا: ہاں، اللہ تعالیٰ نے کوئی بشر پیدا نہیں کیا، مگر اس کا دل اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے بیچ میں ہے۔ چاہے اس کو سیدھا رکھے، چاہے پلٹ دے، ہم اللہ سے یہ مانگتے ہیں کہ ہمارے دلوں کو ہدایت دینے کے بعد نہ پلٹے، ہم کو اپنے پاس سے رحمت دے، کیوں کہ دینے والا وہی ہے۔ (رواه ابن مردويه) ابن جریر رحمہ اللہ نے اتنا اور زیادہ کیا ہے: میں نے کہا: آپ مجھے ایسی دعا نہیں سکھا دیتے، جو میں اپنے لیے کیا کروں؟ فرمایا: یوں کہو: «اَللّٰهُمَّ رَبَّ مُحَمَّدِ النَّبِيِّ! اِغْفِرْ لِيْ ذَنْبِيْ، وَأَذْهِبْ غَيْظَ قَلْبِيْ، وَأَجِرْنِيْ مِنْ مُضِلَّاتِ الْفِتَنِ»[5] (اے اللہ! محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رب! میرے گناہ بخش دے، میرے دل کا جوش وغیظ ختم کر دے اور مجھے گمراہ کن فتنوں سے اپنی پناہ میں رکھنا) اس کے بعد جو دعا آئی ہے، اس میں معاد کا اقرار ہے۔

"حزب أعظم" اور "نزل الأبرار" میں قرآن کریم کی تمام دعاؤں کو قرآنی ترتیب سے ایک جگہ لکھ دیا ہے۔ سب سے بہتر وہ دعا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں انبیا و صلحا کی زبان سے نقل کیا ہے، پھر وہ دعا جو

---

[1] تفسير الطبري (١/ ٦٨) مستدرك الحاكم (١/ ٧٣٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٥٨٧)

[2] تفسير الطبري (١/ ٢١، ٢٢) امام البانی رحمہ اللہ نے "السلسلة الصحيحة" (رقم الحديث: ١٥٢٢) پر بحث کرتے ہوئے مذکورہ روایت کو ذکر کر کے فرمایا: "وسنده صحيح على شرط الشيخين"

[3] سنن الدارمي (١/ ٦٦) تاريخ دمشق لابن عساكر (٢٣/ ٤١١) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ سلیمان بن یسار رحمہ اللہ نے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔

[4] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٠١۔ ٦٠٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٠٩١)

[5] تفسير الطبري (٦/ ٢١٤) مسند أحمد (٦/ ٣٠١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسناده حسن" (مجمع الزوائد: ١٠/ ٢٧٨)

نبی مکرم ﷺ سے ماثور ہوئی۔ دنیا و دین کا وہ کون سا مطلب ہے جو ان دعاؤں میں نہیں آچکا کہ ہم ان کو چھوڑ کر علما اور مشائخ کی دعاؤں کو اپنا وظیفہ ٹھہرائیں۔

نبی اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ جو کوئی اس آیت یعنی ﴿ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا ﴾ کو گم شدہ چیز پر پڑھے گا، اللہ تعالیٰ وہ چیز اس کو لوٹا دے گا۔ جب یہ دعا پڑھ چکے تو یوں کہے: "يَا جَامِعَ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيْهِ اِجْمَعْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ مَالِيْ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ" (اے لوگوں کو اس دن اکٹھا کرنے والے، جس میں کوئی شک نہیں! میرے مال کو میرے ساتھ اکٹھا کر دے تُو ہر چیز پر قادر ہے)۔ (رواہ ابن النجار في تاریخه عن جعفر بن محمد الخلدي)[1]

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَھُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) سے (بچانے میں) ان کے کچھ بھی کام نہیں آئیں گی اور وہی لوگ آگ کا ایندھن ہیں (10) (ان کا انجام) آلِ فرعون اور ان لوگوں کا سا ہوگا جو ان سے پہلے تھے، انھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تو اللہ نے ان کے گناہوں کے باعث انھیں پکڑ لیا اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے (11)

کافر جہنم کا ایندھن ہیں اور قیامت کے دن مال و اولاد ان کے کام نہیں آئیں گے:

اللہ پاک نے اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ کافر لوگ جہنم کا ایندھن ہیں، اس دن کسی ظالم کو کوئی عذر فائدہ نہ دے گا، بلکہ ان کے لیے لعنت اور برا گھر ہے۔ یہ مال جو دنیا میں ان کو ملا ہے، یہ اللہ کے سامنے کچھ کام نہیں آئے گا نہ مال خرچ کرنے سے عذاب دور ہوگا اور نہ اولاد کی مدد سے کچھ فائدہ ہی ہاتھ آئے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ ﴾ [التوبة: ٥٥] "چناں چہ ان کے مال اور ان کی اولاد آپ کو حیرت میں نہ ڈالیں، یقیناً اللہ یہی چاہتا ہے کہ ان کی وجہ سے انھیں دنیاوی زندگی ہی میں عذاب دے اور ان کی جانیں حالتِ کفر ہی میں نکلیں۔" اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۣ ثُمَّ مَاْوٰىھُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ

[1] نیز دیکھیں: ذیل تاریخ بغداد لابن النجار (۳/ ۱٤) اس میں یہ روایت بلاسند مذکور ہے۔

الْمِهَادُ ﴾ [آل عمران: ١٩٦۔ ١٩٧] ”جن لوگوں نے کفر کیا، ان کا شہروں میں چلنا پھرنا آپ کو دھوکے میں نہ ڈال دے۔ یہ تھوڑا سا فائدہ ہے، پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔“

یہاں یہ فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی آیات، رسولوں اور کتاب کے مخالف ہیں؛ وہ جہنم کا ایندھن ہوں گے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴾ [الأنبياء: ٩٨] ”بے شک تم اور جن کی اللہ کے سوا تم عبادت کرتے ہو جہنم کا ایندھن ہیں، تم اس میں داخل ہونے والے ہو۔“

سیدہ ام الفضل والدہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہم مکہ میں تھے کہ ایک رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر تین بار بہ آواز بلند کہا: « اَللّٰهُمَّ هَلْ بَلَّغْتُ؟ » (کیا میں نے پہنچا دیا؟) سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: ”نعم“ (جی ہاں) پھر صبح کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قریب ہے کہ اسلام غالب ہوگا اور کفر مغلوب ہو جائے گا، کچھ لوگ دریاؤں اور سمندروں کو چیرتے ہوئے نکل جائیں گے اور اسلام کی اشاعت کریں گے۔ یاد رکھو! لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ قرآن سیکھ کر اس کی قراءت کریں گے، کہیں گے: ہم نے قرآن پڑھا، علم سیکھ لیا، ہم سے بہتر کون ہے؟ بھلا ان میں کچھ بھی خیر ہے؟ کہا: اے اللہ کے رسول! وہ کون لوگ ہوں گے؟ فرمایا: وہ تمھی میں سے ہوں گے، وہ آگ کا ایندھن ہیں۔ اس کو ابن ابی حاتم وابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ صرف علم بغیر عمل کے آگ میں داخل ہونے سے نہیں روک سکتا۔[1]

”دأب“ کا معنی:

”دأب“ کے معنی ہیں: صنیع۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام عکرمہ، مجاہد، ابو مالک، ضحاک رحمہم اللہ اور ان کے علاوہ نے اسی طرح کہا ہے۔[2] صنیع کام کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ دأب سے مراد سنت ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ شبہہ مراد ہے۔ دأب بسکون وبتحریک کے معنی صنیع، حال، معاملہ، امر، عادت ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جس طرح کا عذاب آلِ فرعون اور اس سے پہلی امتوں پر رسولوں کے جھٹلانے کی وجہ سے ہوگا، اسی طرح کا عذاب ان کافروں کو ہوگا، جو مال دار اور صاحبِ اولاد ہیں۔ کفار ہر طرح کے کفر کو شامل ہے، اگرچہ بعض نے کہا ہے کہ اس جگہ مراد وفدِ نجران یا بنو قریظہ یا بنو نضیر یا عرب کے مشرکین ہیں، لیکن عام رکھنا زیادہ بہتر ہے۔

---

① تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٦٠٣) المعجم الكبير (٢٥٠/١٢١) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٣٢)

② تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٦٠٣)

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝۱۲
قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ
بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝۱۳

(اے نبی!) جن لوگوں نے کفر کیا، ان سے کہہ دیجیے: عن قریب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور تم جہنم کی طرف اکٹھے کیے (ہانکے) جاؤ گے اور وہ برا ٹھکانا ہے (12) تحقیق تمھارے لیے ان دو گروہوں میں ایک بڑی نشانی ہے جو (بدر میں) باہم ٹکرائے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا۔ وہ (کافر) ان (مسلمانوں) کو اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے، ظاہری آنکھوں سے اور اللہ اپنی مدد سے جس کو چاہتا ہے قوت دیتا ہے، بے شک اس میں بصیرت والوں کے لیے عبرت ہے (13)

یہودیوں کو مغلوبیت کی دھمکی اور بدر سے عبرت خیزی کی نصیحت:

یعنی جنگِ بدر میں، جس کا قصہ سورت انفال میں ہے، مسلمانوں سے کافر تین گنا تھے، لیکن اللہ دوگنا ہی دکھاتا تھا تاکہ خوف نہ کھائیں۔ پھر اللہ نے مسلمانوں کو فتح دی۔ اس سے چاہیے کہ کافر عبرت پکڑیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ تم کافروں سے یہ بات کہہ دو کہ تم دنیا میں مغلوب ہوگے اور آخرت میں تم جہنم میں جاؤ گے۔ عاصم بن عمرو رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ بدر سے پھر کر آئے تو یہودیوں کو بازارِ بنی قینقاع میں جمع کر کے فرمایا: اے یہودیوں کے گروہ! تم مسلمان ہو جاؤ، اس سے پہلے کہ تمھاری ویسی حالت بنے جیسی قریش کی ہوئی۔ انھوں نے کہا: اے محمد (ﷺ)! تم اس گھمنڈ میں نہ رہو کہ تم نے قریش کے چند لوگ مار ڈالے ہیں، وہ تو بیوقوف اور اناڑی تھے، وہ لڑنا کیا جانیں، اگر تم ہم سے لڑو تو تم کو بھی معلوم ہو کہ ہم آدمی ہیں۔ ہمارے برابر لڑنے والا کوئی تم کو نہیں ملے گا، اس پر یہ آیت اتری۔[1]

جنگ میں مسلمانوں کی حقیقی اور نظر آنے والی تعداد:

یہی بات سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کہی ہے۔[2] ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مشرک لوگ بدر کے دن

---

(1) تفسیر الطبري (٦/ ٢٢٨) یہ روایت مرسل ہے۔

(2) تفسیر الطبري (٦/ ٢٢٧) اس کی سند حسن ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الصحیح المسبور (١/ ٣٧۔ ٤٥)

اپنی تعداد مسلمانوں سے دوگنا دیکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام کی مدد کے لیے اہلِ اسلام کو ان کی آنکھوں میں ان سے دوگنا کر کے دکھایا۔ اس میں یہ اشکال ہے کہ مشرکین نے عمر بن سعد کو لڑائی سے پہلے جاسوسی کے لیے بھیجا تھا کہ دیکھ آؤ مسلمان کتنے ہیں؟ اس نے کہا: تین سو ہیں یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ، بات بھی یوں ہی تھی کہ مسلمان تین سو سے کچھ اوپر تھے۔ جب لڑائی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار فرشتے خواص اور ساداتِ ملائکہ سے مدد کے لیے بھیجے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ مسلمانوں نے مشرکوں کو اپنے سے دوگنا دیکھا، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی، اس میں کچھ اشکال نہیں ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ مسلمان بدر کے دن تین سو تیرہ آدمی تھے، مشرک چھے سو چھبیس،[2] گویا یہ قول ظاہر آیت سے ماخوذ ہے، لیکن اس کے خلاف مشہور ہے، کیوں کہ اہلِ تاریخ و اہلِ سیرت اور جمہور کے نزدیک اس دن مشرکین نو سو سے لے کر ہزار نفر تک تھے، جس طرح عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے بھی مرفوعاً یوں ہی کہا ہے۔ سیدنا علی اور سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ایک ہزار تھے، بہر حال وہ مسلمانوں سے تین گنا زیادہ تھے۔[3] ابن جریر رحمہ اللہ نے اشکال کے باوجود اسی قول کو پسندیدہ کہا ہے۔[4]

رہی وہ آیت جو قصہ بدر میں آئی ہے: ﴿ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّ يُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾ [الأنفال: ٤٤] ''اور (اے مسلمانو! یاد کرو) جب تم (کافروں کے) آمنے سامنے ہوئے تو اللہ نے انھیں تمھاری نظروں میں تھوڑا دکھایا اور تمھیں ان کی نظروں میں تھوڑا دکھایا، تاکہ اللہ اس کام کو پورا کر دے جو ہونے والا تھا۔ اور سب کام اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔'' تو اس میں دوسری حالت کا ذکر ہے، اس جگہ اور حالت کا ذکر ہے۔ ہر فریق نے دوسرے فریق کو آپ سے دوگنا دیکھا۔ یہ دیکھنا مسلمانوں کے لیے فتح اور دلاوری کا سبب بنا اور مشرکوں کے لیے شکست کا سبب ہوا۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ﴾ [آل عمران: ١٢٣] ''اور اللہ نے بدر میں عین اس وقت تمھاری مدد کی جب تم کمزور تھے۔'' اور یہاں یہ کہا: ﴿ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [آل عمران: ١٣] ''اور اللہ اپنی مدد سے جس کو چاہتا ہے قوت دیتا ہے۔'' بہر حال یہ معرکہ ایسا ہوا کہ جس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ فتح البیان میں کہا گیا ہے کہ اس جگہ کفار سے مراد یہودی ہیں یا مشرکینِ مکہ معظمہ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے مغلوب ہونے کا جو وعدہ کیا تھا، وہ اس طرح سچا ہوا کہ بنی قریظہ قتل ہوئے، بنی نضیر نکالے گئے، خیبر فتح ہو گیا اور باقی یہودیوں پر جزیہ عائد کر دیا گیا۔ وللہ الحمد.

---

[1] تفسير الطبري (٦/ ٢٣٣) تفسير ابن كثير (١/ ٤٥٧)
[2] تفسير الطبري (٦/ ٢٣٥) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔
[3] تفسير الطبري (٦/ ٢٣٥، ٢٣٦) تفسير ابن كثير (١/ ٤٥٨)
[4] تفسير الطبري (٦/ ٢٣٨)

مجاہدین کی تعداد اور اسلحہ وغیرہ کی مقدار:

اس لڑائی میں ستر مہاجر اور دو سو چھتیس انصار تھے، یہ سب تین سو تیرہ ہوئے۔ مہاجرین کا جھنڈا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا اور انصار کا جھنڈا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا۔ لشکرِ اسلام میں ستر اونٹ، دو گھوڑے، چھے زرہ اور آٹھ تلواریں تھیں، اکثر لشکری پیدل تھے۔ مشرکین نو سو پچاس تھے۔ سب لڑنے والے۔ ان کا سردار عتبہ بن ربیعہ تھا، ان کے لشکر میں سو گھوڑے تھے۔ ہجرت کے بعد سب سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی جنگِ بدر میں شریک ہوئے تھے۔ صحیح بات یہی ہے کہ مشرکوں نے مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا دیکھا نہ کہ مسلمانوں نے مشرکوں کو۔ اگرچہ بعض اہلِ علم تکلف سے تقریر کر کے اس طرف گئے ہیں۔ تین سو تیرہ اشخاص کا نو سو پچاس کی نفری پر فتح پانا لائقِ عبرت ہے۔[1]

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۚ ﴿۱۵﴾

لوگوں کے لیے خواہشاتِ نفس کی محبت مزین (پرکشش) کر دی گئی ہے، یعنی عورتوں کی، بیٹوں کی، سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے ڈھیروں کی، نشان لگے (عمدہ) گھوڑوں کی، مویشیوں کی اور کھیتی کی، یہ سب دنیاوی زندگی کا سامان ہے اور اچھا ٹھکانا اللہ ہی کے پاس ہے (14) (اے نبی!) کہہ دیجیے: کیا میں تمھیں ان سے بہتر چیز بتاؤں؟ پرہیزگاروں کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور وہاں ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور انھیں اللہ کی رضا حاصل ہوگی اور اللہ اپنے بندوں پر خوب نظر رکھنے والا ہے (15)

دنیا کی زینتیں اور اُن سے صحیح استفادہ کرنے کی راہنمائی:

اللہ نے اس آیت میں دنیا کے سارے مزوں کا ذکر فرمایا۔ پہلے عورتوں سے شروع کیا، کیوں کہ ان کا فتنہ سب

[1] فتح البیان (۲/ ۱۹۴۔ ۱۹۷)

سے زیادہ سخت ہے۔ صحیح حدیث میں مروی ہے کہ میں نے اپنے بعد مردوں پر عورتوں سے زیادہ مضر کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔[1] عورتوں سے اگر مقصود عورتوں کی پارسائی اور اولاد کی کثرت ہے تو وہ مطلوب، مرغوب فیہ اور مستحب امر ہے، جس طرح حدیثوں میں نکاح کرنے کی ترغیب آئی ہے۔ فرمایا: امت میں سے بہترین وہ ہے، جس کی عورتیں بہت ہوں۔[2] دنیا متاع ہے اور بہترین متاع نیک بخت عورت ہے،[3] جب اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کرے، جب اس کو کوئی حکم دے تو بجا لائے، جب اس کے پاس سے کہیں جائے تو اس کے مال کی حفاظت کرے، اپنی جان کو پارسا رکھے۔[4]

دوسری حدیث میں مروی ہے کہ مجھ کو عورتیں اور خوشبو پسند ہیں اور میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔[5] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں کے بعد گھوڑوں کے سوا اور کوئی چیز محبوب نہیں تھی۔[6] رہی بیٹوں کی محبت، سو اگر فخر اور زینت کے لیے ہے تو اس آیت میں داخل ہے اور اگر نسل بڑھانے کے لیے ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت بڑھے، اللہ کو بغیر شرک کے پوجنے والے زیادہ پیدا ہوں تو یہ قابلِ تعریف ہے۔ حدیث میں مروی ہے کہ تم زیادہ بچے پیدا کرنے والی اور محبت کرنے والی عورت سے بیاہ کرو، میں قیامت کے دن اور اُمتوں سے بڑھنا چاہتا ہوں۔[7] یہی حال مال کی محبت کا ہے۔ اگر فخر و تکبر اور دوسروں پر جبر کرنے اور اترانے کے لیے ہو، فقرا کو حقیر سمجھے، اپنے آپ کو امیر جانے تو قابلِ مذمت ہے اور اگر قریبی رشتے داروں پر خرچ کرنے کے لیے ہے یا صلہ رحمی کے لیے یا نیکی اور اطاعتِ الٰہی کے کاموں میں خرچ کرنے کے لیے ہے تو شرعاً قابلِ تعریف ہے۔

قِنطار کی تفسیر:

مفسرین کا اختلاف ہے کہ قنطار کیا چیز ہے۔ تمام اقوال کا حاصل یہ ہے کہ قنطار سے مراد بہت زیادہ مال ہے۔ کسی نے کہا: ہزار دینار۔ کسی نے کہا: بارہ سو دینار۔ کسی نے کہا: بارہ ہزار۔ کسی نے کہا: چالیس ہزار۔ کسی نے کہا: ساٹھ ہزار۔ کسی نے کہا: ستر ہزار۔ کسی نے کہا: اسّی ہزار۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قنطار

---

1. صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٨٠٨) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٧٤٠)
2. صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤٧٨٢) یہ روایت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے۔
3. صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٤٦٧)
4. سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٨٥٧) السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (٤٤٢١) البتہ اس کے ہم معنی روایت صحیح سند سے مروی ہے۔ دیکھیں: السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (١٨٣٨)
5. سنن النسائي، رقم الحدیث (٣٩٤٠) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٣١٢٤)
6. سنن النسائي، رقم الحدیث (٣٥٦٤) مسند أحمد (٥/ ٢٧) یہ روایت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بجائے سنن النسائی میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ اور مسند احمد میں معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ نیز امام ہیثمی رحمہ اللہ نے مسند احمد والی روایت کے راویوں کو ثقہ کہا ہے۔ (مجمع الزوائد: ٥/ ٤٧٠)
7. سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢٠٥٠) سنن النسائي، رقم الحدیث (٣٢٢٧)

بارہ ہزار اوقیہ ہے، ہر اوقیہ اس سے بہتر ہے جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے۔ (رواہ أحمد) امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے اس حدیث کو موقوفاً روایت کیا ہے، یہی زیادہ صحیح ہے۔[1] سیدنا معاذ بن جبل اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کا بھی یہی قول ہے۔[2] ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ قنطار بارہ سو اوقیہ ہوتا ہے۔[3] انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: "قناطیر مقنطرہ" کیا ہیں؟ فرمایا: قنطار دو ہزار اوقیہ ہیں۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث شیخین کی شرط پر صحیح ہے، اگرچہ انھوں نے اس کو روایت نہیں کیا۔[4] سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت مرفوعاً یہ ہے کہ قنطار ہزار دینار ہے۔[5] (رواہ ابن أبي حاتم والطبراني) حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: قنطار بارہ سو دینار ہیں۔[6] سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ قنطار بیل کی کھال بھر کے برابر سونے (کے ذخیرے) کو کہتے ہیں۔[7]

گھوڑوں کا بیان:

رہا گھوڑا تو اس کی محبت تین طرح سے ہوتی ہے: ایک اس لیے پالنا کہ جب جہاد کا موقع ملے تو اس پر اللہ کی راہ میں سوار ہو کر لڑے، ایسے شخص کو ثواب ملتا ہے۔ دوسرا اس لیے پالنا کہ فخر کرے اور اہلِ اسلام پر چڑھے، وہ اپنے مالک پر وبال اور بوجھ ہے۔ تیسرا اس لیے پالنا کہ کسی سے سواری نہ مانگنا پڑے، محتاجی ظاہر نہ ہو یا اس کی نسل لینے کے لیے ہو، پھر اللہ تعالیٰ کا حق بھی نہ بھولے، یہ اپنے صاحب کے لیے پردہ ہے۔ "مُسَوَّمَة" سے پلے ہوئے گھوڑے مراد ہیں جو چرنے کو جاتے ہیں، وہ خوب موٹے تازے ہوتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عکرمہ، سدی اور ربیع وغیرہم کا یہی قول ہے۔ امام مکحول رحمہ اللہ نے کہا: یہ وہ گھوڑے ہیں، جن کی پیشانی، ہاتھ اور پاؤں سفید ہیں،[8] اس کے سوا اور بھی معنی کیے گئے ہیں۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ ہر عربی گھوڑے کو ہر صبح دو دعائیں کرنے کی اجازت دی جاتی ہے: اے اللہ! تو نے مجھے بنی آدم کے حوالے کیا، جسے چاہا مجھے اس کو

---

① مسند أحمد (۲/ ۳۶۳) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۳۶۶۰) اس حدیث کو امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے موقوفاً بیان کرنے کے بجائے مرفوعاً بیان کیا ہے۔ السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۴۰۷۶) البتہ جس روایت کو امام ابن جریر رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے موقوفاً بیان کیا ہے اس میں قنطار سے مراد بارہ سو اوقیہ ہے۔ دیکھیں: تفسير الطبري (۶/ ۲۴۴) اس کی سند حسن ہے۔

② سیدنا معاذ بن جبل اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کا قول یہ ہے کہ قنطار سے مراد بارہ سو اوقیہ ہے۔ دیکھیں: تفسير الطبري (۶/ ۲۴۴)

③ تفسير ابن أبي حاتم (۲/ ۶۰۸)

④ مستدرك الحاكم (۲/ ۱۹۴) امام البانی رحمہ اللہ نے "السلسلة الضعيفة" (رقم الحديث: ۴۰۷۶) پر بحث کرتے ہوئے مذکورہ روایت کو ذکر کر کے اس کو بھی ضعیف کہا ہے۔

⑤ تفسير ابن أبي حاتم (۲/ ۶۰۹) امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس روایت کو دو سندوں سے روایت کیا ہے۔ پہلی سند میں "یزید رقاشی" اور دوسری سند میں "عمرو بن ابی سلمہ عن زہیر بن محمد" ضعیف راوی ہیں۔

⑥ تفسير الطبري (۶/ ۲۴۵) ⑦ تفسير الطبري (۶/ ۲۴۸) تفسير ابن أبي حاتم (۲/ ۶۰۸۔ ۶۰۹) اس کی سند صحیح ہے۔

⑧ تفسير ابن أبي حاتم (۲/ ۶۱۰، ۶۱۱)

دے دیا، اب تو مجھ کو اس کے لیے مال و اہل سے زیادہ محبوب کر دے۔[1] (رواہ أحمد) مویشی سے مراد اونٹ بیل بکری ہے۔ ''حرث'' سے مراد وہ زمین ہے، جس میں کوئی درخت لگائیں یا کھیتی کریں۔ سیدنا سوید بن ہبیرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ آدمی کا بہترین مال کثیر النسل گھوڑا ہے یا کھجور کے گھنے درخت جو پھل لاتے ہیں۔[2] (رواہ أحمد)

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دنیا کے مزوں کی حقارت بیان کی ہے اور ان سے بے رغبتی دلائی ہے۔ مُزَیِّن (زینت دینے والا) سے مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی کو بخاری نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔[3] آیتِ کریمہ: ﴿ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ ﴾ [الكهف: ٧] ''بلاشبہ ہم نے جو کچھ روئے زمین پر ہے، اسے اس کی زینت بنایا ہے، تاکہ ہم انھیں آزمائیں۔'' بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ اسی لیے امام مجاہد رحمہ اللہ نے لفظ ''زَیَّن'' کو بصیغۂ معروف پڑھا ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: مراد شیطان ہے، جیسے صاف طور پر آ چکا ہے: ﴿ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ ﴾ [النمل: ٢٤] ''اور شیطان نے ان کے اعمال ان کے لیے پرکشش بنا دیے ہیں۔''[4] یہ آیت مذمت کے طور پر آئی ہے۔ معتزلہ کے ایک گروہ کا یہی قول ہے، لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔

لفظِ ''ناس'' سے مراد سارے آدمی ہیں، یعنی جنسِ بنی آدم۔ مشتہیات (خواہشات) کو شہوات کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، تاکہ ان کا پسندیدہ ہونا معلوم ہو یا حقارت کے لیے ایسا کہا ہے، کیوں کہ اہلِ عقل کے نزدیک یہ ساری خواہشات حیوانی طبیعت کی صفات سے ہیں، پھر شہوت کبھی جھوٹی ہوتی ہے، جیسے: ﴿ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ ﴾ [مريم: ٥٩] ''جنھوں نے نماز ضائع کی اور خواہشات کی پیروی کی۔'' اور کبھی سچی، جیسے: ﴿ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ﴾ [الزخرف: ٧١] ''اور اس (جنت) میں جس شے کو ان کے دل چاہیں گے اور (ان کی) آنکھیں متلذذ ہوں گی (وہ موجود ہوگی)۔'' امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: ''مُقَنْطَرَةَ'' سے مراد مضروبہ ہے، یعنی سکہ۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ڈھیر پر ڈھیر مراد ہے۔ کسی نے کہا: مراد مکملہ ہے، یعنی پورا ڈھیر۔ تین کو قناطیر، نو کو مقنطرہ کہتے ہیں۔[5] ابن کیسان رحمہ اللہ نے کہا: مقنطرہ سات قناطیر سے کم نہیں ہوتا۔[6] مسومہ وہ گھوڑے ہیں جو سبزہ زار میں چرتے ہیں یا جن کو داغا گیا نشانی کے لیے یا جن کی پشت پر لوگ سوار ہیں یا سفید و سیاہ داغوں والا۔[7]

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (٣٥٧٩) مسند أحمد (٥/ ١٧٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٤١٤)

[2] مسند أحمد (٣/ ٤٦٨) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رجال أحمد ثقات'' (مجمع الزوائد: ٥/ ٤٧٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥/ ٢٣٦٥) [4] تفسير القرطبي (٤/ ٢٨) [5] تفسير الطبري (٦/ ٢٤٩، ٢٥٠)

[6] تفسير القرطبي (٤/ ٣١) [7] فتح البيان (٢/ ١٩٧۔ ٢٠٠)

متقین کی جزا دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر ہے:

پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد یہ فرمایا کہ یہ سارا ٹھاٹھ باٹھ، دنیا والی زندگی کی چمک دمک اس دارِ فانی کی رونق اور آرایش ہے، یہ کوئی رکنے والی چیز نہیں ہے، اچھا ثواب اللہ کے پاس ہے۔ جب یہ آیت اتری تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے رب! اب ہم کیا کریں؟ تب فرمایا: میں تم کو اس سے بہتر چیز کی خبر دیتا ہوں، وہ چیز جنت ہے، جس کے نیچے سے طرح طرح کی نہریں بہتی ہیں کوئی شہد کی، کوئی دودھ کی، کوئی شراب کی، بلکہ اس میں وہ چیز ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی اور نہ کسی دل پر گزری۔[1] خلود سے یہ مراد ہے کہ ابد الآباد تک انقطاع کے بغیر اس میں رہیں گے، اس میں سے نکلنا یا باہر جانا ہرگز پسند نہیں کریں گے۔

بیویوں کی طہارت سے یہ مراد ہے کہ ان میں کسی طرح کی میل کچیل، بدبو، حیض، نفاس، منی کا پانی وغیرہ نہیں ہوگا، جس طرح دنیا کی عورتوں میں ہوتا ہے۔ سب سے بڑی نعمت اللہ کی رضا مندی ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی رہے گا، کبھی ناراض نہ ہوگا۔ یہ نعمت سب سے زیادہ ہوگی۔ سورت براءت میں فرمایا ہے: ﴿ وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾ [التوبة: ۷۲] یعنی اللہ کی رضا مندی سب سے بڑھ کر (نعمت) ہوگی۔

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ جنتیوں سے کہے گا: اے جنت والو! وہ کہیں گے: "لَبَّيْكَ رَبَّنَا وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ كُلُّهُ فِي يَدَيْكَ" یعنی اے رب! ہم حاضر ہیں، ساری بہتری تیرے ہاتھ میں ہے۔ پھر وہ فرمائے گا: تم راضی ہو؟ وہ کہیں گے: ہم کو کیا ہوا ہے، جو ہم راضی نہ ہوں۔ ہمیں تو تو نے وہ کچھ دیا ہے، جو کسی مخلوق کو نہیں دیا۔ فرمائے گا: بھلا کیا اس سے بھی بہتر چیز تم کو نہ دوں؟ وہ کہیں گے: اس سے افضل اب کیا ہوگا؟ فرمائے گا: میں تم پر اپنی رضامندی اُتارتا ہوں، اب تم پر کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔[2] (رواہ الشیخان) بندے کو جب یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ اللہ اس سے راضی ہو گیا ہے تو اس کو بڑی خوشی حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کے بصیر ہونے کا یہی نتیجہ ہے کہ ہر ایک کے ساتھ اس کے مرتبے اور حقوق کے مطابق انعام و اکرام فرمائے گا۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۱۶ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝۱۷

جو لوگ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! بے شک ہم ایمان لائے، پس تو ہمارے گناہ بخش دے

[1] تفسیر الطبري (٦/ ٢٤٤) تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٦٠٦) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابوبکر بن حفص کی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔ البتہ معنوی طور پر یہ بات درست اور ثابت ہے۔

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦١٨٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٨٢٩)

اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا⑯ (یہ لوگ) صبر کرنے والے، سچ بولنے والے، حکم بجا لانے والے، خرچ کرنے والے اور سحری کے اوقات میں بخشش طلب کرنے والے ہیں⑰

متقین کی دعا اور صفات:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان متقیوں کا ذکر فرمایا ہے جن سے ثوابِ جمیل اور اجرِ جزیل کا وعدہ کیا ہے۔ ان کی پہلی صفت صبر ہے، یعنی اطاعت پر ثابت قدم رہنے والے اور محرمات کو ترک کرنے والے۔ دوسری صفت صدق ہے، یعنی ایمان کے دعوے میں سچے اور پکے ہیں۔ مومن نہ ہوتے تو یہ مشقت والے اعمال کیوں بجا لاتے؟ تیسرا وصف قنوت ہے، جس کے معنی اطاعت اور خضوع ہیں۔ چوتھا وصف اللہ کی فرمانبرداری میں صلہ رحمی کے لیے قریبی رشتے داروں پر مال خرچ کرنا۔ فقرا و افلاس زدہ کو مدد دینا، حاجت مندوں کی دل جوئی کرنا، ان کاموں میں ان کا مال خرچ ہوتا ہے، جہاں اللہ کی مرضی ہے۔ پانچویں صفت سحری کے وقت استغفار کرنا ہے۔

استغفارِ سحری کی فضیلت:

کہتے ہیں یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا کہ میں تمھارے لیے جلد استغفار کروں گا، پھر سحر تک تاخیر کی۔ صحیحین اور مسانید اور سنن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے کئی طرح یہ روایت آئی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب پچھلی رات کی تہائی رہ جاتی ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ آسمانِ دنیا کی طرف اترتا ہے اور فرماتا ہے: کوئی ہے مانگنے والا، میں اس کو دوں؟ کوئی ہے دعا کرنے والا، جس کی دعا قبول کروں؟ کوئی استغفار کرنے والا ہے کہ اس کو بخش دوں؟[1] حافظ ابو الحسن دارقطنی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے طرق کو ایک مستقل جزو میں علاحدہ جمع کیا ہے۔ میں کہتا ہوں: یہ بات تہجد پڑھنے والوں کے لیے آسان ہے۔ دعا اور استغفار کا جو اثر آخرِ شب سحر کے وقت ہوتا ہے، وہ دوسرے وقت میں کم تر ہوتا ہے۔

صحیحین میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر پڑھا رات کے ہر حصے میں، کبھی رات کے پہلے حصے میں، کبھی رات کے درمیان میں اور کبھی رات کے اخیر میں۔[2] سحری کا وقت سب سے آخری وقت ہوتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رات کو نماز پڑھتے تھے اور کہتے: اے نافع! سحر ہوئی یا نہیں؟ جب وہ کہتا: ہوگئی تو صبح تک دعا و استغفار میں لگے رہتے۔[3] (رواہ ابن أبي حاتم) حاطب رحمہ اللہ نے کہا: میں نے ایک شخص کو سحر کے وقت مسجد کے کنارے

---

① صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٠٩٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٧٥٨)

② صحیح البخاري، رقم الحدیث (٩٥١) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٧٤٥)

③ تفسیر الطبري (٦/ ٢٦٦) تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٦١٦) اس کی سند حسن ہے۔

میں دیکھا، وہ کہہ رہا تھا: ''يَا رَبِّ أَمَرْتَنِي فَأَطَعْتُكَ، وَهٰذَا السَّحَرُ فَاغْفِرْ لِي'' (اے رب! تونے حکم دیا تو میں نے تسلیم کیا، یہ سحری کا وقت ہے تو مجھے بخش دے) دیکھا تو وہ مرد سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔[1] (رواہ ابن مردویہ) سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: ہمیں حکم تھا کہ جب ہم رات میں نماز پڑھیں تو آخر سحر میں ستر بار استغفار کریں۔[2] (رواہ ابن مردویہ) اس آیت میں سوال کو صرف ایمان پر مترتب کیا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مغفرت کا مستحق ہونے کے لیے صرف ایمان کافی ہے۔ معتزلہ کا یہ کہنا کہ صرف ایمان لانے سے بخشش کا استحقاق نہیں ہوتا، مردود ہے۔ امام کرخی رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ مستغفرین سے بخشش کی دعا مانگنے والے مراد ہیں یا نمازی یا جو صبح کی نماز میں حاضر ہوتے ہیں۔

سحر کے وقت کی تعیین:

سعید جریری رحمہ اللہ نے کہا: داود علیہ السلام نے جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ رات کا کون سا وقت افضل ہے؟ کہا: میں نہیں جانتا، اتنی بات ہے کہ سحر کے وقت عرش جنبش کرتا ہے، جس وقت سے رات پیٹھ پھیرتی ہے، اس وقت سے طلوعِ فجر تک سحر کا وقت ہوتا ہے۔[3] امام راغب رحمہ اللہ نے کہا کہ سحر وہ وقت ہے کہ رات کی سیاہی دن کے اُجالے سے ملتی ہے۔[4] وہ وقت دعا کی قبولیت کا ہوتا ہے، اکثر لوگ اس وقت غفلت اور لذتِ خواب میں رہتے ہیں، اس لیے خاص طور پر سحر کا ذکر فرمایا۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ؕ ﴿۱۸﴾ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾

اللہ نے گواہی دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں فرشتوں اور اہلِ علم نے بھی (گواہی دی ہے)، دراں حالیکہ وہ انصاف کے ساتھ قائم ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ انتہائی غالب،

---

[1] تفسير الطبري (٦/ ٢٦٦) [2] شعب الإيمان (٣/ ١٧٣) تفسير ابن كثير (١/ ٤٦١)
[3] المصنف ابن أبي شيبة (٧/ ٦٨) [4] مفردات القرآن (١/ ٦٦٢)

خوب حکمت والا ہے ⑱ بے شک اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ اور اہلِ کتاب نے (صحیح) علم آجانے کے بعد صرف اس لیے اختلاف کیا کہ وہ باہم ضد اور حسد رکھتے تھے اور جو کوئی اللہ کی آیات کا انکار کرتا ہے تو بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے ⑲ (اے نبی!) پھر اگر وہ آپ سے جھگڑا کریں تو کہہ دیجیے: میں نے اپنا سر اللہ کے آگے جھکا دیا ہے اور میرا اتباع کرنے والوں نے بھی، اور ان اہلِ کتاب اور اَن پڑھ لوگوں سے پوچھیں: کیا تم اسلام لاتے ہو؟ پھر اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر منہ موڑیں تو آپ کے ذمے صرف پیغام پہنچانا ہے، اور اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھ رہا ہے ⑳

توحید کی گواہی:

عرب لوگوں کو اَن پڑھ کہتے تھے، ان کے پاس پہلے پیغمبروں کا علم نہیں تھا۔ اللہ پاک نے اس آیتِ شریفہ میں گواہی دی، اس کی گواہی کافی، وافی اور شافی ہے۔ وہ سب گواہوں میں سب سے زیادہ سچا اور سب سے زیادہ انصاف کرنے والا ہے۔ اس بات کی گواہی دی ہے کہ وہی اکیلا تمام مخلوق کا الٰہ ہے، سب کے سب اس کے بندے اور پیدا کیے ہوئے ہیں، سب اسی کے محتاج ہیں، وہ غنی ہے، کسی کی پروا نہیں رکھتا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴾ [النساء: ١٦٦] ”لیکن اللہ نے آپ پر جو نازل کیا ہے، وہ اس کی بابت گواہی دیتا ہے کہ اس نے اپنے علم کے ساتھ نازل کیا ہے۔ اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور اللہ بطور گواہ کافی ہے۔“ پھر اپنی گواہی کے ساتھ فرشتوں اور علما کی گواہی کو ملا لیا۔ یہ اس مقام پر اہلِ علم کے لیے ایک بڑی خصوصیت ہے۔

سیدنا زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ سے سنا، آپ ﷺ عرفہ میں تھے کہ آیت زیرِ تفسیر کو پڑھ کر فرمایا: « وَأَنَا عَلٰى ذٰلِكَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ يَا رَبِّ »[1] ”اے میرے رب! میں بھی اس بات کا شاہد ہوں۔“ (رواه أحمد) ابن ابی حاتم میں یہ الفاظ ہیں: « وَأَنَا أَشْهَدُ أَيْ رَبِّ! »[2] ”اور میں بھی گواہی دیتا ہوں، اے میرے رب!“ اعمش رحمہ اللہ نے ایک رات تہجد میں یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ﴾ پھر کہا: میں گواہی دیتا ہوں، جس بات کی اللہ تعالیٰ نے گواہی دی، میں اس گواہی کو اللہ کے پاس ودیعت رکھتا ہوں، یہ گواہی اللہ کے پاس

---

① مسند أحمد (١/ ١٦٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رواه أحمد والطبراني وفي أسانيدهما مجاهيل“ (مجمع الزوائد: ٧/ ٤٦)

② تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦١٦) یہ امام طبرانی رحمہ اللہ والی سند ہے اور اسی پر امام ہیثمی رحمہ اللہ نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس میں مجاہیل ہیں۔

میری امانت ہے۔ تین بار ایسے ہی کہا، پھر سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا کہ اس گواہی والے کو قیامت کے دن لایا جائے گا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرے بندے نے مجھ سے عہد کیا تھا، میں عہد کو پورا کرنے کا زیادہ حق دار ہوں، اس کو جنت میں لے جاؤ۔[1] میں بھی اس جگہ پر اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، دین ہی اسلام ہے۔ اے اللہ! میں نے اس گواہی کو تیرے پاس امانت رکھا ہے تو مجھ کو بھی بخش دینا۔ اللھم آمین.

اللہ کے ہاں مقبول دین صرف اسلام ہے:

اس آیت سے یہ بھی نکلا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام کے سوا کوئی دین مقبول نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اسلام اتباعِ رسل کو کہتے ہیں۔ جس پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے جس وقت میں بھیجا تھا، پھر ان کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ختم کیا، سب راستوں کو بند کر کے صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا راستہ مقرر رکھا، لہٰذا جو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اللہ تعالیٰ کے پاس شریعتِ اسلام کے علاوہ کوئی اور دین لے کر آئے گا، وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [آل عمران: ٨٥] ”اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔“[2]

اس جگہ دینِ مقبول کو اسی اسلام میں منحصر فرمایا ہے کہ جن کو پہلے کتاب مل چکی، ان کا اختلاف قیامِ حجت کے بعد تھا، وہ حجت یہی رسولوں کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل کرنا تھا۔ آپس کے بغض و حسد سے بعض نے بعض پر بغاوت کی، سب اقوال و افعال میں مخالفت برتی، اگرچہ وہ حق تھے۔ پھر یہ کہا کہ جو اللہ کی کتاب کے مخالف ہیں، اللہ جلد ان کا حساب لے گا اور ان کو ان کی تکذیب کی سزا دے گا۔ پھر یہ فرمایا کہ جو کوئی تجھ سے توحید کے بارے میں حجت کرے تو تو کہہ دے کہ میں تو موحد ہوں اور جو میری بات کا تابع ہے، وہ بھی موحد ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۚ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ﴾ [يوسف: ١٠٨] ”(اے نبی!) کہہ دیجیے: یہی میری راہ ہے، میں (تمھیں) اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں اور وہ لوگ جنھوں نے میری اتباع کی، بصیرت پر ہیں۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عمومی ہے:

پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا کہ تم سب لوگوں کو اپنے طریقے اور دین کی طرف بلاؤ، اگر وہ آجائیں تو بہتر، ورنہ جو کام تمھارا تھا، وہ تم کر چکے، ہدایت دینا اور گمراہ کرنا اللہ کی مشیت اور حکمتِ بالغہ پر موقوف ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ کس کو ہدایت دینی چاہیے اور کس کو گمراہی میں رکھنا چاہیے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ اس قسم کی آیات میں

[1] المعجم الكبير (١٠/ ١٩٩) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”وفيه عمر بن المختار وهو ضعيف“ (مجمع الزوائد: ٧/ ٤٦)

[2] تفسير ابن كثير (١/ ٤٦٢)

رسول اللہ ﷺ کی تمام مخلوق کی طرف بعثتِ عمومی کی صریح دلیل ہے۔ چناں چہ یہ عموم کتاب وسنت سے بہ خوبی ثابت ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ قُلۡ يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنِّي رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيۡكُمۡ جَمِيعًا ﴾ [الأعراف: ۱۵۸] ''کہہ دیجیے: اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ تَبَارَكَ ٱلَّذِي نَزَّلَ ٱلۡفُرۡقَانَ عَلَىٰ عَبۡدِهِۦ لِيَكُونَ لِلۡعَٰلَمِينَ نَذِيرًا ﴾ [الفرقان: ۱] ''وہ ذات بڑی ہی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر فرقان (قرآن) نازل کیا، تاکہ وہ جہان والوں کے لیے ڈرانے والا بنے۔''[1]

صحیحین وغیرہما میں متعدد واقعات سے تواتر کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تمام دنیا کے بادشاہوں کو وہ عربی تھے یا عجمی، اُمّی تھے یا کتابی، خطوط لکھے اسلام کی دعوت دی اور اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کیا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر کسی یہودی یا نصرانی نے میری دعوت کو سنا، لیکن وہ مجھ پر ایمان نہ لایا اور مرگیا تو وہ دوزخیوں میں ہوگا۔[2] (رواہ مسلم و عبدالرزاق) دوسری حدیث میں اس طرح مروی ہے کہ میں احمر و اسود (سرخ و سیاہ رنگ کے لوگوں) کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔ پہلے نبی خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا، میں سب لوگوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔[3]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی کا لڑکا نبی اکرم ﷺ کے وضو کا پانی رکھتا تھا، وہ بیمار ہوا تو نبی کریم ﷺ نے اس کی عیادت کی اور اس کے سرہانے بیٹھ کر فرمایا: اے فلاں! ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ'' کہہ، اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا، باپ خاموش رہا، پھر آپ ﷺ نے یہی فرمایا: اس نے پھر باپ کی طرف دیکھا، باپ نے کہا: جو ابو القاسم کہتے ہیں، مان لے۔ اس نے کہا: ''أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ'' آپ ﷺ نے وہاں سے اُٹھ کر فرمایا: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَخْرَجَهُ بِيْ مِنَ النَّارِ»[4] (رواه أحمد والبخاري) ''اللہ کا شکر ہے، جس نے اس کو میرے ذریعے آگ سے نکال دیا۔'' اس کے علاوہ اور بہت سی آیات و احادیث ہیں۔

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ شَهِدَ ٱللَّهُ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے اپنی توحید کو بیان کیا۔ کسی اعرابی نے پوچھا تھا کہ صانع (اللہ) کے وجود پر کیا دلیل ہے؟ کہا: بَعْرہ (اونٹ کی مینگنی) دلیل ہے، بَعیر (اونٹ) پر، قدموں کے نشان کسی چلنے والے پر دلیل ہیں، یہ انسانی جسم اور اس کی لطیف بناوٹ اور یہ زمین اور اس کی کثافت، کیا اس بات کی دلیل نہیں کہ کوئی ان کو بنانے والا اور خبر گیری کرنے والا ہے؟ قرآن شریف میں توحید کے بے شمار دلائل ہیں، یہ سب اس بات کی دلیل ہیں کہ اصولِ دین کا علم رکھنے والے کو فضیلت اور شرف حاصل ہے۔[5]

[1] تفسير ابن كثير (۱/ ٤٦٣) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۵۳)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۲۸) صحيح مسلم، رقم الحديث (۵۲۱) مسند أحمد (۳/ ۳۰٤)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۲۹۰) مسند أحمد (۳/ ۱۷۵) [5] فتح البيان (۲/ ۲۰۳)

اولو العلم کی تفسیر:

اہلِ علم کا اس بات میں اختلاف ہے کہ اس جگہ اولو العلم سے کون لوگ مراد ہیں۔ کسی نے کہا: انبیا علیہم السلام ہیں۔ کسی نے کہا: مہاجرین اور انصار ہیں۔ ابن کیسان رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ کسی نے کہا: مومنینِ اہلِ کتاب ہیں۔ مقاتل رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ کسی نے کہا: سارے اہلِ ایمان ہیں۔ یہ مقولہ امام سدی و کلبی رحمہما اللہ کا ہے۔[1] یہی حق ہے، کیوں کہ تخصیص کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

اس آیتِ شریفہ میں علما کی بڑی فضیلت اور مقام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور ملائکہ کے نام کے ساتھ ان کا ذکر کیا۔ اس جگہ علما سے مراد علمائے کتاب و سنت ہیں، کیوں کہ توحید کی حقیقت انھی کے پاس ہے۔ ایسے علم کا کیا اعتبار، جس میں قرآن و حدیث کا دخل نہیں۔ ”لا إله إلا الله“ کو دوبارہ تاکید کے لیے ذکر کیا گیا ہے۔ اس تقریر کا فائدہ یہ ہے کہ سب لوگ معلوم کر لیں کہ یہ کلمہ اعظم و اشرف کلام ہے، گویا بندوں کو اشارہ کیا ہے کہ تم اس کلمے کو کثرت سے کہا کرو، جو کوئی اس کے کہنے میں مشغول رہتا ہے، وہ گویا افضل عبادت میں مشغول ہے۔ پھر اسلام کو پسندیدہ دین ٹھہرایا، کیوں کہ یہ توحید پر مبنی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ [المائدة: ٣] ”اور میں نے پسند کر لیا تمھارے لیے اسلام کو بطورِ دین کے۔“

دین، ایمان اور اسلام کا مفہوم:

دین ہر اس چیز کا نام ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے مخلوق سے اپنی بندگی چاہی ہے اور اس پر قائم رہنے کا حکم دیا ہے۔ لفظِ اسلام کے معنی ہیں: سِلم میں داخل ہونا۔ سِلم کہتے ہیں: اطاعت میں پکا ہونا۔ جمہور رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ اس جگہ اسلام سے مراد ایمان ہے، اگرچہ اصل میں دونوں الگ ہیں، جس طرح حدیثِ جبرائیل علیہ السلام میں اسلام اور ایمان کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے۔ یہ حدیث صحیحین میں ہے،[2] مگر کبھی ایمان کو اسلام اور اسلام کو ایمان بھی بول لیتے ہیں۔ یہ محاورہ قرآن و حدیث دونوں میں آیا ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اسلام ”لا إله إلا الله“ کی گواہی دینا ہے اور اس بات کا اقرار کرتا ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں، یہ وہی دین ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے پسند اور جائز رکھا اور رسولوں کو دے کر بھیجا اور اپنے دوستوں کو بتایا، اس دین کے سوا کوئی دین مقبول نہیں۔[3]

یہودیوں کا اختلاف محض ضد کی بنا پر تھا:

امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے جو بھی رسول بھیجا، اس کو یہی اسلام دے کر بھیجا۔[4] پھر اس آیت میں

---

(1) تفسير القرطبي (٤/ ٤١) (2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٩٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩)

(3) تفسير الطبري (٦/ ٢٧٥) (4) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦١٨)

خبر دی کہ یہود و نصاریٰ کا اختلاف محض ضد کی بنا پر تھا، وہ جانتے تھے کہ اسلام میں داخل ہونا واجب ہے، کیوں کہ یہ بات ان کی کتابوں میں موجود تھی۔ اس سلسلے میں زیادہ تر بنی اسرائیل کی برائی کی گئی ہے، کیوں کہ کتاب آ جانے کے بعد اختلاف کرنا سخت بدتر ہوتا ہے۔ وہ اختلاف یہ تھا کہ کسی نے کہا کہ محمد ﷺ نبی نہیں ہیں۔ کسی نے کہا: دینِ اسلام حق نہیں ہے۔ کسی نے کہا: نبی کریم ﷺ کی نبوت صرف عرب کے لیے مخصوص تھی۔ کسی نے کہا: توحید حق نہیں ہے، تثلیث حق ہے، جیسے نصاریٰ کہتے ہیں۔ کسی نے کہا: عزیر علیہ السلام اللہ کے فرزندِ سعادت مند تھے۔ کسی نے کہا: عیسیٰ علیہ السلام نبی نہیں ہیں۔ کسی نے کہا: آپس کا اختلاف مراد ہے۔ یہودیوں نے کہا: نصاریٰ کچھ چیز نہیں ہیں۔ نصاریٰ نے کہا: یہود کچھ چیز نہیں ہیں۔ ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ کام دنیا طلبی کے لیے کیا تھا، تاکہ مسلک و سلطنت قائم رہے، پھر بعض نے بعض کو قتل کیا، حالاں کہ اس سے پہلے وہ علما تھے۔[1]

اختلاف تباہی کا راستہ ہے:

پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر ظالم اور جابر لوگوں کو مسلط کر دیا۔[2] یہی اب اس اُمتِ اسلام کا حال ہوگیا ہے کہ قرآن پاک کے آجانے اور سنتِ خاتم الانبیاء ﷺ کے مدون ہو جانے کے بعد مختلف ہوگئے ہیں۔ بہتر گمراہ فرقوں کو تو جانے دو، اہلِ سنت کہلانے والوں نے بھی چار الگ الگ مذہب ٹھہرا لیے ہیں۔ ہر مذہب والا دوسرے مذہب کو بے حقیقت سمجھتا ہے۔ اپنے مذہب کو حق اور دوسرے کے مذہب کو باطل جانتا ہے۔ پھر اس مذہبی تعصب کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ایک دوسرے کا قتل کرنا چاہتا ہے۔ ان اہلِ مذاہب کو سب سے زیادہ دشمنی اہلِ سنت (اہلِ حدیث) سے ہے۔ علم آنے کے بعد اس اختلاف اور ضد کا انجام یہ ہوا کہ کافر اور فاجر لوگ اہلِ اسلام پر غالب آگئے، اسلام غریب ہوگیا، دین پر قائم رہنا ایسا مشکل ہوگیا، جیسے ہتھیلی پر آگ کی چنگاری رکھنا۔ حدیث میں مروی ہے کہ جب اُمت میں اختلافِ کثیر دیکھو تو تم میری سنت پر چلو۔ نئی نئی چیزوں اور بدعات سے بچو۔[3] جس کو اپنا دین و ایمان عزیز ہو، اس پر واجب ہے کہ اس آخر زمانے میں جو قیامت کے قریب کا زمانہ ہے، سارے اختلاف سے بچ کر قرآن و حدیث کو دانتوں سے پکڑے، کسی سے کچھ کام نہ رکھے۔

دلآرامی کہ داری دل درو بند   وگر چشم از ہر عالم فروبند

”تو دل میں سوز پیدا کرنے والا محبوب حقیقی رکھتا ہے ماسویٰ اللہ کے اپنی امیدیں منقطع کر لے۔“

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦١٨) [2] فتح البيان (٢/ ٢٠٣۔ ٢٠٦)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٧٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٧٣٥)

بحث کرنے والوں کو جواب:

پھر یہ فرمایا کہ اگر یہود ونصاریٰ شبہۂ باطلہ اور تحریف کیے ہوئے اقوال پیش کر کے تجھ سے بحث کرنا چاہیں تو تُو ان سے صاف صاف کہہ دے کہ میں اپنے دل، زبان اور سارے اعضا سے صرف اللہ کی ذات کی عبادت کرتا ہوں۔ اسی طرح میرے پیروکار موحد خالص ہیں۔ پھر فرمایا کہ تو اہلِ کتاب ومشرکین سے جو اَن پڑھ ہیں، یہ بات کہہ کہ تم سب مسلمان ہو جاؤ۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے یوں ہی کہا ہے۔[1] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ صیغۂ امر ڈرانے کے لیے ہے۔[2] یعنی تمھارے پاس اسلام کے وجوب کی دلیلیں آچکی ہیں، سوتم نے ان دلیلوں پر عمل کیا یا نہیں، اس میں ان کی شان کو قلتِ انصاف کی وجہ سے گھٹایا ہے، کیوں کہ منصف آدمی پر جب دلیل واضح ہو جاتی ہے تو پھر اس کو حق قبول کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔

نبی کا کام صرف تبلیغ کرنا ہے:

پھر یہ فرمایا کہ اگر وہ مسلمان ہو جائیں گے تو سمجھو کہ راہ پر آگئے، دُنیا اور آخرت کی بہتری پالی، وگرنہ تمھارا کیا نقصان، تم پر تو صرف اللہ کا حکم پہنچا دینا تھا، جو تم نے پہنچا دیا، اب چاہے وہ مانیں یا نہ مانیں۔ ﴿ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ﴾ [الغاشية: ٢٢] ”آپ ان پر کوئی فوج دار نہیں۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ﴾ [الفاطر: ٨] ”لہٰذا آپ کی جان ان پر افسوس کرتے ہوئے نہ جاتی رہے۔“ یہ آیت محکم ہے، اس سے مراد نبی اکرم ﷺ کو تسلی دینا ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ آیت سیف سے منسوخ ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝٢١ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝٢٢

بے شک جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں، نبیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ان لوگوں کو بھی قتل کرتے ہیں جو انصاف کا حکم دیتے ہیں، تو آپ انھیں دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیجیے! (21) یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں برباد ہوگئے اور ان کا کوئی مددگار نہیں (22)

یہودیوں کے کفر اور انبیا وصالحین کو قتل کرنے کی مذمت:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کی ان گناہ کے کاموں اور حرام کردہ کاموں کو کرنے پر مذمت کی ہے،

---

(1) تفسير الطبري (٦/ ٢٨١) (2) معاني القرآن للزجاج (١/ ٣٩٠)

جس کے وہ مرتکب ہوتے تھے۔ انھوں نے تکبر اور عداوت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھٹلایا، پہلے بھی اور بعد میں بھی اتباعِ حق سے شرم محسوس کی۔ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوئے یہ کام کیا کہ جب انبیا نے ان کو دینِ حق پہنچایا تو ان کو بلا وجہ قتل کر دیا، ان کا قصور یہی تھا کہ انھوں نے حق کی دعوت دی تھی، اسی طرح جو لوگ انصاف کا حکم دیتے تھے، ان کو بھی مار دیا۔ یہ حد درجہ کا تکبر اور غرور تھا۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ تکبر یہ ہے کہ حق کو رد کرے اور لوگوں کو حقیر سمجھے۔[1] سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب کس شخص کو ہوگا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس شخص کو جس نے کسی نبی کو قتل کیا ہے یا ایسے شخص کو قتل کیا جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا تھا، پھر آیت زیرِ تفسیر پڑھی۔ پھر فرمایا: اے ابوعبیدہ! بنی اسرائیل نے دن کے پہلے حصے میں ایک گھڑی میں تنتالیس نبی قتل کیے۔ اس پر ایک سو ستر آدمیوں نے ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا، انھوں نے دن کے آخری حصے میں ان سب کو بھی مار ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں انہی کا ذکر فرمایا ہے۔[2] (رواه ابن أبي حاتم و ابن جرير)

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: بنی اسرائیل نے دن کے پہلے حصے میں تین سو پیغمبروں کو قتل کیا اور آخری حصے میں سبزی فروشی کا بازار گرم کیا۔[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: جب انھوں نے حق سے یہ تکبر (انکار) کیا اور مخلوق پر غرور کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس وجہ سے ان پر دنیا میں ذلت و خواری اور آخرت میں ذلت والا عذاب مقرر کیا۔ اس عذاب کی ان کو بشارت سنائی اور ان کے اعمال ضائع کیے، ان کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔[4]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح سند سے مروی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے یحییٰ علیہ السلام کو حواریین میں سے بارہ آدمی ساتھ دے کر بھیجا کہ تم ان لوگوں کو تعلیم دو۔ وہ ان کو بھائی کی بیٹی سے نکاح کرنے سے منع کرتے تھے۔ ایک بادشاہ اپنی بھتیجی کو چاہتا تھا۔ ہر دن اس کا کوئی کام کرتا، تاکہ وہ ملے۔ اس عورت کی ماں نے کہا: اب اگر وہ تجھ سے کسی کام کا پوچھے تو تُو یہ کہنا کہ میری حاجت یہ ہے کہ تم یحییٰ بن زکریا کو مار ڈالو، یعنی تب میں تم سے ملوں گی۔ بادشاہ نے کہا: اس کے سوا کوئی اور حاجت بتاؤ؟ اس نے کہا: میری تو حاجت یہی ہے۔ جب دیکھا کہ وہ کسی طرح نہیں مانتی تو یحییٰ علیہ السلام کو ایک طشت میں ذبح کیا، ان کے خون کا ایک قطرہ زمین پر گرا، وہ ہمیشہ جوش مارتا تھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے بخت نصر کو بھیجا، ایک بڑھیا نے اس کو وہ جگہ بتائی۔ اس نے اپنے جی میں کہا کہ جب تک وہ خون ساکن نہ ہو، تب تک میں قتل کرتا رہوں گا، پھر ایک دن میں ایک عمر کے ستر ہزار آدمی اسی قطرے پر مار ڈالے، تب وہ خون تھما۔[5]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩١)

[2] تفسير الطبري (٦/ ٢٨٥، ٢٨٦) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٢٠، ٦٢١) اس روایت کی سند پر علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ کا مفصل کلام دیکھیں: تفسير الطبري (٦/ ٢٨٦) [3] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٧٣٦) اس کی سند صحیح ہے۔ [4] تفسير ابن كثير (١/ ٤٦٤)

[5] تفسير الطبري (١٧/ ٣٨٧۔ ٣٨٨) مستدرك الحاكم (٢/ ٦٤٧) امام حاکم اور ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

راست بازوں کو اذیت پہنچانے والوں کی سزا:

اللہ پاک نے اس آیت میں انبیا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والوں کے قاتل کی ایک ہی سزا فرمائی ہے، لہٰذا جس طرح یحییٰ علیہ السلام کے خون کا بدلہ لیا کہ ستر ہزار لوگ مارے، اسی طرح حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا بدلہ لیا۔ وللہ الحمد۔ ان لوگوں کا بھی یہی حکم ہے، جو اہلِ حدیث وقرآن کے دشمن ہیں، جو کوئی ان کو ذلیل وخوار کرتا ہے، مارتا ہے، وہ اگر دنیا میں بچ گیا تو آخرت میں تو بلاشبہہ اس کے لیے اس آیتِ شریفہ کی رو سے دردناک عذاب مقرر ہے، کیوں کہ لفظ کی عمومیت کا بہ نسبت سبب کی خصوصیت کے اعتبار ہوتا ہے۔ اس دین کے سلف ائمۂ دین کو مبتدعین کے ہاتھوں کیا کیا تکلیفیں نہیں پہنچیں، مگر انھوں نے صبر سے کام لیا۔ وہ انجام میں اچھے رہے اور ان کو ایذا دینے والے برباد ہوگئے۔ ﴿ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ [هود: ٤٩] ''اس لیے آپ صبر کریں، بے شک (بہترین) انجام متقین ہی کے لیے ہے۔'' امام احمد، شیخ الاسلام ابن تیمیہ، حافظ ابن القیم اور امام شوکانی رحمہم اللہ وغیرہم کے قصے تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿٢٣﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۠ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٢٤﴾ فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿٢٥﴾

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ ملا، انھیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے، تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، پھر ان میں سے ایک گروہ منہ موڑ لیتا ہے اور وہ حق سے پھرنے والے ہیں ﴿23﴾ یہ اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے کہا: ہمیں آگ چند دنوں کے سوا ہرگز نہیں چھوئے گی۔ اور ان کو ان کے دین کی بابت ان باتوں نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے جو وہ خود گھڑتے ہیں ﴿24﴾ پھر کیا حال ہوگا جب ہم انھیں اس دن جمع کریں گے، جس میں کوئی شک نہیں اور (اس روز) ہر شخص کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿25﴾

کتاب اللہ کو فیصل نہ بنانے پر اہلِ کتاب کی مذمت:

یہ یہودیوں کا تذکرہ ہے کہ مسئلے میں اپنی کتاب پر بھی عمل نہیں کرتے ہیں، اس دھوکے کی بنا پر کہ ان کے پہلے بزرگ جھوٹ بنا کر کہہ گئے ہیں کہ ہم میں اگر کوئی بہت گناہ گار ہوگا تو سات دن سے زیادہ عذاب نہیں پائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں اور عیسائیوں کے اس دعوے کا انکار کیا، فرمایا: تورات و انجیل، جو ان کے پاس موجود ہے، نہ اپنے فیصلوں کے لیے ان سے رجوع کرتے ہیں اور نہ نبی کریم ﷺ ہی کا اتباع کرتے ہیں، جس کا حکم ان کی کتابوں میں موجود ہے، دُم دبا کر بھاگ جاتے ہیں۔ اس میں ان کی بہت مذمت فرمائی، ان کی مخالفت اور دشمنی کا ذکر کیا، وہ اس دھوکے میں پڑے ہیں کہ دنیا سات ہزار برس ہے اور ہم ہر ہزار کے بدلے ایک دن آگ میں رہیں گے۔

یہ بات خود انھی کی بنائی اور گھڑی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ اسی لیے اس کے بعد یہ فرمایا کہ اس دن ان کا کیا حال ہوگا، وہ بڑے مفتری (جھوٹ گھڑنے والے) ہیں، انبیا و علما کو قتل کیا، اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھا، اللہ تعالیٰ ان سے یہ سب حال پوچھے گا، ان کے ہر قول و فعل کی سزا اور جزا دے گا، اس وقت ان کا اپنا جھوٹ اور سچ کھل جائے گا۔

اُمت کے جاہلوں کو اہلِ کتاب سے مماثلت:

فتح البیان میں مذکور ہے کہ ان کا یہ مقولہ تھا کہ ہمارے باپ دادا پیغمبر تھے، وہ ہم کو بخشوالیں گے، سفارش اور شفاعت کر کے مواخذے سے بچالیں گے، جس طرح آج کل اس امت کے جاہل مرید بھی یہی اعتقاد اپنے پیر و مرشد کے حق میں رکھتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام سے وعدہ کر لیا ہے کہ میں تیری اولاد کو صرف قسم پوری کرنے کے لیے عذاب دوں گا۔ امام ابو قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: وہ کہتے تھے: ﴿ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبّٰٓؤُهٗ ﴾ [المائدۃ: ۱۸] ''ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔''[1] ان کا ایک یہ بھی قول تھا کہ ہم حق پر ہیں، تم باطل پر ہو۔[2] یعنی جس طرح آج کل مقلدین متبعین سے کہتے ہیں کہ ہمارا مذہب حق ہے، تمھارا طریقہ باطل ہے۔ غرض کہ نبی کریم ﷺ کا وہ ارشاد سچ ثابت ہوا کہ جو کام اہلِ کتاب نے کیا تھا، بعینہٖ وہی کام اس اُمت کے لوگ بھی کریں گے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فی الحال ایسا ہی ہو رہا ہے۔ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا.

---

[1] الدر المنثور (۲/ ۱۷۱)

[2] فتح البیان (۲/ ۲۱۰)

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۫ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۫ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

آپ کہہ دیجیے: اے اللہ! اے بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے بادشاہی دیتا ہے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لیتا ہے اور تو ہی جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلت دیتا ہے۔ سب بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے، بے شک تو ہر چیز پر خوب قادر ہے (26) تو رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تو مُردے سے زندے کو اور زندے سے مردے کو نکالتا ہے اور جسے تو چاہے بے حساب رزق دیتا ہے (27)

شکر کی تلقین:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کی ہے اور ارشاد فرمایا ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر اور آپ ﷺ کی اُمت پر اللہ تعالیٰ نے جو نعمت کی ہے، اس پر شکر بجا لاؤ۔ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے خاندانِ بنی اسرائیل سے نبوت کو نکال کر ایک عربی، قرشی اُمی اور مکی کو خاتم الانبیاء بنا کر جن و انس کی طرف مبعوث فرمایا، جتنی خوبیاں پہلے انبیا میں تھیں، وہ سب ان کو عطا فرمائیں اور مزید ان کو ایسی خصوصیتیں دیں، جو کسی نبی اور رسول کو نہیں دیں، جیسے اللہ کے بارے میں علم، ماضی اور مستقبل کے بعض غیبی امور کا انکشاف، آخرت کے حقائق کا علم، اُمتِ اسلام کا پوری زمین کے مشرق و مغرب پر پھیل جانا۔ دینِ اسلام کا سارے دینوں اور شریعتوں پر غلبہ اور بالادستی اور اس جیسے کئی انعامات کیے، جن کا شمار اس جگہ مشکل ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے اس بارے میں دو کتابیں لکھی ہیں۔ ایک ''الخصائص الکبریٰ'' اور دوسری ''أنموذج اللبیب''، وللہ الحمد.

متصرف کامل صرف اللہ ہے:

آیتِ شریفہ کا مطلب یہ ہے کہ عطا کرنے والا اور روکنے والا، عزت اور ذلت دینے والا، خلق میں ہر قسم کا تصرف رکھنے والا جو چاہے، وہ کر گزرنے والا اللہ ہی ہے، کوئی اور نہیں، چناں چہ بطورِ رد فرمایا: ﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ﴿۳۱﴾ ﴾ [الزخرف: ۳۱] ''اور انھوں نے کہا: یہ قرآن ان دونوں شہروں

میں سے کسی بڑے آدمی پر نازل کیوں نہیں کیا گیا؟'' دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ﴾ [الزخرف: ٣٢] ''کیا وہ آپ کے رب کی رحمت تقسیم کرتے ہیں؟'' یعنی خلق میں متصرف ہم ہی ہیں، جیسا ہم چاہتے ہیں، ویسا کرتے ہیں۔ نہ کوئی منع کرنے والا ہے اور نہ مدافعت کرنے والا۔ ہر قسم کی حکمت اور ہر طرح کی حجت ہمارے ہی لیے ہے، اسی طرح جس کو ہم چاہیں نبوت دیں، کسی کا اس میں کیا اختیار ہے؟ ﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ﴾ [الأنعام: ١٢٤] ''اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا کام کس کو سونپے۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ [الإسراء: ٢١] ''دیکھیے! کس طرح ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی؟''

دن رات کا تداخل اور مردہ کو زندہ، زندہ کو مردہ سے نکالنے کا مفہوم:

رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرنے کا یہ مطلب ہے کہ ایک کی لمبائی لے کر دوسرے کی کمی کو بڑھا دیا یا دونوں برابر ہوگئے، اسی طرح ایک کی کمی لے کر دوسرے کی لمبائی میں لگا دی، دونوں معتدل ہوگئے۔ یہی حال ہر سال کے موسموں کا ہے، یعنی بہار، خزاں، گرمی اور سردی۔ پھر کھیتی کو دانے سے، دانے کو کھیتی سے، درخت کو گٹھلی سے اور گٹھلی کو درخت سے، مومن کو کافر سے، کافر کو مومن سے، مرغ کو انڈے سے، انڈے کو مرغ سے نکالا۔ اسی طرح ساری چیزیں جو اس طرح کی ہیں، پھر جس کو چاہا بغیر گنتی مال دے دیا، جس پر چاہا مال کی تنگی کر دی، وہ جانے اور اس کی حکمت و ارادہ اور مشیت جانے۔

اللہ کا اسمِ اعظم:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اسمِ اعظم کہ جب اس نام کو لے کر دعا کرو، قبول ہو، آلِ عمران کی اس آیت میں ہے: ﴿ قُلِ اللّٰهُمَّ ﴾ سے لے کر ﴿ قَدِيْرٌ ﴾ تک۔[1] (رواه الطبراني) نضر بن شمیل نے کہا: جس نے ''اَللّٰهُمَّ'' کہا، اس نے اللہ کو سارے ناموں سے پکارا۔[2] سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی قرض داری کا شکوہ کیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس آیت کو پڑھا کرو۔[3] (رواه الطبراني و ابن أبي الدنيا) سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت یہ ہے کہ اگر تجھ پر اُحد کے برابر بھی قرض ہوگا تو اللہ تجھ سے ادا کرا دے گا۔[4] (رواه الطبراني) اس کی سند جید ہے۔ خیر کی تخصیص اس لیے ہے کہ یہ مقام، مقامِ دعا ہے۔ جب رات چھوٹی ہوتی ہے تو وہ کمی اس طرح دور کر دی جاتی ہے کہ دن پندرہ گھنٹے کا ہو جاتا ہے، یہ دن کی لمبائی کی انتہا ہوئی۔ رات نو گھنٹے کی رہ جاتی ہے، یہ رات کی کم سے کم ہیئت ہوئی۔

---

① المعجم الكبير (١٢/ ١٧١) السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٧٧٢) ② تفسير القرطبي (٤/ ٥٤)

③ المعجم الكبير (٢٠/ ١٥٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ سعید بن مسیب رحمہ اللہ کا سماع سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔

④ المعجم الصغير (١/ ٣٣٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رجاله ثقات'' (مجمع الزوائد: ١٠/ ٢٩٩)

اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ جس کو ایسے بڑے بڑے کاموں پر قدرت حاصل ہے، جس میں سب کی عقل حیران ہے، وہ کیا یہ نہیں کرسکتا کہ ملک اور سلطنت کو عجم کے ہاتھ سے نکال کر عرب کے حوالے کر دے۔ عجم ذلیل ہو جائیں اور عرب معزز ٹھہر جائیں، بلکہ یہ تو اس کے لیے سب سے زیادہ سہل اور آسان ہے۔ اسی طرح جب رات بڑھتی ہے تو پندرہ گھنٹے کی ہو جاتی ہے، یہ اس کی سب سے زیادہ لمبائی ہے۔ دن نو گھنٹے کا رہ جاتا ہے، یہ اس کی سب سے کم لمبائی ہے۔ کسی نے کہا: یہاں ولوج سے مراد ایک دوسرے کا تعاقب ہے کہ ایک کا جانا دوسرے کا آنا گویا ولوج ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: گرمی کو جاڑے سے اور جاڑے کو گرمی سے لیتا ہے،[1] حیوان کو نطفے سے نکالتا ہے اور نطفے کو حیوان سے پیدا کرتا ہے، مومن بندہ زندہ دل ہے، کافر بندہ مردہ دل ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ ﴾ [الأنعام: ١٢٢] ''کیا ایک ایسا شخص جو مردہ تھا، پھر ہم نے اسے زندہ کیا'' سیدنا عبیداللہ بن عبداللہ نے کہا کہ خالدہ دختر اسود بن عبد یغوث نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی۔ پوچھا: کون ہے؟ کہا: خالدہ! فرمایا: «سُبْحَانَ الَّذِيْ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ»[2] ''پاک ہے وہ ذات جس نے زندہ کو مردہ سے نکالا'' یہ عورت نیک بخت تھی اور اس کا باپ کافر تھا۔ (رواه عبدالرزاق و ابن سعد و ابن جرير و ابن أبي حاتم و ابن مردويه)

حساب کا معنی:

حساب کا لفظ قرآن شریف میں تین معنوں میں آیا ہے، ایک تعب (مشقت) جیسے: ﴿ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [آل عمران: ٢٧] ''اور جسے تو چاہے بے حساب رزق دیتا ہے۔'' دوسرا عدد جیسے: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [الزمر: ١٠] ''بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ان کا پورا پورا اجر بے حساب دیا جائے گا'' تیسرا مطالبہ، جیسے ﴿ فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [ص: ٣٩] ''لہٰذا (لوگوں پر) احسان کر یا روک رکھ، کوئی حساب نہیں ہوگا'' اس جگہ معنی اول وثانی دونوں بنتے ہیں۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿٢٨﴾

اہل ایمان، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو ہرگز دوست نہ بنائیں اور جو کوئی ایسا کرے گا تو اس کا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٢٥)

[2] تفسير الصنعاني (١/ ١١٧۔ ١١٨) الطبقات الكبرىٰ لابن سعد (٨/ ٢٤٧) تفسير الطبري (٦/ ٣٠٨) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٢٦) المعجم الكبير (٢٥/ ٩٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رواه الطبراني بإسنادين وإسناد الثاني حسن'' (مجمع الزوائد: ٩/ ٤٢٧)

اللہ سے کوئی تعلق نہیں، الا یہ کہ تم ان (کافروں کے شر) سے بچنا چاہو اور اللہ تمھیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور تمھیں اللہ کی طرف لوٹ کر جانا ہے ﴿28﴾

کافروں کی دوست داری سے ممانعت:

اس آیتِ شریفہ میں اللہ تعالیٰ مومن بندوں کو اس بات سے منع کرتا ہے کہ وہ کافروں کے دوست دار بنیں، ان کو اپنا دوست بنائیں اور اہلِ ایمان کو چھوڑ کر ان کے ساتھ چھپی دوستی رکھیں۔ پھر یہ وعید فرمائی کہ جو ایسا کام کرے گا، اللہ اس سے بَری ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَ عَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ قَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَ اِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَ اَنَا اَعْلَمُ بِمَاۤ اَخْفَيْتُمْ وَ مَاۤ اَعْلَنْتُمْ وَ مَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱﴾ ﴾ [الممتحنة: ١] ''اے ایمان والو! تم میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم ان کی طرف دوستی کا پیغام بھیجتے ہو، حالاں کہ وہ حق (سچے دین) کے منکر ہوئے ہیں جو تمھارے پاس آیا ہے، وہ رسول کو اور تمھیں بھی جلا وطن کرتے ہیں، اس لیے کہ تم اپنے رب اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اگر تم میرے راستے میں نکلے ہو، جہاد اور میری رضا ڈھونڈنے کے لیے (تو کفار کو دوست نہ بناؤ)، تم ان کو دوستی کا خفیہ پیغام بھیجتے ہو، اور میں خوب جانتا ہوں جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو، اور تم میں سے جو کوئی ایسا کرے گا، تو یقیناً وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ ﴾ [المائدة: ٥١] ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور تم میں سے جو کوئی ان سے دوستی رکھے گا تو بے شک وہ انھی میں سے ہوگا۔ یقیناً اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔'' نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِيْرٌ ﴿۷۳﴾ ﴾ [الأنفال: ٧٣] ''اور جن لوگوں نے کفر کیا، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ (اے مسلمانو!) اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد مچے گا۔''

ان آیتوں میں عموماً و خصوصاً غیر اسلامی لوگوں سے دوستی سے منع فرمایا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ وہ آپس میں ایک ہیں، تم ان کے دوست بن کر کیوں گمراہ اور فتنہ انگیز بنتے ہو۔ لیکن مدت سے اہلِ اسلام نے اس آیت پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے، گویا اسے منسوخ سمجھ لیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس ممانعت کے بعد یہ بات فرمائی ہے کہ اگر بعض شہروں یا اوقات میں ان کے شر اور فساد کا اندیشہ اور خوف ہو تو ظاہر میں ان سے بچے اور باطن اور نیت میں ان کا دوست دار اور خیر خواہ نہ ہو۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ہم بعض اقوام کے سامنے ان کے منہ پر بشاشت ظاہر کرتے تھے اور ہمارے دل ان پر لعنت کرتے تھے۔[1] امام ثوری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ تقیہ عمل سے نہیں ہوتا، تقیہ تو زبان کا ہے۔[2] اس روایت کو عوفی رحمہ اللہ نے بھی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ "إِنَّمَا التَقِيَّةُ بِاللِّسَانِ"[3] یہی ابو العالیہ، ابو الشعثاء، ضحاک، ربیع بن انس رحمہم اللہ کا قول ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: ان کے قول کی تائید میں یہ آیت ہے: ﴿ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ ﴾ [النحل: ١٠٦] "جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ سے کفر کرے، سوائے اس کے جس پر جبر کیا گیا اور اس کا دل ایمان پر مطمئن تھا۔"[4] امام بخاری رحمہ اللہ نے حسن رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے: "اَلتَّقِيَّةُ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ"[5] "تقیہ قیامت تک ہے۔"

کافروں سے دوستی کی حدود اور تقیہ کی صورتیں:

فتح البیان میں ہے کہ یہ آیت کافروں کی دوستی سے منع کرتی ہے، ان سے کسی طرح کی دوستی و معاشرتی تعلقات نہ رکھے، جیسے: قرابت یا جاہلیت کے زمانے کی محبت یا لڑائی میں ان سے مدد لینا یا باقی دینی امور میں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ ﴾ [آلِ عمران: ١١٨] "تم اپنے لوگوں کے سوا کسی کو دلی دوست نہ بناؤ۔" خواہ وہ دوستی مستقل طور پر ہو یا اشتراک کے طور پر کہ مسلمانوں سے بھی میل جول رہے اور کافروں سے بھی آشنائی۔ یہ بات ٹھیک نہیں ہے، کیوں کہ اللہ کی دوستی اور کفار کی دوستی ایک دوسرے کی ضد ہیں، یہ دونوں جمع نہیں ہوسکتیں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ کسی شر کے ڈر سے بچاؤ کی خاطر ہو، کیوں کہ اس حالت کو اللہ پاک نے مستثنیٰ فرمایا ہے۔ تُقَاةً "وقاية" سے مشتق ہے۔ تقویٰ اور تقیٰ ایک چیز ہے، تُقَاة اور تَقِية ایک بات ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حالتِ خوف میں زبانی دوستی جتانا جائز ہے، لیکن دل سے ان کا دوست نہ ہو، ورنہ پھر یہ بھی انہی میں ہو جائے گا۔ مگر سلف کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اسلام کے غلبے کے بعد اب تقیہ نہیں ہے۔ اگر کسی شخص سے کوئی معصیت کی بات کہلائیں اور وہ لوگوں کے خوف سے کہہ دے، مگر اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو تو یہ کہنا اس کو مضر نہیں۔ تقاۃ یہی ہے کہ زبان سے کہے، دل سے مطمئن بہ ایمان رہے، ہاتھ نہ بڑھائے کہ مارا جائے، نہ گناہ کرے کہ پھر کوئی عذر نہ ہو۔ امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا: تقیہ زبان سے ہے نہ کہ کام سے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا:

---

[1] صحيح البخاري (٥/ ٢٢٧٠)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٢٩) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا زمانہ نہیں پایا۔

[3] تفسير الطبري (٦/ ٣١٥۔ ٣١٦) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ [4] تفسير ابن كثير (١/ ٤٦٦)

[5] صحيح البخاري (٦/ ٢٥٤٧)

یعنی اگر تجھ سے اور اس سے رشتے داری ہے تو تُو صلہ رحمی کر۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو کفار کے ساتھ دوستی، یعنی ملاطفت (باہم لطف و کرم) سے منع کیا ہے اور اس بات سے منع کیا ہے کہ مومنوں کو چھوڑ کر کفار کے ساتھ چپکے چپکے دوستی کریں۔ ہاں اگر کافر مسلمانوں پر غالب آ جائیں تو ان سے اظہارِ لطف کریں، مگر دین میں ان کی مخالفت رہے۔[2] اس آیت کا یہی مطلب ہے۔

الغرض آیتِ شریفہ کے یہ معنی ہوئے کہ کافروں کے ساتھ میل جول، مداہنت اور چھپی دوستی ممنوع ہے۔ ہاں اگر وہ غالب ہوں یا کوئی مومن کفار کی قوم میں ہو اور زبان سے ان کے ساتھ مداہنت کرے، دل ایمان پر جما ہو تو اس کے لیے اپنی جان کا دفاع کرنا جائز ہے، مگر یہ نہ کرے کہ کسی خون یا مالِ حرام کو حلال سمجھ لے۔ یا کفار مسلمین کی عورتوں پر غالب آ جائیں کہ اس وقت ان سے بچاؤ کرنا منع نہیں ہے۔ تقیہ صرف اس صورت میں ہوتا ہے، جب قتل کا خوف ہو اور نیت درست ہو، یہ جائز ہے واجب نہیں۔ اگر صبر کیا اور مارا گیا تو اجرِ عظیم کا مستحق ٹھہرے گا۔ إن شاء اللہ تعالیٰ۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا کہ امن کی حالت میں تقیہ نہیں ہوتا۔ تقیہ جنگ میں ہوتا ہے اور اس لیے ہوتا ہے کہ آدمی اپنی جان کو نقصان سے بچائے، کیوں کہ نفس سے حتی الامکان نقصان دور کرنا واجب ہے۔[3] وہ تقیہ اور ہے جس کو شیعہ نے پسند کیا ہے، اس کو تقیہ کہنا، ان کی اصطلاح ہے، ورنہ ویسا تقیہ اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک نفاق یا کفر یا نافرمانی یا افتراق ہوتا ہے۔

اسی لیے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تم کو ڈراتا ہے کہ کہیں تم وہی کام نہ کر بیٹھو، جس سے تم کو منع کیا ہے۔ یا جس کا تمھیں حکم دیا گیا، اس کے خلاف کرو، یا کفار کے دوستدار بنو، یا اہلِ کتاب کے یار ہو جاؤ کہ ان سب صورتوں میں تم آگ کے عذاب کے مستحق ہو جاؤ گے۔ اس آیت میں لفظِ نفس اللہ پاک کے لیے آیا ہے، جس طرح اور جگہ فرمایا: ﴿ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ﴾ [المائدۃ: ۱۱۶] ''تو اسے بھی جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں اسے نہیں جانتا، جو کچھ تیرے نفس میں ہے۔'' پھر اس کے بعد جو یہ کہا کہ اللہ ہی تک پہنچنا ہے، اس میں بندوں کو سخت تنبیہ اور خوف دلایا گیا ہے کہ دیکھو! جس دوستی سے تم کو منع کیا ہے، کہیں تم اس میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔[4] اللہ تعالیٰ کا کہنا سچ ہوا ہے کہ اکثر نام کے مسلمان اس بلا میں گرفتار ہیں، کفار کے یارِ غار ہیں، مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: اے لوگو! میں اللہ کے رسول کا قاصد ہوں، سن رکھو! بازگشت اللہ ہی کی طرف ہے، خواہ جنت کی طرف ہو یا جہنم کی طرف۔[5]

---

[1] تفسیر الطبري (٦/ ٣١٥۔ ٣١٦) [2] تفسیر الطبري (٦/ ٣١٣) تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٦٢٨) اس کی سند حسن ہے۔
[3] تفسیر الخازن (١/ ٣٣٦) [4] فتح البیان (٢/ ٢١٤۔ ٢١٦)
[5] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٦٣٠) تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٦٧)

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَیَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۹﴾ یَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا ۖۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَهَا وَبَیْنَهٗۤ اَمَدًۢا بَعِیْدًا ؕ وَیُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾

آپ کہہ دیجیے: اگر تم وہ بات چھپاؤ جو تمھارے سینوں میں ہے یا اسے ظاہر کرو، اللہ اسے جانتا ہے اور وہ اسے بھی جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے (29) جس دن ہر شخص اپنے کیے ہوئے اچھے عمل کو اور اپنے کیے ہوئے بُرے عمل کو اپنے سامنے پائے گا، وہ خواہش کرے گا، کاش! اس کے اور اس کی برائی کے درمیان دور کا فاصلہ ہوتا اور اللہ تمھیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ اپنے بندوں سے بڑی شفقت کرتا ہے (30)

اللہ کے علم کی وسعت:

اس آیت میں اس بات کی خبر دی ہے کہ اللہ چھپی باتوں اور دل کی باتوں اور کھلی ہوئی باتوں کو جاننے والا ہے، اس پر کوئی چیز مخفی نہیں، بلکہ اس کا علم تمام حالات، زمانوں، دنوں، لحظوں، اوقات اور جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے، ان سب کو گھیرے ہوئے ہے۔ ذرہ برابر بھی کوئی چیز اس کے علم سے غائب ہے، نہ ذرہ برابر کم۔ ساری چیزیں جو زمین کے کناروں تک میں ہیں اور سمندروں اور پہاڑوں میں ہیں، ان سب کی اس کو خبر ہے۔ اس کی قدرت سب پر نافذ ہے۔ اس ارشاد میں بندوں کو اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ ہر دم اللہ کا خوف اور خشیت رکھیں، کسی ممنوع چیز کے مرتکب نہ ہوں، جس بات کو اللہ تعالیٰ دشمن رکھتا ہے، اس کے آس پاس نہ پھٹکیں، وہ سارے امور کا عالم ہے۔ عذاب دے کر ان کا علاج کر سکتا ہے، گو کسی کو مہلت دے رکھی ہو، کیوں کہ وہ مہلت کے بعد پکڑ لیتا ہے۔ عزت والا ہے اور صاحبِ اقتدار ہے۔

روزِ قیامت تمام اعمال سامنے ہوں گے:

اسی لیے یہ فرمایا ہے کہ قیامت کو ہر بندہ اپنے اچھے اور برے عمل کو موجود پائے گا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ﴾ [القیامة: ۱۳] ''اس دن انسان کو بتا دیا جائے گا جو اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا۔'' اگر اعمالِ حسنہ ہوئے تو خوش ہوگا اور اگر قبیح ہوئے تو آرزو کرے گا کہ ان اعمال سے بیزار ہو، اس

کے اور ان کے درمیان لمبی مسافت ہو۔ اپنے شیطان سے، جو دنیا میں اس کا ساتھی تھا، جس نے اس کو ان برے کاموں پر جرأت دلائی تھی، کہے گا: ﴿ يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ﴾ [الزخرف: ۳۸] ''کاش! میرے اور تیرے درمیان مشرق ومغرب کی دوری ہوتی، تو تُو بڑا بُرا ساتھی ہے۔''

خوف اور امید:

پھر اللہ تعالیٰ نے تاکید اور وعید کے طور پر فرمایا کہ تم مجھ سے، یعنی میرے عذاب سے بچتے رہو، یہ ڈرانا ہوا۔ پھر اپنے بندوں کو اُمید دلائی، تاکہ وہ اس کی رحمت سے ناامید نہ ہوں۔ کہا: اللہ بندوں پر مہربان ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کی نرمی اور مہربانی ہے کہ اس نے اپنا ڈر بتایا۔[1] بعض نے کہا کہ اللہ رحیم ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے سیدھی راہ پر چلیں، اس کے دینِ قوی پر قائم رہیں اور اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کریں۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۱ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۲

آپ کہہ دیجیے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (31) آپ کہہ دیجیے: تم اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ منہ موڑیں تو بے شک اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا (32)

محبتِ الٰہی کا تقاضا:

موضح قرآن میں ہے کہ اگر کوئی کسی کی محبت کا دعویٰ کرے تو اس طرح محبت کرے، جس طرح محبوب چاہے نہ کہ جس طرح اپنا جی چاہے، اگر وہ اسی طرح چاہے گا تو محبوب بھی اس کو چاہے گا۔ اللہ تعالیٰ کا بندوں کو چاہنا یہ ہے کہ ان پر مہربان ہو، گناہ اور فضول خیالات پر پکڑ نہ کرے۔ بندے کی محبت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام اور اس کے حکم پر شوق سے عمل پیرا ہو۔ یہ آیت ہر اس محبت کے مدعی کا فیصلہ کرنے والی ہے، جو اللہ سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے۔ فیصلہ یہ ہے کہ جو طریقۂ محمدیہ پر نہیں ہے، وہ اپنے دعوے میں حقیقتاً جھوٹا ہے، جب تک سارے اقوال و افعال میں شرعِ محمدی اور دینِ نبوی کی اتباع نہ کرے۔ جس طرح صحیحین میں مروی ہے کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے وہ کام کیا، جس پر ہمارا حکم نہیں ہے، وہ مردود ہے۔[2]

---

[1] تفسیر الطبري (٦/ ٣٢١) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢/ ٧٥٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧١٨)

اسی لیے یہ فرمایا کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری فرماں برداری کرو، تمھیں تمھاری طلب سے زیادہ ملے گا۔ وہ یہ ہے کہ خود اللہ تم کو دوست رکھے گا۔ یہ کام اللہ سے تمھاری محبت سے بڑھ کر ہے۔ بعض علما نے کہا ہے کہ یہ کچھ نہیں کہ محبّ ہو، بات تو یہ ہے کہ محبوب ہو۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ وغیرہ سلف نے کہا ہے کہ ایک قوم نے گمان کیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے محبّ ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اس آیت کے ذریعے آزمایا۔[1] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ دین صرف حب فی اللہ اور بغض فی اللہ ہے، پھر زیرِ تفسیر آیت پڑھی۔ (رواہ ابن أبي حاتم) مگر ابو زرعہ رحمہ اللہ نے اس حدیث کو منکر کہا ہے۔[2] یہ انکار اس طرح دور ہو سکتا ہے کہ یہی مضمون اور صحیح حدیثوں میں بھی مروی ہے۔[3]

اطاعتِ رسول بخشش کا ذریعہ ہے:

پھر رسول کی اتباع کرنے پر گناہوں کی بخشش کا وعدہ فرمایا ہے، گویا یہ بخشش سفارتِ [وساطت] رسول کی برکت سے حاصل ہوگی۔ پھر ہر خاص و عام کو یہ حکم دیا کہ تم اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ اگر حکم کے خلاف کرو گے تو اللہ کو کافروں سے کچھ تعلق اور محبت نہیں ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کتاب و سنت کے طریقے کی مخالفت کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ کافر کو نہیں چاہتا، گو وہ اپنے زعم میں اللہ تعالیٰ کا محبّ اور متقرب الی اللہ ہو اور محبت کا دعویٰ کرتا رہے، جب تک کہ وہ رسول، نبی، خاتم الرسل، رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع نہ کرے۔ وہ رسول کہ اگر سارے انبیا اور رسول، بلکہ ان میں سے اولو العزم ہستیاں، اس رسول کے زمانے میں ہوتے تو ان کو اس رسول کی پیروی کے سوا چارہ نہ تھا۔ اس کی اطاعت اور اتباعِ شریعت میں داخل ہوئے بغیر گزارا نہ تھا۔ چناں چہ یہ تقریر تفسیر آیت میثاقِ انبیا علیہم السلام میں ۔ان شاء اللہ تعالیٰ۔ آئے گی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کا قول یہاں ختم ہوا۔[4]

فتح البیان میں ہے کہ حب یا محبت کسی شے پر دل کے میلان اور جھکاؤ کو کہتے ہیں۔ یہ جھکنا اس لیے ہوتا ہے کہ دل نے اس شے میں کوئی کمال دیکھا ہے، اس لیے اس کی طرف میلانِ قلبی ہوا۔ امام ازہری رحمہ اللہ نے کہا ہے: بندے کی اللہ اور رسول کے ساتھ محبت یہ ہے کہ ان دونوں کی اطاعت بجا لائے اور ان کا حکم مانے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت بندے سے یہ ہے کہ اس کو بخش دے۔[5] حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کچھ قوموں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کہا کہ ہم اپنے رب کو چاہتے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔[6] (رواہ ابن جریر وغیرہ) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شرک اندھیری رات میں پتھر پر چیونٹی کے چلنے سے بھی زیادہ مخفی ہے۔ سب سے کم شرک یہ

---

[1] تفسير الطبري (٦/ ٣٢٢) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٣٣)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٣٢) اس کی سند میں ''عبدالاعلیٰ بن اعین'' ضعیف راوی ہے۔

[3] دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٩٩٨) [4] تفسير ابن كثير (١/ ٤٦٧، ٤٦٨)

[5] تفسير القرطبي (٤/ ٦٠) [6] تفسير الطبري (٦/ ٣٢٢) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٣٣)

ہے کہ تو ذرا سی سخاوت پر کسی کو دوست رکھے اور ذرا سے انصاف پر کسی کو دشمن رکھے۔ اللہ کی راہ میں دوستی اور دشمنی ہی کو دین کہتے ہیں۔[1] (رواه أبو نعيم في الحلية و الحاكم)

اتباعِ سنت اور ترکِ تقلید کا حکم:

بعض نے کہا ہے کہ یہ آیتیں یہود و نصاریٰ کے حق میں اُتری ہیں۔ وہ کہتے تھے: ہم اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں۔ کسی نے کہا: قریش کے لیے آئی ہے، وہ کہتے تھے: ہم ان بتوں کو اللہ کی محبت سے پوجتے ہیں، تاکہ وہ ہم کو اللہ سے ملا دیں، لیکن اس کا اطلاق عمومی طور پر کرنا زیادہ بہتر ہے۔ اس آیت میں اتباعِ سنت، ترکِ تقلید اور کتاب و حدیث کے قطعی احکام کی طرف رجوع کرنے کی دلیل ہے۔ پھر جب نبی اکرم ﷺ کی اتباع پر بخشش مترتب ہوئی تو اتباع کو چھوڑنے اور تقلید اختیار کرنے پر عدمِ مغفرت مقرر رہے گی۔ پھر عموماً سب کو حکم دیا کہ تم اللہ اور رسول کے مطیع بن جاؤ۔ سارے اوامر و نواہی میں اللہ اور رسول کی پیروی کرو۔ معلوم ہوا کہ مقلد اللہ اور رسول کا مطیع نہیں ہوتا، بلکہ نافرمان ہے، اس نے اللہ اور رسول کی اطاعت کو چھوڑ کر کسی واضح حجت اور کھلی دلیل کے بغیر غیر کی اطاعت اختیار کی ہے۔ پھر کفار سے اپنی محبت کی نفی کی ہے، محبت کی نفی دشمنی اور غصے کی طرف اشارہ ہے۔ معلوم ہوا کہ جو لوگ کتاب و سنت کے مطیع نہیں ہیں، اللہ ان کے کام سے خوش ہے، نہ ان کو بخشے گا۔[2]

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٣٣﴾ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٣٤﴾

بے شک اللہ نے آدم کو، آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو تمام جہانوں میں سے (نبوت کے لیے) چن لیا ہے (33) یہ ایک دوسرے کی اولاد تھے اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (34)

اہلِ زمین سے چنیدہ افراد:

اس آیت میں اس بات کی خبر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان خاندانوں کو تمام اہلِ زمین سے منتخب کیا ہے۔ پہلے مصطفیٰ (چنے ہوئے) آدم علیہ السلام تھے، ان کو اپنے ہاتھ سے بنایا، ان میں اپنی روح پھونکی، ہر شے کا نام سکھایا، جنت میں بسایا، پھر وہاں سے کسی حکمت کے لیے ان کو نیچے اُتارا۔ دوسرے مصطفیٰ نوح علیہ السلام تھے، ان کو سب سے پہلا رسول بنا کر

---

[1] مستدرك الحاكم (۲/ ۳۱۹) حلية الأولياء (۹/ ۲۵۳) امام البانی رحمہ اللہ نے "السلسلة الضعيفة" (رقم الحديث: ۳۷۵۵) میں اس روایت پر بحث کرتے ہوئے اس کے پہلے حصے کو صحیح کہا ہے۔ البتہ محبت اور بغض کے موضوع کی دوسری روایت صحیح ہے۔ دیکھیں: السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۹۹۸)

[2] فتح البيان (۲/ ۲۱۸۔ ۲۱۹)

اہلِ زمین کی طرف بھیجا، جب لوگ بت پرست ہوگئے تھے اور اللہ کے ساتھ شرک کرنے لگ گئے تھے، پھر جب مدت دراز ہوگئی اور وہ رات دن چھپے اور کھلے لوگوں کو توحید کی طرف بلاتے رہے، لیکن وہ نہ آئے تو اللہ نے ان سے انتقام لیا، سب کو از اول تا آخر طوفان میں ڈبو دیا، ان لوگوں کے سوا کوئی بھی نہ بچا جو اُن کے دین کے تابع ہوگئے تھے۔ تیسرے مصطفیٰ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ہیں۔ سید البشر خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم علی الاطلاق انہی کی نسل سے ہیں۔ عمران سے اس جگہ مراد مریم اُم عیسیٰ کے والد ہیں۔ محمد بن اسحق رحمہ اللہ کا یہی قول ہے کہ وہ عمران بن یاشم بن اَمون بن میشا بن حزقیا بن اَحریق بن یوثم بن عزاریا بن امصیاء بن یاوش بن اَجریہو بن یازم بن یہفاشاط بن اِنشا بن اَبیان بن رَحیعم بن سلیمان بن داود علیہما السلام ہیں۔ اس طرح عیسیٰ علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ٹھہرے، اس کا بیان سورت انعام میں آئے گا۔[1] إن شاء الله تعالیٰ۔ موضح قرآن میں ہے کہ عمران موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام بھی ہے اور مریم کے والد کا بھی، شاید یہاں یہی مراد ہے۔

فتح البیان میں ہے: اصطفاء کے معنی ہیں: اختیار کرنا۔ یہ صفوۃ سے مشتق ہے۔ صفوۃ ہر شے کے خالص کو کہتے ہیں۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان کو سارے جہان میں سے نبوت کے لیے چن لیا۔[2] کسی نے کہا: اللہ نے دینِ آدم علیہ السلام کو چن لیا۔ آدم علیہ السلام ابو البشر ہیں۔ اس لیے ان کا نام پہلے لیا، پھر نوح علیہ السلام کا کہ وہ آدمِ ثانی ہیں، پھر ابراہیم علیہ السلام کا کہ وہ آدمِ ثالث ہیں۔ ابو سلیمان دمشقی رحمہ اللہ نے کہا کہ نوح علیہ السلام کا نام سکن تھا، وہ نوحہ بہت کیا کرتے تھے، اس لیے نوح کہلائے۔[3] آدم علیہ السلام نو سو ساٹھ برس جیے، نوح علیہ السلام ادریس علیہ السلام کی نسل سے تھے، ان کے اور اُن کے درمیان دو واسطے تھے۔ کیوں کہ لمک کے یہ بیٹے ہیں، لمک متوشلخ کے بیٹے ہیں، وہ اخنوخ کے بیٹے ہیں، یہ ادریس علیہ السلام کا نام ہے۔ نوح ایک ہزار پچاس سال زندہ رہے۔ محققینِ نحاۃ کہتے ہیں، نوح عجمی اسم ہے، مشتق نہیں۔

آلِ ابراہیم سے خود ابراہیم علیہ السلام مراد ہیں یا اسماعیل و اسحاق و یعقوب علیہم السلام، یا وہ لوگ جو اُن کے دین پر تھے۔ قولِ ثانی زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو دو شاخوں کی اصل بنایا تھا۔ اسماعیل علیہ السلام کو اصلِ عرب ٹھہرایا، ان میں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لہٰذا وہ اصطفا میں داخل ہیں۔ اسحاق علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی اصل بنایا، ان میں نبوت اور ملک (بادشاہت) کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک رکھا۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو قیامت تک ملک دیا اور آپ کو نبی کر کے بھیجا۔ ابراہیم علیہ السلام ایک سو ستر برس جیے۔

آلِ عمران سے مراد موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے والد ہیں یا وہ جو سلیمان علیہ السلام کی اولاد سے تھے، یعنی مریم کے والد مراد ہیں۔ ظاہر قولِ ثانی ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد عیسیٰ اور مریم علیہما السلام کا قصہ بیان فرمایا ہے۔ دونوں

[1] تفسير ابن كثير (١/ ٤٦٨) [2] تفسير القرطبي (٤/ ٦٢) [3] زاد المسير (١/ ٣٧٤)

عمران کے درمیان ایک ہزار آٹھ سو برس گزرے۔ عمران اول اور یعقوب کے درمیان تین اجداد ہوئے اور عمران ثانی اور یعقوب علیہ السلام کے درمیان تیس دادا تھے۔ عمران عجمی اسم ہے۔ کسی نے کہا: عربی ہے اور عمر سے مشتق ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ نام علمیت و عجمہ یا الف اور نون کی زیادتی کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ یہ السمین الحلبی کا قول ہے۔ ”ذریت“ کا لفظ اصول اور فروع دونوں پر آتا ہے۔ آدم کے لیے بعض کا بعض سے ہونا ایسے تھا کہ دین میں ایک دوسرے کے حامی و ناصر، قوتِ بازو اور مددگار تھے۔ ابو قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یعنی نیت، عمل، اخلاص اور توحید میں۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: مراد مومنین، آلِ ابراہیم، آلِ عمران، آلِ یاسین اور آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔[2]

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِکَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳۶﴾

جب عمران کی بیوی نے کہا: اے میرے رب! بے شک میں نے منت مانی ہے کہ جو (بچہ) میرے پیٹ میں ہے، وہ تیرے ہی لیے وقف ہے، چناں چہ تو (اسے) مجھ سے قبول فرما، بے شک تو ہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (35) پھر جب اس نے بچی کو جنم دیا تو کہنے لگی: میرے رب! بے شک میں نے تو لڑکی کو جنم دیا ہے اور اللہ خوب جانتا تھا جو اس نے جنا تھا اور لڑکا (اس) لڑکی کی مثل نہیں اور بے شک میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور بے شک میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں (36)

مریم کی ولادت کا واقعہ:

اس اُمت میں دستور تھا کہ ماں باپ بعض لڑکوں کو اپنے حق سے آزاد کر کے اللہ تعالیٰ کے لیے وقف کر دیتے، پھر ساری عمر اُن کو دنیا کے کام میں نہ لگاتے، وہ ہمیشہ مسجد میں عبادت کرتے رہتے۔ عمران کی عورت کو حمل تھا، اس نے پہلے سے یہی نذر کر رکھی تھی، جب بیٹی پیدا ہوئی تو وہ نا اُمید ہوئی کہ میری نذر پوری نہیں ہوئی، کیوں کہ دستور

[1] تفسیر الطبري (٦/ ٣٢٨)

[2] تفسیر الطبري (٦/ ٣٢٦) تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٦٣٥) اس کی سند حسن ہے۔ فتح البیان (٢/ ٢٢٠۔ ٢٢١)

لڑکے کی نیاز کا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اللہ کو بہتر معلوم ہے، یعنی گو وہ بیٹی ہے، مگر بیٹے سے بہتر ہے۔

عمران کی عورت کا نام حنہ بنت فاقوذ تھا۔ یہ مریم علیہا السلام کی والدہ ہیں۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: ان کو حمل نہیں ٹھہرتا تھا، ایک دن ایک پرندے کو دیکھا کہ اپنے بچے جگا رہا ہے، ان کے دل میں بھی بچے کی خواہش پیدا ہوئی، اللہ تعالیٰ سے بچہ مانگا۔ دعا قبول ہوئی، شوہر نے صحبت کی تو حمل ٹھہر گیا۔ جب حمل ثابت ہوا تو نذر مانی کہ میں اس کو دنیا کے کاموں سے آزاد کر کے خالص تیری عبادت کے لیے فارغ رکھوں گی، وہ بیت المقدس کی خدمت کیا کرے گا۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ نر ہوگا یا مادہ، اس لیے جب بچی پیدا ہوئی تو وہ کہا جو اوپر گزرا۔ ﴿وَضَعَتْ﴾ کی تا اگر مرفوع (یعنی اس پر پیش) ہے تو یہ زوجۂ عمران کا قول ہے اور اگر ساکن ہے تو یہ اللہ پاک کا قول ہے۔ مطلب یہ کہ عبادت اور مسجد کی خدمت کے لیے لڑکی کی قوت اور تیزی لڑکے کے برابر نہیں ہوتی۔ پھر اس بچی کا نام مریم رکھا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ولادت کے دن نام رکھنا جائز ہے، کیونکہ ظاہر سیاق یہی ہے۔ یہ پہلی شریعت تھی، اس کا بیان بطور تقریر (اثبات) کیا گیا ہے۔[1]

بچے کی پیدائش کے وقت نام رکھنے کا مسئلہ:

مرفوع حدیث میں بھی اسی طرح مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج کی رات میرا بیٹا پیدا ہوا ہے، میں نے اس کا نام اپنے والد ابراہیم کے نام پر رکھا ہے۔[2] (أخرجه الشيخان) یہ بھی صحیحین میں مروی ہے کہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ اپنے بھائی کو، جسے ان کی والدہ نے جنا تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے، آپ نے گھٹی دی اور عبداللہ نام رکھا۔[3] صحیح بخاری میں مروی ہے کہ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! آج کی رات میرے گھر بیٹا ہوا ہے، میں اس کا نام کیا رکھوں؟ فرمایا تو اپنے بیٹے کا نام عبدالرحمٰن رکھ۔[4] یہ بھی صحیح میں مروی ہے کہ جب ابو اُسید رضی اللہ عنہ اپنے بیٹے کو گھٹی دلوانے کے لیے لائے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشغول پا کر بچے کو گھر بھیج دیا تو آپ کو یاد آیا، اسی مجلس میں اس کا نام منذر رکھا۔[5] رہی سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث جس کو امام حسن بصری رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے کہ بچہ اپنے عقیقے میں گروی ہے، ساتویں دن جانور ذبح کریں، نام رکھیں، سر منڈا دیں۔ سو اس کو احمد اور اہلِ سنن نے روایت کیا ہے۔[6] (وصححه الترمذي)

---

(1) تفسير ابن كثير (١/ ٤٦٨) (2) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٤١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣١٥)

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٤٤)

(4) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٣٢) (5) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٣٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٤٩)

(6) مسند أحمد (٥/ ١٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٣٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٢٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٢٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٦٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤١٨٤)

دوسری روایت میں نام رکھنے کے بجائے خون بہانا مروی ہے۔[1] یہ زیادہ ثابت اور زیادہ محفوظ ہے۔ پھر اللہ نے شیطان سے حفاظت کے لیے والدۂ مریم کی دعا قبول کرلی۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ کوئی بچہ ایسا نہیں جس کو ولادت کے وقت شیطان نہ چھوتا ہو، وہ بچہ شیطان کے چھونے سے رونے لگتا ہے، مگر مریم اور ان کا بیٹا شیطان کے چھونے سے محفوظ رہے، تم چاہو تو اس آیت کو پڑھو: ﴿ اِنِّيْٓ اُعِيْذُھَا بِكَ ﴾ (رواہ الشیخان)[2] دوسری روایت میں شیطان کا چھونا ایک دو بار مروی ہے۔[3] تیسری روایت میں مروی ہے کہ اس کو پہلو میں کونچ (ٹھونکا) دیتا ہے، مگر عیسیٰ بن مریم علیہما السلام، یعنی وہ شیطان کے تصرف سے محفوظ رہے۔[4]

فتح البیان میں ہے کہ مریم کی ماں عیسیٰ علیہ السلام کی نانی ہوئیں۔ عمران بن ماثان ان کے نانا ہوئے، وہ نبی نہیں تھے۔ نانا نانی، دادا دادی کے حکم میں ہیں۔ حنہ کو حمل تھا کہ عمران فوت ہوگئے۔ مریم کے معنی خادم کے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ وہ اگر کنیسہ کی خدمت کے لائق نہیں ہیں تو عبادت گزار ہی سہی۔ رجیم کے معنی مردود و مطرود (دھتکارا ہوا) ہیں۔ سلیمان جمل نے کہا ہے: اس جگہ یہ مشکل ہے کہ ظاہر آیت سے یہ نکلتا ہے کہ وہ استعاذہ (شیطان سے پناہ مانگنا) وضع حمل کے بعد تھا۔ حالاں کہ شیطان بچے کو ماں کے پیٹ سے نکلتے ہی فوراً طعن و مس کرتا ہے۔[5]

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝٣٧

چناں چہ اس کے رب نے اس (لڑکی) کو اچھے طریقے سے قبول کر لیا اور اس کی بہت اچھی پرورش کی اور زکریا کو اس کا سرپرست بنا دیا۔ زکریا جب بھی محراب میں داخل ہوتے تو اس کے پاس کچھ کھانے پینے کی چیزیں پاتے، وہ کہتے: اے مریم! تیرے پاس یہ کہاں سے آئیں؟ وہ کہتی: یہ اللہ کی طرف سے (آئی) ہیں، بے شک اللہ جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے (37)

مریم علیہا السلام کی پرورش اور اُن کی کرامتیں:

موضح قرآن میں ہے: ان کی ماں نے خواب دیکھا کہ اگرچہ یہ لڑکی ہے، مگر اللہ نے یہی نیاز میں قبول کی

[1] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۸۳۷) امام ابو داود رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ویسمی أصح، ویدمی وهم من همام"

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۲۴۸) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۳۶۶) [3] تفسیر الطبري (۶/ ۳۳۹)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۱۱۲) [5] فتح البیان (۲/ ۲۲۲۔ ۲۲۴)

ہے۔ اس کو مسجد میں لے جاؤ، مسجد میں لے گئے تو بزرگوں نے پہلے کہا کہ لڑکی کے رکھنے کا دستور نہیں ہے، جب اس کا خواب سنا تب قبول کیا۔ زکریا علیہ السلام کی بیوی ان کی خالہ تھی۔ اس لیے وہی رکھنے لگے، ان کے لیے مسجد میں الگ حجرہ بنایا، دن کو یہ وہاں عبادت کرتیں، رات کو زکریا علیہ السلام اسے اپنے ساتھ گھر لے جاتے، ان سے یہ کرامت دیکھی کہ بے موسم میوہ اللہ کے ہاں سے آتا، تب زکریا علیہ السلام جو ساری عمر اولاد سے نا امید تھے، اب امیدوار ہوئے کہ شاید بے موسم میوہ مجھ کو بھی ملے۔ اسی جگہ اولاد کی دعا کی۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ ہم نے مریم کو نذر میں قبول کر لیا۔ اچھی اور خوش صورت بنایا، قبول کے اسباب مہیا کر دیے، صلحا میں ملا دیا، وہ ان سے علم و خیر و دین کی تعلیم پانے لگیں، اسی لیے یہ فرمایا کہ ہم نے اس کو زکریا کے حوالے کر دیا۔ امام ابن اسحق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ سپردگی اس لیے تھی کہ وہ یتیم تھیں۔ بعض نے کہا: بنی اسرائیل پر قحط پڑا تھا، اس لیے زکریا علیہ السلام مریم علیہا السلام کے کفیل ہوگئے۔ ان دونوں اقوال میں تضاد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زکریا علیہ السلام کا کفیل ہونا اسی لیے مقدر کیا تھا کہ مریم علمِ نافع اور عملِ صالح کر کے سعادت پائیں۔ زکریا مریم علیہا السلام کی خالہ کے شوہر تھے، جس طرح امام ابن جریر اور امام ابن اسحق رحمہما اللہ نے کہا ہے۔[1] کسی نے کہا ہے: مریم کے بہنوئی تھے، جس طرح صحیح میں مروی ہے۔[2]

اس طرح سے یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام خالہ زاد بھائی ٹھہرتے ہیں۔ اسحاق کے قول کا اس پر توسُّعاً (کھینچ تان کر) اطلاق کیا جا سکتا ہے، اس صورت میں گویا مریم اپنی خالہ کی گود میں پرورش پاتی تھیں۔ صحیح میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ عمارہ بنت حمزہ کو اس کی خالہ جعفر بن ابو طالب کی بیوی پالے، پھر فرمایا: خالہ بمنزلہ ماں ہوتی ہے۔[3] پھر اللہ تعالیٰ نے مریم علیہا السلام کی سیادت اور سخت محنت کا بیان کیا کہ وہ عبادت میں ایسی مستعد تھیں کہ جب زکریا علیہ السلام ان کے پاس آتے تو رزق پاتے۔ امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، ابو الشعثاء، نخعی، ضحاک، قتادہ، ربیع، عطیہ اور سدی رحمہم اللہ نے کہا: گرمی کا میوہ سردی میں اور سردی کا میوہ گرمی میں موجود دیکھتے۔ ایک قول امام مجاہد رحمہ اللہ کا یہ ہے کہ اس جگہ رزق سے مراد علم ہے یا علم کے صحیفے۔[4] مگر پہلا قول صحیح تر ہے۔ اس آیت میں کراماتِ اولیاء اللہ پر دلیل ہے، سنت میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ جامی رحمہ اللہ نے کتاب "شواهد النبوة" میں بہت سی کراماتِ صحابہ و اہلِ بیت نقل کی ہیں۔ وللہ الحمد۔ زکریا علیہ السلام جب اس رزق کو دیکھ کر کہتے: یہ کہاں سے آیا تو مریم علیہا السلام فرماتیں کہ اللہ کے پاس سے آیا ہے، وہ جسے چاہے بے قیاس رزق دے۔

---

[1] تفسير الطبري (٦/ ٣٥٢) تفسير ابن كثير (١/ ٤٧٠)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٧٤)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٢)
[4] تفسير الطبري (٦/ ٣٥٤ و ٣٥٥) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٤٠)

رسول اللہ ﷺ کا ایک معجزہ:

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے کئی دن تک کچھ نہ کھایا، جب بہت بھوک لگی تو بیویوں کے گھر میں گئے، کسی ایک کے پاس بھی کچھ نہ پایا۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس آ کر کہا: تیرے پاس کچھ ہے کہ میں کھاؤں، مجھے بھوک لگی ہے؟ انھوں نے کہا: ”لَا وَاللّٰهِ بِأَبِي أَنْتَ وَ أُمِّي“ جب وہاں سے باہر نکلے تو ہمسائے کی ایک عورت نے دو روٹیاں اور ذرا سا گوشت بھیجا۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے لے کر ہانڈی رکابی میں رکھا اور کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کو اپنی جان اور جو لوگ میرے پاس ہیں، ان پر مقدم کروں گی، حالانکہ وہ سب بھوکے تھے اور ان کو طعام کی حاجت تھی۔ پھر حسن و حسین رضی اللہ عنہما کو بھیج کر رسول اللہ ﷺ کو بلایا۔ آئے تو کہا: ”بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي“ اللہ تعالیٰ نے کچھ بھیج دیا ہے۔ میں نے وہ آپ کے لیے چھپا کر رکھ دیا ہے۔ کہا: بیٹی لاؤ۔ وہ ہانڈی رکابی اٹھا لائیں، کھولا تو دیکھا کہ گوشت روٹی سے پر ہیں، دیکھ کر حیران رہ گئیں، جان لیا کہ یہ برکت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد کی، پھر نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجا اور وہ کھانا آپ کے سامنے رکھ دیا، آپ ﷺ نے دیکھ کر الحمد للہ کہا، پوچھا: یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟ کہا: اے ابا جان! ﴿ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ آپ ﷺ نے فرمایا: «اَلْحَمْدُ لِلّٰه الَّذِيْ جَعَلَكِ يَا بُنَيَّةُ شَبِيْهَةً بِسَيِّدَةِ نِسَاءِ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ فَكَانَتْ إِذَا رَزَقَهَا اللّٰهُ شَيْئًا وَسُئِلَتْ عَنْهُ قَالَتْ: هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ» (بیٹی! اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تجھ کو بنی اسرائیل کی عورتوں کی سردار عورت کے مشابہ بنایا ہے کہ جب اللہ اس کو کچھ دیتا اور اس سے پوچھا جاتا کہ یہ کہاں سے آیا ہے تو وہ جواب دیتی: یہ اللہ کی طرف سے ہے) پھر نبی کریم ﷺ نے علی کو بلایا اور علی و فاطمہ و حسن و حسین و ساری ازواج و اہل بیت رضی اللہ عنہم کے ساتھ مل کر کھایا۔ سب کا پیٹ بھر گیا، وہ ہانڈی اور رکابی اسی طرح بھری رہی، میں نے سب ہمسایوں کو اس میں سے دیا، اللہ تعالیٰ نے اس میں بڑی خیر و برکت بخشی۔[1] (رواه أبو يعلى)

فتح البیان میں ہے: ﴿ كَفَّلَهَا ﴾ کو ”أَكْفَلَهَا“ بھی پڑھا ہے، یعنی زکریا علیہ السلام مریم علیہا السلام کے کفیل ہوئے۔ زکریا علیہ السلام سلیمان علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد رحمہ اللہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ مریم سید و امام بنی اسرائیل کی صاحبزادی تھیں۔ سارے احبار چاہتے تھے کہ ہم ان کے کفیل ہوں۔ آخر قرعہ ڈالا کہ جس کا نام نکلے، وہ کفالت کرے۔ زکریا علیہ السلام ان کے بہنوئی تھے، وہی کفیل ٹھہرے۔ اپنے ساتھ محراب میں رکھتے، پرورش کرتے۔ محراب کہتے ہیں بالاخانے کو اور ہر عبادت کی جگہ کو جیسے مسجد کی محراب، کیوں کہ اس جگہ

---

[1] ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ”المطالب العالية“ (١٦/ ١٧٨) میں امام ابویعلی سے ذکر کرتے ہیں۔ اس روایت کی سند میں ”عبداللہ بن لہیعہ“ ضعیف راوی ہے۔

شیطان سے محاربہ (جنگ) ہوتا ہے۔ بعض نے کہا: زکریا علیہ السلام نے ان کے لیے ایک الگ اونچی محراب بنائی تھی، جس پر سیڑھی لگا کر جانا ہوتا تھا، اس کا دروازہ بند کر دیتے تھے، یہاں تک کہ مریم علیہا السلام سیانی ہوگئیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ رزق انگور تھا، بے وقت ایک ڈلیا [چھوٹی ٹوکری] میں آ جاتا تھا۔[1]

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿٣٨﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٣٩﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿٤٠﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿٤١﴾

وہیں زکریا نے اپنے رب سے دعا کی، کہا: میرے رب! مجھے اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا کر، بے شک تو ہی دعا سننے والا ہے (38) پھر جب وہ حجرے میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا تو فرشتوں نے اسے آواز دی: بے شک اللہ تجھے یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے، وہ اللہ کے ایک کلمے (عیسیٰ) کی تصدیق کرے گا اور سردار اور پارسا اور نیکوکاروں میں سے نبی ہوگا (39) زکریا نے کہا: اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیوں کر ہوگا جب کہ میں خود بوڑھا ہو چکا اور میری بیوی بانجھ ہے؟ فرشتے نے کہا: اللہ اسی طرح جو چاہے کرتا ہے (40) زکریا نے کہا: اے میرے رب! میرے لیے کوئی نشانی مقرر فرما۔ اللہ نے کہا: تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین دن تک لوگوں سے اشارے کے سوا بات چیت نہ کر سکے گا اور اپنے رب کو کثرت سے یاد کر اور صبح و شام اس کی تسبیح کر (41)

زکریا علیہ السلام کی دعا اور یحییٰ علیہ السلام کی خوش خبری:

موضح قرآن میں کہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی گواہی دے گا، یعنی مسیح کی۔ جب عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو یحییٰ علیہ السلام لوگوں کو آگے سے خبر دیتے تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے اپنے کلمے کا خطاب دیا ہے، یعنی وہ باپ کے بغیر محض

[1] تفسیر الطبري (٦/ ٣٥٤) مستدرك الحاكم (٢/ ٣١٩) امام حاکم اور ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ فتح البیان (٢/ ٢٢٥۔ ٢٢٦)

اللہ کے کلمے، یعنی حکم سے پیدا ہوئے۔ پھر جب یحییٰ علیہ السلام ماں کے پیٹ میں پڑے تو زکریا علیہ السلام کی تین روز یہی حالت رہی کہ آدمی سے کلام نہ کر سکتے تھے، اس وقت ان کی عمر ایک سال کم سو برس تھی اور اُن کی عورت کی عمر دو سال کم سو سال تھی۔ انھیں دِنوں میں مریم علیہا السلام کے ہاں عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب زکریا علیہ السلام نے دیکھا کہ مریم علیہا السلام کے پاس بے موسم میوہ آتا ہے تو ان کو بھی اولاد کی خواہش ہوئی، اگرچہ بڑے بوڑھے ہو گئے تھے، ہڈیاں ضعیف ہوگئی تھیں، سر کے بال سفید پڑ گئے تھے، بیوی بھی بوڑھی بانجھ تھی، لیکن اس حال کے باوجود دعا مانگی، چپکے سے کہا: اے رب! مجھے بھی اچھی اولاد دے۔ فرشتوں نے محراب میں سامنے آکر اُن سے دو بدو کہہ دیا۔ محراب سے مراد وہ جگہ ہے، جہاں وہ عبادت کرتے تھے، وہ جگہ علاحدگی کی اور مجلس و مناجات اور نماز کی تھی۔ یہاں تک کہہ دیا کہ اس بچے کا نام یحییٰ ہوگا۔[1]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یحییٰ نام اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ بہ ایمان کیا۔ اس جگہ کلمۃ اللہ سے مراد عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ہیں۔ ربیع بن انس رحمہ اللہ نے کہا: سب سے پہلے جس نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی تصدیق کی، وہ یحییٰ علیہ السلام ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یحییٰ سنت و منہاجِ عیسیٰ علیہ السلام تھے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام خالہ زاد بھائی تھے۔ یحییٰ علیہ السلام کی والدہ مریم علیہا السلام سے کہتی تھیں کہ جو بچہ میرے پیٹ میں ہے، وہ اس کو سجدہ کرتا ہے، جو تیرے پیٹ میں ہے۔ یہ ہے تصدیق یحییٰ علیہ السلام کی، عیسیٰ علیہ السلام کو ماں کے پیٹ میں۔ عیسیٰ علیہ السلام کے ماں کے پیٹ میں سب سے پہلے مصدق (تصدیق کرنے والے) یہی یحییٰ علیہ السلام تھے۔ کلمۃ اللہ عیسیٰ علیہ السلام تھے۔ یحییٰ علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے۔[3] امام سدی رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔[4]

"سیّد" کی تفسیر:

امام ابو العالیہ، ربیع، قتادہ، سعید بن جبیر رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا: سید حلیم کے معنی میں ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: وہ علم اور عبادت میں سید تھے۔ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا: حلیم و تقی تھے۔ یہی قول امام ضحاک رحمہ اللہ کا ہے۔ ابن المسیب رحمہ اللہ نے کہا: سید فقیہ و عالم کے معنی میں ہے۔ امام عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ خلق اور دین میں سید تھے۔ عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: سید وہ ہے جس پر غصہ غالب نہ ہو۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا کہ سید شریف کو کہتے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا: اللہ کے ہاں معزز کو سید کہتے ہیں۔[5]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ٤٧١) [2] تفسیر الطبري (٦/ ٣٧٠۔ ٣٧٢)

[3] تفسیر الطبري (٦/ ٣٧٣) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ امام ابن جریج رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا زمانہ نہیں پایا۔ نیز اس میں "حسین بن داود" ضعیف راوی ہے۔

[4] تفسیر الطبري (٦/ ٣٧٣) [5] تفسیر الطبري (٦/ ٣٧٤۔ ٣٧٦) تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٦٤٢)

''حصور'' کی تشریح:

حصور وہ ہے جو عورت کے پاس نہ جائے۔ یہی قول سیدنا عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام مجاہد، عکرمہ، ابن المسیب، ابی الشعثاء اور عطیہ عوفی رحمہم اللہ کا ہے۔ امام ابو العالیہ و ربیع رحمہما اللہ نے کہا: حصور وہ ہے جس کے ہاں نہ اولاد پیدا ہو نہ منی ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: وہ جس کے پانی نہ اترے، یعنی منزل نہ ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ کی خلق (مخلوق) میں یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کے سوا ایسا کوئی نہیں ہوا، جو اُسے بے گناہ ملا ہو۔ پھر سعید بن المسیب رحمہ اللہ نے یہ آیت پڑھی: ﴿سَيِّدًا وَّحَصُوْرًا﴾ (آیت زیرِ تفسیر) پھر کچھ زمین سے اٹھا کر کہا کہ حصور وہ ہے، جس کا ذَکر اس چیز کی طرح ہو، یعنی بے حس و حرکت۔ یحییٰ قطان نے نوکِ سبابہ (تشہد کی انگلی) سے اشارہ کیا۔ ابن المنذر رحمہ اللہ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کے سوا جو بھی اللہ سے ملے گا، وہ گناہ گار ہوگا، اللہ تعالیٰ نے ان کو سید اور حصور فرمایا۔ ان کا ذَکر (آلۂ تناسل) کپڑے کے ٹکڑے کی طرح تھا، پھر اپنی انگلی سے اشارہ کیا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت یہ ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر ابن آدم اللہ سے گناہ لے کر ملے گا، وہ چاہے اس کو عذاب کرے، چاہے اس پر رحم فرمائے، مگر یحییٰ علیہ السلام کہ وہ سید، حصور اور نبی تھے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین پر سے ایک تنکا اُٹھا کر کہا کہ ان کا ذَکر ایسا تھا۔[1]

اس لفظ میں ﴿وَنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ بشارتِ ولادت کے علاوہ ایک دوسری بشارت ہے، پچھلی بشارت اس اگلی بشارت سے اعلیٰ ہے۔ زکریا علیہ السلام کو جب اس بشارت کا یقین ہوگیا تو اس بڑھاپے کی حالت میں بیٹے کے وجود سے تعجب کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، پھر اس بات کی دو نشانیاں بتائیں: ایک یہ کہ باوجود تندرست و بھرپور ہونے کے تم تین دن کسی سے اشاروں کے علاوہ بات نہیں کر سکو گے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا﴾ [مریم: ۱۰] دوسری یہ کہ اس حال میں اللہ تعالیٰ کی تکبیر و تسبیح بہت سی کرو۔ یہ قصہ تفصیل کے ساتھ۔ إن شاء اللہ۔ سورت مریم میں آئے گا۔

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ زکریا علیہ السلام نے وہ دعا مریم علیہا السلام کے پاس کی تھی یا اسی زمانے میں کی جب رزق دیکھا تھا۔ اس دعا کا سبب یہ ہوا کہ حنہ بانجھ تھیں، اس کے پیٹ سے مریم پیدا ہوئیں۔ زکریا علیہ السلام نے خیال کیا کہ جس نے اس کو بچہ دیا، وہ مجھ کو بھی میری عورت کے بانجھ ہونے کے باوجود اس بڑھاپے میں دے سکتا ہے یا جس نے مریم کو بے وقت

---

[1] تفسير الطبري (٦/ ٣٧٧ـ ٣٨٠) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٤٣، ٦٤٤) یہ روایت لکھنے کے بعد امام ابن ابی حاتم نے اس پر نقد کیا ہے اور امام ابن عدی نے اسے منکر شمار کیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: الكامل (٢/ ٢٣٤)

میوہ دیا، کیا وہ بے وقت بچہ نہیں دے سکتا؟ ان کے گھر والے ان سے منقرض ہو گئے تھے (کٹ گئے تھے)۔ ذریت نسل کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ واحد جمع سب پر بولا جاتا ہے۔ ملائکہ سے جبرائیل علیہ السلام مراد ہیں۔ عربی زبان میں جمع کا صیغہ واحد پر بولنا جائز ہے۔ یا کئی ایک فرشتوں نے پکارا ہو، جس طرح ظاہر الفاظ ہیں۔ حقیقی معنی کو مجازی معنی پر فوقیت دی جاتی ہے۔

محراب سے مراد مصلیٰ یا مسجد ہے۔ یحییٰ کا نام اگلی کتاب میں یوحنا تھا، یہ نام عجمی ہے، مشتق نہیں۔ کلمۃ اللہ سے عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں، کیوں کہ وہ کلمہ ﴿ کُنْ ﴾ سے پیدا ہوئے یا جس طرح لوگ کلام اللہ سے ہدایت پاتے ہیں، اسی طرح ان سے ہدایت پائیں گے، اس لیے وہ کلمۃ اللہ کہلائے یا پہلی کتابوں میں ان کی خبر تھی کہ وہ بن باپ پیدا ہوں گے، لہٰذا جب پیدا ہوئے تو لوگوں نے کہا کہ یہ وہی کلمہ ہیں جس کا وعدہ تھا۔ ابو عبید رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ کا کلمہ، یعنی کتاب لے کر آئے۔[1] عیسیٰ علیہ السلام پر سب سے پہلے یحییٰ علیہ السلام ہی ایمان لائے۔ یہ ان سے تین برس یا چھے ماہ بڑے تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے سے پہلے شہید کیے گئے۔

سید سردارِ قوم کو کہتے ہیں۔ یحییٰ علیہ السلام عورتوں کے پاس نہیں جاتے تھے یا تو قدرتِ جماع نہیں رکھتے تھے یا اپنے آپ کو شہوت سے روکتے تھے۔ قاموس میں ہے کہ حصور وہ ہے جو باوجود قدرت کے عورت کے پاس نہ جائے۔[2] یہی معنی اس جگہ مناسب ہیں، کیوں کہ یہ مقام، تعریف کا مقام ہے۔ ان کو صالحین میں سے اس لیے کہا کہ وہ انبیا کی نسل میں سے تھے یا من جملہ صلحا کے تھے، جس طرح فرمایا ہے: ﴿ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [البقرة: ١٣٠] امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: صالح وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے فرائض اور لوگوں کے حقوق ادا کرے۔[3] بشارت کے حصول کے بعد زکریا علیہ السلام کا استبعاد (بعید خیال کرنا) اس لیے تھا کہ بشارت پر بیس یا چالیس برس گزر گئے۔ بشارت کے دن وہ نوے برس کے تھے یا ایک سو بیس برس کے، ان کی بیوی اٹھانوے برس کی تھیں۔ رمز کہتے ہیں: ہونٹ یا آنکھ یا ہاتھ یا ابرو سے اشارہ کرنے کو۔ واحدی رحمہ اللہ نے کہا: "عَشِي" تیسرے پہر کو کہتے ہیں، یعنی زوالِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک کے وقت کو کہتے ہیں۔ اس لیے نمازِ ظہر و عصر کو "صَلَاتَيِ الْعَشِيّ" بولتے ہیں۔ کسی نے کہا: "عَشِي" عصر سے شروع شب تک کو کہتے ہیں، مگر یہ قول ضعیف ہے۔ بکرہ کہتے ہیں: طلوعِ فجر سے دوپہر تک۔ تسبیح سے اس جگہ مراد نماز ہے یا سبحان اللہ کہنا۔[4]

---

[1] تفسير القرطبي (٤/ ٧٦)
[2] القاموس المحيط (ص: ٤٨١)
[3] معاني القرآن۔ للزجاج (١/ ٤٠٧)
[4] فتح البيان (٢/ ٢٢٦۔ ٢٣٢)

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٢﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿٤٣﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٤٤﴾

اور (یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بے شک اللہ نے تجھے چن لیا ہے اور تجھے پاکیزگی عطا کی ہے اور دنیا بھر کی عورتوں میں سے تجھے منتخب کیا ہے (42) اے مریم! اپنے رب کی فرماں برداری کر، سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر (43) (اے نبی!) یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں اور آپ اس وقت ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کا سرپرست ہو اور نہ آپ اس وقت ان کے پاس تھے، جب وہ باہم جھگڑ رہے تھے (44)

سیدہ مریم علیہا السلام کی اپنے زمانے کی عورتوں پر فضیلت:

مسجد کے بزرگوں نے جب مریم علیہا السلام کی ماں کا خواب سنا تو سب چاہنے لگے کہ مریم کو ہم پالیں۔ فیصلہ اس بات پر ہوا کہ ہر ایک نے اپنا وہ قلم جس سے تورات لکھتے تھے، بہتے پانی میں ڈالا، سب قلم بہاؤ پر ہو گئے۔ زکریا علیہ السلام کا قلم اُلٹا اوپر کی طرف بہا، لہٰذا مریم کی پرورش کا قرعۂ فال انھی کے نام نکلا۔

اس آیت میں اس بات کی خبر دی ہے، جو اللہ کے حکم سے فرشتوں نے مریم علیہا السلام سے کہی تھی، وہ بات یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے کثرتِ عبادت، زہد، شرف اور طہارت کی وجہ سے ان کو کدورت اور وسوسوں سے پاک کر کے پسند کر لیا ہے۔ بار بار چن کر ان کی بزرگی اس زمانے کی ساری عورتوں پر ثابت فرمائی۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ بہتر عورتیں جنھوں نے اُونٹ کی سواری کی، وہ قریش کی عورتیں ہیں، اولاد پر ان کی چھوٹی عمر میں بڑی مہربان، شوہروں کے مال کی نگہبان۔ مریم بنت عمران علیہا السلام کبھی اونٹ پر سوار نہ ہوئیں۔ اس حدیث کو عبدالرزاق اور مسلم نے روایت کیا ہے۔[1] سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہان کی عورتوں میں بہتر مریم بنت عمران علیہا السلام اور خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا ہیں۔ (أخرجه الشيخان)[2]

---

(1) تفسير الصنعاني (١/ ١٢٠۔ ١٢١) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٥١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٢٧)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٣٠)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت یوں ہے کہ تجھ کو جہان بھر کی عورتوں سے مریم بنت عمران علیہا السلام، خدیجہ بنت خویلد، فاطمہ بنت محمد رضی اللہ عنہا اور آسیہ فرعون کی بیوی علیہا السلام کافی ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ اس روایت کے ساتھ متفرد ہیں۔ اس روایت کے ساتھ اس حدیث کو صحیح بتایا ہے۔[1] سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام جہان کی عورتوں سے بہترین چار ہیں: مریم، آسیہ علیہما السلام خدیجہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہما[2] (رواہ ابن مردویہ) معاویہ بن قرہ عن ابیہ کی سند میں مرفوعاً مروی ہے کہ مردوں میں بہت لوگ کامل ہوئے ہیں، مگر عورتوں سے تین کامل ہوئیں: مریم علیہا السلام، آسیہ علیہا السلام اور خدیجہ رضی اللہ عنہا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت عورتوں پر ایسے ہے، جیسے عام کھانے پر ثرید کی فضیلت ہے۔ اس کو ابن مردویہ نے روایت کیا ہے۔ صحیح بخاری میں حدیث کے الفاظ یہ ہیں: «يَكْمُلُ مِنَ الرِّجَالِ كَثِيرٌ وَلَمْ يَكْمُلْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا آسِيَةُ امْرَأَةُ فِرْعَوْنَ وَمَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَأَنَّ فَضْلَ عَائِشَةَ عَلَى النِّسَاءِ كَفَضْلِ الثَّرِيدِ عَلَى سَائِرِ الطَّعَامِ»[3] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے اس حدیث کے طرق اور الفاظ اپنی کتاب "البداية و النهاية" میں "قصہ عیسیٰ" کے تحت اچھی طرح تلاش کر کے لکھے ہیں۔[4] وللّٰه الحمد والمنة.

قنوت کا مفہوم:

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ فرشتوں نے مریم علیہا السلام سے کہا کہ تو بہت عبادت کیا کر۔ قنوت کہتے ہیں: طاعت باخشوع کو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴾ [البقرة: ١١٦] "أَيْ: خَاشِعُوْنَ"، "سب اسی کے فرماں بردار ہیں۔" سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ قرآن کے جس حرف میں قنوت کا ذکر آیا ہے، اس سے مراد اطاعت ہے۔[5] (رواہ ابن أبي حاتم) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ مریم علیہا السلام اتنا قیام کرتیں کہ پاؤں سوج جاتے۔[6] قنوت ہر نماز میں طولِ رکوع ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی بجا آوری تھی: ﴿ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) "اپنے رب کی فرماں برداری کر۔" امام اوزاعی رحمہ اللہ نے کہا کہ اپنے محراب مین رکوع وسجود و قیام کے لیے اتنا جمیں کہ پاؤں میں زرد رنگ کا پانی اُتر آیا۔[7] امام سدی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ نہر اُردن پر جا کر قرعہ ڈالا، اس بات پر اتفاق ہوا کہ جس کا قلم بہاؤ پر ٹھہرے گا، وہی مریم علیہا السلام کو پالے گا، سب کے قلم بہہ گئے۔ زکریا علیہ السلام کا قلم ٹھہر گیا، یہی کفیل ہوئے۔ ان سب میں یہی بڑے سردار، عالم، امام اور نبی تھے۔[8]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٧٨) صحيح الجامع (٣١٤٣)
[2] صحيح ابن حبان (١٥/ ٤٠١) صحيح الجامع (٣٣٢٨)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٣٠)
[4] تفسير ابن كثير (١/ ٤٧٤) البداية والنهاية (٢/ ٥٦)
[5] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٤٨) السلسلة الضعيفة (٤١٠٥)
[6] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٤٨)
[7] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٤٨)
[8] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٣٩)

عمومی تفسیر :

فتح البیان میں ہے کہ اصطفا سے مراد یہ ہے کہ تجھ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے زمرۂ نساء سے کسی کو اختیار نہیں کیا۔ زکریا علیہ السلام کی گود میں پالا، جنت سے رزق دیا، لوگوں کے وسوسوں یا کفر یا گناہوں یا ایذا رسانیوں سے تجھ کو صاف رکھا۔ مریم علیہا السلام کو حیض نہ آتا تھا، ہاں حملِ عیسیٰ علیہ السلام سے دو بار حیض آیا۔ دوسرا اِصْطِفا یہ تھا کہ فرشتوں کا کلام سنوایا۔ زجاج رحمہ اللہ نے کہا: مراد قیامت تک سارے جہان کی عورتیں ہیں،[1] مگر صحیح یہ ہے کہ مراد اسی زمانے کی عورتیں ہیں۔ حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے: ’’أَرْبَعُ نِسْوَةٍ سَادَاتُ نِسَاءِ الْعٰلَمِيْنَ مَرْيَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ ... إِلٰى قوله... وَأَفْضَلُهُنَّ عَالَمًا فَاطِمَةُ‘‘[2] (چار عورتیں تمام جہان کی عورتوں کی سردار ہیں: مریم بنت عمران ...اور ان سے سب سے زیادہ فضیلت والی فاطمہ رضی اللہ عنہا ہے)

سجدے کا ذکر رکوع سے پہلے اس لیے کیا کہ سجدہ افضل ہے یا ان کی نماز میں ترتیب نہ تھی یا واو صرف جمع کے لیے آیا ہے، ترتیب کے لیے نہیں آیا۔ سجدے اور رکوع سے مراد نماز ہے اور قنوت سے نماز کا طول۔ اس آیت سے جماعت کی مشروعیت نکلی یا یہ مطلب کہ جس طرح وہ نماز پڑھتے ہیں، اسی طرح تو بھی نماز پڑھ ان کے ہمراہ نہ ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یہ سیدہ نساء والی بات جو ہم نے آپ کو بتائی ہے یہ غیب کی خبر ہے، آپ اس وقت وہاں موجود نہیں تھے، جب ان میں جھگڑا ہوا اور قرعہ ڈالا گیا کہ مریم کو کون پالے گا؟

قرعے کا جواز:

اس آیت سے قرعے کے جواز پر استدلال کیا گیا ہے، اس مسئلے میں اختلاف مشہور ہے، لیکن قرعے کے بارے میں احادیثِ صحیحہ ثابت ہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے ’’نیل الأوطار‘‘ میں پانچ جگہوں کا شمار کیا ہے، جہاں قرعہ وارد ہوا ہے۔[3] یہی بات صحیح ہے۔

---

[1] معاني القرآن للزجاج (۱/ ۴۱۰)

[2] تاریخ دمشق (۷۰/ ۱۰۷۔ ۱۰۸)

[3] نیل الأوطار (۵/ ۳۰۷) فتح البیان (۲/ ۲۳۲۔ ۲۳۵)

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓىِٕكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖۗ
اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ
وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ
الصّٰلِحِيْنَ ﴿٤٦﴾ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ
بَشَرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ
لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٤٧﴾

جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بے شک اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلمے کی خوش خبری دیتا ہے، اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا، وہ دنیا اور آخرت میں بڑے مرتبے والا اور اللہ کے قریبی بندوں میں سے ہوگا (45) اور وہ لوگوں سے ماں کی گود میں اور بڑی عمر میں بھی کلام کرے گا اور نیکو کاروں میں سے ہوگا (46) مریم نے کہا: اے میرے رب! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا، حالاں کہ مجھے کسی شخص نے نہیں چھوا؟ فرشتے نے کہا: اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جب وہ کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اسے صرف یہ کہتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے (47)

مریم علیہا السلام کو عیسیٰ علیہ السلام کی خوش خبری:

موضح قرآن میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت پہلے نبیوں نے دی تھی کہ مسیح پیدا ہوگا، جس سے بنی اسرائیل کا عروج ہوگا۔ مسیح کے معنی ہیں: جس کے ہاتھ لگانے سے بیمار اچھے ہوں، جس کا کہیں وطن نہ ہو، ہمیشہ سیاحی میں رہے۔ لہٰذا جب عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو یہودیوں نے ان کو نہ مانا۔ جب یہود میں دجال پیدا ہوگا، وہ اپنے آپ کو مسیح کہے گا، یہود اس کو مسیح مانیں گے۔ یہ مریم کو فرشتوں کی بشارت ہے کہ تمھارے ہاں ایک بڑی شان والا لڑکا پیدا ہوگا، وہ ایک حرف ﴿ كُنْ ﴾ کہنے سے موجود ہو جائے گا۔ جمہور رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ لفظ ﴿ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ ﴾ [آلِ عمران: ۳۹] کی تفسیر ہے، اس کا نام دنیا میں مسیح مشہور ہوگا، سب مومن اس کو پہچان لیں گے۔ عیسیٰ علیہ السلام کو مریم علیہا السلام کا بیٹا اس لیے کہا کہ وہ بغیر باپ کے تھے، دنیا میں ان کی یہ وجاہت تھی کہ وہ پیغمبر ہو کر آئے، شریعت لائے، بیمار کو اچھا کرتے، مردے کو زندہ کرتے۔ آخرت میں یہ وجاہت ہوگی کہ جس کے لیے اذن ہوگا، اس کی شفاعت کریں گے، وہ قبول ہوگی، جس طرح دیگر اولوا العزم کی شفاعت بھی، جو اُن کے بھائی ہیں، منظور ہوگی۔

عیسیٰ علیہ السلام کا گود میں بات کرنا:

گود میں بات کرنے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ وحدہ لا شریک لہ کی عبادت اور اس کی توحید کی طرف بلائیں گے۔ یہ ان کا ایک معجزہ اور اللہ کی ایک نشانی ہے۔ کہولت [بڑھاپے کی شروعات] میں ان کو وحی آئے گی اور وہ اپنے قول وعمل میں صاحبِ علم صحیح اور عملِ صالح ہوں گے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ کسی نے اپنے بچپن میں بات نہیں کی مگر عیسیٰ علیہ السلام اور صاحبِ جریج نے۔ اس کو ابن اسحاق رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔[1] دوسری روایت یہ ہے کہ گود میں صرف تین بچوں نے کلام کیا ہے: ایک عیسیٰ علیہ السلام نے، دوسرے اس بچے نے جو زمانہ جریج میں تھا اور تیسرے ایک اور بچے نے۔[2] (رواه ابن أبي حاتم)

عیسیٰ علیہ السلام کا بن باپ پیدا ہونا:

مریم علیہا السلام نے اس بشارت کو سن کر تعجب کیا، کیوں کہ ان کا کوئی شوہر تھا نہ شوہر کرنے کا ان کا ارادہ تھا اور نہ وہ بدکار تھیں۔ حَاشَا لِلّٰهِ. فرشتے نے ان کے سوال کا جواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ بات کچھ مشکل نہیں ہے۔ یہاں ﴿ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ﴾ [آل عمران: ٤٧] کہا، یہ نہیں کہا کہ ہاں ہوگا، جیسے زکریا علیہ السلام کے قصے میں کہا تھا: ﴿ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴾ [آل عمران: ٤٠] اس میں یہ نکتہ ہے کہ کسی کو عیسیٰ علیہ السلام کے مخلوق ہونے میں کوئی شبہہ باقی نہ رہے۔ پھر اس کی یہ تاکید فرمائی کہ جب ہم کوئی حکم دیتے ہیں تو لفظ ﴿ كُنْ ﴾ کہہ دیتے ہیں اور وہ امر وجود میں آ جاتا ہے، ذرا تاخیر نہیں ہوتی۔ کہنے کی دیر ہوتی ہے، اِدھر کہا اُدھر ہوگیا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ﴾ [القمر: ٥٠] یعنی ایک بار کا کہنا کافی ہوتا ہے، دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ پل جھپکنے میں وہ شے موجود ہو جاتی ہے۔

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں کہا ہے کہ کلمے سے پیدا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم عادی اسباب کے واسطے کے بغیر اس کو پیدا کریں گے۔ نہ بعل ہوگا نہ فحل (یعنی مریم علیہا السلام کے کسی مرد کے ساتھ جنسی تعلق کے بغیر) ایک لفظ ﴿ كُنْ ﴾ سے وہ پیدا ہو جائے گا۔ ابو السعود رحمہ اللہ نے سورۃ النساء کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ خلیفہ رشید کے سامنے ایک بڑا نصرانی ڈاکٹر آیا اور اس نے علی بن حسین واقدی رحمہ اللہ سے مناظرہ کیا۔ اس نے کہا: تمھاری کتاب، یعنی قرآن میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ عیسیٰ اللہ کا جزو ہیں، پھر اس نے یہ آیت پڑھی: ﴿ وَكَلِمَتُهٗٓ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ﴾

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٥٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٠) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٥٢)

[النساء: ۱۷۱] ''اور اس کا کلمہ ہی ہے جسے اس نے مریم کی طرف ڈالا، اور وہ اس کی طرف سے ایک روح ہے۔'' واقدی رحمہ اللہ نے کہا: تم نے وہ آیت نہیں پڑھی: ﴿ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ﴾ [الجاثية: ۱۳] ''اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، سب کو اپنے سے تمھارے کام میں لگا دیا۔'' پھر انھوں نے کہا: اس آیت سے تو یہ لازم آتا ہے کہ یہ ساری اشیا اللہ کے اجزا ہوں؟ وہ نصرانی عاجز ہو کر اسلام لے آیا۔ خلیفہ رشید نہایت درجہ خوش ہوئے اور امام واقدی رحمہ اللہ کو ایک خلعتِ فاخرہ سے نوازا۔[1]

اسی طرح ایک بار روم کا ایلچی انگلستان کے بادشاہ کے پاس گیا تو اس کی مجلس میں ایک عیسائی نے اس کو مسلمان دیکھ کر یہ طعن کیا کہ تم کو کچھ خبر ہے کہ تمھارے پیغمبر کی بیوی کو لوگوں نے کیا کہا تھا؟ اس نے جواب دیا: ہاں مجھ کو یہ معلوم ہے کہ اس طرح کی دو بیبیاں تھیں، جن پر زنا کی تہمت لگائی گئی، مگر اتنا فرق ہوا کہ ایک بی بی پر فقط تہمت لگی تھی اور دوسری بی بی ایک بچہ بھی جن لائی تھی۔ وہ نصرانی مبہوت ہو کر رہ گیا۔ یہ جواب دشمن کے الزام کے معارضے (مقابلے) کے طور پر دیا گیا، حقیقت کے مطابق نہیں تھا، کیوں کہ حقیقت میں تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور مریم علیہا السلام دونوں اس عیب سے پاک تھیں۔

مسیح کا مفہوم:

کشاف میں لکھا ہے کہ مسیح ایک اچھا لقب ہے، جو عربی زبان میں مبارک کے معنی میں آتا ہے۔[2] دجال کو مسیح اس لیے کہتے ہیں کہ وہ کانا ہوگا، اس کی ایک آنکھ ممسوح ہوگی، گویا کسی نے مل کر نکال ڈالی یا اس لیے کہ سوائے مکہ و مدینہ اور بیت المقدس کے سارے شہروں میں سیاحت کرے گا۔ عیسیٰ اسمِ عجمی ہے، سرخ و سفید کے معنی میں۔ عربی میں ایشوع ہے، مگر انجیل میں جابجا یشوع آیا ہے، بغیر ہمزہ کے۔ اس آیت میں لقب، نام اور کنیت تینوں کو ذکر فرمایا ہے کہ اس کے بغیر کامل طور پر تمیز نہیں ہوسکتی۔ مقربین میں آسمان کی طرف اٹھائے جانے کا اشارہ ہے۔ ''مھد'' بچے کے بستر کو کہتے ہیں، جہاں وہ رضاعت کے زمانے میں سوتا ہے۔ ''کھل'' ادھیڑ عمر کو کہتے ہیں جو جوانی اور بڑھاپے کے درمیان ہوتی ہے۔

گود میں کلام:

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ چار بچوں نے مہد میں باتیں کی ہیں: عیسیٰ علیہ السلام، شاہد یوسف، صاحبِ جریج اور ابن ماشطۂ فرعون۔[3] امام خفاجی رحمہ اللہ نے کہا: سب گیارہ بچے ہیں، جو مہد میں بولے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ

---

[1] تفسیر أبي السعود (۲/ ۲۵۹) فتح البیان (۲/ ۲۳۵) [2] تفسیر الکشاف (۱/ ۳۹۰)

[3] مستدرك الحاکم (۲/ ۶۵۰) السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (۸۸۰) البتہ عیسیٰ علیہ السلام، صاحبِ جریج اور ایک بچے کا مہد میں بات کرنا، یہ صحیح میں مروی ہے۔ صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۲۵۳) صحیح مسلم (۲۵۵۰)

نے ان کو نظم کیا ہے۔ وہ نظم فتح البیان میں موجود ہے۔[1] مطلب یہ ہوا کہ عیسیٰ صِغر (بچپن) اور کِبر (جوانی) دونوں عہد میں بات کریں گے۔

موضح قرآن میں کہا گیا ہے کہ وہ باتیں عیسیٰ علیہ السلام نے ماں کی گود میں کہیں یا نبی ہو کر کہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ''کہل'' حلیم کے معنی میں ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے مہد میں ایک ساعت بات کی، پھر نہ بولے، یہاں تک کہ بات کرنے کی عمر کو پہنچے۔ وہ بات یہ تھی: ﴿ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ ﴾ [مریم: ٣٠] ''بلاشبہہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے۔'' اسی بات میں اپنی ماں کی براءت بھی ثابت کر دی۔ ابن قتیبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام جب تیس برس کے ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو رسول کیا، تیس مہینے رہے، پھر آسمان پر اٹھا لیے گئے۔ امام وہب رحمہ اللہ نے کہا: تیس برس رہے۔ اس آیت میں مریم علیہا السلام کو یہ بشارت دی گئی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام عمرِ کہولت تک باقی رہیں گے، ایک حال سے دوسرے حال میں تبدیلی ہوگی، اگر عیسیٰ علیہ السلام رب ہوتے تو حال کی یہ تبدیلی کیوں ہوتی؟ اس میں نصاریٰ کا رد ہے۔[3]

قربِ قیامت میں نزولِ عیسیٰ:

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے زمین پر اُتریں گے۔ دوسری آیت میں ان کے اُترنے کو قیامت کی نشانی فرمایا ہے، اب وہ زمانہ قریب معلوم ہوتا ہے کہ ابن مریم نازل ہوں۔ حدیث میں مروی ہے کہ جو کوئی تم میں ان کو پائے، میرا سلام کہے۔[4]

مجھ کو بڑی تمنا ہے کہ اگر میں اس وقت کو پاؤں تو سب سے پہلے میں ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام ان کو پہنچاؤں یا میری اولاد، تاکہ لشکرِ محمدی کا پچھلا آدمی میں ہی ہو جاؤں۔ اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنَا.

پھر اوصافِ عیسوی کو صلاح کی صفت پر ختم کیا، کیوں کہ آدمی صالح اسی وقت ہوتا ہے جب تمام حالات میں اصل اور مکمل ترین دین کے طریقے پر قائم ہو، لہٰذا یہ لفظ دین و دنیا کے تمام مقامات اور انسان کے دلی خیالات اور اعمال کو شامل ہے۔ اسی لیے سلیمان علیہ السلام نے نبوت کے بعد یہ دعا مانگی تھی: ﴿ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ﴾ [النمل: ١٩] ''اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل کر۔'' آیت زیرِ تفسیر میں صلحا سے ابراہیم، اسماعیل، اسحق، یعقوب اور موسیٰ علیہم السلام وغیرہم اور ان کے مثل مراد ہیں۔ کسی نے کہا: ﴿ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴾ سے مراد کمالِ قدرت ہے، یہ اس کی تمثیل ہے، مگر حق یہ ہے کہ لفظ ﴿ كُنْ ﴾ ہی حقیقتاً مراد ہے نہ کہ نری مثال۔ اس تاویل میں ناحق قرآن پاک کی تحریف ہوتی ہے۔

---

[1] فتح البیان (٢/ ٢٣٧) [2] تفسیر الطبري (٦/ ٤١٩) [3] تفسیر الخازن (١/ ٣٤٨، ٣٤٩)

[4] مستدرك الحاكم (٤/ ٥٨٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٣٠٨)

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُوْلًا
اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ
لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا
بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ
وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ
التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ
مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ
فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾

اور اللہ اسے کتاب وحکمت اور تورات وانجیل کی تعلیم دے گا (48) اور اسے بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول مقرر کرے گا (وہ کہے گا:) بے شک میں تمھارے پاس تمھارے رب کی نشانیاں لے کر آیا ہوں، بے شک میں تمھارے لیے گارے سے پرندے کی شکل بناتا ہوں، پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو اللہ کے حکم سے وہ واقعی پرندہ بن جاتا ہے اور میں اللہ کے حکم سے پیدائشی اندھے اور برص والے (کوڑھی) کو اچھا کرتا ہوں اور مُردوں کو زندہ کرتا ہوں اور میں تمھیں بتاتا ہوں جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو، بے شک اس میں تمھارے لیے بہت بڑی نشانی ہے اگر تم مومن ہو (49) اور میں اس کی تصدیق کرتا ہوں جو تورات مجھ سے پہلے (نازل کی گئی) ہے اور تاکہ میں تمھارے لیے بعض وہ چیزیں حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی تھیں اور میں تمھارے پاس تمھارے رب کی نشانی لے کر آیا ہوں، چناں چہ تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (50) بے شک اللہ میرا اور تمھارا رب ہے، چناں چہ اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے (51)

عیسیٰ علیہ السلام کی صفات، معجزات اور دعوت:

موضح قرآن میں لکھا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو تورات اور ہر کتاب بغیر پڑھے آتی تھی، یہ سب معجزے ہوتے تھے۔

ان کے وقت میں تورات کے کئی حکم جو مشکل تھے موقوف ہوئے، باقی وہی تورات کا حکم تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پوری بشارت کو ذکر فرمایا ہے، ظاہر یہ ہے کہ اس جگہ کتاب سے کتابت مراد ہے۔ تورات وہ کتاب ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر اُتری تھی، انجیل وہ کتاب ہے جو عیسیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری۔ عیسیٰ علیہ السلام دونوں کتابوں کے حافظ تھے، بنی اسرائیل میں رسول ہو کر آئے تھے۔ اپنے معجزوں کا پتا بتایا کہ میں یہ کرتا ہوں، وہ کرتا ہوں۔ کہتے ہیں: "اَکْمَہَ" وہ ہے جو دن کو نہ دیکھے، رات کو دیکھے۔ کسی نے اس کے برعکس بھی کہا ہے۔ کسی نے کہا: مراد چندھا (ایسا شخص جس کی آنکھیں روشنی کی تاب نہ لاسکیں) ہے۔ کسی نے کہا: اَعشی (جس کو شام کے وقت نظر نہ آئے) ہے۔ کسی نے کہا: اندھا ہے، یہی قول معجزے کے زیادہ مشابہ ہے، کیوں کہ معجزہ اور چیلنج کے لیے یہی زیادہ بلیغ اور قوی بات ہے۔ اَبرص وہ ہے جس کے بدن پر سفید داغ ہوں، یعنی پھلبہری زدہ۔

معجزے کی تمدن کے ساتھ مطابقت:

بہت سے علما نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو اس کے زمانے کے مناسب معجزے عطا فرمائے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو غالب تھا، جادوگروں کی تعظیم و تکریم کی جاتی تھی، اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وہ معجزہ دے کر بھیجا، جس سے سارے جادوگر دنگ ہو کر رہ گئے، ان کی آنکھیں پتھرا گئیں، عقل حیران رہ گئی، جب یقین ہو گیا کہ یہ تو اللہ جبار عظیم ہی کی طرف سے ہے تو اسلام لے آئے اور نیک بندے بن گئے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں طبیبوں کا بڑا زور شور تھا۔ علمِ طبیعات کے ماہر باوقار تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ معجزے بخشے، جو کسی طبیب و حکیم کے باپ سے بھی نہ ہو سکیں، ہاں اسی سے ہو سکتے ہیں، جس کو اللہ کی تائید حاصل ہو سکے۔ طبیب کی کیا ہستی کہ وہ ساکت و جامد مردہ کو زندہ کر سکے یا اندھے اور برص والے کو شفا بخشے یا جو قیامت تک کے لیے قبر میں گیا ہے، اس کو اٹھا بٹھائے۔ اسی طرح ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بڑے فصیح و بلیغ کلام کہنے والے اور زیرک شعرا مشہور و معروف تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پاس سے ایک ایسی کتاب لائے کہ اگر سارے انسان اور جن جمع ہو کر چاہیں کہ اس کی مثل دس سورتیں یا ایک سورت بلکہ ایک آیت یا ایک جملہ ہی بنا لائیں تو وہ اس کی قدرت اور استطاعت نہیں رکھتے، گو وہ ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ پاک ربِ عز و جل کا کلام کبھی مخلوق کے کلام کے مشابہ نہیں ہو سکتا۔

تورات کے بعض احکام کی منسوخی:

بہر حال آیت زیرِ تفسیر میں اس بات پر دلیل ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے تورات کے بعض احکامات کو منسوخ فرمایا تھا۔ یہی قول صحیح ہے۔ بعض نے کہا: منسوخ تو کچھ بھی نہیں کیا، بعض اشیا جن کے حلال ہونے میں جھگڑا تھا، ان کو حلال کر دیا۔

جس طرح دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ﴾ [الزخرف: ٦٣] [1] فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ کتاب سے مراد لکھنا یا کتبِ الٰہیہ کی قسم ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ کتاب قلم سے لکھنے کو کہتے ہیں۔[2] جناب عیسیٰ علیہ السلام بڑے خوش خط تھے۔ حکمت سے مراد علم ہے یا تہذیبِ اخلاق۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے طویل حدیث میں مروی ہے کہ بنی اسرائیل کے سب سے پہلے نبی موسیٰ علیہ السلام تھے اور ان کے آخری نبی عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔[3]

عیسیٰ علیہ السلام نے صرف چمگادڑ تخلیق کیا:

کہتے ہیں کہ انھوں نے فقط چمگادڑ کو بنایا تھا نہ کہ اور کچھ۔ کیوں کہ چمگادڑ میں عجیب صفت ہے، دانت، داڑھ اور کان رکھتا ہے۔ مادہ کے پستان ہوتے ہیں، حیض آتا ہے۔ حیض سے طہارت حاصل ہوتی ہے۔ بغیر پر کے اڑتا پھرتا ہے، جس طرح جانور جنتے ہیں، یہ بھی جنتا ہے، حالاں کہ پرندہ ہے اور پرندے کے بچے نہیں ہوتے انڈا ہوتا ہے۔ رات دن کسی وقت اس کو دکھائی نہیں دیتا، دو گھڑی کے لیے اس کو نظر آتا ہے، ایک غروبِ آفتاب کے بعد اور دوسرا طلوعِ فجر کے بعد۔ آدمی کی طرح ہنستا ہے۔ یہ جانور ان کی فرمایش سے بنایا تھا۔ جہاں تک ان کی نظر جاتی اُڑتا نظر آیا، جب آنکھ سے غائب ہوتا مر کر گر پڑتا۔ یہ اس لیے کہ اللہ کا کام بندے کے کام سے مختلف اور ممتاز رہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: عیسیٰ علیہ السلام نے فقط ایک چمگادڑ بنایا تھا۔[4] اذن کی قید سے ثابت ہوا کہ اگر اللہ کا حکم نہ ہوتا، وہ ہرگز چمگادڑ نہ بنا سکتے، خالق اللہ ہی تھا، مگر اس خلق کو عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر جاری کیا۔ برابر کرنا اور پھونکنا عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے تھا اور پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔

اندھے اور برص زدہ کو صحت یاب کرنے میں حکمت:

"أکمه" کہتے ہیں: مادر زاد اندھے کو۔ عرب کو جو نفرت برص والے سے تھی، وہ کسی چیز سے نہ تھی، برص کو وضح بھی کہتے ہیں۔ عرب کے بادشاہوں میں ایک شخص وضاح تھا، مگر ڈر کے مارے اسے کوئی ابرص نہ کہتا تھا۔ چاند اور گرگٹ کو اسی سخت سفیدی کی وجہ سے ابرص و سام ابرص بولتے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام بہت سی بیماریوں سے اچھا کر دیتے تھے، جن کا ذکر انجیل میں آیا ہے۔ اس جگہ ان دو بیماریوں کا خاص طور پر اس لیے ذکر کیا ہے کہ غالباً یہ دونوں مرض دوا سے اچھے نہیں ہوتے۔ ایک دن میں ایمان لانے کی شرط پر پچاس ہزار لوگوں کو اچھا کیا۔ اکمہ وابرص کے ساتھ اذن کی قید اس لیے نہیں لگائی کہ پرندوں کو پیدا کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے کی نسبت ان میں زیادہ غرابت (اچھنبا پن) نہیں ہے کہ ان میں اُلوہیت کا گمان ہونے لگے، اس وقت اور بھی طبیب موجود تھے۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٧٦) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٦٥٣) اس کی سند میں "مطر بن میمون" متروک راوی ہے۔
[3] تاریخ دمشق (٢٣/ ٢٧٧، ٢٧٨) [4] الدر المنثور (٢/ ٢١٥)

زندہ کرنا اذنِ الٰہی سے مربوط تھا:

انجیل میں مردوں کو زندہ کرنے کے کئی قصے ذکر ہوئے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے: چار آدمی زندہ کیے: عازر، ابن العجوز، ابنۃ العاشر، سام بن نوح۔ وہ سب باقی رہے، ان کی اولاد ہوئی مگر سام۔[1] کہتے ہیں کہ زندہ کرنے کی دعا یہ تھی: "يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ" اہلِ علم نے اس کو اسمِ اعظم بتایا ہے۔ زندہ کرنے کے ساتھ اذن (اللہ کی اجازت) کی قید اس لیے لگائی ہے کہ کہیں الوہیت کا وہم نہ ہو، کیوں کہ یہ کام آدمی کے کرنے کے کاموں میں سے نہیں ہے۔ اس قید میں نصاریٰ کی تردید کی گئی ہے۔

کھانے اور ذخیرہ کرنے کی خبر دینا اور بعض حرام چیزوں کو حلال کرنا:

کھانے اور ذخیرہ کرنے کی خبر دینے میں نبوتِ عیسیٰ علیہ السلام کی صداقت پر دلیلِ قاطع ہے۔ یہ ان کا ایک بڑا معجزہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے بتانے سے غیب کی خبر دیتے تھے۔ جس کی خبر کسی شخص کے فرشتوں کو بھی نہ ہوتی۔ علمِ نجوم والے اور کاہن جو خبر سناتے ہیں، اس کی بنیاد مقدمات اور قرائن پر ہوتی ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کی اطلاع پر۔ پھر اس میں اکثر بھول چوک اور خطا واقع ہوتی رہتی ہے۔ تورات کی تصدیق اس لیے تھی کہ انبیا یہی کرتے ہیں، ایک دوسرے کو سچا بتاتے ہیں۔ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان ایک ہزار نو سو پچھتر برس گزرے تھے۔ تورات میں چربی اور ہر پنجے والا جانور حرام تھا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَاۤ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَاۤ اَوِ الْحَوَايَاۤ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ۚ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١٤٦] "اور جو لوگ یہودی ہوئے ان پر ہم نے ہر ناخن والا (جانور) حرام کیا تھا، اور گائے اور بکری میں سے ان پر ان کی چربی حرام کی تھی، سوائے اس چربی کے جو ان کی پیٹھوں یا آنتوں کے ساتھ لگی ہو یا ہڈی کے ساتھ ملی ہوئی ہو، یہ سزا ہم نے انھیں ان کی سرکشی کے باعث دی تھی اور بے شک ہم سچے ہیں۔"

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴾ [النساء: ١٦٠] "پھر جو لوگ یہودی ہوئے ان کے ظلم کی وجہ سے اور ان کے، اکثر لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے کی وجہ سے ہم نے ان پر کچھ پاک چیزیں حرام کر دیں، جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں۔" اس قسم کی بعض اشیا کو جو اصل تورات میں حرام نہیں تھیں، ان کے علما نے حرام کر رکھا تھا، عیسیٰ علیہ السلام نے حلال کر دیا۔ جس نے کہا ہے کہ اس جگہ بعض سے مراد کل ہے، اس نے غلط کہا، کیوں کہ لغتِ عرب میں کسی جگہ بعض کل کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی نسبت بہت نرم اور آسان تھی۔ یہ کہنے سے کہ میرا

---

[1] تفسیر البغوي (٢/ ٤٠) تفسير الخازن (١/ ٣٥٠)

اور تمھارا رب وہی ہے، یہ ثابت ہوا کہ سارے رسولوں کا دین ایک ہی تھا۔ کسی نے کبھی توحید کے خلاف نہیں کیا۔ یہ نجران سے آنے والے نصاریٰ کے وفد پر ایک بڑی حجت ہے اور اُن پر بھی جو اُن کی طرح توحید کے قائل نہ ہوں۔[1]

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾

پھر جب عیسیٰ نے ان میں کفر محسوس کیا تو ان سے کہا: اللہ کی راہ میں کون میرا مددگار بنے گا؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے انصار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور تو گواہ رہ کہ ہم فرماں بردار ہیں (52) اے ہمارے رب! ہم اس پر ایمان لائے ہیں جو تو نے نازل کیا اور ہم نے رسول کی پیروی کی ہے، چناں چہ ہمیں گواہی دینے والوں میں لکھ لے (53) اور انھوں نے تدبیر کی اور اللہ نے بھی تدبیر کی اور اللہ سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے (54)

حواریوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدد کرنا:

موضح قرآن میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ یاروں کا خطاب حواری تھا۔ حواری اصل میں دھوبی کو کہتے ہیں، ان میں پہلے جو دو شخص ان کے تابع ہوئے، وہ دھوبی تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا: کپڑے کیا دھوتے ہو، آؤ میں تم کو دل دھونا سکھا دوں، وہ ان کے ساتھ ہوئے، اس طرح سب کا یہی خطاب ٹھہر گیا۔ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے لیے رسول تھے، جب معلوم کیا کہ یہ میرا دین قبول نہیں کریں گے تو چاہا کہ اور کوئی میرے دین کو رواج دے۔ حواریوں کے ہاتھ سے غیروں کو دین پہنچا، اب تک بنی اسرائیل ان کے دین میں کم ہیں۔ یہودی عالموں نے اس وقت کے بادشاہ کو بہکایا کہ یہ شخص ملحد ہے، تورات کے حکم کے خلاف بتاتا ہے۔ اس نے لوگ بھیجے کہ ان کو پکڑ لائیں، جب وہ پہنچے، عیسیٰ علیہ السلام کے دوست سرک گئے، اس شتابی میں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اُٹھا لیا اور ان کا ایک ہم شکل رہ گیا، اسی کو پکڑ لائے، پھر اس کو سولی پر چڑھا دیا۔ اللہ پاک نے اس آیتِ مقدس میں یہ خبر دی ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نے اچھی طرح سے یہ معلوم کر لیا کہ انھوں نے کفر اور گمراہی پر ہمیشہ جمے رہنے کا پکا ارادہ کر لیا ہے، تب انصار کی طرف متوجہ ہو کر انھیں دعوت دینی شروع کی۔ مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿ اَنْصَارِيْٓ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ کون میرا تابع ہوتا ہے؟ امام ثوری رحمہ اللہ نے کہا: کون میرا مددگار ہے اللہ کے ساتھ۔[2]

[1] فتح البيان (٢/ ٢٣٩_ ٢٤٣)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٥٩)

انصارِ رسول اور انصارِ عیسیٰ میں مماثلت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ مجاہد رحمہ اللہ کا قول حق کے زیادہ قریب ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ مراد اس سے یہ ہے کہ کون دعوت الی اللہ میں میرا مددگار ہے؟ جس طرح ہمارے نبی اکرم ﷺ ہجرت سے پہلے حج کے موسموں میں فرمایا کرتے تھے کہ کون آدمی مجھے جگہ دیتا ہے کہ میں اپنے رب کا کلام پہنچا دوں، کیوں کہ قریش نے مجھ کو کلامِ رب کی تبلیغ سے روک رکھا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انصار دیے، انھوں نے آپ کو جگہ دی، آپ ﷺ کی مدد کی، نبی اکرم ﷺ ہجرت کر کے ان کے پاس جا رہے، انھوں نے آپ کو ہر کالے گورے سے بچایا، کسی کو ستانے نہ دیا۔ رضي الله عنهم و أرضاهم۔ یہی حال عیسیٰ علیہ السلام کا ہوا تھا کہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ اُن پر ایمان لے آیا تھا، ان کا ناصر بنا تھا اور جو نور اللہ تعالیٰ نے ان پر اُتارا تھا، اس کا تابع ہوگیا تھا۔

حواری کی تفسیر اور رسول اللہ ﷺ کا حواری:

کہتے ہیں کہ حواری دھوبی تھے۔ بعض نے کہا: سفید پوش تھے۔ کسی نے کہا: شکاری تھے۔ صحیح یہ ہے کہ حواری ناصر کے معنی میں ہے، جس طرح صحیحین میں مروی ہے کہ احزاب کے دن نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو بلایا تو زبیر رضی اللہ عنہ آئے، پھر بلایا تو زبیر رضی اللہ عنہ آئے، اس پر فرمایا کہ ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے، یعنی خالص دوست، سچا مددگار، میرا حواری زبیر ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: شاہدین (گواہی دینے والے) سے مراد اُمتِ محمد ﷺ ہے۔ اس کو ابن ابی حاتم نے باسنادِ جید روایت کیا ہے۔[2]

یہود کی سازش اور اللہ کا جواب:

پھر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ارادۂ فاسدہ کا ذکر کیا کہ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنا چاہا تھا۔ اس وقت کا بادشاہ کافر تھا، اس کو بہکایا کہ یہاں ایک آدمی لوگوں کو بادشاہ کی اطاعت سے روکتا ہے، راہ سے گمراہ کرتا ہے، رعایا میں فساد ڈالنا چاہتا ہے، باپ بیٹوں میں تفرقہ کراتا ہے، اسی طرح اور بہت جھوٹ اور بہتان باندھ کر بادشاہ کو اس تک پہنچایا۔ وہ مردود بدذات اور زنا کی اولاد تھا، سنتے ہی آگ بگولا ہوگیا، غصے کے مارے بھڑک اُٹھا، آدمی دوڑائے کہ ابھی پکڑ لاؤ، سولی پر چڑھا دو۔ جب آ کر گھر گھیر لیا، سمجھے کہ مطلب حاصل ہوا، اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اس گھر کے روشندان کے سوراخ سے آسمان پر اُٹھا لیا، ایک آدمی کو جو اس گھر میں تھا، مسیح کی شکل کا بنا دیا، وہ لوگ رات کو گھر میں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٩٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤١٥)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٦٠)

گھسے اور سمجھے کہ عیسیٰ یہی ہیں، اس غریب کو پکڑ لائے، خوب ذلیل کیا، دار پر کھینچا اور سر پر کانٹے رکھے۔ اللہ تعالیٰ کا مکر (تدبیر) یہ تھا کہ ان کو دھوکا لگ گیا، عیسیٰ علیہ السلام ان کے بیچ میں سے صاف نکل گئے اور آسمان پر چلے گئے، وہ اپنی گمراہی میں اندھوں کی طرح پھنسے رہ گئے، ان کو یہی گمان ہے کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دیدیا۔ یہ سختی اور حق کی دشمنی ان کے دل میں ایسی بس گئی ہے کہ قیامت تک ان کے دل سے دور نہ ہوگی، ہمیشہ ذلیل و خوار رہیں گے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دیکھو ہمارا مکر (تدبیر) اچھا ہے۔[1]

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ احساس ﴿ اَحَسَّ ﴾ سے مراد ہے کہ انھیں یقینی طور پر معلوم ہو گیا۔ کفر سے مراد کلمۂ کفر ہے، جس کو اپنے کانوں سے سنا تھا یا ارادۂ قتل جو کفر کی طرح تھا۔

لو حضرتِ دل اور سنو تازہ خبر ہوتا ہے وہاں مشورۂ قتل ہمارا

جن یہودیوں نے ان کے قتل کا ارادہ کر کے انھیں قتل کرنا چاہا، وہ تورات سے جان چکے تھے کہ جس مسیح کی خبر اس کتاب میں دی گئی ہے، وہ یہی عیسیٰ بن مریم علیہما السلام ہیں، وہ ان کے بعض دین کو منسوخ کریں گے۔ لہٰذا جب عیسیٰ علیہ السلام ظاہر ہوئے اور دعوت دی تو کافر اور منکر بن کر ان کو تکلیف دینے لگے اور ان کے قتل کے درپے ہوئے۔ ماں بیٹے دونوں کو اپنے شہر سے نکال دیا، وہ زمین میں سیاحت کرتے۔ ﴿ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ﴾ کہتے پھرتے۔ اس پر بیچارے حواریوں نے ساتھ دیا، سب سے پہلے وہ ہی بارہ آدمی ان پر ایمان لائے۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: اللہ تعالیٰ کا مکر یہ ہے کہ مکاروں کو ان کے مکر پر سزا دیتا ہے۔[2] جزا کا نام مکر رکھ دیا، یہاں دھوکا اور فریب اور اختیال (گھمنڈ) کے معنی مراد نہیں ہیں یا اس مکر سے مراد کسی اور پر عیسیٰ علیہ السلام کا شبہہ ڈال دینا ہے اور ان کو آسمان پر اُٹھا لینا ہے۔ سدی رحمہ اللہ نے کہا کہ بنی اسرائیل نے ایک گھر میں عیسیٰ علیہ السلام کا انیس حواریوں کے ساتھ محاصرہ کر لیا تھا، اس وقت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا: کون شخص میری شکل و صورت قبول کرتا ہے، اس کو جنت ملے گی، ایک شخص نے وہ صورت لے لی۔ عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر چلے گئے۔[3] اس پر اللہ نے فرمایا: ہمارا مکر بہتر ہے کہ تم نے جس کو ضرر پہنچانا چاہا تھا، تم کو اس پر قدرت نہ ملی، بلکہ تمھارا مکر تمھی پر پلٹ پڑا۔[4]

---

[1] تفسیر ابن كثير (١/ ٤٧٧)
[2] معاني القرآن (١/ ٤١٩)
[3] تفسير الطبري (٦/ ٤٥٤)
[4] فتح البيان (٢/ ٢٤٣_ ٢٤٥)

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ
الْقِيٰمَةِ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ
تَخْتَلِفُوْنَ ﴿٥٥﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿٥٦﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٥٧﴾ ذٰلِكَ
نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿٥٨﴾

جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰ! بے شک میں تجھے پورا لے لوں گا اور اپنی طرف اُٹھا لوں گا اور ان کافروں سے تجھے پاک کر دوں گا، اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی، انھیں کافروں پر قیامت تک غالب رکھوں گا، پھر تمھیں میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے اور میں تمھارے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کر دوں گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے (55) پھر جن لوگوں نے کفر کیا، انھیں میں دنیا اور آخرت میں سخت عذاب دوں گا اور ان کے لیے کوئی مدد گار نہ ہوگا (56) لیکن جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے تو اللہ انھیں ان کا پورا پورا اجر دے گا اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا (57) (اے نبی!) یہ جو ہم آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں، آیتیں ہیں اور حکمت والی نصیحت ہے (58)

عیسیٰ علیہ السلام کو فوت کرنے اور اُٹھانے کی تفسیر:

موضح قرآن میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے پہلے تابع فرمان نصاریٰ تھے، پھر مسلمان ہیں، سو وہ ہمیشہ غالب رہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: مفسرین کا اس بات میں اختلاف ہے کہ ﴿اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ﴾ (آیت زیر تفسیر) سے کیا مراد ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اس میں تقدیم و تاخیر ہے، یعنی پہلی بات کو بعد میں اور بعد والی بات کو پہلے بیان کیا گیا ہے۔ اصل عبارت یوں ہے: "إِنِّي رَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُتَوَفِّيكَ" یعنی پہلے رفع ہے، پھر وفات۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: متوفی کے معنی ہیں: "مُمِيتُ"[2] (مارنے والا)۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو پہلے دن کی تین ساعت میں وفات دی، جس وقت کہ ان کو اپنی طرف اُٹھا لیا۔

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٦٦١) [2] تفسیر الطبري (٦/ ٤٥٧) تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٦٦١) اس کی سند حسن ہے۔

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: نصاریٰ کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ سات ساعت مرے رہے، پھر زندہ ہو گئے۔[1] وہب کا دوسرا قول یہ ہے کہ تین دن مرے رہے، پھر اُٹھے پھر مرفوع ہو گئے۔[2] مطر وراق رحمہ اللہ نے کہا: مراد دنیا کی وفات ہے نہ کہ موت کی وفات۔[3] ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: توفی سے مراد رفع ہے۔[4]

اکثر اہلِ علم کا قول یہ ہے کہ اس جگہ وفات سے مراد نیند ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰۤى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ [الأنعام: ٦٠] ”اور وہی ہے (اللہ) جو رات کو تمھیں فوت کرتا ہے، اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم دن میں کرتے ہو، پھر اس (دوسرے دن) میں تمھیں اُٹھاتا ہے، تاکہ (زندگی کی) مقررہ مدت پوری کی جائے، پھر اسی کی طرف تمھاری واپسی ہے، پھر وہ تمھیں بتا دے گا جو تم کرتے رہے ہو۔“ نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ ﴾ [الزمر: ٤٢] ”اللہ ہی موت کے وقت جانیں قبض کرتا ہے اور جس کی موت نہیں آئی ہوتی، اسے اس کی نیند میں (قبض کرتا ہے) پھر وہ اس (روح) کو روک لیتا ہے جس پر اس نے موت کا فیصلہ کر دیا ہو اور دوسری کو ایک مقرر وقت تک (واپس) بھیج دیتا ہے، بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔“

ہمارے نبی اکرم ﷺ جب سو کر اُٹھتے تو کہتے: «اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا»[5] ”اس اللہ کی تعریفیں ہیں، جس نے ہمیں موت دینے کے بعد زندہ کیا۔“ نوم (نیند) کو برادرِ مرگ (موت کا بھائی) کہتے ہیں۔ سونا جاگنا گویا مرنا جینا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۝ ﴾ [النساء: ١٥٦۔ ١٥٩] ”اور (ہم نے ان پر لعنت کی) ان کے کفر کی وجہ سے، اور مریم پر بہت بڑا بہتان لگانے کی وجہ سے۔ اور ان کے یہ کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم اللہ کے رسول کو قتل کیا، حالاں کہ انھوں نے نہ انھیں قتل کیا اور نہ انھیں سولی پر چڑھایا، بلکہ انھیں شبہے میں ڈال دیا گیا۔ اور بے شک جنھوں نے عیسیٰ کے بارے میں اختلاف کیا، وہ ضرور ان کے متعلق شک میں ہیں۔ ان لوگوں کے پاس ان کے بارے میں کوئی علم نہیں سوائے گمان کی پیروی کے، اور

---

[1] تفسير الطبري (٦/ ٤٥٧۔ ٤٥٨) [2] تاريخ دمشق (٤٧/ ٤٧٠) [3] تفسير الطبري (٦/ ٤٥٦)
[4] تفسير الطبري (٦/ ٤٥٨) [5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧١١)

انھوں نے یقیناً انھیں قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے انھیں اپنی طرف اُٹھا لیا اور اللہ بڑا زبردست، بہت حکمت والا ہے۔ اور اہلِ کتاب میں سے کوئی بھی ایسا نہ بچے گا جو عیسیٰ پر ان کی موت سے پہلے ایمان نہ لے آئے، اور قیامت کے دن وہ ان سب پر گواہ ہوں گے۔''

اس میں ﴿ قَبْلَ مَوْتِهٖ ﴾ [النساء: ۱۵۹] کی ضمیر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف لوٹتی ہے۔ یعنی اہلِ کتاب میں سے ہر شخص عیسیٰ پر ایمان لائے گا، یہ اس وقت ہوگا جب وہ قیامت سے پہلے زمین پر اُتر آئیں گے، اس وقت سارے اہلِ کتاب ان پر ایمان لے آئیں گے، کیوں کہ وہ جزیہ دینا موقوف کر دیں گے، سوائے اسلام کے کچھ منظور نہ کریں گے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وفات سے مراد نیند ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو نیند میں اُٹھا لیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں سے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام فوت نہیں ہوئے، وہ قیامت سے پہلے تمھارے پاس پھر آئیں گے۔[1]

عیسائیوں کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق نظریات:

تطہیر کا مطلب یہ ہے کہ تم کو جب اُٹھا لوں گا تو تم کافروں کے ہاتھ سے بچ جاؤ گے۔ پھر یہ فرمایا کہ تمھارے فرماں بردار قیامت تک کافروں پر فائق رہیں گے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جیسا اللہ تعالیٰ نے کہا، ویسا ہی ہوا، جب مسیح علیہ السلام آسمان پر اُٹھ گئے، ان کے اصحاب متفرق ہو کر کئی گروہ بن گئے۔ بعض نے کہا: وہ اللہ کے بندے اور رسول تھے، اللہ کی لونڈی کے بیٹے تھے۔ بعض نے غلو کیا اور کہا: اللہ کے بیٹے تھے۔ بعض نے کہا: خود اللہ ہی تھے۔ کسی نے کہا: تین الٰہوں میں سے ایک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی بات کو قرآن میں نقل کر کے ہر ایک فریق کا رد کیا۔

مسیحیت میں تحریف کرنے اور اس کو پھیلانے میں قسطنطین کا کردار:

الغرض وہ تین سو برس تک ایسے تفرقے پر جمے رہے، پھر یونان سے ایک بادشاہ اُٹھا، جس کو قسطنطین کہتے تھے، وہ نصرانی ہوگیا۔ کہتے ہیں: اس نے یہ حیلہ کیا، تاکہ دینِ نصاریٰ کو بگاڑے، ورنہ وہ تو فیلسوف تھا۔ بعض نے کہا: جہل سے عیسائی ہو گیا۔ کچھ ہو اس نے دینِ مسیح کو بدل دیا، کچھ بڑھایا، کچھ گھٹایا، قوانین نکالے، تھوڑی خیانت کی۔ اسی کے زمانے میں گوشت خون حلال ہوا۔ مشرق کی طرف نماز پڑھی گئی۔ کنیسے، عبادت گاہیں اور صوامع بنائے گئے، دس روزے کسی گناہ کی وجہ سے زیادہ کر دیے۔ دینِ مسیح دینِ قسطنطین ٹھہرا۔ اس نے نصاریٰ کے لیے بارہ ہزار گرجا گھروں سے زیادہ کنیسے، عبادت گاہیں اور صوامع بنائے۔ اپنے نام کا شہر بسایا، سرداروں کا گروہ اس کے تابع ہوگیا۔ یہودیوں پر غالب آیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر اس کی مدد کی، اس لیے کہ وہ حق کے زیادہ قریب تھا، اگرچہ سب کے سب کافر تھے۔ علیهم لعائن الله.

---

[1] تفسیر الطبري (٦/ ٤٥٥) یہ روایت مرسل ہے۔ البتہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ آنا دیگر دلائل سے ثابت ہے۔

غلبۂ اسلام:

جب ہمارے نبی ﷺ مبعوث ہوئے، جو ان پر ایمان لایا، وہ اللہ، ملائکہ، کتب اور رسولوں سب پر ان کے حق ہونے کی وجہ سے ایمان لایا۔ اس راہ سے وہ ہر نبی کے تابع ہیں، جو زمین پر ہوا، کیوں کہ انھوں نے رسول، نبی امی عربی، خاتم الرسل سید ولد آدم علی الاطلاق کی تصدیق کی۔ نبیِ کریم ﷺ نے ان کو تمام رسل و انبیا کی تصدیق کی طرف بلایا، اس لیے وہ ہر نبی کے زیادہ ماننے والے ٹھہرے، بہ نسبت اس نبی کی اُمت کے کہ جو اپنے آپ کو اس نبی کی ملت وطریقے پر خیال کرتے، حالاں کہ انھوں نے اس دین میں تبدیلی اور تحریف کر ڈالی ہے۔ پھر اگر یہ بات بھی نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوں کی شریعتوں کو دینِ محمد ﷺ سے، جو قیامت تک تبدیل نہ ہوگا، منسوخ کر دیا ہے۔ یہ دین ہمیشہ منصور اور ہر دین پر غالب رہے گا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے زمین کے مشارق و مغارب (چاروں اطراف) کو اصحابِ نبوی ﷺ پر مفتوح کر دیا، انھوں نے تمام ممالک کو لے لیا، تمام ملتوں اور وادیوں پر قبضہ کر لیا۔ کسریٰ کو توڑ ڈالا، قیصر کو ذلیل کر دیا، ان کے تمام خزانے چھین لیے اور اللہ کی راہ میں خرچ کر دیے۔

جس طرح نبی اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر دی تھی: ﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۚ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ۚ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴾ [النور: ۵۵] ”جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین میں ضرور خلافت دے گا، جیسے اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت دی تھی، اور ان کے لیے ضرور ان کا وہ دین محکم و پائیدار کر دے گا جو اس نے ان کے لیے چنا اور یقیناً ان کی حالتِ خوف کو بدل کر وہ ضرور انھیں امن دے گا، وہ میری عبادت کریں گے، میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، اور جو کوئی اس کے بعد کفر کرے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔“ یہ اس لیے ہوا کہ مسیح علیہ السلام پر سچے ایمان لانے والے یہی لوگ تھے، انھوں نے نصاریٰ کے شہروں ملکِ شام کو اُن کے ہاتھ سے چھین کر اُن کو روم اور قسطنطنیہ کے شہر کی طرف نکال دیا۔ اسلام اور اہلِ اسلام قیامت تک ان پر غالب رہیں گے۔

صادق و مصدوق ﷺ نے اپنی اُمت کو یہ خبر دی تھی کہ اس اُمت کے لوگ جو بعد میں آئیں گے، وہ قسطنطنیہ فتح کر لیں گے اور وہاں کے سارے مال ان کے ہاتھ آئیں گے۔ روم سے ایک ایسی سخت لڑائی ہوگی کہ اس جیسی لڑائی نہ کسی نے دیکھی ہے نہ پھر دیکھے گا۔ میں نے اس سلسلے میں ایک جزو مفرد جمع کیا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہم تیرے پیروکاروں کو کافروں پر غالب کر دیں گے قیامت تک کے لیے، پھر جب وہ ہمارے پاس لوٹ کر آئیں گے تو ہم ان کے اختلاف کا فیصلہ کر دیں گے، کافروں کو دنیا اور آخرت میں عذاب کریں گے۔

منکرین یا غلو پسندوں کا انجام:

چنانچہ جو یہودی مسیح علیہ السلام کے منکر تھے یا ان کے حق میں غالی (حد سے بڑھنے والے) تھے، جو نصاریٰ مسیح علیہ السلام کو اللہ کہتے تھے یا ابن اللہ، وہ دنیا میں مارے گئے، قید ہوئے، ان کا مال لے لیا گیا، ان کا ملکوں پر سے قبضہ اُٹھ گیا، آخرت میں ان کو اس سے بھی زیادہ اور سخت عذاب ہوگا اور جو لوگ مومن صالح ہیں، ان کو دنیا اور آخرت میں پورا اجر دیں گے۔ دنیا میں مدد اور کامیابی ملے گی، آخرت میں ان کے لیے بلند باغات ہیں، اللہ ظالموں کو نہیں چاہتا۔

عیسیٰ علیہ السلام کی پیدایش کا واقعہ سچا ہے:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبی! ہم نے تم کو عیسیٰ علیہ السلام کی پیدایش اور ان کی کیفیت کا جو قصہ سنایا، یہ ہم نے لوحِ محفوظ سے تم پر نازل کیا ہے، اس میں کسی طرح کا شک وشبہہ نہیں ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے سورت مریم میں فرمایا: ﴿ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝﴾ [مریم: ۳٤۔ ۳۵] ''یہ ہے عیسیٰ ابن مریم، (یہی ہے) حق کی بات جس میں وہ لوگ شک کرتے ہیں۔ اللہ کے لائق ہی نہیں کہ وہ کوئی بھی اولاد بنائے، وہ پاک ہے، جب وہ کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کے لیے بس یہی کہتا ہے کہ ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔''[1]

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں لکھا ہے کہ آیت زیرِ تفسیر میں تقدیم و تاخیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے رفع پھر تطہیر پھر آسمان سے اترنے کے بعد وفات ہوگی۔ ابو زید رحمہ اللہ نے کہا: متوفی کے معنی قابض ہیں۔[2] کشاف میں کہا ہے: یعنی ہم تمھاری مدت پوری کریں گے، تم ان کے ہاتھ سے مارے نہیں جاؤ گے، اپنی موت سے معینہ مدت پر وفات پاؤ گے۔[3] مطر وراق رحمہ اللہ نے کہا: ہم دنیا سے تم کو وفات دیں گے، یہ وفات کچھ موت نہیں ہے۔[4] مفسرین کو اس تاویل کی اس لیے ضرورت پیش آئی کہ ان کا آسمان پر اُٹھایا جانا بغیر وفات کے ثابت ہے۔ اسی کو اکثر مفسرین نے قابلِ ترجیح کہا ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار فرمایا ہے[5] کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں ان کا اترنا اور دجال کو مارنا ثابت ہے۔[6]

یہ قول کہ وہ تین گھڑی فوت رہے، ضعیف ہے۔ اکثر اہلِ تفسیر نے اس جگہ وفات کو نیند سمجھا ہے۔ جب واؤ جمع کے لیے ٹھہرا، ترتیب کے لیے نہیں تو تقدیم و تاخیر کی کچھ ضرورت نہیں رہتی۔ ابوبکر واسطی رحمہ اللہ کا یہ قول کہ ہم تم کو شہوات اور حظوظِ نفس سے جدا کر دیں گے، تمھارا جی ان سے مر جائے گا،[7] تفسیر نہیں، بلکہ تحریف ہے۔ ابن المسیب رحمہ اللہ

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ٤۷۸۔ ٤۷۹) [2] فتح القدیر (۱/ ۵٦۹۔ ۵۷۰) [3] تفسیر الکشاف (۱/ ۳۹٤)
[4] تفسیر الطبري (٦/ ٤۵٦) [5] تفسیر الطبري (٦/ ٤۵۸) [6] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۹۳۷)
[7] تفسیر الخازن (۱/ ۳۵٦)

نے کہا: عیسیٰ علیہ السلام کو جب آسمان کی طرف اُٹھایا گیا، اس وقت اُن کی عمر تینتیس برس تھی،[1] بیت المقدس سے ماہِ رمضان کی شبِ قدر کو دنیا سے اُٹھا لیے گئے۔ مریم علیہا السلام تیرہ برس کی تھیں کہ وہ پیٹ میں رہے تھے۔ بابل کی سرزمین پر سکندر کے قبضے کو پینسٹھ برس گزرے تھے۔ مریم مسیح علیہ السلام کے اٹھائے جانے کے بعد چھے سال زندہ رہیں۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ نے "زاد المعاد" میں لکھا ہے کہ کوئی متصل اصل دلیل، جس کی طرف رجوع کرنا لازمی ہو، اس بارے میں نہیں آئی کہ رفع کے وقت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر تینتیس سال تھی،[2] بلکہ ہر نبی چالیس سال کی عمر میں رسالت سے سرفراز ہوتا ہے، کیوں کہ کمال کو پہنچنے کا سال اور رسولوں کو رسالت عطا ہونے کا سال وہی ہوتا ہے، پھر اس حکم کا اطلاق تمام انبیا پر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو بھی شامل ہے۔ یہی بات صحیح ہے۔ امام شامی رحمہ اللہ نے کہا: ابن القیم رحمہ اللہ کا قول صحیح ہے۔ وہ روایت نصاریٰ کی ہے۔ احادیثِ نبویہ میں ان کا ایک سو بیس سال کی عمر میں اُٹھایا جانا آیا ہے۔[3] امام زرقانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام سیوطی رحمہ اللہ نے تکملہ تفسیر محلی اور شرح نقایہ وغیرہ کتب میں اس بات کا پختہ اظہار کیا ہے کہ رفع عیسیٰ علیہ السلام تینتیس (۳۳) سال کی عمر میں ہوا تھا اور وہ نزول کے بعد سات سال ٹھہریں گے۔ مجھ کو تعجب تھا کہ باوجود حفظ و اتقان کے انھوں نے یہ کیسی بات لکھی ہے؟! وہ تو جامع منقول و معقول تھے، لیکن پھر میں نے "مرقاۃ الصعود" میں دیکھا ہے کہ انھوں نے اس قول سے رجوع کر لیا ہے۔

تطہیر سے مراد ہے اہلِ کفر کی ناپاک صحبت سے الگ کر دیا اور آسمان پر بلا لیا۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: یہود و نصاریٰ، مجوس اور کفار کی قوم سے علاحدہ کر دیا،[4] کیوں کہ ان کا ان کے درمیان رہنا ایسا تھا جیسے نجس ہو جانا۔ تابعین عیسیٰ علیہ السلام سے وہ لوگ مراد ہیں جو اُن کے اصحابِ خاص تھے، جنھوں نے ان کے حق میں غلو نہیں کیا تھا، ان کو اللہ یا اللہ کا بیٹا نہیں بنایا تھا، انھی میں سے مسلمان لوگ بھی ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے ہیں۔ وصفِ عیسوی میں غلو نہیں کرتے، جس طرح نصاریٰ نے کیا، نہ ان کے اوصاف میں کچھ کمی کرتے ہیں، جس طرح یہود نے کی۔ اکثر اہلِ علم کا مذہب یہی ہے۔ بعض نے کہا: مراد یہ ہے کہ نصاریٰ ہمیشہ یہودیوں پر غالب رہیں گے۔

اس صورت میں کفار سے خاص یہودی مقصود ٹھہرتے ہیں۔ کسی نے کہا: مراد اہلِ روم ہیں۔ یہ ہمیشہ کفار مخالفین پر غالب رہیں گے۔ کسی نے کہا: مراد حواری ہیں، جو مسیح کے منکرین پر غالب رہیں گے۔ کسی نے کہا: مسلمان و نصاریٰ ہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نصاریٰ کا کفار کے ایک گروہ یا سارے کفار پر غلبہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ وہ مسلمین کی جماعتوں کے مقہور و مغلوب ہوں، جس طرح آیاتِ کثیرہ سے یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ ملتِ اسلامیہ

---

[1] مستدرك الحاكم (٣/ ٣٠٢) [2] زاد المعاد (١/ ٨٤)

[3] اس سلسلے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "واختلف في عمره حين رفع، فقيل: ابن ثلاث و ثلاثين. وقيل: مائة وعشرين" (فتح الباري: ٦/ ٤٩٣) [4] تفسير الطبري (٦/ ٤٦١۔ ٤٦٢)

ساری ملتوں پر ہمیشہ غالب رہے گی اور سب پر قاہر اور بلند ہوگی۔ اس بارے میں امام شوکانی رحمہ اللہ نے ایک مستقل رسالہ ”وبل الغمامه في تفسير: و جاعل الذين اتبعوك فوق الذين كفروا إلى يوم القيامة“ لکھا ہے۔[1]

عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کی فوقیت:

حاصل یہ ہے کہ صیغہ ﴿الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ﴾ عام ہے، اسی طرح صیغہ ﴿الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا﴾ بھی عام ہے، ہم پر یہ واجب ہے کہ جو بات دلیل کے ساتھ نظمِ قرآن کے مطابق ہو، اس پر عمل کریں اور جب کوئی معاملہ اس طرح کا ہو کہ اس کی تخصیص یا تقیید یا ظاہری معانی سے ہٹ کر عمل کرنا ضروری ہو تو اس پر عمل کرنے کو بھی واجب سمجھیں اور اگر ایسا ضروری نہ ہو تو اس کے عموم (ظاہری معنوں) پر قائم رہیں۔ سو اس آیتِ کریمہ کا ظاہر ہر متبع کو شامل ہے، یعنی ان کے سب تابع کافروں پر غالب رہیں گے، خواہ وہ اتباع بطورِ حجت کے ہو یا بوسیلہ سیف یا دونوں طرح پر، اور خواہ وہ اتباع سارے دین میں ہو یا دین کے بعض حصے میں اور سب زمانوں، جگہوں اور حالات میں ہو یا بعض میں۔

اسی طرح کافر جس پر متبع غالب رہے گا، اس سے مراد ہر کافر ہے، خواہ وہ کفر اس طرح ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو پہچان کر چھپایا ہو یا مکر کیا ہو یا دین کی مخالفت یوں برتی ہو کہ کسی دین پر بھی نہ ہو، جیسے بُت پرست، آتش پرست، آفتاب پرست، ماہتاب پرست یا اللہ کے یا اس کی نازل کردہ شریعت کے منکر یا عیسیٰ علیہ السلام کے دین کے مخالف یا کسی اور دین کو خاتم الانبیاء کے مبعوث ہونے سے پہلے اختیار کیا ہو، جس طرح سارے یہودیوں اور کفریہ ملتوں کا حال ہے۔ غرض کہ عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین وہ ان وجوہ میں سے کسی وجہ ہی سے متبعین کیوں نہ ہوں، وہ ہر کافر پر، جس کا کفر مذکورہ اقسام میں سے کسی قسم کا ہو، غالب ٹھہرائے گئے ہیں۔

پھر ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو اب اس بات میں کوئی شک باقی نہیں رہا کہ متبعینِ عیسیٰ علیہ السلام یہی سب مسلمان لوگ ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کیا ہے اور ان کے وجودِ بابرکت کی بشارت دی ہے، جس طرح قرآنِ کریم اور انجیلِ مقدس میں وہ بشارت آچکی ہے، بلکہ انجیل میں یہ حکم ہے کہ متبعینِ عیسیٰ علیہ السلام کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنی چاہیے۔ اس لیے متبعینِ عیسیٰ علیہ السلام امرِ دین میں مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد یہی اہلِ اسلام ہیں اور جو کوئی بعثتِ محمدیہ کے بعد نصرانی رہ گیا ہے، وہ اگرچہ امرِ دین میں متبعِ عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہے، مگر صورت، نام اور جزئیات شریعتِ عیسویہ میں متبع ہے۔ اس پر یہ بات صادق آتی ہے کہ وہ صورت اور شریعتِ عیسوی کے بعض حصوں میں متبعِ عیسیٰ ہے، اگرچہ گمراہی اور کفر کے وبال میں پھنسا ہوا ہے۔ اس لیے ایسے لوگ قرآن پاک کے عموم سے باہر نہیں نکل سکتے نہ ان کا اس عموم کے نیچے اندراج ضروری ہے، بلکہ وہ آخرت میں ہلاک ہونے والے ہوں گے،

[1] فتح القدير (١/ ٥٧٠)

اگر چہ یہاں کافروں پر فائق ہوں، کیوں کہ یہ فوقیت اسی گھر (دنیا) میں ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے بعد یہ فرمایا ہے کہ پھر تمھارا لوٹ کر آنا ہماری طرف ہے، ہم تمھارے اختلاف کا فیصلہ کر دیں گے، ہم کوئی ظالم مجبور نہیں۔

خلاصہ کلام:

خلاصہ مدعا یہ ٹھہرا کہ اَتباعِ عیسیٰ علیہ السلام اہلِ کفر پر فائق ہیں۔ نبوتِ محمدیہ سے پہلے ان سے مراد حواریین اور نصاریٰ ہیں، پھر خاتم الانبیاء کی بعثت کے بعد مسلمان اور نصاریٰ اور حواریین سچے حقیقی متبع، وہی اگلی قسم کے لوگ ہیں، باقی نہ صورت میں متبع ہیں نہ سیرت میں، مگر اللہ تعالیٰ نے سب کو سارے کفار پر، وہ یہود ہوں یا کافروں کے دیگر گروہ، فائق ٹھہرا دیا ہے۔ چناں چہ حقیقت میں ایسے ہی ہوا ہے کہ بعثتِ محمدیہ سے پہلے ملتِ نصرانیہ کفر کی تمام ملتوں پر قاہر اور غالب تھی۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو کافروں کی تمام اُمتیں ملتِ اسلامیہ اور ملتِ نصرانیہ کے درمیان لٹ پٹ گئیں۔ کوئی قتل ہوئے، کوئی قیدی اور کوئی مسلمان۔ جس کو دنیا کی خبروں کا علم ہے، وہ اس حال سے بہ خوبی واقف ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ملتِ اسلامیہ کو ملتِ نصرانیہ پر غالب کر دیا۔

اپنی کتابِ عزیز میں ان سے جو وعدہ فرمایا تھا، اسے پورا کیا، جس طرح قرآن میں جا بجا آیا ہے کہ لشکرِ اسلام غالب ہوگا، اسلام کا گروہ منصور ہوگا۔ اسی میں سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ﴾ [الصف: ١٤] ”تو ہم نے ان لوگوں کو، جو ایمان لائے، ان کے دشمنوں پر قوت دی تو وہ غالب آ گئے۔“ اور یہ فرمان ہے: ﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [المنافقون: ٨] ”اور عزت اللہ ہی کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے، اور مومنوں کے لیے، لیکن منافق (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔“ اور یہ فرمان: ﴿ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴾ [النساء: ١٤١] ”اور اللہ کافروں کو مومنوں کے خلاف ہرگز کوئی راستہ نہیں دے گا۔“ اُدھر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی، اِدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میری اُمت ساری امتوں پر ظاہر اور غالب ہو جائے گی۔“[1]

غرض کہ ملتِ اسلامیہ اور نصرانیہ میں غور کرنے سے یہ بات بہ خوبی ثابت ہوتی ہے کہ کتاب وسنت ملتِ نصرانیہ پر ملتِ اسلامیہ کے غلبے کی دلیل ہیں اور جب باقی تمام ملتوں کو دیکھتے ہیں تو اسی آیت زیرِ تفسیر کی دلیل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اہلِ ملتِ اسلامیہ وملتِ نصرانیہ تمام کفریہ ملتوں پر فائق ہیں۔ مفسرین کی ایک جماعت کا یہ کہنا کہ ﴿ اتَّبَعُوْكَ ﴾ میں کاف (كَ) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے۔ ایک بے فائدہ تکلف ہے، کیوں کہ جو بات بیان ہو رہی ہے، وہ اس بات کی دلیل ہے کہ مخاطب عیسیٰ علیہ السلام ہیں، بلکہ ظاہر بھی یہی بات ہے، اس کے خلاف کرنا ہرگز درست نہیں۔ اس

[1] سنن الدارقطني (٣/ ٢٥٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٧٧٨)

خطاب سے یہ بات ضروری نہیں کہ ملتِ محمدیہ بعثتِ خاتم الانبیاء ﷺ کے بعد خارج ٹھہرے، کیوں کہ سارے مسلمان عیسیٰ علیہ السلام کے متبع ہیں۔

اس امر میں اہلِ اسلام کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ بعثتِ محمدیہ سے پہلے ملتِ نصرانیہ تمام کفریہ ملتوں پر قاہر تھی، اس صورت میں ضمیر کو اس کے اصل مخاطب سے کسی اور طرف پھیرنے کا سوائے اس کے کوئی فائدہ نہیں ہے کہ قرآن کے نظم اور اسلوبِ بلاغت میں فرق آجائے۔ صحیح احادیث میں آچکا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانے میں آسمان سے دنیا پر اتریں گے، صلیب کو توڑ دیں گے، سور کو مار ڈالیں گے، جزیہ نہ لیں گے، لوگوں کے درمیان شریعتِ محمدیہ اور ملتِ اسلامیہ کے مطابق فیصلے کریں گے۔[1] اس وقت ان کے مددگار اور متبعین یہی مسلمان لوگ ہوں گے، لہٰذا اس آیتِ شریفہ میں اگر اس حالت کی طرف اشارہ ہو تو کچھ بعید نہیں۔ واللہ أعلم.

حق پرست گروہ قیامت تک رہے گا:

لفظ ﴿ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ﴾ انتہا ہے "جعل" کی، یعنی اسلام کی سر بلندی اس وقت تک رہے گی، پھر بعد کو جو اللہ چاہے گا، وہ ہوگا۔ چناں چہ اس کے بعد اہلِ کفر اور اہلِ ایمان کا انجام بتایا ہے کہ اہلِ کفر کو عذاب ہوگا اور اہلِ ایمان اپنا اجر پائیں گے۔ سیدنا نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ میری اُمت کا ایک گروہ ہمیشہ غالب رہے گا، ان کو اپنے مخالف کی کچھ پروا نہ ہوگی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آئے۔ اس کو امام ابن ابی حاتم اور حافظ ابن عساکر رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ پھر سیدنا نعمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر کوئی کہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ پر یہ بات بنائی ہے تو وہ شخص اس حدیث کی تصدیق کتاب اللہ میں دیکھ لے: ﴿ وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)[2] سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے اسی مفہوم کی حامل حدیث مرفوعاً مروی ہے، انھوں نے بھی استدلال میں یہی آیت پڑھی۔[3]

الحمد للہ یہ بشارت کتاب وسنت دونوں میں آچکی ہے کہ اسلام تا قیامت باقی رہے گا۔ قیامت اور صور پھونکے جانے سے پہلے یہ کسی کے مٹانے سے نہ مٹے گا۔ کوئی کتنا ہی کیوں نہ چاہے، کتنی ہی کشش اور کوشش کیوں نہ کرے، اگر زمین کے ایک کنارے میں اسلام کو ماننے والوں کا ایک گروہ غریب ہو جائے گا تو کسی دوسرے یا تیسرے کنارے میں وہ گروہ اسلام کے مخالفین پر غالب رہے گا، کسی مخالف کا ذرا خوف اور پروا نہیں کرے گا۔ چناں چہ اب تک مسلمانوں کی تباہی اور غربت کے باوجود زمین کے بعض کناروں پر مسلمانوں کے بعض بادشاہ اور رئیس اہلِ کفر پر غالب ہیں، کسی کافر سے ہرگز ڈرتے اور دبتے نہیں، بلکہ کافروں ہی کی آنکھ ان سے جھپکتی ہے۔ لہٰذا یہ کارخانہ قدرت دنیا کے اختتام تک اسی طرح چلتا رہے گا۔ مخالفین کی آرزو کہ ہم اسلام کو سارے جہاں سے نکال دیں گے اور دنیا بھر کے

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۱۰۹) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۵۵)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ۶۶۲۔ ۶۶۳) تاریخ دمشق (۱/ ۲۶۵)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۷۱) صحیح مسلم (۱۰۳۷) المعجم الکبیر (۱۹/ ۳۸۶) فتح البیان (۲/ ۲۴۶۔ ۲۵۲)

مسلمانوں کو مٹا دیں گے، ایک باطل خیال ہے۔

عنقا شکار کس نشود دام باز چین که ایں جا ہمیشہ باد بدست ست دام را

''عنقا کسی کا شکار نہیں ہوتا، اپنا جال اٹھا لے، کیونکہ اس جگہ ہمیشہ جال ہی کے پاس ہوا ہوتی ہے۔''

ابن زید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نصاریٰ قیامت تک یہودیوں کے اوپر رہیں گے، کوئی شہر ایسا نہیں ہے جہاں کوئی نصرانی ہو، مگر وہ وہاں کے یہود پر غالب نہ ہو، خواہ وہ شہر مشرق میں ہو یا مغرب میں، جتنے شہر ہیں سب میں یہود ذلیل وخوار ہیں۔[1]

حاصل کلام یہ ہے کہ ہفت اقلیم میں دو ہی ملت والے حاکم ہیں: ایک مسلمان، دوسرے نصاریٰ، باقی سارے اہلِ ملت مقہور اور مغلوب ہیں، گو ظاہر میں کسی جگہ ریاست یا سلطنت رکھتے ہوں۔ پھر نصاریٰ اگرچہ قربِ قیامت کی وجہ سے صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی اطلاع کے مطابق اکثر ممالک پر حاکم ہوگئے ہیں، لیکن اس کے ساتھ اسلام بھی موجود ہے۔ حکومت اور سلطنت، اقتدار اور غلبہ اس کے ساتھ مسلمانوں کو بھی برابر حاصل ہے اور قیامتِ کبریٰ تک برابر اسی طرح چلتا رہے گا۔ وللّٰه الحمد والمنة.

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ
كُنْ فَيَكُوْنُ ۝59 اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝60
فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا
نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ
ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝61 اِنَّ هٰذَا لَهُوَ
الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ۝62 فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝63

بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے، اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا، پھر اس سے کہا کہ ہو جا، تو وہ ہوگیا (59) (یہ) آپ کے رب کی طرف سے حق ہے، لہٰذا آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں (60) پھر علم آ جانے کے بعد جو کوئی عیسیٰ کے متعلق آپ سے جھگڑا کرے تو آپ کہہ دیں: آؤ ہم اور تم اپنے اپنے بیٹوں کو اور اپنی اپنی عورتوں کو بلا لیں اور

[1] تفسير الطبري (٦/ ٤٦٣)

خود بھی (حاضر ہوں) پھر گڑ گڑا کر اللہ سے دعا کریں کہ جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہو (61) بے شک یہی بیان سچا ہے اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور بے شک اللہ ہی غالب، خوب حکمت والا ہے (62) پھر اگر وہ منہ موڑیں تو بے شک اللہ فساد کرنے والوں کو خوب جاننے والا ہے (63)

عیسیٰ علیہ السلام اور آدم علیہ السلام کی پیدائش میں مشابہت:

موضح قرآن میں ہے کہ نصاریٰ اس بات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت جھگڑے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے نہیں بیٹے ہیں۔ آخر کہنے لگے کہ وہ اللہ کا بیٹا نہیں تو آپ بتائیں کہ وہ کس کا بیٹا ہے؟ اس کے جواب میں یہ آیت اتری کہ آدم کا تو نہ ماں اور نہ باپ، اگر عیسیٰ کا باپ نہ ہو تو کیا عجب ہے؟ پھر اللہ نے فرمایا کہ اس قدر سمجھانے پر بھی اگر نصاریٰ قائل نہ ہوں تو ان کے ساتھ مباہلہ کرو۔ یہ بھی فیصلے کی ایک صورت ہے کہ دونوں فریق اپنی جان اور اولاد سے حاضر ہوں اور دعا کریں کہ جو کوئی ہم میں جھوٹا ہے، اس پر لعنت اور عذاب پڑے۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ فاطمہ، حضرت حسن و حسین اور سیدنا علی رضی اللہ عنہم کو لے کر آ گئے۔[1] ان نصاریٰ میں جو عقل مند تھے، انھوں نے مقابلہ نہ کیا اور جزیہ دینا قبول کر لیا۔

اللہ پاک نے اس آیت میں یہ کہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ کی قدرت کے نزدیک بغیر باپ کے پیدا کرنے کی ویسی ہی ہے، جیسے آدم کو بغیر ماں باپ کے مٹی سے ایک حرف ﴿ كُنْ ﴾ کہہ کر پیدا کیا تھا، لہٰذا جس نے آدم کو بغیر ماں باپ کے پیدا کیا تھا، کیا وہ عیسیٰ کو پیدا نہیں کر سکتا؟ بلکہ وہ ہر لحاظ سے عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا کرنے پر قادر ہے اور اگر وہ بغیر باپ کے پیدا کیے جانے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بیٹے ٹھہرائے جاتے ہیں تو یہ دعویٰ آدم علیہ السلام کے لیے بھی جائز ہو سکتا ہے، حالاں کہ بالاتفاق اس دعوے کا باطل ہونا سب کو معلوم ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں ایسا دعویٰ تو اور زیادہ باطل اور باعثِ فساد ہوگا، بلکہ بات اس طرح سے ہے کہ جب اللہ پاک نے اپنی قدرت کو ظاہر کرنے کا فیصلہ کیا تو آدم علیہ السلام کو کسی نر اور مادہ کے بغیر پیدا کیا، حوا کو مرد سے بغیر عورت کے پیدا کیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو عورت سے بغیر مرد کے پیدا کیا، باقی مخلوق کو مرد اور عورت سے پیدا کیا۔ اسی لیے سورت مریم میں اس طرح فرمایا تھا: ﴿ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ﴾ [مریم: ۲۱] ”تاکہ ہم اسے لوگوں کے لیے نشانی اور اپنی طرف سے رحمت بنائیں۔“ اور اس جگہ ایسے فرمایا: ﴿ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ”(یہ) آپ کے رب کی طرف سے حق ہے، لہٰذا آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔“

---

[1] ان کو لے کر آنے والی روایات ضعیف ہیں۔ صحیح روایات سے، جو آگے آ رہی ہیں، یہی ثابت ہوتا ہے کہ مباہلے کی نوبت ہی نہیں آئی، کیوں کہ وفدِ نجران نے دوسرے روز آ کر مباہلہ کرنے سے انکار اور جزیہ دینے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ [ح۔ ی]

یعنی سچی بات یہی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آدم کی طرح مٹی سے بنائے گئے ہیں، اس کے سوا جو کوئی جو کچھ کہے، وہ سب غلط ہے صحیح نہیں ہے۔ ﴿ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ﴾ [یونس: ۳۲] ''پھر حق کے بعد گمراہی کے سوا کیا ہے؟'' پھر اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا کہ تم ان دشمنوں سے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مباہلہ کرو۔ اس سورت کے اول سے لے کر اس جگہ تک اس مباہلہ کے حکم کے نازل ہونے کا سبب وفد نجران تھا۔

وفدِ نجران کو دعوتِ مباہلہ:

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے سیرت میں لکھا ہے کہ نجران سے ساٹھ عیسائی آئے تھے، ان میں چودہ آدمی اشراف تھے، جن کی طرف امور لوٹائے جاتے تھے، یعنی جو با اختیار تھے۔ عاقب اس کا نام عبدالمسیح تھا۔ سید اس کا نام ایہم تھا، ابو حارثہ بن علقمہ برادر بکر بن وائل، اویس بن الحارث، زید، قیس، یزید دو بیٹوں کے ساتھ، خویلد، عمرو، خالد اور عبداللہ محسن۔ پھر ان سب کے تین امیر تھے: ایک عاقب صاحبِ رائے یہی تھے، انہی کے مشورے اور حکم سے سارا کام ہوتا تھا۔ لوگ انہی کی رائے پر چلتے تھے۔ دوسرے سید، یہ ان کے پادری اور صاحبِ مدارس تھے۔ اصل میں یہ آدمی عربی النسل تھا اور بنی بکر بن وائل سے تعلق رکھتا تھا، لیکن جب نصرانی ہوگیا تو روم کے بادشاہوں نے اس کی بہت تعظیم کی اور اس کو عزت بخشی، اس کے لیے گرجا گھر بنا کر اس کو ان کا متولی بنا دیا تھا، کیوں کہ وہ اپنے دین میں بڑا سخت تھا۔ نبی اکرم ﷺ کا حال، شان اور صفتیں کتبِ مقدسہ سے خوب پہچانتا تھا، لیکن نصاریٰ نے جو اس کو تعظیم اور وقار دیا تھا، اس کی وجہ سے نصرانیت پر جما رہا۔

سارے لوگ مدینہ میں آئے، نبی کریم ﷺ کی مسجد میں عصر کے وقت داخل ہوئے، سب اچھی اچھی چادریں اور عمدہ عمدہ لباس زیبِ تن کیے ہوئے تھے، گویا بنی الحارث بن کعب کی قوم کے تھے، جن صحابہ نے انھیں دیکھا، انھوں نے کہا کہ ان کے بعد پھر ویسے ایلچی نہیں دیکھے۔ اتنے میں ان کی نماز کا وقت آیا، وہ مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ان کو پڑھنے دو، مت روکو۔ انھوں نے مشرق کی طرف نماز پڑھی۔ پھر نبی مکرم ﷺ نے ان سے بات چیت کی۔ حارثہ بن علقمہ، عاقب، سید باوجود اختلافِ امر کے بادشاہ کے دین پر تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہتے کہ اللہ ہیں، اللہ کے بیٹے ہیں، وہ ثالث ثلاثہ ہیں، حالاں کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس قول سے کہیں برتر ہے، اسی طرح سارے نصاریٰ ان کو اللہ بتاتے تھے اور دلیل یہ دیتے تھے کہ وہ مردے کو زندہ کر دیتے، اندھے اور برص والے کو اچھا بھلا بنا دیتے، غیب کی خبر دیتے، مٹی سے پرندہ پیدا کرتے تھے۔ حالاں کہ یہ سب کام اللہ کے حکم سے ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو لوگوں کے لیے اپنی قدرت کی ایک نشانی بنایا تھا، وہ اللہ نہیں تھے۔ جو ان کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے ماں کی گود میں بات کی، جو اُن سے پہلے کسی آدمی نے نہیں کی تھی، ان

کا باپ نہیں تھا۔ جو ثالث ثلاثہ کے قائل ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ اللہ کہتا ہے کہ ہم نے یوں کیا، ایسا حکم دیا، ہم نے پیدا کیا، سو اگر اللہ ایک ہوتا تو یوں نہ کہتا، بلکہ کہتا کہ میں نے یوں کیا، ایسا امر کیا، میں نے پیدا کیا، میں حاکم اور خالق ہوں، لہٰذا اللہ اور عیسیٰ اور مریم تینوں اللہ ہیں۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ ان ظالموں کی بات سے کہیں برتر ہے۔ ان تینوں قسم کے اقوال کے بارے میں قرآن نازل ہوا ہے اور ہر قول کو رد کیا ہے۔

غرضیکہ جب دونوں پادریوں نے نبی کریم ﷺ سے گفتگو کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم مسلمان ہو جاؤ، انھوں نے کہا: ہم اسلام لائے۔ فرمایا: ابھی تم نہیں لائے۔ کہا: نہیں ہم تم سے پہلے اسلام لا چکے ہیں۔ فرمایا: بھلا کیا اسلام تم کو اس دعوے سے روکتا ہے کہ تم اللہ کا بیٹا نہ بناؤ، صلیب کی عبادت نہ کرو، سور نہ کھاؤ۔ انھوں نے کہا: اچھا تمھی بتاؤ کہ پھر عیسیٰ علیہ السلام کا باپ کون تھا؟ نبی اکرم ﷺ چپ رہے، کچھ جواب نہ دیا، اتنے میں وحی آئی۔ سورت آلِ عمران کے شروع سے لے کر اس آیت کے کچھ اوپر تک اُتری۔

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے ان آیتوں کی تفسیر لکھ کر یہ کہا ہے کہ جب یہ خبر اللہ کی طرف سے آئی اور اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دیا اور نبی مکرم ﷺ کو ملاعنہ کا حکم دیا کہ اگر وہ تمھاری بات نہیں مانتے تو تم ان کو مباہلے کے لیے بلاؤ تو انھوں نے کہا: اے ابو القاسم! آپ ہمیں ذرا مہلت دو کہ ہم سوچ سمجھ لیں، پھر جو آپ کہتے ہیں، ہم وہی بات کریں گے۔ یہ کہہ کر واپس آئے اور عاقب سے علاحدگی میں مشورہ کیا۔ کہا: اے عبدالمسیح! تم کیا رائے دیتے ہو؟ اس نے کہا کہ اے نصاریٰ کی جماعت! تم جان چکے ہو کہ محمد ﷺ نبی مرسل ہیں، تمھیں انھوں نے تمھارے صاحب کے متعلق صاف بات کہہ دی ہے اور تم جانتے ہو کہ کسی قوم نے کسی نبی سے کبھی ملاعنہ نہیں کیا کہ پھر اس قوم کا کوئی بڑا بچا ہو اور چھوٹا پھر پیدا ہوا ہو، اگر تم نے یہ کام کیا تو سمجھ لو کہ تمھارا استیصال (خاتمہ) ہو چکا اور اگر تمھیں یہ منظور ہے کہ تم اپنے دین پر رہو اور اپنے صاحب، یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو جو کہتے ہو، وہی کہو تو پھر تم اس شخص، یعنی نبی مکرم ﷺ سے رخصت ہو کر اپنے شہر کا راستہ لو۔

امینِ امت:

وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہا: اے ابو القاسم! ہماری رائے یہ ہے کہ ہم آپ سے مباہلہ ملاعنہ نہ کریں، آپ کو آپ کے دین پر چھوڑ کر ہم اپنے دین پر رہیں، لیکن آپ کسی ایک آدمی کو پسند کر کے ہمارے ساتھ بھیج دیں، تاکہ جن اموال کے بارے میں ہمارے درمیان اختلاف رہتا ہے، وہ اس کا فیصلہ کر دیا کرے۔ ہم آپ کو پسند کرتے ہیں۔ محمد بن جعفر رحمہ اللہ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تم تیسرے پہر کو آؤ، میں تمھارے ساتھ ایک قوی امین کو بھیج دوں گا۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھے کبھی امارت کا شوق نہ ہوا، جیسا اس دن ہوا، میں نے چاہا

کہ میں ہی بھیجا جاؤں۔ اس امید پر ظہر کے اول وقت مسجد میں آ بیٹھا۔ نبی کریم ﷺ نے ظہر کی نماز کا سلام پھیر کر دائیں بائیں دیکھنا شروع کیا، میں اونچا ہوتا تھا کہ مجھے دیکھیں، الغرض دیکھتے دیکھتے ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ پر نظر پڑی، ان کو بلا کر فرمایا: تو ان کے ساتھ جا اور ان کے اختلافات میں حق کے مطابق فیصلہ کر۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ان کو لے گئے۔ اس روایت میں سیدنا ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کی فضیلت ہے۔ اس کو ابن مردویہ نے بھی روایت کیا ہے اور اشراف بارہ آدمی بتائے ہیں۔ باقی حدیث اس سیاق سے زیادہ لمبی لکھی ہے۔[1]

امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح روایت کیا ہے کہ عاقب اور سید نجران سے آئے، چاہا کہ نبی کریم ﷺ سے ملاعنہ کریں۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ دیکھو یہ کام نہ کرو۔ اگر وہ نبی ہے اور ہم نے ملاعنہ کیا تو ہم کو کبھی فلاح نہ ہوگی، نہ ہماری نسل آگے چل سکے گی، پھر نبی مکرم ﷺ سے کہا کہ جو تم مانگتے ہو، وہ ہم تم کو دیں گے، تم ہمارے ساتھ ایک امین مرد کر دو۔ سوائے امانت دار شخص کے اور کسی کو نہ بھیجیں۔ فرمایا: میں ایک بڑے امانت دار شخص کو تمھارے ساتھ بھیجوں گا۔ صحابی جھانکنے تاکنے لگے، نبی اکرم ﷺ نے کہا: اے ابوعبیدہ بن جراح! کھڑے ہو جاؤ، جب وہ کھڑے ہوگئے، فرمایا: اس اُمت کا یہ امین ہے۔[2] (رواه الشيخان والترمذي و ابن ماجه)

اس حدیث کو سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے احمد، نسائی اور ابن ماجہ نے بھی روایت کیا ہے۔[3] بخاری میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ ہر اُمت کا ایک امین ہوتا ہے، اس امت کا امین ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ ہے۔[4]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ابوجہل نے کہا کہ اگر میں محمد ﷺ کو کعبہ کے پاس نماز پڑھتے دیکھوں گا تو آ کر ان کی گردن دبا دوں گا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر وہ ایسا کرتا تو ظاہراً اس کو فرشتے پکڑ لیتے اور اگر یہود موت کی آرزو کرتے تو مر جاتے اور آگ میں اپنی جگہ دیکھ لیتے اور اگر مباہلہ کرنے والے نبی اکرم ﷺ سے مباہلہ کر کے باہر آتے تو مال اور گھر بار کو پھر نہ پاتے۔ (رواه أحمد و البخاري و الترمذي و النسائي) امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔[5]

---

[1] تفسير الطبري (٦/ ١٥١) تفسير ابن كثير (١/ ٤٨٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٢٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٩٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٥)

[3] مسند أحمد (١/ ٤١٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٥/ ٥٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٦)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٢١)

[5] مسند أحمد (١/ ٢٤٨) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٧٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٤٨) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣٠٨)

سب سے پہلے جزیہ دینے والے عیسائی:

بیہقی رحمہ اللہ نے وفد نجران کا قصہ تفصیل کے ساتھ ”دلائل النبوۃ“ میں لکھا ہے۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کو اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔[2] اس میں بہت فوائد ہیں، لیکن غرابت کی وجہ سے اس جگہ نہیں لکھا گیا۔ یہ واقعہ ۹ ھ میں ہوا۔ سب سے پہلے جنھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جزیہ دیا، یہی اہلِ نجران ہیں۔ آیتِ جزیہ فتح مکہ کے بعد اُتری ہے۔ وہ آیت یہ ہے: ﴿ قٰتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ [التوبة: ۲۹]

”ان لوگوں سے لڑو جو اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اس چیز کو حرام نہیں ٹھہراتے جسے اللہ نے اور اس کے رسول نے حرام ٹھہرایا ہے اور دینِ حق کو قبول نہیں کرتے، وہ جو اہلِ کتاب میں سے ہیں، (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔“

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: عاقب اور طیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا: اچھا ملاعنہ کرو، انھوں نے کہا: بہتر ہے کل ملاعنہ کریں گے۔ صبح کو سیدنا علی و فاطمہ وحسن وحسین رضی اللہ عنہم کا ہاتھ پکڑ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے، آدمی بھیج کر ان کو بلایا۔[3] وہ نہ آئے اور خراج دینا منظور کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے! اگر وہ مباہلہ کرتے تو سارے جنگل پر آگ برستی۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ آیت انھی کے حق میں اُتری ہے۔ ﴿ اَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ﴾ سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور علی مرتضی رضی اللہ عنہ ہیں۔ ﴿ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ ﴾ سے مراد حسن وحسین رضی اللہ عنہما ہیں۔ ﴿ نِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ ﴾ سے مراد فاطمہ رضی اللہ عنہا ہیں۔[4] (رواہ ابن مردویہ) اس کو امام حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں روایت کر کے کہا ہے کہ یہ حدیث شرطِ مسلم پر ہے۔ امام ابو داود طیالسی رحمہ اللہ نے اس کو امام شعبی رحمہ اللہ سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ یہی زیادہ صحیح ہے، اس کے لگ بھگ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور سیدنا براء رضی اللہ عنہ سے بھی روایت مروی ہے۔[5]

---

(1) دلائل النبوۃ (۵/ ۳۸۲) (2) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۴۸۲)

(3) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان حضرات کو لے کر نکلنا کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں۔ یہ روایت جیسا کہ آگے وضاحت آ رہی ہے، مرسل ہے، جو عند المحدثین ضعیف ہوتی ہے۔ [ص۔ ی]

(4) اس روایت کے غیر صحیح ہونے کی یہ ایک اور واضح دلیل ہے کہ اس میں ”نساءنا“ سے مراد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو لیا گیا ہے، جبکہ ”نساء“ کا لفظ ازواج (بیویوں) کے لیے استعمال ہو سکتا ہے، لیکن عربی زبان میں بیٹی کے لیے یہ استعمال نہیں ہوتا۔ فافهم وتدبر. [ص۔ ی]

(5) مستدرک الحاکم میں اس روایت کے ہم معنی روایت سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ دیکھیں: مستدرك الحاكم (۲/ ٦٤٩) تفسير الطبري (٦/ ٤٦٨) تفسير ابن أبي حاتم (۲/ ٦٦٧) تفسير ابن كثير (۱/ ٤٨٤) امام حاکم اور ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

اہلِ نجران کا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مباحثہ:

اس آیت کی تفسیر میں فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اہلِ نجران نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے، ان میں سید و عاقب تھے، انھوں نے آ کر کہا: تم ہمارے صاحب کا ذکر کیوں کرتے ہو؟ پوچھا: کس کا؟ کہا: عیسیٰ کا، تم کو زعم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے تھے، تم نے ان کا سا کوئی دیکھا یا سنا ہے؟ یہ کہہ کر واپس گئے۔ جبریل علیہ السلام نے آ کر کہا: اب اگر وہ تمھارے پاس آئیں تو آپ ان سے یہ کہنا کہ ﴿ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)

یہ قصہ صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت سے کئی طرح پر مروی ہے، اس کی اصل صحیحین میں ہے۔[1] کہتے ہیں کہ ایک عالم روم کے کسی شہر میں قید ہو گئے تھے، انھوں نے ان سے کہا: تم عیسیٰ علیہ السلام کو کیوں پوجتے ہو؟ اہلِ روم نے کہا: اس لیے کہ وہ بے باپ کے تھے۔ انھوں نے کہا کہ آدم علیہ السلام تو اس سے بھی زیادہ اس لائق ہیں کہ انھیں پوجا جائے، کیوں کہ ان کا نہ باپ تھا اور نہ ماں تھی۔ کہا: عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ انھوں نے کہا: تو حزقیل زیادہ لائق ٹھہریں گے، کیوں کہ عیسیٰ نے صرف چار شخص زندہ کیے اور حزقیل نے چار ہزار آدمی زندہ کر دیے۔ کہا: وہ اندھے اور برص والے کو اچھا کر دیتے تھے۔ کہا: تو جرجیس زیادہ لائق ہوئے، کیوں کہ ان کو دیگ میں پکا کر جلا ڈالا تھا اور وہ اچھے خاصے صحیح سلامت اُٹھ کھڑے ہوئے۔

آلِ بیتِ رسول:

یہ آیت ﴿ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) اگرچہ عام ہے، مگر اس سے مراد خاص لوگ ہیں، یعنی وہ نصاریٰ جو نجران سے نبیِ اکرم ﷺ کے پاس آئے تھے، اس قصے کو حاکم و ابونعیم رحمہ اللہ نے دلائل میں لکھا ہے۔[2] سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ جب یہ آیت اتری تو نبی کریم ﷺ نے سیدنا علی و فاطمہ و حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا، کہا: ''اے اللہ! یہ (بھی) میرے اہلِ (بیت) ہیں۔''[3] (أخرجه مسلم و الترمذي

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٤١١٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٤٢٠)

[2] مستدرك الحاكم (٢/ ٦٤٩) امام حاکم اور ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[3] حدیث کے اصل الفاظ ہیں: "هؤلاء أهلي" اس کا مطلب وہی ہے جو ہم نے ترجمے میں ''بھی'' کے اضافے کے ساتھ بیان کیا ہے، کیوں کہ قرآنِ کریم کی آیتِ تطہیر (الأحزاب: ٣٣) میں اللہ تعالیٰ نے ازواجِ مطہرات کو اہل البیت کہا ہے، جس کی مزید تائید سورت ھود کی آیت (٧٣) سے بھی ہوتی، جس میں حضرت ابراہیم کی اہلیہ حضرت سارہ کو ان کی اہل البیت کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ اس سے یہ واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اہلِ بیت تو ازواجِ رسول ہی ہیں، تاہم آپ نے دعا کے ذریعے سے حضرت علی و فاطمہ اور حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو بھی اہلِ بیت میں شامل فرما لیا۔ اس لیے "اللهم هؤلاء أهل بيتي" کا مفہوم یہی ہوگا کہ ''اے اللہ! یہ بھی میرے اہلِ (بیت) ہیں'' یعنی ان کو بھی ان میں شامل فرما۔ نہ کہ یہ مفہوم ہوگا کہ ''یہ میرے اہلِ بیت ہیں۔'' اس طرح تو ازواجِ مطہرات اہلِ بیت ہی نہیں رہتیں جبکہ قرآن کی رُو سے وہ یقیناً اہلِ بیت نبوی ہیں۔

←

و ابن المنذر والحاكم و البيهقي)[1] مگر جعفر بن محمد عن ابیہ سے یوں مروی ہے کہ سیدنا ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم مع اپنی اولاد کے آئے۔[2] (رواہ ابن عساکر) ہو سکتا ہے یہ بلانا عام اہلِ دین کی جماعت کو ہو، اگرچہ اس کا سبب خاص ہے اس میں مباہلہ کے جواز پر دلیل ہے کہ جو نبی اکرم ﷺ سے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حجت کرے، اس سے مباہلہ کریں، اس معاملے میں اُمت نبی اکرم ﷺ کی مقتدی ہے۔[3]

لڑکوں کا ذکر کیا، لڑکیوں کا ذکر نہیں کیا، کیوں کہ وہ لفظ نساء میں داخل ہیں یا یہ کہ لڑائی جھگڑے کے موقع پر لڑکے ہی آتے ہیں نہ کہ لڑکیاں، اس جگہ ابناء سے مراد حسین رضی اللہ عنہما ہیں۔ کیوں کہ نبی اکرم ﷺ انھی کو لے کر نکلے تھے۔ معلوم ہوا نواسوں کو بھی بیٹا کہتے ہیں۔ بیٹے اور عورتیں عزیز ترین اہل ہوتے ہیں، اسی لیے انھی کو خاص کیا۔ "أبناء" و "نساء" کا ذکر "أنفسنا" سے پہلے اس لیے کیا، تاکہ ان کی قدر و منزلت اور مقام ثابت ہو۔ مباہلہ اس لیے ہوتا ہے کہ سچا جھوٹے سے الگ ہو جائے۔ اس کام کے لیے صرف مباہلہ کرنے والا کافی ہوتا ہے، لیکن بیٹوں اور عورتوں کو بھی ہمراہ اس لیے لیا جاتا ہے کہ ان کے لینے سے بات زیادہ پکی ہوتی ہے اور صدق پر یقین پایا جاتا ہے کہ گھر بار کے ساتھ حاضر ہیں، اگر مباہلہ ہوگا تو جھگڑنے والا بھی اپنے گھر بار کے ساتھ برباد ہو جائے گا۔

نبی اکرم ﷺ کے بعد مباہلہ کے جواز اور عدم جواز کا حکم:

سلیمان جمل نے کہا ہے کہ ہمارے شیخ علامہ دوانی کے سامنے اس بات پر بحث ہوئی کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد مباہلہ جائز ہے یا نہیں؟ انھوں نے کتاب و سنت و آثار اور ائمہ کے کلام سے مباہلہ کی شرائط نکال کر ایک رسالہ لکھا، جس کا حاصل یہ ہے کہ مباہلہ صرف کسی ایسے اہم شرعی معاملے ہی میں جائز ہے جس کے اندر کچھ شبہہ اور تنازع ہو اور

← اس کی مثال اس طرح سمجھیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ آیندہ سال میں زندہ رہا تو "لَأَصُوْمَنَّ التَّاسِعَةَ" (میں نو محرم کا روزہ (بھی) رکھوں گا) یہاں بھی کے اضافے والا مفہوم ہی درست ہوگا، کیونکہ دس محرم کے روزے کی فضیلت اور وجہ تو مسلّم ہے۔ آپ ﷺ کا مطلب یہی ہوگا کہ میں ۱۰ر محرم کے ساتھ نو محرم کا روزہ بھی رکھوں گا، تاکہ یہود کی مخالفت بھی ہو جائے اور دس محرم کے روزے سے حضرت موسیٰ کی نجات کی خوشی میں شرکت بھی ہو جائے۔ یہاں جس طرح صرف ۹ر محرم کا روزہ رکھنے کا مطلب غلط ہوگا (جیسا کہ بعض حضرات لے رہے ہیں) اسی طرح "هؤلاء بيتي" سے صرف حضرت علی و فاطمہ اور حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہم کو مراد لینا بھی غلط ہوگا اور صحیح مطلب یہی ہوگا کہ ازواجِ مطہرات کے ساتھ یہ بھی میرے اہلِ بیت ہیں۔ [ص۔ ي]

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٩٩) مستدرك الحاكم (٣/ ١٦٣) سنن البيهقي الكبرىٰ (٧/ ٦٣)

[2] تاريخ دمشق (٣٩/ ١٧٧)

[3] تاریخ دمشق کی یہ روایت بھی صحیح نہیں۔ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ نے دوسرے روز مباہلے کے لیے نہ حضرات علی و فاطمہ کو بلایا اور نہ دوسرے مسلمانوں کو، مباہلے کا موقع ہی نہیں آیا۔ [ص۔ ي]

وہ مباہلے کے بغیر دور نہ ہو سکے۔ پہلے حجت قائم کرے، شبہے کے دور کرنے کے لیے پوری کوشش کرے، نصیحت کرے، ڈرائے، جب دیکھے کہ کسی طرح فائدہ نہیں ہوتا اور مباہلے کی ضرورت ہے تو مباہلہ کرے۔ انتہیٰ. من تفسير الكازروني.
معلوم ہوا مباہلہ رسول اللہ ﷺ یا آپ ﷺ کے زمانے کے ساتھ خاص نہیں تھا، ہر زمانے میں کفار و مشرکین و اہلِ کتاب کے ساتھ شدید ضرورت کی صورت میں ہوسکتا ہے، جو شخص اس کو نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص کرتا ہے، اس کے پاس جہالت کے سوا اور کوئی دلیل نہیں ہے۔

اسلاف کے مباہلے:

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے جب دیکھا کہ اللہ کی صفات کے منکرین کسی طرح نہیں مانتے، اجرائے صفات کو ظواہر نصوص پر تاویل، تحریف اور تعطیل کے بغیر جاری نہیں کرتے تو ان سے کہا: آؤ! ہم تم مباہلہ کریں اور رکن اور مقام (حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم بیت اللہ میں دو مقام ہیں) کے درمیان کھڑے ہو کر جھوٹے پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔ منکرین نے نہ مانا، وہ انجامِ بد سے ڈر گئے۔ یہ سارا قصہ دیباچہ قصیدہ نونیہ میں مفصل لکھا ہے۔[1] ان کے بعد حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی مباہلہ کرنا چاہا تھا مگر نہ ہوا۔

مباہلہ ہر عہد میں جائز ہے:

عہدِ رسالت کے بعد مباہلے کی ممانعت کے بارے میں کسی معتبر عالم کا کلام دیکھنے میں نہیں آیا اور نہ ہی مباہلہ کو عہدِ رسالت کے لیے خاص کرنے کی کوئی دلیل ڈھونڈے سے ملتی ہے۔ یہ مباہلہ حجت قائم کرنے کے بعد ہر زمانے میں ہوسکتا ہے۔ مباہلہ کرنے والے کا تعلق اہلِ دین اور تقویٰ سے ہونا چاہیے، تاکہ مخالف پر بصورتِ وقوع مباہلے کا اثر ظاہر ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے اہلِ نجران کے ساتھ توحیدِ الٰہی پر مباہلہ کرنا چاہا تھا اور ابن القیم رحمہ اللہ نے مسئلہ صفات میں مباہلہ کرنا چاہا تھا، مگر کسی کے قدم نہ جمے۔

اہلِ تقلید کو مباہلہ کی دعوت:

اس زمانہ اخیر میں شرک فی الرسالت عام ہو گیا ہے، مقلدینِ رائے و قیاس عمل بالحدیث اور تمسک بہ سنت کے منکر ہیں۔ ان کا اگر جی چاہے تو وہ اہلِ سنت اور متبعین کی جماعت سے تقلیدِ شخصی کے وجوب پر مباہلہ کر لیں، کیوں کہ اہلِ حدیث و قرآن کی طرف سے اس سلسلے میں تحریروں اور زبانی بیانات سے حجت قائم اور دلیلیں ظاہر کر دی گئی ہیں اور تقلید کی ممانعت کے لیے کوئی کسر نہیں رہی، مگر مبتدعین اپنی بات پر جمے ہوئے ہیں، اگرچہ وہ ان دلیلوں کا جواب دینے یا ان کا رد کرنے سے عاجز ہیں۔ اس صورت میں فیصلے کی اس کے سوا کوئی اور صورت نظر نہیں آتی، ان سے مباہلے کی درخواست کی جائے اور اُن کو میدانِ ملاعنہ میں بلایا جائے، پھر اس بات پر مباہلہ عمل میں آئے کہ

[1] فتح البیان (۲/ ۲۵٤ ـ ۲۵۸)

کتاب وسنت کا اتباع اور ترکِ تقلیدِ رائے و مذہب معین واجب ہے یا نہیں۔ ”هَلْ مِنْ مُبَارِزٍ يُبَارِزُنِيْ؟“ کیا کوئی میدان میں میرے سامنے اُترنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ لیکن ہمیں اُمید نہیں ہے کہ کوئی مقلد خصوصاً اہلِ رائے مباہلہ کرنے پر تیار ہو۔ خیر اگر مباہلہ نہیں کرتے تو ہم بھی چپکے بیٹھے ہیں، وہ زمانہ بھی اب قریب آ گیا ہے کہ مہدی موعود ظاہر ہوں، مسیح علیہ السلام آسمان سے زمین پر اُتریں، ان کے ظہور اور نزول کے بعد یہ سارا قصہ مباہلے کے بغیر حل ہو جائے گا۔

قَضِيَّةُ الْمُدَّةِ الطُّوْلٰى قَدِ انْفَصَلَتْ

”اب لمبی مدت کی بات باقی نہیں رہی۔“

بلکہ اس وقتِ مبارک میں صرف کفار ہی پست نہیں ہوں گے، بلکہ سارے اہلِ رائے و قیاس کا بھی دیوالیہ نکل جائے گا، تمام جہان میں اتباعِ کتاب وسنت کا دور دورہ ہوگا اور خالص دین کا ڈنکا بجے گا۔ ﴿ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴾ [الأعراف: ۷۱] ”چناں چہ تم انتظار کرو، بے شک میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔“

نبوت کی صداقت کی دلیل:

اس آیت میں نبی اکرم ﷺ کی نبوت کی صداقت پر قطعی دلیل اور چمکتی ہوئی برہان ہے، کیوں کہ کسی ایک نے بھی خواہ وہ موافق ہو یا مخالف یہ بات روایت نہیں کی کہ انھوں نے مباہلہ کرنا قبول کیا ہو، وہ تو آپ کی نبوت کی سچائی پہلے ہی سے قدیم کتابِ آسمانی میں دیکھ چکے تھے اور سن چکے تھے۔ دل میں خوب سمجھتے تھے کہ اگر مباہلہ کریں گے تو تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

مقلدین اور عیسائیوں میں مماثلت:

اسی طرح تقلیدِ شخصی کو واجب کہنے والے بھی خوب ہی سمجھے بیٹھے ہیں کہ اتباعِ سنت حق ہے اور تقلید باطل ہے۔ قرآن و حدیث میں جگہ جگہ ہر معاملہ میں خواہ وہ آسان ہو یا مشکل، چھوٹا ہو یا بڑا، اللہ اور رسول کی اطاعت اور اتباع کا حکم آ چکا ہے، کتاب وسنت تقلید اور اہلِ تقلید کی مذمت سے پُر ہیں، مباہلہ کریں تو کس حق کی بنا پر کریں۔ نجران کے نصاریٰ تو تین اللہ بتاتے تھے، مقلدین چار امام واجب الاتباع بتاتے ہیں، وہ تثلیث تھی، یہ تربیع ہے، وہ شرک فی الالوہیت تھا، یہ شرک فی الرسالت ہے۔ پھر اللہ پاک نے یہ فرمایا کہ اے نبی کریم! عیسیٰ علیہ السلام کا جو قصہ ہم نے اس جگہ بیان کیا ہے، ٹھیک بات وہی ہے، اس سے انکار نہیں ہو سکتا، پھر اگر وہ انکار کرتے ہیں تو کیا کریں، اللہ تعالیٰ ان مفسدوں کو خوب ہی جانتا ہے، وہ ان کو ان کے فساد کی جزا سزا دے گا۔ کہیں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے ہاتھ سے نکل جائیں، اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے انتقام سے بچائے، ہر باطل سے بچا کر حق پر چلائے۔ اللھم آمین.

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝۶۴

آپ کہہ دیجیے: اے اہلِ کتاب! ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو رب نہ بنائے، پھر اگر وہ منہ موڑیں تو تم کہہ دو: اس بات کے گواہ رہو کہ بے شک ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں ﴿64﴾

توحید انبیائے کرام کی مشترکہ دعوت ہے:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ خطاب اہلِ کتاب اور ان کو شامل ہے، جو ان کی چال پر چلتے ہیں۔ ''کلمہ'' جملہ مفیدہ کو کہتے ہیں، اس کلمے کی یہ تعریف کی کہ وہ عدل و انصاف کی بات ہے، ہم اور تم اس میں برابر ہیں۔ وہ کلمہ یہ ہے کہ سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں، وہ وثن (بت) ہو یا صلیب، صنم ہو یا طاغوت، نار ہو یا کچھ اور، بلکہ صرف اللہ ''وحده لا شريك له'' کو پوجیں۔ سارے رسولوں کی یہی ایک دعوت تھی، سب اپنی اُمتوں کو اسی بات کی طرف بلاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝۲۵ ﴾ [الأنبياء: ٢٥] ''اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے، ان کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [النحل: ٣٦] ''اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔''[1]

ایک دوسرے کو ''رب'' بنانے کا مفہوم:

پھر یہ فرمایا کہ بعض لوگ بعض کو رب نہ ٹھہرائیں، جس طرح اہلِ کتاب نے اپنے علما و مشائخ کو رب ٹھہرا لیا تھا: ﴿ اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ [التوبة: ٣١] ''انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علما اور درویشوں کو (اپنا) رب بنا لیا۔'' جس طرح اُمتِ اسلام کے مقلدین نے مولویوں، درویشوں اور اماموں کو اپنا رب ٹھہرا لیا ہے کہ ان کی بات کے آگے اللہ اور رسول کی بات کو نہیں مانتے، ان کی رائے و قیاس اور اجتہاد کو کتاب و سنت

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٨٤)

کے صریح احکام پر مقدم رکھتے ہیں، حالاں کہ قرآن میں جا بجا اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم ہے اور تقدیم سے منع فرمایا ہے: ﴿ لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ [الحجرات: ۱] ”تم اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھو۔“

امام ابن جریج رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ”اِتِّخَاذِ أَرْبَابٍ“ کے یہ معنی ہیں کہ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں بعض کی اطاعت کرتے ہیں۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: بعض لوگ بعض کو سجدہ کرتے ہیں۔[1] یعنی جس طرح بعض ممالک میں رعایا اپنے بادشاہوں کو سجدہ کرتی ہے یا مرید پیروں کو سجدہ کرتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا: اگر وہ اس بات کو نہ مانیں، اس عدل و دعوت کا انکار کریں تو تم گواہ رہو اپنے پکے اسلام پر، جس کو اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے شرع ٹھہرایا ہے۔

ابوسفیان اور قیصرِ روم کا مکالمہ:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہم نے شرح بخاری میں ابوسفیان کے قصے کے تحت ذکر کیا ہے کہ قیصر نے ان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب و نسب اور خصوصیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے بارے میں پوچھا تھا تو انھوں نے صاف صاف سارا حال بیان کیا، حالاں کہ وہ اس وقت مشرک تھے اور اس کے بعد اسلام لائے۔ یہ قصہ صلح حدیبیہ کے بعد اور فتح مکہ سے پہلے کا ہے۔ جس طرح کہ حدیث میں صریحاً آچکا ہے۔ ان سے قیصر نے یہ بھی پوچھا تھا کہ وہ بدعہدی اور غدر بھی کرتے ہیں یا نہیں؟ ابوسفیان نے کہا: نہیں۔ ہم نے ایک مدت کے لیے معاہدہ کیا ہے، معلوم نہیں کہ اس مدت میں کیا کرے گا۔ ابوسفیان کہتے ہیں: مجھ سے نہ ہو سکا کہ ان کلمات سے زیادہ ایک کلمہ بھی کہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیصر کے نام خط:

حاصل یہ ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خط قیصر کے پاس پہنچا، اس کو پڑھا، اس میں یہ لکھا تھا: « بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ إِلٰى هِرَقْلَ عَظِيْمِ الرُّوْمِ سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى أَمَّا بَعْدُ فَأَسْلِمْ تَسْلَمْ يُؤْتِكَ اللّٰهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ إِثْمُ الْأَرِيْسِيِّيْنَ وَيَا أَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا... إِلٰى قوله... مُسْلِمُوْنَ »[2] ”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے روم کے فرمانروا قیصر کے نام۔ اس پر سلامتی ہو جو ہدایت کی پیروی کرے۔ مسلمان ہو جا تو محفوظ ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ تجھے دوہرا اجر عطا کرے گا، اگر تو نے منہ موڑا تو کسانوں (اس کی عیسائی رعایا) کا گناہ بھی تیرے سر ہوگا۔ اے اہلِ کتاب! اس بات کی طرف آؤ، جو ہمارے اور تمھارے درمیان مشترک ہے۔“ امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا ہے کہ سورت آلِ عمران ابتدا سے لے کر اس آیت تک وفدِ نجران کے حق میں اتری ہے۔ امام زہری رحمہ اللہ نے کہا: سب سے پہلے جزیہ دینے والے یہی ہیں۔ اس میں اختلاف نہیں کہ آیتِ جزیہ فتح مکہ کے بعد اتری ہے۔

---

[1] تفسیر الطبري (٦/ ٤٨٨۔ ٤٨٩)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٧) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٧٧٣)

آیت کے نزول کے بارے میں اقوال کے درمیان تطبیق:

سو اس آیت کو فتح مکہ سے قبل ہرقل کو لکھے گئے خط میں شامل کرنے اور امام ابن اسحاق اور زہری رحمہ اللہ کے اقوال کو کئی طرح پر جمع کیا جا سکتا ہے۔ ایک یہ ہے کہ یہ آیت دو دفعہ اُتری ہے۔ ایک بار حدیبیہ سے پہلے، دوسری بار فتح مکہ کے بعد۔ دوسرے یہ کہ سورت کے شروع سے اس آیت تک نجران کے وفد کے بارے میں اتری ہو، یہ آیت اس سے پہلے آئی ہو۔ جو امام ابن اسحاق رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ آیت اور کچھ اوپر تک آیات، ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی روشنی میں، نجران کے وفد کے حق میں اتری ہیں، وہ غیر محفوظ ہے۔ تیسرے یہ کہ نجران کے وفد کا آنا حدیبیہ سے پہلے ہوا ہو اور جو کچھ انھوں نے مباہلہ سے صلح کر کے دینا منظور کیا ہو، وہ بطورِ جزیہ نہ ہو، بلکہ صلح کے لیے ہو اور آیتِ جزیہ کا نزول اس کے مطابق ہوا ہو، جس طرح خُمس اور چار اخماس کا فرض ہونا عبداللہ بن جحش کی بدر سے پہلے کارروائی کے موافق ہوا، پھر اسی کے مطابق فریضہ (تقسیم غنائم) اترا۔

چوتھے یہ کہ جب نبی اکرم ﷺ نے ہرقل کو خط لکھا تھا، اس وقت یہ آیت نہ اتری ہو، پھر آپ کے لکھنے کے مطابق آیت آئی، جس طرح پردے، قیدیوں کے بارے، مقامِ ابراہیم اور طلاقِ ازواج یا منافقین کا نمازِ جنازہ نہ پڑھنے کے بارے میں وحی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی رائے کہ مطابق نازل ہوئی۔ واللہ أعلم.[1]

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ اس آیت کا خطاب اہلِ نجران کو ہے یا یہودِ مدینہ کو یا دونوں کو۔ قرآن کے اسلوب سے یہی عمومیت ظاہر ہوتی ہے، کسی ایک ملت کے لیے اس کو خاص کرنے کی کوئی دلیل نہیں۔ غرض یہی ہے کہ وہ بھی بطریقِ اولیٰ داخل ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت یہ ہے: "إِلىٰ كَلِمَةِ عَدْلٍ"[2] سواء اور عدل کے ایک ہی معنی ہیں، یعنی اے کتاب والو! تم میری دعوت کو مانو، وہ دعوت اسی کلمہ "عادلہ مستقیمہ" (عادل اور راست) کی ہے، جس میں حق سے کسی طرح کی روگردانی نہیں پائی جاتی۔ وہ کلمہ عبادت میں توحید اختیار کرنے اور شرک کو چھوڑنے کا ہے، کیوں کہ نصاریٰ غیر اللہ کی عبادت کرتے تھے، مسیح علیہ السلام کو اُلوہیت میں شریک کر کے باپ بیٹا روح پاک ثابت کرتے تھے، انھوں نے ایک اللہ کے تین اللہ بنا ڈالے تھے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا کفار کی طرف خط یہی ہوتا تھا: ﴿ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) (أخرجه الطبراني)[3] امام ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہود کو اس آیت کی طرف بلایا،

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۴۸۴۔ ۴۸۵) [2] تفسير الطبري (٦/ ٤٨٧)

[3] المعجم الكبير (١١/ ٣٩٣)

انھوں نے نہ مانا اس پر جہاد کیا، آخر جزیہ دینے کی ٹھہری۔ اسی کے لگ بھگ قتادہ رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے۔[1] "اِتِّخَاذِ رَبّ" میں ایک تو اہلِ کتاب پر ملامت ہے کہ انھوں نے مسیح علیہ السلام اور عزیر علیہ السلام کو رب سمجھ لیا ہے، حالاں کہ وہ جنسِ بشر سے تھے، بنی آدم میں سے بعض تھے۔ دوسرے دین اللہ میں لوگوں کے مقلدین کی مذمت کی ہے کہ جس کو ان کے ائمہ نے حلال حرام کر دیا، انھوں نے اس کو مان لیا، لہٰذا جو کوئی ایسا کام کرتا ہے، وہ انھیں رب بنا لیتا ہے۔ بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ اس رب بنانے سے یہ مراد ہے کہ لوگ اپنے سرداروں کی بغیر عبادت کے اطاعت کریں، یعنی اگرچہ ان کی عبادت نہیں کرتے، مگر ایسے فرماں بردار ہیں، جیسے کوئی اپنے رب کا مطیع ہوتا ہے۔[2]

يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِىۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَمَاۤ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰىةُ وَالۡاِنۡجِيۡلُ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ‌ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۝٦٥ هٰۤاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَاۤءِ حَاجَجۡتُمۡ فِيۡمَا لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡمَا لَيۡسَ لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ‌ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝٦٦ مَا كَانَ اِبۡرٰهِيۡمُ يَهُوۡدِيًّا وَّلَا نَصۡرَانِيًّا وَّلٰكِنۡ كَانَ حَنِيۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۝٦٧ اِنَّ اَوۡلَى النَّاسِ بِاِبۡرٰهِيۡمَ لَلَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُ وَهٰذَا النَّبِىُّ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ‌ؕ وَاللّٰهُ وَلِىُّ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝٦٨

اے اہلِ کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو؟ حالاں کہ تورات اور انجیل تو اس کے بعد ہی نازل کی گئی ہیں، کیا تم عقل نہیں رکھتے؟ (65) آگاہ رہو! تم وہ لوگ ہو کہ تم نے اس بات میں جھگڑا کیا جس کا تمھیں کچھ علم تھا تو اب تم اس چیز کی بابت کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمھیں کوئی علم نہیں؟ اور اللہ ہی جانتا ہے تم نہیں جانتے (66) ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی، بلکہ وہ صرف حق پرست، فرماں بردار تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے (67) بے شک ابراہیم سے قریب تر وہی لوگ ہیں جنھوں نے ان کی پیروی کی، اور یہ نبی اور مومن لوگ۔ اور اللہ مومنوں کا دوست ہے (68)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصل دین اور اہلِ کتاب کا اس کے بارے میں مباحثہ:

موضح قرآن میں کہا گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ کا ایک یہ جھگڑا تھا کہ ہر کوئی کہتا تھا کہ ابراہیم ہمارے دین پر

[1] تفسير الطبري (٦/ ٣٨٣۔ ٣٨٤) [2] فتح البيان (٢/ ٢٥٩۔ ٢٦٠)

تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اگر ابراہیم کو یہودی یا نصرانی اس معنی میں کہتے ہو کہ وہ تورات اور انجیل پر عمل کرتے تھے تو یہ صریح بے عقلی ہے۔ تورات اور انجیل تو اس سے بعد نازل ہوئی ہیں اور اگر یہ غرض ہے کہ اس وقت بھی اہلِ ہدایت کا نام یہود و نصاریٰ تھا تو یہ بھی غلط ہے، بلکہ ابراہیم نے اپنے آپ کو حنیف کہا ہے یا مسلم۔ حنیف کے معنی ہیں جو کوئی تمام باطل راستے چھوڑ کر ایک راہِ حق کو پکڑے۔ مسلم کے معنی حکم بردار۔ اور اگر غرض یہ ہے کہ ادیان میں سے یہود و نصاریٰ کے دین کو ابراہیم علیہ السلام کے دین سے زیادہ نسبت ہے تو اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ ابراہیم سے زیادہ مناسبت اس وقت کی اُمت کو تھی یا پچھلی اُمتوں میں سے اس نبی کی اُمت کو ہے، تو یہ اُمت نام میں بھی اور راہ میں بھی ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

پھر فرمایا کہ اپنے راہِ حق پر ہونے کے لیے کسی اور کی موافقت سے تو دلیل اس وقت پکڑے جب اپنے اوپر وحی نہ آتی ہو۔ مسلمانوں کا والی اللہ ہے اور یہ اس کے حکم پر چلتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ابراہیم کے بارے میں یہود و نصاریٰ کے باہم نزاع اور ان کے ان دعووں کا انکار کیا ہے کہ ہر کوئی انھیں اپنا ہم مذہب بتاتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نجران کے نصاریٰ اور یہودیوں کے علما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہوئے اور آپس میں نزاع ہوا۔ یہود نے کہا: ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے۔ نصاریٰ نے کہا: نصرانی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا: تم کیوں جھگڑتے ہو؟ ابراہیم تورات کے نازل ہونے کے زمانے سے پہلے تھے اور نصرانیت تو ان (یہودیوں) کے زمانے سے ایک مدت دراز کے بعد نکلی ہے۔[1]

علم کے بغیر بحث و تکرار کی مذمت:

اس آیت میں ان لوگوں پر بھی انکار ہے جو بغیر علم حجت کرتے ہیں اور جاہل ہو کر اہلِ علم سے اُلجھتے ہیں۔ اہلِ کتاب کا ابراہیم علیہ السلام کے حق میں جھگڑنا جاہلانہ طور پر تھا نہ کہ کسی علم کی بنیاد پر۔ اگر وہ کسی شرعی مسئلے پر جو ان کی کتابوں میں نبی کی بعثت تک موجود ہے، جھگڑا کرتے تو یہ ایک معقول بات بھی تھی۔ لیکن جس بات کا علم رکھتے تھے، اس پر تو حجت نہ کی اور جس بات کا علم نہیں تھا، اس میں گفتگو کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس طرزِ عمل کی تردید فرمائی اور کہا کہ اس کو علام الغیوب کی طرف پھیر دو، جس کو تمام امور کے حقائق معلوم ہیں۔ اسی لیے یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔[2]

خیال کریں تو فرقہ جہمیہ معطلہ مؤولہ کا صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں جھگڑنا بھی اسی جنس کا ہے کہ جس بات کی ان کو خبر نہیں ہے، اس میں اُلجھتے ہیں۔ اپنی طرف سے ہر صفت کی تاویل کرتے ہیں اور سلف کے طریقے کے

---

[1] تفسیر الطبري (٦/ ٤٩٠) اس کی سند حسن ہے۔　[2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٨٥)

مطابق اس کا علم اللہ کو نہیں سونپتے۔ یہی حال مقلدین کا ہے کہ بے سوچے سمجھے ایجابِ تقلید میں سرگرداں ہیں اور اتباع کو، جس کا ان کو اللہ اور رسول نے حکم دیا ہے، پسند نہیں کرتے۔ خود تو جاہل اور بے علم ہیں اور علمائے کتاب و سنت سے بے فائدہ اُلجھتے ہیں۔

حنیف کا معنی اور ابراہیم علیہ السلام کی اتباع:

حنیف وہ ہے جو شرک سے یکسو ہو کر ایمان کی طرف آیا ہے، جیسے ابراہیم علیہ السلام تھے۔ یہ آیت اس طرح کی ہے، جیسے سورت بقرہ میں فرمایا تھا: ﴿ وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ۭ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰھٖمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ ﴾ [البقرۃ: ۱۳۵] ''اور انھوں نے کہا: تم یہودی یا عیسائی ہو جاؤ تو تم ہدایت پا جاؤ گے۔ (اے نبی!) کہہ دیجیے: (نہیں) بلکہ ہم تو ملتِ ابراہیم کی پیروی کرتے ہیں جو سب کو چھوڑ کر ایک اللہ کا ہو گیا اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔''

پھر فرمایا: ابراہیم کی متابعت کے بڑے حق دار وہی لوگ تھے، جنھوں نے ان کا اتباع کیا یا یہ نبی اور جو اس پر ایمان لائے ہیں، خواہ مہاجر ہیں یا انصار ہیں یا قیامت تک ان کے متبعین رحمہم اللہ۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ ہر نبی کے لیے کچھ نبیوں میں سے دوست دار تھے، میرے دوست دار میرے باپ اللہ کے خلیل ہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت زیرِ تفسیر پڑھی۔[1] (رواہ سعید بن منصور والترمذي والبزار)

عمومی تفسیر:

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ زجاج رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت اہلِ کتاب پر اس بات کے لیے حجت ہے کہ تورات اور انجیل کا نزول ابراہیم علیہ السلام کے بعد ہوا ہے۔ ان دونوں میں سے کسی ایک دین کا نام ان ادیان کے علاوہ نہیں آیا ہے۔ اسلام کا نام تو ہر کتاب میں موجود ہے۔[2] مگر اس قول میں نظر (اعتراض) ہے، کیوں کہ انجیل آیاتِ تورات سے بھری ہوئی ہے، اس میں موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کا ذکر آیا ہے، وہ یہود پر حجت ہے۔ اسی طرح زبور میں بہت جگہ شریعتِ موسیٰ علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔ اس کے شروع میں بشارتِ عیسیٰ علیہ السلام ہے، پھر تورات میں بہت سی پہلی شریعتوں کا ذکر ہوا ہے۔ ان کتب کو پہچاننے والا اس بات کو بہ خوبی جانتا ہے۔

انبیا کا درمیانی فاصلہ:

اس بات میں اختلاف ہے کہ ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے درمیان کتنی مدت گزری ہے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام

[1] سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۹۹۵) مسند البزار (۵/ ۳۴۵) سنن سعید بن منصور (۳/ ۱۰۴۷) البتہ سنن سعید بن منصور کی روایت میں ''نبیوں'' کی جگہ ''مومنوں'' کے الفاظ ہیں۔ صحیح الجامع، رقم الحدیث (۲۱۵۸)

[2] معاني القرآن (۱/ ۴۲۶)

کے درمیان کتنا زمانہ ہوا۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: ابراہیم علیہ السلام سے موسیٰ علیہ السلام تک ایک ہزار برس گزرے۔ موسیٰ علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام تک دو ہزار برس۔[1] کشاف میں بھی اسی طرح ہے۔[2] بعض نے کہا: موسیٰ علیہ السلام ابراہیم علیہ السلام سے پانچ سو پچھتر برس بعد ہوئے اور عیسیٰ علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام سے ایک ہزار چھے سو بتیس برس بعد آئے۔ کسی نے کہا: ابراہیم علیہ السلام سے پانچ سو پینسٹھ برس بعد موسیٰ علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام سے ایک ہزار نو سو بیس برس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام آئے۔[3] اللہ ہی جانے کتنی مدت ہوئی، کیوں کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے: ﴿ وَ قُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا ﴾ [الفرقان: ٣٨] ''اور ان کے درمیان (دیگر) بہت سی قوموں کو بھی (ہم نے ہلاک کر دیا)۔'' نیز فرمایا: ﴿ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ [إبراهيم: ٩] ''جنھیں صرف اللہ جانتا ہے۔''

آیت زیرِ تفسیر میں اس بات کی دلیل ہے کہ غلط بات پر جھگڑنا منع ہے، بلکہ حدیث میں تو حق بات کے لیے بھی جھگڑا ترک کرنے کی ترغیب آئی ہے۔ فرمایا کہ جس نے جھگڑنا چھوڑا، اگرچہ وہ حق پر ہو تو میں اس کا اللہ پر ضامن ہوں کہ اس کا ایک گھر جنت کے وسط میں ہوگا۔[4] ہاں احسن طریقے سے جھگڑنے کو جائز فرمایا ہے: ﴿ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ [النحل: ١٢٥] ''اور ان سے احسن طریقے سے بحث کیجیے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَلَا تُجَادِلُوْۤا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ [العنكبوت: ٤٦] ''اور تم اہلِ کتاب سے احسن انداز ہی سے بحث و تکرار کرو۔''

معلوم ہوا کہ جھگڑا کرنے کے جواز کو انھی مقامات تک محدود رکھے، جن میں فساد کی نسبت اصلاح زیادہ ہو۔ ان میں جھگڑا خوبی کے ساتھ ہو، سختی کے ساتھ نہ ہو۔ اس زمانے میں جھگڑے کا جو طریقہ جاری ہے، وہ سختی والا بھی نہیں ہے، بلکہ ایک دوسرے کو گالی گلوچ اور فواحش کا تبادلہ کرنا ہے۔ سو ایسے جھگڑے یقیناً حرام ہیں۔ اس قسم کے جھگڑالو لوگ درحقیقت دجال کے مددگار ہیں۔ مناظرہ اور جھگڑے کا احسن طریقہ وہی ہے جو قرآن و حدیث میں اللہ اور رسول کی طرف سے برتا گیا ہے، جس نے اس طریقے سے تجاوز کیا، اپنے آپ کو غالب اور دوسرے کا مغلوب ہونا پسند کیا، وہ گمراہ ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کو جو حنیف فرمایا ہے، تو اسی لیے کہ وہ سارے ادیانِ باطلہ سے الگ ہو کر صرف اسلام کے ایک صراطِ مستقیم پر آ گئے تھے۔ کسی نے کہا: حنیف وہ ہے، جو موحد ہو، ختنہ کرے، قربانی کرے، نماز میں قبلہ رو ہو۔ یہ دین سارے ادیان میں سے سب سے زیادہ اچھا، سب سے زیادہ آسان اور اللہ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان کی سب دلیلیں باطل کر دیں اور ان کو ان کے دعوے میں جھوٹا ثابت کر دیا۔[5]

---

[1] ہمارے پاس جو تفسیر القرطبی کا مطبوعہ نسخہ ہے، اس میں موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان دو ہزار سال کے بجائے ایک ہزار سال کا ذکر ہے۔ دیکھیں: تفسير القرطبي (٤/ ١٠٧) [2] الكشاف (١/ ٣٩٨) [3] فتح البيان (٢/ ٢٦١)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٠٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٧٣) [5] تفسير الطبري (٦/ ٤٩٤)

کہہ دیا کہ ابراہیم مشرک نہیں تھے، جس طرح تم مشرک ہو، مسیح اور عزیر علیہما السلام کو اللہ بتاتے ہو۔ حسن رحمہ اللہ نے کہا: ہر مومن خواہ وہ گزر گیا ہو یا ابھی آنے والا ہے، ابراہیم علیہ السلام کا ولی ہے۔[1] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابراہیم علیہ السلام سے دو مناسبتیں تھیں، ایک یہ کہ آپ ان کی نسل و ذریت اور اولاد میں سے تھے، دوسری یہ کہ آپ کا دین ان کے دین کے موافق آیا۔ و لله الحمد.

وَدَّتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ
اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ
وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَقَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ
اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْۤ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ
النَّهَارِ وَاكْفُرُوْۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْۤا اِلَّا لِمَنْ
تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ
اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ
يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ ۙ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ
يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ تمھیں گمراہ کرنا چاہتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ ہی کو گمراہ کر رہے ہیں اور وہ شعور نہیں رکھتے (69) اے اہلِ کتاب! تم اللہ کی آیتوں کا انکار کیوں کرتے ہو، حالاں کہ تم خود (ان کی سچائی کے) گواہ ہو؟ (70) اے اہلِ کتاب! تم حق کو باطل کے ساتھ کیوں خلط ملط کرتے ہو؟ اور تم جانتے بوجھتے حق کو کیوں چھپاتے ہو؟ (71) اور اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ نے (اپنے لوگوں سے) کہا: مسلمانوں پر جو چیز نازل کی گئی ہے اس پر تم صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس کا انکار کر دو، تاکہ وہ بھی (ایمان سے) پھر جائیں (72) اور تم اسی کا یقین کرو جو تمھارے دین کا پیروکار ہے، آپ کہہ دیجیے: حقیقی ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے۔ (اور کہتے

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٧٥)

ہیں: مت مانو) کہ کسی کو ویسی چیز مل سکتی ہے جو تمھیں ملی ہے یا (جس سے) وہ تمھارے رب کے ہاں تم پر حجت قائم کر سکیں۔ کہہ دیجیے: بے شک فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ وسعت والا، خوب جاننے والا ہے (73) وہ خاص کرتا ہے اپنی رحمت سے جسے چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے (74)

یہود کا مسلمانوں کے لیے حسد اور اُن کی سازش:

موضح قرآن میں ہے: یعنی تورات کے قائل ہو، پھر اسی کے خلاف کہتے ہو۔ تورات کے بعض حکم تو موقوف ہی کر ڈالے تھے، اپنی غرض کے لیے اور بعض آیتوں کے معنی پھیر ڈالے تھے اور بعض چیز چھپا رکھی تھی، ہر کسی کو خبر نہیں کرتے تھے، جیسے پیغمبر آخر الزمان کے بارے میں جو بیان تورات میں تھا۔ بعض یہودیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ تم صبح جا کر ظاہر طور پر مسلمان بن جاؤ، شام کو پھر جاؤ، شاید مسلمان بھی پھر جائیں کہ یہ لوگ منصف تھے کہ اپنا دین چھوڑ کر ہمارے دین میں آئے تھے۔ پھر کچھ ایسی ہی غلطی پائی کہ پھر گئے۔ اور آپس میں کہا کہ دل سے ہرگز یقین نہ کرو، مگر اپنے دین والوں کی بات پر، تاکہ کسی کے دل میں اسلام کا سچ داخل نہ ہو جائے۔ لہٰذا اللہ نے ان کا فریب کھول دیا اور فرمایا کہ تو کہہ ہدایت وہی ہے جو اللہ دے، تمھارے فریب سے کوئی گمراہ نہیں ہوگا، مگر تم اس بات پر حسد کرتے ہو کہ پہلے نبوت اور بزرگی بنی اسرائیل میں تھی، اب کسی اور فرقے میں کیوں ہوئی یا دین کی مددگاری میں ہمارے مقابل اور کوئی کیوں ہوا، لہٰذا یہ اللہ کا فضل ہے، جس کو چاہا، اس نے دے دیا، یہ کسی کا حق نہیں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خبر دی ہے کہ یہودیوں کو مومنین پر کتنا حسد تھا، وہ ان کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں، سو اس حسد اور ضد کا وبال انھی پر پڑے گا، گو وہ نہیں جانتے کہ ان کا وہ مکر اُن ہی کے گلے کا ہار ہوگا۔ پھر انکار کے طریقے سے یہ فرمایا کہ تم جان بوجھ کر اللہ کی آیتوں کا انکار کیوں کرتے ہو؟ نبی اکرم ﷺ کی تعریف کو پوشیدہ کیوں رکھتے ہو؟ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یہود صبح کی نماز نبی مکرم ﷺ کے ساتھ پڑھتے تھے، پچھلے پہر کافر ہو جاتے، یہ ان کا مکر تھا کہ لوگ اس حال کو دیکھ کر کہیں کہ کچھ تو بات ہے، جو وہ ایمان لا کر پھر گئے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ گروہِ یہود نے کہا: جب تم اصحابِ محمد ﷺ سے ملو تو دن کے پہلے حصے میں ایمان لاؤ اور آخر دن میں اپنی نماز پڑھو، شاید وہ کہیں کہ اہلِ کتاب ہم سے زیادہ جانتے بوجھتے ہیں۔[2] یہی قول امام قتادہ، سدی، ربیع و ابی مالک رحمہ اللہ کا ہے۔[3] یہ بھی کہتے تھے کہ تم اپنا بھید سوائے اپنے ہم مذہبوں کے دوسروں پر

---

(1) تفسير الطبري (٦/ ٥٠٨) (2) تفسير الطبري (٦/ ٥٠٨) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

(3) تفسير الطبري (٦/ ٥٠٧) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٧٩)

ظاہر نہ کرو کہ وہ ایمان لا کر اُلٹی تم پر حجت قائم کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا: ہدایت دینے والا اللہ ہے، جو واضح آیات اور قطعی دلائل اور واضح حجتیں اس نے اپنے بندے پر اُتاری ہیں، ان پر مومنین کے دل پورا ایمان لاتے ہیں۔ اے یہودیو! تم نے اگر پیغمبر آخر الزمان ﷺ کی نشانیوں کو چھپایا تو کیا ہوا۔

علم کسی کی میراث نہیں:

اہلِ کتاب یہ بھی کہتے تھے کہ تم اپنا علم مسلمانوں کو نہ بتاؤ، کہیں وہ اس کو سیکھ کر تمھاری برابری نہ کریں یا تم سے ممتاز نہ ہو جائیں یا اللہ تعالیٰ کے سامنے تم پر حجت قائم نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ فضل اللہ کے ہاتھ میں ہے، تمام معاملات اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں، وہ جس کو چاہے علم و فضل بخشے، کیوں کہ دینے والا اور منع کرنے والا وہ ہے، تم نہیں ہو۔ تم اپنا علم ان کو نہ بتاؤ گے تو کیا ہوگا، اللہ تعالیٰ ان کو بتا دے گا۔ وہ جس کو چاہے گمراہ کر دے، بصارت و بصیرت کو اندھا بنا دے، دل پر مہر لگا دے، آنکھ پر پردہ ڈال دے۔ حجتِ تامہ اور حکمتِ بالغہ اسی کے لیے ہے۔ اے مسلمانو! تم پر اللہ کی مہربانی ہے کہ تم کو ایسا پیغمبر بھیجا، جو سب انبیا سے اشرف ہے، پھر تم کو وہ شریعت دی، جو تمام شریعتوں سے اکمل ہے۔[1]

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ اس جگہ طائفۂ اہلِ کتاب سے بنی نضیر کے یہود مراد ہیں۔ یہ اور بنو قریظہ اور بنو قینقاع مسلمانوں کی ایک جماعت کو اپنے دین کی طرف بلاتے تھے یا سارے اہلِ کتاب مراد ہیں۔ حرف ﴿مِنْ﴾ بیان کے لیے ہے۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے کہا کہ سورت آلِ عمران میں جہاں کہیں اہلِ کتاب کا ذکر آیا ہے، ان سے نصاریٰ مراد ہیں۔[2] مگر اس میں نظر ہے، کیوں کہ اس سورت میں بہت جگہ یہودیوں کو خطاب ہے، جس طرح اسی آیت زیرِ تفسیر میں آیات اللہ سے مراد نبی اکرم ﷺ کی نبوت کے دلائل ہیں، جو پہلے انبیا کی زبانی ان کی کتابوں میں منقول ہیں یا وہ ساری نشانیاں، جن کو وہ دشمنی اور عناد کی وجہ سے پوشیدہ رکھتے تھے۔

حق کو باطل سے ملانے کا مطلب یہ ہے کہ تحریف کرتے ہو یا یہودیت و نصرانیت کو اسلام سے ملاتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے پاس سوائے دینِ اسلام کے اور کوئی دین مقبول نہیں۔ اہلِ کتاب کے رؤسا اور شرفا سفلوں (کم تر درجے کے لوگوں) سے یہ بات کہتے کہ تم صبح کو مومن شام کو کافر بنو، تا کہ مسلمانوں کے دل میں شک پڑے، وہ متزلزل ہو جائیں، یہ معلوم ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں کو مضبوطی دی ہے کہ دشمنوں کی ہوا بندی سے کبھی وہ جنبش نہیں کر سکتے۔ عبداللہ بن صیف، عدی بن زید، حارث بن عوف وغیرہم نے یہ بات کہی تھی تو اس پر یہ آیت اتری۔[3] سلف کی ایک جماعت سے یوں ہی مروی ہے۔

---

[1] تفسير ابن كثير (١/ ٤٨٧) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٧٦) [3] تفسير الطبري (٦/ ٥٠٤)

قرآن کی مشکل آیت:

اہلِ علم نے کہا ہے کہ اس سورت میں یہ آیت بڑی مشکل آیت ہے۔ واحدی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ یہ آیت قرآن کی مشکلات سے ہے۔ تفسیراً و اعراباً میں نے اہلِ تفسیر و معانی کے اقوال کو جانچا، کوئی قول ایسا نہ پایا، جو اول آیت سے آخر آیت تک مطرد (چھوڑا ہوا) ہو۔ بیانِ معنی اور صحتِ نظم کو ظاہر کر دے۔[1] سلیمان جمل نے اقوالِ مذکورہ کو ذکر کیا ہے۔ رحمت سے مراد اسلام ہے یا قرآن یا نبوت یا یہ سب معنی۔ بہرحال یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ نبوت بغیر خصوصیت اور فضیلت کے نہیں ملتی۔ یہ بات نہیں کہ کسی استحقاق سے ہاتھ آ جائے یا کسب سے ملے۔[2]

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝75 بَلٰي مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝76

اور اہلِ کتاب میں سے بعض وہ ہیں کہ اگر آپ ان کے پاس خزانے کا ڈھیر امانت رکھیں تو وہ بھی آپ کو ادا کر دیں گے اور ان میں سے بعض وہ ہیں کہ اگر آپ ان کے پاس ایک دینار امانت رکھیں تو وہ آپ کو ادا نہیں کریں گے الا یہ کہ آپ ہمیشہ ان (کے سر) پر کھڑے رہیں۔ یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں: ہم پر اُمّیوں (عربوں) کی بابت کوئی گناہ نہیں اور وہ جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں (75) کیوں نہیں! (بلکہ مواخذہ ہوگا، البتہ) جو شخص اپنا عہد پورا کرے اور اللہ سے ڈرے تو بے شک اللہ متقیوں کو پسند کرتا ہے (76)

یہود کی امانت داری اور خیانت کا ذکر:

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ سنایا ہے کہ جن کی یہ نیت ہے کہ پرایا حق کھانے کو یہ مسئلہ بنا لیا کہ ہمارے لیے غیر دین والوں کی امانت میں خیانت کرنا جائز ہے، ان کی بات دین کے بارے میں کیا سند ہو سکے گی؟ ہمارے یہاں بھی حربی کافر کا مال زور سے لینا جائز ہے، لیکن امانت میں خیانت کرنا روا نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں:

---

[1] اللباب في علوم الكتاب (٥/ ٣٢٨) [2] فتح البيان (٢/ ٢٦٤_ ٢٦٧)

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ یہودی خائن ہیں، پھر مسلمانوں کو ڈرایا ہے کہ تم ان کے پھندے میں نہ آنا، ان میں دونوں طرح کے آدمی ہوتے ہیں، ایک وہ ہیں کہ اگر ایک خزانہ ان کے حوالے ہو تو دے دیں اور ایک وہ ہیں کہ ایک دینار بھی مشکل سے ادا کریں۔ زور دار مطالبے اور آہ و زاری کے بغیر وہ امانت ان کے ہاتھ سے نکالنی مشکل ہے۔[1] قنطار کے معنی اسی سورت کے شروع (آیت نمبر ۱۵) میں گزر چکے ہیں۔ دینار معروف ہے۔

دینار کا معنی:

مالک بن دینار رحمہ اللہ نے کہا: دینار اس لیے کہتے ہیں کہ دین اور نار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس نے حق سے لیا تو وہ اس کا دین ہے، اگر ناحق لیا تو پھر اس کے لیے نار ہے۔[2] کسی نے کہا: دینار کا آخر نار ہے اور درہم کا آخر ''ہم'' (غم) ہے۔

ترا کہ مالک دینار نیستی سعدی   طریق نیست بجز زہد مالک دینار

''اے سعدی! تو چونکہ دینار کا مالک نہیں ہے، تیرے لیے دنیا کی لذتوں سے کنارہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں، کیوں کہ تیرے لیے دینار نہیں۔'' (کہتے ہیں کہ سعدی کو چالیس دینار ترکۂ پدری میں ملے تھے، چالیس برس میں خرچ کیے۔ کسی سے کچھ نہ لیا)

ایک بنی اسرائیلی کا واقعہ:

اس جگہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ''کتاب الکفالۃ'' صحیح بخاری سے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل مرفوع حدیث نقل کی ہے۔ اس میں بنی اسرائیل کے ایک آدمی کا قصہ مروی ہے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر ایک ہزار دینار قرض دیے تھے، قرض دار کو جب کوئی سواری نہ ملی کہ وہ قرض لے جاتا تو ایک لکڑی میں سوراخ کر کے اس کے اندر ہزار دینار رکھ کے اللہ پر توکل کر کے دریا میں ڈال دیا اور ایک خط لکھ کر ساتھ رکھ دیا۔ وہ لکڑی قرض خواہ کے ہاتھ لگی، اس نے اپنا قرض پالیا۔ اس حدیث کو بخاری نے کئی جگہ تعلیقاً بصیغہ جزم روایت کیا ہے، بعض جگہ مسند بھی روایت کر دیا ہے۔ (رواہ أحمد مطولا والبزار)[3]

ادنیٰ مناسبت سے حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس حدیث کو اس جگہ وارد کیا ہے، اس میں امانت داری اور توکل علی اللہ کا انجام مذکور ہے کہ ایسے امانت دار لوگ بھی تھے، جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی گواہی اور کفالت پر قرض دیا۔ قرض دار نے بھی حقِ امانت ادا کر دیا، ایک وہ لوگ ہیں، جو لوگوں کا مال امانت لے کر کھا جاتے ہیں۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ٤٨٨) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۲/ ٦٨٣)

[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۱٦۹) مسند أحمد (۲/ ۳٤٨) تفسیر ابن کثیر (۱/ ٤٨٨)

کسی کا ناحق مال کھانا جائز نہیں:

اہلِ کتاب کہتے تھے ہمارے لیے عرب کا مال کھا لینا درست ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا: تم دغا باز اور جھوٹے ہو۔ کسی کا مال ناجائز و ناروا کھانا جائز نہیں ہے، وہ عرب ہوں یا عجم۔ ایک آدمی نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ ہم لڑائی میں اہلِ ذمہ کی مرغی یا بکری لے لیتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟ کہا: تم کیا کہتے ہو؟ کہا: ہم کہتے ہیں کہ اس کے لینے میں کوئی حرج نہیں۔ کہا: یہ تو وہی اہلِ کتاب کی سی بات ہوئی: ﴿ لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّنَ سَبِيلٌ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) جب اہلِ ذمہ نے جزیہ ادا کر دیا، اب ان کا مال ان کی خوشی کے بغیر لینا کسی طرح بھی حلال نہیں ہے۔[1]

بہ نیم بیضہ کہ سلطان ستم روا دارد　　　زنند لشکریانش ہزار مرغ بسیخ

”جو بادشاہ نصف انڈے کا ظلم جائز سمجھتا ہے تو اس کے فوجی ہزاروں مرغ سیخ پر بھون لیتے ہیں۔“

سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب اہلِ کتاب نے یہ بات کہی تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ اللہ کے دشمن جھوٹے ہیں، جاہلیت کی کوئی بات ایسی نہیں، جو میرے قدموں کے نیچے نہ ہو، مگر امانت کہ وہ ادا کی جاتی ہے، خواہ کوئی نیک ہو یا بد۔[2] (رواه ابن أبي حاتم) پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے اہلِ کتاب! جو کوئی تم میں اپنا عہد پورا کرے گا اور اللہ سے ڈرے گا، اللہ اس کو دوست رکھے گا۔ عہد سے مراد محمد ﷺ پر جب وہ مبعوث ہوں، ایمان لانا ہے، کیوں کہ تمام انبیا اور اُمتوں سے اس بات کا عہد و پیمان لیا گیا تھا۔

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اہلِ کتاب کی دین میں خیانت کا بیان کر دیا تو اب اس آیت میں ان کی مال میں خیانت کا بیان فرمایا۔ دینار کا وزن مقرر ہے، چوبیس قیراط ہوتا ہے، ہر قیراط درمیانے درجے کے تین جَو کو کہتے ہیں: سب بہتر (۷۲) جَو ہوئے۔ مطلب یہ ہوا کہ ان میں ایک وہ ہیں جو بڑی سے بڑی امانت کو ادا کرتے ہیں، پھر تھوڑی امانت کو کیوں کر ادا نہ کریں گے۔ ایک وہ ہیں، جو تھوڑی امانت کو بھی ادا نہیں کرتے، وہ بڑی امانت کو کیا ادا کریں گے۔ جو کثیر میں امین ہے، وہ قلیل میں بالاولیٰ امین ہوگا۔ جو قلیل میں خیانت کرنے والا ہے، وہ کثیر میں بالاولیٰ خیانت کرے گا۔[3] وہ کہتے تھے کہ ہماری کتاب میں لکھا ہے کہ عرب کا مال لے کر ہضم کر جاؤ، کیوں کہ وہ ہمارے دین کے مخالف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر رد کیا کہ یہ دعویٰ بالکل جھوٹ ہے۔

---

[1] تفسیر الطبري (٦/ ٥٢٤) اس کی سند حسن ہے۔

[2] تفسیر الطبري (٦/ ٥٢٢) تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٦٨٤) یہ روایت مرسل ہے۔

[3] فتح البیان (٢/ ٢٦٨)

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۪ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۷۷

بے شک جو لوگ اللہ کا عہد اور اپنی قسمیں تھوڑی قیمت کے بدلے بیچ ڈالتے ہیں، ان لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا اور قیامت کے روز اللہ ان سے کلام نہیں کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے ⑰⑦

عہد کے مخالفین کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں:

یہ یہودیوں کی صفت تھی کہ ان سے اللہ نے اقرار لیا تھا اور قسمیں دی تھیں کہ ہر نبی کے مددگار رہیں، لیکن وہ دنیا کی غرض کے لیے پھر گئے۔ جو دنیا کے لیے جھوٹی قسم کھاتا ہے، اس کا یہی حال ہے۔ اہلِ کتاب نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا کہ ہم محمد ﷺ کی اتباع کریں گے، ان کی صفت اور معاملے کو لوگوں سے بیان کر دیں گے۔ اس عہد پر جھوٹی قسم کھائی تھی۔ دنیائے فانی اور رذیل کے پیچھے تھوڑے داموں پر عہد توڑ بیٹھے، اللہ تعالیٰ نے کہا: اب آخرت میں تمھارا کچھ حصہ نہیں رہا اور تم اس لائق نہیں ہو کہ تم سے بات کی جائے یا تمھاری طرف نظر کی جائے، تم ان گناہوں سے کسی طرح پاک نہیں ہوگے، جہنم کے ایندھن بنو گے۔

جھوٹی قسم کھانے والے، ازار لٹکانے والے اور احسان جتلانے والے کا انجام:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت کے متعلق کچھ حدیثیں آئی ہیں، ہم ان کو ذکر کرتے ہیں۔ سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ تین آدمی ہیں، جن سے اللہ بات کرے گا، نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا، ان کے لیے عذابِ الیم ہے۔ میں نے کہا اے اللہ کے رسول! وہ تو برباد اور تباہ ہوئے۔ نبی کریم ﷺ نے تین بار یہی بات کہی، پھر فرمایا کہ ازار کو لٹکانے والا، جھوٹی قسم کھا کر مال کی نکاسی (فروخت) کرنے والا اور احسان جتلانے والا۔[1] (رواه أحمد و مسلم و أهل السنن)

دوسری روایت یہ ہے کہ وہ تین آدمی جن کو اللہ دشمن رکھتا ہے، یہ ہیں: قسم کھا کر مال فروخت کرنے والا، مغرور فقیر اور احسان چڑھانے والا بخیل۔[2] (رواه أحمد) یہ حدیث غریب ہے۔ عدی بن عمیرہ کندی رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک

① صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦) مسند أحمد (٥/ ١٤٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٨٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢١١) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٦٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٠٨)

② مسند أحمد (٥/ ١٥١) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ١٦٤)

کندی مرد نے جس کو امرؤ القیس بن عامر کہتے ہیں، ایک حضرمی مرد سے رسول اللہ ﷺ کے سامنے زمین کے بارے میں جھگڑا کیا۔ نبی اکرم ﷺ نے حضرمی سے کہا کہ گواہ لاؤ، اس کے پاس گواہ نہیں تھا۔ امرء القیس سے کہا: قسم کھا، حضرمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ نے اس سے قسم لی، ربِ کعبہ کی قسم! میری زمین گئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جس نے جھوٹی قسم اس لیے کھائی کہ کسی کا مال لے، وہ مر کر جب اللہ سے ملے گا، اللہ اس پر سخت غضب ناک ہوگا، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) امرؤ القیس نے کہا: بھلا جو کوئی جھوٹی قسم کھانا چھوڑ دے اس کو کیا ملے گا؟ فرمایا: جنت۔ کہا: آپ گواہ رہیں کہ میں نے اس کو جنت کے واسطے چھوڑ دیا۔[1] (رواه أحمد و النسائي)

اس طرح کی چھے حدیثیں حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھی ہیں۔ ایک آدمی بازار میں قسم کھا کر سودا بیچتا تھا، اس پر یہ آیت اُتری۔[2] (رواه البخاري) صحاح وسنن میں جھوٹی قسم پر سخت وعید آئی ہے۔ وہ احادیث گویا آیتِ باب کی تفسیر ہیں۔

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۷۸

اور بے شک ان میں سے ایک گروہ کتاب پڑھتے ہوئے زبان کو مروڑتا ہے، تاکہ تم اسے کتاب کا حصہ سمجھو، حالاں کہ وہ کتاب میں سے نہیں ہے اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے، حالاں کہ وہ اللہ کی جانب سے نہیں اور وہ جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں (78)

یہود کا زبان موڑ کر کلام میں تحریف کرنا:

یعنی ان پڑھوں کو دھوکا دیتے ہیں، اپنی عبارت بنا کر تورات و انجیل کی طرح پڑھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خبر دی ہے کہ یہودیوں میں ایک گروہ کلمات میں تحریف کرتا ہے، یعنی ان کی جگہ بدل ڈالتا ہے، اللہ تعالیٰ کی باتوں کی مراد کو تبدیل کر دیتا ہے، تاکہ جاہل لوگ اس کو اللہ کی کتاب کی بات سمجھیں اور اللہ کی طرف منسوب سمجھیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا: وہ جان بوجھ کر جھوٹ باتیں بناتے ہیں۔ امام مجاہد، شعبی، حسن، قتادہ اور ربیع رحمہم اللہ نے کہا کہ زبان مروڑنے سے تحریف کرنا مراد ہے۔[3]

اسی کو بخاری نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ وہ تحریف و ازالہ مراد لیتے ہیں۔ اللہ کی

---

(1) مسند أحمد (٤/ ١٩١) سننِ النسائي الكبرىٰ (٣/ ٤٨٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه أحمد والطبراني و رجالهما ثقات" (مجمع الزوائد: ٤/ ٣١٩)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٨٢) تفسير ابن كثير (١/ ٤٨٩)

(3) تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٨٩)

مخلوق میں کسی کو یہ قدرت نہیں کہ وہ اللہ کی کسی کتاب کا کوئی لفظ بدل ڈالے، لیکن وہ اس کی معنوی تحریف کرتے تھے۔① وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا کہ تورات اور انجیل اسی طرح ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے اتاریں تھیں، ان کا ایک حرف بھی نہیں بدلا گیا، ہاں وہ تحریف اور تاویل کی وجہ سے گمراہ ہوگئے۔ کچھ کتابیں اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، اپنے جی سے بناتے تھے، پھر کہتے: یہ اللہ کی طرف سے کتاب ہے، حالاں کہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتی تھی، صرف ان کی گھڑہت تھی، کیوں کہ اللہ کی کتابیں محفوظ ہیں، بدل نہیں سکتیں۔② (رواہ ابن أبي حاتم)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہب رحمہ اللہ کی مراد اگر وہ کتابیں ہیں جو ان کے ہاتھ میں ہیں تو کوئی شک نہیں کہ ان میں تبدیلی اور تحریف اور کمی بیشی موجود ہے۔ رہی ان مواقع کی تعریب عربی زبان میں تو اس میں بھی بہت بھول چوک کمی بیشی اور کھلا وہم موجود ہے، ان میں کثیر لوگوں بلکہ اکثریت بلکہ سب کا فہم فاسد ہے اور اگر اس سے مراد اللہ کی کتابیں ہیں، جو اس کے پاس سے آئی تھیں تو وہ کتابیں بلاشبہہ محفوظ ہیں، ان میں کوئی شے داخل نہیں ہوئی۔③

لفظی اور معنوی تحریف:

میں کہتا ہوں: مسئلہ تحریف میں دو قول ہیں: ایک یہ کہ لفظی تحریف ہوئی۔ دوسرے یہ کہ معنوی ہوئی۔ ہر طرف ایک گروہ گیا ہے۔ محققین نے کہا ہے کہ بلکہ دونوں طرح کی تحریف ہوئی ہے، لفظ و معنی دونوں کا محفوظ رہنا④ صرف قرآن کریم کی خصوصیت ہے، دیگر کتابوں کے الفاظ اور معانی معجزہ نہیں تھے کہ ان میں لفظی تحریف نہ ہوسکتی، یہ ذمہ تو اللہ تعالیٰ نے خاص قرآن پاک کے لیے لیا ہے: ﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ [الحجر: ٩]

''بیشک یہ کتابِ نصیحت ہمیں نے اتاری ہے اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔''

ظاہر نظمِ قرآنی لفظی تحریف کا تقاضا کرتا ہے۔ آج جس قدر نسخے تورات اور انجیل کے ملتے ہیں، ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے، اگر تحریف لفظی نہیں ہوئی ہے تو ان الفاظ کے فرق اور عبارتوں میں تفاوت کی کیا وجہ ہے؟ مضامین میں باہم ٹکراؤ اور مقاصد کا فرق علاحدہ ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اہلِ کتاب نے اپنی کتابوں میں ہر طرح سے تبدیلی کی ہے۔ دنیا کمانے کی خاطر کسی لفظ کو نکال کر اس کی جگہ کوئی اور لفظ رکھ دیا، خواہ وہ وہاں مناسب

---

① صحيح البخاري (٦/ ٢٧٤٥) ② تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٨٩) ③ تفسير ابن كثير (١/ ٤٩١)

④ قرآنِ کریم کا معنوی تحریف سے محفوظ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے معنی میں تحریف کی وضاحت کرنے والے اہلِ حق ہر دور میں موجود رہیں گے، جس سے ہر ذی شعور بہ آسانی سمجھ لے گا کہ قرآن کے فلاں لفظ کے معنی و مفہوم میں یہ تبدیلی کی گئی ہے، ورنہ بہت سے اہلِ باطل نے اپنے خود ساختہ نظریات و عقائد کے اثبات کے لیے معنوی تحریف کا ارتکاب کیا ہے، جیسے غلام احمد پرویز ہے۔ بریلوی مترجم ہیں، فراہی گروہ ہے اور کئی دیگر اہلِ باطل ہیں، جیسا کہ آگے خود فاضل مفسر رحمہ اللہ نے بھی وضاحت کی ہے۔ هداهم الله تعالىٰ: [ص۔ي]

ہو یا نہ ہو۔ کسی جگہ لفظ کے معنی اور طرح لکھ دیے۔ ہر مذہب وملت کے نالائق اور بد دین لوگ اسی طرح کیا کرتے ہیں۔ قرآنِ کریم باوجودیکہ حفاظت کے اعلیٰ مرتبے پر واقع ہے، اہلِ بدعت و نیچر اور اہلِ رائے ہمیشہ اس کے معنی بدل کر آیت کو اپنے باطل مذہب اور فاسد عقیدے اور غلط مقصد پر چپکانا چاہتے ہیں، اگرچہ ان کا وہ داؤ کتاب وسنت کے علما کے سامنے اللہ کی حفاظت اور سنتِ نبوی کی تائید کی بدولت نہیں چلتا۔ مناظرے کے وقت اُلٹے منہ کی کھاتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ بھی قول ہے کہ آیت زیرِ تفسیر یہود و نصاریٰ کے حق میں اُتری ہے۔ انھوں نے تورات اور انجیل میں زیادتی (تحریف) کر دی، جو بات اللہ کی کتاب میں نہیں تھی، وہ اس میں ملا دی۔[1]

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾

کسی شخص کو لائق نہیں کہ اللہ اسے کتاب وحکمت اور نبوت عطا کرے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ، بلکہ (وہ کہے گا:) تم رب والے بن جاؤ، کیوں کہ تم اس کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور خود بھی اسے پڑھتے ہو (79) اور وہ تمھیں یہ حکم نہیں دے گا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو رب بنا لو، کیا وہ تمھیں کفر کا حکم دے گا جب کہ تم مسلمان ہو چکے؟ (80)

نبی اپنی بندگی کی دعوت دیتا ہے نہ غیر کی:

یہودی مسلمانوں سے کہتے تھے کہ تمھارا نبی کہتا ہے کہ اللہ کی بندگی کرو، ہم تو پہلے سے اسی کی بندگی کرتے ہیں، مگر وہ چاہتا ہے کہ میری بندگی کرو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس کو اللہ نبی بنائے اور وہ لوگوں کو کفر سے نکال کر اسلام میں داخل کرے، وہ کیوں کر ان کو کفر سکھائے گا؟ وہ تو یہ کہتا ہے کہ تم میں جو پہلے دین داری تھی، کتاب کا پڑھنا اور سکھانا وہ اب نہیں رہی، لہٰذا اب میری صحبت میں وہی کمال حاصل کرو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب اَحبارِ یہود اور نصاریٰ اہلِ نجران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جمع ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کہا: مسلمان ہو جاؤ، تو ابو رافع قرظی نے کہا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم تمھیں پوجیں، جس طرح نصاریٰ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو

[1] تفسير البغوي (٢/ ٥٩)

پوجتے ہیں؟ ایک نجرانی نصرانی جس کو رئیس کہتے تھے: بولا کیا تمھاری یہی خواہش ہے، اسی طرف تم ہمیں بلاتے ہو؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: معاذ اللہ کہ ہم غیر اللہ کو پوجیں یا غیر اللہ کی عبادت کا کسی کو حکم دیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس لیے بھیجا ہے نہ اس بات کا مجھے حکم دیا ہے، اس پر یہ آیت اتری۔[1] (رواہ محمد بن إسحاق)

جب کسی نبی و رسول کو یہ بات زیبا نہیں ہے تو پھر کسی اور آدمی کو تو بطریقِ اولی لائق نہیں ہو سکتی، اسی لیے امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے: کسی مومن کو لائق نہیں کہ وہ لوگوں کو اپنی عبادت کا حکم کرے۔ اہلِ کتاب اپنے احبار و رہبان کو پوجتے تھے،[2] جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ [التوبۃ: ۳۱] ”انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علما اور درویشوں کو (اپنا) رب بنا لیا۔“ سنن ترمذی میں مروی ہے کہ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! انھوں نے تو ان کو نہیں پوجا، فرمایا: ہاں ان کے علما، فقرا نے جو کچھ ان کے لیے حلال و حرام کر دیا تھا، انھوں نے اس کو مان لیا، یہی ان کی عبادت تھی۔[3]

اہلِ رائے کی پیروی ان کی عبادت ہے:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس مذمت اور جھڑک میں احبار، رہبان، مشائخ، جہلا اور گمراہ سب داخل ہیں۔ اس کے خلاف رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے پیروکاروں میں سے باعمل علما اس بات کا حکم کرتے ہیں، جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے ان کو کیا ہے یا جو رسولوں سے ان کو پہنچا ہے اور وہ اسی چیز سے منع کرتے ہیں، جس سے اللہ اور رسولوں نے منع فرمایا ہے۔ سارے رسول خالق و مخلوق کے درمیان اللہ کے سفیر ہیں۔ وہ رسالت کے حامل اور اللہ کی امانت کو پہنچانے والے ہیں، جیسا چاہیے تھا، انھوں نے ویسا ہی مخلوق کو نصیحت اور تبلیغ کرنے کا حق ادا کیا۔[4]

سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث اس بات پر نصِ قاطع ہے کہ نصِ صریح کو چھوڑ کر اہلِ علم کی رائے کا اتباع کرنا، ان کی عبادت ہے، جب اس طرح کا اتباع ہوگا تو وہ علما اور فقرا ان کے معبود ٹھہریں گے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ لوگوں کی تقلید شرک ہے، اس کی اصل اہلِ کتاب کے پاس سے آئی ہے۔ رسولوں کا کہنا تو یہ ہے کہ تم ربانی بنو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما و سیدنا ابو رزین رضی اللہ عنہ وغیرہما نے کہا ہے کہ ربانیین کے معنی ہیں: حکما، علما اور حلما۔ امام حسن رحمہ اللہ وغیرہ نے کہا: فقہا، یعنی عارفِ کتاب و سنت۔ یہی سعید بن جبیر و قتادہ و عطاء خراسانی و عطیہ وعوفی و ربیع رحمہم اللہ کا قول ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ کا دوسرا قول یہ ہے کہ مراد اہلِ عبادت و اہلِ تقویٰ ہیں۔

رسولوں کی دعوت:

امام ضحاک رحمہ اللہ نے ﴿ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ ﴾ کے یہ معنی کہے ہیں کہ جس نے قرآن سیکھا ہے، اس

---

[1] تفسیر الطبري (٦/ ٥٣٩) تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٦٩٣) اس کی سند حسن ہے
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٢/ ٦٩١)
[3] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٠٩٥) السلسلة الصحیحة (٣٢٩٣)
[4] تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٩٢)

پر حق ہے کہ فقیہ ہو۔[1] ﴿ تُعَلِّمُوْنَ ﴾ کے معنی ہیں "تَفْهَمُوْنَ"۔ بعض نے ﴿ تُعَلِّمُوْنَ ﴾ بہ تشدید تعلیم سے بھی پڑھا ہے۔ ﴿ تَدْرُسُوْنَ ﴾ سے الفاظ کا حفظ کرنا مراد لیا ہے۔ پھر یہ فرمایا کہ تمھیں کوئی بشر سوائے اللہ کے کسی کی عبادت کا حکم نہیں کرتا، خواہ وہ اللہ کے سوا ہستی نبی مرسل ہو یا کوئی مقرب فرشتہ، کیا تمھیں اسلام کے بعد کفر کا حکم کرے گا؟ ایسا کام وہی شخص کرتا ہے جو غیر اللہ کی عبادت کی طرف بلاتا ہے، سو جس نے ایسا کیا، وہی داعی الی الکفر ہے۔ انبیا تو ایمان لانے کا حکم کرتے ہیں۔ ایمان یہ ہے کہ صرف اللہ کو پوجے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ﴾ [الأنبياء: ٢٥] "اور آپ سے پہلے ہم نے جو بھی رسول بھیجا اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ بے شک میرے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو۔"

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾ [النحل: ٣٦] "اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔" نیز فرمایا: ﴿ وَسْـَٔلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ﴾ [الزخرف: ٤٥] "اور ہم نے جو اپنے رسول آپ سے پہلے بھیجے تھے ان سے پوچھیے، کیا ہم نے رحمٰن کے سوا کوئی اور معبود مقرر کیے تھے کہ اُن کی عبادت کی جائے۔" پھر فرشتوں کے حال سے اس طرح خبر دی: ﴿ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [الأنبياء: ٢٩] "اور ان میں سے جو یہ کہے کہ بے شک اللہ کے سوا میں بھی معبود ہوں تو اسے ہم اس (بات) کا بدلہ جہنم دیں گے، ہم ظالموں کو اسی طرح سزا دیتے ہیں۔"

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں کہا گیا ہے کہ اس جگہ لفظ بشر سے سارے بنی آدم مراد ہیں، یعنی کسی ایک آدمی کا بھی یہ رتبہ نہیں ہے کہ وہ کتاب، حکم اور نبوت کے حاصل ہونے کے بعد اپنی الوہیت کا دعویٰ کرے۔ حکم سے مراد فہم اور علم ہے، یا اللہ کی طرف سے حکم کا جاری ہونا۔ پہلا قول زیادہ صحیح ہے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام پر افترا کیا، (جھوٹ باندھا) جو کسی طرح صحیح نہیں ہے، نہ ان کے کہنے کے لائق ہے، ہاں بشر یہ بات کہہ سکتا ہے کہ تم اللہ والے بنو۔

ربانی کی تفسیر:

ربانی اس شخص کو کہتے ہیں جو لوگوں کا مربی ہو، پہلے علم صغیر سکھلائے، پھر علم کبیر بتلائے۔ گویا کاموں کے سہل و آسان کرنے کے لیے اللہ رب قدیر ہی مقتدیٰ ہے۔ مبرد رحمہ اللہ نے کہا: ربانیین سے مراد اربابِ علم ہیں۔[2] ربانی

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم ٢٠/ ٦٩١۔ ٦٩٢)

[2] تفسیر القرطبي (٤/ ١٢٢)

وہ ہے جو عالم ہے اور رب قوی کے دین کے ساتھ متمسک ہے۔ ربانیت تعلیمِ علم کو کہتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ربانی وہ ہے جو عالم باعمل ہو۔ بعض نے کہا: جو حلال وحرام کے احکام کا عالم ہو اور امر و نہی کا عارف ہو۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ ہے جس کے پاس علم بصیرت اور علمِ سیاست ہو۔ جس دن سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا انتقال ہوا، محمد بن حنفیہ رحمہ اللہ نے کہا: آج اس امت کا ربانی وفات پا گیا۔[1] بعض نے کہا: اولی الامر اور علما مراد ہیں۔ ابو عبید رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ کلمہ عبرانی ہے یا سریانی۔[2] میں کہتا ہوں کچھ بھی ہو، اس سے مراد علمائے حق پرست اور فضلائے دیندار ہیں۔

حدیث عشق ے باید چہ سریانی چہ عبرانی

''بات ہمیشہ عشق ومحبت کی ہونی چاہیے خواہ کسی زبان میں کی جائے۔''

مکی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ﴿ تُعَلِّمُوْنَ ﴾ میں تشدید زیادہ بلیغ ہے، کیوں کہ کبھی عالم غیر معلم بھی ہوتا ہے، تشدید سے علم حاصل کرنا اور تعلیم دینا دونوں ثابت ہوتے ہیں۔ تخفیف سے صرف علم کی دلیل ملتی ہے۔[3] ﴿ تَدْرُسُوْنَ ﴾ بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ اس آیت میں عالم کے لیے اپنے علم پر عمل کرنے کا سب سے بڑا محرک ہے، عالم کا اپنے علم پر سب سے بڑا عمل یہی ہے کہ وہ اس کی تعلیم دے۔ دراست علم وفقہ کا مذاکرہ ہے، جو آدمی کو ربانی بنا دیتا ہے۔ جو اس مقصد کے لیے علم کے ساتھ زیادہ شغل نہیں رکھتا، اس کا عمل ضائع ہو جاتا ہے اور اس کی کوشش بے کار ثابت ہوتی ہے۔ بھلا کہیں اسلام کے بعد کوئی کفر کا حکم بھی دے سکتا ہے؟ کہتے ہیں: کسی نے نبی اکرم ﷺ سے اجازت چاہی تھی کہ آپ کو سجدہ کرے، اس پر یہ آیت اتری۔[4] معلوم ہوا غیر اللہ کو سجدہ کرنا خواہ وہ پیغمبر ہو، یا بادشاہ، فقیر ہو یا قبر، سورج ہو یا چاند، آگ ہو یا پانی، لوہا ہو یا لکڑی یا اور کچھ، کفر ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ
جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ
قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ
فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝۸۱ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۸۲

اور (یاد کرو) جب اللہ نے تمام نبیوں سے عہد لیا تھا کہ جب میں تمھیں کتاب اور حکمت عطا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٤/ ١١٤٠) [2] تفسير الخازن (١/ ٣٧٣) [3] تفسير القرطبي (٤/ ١٢٣)

[4] فتح القدير (١/ ٥٨٥) فتح البيان ٢٠/ ٢٧٢_ ٢٧٤)

کروں، پھر تمھارے پاس کوئی رسول آئے جو اس (کتاب) کی تصدیق کرتا ہو جو تمھارے پاس ہے تو تمھیں اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی۔ اللہ نے فرمایا: کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرا عہد قبول کرتے ہو؟ انھوں نے کہا: ہم نے اقرار کیا۔ اللہ نے فرمایا: تو تم گواہ رہنا اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں (81) پھر اس کے بعد جو بھی منہ موڑے گا تو ایسے لوگ ہی نافرمان ہیں (82)

محمد ﷺ پر ایمان لانے کے لیے انبیا سے میثاق لینا:

اللہ تعالیٰ نے اس جگہ یہ خبر دی ہے کہ ہم نے ہر نبی سے جو آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک آیا ہے، یہ عہد لیا تھا کہ جس کسی کو ہم کتاب و حکمت دے کر بھیجیں تو پہلا رسول بعد میں آنے والے رسول کی مدد کرے، اس پر ایمان لائے، یہ نہ ہو کہ پچھلے کا علم و نبوت اس کی نصرت سے مانع ٹھہرے، انھوں نے ہم سے اس بات پر قول و اقرار کر لیا تھا۔ موضح قرآن کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے بارے میں بنی اسرائیل سے اقرار لیا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، ربیع، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ کہتے ہیں: اصر سے مراد عہد ہے۔ امام ابن اسحٰق رحمہ اللہ نے کہا کہ اس سے عہد کا بوجھ، یعنی بہت پکا عہد ہے۔[1] سیدنا علی بن ابی طالب اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا، مگر اس سے اقرار لیا کہ اگر ہم محمد ﷺ کو بھیجیں اور وہ نبی زندہ ہو تو ان پر ایمان لائے، ان کی مدد کرے، اپنی اُمت سے اس بات کا عہد لے کہ اگر وہ اُمت محمد ﷺ کے مبعوث ہونے تک زندہ و موجود باقی ہو تو ان پر ایمان لائے اور ان کی مددگار بنے۔[2]

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے یہ اقرار لیا ہے کہ بعض ان کے بعض کی تصدیق کریں۔ یہ قول علی اور سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے خلاف نہیں ہے، بلکہ اسی کا مستلزم اور مقتضی ہے۔[3] عبداللہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور کہا: میں نے اپنے ایک یہودی قرظی بھائی کو حکم دیا تھا کہ وہ میرے لیے کچھ جوامع تورات سے لکھ دے، سو وہ لکھ لایا ہے، میں اس کو آپ پر عرض کروں۔ نبی کریم ﷺ کا چہرہ متغیر ہوگیا۔ عبداللہ بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا: اے عمر! تم نبی اکرم ﷺ کا روئے مبارک نہیں دیکھتے؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "رَضِيتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّ بِالْإِسْلَامِ دِينًا وَ بِمُحَمَّدٍ رَّسُولًا" "میں اللہ کو رب مان کر اور اسلام کو دین مان کر اور محمد ﷺ کو رسول مان کر راضی ہوں۔" تب نبی اکرم ﷺ کا غصہ دور ہوا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: «وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ لَوْ أَصْبَحَ فِيكُمْ مُوسٰى ثُمَّ اتَّبَعْتُمُوهُ وَتَرَكْتُمُونِي لَضَلَلْتُمْ

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٢/ ٦٩٥) [2] تفسير الطبري (٦/ ٥٥٥، ٥٥٦) [3] تفسير ابن كثير (١/ ٤٩٣)

إِنَّكُمْ حَظِّيْ مِنَ الْأُمَمِ وَأَنَا حَظُّكُمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ ﴾ [1] ''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر تم میں موسیٰ علیہ السلام آ جائیں، پھر تم ان کے پیچھے لگ جاؤ اور مجھے چھوڑ دو تو تم گمراہ ہو جاؤ گے، تم تمام اُمتوں میں سے میرا حصہ ہو اور میں تمام نبیوں میں سے تمھارا حصہ ہوں۔'' (رواہ أحمد) سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ اہلِ کتاب سے کچھ مت پوچھو! وہ تم کو کیا خاک ہدایت کریں گے، جبکہ وہ خود گمراہ ہو گئے ہیں، تم یا تو باطل کی تصدیق کرو گے یا سچ کو جھٹلاؤ گے۔ واللہ! حقیقت یہ ہے کہ اگر تمھارے درمیان موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو اس کے سوا کچھ جائز نہ ہوتا کہ وہ میری پیروی کریں۔ [2] بعض احادیث میں یوں مروی ہے: ﴿لَوْ كَانَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى حَيَّيْنِ لَمَا وَسِعَهُمَا إِلَّا اتِّبَاعِيْ ﴾ [3] ''اگر موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام زندہ ہوتے تو ان کو میری اتباع کے بغیر چارہ کار نہ ہوتا۔''

معلوم ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لیے خاتم الانبیا ہیں۔ اس جگہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ اس طرح ہیں: ﴿هٰذَا الْإِمَامُ الْأَعْظَمُ الَّذِيْ لَوْ وُجِدَ فِيْ أَيِّ عَصْرٍ وُجِدَ لَكَانَ هُوَ الْوَاجِبُ الطَّاعَةِ الْمُقَدَّمُ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ كُلِّهِمْ وَلِهٰذَا كَانَ إِمَامَهُمْ لَيْلَةَ الْإِسْرَاءِ لَمَّا اجْتَمَعُوْا بِبَيْتِ الْمَقْدِسِ وَكَذٰلِكَ هُوَ الشَّفِيْعُ فِي الْمَحْشَرِ فِيْ إِتْيَانِ الرَّبِّ جَلَّ جَلَالُهُ لِفَصْلِ الْقَضَاءِ بَيْنَ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْمُقَامُ الْمَحْمُوْدُ الَّذِيْ لَا يَلِيْقُ إِلَّا لَهُ وَالَّذِيْ يَحِيْدُ عَنْهُ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ وَ الْمُرْسَلِيْنَ حَتّٰى تَنْتَهِيَ النَّوْبَةُ إِلَيْهِ فَيَكُوْنُ هُوَ الْمَخْصُوْصُ بِهٖ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِ ﴾ اس عبارت کا یہ مفہوم ہے کہ ہمارے نبی سارے انبیا کے امام ہیں، جس زمانے میں ہوتے واجب الطاعۃ ہوتے اور سارے انبیا پر مقدم ٹھہرتے، دیکھو جب شبِ معراج میں سارے نبی بیت المقدس میں جمع ہوئے تو سب کے امام آپ ہی ہوئے، حشر میں بندوں کے درمیان فیصلہ کروانے کے لیے آپ ہی اللہ کے حضور سفارشی ہوں گے، جبکہ مقامِ محمود میں جہاں سارے انبیا اولوا العزم جواب دے جائیں گے، آپ کھڑے ہو کر اذنِ شفاعت حاصل فرمائیں گے۔ یہ مقام آپ ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ وللہ الحمد۔ [4]

میثاق کے بارے میں اقوال:

فتح البیان کا بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر پہلے نبی سے پچھلے نبی پر ایمان لانے اور ان کی نصرت کرنے کے

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٤٧٠) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رجاله رجال الصحيح إلا أن فيه جابر الجعفي وهو ضعيف'' (مجمع الزوائد: ١/ ٤٢٠)

[2] مسند أحمد (٣/ ٣٨٧) امام البانی رحمہ اللہ نے اس روایت پر مفصل بحث کرتے ہوئے اس کو حسن کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ٦/ ٣٤۔ ٣٨)

[3] شعب الإيمان (١/ ١٩٩) إرواء الغليل (٦/ ٣٤۔ ٣٨) ''عیسیٰ'' کے الفاظ کسی روایت میں نہیں مل سکے۔ البتہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ذکر کیے ہیں۔ دیکھیں: تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٩٣)

[4] تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٩٣)

لیے عہد و پیمان لیا تھا کہ اگر خود اس نبی کو پائے تو اس پر ایمان لائے یقین کرے، اس کا مددگار ہو، ورنہ اپنی امت کو حکم دے جائے کہ اس کی مدد کریں، اس پر ایمان لائیں۔ موسیٰ علیہ السلام سے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے کا میثاق لیا تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا میثاق لیا تھا۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت یوں ہے: "وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ"[1] یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ میثاق امتِ یہود و نصاریٰ سے لیا گیا تھا۔ کسی نے کہا کہ یہ میثاق خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لیا گیا تھا نہ کہ عموماً سارے انبیا کے بارے میں۔

سیدنا علی، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم، امام قتادہ و سدی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[2] بعض نے کہا کہ میثاق مذکور انبیا اور ان کی اُمتوں سے لیا گیا تھا۔ اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ اس آیت میں رسول سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جن کا تذکرہ اور حالات تورات و انجیل میں آئے ہیں۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ میثاق اس وقت ہوا تھا، جب آدم علیہ السلام کی اولاد کو ان کی پشت سے نکالا تھا۔[3] امام رازی رحمہ اللہ نے کہا کہ اس میثاق میں وہ دلائل ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو عقلی طور پر واجب بتاتے ہیں،[4] لیکن آیت کا ظاہر وہی پہلا قول ہے۔ بہرحال وہ میثاق گواہی کے طور پر تھا، جو کوئی اقرار کرنے کے بعد اس سے پھر گیا وہ فاسق ہے۔[5]

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿٨٣﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰي وَعِيْسٰي وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٨٥﴾

کیا وہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں؟ حالاں کہ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے وہ چاہتے اور نہ چاہتے ہوئے بھی اللہ کا فرماں بردار ہے اور اسی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے (83) آپ کہہ دیجیے: ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر بھی جو کچھ ہم پر نازل کیا گیا، اور جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اُن کی اولاد پر (نازل کیا گیا) اور ان (کتابوں)

---

[1] تفسير الطبري (٦/ ٥٥٣) [2] تفسير الطبري (٦/ ٥٥٥، ٥٥٦) [3] تفسير البغوي (٢/ ٦٢)
[4] تفسير الرازي (٨/ ١٠٥) [5] فتح البيان (٢/ ٢٧٤_ ٢٧٦)

پر بھی جو موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئیں، ہم ان میں سے کسی ایک کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اسی (اللہ) کے فرماں بردار ہیں﴿84﴾ اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا﴿85﴾

اللہ کے ہاں دین، اسلام ہی ہے، اور کوئی دین مقبول نہیں:

یعنی جس عہد کا حکم فرمایا تھا، اس کے سوا اور دین قبول نہیں۔ اس آیت میں اس شخص کی تردید ہے جو اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وہ دین یہی ہے کہ اللہ وحدہ لا شریک لہ کو پوجیں، جس کے حکم کی پابندی ساری کائنات زمین و آسمان نے اٹھائی ہے، خوشی یا ناخوشی سے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا ﴾ [الرعد: ١٥] ''اور اللہ ہی کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے، خوشی سے اور ناخوشی سے۔'' نیز فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ﴿48﴾ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿49﴾ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿50﴾ ﴾ [النحل: ٤٨۔ ٥٠] ''کیا یہ لوگ اللہ کی پیدا کی ہوئی ان چیزوں کو نہیں دیکھتے کہ ان کے سائے دائیں اور بائیں جانب سے ڈھلتے ہیں، اللہ کو سجدہ کرتے ہوئے، اور (اس کے سامنے) وہ سب عاجز ہیں۔ اور آسمانوں اور زمین کے تمام جاندار اللہ کو سجدہ کرتے ہیں اور تمام فرشتے بھی، اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ وہ اپنے اوپر سے اپنے رب سے ڈرتے ہیں، اور وہی کرتے ہیں جو انھیں حکم دیا جاتا ہے۔''

ہر مومن دل و جان اور جسم سے اللہ تعالیٰ کا حکم بردار، تابع فرمان اور اطاعت گزار ہے۔ کافر ناخوشی سے مطیع ہے، کیا کرے اللہ کی تسخیر اور قہر اور سلطانِ عظیم کے تحت ہے۔ عطاء بن ابی رباح رحمہ اللہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ ''مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ''، فرشتے ہیں۔ ''مَنْ فِي الْاَرْضِ'' ہر وہ شخص ہے جو اسلام پر پیدا ہوا۔ ﴿ كَرْهًا ﴾ وہ اُمتیں ہیں جو بیڑیوں اور طوقوں میں مقید ہو کر جنت کی طرف ہانکی جاتی ہیں اور وہ جی میں ناخوش ہیں۔[1] (رواه الطبراني) اس حدیث میں غرابت ہے۔ صحیح میں مروی ہے: تیرے رب نے اس قوم پر تعجب کیا، جو بہشت کی طرف زنجیروں میں کھینچی جاتی ہے۔[2] لیکن حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے پہلے معنی کو زیادہ مضبوط بتایا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ

---

[1] المعجم الكبير (١١/ ١٩٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''فيه محمد بن محصن العكاشي وهو متروك'' (مجمع الزوائد: ٧/ ٤٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٤٨)

نے ﴿ لَهٗٓ اَسْلَمَ ﴾ کی تفسیر میں کہا کہ یہ اس آیت کی طرح ہے: ﴿ وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ﴾ [لقمان: ۲۵] ''اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے!'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ استسلام، یعنی اسلام کی طرف بلانا عہد لینے کے وقت تھا۔[1]

''أَسْبَاطٌ'' اولادِ یعقوب علیہ السلام کو کہتے ہیں، وہ بارہ گروہ تھے۔ ہم پر قرآن اُترا، انبیاے مذکورین پر صحیفے اترے، وحی آئی۔ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام پر تورات اور انجیل اُتری۔ ''نَبِيُّوْنَ'' کا لفظ عام ہے، اجمالاً سب نبیوں کو شامل ہے، اس امت کے مومنین ہر نبی، رسول اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُتاری ہوئی ہر کتاب پر ایمان لائے ہیں، کسی ایک کا بھی انکار نہیں کرتے، بلکہ ہر نبی اور وحی کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ جو کوئی اس طریق کے سوا جو اللہ نے مشروع کیا ہے، کسی اور طریق پر چلے گا تو وہ طریق اس شخص سے قبول نہیں کیا جائے گا، بلکہ وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ جس طرح صحیح حدیث میں مروی ہے: ((مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ))[2] ''جس نے ایسا عمل کیا، جس پر ہمارا حکم نہیں تو وہ عمل رد کیا جائے گا۔''

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ قیامت کے دن اعمال آئیں گے، نماز کہے گی: اے میرے رب! میں نماز ہوں، اللہ پاک فرمائے گا: بہتر ہے۔ صدقہ آئے گا، کہے گا: میں صدقہ ہوں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: بہتر۔ روزہ آئے گا، کہے گا: میں روزہ ہوں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: بہتر۔ اسی طرح سارے عمل آئیں گے اور اللہ تعالیٰ سب سے یہی فرمائے گا: ''إِنَّكَ عَلٰى خَيْرٍ'' ''تو بہتری پر ہے۔'' پھر اسلام آئے گا، کہے گا: اے رب! تو سلام ہے اور میں اسلام ہوں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: بہتر میں آج تجھی سے لین دین کروں گا، پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۸۵ ﴾ (رواه أحمد) عبداللہ بن احمد رحمہ اللہ نے کہا: اس کی سند میں ''عباد بن راشد'' ثقہ ہے۔ لیکن امام حسن رحمہ اللہ نے اس حدیث کو سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نہیں سنا۔[3]

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اور اپنی اُمت کی طرف سے خبر دی ہے۔ انبیا کا ذکر بالخصوص اس لیے کیا ہے کہ اہلِ کتاب ان کے وجود کے معترف ہیں، ان کی نبوت کے بارے میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس جگہ ''أسباط'' سے مراد ''أحفاد'' (پوتے) ہیں، کیوں کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کے پوتے تھے۔ لغوی معنی مراد نہیں ہیں، یعنی یہود و نصاریٰ کے نواسے بعض انبیا پر ایمان لائے، بعض کا انکار کیا، مسلمان سب پر ایمان لائے۔ وللہ الحمد۔ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول دین یہی دینِ اسلام ہے، اس کے سوا جو دین ہے، وہ مقبول نہیں، کیوں کہ دین صحیح وہی ہوتا ہے جس کو اللہ پاک پسند کرے اور اس پر ثواب دے۔[4]

---

[1] تفسیر الطبري (٦/ ٥٦٥) تفسیر ابن کثیر (١/ ٤٩٤) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٥٥٠) صحیح مسلم (١٧١٨)
[3] مسند أحمد (٢/ ٣٦٢) السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث (٥٧٨٠) [4] فتح البیان (٢/ ٢٧٧۔ ٢٧٨)

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ
الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝٨٦
اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُھُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ
اَجْمَعِيْنَ ۝٨٧ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ
يُنْظَرُوْنَ ۝٨٨ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ
اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٨٩

اللہ ان لوگوں کو کیسے ہدایت دے گا جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے، جب کہ وہ گواہی دے چکے کہ بے شک رسول (ﷺ) برحق ہیں اور ان کے پاس واضح نشانیاں آ چکیں؟ اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا (86) ان لوگوں کی سزا یہی ہے کہ ان پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے (87) وہ اس (لعنت) میں ہمیشہ رہیں گے، ان سے نہ تو عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت ہی دی جائے گی (88) مگر جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لی، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے (89)

مرتد کی توبہ کا مسئلہ:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ایک انصاری مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو کر مشرکین سے جا ملا، پھر نادم ہو کر اپنی قوم کو کہلا بھیجا کہ نبی اکرم ﷺ سے پوچھو کہ میری توبہ قبول ہوگی یا نہیں؟ اس پر یہ آیت اُتری اور وہ اسلام لے آیا۔ (رواه ابن جرير و النسائي والحاكم و ابن حبان) امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث صحیح الاسناد ہے، اگرچہ شیخین نے اس کو روایت نہیں کیا۔[1] امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: حارث بن سوید مسلمان ہوا، پھر کافر ہو کر اپنی قوم میں جا ملا۔ اس پر یہ آیت اُتری۔ ایک آدمی نے اس کی قوم میں سے یہ آیت اس کو پہنچائی، اس نے سن کر کہا: میں تجھ کو سچا جانتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ تجھ سے بھی زیادہ سچے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم تینوں سے زیادہ سچا ہے، پھر آ کر اسلام لایا، اچھا پکا مسلمان بن گیا۔[2]

---

[1] تفسير الطبري (٦/ ٥٧٢- ٥٧٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٠٦٨) مستدرك الحاكم (٢/ ١٥٤) صحيح ابن حبان (١٠/ ٣٢٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٠٦٦)

[2] تفسير الطبري (٦/ ٥٧٣)

''بینات'' سے مرادِ صدقِ رسول پر حجتوں اور دلائل کا قیام ہے۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ جو کوئی توبہ کرتا ہے، وہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ فتح البیان میں کہا گیا ہے کہ اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ مرتد کی توبہ قبول ہے، اگر سچے دل سے پھر مسلمان ہو جائے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ کسی نے کہا: صرف توبہ قبول نہیں ہوتی، جب تک عمل صالح نہ کرے، باطن سے حق کے ساتھ ہو اور ظاہر میں اطاعت ہو، لیکن پہلے معنی آیت کے ظاہر پر زیادہ ٹھیک بیٹھتے ہیں۔[1]

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ۭ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝

بے شک جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا، پھر وہ کفر میں بڑھتے گئے، ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں کی جائے گی اور وہی لوگ گمراہ ہیں (90) بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور حالتِ کفر میں مرے ان میں سے کسی سے زمین بھر سونا بھی قبول نہ کیا جائے گا اگرچہ وہ فدیے میں دینا چاہے۔ انھی لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا (91)

موت کے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی:

یہودی پہلے اقرار کرتے تھے کہ یہ نبی سچا ہے۔ جب ان سے مقابلہ ہوا تو منکر ہوگئے اور انکار میں بڑھتے گئے، یعنی لڑائی کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔ ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی، یعنی ان کو توبہ کرنا ہی نصیب نہیں ہوگا کہ قبول ہو۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان لوگوں کو وعید اور دھمکی دی ہے، جو ایمان لانے کے بعد کفر پر جم گئے ہیں کہ مرتے دم تک ان کو توبہ نصیب نہ ہوگی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝18 ﴾ [النساء: ۱۸] ''اور ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو برے کام کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آ جائے تو وہ کہتا ہے: بے شک اب میں نے توبہ کی، اور نہ ان لوگوں کی توبہ قبول ہوتی ہے جو اس حال میں مرتے ہیں کہ وہ کافر ہی ہوتے ہیں، ان لوگوں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

[1] فتح البیان (۲/ ۲۸۰)

اسی لیے اس جگہ یہ کہا ہے کہ ان کی توبہ قبول نہ ہوگی، وہ حق طریقے سے خارج ہیں اور سرکشی کے طریق کی طرف ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ایک قوم مسلمان ہوئی، پھر مرتد ہوگئی، پھر اسلام لائی، پھر مرتد بن گئی، پھر اپنی قوم کے پاس آدمی بھیج کر حال دریافت کیا۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اس پر یہ آیت اتری۔[1] (هكذا رواه البزار و إسناده جيد)

قیامت کے دن کوئی فدیہ قبول نہیں ہوگا:

پھر اللہ تعالیٰ نے فدیے کا ذکر کیا کہ جو لوگ کفر پر مرگئے، وہ اگر فدیے میں زمین بھر سونا دیں تو بھی کچھ فائدہ نہیں ہوگا، جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عبداللہ بن جدعان کا حال پوچھا گیا کہ وہ مہمان نواز تھا، قیدی کو چھڑاتا تھا، محتاجوں کو کھانا کھلاتا تھا، کیا یہ اس کے کچھ کام آئے گا؟ فرمایا: نہیں، کیوں کہ اس نے ایک دن بھی یہ نہیں کہا کہ "اِغْفِرْ لِيْ خَطِيْئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ"[2] "میری خطا کو انصاف کے دن بخش دے۔"

کافروں کے عملوں کی کوئی حیثیت نہیں:

معلوم ہوا کہ کافر خواہ دنیا میں خیرات کرے یا آخرت میں فدیہ دینا چاہے، کچھ کام نہیں آتا، برباد جاتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ ﴾ [البقرة: ۱۲۳] "اور نہ اس سے کوئی بدل قبول کیا جائے گا اور نہ اسے کوئی سفارش نفع دے گی۔" نیز فرمایا: ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ [المائدة: ۳۶] "بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اگر ان کے پاس وہ سب کچھ ہو جو ساری زمین میں ہے اور اس کے برابر اور بھی ہو، تاکہ وہ قیامت کے دن عذاب سے بچنے کے لیے فدیے میں دے دیں تو بھی وہ ان سے قبول نہیں کیا جائے گا اور ان کے لیے بہت دردناک عذاب ہے۔"

اس جگہ پہلے زمین بھر سونا خرچ کرنے کا ذکر کیا، پھر فدیے کا تذکرہ ہے، جس سے معلوم ہوا کہ وہ اور ہے یہ اور ہے، کیوں کہ واو عطف کے لیے آیا ہے، زائد نہیں ہے۔ حاصل یہ ہے کہ کافر کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کوئی چیز نہ چھڑا سکے گی، خواہ زمین بھر سونا دنیا میں دے چکا ہوگا یا آخرت میں اپنی جان کے عوض دنیا بھر سونا دینا چاہتا ہو۔

---

① امام سیوطی رحمہ اللہ نے اس روایت کی نسبت مسند بزار کی طرف کی ہے اور روایت نقل کرنے کے بعد خود ہی کہا ہے کہ یہ روایت مسند بزار میں نہیں ہے۔ دیکھیں: الدر المنثور (۲/ ۲۵۸) البتہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس روایت کو اپنی تفسیر (۱/ ۴۹۵۔ ۴۹۶) میں ذکر کرتے ہوئے اس کی نسبت امام بزار کی طرف کی ہے اور سند کو جید کہا ہے۔

② صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۱۴) مسند أحمد (۶/ ۱۲۰)

دوزخی کا واقعہ:

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ ایک دوزخی آدمی سے قیامت کے دن کہا جائے گا کہ بھلا اگر ساری دنیا تیرے لیے ہو تو تُو اس کو دے کر اپنی جان چھڑائے گا؟ وہ کہے گا: ہاں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں تو تجھ سے اس سے بھی زیادہ آسان چیز چاہتا تھا، تیرے باپ آدم کی پیٹھ میں تجھ سے اقرار لیا تھا کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، مگر تو نے نہ مانا اور شرک ہی کیا۔[1] (رواه أحمد و الشيخان)

دوسری حدیث سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اس طرح مرفوعاً مروی ہے کہ ایک جہنمی آدمی کو لائیں گے، اس سے اللہ کہے گا: اے آدم کے بیٹے! تو نے اپنا گھر کیسا پایا؟ وہ کہے گا: اے میرے رب! بہت بری جگہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: بھلا زمین بھر سونا دے کر تو مجھ سے اپنے آپ کو چھڑانا چاہتا ہے؟ وہ کہے گا: ہاں اے رب! اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹا ہے، میں نے اس سے بھی کم اور آسان بات تجھ سے مانگی تھی تو نے وہ نہ کی۔ پھر اس کو دوزخ میں لے جائیں گے۔[2] اسی لیے اس جگہ یہ فرمایا ہے کہ ان کے لیے عذابِ الیم ہوگا اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا، جو ان کو اس دُکھ کی مار سے چھڑائے، عقابِ الیم سے بچائے۔

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ یہ آیت نصاریٰ اور یہودیوں کے حق میں اُتری ہے۔ یہی قول امام قتادہ، عطاء اور حسن رحمہ اللہ کا ہے۔[3] وہ لوگ پہلے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف اور صفت پر ایمان لائے تھے، پھر منکر ہو گئے، پھر اس کفر پر جم گئے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ کفر کی زیادتی گناہوں سے ہوئی۔ یہ آیت خاص یہودیوں کے لیے آئی ہے۔[4] بعض نے کہا: تمام کافروں کے حق میں اُتری ہے، پہلے انھوں نے اللہ تعالیٰ کے خالق ہونے کا اقرار کیا، پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کیا، پھر کفر پر جم گئے، یہ زیادتی ہوئی۔

سمندِ ناز پہ ایک اور تازیانہ ہوا

بعض نے کہا ہے کہ زیادتِ کفر یہ بات تھی کہ وہ کہتے تھے: ہمیں اس بات کی توقع ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی آفتِ زمانہ نازل ہو۔ کسی نے کہا: یہ آیت حارث بن سوید کے بارہ ساتھیوں کے حق میں اُتری، جو مرتد ہو گئے تھے۔ حارث نے تو رجوع کیا، باقی مکہ میں کفر پر جمے رہے۔

---

[1] مسند أحمد (٣/ ١٢٧) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٨٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٠٥)

[2] مسند أحمد (٣/ ٢٣٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٠٠٨)

[3] تفسير الطبري (٦/ ٥٧٨ـ ٥٧٩) [4] تفسير الطبري (٦/ ٥٨١)

توبہ کی قبولیت میں اشکال:

مفسرین رحمہ اللہ کی ایک جماعت نے کہا کہ جو اس آیت میں توبہ کا قبول نہ ہونا آیا ہے، وہ مشکل ہے، کیوں کہ پہلی آیت میں توبہ کا مقبول ہونا آ چکا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿ وَهُوَ الَّذِىْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ ﴾ [الشوریٰ: ۲۵] ''اور وہی تو ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔'' بعض نے کہا: یہ مراد ہے کہ مرتے وقت توبہ قبول نہیں ہوتی۔ نحاس رحمہ اللہ نے کہا: یہ قول حسن ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ ﴾ [النساء: ۱۸] ''اور ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو برے کام کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آ جائے تو وہ کہتا ہے: بے شک اب میں نے توبہ کی۔'' امام حسن، قتادہ، عطاء اور سدی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔[1] یہ حدیث بھی اسی کی تائید کرتی ہے: « إِنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ تَوْبَةَ الْعَبْدِ مَا لَمْ يُغَرْغِرْ »[2] ''بے شک اللہ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے، جب تک اس کی جان غرغرے تک نہیں پہنچ جاتی۔''

توبہا را نفس باز پسیں دست ز دست   بے خبر دیر رسیدے در محمل بستند

''توبہ کرنے والوں کو واپسی (رجوع) بہت جلد نصیب ہوتا ہے، (توبہ سے) بے خبر دیر کا شکار ہوتے ہیں، اس لیے اسی حالت میں روک لیے جاتے ہیں۔''

کسی نے کہا: مطلب یہ ہے کہ جو توبہ انھوں نے کفر سے پہلے کی تھی، وہ مقبول نہیں ہوگی، کیوں کہ کفر نے اس کو ضائع کر دیا۔ بعض نے کہا کہ وہ توبہ قبول نہیں ہے کہ ایک کفر سے توبہ کی اور دوسرا کفر اختیار کیا، جس طرح بعض کافر مسلمان ہو کر رافضی خارجی بن جاتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مراد وہ لوگ ہیں جو مرتد ہو کر اپنا حال چھپانے کے لیے لوگوں کو دکھانے کے لیے توبہ کرنے کے ارادے کا اظہار کرتے ہیں، مگر ان کے دلوں میں کفر ہے۔ ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں، جنھوں نے حالتِ شرک میں گناہوں سے توبہ کی ہے، مگر شرک سے توبہ نہ کی۔[3]

یہی حال بعینہٖ ان مسلمانوں کا ہے، جو مومن کہلا کر قبر پرستی، پیر پرستی، تقلید پرستی کرتے ہیں۔ گناہوں سے تو بچتے ہیں، مگر شرک نہیں چھوڑتے، کوئی غیر اللہ کی نذر مانتا ہے، کوئی کسی کے نام کا جانور ذبح کرتا ہے، کوئی کسی سے فریاد کرتا ہے، کوئی بیمار کی شفا کے لیے غیر اللہ سے مدد مانگتا ہے، کوئی کسی مصیبت کے وقت کسی پیر و مرشد کو پکارتا ہے۔ وعلی ھذا القیاس۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ جب کفر پر مرے ہوں تو توبہ قبول نہیں۔[4] امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا:

---

[1] تفسیر القرطبي (٤/ ١٣٠)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٣٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٥٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٩٠٣)

[3] تفسير الخازن (١/ ٣٧٨) [4] تفسير الخازن (١/ ٣٧٨)

’’زیادت علی الکفر بعد الکفر‘‘ یہی ہے کہ جب تک وہ کفر پر قائم ہیں، ان کی توبہ قابلِ توجہ نہیں ہے،[1] کیوں کہ وہ، وہ تو راہِ حق سے بہکے ہوئے ہیں۔[2]

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس آیت میں جو توبہ کے قبول نہ ہونے کا ذکر ہے، اسے اس شخص کے لیے سمجھا جائے، جو کافر ہوتے ہوئے بغیر توبہ کے مرگیا ہے، گویا کفر پر مرنے کو توبہ نہ کرنے سے تعبیر کیا ہے۔[3] یہ جو فرمایا کہ ان سے زمین بھر سونا لینا منظور نہیں ہے، اس سے مراد حارث کے ساتھی ہیں، جو کفر پر مرگئے، یا روئے زمین کے سارے کافر، خواہ وہ اہلِ کتاب ہوں یا بت پرست۔ یہی قول مضبوط ہے، کیوں کہ آیت اُن سب کے حق میں عام ہے۔ اس آیت پر تیسرا پارہ قرآنِ مجید کا ختم ہوا۔ وللہ الحمد۔ اب چوتھا پارہ شروع ہوتا ہے۔

رب یسر وتمم بالخیر.

---

[1] تفسیر الطبري (٦/ ٥٨٢) [2] فتح البیان (٢/ ٢٨٠۔ ٢٨١) [3] فتح القدیر (١/ ٥٩٠)

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ۬ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ﴿۹۲﴾

تم ہرگز بھلائی نہ پاسکو گے جب تک ان چیزوں میں سے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو جنھیں تم پسند کرتے ہو، اور تم جو بھی چیز خرچ کرو گے تو بے شک اللہ اسے خوب جاننے والا ہے (92)

نیکی حاصل کرنے کے لیے عزیز ترین چیز خرچ کرنا:

یعنی جس چیز سے دل بہت لگا ہو، اس کو خرچ کرنے کا بڑا درجہ ہے اور ہر چیز میں ثواب ہے۔ یہ آیت یہودیوں کے ذکر میں شاید اس لیے فرمائی کہ ان کو اپنی ریاست بہت عزیز تھی، جس کو تھامنے کے لیے نبی اکرم ﷺ کے تابع نہیں ہوتے تھے تو جب تک اس کو نہ چھوڑیں، تب تک اللہ کی راہ میں ایمان کا درجہ نہیں پا سکتے۔ عمرو بن میمون رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس جگہ نیکی سے مراد جنت ہے۔[1]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: انصار میں سب سے زیادہ مال دار سیدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ تھے۔ وہ بیرحاء کو اپنے سارے اموال میں زیادہ پسند کرتے تھے؛ وہ باغ مسجد کے سامنے تھا۔ نبی اکرم ﷺ اس میں جاتے تھے اور وہاں کا اچھا پانی پیتے۔ جب یہ آیت اتری تو سیدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! اللہ یوں فرماتا ہے تو مجھ کو سب سے زیادہ عزیز مال یہی بیرحاء ہے۔ میں اس کو اللہ کے لیے نیکی کی امید سے صدقہ کرتا ہوں کہ اللہ کے پاس ذخیرہ رہے۔ آپ اس مال کو جہاں اللہ چاہے رکھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: «بَخٍ بَخٍ ذَاكَ مَالٌ رَابِحٌ» یہ ارشاد دو دفعہ فرمایا۔ یعنی واہ واہ! یہ بڑے نفع کا مال ہے۔ پھر فرمایا کہ میں نے سن لیا اور میری رائے یہ ہے کہ تو اس باغ کو اپنے رشتے داروں کو دے دے۔ سیدنا ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: بہت اچھا، پھر اس کو اپنے قریبی رشتے داروں چچازاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔[2] (رواہ أحمد والشیخان)

صحیحین میں مروی ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے اس مال سے بہتر کوئی مال نہیں پایا، جو مجھے خیبر میں اپنے حصے میں ملا، آپ کیا حکم کرتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اصل کو روک لے اور پھل کو وقف کر دے۔[3] عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: مجھ کو اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دیا ہے، مگر مجھے اپنی کنیز رومیہ سے زیادہ پیاری کوئی

---

[1] تفسير الطبري (٦/ ٥٨٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٩٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٩٨) مسند أحمد (٣/ ١٤١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٨٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٣٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٦٠٣)

چیز نہیں، میں نے اس کو اللہ کے لیے آزاد کر دیا۔ اگر میں کوئی چیز جو مجھے اللہ تعالیٰ نے دی ہے اور میں اسے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے بعد اسے دوبارہ لوٹاتا تو میں اس لڑکی سے شادی کر لیتا۔[1]

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ اس آیت میں مومنین کو خطاب ہے۔ ''نیل'' کسی چیز کے پانے کو کہتے ہیں۔ ''نوال'' عطا کو کہا جاتا ہے۔ اور ''نول'' کسی چیز کے دینے کو کہتے ہیں۔ ''بر'' خیرات اور عملِ صالح کرنے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ تم عملِ صالح یا جنت کو تب ہی پہنچو گے، جب اپنی محبوب اور عمدہ چیز اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ کسی نے کہا: ''بر'' سے مراد تقویٰ ہے یا ثواب یا اطاعت۔ اصل بر یہ ہے کہ نیکی کے کام میں فراخی کرے۔ ''بر'' کا استعمال سچائی اور اچھے اخلاق کے طور پر بھی آیا ہے۔ نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: بر اور اثم کیا ہے؟ فرمایا: بر حسنِ خلق ہے اور اِثم وہ ہے جو تیرے سینے میں کھٹکے اور تجھے لوگوں کا اس کو جاننا ناپسند ہو۔[2] (أخرجه مسلم)

اس سے مراد راہِ خیر میں خرچ کرنا ہے، صدقہ ہو یا کوئی اور نیکی۔ کسی نے کہا: مراد فرض زکات ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے کہا: مال خرچ کرے یا لوگوں کی معاونت کے لیے اپنی عزت یا منصب کو استعمال میں لائے، یا بدن یا دل اللہ کی راہ میں لگائے۔[3] یا علم سکھائے، یا دین میں تصنیف و تالیف کر کے پھیلائے، یا سنت کی طرف بلائے، یا بدعت چھڑوائے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک لونڈی، جو جلولاء سے آئی تھی، آزاد کر دی۔[4] سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے پاس ایک گھوڑا تھا، اس کو وہ بہت پسند کرتے تھے، انھوں نے وہ وقف کر دیا۔[5] غرض یہ کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے، پاک ہو یا ناپاک، اعلیٰ ہو یا ناقص وہ ہر خرچ کے مطابق جزا دے گا۔ اس آیت میں اعلیٰ قسم کا مال خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے اور ناقص مال کے خرچ سے ڈرایا ہے۔[6]

---

(1) الدر المنثور (٢/ ٢٦٠) امام ہیثمی رحمہ اللہ اس کی نسبت امام بزار رحمہ اللہ کی طرف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "وفيه من لم أعرفه" (مجمع الزوائد: ٧/ ٤٨)

(2) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٥٣)

(3) تفسير البيضاوي (١/ ٦٤) (4) تفسير الطبري (٦/ ٥٨٨) (5) تفسير الطبري (٦/ ٥٩٢)

(6) فتح البيان (٢/ ٢٨٣، ٢٨٤) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پرانی یا استعمال شدہ چیز کا صدقہ کرنا یا کسی ضرورت مند کو دے دینا جائز نہیں ہے، بلکہ اس کا بھی اپنی جگہ اجر و ثواب ہے۔ دراصل اپنی عزیز ترین چیزوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب سے اصل مقصود زیادہ فضیلت کا حصول اور دنیائے فانی سے بے رغبتی اختیار کرنے کی تلقین ہے۔ بے رغبتی کا صحیح اظہار اسی وقت ہوتا ہے، جب انسان آخرت کو ترجیح دیتے ہوئے عزیز ترین متاع بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے دریغ نہ کرے۔ [ص۔ ی]

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰي نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْھَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿93﴾ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿94﴾ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۣ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿95﴾

بنی اسرائیل کے لیے تمام کھانے حلال تھے سوائے ان چیزوں کے جنھیں تورات نازل ہونے سے پہلے یعقوب نے اپنے اوپر حرام کرلیا تھا۔ (اے نبی!) آپ کہہ دیجیے کہ تم تورات لے آؤ اور اسے پڑھو اگر تم سچے ہو (93) اس کے بعد جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا، وہی لوگ ظالم ہیں (94) کہہ دیجیے: اللہ نے سچ کہا، پس تم ملتِ ابراہیم کی پیروی کرو، جو حق پرست تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا (95)

یہودیوں کے رسول اللہ ﷺ سے سوالات:

یہودی کہتے تھے: تم کہتے ہو کہ ہم ابراہیم کے دین پر ہیں، لیکن ابراہیم کے گھرانے میں جو چیزیں حرام ہیں، وہ تم کھاتے ہو، جیسے: اونٹ کا گوشت اور دودھ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جتنی چیزیں اب لوگ کھاتے ہیں، سب ابراہیم علیہ السلام کے وقت میں حلال تھیں، جب تک تورات نہ اُتری۔ جب تورات اُتری تو اس میں خاص بنی اسرائیل کے لیے حرام ہوئی، مگر ایک اونٹ کہ تورات سے پہلے یعقوب علیہ السلام نے اس کو نہ کھانے کی قسم کھائی تھی۔ ان کی پیروی میں ان کی اولاد نے بھی اس کو چھوڑ دیا تھا۔ اس قسم کا سبب یہ تھا کہ ان کو ایک مرض ہوا تھا، انھوں نے نذر مانی کہ اگر میں صحت یاب ہوگیا تو جو میری بہت پیاری چیز ہے، اس کو چھوڑ دوں گا، ان کو یہ بہت پسند تھا، لہٰذا نذر کی وجہ سے چھوڑ دیا۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت نبی اکرم ﷺ کے پاس آئی اور کہا کہ کچھ باتیں ہم آپ سے پوچھتے ہیں، آپ ہمیں بتائیں، ان باتوں کو نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ فرمایا: جو چاہو پوچھو، لیکن اللہ کا عہد اور ذمہ کرو اور وہ عہد کرو، جو یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد سے لیا تھا۔ اگر میں وہ باتیں تم کو بتا دوں اور تم ان کو پہچان لو تو اسلام پر میرے تابع ہو جاؤ۔ کہا: بہتر ہے۔ انھوں نے کہا: چار باتیں بتاؤ، ایک یہ کہ اسرائیل نے اپنی جان پر کس کھانے کو حرام کیا تھا؟ عورت و مرد کا پانی کیسا ہوتا ہے؟ لڑکا لڑکی کیوں کر ہوتے ہیں؟ ہم کو اس نبی اُمّی کے سونے کے بارے میں بتاؤ اور یہ کہ فرشتوں میں کونسا فرشتہ اس کا دوست ہے؟

نبی اکرم ﷺ نے ان سے عہد لیا کہ اگر میں بتا دوں تو تم میرے تابع ہو جاؤ گے۔ پھر فرمایا: تم کو اس اللہ کی قسم ہے جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات اُتاری ہے، تم جانتے ہو کہ اسرائیل سخت بیمار ہوئے تھے، جب بیماری زیادہ بڑھ گئی تو انھوں نے اللہ کی نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کو اس بیماری سے شفا دے گا تو وہ اپنے محبوب ترین کھانے اور مشروب کو اپنے اوپر حرام کر لیں گے۔ ان کا محبوب کھانا اونٹ کا گوشت اور مشروب اونٹ کا دودھ تھا۔ انھوں نے کہا: ''اَللّٰھُمَّ نَعَمْ'' آپ ﷺ نے فرمایا: اے اللہ! تو گواہ رہ۔ پھر فرمایا: تم کو قسم ہے اللہ کی جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی، تم جانتے ہو کہ مرد کی منی سفید اور غلیظ ہوتی ہے اور عورت کی منی زرد پتلی۔ جو منی غالب ہوتی ہے، بچہ ویسا ہی پیدا ہوتا ہے اور اللہ کی اجازت سے اس کے مشابہ ہوتا ہے۔ مرد کا پانی عورت کے پانی سے بالا ہو تو نر پیدا ہوتا ہے، اگر عورت کا پانی مرد کے پانی پر بالا ہو تو مادہ پیدا ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا: ہاں! فرمایا: ''اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ عَلَیْھِمْ''

پھر فرمایا: قسم ہے تم کو اس اللہ کی جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات اُتاری، تمھیں معلوم ہے کہ اس نبی اُمی کی آنکھیں سوتی ہیں، دل نہیں سوتا۔ انھوں نے کہا: ''اَللّٰھُمَّ نَعَمْ'' پھر فرمایا: میرا دوست جبریل علیہ السلام ہے، اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی کبھی نہیں بھیجا، مگر جبریل علیہ السلام اس کا دوست تھا۔ کہنے لگے: اب ہم تمھیں چھوڑ دیں گے، اگر تمھارا دوست اس کے سوا کوئی اور ہوتا تو ہم تمھارے تابع ہوتے۔ اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [البقرۃ: ۹۷] ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: جو کوئی جبریل کا دشمن ہے، تو اُسی نے اِس قرآن کو اللہ کے حکم سے آپ کے دل پر نازل کیا ہے، یہ اس (کتاب) کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے نازل ہوئی اور مومنوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہے۔''

دوسری روایت میں ایک پانچواں سوال بھی آیا ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے بادل گرجنے اور بجلی چمکنے کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: رعد ایک فرشتہ ہے، جو بادل پر مقرر ہے، اس کے ہاتھ میں آگ کا کوڑا ہے، جس سے وہ اَبر کو ڈانٹا ہے، جس جگہ کا حکم ہوتا ہے، اس طرف اس کو ہانکتا ہے، کڑک اس کی آواز ہے۔ اس کو ترمذی نے بھی روایت کیا ہے اور حسن غریب کہا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اسرائیل کو عرق النساء کی بیماری تھی، رات کو بے چین رہتے، نیند نہ آتی، دن کو درد تھم جاتا، اس پر نذر مانی تھی۔[2] یہی قول امام ضحاک اور سدی رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: ان کے بیٹوں نے بھی ان کی پیروی کرتے ہوئے اونٹ کے گوشت کو حرام کر لیا تھا۔[3]

---

① سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١١٧) مسند أحمد (١/ ٢٧٤۔ ٢٧٨) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رواہ أحمد و الطبراني و رجالهما ثقات'' (مجمع الزوائد: ٨/ ٤٣٨)

② تفسير الطبري (٧/ ١٠) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا زمانہ نہیں پایا ہے۔ نیز اس سند میں ''حسین بن داود'' ضعیف راوی ہے اور یہی الفاظ دوسری سند سے بھی مروی ہیں، جو کہ مسلسل بالضعفاء ہے۔

③ تفسير الطبري (٧/ ٧۔ ١٠)

سیاقِ کلام کی پہلی مناسبت:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سیاق کی پہلے سیاق کے ساتھ دو مناسبتیں ہیں: ایک یہ کہ اسرائیل نے سب سے پسندیدہ اشیا کو اللہ کے لیے چھوڑ کر اپنے اوپر حرام کر لیا، ان کی شریعت میں یہ بات درست تھی، ہماری شریعت میں بھی یہ بات درست ہے کہ جو چیز بہت محبوب ہو، اس کو اللہ کی اطاعت میں خرچ کرے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ﴾ [البقرة: ١٧٧] ''اور مال سے محبت کے باوجود اُسے خرچ کرے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ ﴾ [الدھر: ٨] ''اور وہ کھانا، اس کی محبت کے باوجود، کھلاتے ہیں۔''

دوسری مناسبت:

دوسری مناسبت یہ ہے کہ نصاریٰ کے مسیح علیہ السلام کے بارے میں باطل عقیدے کا رد کیا ہے اور ان کے مذہب کو خود ساختہ قرار دیا ہے، کیوں کہ جو بات عیسیٰ و مریم علیہما السلام کے بارے میں صحیح اور یقینی تھی، وہ ظاہر ہو چکی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی قدرت سے بنایا، بنی اسرائیل کی طرف بھیجا، وہ سب کو اللہ کی عبادت کی طرف بلاتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کا رد کیا کہ جس نسخ کا تم انکار کرتے ہو اور اس کو جائز نہیں جانتے، وہ نسخ تو واقع ہوا، دیکھو تورات میں یہ بات منصوص (ثابت) ہے کہ جب نوح علیہ السلام کشتی سے نکلے، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے تمام جانور حلال کر دیے کہ جس کو چاہیں کھائیں۔

پھر اس کے بعد اسرائیل نے اونٹ کا گوشت اور دودھ اپنے اوپر خود حرام کر لیا۔ تورات میں اس کی حرمت آ گئی۔ اسی طرح اور کئی چیزوں کا حال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو اجازت دی تھی کہ وہ اپنی بیٹیوں کا نکاح اپنے بیٹوں سے کر دیں، پھر یہ بات حرام کر دی گئی۔ ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں بیوی پر لونڈی لانا جائز تھا، چناں چہ سارہ پر ہاجرہ کو لے آئے، حالاں کہ تورات میں ایسے کام کو حرام کیا ہے۔ اسی طرح دو بہنوں کا جمع کرنا درست تھا، چناں چہ یعقوب علیہ السلام کے پاس دو بہنیں تھیں، پھر تورات میں اس کی تحریم آ گئی۔

یہ سب مسائل تورات میں منصوص ہیں، لیکن یہودی نہیں مانتے، وہ ان کو جھٹلا کر ان کے خلاف چلتے ہیں۔ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم دینِ قدیم، صراطِ مستقیم، ملتِ ابراہیم علیہ السلام لے کر آئے، تو اب ان پر ایمان نہیں لاتے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ان پر تورات کے اُترنے سے پہلے سارے کھانے حلال تھے، مگر جس کو اسرائیل نے از خود حرام کر لیا۔ اب تم تورات لے کر آؤ، تمھارا جھوٹ سچ کھل جائے گا۔ جس کا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ہفتے کے دن شکار کرنا اور ہمیشہ تورات پر چلنا اور کسی اور نبی کا مبعوث نہ ہونا، جو داعی الی اللہ ہو، مشروع کر دیا ہے، وہ ظالم ہے، کیوں کہ پہلی شریعت منسوخ ہو چکی ہے اور حق اور سچ ظاہر ہو چکا ہے۔

دینِ اسلام دینِ ابراہیمی کا تسلسل ہے:

پھر اللہ نے نبی اکرم ﷺ سے کہا کہ تم کہہ دو کہ اللہ سچا ہے، جو کچھ اس نے قرآن میں مشروع کیا ہے، وہ سب ٹھیک ہے، اب تو ملتِ ابراہیم علیہ السلام کے تابع ہو جاؤ، وہ تو مشرک نہیں تھے۔ قرآن میں نبی اکرم ﷺ کی زبان پر وہی ملت اُتاری، جس پر ابراہیم تھے، وہ ملت حق ہے، اس میں کسی طرح کا شک اور شبہہ نہیں ہے۔ اس ملت سے زیادہ مکمل، زیادہ مبین، زیادہ واضح اور زیادہ تمام کوئی نبی نہیں لایا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴾ [الأنعام: ١٦١] ”(اے نبی!) کہہ دیجیے: بے شک مجھے میرے رب نے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی ہے، صحیح اعلیٰ اقدار کے حامل دین کی، ایک رب کے پرستار ابراہیم کے طریقے کی، اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔“ نیز فرمایا: ﴿ ثُمَّ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۗ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴾ [النحل: ١٢٣] ”(اے نبی!) پھر ہم نے آپ کی طرف وحی کی کہ ملتِ ابراہیم کی اتباع کریں جو (اللہ کی طرف) یکسو تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔“[1]

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ تمام کھانے والی چیزیں یعقوب علیہ السلام کے لیے حلال تھیں، کوئی چیز حرام نہیں تھی، مگر وہی جو اسرائیل (حضرت یعقوب) نے خود اپنے اوپر حرام کر لی تھی۔ وہ گاؤں میں رہتے تھے، وہاں عرق النساء ہوگئی، اس پر انھوں نے اونٹ کا گوشت اور دودھ کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ یہودیوں کا قرآن مجید کی اس خبر دینے پر انکار ناقابلِ تسلیم ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کے فرمان سے ظاہر ہے: ﴿ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَثِیْرًا ﴾ [النساء: ١٦٠] ”پھر جو لوگ یہودی ہوئے ان کے ظلم کی وجہ سے اور ان کے، اکثر لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنے کی وجہ سے ہم نے ان پر کچھ پاک چیزیں حرام کر دیں، جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں۔“ نیز اس کا فرمان ہے: ﴿ وَعَلَى الَّذِیْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَیْهِمْ شُحُوْمَهُمَاۤ اِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُوْرُهُمَاۤ اَوِ الْحَوَایَاۤ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ؕ ذٰلِكَ جَزَیْنٰهُمْ بِبَغْیِهِمْ ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١٤٦] ”اور جو لوگ یہودی ہوئے ان پر ہم نے ہر ناخن والا (جانور) حرام کیا تھا، اور گائے اور بکری میں سے ان پر ان کی چربی حرام کی تھی، سوائے اس چربی کے جو ان کی پیٹھوں یا آنتوں کے ساتھ لگی ہو یا ہڈی کے ساتھ ملی ہوئی ہو، یہ سزا ہم نے انھیں ان کی سرکشی کے باعث دی تھی اور بے شک ہم سچے ہیں۔“

یہودی کہتے تھے کہ یہ اشیا ہم سے پہلے نوح اور ابراہیم علیہما السلام پر بھی حرام تھیں، یہاں تک کہ نوبت ہم تک پہنچی۔

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۴۹۸۔ ۴۹۹)

مطلب یہ کہ جو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں حضرت یعقوب کا قصہ سنایا ہے، اس کی تکذیب کریں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا: تم غلط کہتے ہو، اسرائیل نے کھانے کی بعض قسموں کو خود حرام کر لیا تھا، وہ کھانا پہلے سے زمانۂ ابراہیم علیہ السلام میں ہرگز حرام نہیں تھا، ہاں تورات کے نزول کے بعد جو ابراہیم علیہ السلام سے ہزار سال بعد اُتری، کچھ قسم کے کھانے حرام ہو گئے، اگر تم سچے ہو تو تورات میں ان کی پرانی تحریم لا کر بتاؤ۔

لیکن ان کو جرأت نہ ہوئی، وہ رسوائی کے ڈر سے کتاب نہ لائے اور حیران ہو کر رہ گئے۔ یہ وہ دلیل ہے جس نے جھگڑا کرنے والوں کو چپ کرا دیا۔ نبی کریم ﷺ کی سچائی اور پہلی شریعت کی منسوخی کو ثابت کر دکھلایا۔ اس آیت میں یہودیوں کے شرک کو پیش کیا گیا اور اس بات کی تشریح کی گئی ہے کہ یہودیوں اور نبی اکرم ﷺ کے درمیان کوئی دینی تعلق نہیں ہے، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ اصولِ دین میں ملتِ ابراہیم پر ہیں اور توحید کی طرف بلاتے ہیں، ہر باطل معبود سے بیزار کرتے ہیں، ابراہیم علیہ السلام کا بھی یہی دین تھا۔[1]

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿96﴾ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَ مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿97﴾

بے شک (اللہ کا) پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے۔ وہ تمام دنیا کے لیے بڑی برکت اور ہدایت والا ہے (96) اس میں واضح نشانیاں ہیں (اور) مقامِ ابراہیم ہے اور جو اس میں داخل ہو جائے، وہ امن والا ہو جاتا ہے، اللہ نے ان لوگوں پر بیت اللہ کا حج فرض کیا ہے جو اس کی طرف سفر کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور جس نے کفر کیا تو بے شک اللہ ساری دنیا سے بے پروا ہے (97)

دنیا میں خدا کا پہلا گھر، کعبہ:

یہ بھی یہودیوں کا ایک شبہہ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کا گھرانہ ہمیشہ سے شام میں رہا، انھوں نے بیت المقدس کو قبلہ رکھا اور تم مکہ میں ہو، کعبے کو قبلہ بناتے ہو، تم کیوں کر ابراہیم علیہ السلام کے وارث ہو سکتے ہو؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ سے اللہ تعالیٰ کے نام پر یہی پہلا عبادت خانہ بنا۔ اس میں بزرگی کی نشانیاں اور ایسی علامتیں

---

[1] فتح البیان (۲/ ۲۸۵۔ ۲۸۸)

ہیں، جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کا اصل مقام یہی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ پہلا گھر جو لوگوں کے لیے ان کی عام عبادات، قربانی، طواف، نماز اور اعتکاف کے لیے بنا، وہ یہی خانہ کعبہ ہے، جس کو ابراہیم نے بنایا ہے۔ یہود و نصاریٰ سمجھتے ہیں کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کے دین اور طریقے پر ہیں، اگر یہ سچ ہے تو پھر کیوں اس گھر کا حج نہیں کرتے، جس کو ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے بنایا ہے اور سب لوگوں کو اس کے حج کی طرف بلایا تھا۔ اسی لیے یہ فرمایا کہ وہ گھر مبارک ہے اور سارے جہان والوں کے لیے موجبِ ہدایت ہے۔[1] سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کون سی مسجد سب سے پہلے بنی ہے؟ فرمایا: مسجد الحرام۔ میں نے کہا: پھر کون سی؟ فرمایا: مسجدِ اقصیٰ۔ میں نے کہا: دونوں کے درمیان میں کتنی مدت ہوئی؟ فرمایا: چالیس برس۔ میں نے کہا: پھر کون سی مسجد؟ فرمایا: پھر جس جگہ تم کو نماز پا لے، وہیں نماز پڑھ، ساری زمین مسجد ہے۔[2] (رواه أحمد و الشيخان)

پہلا گھر ہونے کا مفہوم:

سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا: اس گھر سے پہلے اور گھر بھی تھے، لیکن پہلا گھر جو عبادت کے لیے بنا، وہ یہی کعبہ ہے۔[3] دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ کسی نے ان سے کہا کہ کیا زمین پر جو سب سے پہلے گھر بنا یہی ہے؟ فرمایا: یہ بات نہیں ہے، لیکن پہلا گھر، جس میں برکت رکھی گئی، مقامِ ابراہیم ہے، جو اس میں آیا، امن میں ہوا۔ امام سدی رحمہ اللہ کا یہ زعم کہ پہلا گھر جو روئے زمین پر مطلقاً بنا یہی گھر ہے،[4] ٹھیک نہیں ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول صحیح ہے۔ رہی سیدنا ابن عمرو رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث کہ جس میں مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو بھیج کر آدم اور حوا کو حکم دیا کہ تم کعبہ بناؤ، جب بنایا تو حکم دیا کہ اس کا طواف کرو اور یہ فرمایا کہ تو پہلا شخص ہے اور یہ پہلا گھر ہے، جو لوگوں کے لیے بنایا گیا ہے۔[5] اس حدیث کو امام بیہقی رحمہ اللہ نے کتاب "دلائل النبوة" میں روایت کیا ہے، مگر یہ حدیث مفردات ابن لہیعہ سے ہے اور ابن لہیعہ ضعیف ہے۔ غالب گمان یہی ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے اور ان دو کتابوں سے لدھے اونٹوں میں سے ہے، جن کو جنگِ یرموک کے دن اہلِ کتاب کے کلام میں سے پایا تھا۔

مکہ کے نام اور بکہ کی وجہ تسمیہ:

بکہ یہ مکہ کا نام ہے، کیوں کہ وہ ظالموں اور جابروں کی گردنوں کو توڑتا ہے، یعنی اس کے سامنے ذلیل اور عاجز

---

(1) تفسير ابن كثير (١/ ٤٩٩)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٨٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٠) مسند أحمد (٥/ ١٥٠)

(3) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٧٠٧_ ٧٠٨)

(4) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٧٠٧) اس کی سند میں "مجالد بن سعید" ضعیف راوی ہے۔

(5) دلائل النبوة للبيهقي (٢/ ٤٤_ ٤٥) اس کی سند میں "ابن لہیعہ" ضعیف راوی ہے۔

ہو کر آتے ہیں یا اس لیے کہ لوگ وہاں ازدحام کر کے آتے ہیں اور ایک بھیڑ لگی رہتی ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے سبب سے سب کو توڑ دیا، وہاں عورتیں مردوں کے آگے نماز پڑھتی ہیں، یہ بات مکہ کے سوا کسی شہر میں نہیں۔ اسی طرح امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، عمرو بن شعیب اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مکہ فج سے تنعیم تک اور بکہ بیت سے بطحاء تک ہے۔ ابراہیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بکہ بیت و مسجد کو کہتے ہیں۔ امام زہری رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: بیت اور جو کچھ اس کے گرد ہے، بکہ ہے، جو اس کے ماسوا ہے، وہ مکہ ہے۔ ابو مالک، نخعی، عطیہ اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ جس جگہ گھر بنا ہے، وہ بکہ ہے، اس کے ماسوا مکہ ہے۔[1] اہلِ علم نے ذکر کیا ہے کہ مکہ کے بہت نام ہیں۔ مکہ، بکہ، بیتِ عتیق، بیتِ حرام، بلدِ امین، مامون، اُم رحم، اُم قریٰ، صلاح، عرشِ کادس، مقدسہ، ناسہ، باسہ، حاطمہ، راس، کوثا، بلدہ، بینہ اور کعبہ۔ اس گھر میں اس بات کی ظاہر نشانیاں ہیں کہ اسے ابراہیم علیہ السلام نے بنایا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو عظمت اور شرف بخشا ہے۔

مقام ابراہیم:

مقامِ ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر ابراہیم علیہ السلام دیوارِ کعبہ چنتے تھے۔ پہلے وہ پتھر دیوار میں چپکا ہوا تھا، سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنی امارت میں اس کو مشرق کی طرف رکھ دیا، تاکہ طواف آسان ہو اور نمازیوں کو تشویش نہ ہو، کیوں کہ اس کے پاس نماز پڑھنے کا حکم ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ﴾ [البقرة: ١٢٥] ''اور (حکم دیا کہ) تم مقامِ ابراہیم کو جائے نماز بناؤ۔'' امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے: ابراہیم علیہ السلام کے دونوں قدموں کے نشان ایک واضح نشانی ہے۔ اسی طرح عمر بن عبدالعزیز، حسن، قتادہ اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم سے بھی مروی ہے۔[2] ابو طالب والد سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے اپنے قصیدہ لامیہ میں کہا ہے۔

وَمَوْطِئُ إِبْرَاهِيمَ فِيْ الصَّخْرِ رَطْبَةٌ   عَلٰى قَدَمَيْهِ حَافِيًا غَيْرَ نَاعِلِ

''چٹان پر ابراہیم علیہ السلام کے ننگے قدموں کے نشان تازہ ہیں۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ سارا حرم مقامِ ابراہیم ہے۔ عمرو رحمہ اللہ کا کہنا یہ ہے کہ سارا حجر مقامِ ابراہیم ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے کہا: حج مقامِ ابراہیم ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: نسخے میں یوں ہی دیکھا ہے، شاید حجر کی جگہ حج لکھا گیا ہے، جس طرح امام مجاہد رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے: ''اَلْحِجْرُ كُلُّهُ مَقَامُ إِبْرَاهِيمَ''[3]

مقام، مقام امن ہے:

حرمِ مکہ میں جب کوئی خوف زدہ آ جاتا ہے، تو ہر طرح سے امن میں ہو جاتا ہے۔ جاہلیت میں بھی اسی طرح

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٧٠٩) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٧١١)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٧١١) تفسير ابن كثير (١/ ٥٠٠)

تھا۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں: قاتل اپنی گردن میں صوف (اون کا ٹکڑا) رکھ کر حرم میں آ جاتا، مقتول کا بیٹا اس کو دیکھتا، لیکن کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کر سکتا، یہاں تک کہ وہ خود ہی حرم سے باہر نکلے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: جس نے بیت کی پناہ پکڑی، بیت نے اس کو پناہ دی، لیکن اس کو جگہ دی جائے نہ کھانا پینا، جب باہر آئے تو اس کے گناہ کی وجہ سے اس کو پکڑ لیا جائے،[1] جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَوَ لَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ ﴾ [العنكبوت: ٦٧] ”کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ بے شک ہم نے حرم (مکہ) کو پُرامن بنایا ہے، جبکہ لوگ اس کے اِردگرد سے اُچک لیے جاتے ہیں۔ کیا پھر وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں۔“ نیز فرمایا: ﴿ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۝ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴾ [القريش: ٣۔ ٤] ”لہٰذا انھیں چاہیے کہ وہ اس گھر (کعبہ) کے مالک کی عبادت کریں۔ جس نے انھیں بھوک میں کھانا کھلایا اور اُنھیں خوف سے امن دیا۔“

حرمتِ مکہ کے تقاضے:

حرم کی ایک حرمت یہ ہے کہ وہاں شکار کرنا، پرندوں کو آشیانے سے اڑانا، درخت کاٹنا، گھاس اُکھیڑنا حرام ہے۔ اس بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے احادیثِ مرفوعہ وموقوفہ آئی ہیں۔ صحیح مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا: اب ہجرت نہیں لیکن جہاد اور نیت ہے، جب تم بلائے جاؤ تو حاضر ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو اس دن سے حرام کر دیا ہے، جس دن آسمان و زمین بنائے۔ یہ شہر قیامت کے دن تک اللہ کے حرام کرنے سے حرام ہے، مجھ سے پہلے کسی کے لیے یہاں لڑنا حلال نہیں ہوا۔ میرے لیے جو حلال ہوا تو وہ دن میں ایک گھڑی کے لیے تھا، اب قیامت تک وہ حرام ہے، نہ یہاں کا کانٹا توڑیں، نہ شکار کو بھڑکائیں، نہ گری پڑی چیز اٹھائیں، سوائے اس کے جو اس کی پہچان کروائے اور نہ گھاس اُکھاڑیں۔

سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! مگر اذخر (گھاس) کہ وہ لوہاروں اور گھروں کے کام آتی ہے۔ فرمایا: مگر اذخر۔[2] اس کو شیخین نے سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی کے قریب قریب روایت کیا ہے۔[3] سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے سنا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ کسی کو حلال نہیں کہ مکہ میں ہتھیار اُٹھائے۔[4] (رواہ مسلم) عبداللہ بن عدی بن حمراء زہری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے بازار میں کھڑے تھے، فرمایا: واللہ! تو اللہ کی بہترین اور محبوب ترین زمین ہے، اگر میں تیرے پاس سے نہ نکالا جاتا تو نہ نکلتا۔ (رواه أحمد وهذا لفظه والترمذي والنسائي

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٧١١۔ ٧١٢) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٥٣)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٥٥) [4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٥٦)

و ابن ماجه) امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث صحیح ہے۔[1] اسی طرح کی ایک صحیح حدیث سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی آئی ہے۔[2] امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس کے مثل روایت کیا ہے۔[3] یحییٰ بن جعدہ رحمہ اللہ نے کہا: جو کوئی اس میں آیا، وہ نار (آگ) سے امن میں ہوا۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں: جو کوئی بیت اللہ میں داخل ہوا، وہ نیکی میں داخل ہوا اور مغفور ہو کر برائی سے باہر نکل آیا۔ (رواہ البیهقي) اس حدیث کی سند میں عبداللہ بن مومل ہیں، جو متفرد ہیں، اس لیے حدیث کچھ قوی نہیں ہے۔[5]

بیت اللہ کی فضیلت:

فتح البیان میں ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ بیت المقدس کعبہ سے افضل اور زیادہ عظمت والا ہے، کیوں کہ وہ انبیا کی ہجرت گاہ اور ارضِ محشر ہے، مقدس زمین میں واقع ہوا ہے اور سب انبیا کا قبلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا رد کیا اور ان کو اس بات سے آگاہ کیا کہ پہلی عبادت گاہ یہی کعبہ ہے تو کسی اور سے یہی افضل ٹھہرا۔ جو پہلا ہوتا ہے، وہی دوسروں سے متقدم ہوتا ہے۔ سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ آدم علیہ السلام کی پیدایش سے دو ہزار سال پہلے عبادت کے لیے مقرر ہو چکا تھا، پھر مسجدِ اقصیٰ بنی۔ معلوم ہوا کہ مسجدِ اقصیٰ کے بانی بھی ملائکہ ہیں۔ کہتے ہیں کہ بیت اللہ کو پہلے ملائکہ نے بنایا، پھر آدم علیہ السلام نے اس کی تجدید کی، پھر ابراہیم علیہ السلام نے۔

لفظِ ناس تمام لوگوں کو شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ سَوَآءٌ الْعٰكِفُ فِيْهِ وَ الْبَادِ ﴾ [الحج: ۲۵] ''اس میں مقیم اور بادیہ نشین (باہر سے آنے والے) برابر ہیں۔'' اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو اطاعت گزاری کی جگہ، عبادات کی جگہ، نمازوں کے لیے قبلہ، حج اور عمرہ کرنے والوں کا مقصود اور طواف کا گھر ٹھہرایا۔ وہاں نیکیوں کا ثواب، اطاعت کا اجر اور خیرات کا بدلہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس گھر کا برکت والا ہونا یہ ہے کہ جو کوئی وہاں ٹھہرتا ہے یا اس کا قصد کرتا ہے، اس کو خیرِ کثیر حاصل ہوتی ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ میری اس مسجد میں نماز اور مسجدوں میں ہزار نمازوں سے بہتر ہے سوائے مسجد حرام کے۔[6] (أخرجه الشیخان)

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٣٠٥) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٩٢٥) سنن النسائي الکبریٰ (٢/ ٤٧٩) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٣١٠٨) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٧٠٨٩)

[2] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٩٢٦) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٥٥٣٦)

[3] مسند أحمد (٤/ ٣٠٥) مسند البزار (١٤/ ٢٧٩) امام ہیثمی رحمہ اللہ نے اس کی نسبت امام بزار رحمہ اللہ کی طرف کرتے ہوئے اس کے رجال کو صحیح کہا ہے۔ (مجمع الزوائد: ٣/ ٦١٦)

[4] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٧١٢)

[5] سنن البیهقي الکبریٰ (٥/ ١٥٨) اس کی سند میں ''عبداللہ بن مومل'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعیفة، رقم الحدیث: ١٩١٧)

[6] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١١٣٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٣٩٤)

وہ گھر سارے مومنوں کا قبلہ ہے، اس سے نماز کی سمت معلوم کرتے ہیں، اس لیے اس کو ﴿ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ فرمایا، کیونکہ وہ گھر اس کے بنانے والے مختارِ کل کے وجود پر دلیل ہے، اس میں وہ نشانیاں ہیں، جن پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو قدرت حاصل نہیں یا اس لیے کہ وہ جنت کی طرف راہنما ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مروی ہے: جب عرش پانی پر تھا، ایک سفید پھین (جھاگ) تھا، اس کے نیچے زمین تھی، جیسے زبدۃ (مکھن)، وہیں سے زمین کو پھیلایا۔[1] (أخرجه الطبراني والبيهقي في الشعب و ابن جرير و ابن المنذر)

حرم میں اقامتِ حد:

حرم کا ایک حکم یہ ہے کہ جو اس میں آیا، وہ امن میں ہوا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ایسا شخص جس پر حد لگنا ہو، وہ اگر حرم میں آجائے تو جب تک وہ باہر نہ نکلے، تب تک اس پر حد قائم نہ کی جائے، مگر جمہور نے اس کے خلاف کہا ہے کہ حرم میں اقامتِ حدود ہو سکتی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور ایک جماعت کا یہی قول ہے، کیوں کہ آیت اگرچہ بطورِ خبر ہے، مگر امر کے حکم میں ہے، یعنی جو اس میں آجائے، تم اس کو امن دو، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ﴾ [البقرة: ۱۹۷] ''تو حج کے دوران میں وہ جنسی باتیں نہ کرے، اللہ کی نافرمانی نہ کرے اور کسی سے جھگڑا نہ کرے۔'' یعنی تم یہ کام نہ کرو۔

امن کی تفسیر:

کسی نے کہا: جو بیت اللہ میں عامِ عمرۃ القضاء میں داخل ہوا، وہ امن میں ہے۔ کسی نے کہا: جو اللہ کی تعظیم کرتا ہوا اس کا تقرب چاہنے کے لیے آیا، وہ قیامت کے دن کے عذاب سے امن میں ہے۔ حدیث میں مروی ہے کہ جو دو حرم میں سے کسی ایک میں مرا، وہ قیامت کے دن امن میں اُٹھے گا۔[2] دوسری حدیث میں مروی ہے کہ حجون اور بقیع کے کناروں کو، جو مکہ اور مدینہ کے قبرستان ہیں، پکڑ کر جنت میں جھاڑ دیں گے۔[3] ابو السعود رحمہ اللہ نے ان حدیثوں کا ذکر کیا ہے،[4] مگر تخریج نہیں بتائی۔ کسی نے کہا: ان گناہوں سے امن ہے، جو آنے سے پہلے کمائے تھے۔ پہلا قول مضبوط ہے۔[5] اگر امن سے دنیا اور آخرت دونوں کا امن مراد لیں تو بھی کوئی ممانعت نہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اس

---

① شعب الإيمان (۳/ ٤٣١) تفسير الطبري (۷/ ۲۰) امام ہیثمی رحمہ اللہ اس کی نسبت ''المعجم الكبير'' کی طرف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''ورجاله رجال الصحيح'' (مجمع الزوائد: ۳/ ٦٢٥)

② سنن الدارقطني (۲/ ۲۷۸) اس روایت کی سند میں ''ہارون ابو قزعہ'' اور ''رجل من آل حاطب'' مجہول راوی ہیں۔ مزید دیکھیں: إرواء الغليل (٤/ ۳۳۳)

③ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''لا يعرف له أصل'' (المصنوع في معرفة الحديث الموضوع: ۱/ ۹۲)

④ تفسير أبي السعود (۲/ ٦١)

⑤ فتح البيان (۲/ ۲۸۸۔ ۲۹۲)

زمانے میں حرمِ مامن (امن کی جگہ) نہیں رہا، کسی مجرم اور واجب الحد کا وہاں امن میں ہونا تو درکنار جو متبع کتاب، مقتدیِ سنت، موحدِ مخلص اب وہاں جاتا ہے، اس کو ٹھہرنے نہیں دیتے، مشرکین اور کفار کی طرح حرم سے ان کو نکالتے ہیں، حالاں کہ کتاب وسنت کے احکام کو چھوڑ کر یہ کام امام صاحب کے مذہب کے بھی خلاف ہے۔[1] إنا للّٰه.

زندگی میں ایک مرتبہ حج کی فرضیت:

پھر اللہ تعالیٰ نے حج کے واجب ہونے کا حکم ارشاد فرمایا کہ سب لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا فرض ہے، جس سے ہو سکے۔ جمہور کہتے ہیں: وجوبِ حج پر یہ آیت دلیل ہے۔ بعض نے کہا: دلیل وہ آیت ہے: ﴿ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ﴾ [البقرة: ١٩٦] ''اور تم حج اور عمرہ اللہ کے لیے پورا کرو۔'' پہلا قول زیادہ ظاہر ہے۔ بہت سی حدیثوں میں مروی ہے کہ حج اسلام کا ایک رکن اور دین کا ایک ستون ہے۔ سارے مسلمانوں کا اس پر اجماع ضروری ہے۔ نصِ قرآنی اور اجماع کی دلیل سے مکلّف پر تمام عمر میں ایک بار حج کرنا فرض ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو خطبہ سنایا، اس میں یہ فرمایا کہ اے لوگو! تم پر حج فرض کیا گیا ہے، لہٰذا تم حج کیا کرو۔ ایک آدمی نے کہا: کیا ہر سال؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، جب اس نے تین بار یہی کہا تو فرمایا: اگر میں ہاں کہہ دیتا تو واجب ہو جاتا اور تم سے ہرگز نہ بنتا۔ پھر فرمایا کہ تم مجھ کو (غیر ضروری سوال کرنے سے) چھوڑ دیا کرو، جب تک کہ میں تم کو چھوڑوں، (کچھ بیان نہ کروں) نہیں ہلاک ہوئے وہ لوگ جو تم سے پہلے تھے، مگر اپنے انبیا سے اسی کثرتِ سوال اور اختلاف کی وجہ سے۔ جب میں تم کو کسی بات کا حکم کروں تو جہاں تک تم سے ہو سکے اس کو کرو اور جب تم کو کسی بات سے منع کر دوں تو اس کو چھوڑ دو۔[2] (رواه أحمد و مسلم نحوه)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے میں فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج کرنا فرض کیا ہے۔ سیدنا اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ بولے: کیا ہر سال؟ فرمایا: اگر میں ہاں کہہ دوں تو واجب ہو جائے گا اور تم نہ کر سکو گے اور نہ کرو گے تو گناہ گار ہو گے، حج ایک بار ہے، جس نے زیادہ کیا وہ تطوع (نیکی اور نفل) ہے۔[3] (رواه أحمد و أبو داود والنسائي و ابن ماجه) سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری، ایک شخص نے کہا: کیا ہر برس؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم چپ رہے، اس نے پھر کہا تو فرمایا کہ نہیں، اگر میں ہاں کہتا تو واجب ہو جاتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے وہ آیت اُتاری: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ﴾ [المائدة: ١٠١]

---

[1] یہ نواب صاحب کے وقت کی بات ہے، جب حرم پر شریفِ مکہ جیسے قبر پرستوں کا قبضہ تھا، اب حالات الحمد للہ اس کے برعکس ہیں۔

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٣٧) مسند أحمد (٢/ ٥٠٨)

[3] مسند أحمد (١/ ٢٩٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٢١) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٦٢٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٨٦) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو ''صحیح'' کہا ہے۔ (صحيح أبي داود: ٥/ ٤٠٥)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایسی باتوں کے بارے میں سوال نہ کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمھیں بری لگیں۔''[1] (رواه أحمد و كذا رواه الترمذي و ابن ماجه والحاكم، ثم قال الترمذي: حسن غريب)

لیکن اس میں نظر ہے، کیوں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابو البختری رحمہ اللہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے نہیں سنا۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ لوگوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا حج ہر سال ہے؟ فرمایا: اگر ہاں کہوں گا تو واجب ہو جائے گا، واجب ہوگا تو تم اس پر قائم نہیں رہ سکو گے اور اگر قائم نہ رہو گے تو عذاب دیے جاؤ گے۔[2] (رواه ابن ماجه) سیدنا سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ ہمارا متعہ، یعنی حج تمتع اسی سال کے لیے ہے؟ فرمایا: نہیں، بلکہ ہمیشہ کے لیے۔ دوسری روایت میں مروی ہے: بلکہ ابد الآباد کے لیے۔[3] (رواه الشيخان) سیدنا ابو واقد لیثی رضی اللہ عنہ کی روایت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج میں اپنی بیویوں سے کہا: «هٰذِهٖ ثُمَّ ظُهُوْرَ الْحُصُرِ»[4] ''تم اس حج کے بعد بوریوں کی پشت کو پکڑے ہوئے گھر سے باہر نہ نکلو۔'' (رواه أحمد و أبو داود) اس سے معلوم ہوا کہ حج تمام عمر میں ایک ہی بار فرض ہے، پھر عورتوں کے لیے بار بار نفل حج کرنا بھی کچھ ضروری نہیں ہے۔

استطاعت کا مفہوم:

رہی استطاعت تو وہ کبھی بہ نفسہ ہوتی ہے اور کبھی اس کے علاوہ، جس طرح کتبِ احکام میں لکھا ہوا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ایک آدمی نے کھڑے ہو کر پوچھا: اے اللہ کے رسول! حاجی کون ہے؟ فرمایا: پریشان بال، میلا کچیلا۔ دوسرے نے کہا: کون سا حج افضل ہے؟ فرمایا: لبیک کہنا، جانور ذبح کرنا۔ تیسرے نے کہا: راہ کیا ہے؟ فرمایا: زادِ راہ اور سواری۔ (رواه الترمذي) اس کو ابن ماجہ رحمہ اللہ نے ابراہیم بن یزید خوزی رحمہ اللہ سے مروی حدیث سے لیا ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث مرفوع نہیں ہے، مگر انھی کی روایت سے، ان کے حفظ میں بعض اہلِ علم نے کلام کیا ہے۔ یہاں تک یہ کہا۔ اور کتاب الحج میں یوں فرمایا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے۔[5] کوئی شک نہیں کہ اس اسناد کے خوزی کے سوا سارے رجال (راوی) ثقات ہیں۔ خوزی میں اسی حدیث کی بنیاد پر کلام کیا ہے، لیکن دوسروں نے اس کی متابعت کی ہے۔

---

[1] مسند أحمد (١/ ١١٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٨١٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٨٤) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٢٢) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ ابو البختری رحمہ اللہ کا سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ (نصب الراية: ٣/ ٥)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٨٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٢٧٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٣٧١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢١٦، ١٢١٨)

[4] مسند أحمد (٥/ ٢١٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٢٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٠٠٨)

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩٩٨، ٨١٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٩٦) اس کی سند میں ''ابراہیم بن یزید خوزی'' متروک راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ١/ ١٨٠)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ایک آدمی نے آ کر نبی اکرم ﷺ سے کہا: سبیل کیا ہے؟ فرمایا: زادِ راہ اور سواری، یعنی خرچ اور سواری۔ (رواہ ابن أبي حاتم و ابن مردویه) اسی طرح سیدنا عبداللہ بن عباس، انس رضی اللہ عنہم، امام حسن، مجاہد، عطا، سعید بن جبیر، ربیع و قتادہ رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے۔[1] یہ حدیث کئی طرق سے آئی ہے۔ سیدنا انس، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہم سب نے اس کو مرفوعاً روایت کیا ہے، لیکن اس کی اسانید میں کلام ہے۔ حافظ ابوبکر بن مردویہ رحمہ اللہ نے اس حدیث کے تمام طرق کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے ﴿ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا ﴾ کا مطلب پوچھا گیا کہ سبیل کیا ہے؟ فرمایا: زاد و راحلہ (سفر کا خرچ اور سواری)۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ حدیث مسلم کی شرط پر ہے، اگرچہ شیخین نے اس کو روایت نہیں کیا ہے۔[2] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ آیت پڑھی تو لوگوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! سبیل کیا ہے؟ فرمایا توشہ و سواری۔[3] (رواہ ابن جریر)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ حج کی جلدی کرو، یعنی فرض حج کی، کیوں کہ تم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ اس کو کیا پیش آئے گا۔[4] (رواہ أحمد) دوسری روایت یہ ہے کہ جس کا ارادہ ہو کہ حج کرے تو اس کو چاہیے کہ جلدی کرے۔[5] (رواہ أحمد) عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: جو تین سو درہم کا مالک ہو، وہ مستطیع سبیل ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: سبیل سے مراد صحت ہے، یعنی تندرستی۔ دوسرے الفاظ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ہیں کہ سبیل زاد اور شتر ہے، یعنی خرچ اور سواری۔[6] فتح البیان میں کہا ہے کہ ﴿ لِلّٰهِ ﴾ کا ''لام'' واجب اور لازمی قرار دینے کے لیے ہے اور ﴿ عَلَى ﴾ نے اس کی تاکید مزید کر دی ہے۔ عرب کے محاورے میں یہ حرف وجوب کی سب سے واضح دلیل ہے۔ یہ خطاب تمام لوگوں کو شامل ہے، سوائے اس کے جس کو دلیل نے اس سے مستثنیٰ کر دیا ہو، جیسے: بچہ اور غلام۔

حج اور عمرے کے فضائل:

حجِ بیت اللہ اور عمرے کی فضیلت میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث یہ ہے، جس کو سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً روایت کیا ہے: « لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلٰى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: مَسْجِدِيْ هٰذَا

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۷۱۳) اس کی سند یں ''محمد بن عبداللہ بن عمیر لیثی'' ضعیف راوی ہے۔

[2] مستدرك الحاكم (۱/ ۶۰۹) اس کی سند میں ''ابو قتادہ حرانی'' متروک راوی ہے۔ نیز امام البانی رحمہ اللہ نے گزشتہ تمام روایتوں کو جمع کرتے ہوئے ہر ایک کی وجہ ضعف بھی بتائی ہے۔ دیکھیں: إرواء الغلیل (٤/ ١٦٠)

[3] تفسیر الطبري (۷/ ۳۹) یہ روایت مرسل ہے۔

[4] مسند أحمد (۱/ ۳۱۳) امام البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو ''حسن'' کہا ہے۔ (إرواء الغلیل: ٤/ ١٦٨)

[5] مسند أحمد (۱/ ۲۲۵) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٦٠٠٣) [6] تفسیر الطبري (۷/ ۳۸، ٤٤)

وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصٰی » [1] (رواه الشيخان) ”کجاوے نہ کسے جائیں (برائے حصولِ قربِ الٰہی سفر نہ کیا جائے)، مگر تین مساجد کی طرف (سفر کے لیے): میری اس مسجد (مسجدِ نبوی) کے لیے اور مسجد الحرام (بیت اللہ) اور مسجد اقصیٰ کے لیے۔“ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یہ مروی ہے: «اَلْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا وَالْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ » [2] (أخرجه البخاري و مسلم) ”ایک عمرہ دوسرے عمرے کے درمیان کیے گئے گناہوں کے لیے کفارہ ہو جاتا ہے اور حجِ مبرور کی جزا صرف جنت ہے۔“ رسالہ ”إیضاح المحجة“ اور رسالہ ”طراز الخمرة“ میں اس بارے میں احادیث مذکور ہیں۔ وللہ الحمد.

استطاعت کی تفسیر میں علما کا اختلاف:

استطاعت میں اہلِ علم کا اختلاف ہے، بعض نے کہا: زاد اور سواری مراد ہے۔ یہی تفسیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کا بھی یہی موقف ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: یہی اکثر اہلِ علم کا قول ہے، لہٰذا یہی حق ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا: جس آدمی کو اپنی قوت پر اعتماد ہو، اس پر حج لازم ہے، اگرچہ اس کے پاس زادِ راہ اور سواری نہ ہو، جبکہ وہ شخص کما سکتا ہو۔ ابن الزبیر رضی اللہ عنہما، شعبی اور عکرمہ رحمہما اللہ کا یہی قول ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا کہ اگر جوان قوی صحیح ہو اور مال دار نہ ہو تو کسی کا مزدور ہو کر حج کرے۔ [3] نیز من جملہ استطاعت کے ایک یہ ہے کہ حج کا راستہ پُر امن ہو، حاجی اپنی جان و مال کا امن رکھتا ہو، جبکہ اس مال کے سوا اور کچھ زادِ راہ نہ ہو۔ پھر اگر راستے میں امن نہیں ہے تو استطاعت بھی نہیں ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے استطاعتِ سبیل کی قید فرمائی ہے۔

اس لیے جس کو اپنی جان و مال کا امن نہیں ہے، وہ بلا شک و شبہہ مستطیعِ سبیل نہیں ہے۔ اگر راستے میں ظالم لوگ ہیں، جو کچھ مال لے لیتے ہیں اور باقی مال زاد کے لیے کافی نہیں ہوتا تو امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک دانہ نہ دے، فرض حج اس سے ساقط ہے۔ ایک جماعت نے اس قول میں امام شافعی رحمہ اللہ کی موافقت کی ہے اور دوسروں نے مخالفت کی ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ جس کے پاس زاد و راحلہ ہے اور راستہ پُر امن ہے، اس راہ سے گزر سکتا ہے، اگرچہ بعض ظالموں کو کچھ دینا پڑتا ہے اور حاجی اس قدر مال دے سکتا ہے اور زاد میں اتنی کمی نہیں پڑتی کہ خرچ کی تنگی ہو یا دستِ سوال دراز کرنا پڑے تو اس سے حج ساقط نہیں ہو سکتا، بلکہ اس پر واجب ہے، کیوں کہ وہ بعض مال دے کر مستطیعِ سبیل ہے۔ لیکن استطاعت اس مال پر موقوف ہے، جو راستے میں دیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی کے پاس فقط اتنا ہے کہ زاد اور سواری ہی کے لیے ہے اور راستے میں کسی کو دینے کی گنجایش نہیں تو اس پر حج واجب نہیں ہے، کیوں کہ اس کو راہ کی استطاعت نہیں ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٣٢)
[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦٨٣) صحيح مسلم (١٣٤٩)
[3] تفسير الطبري (٧/ ٤٣)

یہ بات تفسیرِ استطاعت زاد و راحلہ (سواری) کے خلاف نہیں ہوسکتی، کیوں کہ جس کے پاس فقط زاد اور راحلہ ہے اور راستے میں اہلِ مکس (ٹیکس لینے والے ظالموں) کو دینے کے لیے کچھ نہیں، وہ اس راہ سے گزر نہیں سکتا۔ شاید امام شافعی رحمہ اللہ کے قول کی یہی وجہ ہے کہ یہ مکس منکر ہے اور حاجی پر ہر منکر میں داخل ہونا واجب نہیں ہے، وہ اس منکر کی وجہ سے مستطیع نہیں رہا۔ من جملہ استطاعت کے ایک یہ بات بھی ہے کہ حاجی صحیح بدن والا ہو، تندرست ہو، سواری پر بیٹھ سکتا ہو، اگر ایسا وقت ہے کہ پاؤں سے چل نہیں سکتا نہ سوار ہوسکتا ہے تو ایسے شخص پر زادِ راہ اور سواری ہونے کے باوجود حج واجب نہیں،[1] کیوں کہ وہ سبیل کی استطاعت نہیں رکھتا۔ تفسیرِ استطاعت برائے زاد و راحلہ کے بارے میں جو حدیث کئی طرق سے مرفوعاً مروی ہے اور اسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے روایت کیا ہے، اس کا سب سے کم درجہ یہ ہے کہ حسن لغیرہ ہو۔ اس صورت میں اس کے بعض طرق پر جو اعتراض کیا گیا، وہ اس کو کچھ مضر نہیں۔

عورت کے لیے محرم، استطاعت میں شامل ہے:

نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے عورت کو بغیر ذی رحم محرم کے سفر سے منع فرمایا ہے۔ مدت میں اختلاف ہے، ایک روایت میں تین دن، دوسری میں ایک دن اور رات،[2] تیسری میں ایک برید آیا ہے۔[3] برید ڈاک کی ایک چوکی کو کہتے ہیں۔[4]

استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے والے کا حکم:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس نے کفر کیا اور فرضیتِ حج کو نہ مانا تو اللہ تعالیٰ سارے جہان سے بے پروا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور امام مجاہد رحمہ اللہ وغیرہما کا یہی قول ہے۔[5] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾[آل عمران: ۸۵] ''اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔'' یہودیوں نے کہا: ہم مسلمان ہیں، اللہ تعالیٰ نے کہا: تم ان سے کہو: اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر حج فرض کیا ہے، جس کو مقدور ہو، وہ حج کرے۔ کہنے لگے: ہم پر فرض نہیں ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) امام مجاہد رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔[6]

سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً مروی حدیث میں ہے کہ جو کوئی زاد اور راحلہ کا مالک ہو اور اس نے بیت اللہ کا حج نہ کیا تو اس کو کچھ ضرر نہیں، یہودی مرے یا نصرانی، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ ﴾

---

[1] فتح القدير (۱/ ۵۹۵۔ ۵۹۶) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۱۰۳۶، ۱۰۳۸) صحيح مسلم (۱۳۳۸، ۱۳۳۹)
[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۷۲۵) صحيح ابن خزيمة (۴/ ۱۳۵) صحيح ابن حبان (۶/ ۴۳۸) صحيح الجامع (۷۳۰۲)
[4] فتح البيان (۲/ ۲۹۲۔ ۲۹۵) [5] تفسير الطبري (۷/ ۴۷) [6] سنن البيهقي الكبرىٰ (۴/ ۳۲۴)

(آیت زیرِتفسیر)۔ (رواہ ابن مردویہ و ابن جریر و ابن أبي حاتم و الترمذي) امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث غریب ہے، ہم اس کو نہیں پہچانتے، مگر اسی سند سے۔ اس کی اسناد میں کلام ہے۔ ''ہلال'' راوی مجہول ہے اور ''حارث'' حدیث میں ضعیف ہے۔[1] امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا: ہلال منکر الحدیث ہے۔ ابن عدی رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث محفوظ نہیں۔ میں کہتا ہوں: اگرچہ حدیث ضعیف ہے، مگر اس کے معنی صحیح ہیں، کیوں کہ جس طرح نماز اور روزہ فرض ہے، اسی طرح حج بھی فرض ہے، سو جس طرح جان بوجھ کر نماز ترک کرنا کفر ہے، اسی طرح حج کو استطاعت کے باوجود ترک کرنا کفر ہے، جب کفر ہوا تو اس کی موت خود بخود کفار کی طرح ہوگی۔ یہود و نصاریٰ کافر ہیں، حج نہیں کرتے، اس نے بھی حج نہیں کیا، اس لیے یہ ان کے مثل ٹھہرا۔

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے صحیح سند سے مروی ہے کہ جس کے پاس حج کی طاقت ہے، لیکن اس نے حج نہیں کیا، اب اس پر برابر ہے کہ یہودی مرے یا نصرانی۔[2] (رواہ الحافظ أبوبکر الإسماعیلی) سعید بن منصور رحمہ اللہ نے حسن رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں کچھ لوگ شہروں میں بھیجوں، وہ جا کر دیکھیں کہ جس کے پاس مال ہے اور اس نے حج نہیں کیا تو اس پر جزیہ لگائیں، وہ لوگ مسلمان نہیں ہیں۔[3]

فتح البیان میں کہا گیا ہے کہ اس میں ترکِ حج کو کفر کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، وجوب کی تاکید کے لیے تارک پر سخت وعید فرمائی۔ کفر سے یہ مراد ہے کہ حج کو فرض نہیں جانتا یا باوجود قدرت کے ترک کرتا ہے تو وہ کافر ہے۔ بعض نے کہا: وہ شخص مراد ہے، جو اللہ اور یومِ آخر کا منکر ہے، یا ان آیتوں کا، یا وہ شخص جو حج کے ترک کرنے کو گناہ نہیں سمجھتا۔ ''عالمین'' سے مراد انسان، جن اور فرشتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی عبادت سے بے نیاز ہے۔ بہرحال اس آیت میں تارکِ حج پر اس غصے اور رسوا کن انجام کا اظہار کیا گیا ہے، جس کو سن کر دل کانپ اُٹھتا ہے اور جان تھرتھرانے لگتی ہے۔ سیدنا ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ جو شخص مر گیا اور اس نے حجِ اسلام نہ کیا، اس کو کسی بیماری یا ظالم بادشاہ یا ظاہری حاجت نے نہیں روکا تھا تو وہ جس حال پر چاہے مرے، یہودی یا نصرانی۔[4] (رواہ أحمد و أبو یعلیٰ و البیهقي و سعید بن منصور)

امام شوکانی رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی پہلے گزرنے والی حدیث کو موضوعات میں ذکر کر کے کہا ہے کہ امام

---

[1] تفسیر الطبري (٧/ ٤٢) تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٧١٣) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٨١٢) ضعیف الترغیب والترهیب (١/ ١٨٩)

[2] مصنف ابن أبي شیبة (٣/ ٣٠٦) اس کی سند صحیح ہے۔

[3] الدر المنثور (٢/ ٢٧٥) تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٠٣۔ ٥٠٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔

[4] شعب الإیمان (٣/ ٤٣٠) الدر المنثور (٢/ ٢٧٥) اس کی سند میں ''لیث بن ابی سلیم'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعیف الترغیب والترهیب: ١/١٨٩)

ابن جوزی رحمہ اللہ اس کو موضوع بتاتے ہیں۔[1] مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کے موضوع ہونے کے شبہے کو دور کر دیا ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: جو کوئی آسودہ حال ہے اور اس نے حج نہیں کیا، وہ قیامت کے دن آئے گا اور اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان کافر لکھا ہوگا۔[3] ان کی دوسری روایت یہ ہے کہ جس نے ایک سال، دوسرے سال اور تیسرے سال حج کرنے کی راہ پائی، پھر مرگیا اور حج نہ کیا تو اس پر نمازِ جنازہ نہ پڑھی جائے، معلوم نہیں کہ وہ یہودی مرا یا نصرانی۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ لوگ اگر حج کرنا چھوڑ دیں گے تو میں ان سے جنگ کروں گا، جس طرح میں ترکِ نماز پر اُن سے جنگ کرتا ہوں۔[4]

غرض کہ یہ آیت اور ساری احادیث و اقوالِ صحابہ اس بات پر واضح دلیل ہیں کہ تارکِ حج اور تارکِ نماز کا ایک ہی حکم ہے، جس طرح عمداً فرض نماز کو چھوڑنے سے کافر ہو جاتا ہے، اسی طرح عمداً حج نہ کرنے سے کافر بن جاتا ہے، کیوں کہ اسلام کی پانچ بنیادیں ہیں، ان پانچوں کا حکم وجوب اور فرضیت میں برابر ہے۔ یہ بات غلط مشہور ہے کہ روزہ و حج و زکات کو چھوڑنے والا فاسق ہو جاتا ہے نہ کہ کافر، بلکہ حنفیہ تو تارکِ نماز کو بھی کافر نہیں کہتے۔ مگر امام احمد و شافعی اور تمام محدثین رحمہم اللہ کے نزدیک ایک نماز کو دیدہ دانستہ ترک کرنے سے، جبکہ کوئی شرعی عذر نہ ہو، جیسے: سو گیا ہو، یا بھول گیا ہو، یا بیماری میں بے ہوش رہا، بلاشک وشبہہ کافر ہو جاتا ہے، اس کو توبہ کرنے کے لیے کہنا چاہیے، اگر نہ مانے تو فی الفور قتل کریں، نمازِ جنازہ نہ پڑھیں، مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کریں، بیٹا اگر مسلمان ہے تو اس کا وارث نہ ہوگا۔ اسلام کی ہر بنیاد کا یہی حکم ہے، جو حدیث «بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ»[5] ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔'' میں مذکور ہے۔ واللہ أعلم بالصواب.

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿98﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿99﴾

(اے نبی!) کہہ دیجیے: اے اہلِ کتاب! تم اللہ کی آیتوں کا انکار کیوں کرتے ہو؟ اللہ اس پر

---

[1] الموضوعات لابن الجوزي (٢/ ٢٠٩۔ ٢١٠)
[2] تلخيص الحبير (٢/ ٢٢٢۔ ٢٢٣)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٧١٥)
[4] الدر المنثور (٢/ ٢٧٥۔ ٢٧٦) فتح البيان (٢/ ٢٩٥۔ ٢٩٦)
[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦)

گواہ ہے جو کچھ تم کرتے ہو ﴿98﴾ کہہ دیجیے: اے اہلِ کتاب! تم اس شخص کو اللہ کے راستے سے کیوں روکتے ہو جو ایمان لے آیا؟ تم چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھے راستے پر چلے، حالاں کہ تم خود اس (کے سیدھی راہ پر ہونے) کے گواہ ہو، اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے ﴿99﴾

اہلِ کتاب کو کفر اختیار کرنے اور حق سے روکنے پر سرزنش:

اس آیتِ پاک میں اہلِ کتاب کافروں پر ملامت ہے کہ وہ حق کے دشمن اور اللہ تعالیٰ کی آیات کے منکر ہیں۔ جہاں تک ان سے بنتا ہے، اہلِ ایمان کو اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکتے ہیں اور باز رکھتے ہیں، حالاں کہ خوب جانتے ہیں کہ جو بات رسول اللہ ﷺ لائے ہیں، وہ حق ہے، خود ان کے پاس پہلے انبیا و مرسلین سے اس کا حق ہونا ثابت ہو چکا ہے، کیوں کہ نبیِ کریم ﷺ کے وجود اور بعثت کی بشارت پہلے ہی سے دے رکھی ہے کہ ایک نبی اُمی، ہاشمی، عربی، مکی بنی آدم کے سردار، خاتم الانبیاء رسول رب العالمین آنے والا ہے، اس لیے اللہ پاک نے ان کو وعید سنا دی کہ ہم تمھاری ان ریشہ دوانیوں کے گواہ ہیں، تمھاری تکذیب، انکار اور دشمنی کو خوب جان چکے ہیں، تم ہم کو غافل نہ سمجھو، جس دن مال و اولاد کچھ کام نہیں آئے گا، اس دن ہم تمھیں اس عمل کی جزا دیں گے۔

اہلِ کتاب کے کفر کی دلیل:

فتح البیان میں ہے کہ یہ خطاب یہود و نصاریٰ یا ان کے علما کو ہے، کیوں کہ وہ نبیِ کریم ﷺ کی نبوت کی صداقت کو جانتے تھے۔ اس خطاب کو صرف اہلِ کتاب کے لیے خاص کرنا، ان کے صریح کفر پر روشن دلیل ہے، گو وہ اپنے آپ کو تورات اور انجیل پر ایمان لانے والا خیال کریں، مگر حقیقت میں وہ خود ان دونوں کتابوں کے منکر ہیں۔ اس آیت میں ''آیات اللہ'' سے نبیِ اکرم ﷺ کی نبوت، یا قرآن، یا آپ ﷺ کی ذات کی سچائی مراد ہے۔ آیت میں جو سوالیہ انداز اختیار کیا گیا ہے، وہ ان کے انکار اور ملامت کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنا یہ تھا کہ کہتے تھے، ہماری کتاب میں محمد ﷺ کی کوئی صفت بیان نہیں ہوئی، نہ ان کے بارے میں کوئی بشارت آئی ہے۔ سبیل اللہ سے مراد دینِ اسلام ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے سارے بندوں کے لیے پسند فرمایا ہے، اس کہنے میں کہ اللہ تمھارے عمل سے غافل نہیں ہے، بڑی وعید اور ڈراوا ہے، کیوں کہ احاطۂ علم ثابت فرما کر اُن کے حیلے حوالوں کا قلع قمع کر دیا ہے۔[1]

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تُطِيعُوا فَرِيقًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ ﴿100﴾ وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ

---

(1) فتح البیان (۲/ ۲۹۷۔ ۲۹۸)

وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَ مَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اہلِ کتاب کے ایک فریق کی بات مانو گے تو وہ تمھارے ایمان لانے کے بعد تمھیں کافر بنا کر چھوڑیں گے ﴿۱۰۰﴾ اور تم کیسے کفر کر سکتے ہو جب کہ تمھیں اللہ کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اور تمھارے اندر اس کا رسول (موجود) ہے؟ اور جو شخص اللہ کے دین کو مضبوطی سے پکڑ لے تو اسے سیدھے راستے کی طرف ہدایت مل جاتی ہے ﴿۱۰۱﴾

اہلِ کتاب کی فرمانبرداری سے ممانعت:

اللہ نے اہلِ کتاب کے شبہوں کا جواب دے کر مسلمانوں کو فرمایا کہ تم ان کی بات مت سنو، یہی علاج ہے، نہیں تو ان کے شبہے سنتے سنتے تم اپنی راہ سے نکل جاؤ گے۔ اب بھی ہر مسلمان کو چاہیے کہ شبہے والوں کی بات نہ سنے، اس میں دین کی سلامتی ہے، جھگڑنے سے شبہے پڑتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے مومن بندوں کو اس بات سے ڈرایا ہے کہ وہ اہلِ کتاب کے کسی گروہ کی اطاعت نہ کریں، کیوں کہ ان کو ایمان والوں پر اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان میں رسول آیا، حسد ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۖۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَ اصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [البقرة: ۱۰۹] ''اہلِ کتاب میں سے بہت سے یہ چاہتے ہیں کاش کہ وہ تمھارے ایمان لانے کے بعد تمھیں پھیر کر کافر بنا دیں، اپنے دِلوں میں حسد کرتے ہوئے، اس کے بعد کہ ان کے سامنے حق واضح ہو چکا، پس معاف کر دو اور جانے دو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے، بے شک اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔''

اسی طرح اس جگہ فرمایا کہ تم ان کی اطاعت سے پھر کافر ہو جاؤ گے، تمھارا کافر ہونا نہایت بعید ہے، اللہ نہ کرے کہ تم ایمان لا کر پھر جاؤ، تم پر تو رات دن اللہ تعالیٰ کی آیتیں اترتی ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ہے: ﴿ وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ [الحديد: ۸] ''اور تمھیں کیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے؟ حالاں کہ رسول تمھیں بلاتا ہے کہ تم اپنے رب پر ایمان لاؤ اور یقیناً وہ تم سے پختہ وعدہ لے چکا ہے اگر تم مومن ہو۔'' حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک دن صحابہ کرام سے فرمایا: بھلا بتاؤ تم کو کون سے مومن بہت انوکھے (ایمان میں قابلِ تعجب) معلوم ہوتے ہیں؟ کہا: فرشتے۔ فرمایا: وہ کیوں ایمان نہ لائیں گے، وحی تو انھی پر اترتی ہے۔ کہا: ہم لوگ، کہا: تم کیوں ایمان نہ لاؤ گے، میں

تمھارے درمیان موجود ہوں؟ کہا: پھر کون لوگ ایمان میں قابلِ تعجب ہیں؟ فرمایا: ایک قوم تمھارے بعد آئے گی، کچھ صحیفے پائے گی، جو کچھ ان میں ہوگا، اس پر ایمان لائے گی۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اس حدیث کی سند مع کلام کے شرح بخاری کے شروع میں نقل کی ہے، اس حدیث میں صحف سے مراد صحفِ کتاب وسنت ہیں۔[2]

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿١٠٢﴾ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٠٣﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ سے اس طرح ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمھیں موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو (102) اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا جدا نہ ہو، اور تم اپنے آپ پر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کے احسان سے بھائی (بھائی) بن گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، پھر اس نے تمھیں اس میں گرنے سے بچا لیا، اللہ تعالیٰ اسی طرح تمھارے لیے اپنی آیتیں بیان کرتا ہے، شاید کہ تم ہدایت پاؤ (103)

اللہ سے ڈرنے کا حق کیا ہے؟

ایک مجلس میں مسلمان اور یہودی تھے، یہودیوں نے مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیا اور قریب تھا کہ تلوار چل جائے، نبی کریم ﷺ وہاں پہنچے اور صلح کرا دی۔ انھوں نے اس طرح لڑایا تھا کہ اسلام سے پہلے مدینہ کے لوگ دو فرقے تھے اور آپس میں لڑ چکے تھے، دونوں طرف کے بہت لوگ مرے تھے۔ اس وقت یہودیوں نے دونوں کو وہی لڑائی یاد دلا کر غصہ دلا دیا اور لڑا دیا۔ حق تعالیٰ مسلمانوں کو خبردار کرتا ہے کہ تم بہکاوے میں نہ آؤ اور آپس کا اتفاق نعمت سمجھو، یہودیوں کی طرح پھوٹ کر خراب نہ ہو۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے جیسے ڈرنا چاہیے، ویسے ڈرنا

[1] دلائل النبوة للبيهقي (٦/ ٥٣٨) اس کی سند میں ''مغیرہ بن قیس'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم: ٦٤٧)

[2] تفسير ابن كثير (١/ ٥٠٤، ٥٠٥)

یہ ہے کہ اس کی اطاعت کریں، نافرمانی نہ کریں، اس کو یاد رکھیں، بھولیں نہیں، اس کا شکر ادا کریں، ناشکری نہ کریں۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم) اس اسناد کو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔ یہ مضمون سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً بھی مروی ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے اس کو شرطِ شیخین پر صحیح بتایا ہے،[2] مگر ظاہر تر یہ ہے کہ یہ موقوف ہے۔ یہی قول مرہ ہمدانی، ربیع بن خثیم، عمرو بن میمون، ابراہیم نخعی، طاؤس، حسن، قتادہ، ابو سنان اور سدی رحمہم اللہ سے بھی مروی ہے۔[3] سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا: بندہ اللہ تعالیٰ سے جیسا چاہیے ویسا نہیں ڈرتا، جب تک کہ اپنی زبان کو بند نہ رکھے۔

سعید بن جبیر، ابو العالیہ، ربیع بن انس، قتادہ، مقاتل بن حیان، زید بن اسلم اور سدی رحمہم اللہ وغیرہم کا مذہب یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور اس کی ناسخ یہ آیت ہے: ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن: ١٦] ''چناں چہ جہاں تک تمھاری استطاعت ہو تم اللہ سے ڈرو۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یہ آیت منسوخ نہیں ہے، لیکن حقِ تقویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جیسا چاہیے، ویسا جہاد کرے، کسی کی ملامت سے نہ ڈرے، انصاف پر قائم رہے، گو اپنی ہی جان پر کیوں نہ ہو یا اپنے آبا و ابنا پر۔[4] امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: جب یہ آیت اتری تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر شاق گزری، اس پر مذکورہ آیتِ ناسخ آئی۔ مقاتل رحمہ اللہ نے کہا کہ آلِ عمران میں فقط ایک یہی آیت منسوخ ہے۔[5] بعض نے کہا: منسوخ نہیں ہے، بلکہ مبین ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جہاں تک تم سے بن سکے، وہاں تک تم اللہ تعالیٰ سے جیسا چاہیے ویسا ڈرو، یہی زیادہ صحیح ہے، کیوں کہ نسخ وہاں ہوتا ہے، جہاں جمع نہ ہو سکے اور یہاں جمع (تطبیق) ممکن ہے۔

موت تک اسلام کی حفاظت کرو:

یہ جو فرمایا کہ ''نہ مرو تم مگر مسلمان'' اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی صحت اور سلامتی کی حالت میں اپنے اسلام کی حفاظت رکھو، تا کہ اسلام ہی پر موت آئے، کیوں کہ اللہ کریم کی عادت یوں ہی جاری ہے کہ جو کوئی جس حالت پر زندہ رہتا ہے، اسی پر مرتا ہے، یہ اس کا فضل و کرم ہے، پھر جس حالت پر مرتا ہے، اسی پر اُٹھے گا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: ''فعياذاً باللّٰهِ مِنْ خِلَافِ ذٰلِك''[6] ''اللہ تعالیٰ اسلام کے خلاف مرنے سے پناہ دے۔'' سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو پڑھ کر فرمایا کہ اگر زقوم (تھوہر) کا ایک قطرہ دنیا پر ٹپکے تو ساری دنیا اہلِ دنیا پر ان کے عیش کو بگاڑ دے، پھر اس کا کیا حال ہوگا، جس کا کھانا ہی زقوم ہوگا۔ (رواہ أحمد و الترمذي و النسائي و ابن ماجه و ابن حبان و الحاکم) امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث ''حسن صحیح'' ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٧٢٢) اس کی سند صحیح ہے۔
[2] مستدرك الحاکم (٢/ ٣٢٣) امام حاکم رحمہ اللہ نے اس کو مرفوعاً کے بجائے موقوفاً ہی بیان کیا ہے اور صحیح کہا ہے۔
[3] تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٠٥)
[4] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٧٢٢)
[5] تفسیر القرطبي (٤/ ١٥٧)
[6] تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٠٥)

کہا: شرطِ شیخین پر ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں: جس کو یہ بات پسند ہو کہ وہ دوزخ کی آگ سے سرکا (دور کر) دیا جائے اور جنت میں داخل ہو تو جب اس کو موت آئے تو چاہیے کہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اور لوگوں سے ایسا برتاؤ کرے، جیسا اپنے ساتھ لوگوں کا برتاؤ چاہتا ہو۔[2] (رواہ أحمد) سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے تین دن پہلے فرمایا کہ تم میں سے کوئی نہ مرے، مگر وہ اللہ کے ساتھ نیک گمان رکھتا ہو۔[3] (رواہ أحمد و مسلم) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: «أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ فَإِنْ ظَنَّ خَيْراً فَلَهُ وَإِنْ ظَنَّ بِيْ شَرًّا فَلَهُ»[4] (رواہ أحمد) ''میں اپنے بندے کے گمان کے پاس ہوں، اگر اس کا گمان مجھ سے اچھا ہے تو ویسا ہی ہوگا اور اگر مجھ سے بدگمان ہے تو ویسا ہی ہوگا۔''

اس حدیث کی اصل صحیحین میں ثابت ہے۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں: «يَقُوْلُ اللّٰهُ: أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ»[5] ''میں اس طرح کرتا ہوں، جس طرح میرا بندہ میرے بارے میں گمان رکھے۔'' سیدنا انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک انصاری بیمار تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کے لیے آئے، دیکھا کہ مر رہا تھا، سلام کیا، پھر فرمایا: تو کیسا ہے؟ کہا: اچھا ہوں، اللہ سے اُمید رکھتا ہوں اور اپنے گناہوں سے ڈرتا ہوں۔ فرمایا: ایسے وقت میں اگر کسی بندے کے دل میں یہ دونوں باتیں جمع ہو جائیں تو اللہ اس کو اس کی اُمید دیتا ہے اور اس کو خوف سے امن میں رکھتا ہے۔ (رواہ البزار والترمذي والنسائي وابن ماجه) امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث غریب ہے۔[6] حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر بیعت کی کہ میں نہ گروں سجدے میں مگر کھڑے ہو کر۔[7] (رواہ أحمد) اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ مروں مگر مسلمان، یا نہ مارا جاؤں مگر دشمن کی طرف منہ کر کے لڑتے ہوئے، پیٹھ پھیر کر بھاگتے ہوئے نہیں۔

فتح البیان میں کہا ہے کہ ﴿ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴾ عام احوال سے استثنائے مفرغ ہے، یعنی نہ ہو تم کسی حال

---

[1] مسند أحمد (١/ ٣٠٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٨٥) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣١٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٢٥) صحيح ابن حبان (١٦/ ٥١١) مستدرك الحاكم (٢/ ٤٩٠) اس کی سند میں ''اعمش'' مدلس راوی ہے اور عنعنہ کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم: ٦٧٨٢)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٤٤) مسند أحمد (٢/ ١٩١)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٧٧) مسند أحمد (٣/ ٣٢٥)

[4] مسند أحمد (٢/ ٣٩١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٣١٥)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٩٧٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٧٥)

[6] مسند البزار (١٣/ ٢٩٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٨٣) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٢٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٦١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٥١)

[7] سنن النسائي، رقم الحديث (١٠٨٤) مسند أحمد (٣/ ٤٠٢) اس کی سند صحیح ہے۔

پر سوائے حالِ اسلام کے۔ جملہ اسمیہ نے اس کی اور بھی تاکید فرمائی ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے تحبیر میں کہا ہے: عوام کہتے ہیں کہ اس جگہ ﴿ مُسْلِمُوْنَ ﴾ سے مراد "مُتَزَوِّجُوْنَ" ہے، یعنی غیر شادی شدہ مت مرو۔ یہ تفسیر ہرگز درست نہیں ہے۔ اس طرح کی ایک آیت سورت بقرہ میں بھی گزر چکی ہے۔ ظاہر میں تو اس بات سے نہی ہے کہ موت جب آئے اس وقت اسلام کے علاوہ کوئی اور حالت نہیں ہونی چاہیے۔ مگر مراد یہ ہے کہ ہمیشہ اسلام پر قائم و دائم رہو، کیوں کہ موت ایک ضروری چیز ہے جو آئے گی، سو تم مرتے دم تک اسلام پر مداومت رکھو۔[1]

اللہ کی رسی سے مراد اور اس کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم:

اللہ کی رسی سے مراد اللہ کا عہد ہے، جس طرح اس کے بعد دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ ﴾ [آل عمران: ۱۱۲] "یہ جہاں نظر آئیں گے، ذلت (کو دیکھو گے کہ) ان سے چمٹ رہی ہے، بجز اس کے کہ یہ اللہ اور مسلمان لوگوں کی پناہ میں آ جائیں۔" حبل (رسی) مذکور سے مراد عہد و ذمہ ہے۔ کسی نے کہا: مراد قرآن ہے، جس طرح حارث اعور رحمہ اللہ کی روایت میں سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ قرآن اللہ کی مضبوط رسی ہے اور صراطِ مستقیم ہے۔[2] بلکہ اس باب میں ایک حدیث خاص بھی آئی ہے، سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « كِتَابُ اللّٰهِ هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَآءِ إِلَى الْأَرْضِ »[3] "اللہ کی کتاب اللہ کی وہ رسی ہے، جو زمین اور آسمان کے درمیان لٹکی ہوئی ہے۔" (رواه أبو جعفر الطبري) سیدنا عبداللہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: یہ قرآن اللہ کی مضبوط رسی ہے، ایک چمکتا ہوا نور ہے۔ شفائے نافع ہے، اس کے لیے پناہ ہے، جس نے اس کو پکڑا اور اس کے لیے نجات ہے، جس نے اس کی پیروی کی۔[4] (رواه ابن مردويه) اسی کے قریب قریب سیدنا حذیفہ اور زید بن ارقم رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مروی ہے۔[5]

فتح البیان کے الفاظ یہ ہیں کہ حبل سے مراد اسلام ہے، یا قرآن، یا اخلاصِ توحید، یا عہد و امر۔

پھر تفرق (فرقہ بندی) سے منع کیا، جس طرح یہود و نصاریٰ متفرق ہوگئے ہیں، اسی طرح تم اسلام میں جدا جدا نہ ہو جانا۔ یا جس طرح اہلِ جاہلیت ایک دوسرے سے الگ الگ تھے۔ یا ایسی بات نہ نکالو، جس سے آپس میں تفرقہ پڑے اور اجتماعیت جاتی رہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو تفرقہ اختلاف فی الدین میں اُٹھتا ہے، اس سے منع کیا،

---

① فتح البيان (۲/ ۳۰۱)

② سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۹۰۶) اس کی سند میں "حارث اعور" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ۲۰۸۱)

③ تفسير الطبري (۷/ ۷۲) اس کی سند میں "عطیہ عوفی" ضعیف راوی ہے۔

④ مستدرك الحاكم (۱/ ۷٤۱) اس کی سند میں "ابراہیم ہجری" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ۱/ ۲۱٦)

⑤ سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت نہیں ملی۔ البتہ سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی روایت "صحیح مسلم" (رقم الحديث: ۲٤۰۸) میں مذکور ہے۔

کیوں کہ فرقہ فرقہ بن کر رہنا جاہلیت کی عادت ہے۔[1] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ جماعت کا حکم دیا ہے اور تفرقے سے منع کیا ہے۔ اس بارے میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے تین کام پسند کرتا ہے اور تین کاموں پر ناراض ہوتا ہے: اس بات کو پسند کرتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور تم سب اللہ کی رسی کو پکڑو اور جدا نہ ہو اور اس کی خیر خواہی کرو، جس کو اللہ نے تمھارا والی کیا ہے۔ اللہ ناخوش ہوتا ہے ''قیل و قال'' (فضول بحث، لڑائی جھگڑا) اور کثرتِ سوال اور مال کو ضائع کرنے سے۔[2] میں بے شک ان کے لیے خطا سے بچنے کی ضمانت دیتا ہوں، جبکہ وہ متفق رہیں۔

اس بارے میں اور بھی کئی حدیثیں آئی ہیں، جن میں فرقہ بندی سے منع فرمایا ہے اور اجتماع اور آپس میں اُلفت رکھنے کا حکم فرمایا ہے۔ جس بات کا ڈر تھا، اب وہی بات ہوئی کہ اس اُمت میں تہتر فرقے ہوگئے، ان میں سے ایک فرقہ ناجی (نجات پانے والا) ہے، جو جنت میں جائے گا، عذابِ نار سے سلامت رہے گا۔ یہ وہ فرقہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے اور طریقۂ اصحاب پر ہے، باقی سب ناری ہیں۔ یہ آیت کہ پہلے تم اعداء (دشمن) تھے، پھر تمھارے درمیان الفت ڈال دی گئی، اوس اور خزرج کی شان میں اُتری ہے۔ عہدِ جاہلیت میں ان کی آپس میں لڑائی رہتی تھی، سخت عداوت اور دشمنی تھی۔ جب اسلام آیا اور ہر کوئی اس میں داخل ہوا، سب ایک دوسرے کے بھائی ہوگئے۔ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار بن گئے، اللہ کی خاطر آپس میں مل جل گئے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ [الأنفال: ٦٢۔ ٦٣] ''وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں سے آپ کی تائید کی۔ اور اس نے ان (مومنوں) کے دلوں میں الفت ڈال دی، اگر آپ دنیا بھر کے سب خزانے خرچ کر دیتے تو بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کر سکتے، لیکن اللہ ہی نے ان میں اُلفت ڈالی۔ بے شک وہ زبردست (اور) خوب حکمت والا ہے۔''

کفر کے سبب وہ آگ کے گڑھے کے کنارے لگ گئے تھے، اللہ تعالیٰ نے ایمان کی ہدایت دے کر ان کو اس آگ سے بچا لیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دن غنیمتِ حنین کو بانٹا اور بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ فلاں کو ہم سے زیادہ حصہ ملا تو آپ نے ان پر اس بات کا احسان رکھا اور آپ نے خطبہ پڑھا، اس میں فرمایا: اے انصار کے گروہ! کیا میں نے تم کو گمراہ نہیں پایا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے میرے سبب سے تم کو ہدایت کی، تم فرقوں میں بٹ چکے تھے، میرے سبب سے تم کو باہم اُلفت بخشی۔ محتاج تھے، اللہ نے میرے سبب سے تم کو غنی کر دیا۔ غرض جو بات آپ فرماتے تھے، سب لوگ یہی کہتے تھے کہ اللہ اور رسول زیادہ احسان والے ہیں۔[3]

---

[1] فتح البيان (٢/ ٣٠٢)
[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٥) مسند أحمد (٢/ ٣٦٧)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٦١)

امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ وغیرہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک یہودی کا اوس وخزرج کی جماعت پر گزر ہوا تو اس کو ان کا اتفاق اور آپس کی اُلفت بری لگی، اس نے ایک آدمی بھیجا کہ ان کے پاس بیٹھ کر پہلی لڑائیوں کا چرچا کرے کہ بعاث کے دن کیسی لڑائی ہوئی تھی۔ وہ شخص یہی کیا کرتا تھا، یہاں تک کہ قوم کے لوگوں کو حمیت آئی، بعض بعض پر بھڑک اُٹھے اور اپنے لوگوں کو بلایا، ہتھیار طلب کیے اور وعدہ کیا کہ حرہ پر جا کر چڑھائی کریں گے۔ نبی اکرم ﷺ کو یہ خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے تشریف لا کر ان کو ٹھنڈا کیا اور فرمایا: کیا تم جاہلیت کی پکار کرتے ہو اور میں تم میں موجود ہوں؟ پھر ان پر آیت زیرِ تفسیر پڑھی۔ وہ اپنے ارادے پر نادم ہوئے اور باہم صلح کر لی، پھر ایک دوسرے کے گلے سے ملے اور ہتھیار ڈال دیے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیت انہی کے حق میں اتری ہے، جبکہ قضیۂ افک پر وہ بگڑ کر بیٹھے تھے۔ واللہ أعلم۔[1]

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٠٤﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٠٥﴾ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْھُھُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿١٠٦﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْھُھُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿١٠٧﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْھَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٨﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿١٠٩﴾

اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے، جو خیر کی طرف بلائے اور نیک کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے۔ اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں (104) اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو فرقوں میں بٹ گئے اور ان کے پاس واضح دلیلیں آ جانے کے بعد انھوں نے ایک دوسرے سے اختلاف کیا اور ان لوگوں کے لیے بہت بڑا عذاب ہے (105) جس دن کئی چہرے

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۵۰۷)

سفید ہوں گے اور کئی چہرے سیاہ ہوں گے، پھر جن لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے (ان سے کہا جائے گا:) کیا تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا؟ پس اب عذاب چکھو اس کفر کے بدلے جو تم کرتے رہے ہو (106) اور جن لوگوں کے چہرے سفید ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے (107) (اے نبی!) یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم آپ کو حق کے ساتھ سناتے ہیں اور اللہ جہان والوں پر ظلم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا (108) اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، اور سب معاملے اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں (109)

دعوتِ دین کا فریضہ:

معلوم ہوا کہ مسلمانوں پر جہاد کرنے کے لیے اور دین کی پیروی برقرار رکھنے کے لیے ایک جماعت کا قیام فرض ہے، تا کہ دین کے خلاف کوئی بات نہ کرے اور جو اس بات پر قائم رہیں گے، وہی کامیاب ہیں اور یہ کہ کوئی کسی سے تعرض نہ کرے۔ کوئی ادھر کوئی ادھر یہ مسلمانی کا راستہ نہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے چہرے سیاہ ہیں، جو مسلمانی میں کفر کرتے ہیں، یعنی منہ سے کلمۂ اسلام کہتے ہیں، لیکن عقیدہ اسلام کے خلاف رکھتے ہیں۔ سب گمراہ فرقوں کا یہی حکم ہے۔ جہاد اور امر بالمعروف کا جو حکم دیا، یہ خلق پر ظلم نہیں، بلکہ ان کی تربیت ہے۔ جہاد میں خلق کی جان و مال ضائع ہو تو مالک کے حکم سے ہے، سب چیز اللہ کا مال ہے۔ یہ فائدہ موضح قرآن سے لکھا گیا ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ پاک فرماتا ہے کہ تم میں ایک گروہ اسی بات پر قائم ہو کہ وہ سب لوگوں کو خیر کی طرف بلائے، معروف کا حکم کرے، منکر سے روکے، یہی گروہ کامیابی پانے والا ہے۔ امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا: اس گروہ سے مراد خاص صحابہ اور خاص راوی ہیں،[1] یعنی مجاہدین وعلمائے حدیث۔ مگر اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کیوں کہ آیت میں ویسا ہی خطاب ہے، جیسا تمام شرعی امور کے بارے میں تمام بندوں کو خطاب ہے، وہ اس کے ساتھ مکلّف ہیں، ہاں ابوجعفر باقر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے یہ آیت پڑھ کر فرمایا: «اَلْخَیْرُ اِتِّبَاعُ الْقُرْآنِ وَسُنَّتِيْ» (رواہ ابن مردویہ) یعنی دعوت الی الخیر سے مراد اتباع کتاب وسنت کی دعوت ہے۔[2] یہ مرفوع تفسیر تمام تفاسیر پر مقدم ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم:

آیت کا مقصد یہ ٹھہرا کہ اس اُمت کا ایک فرقہ اسی کام کے لیے رہے، اگرچہ یہ کام اُمت کے ہر فرد پر اس کے حال کے مطابق واجب ہے۔ جس طرح صحیح مسلم میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے: ''جو کوئی تم میں سے

[1] تفسیر الطبري (۷/ ۹۲) [2] الدر المنثور (۲/ ۲۸۹) یہ روایت معضل ہے۔

کسی منکر کو دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے مٹا دے، اگر ہاتھ سے نہ مٹا سکے تو زبان سے اور اگر زبان سے بھی مٹا نہ سکے تو دل سے برا جانے، یہ ایمان بہت ضعیف ہے۔"[1] دوسری روایت میں اس طرح ہے: "اس کے بعد ایمان ایک رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں رہتا۔"[2]

سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم ضرور نیکی کا حکم کرو گے اور برائی سے منع کرو گے، ورنہ نزدیک ہے کہ اللہ اپنے پاس سے تم پر عذاب بھیج دے، پھر تم اللہ سے دعا کرو گے، وہ اس کو قبول نہیں کرے گا۔ (رواه أحمد والترمذي وابن ماجه) امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث حسن ہے۔[3] اس بارے میں اور بہت سی حدیثیں آئی ہیں، جس طرح بہت سی آیات بھی آئی ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرضِ کفایہ ہے، یہ اہلِ علم کا کام ہے، جو معروف اور منکر کو پہچانتے ہیں، اللہ نے ان کو اس آیت میں بتا دیا ہے: ﴿ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾ [الحج: ٤١] "(یہ) وہ لوگ (ہیں) کہ جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں (تو) وہ نماز قائم کریں اور زکات دیں، اور نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں اور تمام امور کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔"[4]

امام ابو العالیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ قرآن کے اندر جس آیت میں اللہ پاک نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ذکر کیا ہے، اس سے مراد اسلام اور بتوں کی پرستش ہے،[5] مگر یہ تخصیص مخصص کے بغیر ہے۔ عربی لغت اور شرعی احکام میں اس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ آیت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دلیل ہے۔ یہ وجوب کتاب و سنت دونوں سے ثابت ہے، بلکہ یہ کام شریعتِ مطہرہ کے بڑے واجبات سے ہے۔ شریعت کے اصولوں کے اصلِ عظیم اور ارکانِ اسلام میں سے ایک واضح رکن ہے۔ دین کو سر بلند کرنے کا نظام بھی اسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر موقوف ہے۔ جو لوگ یہ کام کرتے ہیں، وہ دین و دنیا کی کامیابی و کامرانی کے ساتھ مختص ہیں۔

فرقہ بندی سے ممانعت:

پھر اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو اس بات سے منع کیا ہے کہ پہلی اُمتوں کی طرح افتراق اور اختلاف کر کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دیں، حالاں کہ ان پر حجت قائم ہو چکی ہے۔ عبداللہ بن لحیی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہم نے معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کے ساتھ حج کیا۔ جب ہم مکہ پہنچے، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ نے نمازِ ظہر کے بعد کھڑے ہو کر کہا کہ

---

[1] صحیح مسلم میں ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، دیکھیں: صحیح مسلم، رقم الحديث (٤٩)

[2] صحیح مسلم، رقم الحديث (٥٠)

[3] مسند أحمد (٥/ ٣٨٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٦٩) تفسير ابن كثير (١/ ٥٠٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٠٧٠)

[4] تفسير القرطبي (٤/ ١٦٥) [5] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٧٢٧)

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے: ''بے شک اہلِ کتابَین (تورات اور انجیل کے ماننے والے) اپنے دین میں فرقے فرقے ہوکر بہتر (۷۲) ملتیں ہوگئے، یہ امت تہتر (۷۳) فرقے ہو جائے گی، سب نار میں ہیں، مگر ایک فرقہ جو جماعت ہے۔ میری اُمت میں قومیں ہوں گی کہ ان میں بدعتیں اس طرح گھس جائیں گی، جیسے پاگل کتے کا کاٹنا اثر کرتا ہے کہ کوئی ایسی رگ اور جوڑ نہیں بچتا، جس میں اس کا اثر داخل نہ ہو۔ اللہ کی قسم! اے عرب کے لوگو! اگر تم اس چیز پر قائم نہ رہو گے، جو تمھارے نبی سب لوگوں کے لیے لائے ہیں تو پھر وہ تمھارے ساتھ بھی نہ رہے گی۔''[1] (رواه أحمد و أبو داود)

یہ حدیث کئی طرق سے مروی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا: ''بنی اسرائیل بہتّر (۷۲) ملتوں میں بٹ گئے، یہ اُمت تہتّر (۷۳) ملتوں میں تقسیم ہو جائے گی، سب کے سب آگ میں ہوں گے، مگر ایک ملت۔ کہا: وہ کون سی ملت ہے؟ فرمایا: جس پر میں ہوں اور میرے اصحاب (یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) ہیں۔''[2] (رواه الترمذي)

فتح البیان میں ہے کہ اس آیت میں جمہور مفسرین کے نزدیک اہلِ افتراق و اختلاف سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں، کیوں کہ ان میں ہر ملت والا کئی ایک فرقے ہوگیا ہے، ہر ایک نے ٹیڑھی تاویلات نکالیں۔ آیاتِ نافعہ کو چھپا ڈالا۔ دنیا کے معمولی سے فائدے کی خاطر آیات کو بدل دیا۔ بعض نے کہا: اُمتِ اسلام کے بدعتی لوگ مراد ہیں۔ بعض نے کہا: خارجی مراد ہیں۔ ظاہر پہلا قول ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ اصل مسائل میں افتراق اور اختلاف کی ممانعت ہے۔ رہے فروعی مسائل، جن میں اجتہاد کیا جاسکتا ہے تو ان میں اختلاف جائز ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ ہمیشہ ایسے پیش آنے والے معاملات میں احکام میں مختلف تھے۔ مگر اس قول میں نظر ہے، کیوں کہ ان کے اختلاف کے منکرین بھی موجود تھے۔ بعض مسائل کو اختلاف کے ساتھ خاص کر لینا اور کچھ کو نہ کرنا، کوئی ٹھیک بات نہیں ہے۔ سارے شرعی مسائل شریعت کی طرف نسبت کرنے کے لحاظ سے برابر ہیں۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہود کے اکہتر (۷۱)، نصاریٰ کے بہتر (۷۲) اور میری اُمت کے تہتر (۷۳) فرقے ہوں گے۔[3] (أخرجه أبو داود والترمذي و ابن ماجه) ان میں یہ فرقہ بندی واضح حجتیں آنے کے بعد ہوئی۔ انھوں نے جان بوجھ کر اختلاف کیا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان مختلف فرقوں کے لیے عذابِ الیم ہے، یعنی آخرت میں۔ اس آیت میں مومنوں کو فرقہ بندی اور اختلاف کرنے سے سختی سے ڈرایا دھمکایا گیا

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١٠٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٩٧) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ١٢)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٣٤٣)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٩٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٩١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٠٣)

ہے۔سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ جس نے جماعت کو ایک بالشت بھر چھوڑا، اس نے اسلام کی رسی اپنے گلے سے نکال ڈالی۔[1] (أخرجه أبو داود) سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ جس کسی کو یہ بات اچھی لگے کہ وہ جنت کے وسط میں ہو، اس کو چاہیے کہ وہ جماعت کو پکڑے رہے، کیوں کہ شیطان اکیلے آدمی کے ساتھ ہوتا ہے اور دو آدمیوں سے دور تر رہتا ہے۔[2] (رواه البغوي بسنده) سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ شیطان انسان کا بھیڑیا ہے، جیسے بکری کا بھیڑیا ہوتا ہے، اکیلی بکری کو اٹھالے جاتا ہے، جو اِدھر اُدھر کسی کنارے پر تنہا چر رہی ہوتی ہے، سو تم شعاب سے بچتے رہو، یعنی پگڈنڈی راہوں سے، تم جماعت اور عام لوگوں کو پکڑو۔[3] (رواه أحمد) ان حدیثوں میں جماعت سے مراد جماعتِ صحابہ و تابعین و تبع تابعین ہے۔ امام مالک بن انس رحمہ اللہ سے حدیث میں مرسلاً مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں، تم گمراہ نہ ہوگے، جب تک کہ ان کو پکڑے رہو گے، اللہ کی کتاب اور رسول اللہ (ﷺ) کی سنت۔[4] (رواه في الموطأ)

قیامت کے دن اُلفت اور فرقت کے ثمرات:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ منہ کی سفیدی اور سیاہی قیامت کے دن ہوگی۔ اہلِ سنت و جماعت کے منہ سفید ہوں گے، اہلِ بدعت و فرقت کے منہ سیاہ ہوں گے۔سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی قول ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: وہ لوگ جو ایمان لانے کے بعد کافر ہوگئے، وہ اس دن روسیاہ ہوں گے، وہ منافقین ہیں۔[5] ان سے کہا جائے گا: اب چکھو اپنے کفر کا مزا، یہ وصف ہر کافر کو شامل ہے۔سفید منہ والے اللہ کی رحمت سے ہمیشہ جنت میں رہیں گے، یعنی وہاں سے جگہ بدلنا نہیں چاہیں گے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں ابو غالب رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ ابو امامہ رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے کچھ سر مسجدِ دمشق کے زینوں پر لٹکے ہوئے دیکھے، کہا: یہ آگ کے کتے آسمان کے نیچے برے مقتول ہیں۔ وہ بہترین قاتل ہیں، جنھوں نے ان کو قتل کیا ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی۔ میں نے ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے کہا: کیا تو نے یہ حدیث نبی کریم ﷺ سے سنی ہے؟ کہا: کیا ایک بار، بلکہ دو بار، تین بار نہ چار بار، حتیٰ کہ سات بار تک گن کر کہا: اگر اتنی بار نہ سنتا کبھی تم سے نہ کہتا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث حسن ہے۔[6] (رواه ابن ماجه و أحمد بنحوه)

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٥٨)

[2] تفسير البغوي (٢/ ٨٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٥٤٦) فتح البيان (٢/ ٣٠٥_ ٣٠٦)

[3] مسند أحمد (٥/ ٢٣٢) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ العلاء بن زیاد رحمہ اللہ کا سماع سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے ثابت نہیں ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٠١٦)

[4] الموطأ (٢/ ٨٩٩) المستدرك (١/ ١٧٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٩٣٧)

[5] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٧٢٩)

[6] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٠٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٦) مسند أحمد (٥/ ٢٥٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه الترمذي وابن ماجه باختصار و رواه الطبراني و رجاله ثقات" (مجمع الزوائد: ٦/ ٣٥٠)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں ایک عجیب وغریب حدیث ذکر کی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اے محمد! یہ ہماری آیتیں اور حجتیں ہیں، جو ہم نے تم پر پڑھی ہیں، ان میں دنیا اور آخرت کا حال کھول دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا، وہ تو حاکم عادل ہے، ہر شے پر قادر ہے، ہر شے کا عالم ہے، پھر اس کو ظلم کرنا کیسے روا ہوسکتا ہے۔ اس لیے یہ فرما دیا کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، وہ سب اسی کی ملکیت اور عبودیت میں ہے، سارے امور کا مرجع اسی کی طرف ہے۔[1]

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ اَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّاۤ اَذًى ؕ وَ اِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْۤا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ حَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے پیدا کی گئی ہے، تم نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہلِ کتاب ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہت بہتر ہوتا۔ ان میں بعض ایمان والے بھی ہیں، مگر ان کے اکثر نافرمان ہیں ﴿۱۱۰﴾ وہ تمھیں تھوڑی سی ایذا کے سوا ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکیں گے، اور اگر وہ تم سے لڑیں تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے اور پھر ان کی مدد نہیں کی جائے گی ﴿۱۱۱﴾ وہ جہاں کہیں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار پڑی، الا یہ کہ وہ اللہ کی یا لوگوں کی پناہ میں تھے، وہ اللہ

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۵۰۸۔ ۵۰۹)

کی طرف سے غضب کے حق دار ٹھہرے اور ان پر محتاجی مسلط کر دی گئی، یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے، اور اس وجہ سے بھی کہ وہ نافرمانی کرتے اور حد سے بڑھ جاتے تھے (112)

اُمتِ محمدیہ بہترین اُمت ہے:

موضح قرآن میں ہے، یعنی یہ اُمت ہر اُمت سے انہی دو صفتوں، یعنی امر بالمعروف (جہاد) اور ایمان کی وجہ سے بہتر ہے، یعنی توحید کی بندش اس قدر کسی اور دین میں نہیں ہے۔ یہود دنیا میں کہیں اللہ کی دستاویز (پناہ) کے بغیر اپنی حکومت سے نہیں رہتے۔ تورات کی بعض رسمیں عمل میں لاتے ہیں، اس کے طفیل سے لوگوں کی پناہ میں پڑے ہیں کہ کسی کی رعیت ہیں۔ اللہ پاک نے اس آیتِ کریمہ میں یہ خبر دی ہے کہ اُمتِ محمدیہ بہترین اُمت ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ تم لوگوں کے لیے بہتر لوگ ہو۔ ان کو گلوں میں زنجیریں ڈال کر لاتے ہو، یہاں تک کہ وہ اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، عوفی، عکرمہ، عطا اور ربیع رحمہ اللہ کا یہی قول ہے،[1] یعنی ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں کو سب سے زیادہ فائدہ دینے والے ہو اور بہترین امت ہو۔ درہ بنت ابی لہب نے کہا ہے کہ ایک آدمی نے کھڑے ہو کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، جب وہ منبر پر تھے کہ کون لوگ بہتر ہیں؟ فرمایا: جو زیادہ پڑھنے والا، زیادہ پرہیز گار ہے، آمر بالمعروف اور ناہی عن المنکر ہے۔ زیادہ صلہ رحمی کرنے والا ہے (رشتوں کو ملانے والا ہے)۔[2] (رواہ أحمد) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اس اُمت سے مراد وہ لوگ ہیں، جنھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کی اور مکہ سے مدینہ آئے۔[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صحیح یہ ہے کہ یہ آیت ساری اُمت کے حق میں عام ہے، ہر زمانہ اپنے رتبے کے مطابق خیر ہے اور خیر القرون وہ ہے، جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، پھر جو اُن سے نزدیک ہیں، پھر جو اُن سے قریب ہیں، جس طرح دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ﴾ [البقرة: ۱۴۳] ''اور (جیسے تمھیں ہدایت دی) اسی طرح ہم نے تمھیں افضل اُمت بنایا، تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو۔'' سیدنا معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم ستر (۷۰) اُمتوں کو پورا کرتے ہو،

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (۴۲۸۱) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۵۰۹)

(2) مسند أحمد (۶/ ۴۳۲) اس کی سند میں ''زوج درہ'' کا ترجمہ نہیں ملا۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۲۰۹۳)

(3) سنن النسائي الكبرىٰ (۶/ ۳۱۳) مسند أحمد (۱/ ۳۵۴) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ورجال أحمد رجال الصحيح'' (مجمع الزوائد: ۷/ ۴۹)

تم ان میں اللہ کے نزدیک بہتر اور بزرگ تر ہو۔ (رواه أحمد و الترمذي وابن ماجه والحاكم) یہ حدیث مشہور ہے، ترمذی نے اس کو حسن کہا ہے۔[1] سیدنا معاذ بن جبل اور ابوسعید رضی اللہ عنہما سے بھی اسی کے قریب قریب روایت ہے۔

اس اُمت کو یہ امتیاز اور سبقت ان کے نبی کی وجہ سے حاصل ہوئی، کیوں کہ آپ ﷺ اللہ کی مخلوق میں سے سب سے زیادہ شرف والے اور رسولوں میں سے سب سے زیادہ مکرم ہیں۔ اللہ نے ان کو وہ شریعتِ کامل دے کر بھیجا ہے، جو اُن سے پہلے نہ کسی نبی کو اور نہ کسی رسول کو دی تھی۔ اس لیے اس صراطِ مستقیم پر تھوڑا چلنا وہ کام کرتا ہے، جو دوسروں کے اعمالِ کثیر نہیں کرتے۔ سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ جو کچھ مجھے دیا گیا ہے، وہ مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیا گیا۔ ہم نے کہا: وہ کیا ہے؟ فرمایا: میں رعب کے ساتھ مدد دیا گیا ہوں، مجھ کو زمین کی کنجیاں دی گئی ہیں، میرا نام احمد رکھا گیا ہے، میرے لیے مٹی پاک کر دی گئی ہے، میری اُمت خیر الامم بنائی گئی ہے۔[2] (رواه أحمد) اس کی سند حسن ہے۔

اُمتِ محمدیہ کی فضیلت میں احادیث:

سیدنا ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کہا: اے عیسیٰ! میں تیرے بعد ایک اُمت اُٹھاؤں گا، اگر ان کو وہ چیز ملے گی جو وہ چاہتے ہیں تو حمد و شکر کریں گے اور اگر ان کو وہ چیز پہنچے گی جو مکروہ ہے تو صبر کریں گے اور اجر کی اُمید رکھیں گے، نہ حلم ہے نہ علم۔ کہا: اے رب! یہ کام وہ کیوں کر کریں گے، نہ حلم ہوگا نہ علم؟ فرمایا: میں ان کو اپنے علم و حلم سے دوں گا۔[3] (رواه أحمد) پھر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: اس جگہ کچھ حدیثیں آئی ہیں، جن کا ذکر مناسب ہے۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھ کو ستر ہزار ایسے افراد دیے گئے ہیں، جو بغیر حساب جنت میں جائیں گے، ان کے منہ جیسے چودھویں رات کا چاند، ان سب کے دل جیسے ایک آدمی کا دل۔ پھر میں نے اپنے رب سے زیادہ مانگا مجھ کو زیادہ دیا، ہر ایک کے ساتھ ستر ہزار اور دیے۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: میں سمجھتا ہوں کہ یہ گاؤں والے اور جنگل والے ہوں گے۔[4] (أخرجه أحمد)

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ مجھ کو میرے رب نے ستر ہزار دیے، جو بہشت میں بغیر حساب کے جائیں گے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ نے زیادہ نہ مانگا؟ فرمایا: مانگا تھا، ہر ہزار کے ساتھ ستر

---

[1] مسند أحمد (٤/ ٤٤٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٠١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٨٨) مستدرك الحاكم (٤/ ٩٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٣٠١)

[2] مسند أحمد (١/ ٩٨) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٩٣٩)

[3] مسند أحمد (٦/ ٤٥٠) اس کی سند میں "ابو حلبس یزید بن میسرۃ" مجہول راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٤٠٣٨)

[4] مسند أحمد (١/ ٦) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٤٨٤)

ہزار اور مجھ کو دیے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ نے اور زیادہ مانگا ہوتا۔ فرمایا: مانگا تھا، ہر آدمی کے ساتھ ستر ہزار اور بخشے۔ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہی کہا کہ آپ نے اور زیادہ مانگے ہوتے۔ فرمایا: میں نے مانگے تھے، سو اس قدر دیے۔ عبدالرحمٰن بن ابوبکر نے دونوں ہاتھ پھیلا کر بتایا۔ عبداللہ نے کہا: دونوں باع (بازو) پھیلائے۔ پھر عبداللہ نے لپ بھر کر بتایا اور ہشام نے کہا: یہ اللہ کی طرف سے ہے، اس کی گنتی معلوم نہیں۔[1] (رواہ أحمد) سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ میری اُمت میں سے جنت میں ستر ہزار داخل ہوں گے، جن پر نہ حساب ہے نہ عذاب، ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار ہوں گے۔[2] امام احمد رحمہ اللہ اس حدیث کے ساتھ متفرد ہیں، اس اسناد کے تمام رجال شامی حمصی ثقات ہیں۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ وللہ الحمد۔ امام طبرانی رحمہ اللہ نے سیدنا ثوبان رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یوں روایت کیا ہے کہ میرے رب عزوجل نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میری اُمت کے ستر ہزار لوگوں کا حساب نہ ہوگا، ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار اور ہوں گے۔[3]

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک رات ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت سی باتیں کیں، پھر صبح کو گئے تو فرمایا: آج کی رات سارے انبیا اپنی اُمتوں کے ساتھ مجھے دکھلائے گئے، ایک نبی گزرا، اس کے ساتھ تین آدمی تھے، کسی نبی کے ساتھ عصابہ (لوگوں کا ایک گروہ، جس میں دس سے چالیس تک افراد ہوتے ہیں) تھا۔ کسی کے ساتھ تین سے دس افراد، کسی کے ساتھ کوئی بھی نہیں، یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام کا مجھ پر گزر ہوا، ان کے ہمراہ بنی اسرائیل کا ایک کبکبہ (سواروں کا ایک گروہ) تھا، وہ مجھے اچھے لگے، میں نے کہا: یہ کون ہیں؟ کہا: تمھارے بھائی موسیٰ علیہ السلام ہیں، ان کے ساتھ بنی اسرائیل ہیں۔ میں نے کہا: میری اُمت کہاں ہے؟ کہا: اپنی داہنی طرف دیکھو، دیکھا تو ایک جہان لوگوں سے بھرا ہوا ہے، مجھ سے کہا: تو راضی ہوا؟ میں نے کہا: ہاں اے رب! میں راضی ہوں۔ مجھ سے کہا: ان کے ساتھ ستر ہزار بغیر حساب کے جنت میں جائیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم پر میرے ماں باپ فدا ہوں، اگر تم سے بن سکے کہ تم ان ستر ہزار میں ہو سکو تو ہو جاؤ، اگر تم قاصر رہو تو اہلِ ظراب (ٹیلے والے) میں اور اس سے بھی قاصر ہو تو اہلِ اُفق میں ہو جاؤ، کیوں کہ میں نے وہاں کچھ لوگوں کو دیکھا کہ وہ باہم مختلط ہو رہے تھے۔

پھر عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا: اے اللہ کے رسول! اللہ سے دعا کریں کہ مجھے ان میں سے کر دے، یعنی ستر ہزار میں سے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے دعا کی۔ ایک دوسرے آدمی نے کھڑے ہو کر یہی کہا، فرمایا: عکاشہ نے تم سے پہلے یہ دعا لے لی۔ پھر ہم نے آپس میں باتیں کیں کہ وہ ستر ہزار وہ اقوام ہیں، جو اسلام

---

[1] مسند أحمد (١/ ١٩٧) اس کی سند میں ''قاسم بن مہران، موسیٰ بن عبید'' مجہول راوی ہیں۔ البتہ اس کی اصل صحیحین میں مروی ہے، جو کہ آگے آ رہی ہیں۔

[2] مسند أحمد (٥/ ٢٨٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢١٧٩)

[3] المعجم الكبير (٢/ ٩٢) اس کی سند میں ''محمد بن اسماعیل حمصی'' ضعیف راوی ہے۔

میں پیدا ہوئے ہیں، انھوں نے اللہ کے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں کیا، یہاں تک کہ مر گئے۔ یہ خبر نبی مکرم ﷺ کو پہنچی، فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں، جو منتر نہیں کراتے، داغتے نہیں، بدفالی نہیں لیتے اور اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں۔[1] (رواه أحمد بهذا السند و هذا السياق) دوسری روایت میں اتنا اور زیادہ مروی ہے کہ جب نبی مکرم ﷺ نے کہا: اے رب! میں راضی ہوا تو فرمایا: اپنی بائیں طرف دیکھ، دیکھا تو سارا اُفق لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ مجھ سے کہا: تو خوش ہوا؟ میں نے کہا: ہاں۔[2] یہ اسناد صحیح ہے۔ امام احمد اس کے ساتھ متفرد ہیں۔

تیسری حدیث میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ مجھ کو اُمتیں موسمِ حج میں دکھلائی گئیں، میں نے اپنی اُمت دیکھی تو ان کی کثرت اور ہیئت مجھے پسند آئی، میدان، پہاڑ سب اُن سے بھرا ہوا تھا۔ مجھ سے کہا: اے محمد! تم راضی ہوئے؟ میں نے کہا: ہاں۔ فرمایا: ان کے ہمراہ ستر ہزار وہ ہیں، جو بے حساب جنت میں جائیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو منتر نہیں کراتے، نہ فالِ بد لیتے ہیں، اپنے رب پر توکل کرتے ہیں۔ سیدنا عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر کہا: اے اللہ کے رسول! اللہ سے دعا کریں کہ وہ مجھ کو ان میں سے کر دے۔ فرمایا: تو انھی میں سے ہے۔ ایک دوسرے شخص نے بھی یہی کہا۔ فرمایا: «سَبَقَكَ بِهَا عُكَاشَةُ» (رواه أحمد) ''عکاشہ یہ دعا کرانے میں تم سے سبقت لے گیا'' حافظ ضیاء مقدسی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ حدیث شرطِ مسلم پر ہے۔[3]

سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے کہا: میری اُمت کے ستر ہزار لوگ بے حساب، بے عذاب جنت میں داخل ہوں گے۔ پوچھا گیا: وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا: جو منتر نہیں کراتے، نہ داغتے ہیں اور نہ فالِ بد لیتے ہیں، اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں۔[4] (رواه الطبراني ومسلم) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے کہا کہ میری اُمت کا ایک گروہ جنت میں داخل ہوگا، وہ ستر ہزار ہوں گے، ان کے منہ ایسے چمکتے ہوں گے، جیسے چودھویں رات کا چاند۔ سیدنا عکاشہ بن محصن اسدی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر اپنا کمبل سنبھال کر کہا: اے اللہ کے رسول! آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو ان میں سے کر دے۔ فرمایا: «اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ مِنْهُمْ» پھر ایک انصاری نے کھڑے ہو کر یہی کہا۔ فرمایا: تجھ سے پہلے یہ اعزاز عکاشہ لے گیا۔[5] (رواه الشيخان)

سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے کہا: میری اُمت سے ستر ہزار یا سات

---

[1] مسند أحمد (١/ ٤٠١) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ (فتح الباري: ١١/ ٤٠٧) [2] مسند أحمد (١/ ٤٢٠)

[3] مسند أحمد (١/ ٤٥٤) صفة الجنة (١/ ٥٤) الأدب المفرد (١/ ٣١٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه أحمد مطولاً و مختصراً و رواه أبو يعلىٰ كذلك و رجالهما في المطول رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٩/ ٥٠١)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٨) المعجم الكبير (١٨/ ١٨٢)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٧٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٦)

لاکھ لوگ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے آئیں گے، یہاں تک کہ ان کے اگلے پچھلے بہشت میں داخل ہوں گے، ان کے منہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ہوں گے۔[1] (أخرجه الطبراني والشيخان جميعاً) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے کہ مجھ پر اُمتیں پیش کی گئیں۔ میں نے ایک نبی کو دیکھا، اس کے ہمراہ ایک رہط، یعنی گروہ ہے، کسی نبی کے ہمراہ ایک یا دو آدمی ہیں، کسی نبی کے ساتھ کوئی بھی نہیں ہے۔ اس اثنا میں ایک سوادِ اعظم مجھے دکھلایا گیا، میں نے گمان کیا کہ یہ میری اُمت ہوگی، مجھ سے کہا گیا: یہ موسیٰ اور ان کی قوم ہے، لیکن جب آسمان کے کنارے کی طرف دیکھا تو ایک سوادِ عظیم نظر آیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ دوسرے اُفق کو دیکھو، دیکھا تو ایک سوادِ عظیم ہے، مجھ سے کہا گیا کہ یہ تیری اُمت ہے، پھر ان کے ہمراہ ستر ہزار ہیں، جو بے حساب اور بے عذاب جنت میں جائیں گے۔

پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُٹھ کر گھر میں چلے گئے، لوگوں نے غور کیا کہ وہ کون لوگ ہیں، جو بغیر حساب و عذاب جنت میں جائیں گے۔ بعض نے کہا: شاید اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ بعض نے کہا: شاید وہ ہیں جو اسلام میں پیدا ہوئے، کسی شے کو اللہ کے ساتھ شریک نہ کیا۔ اسی طرح اور چیزوں کا ذکر کیا۔ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باہر آ کر فرمایا: تم کیا غور و خوض کر رہے ہو؟ لوگوں نے بیان کیا تو فرمایا: «هُمُ الَّذِيْنَ لَا يَرْقُوْنَ، وَلَا يَسْتَرْقُوْنَ، وَلَا يَكْتَوُوْنَ، وَلَا يَتَطَيَّرُوْنَ، وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ» سیدنا عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ نے کہا: آپ دعا کریں کہ اللہ مجھ کو ان میں سے کرے۔ فرمایا: «أَنْتَ مِنْهُمْ» پھر ایک دوسرے شخص نے کھڑے ہو کر کہا: ''أُدْعُ اللّٰهَ أَنْ يَّجْعَلَنِيْ مِنْهُمْ'' ''دعا فرمائیں اللہ مجھے اُن میں کر دے۔'' فرمایا: «سَبَقَكَ بِهَا عُكَاشَةُ» (رواه مسلم) ''عکاشہ تجھ سے سبقت لے گیا ہے۔'' اس حدیث کو بخاری نے بھی روایت کیا ہے، مگر اس میں لفظ ''يَرْقُوْنَ'' نہیں ہے۔[2]

سیدنا ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ مجھ سے میرے رب نے اس بات کا وعدہ کیا کہ میری اُمت میں سے ستر ہزار کو جنت میں داخل کرے، ان میں ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار ہوں گے، جن پر نہ حساب ہے نہ عذاب۔ علاوہ ازیں میرے رب کے چلوؤں میں سے تین چلو مزید۔[3] (رواه أبوبكر بن أبي عاصم والطبراني) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: طبرانی کی اسناد جید ہے۔ سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میری اُمت میں سے ستر ہزار لوگوں کو بغیر حساب جنت میں داخل کرے گا۔ یزید بن اخنس نے کہا: واللہ! وہ آپ کی اُمت میں ایسے ہوں گے، جیسے بھوری مکھی مکھیوں میں ہوتی ہے۔ فرمایا: اللہ نے ستر ہزار کا وعدہ کیا ہے، ہر ہزار کے ساتھ ستر ہزار ہوں گے، اس پر تین لپ (چلو) اور

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٠٧٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٩) المعجم الكبير (٦/ ١٤٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٠)

[3] السنة لابن أبي عاصم (٢/ ١١٠) المعجم الكبير (٨/ ١١٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧١١١)

بڑھا دیے ہیں۔[1] (رواه ابن أبي عاصم) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ اسناد حسن ہے۔

سیدنا عتبہ بن عبد السلمی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرے رب عزوجل نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میری اُمت میں سے ستر ہزار بغیر حساب جنت میں داخل ہوں گے، پھر ہر ہزار ستر ہزار کی حفاظت کرے گا، پھر میرا رب اپنے دونوں کفِ دست سے تین لپ بھرے گا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے تکبیر کہی اور کہا: پہلے سَتّر کو اللہ ان کے باپوں، بیٹوں اور عشیرہ (خاندان) کے لیے سفارشی بنائے گا اور میں اُمید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو پچھلے لپوں میں کرے۔[2] (رواه أبو القاسم الطبراني) حافظ ضیاء مقدسی نے کتاب "صفة الجنة" میں کہا ہے: «لَا أَعْلَمُ لِهٰذَا الْإِسْنَادِ عِلَّةً، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ»[3] "مجھے اس سند کی کوئی علت معلوم نہیں۔" سیدنا رفاعہ جہنی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آئے، پھر جب کدید یا قدید میں پہنچے تو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث فرمائی، اس میں یہ بھی کہا کہ مجھ سے میرے رب عزوجل نے وعدہ کیا کہ میری اُمت میں سے ستر ہزار کو بغیر حساب جنت میں داخل کرے گا اور مجھ کو اُمید ہے کہ وہ اس وقت تک داخل نہیں ہوں گے، جب تک کہ تم اور تمھاری صالح اولاد اور ازواج جنت میں جگہ نہ پالیں گے۔ (رواه أحمد)

حافظ ضیاء نے کہا کہ یہ حدیث میرے نزدیک شرطِ مسلم پر ہے۔[4] اس حدیث سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہ ستر ہزار صحابہ کے علاوہ ہیں، گو عکاشہ رضی اللہ عنہ کی طرح بعض صحابہ بھی ان میں شامل ہوں۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھ سے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ میری اُمت سے چار لاکھ کو جنت میں داخل کرے گا۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! کچھ اور بڑھالیں۔ فرمایا: واللہ! اسی قدر۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: بس کرو اے ابوبکر! اس پر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: چھوڑو مجھ کو، اگر اللہ تعالیٰ ہم سب کو جنت میں لے جائے تو تمھارا کیا نقصان ہے؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر اللہ چاہے تو ایک ہتھیلی میں ساری خلق کو جنت میں داخل کر دے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر رضی اللہ عنہ سچ کہتے ہو۔ (رواه عبد الرزاق وتفرد به قاله الضياء) حافظ ضیاء نے کہا: اس حدیث کو ابو نعیم اصفہانی رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا تھا، مگر وہ حدیث غریب ہے۔[5]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اُمت میں سے ستر ہزار جنت میں داخل ہوں گے۔ کہا: اے اللہ کے رسول! بڑھاؤ، فرمایا: ہر آدمی کے ساتھ ستر ہزار ہوں گے۔ کہا: اور بڑھاؤ۔ وہ ایک ٹیلے پر بیٹھے تھے، فرمایا: اس قدر، پھر دونوں ہاتھوں سے چلو بھر کر بتایا۔ کہا: اے اللہ کے رسول! جو اس کے بعد آگ میں داخل ہوا، اس کو اللہ نے دور کر ڈالا۔ (رواه أبو يعلیٰ) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: یہ اسناد جید ہے۔ اس کے

---

[1] السنة لابن أبي عاصم (٢/ ١٠٩) مسند أحمد (٥/ ٢٥٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ (ظلال الجنة: ١/ ٣١٩)

[2] المعجم الكبير (١٧/ ١٢٦) حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو جید کہا ہے۔ (فتح الباري: ١١/ ٤١٠)

[3] صفة الجنة (١/ ٥٥)

[4] مسند أحمد (٤/ ١٦) صفة الجنة (١/ ٥٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٤٠٥)

[5] مصنف عبد الرزاق (١١/ ٢٨٦) حلية الأولياء (٢/ ٣٤٤) صفة الجنة (١/ ٥٧)

سب رجال سوائے عبدالقاہر بن سدی کے ثقات ہیں، مگر ابن معین رحمہ اللہ نے ان کو صالح بتایا ہے۔[1] سیدنا ابو مالک رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے! تم میں سے قیامت کے دن جنت کی طرف کالی رات کی طرح بھیجے جائیں گے۔ وہ گروہ ساری زمین کو گھیر لے گا، فرشتے کہیں گے: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اتنے آئے ہیں جتنے دوسرے نبیوں کے ساتھ نہیں آئے، یہ ان سب سے زیادہ ہیں۔[2]

(رواہ الطبراني وهذا إسناد حسن)

امام احمد کے نزدیک سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے، جس میں اس اُمت کی فضیلت، شرف اور کرامت کا ذکر ہے، جس سے اس کا دنیا و آخرت میں خیر الامم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ انھوں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، آپ فرماتے تھے کہ میں اُمید رکھتا ہوں کہ جو لوگ میری اُمت میں سے میرے تابع ہوں گے، وہ اہلِ جنت کا ایک چوتھائی ہوں گے۔ ہم نے تکبیر کہی، فرمایا: مجھ کو اُمید ہے کہ ایک تہائی لوگ ہوں گے، ہم نے اللہ اکبر کہا۔ فرمایا: مجھے اُمید ہے کہ نصف اہلِ جنت ہوں گے۔[3] یہ حدیث شرطِ مسلم پر ہے۔ صحیحین میں سیدنا ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا، کیا تم راضی نہیں ہو کہ تم اہلِ جنت کی ایک چوتھائی ہو؟ ہم نے تکبیر کہی، فرمایا: کیا تم راضی نہیں ہو کہ اہلِ جنت کا ایک تہائی ہو۔ ہم نے کہا: اللہ اکبر۔ فرمایا: مجھے اُمید ہے کہ تم نصف اہلِ جنت ہو۔[4]

طبرانی میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس طرح مروی ہے کہ تمھارا کیا حال ہے، چوتھائی جنت تمھارے لیے ہے۔ کہا: یہ تو بہت ہوا، فرمایا: کیا حال ہے تمھارا، آدھی جنت تمھارے لیے ہے۔ کہا: یہ تو بہت ہوا۔ فرمایا: اہلِ جنت کی ایک سو بیس صف ہوں گے، ان میں سے تم اسّی صف ہو گے۔[5] امام طبرانی رحمہ اللہ نے کہا کہ اس حدیث کے ساتھ حارث بن حصین متفرد ہے۔ سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ جنت ایک سو بیس صف ہوں گے، ان میں سے یہ اُمت اسّی صف ہوگی۔[6] (رواه أحمد و حسنه الترمذي و رواه ابن ماجه)

---

[1] مسند أبي يعلىٰ (٦/ ٤١٧) تفسیر ابن کثیر (١/ ٥١٤) امام بوصیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ورواته ثقات"

[2] المعجم الكبير (٣/ ٢٩٧) اس کی سند منقطع ہے اور "محمد بن اسماعیل، ہاشم" ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٥٦١٢)

[3] مسند أحمد (٣/ ٣٨٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه أحمد والبزار والطبراني في الأوسط، و رجال البزار رجال الصحيح و كذلك أحد إسنادي أحمد" (مجمع الزوائد: ١٠/ ٧٤٣)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٦٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢١)

[5] المعجم الكبير (١٠/ ١٦٨) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ورجالهم رجال الصحيح غير الحارث بن حصيرة وقد وثق" (مجمع الزوائد: ١٠/ ٧٤٤)

[6] مسند أحمد (٥/ ٣٦١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٤٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٨٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٥٢٦)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ جنت والے ایک سو بیس صف ہوں گے، اسّی صف ان میں سے میری اُمت ہوگی۔ (رواه الطبراني) اس حدیث کے ساتھ خالد بن یزید بجلی متفرد ہے۔ ابن عدی رحمہ اللہ نے اس میں کلام کیا ہے۔[1] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اُتری: ﴿ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ۝ ﴾ [الواقعة: ۳۹۔ ۴۰] ''کثیر جماعت پہلوں میں سے۔ اور کثیر جماعت پچھلوں میں سے۔'' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اہلِ جنت کا ایک چوتھائی ہو، ایک تہائی ہو، نصف ہو، دوتہائی ہو۔[2] (رواه الطبراني) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے دوسری مرفوع روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ ہم پچھلے ہیں، مگر قیامت کے دن ہم پہلے ہیں۔ جنت میں ہم سب لوگوں سے پہلے جائیں گے، سوائے ان لوگوں کے جن کو ہم سے پہلے کتاب دی گئی ہے، ہم کو ان سے بعد ملی ہے۔ جس حق میں انھوں نے اختلاف کیا تھا، وہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو سجھا دیا۔ یہ وہ دن ہے، جس میں انھوں نے اختلاف کیا تھا، لوگ اس میں ہمارے تابع ہیں، کل کا دن یہود کے لیے ہے اور کل کے بعد نصاریٰ کا دن ہے۔[3] (رواه عبد الرزاق ورواه الشيخان عنه مرفوعاً بنحوه)

صحیح مسلم میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت اس طرح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « نَحْنُ الْآخِرُوْنَ الْأَوَّلُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ نَحْنُ أَوَّلُ مَنْ يَّدْخُلُ الْجَنَّةَ »[4] (الحديث) ''ہم آخر میں آنے والے قیامت کے دن پہلے ہوں گے اور سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔'' سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ جب تک میں نہ اس میں داخل ہو جاؤں، جنت سب انبیا پر حرام ہے اور جب تک میری اُمت داخل نہ ہو، سب اُمتوں پر حرام ہے۔[5] (رواه الدار قطني في الأفراد و رواه أبو أحمد بن عدي و الثعلبي) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ احادیث آیت زیرِ تفسیر کے معنی میں ہے، جو اس اُمت میں ان صفتوں کا مالک ہوگا، وہ ان کے ساتھ اس تعریف میں شامل ہے۔ امت کا بہتر ہونا اقامتِ دین کے فریضے کے ساتھ مشروط ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے ایک حج میں لوگوں کو تیزی میں دیکھ کر یہ آیت پڑھی: ﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ﴾ پھر کہا: جس کو یہ بات

---

[1] المعجم الكبير (١٠/ ٢٨٧) الكامل لابن عدي (٣/ ١٥) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''وفيه خالد بن يزيد الدمشقي وهو ضعيف وقد وثق'' (مجمع الزوائد: ١٠/ ٩٧٤٤) البتہ گذشتہ روایت اس کی تائید کرتی ہے۔

[2] حلية الأولياء (٧/ ١٠١) اس کی سند حسن ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٣٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٥٥) تفسير الصنعاني (١/ ٨٢)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٥٥)

[5] أطراف الغرائب والأفراد (١/ ١٠٣) الكامل لابن عدي (٤/ ١٢٩) تفسير الثعلبي (٣/ ١٢٨) اس کی سند میں ''زہیر بن محمد'' اور ''صدقہ دمشقی'' ضعیف راوی ہیں۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٣٢٩)

پسند ہو کہ وہ اس اُمت میں ہو تو وہ اللہ کی شرط جو اس آیت میں ہے، ادا کرے۔[1] (رواہ ابن جریر) اور جو کوئی ان صفتوں کا حامل نہیں، وہ اہلِ کتاب سے زیادہ مشابہ ہے، جن کی اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مذمت کی ہے: ﴿ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ﴾[2] [المائدة: ۷۹]

فتح البیان میں ہے کہ یہ اُمت بہتر ہے، جب تک کہ آیت کے مضمون پر قائم رہے۔ جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک کر دے گی بہتر نہ رہے گی، اسی لیے امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ان کی خیریت مذکورہ شرائط پر ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مراد مہاجرین ہیں۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ اگر "أنتم" کہتا تو ہم خیر اُمت ہوتے، مگر ﴿ كُنْتُمْ ﴾ فرمایا، یعنی خاص اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور جو کوئی ان کی طرح ہو۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ آیت اِن صحابہ سیدنا عبداللہ بن مسعود، عمار بن یاسر، سالم مولی ابی حذیفہ، ابی بن کعب اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم کے حق میں اُتری ہے۔[4] ٹھیک بات یہی ہے کہ جس میں مذکورہ صفات موجود ہوں، خواہ وہ سلف میں تھا یا خلف میں ہو، وہ اس آیت کا مصداق ہے۔ اس لیے جب اللہ تعالیٰ نے ان صفات پر اس اُمت کی تعریف کی تو اہلِ کتاب کی مذمت فرمائی کہا کہ اگر اہلِ کتاب اس پر ایمان لائیں، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا ہے تو یہ اُن کے لیے بہتر ہے، مگر ایمان لانے والے کم ہیں۔ زیادہ گمراہ، کافر، فاسق اور نافرمان ہیں۔

مسلمانوں کو اہلِ کتاب پر فتح کی بشارت:

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو یہ خوش خبری سنائی کہ اہلِ کتاب پر مدد اور کامیابی تمھی کو ہے، وہ کافر ملحد ہیں، اللہ تعالیٰ نے خیبر کے دن ان کو ذلیل وخوار کر دیا۔ اسی طرح جو یہودی مدینہ میں ان سے پہلے تھے، جیسے: بنی قینقاع و بنی نضیر و بنی قریظہ ان سب کو بھی ذلیل کیا تھا۔ اسی طرح شام کے نصاریٰ کو صحابہ کرام صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی لڑائیوں میں شکستِ فاش دے کر ملکِ شام کو ان کے ہاتھ سے ابد الآباد تک کے لیے نکال لیا۔ شام میں ہمیشہ ایک گروہ اسلام کا رہے گا، یہاں تک کہ عیسیٰ بن مریم علیہ السلام اتریں اور ملتِ اسلام اور شریعتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق حکم کریں، صلیب کو توڑ ڈالیں، خنزیر کو قتل کریں، جزیہ لینا موقوف کر دیں اور سوائے اسلام کے کچھ قبول نہ کریں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے مسلمانو! تم کو یہودی کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچا سکتے، یعنی جنگ اور لوٹ مار وغیرہما سے، ہاں کذب وتحریف وغیرہ سے ایذا رسانی کریں تو کریں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا مومنین سے وعدہ ہے کہ اہلِ کتاب ان پر غالب نہ ہوں گے، بلکہ وہی ان پر منصور رہیں گے، پھر یہاں تک کہہ دیا کہ اگر لڑیں گے تو بھاگ جائیں گے، ان کو

---

[1] تفسير الطبري (٧/ ١٠٢)
[2] تفسير ابن كثير (٥٠٩ـ ٥١٦)
[3] تفسير القرطبي (٤/ ١٧٠)
[4] تفسير الطبري (٧/ ١٠١) فتح البيان (٢/ ٣١٠، ٣١١)

کسی طرح سے مدد نہیں ملے گی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا کہ یہود کو اس آیت کے نزول کے بعد کسی جگہ حکومت نہ ملی، نہ ان کا کوئی لشکر کہیں جمع ہوا۔ یہ معجزات نبوت سے ایک معجزہ ہے۔

ذلت یہود کا مقدر ہے:

پھر یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ذلت وخواری ان کے نصیب میں لکھ دی ہے، کہیں وہ اللہ کی رسی یا لوگوں کی رسی کے بغیر امن سے نہیں رہ سکتے۔ رسی سے مراد عہد اور ذمہ ہے اور اُن پر جزیہ مقرر کرنا اور احکامِ ملت لازم کرنا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: رسی سے مراد عہد ہے۔ امام مجاہد، عکرمہ، عطا، ضحاک، حسن، قتادہ، سدی اور ربیع رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔[1] یعنی اللہ اور اللہ کی مخلوق کے ساتھ معاہدہ کیے بغیر وہ کسی جگہ امن سے نہیں رہ سکتے۔ مارے جاتے ہیں، یا قید ہوتے ہیں، یا مال لوٹا جاتا ہے، یا ذلت سے مراد باطل کے ساتھ چمٹنا ہے، یا یہ بات کہ ان میں کوئی بادشاہ قاہر یا معتبر سردار نہیں ہے، بلکہ وہ اہلِ اسلام اور نصاریٰ کے درمیان سارے شہروں میں ضعیف اور عاجز ہیں۔

ان پر اللہ کا یہ غضب وغصہ اور ذلت کی یہ مار قدراً وشرعاً اس لیے ہوئی کہ انھوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا۔ پیغمبروں کو ناحق مارا۔ یہ کام ان سے تکبر، حسد اور سرکشی کے سبب سے ہوا۔ اس کے عوض مستقل طور پر ذلت، توہین اور مسکینی ان کے گلے بندھی رہی۔ کفر وعصیان ان سے اس لیے ہوا کہ وہ بہ کثرت اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کرتے تھے۔ رات دن نافرمانی میں مبتلا تھے، اللہ کی شریعت میں حد سے تجاوز کر جاتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ بنی اسرائیل ایک ایک دن میں تین تین سو نبی قتل کرتے اور تیسرے پہر بازار میں جا کر سبزی وغیرہ فروخت کرتے۔[2]

لَيۡسُوۡا سَوَآءً ؕ مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتۡلُوۡنَ اٰيٰتِ
اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيۡلِ وَهُمۡ يَسۡجُدُوۡنَ ۝١١٣ يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ
الۡاٰخِرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَيُسَارِعُوۡنَ
فِى الۡخَيۡرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۝١١٤ وَمَا يَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ
فَلَنۡ يُّكۡفَرُوۡهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ ۢ بِالۡمُتَّقِيۡنَ ۝١١٥ اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا
لَنۡ تُغۡنِىَ عَنۡهُمۡ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ شَيۡـئًا ؕ
وَاُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۝١١٦ مَثَلُ مَا

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٧٣٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٧٣٦) اس کی سند صحیح ہے۔

يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿117﴾

وہ سب برابر نہیں ہیں، اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ حق پر قائم ہے، وہ رات کی گھڑیوں میں اللہ کی آیتیں تلاوت کرتے ہیں اور وہ سجدہ کرتے ہیں ﴿113﴾ وہ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں اور وہ بھلائی کے کاموں میں سبقت کرتے ہیں اور وہی نیکوکاروں میں سے ہیں ﴿114﴾ اور وہ جو بھی بھلائی کریں گے اس کی ناقدری نہیں کی جائے گی اور اللہ پرہیز گاروں کو خوب جانتا ہے ﴿115﴾ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، انھیں ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) سے ذرا بھی چھڑا نہ سکیں گے اور وہی دوزخ والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ﴿116﴾ (کافر) اس دنیا میں جو کچھ خرچ کرتے ہیں، اس کی مثال ایسی آندھی کی سی ہے جس میں سخت پالا ہو، وہ ان لوگوں کی کھیتی پر چلے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، تو وہ اسے تباہ کر ڈالے۔ اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے ﴿117﴾

اہلِ کتاب میں سے مسلمان ہونے والوں کی فضیلت:

یہودیوں میں پانچ سات آدمی حق پرست تھے، وہ مسلمان ہوگئے، ان کے سردار عبداللہ بن سلام تھے۔ اللہ تعالیٰ ہر جگہ اہلِ کتاب کی مذمت میں سے ان کو نکال لیتا ہے، یہاں بھی انہی کا ذکر ہے۔ پھر فرمایا: جو مال خرچ کیا اور اللہ کی رضا کے لیے نہ دیا تو وہ آخرت میں دیا نہ دیا برابر ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آیت زیرِ تفسیر سے مراد یہ ہے کہ اہلِ کتاب اور محمد ﷺ کی اُمت برابر نہیں ہیں۔ یہی قول امام سدی رحمہ اللہ کا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ کہا کہ نبی کریم ﷺ نے نمازِ عشا میں دیر لگائی، پھر مسجد میں آئے، لوگ نماز کے منتظر تھے، فرمایا: سنو! اس وقت ان دین والوں میں سے کوئی ایک بھی اللہ کو یاد نہیں کرتا سوائے تمھارے، اس پر یہ آیت متقین تک اتری۔[2]

اکثر مفسرین رحمہم اللہ کے نزدیک مشہور یہ ہے کہ یہ آیتیں اہلِ کتاب کے احبار کے حق میں آئی ہیں۔ یہی

[1] تفسیر الطبري (٧/ ١٢٢)

[2] سنن النسائي الکبریٰ (٦/ ٣١٣) مسند أحمد (١/ ٣٩٦) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ (الثمر المستطاب: ١/ ٧٣)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے،[1] یعنی وہ اہل کتاب، جن کی مذمت اوپر گزری، اور یہ لوگ جو اُن میں سے اسلام لائے ہیں، جیسے: عبداللہ بن سلام، اسد بن عبید، ثعلبہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم وغیرہم، برابر نہیں ہیں۔ مطلب یہ کہ سارے کتاب والے ایک طرح نہیں ہیں، بعض ان میں مومن ہیں اور بعض مجرم۔ اسی لیے فرمایا کہ اہل کتاب کا ایک گروہ اللہ کے حکم پر قائم، شریعت کا مطیع اور اللہ کے نبی کا پیروکار ہے۔

قائم سے مراد مستقیم ہے، راتوں کو نماز پڑھتا ہے، تہجد ادا کرتا ہے اور نماز میں قرآن کی تلاوت کرتا ہے، اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے، خیرات میں جلدی کرتا ہے۔ یہ لوگ صلحا ہیں، ان کا ذکر سورت کے آخر میں آیا ہے: ﴿ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴾ [آل عمران: ١٩٩] ''اور بے شک اہل کتاب میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ پر اور جو کچھ تمھاری طرف نازل کیا گیا اور جو کچھ ان کی طرف نازل کیا گیا، اس پر ایمان لاتے ہیں، وہ اللہ کے سامنے جھکنے والے ہیں، وہ اللہ کی آیتیں تھوڑی قیمت کے بدلے نہیں بیچتے، وہی ہیں جن کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔'' اسی لیے اس جگہ یوں فرمایا ہے کہ ان کا فعل خیر اللہ کے نزدیک برباد نہیں جائے گا، بلکہ ان کو ان کے نیک اعمال کی پوری جزا دے گا۔ اللہ کو متقین کے حال کی خبر ہے، اس پر کسی عمل کرنے والے کا کوئی عمل پوشیدہ نہیں اور نہ اس کے پاس کسی اچھے عمل کرنے والے کا اجر برباد جاتا ہے۔

کافروں کے خرچ کرنے کی مثال:

پھر کفار مشرکین کا حال بیان کیا کہ ان کا مال و اولاد اللہ کی تکلیف اور عذاب کو اُن سے دور نہیں کر سکتا، وہ جہنمی ہیں۔ پھر کفار کے خرچ کی مثال بیان فرمائی کہ وہ جو کچھ اس زندگی میں خرچ کرتے ہیں، اس کا حال ایسا ہے، جیسے ہوا کے اندر سخت سردی ہو۔ یہ قول سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام عکرمہ، سعید بن جبیر، حسن، قتادہ، ضحاک اور ربیع رحمہم اللہ وغیرہم کا ہے۔[2] امام عطا رحمہ اللہ نے کہا: ''صر'' سے مراد سردی اور اولے ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: آگ ہے۔[3] یہ قول پہلے قول کی طرف ہی لوٹتا ہے، کیوں کہ سخت سردی خصوصاً اولے کھیتی اور پھلوں کو ویسا ہی جلا دیتے ہیں، جیسے آگ کسی چیز کو جلا دیتی ہے۔ جب کھیتی تیار ہوگئی، کاٹنے کا وقت آیا، ہوا چلی تو اس میں سردی تھی جو اس کو مار گئی اور برباد کر گئی۔ یہ آفت ایسے وقت آئی کہ کھیتی والا اس کھیتی کا سخت محتاج تھا۔ اسی طرح کفار کا حال ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا

---

[1] تفسیر الطبري (٧/ ١٢٠۔ ١٢١) تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٧٣٧) اس کی سند حسن ہے۔

[2] تفسیر الطبري (٧/ ١٣٦۔ ١٣٧)

[3] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٧٤١)

ثواب اور بدلہ اس دنیا میں مٹا دیتا ہے، جس طرح اس کھیتی کا پھل اس کھیتی والوں کے گناہوں کی وجہ سے برباد کر دیتا ہے، اسی طرح ان کفار کے اعمال بے بنیاد اور بے اساس ہیں، یہ ظلم خود انھوں نے اپنے اوپر کیا ہے، اللہ نے کچھ نہیں کیا۔

از مکافاتِ عمل غافل مشو گندم از گندم بروید جو ز جو

''گندم سے ہمیشہ گندم ہی اُگتی ہے اور جو سے جو پیدا ہوا ہے، اس لیے اپنے عمل کی پاداش سے غافل نہ رہو۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ﴿ اٰنَآءَ الَّیۡلِ ﴾ سے مراد جوفِ لیل (آدھی رات) ہے۔[1] سجدے سے مراد نماز ہے نہ کہ رکنِ خاص، اس لیے کہ سجدے میں تلاوت درست نہیں ہے۔ مراد مطلق نماز ہے، یا بین العشائین (مغرب اور عشا کے درمیان)، یا صرف نمازِ شب۔ سرعت مقدم کام میں ہوتی ہے اور عجلت غیر مقدم کام میں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَعَجِلۡتُ اِلَیۡكَ رَبِّ لِتَرۡضٰی ﴾ [طٰہٰ: ۸٤] ''اور اے میرے رب! میں نے تیری طرف جلدی کی، تاکہ تو راضی ہو جائے۔'' آیت زیرِ تفسیر میں کفار سے مراد بنو قریظہ اور بنو نضیر ہیں۔ بعض نے کہا: مشرکینِ قریش مراد ہیں، کیوں کہ ابوجہل کو اپنے مال پر بڑا فخر تھا، ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے بدر اور اُحد کے مشرکوں پر بہت سا مال خرچ کیا۔ ظاہر یہ ہے کہ مراد ہر کافر ہے، اس لیے کہ لفظ عام ہے، اس کو خاص کرنے کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ نفقۂ حیاتِ دنیا سے مراد ابوسفیان کا بدر اور اُحد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں خرچ کرنا ہے، یا یہودیوں کا اپنے علما اور رؤسا پر خرچ کرنا، یا سارے کفار کا خرچہ ہے، جو وہ دنیا میں بطور صدقات و خیرات کرتے ہیں، یا اہلِ ریا کا خرچ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً مِّنۡ دُوۡنِكُمۡ لَا يَاۡلُوۡنَكُمۡ خَبَالًا ؕ وَدُّوۡا مَا عَنِتُّمۡ ۚ قَدۡ بَدَتِ الۡبَغۡضَآءُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ ۖۚ وَمَا تُخۡفِىۡ صُدُوۡرُهُمۡ اَكۡبَرُ ؕ قَدۡ بَيَّنَّا لَكُمُ الۡاٰيٰتِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾ هٰۤاَنۡتُمۡ اُولَاۤءِ تُحِبُّوۡنَهُمۡ وَلَا يُحِبُّوۡنَكُمۡ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوۡكُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوۡا عَضُّوۡا عَلَيۡكُمُ الۡاَنَامِلَ مِنَ الۡغَيۡظِ ؕ قُلۡ مُوۡتُوۡا بِغَيۡظِكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۱۱۹﴾ اِنۡ تَمۡسَسۡكُمۡ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ وَاِنۡ تُصِبۡكُمۡ سَيِّئَةٌ يَّفۡرَحُوۡا بِهَا ؕ وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا لَا يَضُرُّكُمۡ كَيۡدُهُمۡ

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۷۳۸)

شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ١٢٠ۧ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم اپنے لوگوں کے سوا کسی کو دلی دوست نہ بناؤ، دوسرے لوگ تمھیں برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے، وہ چاہتے ہیں کہ تم مصیبت میں پڑو، ان کے دلوں کی دشمنی ان کے مونہوں سے ظاہر ہو چکی ہے اور وہ اپنے سینوں میں جو (بغض و عناد) چھپاتے ہیں، وہ کہیں زیادہ ہے۔ ہم نے تمھارے لیے آیتیں کھول کر بیان کی ہیں اگر تم عقل رکھتے ہو ﴿118﴾ خبردار! تم لوگ ان سے محبت رکھتے ہو، جب کہ وہ تم سے محبت نہیں رکھتے تم سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہو (جب کہ وہ ایسا نہیں کرتے) اور وہ تمھارے سامنے تو اپنے ایمان کا اقرار کرتے ہیں مگر جب تنہا ہوتے ہیں تو تم پر اپنی انگلیاں چباتے ہیں غصے کے مارے۔ (ان سے) کہیے: تم اپنے غصے ہی میں مر جاؤ، بے شک اللہ دلوں کے راز خوب جانتا ہے ﴿119﴾ اگر تمھیں کوئی بھلائی پہنچے تو وہ انھیں بری لگتی ہے اور اگر تمھیں کوئی برائی پہنچے تو وہ اس پر خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم صبر کرو اور پرہیز گاری اختیار کرو تو ان کا مکر تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ بے شک اللہ نے ان کے اعمال کو گھیر رکھا ہے ﴿120﴾

کافروں کو راز دار بنانے سے ممانعت:

یعنی مسلمانوں کو کافروں سے دوستی نہیں کرنی چاہیے، وہ ہر طرح دشمن ہیں۔ اکثر منافق بھی یہود میں سے تھے، اس لیے ان کے ذکر کے ساتھ ان کا بھی ذکر فرمایا۔ اب آگے جنگِ اُحد کی باتیں ذکر کیں کہ اس میں بھی مسلمانوں نے بعض کافروں کا کہا مان لیا تھا اور لڑائی سے پھر چلے تھے۔ منافقوں نے اپنے نفاق کی باتیں ظاہر کی تھیں، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے مومن بندوں کو اس بات سے منع کیا ہے کہ وہ منافقوں کو اپنے رازوں پر مطلع کریں اور دشمنوں کے لیے جو بندوبست اپنے دل میں سوچ رکھا ہے، اس پر ان کو آگاہی دیں۔ رہے منافق، سو وہ جہاں تک ہو سکتا ہے اپنی پوری طاقت اور قوت اہلِ اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے خرچ کرتے ہیں، ان سے جو مکر و فریب بن سکتا ہے، وہ ضرور کرتے ہیں۔ مسلمانوں پر جو تکلیف، محنت، سختی اور زخم وغیرہ کی تکلیف آتی ہے، اس سے خوش ہوتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ تم مسلمان ہو تمھیں کسی غیر دین والے کو اپنا ہم راز نہیں بنانا چاہیے۔ ''بطانہ'' اس کو کہتے ہیں، جو کسی شخص کا ہم راز اور خاص الخاص ہو۔ سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ

اللہ تعالیٰ نے کوئی رسول نہیں بھیجا اور نہ کسی کو خلیفہ بنایا، مگر اس کے ساتھ دو بطانہ تھے، ایک وہ جو بھلی بات بتاتا اور خیر کی ترغیب دیتا۔ دوسرا وہ بطانہ جو برائی سکھاتا اور اس پر آمادہ کرتا۔ معصوم وہی ہے جس کو اللہ بچائے۔[1] (رواه البخاري و النسائي وغير هما من حديث جماعة)

کسی نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کہا تھا، یہاں اہلِ حیرہ سے ایک لڑکا ہے، جو حافظ کاتب ہے، آپ اس کو اپنا منشی مقرر کر لیں۔ کہا: اگر میں ایسا کروں گا تو میں نے غیر مومنین سے ایک بطانہ بنایا۔[2] (رواه ابن أبي حاتم) اس آیت واثر میں اس بات کی دلیل ہے کہ اہلِ ذمہ کو منشی گری (حساب کتاب) کے کام میں رکھنا جائز نہیں، کیوں کہ اس میں مسلمانوں پر دراز دستی ہے اور ان کو امورِ داخلیہ پر مطلع کرنا ہے، کہیں وہ ان امور کو اہلِ حرب دشمنوں میں افشا کر دیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا وَّدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) ''دوسرے لوگ تمھیں برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے، وہ چاہتے ہیں کہ تم مصیبت میں پڑو۔''

ازہر بن راشد رحمہ اللہ نے کہا کہ لوگ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے پاس آتے تو وہ ان کو حدیث سناتے، وہ کچھ مطلب نہ سمجھتے اور امام حسن بصری رحمہ اللہ سے آکر پوچھتے، وہ اس کی تفسیر کر دیتے۔ ایک دن سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان کی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مشرکوں کی آگ سے روشنی نہ لو، انگوٹھیوں میں عربی نقش نہ کرو۔ لوگ کچھ نہ سمجھے کہ کیا مطلب ہے؟ امام حسن بصری رحمہ اللہ سے پوچھا، انھوں نے کہا: نقشِ عربی سے مراد اپنی انگوٹھیوں پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ لکھو۔ روشنی نہ لینے کا یہ مطلب ہے کہ تم اپنے امور میں ان سے مشورہ نہ لو۔ پھر امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: اس کی تصدیق کتاب اللہ میں ہے: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ ﴾۔[3] (رواه أبو يعلىٰ والنسائي و أحمد)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس تفسیر میں نظر ہے، حدیث کے معنی ظاہر ہیں، یعنی مہر پر نقش بخطِ عربی نہ کرو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر کے نقش کے مشابہ ہو جائے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر پر محمد رسول اللہ بخطِ عربی منقوش تھا۔ اسی لیے صحیح حدیث میں مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع کیا کہ کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش پر نقش کرے۔[4] روشنی لینے کے یہ معنی ہیں کہ تم ان کے گھروں کے پاس نہ رہو کہ تم اور وہ ایک شہر میں بسو، بلکہ ان سے دور ہو جاؤ اور ان کے شہروں سے ہجرت کر جاؤ۔ اسی لیے ابو داود نے روایت کیا ہے: «لَا تَتَرَاءٰى نَارَاهُمَا»[5] ''ان کی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٣٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٠٢)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٧٤٣) اس کی سند صحیح ہے۔

[3] سنن النسائي، رقم الحديث (٥٢٠٩) مسند أحمد (٣/ ٩٩) تفسير الطبري (٧/ ١٤٢) اس کی سند میں ''ازہر بن راشد'' مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٧٨١)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٥٣٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٩٢)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٤٥) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ (إرواء الغليل: ٥/ ٢٩۔ ٣٠)

آگ نظر نہ آئے۔'' دوسری حدیث میں مروی ہے:((مَنْ جَامَعَ الْمُشْرِكَ أَوْ سَكَنَ مَعَهُ فَهُوَ مِثْلُهُ))[1] ''جو مشرک کے ساتھ رہا، وہ اسی کی طرح ہے۔'' پس اس حدیث کو حسن رحمہ اللہ کے قول کے مطابق سمجھنا اور آیت کو اس پر بطورِ استشہاد لانا محلِ نظر ہے۔[2]

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان کی دشمنی ان کے چہروں اور زبان سے ظاہر ہوتی ہے اور جو دشمنی ان کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ہے، وہ الگ ہے اور عقل مند پر پوشیدہ نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے تمھیں بتا دیا ہے، اگر تم میں کچھ عقل ہے۔ پھر فرمایا: اے مومنو! تم منافقوں کو دوست رکھتے ہو، اس لیے کہ وہ تمھارے سامنے ایمان ظاہر کرتے ہیں، حالاں کہ وہ تمھیں نہ باطن میں دوست رکھتے ہیں نہ ظاہر میں ساری کتاب پر ایمان رکھتے ہو۔ اس کتاب کی کسی ایک بات میں بھی تمھیں کچھ شک وشبہہ نہیں ہے، وہ اس کی ہر شے پر شک وشبہہ اور حیرت رکھتے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: کتاب سے مراد تمھاری کتاب اور اُن کی کتاب اور ہر گذشتہ کتاب ہے، لہٰذا وہ تمھاری کتاب کو نہیں مانتے، اس کا انکار کرتے ہیں تو تم پر بھی لازم ہے کہ تم ان کے دشمن بنے رہو۔[3]

کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کی عداوت:

''انامل'' انگلیوں کے کناروں کو کہتے ہیں۔ یہ امام قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امام سدی اور ربیع رحمہم اللہ نے کہا: انامل انگلیوں کو کہتے ہیں۔[4] منافقوں کا یہ حال ہے کہ ظاہر میں مومنوں سے ایمان اور دوستی ظاہر کرتے ہیں، باطن میں ہر طرح سے برخلاف ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کہا کہ جب وہ اکیلے ہوتے ہیں تو غصے کے مارے اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں۔ یہ گویا نہایت درجے کا غصہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کہا: تم اپنے غصے میں مر جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں پر اپنی نعمت کو پورا کرنا ہے۔ اپنے دین کو کامل فرمانا اور اپنی بات کو اوپر کرنا منظور ہے، اللہ کو تمھارے سارے بھید، حسد وبغض اور کینے کی خبر ہے، وہ تمھیں دنیا میں یہ جزا دے گا کہ سب کچھ تمھاری اُمیدوں کے خلاف ہوگا، آخرت میں تمھیں عذاب دے گا اور تم نار میں جاؤ گے، وہاں سے نکلنا نہیں ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب مومنوں کو انصار کی طرف سے آسانی، مدد، تائید اور مددگار پہنچتے ہیں تو ان کو برا لگتا ہے اور جب کسی طرح کی تکلیف وقحط سالی اور دشمن کا غلبہ دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو یہ خطاب کیا کہ تم صبر وتقویٰ اختیار کرو، ان کا مکر تم پر نہیں چلے گا، تم شرارتیوں کے شر سے اور فاسقوں فاجروں کے مکر وفریب سے سلامت رہو گے، تمھارا بھروسا اللہ پر ہے، تمھارے سارے دشمن اس کے گھیرے میں ہیں۔ ان کا کیا اختیار اور قوت ہے، ہوتا تو وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے، جو کچھ وجود میں آتا ہے، وہ

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٨٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٣٣٠)
[2] تفسير ابن كثير (١/ ٥١٩)
[3] تفسير الطبري (٧/ ١٤٩)
[4] تفسير الطبري (٧/ ١٥٣۔ ١٥٤)

اسی کی تقدیر اور مشیت سے واقع ہوتا ہے۔ جس نے اللہ پر بھروسا کیا، اللہ اس کو کفایت کرتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اُحد کا قصہ ذکر کیا۔ اس معرکے میں اہلِ ایمان کا امتحان لیا، مومنین اور منافقین میں تمیز کر دی۔ فرمایا:

وَ اِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۱۲۱ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۲۲ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۲۳

اور (اے نبی! یاد کریں) جب آپ صبح سویرے اپنے گھر والوں سے روانہ ہوئے اور مومنوں کو جنگِ (احد) کے لیے مورچوں پر بٹھا رہے تھے اور اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے (121) جب تمھارے دو گروہوں نے کم ہمتی دکھانے کا ارادہ کیا اور اللہ ان کا دوست تھا، اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے (122) اور اللہ نے بدر میں عین اس وقت تمھاری مدد کی جب تم کمزور تھے۔ پس تم اللہ سے ڈرو، تاکہ تمھیں شکر ادا کرنے کی توفیق ہو (123)

غزوۂ اُحد کا بیان اور پسِ منظر:

جب نبی اکرم ﷺ مکہ سے مدینہ آئے، اس کے ڈیڑھ برس بعد جنگِ بدر ہوئی، مکہ والوں پر اللہ نے مسلمانوں کو فتح دی، ستر آدمی کافروں کے مارے گئے اور ستر قیدی ہوئے۔ اگلے سال کافر جمع ہو کر مدینہ پر چڑھ آئے، نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں سے مشورہ کیا، اکثر کہنے لگے: ہم شہر میں لڑیں گے، نبی اکرم ﷺ کی مرضی بھی یہی تھی۔ بعض کہنے لگے: یہ عار ہے، بلکہ میدان میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہو کر لڑیں گے، آخر یہی مشورہ منظور ہوا۔ جب نبی کریم ﷺ شہر سے باہر چلے تو عبداللہ بن ابی منافق، جو مدینہ کا رہنے والا تھا، وہ بھی شریکِ جنگ ہوا۔ لیکن ناراض ہو کر واپس چلا گیا کہ ہماری بات پر عمل نہ کیا۔ اس کے بہکانے سے انصار کے دو قبیلے بھی واپس جانے لگے، آخر ان کے سردار عوام کو سمجھا کر لے آئے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو تقویت دیتا ہے کہ اللہ پر توکل کرنا چاہیے، حکم کی اطاعت میں کسی قسم کا اندیشہ نہیں ہے۔ یہ عبارت موضح قرآن کی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس آیت سے واقعہ یومِ اُحد مراد ہے۔ یہی سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام حسن، قتادہ، سدی اور جمہور کا قول ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا کہ یوم الاحزاب مراد ہے۔ اسی کو ابن جریر نے بھی روایت کیا ہے،[1] مگر یہ قول غریب ہے، جو لائقِ اعتماد نہیں۔

---

(1) تفسير الطبري (٧/ ١٦٠۔ ١٦١)

جنگِ اُحد کی تاریخ:

یہ واقعہ ہفتے کے دن شوال کے مہینے میں تین ہجری میں ہوا۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: شوال سے گیارہ راتیں گزری تھیں۔[1] امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: ہفتے کے دن نصف شوال میں ہوا تھا۔[2] واللہ أعلم.

غزوۂ اُحد کے اسباب:

بدر کے دن مشرکین کے اشراف مارے گئے تھے، ابوسفیان کا قافلۂ تجارت بچ گیا تھا۔ مقتولین کے بیٹوں اور رؤسا نے ابوسفیان سے کہا کہ تم اس مال کو محمد ﷺ کے ساتھ جنگ کے لیے رہنے دو۔ انھوں نے اس کو اسی کام میں خرچ کیا۔ جماعتیں اور قبیلے جمع کر کے تقریباً تین ہزار لوگ آ دھمکے اور اُحد کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ اُحد مدینہ کے سامنے ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے جمعہ کی نماز پڑھی، پھر بنی نجار کے ایک شخص کی نمازِ جنازہ ادا کی، اس کا نام مالک بن عمرو رضی اللہ عنہ تھا۔

صحابہ سے مشورہ:

لوگوں سے مشورہ لیا کہ ہم باہر نکل کر لڑیں یا شہر میں رہیں؟ عبداللہ بن ابی نے کہا: شہر میں رہو، اگر وہ ٹھہرے رہے تو بُری مجلس میں ٹھہرے اور اگر شہر میں آئے تو مردان کے منہ پر لڑیں گے، عورتیں اور بچے ان پر پتھر برسائیں گے۔ اگر پھر کر چلے گئے تو نامراد پھریں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو بدر میں حاضر نہیں ہوئے تھے، انھوں نے یہ صلاح دی کہ باہر نکل کر لڑنا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ اپنا لباسِ جنگ پہن کر باہر نکلے تو بعض کو ندامت ہوئی کہ شاید ہماری بات نبی کریم ﷺ کو پسند نہیں آئی تو کہا: اگر آپ چاہیں تو ہم ٹھہر جاتے ہیں، باہر نہ نکلیں۔ فرمایا: جب نبی نے اپنا سامانِ جنگ پہن لیا تو اب پھرنا درست نہیں ہے، جب تک کہ اللہ کچھ حکم نہ کرے، پھر نبی کریم ﷺ ایک ہزار صحابہ کو اپنے ساتھ لے کر نکلے۔

منافقوں کی علاحدگی:

جب مقامِ شوط میں پہنچے تو عبداللہ بن ابی ایک تہائی لشکر لے کر پھرنے کے لیے کھڑا ہوگیا، کیوں کہ اس کی بات نہیں مانی گئی تھی۔ وہ اور اس کے ساتھی کہنے لگے کہ اگر ہمیں علم ہو کہ آج لڑائی ہوگی تو تمھارے ہمراہ چلیں، مگر دیکھتے ہیں کہ تم نہیں لڑو گے۔

اُحد میں قیام، تیراندازوں کی تقرری اور صف بندی:

نبی اکرم ﷺ آگے بڑھے اور اُحد کی ایک گھاٹی عدوہ وادی میں اُترے، اپنی اور لشکر کی پشت اُحد کی طرف رکھی فرمایا کہ جب تک میں حکم نہ دوں کوئی شخص نہ لڑے اور خود سات سو اصحاب کو لے کر لڑنے کے لیے تیار ہوگئے۔ تیراندازوں پر عبداللہ بن جبیر بن عمرو بن عوف کے بھائی کو امیر مقرر کیا۔ اس دن پچاس شخص تیرانداز تھے، ان کو حکم دیا کہ گھوڑوں کو ہم

[1] دلائل النبوة للبيهقي (٣/ ٢٠١) [2] تفسير الطبري (٧/ ٣٩٩)

سے روکو۔ تمھاری طرف سے ہمارے پاس کوئی نہ آئے، تم اپنی جگہ پر رہو، خواہ ہم جیتیں یا ہاریں یا پرندے ہم کو اُچک لے جائیں، مگر تم اپنی جگہ سے نہ ہلنا۔ نبی کریم ﷺ نے خود زرہ پہنی، عبدالدار کے بھائی مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں علم دیا، پھر بعض لڑکوں کو اجازت دی، بعض کو روک دیا، وہ دو برس بعد خندق کے دن لڑے۔

قریش کا لشکر:

اُدھر قریش تیار ہوئے، وہ تین ہزار آدمی تھے، ان میں دو سو گھوڑے تھے، ان کو الگ الگ جمایا، میمنہ کی طرف خالد بن ولید کو، میسرہ پر عکرمہ بن ابی جہل کو مقرر کیا، فوج کا نشان بنی عبدالدار کے ہاتھ میں دیا، پھر لڑائی شروع ہوئی۔ لڑائی کا تفصیلی بیان اپنی اپنی جگہ پر متعلقہ آیات کے تحت۔ إن شاء اللّٰہ۔ آئے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو نے گھر سے نکل کر مومنوں کو جا بجا مقرر کیا، بعض کو میمنہ پر اور بعض کو میسرہ پر مقرر کیا۔

ایک سوال اور اس کا جواب:

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا: اس جگہ یہ سوال ہے کہ نبی کریم ﷺ بدر کے دن نمازِ جمعہ کے بعد نکلے تھے اور اللہ پاک نے فجر کے وقت نکلنا فرمایا ہے۔[1] اس کا جواب یہ ہے کہ ہفتے کی صبح کو اول وقت لشکر کے لیے جگہ مقرر کی۔ بخاری میں ہے کہ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ آیت: ﴿ اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ ﴾ ہمارے حق میں اُتری ہے، ہم دو گروہ تھے: بنو حارثہ و بنو سلمہ۔ ہم اس بات کو نہیں چاہتے کہ یہ آیت نہ اترتی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ﴾[2] یعنی اللہ ان کا دوست ہے۔ (رواه مسلم، أيضاً) سلف کی ایک جماعت کا یہی قول ہے کہ ان سے بنو حارث اور بنو سلمہ مراد ہیں۔

بدر کی مدد کا ذکر:

پھر اللہ تعالیٰ نے بدر کی مدد کا قصہ ذکر کیا کہ دیکھو اس دن تمھاری کیسی مدد کی گئی تھی۔ بدر کی لڑائی جمعہ کے دن سترہویں رمضان ۲ ہجری کو ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس دن اسلام اور اہلِ اسلام کو غلبہ دیا اور شرک کو دبا دیا۔ شرک کی جگہ کو ویران کر دیا، حالاں کہ اس دن مسلمان بہت تھوڑے تھے۔ تین سو تیرہ آدمی تھے، دو سوار ستر اونٹ تھے، باقی پیدل تھے۔ سامان بھی ضرورت کے مطابق ساتھ نہیں تھا۔ دشمن نو سو سے ہزار تک تھے، لباسِ جنگ پہنے ہوئے ہتھیار لگائے ہوئے، ہر طرح کا سامان موجود، زر و زیور زیادہ، اس کے ساتھ اللہ نے اپنے رسول کو عزت بخشی، اپنی وحی کو غالب کر دیا۔ نبی اکرم ﷺ اور اصحاب کو سرخرو کیا، شیطان اور اس کی قوم کو ذلیل و خوار کیا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے عبادِ مومنین اور حزبِ متقین پر اس دن کا احسان رکھا، تا کہ وہ جان لیں کہ مدد اللہ کی طرف سے آتی ہے، تعداد کی کثرت پر موقوف نہیں ہے۔

---

[1] تفسير الطبري (٧/ ١٦١) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٨٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٠٥)

دوسری آیت میں فرمایا: ﴿ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۞ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۞ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [التوبة: ۲۵۔ ۲۷] ’’اور حنین کے دن (بھی) جب کہ تمھاری کثرت نے تمھیں خوش فہمی میں ڈال دیا تھا، تو وہ تمھارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین فراخی کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر پلٹے۔ پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل کی اور اس نے ایسے لشکر اتارے جنھیں تم نے نہیں دیکھا اور جن لوگوں نے کفر کیا انھیں عذاب دیا اور کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اس کے بعد اللہ جس پر چاہے گا مہربانی فرمائے گا اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔‘‘ [1]

فتح البیان میں ہے کہ غزوۂ اُحد میں ساٹھ آیتیں اُتری ہیں، جن میں اس لڑائی کا حال ہے۔ ’’هَمَّ‘‘ سے اس جگہ مراد حدیثِ نفس ہے، اللہ دل کے خطرے (خیال) پر نہیں پکڑتا۔ ’’فشل‘‘ جبن اور بزدلی کو کہتے ہیں۔ ان کے دل میں باہر نکلنے کے بعد یہ خطرہ عبداللہ بن ابی کے پھر جانے کے بعد پیدا ہوا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو تھام لیا، وہ نہ پھرے اور لڑنے پر جم گئے ؎

تا سرندہم پا نہ کشم از سر کویت   نامردی و مردی قدمی فاصلہ دارد

’’جب تک میرا سر نہ کٹ جائے، تیری گلی سے پیچھے نہیں ہٹوں گا، بزدلی اور بہادری میں ایک قدم ہی کا تو فاصلہ ہے۔‘‘

بدر ایک جگہ کا نام ہے، جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ہے یا جس جگہ وہ واقعہ ہوا تھا، وہاں کے پانی کا نام بدر ہے، اس کا قصہ سورت انفال میں آئے گا۔ [2]

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ۝۱۲۴ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ۝۱۲۵ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۭ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝۱۲۶ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۵۲۰۔ ۵۲۲)
[2] فتح البیان (۲/ ۳۲۳۔ ۳۲٤)

الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾

(اے نبی!) جب آپ مومنوں سے کہہ رہے تھے: کیا تمھارے لیے کافی نہ ہوگا کہ اللہ آسمان سے تین ہزار فرشتے اُتار کر تمھاری مدد کرے؟ ﴿124﴾ کیوں نہیں! اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور دشمن تم پر فوراً چڑھ آئے تو اسی لمحے تمھارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا جن کے (خاص) نشان لگے ہوں گے ﴿125﴾ اور اللہ نے اسے تمھارے لیے خوش خبری بنا دیا، تاکہ اس سے تمھارے دلوں کو تسلی ہو۔ اور مدد تو اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے جو بہت زبردست، نہایت حکمت والا ہے ﴿126﴾ اللہ کا مقصد یہ تھا کہ وہ کافروں کے ایک گروہ کو ہلاک کر دے یا انھیں ذلیل کر دے، پھر وہ نامراد ہو کر لوٹ جائیں ﴿127﴾ (اے نبی!) آپ کا اس معاملے میں کچھ اختیار نہیں، اللہ چاہے تو ان کی توبہ قبول کرے، چاہے تو انھیں عذاب دے، کیوں کہ وہ ظالم ہیں ﴿128﴾ اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اللہ ہی کا ہے، وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے، اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے ﴿129﴾

فرشتوں کے ساتھ مدد:

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر ﷺ کو نصیحت فرمائی کہ بندے کو اختیار نہیں، اللہ جو چاہے سو کرے، اگرچہ کافر تمھارے دشمن ہیں اور ظلم پر ہیں، لیکن چاہے ان کو ہدایت کرے، چاہے عذاب کرے، اپنی طرف سے بددعا نہ کرو۔ مفسرین رحمہم اللہ کا اختلاف ہے کہ یہ وعدہ بدر کے دن تھا یا اُحد کے دن۔ امام حسن بصری، عامر شعبی اور ربیع رحمہم اللہ وغیرہم کا قول یہ ہے کہ بدر کے دن تھا۔ اسی کو ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی اختیار کیا ہے۔ امام شعبی رحمہ اللہ نے کہا: بدر کے دن مسلمانوں کو یہ خبر لگی کہ کرز بن جابر مشرکوں کی مدد کرتا ہے، ان پر یہ بات شاق گزری۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ﴿مُسَوِّمِيْنَ﴾ تک اتاری۔ کرز کو شکست ہوئی، وہ مشرکوں کی مدد نہ کر سکا، پھر مسلمانوں کی مدد پانچ ہزار فرشتوں سے ہوئی۔ سیدنا ربیع بن انس رضی اللہ عنہ نے کہا: اول اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار فرشتے مسلمین کی مدد کے لیے بھیجے، پھر وہ تین ہزار ہو گئے، پھر پانچ ہزار۔[1]

[1] تفسير الطبري (٧/ ١٧٣) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٧٥٢) تفسير ابن كثير (١/ ٥٢٢)

اس آیت میں اور قصۂ بدر کی آیت: ﴿ اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىِٕكَةِ مُرْدِفِيْنَ ﴾ [الأنفال: ۹] ''(یاد کرو) جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے، تو اس نے تمھاری فریاد قبول کر لی (اور کہا) کہ بے شک میں ایک دوسرے کے پیچھے آنے والے ایک ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کروں گا۔'' میں اس طرح تطبیق ہے کہ لفظ ﴿ مُرْدِفِيْنَ ﴾ [الأنفال: ۹] سے معلوم ہوا کہ ایک ہزار کے پیچھے ایک ہزار فرشتے تھے۔ یہ سیاق سورت آلِ عمران کے سیاق کی مثل ہے۔ ظاہر یہی ہے کہ یہ ماجرا بدر کے دن کا ہے، جس طرح مشہور ہے کہ فرشتوں کا لڑنا بدر کے دن تھا۔

امام سعید بن ابی عروبہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بدر کے دن مسلمانوں کی پانچ ہزار فرشتوں سے مدد کی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ وعدہ اُحد کے دن ہوا۔ امام مجاہد، عکرمہ، ضحاک، زہری اور موسیٰ بن عقبہ رحمہم اللہ وغیرہم اسی کے قائل ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس دن کچھ مدد نہیں آئی، کیوں کہ مسلمانوں نے شکست کھائی۔ امام حسن، قتادہ، ربیع اور سدی رحمہم اللہ نے کہا: ﴿ مِّنْ فَوْرِهِمْ ﴾ کے معنی ہیں: ''من وجههم'' ''ان کے سامنے سے'' امام مجاہد، عکرمہ و ابو صالح نے کہا: ''مِنْ غَضَبِهِمْ'' ''ان کے غضب سے'' یہی قول امام ضحاک رحمہ اللہ کا بھی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ''مِنْ سَفَرِهِمْ'' ''ان کے سفر سے'' یہ سب معانی قریب قریب ہیں۔ سب کا مطلب ایک ہے۔ ''مُسَوِّمِيْنَ'' کے معنی ''مُعْلَمِيْنَ بِالسِّيْمَاءِ'' ہیں۔ یعنی وردی پہنے ہوئے۔[1]

فرشتوں کی وردی:

علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: بدر کے دن فرشتے سفید پشمینہ پہنے ہوئے تھے، ان کے گھوڑوں کے ماتھے میں بھی یہی علامت تھی۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ان کا بانا سرخ تھا۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فرشتے صوف پہنے آئے تو ان کو دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اپنے اور اپنے گھوڑں کی وہی شکل بنائی اور صوف لپیٹا۔[3] امام قتادہ اور عکرمہ رحمہما اللہ نے کہا کہ لڑائی کا بانا پہن کر آئے۔ امام مکحول رحمہ اللہ نے کہا: عمامے باندھے ہوئے آئے۔[4] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ بدر کے دن فرشتوں کی علامت سیاہ رنگ کی دستار تھی۔ حنین کے دن سرخ یا سفید دستار تھی، جس کو پسِ پشت چھوڑا تھا۔ دوسرا لفظ یہ ہے کہ نہیں لڑے فرشتے مگر بدر کے دن اور وہ بطور عدد و مدد آئے تھے۔[5] یحییٰ بن عباد رحمہ اللہ نے کہا کہ بدر کے دن سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ زرد عمامہ باندھے ہوئے تھے، فرشتے بھی زرد دستار باندھے ہوئے آئے تھے۔[6]

---

(1) تفسير ابن أبي حاتم (۳/ ۷۵۳_ ۷۵٤) تفسير ابن كثير (۱/ ۵۲۳)

(2) تفسير ابن أبي حاتم (۳/ ۷۵٤)

(3) تفسير ابن أبي حاتم (۳/ ۷۵٤) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

(4) تفسير ابن أبي حاتم (۳/ ۷۵۵)

(5) المعجم الكبير (۱۱/ ۱۹۳، ۳۸۹) ''المعجم الكبير'' میں [یا سفید دستار تھی] یہ الفاظ مروی نہیں ہیں۔

(6) تفسير ابن أبي حاتم (۳/ ۷۵۵)

اطمینانِ قلب کے لیے فرشتوں کا آنا:

اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بشارت کے لیے اور دلوں کو خوش کرنے کے لیے اور اطمینانِ قلب کے لیے بھیجا تھا، ورنہ مدد تو اللہ کی طرف سے ہے، وہ چاہے تو اپنے دشمنوں کو یوں ہی غارت کر دے، اس کی کچھ ضرورت نہیں کہ تم لڑو یا فرشتے آئیں۔ جس طرح مومنوں کو جنگ کا حکم دے کر فرمایا ہے: ﴿ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ ۝ ﴾ [محمد: ٤۔ ٦] ”اور اگر اللہ چاہتا (تو خود ہی) ان سے بدلہ لے لیتا، لیکن (اس نے تمھیں حکم دیا ہے) تاکہ وہ تمھیں ایک دوسرے سے آزمائے، اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل (شہید) کیے گئے، تو اللہ ان کے اعمال ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ وہ جلد ان کی راہنمائی کرے گا اور اُن کے حال کی اصلاح کرے گا۔ اور وہ انھیں (اس) جنت میں داخل کرے گا جس کی ان کو خوب پہچان کروا چکا ہے۔“ پھر اس جگہ یہ فرمایا کہ فرشتوں کا آنا بشارت اور اطمینان کے لیے ہوا۔ اللہ عزیز اور حکیم ہے، تم کو جو جہاد اور جنگ کا حکم دیا ہے، اس میں حکمت ہے، اس لیے سارے اقسام جو کفار میں ممکن ہیں، ان کا ذکر فرمایا۔ کہا: بعض کو ہلاک کریں گے، بعض کو ذلیل کر کے نامراد پھیریں گے۔

ہدایت دینا اللہ کا کام ہے:

پھر یہ بات سنائی کہ دنیا و آخرت میں حکم صرف اسی ایک اللہ کا ہے، جس کا کوئی شریک نہیں ہے، تیرا کیا اختیار ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ﴾ [الرعد: ٤٠] ”آپ کے ذمے تو صرف پہنچا دینا ہی ہے اور ہمارے ذمے حساب لینا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [البقرۃ: ٢٧٢] ”(اے نبی!) لوگوں کو ہدایت دینا آپ کی ذمے داری نہیں، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔“ اور فرمایا: ﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ ﴾ [القصص: ٥٦] ”(اے نبی!) بے شک جسے آپ چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے، بلکہ اللہ ہی جسے چاہے ہدایت دیتا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو خوب جانتا ہے۔“

کافروں کے خلاف بد دعا اور آیت کا شانِ نزول:

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، جب نمازِ فجر کی دوسری رکعت میں رکوع سے سر اٹھاتے تو فرماتے: «اَللّٰهُمَّ الْعَنْ فُلَانًا وَفُلَانًا» یہ دعا ”سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ“ کہنے کے بعد کہتے۔

اس پر یہ آیت اتری: ﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)۔[1] (رواه البخاري والنسائي) دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آپ ﷺ یوں کہتے: «اَللّٰهُمَّ الْعَنِ الْحَارِثَ بْنَ هِشَامٍ، اَللّٰهُمَّ الْعَنْ سُهَيْلَ بْنَ عَمْرٍو، اَللّٰهُمَّ الْعَنْ صَفْوَانَ بْنَ أُمَيَّةَ» ''اے اللہ! حارث بن ہشام، سہیل بن عمرو اور صفوان بن امیہ پر لعنت کر۔'' اس پر یہ آیت اتری۔[2] (رواه أحمد عن ابن عمر) عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ چار آدمیوں پر بددعا کرتے تھے۔ اس پر آیت زیرِ تفسیر اتری۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام کی ہدایت فرمائی۔[3] (رواه أحمد)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم ﷺ کچھ مشرکوں کے نام لے کر ان پر بددعا کرتے تھے، یہاں تک کہ یہ آیت آئی۔[4] (رواه البخاري) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ جب کسی پر بددعا کرتے یا کسی کے لیے دعا کرتے تو رکوع کے بعد قنوت پڑھتے، کبھی ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهُ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ'' کے بعد یوں کہتے: «اَللّٰهُمَّ انْجِ الْوَلِيْدَ بْنَ الْوَلِيْدِ وَسَلَمَةَ بْنَ هِشَامٍ وَعَيَّاشَ بْنَ رَبِيْعَةَ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ، اَللّٰهُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلٰى مُضَرَ وَاجْعَلْهَا عَلَيْهِمْ سِنِيْنَ كَسِنِيْ يُوْسُفَ» ''اے اللہ! ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام، عیاش بن ربیعہ اور کمزور مومنوں کو نجات دے۔ اے اللہ! مضر پر اپنی پکڑ سخت کر اور ان پر ایسا قحط نازل کر، جیسا قومِ یوسف پر کیا تھا'' اس دعا کو جہر (اونچی آواز سے) کہتے، کبھی نمازِ فجر میں بعض زندہ لوگوں پر نام بہ نام بددعا کرتے کہ اے اللہ! فلاں فلاں پر لعنت کر۔ یہاں تک کہ یہ آیت اتری۔[5] (رواه البخاري)

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: نبی اکرم ﷺ اُحد کے دن زخمی ہوگئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: « كَيْفَ يُفْلِحُ قَوْمٌ شَجُّوْا نَبِيَّهُمْ » ''وہ قوم کیسے نجات پائے گی، جس نے اپنے نبی کو زخمی کر دیا'' اس پر آیت زیرِ تفسیر اُتری۔[6] (رواه البخاري) سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ اُحد کے دن نبی اکرم ﷺ کے دانت ٹوٹے اور سر کو چوٹ لگی، یہاں تک کہ روئے مبارک پر خون بہا، فرمایا: کیوں کر فلاح پائے گی وہ قوم، جس نے اپنے نبی سے ایسا کام کیا اور وہ ان کو اللہ عزوجل کی طرف بلاتا ہے۔ اس پر آیت زیرِ تفسیر نازل ہوئی۔[7] (رواه أحمد و مسلم) امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ اُحد کے دن زخمی ہوئے اور آپ ﷺ کے دانت ٹوٹے، ابرو میں فرق آ گیا، آپ ﷺ گر پڑے، زرہ پہنے ہوئے تھے، خون بہہ رہا تھا، سالم مولی ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا، اس نے اُٹھا کر بٹھایا،

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٤٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٢/ ٢٠٣)

② مسند أحمد (٢/ ٩٣) اس روایت کی سند میں ''عمر بن حمزہ'' ضعیف راوی ہے۔ البتہ گزشتہ روایت اس کی تائید کرتی ہے۔

③ مسند أحمد (٢/ ١٠٤) اس کی سند حسن ہے۔

④ ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت صحیح بخاری کے بجائے مسند احمد میں مروی ہیں۔ دیکھیں: مسند أحمد (٢/ ١١٨)

⑤ صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٨٤)

⑥ صحيح البخاري (٤/ ١٤٩٣) ⑦ صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٩١) مسند أحمد (٣/ ٩٩)

چہرہ مبارک سے خون پونچھا، جب افاقہ ہوا، فرمایا: « كَيْفَ بِقَوْمٍ فَعَلُوْا هٰذَا بِنَبِيِّهِمْ وَهُوَ يَدْعُوْهُمْ إِلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ » ''اس قوم کا کیا ہوگا، جس نے اپنے نبی کے ساتھ یہ کیا جوان کو اللہ کی طرف بلاتا ہے؟'' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔[1] (رواه ابن جرير و عبد الرزاق)

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے، سب اسی کی ملک ہے، سب اس کے بندے ہیں، جسے چاہے بخشے، جسے چاہے مارے دھاڑے، کسی کی کیا مجال ہے کہ اس کے حکم کو روکے یا اس سے پوچھ سکے، ہاں ان سے سوال ہوگا۔ اللہ غفور رحیم ہے۔

فتح البیان میں ہے کہ ملائکہ کی مدد بدر کے دن ہوئی تھی۔ کسی نے کہا ہے کہ اُحد کے دن ہوئی تھی۔ راجح پہلا قول ہے۔ تسویم کے بارے میں سلف کا اختلاف ہے۔ کسی نے کہا: سفید عمامے تھے۔ کسی نے کہا: سرخ۔ کسی نے کہا: زرد۔ کسی نے کہا: سبز۔ اس بیان میں کچھ بڑا فائدہ نہیں ہے۔ مطلب اتنا ہے کہ فرشتے بطورِ مدد آئے تھے۔ جبریل علیہ السلام چاہتے تو ایک پر سے سارے کفار کو غارت کر دیتے، مگر اللہ نے صورت و عادت کی رعایت فرمائی، ملائکہ کو بطور مدد و عدد بھیجا، جس طرح ایک لشکر کی کمک کو دوسرا لشکر آتا ہے، تاکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو فضیلت ہو۔ یہ بات امام سبکی رحمہ اللہ نے کہی ہے۔ والله أعلم.[2]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا
مُّضٰعَفَةً ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝١٣٠ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ
اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝١٣١ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝١٣٢
وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا
السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝١٣٣ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ
فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ
النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝١٣٤ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً
اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ
الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ڞ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝١٣٥
اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُھُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ

[1] تفسیر الطبري (٧/ ١٩٧) تفسیر الصنعاني (١/ ١٣١) یہ روایت مرسل ہے۔
[2] فتح البیان (٢/ ٣٢٥۔ ٣٢٦)

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بڑھا چڑھا کر سود نہ کھاؤ، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو تاکہ تمھیں نجات مل سکے ﴿۱۳۰﴾ اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے ﴿۱۳۱﴾ اور اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے ﴿۱۳۲﴾ اور اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے جو پرہیز گاروں کے لیے تیار کی گئی ہے ﴿۱۳۳﴾ وہ لوگ جو خوشی اور سختی کے موقع پر (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور غصہ پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کر دینے والے ہیں۔ اور اللہ نیکو کاروں کو پسند کرتا ہے ﴿۱۳۴﴾ اور وہ لوگ جب کوئی برا کام کر بیٹھتے ہیں یا اپنے آپ پر ظلم کر گزرتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے، پھر اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو بخشتا ہے؟ اور وہ اپنے کیے پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے ﴿۱۳۵﴾ وہی لوگ ہیں جن کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے بخشش اور جنت کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ (ان باغوں) میں ہمیشہ رہیں گے اور عمل کرنے والوں کے لیے (اللہ کے ہاں) اچھے اجر ہے ﴿۱۳۶﴾

سود کی مطلقاً حرمت:

موضح قرآن میں ہے کہ اس جگہ سود کا ذکر شاید اس لیے کیا کہ اوپر جہاد میں نامردی کے بارے میں ذکر تھا اور سود کھانے سے دو وجہ سے نامردی آتی ہے: ایک یہ کہ حرام مال کھانے سے اطاعت کی توفیق کم ہوتی ہے اور بڑی اطاعت جہاد ہے۔ دوسرے یہ کہ سود لینا کمال بخل ہے، جب اپنا مال جتنا دیا تھا لے لیا، بیچ میں کسی کا کام نکلا، وہ بھی مفت نہ چھوڑا تو جس کو مال پر اتنا بخل ہو، وہ جان کب دے گا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں کو سود کے لین دین سے اور دُگنے تگنے سود کھانے سے منع کیا، جس طرح لوگ جاہلیت میں جب مدت گزر جاتی تو کہتے کہ قرض ادا کر یا سود بڑھا۔ اگر قرض دے دیتا فبہا، ورنہ ایک طرف سے مدت اور دوسری طرف سے مقدار زیادہ کرتے، ہر سال سود پر سود بڑھتا رہتا، یہاں تک کہ تھوڑا قرض بہت ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم ڈرو، شاید تمھارا بھلا ہو۔ یہاں اور وہاں۔ پھر آگ سے ڈرایا۔ پھر فرمایا کہ تم خیرات کی طرف اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کی طرف جلدی کرو، جنت ڈرنے والوں کے لیے تیار ہے، آگ کافروں کے لیے مہیا ہے۔

جنت کا عرض:

یہ کہنے سے کہ جنت کا عرض آسمانوں اور زمین کے عرض کے برابر ہے، طولِ جنت کی وسعت کے بارے میں خبر دینا ہے، جس طرح فُرُشِ جنت کی صفت کے بارے میں فرمایا ہے: ﴿ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ﴾ [الرحمن: ٥٤] ''جن کے استر دبیز ریشم کے ہوں گے۔'' یعنی جب استر ایسا ہو تو ابرا کیسا ہوگا۔ بعض نے کہا: جنت کا عرض اور طول برابر ہے، کیوں کہ جنت عرش کے نیچے ایک قبے کی طرح ہے قبہ دار اور گول چیز کا عرض اس کے طول کے برابر ہوتا ہے۔ اس دعوے کی دلیل صحیح حدیث ہے کہ جب تم اللہ سے جنت مانگو تو فردوس مانگو، وہ اعلیٰ جنت اور اوسط جنت ہے، جنت کی نہریں اسی سے نکلی ہیں، اس کی چھت رحمان کا عرش ہے۔[1]

یہ آیت سورۃ الحدید کی اس آیت کی طرح ہے: ﴿ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴾ [الحدید: ٢١] ''تم اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا عرض آسمان اور زمین کے عرض کی طرح ہے، وہ ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے، یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہے یہ دیتا ہے، اور اللہ عظیم فضل والا ہے۔'' مسند احمد میں مروی ہے کہ ہرقل نے رسول اللہ ﷺ کو لکھا: تم نے مجھ کو جنت کی طرف بلایا ہے، جس کا عرض آسمان اور زمین کے برابر ہے تو پھر نار کہاں ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سبحان اللہ! جب دن آتا ہے تو رات کہاں جاتی ہے؟ اس کو ابن جریر رحمہ اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔[2]

یہی جواب سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے یہود کو دیا تھا، جب انھوں نے کہا: "فَأَيْنَ النَّارِ؟" کہا: "أَرَأَيْتُمْ إِذَا جَاءَ النَّهَارُ أَيْنَ اللَّيْلُ وَإِذَا جَاءَ اللَّيْلُ أَيْنَ النَّهَار؟" یہود نے کہا: "لَقَدْ نَزَعْتَ مِثْلُهَا مِنَ التَّوْرَاةِ" یہی سوال ایک اہلِ کتاب نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کیا تھا، انھوں نے بھی اس کا یہی جواب دیا تھا۔[3] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: ایک آدمی نے آکر نبی اکرم ﷺ سے کہا: بھلا بتاؤ کہ جنت کا عرض تو آسمانوں اور زمین کے برابر ہے تو پھر نار کہاں ہے؟ فرمایا: تو ہی بتا جب رات آتی ہے تو ہر چیز ملتبس (پوشیدہ) ہوجاتی ہے، دن کہاں جاتا ہے؟ کہا: جہاں اللہ چاہتا ہے۔ فرمایا: اسی طرح آگ بھی وہاں ہوتی ہے، جہاں اللہ چاہتا ہے۔[4] (رواہ البزار)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٣٧)

[2] مسند أحمد (٣/ ٤٤١) تفسير الطبري (٧/ ٢٠٩) اس کی سند میں ''سعید بن ابی راشد'' مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٦٨٦)

[3] تفسير الطبري (٧/ ٢١٠۔ ٢١٢) ان دونوں کی اسناد صحیح ہے۔

[4] مسند البزار (١٦/ ٢٢٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٨٩٢)

اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ دن نکلنے سے رات کا دکھائی نہ دینا، اس بات کو لازم نہیں کرتا کہ رات کسی جگہ میں نہ ہو، گو ہم اس جگہ کو نہ جانیں۔ اسی طرح نار بھی، جہاں اللہ چاہتا ہے، وہاں ہوگی، یہ مطلب ظاہر تر ہے۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ جب دن اس عالم کو ایک طرف سے ڈھانپ لیتا ہے تو دوسرے رخ پر اس کی رات ہوتی ہے، اسی طرح جنت اعلیٰ علیین میں آسمانوں کے اوپر اور عرش کے نیچے ہے، اس کا عرض، جس طرح اللہ نے فرمایا، آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، نار ﴿ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ﴾ میں ہے، اس عرض اور وجودِ نار میں کوئی باہم تضاد نہیں ہے۔[1] واللہ أعلم.

اہلِ جنت کی صفات:

پھر اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کی صفت بیان فرمائی کہ وہ خوشی اور تکلیف میں، تنگی اور فراخی میں، خوشی اور غمی کے حالات، صحت اور بیماری؛ غرض یہ کہ ہر حالت میں خرچ کیے جاتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً ﴾ [البقرة: ٢٧٤] ''جو لوگ اپنے مال خرچ کرتے ہیں رات اور دن میں، چھپا کر اور ظاہر۔'' مطلب یہ کہ کوئی حالت ان کو اللہ کی اطاعت سے باز نہیں رکھتی۔ وہ اللہ کی مرضی میں، مخلوق کے ساتھ احسان کرنے میں، نیکی کی مختلف قسموں میں اپنا مال خرچ کرتے رہتے ہیں۔ پھر فرمایا: جب ان کو غصہ آتا ہے تو پی جاتے ہیں، جس نے ان کے ساتھ برائی کی ہوتی ہے، اسے معاف کر دیتے ہیں۔ بعض آثار میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ابن آدم! جب تجھ کو غصہ آئے تو مجھ کو یاد کر، میں تجھے یاد کروں گا، جب مجھے غصہ آئے گا، میں تجھے ہلاک ہونے والوں کے ہمراہ تجھے ہلاک نہیں کروں گا۔[2] (رواہ ابن أبي حاتم)

غصے کی مذمت:

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اپنے غضب کو روکا، اللہ تعالیٰ اس سے اپنے عذاب کو روکے گا اور جس نے اپنی زبان کو بند کیا، اللہ اس کے عیب کو چھپا دے گا اور جس نے اللہ سے معذرت کی، اللہ اس کے عذر کو قبول کرتا ہے۔ (رواہ أبو یعلیٰ في مسندہ) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث غریب ہے اور اس کی اسناد میں نظر ہے۔[3] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ پہلوان نہیں جو پچھاڑ دیتا ہے۔ پہلوان وہ ہے جو غضب کے وقت اپنے آپ کو قابو میں رکھتا ہے۔[4] (رواہ أحمد وقد رواہ الشیخان من حدیث مالك)

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٢٦، ٥٢٧) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٩٦٥)

[3] مسند أبي یعلیٰ (٧/ ٣٠٢) تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٢٧) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٢٣٦٠)

[4] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٧٦٣) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٠٩) مسند أحمد (٢/ ٢٣٦)

امام احمد کے نزدیک سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم کس کو پہلوان سمجھتے ہو؟ کہا: جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکیں۔ فرمایا: لیکن پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھتا ہے۔[1] یہ مضمون اور حدیث میں بھی مروی ہے۔ جاریہ بن قدامہ سعدی رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی نفع کی بات بتائیں اور تھوڑی سی بتائیں، شاید میں یاد رکھوں؟ فرمایا: « لَا تَغْضَبْ » یعنی غصہ نہ کیا کر۔ حارثہ نے پھر بار بار وہی کہا: تو نبی اکرم ﷺ نے ہر بار یہی جواب دیا کہ غصہ نہ کیا کرو۔[2] (رواہ أحمد) ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے وصیت کریں۔ فرمایا: غصہ نہ کیا کر۔ وہ آدمی کہتا ہے کہ جب آپ ﷺ نے یہ فرمایا تو میں نے اس فرمان میں سوچ بچار کی، دیکھا تو غضب ہر شر کا جامع ہے۔[3] (انفرد بہ أحمد)

غصے کا علاج:

سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے کہا: تم میں جب کسی کو غصہ آئے اور وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، اگر غصہ جاتا رہے تو بہتر ورنہ لیٹ جائے۔[4] (رواہ أحمد) عطیہ سعدی رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ غضب شیطان کی طرف سے ہوتا ہے، شیطان آگ سے بنا ہے، آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے، تم میں جس کسی کو غصہ آئے تو وضو کرے۔[5] (رواہ أحمد و أبو داود) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی گھونٹ اتنا محبوب نہیں جتنا غصے کا گھونٹ، جس کو بندہ پی جاتا ہے، اگر کوئی بندہ غصے کے گھونٹ کو اللہ کی خاطر پی جاتا ہے تو اللہ اس کا پیٹ ایمان سے بھر دیتا ہے۔[6] (انفرد بہ أحمد و إسنادہ حسن، لیس فیہ مجروح و متنہ حسن)

غصہ پینے کی فضیلت:

ایک صحابی مرفوعاً کہتے ہیں کہ جس نے غصہ پی لیا اور وہ اس کے جاری کرنے کی قدرت رکھتا تھا، اللہ تعالیٰ اس کے پیٹ کو امن اور ایمان سے بھر دے گا۔[7] الحدیث (رواہ أبو داود) معاذ بن انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس نے غصے کو پی لیا اور وہ اس کو جاری کر سکتا تھا تو وہ اس کو خلائق کے سامنے بلائے گا اور اس کو اختیار دے گا کہ جس حور کو چاہے لے لے۔ (رواہ أحمد و ابن ماجہ) امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث

---

① صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٠٨) مسند أحمد (١/ ٣٨٢) ② مسند أحمد (٥/ ٣٤) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٢٩)
③ مسند أحمد (٥/ ٣٧٣) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٢٩) ④ مسند أحمد (٥/ ١٥٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٩٤)
⑤ مسند أحمد (٤/ ٢٢٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٨٤) اس کی سند میں ''عروہ بن محمد'' مجہول راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٨٢)
⑥ مسند أحمد (١/ ٣٧٢) اس کی سند میں ''نوح بن جعونہ'' ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٦٧٤١)
⑦ سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٧٨) اس کی سند میں ''سوید بن وہب'' مجہول راوی ہے اور ایک راوی کا نام ذکر نہیں ہوا۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٥٨٢٢)

حسن غریب ہے۔[1] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے آیتِ باب کی تفسیر میں مرفوعاً روایت کیا ہے: «مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَهُوَ يَقْدِرُ عَلٰى إِنْفَاذِهِ مَلَأَ اللّٰهُ جَوْفَهُ أَمْنًا وَإِيْمَانًا»[2] (رواہ عبد الرزاق) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَا تَجَرَّعَ عَبْدٌ مِنْ جُرْعَةٍ أَفْضَلَ أَجْراً مِنْ جُرْعَةِ غَيْظٍ كَظَمَهَا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ»[3] (رواہ ابن مردویہ و ابن ماجہ) ''کسی بندے نے کوئی ایسا گھونٹ نہیں بھرا، جو اس گھونٹ سے اجر میں افضل ہو، جو بندہ اللہ کی رضا کی خاطر غصے کا گھونٹ بھرتا ہے۔'' غرض کہ آیت کا مطلب یہ ٹھہرا کہ اپنا غصہ نہیں نکالتے، بلکہ لوگوں کو اپنے شر سے باز رکھتے اور اللہ کے پاس اجر کی امید رکھتے ہیں۔

عفو و درگزر کا اجر:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فقط غصہ ہی نہیں پی جاتے، بلکہ جو ان پر ظلم کرتا ہے، اس کے قصور کو معاف کر دیتے ہیں، ان کے دل میں کسی پر خفگی باقی نہیں رہتی۔ یہ حال اکمل احوال ہے، اس لیے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ محسنین کو دوست رکھتا ہے۔ یہ حال مقاماتِ احسان سے ایک مقام ہے۔ حدیث شریف میں مروی ہے کہ تین چیزیں ہیں جن پر میں قسم کھاتا ہوں: نہیں گھٹتا مال صدقے سے، نہیں بڑھتا بندہ عفو سے مگر عزت میں، جس نے اللہ تعالیٰ کے لیے فروتنی کی اللہ اس کو بلند کر دے گا۔[4] سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کو یہ بات پسند ہو کہ اس کے گھر کی بنیاد بلند ہو اور اُس کے درجات بلند ہوں تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے ظالم کو معاف کر دے، اس کو دے جس نے اسے محروم رکھا، اس سے صلہ کرے جس نے اس سے قطع کیا۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث شرطِ شیخین پر صحیح ہے۔[5] امام ابن مردویہ رحمہ اللہ نے بھی اس کو سیدنا علی، کعب بن عجرہ، ابو ہریرہ اور اُم سلمہ رضی اللہ عنہم سے روایت کیا ہے۔ ان کے الفاظ ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں کہ قیامت کے دن ایک آواز لگانے والا آواز لگائے گا: کہاں ہیں لوگوں سے عفو و درگزر کرنے والے؟ اپنے رب کے پاس آئیں اور اپنا اجر حاصل کریں۔ ہر مسلمان مرد پر، جب اس نے عفو کیا، حق ہے کہ وہ بہشت میں جائے۔[6]

---

[1] مسند أحمد (٣/ ٤٤٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٨٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٢١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٥٢٢)

[2] تفسير الصنعاني (١/ ١٣٢) اس کی سند میں ''عبدالجلیل'' مجہول راوی ہے اور ایک راوی کا نام ذکر نہیں ہوا۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ١٩١٢)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٨٩) تفسير ابن كثير (١/ ٥٢٩) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٣٠)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٨٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٢٥)

[5] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٢٣) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ اسحاق بن یحییٰ رحمہ اللہ نے سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔ نیز ''ابوامیہ بن یعلیٰ'' ضعیف راوی ہے۔

[6] تفسير ابن كثير (١/ ٥٢٩)

توبہ کی فضیلت:

پھر اللہ پاک نے ان لوگوں کا ذکر کیا جو گناہ ہو جانے کے بعد توبہ و استغفار کرتے ہیں۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ ایک آدمی سے ایک گناہ ہوتا ہے، وہ کہتا ہے: اے میرے رب! مجھ سے گناہ ہوا تو مجھے بخش دے۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ میرے بندے نے گناہ کیا، وہ جانتا ہے کہ اس کا رب گناہ بخشتا ہے اور گناہ پر پکڑتا بھی ہے، میں نے اپنے بندے کا گناہ بخش دیا۔ پھر اس نے ایک دوسرا گناہ کیا اور کہا: اے رب! مجھ سے قصور ہوا تو اسے بخش دے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے کو معلوم ہے کہ اس کا ایک رب ہے، جو گناہ بخشتا ہے اور گناہ پر اس کو پکڑتا بھی ہے، میں نے اپنے بندے کا وہ گناہ بخش دیا۔ پھر اس سے ایک تیسرا گناہ ہوا تو اس نے کہا: اے رب! میں نے گناہ کیا تو بخش دے۔ اللہ عزوجل کہتا ہے کہ میرے بندے کو معلوم ہے کہ اس کا ایک رب ہے، جو گناہ بخشتا ہے، گناہ پر مواخذہ کرتا ہے، تم گواہ رہو، میں نے وہ گناہ اپنے بندے کو بخش دیا۔ اب وہ جو چاہے سو کرے۔[1] (أخرجه أحمد وأخرجاه في الصحيحين بنحوه)

معلوم ہوا کہ جس گناہ کے بعد بندہ توبہ کرتا رہتا ہے، وہ گناہ بخش دیا جاتا ہے، کثرتِ گناہ سے بندہ مایوس نہ ہو۔ ''اب جو چاہے سو کرے'' کا مطلب یہ ہے کہ کتنے ہی گناہ کیوں نہ ہوں، توبہ کر ڈالے، اللہ بخشنے والا ہے، نا اُمید نہیں ہونا چاہیے۔ یہ مطلب نہیں کہ گناہ کرتا رہے، سچی توبہ کا قبول ہونا مقرر ہے۔ اس حدیث میں تین بار گناہ کا ہونا مذکور ہے، ان گناہوں سے مراد گناہ جدید ہیں، یعنی ایک بار گناہ ہو گیا تھا، اس سے توبہ کی تھی، پھر دوبارہ اور سہ بارہ گناہ ہو گیا، اس سے بھی توبہ کی، یہ نہیں کہ اسی گناہ کو مکرر سہ کرر کیا، کیوں کہ توبہ کر کے توڑ ڈالنا بہت برا ہے، اس سے اگلا گناہ پھر قائم ہو جاتا ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! جب ہم آپ کو دیکھتے ہیں تو ہمارے دل نرم پڑ جاتے ہیں، ہم اہلِ آخرت میں سے ہوتے ہیں اور جب ہم آپ سے جدا ہوتے ہیں، تو ہمیں دنیا اچھی لگتی ہے، عورتوں کو اور اولاد کو سونگھتے ہیں۔ فرمایا: اگر تم ہر وقت اسی حال پر رہو، جس حال پر میرے پاس رہتے ہو تو تم سے فرشتے اپنے ہاتھوں سے مصافحہ کریں، تمھارے گھروں میں آ کر تم سے ملاقات کریں اور اگر تم گناہ نہیں کرو گے تو اللہ ایک اور قوم کو لے آئے گا، جو گناہ کرے گی، تا کہ اللہ تعالیٰ ان کو بخشے۔ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم سے جنت کا حال بیان کریں کہ وہ کس چیز سے بنائی گئی ہے؟ فرمایا: ایک اینٹ سونے کی ہے، ایک اینٹ چاندی کی، گارا اس کا مشک اذفر ہے، یعنی خالص ہے، اس کی کنکریاں موتی اور یاقوت ہیں، اس کی مٹی زعفران ہے۔ جو جنت میں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٥٨) مسند أحمد (٢/ ٢٩٦)

جائے گا، وہ مزے اڑائے گا، تکلیف نہیں پائے گا، ہمیشہ رہے گا، مرے گا نہیں، نہ اس کے کپڑے پرانے ہوں گے نہ اس کی جوانی فنا ہوگی۔ تین آدمی ہیں جن کی دعا رد نہیں ہوتی: ایک امام عادل، دوسرا روزہ دار یہاں تک کہ افطار کرے، تیسرا مظلوم۔ اس کی دعا بادل کے اوپر اٹھائی جاتی ہے، اس دعا کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مجھ کو اپنی عزت کی قسم ہے، میں تیری مدد ضرور کروں گا، چاہے کچھ وقت کے بعد ہی ہو۔[1] (رواه أحمد والترمذي و ابن ماجه من وجه آخر)

توبہ کی دو رکعتیں:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے: توبہ کے وقت وضو کرنے اور دو رکعت نماز پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص سے کوئی گناہ ہو جائے اور وہ وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھے، پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہے تو اللہ اس کو بخش دیتا ہے۔[2] (وهكذا رواه علي بن المديني والحميدي و أبوبكر بن أبي شيبة و أهل السنن و ابن حبان في صحيحه والبزار والدارقطني، وقال الترمذي: هو حديث حسن)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: ہم نے اس حدیث کے طرق اور اس پر کلام کو بطورِ استقصاء مسندِ صدیق رضی اللہ عنہ میں ذکر کیا ہے۔ بالجملہ یہ حدیث حسن ہے، اس کو امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے خلیفۂ نبی سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ اس حدیث کی صحت پر امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث گواہ ہے، جس کو مسلم نے اپنی صحیح میں مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جو تم میں اچھی طرح وضو کرے، پھر کہے: «أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ» اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جاتے ہیں، جس دروازے سے چاہے داخل ہو۔[3] صحیحین میں سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح وضو کر کے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے میرے جیسا وضو کیا، پھر دو رکعتیں پڑھیں، جن میں حدیثِ نفس نہ کی تو اس کے اگلے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔[4]

استغفار کے فوائد:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث ائمہ اربعہ خلفائے راشدین کی روایت سے ثابت ہے، انھوں نے

---

① مسند أحمد (٢/ ٣٠٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٩٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٥٢) صحيح الجامع (٥٢٥٣)
② سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٠٦) مسند الحميدي (١/ ٤) مصنف ابن أبي شيبة (٢/ ١٥٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٩٥) صحيح ابن حبان (٢/ ٣٨٩) مسند البزار (١/ ٦١) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ١٦٥)
③ صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٤) ④ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٦)

اس کو سید الاولین والآخرین ﷺ سے روایت کیا ہے۔ کتاب مبین بھی اس بات پر دلیل ہے کہ گناہ سے استغفار کرنا گناہ گاروں کو نفع دیتا ہے۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) تو ابلیس رویا۔[1] (أخرجه عبدالرزاق) سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ تم پر لا الہ الا اللہ کہنا اور استغفار کرنا لازم ہے، تم ان دونوں کو کثرت سے کہا کرو، کیوں کہ ابلیس نے کہا ہے کہ میں نے لوگوں کو گناہوں سے ہلاک کیا اور لوگوں نے مجھ کو لا الہ الا اللہ اور استغفار سے ہلاک کیا۔ جب میں نے یہ حال دیکھا تو میں نے ان کو اہواء اور خواہشات سے ہلاک کیا، اب وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ کوئی اچھا کام کر رہے ہیں۔[2] (رواه أبو يعلى) اس حدیث میں عثمان بن مطر اور ان کے شیخ دونوں ضعیف ہیں۔

سیدنا ابوسعید رضی اللہ عنہ مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ ابلیس نے کہا: اے رب! مجھے تیری عزت کی قسم ہے، میں ہمیشہ بنی آدم کو پھسلاؤں گا، جب تک کہ ان کی جانیں ان کے بدنوں میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مجھے بھی اپنی عزت اور جلال کی قسم ہے، میں ہمیشہ ان کو بخشتا رہوں گا، جب تک کہ وہ مجھ سے استغفار کرتے رہیں گے۔[3] (رواه أحمد) سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایک آدمی نے آ کر کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھ سے گناہ ہو گیا ہے۔ فرمایا: جب تجھ سے کوئی گناہ ہو تو تُو اپنے رب سے استغفار کر۔ کہا: میں استغفار کرتا ہوں، پھر لوٹ کر آتا ہوں، پھر گناہ ہو جاتا ہے، فرمایا: جب تو گناہ کرے تو لوٹ کر رب سے استغفار کر، جب چوتھی بار اس نے وہی بات کہی تو فرمایا: استغفار کر اپنے رب سے، یہاں تک کہ شیطان ہی تھک جائے۔[4] (رواه أبوبكر البزار) سیدنا ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث اس وجہ سے غریب ہے، یعنی اگر گناہ بار بار صادر ہوتا ہے تو استغفار بھی بار بار کرے، استغفار نہ چھوڑے، آخر شیطان ہی تھک کر بیٹھ رہے گا، کہاں تک استغفار کے ساتھ گناہ کرائے گا۔

دیکھنا ہے مجھے ساقی تیری میخوار کی ہوش — دور کے ساتھ چلی جائے گی گردشِ چشم

اللہ پاک نے یہ فرمایا ہے کہ وہ اپنے فعل پر اڑ نہیں رہے، یعنی جب ان سے کوئی فعلِ بد ہوا تو انھوں نے فی الفور اس سے توبہ کر لی اور جلدی سے تائب ہو گئے۔ اس گناہ پر مستمر اور مصر نہ رہے (اس گناہ پر ہمیشگی اختیار نہ کی اور دوبارہ نہ کیا) اگر گناہ دوبارہ ہوا ہے تو توبہ بھی دوبارہ کرتے رہے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ

---

[1] تفسير الصنعاني (١/ ١٣٣) تفسیر الصنعانی میں یہ الفاظ سیدنا انس رضی اللہ عنہ کے بجائے ثابت بنانی رحمہ اللہ سے مروی ہیں۔ البتہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان الفاظ کی نسبت عبدالرزاق رحمہ اللہ کی طرف کرتے ہوئے سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر: ١/ ٥٣٠)

[2] مسند أبي يعلىٰ (١/ ١٢٣) اس کی سند میں ''عثمان بن مطر'' اور ''عبدالغفور'' ضعیف راوی ہیں۔ (ضعيف الجامع، رقم: ٣٧٩٥)

[3] مسند أحمد (٣/ ٢٩) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٠٤)

[4] مسند البزار (١٣/ ٣١٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه بشار بن الحكم الضبي ضعفه غير واحد وقال ابن عدي: أرجو أنه لا بأس به وبقية رجاله وثقوا" (مجمع الزوائد: ١٠/ ٣٣٢)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((مَا أَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَإِنْ عَادَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِينَ مَرَّةً)) [1] ''جس نے استغفار کیا، اس نے گناہ پر اصرار نہیں کیا، چاہے ایک دن میں ستر مرتبہ اس کی طرف لوٹا۔'' (رواه أبو يعلى و رواه أبو داود والترمذي والبزار من حديث عثمان بن واقد، وقد وثقه يحيىٰ بن معين، و شيخه أبو نصيرة الواسطي و اسمه مسلم بن عبيد، وثقه الإمام أحمد و ابن حبان، و قول علي المديني والترمذي: ليس إسناد هذا الحديث بذاك فالظاهر أنه لأجل جهالة مولىٰ أبي بكر، و لكن جهالة مثله لا تضر، لأنه تابعي كبير، و يكفيه نسبته إلى أبي بكر فهو حديث حسن والله أعلم)

یہ جو فرمایا کہ وہ جانتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کو معلوم ہے، جو توبہ کرتا ہے تو اللہ پاک اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ یہی مجاہد وعبداللہ بن عبید بن عمیر کا قول ہے، [2] جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴾ [التوبة: ١٠٤] ''کیا انھیں معلوم نہیں کہ بے شک اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے، اور وہی صدقات لیتا ہے اور یہ کہ بلاشبہ اللہ ہی بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔'' اس کے نظائر اور بہت سے ہیں۔ سیدنا ابن عمرو رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے منبر پر فرمایا: تم رحم کرو، رحم کیے جاؤ گے، تم بخشو، بخشے جاؤ گے، خرابی ہے بات بگاڑنے والوں کی، خرابی ہے ان کی جو اپنے کیے پر اَڑے ہوئے ہیں اور وہ جانتے ہیں۔ [3] (تفرد به أحمد) پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے وصف بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ جو توبہ کرنے والا اور استغفار کرنے والا اور غیر مصر (یعنی گناہوں کو بار بار نہ کرنے والا) ہے، ان کے لیے وعدۂ مغفرت اور جنت ہے۔ یہ ان کے کام کی مزدوری ہوئی، کیا خوب مزدوری ملی۔ [4] اللهم ارزقنا.

اجمالی تفسیر:

فتح البیان میں آیت زیرِ تفسیر کے تحت شروع سے آخر تک جو لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اَضْعَاف مُضَاعَفَه سے مراد سود کو سال در سال بڑھاتے اور دہراتے جانا ہے۔ اس عبارت میں مبالغہ ہے، جس سے سود کی حد درجہ ملامت نکلتی ہے۔ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ سود کھانا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ سود کو حلال سمجھنے والا کافر ہے۔ قرآن میں یہ آیت بڑی وعید والی ہے، کیوں کہ جس آگ کو اللہ نے کافروں کے لیے تیار کیا ہے، اس کی وعید مومنوں کو سنائی ہے، اگر وہ اللہ سے ڈر کر اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے باز نہ رہیں گے۔ امام واحدی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کی اُمید کو مضبوط بھی فرمایا ہے، یہ اس کی رحمت ہے، کیوں کہ آگ کفار کے واسطے تیار کی گئی ہے، مومنوں کے لیے نہیں۔ [5]

---

[1] مسند أبي يعلىٰ (١/ ١٢٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥١٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٥٩) مسند البزار (١/ ٢٠٥) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٥٠٠٤)

[2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٧٦٧)

[3] مسند أحمد (٢/ ١٦٥) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٤٨٢)

[4] تفسير ابن كثير (١/ ٥٠٣۔ ٥٣١)

[5] تفسير الخازن (١/ ٤١٨)

پھر اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم عام فرمایا، جس سے معلوم ہوا کہ ہر امر و نہی میں اللہ و رسول کی اطاعت واجب ہے۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس آیت میں ان لوگوں پر عتاب ہے، جنھوں نے اُحد کے دن رسول کی نافرمانی کی تھی۔[1] یہ جو فرمایا کہ رب کی مغفرت کی طرف جلدی کرو، اس سے مراد اسلام ہے یا توبہ یا ادائے فرائض یا تکبیر اول یا اخلاص عمل یا ہجرت یا جہاد، لیکن کسی قسم کی تخصیص کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لفظ مطلق ہے، جو سب کو شامل ہے، ساری طاعات اور اعمالِ صالحہ اس میں داخل ہیں۔ کسی نے سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا کہ جنت آسمان میں ہے یا زمین میں؟ کہا: کون سا آسمان اور زمین جنت کو سما سکتا ہے، کہا: پھر کہاں ہے؟ کہا: ساتوں آسمان کے اوپر عرش کے نیچے ہے۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: صحابہ کہتے تھے، جنت ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے اور جہنم سات زمینوں کے نیچے ہے۔ اس کہنے میں کہ جنت پرہیز گاروں کے لیے تیار کی گئی ہے اور دوزخ کافروں کے لیے، اس بات پر دلیل ہے کہ جنت اور نار دونوں آج اس وقت موجود ہیں۔[2] یہی قول حق ہے، اگرچہ معتزلہ کے خلاف ہے۔

''سَرَّاء'' سے مراد آسودگی ہے اور ''ضَرَّاء'' سے مراد محتاجی ہے یا حیات و موت یا فراخی اور شدت۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی حال کیوں نہ ہو، غنا ہو یا فقر، فرحت ہو یا اندوہ، سرور ہو یا شرور، محنت و آزمایش ہو یا راحت، بے فکری ہو یا قید، ہر حال میں اپنا مال اللہ کے راستے میں اللہ کی مرضی میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ جو اخلاق جنت میں داخلے کا سبب بنتے ہیں، ان میں پہلے اسی سخاوت کا ذکر کیا ہے، جو تمام لوگوں پر سب سے زیادہ سخت اور ناگوار ہے۔ صحیحین وغیرہما میں بہت سی احادیث انفاق کی تعریف اور بخل کی مذمت میں آئی ہیں۔

پھر غصے کو پی جانے کا ذکر فرمایا، اس بارے میں بھی بہت سی احادیث آئی ہیں، جن میں غصے کو پی جانے کا ثواب ذکر کیا ہے۔ لوگوں سے عفو کرنا عام ہے، خواہ اپنے ماتحتوں کا یا اجنبیوں کا قصور وظلم معاف کرنا۔ امام زجاج رحمہ اللہ نے کہا: مراد ممالیک (غلام) ہیں۔[3] مگر پہلا قول قوی ہے، ممالیک بھی اس میں ضرور شامل ہیں۔ لفظ ''محسنین'' بھی ہر احسان کو شامل ہے، اللہ تعالیٰ ہر محسن کا دوست دار ہے۔ لفظ ''فاحشہ'' ہر گناہ کے لیے بولا جاتا ہے، اگرچہ اس کو زیادہ تر زنا کے ساتھ خاص کیا جاتا ہے۔ اصل فحش حد سے بڑھ جانا ہے اور برے کام۔ ظلم سے مراد گناہ کرنا ہے، کوئی سا گناہ کیوں نہ ہو یا جو زنا سے کم ہے، جیسے: بوسہ لینا، معانقہ کرنا، ہاتھ سے چھونا، آنکھ سے دیکھنا۔ یا ''فاحشہ'' سے مراد کبیرہ گناہ ہے اور ظلم نفس سے صغیرہ گناہ۔ امام نخعی رحمہ اللہ نے کہا: ظلم فاحشہ ہے اور فاحشہ ظلم ہے۔[4] ذکر اللہ سے مراد یہ ہے کہ زبان سے اللہ کو یاد کیا، یا دل میں خیال کیا، یا اس کے وعدہ و وعید کو یاد کیا، یا اس کے جلال کو یاد کرکے شرم کی،

---

[1] تفسیر الطبري (۷/ ۲۰٦۔ ۲۰۷)
[2] تفسیر البغوي (۲/ ۱۰٤)
[3] تفسیر القرطبي (٤/ ۲۰۷)
[4] تفسیر الطبري (۷/ ۲۱۸)

پھر اللہ تعالیٰ سے اس گناہ کی مغفرت چاہی۔ اس جگہ استغفار کی تفسیر لفظ توبہ سے کرنا، لغوی معنی کے خلاف ہے۔

اس کہنے میں کہ اللہ کے سوا کون گناہ بخشتا ہے، یہ نکلا کہ گناہوں کی جنس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں بخش سکتا۔ یہ خصوصیت اللہ پاک ہی کو حاصل ہے، اس میں اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرنے کی ترغیب فرمائی ہے اور گناہ گاروں کو خوش کیا ہے کہ ان کو چاہیے کہ خضوع اور فروتنی کی جگہوں میں کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں اور خطاؤں کی بخشش مانگیں۔ اس جگہ اصرار سے مراد گناہ کی طرف لوٹ جانے کا عزم اور گناہ سے توبہ کر کے باز نہ رہنا ہے۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی سکوت کرتے ہیں، استغفار بجا نہیں لاتے۔[1] حالاں کہ ان کو معصیت کی قباحت معلوم ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کا رب گناہوں کو معاف کرتا ہے یا وہ گناہوں پر ڈٹے رہنے کے نقصان کو جانے ہوئے ہیں، یا جان چکے ہیں کہ اللہ کے لیے گناہوں کو معاف کر دینا، خواہ کتنے ہی زیادہ گناہ کیوں نہ ہوں کچھ بڑی بات نہیں ہے، یا ان کو معلوم ہے کہ اگر ہم استغفار کریں گے تو ہماری بخشش ہوگی، یا جانتے ہیں کہ جو توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ یہ امام مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے۔[2]

امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ جانتے ہیں کہ ترکِ گناہ بہت بہتر ہے[3] یا جانتے ہیں کہ گناہ پر پکڑ ہوگی۔ یہ سب معانی ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ قرآنِ مجید میں دو آیتیں ہیں، جن کو کوئی بندہ، جس نے گناہ کیا ہے، پڑھ کر استغفار کرتا ہے تو اس کا وہ گناہ بخش دیا جاتا ہے: ایک تو یہی آیت: ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) اور دوسری آیت: ﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ [النساء: ۱۱۰] ”اور جو شخص برا عمل کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے، پھر وہ اللہ سے بخشش مانگے تو وہ اللہ کو بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا پائے گا۔“[4]

عطاف بن خالد رحمہ اللہ کہتے ہیں: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ جب یہ آیت اتری، ابلیس نے اپنے سارے لشکر کو پکارا، اپنے سر پر خاک ڈالی، واویلا کیا، ہائے وائے مچائی، خشکی اور تری کا سارا لشکر جمع ہوا، کہا: اے ہمارے سردار! تمھیں کیا ہوا ہے؟ کہا: کتاب اللہ میں ایک آیت اُتری ہے کہ اس کے بعد کسی ایک آدمی کو کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچائے گا۔ پوچھا: کون سی آیت ہے؟ اس نے بتائی تو انھوں نے کہا: ہم بنی آدم کے لیے خواہشات کے دروازے کھول دیں گے، پھر وہ نہ توبہ کریں گے نہ استغفار، وہ یہی سمجھیں گے کہ وہ حق پر ہیں۔ ابلیس اس بات پر ان سے راضی ہوا۔[5]

---

(1) تفسير الطبري (٧/ ٢٢٤) (2) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٧٦٧) (3) اللباب في علوم الكتاب (٥/ ٥٤٦)

(4) المعجم الكبير (٩/ ٢١٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”رجاله رجال الصحيح“ (مجمع الزوائد: ٧/ ٧٠)

(5) الدر المنثور (٢/ ٣٢٦) فتح البيان (٢/ ٣٢٩۔ ٣٣٥)

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ
فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝١٣٧ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ
وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝١٣٨ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ
الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝١٣٩ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ
فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ۭ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ
النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاۗءَ ۭ وَاللّٰهُ
لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝١٤٠ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ
الْكٰفِرِيْنَ ۝١٤١ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ
الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝١٤٢ وَلَقَدْ كُنْتُمْ
تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۠ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ
وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝١٤٣ ۧ

تم سے پہلے بھی ایسے واقعات گزر چکے ہیں، چناں چہ تم زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ (نبیوں کو) جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا؟ (137) یہ (قرآن) لوگوں کے لیے وضاحت اور پرہیز گاروں کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے (138) اور تم سستی نہ کرو، اور نہ غم کھاؤ، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو (139) اگر تمھیں (احد میں) زخم لگے ہیں تو ایسے ہی زخم (بدر میں) کافروں کو بھی لگ چکے ہیں۔ ہم ان دنوں کو لوگوں کے درمیان ادل بدل کرتے رہتے ہیں۔ اور (تمھیں یہ زخم اس لیے لگے کہ) اللہ جاننا چاہتا تھا کہ کون ایمان والے ہیں؟ اور وہ تم میں سے بعض کو شہادت کا مرتبہ دینا چاہتا تھا اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا (140) اور (ایک وجہ یہ تھی کہ) اللہ ایمان والوں کو پاک صاف کر دینا اور کافروں کو مٹا دینا چاہتا تھا (141) کیا تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ تم (سیدھے) جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالاں کہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون لوگ اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور صبر کرنے والے ہیں (142) تحقیق تم جنگ سے پہلے ہی (شہادت کی) موت کی خواہش کرتے تھے، چناں چہ پس اب تم نے اسے اپنی آنکھوں سے اپنے سامنے دیکھ لیا ہے (143)

جنگِ اُحد میں ہونے والے نقصان کی حکمت کا بیان:

یعنی کافروں کا نبیوں سے مقابلہ قدیم دستور ہے۔ ہر ملک کے حالات دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ پہلے انبیا پر بھی تکلیفیں آئی ہیں، لیکن آخر جھٹلانے والے خراب ہوئے۔ جنگِ اُحد میں ستر مسلمان شہید ہوئے، اس لیے اللہ تقویت فرماتا ہے۔ پھر فرمایا: فتح شکست بدلتی چیز ہے، مسلمانوں کو شہادت کا درجہ ملنا تھا، مومن اور منافق کا پرکھنا منظور تھا اور مسلمانوں کا سدھانا مقصود تھا، اس لیے اتنی شکست ہوئی، وگرنہ اللہ کافروں سے راضی نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مومنوں کو اس وقت خطاب فرمایا ہے، جب اُحد کے دن وہ آزمایش میں گرفتار ہوئے، ان کے ستر آدمی شہید ہوگئے، یعنی وہ مصیبت کچھ تم پر نہیں پڑی، ایسا ماجرا اگلی اُمتوں پر بھی گزر چکا ہے، لیکن انجام کار انبیا کے متبع ہی غالب رہے اور ہلاکت کافروں ہی کا مقدر ہوئی۔

اسی لیے یہ فرمایا کہ ذرا زمین کی سیر تو کرو، چل پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا، کس طرح وہ خاک میں مل گئے، اب کہیں ان کا اَتا پتا باقی نہیں رہا۔ پھر فرمایا کہ اس قرآن میں سارے امور کو کھول کر بیان کیا ہے۔ پہلی اُمتوں کا معاملہ جو اُن کے دشمنوں کے ساتھ گزر چکا ہے، اس کو ذکر کیا ہے۔ پھر مسلمانوں کو ہمت دی، حوصلہ دیا، تسلی بخشی کہ تم ہرگز پست ہمتی دکھاؤ نہ کمزور بنو۔ اس تکلیف کا، جو تم پر گزری ہے، کچھ رنج و غم نہ کھاؤ، تمھی بالا رہوگے، عاقبت اور نصرت تمھارے لیے ہی ہے، جس طرح تمھیں زخم و قتل پہنچا ہے، اسی طرح تمھارے دشمنوں کو بھی پہنچ چکا ہے۔ یہ دن ہیں، ان کے ہیر پھیر میں کبھی دشمنوں کو غلبہ ہو جاتا ہے، اگرچہ انجامِ نیک تمھارے ہی لیے ہے، اس ایام کے ہیر پھیر میں کوئی حکمت ہے، ایک حکمت تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مومن منافق معلوم ہو جائیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی ہم دیکھ لیں کہ دشمنوں کے مقابلے کے وقت کون صبر کرتا ہے، کون تم میں سے شہید ہوتا ہے، اپنی جان اللہ کی راہ میں دیتا ہے، اللہ ظالموں کو نہیں چاہتا، ایمان والوں کو خالص کرنا منظور ہے کہ اگر وہ گناہ گار ہیں تو ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے اور اُن کے درجات بلند ہو جائیں۔ جتنی مصیبت آتی ہے، اتنا ہی مرتبہ بڑھتا ہے، کافروں کا مٹانا منظور ہے، جب وہ فتح پائیں گے تو باغی ہوں گے، حد سے آگے بڑھیں گے۔ یہی کام ان کی مار، ہلاکت، مٹ جانے اور فنا کا ہو جائے گا۔[1]

اہلِ ایمان کو آزمانا سنتِ الٰہی ہے:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تم خیال کرتے ہو کہ بغیر لڑے بھڑے جنت میں چلے جاؤ گے، جیسے سورت بقرہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۵۳۲)

اَلْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴾ [البقرۃ: ۲۱۴] ''(پھر) کیا تمھارا خیال ہے کہ تم یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ حالاں کہ ابھی تک تمھیں ان لوگوں کے مانند (مشکلیں) پیش نہیں آئیں جو تم سے پہلے گزرے، ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور وہ ہلا ڈالے گئے، یہاں تک کہ رسول اور وہ لوگ جو ان پر ایمان لائے تھے، کہنے لگے: اللہ کی مدد کب (آئے گی؟) آگاہ رہو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ﴾ [العنکبوت: ۱۔ ۳] ''الٓمّٓ۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ صرف یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انھیں آزمایا نہیں جائے گا۔ اور البتہ تحقیق ہم نے ان لوگوں کو آزمایا ہے جو ان سے پہلے تھے، چناں چہ اللہ ان لوگوں کو ضرور ظاہر کرے گا جنھوں نے سچ بولا، اور وہ ضرور ظاہر کرے گا ان کو جو جھوٹے ہیں۔''

اس جگہ یہ فرمایا کہ تم جنت میں نہیں جا سکتے، جب تک تمھاری آزمائش نہ ہوگی اور اللہ دیکھ نہ لے گا کہ تم میں سے کس نے اس کی راہ میں جہاد کیا اور کون دشمنوں کے مقابلے میں جما رہا۔ تم تو اس دن سے پہلے یہ تمنا کرتے تھے کہ دشمنوں سے ملاقات اور مقابلہ ہو، تمھارا جی ان پر جلتا تھا، ان سے لڑنے بھڑنے کو تیار تھے، سو تمھاری آرزو حاصل ہوئی تو اب رنج نہ کرو، خوب دل کھول کر قتال کرو اور جمے رہو۔ صحیحین میں مرفوعاً مروی ہے کہ تم دشمن سے ملنے کی تمنا نہ کرو، اللہ سے عافیت مانگو اور جب دشمن کا سامنا ہو تو صبر کرو اور مقابلے سے نہ ہٹو، جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے کے نیچے ہے۔[1] اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) تم نے نیزوں کی تیزی، تیروں کا اُلجھاؤ، لشکرِ جنگ کی صف بندی بہ خوبی دیکھ لی ہے۔

﴿ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ﴾ کا مفہوم:

فتح البیان میں ہے کہ یہ جو فرمایا کہ تم ہی بالا ہو، اس کا مطلب ابن جریج رحمہ اللہ نے یوں بیان کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے اصحاب نے اُحد کے دن گھاٹی میں شکست پائی۔ پوچھا کہ نبی اکرم ﷺ کہاں ہیں؟ فلاں شخص کدھر ہے؟ بعض نے بعض کو خبر دی کہ فلاں مارا گیا۔ یہ چرچا بھی ہوا کہ نبی اکرم ﷺ مقتول ہوئے، سب لوگ نہایت غم واندوہ میں تھے، اتنے میں خالد بن ولید مشرکین کے گھڑسوار دستے کو لے کر پہاڑ پر چڑھ گئے، کیوں کہ وہ مشرکین کی ایک طرف پر تھے۔ یہ لوگ گھاٹی کے نچلے حصے میں تھے، جب نبی اکرم ﷺ کو دیکھا تو خوش ہوئے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اے اللہ! ہم کو کچھ قوت نہیں، مگر تیری مدد کے ساتھ، اس شہر میں ان جیسا تیرا کوئی پوجنے والا نہیں تو ان کو ہلاک نہ کر۔

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۸۰٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷٤۲)

مسلمانوں میں سے تیر اندازوں کا ایک گروہ لپکا اور اوپر چڑھ کر مشرکین کے دستے پر تیر مارنے لگا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شکست دی، مسلمان پہاڑ پر چڑھ گئے۔ ﴿ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ ﴾ کا یہ مطلب ہے۔[1] امام ضحاک رحمہ اللہ نے کہا ہے: یعنی تم ہی غالب رہو گے۔[2]

دن پھرتے رہتے ہیں:

ایام سے مراد ایامِ حرب ہیں، جو پہلی اُمتوں میں گزر چکے اور بعد میں آئے، یعنی نبی اکرم ﷺ کی نبوت کے ایام ہیں۔ ان ایام میں کبھی کوئی گروہ غالب ہوا، کبھی کوئی گروہ، جس طرح مسلمانوں کے ساتھ بدر اور اُحد کے دن ہوا۔ تداولِ ایام سے یہی مراد ہے۔

فَيَوْماً عَلَيْنَا وَيَوْمًا لَنَا يَوْمًا نُسَاءُ وَيَوْمًا نُسَرُّ

"کبھی دن ہمارے حق میں ہوتے ہیں، کبھی ہمارے خلاف، کسی دن ہمیں خوشی پہنچتی ہے تو کسی دن ناخوش گواری۔"

مطلب یہ ہوا کہ دنیا کے ایام لوگوں کے درمیان دول ہیں (یعنی پھرتے رہتے ہیں)، ایک دن کسی کا اور ایک دن کسی اور کا۔ بدر کے دن مسلمانوں کی دولت مشرکوں پر ہوئی، یہاں تک کہ ستر مشرک مارے گئے، ستر قید ہوئے۔ اُحد کے دن مشرک مسلمانوں پر غالب آ گئے، ستر مسلمان زخمی ہوئے، پچھتر شہید ہو گئے۔ یہ سارا قصہ بخاری میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی اور محفوظ ہے۔[3]

شہید کی تعریف:

لفظ ﴿ شُهَدَآءَ ﴾ شہید کی جمع ہے۔ شہید وہ مسلمان ہے جو معرکے میں کسی کافر کی تلوار سے مارا گیا ہے، اس کو شہید اس لیے کہتے ہیں کہ وہ مشہود لہ بالجنۃ ہوتا ہے (یعنی اس کے لیے جنت کی گواہی دی گئی ہے) یا لفظ شاہد کی جمع ہے، کیوں کہ وہ جنت کے مشاہد کی طرح ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگی تھی کہ ہمیں یومِ بدر کی طرح ایک دن دکھلا کہ ہم اس دن میں دشمنوں سے لڑیں اور شہادت حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اُحد کے دن اُن کو بھڑا دیا، کچھ لوگ شہید ہو گئے۔

"تمحیص" خالص کو نکھارنے اور صاف کرنے کو کہتے ہیں۔ کسی چیز کا آہستہ آہستہ نشان مٹانے کو "محق" کہتے ہیں۔ تمنائے موت سے اس جگہ حصولِ شہادت مراد ہے، کیوں کہ موت کی آرزو سے منع فرمایا گیا ہے۔ جو لوگ بدر میں حاضر نہیں ہوئے تھے، وہ بدر کے دن کی طرح کے دن کی تمنا کرتے تھے، جب اُحد کے دن شکست پڑی تو اللہ تعالیٰ نے کہا: یہ تو عین تمھاری مراد تھی تو پھر تم اس شکست پر غمگین نہ ہو، فتح تمھاری ہی ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ آیت میں ایک

---

[1] تفسير الطبري (٧/ ٢٣٥) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٧٧١) [3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٧٤)

طرح کی ڈانٹ بھی ہے کہ تم نے خود تمنا کر کے لڑائی لی، پھر ہمت ہار کر شکست کھانے لگے، ایسی آرزو اول تو کرنی ہی نہیں چاہیے تھی، یا طلبِ شہادت پر ڈانٹ ہے، کیوں کہ تمھاری شہادت میں ایک طرح غلبۂ کفار کی تمنا نکلتی ہے۔[1] واللہ أعلم.

وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ
اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَ مَنْ
يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَ سَيَجْزِي اللّٰهُ
الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ
اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَ
مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَ سَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾
وَ كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا
لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا ؕ
وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا
رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْۤ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ
اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ
الدُّنْيَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

اور محمد (ﷺ) ایک رسول ہی تو ہیں۔ ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ اگر ان کا انتقال ہو جائے یا یہ شہید ہو جائیں تو کیا تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکے گا۔ اور اللہ شکر ادا کرنے والوں کو اچھی جزا دے گا ﴿144﴾ اور کوئی جاندار اللہ کے حکم کے بغیر مر نہیں سکتا، اس نے موت کا وقت لکھا ہوا ہے اور جو کوئی دنیا کا بدلہ چاہتا ہو تو ہم اسے دنیا ہی میں کچھ دے دیتے ہیں اور جو کوئی آخرت کا بدلہ چاہتا ہو تو ہم اسے اس میں سے کچھ دے دیتے ہیں اور ہم شکر ادا کرنے والوں کو اچھی جزا دیں گے ﴿145﴾ اور کتنے ہی نبی گزرے جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ والوں نے جہاد کیا،

[1] فتح البیان (۲/ ۳۳۹۔ ۳۴۳)

انھیں اللہ کی راہ میں جو تکلیفیں پہنچیں انھوں نے ہمت نہ ہاری اور نہ کمزوری دکھائی اور نہ وہ (کافروں سے) دبے، اور اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے (146) اور ان کا کہنا یہی تھا کہ اے ہمارے رب! ہمارے گناہ بخش دے اور ہمارے کاموں میں ہم سے جو زیادتیاں ہوئیں وہ معاف کر دے۔ اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما (147) چناں چہ اللہ نے انھیں دنیا میں ثواب دیا اور آخرت میں بہت اچھا ثواب دیا۔ اور اللہ نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے (148)

غزوۂ اُحد میں رسول اللہ ﷺ کی موت کی افواہ اور ایسی صورت میں درست اقدام کا بیان:

جنگِ اُحد میں بعض کامل مسلمان بھی بہت ہٹ گئے تھے، کیوں کہ ایک کافر نے اپنی فوج میں پکارا کہ میں محمد ﷺ کو مار آیا ہوں۔ آپ ﷺ کے زخم سے بہت خون بہہ گیا تھا، ضعف میں آ کر ایک گڑھے میں گر گئے تھے، مسلمانوں نے نبی اکرم ﷺ کو نہ دیکھا، تو ان کے ذہنوں میں یہ بات پختہ ہوگئی۔ جب آپ ﷺ متوجہ ہوئے تو میدان میں جو لوگ حاضر تھے، ان کو جمع کر کے پھر لڑائی شروع کی تو کافر پھر کر چلے گئے۔ لہٰذا اللہ پاک نے فرمایا کہ رسول زندہ رہے یا نہ رہے، دین اللہ کا ہے، اس پر قائم رہو۔ اس میں اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی وفات پر بعض لوگ پھر جائیں گے، جو قائم رہیں گے، ان کو بڑا ثواب ہے۔ اسی طرح ہوا کہ آپ ﷺ کے بعد بعض لوگ مرتد ہوگئے، جناب سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو پھر مسلمان کیا اور کچھ کو مارا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ جو لوگ اس دین پر ثابت رہیں گے، ان کو دین بھی ملے گا اور دنیا بھی، لیکن جو کوئی اس نعمت کی قدر جانے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اُحد کے دن جب بعض مسلمان بھاگے اور بعض مارے گئے تو شیطان نے پکارا کہ محمد ﷺ شہید ہو گئے۔ ابن قمیئہ نے پھر کر مشرکوں سے کہا کہ میں محمد ﷺ کو مار آیا ہوں، حالاں کہ فقط سر مبارک پر زخم آیا تھا، بہت لوگوں کے دل میں بھی آ گیا کہ ہاں آپ ﷺ شہید گئے ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں انبیا کے قتل کے بہت قصے ذکر کیے ہیں تو نبی کریم ﷺ کا مقتول ہونا بھی جائز سمجھ لیا۔ اس خیال پر ان کی ہمتوں میں کچھ ضعف اور سستی آ گئی، قتال سے ہٹ جانا چاہا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔ یعنی جب محمد ﷺ رسول ٹھہرے تو جو حال سب نبیوں کا تھا، وہ حال ان پر بھی روا ہے۔ ابو نجیح رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ایک مہاجر کا گزر ایک انصاری پر ہوا، وہ اپنے خون میں لت پت تھا، اس نے کہا: تمھیں کچھ خبر ہے کہ محمد ﷺ شہید ہو گئے۔ انصاری نے کہا: اگر شہید ہو گئے تو انھوں نے اللہ تعالیٰ کا حکم پہنچا دیا، اب تم اپنے دین پر لڑو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1] (رواه البيهقي في دلائل النبوة)

[1] دلائل النبوة (٣/ ٢٤٨، ٢٤٩)

پھر اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ملامت کی جو ہمت ہارنے لگے تھے اور سستی و ناتوانی میں گرفتار ہو چکے تھے۔ فرمایا کہ اگر نبی کریم ﷺ نہیں ہوں گے تو تم دین سے پھر جاؤ گے؟ اگر پھر جاؤ گے تو اللہ پاک کا کیا نقصان؟ ہاں جو لوگ اللہ کی اطاعت پر قائم ہیں اور اس کے دین پر لڑتے ہیں، اس کے رسول کا اتباع کرتے ہیں، خواہ رسول زندہ ہے یا فوت شدہ، ان کو ان کے کام کی جزا ملے گی۔ یہی بات صحاح و مسانید و سنن وغیرہ کتبِ اسلام سے متعدد طریقوں سے ثابت ہوئی ہے اور یقین کے لیے مفید ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بصیرت افروز استدلال اور اقدام:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم نے مسندِ شیخین ابی بکر و عمر رضی اللہ عنہما میں اس کا ذکر کیا ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کا انتقال ہوا، سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہی آیت پڑھی۔ بخاری شریف میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے گھر سے، جو سنخ میں تھا، گھوڑے پر سوار ہو کر آئے اور اتر کر مسجد میں داخل ہوئے، کسی آدمی سے بات نہ کی، سیدھے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے۔ نبی مکرم ﷺ ایک یمنی چادر میں لپٹے تھے، منہ کھول کر پیشانی پر بوسہ دیا روئے اور کہا: میرے ماں باپ آپ پر فدا! اللہ تعالیٰ آپ پر دو موتوں کو جمع نہ کرے گا، وہ موت جو آپ پر لکھی گئی تھی، وہ آ گئی ہے۔[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ پھر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ باہر نکلے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ لوگوں سے باتیں کر رہے تھے، کہا: اے عمر! بیٹھ جاؤ۔ پھر کہا: اما بعد! جو محمد ﷺ کو پوجتا تھا تو محمد ﷺ وفات پا گئے اور جو اللہ کو پوجتا ہے تو اللہ زندہ ہے، نہیں مرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ﴾ اس آیت کو ﴿ الشّٰكِرِيْنَ ﴾ تک پڑھا۔ واللہ! گویا لوگ اس وقت تک نہیں جانتے تھے کہ یہ آیت بھی اتری ہے۔ یہاں تک کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کو پڑھ کر سنائی۔ پھر سب لوگ اس کو پڑھنے لگے، جو شخص اس آیت کو سنتا، پڑھنے لگتا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: واللہ! مجھ کو کچھ خبر نہ تھی، ہاں میں نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سنا کہ وہ یہ آیت پڑھتے ہیں۔ ایسا عرقِ پشیمانی آیا کہ پاؤں نہ تھمے، زمین پر گر پڑے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اس آیت کو پڑھ کر کہا کرتے تھے: واللہ! ہم کبھی اس کے بعد اُلٹے پاؤں نہیں پھریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہدایت فرمائی ہے۔ واللہ! اگر نبی کریم ﷺ وفات پا گئے یا شہید ہو گئے تو ہم اسی بات پر لڑیں گے، جس پر وہ لڑتے تھے، یہاں تک کہ ہم مرجائیں۔ واللہ! میں ان کا بھائی، ولی، چچا کا بیٹا اور وارث ہوں، مجھ سے زیادہ اور کون ان کا حق دار ہے۔[3] (رواه الطبراني)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٨٤) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤١٨٧)

[3] المعجم الكبير (١/ ١٠٧) تفسير ابن كثير (١/ ٥٣٣۔ ٥٣٤) اس کی سند میں ''سماک بن حرب عن عکرمہ'' مضطرب راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٤٩٤٨)

حاصل کلام یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا وفات پانا یا شہید ہو جانا دین میں کمزوری یا اسلام سے پھر جانے کا سبب نہیں ہوسکتا، کیوں کہ تمام انبیا جو نبی اکرم ﷺ سے پہلے تھے، وفات پا چکے ہیں، مگر ان کے متبعین ان کی وفات کے بعد انبیا کے دین سے نہیں پھرے تو مسلمانوں کو بھی اپنے دین سے پھرنا اور مرتد ہونا زیب نہیں دیتا، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ ایک عبدِ مبلغ ہیں نہ کہ معبود۔ ان کا کام پہنچا دینا تھا، لہٰذا انھوں نے پہنچا دیا، جو معبود ہے، وہ باقی اور حی و قیوم ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ تم دینِ حق سے پھرو گے؟

مقرر عمر سے پہلے موت نہیں آتی:

سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ امیر الشاکرین ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے، شاکرین اصحابِ ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔[1] پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کوئی شخص نہیں مرتا، مگر اللہ کی تقدیر سے، جو مدت اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقرر کی ہے، اس کو پورا کرتا ہے، اسی لیے یہ فرمایا: ﴿كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا﴾، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ﴾ [الفاطر: ۱۱] ''اور بڑی عمر والے کو عمر دی جاتی ہے یا اس کی عمر کم کی جاتی ہے (وہ) ایک کتاب (لوحِ محفوظ) میں (درج) ہے۔'' اور اس کا فرمان ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ﴾ [الأنعام: ۲] ''وہی اللہ ہے جس نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر اس نے (تمھارے لیے) ایک وقت مقرر کیا اور اس کے ہاں (قیامت کا) ایک مقرر وقت بھی ہے۔''

اس آیت میں لوگوں کو شجاعت دلائی ہے اور نامردوں کو قتال کی ترغیب دلائی ہے، کیوں کہ اقدام و احجام (لڑائی میں کودنا اور لڑائی سے پیچھے رہنا) عمر کو گھٹاتا ہے نہ زیادہ کرتا ہے۔ حجر بن عدی رحمہ اللہ نے کہا کہ تمھیں اس بات سے کون سی چیز روکتی ہے کہ تم ان دشمنوں کو نہ پکڑو اور دجلہ کے پار نہ اترو؟ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) یہ کہہ کر اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا، پھر لوگوں نے بھی اپنے اپنے گھوڑے ڈال دیے، جب دشمن نے ان کو دیکھا، کہا: دیو آ گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔[2]

دنیا کے طلبگار کو دنیا اور آخرت کے طلبگار کو دونوں ملتی ہیں:

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ جس کا کام صرف دنیا کی خاطر ہوتا ہے، اس کو دنیا بقدر تقدیر ملتی ہے، آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہوتا اور جو کوئی آخرت کے لیے کام کرتا ہے، اس کو دنیا بھی قسمت کے مطابق ملتی ہے اور آخرت کا حصہ الگ ہاتھ آتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ﴾ [الشوریٰ: ۲۰] ''جو شخص آخرت کی کھیتی چاہتا

[1] تفسیر الطبري (۷/ ۲۵۲) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۷۷۹)

ہے، ہم اس کے لیے اس کی کھیتی میں اضافہ کرتے ہیں اور جو شخص دنیا کی کھیتی چاہتا ہے، ہم اسے اس میں سے کچھ دے دیتے ہیں اور اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىِٕكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴾ [الإسراء: ۱۸۔ ۱۹] ''جو کوئی جلدی والی (دنیا) چاہے تو ہم اسی (دنیا) میں جس کے لیے چاہیں جس قدر چاہیں جلد عطا کرتے ہیں، پھر اس کے لیے ہم جہنم ٹھہرا دیتے ہیں، وہ اس میں مذموم اور دھتکارا ہوا داخل ہوگا۔ اور جو آخرت چاہے اور اس کے لیے پوری پوری سعی کرے، جب کہ وہ مومن ہو، تو یہی لوگ ہیں جن کی سعی قابلِ قدر ہے۔'' اسی لیے اس جگہ یوں فرمایا: ﴿ وَسَنَجْزِی الشّٰكِرِيْنَ ﴾ یعنی ہم ان کو اپنا فضل و رحمت ان کی شکر گزاری اور عمل کے برابر دیں گے۔

اہلِ ایمان کو تسلی:

پھر اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو تسلی دی کہ جو بات اُحد کے دن تمھارے دل میں پڑی تم اس کا کچھ خیال نہ کرو، دیکھو کتنے پیغمبر شہید ہوگئے اور اُن کے ہمراہ بعض ربانی لوگ بھی شہید ہوئے۔ اس قول کو ابن جریر رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، ان کی قراءت ''قُتِلَ مَعَهٗ'' ہے نہ کہ ''قَاتَلَ''۔[1] پھر جو ربانی بچ رہے تھے، ان سے بزدلی اور ضعف کی نفی فرمائی۔ جس نے ''قَاتَلَ'' پڑھا، اس نے اسی بات کو اختیار کیا ہے، پھر پہلی قراءت کو اختیار کیا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اُن لوگوں پر عتاب فرمایا ہے، جو اُحد کے دن شکست کھا کر لڑنے سے باز رہے۔

﴿ رِبِّيُّوْنَ ﴾ کی تفسیر:

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے سیرت میں یہ معنی کہے ہیں کہ بہت سے نبی مارے گئے، ان کے ہمراہ ربانی تھے، یعنی جماعتیں تھیں، وہ نبی کے قتل کے بعد ہارے نہ اپنے دشمنوں کے روبرو سست پڑے، بلکہ صابر و شاکر رہے، اللہ تعالیٰ صابرین کا دوست ہے۔ سہیلی رحمہ اللہ نے اسی قول کی بہت مبالغے کے ساتھ تائید کی ہے اور اسی بات کو قابلِ توجہ ٹھہرایا ہے۔ اسی قول کو اموی رحمہ اللہ نے ''مغازی'' میں حکایت کیا ہے۔ بعض نے کہا: لفظ کثیر سے الوف مراد ہیں، یعنی ہزاروں ربانی لڑے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، حسن، قتادہ، سدی، ربیع اور عطاء خراسانی رحمہم اللہ وغیرہم نے کہا: ﴿ رِبِّيُّوْنَ ﴾ سے اجتماعِ کثیر مراد ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: علمائے کثیر مراد ہیں، جو نیک اور متقی تھے۔[2]

[1] تفسیر الطبري (٧/ ٢٦٤)
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٧٨٠۔ ٧٨١)

بصری نحویوں نے کہا: ﴿ رِبِّيُّوْنَ ﴾ وہ لوگ ہیں، جو رب عزوجل کو پوجتے ہیں۔ کسی نے کہا: اگر یہ بات ہوتی تو "رَبِّيُّوْنَ" ہوتا یعنی "ر" پر زبر ہوتی۔ ابن زید نے کہا: ﴿ رِبِّيُّوْنَ ﴾ سے اَتباع و رعایا اور "ربانیون" سے ولاۃ مراد ہیں۔ امام قتادہ اور ربیع رحمہ اللہ نے کہا ہے: مطلب یہ ہوا کہ جس بات پر انبیا لڑے تھے، اسی دین پر وہ لڑے، کاہل اور سست نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: یعنی ڈرے دبے نہیں۔ سیدنا ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: خوار نہیں ہوئے۔[1] ان کی عادت یہی رہی کہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگی اور صبر چاہا، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو نصرت، کامیابی اور اچھا انجام بخشا۔ اللہ ان نیکوں کو چاہتا ہے۔[2]

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ یہ جملہ ﴿ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ ﴾ [الآیة] اپنے سے پہلے کے الفاظ سے الگ تھلگ ہے، اس میں جہاد پر اُبھارنا ہے اور یہ بات جتلانا ہے کہ موت ضرور آئے گی، خواہ لڑو یا نہ لڑو، موت خواہ قتل کے طریقے سے ہو یا کسی اور طرح، اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر نہیں آتی، پھر جب آتی ہے تو کسی حیلے یا حوالے سے ٹل نہیں سکتی، پھر نامردی کرنے اور ڈرنے سے کیا حاصل ہے۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اللہ کی حفاظت میں ہیں، دشمن کتنا ہی غلبہ کیوں نہ کریں، وہ سلامت با کرامت رہیں گے، ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ مُؤجل مُؤقت کو کہتے ہیں، یعنی موت کا ایک وقتِ مقرر ہے، کم نہ زیادہ۔ پھر فرمایا کہ اللہ محسنین سے محبت کرتا ہے، گویا یہ سکھایا کہ مومنین بندوں کو دشمن کے آمنے سامنے ہونے کے وقت یہی کہنا چاہیے، جو اُن ربیوں نے کہا تھا۔ اس جگہ ایک نکتہ ہے کہ جب انھوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور وہ بدکار تھے تو اللہ نے ان کا نام نیکوکار رکھا۔[3]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ
عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿١٤٩﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ
وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿١٥٠﴾ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ
بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ
النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٥١﴾ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ
اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ
وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ

[1] تفسیر الطبري (٧/ ٢٦٩۔ ٢٧١) [2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٣٤۔ ٥٣٥) [3] فتح البیان (٢/ ٣٤٦۔ ٣٥١)

الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝١٥٢ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّاۢ بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝١٥٣

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم کافروں کی باتیں مانو گے تو وہ تمھیں پلٹا کر مرتد بنا دیں گے، پھر تم خسارہ پانے والے ہو گے (149) بلکہ اللہ تمھارا مولا ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے (150) جن لوگوں نے کفر کیا، ہم ان کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے، اس لیے کہ انھوں نے اللہ کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہرایا ہے جن کی اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ ظالموں کا بہت برا ٹھکانا ہے (151) یقیناً اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا جب تم (احد میں) اس کے حکم سے کافروں کو قتل کر رہے تھے، یہاں تک کہ جب تم نے کم ہمتی اختیار کی اور اپنی ذمے داری کے بارے میں جھگڑنے لگے اور بعد اس کے جب اللہ نے تمھیں وہ چیز (مالِ غنیمت کی جھلک) دکھائی جس سے تم محبت کرتے تھے تو تم نے نافرمانی کی، تم میں سے کچھ لوگ دنیا کو چاہتے تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے، پھر اللہ نے تمھیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا، تاکہ تمھاری آزمایش کرے۔ بلاشبہ (پھر بھی) اس نے تمھیں معاف کر دیا اور اللہ مومنوں پر فضل کرنے والا ہے (152) جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے اور کسی کی طرف پلٹ کر نہ دیکھتے تھے اور رسول (ﷺ) تمھارے پیچھے سے تمھیں آوازیں دے رہے تھے، پھر اللہ نے تمھیں غم پر غم دیے، تاکہ تمھیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمھارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر تمھیں غمگین نہیں ہونا چاہیے اور تم جو عمل کرتے ہو اللہ اس کی خبر رکھتا ہے (153)

کافروں کی اطاعت سے ممانعت اور اُحد کے نتائج کے اسباب:

یعنی اس جنگ میں جو مسلمانوں کے دل ٹوٹے تو کافروں اور منافقوں نے موقع پایا۔ بعض الزام دینے لگے،

بعض خیر خواہی کے پردے میں سمجھانے لگے، تاکہ آگے لڑائی پر دلیری نہ کریں۔ حق تعالیٰ خبردار کرتا ہے کہ دشمن کا فریب مت کھاؤ۔ وہ اللہ کے چور ہیں اور چور کے دل میں ڈر ہوتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ ان کے دل میں ہیبت ڈال دے گا۔ پھر فرمایا کہ شروع میں مسلمانوں کو غلبہ حاصل تھا، وہ کافروں کو مارتے تھے اور وہ بھاگتے تھے، فتح کے آثار نظر آرہے تھے، کسی کو مال کی خوشی تھی اور کسی کو غلبۂ اسلام کی۔ جب مسلمانوں سے پیغمبر کی حکم عدولی ہوئی تو مقدمہ اُلٹا ہو گیا۔

وہ حکم عدولی یہ تھی کہ نبی اکرم ﷺ نے پچاس تیر انداز پہاڑ کی راہ پر نگہبانی کے لیے کھڑے کیے تھے، باقی لشکر لڑنے لگا۔ جب ان تیر اندازوں نے فتح اور غلبہ دیکھا تو چاہا کہ اس جگہ سے چلے آئیں، فتح میں شریک ہوں اور مالِ غنیمت لے لیں۔ کچھ نے منع کیا، لیکن انھوں نے نہ مانا، وہاں دس آدمی رہ گئے، اس طرف سے کافروں کی فوج نے پیچھے سے حملہ کر دیا۔ دوسری حکم عدولی یہ تھی کہ جب کافر بھاگنے لگے، مسلمان ان کے تعاقب کو دوڑے، نبی اکرم ﷺ پیچھے سے پکارتے رہے کہ میری طرف آؤ، آگے مت جاؤ، اس طرف جو غنیمت نظر آئی، لوگ نہ پھرے، اس حکم عدولی کی وجہ سے شکست پڑی۔ پھر فرمایا کہ تم نے رسول کا دل تنگ کیا، اس کے بدلے تم پر تنگی آئی، اب آگے کو دیکھو اور حکم پر چلو، کچھ ہاتھ سے جائے یا کوئی چیز سامنے آئے نہ آئے۔ یہ موضح قرآن کا بیان ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے ایمان والے بندوں کو کافروں اور منافقین کی اطاعت سے ڈرایا ہے، یعنی ان کی اطاعت دنیا اور آخرت میں موجبِ ہلاکت ہے۔ پھر یہ حکم دیا کہ تم اللہ کی اطاعت کرو، اسی کی دوستی میں رہو، اسی سے مدد چاہو اور اسی پر بھروسا رکھو۔ پھر یہ خوشخبری سنائی کہ ہم کافروں کے دل میں تمھارا ڈر ڈال دیں گے، ان کو شرک و کفر کے سبب سے ذلیل و خوار کریں گے، یہ تو دنیا میں ہوگا۔ رہی آخرت تو وہاں علاحدہ عذاب اور سزا ہے۔[1]

رسول اللہ ﷺ کے امتیازات:

صحیحین میں سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مجھے پانچ چیزیں دی گئی ہیں، جو کسی نبی کو مجھ سے پہلے نہیں ملیں: مَیں ایک مہینے کی مسافت سے رعب کے ساتھ مدد دیا گیا ہوں، زمین میرے لیے مسجد اور پاک کر دی گئی ہے، مجھ کو غنیمت کا مال حلال ہے، مجھے شفاعت دی گئی اور ہر نبی خاص اپنی قوم کے لیے ہوتا تھا، میں سارے لوگوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔[2] سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ نے انبیا پر یا سب اُمتوں پر چار باتوں میں بزرگی دی: میں سب لوگوں کی طرف بھیجا گیا، زمین میرے اور میری اُمت کے لیے مسجد اور پاک بنا دی گئی، جس جگہ میری اُمت کے کسی شخص کو نماز پا لے تو اس کے پاس اس

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۵۳۵) [2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۲۸) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۲۱)

کی مسجد اور اس کا سامان طہارت (مٹی) موجود ہے، مجھے رعب کے ساتھ ایک ماہ کی راہ تک مدد دی گئی ہے، وہ رعب میرے دشمنوں کے دل میں ڈالا گیا ہے اور میرے لیے غنیمتیں حلال کر دی گئی ہیں۔ (رواہ أحمد) امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔[1] سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: « نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ عَلَى الْعَدُوِّ »[2] (رواہ سعید بن منصور و مسلم) یعنی دشمن پر رعب کے ساتھ میری مدد کی گئی ہے۔

سیدنا ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے: میں پانچ چیزیں دیا گیا ہوں: احمر و اسود کی طرف مبعوث ہوا ہوں، یعنی گورے اور کالے لوگوں کی طرف۔ میرے لیے زمین پاک اور مسجد بنا دی گئی ہے، غنیمتیں میرے لیے حلال ہیں، وہ ان کے لیے حلال نہیں تھیں، جو مجھ سے پہلے تھے۔ میں رعب کے ساتھ ایک ماہ کی راہ تک مدد دیا گیا ہوں، مجھے شفاعت دی گئی ہے، ہر نبی نے شفاعت کر لی ہے، ایک میں نے اپنی شفاعت چھپا رکھی ہے، یہ شفاعت اس شخص کے لیے ہوگی، جس نے کسی چیز کو اللہ کے ساتھ شریک نہیں کیا۔[3] (تفرد به أحمد)

جنگ کے واقعات:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ابوسفیان کے دل میں رعب ڈال دیا، وہ مکہ کو پھر گیا۔[4] اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے نصرت کا وعدہ کیا تھا، سو وہ پورا ہوا، دن کے پہلے حصے میں مسلمان غالب آئے، پھر آخر دن تیر اندازوں کی بے عنوانی سے شکست پڑی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے بالآخر ان کا وہ قصور معاف کر دیا، کیوں کہ دشمنوں کی تعداد زیادہ اور مسلمانوں کی تعداد کم تھی۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا: عفو کے یہ معنی ہیں کہ ہم نے تم کو جڑ سے نہیں اُکھیڑا، یہ تم پر ہماری مہربانی ہے۔[5] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جیسی مدد اُحد کے دن کی، ویسی کسی جگہ میں نہیں کی، پھر اس دن جو آپس میں تکرار اور شکست ہوئی، وہ تیر اندازوں کے سبب سے ہوا تھا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زخمی ہوئے، آپ کا خون بہا۔ فرمایا: « اِشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلٰى قَوْمٍ دَمَّوْا وَجْهَ رَسُوْلِ اللّٰهِ » ''اس قوم پر اللہ کا سخت غضب ہوا، جنھوں نے اللہ کے رسول کے چہرے کو خون آلود کیا۔'' کبھی یہ فرمایا: « لَيْسَ لَهُمْ أَنْ يَعْلُوْنَا » ''وہ ہم پر غالب نہیں آسکتے'' ابوسفیان نے پہاڑ کے نیچے پکار کر کہا: ''أُعْلُ هُبَلُ'' ''ہبل کی جے ہو'' ابن ابی کبشہ کہاں ہے؟ ابن ابی قحافہ کہاں ہے؟ ابن خطاب کہاں ہے؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اگر حکم ہو تو میں جواب دوں؟ فرمایا: ہاں! سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اَللّٰهُ أَعْلٰى وَأَجَلُّ'' ''اللہ ہی بلند اور جلیل ہے'' اس طول طویل

---

[1] مسند أحمد (٥/ ٢٤٨) سنن الترمذي (١٥٥٣) امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وهذا إسناد حسن" (إرواء الغليل: ١/ ١٨٠)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٣)

[3] مسند أحمد (٤/ ٤١٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح" (مجمع الزوائد: ٨/ ٤٦٢)

[4] تفسير الطبري (٧/ ٤٠١۔ ٤٠٢) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ [5] تفسير الطبري (٧/ ٢٩٨)

قصے کو امام حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں روایت کیا ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کی حدیث کا سیاق عجیب وغریب ہے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کا ذکر "دلائل النبوة" میں کیا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اُحد کے دن عورتیں مردوں کے پیچھے تھیں، زخمی صحابہ کی دوا دارو میں لگی تھیں۔ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے رہ گئے، سب نو آدمی تھے، سات انصاری دو قریشی اور دسویں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ جب مشرکوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھیر لیا، فرمایا:« رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلًا رَدَّهُمْ عَنَّا » ''اللہ اس پر رحم فرمائے، جو اُن کو ہم سے روکے۔'' ایک انصاری ایک ساعت تک لڑ کر شہید ہوا، جب دوبارہ ہجوم کیا تو پھر وہی فرمایا کہ اللہ اس پر رحم فرمائے، جو اُن کو ہم سے روکے، یہاں تک کہ ساتوں آدمی شہید ہو گئے۔

ابوسفیان نے آ کر کہا: "أُعْلُ هُبَلُ" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم یوں کہو:« اَللّٰه أَعْلٰى وَأَجَلُّ » جب سیدنا ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے یوں کہا تو ابوسفیان بولا: "لَنَا الْعُزّٰى وَلَا عُزّٰى لَكُمْ" ''ہمارے پاس عزیٰ ہے، تمھارے پاس تو عزیٰ بھی نہیں'' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم یوں کہو:« اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَالْكٰفِرُوْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ » ''اللہ ہمارا مولیٰ اور مددگار ہے، کافروں کا کوئی مولیٰ و مددگار نہیں۔'' جب میدانِ جنگ تھا تو دیکھا کہ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کا پیٹ پھٹا ہوا ہے، ہندہ ابوسفیان کی بیوی نے حمزہ رضی اللہ عنہ کا جگر نکالا اور دانتوں سے چبایا، لیکن چبا نہ سکی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا اس نے ان کے جگر سے کچھ کھایا ہے؟ کہا: نہیں۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی کوئی شے آگ میں داخل نہیں کرے گا۔ پھر سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ پر نمازِ جنازہ پڑھی، پھر ایک انصاری کو لا کر سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کے پاس رکھا گیا، اس پر بھی نماز پڑھی، حمزہ رضی اللہ عنہ کا جنازہ بدستور رکھا رہا، اس پر ستر بار نماز ادا کی۔[2] (تفرد به أحمد الحديث بطوله)

بدر کا قصہ بخاری شریف میں بھی براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس کو اس جگہ ذکر کیا ہے۔[3] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہمیں ہرگز خیال نہیں تھا کہ اس دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے کوئی شخص دنیا کے ارادے سے لڑا ہو، یہاں تک کہ آیت زیرِ تفسیر اتری،[4] یعنی تب معلوم ہوا۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: میرے چچا سیدنا انس بن نضر رضی اللہ عنہ بدر کے دن حاضر نہیں تھے۔ انھوں نے کہا: میں پہلی لڑائی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے غائب رہا، اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ کو کسی لڑائی میں آپ کے ساتھ کیا تو پھر اللہ تعالیٰ بھی دیکھے گا کہ میں کیا کرتا ہوں۔ جب اُحد کے دن لوگ بھاگے، کہا: اے اللہ! میں ان کے کام سے عذر کرتا ہوں اور مشرکوں کے کام سے بَری

---

(1) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٢٤) مسند أحمد (١/ ٢٨٧) دلائل النبوة (٣/ ٢٦٩۔ ٢٧١) اسے امام حاکم اور ذہبی رحمہما اللہ نے صحیح کہا ہے۔

(2) مسند أحمد (١/ ٤٦٣) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ عامر شعبی رحمہ اللہ کا سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ البتہ اس کے بعض الفاظ کے شواہد صحیحین میں ہیں۔

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٧٤) تفسير ابن كثير (١/ ٥٣٨)

(4) تفسير الطبري (٧/ ٢٩٥۔ ٢٩٦)

ہوں، پھر تلوار لے کر آگے بڑھے۔ سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی، کہا: اے سعد! کہاں ہو؟ میں تو جنت کی خوشبو اُحد کے اس پار سے پا رہا ہوں۔ پھر اتنا لڑے کہ شہید ہو گئے، لوگوں نے ان کو نہ پہچانا۔ ان کی بہن نے تل یا ہاتھ کے پوروں سے پہچانا، ان کو تیر تلوار اور نیزہ کے اسّی سے زیادہ زخم لگے تھے۔[1] (هذا لفظ البخاري و أخرج مسلم بنحوه)

صحیح بخاری میں سیدنا عثمان بن موہب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی حج کے لیے آیا تھا، اس نے ایک قوم کو حرم شریف میں بیٹھا ہوا دیکھ کر پوچھا کہ یہ کون لوگ بیٹھے ہیں؟ کہا: قریش ہیں۔ کہا: ان میں شیخ کون ہے؟ کہا: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما۔ اس نے ان کے پاس آ کر کہا: میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں، تم مجھے بتاؤ، کہا: پوچھو، کہا: تم کو قسم ہے اس حرمت والے گھر کی! کیا سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اُحد کے دن بھاگ گئے تھے؟ کہا: ہاں، کہا: تم جانتے ہو کہ وہ بدر کے دن غائب تھے؟ کہا: ہاں! کہا: کیا تمھیں معلوم ہے کہ وہ بیعتِ رضوان سے پیچھے رہ گئے تھے، وہاں حاضر نہیں ہوئے؟ کہا: ہاں۔ اس آدمی نے تکبیر کہی، سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا: بھلا میں تجھ کو حقیقتِ حال سے خبر نہ دوں؟ اُحد کے دن جو وہ بھاگے تو میں گواہ ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف کر دیا۔ بدر سے جو غائب رہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادی تھیں، وہ بیمار تھیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا تھا کہ تمھیں بدر کے مجاہدین میں سے ایک کے برابر اجر ملے گا۔ بیعتِ رضوان میں اس لیے حاضر نہ ہوئے کہ اگر بطنِ مکہ میں ان سے زیادہ کوئی معزز ہوتا تو ان کے بجائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو بھیجتے، بیعت ان کے جانے کے بعد ہوئی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر مار کر فرمایا کہ یہ عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ ہے۔ اب تو نے یہ حال سن لیا تو اس کو لے کر چلا جا۔[2] (رواه البخاري)

سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اُحد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو تیر دیتے جاتے تھے اور فرماتے تھے: «اِرْمِ فِدَاكَ أَبِيْ وَأُمِّيْ» ''تیر پھینک تجھ پر میرے ماں باپ قربان'' یہاں تک کہ بغیر پَر والا تیر دیتے، میں اس کو بھی مارتا تھا۔[3] (رواه البخاري) سیدنا سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے یہ بھی کہا ہے کہ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں اور بائیں دو سفید پوش آدمی خوب لڑ رہے ہیں، میں نے ان کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا نہ پھر دیکھا، یعنی جبریل و میکائیل علیہما السلام۔ یہ روایت صحیحین میں ہے۔[4] ابی بن خلف نے کہا تھا کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کروں گا، اس پر قسم کھائی تھی، جب یہ خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو فرمایا: «بَلْ أَنَا أَقْتُلُهُ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰی» ''بلکہ میں ان شاء اللہ اس کو قتل کروں گا۔'' چناں چہ ایسا ہی ہوا کہ وہ اُحد کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے جہنم واصل ہوا۔[5] امام واقدی رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ابی بن خلف بطنِ رابغ میں مرا۔ ایک رات میں اس طرف جاتا تھا،

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحديث (۲٦٥١) صحیح مسلم، رقم الحديث (۱۹۰۳) [2] صحیح البخاري، رقم الحديث (۳٦۹٥)

[3] صحیح البخاري، رقم الحديث (۲۷٤۹) تفسیر ابن کثیر (۱/ ٥٤۱)

[4] صحیح البخاري، رقم الحديث (۳۸۲۸) صحیح مسلم، رقم الحديث (۲۳۰٦) [5] مصنف عبد الرزاق (٥/ ۳٥٥)

ایک آگ بھڑک رہی تھی، میں اس کو دیکھ کر ڈرا، اچانک اس میں سے ایک آدمی زنجیروں میں جکڑا ہوا نکلا، پیاسا تھا۔ ایک دوسرا شخص بولا: اس کو پانی نہ پلانا، یہ اُبی بن خلف قتیلِ رسول اللہ ﷺ ہے۔[1]

صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا سخت غضب ہو، جس نے اس کے رسول کے ساتھ یہ کام کیا اور اپنے دانتوں کی طرف اشارہ کیا۔ پھر فرمایا: اس پر اللہ کا شدید غضب ہو، جس کو رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں قتل کیا۔[2] (رواہ البخاري) یہ حدیث کئی الفاظ سے آئی ہے۔

صحیحین میں مروی ہے کہ کسی نے سیدنا سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے نبی اکرم ﷺ کے زخمی ہونے کا حال پوچھا، کہا: آپ ﷺ کا چہرہ مبارک زخمی ہوا، سامنے کے چار دانت ٹوٹ گئے، خول سر میں گھس گیا، فاطمہ رضی اللہ عنہا خون دھوتی تھیں، سیدنا علی رضی اللہ عنہ ڈھال سے پانی ڈالتے تھے، جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا کہ پانی سے خون بند نہیں ہوتا تو بورے کا ایک ٹکڑا جلا کر اس کی راکھ زخم کی جگہ پر بھر دی، خون تھم گیا۔[3] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ﴿ فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ ﴾ سے ایک تو وہ غم مراد ہے، جو شکست کی وجہ سے پہنچا اور نبی اکرم ﷺ کی شہادت کی خبر مشہور ہوئی، دوسرا غم وہ تھا کہ مشرک پہاڑ پر چڑھ گئے، اس پر نبی اکرم ﷺ نے کہا: « اَللّٰهُمَّ لَيْسَ لَهُمْ أَنْ يَّعْلُوْنَا » ''اے اللہ! یہ ان کا حق نہیں کہ ہم سے بلند ہوں۔''

سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: پہلا غم ہزیمت تھا۔ دوسرا نبی اکرم ﷺ کی شہادت کی خبر۔ اُن کے نزدیک یہ غم سب سے بڑھ کر تھا۔[4] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: پہلا غم غنیمت اور فتح کا حاصل نہ ہونا تھا۔ دوسرا دشمنوں کے اوپر چڑھنے کا۔ امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: یعنی ''کَرْبًا بَعْدَ کَرْبٍ'' ''ایک تکلیف کے بعد دوسری تکلیف۔'' امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: غمِ اول نبی اکرم ﷺ کی شہادت کی افواہ تھی اور دوسرا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قتل ہونا اور زخمی ہونا تھا۔ امام قتادہ اور ربیع رحمہما اللہ نے اس کے برعکس کہا ہے۔ امام ابن جریر رحمہ اللہ نے کہا کہ زیادہ صحیح یہ قول ہے کہ پہلا غم یہ تھا کہ پہلے اپنی فتح کے آثار دیکھ لینے کے بعد دشمن پر کامیابی اور غنیمت سے نہ صرف محروم رہے، بلکہ خود مقتول اور مجروح ہوئے۔ اس غم میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کے خلاف کرنے سے پھنسے۔ دوسرا غم یہ ہوا کہ نبی کریم ﷺ کی شہادت کی افواہ سنی اور دشمنوں کا غلبہ دیکھا۔[5]

---

[1] كتاب المغازي للواقدي (١/ ٢٥٢) اس کی کوئی سند نہیں ملی ہے۔ نیز واقدی رحمہ اللہ خود بھی محدثین کے نزدیک ثقہ نہیں ہیں۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٤٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٩٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٩٠)

[4] تفسير ابن كثير (١/ ٥٤٣) [5] تفسير الطبري (٧/ ٣٠٥_ ٣١٣)

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى
طَآىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَ طَآىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ
يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ يَقُوْلُوْنَ
هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ
يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ
لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ
بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ
وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ
قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا
مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ
بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾

پھر اس نے (غم کے بعد) تم پر سکون نازل کیا جس سے تمھارے ایک گروہ پر اونگھ طاری ہوگئی اور دوسرا گروہ جس کے نزدیک ساری اہمیت اپنی ذات ہی کی تھی، وہ اللہ کے بارے میں ناحق جاہلانہ طور پر گمان کرنے لگا۔ وہ کہتے تھے: کیا اس معاملے میں ہمارا بھی کوئی اختیار ہے؟ کہہ دیجیے: سب اختیار اللہ ہی کا ہے۔ وہ اپنے دلوں میں وہ بات چھپاتے ہیں جو آپ (ﷺ) کے سامنے ظاہر نہیں کر سکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اس معاملے میں ہمارا بھی کچھ اختیار ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔ کہہ دیجیے: اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو بھی جن کی قسمت میں قتل ہونا لکھا تھا، وہ اپنی قتل گاہوں کی طرف ضرور نکل آتے، اور یہ اس لیے ہوا کہ جو کچھ تمھارے سینوں میں ہے اللہ اسے آزمائے اور تاکہ تمھارے دلوں میں سے وسوسے صاف کر دے اور اللہ سینوں کے بھید خوب جانتا ہے (154) بے شک جب دو لشکر (احد میں) آپس میں ٹکرائے تھے تو تم میں سے جن لوگوں نے پسپائی اختیار کی، یقیناً وہ اپنی بعض کوتاہیوں کے سبب شیطان کے

بہکاوے میں آ گئے تھے اور بلاشبہ اللہ نے انھیں معاف کر دیا، بے شک اللہ نہایت بخشنے والا، بہت حوصلے والا ہے (155)

جنگ کے دوران میں مسلمانوں پر اُونگھ کا اُتارنا اور کافروں کی گھبراہٹ:

اول شکست میں جن کو شہید ہونا تھا ہو چکے اور جن کو ہٹنا تھا ہٹ گئے اور جو میدان میں رہے، ان پر اونگھ آئی، اس کے بعد رعب اور خوف جاتا رہا اور اتنی دیر نبی اکرم ﷺ پر غشی رہی، پھر جب ہوشیار ہوئے، سب نے آپ ﷺ کے پاس جمع ہو کر پھر لڑائی قائم کی، پست ایمان والے کہنے لگے کہ کیا کچھ کام ہمارے ہاتھ بھی ہے؟ ظاہر یہ معنی کہ اس شکست کے بعد کچھ ہمارا کام بنا رہے گا یا بالکل بگڑ چکا۔ یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ نے جو چاہا سو کیا، ہمارا کیا اختیار اور نیت میں یہ معنی تھے کہ ہمارے مشورے پر عمل نہ کیا جو اتنے لوگ مرے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں معنوں کا جواب فرما دیا اور بتا دیا کہ اللہ کو اس میں حکمت منظور تھی، تا کہ صادق اور منافق معلوم ہو جائیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس جنگ میں جو لوگ ہٹ گئے تھے، ان پر گناہ نہیں رہا۔ یہ فائدہ موضح قرآن میں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے بندوں پر احسان رکھا کہ دیکھو! ہم نے کس طرح تم پر سکینت اور امن اُتارا، مراد اُونگھ ہے۔ وہ غم واندوہ کی حالت میں ہتھیار لگائے ہوئے تھے کہ ایک بارگی اونگھ گئے۔ ایسی حالت میں اونگھ کا آنا امن کی دلیل ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے قصۂ بدر کے بارے میں سورۃ الانفال میں فرمایا: ﴿ اِذْ یُغَشِّیْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ وَ یُنَزِّلُ عَلَیْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّیُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَ یُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّیْطٰنِ وَ لِیَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَ یُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ﴾ [الأنفال: ۱۱] ''(یاد کرو) جب وہ (اللہ) اپنی طرف سے تمھیں امن وسکون دینے کے لیے تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا، اور آسمان سے تم پر بارش برسا رہا تھا، تا کہ تمھیں اس کے ذریعے سے پاک کر دے اور تم سے شیطانی وسوسوں کو لے جائے اور تا کہ تمھارے دلوں کو مضبوط کر دے، اور تا کہ اس کی وجہ سے (تمھیں) ثابت قدم رکھے۔''

سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جنگ میں اونگھ اللہ کی طرف سے ہے اور نماز میں شیطان کی طرف سے۔[1]

صحیح بخاری میں ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں بھی انہی میں تھا، جن کو اُحد کے دن اُونگھ نے گھیرا۔ کئی بار میرے ہاتھ سے تلوار گری اور میں نے اٹھائی۔ یہ روایت کئی طرق سے ترمذی، نسائی اور مستدرک حاکم میں مروی ہے،[2] اس کی سند صحیح ہے۔ غرض کہ جو اہلِ ایمان ویقین، ثابت قدم رہنے والے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والے تھے، وہ صادق تھے، ان کو یقینِ کامل تھا کہ اللہ تعالیٰ جلد اپنے رسول کی مدد کرے گا اور رسول کی اُمیدوں کو پورا کرے گا، جو

---

(1) تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۷۹۳) اس کی سند حسن ہے۔

(2) صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۸٤۱) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۳۰۰۸) سنن النسائي الکبریٰ (٦/ ۳۱٦) مستدرك الحاکم (۲/ ۳۲۵)

منافق تھے، ان کو اپنی جان کی فکر تھی، وہ بے قراری، گھبراہٹ اور خوف میں تھے، اللہ سے جاہلیت کا سا گمان رکھتے تھے، ان کو اُونگھ نہیں آتی تھی۔

جس طرح دوسری آیت میں فرمایا ہے: ﴿ بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا ﴾ [الفتح: ۱۲] ''بلکہ تم نے گمان کیا تھا کہ رسول اور مومنین اپنے اہل وعیال کی طرف ہرگز نہیں پلٹیں گے اور یہ بات تمھارے دلوں میں پرکشش بنا دی گئی تھی اور تم نے برا گمان کیا تھا اور تم لوگ تھے ہی ہلاک ہونے والے۔'' اسی طرح ان منافقوں کو خیال ہوا کہ اس وقت جو مشرکین غالب آگئے ہیں، یہ گویا فیصلہ ہوگیا اور اسلام والے ہلاک ہوگئے۔

منافقوں کی بدگمانیاں:

یہی حال شکوک وشبہات میں مبتلا رہنے والوں کا ہوتا ہے کہ جب کوئی خوفناک معاملہ پیش آتا ہے، ان کو اس طرح کی بُری بُری بدگمانیاں گھیر لیتی ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ لوگ اس حال میں کہتے ہیں کہ ہمارا کیا اختیار ہے تو کہہ دے کہ حکم اللہ کا ہے، جو ان کے دل میں ہے وہ تجھ پر ظاہر نہیں کرتے۔ سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے، جب ہم پر خوف سخت ہوا، اللہ تعالیٰ نے نیند بھیج دی، ہم میں کوئی آدمی نہیں تھا، مگر اس کی ٹھوڑی سینے سے جالگی۔ میں غنودگی کی کیفیت میں معتب بن قشیر کی یہ بات سن رہا تھا: ﴿ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ﴾ (آیت زیرِتفسیر) میں نے اس کی یہ بات یاد رکھی، اس پر یہ آیت اُتری۔[1] (رواه ابن أبي حاتم) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم اگر گھر کے اندر ہوتے تو بھی جن کی موت آنے والی ہے، وہ باہر نکل کر مارے جاتے، اللہ کی تقدیر حتمی حکم ہے، اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ یہ کام اس لیے ہوا کہ تمھارا امتحان ہو جائے، پاک اور ناپاک کی پہچان ہو جائے، اقوال وافعال میں مومن اور منافق کی تمیز ہو جائے، اللہ کو دلوں کے پوشیدہ خیالات تک کا علم ہے۔ اس دن جن کو شیطان نے بہکا دیا تو وہ ان کے بعض سابقہ گناہوں کے سبب سے تھا۔ جس طرح بعض سلف نے کہا کہ نیکی کا بدلہ نیکی اور برائی کی جزا برائی ہوتی ہے۔

اُحد میں راہِ فرار اختیار کرنے والوں کا قصور معاف ہے:

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ ہم نے فرار کا قصور معاف کر دیا، اللہ گناہوں کو بخشنے والا حلیم و کریم ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے اُحد کے دن کے فرار کو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا، اب ان پر کوئی طعن قابلِ توجہ نہیں ہے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ آیت: ﴿ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ﴾ (آیت زیرِتفسیر) سیدنا عثمان، رافع بن المعلّٰی اور خارجہ بن زید رضی اللہ عنہم کے حق میں اتری ہے۔[3]

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۷۹۵) اس کی سند حسن ہے۔
[2] سورت آلِ عمران [آیت: ۱۵۲] آیت کی تفسیر دیکھیں۔
[3] تاریخ دمشق (۳۹/ ۲۶۰) الدر المنثور (۲/ ۳۵۵)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا
لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِى الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ
كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ
حَسْرَةً فِىْ قُلُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ
لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾
وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے کفر کیا اور اپنے بھائیوں کے بارے میں کہنے لگے جب وہ سفر کے لیے یا جہاد کے لیے نکلے کہ اگر وہ ہمارے پاس رہتے تو نہ مرتے اور نہ قتل کیے جاتے، یہ اس لیے کہ اللہ ان کی ایسی باتوں کو ان کے دلوں کا پچھتاوا بنا دے اور اللہ ہی زندہ کرتا اور مارتا ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے (156) اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل ہو جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی بخشش اور رحمت ان چیزوں سے کہیں بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں (157) اور اگر تم مر جاؤ یا قتل کر دیے جاؤ تو یقیناً تم اللہ ہی کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے (158)

مشابہت سے ممانعت:

یعنی نیک کام کے لیے نکلے اور مر گئے یا مارے گئے تو نکلنے پر افسوس نہیں کرنا چاہیے، اس میں تقدیر کا انکار آتا ہے۔ آخرت کا فائدہ دیکھنا اور دنیا کی زندگی کو عزیز رکھنا، یہ سب کافروں کی خصلت ہے۔ اللہ پاک نے اس آیتِ مقدسہ میں اپنے ایمان والے بندوں کو کفار کی مشابہت سے منع فرمایا ہے، کفار کے اس غلط اعتقاد سے بچنے کی بھی تلقین فرمائی ہے، جنھوں نے اپنے ان بھائی بندوں کے حق میں جو سفروں اور جنگوں میں مارے گئے تھے، یہ بات کہی تھی کہ اگر وہ بیٹھ رہتے تو کیوں کر مارے جاتے یا مرتے؟! یعنی نہ سفرِ تجارت میں مرتے اور نہ لڑائی میں مارے جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ان کے دل میں ہم نے یہ اعتقاد اس لیے پیدا کر دیا کہ اپنے مردوں اور مقتولوں پر اُن کی حسرت بڑھ جائے۔

سب کچھ مشیتِ الٰہی سے وابستہ ہے:

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمائی اور کہا کہ جینا اور مرنا تو صرف اللہ کی تقدیر اور مشیت سے ہوتا ہے۔ کسی کی عمر نہ بڑھتی ہے نہ گھٹتی ہے، مگر اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے۔ اللہ پاک کا علم اور بصر ساری خلق میں نافذ ہے، ان کا

کوئی کام اس پر پوشیدہ نہیں رہتا۔ پھر فرمایا کہ اللہ کی راہ میں قتل ہونا یا مرنا اللہ کی رحمت، بخشش اور رضوان حاصل کرنے کا وسیلہ ہے، یہ کام دنیا میں باقی رہنے اور فنا ہونے والی معمولی چیزوں کو جمع کرنے سے بہتر ہے، پھر جب مقتول اور مرنے والے نے لوٹ کر اللہ ہی کے پاس جانا ہے تو اللہ تعالیٰ ہر نفس کو اس کے عمل کا بدلا دے گا، اچھے عمل کا اچھا، برے کام کا برا۔

فتح البیان میں ہے کہ اس آیت میں کفار سے مراد منافقین ہیں، جن کو یہ گمان تھا کہ اگر وہ گھر سے باہر نہ نکلتے، جنگ میں حاضر نہ ہوتے تو مارے نہ جاتے۔ زمخشری نے کہا کہ یہ ان کا قول اور اعتقاد تھا،[1] اللہ تعالیٰ نے کہا: تم ان جیسی بات نہ کہو اور نہ ان جیسا اعتقاد رکھو، ہوسکتا ہے کہ اس جگہ نہی اور انتہا ایک ساتھ مراد ہوں۔ بعض نے کہا: جو اللہ کی عبادت جنت کے شوق میں کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی اُمید پوری کرتا ہے۔ ﴿ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَحْمَةٌ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) میں اسی طرف اشارہ ہے اور جو کوئی شوق میں عبادت کرتا ہے اور اس کی ذاتِ کریم کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا، وہ بندۂ مخلص ہے، اللہ اس بندے کے لیے دارِ کرامت میں اپنی تجلی کرے گا۔ ﴿ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) میں اسی طرف اشارہ ہے۔[2]

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا
غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ
اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۝۱۵۹ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ
لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ
بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۶۰ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ
اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ
تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۱۶۱ اَفَمَنِ
اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ
جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۶۲ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ
وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۶۳ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى

[1] فتح البیان (۲/ ۳۶۰۔ ۳۶۳) [2] الکشاف (۱/ ۴۵۸)

الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

پس (اے نبی) آپ اللہ کی رحمت کے باعث ان کے لیے نرم ہو گئے۔ اگر آپ تند خو اور سخت دل ہوتے تو وہ سب آپ کے پاس سے چھٹ جاتے، چناں چہ آپ ان سے در گزر کریں اور ان کے لیے بخشش مانگیں اور ان سے (اہم) معاملات میں مشورہ کریں، پھر جب آپ پختہ ارادہ کر لیں تو اللہ پر بھروسا کریں، بے شک اللہ بھروسا کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ﴿159﴾ اگر اللہ تمھاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آ سکتا، اور اگر وہ تمھیں بے یار و مددگار چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمھاری مدد کر سکے؟ اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسا کرنا چاہیے ﴿160﴾ یہ ناممکن ہے کہ کوئی نبی خیانت کرے اور جو کوئی خیانت کرے گا تو جو اس نے خیانت کی ہوگی اس کے ساتھ قیامت کے دن حاضر ہوگا، پھر ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿161﴾ بھلا جو شخص اللہ کی رضا کے پیچھے چل رہا ہو، اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اللہ کی ناراضی لے کر لوٹے اور جس کا ٹھکانا جہنم ہے؟ اور وہ بدترین لوٹنے کی جگہ ہے ﴿162﴾ ان کے لیے اللہ کے پاس درجے ہیں اور وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ اسے دیکھ رہا ہے ﴿163﴾ بے شک اللہ نے مومنوں پر احسان کیا، جب ان میں انھی میں سے ایک رسول بھیجا، وہ انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور بے شک وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے ﴿164﴾

موضح قرآن کا بیان:

موضح قرآن میں ہے کہ شاید نبی اکرم ﷺ کا دل مسلمانوں سے خفا ہوا ہوگا اور چاہا ہوگا کہ اب سے ان سے مشاورت نہیں کریں گے، لہٰذا اللہ نے سفارش کی اور فرمایا کہ مشورہ لینا بہتر ہے، جب ایک بات کا فیصلہ کر چکے تو پھر پس و پیش نہ کرے۔ غلول (خیانت) کے ذکر سے یا تو مسلمانوں کی دلداری کرنا مراد ہے، تاکہ یہ نہ سمجھیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں ظاہر میں تو معاف کیا، مگر دل میں خفا ہیں اور شاید پھر کبھی وہ خفگی نکالیں گے، یا یہ کام نبیوں کا نہیں ہے کہ دل

میں کچھ اور ظاہر میں کچھ ہو، یا مسلمانوں کو سمجھانا ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر گمان نہ کریں کہ غنیمت کا مال کچھ چھپا رکھیں گے۔ شاید یہ اس لیے فرمایا کہ وہ تیر انداز مورچہ چھوڑ کر غنیمت لینے کو دوڑے، کیا نبی کریم ﷺ ان کو حصہ نہ دیتے، یا بعض چیز چھپا رکھتے۔ کہتے ہیں بدر کی لڑائی میں غنیمت میں سے ایک چیز گم ہوگئی تھی۔ کسی نے کہا: شاید نبی اکرم ﷺ نے اپنے لیے رکھی ہوگی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر فرمایا کہ نبی اور سب خلق برابر نہیں ہے۔ طمع کے کام جو ادنیٰ قسم کے ہیں، نبیوں سے نہیں ہوتے۔

نبی کی صفات، نرم دلی اور رحم دلی:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ پاک نے اس آیت میں اپنے رسولِ مقبول کو مخاطب کیا اور مومنین کو اس بات کا احسان یاد دلایا کہ ہم نے رسول کے دل کو اپنی اُمت کے لیے نرم کر دیا ہے، جو نبی اکرم ﷺ کے حکم کے تابع ہیں اور نبی ان کو جھڑکتا نہیں، وہ ان سے اچھی نرم بات کہتا ہے، یہ ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا کہ خلقِ محمد ﷺ کا بیان ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اس خلق کے ساتھ بھیجا۔[1] یہ آیتِ کریمہ اس آیتِ کریمہ کے مشابہ ہے، جو سورۃ التوبہ میں اس طرح ہے: ﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [التوبة: ١٢٨] ''(لوگو!) یقیناً تمھارے پاس تمھی میں سے ایک رسول آ گیا ہے، اس پر تمھارا تکلیف میں مبتلا ہونا گراں (گزرتا) ہے، وہ تمھارے لیے (بھلائی کا) حریص ہے، مومنوں پر نہایت شفیق، بہت رحم کرنے والا ہے۔''

ابو راشد حرانی رحمہ اللہ نے کہا کہ ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ نے میرا ہاتھ پکڑا۔ پھر کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: اے ابو امامہ! مومنین میں ایسے لوگ ہیں، جن کے لیے میرا دل نرم ہوجاتا ہے۔[2] (تفرد به أحمد) اس جگہ ''فَظًّا'' سے مراد سخت گو اور ''غَلِيْظ'' سے مراد سخت دل ہے، یعنی اگر تو سخت گو بدزبان سختِ دل ہوتا تو لوگ تجھ کو چھوڑ کر چلے جاتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو تیرے پاس اکٹھا کر دیا اور تیرے دل کو ان کی تالیفِ قلوب کے لیے نرم کر دیا۔ جس طرح سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ میں پہلی کتابوں میں نبی اکرم ﷺ کی یہ صفت دیکھتا ہوں کہ وہ نہ سخت گو ہیں اور نہ سخت دل۔ نہ بازاروں میں چیخنے چلانے والے، نہ بدی کا بدی کے ساتھ بدلہ لینے والے، لیکن معاف کرنے والے اور درگزر کرنے والے ہیں۔[3] سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو لوگوں سے مدارات (خوش سلوکی) کرنے کا حکم دیا ہے، جس طرح مجھ کو فرائض کے قائم کرنے کا حکم کیا ہے۔[4] یہ حدیث غریب ہے۔

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٨٠٠) تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٤٦)
[2] مسند أحمد (٥/ ٢٦٧) السلسلة الصحيحة (١٠٩٥)
[3] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٠١٨)
[4] الكامل لابن عدي (٢/ ١٥) اس کی سند میں ''بشر بن عبید دراسی'' سخت ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم: ٨١٠)

درگزر کرنے اور مشورہ لینے کا حکم:

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَ اسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ وَ شَاوِرۡهُمۡ فِي الۡاَمۡرِ ﴾ (آیت زیر تفسیر) اسی وجہ سے نبی اکرم ﷺ ہر نئے کام میں جو درپیش ہو، مشورہ لیتے تھے کہ ان کا دل خوش ہو اور وہ مسرور ہوں۔ جس طرح بدر کے دن مشورہ لیا تھا کہ قافلے کی طرف جائیں یا نہ جائیں؟ انھوں نے کہا کہ اگر آپ ہمیں دریا میں گھس جانے کا کہیں گے تو ہم گھس جائیں گے اور اگر آپ اپنے ہمراہ برک الغماد کی طرف لے چلیں گے تو ہم چلنے کو حاضر ہیں۔ ہم وہ بات نہیں کہیں گے، جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی: ﴿ فَاذۡهَبۡ اَنۡتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوۡنَ ﴾ [المائدۃ: ٢٤] ''چناں چہ تو اور تیرا رب جائے، پھر تم دونوں ان سے لڑو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔'' بلکہ ہم یہ کہتے ہیں: "اِذۡهَبۡ فَنَحۡنُ مَعَكَ، وَبَيۡنَ يَدَيۡكَ، وَعَنۡ يَّمِيۡنِكَ، وَعَنۡ شِمَالِكَ مُقَاتِلُوۡنَ" ''آپ چلیں، ہم آپ کے ساتھ ہیں اور آپ کے آگے اور دائیں اور بائیں طرف ہو کر دشمن کے ساتھ جنگ کریں گے۔''[1]

اسی طرح یہ مشورہ کیا گیا کہ کس جگہ جا کر ٹھہریں۔ منذر بن عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا کہ قوم کے سامنے ٹھہرو۔ اُحد کے دن مشورہ کیا کہ مدینہ میں رہیں یا باہر نکل کر دشمن سے لڑیں۔ سب نے یہی کہا کہ نکل کر لڑنا چاہیے۔ خندق کے دن مشورہ کیا کہ اس سال احزاب سے ایک تہائی پھلوں کے عوض مصالحت کریں۔ سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما نے نہ مانا، آخر مصالحت کا ارادہ ترک کر دیا۔ حدیبیہ کے دن مشورہ لیا کہ مشرکین کی (اولاد) پر حملہ کریں یا نہیں۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم لڑنے کے لیے نہیں آئے، ہم تو عمرہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کا کہنا قبول فرما لیا۔ قصۂ افک میں فرمایا: اے مسلمانوں کے گروہ! تم مجھ کو اس قوم کے حق میں مشورہ دو، جس نے میری بیوی پر تہمت لگائی ہے، اللہ کی قسم! مجھے اس شخص کی کوئی برائی معلوم نہیں، جس کے ساتھ میری بیوی کو تہمت لگائی ہے۔ میں نے اس سے بھی سوائے بھلائی کے کچھ معلوم نہیں کیا۔ پھر سیدنا علی اور سیدنا اسامہ رضی اللہ عنہما سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرقت کے بارے میں مشورہ لیا۔[2] غرض یہ کہ آپ ﷺ کی عادت شریف تھی کہ جنگ وغیرہ کے سلسلے میں مشورہ لیا کرتے تھے۔

مشورے کا شرعی حکم اور اس کی اہمیت:

فقہا کا اختلاف ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر مشورہ لینا واجب تھا یا مستحب کہ صرف ان کو خوش کرنے کے لیے ان کی صلاح پوچھتے تھے؟ اس میں دو قول ہیں: سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ﴿ وَشَاوِرۡهُمۡ فِي الۡاَمۡرِ ﴾ سے مراد سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ اثر شرطِ شیخین پر ہے۔[3] روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٧٣٦) [2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٩١٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٧٠)

[3] مستدرك الحاكم (٣/ ٧٣) اس کو امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔

یہ آیت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے حق میں اتری ہے۔ وہ دونوں نبی اکرم ﷺ کے حواری اور وزیر تھے اور سب مسلمانوں کے باپ تھے۔[1] عبدالرحمن بن غنم رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے سیدنا ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے فرمایا: اگر تم دونوں کسی مشورے پر مجتمع ہو گئے تو میں تم دونوں کی مخالفت نہیں کروں گا۔[2] (رواہ أحمد)

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا: عزم کیا چیز ہے؟ فرمایا: اہل رائے سے مشورہ لینا، پھر ان کے کہنے پر چلنا۔[3] (رواہ ابن مردویہ) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ جس سے مشورہ لیا جائے، وہ امانت دار ہے۔ (رواہ ابن ماجه و أبو داود) ترمذی نے کہا کہ یہ حدیث حسن ہے، نسائی نے اس کو مبسوط روایت کیا ہے۔[4] پھر سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ابن ماجہ نے تفرداً روایت کیا ہے کہ "اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ" "جس سے مشورہ لیا جائے، وہ امانت دار ہے۔"[5] پھر سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ جب کوئی تم میں اپنے بھائی سے مشورہ لے تو چاہیے کہ وہ اس کو مشورہ دے۔[6] (تفرد به أيضاً) پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب کسی معاملے میں تو نے مشورہ کیا اور اس کام کا عزم کر لیا تو اب اللہ پر بھروسا کرو، اللہ توکل کرنے والوں کو چاہتا ہے۔ زیر تفسیر آیت: ﴿ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ ﴾ اوپر گزری ہوئی اس آیت کے مثل ہے: ﴿ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴾ [آل عمران: ١٢٦] "اور مدد تو اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے جو بہت زبردست، نہایت حکمت والا ہے۔" پھر اللہ پر توکل کرنے کا حکم دیا۔

خیانت نبی کو زیب نہیں دیتی:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، امام مجاہد اور حسن رحمہ اللہ وغیرہ کا قول ہے کہ خیانت کرنا نبی کو زیب نہیں دیتا۔[7] یہاں غلول سے خیانت مراد ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ بدر کے دن ایک قطیفہ (چادر) کھو گیا تھا۔ لوگوں نے کہا: شاید نبی اکرم ﷺ نے لے لیا ہے، اس پر یہ آیت اتری۔ اس کو ابو داود و ترمذی و ابن جریر رحمہ اللہ نے روایت

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٤٧) اس کی سند میں "محمد بن سائب کلبی" ضعیف راوی ہے۔ [2] مسند أحمد (٤/ ٢٢٧)

[3] تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٤٧) الدر المنثور (٢/ ٣٦٠) امام البانی رحمہ اللہ نے "السلسلة الضعيفة" (رقم الحديث: ٤٨٥٥) میں بحث کرتے ہوئے اس روایت کو ذکر کیا ہے اور اس کے صحیح نہ ہونے کا خیال ظاہر کیا ہے۔

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٢٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٢٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٤٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٧٠٠)

[5] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٤٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٧٠٠)

[6] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٤٧) تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٤٨۔ ٥٤٩) اس کی سند میں "محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ" ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٢٣١٧)

[7] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٠٣)

کیا ہے۔ ترمذی رحمہ اللہ نے حسن غریب کہا ہے۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ یہ تہمت منافقوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر لگائی تھی۔ اس پر یہ آیت آئی کہ پیغمبر کا یہ کام نہیں کہ وہ کوئی چیز چھپا رکھے۔[2]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خیانت کی جملہ اقسام سے پاک ومنزہ فرمایا، وہ خواہ امانتوں کو ادا کرنے کا معاملہ ہو یا غنیمت کی تقسیم وغیرہ کا معاملہ ہو۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک قول یہ ہے کہ نبی کو زیب نہیں دیتا کہ بعض لشکریوں کو دیں اور بعض کو نہ دیں۔[3] امام ضحاک رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا کہ نبی کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ اللہ تعالیٰ کی اُتاری ہوئی آیات واحکام میں سے بعض اُمت کو نہ پہنچائے۔[4] امام حسن بصری، طاؤس اور ضحاک رحمہم اللہ نے "یُغَلَّ" (پیش کے ساتھ) "یُخَانُ" کے معنی میں پڑھا ہے، یعنی رسول کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ وہ متہم بخیانت ہو، یعنی خیانت کی تہمت سے آلودہ ہو۔ امام قتادہ اور ربیع رحمہما اللہ نے کہا کہ یہ آیت بدر کے دن اتری ہے، اس دن بعض لوگوں نے کچھ خیانت کی تھی۔[5]

خائن کا انجام:

اس کہنے میں کہ خائن قیامت کے دن خیانت لائے گا، ہر ایک کو اس کے کیے کی پوری سزا ملے گی، سخت قسم کی ڈانٹ اور وعید ہے۔ سنتِ صحیحہ میں غلول اور خیانت کی ممانعت آئی ہے، ابو مالک اشجعی رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا غلول گز بھر زمین ہے، تم پاتے ہو دو آدمیوں کو کہ زمین یا گھر میں ایک دوسرے کے ہمسائے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک دوسرے کی گز بھر زمین لے لیتا ہے، وہ زمین قیامت کے دن سات زمین تک اس کے گلے کا طوق ہوگی۔[6] (رواہ أحمد) مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ جو کوئی ہمارے کسی کام کا والی ہوا اور اس کے پاس گھر نہیں ہے تو وہ گھر بنالے یا جورو نہیں ہے تو جورو کر لے یا خادم نہیں ہے تو خادم رکھ لے یا سواری نہیں ہے تو سواری لے لے۔ جس نے اس کے سوا کچھ لیا، وہ غال یعنی خائن ہے۔[7] (ھکذا رواہ أحمد)

اس کو ابو داود نے بھی روایت کیا ہے، مگر اس لفظ سے کہ جو کوئی عامل ہو، وہ بی بی کرے، اگر خادم نہ رکھتا ہو تو خادم بہم پہنچائے، اگر گھر والا نہ ہو تو گھر بنائے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ مجھے خبر ملی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

---

(1) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٣٩٧١) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٠٠٩) تفسیر الطبري (٧/ ٣٤٨) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٢٧٨٨)

(2) تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٤٨) (3) تفسیر الطبري (٧/ ٣٥١) تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٨٠٣) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

(4) تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٨٠٣۔ ٨٠٤) (5) تفسیر الطبري (٧/ ٣٥٣۔ ٣٥٤)

(6) مسند أحمد (٤/ ١٤٠) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وإسنادہ حسن" (مجمع الزوائد: ٤/ ٣١٠)

(7) مسند أحمد (٤/ ٢٢٩) اس روایت کی سند میں "عبداللہ بن لہیعہ" ضعیف راوی ہے۔ البتہ اگلی روایت اس کی تائید کرتی ہے۔

ہے کہ جو کوئی اس کے سوا کچھ لے گا، وہ غال ہے یا سارق (چور)۔[1] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ میں قیامت کے دن تم میں سے ایک پہچان والے کو دیکھوں گا، وہ ایک بکری کو لیے آئے گا، جو مَیں مَیں کرتی ہوگی، وہ مجھے پکارے گا: اے محمد! اے محمد! میں کہوں گا کہ میں تیرے لیے اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں، میں نے تجھ کو پہنچا دیا تھا۔ (الحدیث رواہ ابن جریر) اس حدیث میں اونٹ اور گھوڑے کا ذکر بھی مروی ہے کہ ان کو لادے ہوئے آئے گا، اونٹ بلبلاتا ہوگا، گھوڑا ہنہناتا ہوگا، ان کو بھی یہی جواب دوں گا: « لَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا قَدْ بَلَّغْتُكَ »[2]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: اس حدیث کو اہلِ کتبِ ستہ نے روایت نہیں کیا۔ سیدنا ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے قبیلہ ازد کے ایک شخص کو صدقات جمع کرنے کے لیے عامل مقرر کیا تھا، اس کو ابن اللتبیہ کہتے تھے۔ جب وہ آیا تو اس نے کہا: یہ مال تمھارا ہے اور یہ مال مجھ کو ہدیے میں ملا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے منبر پر جا کر فرمایا کہ عامل کا کیا حال ہے کہ ہم اس کو ایک کام پر مقرر کرتے ہیں، وہ کہتا ہے: « هٰذَا لَكُمْ وَهٰذَا أُهْدِيَ لِيْ » وہ اپنے ماں باپ کے گھر کیوں نہ بیٹھ رہتا، پھر دیکھتا کہ اس کو کوئی ہدیہ بھیجتا ہے کہ نہیں۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے! تم میں سے کوئی آدمی کچھ نہ لائے گا، مگر قیامت کے دن اس شے کو اپنی گردن پر لادے ہوئے آئے گا، اگر اونٹ ہو تو بلبلاتا ہوگا، اگر گائے ہوگی تو بیں بیں کرتی ہوگی، اگر بکری ہے تو میں میں کرتی ہوگی۔ پھر آپ ﷺ نے دونوں ہاتھ اتنے بلند کیے کہ آپ ﷺ کی بغلوں کی سفیدی ہم نے دیکھی، پھر فرمایا: « اَللّٰهُمَّ بَلَّغْتُ » ''اے اللہ! میں نے پہنچا دیا'' یہ کلمہ تین بار ارشاد فرمایا۔ سیدنا ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''بَصُرَتْهُ عَيْنِيْ وَسَمِعَتْهُ أُذُنِيْ'' یعنی اس حال کو میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا۔[3] (رواہ أحمد وأخرجاہ) سیدنا ابوحمید ساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ہدایا (تحفے) عمال کے غلول ہیں۔[4] حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ حدیث افرادِ احمد سے ہے، اس کی اسناد ضعیف ہے، گویا کہ اگلی حدیث سے مختصر کی گئی ہے۔[5] واللہ أعلم.

سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے مجھے یمن کی طرف بھیجا، جب میں چلا گیا، میرے پیچھے

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٩٤٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٤٨٦)

[2] تفسير الطبري (٧/ ٣٥٨۔ ٣٥٩) اس کی سند حسن ہے۔ نیز یہ روایت صحیحین میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ (صحيح البخاري، رقم الحديث: ٢٩٠٨، صحيح مسلم، رقم الحديث: ١٨٣١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٥٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣٢) مسند أحمد (٥/ ٤٢٣)

[4] مسند أحمد (٥/ ٤٢٤) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: إرواء الغليل (٨/ ٣٦٦) [5] تفسير ابن كثير (١/ ٥٤٩)

آدمی بھیج کر مجھے بلایا، جب میں آیا تو فرمایا کیا جانتے ہو کہ میں نے تجھے پھر کس لیے بلایا ہے؟ تو کوئی چیز میری اجازت کے بغیر نہ لینا، کیوں کہ وہ غلول ہے، جو کوئی غلول، یعنی خیانت کرے گا، وہ قیامت کے دن اس خیانت کو لائے گا۔ میں نے تجھے یہی بات کہنے کے لیے بلایا تھا، اب تو اپنے کام پر جا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔[1] عدی بن عمیرہ سے روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! تم میں سے جو کسی کام پر ہمارا عامل ہوا، پھر اُس نے ہم سے ایک سوئی کو یا اس سے زیادہ کو چھپایا تو وہ خیانت ہے، اس کو قیامت کے دن لائے گا۔

سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھ سے اپنا کام لے لیں، فرمایا: کیوں؟ کہا: میں نے آپ کو یوں فرماتے ہوئے سنا ہے، فرمایا: میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ جس کسی کو ہم کسی کام پر مقرر کریں، اس کو چاہیے کہ تھوڑا بہت سب لے آئے، پھر جو کچھ اس میں سے اس کو دیا جائے، وہ لے لے اور جس سے روکا جائے، اس سے رک جائے۔[2] (رواہ أحمد و مسلم و أبو داود) ابو رافع رضی اللہ عنہ نے کہا کہ معمول کے مطابق نبی اکرم ﷺ نمازِ عصر کے بعد بنی عبد الاشہل کی طرف جاتے ہوئے، ان سے باتیں کرتے، مغرب کے قریب واپس آتے، ایک دن مغرب کے لیے جلدی چلے آئے۔ بقیع پر گزرے، فرمایا: «أُفٍّ لَکَ أُفٍّ لَکَ» یہ بات میرے جی کو لگی، میں آپ کے پیچھے اس خیال سے رہ گیا کہ یہ بات مجھ سے کہی ہے۔ فرمایا: تجھے کیا ہوا جو تو پیچھے رہ گیا؟ میں نے کہا: آپ نے ایک نئی بات کہی، فرمایا: کیا؟ میں نے کہا: آپ نے مجھے «أُفٍّ لَّکَ» کہا؟ فرمایا: نہیں، لیکن یہ فلاں شخص کی قبر ہے، میں نے اس کو آلِ فلاں کے پاس صدقات جمع کرنے کے لیے بھیجا تھا، اس نے ایک نمریا درع (کپڑا) خیانت کر کے چھپا لیا، اس وقت اسی طرح کا آگ کا نمریا درع اس پر موجود ہے۔[3] (رواہ أحمد)

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ غنیمت کے اونٹ کی پشت سے ایک مٹھی بال لے کر فرماتے تھے کہ اس میں سے میرا حصہ ویسا ہی ہے، جیسا تم میں سے کسی ایک کا حصہ، تم غلول سے بچو۔ غال (خائن) پر قیامت کے دن رسوائی ہے، سوئی اور دھاگا دے دو اور جو اس سے بھی حقیر ہو، اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ قریب و بعید سے، حضر اور سفر میں، بے شک جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے، جہاد ہَم و غم سے نجات دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حدوں کو قائم کرو، قریب و بعید میں۔ تمھیں اللہ کے راستے میں کسی ملامت کرنے والی کی ملامت نہ روکے۔[4] (رواہ أحمد) عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ تم دھاگا اور

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٣٥) اس کی سند میں ''داود بن یزید اودی'' ضعیف راوی ہے۔

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٨١) مسند أحمد (٤/ ١٩٢)

[3] مسند أحمد (٦/ ٣٩٢) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٦٢)

[4] مسند أحمد (٥/ ٣٣٠) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٦٧٠)

سوئی تک پھیر دو، کیوں کہ غلول قیامت کے دن غال پر عار و نار و شنار ہے۔[1] (رواہ ابن ماجہ)

سیدنا ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے مجھ کو ساعی (عامل) بنا کر بھیجا۔ پھر فرمایا: جاؤ اے ابو مسعود! ایسا نہ ہو کہ میں قیامت کے دن تجھے اس حال میں پاؤں کہ تو آئے اور تیری پشت پر کوئی صدقے کا اونٹ چلا رہا ہو، تو نے اس کو خیانت کے طور پر لیا ہو۔ میں نے کہا: اب میں نہیں جاتا۔ فرمایا: میں بھی تجھ کو زبردستی نہیں بھیجتا۔[2] (تفرد به أبو داود) سیدنا بریدہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ جہنم میں ایک پتھر پھینکا جاتا ہے، وہ ستر برس تک گرتا ہے، لیکن اس کی تہہ میں نہیں پہنچتا۔ غلول کو لا کر اسی کے ساتھ پھینکتے ہیں، پھر غال (خائن) سے کہیں گے تو اس کو لے آ۔ آیت زیرِ تفسیر کا یہی مطلب ہے: ﴿وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾[3] (رواہ ابن مردویہ)

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ خیبر کے دن کچھ لوگ آئے، کہنے لگے: فلاں فلاں شہید ہوئے، یہاں تک کہ ایک آدمی کے پاس آ کر کہا کہ یہ بھی شہید ہوا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ہرگز نہیں، میں نے اس کو ایک چادر یا عبا کے پیچھے دوزخ کی آگ میں دیکھا ہے، اس چادر میں اس نے خیانت کی ہے۔ پھر فرمایا: جا لوگوں میں اعلان کر دے کہ جنت میں نہیں داخل ہوں گے مگر مومن۔ میں نے نکل کر اسی طرح سب میں منادی کر دی۔ (رواہ أحمد و مسلم) امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔[4] معلوم ہوا کہ خائن بے ایمان ہو جاتا ہے، جنت میں نہ جائے گا۔ اللھم غفراً. سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ تم جس کے سامان میں غلول پاؤ، اس کو جلا دو اور غال (خائن) کو مارو۔ (رواہ أحمد) ایک شخص کے سامان میں ایک مصحف پایا تھا، سالم بن عبداللہ رحمہ اللہ سے پوچھا، کہا: اس کو بیچ کر اس کی قیمت صدقہ کر دو۔[5] امام دارقطنی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ سالم کا فتویٰ تھا، امام احمد رحمہ اللہ اور اصحابِ احمد اسی طرف گئے ہیں۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا کہ غال کی سزا یہی ہے کہ اس کا سامان نکال کر جلا دیں۔ سیدنا علی المرتضی رضی اللہ عنہ کا یہی قول ہے، اتنا اضافہ کیا ہے کہ غال کو حدِ مملوک ماریں اور اس کو اس کے حصہ غنیمت سے محروم رکھا جائے۔ امام ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور جمہور رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ اس کا سامان جلائیں نہیں، بلکہ بقدرِ غلول تعزیر دیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ غال پر نماز پڑھنے سے رک گئے اور اس کا سامان نہ جلایا۔[6] واللّٰه أعلم. خمیر بن مالک رحمہ اللہ نے

---

[1] سنن ابن ماجہ میں اس روایت کے بجائے اس جیسی روایت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ البتہ ان الفاظ کے ساتھ یہ روایت مسند احمد میں مروی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٥٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٨٦٩) مسند أحمد (٢/ ١٨٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٨٨٣)

[2] المعجم الكبير (٢/ ٢١) شعب الإيمان (٤/ ٦٤) اس کی سند میں ''محمد بن ابان جعفی'' ضعیف راوی ہے۔

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٩٤٧) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٥٧٦)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٤) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٧٤) مسند أحمد (١/ ٣٠)

[5] مسند أحمد (١/ ٢٢) اس کی سند میں ''صالح بن محمد بن زائدہ'' ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٧١٧)

[6] تفسير ابن كثير (١/ ٥٥٢)

کہا: مصاحف کو لُوٹنے کا حکم ہے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم میں سے جو کوئی مصحف کو غلول کر سکے تو کرے، کیوں کہ جو کوئی کسی چیز کو غلول کرے گا، وہ اس چیز کو قیامت کے دن لائے گا۔ پھر کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے ستر بار سُنا ہے۔ کیا میں اس چیز کو چھوڑ دوں، جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ سے لی ہے۔[1]

ابراہیم رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ جب مصاحف کو جلانے کا حکم دیا گیا تو سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: اے لوگو! مصاحف کو غلول کرو، جو کوئی غلول کرے گا، وہ قیامت کے دن غلول کو لائے گا، بہتر غلول مصحف ہے، جس کو تم میں سے ایک قیامت کے دن لائے گا۔[2] (رواہ وکیع في تفسیرہ) سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی غنیمت حاصل کرتے تو بلال کو حکم دیتے کہ لوگوں میں پکارو کہ اپنی اپنی لوٹ اکٹھی کرو، پھر اس کو تخمیس کرتے (یعنی اس میں سے اللہ اور رسول کا پانچواں حصہ نکالتے) اور تقسیم فرماتے۔ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی ندا کے بعد ایک آدمی بالوں کی لگام لایا، کہا: میں نے غنیمت میں پائی تھی۔ فرمایا: تو نے بلال کا پکارنا سنا تھا؟ تین بار اس نے کہا: ہاں! فرمایا: پھر تجھ کو کس نے روکا کہ تو اس کو لے آتا؟ اس نے عذر کیا، فرمایا: نہیں تو اس کو قیامت کے دن لے کر آئے گا، میں تجھ سے نہیں لیتا۔[3] (رواہ أبو داود)

امین اور خائن برابر نہیں:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ شخص جو اللہ کی شریعت میں اس کا فرماں بردار ہوا، اجرِ جزیل کا حق دار ٹھہرا اور سخت عذاب سے امن میں ہوگیا، وہ اس شخص کے برابر نہیں ہے، جو اللہ تعالیٰ کے غضب کا مستحق ہوا اور غضب اس کے گلے بندھ گیا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ قرآنِ کریم میں آیت زیرِ تفسیر کے بہت نظائر آئے ہیں۔ جیسے اللہ کا فرمان ہے: ﴿ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ﴾ [الرعد: ١٩] ''کیا پھر وہ شخص جو جانتا ہے کہ یقیناً جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے، وہی حق ہے، وہ اس شخص کے مانند (ہوسکتا) ہے جو اندھا ہے؟'' نیز اس کا فرمان ہے: ﴿ اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴾ [القصص: ٦١] ''بھلا وہ شخص جسے ہم نے اچھا وعدہ دیا، پھر وہ اس (وعدے) کو پانے والا ہے، کیا اس شخص جیسا ہے، جسے ہم نے دنیاوی زندگی کا بہت فائدہ دیا، پھر وہ قیامت کے دن (عذاب میں) حاضر کیے جانے والوں میں سے ہوگا؟''

حسن بصری اور محمد بن اسحاق رحمہما اللہ نے کہا کہ مراد یہ ہے کہ اہلِ خیر اور اہلِ شر کے درجے ہیں۔ ابوعبیدہ اور

---

[1] مسند أحمد (١/ ٤١٤) [2] تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٥٢)

[3] سنن ابی داود میں ان الفاظ کے ساتھ روایت یہ سیدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کے بجائے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ دیکھیں: سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢٧١٢) صحیح الترغیب والترهیب (٢/ ٦١)

کسائی نے کہا: منازل ہیں، یعنی جنت کے درجے اور جہنم کے طبقے ہیں،[1] جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴾ [الأحقاف: ۱۹] ''اور ہر ایک کے لیے اس کے اعمال کے مطابق درجے ہیں، تاکہ وہ (اللہ) انھیں ان کے اعمال کا پورا بدلہ دے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔'' اسی لیے فرمایا ہے کہ جو کچھ وہ کرتے ہیں، اس کو اللہ دیکھتا ہے، یعنی ان کے اعمال کی پوری پوری سزا جزا دے گا، نہ خیر میں ظلم کرے گا نہ شر میں زیادتی فرمائے گا، بلکہ ہر عامل کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دے گا۔

بعثتِ نبوی کا احسانِ عظیم اور نبی کا بشر ہونا:

پھر ایک دوسرے احسان کا ذکر کیا کہ دیکھو ہم نے نبی تمھاری جنس کا بھیجا ہے، تاکہ تم اس سے بات چیت کر سکو، اس کے پاس اُٹھو بیٹھو، اس سے سوال کرو، ہر طرح نفع لو، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا ﴾ [الروم: ۲۱] ''اور (یہ بھی) اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھارے لیے تمھاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّاۤ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ﴾ [الفرقان: ۲۰] ''اور (اے نبی!) ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی رسول بھیجے، بلاشبہ وہ کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے تھے۔''

نیز فرمایا: ﴿ قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ﴾ [الكهف: ۱۱۰] ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: میں تو بس تمھاری ہی طرح بشر ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا الٰہ صرف ایک الٰہ ہے، پھر جو شخص کہ اپنے رب کی ملاقات کی اُمید رکھتا ہو تو وہ عمل کرے نیک عمل اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ ٹھہرائے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْۤ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ﴾ [يوسف: ۱۰۹] ''اور آپ سے پہلے ہم نے مرد ہی (رسول بنا کر) بھیجے، ان کی طرف ہم وحی کرتے تھے (اور) وہ بستیوں کے رہنے والوں میں سے تھے۔'' نیز فرمایا: ﴿ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ ﴾ [الأنعام: ۱۳۰] ''اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! کیا تمھارے پاس تمھی میں سے رسول نہیں آئے تھے؟''

غرض یہ کہ رسول کا ان لوگوں کی جنس میں سے ہونا، جن کی طرف وہ بھیجا گیا، ایک اعلیٰ درجے کا احسان ہے، کیوں کہ اس کے ساتھ بات چیت کرنے اور اس کے کلام کو سمجھنے کے لیے اس کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے، ورنہ بہت دشواری ہوتی۔ اس لیے اس کے بعد یہ فرمایا ہے کہ وہ رسول تم پر قرآن پڑھتا ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کر کے تم کو سنوارتا ہے، تاکہ تم ہر طرح کی میل کچیل سے صاف ستھرے ہو جاؤ اور تمھارے دل اس خباثت اور ناپاکی سے پاک صاف ہو

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۵۵۲)

جائیں جو حالتِ شرک اور جاہلیت میں تم سے لپٹی ہوئی تھیں۔ اس رسول کے آنے سے پہلے تم کھلی گمراہی اور ظاہر جہالت اور سرکشی میں گرفتار تھے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ اس جگہ کتاب وحکمت سے مراد قرآن وسنت ہے۔[1]

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں کہا گیا ہے کہ ﴿ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ ﴾ سے مراد جفا کرنے والا، سخت دل، بدخلق اور شک کرنے والا ہے۔ راغب نے کہا: فظ "كريه الخُلق" (بد اخلاق) کو کہتے ہیں، غلظِ قلب دل کی سختی، نافرمانی اور عدمِ پشیمانی کو کہتے ہیں۔ اس جگہ ان دونوں لفظوں کو تاکید کے لیے جمع فرمایا ہے۔ "انفضاض" اجزاء کے بکھر جانے کو کہتے ہیں یا انتشارِ ابعاض کو۔ یعنی اگر تم بدخلق، بدزبان اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمھارے اردگرد نہ پھرتے، تمھارے ڈر اور دہشت کی وجہ سے تمھیں تنہا چھوڑ کر چل دیتے، لہٰذا تم ان سے اپنے حقوق کو معاف کرو اور اُن کے لیے بخشش مانگو، ان سے بالخصوص جنگ کے معاملے میں صلاح مشورہ لیتے رہو کہ ان کا جی تم سے خوش ہو۔ تمھاری محبت ان کے دل میں آئے۔ اُمت بھی جان لے کہ مشورہ لینا مشروع ہے، پھر تمھارے بعد کوئی اس میں عار نہ کرے۔ اس جگہ مراد غیر شرعی (انتظامی وتدبیری) امور میں مشورہ ہے۔

ابن خواز منداد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سرداروں، حکام اور بادشاہوں پر واجب ہے کہ وہ جن امور کو نہیں جانتے، ان میں علما سے مشاورت کریں، مثلاً: دنیا کے مشکل ترین امور، لشکر کے سرداروں سے ان امور میں مشورہ لینا، جن کا تعلق جنگ سے ہے۔ لوگوں کے سرداروں سے ان امور میں مشورہ لینا، جن کا تعلق ملک کے مصالح سے ہے۔ سرکاری شعبے میں وزرا، عمال اور کاتبوں کے سرداروں سے ان اُمور میں مشورہ لینا، جن کا تعلق عوام الناس اور شہروں کی اصلاح سے ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے ابن عطیہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ جو شخص اہلِ علم ودین سے مشورہ نہیں لیتا، اس کو معزول کرنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔[2]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ جب آیت: ﴿ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ﴾ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سن رکھو کہ اللہ اور رسول مشورے سے بے پروا ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے مشورہ لینے کو میری اُمت کے لیے رحمت ٹھہرایا ہے، میری اُمت میں سے جو کوئی مشورہ کرے گا، وہ رشد (ہدایت) سے محروم نہیں ہوگا اور جو مشورہ لینا چھوڑ دے گا، اس سے سرکشی معدوم نہیں ہوگی۔ (رواه ابن عدي والبيهقي في الشعب) امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا: اس حدیث کی سند حسن ہے۔[3] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے مشورہ لینے کی کچھ

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۵۵۳) [2] تفسير القرطبي (٤/ ٢٤٩، ٢٥٠)

[3] الكامل لابن عدي (٤/ ٣٣٧) شعب الإيمان (٦/ ٧٦) الدر المنثور (٢/ ٣٥٩) اس کی سند میں "عباد بن کثیر رملی" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٥٨٦٨)

ضرورت نہیں ہے، لیکن یہ چاہا کہ ان کی اُمت ان کے بعد اس سنت پر چلے۔[1] کسی نے کہا کہ یہ حکم اس لیے دیا کہ ان کی فہموں اور عقلوں کا معیار معلوم ہو جائے نہ یہ کہ ان سے رائے لی جائے۔

امام بغوی رحمہ اللہ نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو مشورہ لینے والا نہیں دیکھا۔[2] لوگوں سے مشاورت کرنے کے بہت سے فائدے ہیں۔ بعض مفسرین نے وہ فوائد ذکر کیے ہیں، ہمیں صرف اتنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کرنے کا حکم دیا ہے، اس سے بڑھ کر مشاورت کی اور کیا فضیلت ہوگی؟ پھر فرمایا کہ جب کسی چیز کا عزم کر لیا تو اللہ پر بھروسا رکھ کر اسی پر وثوق کر نہ کہ مشاورت پر۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ توکل اس کا نام نہیں کہ تدبیر کرنا چھوڑ دے، ورنہ مشاورت کا حکم توکل کے خلاف ٹھہرے گا، بلکہ توکل وہ ہے کہ ظاہری بہتری کو تلاش کرنا نہ چھوڑے، اس کے ساتھ معاملے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرے اور دل سے اللہ ہی پر بھروسا اور اعتماد ہو۔

گفت پیغمبر باآواز بلند　　　بر توکل زانوئے شتر بہ بند

''نبی نے اونچی آواز سے اس حقیقت کا اظہار کیا کہ پہلے اونٹ کا گھٹنا باندھ، پھر اللہ پر بھروسا رکھ۔''

جس نے یہ بات جان لی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار نہیں ہے اور جس کی مدد پر اللہ تعالیٰ ہے، اس پر کوئی غالب نہ ہوگا اور جس کو اللہ تعالیٰ نے چھوڑ دیا ہے، اس کا کوئی ناصر نہیں تو اس نے اپنا کام اللہ کے سپرد کیا، وہی شخص متوکل علی اللہ ہے اور غیر اللہ کے ساتھ مشغول نہیں ہے، مومنوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسا رکھا کریں، نہ کہ کسی اور پر۔ ظرف کی فعل پر تقدیم مفید قصر ہوتی ہے۔ توکل کے بارے میں بہت سی صحیح حدیثیں آئی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متوکل کو ان ستر ہزار شخصوں میں گنا ہے جو جنت میں بغیر حساب جائیں گے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے:[3] اے اللہ! تو مجھ کو توکل دے، تو دنیا اور آخرت میں میرا ناصر ہو، مجھ پر میرے دشمنوں کو غالب نہ کر، میری توبہ قبول کر، مجھ کو بخش دے، تیرے سامنے اس سوال کا قبول کرنا کچھ حقیقت نہیں ہے۔

ابو عبید نے کہا: غلول بالخصوص غنیمت کے مال میں ہوتا ہے۔[4] اس جگہ غلول کو انبیا کے ساتھ خاص کیا، حالاں کہ غیر انبیا کا خیانت کرنا بھی حرام ہے، خواہ ائمہ وسلاطین کریں یا امراء ورؤسا وغیرہم۔ یہ اس لیے کہ انبیا کی خیانت بہت بڑا گناہ اور بہت عظیم وبال ہے۔ غال جب غلول کی چیز قیامت کو لائے گا تو ساری مخلوق کے سامنے رسوا ہوگا اور اس کے حساب اور عذاب کو سارے لوگ دیکھیں گے، اہلِ محشر اس کے حال پر مطلع ہوں گے۔ غلول کی مذمت اور غلول کرنے والے کی وعید کے متعلق بہت حدیثیں آئی ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان کو ذکر کیا ہے،[5] وہ سب کتبِ سنت میں تحریر ہیں۔

---

[1] تفسير البغوي (٢/ ١٢٤)　[2] تفسير البغوي (٢/ ١٢٤)　[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٨)

[4] تفسير القرطبي (٤/ ٢٥٥)　[5] تفسير ابن كثير (١/ ٥٤٨_ ٥٥٢)

﴿ مِنْ اَنْفُسِهِمْ ﴾ سے مراد "من جنسھم" ہے، یعنی عربی رسول بھیجا، جو ان کے شہر میں پیدا ہوا تھا، وہ اس کے نسب کو جانتے پہچانتے ہیں، یا ان کی طرح کا ایک بشر بھیجا، اگر کوئی فرشتہ نبی ہو کر آتا تو کمال اُنس حاصل نہ ہوتا۔ لفظ ﴿ اَنْفُسِهِمْ ﴾ کو بفتح فا (ف) بھی پڑھا ہے۔ یعنی بہتر سے بہتر قوم وقبیلہ سے بھیجا اور اشرف عرب سے اٹھایا، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ بنی ہاشم میں سے تھے، بنو ہاشم افضل قریش تھے، قریش افضل عرب تھے۔ عجم سے عرب افضل ہیں۔ احسان یہ ہوا کہ لوگ اشرف بنی آدم کے زیادہ فرماں بردار اور تصدیق کرنے والے ہوتے ہیں۔ بنو ہاشم بزرگی اور حسب ونسب کی عزت کے اعتبار سے عرب وعجم کے بہترین تھے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ ﴾ [الزخرف: ٤٤] "اور یقیناً یہ (قرآن) آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے ایک نصیحت ہے۔" ابو طالب نے جب نبی اکرم ﷺ کا سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے بیاہ کیا اور اس تقریب میں مضر اور بنو ہاشم کے رؤسا حاضر تھے تو یہ خطبہ پڑھا: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ جَعَلَنَا مِنْ ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيْمَ وَزَرْعِ إِسْمَاعِيْلَ وَضِئْضِئِ مَعدٍ وَ عُنْصُرِ مُضَرَ وَجَعَلَنَا سَدَنَةَ بَيْتِهٖ وَسُوَّاسَ حَرَمِهٖ وَجَعَلَ لَنَا بَيْتاً مَحْجُوْجًا وَحَرَماً آمِنًا وَجَعَلَنَا الْحُكَّامَ عَلَى النَّاسِ وَإِنَّ ابْنِيْ هٰذَا مُحَمَّدَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ لَا يُوْزَنُ بِهٖ فَتًى إِلَّا رَجَحَ وَهُوَ وَاللّٰهِ بَعْدَ هٰذَا لَهٗ نَبَأٌ عَظِيْمٌ وَخَطْبٌ جَلِيْلٌ" "تمام تعریفات اس اللہ کے لیے جس نے ہمیں ابراہیم کی اولاد، اسماعیل کی کھیتی، معد کی نسل اور مضر کے عنصر سے بنایا، اس نے ہمیں اپنے گھر کے خادم اور اپنے حرم کے منتظم بنایا، اس نے ہمارے لیے وہ گھر بنایا، جس کا حج کیا جاتا ہے اور وہ حرمت اور امن والا ہے، اس نے ہمیں لوگوں کا حاکم بنایا، میرے اس بیٹے محمد بن عبداللہ کے ساتھ جس نوجوان کو بھی تولا جائے گا، اس کا پلڑا جھک جائے گا، پھر اس کے بعد اللہ کی قسم! اس کی بڑی شان اور ناموری ہوگی۔" اللہ تعالیٰ نے تلاوتِ آیات وتزکیہ، تعلیم قرآن وحدیث کا احسان یاد کروایا، کیوں کہ وہ لوگ اہلِ جاہلیت تھے، شرع کو پہچانتے تھے نہ ان کے کان نے کبھی وحی کو سنا تھا۔[1]

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ 165 وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ 166 وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ښ وَقِيْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا

[1] فتح البیان (۲/ ۳۶۳۔ ۳۷۰)

لَا اتَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ
يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ
بِمَا يَكْتُمُوْنَ ۝١٦٧ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا
مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ۝١٦٨

بھلا تمھارا کیا حال ہے جب (اُحد میں) تم پر مصیبت آ پڑی تو تم کہنے لگے کہ یہ کہاں سے آئی ہے؟ حالاں کہ (بدر میں) تم نے اس سے دگنی مصیبت کافروں کو پہنچائی تھی۔ کہہ دیجیے کہ یہ مصیبت تمھاری اپنی لائی ہوئی ہے، بے شک اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے (165) اور اُحد کے دن جب دونوں لشکر باہم ٹکرائے تو تمھیں جو (نقصان) پہنچا، وہ اللہ کے حکم سے تھا، اور اس لیے تھا کہ اللہ جان لے کہ مومن کون ہیں (166) اور یہ بھی جان لے کہ منافق کون ہیں اور ان منافقوں سے کہا گیا تھا: آؤ! اللہ کے راستے میں لڑو یا (شہر کا) دفاع کرو۔ انھوں نے کہا: اگر ہمیں جنگ ہونے کا یقینی علم ہوتا تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ وہ اس روز ایمان کی نسبت کفر کے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنے مونہوں سے وہ بات کہہ رہے تھے جو ان کے دلوں میں نہیں تھی اور اللہ وہ بات خوب جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں (167) یہ وہی لوگ ہیں جو خود تو پیچھے بیٹھے رہے اور اپنے بھائیوں سے (جو لڑائی میں مارے گئے) کہنے لگے: اگر وہ ہماری بات مانتے تو قتل نہ ہوتے۔ ان سے کہہ دیجیے: اگر تم اس بات میں سچے ہو تو اپنی موت آنے پر اسے ٹال کر دکھانا (168)

اُحد میں پہنچنے والی پریشانی کا سبب اور حکمت:

یعنی تم بدر کی لڑائی میں ستر کافروں کو مار چکے اور ستر کو پکڑ لائے تھے، تمھارے اس لڑائی میں ستر آدمی شہید ہوئے تو پھر بددل کیوں ہوتے ہو، لہٰذا یہ بھی تمھارے قصور کا نتیجہ ہے کہ بدنظمی سے لڑے یا یہ قصور کہ تم نے بدر کے اسیروں کو نہ مارا اور مال لے کر چھوڑ دیا۔ یہ بھی منافقوں کا کلام تھا کہ اگر ہم کو لڑائی معلوم ہو، یعنی ظاہر میں کہا کہ جس وقت لڑائی دیکھیں گے تو شامل ہوں گے یا کہا کہ ہم لڑائی کے قاعدے سے واقف نہیں اور دل میں یہ اعتراض کیا کہ ہماری مشورت نہیں مانتے، ان کو لڑائی معلوم نہیں۔

اسی لفظ سے کفر کے قریب ہوگئے، ایمان سے دور جا پڑے۔ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب آیندہ سال اُحد کا دن آیا، جو کام بدر کے دن کیا تھا، اس کی سزا میں گرفتار ہوئے۔ وہ کام یہ تھا کہ فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ ستر صحابی مارے گئے، لوگ بھاگ اُٹھے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دانت مبارک شہید ہوئے، سر پر خول تھا، وہ چپک گیا۔ سر مبارک میں چوٹ آئی اور خون بہا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ مصیبت تم پر تمھاری وجہ سے آئی ہے۔ (رواہ ابن أبي حاتم و رواہ أحمد بأطول منه وهكذا قال الحسن البصري)[1] سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں کہ جبریل علیہ السلام نے آ کر کہا: اے محمد! اللہ تعالیٰ نے اسیر کرنے میں تیری قوم کا کام ناپسند کیا ہے۔ تم کو یہ حکم دیا تھا کہ دو باتوں میں سے ایک بات کرو یا تو ان کو مار ڈالو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ ذکر کیا۔ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! وہ ہمارے ہم قبیلہ اور بھائی بند ہیں، ہم فدیہ لیں کہ ہم کو دشمن سے لڑنے پر قوت حاصل ہو اور جتنے لوگ ان کے مارے گئے ہیں، اتنے ہمارے شہید ہوں۔ اس امر میں ہمیں کوئی بات ناپسند نہیں ہے۔ اس پر اُحد کے دن اسیرانِ اہلِ بدر کی تعداد کے برابر مسلمین مارے گئے۔ (رواہ ابن جریر و الترمذي والنسائي)

امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث غریب ہے۔[2] محمد بن اسحاق، ابن جریر، ربیع بن انس اور سدی رحمہم اللہ نے کہا: ﴿ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ﴾ کے یہ معنی ہیں کہ تم نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کہنا نہ مانا، تمھارے تیر انداز جگہ چھوڑ کر لوٹنے کے لیے بھاگے، حالاں کہ ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، وہ ہرگز اپنی جگہ سے نہ ہلیں۔ اس لیے یہ تکلیف تم پر پڑی۔[3] جب دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا تو بھاگ نکلے، دشمنوں نے تمھاری ایک جماعت کو قتل کیا، کچھ لوگوں کو زخمی کیا، یہ سب اللہ کی قضا و قدر و حکمت سے ہوا۔ مومن منافق پہچان لیے گئے، جو مومن تھے، وہ ثابت قدم رہے متزلزل نہ ہوئے، جو منافق تھے، یعنی عبداللہ بن اُبی ابن سلول کے ساتھی، وہ اس کے ہمراہ مدینہ کی طرف پھر گئے۔ راستے میں کچھ مومن ملے، انھوں نے جنگ کے لیے آنے اور مسلمین کی مدد کے لیے کہا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بھلا موت کو دور تو کر کے دکھاؤ۔

تابعینِ عظام رحمہم اللہ و صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُحد کے دن ایک ہزار آدمی لے کر نکلے۔ چلتے چلتے جب اُحد اور مدینہ کے درمیان پہنچے تو عبداللہ مذکور تہائی لشکر لے کر چل دیا۔ اہلِ شک و نفاق اس کے ہمراہ ہوگئے، کہا: ہم نہیں جانتے کہ کس بات پر اپنی جان دیں۔ سیدنا ابن عمرو بن حرام رضی اللہ عنہ نے کہا: اے قوم!

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۸۱۰) مسند أحمد (۱/ ۳۰) اس کی سند حسن ہے۔

[2] تفسیر الطبري (۷/ ۳۷۶) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۱۵٦۷) سنن النسائي الكبرىٰ (۵/ ۲۰۰) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔ (إرواء الغلیل: ۵/ ۴۸۔ ۴۹)

[3] تفسیر الطبري (۷/ ۳۷۱۔ ۳۷۵)

اللہ کو یاد کرو، رسول اللہ ﷺ کو نہ چھوڑو، دیکھو! دشمن تمھارے سر پر آ گیا ہے۔ قوم نے کہا: اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ لڑائی ہوگی تو ہم تمھارے ہمراہ رہتے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ لڑائی نہیں ہوگی۔ یہ کہہ کر پھر گئے، ان کا کہنا نہ مانا۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے کہا: اے اللہ کے دشمنو! اللہ تعالیٰ تم کو دور کرے، اللہ تعالیٰ ہمیں تمھارا محتاج نہیں رکھے گا۔ نبی اکرم ﷺ آگے بڑھے۔[1] اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ اس دن کفر سے قریب تر ہو گئے۔

اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ آدمی کا حال اُلٹتا پلٹتا رہتا ہے، کبھی کفر سے قریب تر ہو جاتا ہے، کبھی ایمان سے۔ ان کو یہ بات بہ خوبی معلوم تھی کہ مشرکین کا لشکر دور کے شہروں سے مسلمانوں کو خراب کرنے کے لیے آیا ہے، جو سردار بدر کے دن مارے گئے تھے، ان کا بدلہ لینا چاہتا ہے، مسلمانوں سے وہ دوگنا ہیں، لڑائی ضرور ہوگی۔ مگر منہ سے یہ کہتے تھے کہ لڑائی نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو تم دل میں چھپاتے ہو، وہ ہمیں معلوم ہے، یہ تمھاری باتیں ہیں کہ اگر مسلمان ہمارے مشورے پر چلتے تو مارے نہ جاتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر گھر میں بیٹھ رہنے سے کوئی شخص موت اور قتل سے بچ سکتا ہے تو بہتر ہے، تم نہ مرنا، حالاں کہ موت آئے بغیر نہیں رہتی۔ کیسے ہی پختہ برجوں کے اندر کیوں نہ چھپے رہو۔ تم اگر سچے ہو تو موت کو نہ آنے دو۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ آیت عبداللہ بن اُبی ابن سلول کے حق میں اُتری ہے۔[2] کہتے ہیں: جس دن منافقوں نے وہ بات کہی تھی، اس دن ستر منافق بغیر لڑے بھڑے گھر سے نکلے اور مر گئے، اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹا ثابت کر دیا۔

فتح البیان میں ہے کہ جو عتاب اللہ تعالیٰ نے آیت: ﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهٗۤ اَسۡرٰى حَتّٰى يُثۡخِنَ فِى الۡاَرۡضِ﴾ [الأنفال: ٦٧] ''کسی نبی کے لائق نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں، یہاں تک کہ وہ زمین میں خوب خون ریزی (انھیں قتل) کرے۔'' میں فدیہ لینے والوں پر کیا ہے، وہ پہلے اختیار دیے جانے کی حدیث پر مشکل ہے۔ اس دن نبی اکرم ﷺ اور ابوبکر روئے اور فدیہ لینے پر نادم ہوئے۔ یہ فدیہ لینا اگر اختیار دیے جانے کے بعد ہوتا تو نہ اللہ کا عتاب ہوتا اور نہ نبی کریم ﷺ کو ندامت اور غم ہوتا اور نہ نبی اکرم ﷺ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کو صحیح بتاتے، کیوں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا تھا کہ قیدی قتل کیے جائیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر عقوبت اترتی تو سوائے عمر کے کوئی نہ بچتا۔ ان دونوں میں تطبیق یوں ہوگی کہ عتاب پہلے اترا تھا، پھر تخییر نازل ہوئی۔ عتاب شروع اور فدیہ لینے کے ارادے پر تھا، تخییر اس کے اتمام پر ہوئی۔[3] واللہ أعلم

---

[1] تفسیر الطبري (٧/ ٣٧٨) [2] تفسیر الطبري (٧/ ٣٨٣) اس کی سند میں ''حسین بن داود'' ضعیف راوی ہے۔
[3] فتح البیان (٢/ ٣٧١)

وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ
بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۙ﴿۱۶۹﴾ فَرِحِيْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ
مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ
خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۘ﴿۱۷۰﴾ يَسْتَبْشِرُوْنَ
بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ۚۛ﴿۱۷۱﴾ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ
اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ؕۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۚ﴿۱۷۲﴾
اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ
فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖۗ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ
الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ
سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ
الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

ان لوگوں کو مردہ خیال نہ کرو جو اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں، انھیں ان کے رب کے ہاں رزق دیا جاتا ہے (169) جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا اس پر وہ خوش ہیں اور ان (مومنوں) کے بارے میں بھی خوشی محسوس کرتے ہیں جو ابھی تک ان سے نہیں ملے اور ان کے پیچھے (دنیا میں) رہ گئے ہیں کہ انھیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے (170) وہ اللہ کی نعمت اور اس کا فضل عطا ہونے پر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اور بے شک اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا (171) یہی لوگ ہیں جنھوں نے جنگ میں زخم لگنے کے بعد اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانا، ان میں سے جو لوگ نیکوکار اور پرہیزگار ہیں، ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے (172) انھی سے لوگوں نے کہا تھا کہ تمھارے خلاف ایک بڑی فوج جمع ہوئی ہے، پس تم ان سے ڈرو، تب اس بات نے ان کے ایمان میں اضافہ کر دیا اور انھوں نے کہا: ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہت

اچھا کارساز ہے (173) پھر وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ لوٹے، انھیں کوئی نقصان نہ پہنچا اور انھوں نے پیروی کی اللہ کی رضا کی، اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے (174) یہ تو شیطان ہی ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، پس تم ان سے نہ ڈرو اور صرف مجھ سے ڈرو، اگر تم مومن ہو (175)

شہدا کی فضیلت:

موضح قرآن میں ہے کہ شہیدوں کو مرنے کے بعد ایک اور طرح کی زندگی حاصل ہوتی ہے، جو دیگر مردوں کو حاصل نہیں ہوتی۔ کھانا پینا پوری خوشی اور عیش ہے، جو دوسروں کو قیامت کے بعد ہوگی۔ جب جنگِ اُحد ختم ہوئی تو ابوسفیان جو کافروں کا سردار تھا، وہ کہہ گیا کہ اگلے سال بدر پر پھر لڑائی ہوگی۔ نبی اکرم ﷺ نے قبول کرلیا۔ جب اگلا سال آیا تو نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ لڑائی کے لیے چلو، اس وقت جنھوں نے رفاقت کی اور تیار ہوئے ان کے لیے یہ بشارت ہے کہ شکست کے بعد پھر جرأت کی۔ ابوسفیان نے چاہا کہ نبی اکرم ﷺ وعدے کے مطابق نہ آئیں، تاکہ الزام انہی پر رہے اور لڑائی سے خوف کھایا۔ ایک شخص مدینہ کی طرف جاتا تھا، اس کو کچھ دینا کیا اور کہا کہ وہاں جاکر اس طرف کی ایسی خبریں کہنا کہ وہ خوف کھائیں اور جنگ کے لیے نہ آئیں۔ وہ شخص مدینہ میں پہنچ کر کہنے لگا کہ مکہ کے لوگوں نے بڑی جمعیت کی ہے، تمھارے لیے لڑنا اچھا نہیں۔ مسلمانوں کو حق تعالیٰ نے استقلال دیا، کہا کہ ہم کو اللہ کافی ہے، آخر بدر پر گئے، تین روز رہ کر تجارت کر کے نفع لے کر پھر آئے۔ اگلی آیتوں میں بھی یہی ذکر ہے، وہ شخص جو بات کہتا تھا، اس کو شیطان سکھاتا تھا۔

اللہ پاک نے اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ شہدا اگرچہ دنیا میں مارے گئے اور قتل ہوئے ہیں، لیکن ان کی روحیں دارالقرار میں رزق پاتی ہیں۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ نے چالیس یا ستر آدمی بئرِ معونہ کی طرف بھیجے تھے، اس پانی پر عامر بن طفیل جعفری امیر تھا۔ ان میں سے ایک آدمی نے جاکر ان لوگوں سے کہا: اے بئرِ معونہ والو! میں رسول اللہ ﷺ کا قاصد ہوں، تمھارے پاس آیا ہوں، اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں، سو تم اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ۔ اس پر ایک آدمی گھر میں سے نیزہ لے کر نکلا اور اس شخص کے پہلو میں مارا تو وہ آر پار ہوگیا۔ اس نے کہا: "اَللّٰهُ أَكْبَرُ فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ" "اللہ اکبر، ربِ کعبہ کی قسم! میں کامیاب ہوگیا" پھر اس کے پیچھے جاکر باقی سب لوگوں کو عامر بن طفیل نے قتل کر ڈالا۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں قرآن نازل فرمایا: "بَلِّغُوا عَنَّا قَوْمَنَا قَدْ لَقِينَا رَبَّنَا فَرَضِيَ عَنَّا وَرَضِينَا عَنْهُ" "ہماری قوم کو ہمارا یہ پیغام پہنچا دو کہ ہم نے اپنے رب سے ملاقات کی ہے، وہ ہم سے راضی ہے اور ہم اُس سے۔" پھر یہ آیت منسوخ ہو کر اٹھالی گئی، ہم مدت تک اس کو پڑھا کرتے تھے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے آیت زیرِ تفسیر نازل فرمائی۔[1] امام مسروق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم نے عبداللہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آیت زیرِ تفسیر کا کیا مطلب ہے؟ کہا: یہی بات ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھی تھی، فرمایا: ان کی روحیں سبز پرندوں کے اندر ہیں، عرش کے نیچے قندیلیں لٹکتی رہتی ہیں، یہ روحیں ان میں رہتی ہیں، جنت میں جہاں چاہتی ہیں چرتی ہیں، پھر ان قندیلوں میں آ کر بسیرا کرتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو جھانک کر کہا: تم کچھ چاہتے ہو؟ انھوں نے کہا: ہم کیا چاہیں، ہم جہاں چاہتے ہیں جنت میں چرتے پھرتے ہیں۔ تین بار یہی بات ان سے فرمائی، جب انھوں نے دیکھا کہ بغیر سوال کیے نہیں چھوٹتے تو کہا: اے رب! ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری جانیں ہمارے بدنوں میں پھیر دی جائیں، تاکہ ہم تیری راہ میں پھر دوبارہ مارے جائیں۔ اللہ نے جب دیکھا کہ ان کو کوئی حاجت نہیں ہے تو چھوڑ دیا۔[2] (رواه مسلم وقد روى نحوه من حديث أنس و أبي سعيد) سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ مرفوع یوں ہیں کہ کوئی نفس ایسا نہیں، جو مرا اور اللہ کے پاس اس کے لیے کچھ بھلائی ہو، اسے دنیا کی طرف لوٹ کر جانا اچھا لگتا ہو، مگر شہید کہ اسے دنیا کی طرف واپس جانا اچھا لگتا ہے، تاکہ وہ دوبارہ مارا جائے، کیوں کہ وہ شہادت کی فضیلت کو دیکھ چکا ہے۔[3] (رواه أحمد وتفرد به ومسلم)

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: تجھے معلوم ہے کہ تیرے باپ کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کر کے یہ فرمایا کہ کچھ بیان کرو؟ اس نے کہا: میں دنیا میں جا کر پھر دوبارہ تیری راہ میں مارا جاؤں، فرمایا: میں نے حکم جاری کر دیا ہے کہ وہ، یعنی شہید لوگ پھر دنیا میں نہیں جائیں گے۔[4] (تفرد به أحمد من هذا الوجه) صحیحین وغیرہما میں آیا ہے کہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کے باپ، یعنی عبداللہ بن عمرو بن حرام انصاری رضی اللہ عنہ اُحد کے دن شہید ہوئے۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب میرے باپ شہید ہو گئے، میں روتا تھا اور ان کا منہ کھول کر دیکھتا تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب مجھ کو منع کرتے تھے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہ کیا، بلکہ یوں فرمایا: تو اب اس کو روتا ہے، فرشتے اس کو اپنے پروں سے سایہ کر رہے ہیں، یہاں تک کہ ان کا جنازہ اٹھایا گیا۔[5] (رواه البخاري)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تمھارے بھائی اُحد کے دن شہید ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو سبز رنگ کے پرندوں میں رکھا ہے، وہ جنت کی نہروں پر آتے ہیں، وہاں کے پھل کھاتے ہیں اور عرش کے نیچے لٹکی سونے کی قندیلوں میں بسیرا کرتے ہیں، جب انھوں نے کھانے پینے اور اچھی خواب گاہ کا مزہ پایا تو کہنے لگے: کاش! ہمارے بھائی جانتے، جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ معاملہ کیا ہے، تاکہ ان کو جہاد میں بے رغبتی نہ ہوتی اور لڑائی سے بیٹھ نہ رہتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم تمھاری طرف سے یہ پیغام ان کو پہنچائے دیتے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٦٢) تفسير الطبري (٧/ ٣٩٢۔ ٣٩٣) [2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٨٧)
[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٧٧) مسند أحمد (٣/ ١٢٦) [4] مسند أحمد (٣/ ٣٦١) السلسلة الصحيحة (٣٢٩٠)
[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٨٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٧١)

ہیں، اس پر آیت زیرِ تفسیر اتری۔[1] (رواه أحمد و ابن جرير و أبو داود و الحاكم)

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ یہ آیت حمزہ اور اُن کے ساتھیوں کے حق میں اتری ہے۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ اثر صحیح ہے اور شیخین کی شرط پر ہے۔[2] امام قتادہ، ربیع اور ضحاک رحمہ اللہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ یہ آیت اُحد کے شہیدوں کے حق میں نازل ہوئی ہے۔[3] سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھ کر فرمایا: اے جابر! میں تجھ کو غمگین دیکھتا ہوں۔ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرے باپ شہید ہوئے، قرض اور عیال چھوڑ گئے۔ فرمایا: کیا میں تجھ کو خبر نہ دوں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی شخص سے کبھی بات نہیں کی، مگر اوٹ کے پیچھے سے اور تیرے باپ سے دو بدو بات کی۔

حدیث میں لفظِ "کفاح" ہے۔ علی رحمہ اللہ نے کہا: "کفاح" مواجہے کو کہتے ہیں۔ یعنی آمنے سامنے کسی سے بات کرنا۔ کہا: مانگ مجھ سے میں تجھ کو دوں گا۔ اس نے کہا: میں یہی مانگتا ہوں کہ پھر دنیا میں جا کر دوسری بار تیری راہ میں مارا جاؤں۔ رب عزوجل نے کہا: « إِنَّهُ قَدْ سَبَقَ مِنِّيْ الْقَوْلُ إِنَّهُمْ إِلَيْهَا لَا يَرْجِعُوْنَ » یعنی یہ بات پہلے ٹھہر چکی ہے کہ شہدا پھر دنیا میں نہیں جائیں گے۔ کہا: اے رب! یہ بات ان کو پہنچا دے، جو میرے پیچھے ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت زیرِ تفسیر بھیجی: ﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا ﴾۔[4] (رواه أبوبكر بن مردويه و رواه البيهقي في دلائل النبوة) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے جابر! کیا میں تجھ کو خوش خبری نہ دوں؟ کہا: ہاں! اللہ تعالیٰ آپ کو بھی خیر کی بشارت دے۔ فرمایا: تو نے جانا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے باپ کو زندہ کر کے فرمایا کہ اے میرے بندے! تو مجھ سے تمنا کر، جو تو چاہے گا میں تجھ کو دوں گا۔ کہا: اے رب! میں نے تیری عبادت جیسی چاہیے تھی نہیں کی، میری آرزو یہی ہے کہ تو مجھے دنیا میں پھیر دے، میں پھر تیری راہ میں دوسری بار مارا جاؤں۔ فرمایا: « إِنَّهُ سَلَفَ مِنِّيْ أَنَّهُ إِلَيْهَا لَا يَرْجِعُ » یعنی یہ بات پہلے ٹھہر چکی ہے کہ مر کر کوئی پھر دنیا میں نہ جائے گا۔[5] (رواه البيهقي) ان حدیثوں میں قائلینِ تناسخ کا رد ہے۔

معلوم ہوا کہ کوئی بشر بھی کسی شکل و قالب میں پھر دوبارہ دنیا میں نہیں آ سکتا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی

---

[1] مسند أحمد (١/ ٢٦٥) تفسير الطبري (٧/ ٣٨٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٢٠) مستدرك الحاكم (٢/ ٩٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٢٠٥)

[2] مستدرك الحاكم (٢/ ٤١٩) امام حاکم اور ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ [3] تفسير الطبري (٧/ ٣٨٩۔٣٩٢)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠١٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٠) دلائل النبوة (٣/ ٢٩٨۔ ٢٩٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٩٠٥)

[5] مستدرك الحاكم (٣/ ٢٢٣) دلائل النبوة (٣/ ٢٩٨) اس کی سند میں "فیض بن وثیق" ضعیف راوی ہے۔ البتہ گذشتہ روایت اس سے مستغنی کرتی ہے۔

مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ شہدا جنت کے دروازے کے پاس چمکتی نہر کے کنارے سبز گنبد میں ہیں، ان کے پاس جنت سے صبح وشام ان کا رزق آتا ہے۔[1] (تفرد به أحمد) اس حدیث کی اسناد جید ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ شہدا طرح طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ ہیں جن کی روحیں جنت میں چرتی ہیں، دوسرے وہ ہیں جو جنت کے دروازے کے پاس اس نہر پر ہیں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی سیر کی آخری حد اس نہر تک ہو، وہاں ان کا مجمع ہوتا ہو۔ اسی جگہ صبح وشام ان کو رزق دیا جاتا ہو۔[2] واللہ أعلم.

مسند امام احمد میں ایک حدیث ہے، جس میں ہر مومن کے لیے بشارت آئی ہے کہ اس کی روح جنت میں چرا کرتی ہے، جنت کے پھل اور میوے کھاتی پھرتی ہے، بہشت کی تازگی اور خوشی کو دیکھتی ہے، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کرامت تیار کی ہے، اس کا مشاہدہ کیا کرتی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کی اسناد صحیح، عزیز اور عظیم ہے۔ ائمۂ اربعہ اصحابِ مذاہبِ متبعہ میں سے تین امام اس کی سند میں جمع ہیں، کیوں کہ امام احمد رحمہ اللہ نے اس کو امام محمد بن ادریس امام شافعی رحمہ اللہ سے، انھوں نے امام مالک بن انس اصبحی رحمہ اللہ سے، مالک نے زہری سے، زہری نے عبدالرحمٰن بن کعب سے، کعب بن مالک نے اپنے والد سے روایت کیا ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «نَسَمَةُ الْمُؤْمِنِ طَائِرٌ يَعْلَقُ فِي شَجَرِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يَرْجِعَهُ اللّٰهُ إِلٰى جَسَدِهِ يَوْمَ يَبْعَثُهُ» ''مومن کی جان ایک پرندے میں ہے، جو جنت کے درختوں میں رہتا ہے اور جنت کے پھل وغیرہ کھاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے بدن کی طرف اس دن پھیرے، جس دن اس کو اٹھائے گا۔''[3] ''يَعْلَقُ'' بمعنی ''يَأْكُلُ'' (کھاتا ہے) ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ مومن کی روح طائر (پرندے) کی شکل میں ہوتی ہے، وہ روحیں گویا ستاروں کی طرح ہیں بہ نسبت عام مومنین کی روحوں کے کہ وہ خود اڑتی پھرتی ہیں۔ فَنَسْأَلُ اللّٰهَ الْكَرِيْمَ الْمَنَّانَ أَنْ يُمِيْتَنَا عَلَى الْإِيْمَانِ[4] ''اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ایمان پر موت نصیب کرے۔''

مومنین وکفار کی روحوں کی قرار گاہ کے بارے میں بڑا اختلاف ہے۔ ارواحِ مسلمین کی قرار گاہ زیرِ عرش سے لے کر تا فرشِ زمین ہر جگہ کو کہا گیا ہے۔ ارواحِ کفار کا ٹھکانا زیرِ زمین کو قرار دیا گیا ہے، کتاب وسنت کے ظاہر نصوص کے مطابق زیادہ مضبوط قول یہ ہے کہ ﴿ إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝١٣ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ۝١٤ ﴾ [الإنفطار: ١٣۔ ١٤] اس آیت میں اگرچہ ارواح کا ذکر نہیں آیا، لیکن پہلے بیان کی گئی حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنین کی روحیں جنت میں رہتی ہیں، یعنی گو ان کا کچھ تعلق جائے دفن وغیرہ سے بھی باقی رہے، جس طرح سورج کی دھوپ آسمان پر سے زمین پر گرتی ہے۔ کفار کی روحیں دوزخ میں رہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ایمان پر قائم رکھے، شرک وکفر سے بچا کر

[1] مسند أحمد (١/ ٢٦٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٧٤٢)
[2] تفسير ابن كثير (١/ ٥٥٧)
[3] مسند أحمد (٣/ ٤٥٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٣٧٣)
[4] تفسير ابن كثير (١/ ٥٥٧)

جنت میں لے جائے۔

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ لَا تَحْسَبَنَّ ﴾ کا خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے یا ہر کسی کو جو لائقِ خطاب ہے۔ اس لفظ کو یاء کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، یعنی ”لَا یَحْسَبَنَّ حَاسِبٌ“ (کوئی گمان کرنے والا نہ گمان کرے) اس آیت میں شہدا سے مراد شہدائے اُحد یا بدر یا بئرِ معونہ ہیں، اگر آیت کا نزول خاص سبب کو قرار دیا جائے، مگر لفظ کی عمومیت کا اعتبار ہے نہ کہ سبب کی خصوصیت کا۔ جمہور کہتے ہیں: مراد حیاتِ محققہ ہے۔ کسی نے کہا کہ ان کی روحیں قبروں میں پھیر دی جاتی ہیں اور آرام میں رہتی ہیں۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: جنت کی ہوا پاتی ہیں، جنت کے اندر نہیں ہوتیں۔[1] بعض نے کہا: وہ حیاتِ مجازی ہے، یعنی اللہ کے حکم میں جنت میں مستحقِ نعمت ہیں۔ صحیح بات وہی قول اول ہے، مجاز کو اختیار کرنے کی کوئی وجہ نہیں، پہلے بیان کی ہوئی بات سنت کی دلیل سے ثابت ہے۔

ارواح کے لیے طیور ایسے ہیں، جیسے بیٹھنے والے کے لیے ہودج۔ اس قول کی یہی دلیل ہے کہ حیات صرف روح کو ہوتی ہے۔ بعض نے کہا: روح اور جسم دونوں کو ہوتی ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے: ﴿ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴾ قولِ اول پر ان کی امتیازی حیثیت کی وجہ یہ ہے کہ شہدا کی روحیں نکلنے کے وقت ہی سے جنت میں داخل ہوتی ہیں۔ باقی مومنین کی روحیں بدن کے ساتھ قیامت کو جنت میں داخل ہوں گی۔ دوسرے قول پر امتیاز ظاہر ہے، شہدا کی فضیلت میں جو احادیث مروی ہیں وہ کتبِ سنت میں معروف ہیں۔

رزق سے مراد معروف معنوں میں رزق ہی ہے، جمہور اسی طرف گئے ہیں۔ یہ کہنا کہ رزق سے مراد ثنائے جمیل (اچھی تعریف) ہے، درحقیقت عربی کلمات کی تحریف ہے۔ اتنی بعید از قیاس تاویلوں کے جواز کا کوئی سبب نہیں ہے۔ مبتدعین جو تناسخ کے قائل ہیں، ان کا تعلق اسی آیت سے ہے، کہتے ہیں کہ انتقال کے بعد روحوں کا عمدہ قسم کی صورتوں میں چین پانا یا قبیح صورتوں کی شکل میں عذاب پانا یہی ثواب وعقاب ہے۔

ان کا یہ زعم ضلالِ مبین ہے۔ اس قول پر علم کا کوئی اثر نہیں ہے۔ اس قول میں تمام شریعتوں کا ابطال ہے اور حشر نشر و معاد اور جنت و نار کا انکار ہے، احادیثِ صحیحہ اس عقیدے کی تردید کرتی ہیں۔ جو لوگ دنیا میں ایمان کے راستے اور جہاد کے عقیدے پر زندہ ہیں، شہدا چاہتے ہیں کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں مقتول اور شہید ہو کر ہم سے آملیں، یا وہ لوگ مراد ہیں جو درجے میں ان کے برابر نہیں، اگرچہ کسی قدر درجہ رکھتے ہیں، یا اخوان سے مراد سارے مسلمان ہیں، خواہ وہ شہید ہوں یا غیر شہید۔ اس لیے کہ جب شہدا نے اللہ کا ثواب دیکھ لیا اور اسلام کی حقیقت کا انھیں یقین حاصل ہو گیا تو وہ جی میں خوش ہوئے کہ سب اہلِ اسلام کو جو زندہ ہیں اور ابھی نہیں مرے ہیں، ان کو بھی اسی طرح کا ثواب۔ إن شاء اللہ تعالیٰ۔ ملے گا۔ یہ قول زیادہ قوی ہے، کیوں کہ اس قول کے معنی زیادہ وسعت

---

[1] تفسیر الطبري (٣/ ٢١٥)

رکھتے ہیں اور اس کا فائدہ اکثر ہے اور الفاظ کا مفہوم بھی یہی نکلتا ہے، بلکہ زیادہ ظاہر یہی قول ہے۔ امام زجاج اور ابن فورک رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔

لفظ استبشار کو دوبارہ اس لیے کہا ہے کہ وہ خوشی صرف خوف و حزن کے نہ ہونے ہی پر نہیں ہے، بلکہ اللہ کی نعمت اور فضل پر بھی ہے۔ بعض نے کہا: نعمت سے مراد ثواب ہے، فضل سے مراد زائد، ہے یا نعمت سے مراد جنت ہے اور فضل اس میں داخل ہے، یا پہلی خوشی بھائیوں کے حال پر اور دوسری اپنی جان پر ہے۔ جہاد اور شہادت کی فضیلت میں بہت سی آیات و احادیث وارد ہیں، جن کا اس جگہ ذکر کرنا مشکل ہے۔[1] اس سلسلے میں کتاب "مشارع الأشواق إلىٰ مصارع العشاق" قدیم کتاب ہے، اکیس کتابوں سے منتخب ہو کر لکھی گئی ہے، اس کے تئیس باب ہیں۔ شیخ علامہ محی الدین احمد بن ابراہیم بن نحاس دمشقی نے لکھی ہے۔ قلمی نسخہ ۱۱۴۲ھ کا دیکھنے میں آیا ہے۔ اس کے بعد ایک کتاب "العبرة في الغزو والشهادة والهجرة" (نواب صاحب کی تالیف) اسی بارے میں آیات و احادیثِ صحیحہ سے جمع کی گئی ہے۔ وللہ الحمد.

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں، وہ جس نعمت و غبطت میں ہیں، اس پر خوش ہیں کہ جو لوگ ان کے بعد مارے جائیں گے، وہ ان کے پاس آئیں گے، ان کو بھی نہ آیندہ کا کوئی خوف ہوگا نہ گذشتہ کا کوئی غم ہوگا۔[2] نَسْأَلُ اللّٰهَ الْجَنَّةَ۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: شہید کو ایک کتاب دی جاتی ہے، جس میں لکھا ہوتا ہے کہ فلاں فلاں شخص، فلاں فلاں دن تیرے پاس شہید ہو کر آئے گا، وہ اس کو پڑھ کر خوش ہوتا ہے، جس طرح دنیا والے اپنے کسی غائب کے آنے سے خوش ہوتے ہیں۔[3] سعید بن جبیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب وہ لوگ جنت میں داخل ہوئے اور وہاں کی کرامت دیکھی تو کہنے لگے: کاش! ہمارے بھائی جو دنیا میں ہیں، معلوم کرلیں کہ ہم کس کرامت اور آسایش میں ہیں، تاکہ جس وقت کسی جنگ کے معرکے میں حاضر ہوں تو خوب لڑیں اور شہید ہو جائیں اور جو ہم کو ملا ہے، وہ ان کو بھی ہاتھ آئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حال اور کرامت کی خبر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت ان کا حال سنا دیا، اب تم خوش ہو جاؤ۔ یہ مطلب ہے اس آیت کا: ﴿وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)[4]

صحیحین میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے اصحابِ بئرِ معونہ میں انصار کے جو ستر آدمی تھے اور صبح دم ایک ہی وقت مارے گئے تھے، ان کے قصے میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قنوت پڑھی اور قاتلین پر بد دعا اور لعنت کی۔ سیدنا انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ان کے حق میں قرآن اترا، جس کو ہم پڑھا کرتے تھے، یہاں تک کہ وہ آیت اٹھالی گئی: "أَنْ بَلِّغُوْا

[1] فتح البيان (٢/ ٣٧٤ـ ٣٧٨)
[2] تفسير ابن كثير (١/ ٥٥٧)
[3] تفسير الطبري (٧/ ٣٩٧)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨١٤)

عَنَّا قَوْمَنَا أَنَّا قَدْ لَقِيْنَا رَبَّنَا فَرَضِيَ عَنَّا وَأَرْضَانَا‘‘ پھر فرمایا: ﴿ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ﴾[1]

محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا: یعنی وہ اپنے ساتھ کیے گئے وعدے کے پورا ہونے اور بہت زیادہ ثواب پا لینے پر مسرور ہوئے۔ ابن زید رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیت سب مومنوں کو شامل ہے، خواہ وہ شہدا ہوں یا غیر شہدا، یہ بہت کم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی جگہ نبیوں کی فضیلت اور ان کے ثواب کا ذکر کیا ہو، مگر اس کے ساتھ ہی جو کچھ مومنین کو عطا فرمایا ہے، اس کا ذکر بھی غالباً کیا ہے۔[2]

غزوۂ حمراء الاسد اور اللہ کا ذکر:

اس لفظ سے کہ جن لوگوں نے اللہ اور رسول کا کہنا مانا زخم پہنچنے کے بعد، اس سے مراد یہ ہے کہ مشرکین مسلمانوں کو مار کر اپنے شہروں میں چلے گئے تو راستے میں نادم ہوئے کہ ہم نے اہلِ مدینہ پر کیوں حملہ نہ کیا کہ فیصلہ ہی ہو جاتا۔ جب یہ خبر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو مسلمانوں سے کہا: تم ان کے پیچھے جاؤ، تاکہ ان پر تمھارا رعب پڑے اور وہ جان لیں کہ تم میں قوت اور تیزی باقی ہے۔ جو لوگ واقعۂ اُحد میں حاضر ہوئے تھے، انھیں کو یہ حکم دیا، سوائے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کے۔ مسلمان باوجود مجروح ہونے کے اللہ اور رسول کی اطاعت بجا لانے کو روانہ ہو گئے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا: مشرکوں نے اُحد سے پھر کر کہا کہ تم نے نہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کیا نہ کنواری عورتوں کو لائے، تم نے کچھ بھی کام نہیں کیا، پھر جاؤ۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر پا کر مسلمانوں کو رغبت دلائی تو وہ حمراء الاسد یا بئرِ ابی عیینہ تک پہنچے۔

مشرکوں نے کہا: ہم اگلے سال پھر آئیں گے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی پھر آئے، اس کو بھی ایک غزوہ شمار کیا ہے، اس پر یہ آیت اتری: ﴿ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح مروی ہے۔[3] محمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا کہ جنگِ اُحد ہفتے کے دن نصف شوال کو ہوئی تھی۔ سولھویں شوال کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منادی نے لوگوں میں اعلان کیا کہ دشمن کی طلب میں جاؤ، وہی لوگ جائیں جو کل ہمارے ساتھ اُحد میں حاضر تھے۔ سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے کہا کہ میرے باپ میری سات بہنیں چھوڑ گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ ان عورتوں کو کسی مرد کے بغیر نہیں رہنا چاہیے۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اجازت دے دی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نکلنا اس لیے تھا کہ دشمن پر خوب رعب پڑے اور وہ جان لیں کہ لوگ ہماری طلب میں آتے ہیں، ابھی تک ان کو قوت حاصل ہے، تکلیف پہنچنے سے کچھ سست نہیں پڑے، ہمت نہیں ہارے۔[4]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اے عروہ! تیرے دونوں باپ زبیر و ابوبکر رضی اللہ عنہما انہی میں تھے، جنھوں نے اللہ اور رسول کی بات کو مانا جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: کون ان دشمنوں کے پیچھے جاتا ہے تو ستر آدمی تیار ہو گئے، ان میں سیدنا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٩٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٧٧)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨١٥)
[3] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨١٦) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣١٧)
[4] تفسير الطبري (٧/ ٣٩٩_ ٤٠٠)

ابوبکر و زبیر رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ (رواه البخاري) امام حاکم نے کہا: یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔ حاکم رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں کہ عروہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے مجھ سے کہا: "إِنَّ أَبَاكَ مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ" امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا: "صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه"[1] ابن مردویہ رحمہ اللہ کے الفاظ یہ ہیں: "قَالَتْ: قَالَ لِيْ ﷺ: «إِنْ كَانَ أَبَوَاكِ لَمِنَ الَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ الخ أَبُوْ بَكْرٍ وَالزُّبَيْرِ» لیکن اس حدیث کا مرفوع ہونا محض خطا ہے، کیوں کہ سیدنا زبیر، سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے باپ داداؤں میں نہیں تھے، بلکہ یہ بات سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عروہ رحمہ اللہ سے کہی تھی، کیوں کہ وہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے، سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا بنت ابی بکر رضی اللہ عنہ کے فرزندِ گرامی تھے۔[2] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابوسفیان کے دل میں رعب ڈال دیا، اُحد کے دن وہ مکہ کو پھر گیا۔ نبی اکرم ﷺ نے کہا: ابوسفیان تم کو تکلیف دے کر پھر گیا ہے، اللہ نے اس کے دل میں رعب ڈالا۔

واقعۂ اُحد شوال میں ہوا۔ سوداگر لوگ مدینہ میں ذوالقعدہ کے مہینے میں آتے، بدرِ صغریٰ میں ہر سال ایک بار اترتے، اب وہ واقعۂ اُحد کے بعد آئے۔ مسلمان زخموں سے چور تھے اور نبی اکرم ﷺ سے اپنی تکالیف کی شکایت کی، فرمایا: چلو وہ اب کوچ کیے جاتے ہیں، حج کو جاتے ہیں، اب ان کو آیندہ سال تک ایسی قدرت حاصل نہیں ہوگی، شیطان نے آکر اپنے دوستوں کو ڈرایا کہ دیکھو لوگ تمھارے لیے جمع ہوئے ہیں، لوگوں نے ہمراہ جانے سے انکار کیا، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میں جاؤں گا کوئی میرے ہمراہ جائے یا نہ جائے۔ لوگوں کو ترغیب فرمائی۔ صدیق و عمر و عثمان و علی و زبیر و سعد و طلحہ و عبدالرحمٰن بن عوف و ابن مسعود و حذیفہ بن الیمان اور ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم وغیرہم ستر آدمی اُٹھ کھڑے ہوئے اور ابوسفیان کے تعاقب میں چلے صفراء تک پہنچے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ ﴾[3] (آیت زیرِ تفسیر)

امام ابن اسحاق رحمہ اللہ نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ حمراء الاسد تک پہنچے، یہ جگہ مدینہ منورہ سے آٹھ میل پر ہے۔[4] ابن ہشام رحمہ اللہ نے کہا: مدینہ پر ابن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنا کر گئے تھے۔ دوشنبہ، سہ شنبہ، چہار شنبہ (سوموار، منگل، بدھ) وہاں ٹھہر کر واپس مدینہ کو آئے۔[5] امام عکرمہ و قتادہ رحمہما اللہ وغیرہما نے کہا ہے کہ یہ سیاق غزوۂ حمراء الاسد کی شان میں نازل ہوا ہے۔ کسی نے کہا: بدر میں۔ مگر صحیح قولِ اول ہے۔[6]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٨٤٩) مستدرك الحاكم (٣/ ٤٠٩)
[2] تفسير ابن كثير (١/ ٥٥٩)
[3] تفسير الطبري (٧/ ٤٠٢)
[4] تفسير الطبري (٧/ ٤٠٠)
[5] السيرة النبوية لابن هشام (٤/ ٥٢)
[6] تفسير ابن كثير (١/ ٥٦٠)

کلمہ "حَسْبُنَا اللّٰہ" کی فضیلت:

صحابہ کو جب ڈرایا کہ دیکھو لوگ تمھارے لیے اکٹھے ہوئے ہیں، دشمن ہر طرف سے جمع ہو کر آ گئے ہیں تو انھوں نے کچھ پروا نہ کی، بلکہ اللہ پر توکل کر کے یہ بات کہی: "حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ" امام بخاری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ یہ وہ کلمہ ہے، جس کو ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت کہا تھا، جب وہ آگ میں ڈالے گئے تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تھا، جب کہ یہ خبر دی گئی کہ لوگ تمھارے لیے جمع ہوئے ہیں، تم ڈرو، اس پر ان کا ایمان اور زیادہ ہو گیا۔[1] (رواه البخاري و النسائي)

بخاری کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں: "عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: كَانَ آخِرُ قَوْلِ إِبْرَاهِيْمَ عليه السلام حِيْنَ أُلْقِيَ فِي النَّارِ: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ"[2] عبدالرزاق رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے ان الفاظ میں روایت کی ہے: «هِيَ كَلِمَةُ إِبْرَاهِيْمَ حِيْنَ أُلْقِيَ فِي النَّارِ»[3] (رواه ابن جرير) سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اُحد کے دن کہا گیا: ﴿اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ﴾ (آیت زیرِ تفسیر) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔[4] (رواه ابن مردويه) سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «إِذَا وَقَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ الْعَظِيْمِ فَقُوْلُوْا: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ» (رواه ابن مردويه) "جب تم کسی مشکل میں گرفتار ہو تو یہ کلمہ کہو: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔" حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: "هذا حديث غريب من هذا الوجه"[5] غریب صحیح حدیث کی ایک قسم ہے۔

ہم غریبوں کے لیے جو اللہ کے سوا کوئی ظاہری وسیلہ یا دنیاوی حیلہ یا قانونی تدبیر رکھتے ہیں نہ جانتے ہی ہیں، یہ کلمہ نسخہ اکسیرِ اعظم ہے۔ اس کا تجربہ بارہا بڑے بڑے امورِ عظیمہ اور خوف دلانے والے حالات میں ہو چکا ہے۔ وللہ الحمد۔ وہ دعا جو قرآن و حدیث دونوں سے ثابت ہے، وہ یہی کلمہ یا دعائے ذی النون ہے۔ باقی دعائیں ایسی ہیں کہ بعض تو قرآن پاک میں آئی ہیں، بعض احادیثِ صحیحہ میں وارد ہوئی ہیں۔ جس طرح یہ کلمۂ مبارک ہر آفت و بلا سے بوجہ معنی اخلاص بچا لیتا ہے، اسی طرح دعاے یونس علیہ السلام بہ وجہ اعترافِ تقصیر ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٨٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣١٦)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٨٨) (3) تفسير الطبري (٧/ ٤١٢) اس کی سند صحیح ہے۔

(4) تفسير ابن كثير (١/ ٥٦١) الدر المنثور (٢/ ٣٨٩) اس کی سند میں "محمد بن معمر" مجہول راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٧٨٨)

(5) تفسير ابن كثير (١/ ٥٦١) الدر المنثور (٢/ ٣٩٠) اس کی سند میں "مصعب بن سعید" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٧٠٠٢)

سیدنا عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کیا، جو آدمی مقدمہ ہار گیا تھا، اس نے پھرتے وقت "حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ" کہا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو واپس بلا لاؤ۔ جب آیا تو فرمایا: تو نے کیا کہا؟ اس نے کہا: میں نے یہ کلمہ کہا۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ عاجزی اور کاہلی پر ملامت کرتا ہے، لیکن تجھ کو ہوشیاری اختیار کرنی چاہیے، اگر پھر کوئی امر تجھ پر غالب ہو تو اس وقت "حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ" کہو۔[1] (رواه أحمد و أبو داود والنسائي) معلوم ہوا کہ یہ کلمہ غلبۂ امر کی حالت کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہر چھوٹے موٹے معاملے میں اس کو کہنا عجز اور بیچارگی کی دلیل ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں کس طرح آرام کروں کہ صور میں پھونکنے والا تو صور کو منہ میں لیے ہوئے ہے، پیشانی کو جھکائے ہوئے سن رہا ہے کہ کب حکم ہو کہ اس میں پھونکے۔ اصحاب رضی اللہ عنہم نے کہا کہ ہم کیا کہیں، فرمایا: کہو "حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا"[2] یہ حدیث کئی طرح سے آئی ہے، اس کی سند جید ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جب صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ کی سواری پر سوار ہوئیں تھیں تو انھوں نے یہی کلمہ کہا تھا، اس پر آخر میں اللہ نے ان کی براءت نازل کی۔ زینب رضی اللہ عنہا نے کہا: یہ کلمة المومنین ہے۔[3] اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا: ﴿ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ﴾ (آیت زیر تفسیر) یعنی جب انھوں نے اللہ پر توکل کیا تو اللہ نے ان کی مہم کو کفایت کر دیا اور جن لوگوں نے ان کے ساتھ مکر و فریب کا ارادہ کیا تھا، ان کی تکلیف کو ان سے رد کر دیا، وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل سے صحیح سلامت اپنے شہر میں لوٹ آئے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نعمت یہ تھی کہ صحیح سلامت رہے، فضل، یعنی فراوانی یہ تھی کہ ایک قافلہ ایامِ موسم میں آیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے مال خریدا، اس میں بہت نفع ہوا۔ نفع سب اصحاب میں تقسیم کیا۔[4] پھر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا: کیا تم ان سے ڈرتے ہو، مجھ سے ڈرو، یعنی جب وہ تم کو دھمکائیں ڈرائیں تو تم مجھ پر بھروسا کرو، مجھ سے ملتجی ہو، میں تم کو کافی ہوں، تمھارا ناصر ہوں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ۭ وَ يُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿36﴾ وَ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ ﴿37﴾ وَ لَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ

---

[1] مسند أحمد (٦/ ٢٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٢٧) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ١٦٠)

[2] مسند أحمد (١/ ٣٢٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٥٩٢)

[3] تفسير الطبري (١٩/ ١١٨۔ ١١٩) المعجم الكبير (٢٤/ ٤٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه المعلى بن عرفان وهو متروك" (مجمع الزوائد: ٩/ ٣٨٤)

[4] دلائل النبوة للبيهقي (٣/ ٣١٨) اس کی سند صحیح ہے۔

قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴾ [الزمر: ۳۶۔ ۳۸] ''کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں؟ اور وہ آپ کو ان (معبودوں) سے ڈراتے ہیں جو (انھوں نے) اللہ کے سوا (بنا رکھے) ہیں اور جسے اللہ گمراہ کر دے تو اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔ اور جسے اللہ ہدایت دے تو اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں، کیا اللہ نہایت غالب، انتقام لینے والا نہیں؟ اور اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے! کہہ دیجیے: بھلا دیکھو تو! جنھیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، اگر اللہ مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو کیا وہ (تمھارے باطل معبود) اس کی (پہنچائی ہوئی) تکلیف دور کر سکتے ہیں؟ یا وہ مجھ پر رحمت کرنا چاہے تو کیا وہ اس کی رحمت کو روک سکتے ہیں؟ کہہ دیجیے: مجھے اللہ کافی ہے، بھروسا کرنے والے اسی پر بھروسا کرتے ہیں۔''

نیز فرمایا: ﴿ فَقَاتِلُوْۤا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴾ [النساء: ۷۶] ''چناں چہ تم شیطان کے ساتھیوں سے لڑو، بے شک شیطان کی چال بڑی کمزور ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ [المجادلة: ۱۹] ''یہ لوگ شیطان کا گروہ ہیں۔ خبردار! بے شک شیطانی گروہ ہی خسارہ پانے والا ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِيْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ [المجادلة: ۲۱] ''اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور غالب آئیں گے، بے شک اللہ قوی، بڑا زبردست ہے۔'' اور فرمایا: ﴿ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ﴾ [الحج: ۴۰] ''اور اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کرے گا۔'' اور فرمایا: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ ﴾ [محمد: ۷] ''اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا۔'' اور فرمایا: ﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ۝ ﴾ [المؤمن: ۵۱۔ ۵۲] ''بلاشبہ ہم اپنے رسول کی اور ایمان والوں کی مدد دنیاوی زندگی میں بھی کرتے ہیں اور اس دن بھی (کریں گے) جب گواہ کھڑے ہوں گے۔ اس دن ظالموں کو ان کی معذرت کوئی نفع نہیں دے گی اور ان کے لیے لعنت ہے اور ان کے لیے برا گھر ہے۔''

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ آیت ﴿ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ ﴾ میں ناس سے مراد نعیم بن مسعود ہے، اس پر ناس کا لفظ اس لیے بولا گیا ہے کہ وہ جنس ناس سے تھا، جس طرح عام بول کر خاص یا کل بول کر بعض مراد لیتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ ﴾ [النساء: ۵۴] ''کیا وہ اس پر لوگوں سے حسد کرتے ہیں'' یعنی

اکیلے نبی اکرم ﷺ مراد ہیں۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ خندق کے دن اسلام لے آیا تھا، [1] اس کی تصریح مواہب لدنیہ میں ہے۔ [2] یا ناس سے مراد عبدالقیس کا قافلہ ہے، جن کا ابوسفیان پر گزر ہوا تھا یا منافقین مراد ہیں۔ آیت: ﴿ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ ﴾ میں ناس سے مراد ابوسفیان اور اس کے ہم راہی ہیں۔ عرب جیش کو جمع کہتے ہیں۔

زیادتِ ایمان سے مراد ہے کہ ان کو اللہ پر یقین کامل آ گیا اور تصدیق قوی ہوگئی، وہ اس دھمکی کو سن کر کچھ نہ ڈرے، اس پر ذرا توجہ نہ کی، بلکہ اخلاص، اطمینانِ قلب اور قوتِ دین اور نبی کریم ﷺ کی مدد کرنے میں اور زیادہ بڑھ گئے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ حسب کے معنی کافی و کفیل کے ہیں۔ شداد بن اوس رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ یہ کلمہ ہر خوف کرنے والے کے لیے امان ہے۔ [3] (رواہ أبو نعیم) سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب نبی اکرم ﷺ کو سخت غم ہوتا تو آپ سر اور ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے، ٹھنڈی سانس لیتے، "حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ" کہتے۔ [4] (رواہ ابن أبي الدنیا) نعمت سے مراد دشمن سے سلامتی و عافیت ہے، فضل سے مراد اللہ کی مہربانی ہے یا تجارت میں فائدہ۔ یا نعمت سے مراد خاص دنیا کا منافع ہے اور فضل سے آخرت کا منافع۔

﴿ سُوْٓءٌ ﴾ سے مراد قتل، زخم اور خوف ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ کسی نے ان کو ایذا نہ دی۔ [5] امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: نعمت، عافیت تھی، فضل، تجارت اور سوء، قتل تھا۔ [6] گویا یہ ارشاد فرمایا ہے کہ تم اس کلمے کو کہا کرو کہ یہ کلمہ ہر بھلائی کو کھینچنے والا اور ہر شر کو دور کرنے والا ہے۔ اس جگہ شیطان سے مراد ظاہراً خود شیطان ہی ہے، اس اعتبار سے کہ وسوسہ ڈالنے والا وہی ہے، اس کے وسوسے سے کم ہمتی نامردی آتی ہے۔ یا نعیم بن مسعود ہے کہ یہ ڈر اس نے دلایا تھا۔ یا ابوسفیان ہے کہ اس نے یہ دھمکی دی تھی۔ بہر حال شیطان کا کام یہی ہے کہ وہ اپنے دوستوں، یعنی کافروں کا ڈر مومنوں کو دلاتا ہے۔ امام ابو مالک رحمہ اللہ نے کہا: اپنے اولیا کو تمھاری آنکھوں میں بڑا کر کے دکھلاتا ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے کہا: یہ شیطان کا ڈرانا تھا، شیطان سے شیطان کا دوست ہی ڈرتا ہے۔ [7] پھر اللہ نے کہا: تم ایمان دار ہو تو مجھ سے ڈرو، ان سے نہ ڈرو، کیوں کہ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ شیطان اور اولیاے شیطان کے شر سے امن مانگا جائے۔ [8]

اے اللہ! اے رب! مجھ کو اخوان الشیاطین نے، بلکہ شیطانوں نے اس وقت بہت ڈرایا ہے اور نہایت درجے کا خوف دلایا ہے۔ میں بھی وہی کہتا ہوں، جو تیرے خلیل جلیل ابراہیم علیہ السلام تیرے رسول متوکل محمد ﷺ اور رسول کے صحابہ مقبول رضی اللہ عنہم نے کہا تھا: "حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ" مجھے اُمید ہے کہ تو مجھ کو ہر خوف سے امن بخشے گا۔ اَللّٰهُمَّ آمِيْنَ.

---

[1] المرقاة (٦/ ٢٥٦٤) [2] المواهب اللدنية (٢/ ٢٧)

[3] الدر المنثور (٢/ ٣٩٠) اس کی سند میں "ابوفروہ رہاوی" ضعیف راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣٠٩٤)

[4] الدر المنثور (٢/ ٣٩٠) امام البانی رحمہ اللہ نے "السلسلة الضعيفة" (رقم الحديث: ٧٠٧) میں بحث کرتے ہوئے مذکورہ روایت کو ذکر کر کے اس کو سخت ضعیف کہا ہے۔

[5] تفسير الطبري (٧/ ٤١٥) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨١٩) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔ [6] تفسير الطبري (٧/ ٤١٥)

[7] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٢٠۔ ٨٢١) [8] فتح البيان (٢/ ٣٧٩۔ ٣٨١)

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّھُمْ لَنْ يَّضُرُّوا
اللّٰهَ شَـيْـــًٔا ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَھُمْ حَظًّا فِي
الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝١٧٦ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا
الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَـيْـــًٔا ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝١٧٧
وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَھُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ
اِنَّمَا نُمْلِيْ لَھُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَھُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝١٧٨ مَا كَانَ
اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰي مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ
الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَي
الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۠ فَاٰمِنُوْا
بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝١٧٩ وَلَا
يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ھُوَ
خَيْرًا لَّھُمْ ۭ بَلْ ھُوَ شَرٌّ لَّھُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا
بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝١٨٠

اور (اے نبی!) جو لوگ کفر میں تیزی دکھاتے ہیں ان کی سرگرمیاں آپ کو غمگین نہ کریں۔ بے شک وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ اللہ چاہتا ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے (176) بے شک جن لوگوں نے ایمان کے بدلے کفر خرید لیا، وہ اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے (177) اور جن لوگوں نے کفر کیا، وہ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ ہم انھیں جو ڈھیل دیتے ہیں، وہ ان کے لیے بہتر ہے۔ ہم تو انھیں صرف اس لیے ڈھیل دیتے ہیں کہ وہ گناہ میں بڑھ جائیں، اور ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے (178) اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم اس وقت ہو، یہاں تک کہ وہ پاک کو ناپاک سے علاحدہ کر دے اور نہ اللہ کا یہ طریقہ ہے کہ وہ

تم پر غیب ظاہر کرے، لیکن اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے (غیب کی باتیں بتانے کے لیے) چن لیتا ہے، پس تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولوں پر، اور اگر تم ایمان لاؤ گے اور پرہیزگاری اختیار کرو گے تو تمھارے لیے بہت بڑا اجر ہے (179) اور جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے بہت کچھ دیا ہے اور وہ اس میں کنجوسی کرتے ہیں تو وہ اس (بخل) کو اپنے لیے ہرگز بہتر نہ سمجھیں، بلکہ وہ ان کے لیے بہت برا ہے۔ جس مال میں انھوں نے کنجوسی کی، قیامت کے دن اسی کے انھیں طوق پہنائے جائیں گے۔ اور آسمانوں اور زمین کی ملکیت اللہ ہی کی ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے خوب باخبر ہے (180)

موضح قرآن کا بیان:

منافق لوگ جہاں مسلمانوں کو دیکھتے، کفر کی باتیں کرنے لگتے، اللہ تعالیٰ مومن و منافق کو اسی طرح کھولتا ہے، غیب سے خبر کسی کو نہیں پہنچاتا۔ آخر آیت میں فرمایا کہ جو کوئی زکات نہ دے گا، اس کا مال اژدہا بن کر گلے میں پڑے گا، اس کے جبڑے چیرے گا۔ اللہ وارث ہے، آخر تم مرجاؤ گے، مال اسی کا ہو رہے گا، تم اپنے ہاتھ سے دو تو ثواب پاؤ۔ یہ موضح قرآن کا فائدہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو تسلی:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی اکرم ﷺ سے فرماتا ہے کہ تم ان کی کفر میں جلدی کرنے سے کیوں غم کھاتے ہو؟ یہ اس لیے کہا کہ نبی کریم ﷺ کو لوگوں کے مسلمانوں ہونے کی بہت حرص تھی، جب وہ مخالفت، دشمنی اور نافرمانی کی طرف جلدی کرتے تو آپ کو رنج ہوتا۔ اللہ نے تسلی دی، غم سے منع کیا اور فرمایا: اگر کفر میں جلدی کرتے ہیں تو کرتے رہیں، اللہ کا کیا نقصان کریں گے، اللہ کی حکمت میں اسی طرح ہے کہ اس کی مشیت اور ارادے سے ان کو آخرت میں کچھ حصہ نہیں ملے گا۔ جنھوں نے ایمان دے کر کفر مول لیا ہے، انھوں نے اللہ کا کچھ نہیں بگاڑا، اپنی ہی جانوں کا نقصان کیا اور عذاب مول لیا۔ یہ مہلت ان کے لیے آفت ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ اَيَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿55﴾ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ بَلْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿56﴾ ﴾ [المومنون: ٥٥۔ ٥٦] ''کیا وہ سمجھتے ہیں کہ بے شک ہم جو بھی ان کے مال اور اولاد میں اضافہ کیے جا رہے ہیں۔ (تو) کیا ہم ان کے لیے بھلائیوں میں جلدی کر رہے ہیں (نہیں نہیں) بلکہ، وہ (اصل حقیقت کا) شعور نہیں رکھتے۔'' اور اس کا فرمان ہے: ﴿ فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ۭ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾ [القلم: ٤٤]

''لہٰذا چھوڑ دیجیے مجھے اور اس کو جو اس حدیث (قرآن) کو جھٹلاتا ہے، ہم انھیں آہستہ آہستہ (تباہی کی طرف) لے جائیں گے، اس طرح کہ انھیں علم تک نہ ہوگا۔'' اور اس کا فرمان ہے: ﴿فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُهُمْ ۚ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ﴾ [التوبة: ٥٥] ''چناں چہ ان کے مال اور ان کی اولاد آپ کو حیرت میں نہ ڈالیں، یقیناً اللہ یہی چاہتا ہے کہ ان کی وجہ سے انھیں دنیاوی زندگی ہی میں عذاب دے اور ان کی جانیں حالتِ کفر ہی میں نکلیں۔''[1]

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ بات ضرور ہے کہ کچھ آزمایش ڈالی جائے، تاکہ اس میں دوست اور دشمن کی پہچان ہو جائے، مومن صابر منافق فاجر سے ممتاز ہو جائے۔ اس آزمایش سے اُحد کا دن مراد ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کا امتحان لیا۔ ان کے اللہ اور اس کے رسول کے راستے میں صبر، چستی اور ثابت قدمی کو آزمایا، منافقوں کا پردہ چاک کیا۔ ان کی مخالفت کھل کر سامنے آگئی، وہ جہاد کرنے سے دم دبا گئے، اللہ اور رسول کے خائن ہوئے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اُحد کے دن ان کے درمیان تمیز کی۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: جہاد اور ہجرت کے ساتھ مسلمانوں اور منافقوں کے درمیان تمیز کر دی۔ امام سدی رحمہ اللہ نے کہا: وہ کہتے تھے کہ اگر محمد ﷺ سچے ہیں تو ہمیں بتا دیں کہ ہم میں سے کون ان پر ایمان لایا ہے اور کون ان کا منکر ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری: ﴿حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ﴾ [آل عمران: ١٧٩] یعنی "يُخْرِجُ الْمُؤْمِنَ مِنَ الْكَافِرِ" ''مومن کو کافر سے نکال دے'' ان سب اقوال کو ابن جریر رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔[2]

رسالت وہبی ہے، کسبی نہیں:

پھر اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تم اللہ کی خلق میں اس کے غیب کو اس وقت تک نہیں جان سکتے، جب تک کہ وہ خود تم کو نہ بتا دے اور غیب کو واضح کرنے والے اسباب منعقد نہ فرما دے۔ ہاں جس رسول کو چاہتا ہے، پسند کرتا ہے، اس کو کسی بات پر آگاہ کر دیتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝﴾ [الجن: ٢٦۔ ٢٧] ''(وہی) عالم الغیب ہے، وہ اپنا غیب کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔ سوائے کسی رسول کے جسے وہ پسند کرے، پھر بے شک وہ اس (رسول) کے آگے اور پیچھے نگہبان لگا دیتا ہے۔'' پھر یہ حکم کیا کہ تم سب اللہ اور رسولوں پر ایمان لاؤ، یعنی ان کی اطاعت اور امورِ شریعت میں ان کی اتباع اختیار کرو۔

بخل کی مذمت:

پھر یہ ذکر کیا کہ بخیل یہ خیال نہ کرے کہ وہ مال جو اس نے جمع کیا ہے، اس کے کچھ کام آئے گا، بلکہ اس کے

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٦٣)
[2] تفسير الطبري (٧/ ٤٢٤۔ ٤٢٦)

دین میں نقصان کرے گا، بلکہ کبھی دنیا میں بھی مضر ہوگا۔ پھر اس مال کا جو انجام قیامت کے دن ہوگا، وہ بتایا کہ وہ طوق بن کر گلے کا ہار ہوگا۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے کچھ مال دیا ہے اور وہ اس مال کی زکات نہیں دیتا تو وہ مال ایک گنجے سانپ کی صورت میں، جس کے سر پر دو نقطے ہوتے ہیں، قیامت کے دن اس کے گلے کا طوق ہوگا، وہ دونوں جبڑوں سے اس شخص کو پکڑے گا اور کہے گا: میں تیرا مال ہوں، تیرا خزانہ ہوں۔ پھر آیت زیرِ تفسیر پڑھی۔[1] (تفرد به البخاري دون مسلم من هذا الوجه و رواه ابن حبان في صحيحه) سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت کے الفاظ یوں ہیں: "إِنَّ الَّذِيْ لَا يُؤَدِّي زَكَاةَ مَالِهٖ يُمَثَّلُ لَهُ مَالُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شُجَاعًا أَقْرَعَ لَهُ زَبِيْبَتَانِ ثُمَّ يَلْزَمُه يُطَوِّقُهُ يَقُوْلُ: أَنَا مَالُكَ أَنَا كَنْزُكَ" (رواه أحمد و النسائي وساقه ابن مزدويه عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ) عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے مرفوعاً کہا ہے کہ کوئی بندہ جو اپنے مال کی زکات نہیں دیتا اس کے لیے ایک گنجا سانپ مقرر کیا جائے گا جو اس کے پیچھے پڑے گا وہ اس سے بھاگے گا لیکن وہ اس کا پیچھا نہ چھوڑے گا کہے گا میں تیرا مال ہوں تیرا خزانہ ہوں۔[2]

پھر عبداللہ رضی اللہ عنہما نے اس حدیث کا مصداق قرآنِ مجید سے پڑھا: ﴿سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ (رواه أحمد والنسائي و ابن ماجه)۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اس کو امام حاکم نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے موقوفاً روایت کیا ہے۔[3] بہز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ سے مرفوع حدیث میں مروی ہے کہ کوئی آدمی اپنے آقا کے پاس آتا ہے اور اس سے اس کے زائد مال سے مانگتا ہے، لیکن وہ اس کو وہ زائد مال نہیں دیتا تو قیامت کے دن اس کے لیے ایک سانپ بلایا جائے گا۔ جو اس زائد مال کو جو اس نے روک رکھا تھا، نگل لے گا۔[4] (رواه ابن جرير و ابن مردويه) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ یہ آیت اہلِ کتاب کے حق میں اتری ہے، جو اُن کی طرف اتاری گئی کتب کو بیان کرنے میں بخل کرتے ہیں۔[5] (رواه ابن جرير) مگر صحیح یہ ہے کہ آیت زکات میں عام ہے اور اہلِ کتاب بھی اس میں ضرور داخل ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم خرچ کرو، سب امور کا مرجع اللہ کی طرف ہے۔ اس نے تم کو اسی کام کے لیے خلیفہ کیا ہے کہ تم اللہ کا مال جو تمھارے پاس ہے، قیامت کے دن کے لیے خرچ کرتے رہو۔ اللہ کو تمھاری نیتوں اور دل کے خیالات کی خبر ہے۔

---

1. صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٣٨) صحيح ابن حبان (٨/ ٤٦)
2. مسند أحمد (٢/ ٩٨) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٤٨١، ٢٤٨٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٦٩٠)
3. مسند أحمد (١/ ٣٧٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠١٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٤٤١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٧٨٤) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٢٦) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ١٨٥)
4. تفسير الطبري (٧/ ٤٣٥) سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٣٩) سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٦٦) صحيح الجامع (٧٥٧٥)
5. تفسير الطبري (٧/ ٤٣٢) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ﴾ سے مراد کفارِ قریش یا منافقین یا رؤسائے یہود یا سارے کفار ہیں۔ امام قشیری رحمہ اللہ نے کہا کہ کافر کے کفر پر غم کھانا نیکی ہے، لیکن نبی اکرم ﷺ کو بہت زیادہ غم ہوتا تھا، اس لیے منع فرمایا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴾ [الفاطر: ٨] ”پس آپ کو ان پر غم کھا کھا کر اپنی جان ہلاکت میں نہ ڈالنی چاہیے، یہ جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے یقیناً اللہ تعالیٰ بہ خوبی واقف ہے۔“[1] مطلب یہ ہوا کہ ان کا کفر اللہ کے ملک میں سے کچھ کم نہیں کرتا، یا اللہ کے دوستوں کو کچھ نقصان نہیں پہنچاتا، یا اس کے دین میں جو بندوں کے لیے مشروع کیا ہے، کچھ نقصان نہیں دیتا۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ آخرت میں ان کے لیے کچھ حصہ نہ ہو، یعنی ثواب کا۔ صیغۂ استقبال اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ و مشیت ہمیشہ کے لیے ہے۔

آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ خیر وشر اللہ ہی کے ارادے سے ہوتا ہے۔ یہ آیت قدریہ ومعتزلہ کی تردید کرتی ہے۔ پھر کفار کے لیے مہلت دینے کا ذکر کیا۔ جمہور کہتے ہیں کہ اس میں معتزلہ کے قول کے باطل ہونے کی دلیل ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ ہم نے جو اُن کی عمر طویل کی ہے، ان کو کھلی عیش دی ہے تو یہ اس لیے کیا ہے کہ ان کا گناہ زیادہ ہو جائے۔ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ کوئی جان نیک ہو یا بد، مگر اس کے لیے موت زندگی سے بہتر ہے۔ اگر نیک ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴾ [آل عمران: ١٩٨] ”اور جو اللہ کے پاس ہے وہ نیک لوگوں کے لیے بہتر ہے۔“ اور اگر بد ہے تو اللہ تعالیٰ نے کہا: ﴿ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ﴾[2] (آیت زیرِ تفسیر) یہی قول ابو الدرداء، محمد بن کعب اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی منقول ہے۔[3] جمہور محدثین کے نزدیک ﴿ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ﴾ کا خطاب کفار اور منافقین کے لیے ہے۔ بعض نے کہا کہ مومنین اور منافقین کے لیے ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ خطاب مشرکین کو ہے۔ مومنین سے مراد وہ ہیں جو ابھی تک باپوں کی پیٹھوں اور ماؤں کے رحموں میں ہیں۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: خبیث وطیب سے اہلِ سعادت اور اہلِ شقاوت مراد ہیں۔[4] ﴿ لِيُطْلِعَكُمْ ﴾ کا خطاب کفارِ قریش کو ہے، یعنی اللہ اس طرح بیان نہیں کرتا کہ فلاں شخص کافر ہے، فلاں شخص مومن ہے، فلاں شخص منافق ہے کہ تم ہر ایک کو اس طرح پر پہچان لو، کیوں کہ غیب کا جاننا اللہ کے ساتھ خاص ہے، کوئی آدمی اللہ کے غیب پر مطلع نہیں ہوسکتا، مگر جس کسی رسول کو وہ پسند کرے، کچھ بتلا دے اور وہ رسول تمھیں بتا دے، جس طرح ہمارے نبی اکرم ﷺ نے بہت سے منافقین کو متعین کر کے بتا دیا تھا۔ ان کا یہ بتانا اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے تھا نہ کہ اس سبب

---

[1] تفسير القرطبي (٤/ ٢٨٥) [2] تفسير الطبري (٧/ ٤٢٣) المعجم الكبير (٩/ ١٥١)
[3] الدر المنثور (٢/ ٣٩٢) [4] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٢٤) اس کی سند حسن ہے۔

سے کہ وہ غیب دان تھے یا نبی کو کوئی ایسا امر معلوم ہو، جو بعد کے امر پر دلیل ہو۔ جس طرح مصارع کفار (کافروں کی موت کی جگہ) پر بدر کے دن نشانات مقرر فرما دیے تھے۔

پھر بخل کا ذکر کیا ہے۔ بخل کی مذمت میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا: لغت میں بخل یہ ہے کہ انسان کسی واجب حق کو روکے۔ جس نے غیر واجب کو روکا، وہ بخیل نہیں ہے۔[1] قاموس میں ہے کہ بخل یہ کرم کی ضد ہے۔[2] امام شوکانی رحمہ اللہ نے منتقی میں حدیث: «اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْبُخْلِ» (اے اللہ! میں بخل سے پناہ مانگتا ہوں) کے تحت لکھا ہے کہ بعض نے اس حدیث کو واجب الاخراج (جس کا نکالنا فرض ہو) کے ساتھ مقید کیا ہے، مگر اس کی کوئی وجہ نہیں، کیوں کہ غیر واجب کے ساتھ بخل کمال کے متضاد ہے، اس سے بچنا بلاشک وشبہہ بہتر ہے۔ حدیث کو عموم پر باقی رکھنا زیادہ صحیح ہے۔[3] معلوم ہوا کہ بخل کے معنی عام ہیں نہ کہ خاص، جس طرح امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے،[4] رہی آیت تو وہ واجب کے حق میں ہے، لیکن عبارت سے عام اطلاق کا مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے۔ واللہ أعلم.

اصل وراثت اللہ ہی کے لیے ہے:

پھر فرمایا کہ آسمان وزمین کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے۔ یعنی خاص اسی کے لیے ہے نہ کہ غیر کے لیے۔ یہ فائدہ لفظ ﴿لِلّٰهِ﴾ کے بیان فرمانے سے نکلا، یعنی یہ مال تمھارے پاس عاریتاً رکھا گیا ہے۔ اس آیت کے مطابق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا﴾ [مریم: ٤٠] ''بلاشبہہ ہم ہی زمین کے اور اس کے بھی، جو اس (سرزمین) پر ہے، وارث ہوں گے۔'' اور اس کا فرمان ہے: ﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ﴾ [الحدید: ٧] ''اور اس (مال) میں سے خرچ کرو جس میں اس نے تمھیں جانشین بنایا ہے۔'' میراث اصل میں اس چیز کو کہتے ہیں، جو ایک مالک کے پاس سے نکل کر دوسرے شخص کے پاس جائے، اس دوسرے کی ملکیت نہ ہو، جب تک کہ بطورِ میراث اس کی طرف منتقل نہ ہو اور یہ بات معلوم ہے کہ اللہ پاک ساری مخلوقات کا حقیقی مالک ہے۔[5]

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ
اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ
ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝١٨١ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ
وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝١٨٢ۚ اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ
اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ

---

[1] تفسير القرطبي (٤/ ٢٩٢) [2] القاموس المحيط (١/ ١٢٤٧) [3] نيل الأوطار (٢/ ٣٤٩)
[4] تفسير القرطبي (٤/ ٢٩٢) [5] فتح البيان (٢/ ٣٨٢۔ ٣٨٨)

تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ
وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾
فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ
بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾

اللہ نے ان لوگوں کی بات سن لی جنھوں نے کہا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم مالدار ہیں۔ یقیناً ان کی یہ بات ہم لکھ لیں گے اور جو وہ نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے (وہ بھی ان کے اعمال نامے میں درج ہے) اور (قیامت کے دن) ہم ان سے کہیں گے: اب جلانے والے عذاب کا مزہ چکھو (181) یہ تمھارے ہاتھوں کی کمائی کا بدلہ ہے اور بے شک اللہ اپنے بندوں پر ہرگز ظلم کرنے والا نہیں (182) یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے کہا: بے شک اللہ نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں، یہاں تک کہ وہ ہمارے پاس ایسی قربانی لائے جسے آگ کھا جائے، کہہ دیجیے کہ مجھ سے پہلے تمھارے پاس کئی رسول کھلی نشانیاں اور وہ (معجزہ) بھی لے کر آئے، جس کا تم کہہ رہے ہو، پھر تم نے انھیں قتل کیوں کیا اگر تم سچے ہو؟ (183) (اے نبی!) پھر اگر وہ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو آپ سے پہلے کئی رسول جھٹلائے گئے تھے جو کھلی نشانیاں، صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے (184)

یہود کا اللہ کو فقیر کہنا اور اللہ کا جواب اور وعید:

موضح قرآن میں ہے کہ یہود نے جب یہ آیت سنی کہ ﴿ اَقْرِضُوا اللّٰهَ ﴾ [المزمل: ۲۰] تو کہنے لگے کہ اللہ ہم سے قرض مانگتا ہے تو اللہ محتاج ہے اور ہم دولت مند ہیں۔ بعض رسولوں سے یہ معجزہ ہوا تھا کہ کچھ چیز اللہ کی نیاز رکھی، پھر آسمان سے آگ آئی، وہ اس کو کھا گئی، پس وہ نیاز قبول ہوئی۔ اب یہود بہانہ پکڑتے تھے کہ ہم کو یہ حکم ہے کہ جس سے یہ معجزہ نہ دیکھیں، اس پر یقین نہ لائیں اور یہ جھوٹے بہانے تھے۔ ہر نبی کو جدا جدا معجزے ملے ہیں، سب کو ایک ہی معجزہ ملنا کیا ضروری ہے؟ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ جب یہ آیت اتری: ﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ﴾ [البقرة: ۲۴۵] ''کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے؟ پھر اللہ وہ مال اس کے لیے کئی گنا بڑھا دے۔''

یہود نے کہا: اے محمد! (ﷺ) تیرا رب فقیر ہوگیا ہے، جو بندوں سے قرض مانگنے لگا۔ اس پر اللہ نے آیت زیرِ تفسیر اتاری۔ (رواہ ابن مردویہ و ابن أبي حاتم) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ ابوبکر بیت المدراس میں آئے، وہاں بہت سے یہود کو دیکھا کہ ایک شخص کے پاس جمع ہیں، اس کو فنحاص کہتے تھے، وہ ان کے علما و احبار میں سے تھا۔ اس کے ہمراہ ایک اور حبر تھا، اس کو اشیع کہتے تھے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے فنحاص! تجھ پر افسوس ہے تو اللہ سے ڈر اور اسلام لے آ، واللہ تو خوب جانتا ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ تمھارے پاس اللہ کی طرف سے حق لے کر آئے ہیں، جس کو تم اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہو۔ فنحاص نے کہا: واللہ اے ابوبکر! ہمیں اللہ کی طرف کوئی حاجت نہیں ہے، اللہ ہمارا محتاج ہے، ہم کیوں اس کی طرف آہ وزاری کریں، جس طرح وہ ہماری طرف تضرع کرتا ہے، ہم غنی ہیں اور اگر وہ غنی ہوتا تو ہم سے قرض نہ مانگتا، جس طرح تمھارے صاحب (نبی) کا خیال ہے کہ تم کو تو سود سے منع کرتے ہیں اور ہم کو سود دیتے ہیں، اگر غنی ہوتے تو ہم کو ربا کیوں دیتے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو غصہ آیا تو زور سے فنحاص کے منہ پر ایک طمانچہ مارا۔

پھر کہا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! اگر ہمارے اور تمھارے درمیان عہد نہ ہوتا تو میں تیری گردن مار دیتا۔ اے اللہ کے دشمن! تم سے جہاں تک ہوسکے ہم کو جھٹلاؤ، اگر تم سچے ہو۔ فنحاص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا: اے محمد! دیکھو تمھارے یار نے میرا کیا حال کیا ہے، نبی اکرم ﷺ نے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم نے یہ کام کیوں کیا؟ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! اس اللہ کے دشمن نے ایک بڑی بری بات کہی تھی، اس کو زعم ہے کہ اللہ فقیر ہے اور یہ لوگ اس سے غنی ہیں۔ جب اس نے یہ بات کہی تو اللہ کے لیے میں نے غصہ کیا، اس کے منہ پر ایک طمانچہ مارا۔ فنحاص نے اس بات کا انکار کیا اور کہا: میں نے وہ بات نہیں کہی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔[1] (رواہ ابن أبي حاتم)

اس ارشاد میں کہ اب ہم لکھ لیں گے، جو کچھ انھوں نے کہا، ایک سخت ڈانٹ اور وعید ہے۔ اسی لیے اس جملے کو قتلِ انبیا بغیر حق کے برابر سمجھا ہے، یعنی وہ قول تو ان کا اللہ کے حق میں ہے اور یہ معاملہ ان کا اللہ کے رسولوں کے ساتھ تھا، اب اس قول و فعل کا بڑا بدلہ پائیں گے۔ ان سے یہ بات کہی جائے گی کہ اب تم جلانے والے عذاب کا مزہ چکھو۔ یہ کہنا تقریع، ڈانٹ، حقارت اور اُن کی بے وقعتی کے طور پر ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو نیاز کی قبولیت کی بابت الزام دیا کہ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو کہ تم رسولوں کی اطاعت اور حق کی اتباع کرتے ہو تو پھر تم نے پہلے انبیا کو کیوں جھٹلایا؟ ان کے ساتھ تکذیب، مخالفت اور دشمنی سے کیوں پیش آئے۔ پھر نبی اکرم ﷺ کو تسلی دی کہ تم ان کی تکذیب کا کچھ خیال نہ کرو، تم سے پہلے جو رسول آئے تھے، ان کے ساتھ بھی ان کا معاملہ اسی طرح پر تھا۔ بینات

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۸۲۸۔ ۸۲۹) ان دونوں کی اسناد حسن ہے۔

سے مراد قطعی حجتیں اور دلائل ہیں۔ زُبُر سے مراد وہ کتابیں ہیں، جو آسمان سے اتری تھیں، جیسے پہلے انبیا پر صحیفے نازل ہوئے تھے۔ منیر سے مراد بالکل واضح کتاب ہے۔[1]

فتح البیان میں ہے کہ یہودیوں نے اللہ پر فقیری کا طعنہ اس لیے کسا تھا کہ ان کے بھائی بند دینِ اسلام میں شک پیدا کریں۔ ''حریق'' بھڑکتی آگ کو کہتے ہیں۔ یہ ان کا تورات پر افترا تھا، کیوں کہ اس میں جس قربانی کا ذکر آیا ہے، وہ عیسیٰ اور محمد۔ علیهما الصلوات والسلام۔ کے علاوہ انبیا کے ساتھ مقید تھی۔ قربان وہ چیز ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کیا جائے، خواہ جانور ذبح کر کے یا صدقہ دے کر یا عملِ صالح کر کے۔ بنی اسرائیل کا دستور تھا کہ وہ قربانی کرتے تھے، نبی کی دعا سے آسمان پر سے آگ اتر کر اُس کو جلا دیتی تھی۔ یہ عبادت اللہ تعالیٰ نے سب انبیا کے لیے نہیں رکھی تھی نہ اس بات کو دعوائے نبوت کی سچائی کے لیے دلیل بنایا تھا۔ اسی لیے اللہ نے ان کی تردید فرمائی۔ پہلے رسولوں سے نوح و ہود و صالح و ابراہیم علیہم السلام وغیرہم مراد ہیں۔

بینات سے مراد حلال وحرام ہے یا ظاہر معجزات مراد ہیں۔ زُبر یہ زبور کی جمع ہے، زبور اس کتاب کو کہتے ہیں، جس کے اندر احکام ہوں۔ یا زبر سے نصیحتیں اور زواجر (زجر و توبیخ) مراد ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: زُبر کتبِ انبیا ہیں اور کتابِ منیر قرآن کریم ہے۔[2] یا زُبُر صحیفے ہیں اور کتابِ منیر تورات و انجیل ہے۔ ابو السعود رحمہ اللہ نے کہا: عرفِ قرآن میں کتاب کا لفظ شریعت اور احکام کے متعلق بولا گیا ہے۔ اسی لیے عام موقعوں پر کتاب وحکمت کا ذکر اکٹھا آیا ہے۔[3]

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿١٨٥﴾ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۫ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿١٨٦﴾

ہر کوئی موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے، بے شک قیامت کے دن تمھیں پورے پورے اجر دیے جائیں گے، پھر جسے آگ سے دور رکھا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو وہ یقیناً کامیاب ہوگیا اور دنیا کی زندگی تو دھوکے ہی کا سامان ہے (185) البتہ تمھیں تمھارے مالوں اور تمھاری

[1] تفسیر ابن کثیر (٥٦٥۔ ٥٦٦) [2] فتح القدير (١/ ٦٥٩)
[3] تفسير أبي السعود (٢/ ١٢٢) فتح البيان (٢/ ٣٨٩۔ ٣٩١)

جانوں کے بارے میں ضرور آزمایا جائے گا اور تم ان لوگوں سے جنھیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور ان لوگوں سے جنھوں نے شرک کیا، ضرور تکلیف دینے والی باتیں سنوں گے اور اگر تم صبر کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو تو بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے ﴿186﴾

ہر جان موت کا ذائقہ چکھنے والی ہے:

اللہ پاک نے اس آیت پاک میں ایسی خبر، جو تمام خلق کو شامل ہے، دی ہے کہ ہر نفس مرنے والا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿26﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿27﴾ ﴾ [الرحمن: ٢٦۔ ٢٧] ''ہر چیز، جو اس (زمین) پر ہے، فنا ہونے والی ہے۔ اور آپ کے رب ذوالجلال والاکرام کا چہرہ باقی رہے گا۔'' لہٰذا اکیلا اللہ ہی حی لا یموت ہے، باقی سارے جن و انسان مرنے والے ہیں۔ اسی طرح سارے ملائکہ اور حاملانِ عرش بھی مر جائیں گے۔ فقط اللہ احد، واحد، قہار، صمد، جو دوام اور بقا کے لیے متفرد ہے، وہی باقی رہے گا۔ آخر بھی وہی ہوگا، جس طرح سب سے اول بھی وہی تھا۔

اس آیت میں سارے لوگوں کی تعزیت (دلاسا و تسلی) ہے کہ روئے زمین پر کوئی فرد و بشر باقی نہیں رہے گا، ہر ایک لقمۂ اجل بن جائے گا، جب اس کی مدت پوری ہو جائے گی۔ وہ نطفہ جس کا آدم کی صلب سے جنم لینا مقدر کیا جا چکا ہے، وہ فارغ و خالی ہو جائے گا، خلق تمام ہو جائے گی، اللہ تعالیٰ قیامت کو قائم کرے گا۔ خلائق کو ان کے اعمال، خواہ وہ جلیل القدر ہوں، حقیر ہوں، کثیر و قلیل ہوں، کبیر و صغیر ہوں، کی جزا و سزا دے گا، کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس دن تم کو تمھارے کیے کا پورا بدلہ ملے گا۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا ہے: جس دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو ایک تعزیت (تسلی) آئی۔ ایک آنے والا آیا، ہم اس کی آہٹ سنتے تھے، لیکن اس کو دیکھتے نہیں تھے، اس نے آ کر کہا: ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّ فِي اللّٰهِ عَزَاءً مِنْ كُلِّ مُصِيْبَةٍ وَخَلَفًا مِنْ كُلِّ هَالِكٍ وَ دَرَكًا مِنْ كُلِّ فَائِتٍ فَبِاللّٰهِ فَاتَّقُوْا وَإِيَّاهُ فَارْجُوْا فَإِنَّ الْمُصَابَ مَنْ حُرِمَ الثَّوَابَ وَالسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ''

''اہلِ بیت تم پر سلامتی، اللہ کی رحمت اور برکت ہو! ہر جان موت کا ذائقہ چکھنے والی ہے، قیامت کے دن تمھیں تمھارے پورے اجر دیے جائیں گے، اللہ ہر مصیبت سے تسلی دیتا ہے، ہر فوت ہونے والے کا جانشین ہوتا ہے اور ہر کھو جانے والے کی تلافی ہو جاتی ہے۔ اللہ سے ڈرو اور اسی سے امید رکھو، دکھی اور مصیبت زدہ وہ ہے جو ثواب سے محروم رہے۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' جعفر بن محمد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مجھ کو میرے باپ نے خبر دی کہ سیدنا علی

بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے کہا: تم جانتے ہو کہ وہ کون شخص تھا؟ وہ خضر علیہ السلام تھے۔ یہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔[1]

یہ حدیث مرفوع نہیں ہے۔ حدیث مرفوع سے جو بات نکلتی ہے، وہ اس امر کی متقاضی ہے کہ خضر علیہ السلام عہدِ نبوت میں موجود نہ ہوں، اگر اس زمانے میں زندہ ہوتے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے۔ اس مسئلے کی بحث اپنے مقام پر آئے گی۔

اصل کامیابی آگ سے نجات میں ہے:

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جو کوئی نار سے بچا، اس نے نجات پائی، جنت میں گیا، اس نے پوری مراد پائی۔ اے اللہ! تو مجھ کو آگ سے بچا اور جنت میں لے جا۔ اللھم آمین.

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ جنت میں ایک چابک (کوڑے) کی جگہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، تم چاہو تو اس آیت کو پڑھو: ﴿ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ﴾۔[2] (رواه ابن أبي حاتم) یہ حدیث صحیحین میں کئی طرح سے اس اضافے کے بغیر آئی ہے، اس کو ابن حبان و حاکم رحمہما اللہ نے بھی روایت کیا ہے۔ ابن مردویہ رحمہ اللہ کے نزدیک سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت اس طرح ہے کہ جنت میں ایک کوڑے کی جگہ تم میں سے کسی کے لیے دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی۔[3] سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کو یہ بات پسند ہو کہ وہ آگ سے الگ تھلگ رہے اور جنت میں جائے تو اس کو چاہیے کہ اس کی موت اس حالت میں آئے کہ وہ اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتا ہو اور چاہیے کہ لوگوں کے ساتھ ویسا برتاؤ رکھے، جیسا ان کا برتاؤ اپنے ساتھ چاہتا ہے۔[4] (رواه أحمد)

دنیا دھوکے کا سامان ہے:

پھر متاعِ دنیا کو غرور فرمایا۔ اس میں دنیا کی حقارت اور پستی ظاہر ہوتی ہے کہ دنیا ایک ادنیٰ سی فنا ہونے والی اور قلیل سی زائل ہونے والی چیز ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴾ [الأعلى: ١٦۔ ١٧] ''بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔ حالاں کہ آخرت بہت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴾ [القصص: ٦٠]

---

(1) تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٨٣٢۔ ٨٣٣) اس کی سند میں ''علی بن ابی علی ہاشمی'' سخت ضعیف راوی ہے۔

(2) سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٠١٣) سنن النسائي الکبریٰ (٦/ ٣١٧) تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٨٣٣) السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (١٩٧٨)

(3) صحیح البخاري، رقم الحدیث (٢٧٣٥) صحیح ابن حبان (١٦/ ٤٣٣) مستدرك الحاکم (٢/ ٣٢٧) تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٦٦۔ ٥٦٧)

(4) صحیح مسلم، رقم الحدیث (١٨٤٤) مسند أحمد (٢/ ١٩٢)

''اور تمھیں جو چیز بھی دی گئی ہے، وہ دنیاوی زندگی کا فائدہ اور اس کی زینت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہت بہتر اور زیادہ دیرپا ہے۔'' حدیث شریف میں مروی ہے: ''واللہ! نہیں ہے دنیا آخرت میں، مگر جیسے تم میں سے کوئی اپنی انگلی کو دریا میں ڈبوئے اور نکالے، پھر دیکھے کہ وہ کیا لے کر پھری۔''[1] امام قتادہ رحمہ اللہ نے متاعِ غرور کی تفسیر میں کہا ہے کہ دنیا ایک متاعِ متروک ہے، قسم ہے اس اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں! قریب ہے کہ یہ متاع اپنے اہل سے مضمحل ہو جائے، تم اس متاع سے جہاں تک بن سکے، اللہ کی اطاعت اخذ کرو۔ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ''۔[2]

مال و جان کی آزمائش:

پھر اللہ تعالیٰ نے مال و جان کی آزمائش کا ذکر فرمایا، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوٰلِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۗ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ [البقرة: ١٥٥۔ ١٥٦] ''اور ہم تمھیں کسی قدر خوف اور بھوک سے مالوں، جانوں اور پھلوں میں کمی کر کے ضرور آزمائیں گے اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دے دیجیے۔ وہ لوگ کہ جب انھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں: بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔'' یعنی یہ بات ضرور ہے کہ مومن کسی شے میں مال یا جان یا اولاد یا اہل سے مبتلا ہوتا ہے۔ ابتلاء ہر آدمی کا اس کے دین کے اندازے سے ہوتا ہے، اگر دین میں پکا ہے تو آزمائش بھی سخت ہوتی ہے۔

اللہ کی راہ میں تکلیفوں پر صبر اور عفو و درگزر:

پھر مومنوں کو واقعۂ بدر سے پہلے مدینہ آنے پر تسلی دی تھی کہ تم کو اہلِ کتاب اور مشرکین کے ہاتھوں ایذا پہنچے گی، تم درگزر اور صبر کرنا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس ایذا سے تم کو نجات بخشے۔ پوشیدہ تکلیف دور ہو، ہمّ اور گھبراہٹ فرحت میں بدل جائے۔ اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم اس آیت کی روشنی میں مشرکین اور اہلِ کتاب سے عفو و درگزر کرتے تھے، ان کی ایذا رسانی پر صبر کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے لڑنے کا حکم بھیجا۔ اس اثر کو امام بخاری رحمہ اللہ نے مطولاً اس آیت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ [البقرة: ١٠٩] ''اہلِ کتاب میں سے بہت سے یہ چاہتے ہیں کاش کہ وہ تمھارے ایمان لانے کے بعد تمھیں پھیر کر کافر بنا دیں، اپنے دِلوں میں حسد کرتے ہوئے، اس کے بعد کہ ان کے سامنے حق واضح ہو چکا، پس معاف کر دو اور جانے دو، یہاں تک کہ اللہ اپنا

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٥٨) [2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٣٣)

حکم لے آئے، بے شک اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔‘‘

غرض یہ کہ نبی کریم ﷺ عفو و درگزر کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے جنگ کرنے کی اجازت دے دی۔ جب غزوۂ بدر ہوا تو کفارِ قریش کے سردار مارے گئے، اس وقت عبداللہ بن اُبی ابن سلول نے اور جو مشرکین اور بت پرست لوگ اس کے ہمراہ تھے، انھوں نے کہا: یہ بات تو سامنے آ گئی، یعنی مسلمانوں کی کامیابی، لہٰذا اب رسول سے اسلام پر بیعت کرلو، سب نے بیعت کی اور اسلام لائے۔[1] لہٰذا جو شخص حق پر قائم رہے گا یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے گا، اس کو ضرور ایذا دی جائے گی۔ اس شخص کے لیے سوائے صبر کے چارہ نہیں۔ اللہ کی راہ میں صبر کرے، اللہ سے مدد چاہے اور اسی کی طرف رجوع کرے۔

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ آیت ﴿ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ﴾ میں مُصدِق اور مُکذِب کے لیے وعدہ و وعید ہے۔ ذائقہ کو تنوین سے پڑھا ہے اور موت کو نصب (زبر) سے۔ جمہور اضافت سے پڑھتے ہیں، یعنی ہر جی (نفس) اپنے تن بدن کی موت کو چکھنے والا ہے، کیوں کہ جان تو مرتی نہیں، اگر مرتی تو حالتِ موت میں موت کا مزہ نہ چکھتی۔ کیوں کہ حیات ذائقے اور تمام قسم کے ادراکات کے لیے شرط ہے۔ رہی وہ آیت کہ ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا ﴾ [الزمر: ٤٢] ’’اللہ ہی موت کے وقت جانیں قبض کرتا ہے۔‘‘ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مارتا ہے جانوں کو اجساد کی موت کے وقت۔ (قاله الكرخي) یہ عبارت اس بات کی مقتضی ہے کہ اس جگہ نفس سے مراد روح ہے، حالاں کہ نفس کا اطلاق کبھی جسم اور روح کے مجموعے پر بھی آتا ہے، یعنی حیوان پر۔ اس جگہ یہ معنی بھی صحیح ہو سکتے ہیں، بلکہ ذہن میں جلد آ جانے والے، یہی معنی ہیں۔

پھر قیامت پر اجر دینے کا وعدہ رکھا۔ لہٰذا مومن کا اجر و ثواب ہوگا اور کافر کا اجر عقاب ہوگا۔ رہا وہ اجر جو دنیا میں یا برزخ میں ہوتا ہے، سو وہ اجر کا ایک حصہ ہے، پورا اجر تو وہیں ملے گا۔ حدیث شریف میں مروی ہے کہ قبر یا تو جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے یا آگ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ ’’زُحْزِحَ‘‘ کے معنی ہیں: کنارے ہونا، دور ہو جانا، یعنی جو شخص مار سے دور پڑا، وہ اپنی مراد کو پہنچا۔ حقیقی کامیابی یہی ہے، جس کے برابر کوئی فوز نہیں ہے، کیوں کہ ہر فوز گو ہر قسم کا ہو سوائے جنت کے تو حصولِ جنت کی نسبت اس کی کچھ ہستی نہیں ہے، مگر ایک روایت کے مطابق جنت میں وہ آخرت کی افضل نعمت ہے۔ اَللّٰهُمَّ لَا فَوْزَ إِلَّا فَوْزَ الْآخِرَةِ وَلَا عَيْشَ إِلَّا عَيْشُهَا وَلَا نَعِيْمَ إِلَّا نَعِيْمُهَا فَاغْفِرْ ذُنُوْبَنَا وَاسْتُرْ عَوْرَاتِنَا وَاٰمِنْ رَوْعَاتِنَا وَارْضَ عَنَّا رَضَاءً لَا سَخَطَ بَعْدَهٗ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٩٠)

وَاجْمَعْ لَنَا بَيْنَ الرِّضَا مِنْكَ عَلَيْنَا وَالْجَنَّةَ لَنَا آمِيْنَ يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ. ”اے اللہ! کامیابی، عیش ونشاط اور نعمتیں صرف آخرت کی ہیں، ہمارے گناہ بخش دے، ہمارے عیوب چھپا دے، ہماری بے چینی کو امن دے، ہم سے اس طرح راضی ہو جا کہ اس کے بعد ناراضی نہ ہو، ہمیں اپنی رضا اور جنت کا مستحق بنا۔ آمین“

متاع ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے اور نفع حاصل کرتا ہے، پھر وہ چیز زائل ہو جاتی ہے، باقی نہیں رہتی۔ اکثر مفسرین رحمہم اللہ کا قول یہی ہے۔ کسی نے کہا: متاع، جیسے: بسولا، کلہاڑی، رکابی اور دیگچی وغیرہ، لیکن پہلا قول بہتر ہے۔ غرور یہ دھوکے اور دغا بازی کو کہتے ہیں، جو ہمیشہ نہ رہے یا باطل ہو۔ شیطان کو غرور اس لیے کہتے ہیں کہ وہ انسان کو باطل آرزوؤں اور جھوٹے وعدوں سے دھوکا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو متاع سے مشابہ ٹھہرایا ہے، جس سے متاع کا ارادہ کرنے والے کو فریب دیا جاتا ہے، جس کا ظاہر بہت پیارا، مگر باطن مکروہ ہوتا ہے۔ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کہا: دنیا متاعِ غرور اس کے لیے ہے، جس کو آخرت طلب کرنے کا شغل نہیں ہے اور جو آخرت طلب کرنے کے لیے مشغول ہے، اس کے لیے دنیا سے بہتر چیز کی فراہمی ہوگی۔[1] پھر اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُمت کو تسلی دی کہ تم کو کافروں اور فاسقوں کے ہاتھوں سے ایذا پہنچے گی، تم ان کے مکر وفریب، آزمائشوں اور امتحان پر صبر کرنا، ثابت قدم رہنا۔

مال کا امتحان یہ ہے کہ مال میں کمی بیشی اور ناگہانی ضروری اخراجات اور مال سے متعلقہ ہر قسم کی تکالیف کا وارد ہونا۔ جانوں کا امتحان یہ ہے کہ بیماری و اموات کا آنا، دوست احباب کا چھوٹ جانا اور اللہ کے راستے جنگ و جدال میں تکالیف اُٹھانا اور شہید ہونا۔ اس جگہ اہلِ کتاب سے مراد کعب بن اشرف ہے، وہ مشرکوں کو شعر گوئی کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر بھڑکاتا تھا۔ ابن جریج رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد یہود ونصاریٰ ہیں، مسلمان سنتے تھے کہ وہ عزیر اور مسیح علیہما السلام کو ابن اللہ کہتے ہیں۔[2] مشرکین سے کافروں کے تمام گروہ مراد ہیں۔ ﴿ اَذًى ﴾ سے مراد دین میں اور آبرو میں طعن ہے۔ امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا: عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر کر کے ان کو اذیت دینا۔[3] جمل کا قول ہے کہ اس سے اوصافِ جمال کا ذکر کرنا مراد ہے۔ کعب بن اشرف مومنین کی عورتوں کا ذکر اپنے اشعار اور غزل میں کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے کہا: تمھارا صبر وتقویٰ کرنا بڑی ہمت کی بات ہے، فضیلت وشرف کا کمال ہے۔[4]

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ٝ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ۝۱۸۷ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ

[1] تفسير البغوي (٨/ ٣٩)
[2] تفسير الطبري (٧/ ٤٥٥، ٤٥٦)
[3] تفسير الجلالين (١/ ٩٣)
[4] فتح البيان (١/ ٣٩٢ ـ ٣٩٥)

اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾

اور جب اللہ نے ان لوگوں سے عہد لیا جنھیں کتاب دی گئی تھی کہ تم اسے لوگوں کے سامنے ضرور بیان کرو گے اور اسے ہرگز نہیں چھپاؤ گے، پھر انھوں نے اس عہد کو پسِ پشت ڈال دیا اور اسے تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالا، پھر کس قدر بری ہے وہ قیمت جو وصول کر رہے ہیں ﴿۱۸۷﴾ یہ لوگ جو اپنے کرتوت پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو انھوں نے نہیں کیا اس پر بھی ان کی تعریف کی جائے، آپ یہ نہ سمجھیں کہ وہ عذاب سے چھوٹ جائیں گے، ان کے لیے دردناک عذاب ہے ﴿۱۸۸﴾

اہلِ کتاب کی عہد شکنی اور حق پوشی پر مذمت:

وہی یہود غلط مسئلے بتاتے اور پیغمبر کی صفت چھپاتے اور پھر خوش ہوتے کہ ہم کو کوئی پکڑ نہیں سکتا اور اُمید رکھتے کہ لوگ ہماری تعریف کریں کہ خوب عالم، دین دار اور حق پرست ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا کہ اس آیت میں اللہ کی طرف سے اہلِ کتاب کو ملامت اور ڈانٹ ہے، وہ اہلِ کتاب جن سے انبیا علیہم السلام کی زبان پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا تھا اور یہ اقرار تھا کہ ان کے ذکر کو لوگوں میں پھیلا دیں گے، جب وہ رسولِ موعود آئے تو اس کے تابع ہو جائیں۔ لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت کو چھپا ڈالا۔ جس خیرِ دارین کا ان سے وعدہ لیا تھا، اس کے عوض یہاں کے تھوڑے فائدے کو اختیار کیا، برا سودا کیا اور خراب لین دین ہوا۔[1]

اس آیت میں علما کو اس بات سے سخت تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ مسلک اہلِ کتاب کو نہ اپنائیں، ورنہ جو مصیبت ان پر پڑی، وہی بلا کہیں ان پر نہ آجائے۔ علما پر واجب ہے کہ ان کے پاس جو علم نافع عملِ صالح کی طرف ترغیب دینے والا ہے، اس کو پھیلائیں۔ اس میں سے کوئی چیز پوشیدہ نہ رکھیں۔ حدیث میں متعدد طریقوں سے مروی ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ فَكَتَمَهُ أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنَ النَّارِ» یعنی جس شخص سے کسی علم کا سوال کیا گیا، اس نے اس مسئلے کو چھپایا تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام دی جائے گی۔[2] پھر اللہ نے مُرائین کا ذکر کیا، جو علم کے بغیر اپنا علم ظاہر کرتے ہیں۔ صحیحین میں مروی ہے کہ جس نے کوئی جھوٹا دعویٰ اس لیے کیا، تاکہ مال بنے تو اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کی تنگی میں اور زیادہ اضافہ کرے گا۔[3]

---

[1] تفسير ابن كثير (١/ ٥٦٨)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٥٨)، سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤٩) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٢٨)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٠)

دوسری حدیث میں مروی ہے کہ « اَلْمُتَشَبِّعُ بِمَا لَمْ يُعْطَ كَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُوْرٍ »[1] (رواه الشيخان أيضاً)

''ایسی چیز کی کثرت کا اظہار کرنے والا جو اس کو حاصل نہ ہو، وہ دو جھوٹ کے کپڑے پہننے والے کی طرح ہے۔''

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ کتاب سے کوئی بات پوچھی تھی، انھوں نے اس کو چھپایا اور غلط طریقے سے بتایا، پھر خیال کیا کہ ہم نے ان کے سوال کا جواب دے دیا، چاہا کہ وہ ہماری تعریف کریں۔ اپنے چھپانے پر خوش ہوئے تو اس پر یہ آیت اتری۔[2] (رواه البخاري و مسلم و الترمذي و النسائي و ابن أبي حاتم و ابن جرير و الحاكم و ابن مردويه) مروان نے اپنے دربان ابو رافع سے کہا: سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس جا کر کہہ کہ اگر ہمارا ہر آدمی اس پر خوش ہوگا، جو کچھ وہ کرتا ہے اور چاہے گا کہ کسی ایسے کام پر اس کی تعریف کی جائے، جو اس نے نہ کیا ہو تو ہم سب عذاب کیے جائیں گے؟ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ہمیں اس آیت سے کیا مطلب؟ یہ تو اہلِ کتاب کے حق میں اتری ہے۔ (رواه أحمد) امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اسی کے قریب قریب ذکر کیا ہے۔[3]

سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ کچھ منافق لوگ، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لڑائی کے لیے باہر نکلتے، بیٹھ رہتے اور اس پر خوش ہوتے، جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لوٹ کر آتے تو وہ لوگ عذر کرتے، قسمیں کھاتے اور چاہتے کہ جو کام انھوں نے کیا، اس پر ان کی تعریف کی جائے، اس پر یہ آیت اتری: ﴿ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ ﴾[4]۔ (رواه البخاري ومسلم بنحوه) مروان نے ابو سعید سے کہا تھا: ''نَحْنُ نَفْرَحُ بِمَا آتَيْنَا وَنُحِبُّ أَنْ نُحْمَدَ بِمَا لَمْ نَفْعَلْ؟'' ''ہماری بھی تو یہی کیفیت ہے کہ ہم جو کرتے ہیں، اس پر خوش ہوتے ہیں اور جو نہیں کرتے اس پر تعریف کیا جانا پسند کرتے ہیں؟'' سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہ نے کہا: ''إِنَّ هٰذَا لَيْسَ مِنْ ذَاكَ'' ''اس کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔'' پھر منافقین کے پیچھے بیٹھ رہنے کا ذکر کیا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی لشکر بھیجتے، اگر اس کو کچھ صدمہ پہنچتا تو اپنے پیچھے رہنے پر خوش ہوتے اور اگر اس کو اللہ تعالیٰ فتح دیتا تو اس کو خوش کرنے کے لیے قسمیں اٹھاتے، ان کی کامیابی کی خوشی کے اظہار کے لیے ان کی تعریف کرتے۔[5] (الحديث رواه ابن مردويه)

سیدنا ثابت بن قیس انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے ڈر ہے کہ میں کہیں ہلاک نہ ہو جاؤں، کہا: کیوں؟ کہا کہ مجھے تعریف پسند ہے اور اللہ تعالیٰ نے اترانے سے منع فرمایا ہے، میں جمال کو دوست رکھتا ہوں۔ اللہ نے اس بات سے روکا ہے کہ ہماری آواز آپ کی آواز پر اونچی ہو اور میں ایک بلند آواز آدمی ہوں۔ فرمایا: تجھے یہ

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢١٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٣٠)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٧٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠١٤) سنن النسائي الكبرىٰ (٦/ ٣١٨) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٣٩۔ ٨٤٠) تفسير الطبري (٧/ ٤٧٠) مستدرك الحاكم (٢/ ٣٢٧)

(3) مسند أحمد (١/ ٢٩٨) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٦٨)

(4) صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٥٦٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٧٧)

(5) تفسير ابن كثير (١/ ٥٦٩)

بات پسند نہیں ہے کہ تو حمید (قابلِ تعریف زندگی) جیے، شہید مرے اور جنت میں جائے؟ کہا: ہاں، پھر وہ حمید جیے اور مسیلمہ کذاب کے ساتھ جنگ والے دن شہید ہوئے۔[1] (رواہ ابن مردویہ) پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تو خیال نہ کر یا وہ خیال نہ کریں کہ ان کو عذاب سے نجات ملے گی، ان کے لیے تو عذابِ الیم ہے، اللہ سب کا مالک ہے، ہر چیز پر قادر ہے، کوئی شے اس کو عاجز نہیں کر سکتی، تم اللہ سے ڈرتے رہو، اس کے حکم کے خلاف نہ کرو، اس کے غضب سے بچو، اس سے بڑا کوئی نہیں ہے نہ اس سے زیادہ کسی کو قدرت ہے۔

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ آیت زیرِ تفسیر میں یہود و نصاریٰ یا صرف یہود کو ڈانٹ پلائی گئی ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اہلِ کتاب سے ہر عالمِ کتاب مراد ہے، کوئی سی کتاب کیوں نہ ہو۔ امام حسن و قتادہ رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ یہ آیت ہر عالم کے لیے عام ہے۔ محمد بن کعب رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول بھی اسی پر دلالت کرتا ہے: ”لَوْلَا مَا أَخَذَہُ اللّٰہُ عَلٰی أَھْلِ الْکِتَابِ مَا حَدَّثْتُکُمْ بِشَيْئٍ“ یعنی اگر اللہ نے کتاب والوں سے اسے بیان کرنے کا عہد نہ لیا ہوتا تو میں تم کو کوئی حدیث بھی نہ سناتا، پھر یہ آیت زیرِ تفسیر پڑھی۔[2] پہلے یہ حکم دیا کہ تم کتاب کو بیان کرو، پھر کتمان سے منع کیا۔ یا بیان سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر دلالت کرنے والی آیات کا ذکر کرنا ہے۔ کتمان سے مراد غلط اور گمراہ کن تاویلات اور باطل شک و شبہات کا پیدا کرنا ہے۔ انھوں نے کتاب اور اللہ کے ساتھ کیے گئے عہد کو پسِ پشت ڈال کر تھوڑی سی حقیر قیمت لی۔

عوام اور سفلہ سے رشوتیں لے کر حق کو چھپایا اور باطل کو ظاہر کیا، تاکہ اپنے کھانے پینے اور دنیا کا فائدہ حاصل کیا جا سکے اور اپنے علم کی ریاست قائم رہ سکے، لوگوں کو غلط مسئلے بتائے اور جھوٹے حکم سمجھائے۔ جس طرح آج کل کے علما جو دنیا کے طالب ہیں، اپنی رائے اور قیاس سے کتاب و سنت کے خلاف فتوے بتا کر عوام اور سفلہ میں شہرت اور عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ معاش پیدا کرنے کے لیے کتبِ فقہ سے سائل کی مرضی کے مطابق مسائل نکال کر بتا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ان کا یہ لین دین بہت برا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا تھا کہ وہ نبی اُمی کا اتباع کریں۔[3] تورات اور انجیل میں ہے کہ اسلام اللہ کا دین ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے بندوں پر فرض کیا ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں۔

---

[1] صحیح ابن حبان (١٦/ ١٢٥) المعجم الکبیر (٢/ ٦٦) مستدرك الحاکم (٣/ ٢٦٠) امام البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں اضطراب، جہالت اور انقطاع ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٦٣٩٨)

[2] تفسیر القرطبي (٤/ ٣٠٤۔ ٣٠٥) فتح القدیر (١/ ٦٦٠۔ ٦٦١)

[3] تفسیر الطبري (٧/ ٤٦٠) تفسیر ابن أبي حاتم (٣/ ٨٣٥) اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: یہ آیت ایک میثاق ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اہلِ علم سے لیا ہے، لہٰذا جس شخص کو علم آتا ہو، اس کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو سکھائے، کتمانِ علم سے دور رہے، علم کا چھپانا ہلاکت ہے۔[1] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: اگر یہ عہد نہ ہوتا، جو اللہ تعالیٰ نے اہلِ علم سے لیا ہے تو میں تمھارے بہت سے سوالوں کا جواب نہ دیتا۔[2] آیت زیرِ تفسیر اگرچہ علمائے اہلِ کتاب کے ساتھ مخصوص ہے، لیکن اس میں علمائے ملتِ اسلامیہ کا داخل ہونا کچھ بعید نہیں، کیوں کہ اس اُمت کے علما بھی اہلِ کتاب، یعنی صاحبِ قرآن ہیں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: خوشی ہو عالم، ناطق، مستمع اور داعی کے لیے کہ اس نے علم سیکھ کر پھیلایا، اس نے اچھی بات سن کر قبول کی، یاد رکھی۔[3] پھر اللہ نے ذکر کیا کہ جو لوگ اپنے فعلِ ضلال پر خوش ہوتے اور چاہتے ہیں کہ ان کی اس فعل پر تعریف ہو، جو انھوں نے نہیں کیا، یعنی تمسک بالحق ان کے لیے عذاب ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ آیت زیرِ تفسیر ہر اس شخص کو شامل ہے، جس سے ایسی بات صادر ہو، جو اس آیت میں ہے، کیوں کہ لفظ کی عمومیت کا اعتبار ہے، خصوصیتِ سبب کا نہیں۔ خوف کی جگہ کو "مفازۃ" تفاؤل (نیک شگونی) کے طور پر کہتے ہیں۔[4]

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿189﴾ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿190﴾ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿191﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿192﴾ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ڰ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿193﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰي رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿194﴾

اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی حکومت، اور اللہ ہر چیز پر خوب قادر ہے ﴿189﴾ بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدایش، اور رات اور دن کے اختلاف میں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں ﴿190﴾

---

[1] تفسير الطبري (٧/ ٤٦١) [2] الطبقات الكبرىٰ لابن سعد (٧/ ١٥٨) الدر المنثور (٢/ ٤٠٣)
[3] تفسير الطبري (٧/ ٤٦١) [4] فتح البيان (٢/ ٣٩٥ ـ ٣٩٨)

جو لوگ کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں سوچ بچار کرتے ہیں۔ (وہ کہتے ہیں:) اے ہمارے رب! تو نے یہ سب کچھ بے فائدہ پیدا نہیں کیا، تو پاک ہے، پس تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا (191) اے ہمارے رب! بے شک جسے تو آگ میں داخل کرے یقیناً اسے تو نے رسوا کر دیا اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں (192) اے ہمارے رب! بے شک ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا، وہ ایمان کی طرف بلاتا ہے، یہ کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لے آئے۔ اے ہمارے رب! پس تو ہمارے گناہ بخش دے، اور ہم سے ہماری برائیاں دور کر دے اور ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ فوت کر (193) (اے) ہمارے رب! اور ہمیں وہ چیز دے جس کا تو نے اپنے رسولوں کے ذریعے ہم سے وعدہ کیا تھا اور ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کرنا۔ بے شک تو وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا (194)

توحید کے دلائل اور عقل مندوں کی صفات اور دعائیں:

یعنی نبی سے معجزہ طلب کرنا کیا ضروری ہے؟ جو بات وہ کہتا ہے، یعنی توحید، اس کی نشانیاں تو سارے عالم میں نمودار ہیں۔ پھر فرمایا: بے فائدہ نہیں بنایا، اس عالم کی انتہا ہوگی تو وہ دوسرے عالم میں چلے جائیں گے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ قریش نے یہود کے پاس آ کر کہا کہ موسیٰ علیہ السلام تمھارے پاس کیا لے کر آئے تھے؟ کہا: عصا اور یدِ بیضا، پھر نصاریٰ کے پاس جا کر پوچھا: عیسیٰ علیہ السلام کیا کرتے تھے؟ کہا: اندھے اور ابرص کو شفا یاب اور مردے کو زندہ کرتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کہا کہ تم اللہ سے دعا کرو کہ کوہِ صفا کو ہمارے لیے سونا کر دے، اس پر یہ آیت اتری کہ تم ان نشانیوں میں غور کرو۔[1] (رواه الطبراني) مگر مشکل یہ ہے کہ یہ آیت مدنی ہے اور ان کا سوال مکہ میں تھا۔ واللہ أعلم.

آیت کا مطلب یہ ہے کہ آسمان کی وسعت اور بلندی اور زمین کی پستی اور کثافت، پھر جو کچھ ان کے درمیان ہے، جیسے چلنے پھرنے والے اور ایک جگہ ٹھہرنے والے ستارے، سمندر، پہاڑ، بیابان، درخت، نباتات، زراعت، پھل، حیوانات، معدنیات جو نفع بخش اور مختلف رنگوں کی ہیں، کھانے کی اشیاء، خوشبوئیں اور مختلف خواص والے میوے، پھر رات دن کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا، ان کا ایک دوسرے کو کاٹنا، ایک بڑھتا دوسرا گھٹتا ہے، یہ سب اللہ کی تقدیر سے ہے۔ اسی لیے یہ فرمایا کہ ان آیاتِ عظیمہ میں جو محسوس ہوتی ہیں اور نظر آتی ہیں، عقل مند لوگوں کے

[1] المعجم الكبير (١٢/ ١٢) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه يحيى الحماني وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٧/ ٥٤)

لیے نشانیاں ہیں، جو حقائق اشیا کو پالینے والے ہیں اور اندھے اور بہرے نہیں ہیں کہ کچھ نہ سمجھیں اور نہ بوجھیں، جس طرح ان کے حق میں فرمایا: ﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿١٠٥﴾ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿١٠٦﴾ ﴾ [یوسف: ١٠٥۔ ١٠٦] ''اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں کہ وہ ان پر سے گزرتے ہیں اور ان سے بے دھیانی کرتے ہیں۔ اور ان کے اکثر اللہ پر (اس طرح) ایمان لاتے ہیں کہ وہ مشرک ہی ہوتے ہیں۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے اولی الالباب کا وصف بیان کیا کہ ان کا یہ حال ہے کہ وہ اللہ کی یاد کسی حال میں نہیں چھوڑتے، کھڑے بیٹھے لیٹے اس کا ذکر کیا کرتے ہیں۔ صحیحین میں عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو کھڑے ہو کر نماز پڑھ، کھڑے ہو کر اگر نہ ہو سکے تو بیٹھ کر، یہ بھی ممکن نہ ہو تو لیٹ کر۔[1] کروٹ سے مطلب یہ ہے کہ وہ ہر حالت میں پوشیدہ طور پر اور ظاہر طور پر اور زبان سے اللہ کا ذکر منقطع نہیں کرتے، زمین اور آسمان کی پیدائش میں غور کیا کرتے ہیں اور جو حکمتیں اللہ کی عظمت و قدرت و علم و حکمت و اختیار اور رحمت پر دلیل ہیں، ان کو سوچا کرتے ہیں۔

تفکر کے متعلق اہل اللہ کے اقوال:

شیخ ابوسلیمان دارانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب میں اپنے گھر سے باہر نکلتا ہوں تو جس چیز پر میری نظر پڑتی ہے، اس میں اپنے اوپر اللہ کی ایک نعمت دیکھتا ہوں، مجھ کو اس میں عبرت حاصل ہوتی ہے۔ (رواه ابن أبي الدنيا في كتاب التوكل و الاعتبار) امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا کہ ایک شب کے قیام سے ایک ساعت کا تفکر بہتر ہے۔ غور وفکر کرنا ایک آئینہ ہے جو تجھ کو تیری نیکیاں اور برائیاں دکھاتا ہے۔ سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا: غور وفکر ایک نور ہے، جو تیرے دل میں داخل ہوتا ہے۔ کبھی یہ شعر پڑھتے:

إِذَا الْمَرْءُ كَانَتْ لَهٗ فِكْرَةٌ فَفِيْ كُلِّ شَيْئٍ لَهٗ عِبْرَةٌ

''اگر آدمی غور کرے تو اس کو ہر چیز میں عبرت نظر آئے گی۔''

عیسیٰ علیہ السلام نے کہا ہے کہ اس شخص کو مبارک ہو، جس کی بات نصیحت ہے، جس کی خاموشی تفکر ہے اور جس کی نظر عبرت ہے۔ لقمان حکیم نے کہا کہ تنہائی کی گوشہ نشینی، جس قدر زیادہ ہو، اسی قدر غور وفکر اور انجام بینی زیادہ ہے اور جس قدر یہ بڑھ جائے، اسی قدر راز انسان پر کھل جاتے ہیں، جو اسے جنت میں لے جاتے جائیں۔ امام وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے کہا کہ طولِ فکر سے فہم آتا ہے، فہم سے علم حاصل ہوتا ہے اور علم سے عمل آتا ہے۔ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ کے ذکر کے ساتھ کلام کرنا حسن ہے، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں فکر کرنا افضل عبادت ہے۔ مغیث اسود رحمہ اللہ نے کہا

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٦٦)

کہ جس دن تم کو فکر ہو، اس دن قبروں کی زیارت کرو، موقف (محشر) کو دل کی آنکھ سے دیکھو، خیال کرو کہ فریقین کی بازگشت کدھر ہے، جنت کی طرف یا نار کی طرف، تم اپنے دل اور بدن سے ذکرِ نار اور نار کے مقامع اور اطباق (ہتھوڑے) دریافت کرو۔ یہ کہہ کر بے ہوش ہو جاتے اور عقل جاتی رہتی۔

امام ابن مبارک رحمہ اللہ نے کہا: ایک آدمی کا ایک راہب پر گزر ہوا، اس کے قریب ایک مزبلہ (کوڑا کرکٹ کی جگہ) اور ایک مقبرہ تھا، اس نے راہب کو پکار کر کہا: تیرے پاس دنیا کے دو خزانے ہیں: ایک کنزِ رجال، دوسرا کنزِ اموال۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب اپنے دل کو خبردار کرنے کا ارادہ کرتے تو کسی ویرانے میں جا کر غم ناک آواز سے کہتے: تیرے لوگ کدھر گئے۔ پھر اپنے جی کی طرف رجوع کرتے اور کہتے: ﴿ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ ﴾ [القصص: ۸۸] سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ایک درمیانے درجے کے مسلمان کی حالتِ تفکر میں دو رکعت نماز ایک غافل دل والے کے شب کے قیام سے بہتر ہے۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: تو ایک تہائی پیٹ کھا، تہائی پیٹ پی اور ایک تہائی فکر کے ساتھ سانس لینے کے لیے چھوڑ۔ بعض حکما نے کہا ہے کہ جس نے دنیا کی طرف بغیر عبرت کے دیکھا، اس کے دل کی آنکھ اس کی غفلت کے برابر اندھی ہوگئی۔ بشر حافی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اگر لوگ اللہ کی عظمت میں تفکر کریں تو کبھی اس کی نافرمانی نہ کریں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہتے تھے کہ ضیا یا نورِ ایمان یہی تفکر ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اے ابن آدم ضعیف! تو جہاں کہیں ہو اللہ سے ڈر، دنیا میں ضعیف ہو کر رہ، مساجد کو گھر ٹھہرا، آنکھوں کو رونا سکھلا، بدن کو صبر، دل کو فکر بتلا، کل کے رزق کا غم نہ کر۔[1] جو لوگ اللہ کی مخلوقات سے، جو اللہ کی ذات، صفات، شرع، تقدیر اور آیات کی نشانیاں ہیں، عبرت نہیں پکڑتے، اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی ہے، فرمایا: ﴿ وَكَأَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴾ [یوسف: ۱۰۵] ''اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں کہ وہ ان پر سے گزرتے ہیں اور ان سے بے دھیانی کرتے ہیں۔''

اہل اللہ کی دعائیں:

جو لوگ اُٹھتے بیٹھتے لیٹتے اللہ کو یاد کرتے ہیں، ان کی آیت زیرِ تفسیر میں تعریف کی گئی ہے، ان کا قول یہ ہے کہ اے رب! تو نے اس خلق کو بے فائدہ پیدا نہیں کیا، بلکہ حق سے بنایا ہے، تاکہ بُروں کو ان کے اعمالِ بد کی سزا اور نیکوں کو ان کے نیک اعمال کی جزا دے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی فضول چیزوں اور خلقِ باطل سے پاکیزگی کر کے یہ کہتے ہیں کہ تو اس بات سے پاک ہے کہ باطل پیدا کرے، اے مخلوق کو حق اور عدل کے ساتھ پیدا کرنے اور اے ہر قسم کے عیب، نقص اور بے فائدگی سے پاک ذات! تو ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے، ہم کو ایسے اعمال پر مقرر کر، جس

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۵۷۱)

سے تو ہم سے راضی ہو، ہم کو عملِ صالح کی توفیق دے، عذابِ الیم سے نجات بخش۔

پھر اس طرح کہتے ہیں کہ اے رب! جس کو تو نے دوزخ میں داخل کیا، اس کو خوار و رسوا کیا۔ اہلِ محشر کے نزدیک اس کو ذلیل کیا، اس دن ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے، جو ان کو بچائے۔ منادی سے مراد داعی ہے اور داعی سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں، انھوں نے ہمیں ایمان لانے کی دعوت دی، ہم سب ایمان لائے، ہم نے ان کی بات مانی۔ لہٰذا اے رب! تو ہمارے گناہ بخش دے، ہم کو نیکوں کے ہمراہ موت دے، یعنی صالحین سے ملا، جو وعدہ تو نے رسولوں کی زبان پر کیا ہے، وہ پورا کر، ہم کو قیامت کے دن ساری مخلوق کے سامنے رسوا نہ کر، تیرا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہوتا۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ قیامت کے دن ابن آدم کی اللہ عزوجل کے سامنے اتنی رسوائی ہوگی کہ وہ تمنا کرے گا کہ اس کے لیے دوزخ ہی کا حکم ہو جائے۔[1] (رواہ أبو یعلیٰ) یہ حدیث غریب ہے۔

آلِ عمران کی ان دس آیات کی فضیلت:

حدیث میں مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ ان دس آیتوں کو رات کے وقت نمازِ تہجد میں پڑھا کرتے تھے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک رات میں اپنی خالہ میمونہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہا۔ نبی اکرم ﷺ تھوڑی دیر باتیں کر کے سو گئے، جب رات کی آخری تہائی ہوئی تو اٹھ کر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا: ﴿ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ ﴾ (آیات زیرِ تفسیر)۔ پھر وضو کیا، مسواک کی، گیارہ رکعتیں پڑھیں۔ پھر سیدنا بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی، دو رکعت پڑھ کر باہر نکلے، لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائی۔[2] (رواہ البخاري و مسلم) دوسری روایت میں اتنا اور مروی ہے کہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: میں نے بھی وہی کیا، جو نبی اکرم ﷺ نے کیا، پھر نبی کریم ﷺ کی بائیں طرف کھڑا ہوا، آپ ﷺ نے مجھے کان سے پکڑ کر دائیں طرف کیا۔ آپ ﷺ نے دو دو کر کے بارہ رکعتیں پڑھیں، پھر وتر پڑھا، پھر لیٹ رہے، یہاں تک کہ موذن آیا، اٹھ کر دو رکعتیں ہلکی پھلکی پڑھیں، پھر جا کر نمازِ فجر ادا کی۔[3] (هكذا أخرجه بقية الجماعة و رواه مسلم أيضاً و أبو داود من وجوه أخر)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے حدیث میں مروی ہے: "وَیْلٌ لِمَنْ قَرَأَ هٰذِهِ الْآيَةَ ثُمَّ لَمْ یَتَفَكَّرْ فِیْهَا"[4] (رواہ ابن أبي حاتم و ابن حبان) "اس کے لیے ہلاکت ہو، جو ان آیات کو پڑھے، لیکن ان میں تفکر نہ کرے۔" سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

---

① مسند أبي يعلیٰ (۳/ ۳۱۱) اس روایت کی سند میں "الفضل بن عیسیٰ" ضعیف راوی ہیں۔ (السلسلة الضعيفة، رقم: ٥٠١١)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٩٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٦٣)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٦٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٣٦٧) سنن النسائي، رقم الحديث (١٦٢٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٦٣)

④ صحيح ابن حبان (۲/ ۳۸۶)

کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی اکرم ﷺ ہر رات سورت آلِ عمران کی آخری دس آیتیں پڑھتے تھے۔[1] (رواه ابن مردويه) لیکن اس کی سند میں ''مظاہر بن اسلم'' ضعیف ہے۔

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ آیات سے مراد واضح دلائل اور کھلی براہین ہیں، جو خالق کے وجود پر دلالت کرتی ہیں۔ اَلْبَاب سے مراد صحیح عقل ہے، جو ہر قسم کے نقص کی آمیزش سے پاک ہو، کیوں کہ اس آیتِ کریمہ میں صرف تفکر کرنے سے ایک عقل مند ایمان کو پہنچ جاتا ہے۔ اس جگہ ذکر کا لفظ نماز وغیرہ کے لیے عام ہے۔ مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اس ذکر سے مراد نماز ہے۔ سیدنا علی، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور امام قتادہ رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ یعنی کسی حال میں بھی نماز ضائع نہیں کرتے، اگر کوئی عذر نہ ہو تو کھڑے ہو کر پڑھتے ہیں، عذر کی حالت میں بیٹھ کر یا لیٹ کر ادا کرتے ہیں۔[2]

بخاری میں عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مجھے بواسیر تھی، میں نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا: نماز کیسے پڑھوں؟ فرمایا: کھڑے ہو کر ورنہ بیٹھ کر ورنہ کروٹ پر۔ عمران رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ میں نے پوچھا کہ بیٹھ کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟ فرمایا: کھڑے ہو کر پڑھنا افضل ہے، جس نے بیٹھ کر پڑھی، اس کو کھڑے ہو کر پڑھنے والے کے اجر کا آدھا ملے گا اور جس نے لیٹ کر پڑھی، اس کو بیٹھ کر پڑھنے والے کے اجر کا آدھا ملے گا۔[3] امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا: اے ابن آدم! یہ سب تیرے حالات ہیں تو اللہ کا ذکر کر کھڑے ہو کر، اگر نہ کر سکے تو بیٹھ کر، یہ بھی نہ ہو سکے تو کروٹ پر، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آسانی اور تخفیف ہے۔[4] سلف سے صرف غور وفکر کرنے کے استحباب کے بارے میں بہت سے آثار مروی ہیں۔ اکثر مفسرین کے نزدیک منادی سے مراد نبی اکرم ﷺ ہیں یا قرآن۔ ذنوب سے کبیرہ گناہ مراد ہیں۔ سیئات سے صغیرہ گناہ مراد ہیں۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ تفرقہ مراد نہیں ہے، بلکہ تکرار مبالغہ اور تاکید کے لیے ہے، جس طرح غفر وکفر کے معنی ستر کے ہیں۔ ابرار سے انبیا یا صلحا مراد ہیں یا وہ سب، کیوں کہ لفظ وسیع ہے۔[5]

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ
ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ ۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا
وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا

[1] المعجم الأوسط (٧/ ٣٦) اس کی سند میں ''مظاہر بن اسلم مخزومی'' ضعیف راوی ہے۔ (مجمع الزوائد: ٢/ ٥٥٨)
[2] تفسير البغوي (٢/ ١٥٢) تفسير الخازن (١/ ٤٦٦۔ ٤٦٧)
[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٦٦۔ ١٠٦٥)
[4] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٤٢)
[5] فتح البيان (٢/ ٣٩٩۔ ٤٠٢)

لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

پھر ان کے رب نے ان کی دعا قبول کی کہ تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کروں گا، خواہ کوئی مرد ہو یا عورت، تم آپس میں ایک دوسرے کے ہم جنس ہو، پھر جن لوگوں نے ہجرت کی اور انھیں ان کے گھروں سے نکال دیا گیا اور انھیں میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں اور انھوں نے جہاد کیا اور وہ قتل ہوئے تو میں ضرور ان کی برائیاں ان سے دور کر دوں گا اور یقیناً انھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے ثواب (بدلہ) ہوگا، اور اللہ ہی کے پاس بہترین ثواب ہے ﴿195﴾

اللہ تعالیٰ کا عقل مندوں کی دعاؤں کو قبول کرنا:

سیدہ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے عورتوں کا ہجرت میں ذکر نہیں کیا، اس پر یہ آیت اتری۔ (رواہ سعید بن منصور) انصار نے کہا کہ یہ پہلی بی بی ہیں، جو سفر کر کے ہمارے پاس آئیں۔ امام حاکم رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو روایت کیا ہے اور اس کو بخاری کی شرط پر صحیح بتایا ہے۔[1] آیت پاک کا مطلب یہ ہوا کہ اولوا الالباب نے سوال مذکور کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴾ [البقرۃ: ۱۸۶] ''اور (اے نبی!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو بے شک میں قریب ہوں، میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں، جب بھی وہ مجھ سے دعا کرے، پس چاہیے کہ وہ بھی میرے حکموں کو مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ وہ ہدایت پائیں۔''

مردوں اور عورتوں کے اعمال میں مساوات:

یہ ارشاد کہ ہم کسی مرد اور عورت کا عمل برباد نہیں کرتے، اجابت کی تفسیر ہے۔ ہر عامل کو اس کے عمل کا پورا اجر دیا جاتا ہے، تم سب مرد عورت میرے ثواب میں برابر ہو، جو لوگ شرک کو چھوڑ کر دارِ ایمان میں آئے ہیں، اپنے احباب، بھائی بندوں، جگری دوستوں اور ہمسائیوں سے جدا ہوئے ہیں، مشرکوں نے یہاں تک ان کو ستایا کہ وہ گھر بار چھوڑ کر

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۰۲۳) مستدرك الحاكم (۲/ ۳۲۸) الدر المنثور (۲/ ۴۱۲) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہما اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

باہر نکلے ہیں، ان کے لیے نہر والی جنت ہے، ان کا گناہ یہی تھا کہ وہ صرف اکیلے اللہ پر ایمان لائے تھے، اس پر ستائے گئے، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ﴾ [الممتحنة: ۱] ''وہ رسول کو اور تمھیں بھی جلا وطن کرتے ہیں، اس لیے کہ تم اپنے رب اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔'' نیز فرمایا: ﴿ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۝ ﴾ [البروج: ۸] ''اور انھیں ان (مومنوں) کا یہی کام برا معلوم ہوا کہ وہ اللہ، غالب، قابلِ تعریف پر ایمان لائے تھے۔''

اللہ کی راہ میں لڑنے کا فائدہ:

پھر مارنے اور مرنے کا ذکر کیا۔ یہ مقام اعلیٰ مقامات سے ہے کہ کوئی اللہ کی راہ میں لڑے، اس کا گھوڑا مارا جائے، اس کا منہ خاک آلود ہو اور خون میں بھرے۔ صحیحین میں مروی ہے کہ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! مجھے بتائیں اگر میں اللہ کے راستے میں صبر و استقامت و احتساب کے ساتھ لڑوں، دشمن کا سامنا کروں، پیٹھ نہ پھیروں اور مارا جاؤں تو اللہ میری خطائیں معاف کر دے گا؟ فرمایا: ہاں۔[1] اسی لیے اس جگہ اللہ تعالیٰ نے یوں کہا ہے کہ ہم ان کی سیئات دور کر کے جنت میں داخل کریں گے، جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں، یعنی دودھ، شہد اور شراب وغیرہ کی، جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کان نے سنیں نہ کسی کے دل میں گزریں۔

اللہ کے پاس اچھا ثواب ہے:

ثواب کو اپنی طرف منسوب کیا، اس سے ثواب کی عظمت ثابت ہوئی، کیوں کہ اللہ عظیم و کریم کچھ دے گا تو جزیل و کثیر ہی دے گا۔ حسن ثواب سے عمل صالح پر حسنِ جزا ہے۔ شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اے لوگو! تم اللہ کو اس کی قضا میں تہمت نہ دو، وہ کسی مومن پر زیادتی اور ظلم نہیں کرتا۔ جب تم میں سے کسی شخص پر کوئی محبوب چیز اترے تو اس کو چاہیے کہ اللہ کی حمد کرے، اگر مکروہ اترے تو صبر و احتساب اختیار کرے، کیوں کہ اللہ کے پاس حسنِ ثواب ہے۔[2] فتح البیان میں ہے کہ ﴿ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ﴾ سے مراد یہ ہے کہ تمھارے مرد تمھاری عورتوں کے مثل ہیں۔ ثوابِ طاعت اور عقابِ معصیت میں تمھاری عورتیں تمھارے مردوں کی مثل ہیں۔ کسی نے کہا کہ دین و نصرت و موالات (باہم دوستی) میں، مگر پہلا قول بہتر ہے۔[3] ہجرت کی فضیلت میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۸۸۵)

[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۸٤٤) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ حریز بن عثمان رحمہ اللہ نے سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔

[3] فتح البیان (۲/ ٤٠٤)

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾

جن لوگوں نے کفر کیا، ان کا شہروں میں چلنا پھرنا آپ کو دھوکے میں نہ ڈال دے ﴿۱۹۶﴾ یہ تھوڑا سا فائدہ ہے، پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے ﴿۱۹۷﴾ لیکن جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے رہے، ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، یہ اللہ کی طرف سے مہمانی ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ نیک لوگوں کے لیے بہتر ہے ﴿۱۹۸﴾

اہلِ دنیا کی آسودگی سے دھوکا کھانے پر تنبیہ:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تو ان کافروں کی آسودگی، نعمت، رشک، سرور اور فرحت کی طرف نہ دیکھ کہ یہ سب کچھ بہت جلد زائل ہو جائے گا، یہ اپنے اعمالِ بد میں گرفتار ہو کر رہ جائیں گے۔ ہمارا ان کی موجودہ حالت میں مدد کرنا استدراج ہے، یہ جو عیش و آرام ان کو حاصل ہے، ایک متاعِ قلیل اور حقیر شے ہے۔ انجام کو ان کے لیے وہی جہنم ہے، جہاں وہ جائیں گے۔ یہ آیت اس آیت کی طرح ہے: ﴿ مَا يُجَادِلُ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ ۝ ﴾ [المؤمن: ٤] ''اللہ کی آیات میں صرف کافر لوگ ہی جھگڑا کرتے ہیں، لہٰذا آپ کو ان کا شہروں میں چلنا پھرنا دھوکے میں نہ ڈالے۔'' اور فرمایا: ﴿ قُلْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۝ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴾ [یونس: ٦٩۔ ٧٠] ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: بلاشبہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، وہ فلاح نہیں پائیں گے۔ دنیا میں تھوڑا سا فائدہ اُٹھانا ہے، پھر انھیں ہماری ہی طرف لوٹنا ہے، پھر ان کے کفر کرنے کی وجہ سے ہم انھیں شدید عذاب (کا مزہ) چکھائیں گے۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝ ﴾ [لقمان: ٢٤] ''ہم انھیں تھوڑا سا فائدہ دیتے ہیں، پھر ہم انھیں سخت عذاب کی طرف مجبور کر دیں گے۔'' اور فرمایا: ﴿ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝ ﴾ [الطارق: ١٧] ''تو (اے نبی!) آپ ان کافروں کو (ان کے حال پر) چھوڑ دیں، انھیں تھوڑی سی مہلت دیں۔'' اور فرمایا: ﴿ اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ كَمَنْ مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ

﴿ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴾ [القصص: ٦١] ''بھلا وہ شخص جسے ہم نے اچھا وعدہ دیا، پھر وہ اس (وعدے) کو پانے والا ہے، کیا اس شخص جیسا ہے، جسے ہم نے دنیاوی زندگی کا بہت فائدہ دیا، پھر وہ قیامت کے دن (عذاب میں) حاضر کیے جانے والوں میں سے ہوگا؟''

ابرار اور صالحین کی جزا:

اسی طرح جب اس جگہ کفار کا دنیا میں حال اور ان کا انجام دوزخ میں ذکر فرمایا تو اس کے بعد اہلِ تقویٰ کے لیے جنت کا ذکر کیا، اس جنت کو ان کی مہمانی اور ضیافت ٹھہرایا، ان کا نام ابرار رکھا۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ ان کا نام ابرار اس لیے رکھا کہ انھوں نے آبا و ابنا کے ساتھ نیکی کی۔ جس طرح تجھ پر تیرے ماں باپ کا حق ہے، اسی طرح تجھ پر تیری اولاد کا حق ہے۔ (رواہ ابن مردویه مرفوعاً و ابن أبي حاتم موقوفاً) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: ''هٰذَا أَشْبَهُ، وَاللّٰهُ أَعْلَمُ'' [1] امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: ابرار وہ ہیں، جو چیونٹی کو نہیں ستاتے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: کوئی نفس ہو، نیک یا بد، مگر موت اس کے لیے بہتر ہے۔ اگر نیک ہو تو اللہ نے کہا ہے: ﴿ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴾ [2]

دوسری روایت میں اتنا اور کہا ہے کہ پھر یہ آیت پڑھی: ﴿ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴾ [آل عمران: ۱۷۸] ''اور جن لوگوں نے کفر کیا، وہ ہرگز یہ خیال نہ کریں کہ ہم انھیں جو ڈھیل دیتے ہیں، وہ ان کے لیے بہتر ہے۔ ہم تو انھیں صرف اس لیے ڈھیل دیتے ہیں کہ وہ گناہ میں بڑھ جائیں، اور ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔'' [3] (رواہ ابن أبي حاتم) ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ کوئی مومن نہیں ہے، مگر موت اس کے لیے بہتر ہے۔ کوئی کافر نہیں ہے، مگر موت اس کے لیے بہتر ہے، جو شخص میری تصدیق نہ کرے تو اللہ فرماتا ہے، پھر ہر دو آیت مذکور کو پڑھا۔ [4]

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ ﴿ لَا يَغُرَّنَّكَ ﴾ کا خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے۔ موجودہ حالت پر تثبیت مراد ہے، یا خطابِ مذکور ہر ایک کو ہے۔ اس آیت میں کفار کے حال کو قبیح ٹھہرایا ہے، یعنی ان کا ملکوں شہروں کا سفر تجارت و وسعتِ معاش کے لیے اور دور دور تک خشکی اور تری میں جانا اور دور دراز کی جگہوں میں جانا دنیا کا ایک ذرا سا برتاؤ ہے۔ امام عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا کہ مراد تقلب کرنا، یعنی رات دن چلتے پھرتے اور سفر کرتے ہیں۔ سو یہ متاع اللہ کے ہاں

---

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۸٤٦) تفسیر ابن کثیر (۱/ ۵۷٦۔ ۵۷۷) اس کی سند میں ''عبیداللہ بن ولید وصافی'' ضعیف راوی ہے۔
[2] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۸٤٦)
[3] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۸۲۳)
[4] تفسیر الطبري (۷/ ٤۹٦) اس کی سند میں ''فرج بن فضالہ'' ضعیف راوی ہے۔

ثواب پانے کی نسبت بہت کم ہے۔[1] متاع وہ ہے جس سے جھٹ پٹ فائدہ اٹھائیں۔ اس کو قلیل اس لیے فرمایا ہے کہ فانی اور زائل ہونے والا ہے۔ فانی شے کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو تھوڑی ہوتی ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مِھَاد سے مراد منزل ہے،[2] یعنی جہنم بری جگہ ہے، جہاں وہ جا کر رہیں گے۔

پھر فرمایا کہ جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں، گو وہ بھی تجارت کرتے ہیں، لیکن ان کو تجارت کے اس دنیاوی فوائد کے علاوہ آخرت میں نہروں والی جنتیں ملیں گی۔ یہ تجارت کچھ ان کو نقصان نہ دے گی۔ نُزُل اس چیز کو کہتے ہیں جو مہمان کے لیے مہیا کریں۔ ''اَنْزَال'' یہ ''نُزُل'' کی جمع ہے، پھر ہر رزق اور غذا کو نزل کہنے لگے، اگرچہ وہ مہمان کے لیے نہ ہو۔ ﴿ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ﴾ [الواقعۃ: ۹۳] ''تو (اس کی) مہمانی کھولتے پانی سے ہوگی۔'' پھر فرمایا کہ ابرار کے لیے جو اللہ کے پاس ہے، وہ اس فائدے سے بہتر ہے، جو کفار کو سفر کرنے سے حاصل ہوتا ہے، کیوں کہ وہ ایک کم قدر فائدہ ہے، جو عن قریب زائل ہو جائے گا۔[3]

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾

اور بے شک اہلِ کتاب میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ پر اور جو کچھ تمھاری طرف نازل کیا گیا اور جو کچھ ان کی طرف نازل کیا گیا، اس پر ایمان لاتے ہیں، وہ اللہ کے سامنے جھکنے والے ہیں، وہ اللہ کی آیتیں تھوڑی قیمت کے بدلے نہیں بیچتے، وہی ہیں جن کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، بے شک اللہ جلد حساب لینے والا ہے (199) اے لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر سے کام لو، اور ثابت قدم رہو اور مورچوں پر ڈٹے رہو اور اللہ سے ڈرو، تاکہ تم فلاح پاؤ (200)

بعض اہلِ کتاب کی حالت اور اُن کا اجر:

یعنی دین پر ثابت رہو اور مقابلے، یعنی جہاد میں ثابت قدم رہو، یعنی کافروں کے سامنے۔ یہ فائدہ موضح قرآن

---

[1] الدر المنثور (۲/ ٤١٤) [2] تفسیر ابن أبي حاتم (۳/ ۸٤٥) اس کی سند میں ''ابراہیم بن حکم بن ابان'' ضعیف راوی ہے۔

[3] فتح البیان (۲/ ٤٠٦۔ ٤٠٧)

کا تھا۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے اس آیت میں یہ خبر دی ہے کہ اہلِ کتاب کا ایک گروہ ایسا بھی ہے، جو اللہ پر ٹھیک ٹھیک ایمان لاتا ہے، وہ اپنی کتابوں پر بھی ایمان لائے ہیں اور جو محمد ﷺ پر اترا ہے، اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں، اللہ کے سامنے فرماں بردار، خضوع وخشوع کرنے والے اور اپنے آپ کو ذلیل کرنے والے ہیں۔ ایسا نہیں کرتے کہ اللہ کی آیتوں کو تھوڑے داموں بیچ ڈالیں۔ محمد ﷺ کی بشارت کو چھپا ڈالیں اور نبی اکرم ﷺ کی تعریف اور مبعوث ہونے کی جگہ اور اُن کی اُمت کی صفت کو پوشیدہ رکھیں۔ یہ گروہ اہلِ کتاب میں سے بہترین اور اعلیٰ ہیں، خواہ وہ یہود ہوں یا نصاریٰ۔[1]

سورۃ القصص میں فرمایا ہے: ﴿ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ ﴿52﴾ وَ اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ ﴿53﴾ ﴾ [القصص: ٥٣] ”وہ لوگ جنھیں ہم نے اس (قرآن) سے پہلے کتاب دی تھی، وہی اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب ان پر (قرآن) تلاوت کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائے، بے شک یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے، بلاشبہ ہم تو اس سے پہلے ہی مسلمان تھے۔“ پھر فرمایا: ﴿ اُولٰٓىِٕكَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ﴿54﴾ وَ اِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَ قَالُوْا لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ١٘ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ١٘ لَا نَبْتَغِی الْجٰهِلِیْنَ ﴾ [القصص: ٥٤۔ ٥٥] ”ان لوگوں کو ان کا دو بار اجر دیا جائے گا، کیوں کہ انھوں نے صبر کیا اور وہ بھلائی کے ساتھ برائی کو دور کرتے ہیں اور جو ہم نے انھیں رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جب وہ بیہودہ بات سنتے ہیں تو وہ اس سے اعراض کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں: ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے اعمال ہیں، تمھیں سلام ہو، ہم جاہلوں کو نہیں چاہتے۔“

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ١ؕ اُولٰٓىِٕكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ١ؕ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ [البقرۃ: ١٢١] ”جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جس طرح اس کی تلاوت کا حق ہے، وہی لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو کوئی اس کا انکار کرتا ہے تو وہی ہیں خسارہ پانے والے۔“ اور فرمایا: ﴿ وَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰۤى اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَ بِهٖ یَعْدِلُوْنَ ﴾ [الأعراف: ١٥٩] ”اور موسیٰ کی قوم میں سے ایک گروہ (ایسا) ہے جو حق کے ساتھ راہنمائی کرتے ہیں اور اسی (حق) کے ساتھ عدل کرتے ہیں۔“ اور فرمایا: ﴿ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا١ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿107﴾ وَّ یَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿108﴾ وَ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْكُوْنَ وَ یَزِیْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴾ [بني إسرائیل: ١٠٧۔ ١٠٩] ”کہہ دیجیے: اس پر ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ، بلاشبہ جنھیں اس سے پہلے علم دیا گیا، جب ان پر

[1] تفسیر ابن کثیر (١/ ٥٧٧)

تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں: پاک ہے ہمارا رب، بے شک ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہونا ہے۔ اور وہ روتے ہوئے اپنی ٹھوڑیوں کے بل گر پڑتے ہیں اور یہ (قرآن) ان کے خشوع کو زیادہ کرتا ہے۔''

یہ صفتیں یہود میں موجود ہیں، لیکن بہت کم، جس طرح عبداللہ بن سلام اور ان جیسے منجملہ احبارِ یہود میں پائی گئیں، لیکن ان کی گنتی دس افراد تک نہیں پہنچتی۔ رہے نصاریٰ تو ان میں اکثر ہدایت پر آ جاتے ہیں اور حق کے فرماں بردار ہو جاتے ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿82﴾ وَاِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿83﴾ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿84﴾ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿85﴾ ﴾ [المائدة: ٨٢۔ ٨٥]

''(اے نبی!) یقیناً آپ لوگوں میں اہلِ ایمان سے عداوت رکھنے میں سخت ترین یہودیوں اور مشرکوں کو پائیں گے، اور اہلِ ایمان سے دوستی رکھنے میں ضرور قریب ترین ان لوگوں کو پائیں گے جنھوں نے کہا: بے شک ہم نصاریٰ ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ بے شک ان میں کچھ عالم ہیں، کچھ دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے ہیں اور یہ کہ وہ غرور نہیں کرتے۔ اور جب وہ رسول پر نازل کیا گیا کلام سنتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہہ رہی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم ایمان لے آئے، لہٰذا تو ہمارے نام (حق کی) گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ لے۔ اور ہمارے پاس کیا عذر ہے ہم اللہ پر اور جو حق ہم تک پہنچا ہے، اس پر ایمان نہ لائیں؟ اور ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں نیک لوگوں کے گروہ میں داخل کرے گا۔ چناں چہ انھوں نے جو کہا اس کے عوض اللہ انھیں ایسے باغ دے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ نیکی کرنے والوں کی جزا ہے۔''

نجاشی کی غائبانہ نمازِ جنازہ اور اس کا جواز:

اسی طرح اس جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ (آیت زیرِ تفسیر)۔ حدیث میں مروی ہے کہ جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے جب سورت مریم نجاشی کے سامنے پڑھی، اس کے پاس عیسائی راہب حاضر تھے۔ نجاشی رونے لگا، اس کے ساتھ وہ بھی رونے لگے، یہاں تک کہ سب کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔[1]

[1] مسند أحمد (١/ ٢٠١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رجاله رجال الصحيح غير إسحاق وقد صرح بالسماع" (مجمع الزوائد: ٦/ ٢٤)

نجاشی حبشہ کے بادشاہ کا نام ہے۔ صحیحین میں مروی ہے کہ جب نجاشی وفات پا گیا تو نبی کریم ﷺ نے اس کے فوت ہونے کی خبر اپنے اصحاب کو دی اور فرمایا کہ حبشہ میں تمھارا ایک بھائی فوت ہو گیا ہے، اس پر نمازِ جنازہ پڑھو، پھر صحرا میں نکل کر صف باندھی اور نماز پڑھی۔[1] سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب نجاشی کا انتقال ہوا تو نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: تم اپنے بھائی کے لیے استغفار کرو۔ بعض لوگوں نے کہا کہ ہمیں حکم ہوا کہ ہم ایک علج (سیاہ حبشی) کے لیے مغفرت مانگیں، جو حبشہ میں فوت ہوا ہے۔ اس پر آیت زیرِ تفسیر نازل ہوئی۔[2] (رواه ابن مردويه و عبد بن حميد و ابن أبي حاتم من طريق أخرى)

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تمھارا بھائی اصحمہ فوت ہو گیا ہے، پھر باہر نکل کر نماز پڑھی، جس طرح جنائز کی نماز پڑھی جاتی ہے، چار تکبیریں کہیں۔ منافقوں نے کہا: ایک علج پر جو حبشہ کی زمین میں مرا ہے نماز پڑھتے ہیں؟! اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت بھیجی۔[3] (رواه ابن جرير) اصحمہ نجاشی کا نام ہے۔ اس آیت سے اصحمہ کی فضیلت ثابت ہوئی۔ حدیثِ مذکور سے غائب پر نمازِ جنازہ کا جواز، بلکہ اس کا سنت ہونا معلوم ہوا۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جب نجاشی مر گیا، ہم سنتے تھے کہ اس کی قبر پر ایک نور نظر آتا ہے۔[4] (رواه أبو داود) عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے کہا: نجاشی پر اس کی زمین کا ایک دشمن حملہ آور ہوا، مہاجرین نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ تمھارے ساتھ ہو کر لڑیں، تم ہماری جرأت دیکھو، جو احسان تو نے ہم پر کیا ہے، اس کا عوض کریں۔ نجاشی نے کہا: جو دُکھ اللہ کی مدد سے ہو، وہ اس دوا سے بہتر ہے، جو لوگوں کی مدد سے ہو۔ اس پر آیت زیرِ تفسیر اتری۔[5] (رواه الحاكم وقال: هذا حديث صحيح الإسناد ولم يخرجاه) امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: ﴿مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ﴾ سے مسلمینِ اہلِ کتاب مراد ہیں۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: وہ اہلِ کتاب ہیں، جو نبی مکرم ﷺ سے پہلے تھے، انھوں نے نبی اکرم ﷺ کا اتباع کیا۔[6] اسلام کو پہچانا، اللہ تعالیٰ نے ان کو دو اجر دیے: ایک ایمان لانے پر، دوسرا اتباع کرنے پر۔

دوہرے اجر کے مستحق لوگ:

صحیحین میں سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تین آدمی ہیں، جن کو دوبار اجر ملے گا، ایک اہلِ کتاب میں سے وہ آدمی جو اپنے نبی پر ایمان لایا، پھر مجھ پر ایمان لایا۔[7] (الحديث) پھر فرمایا کہ جو علم ان کے پاس ہے، اسے نہیں چھپاتے، جس طرح ان میں سے طائفہ مردودہ نے کیا تھا، بلکہ اس علم کو مفت میں تقسیم

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٦٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٥٢)
[2] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٤٦)
[3] تفسير الطبري (٧/ ٤٩٦۔ ٤٩٧) اس کی سند میں "ابوبکر ہذلی" ضعیف راوی ہے۔
[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٢٣)
[5] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٢٩) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔
[6] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٤٦)
[7] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٤)

کرتے ہیں، بلا قیمت سکھاتے ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کہا: ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے اور اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔ امام مجاہد رحمہ اللہ نے کہا: یعنی سریع الاِحصاء (جلد گننے والا) ہے۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا کہ حکم کیے گئے ہیں کہ اپنے دین پر صبر کریں۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے پسند کیا ہے، وہ اسلام ہے، اس کو کسی حال میں آسانی اور تنگی، سختی اور نرمی میں نہ چھوڑیں، یہاں تک کہ اسلام ہی کی حالت میں مریں اور دشمنوں کے مقابلے میں جمے رہیں، جو دین کو چھپاتے ہیں۔ سلف کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔[1]

مرابطہ کا مفہوم ... ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار:

مرابطہ عبادت کی جگہ میں ہمیشہ جانے کو کہتے ہیں اور سرحد پر ثابت رہنے کو بھی کہتے ہیں۔ بعض نے کہا: رباط ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس، سہل بن حنیف رضی اللہ عنہم، محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ وغیرہم کا یہی قول ہے۔ امام ابن ابی حاتم رحمہ اللہ نے اس جگہ ایک حدیث لکھی ہے، جس کو امام مسلم و نسائی نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تم کو اس کام کی خبر نہ دوں، جس سے اللہ تعالیٰ خطاؤں کو مٹاتا اور درجات کو بلند کرتا ہے؟ سختی اور ناپسندیدگی کی حالت میں پورا وضو کرنا، مسجدوں کی طرف بہت جانا، ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا۔ پھر تین بار فرمایا: یہی رباط ہے۔[2] سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ سیدنا ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ سے کہا: اے بھتیجے! کیا تو جانتا ہے کہ یہ آیت کس امر میں اُتری ہے: ﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ کہا: سنو! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوئی لڑائی ایسی نہ تھی کہ اس میں مرابط کرتے، لیکن یہ آیت ان کے حق میں اتری ہے، جو مسجدوں کو آباد رکھتے ہیں، نماز وقت پر پڑھتے ہیں، پھر وہاں بیٹھ کر اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ ان پر یہ آیت اتری کہ تم صبر کرو، نمازِ پنج گانہ پر صبر میں مقابلہ کرو، اپنے نفس اور خواہشات کا مسجدوں میں مرابطہ کرو، اللہ تعالیٰ سے اس کام میں ڈرو، جو تم پر واجب ہیں۔[3] (رواه ابن مردويه والحاكم بنحوه)

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں: کیا میں تم کو وہ چیز نہ بتاؤں جو گناہوں اور خطاؤں کو مٹائے، سختی اور ناپسندیدگی کی حالت میں پورا وضو کرنا، ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا، یہی رباط ہے۔[4] (رواه ابن جرير) سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ کیا میں تمھاری اس چیز کی طرف راہنمائی نہ کروں، جس سے

---

[1] تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٤٧) تفسير ابن كثير (١/ ٥٧٨)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥١) سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٣) تفسير ابن أبي حاتم (٣/ ٨٤٩)

[3] مستدرك الحاكم (٢/ ٣٢٩) الدر المنثور (٢/ ٤١٧) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔

[4] تفسير الطبري (٧/ ٥٠٥) اس کی سند میں "عبداللہ بن سعید مبری" سخت ضعیف راوی ہے۔ البتہ گذشتہ روایت اس سے مستغنی کرتی ہے۔

اللہ خطائیں مٹا دے اور گناہ اُتار دے؟ ہم نے کہا: ہاں، اے اللہ کے رسول ﷺ! فرمایا کہ وضو کے اعضا کو اچھی طرح دھونا، مسجدوں کی طرف زیادہ چل کر جانا، ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا، یہی رباط ہے۔① (رواہ ابن جریر أیضا) سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا: ہمارے پاس نبی اکرم ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کیا تم کو وہ چیز چاہیے، جس سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹا دے اور اجر زیادہ کرے؟ ہم نے کہا: ہاں، وہ کیا چیز ہے؟ فرمایا: ناپسندیدگی اور سختی کی حالت میں بھی اچھی طرح وضو کرنا، ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا یہی مطلب ہے: ﴿ اصۡبِرُوۡا وَصَابِرُوۡا وَرَابِطُوۡا ﴾ مساجد میں رباط یہی ہے۔② (رواہ ابن مردویہ) یہ حدیث غریب ہے۔

رباط کا دوسرا مفہوم...سرحدوں کی حفاظت اور اس کا اجر:

بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ اس جگہ مرابطہ سے مراد جنگ میں دشمن کے مقابلے میں ثابت قدمی ہے اور حفظِ ثغور، یعنی اسلام کی سرحدوں کی حفاظت اور ان کو دیکھتے رہنا کہ کہیں دشمن گرد و نواح کی مسلم بستیوں میں داخل نہ ہو جائے۔ اس بارے میں ترغیب کے لیے بہت احادیث آئی ہیں، ان میں کثرتِ ثواب کا ذکر ہے۔ سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ایک دن کا رِباط دنیا اور مافیہا سے بہتر ہے۔③ (رواہ الشیخان) سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ایک دن اور رات کا رباط ایک مہینے کے روزوں اور قیامِ لیل سے بہتر ہے، اگر مر جائے گا تو اس کا وہ عمل جاری رہے گا، جس کو وہ کیا کرتا تھا، اس کو رزق ملے گا اور فتّان (منکر ونکیر) سے امن میں رہے گا۔④ (رواہ مسلم) سیدنا فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی مکرم ﷺ کو سنا، فرماتے تھے: ہر میت کے عمل کا خاتمہ اس کی موت پر ہو جاتا ہے، مگر وہ شخص جو اللہ کی راہ میں مرابط ہو کر مرا کہ اس کا عمل قیامت کے دن تک بڑھتا رہتا ہے اور وہ فتنۂ قبر سے محفوظ رہتا ہے۔ (رواہ أحمد و أبو داود) امام ترمذی نے کہا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔⑤ (وأخرجه ابن حبان أيضاً في صحيحه)

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں: «كُلُّ مَيِّتٍ يُخْتَمُ لَهُ عَلٰى عَمَلِهٖ إِلَّا الْمُرَابِطَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجْرِيْ عَلَيْهِ عَمَلُهٗ حَتّٰى يُبْعَثَ وَيَأْمَنَ الْفَتَّانَ»⑥ (رواه أحمد والحارث بن محمد في مسنده)

---

① تفسير الطبري (٧/ ٥٠٦) اس کی سند حسن ہے۔

② تفسير ابن كثير (١/ ٥٧٩) الدر المنثور (٢/ ٤١٧) اس کی سند میں ''وازع بن نافع'' ضعیف راوی ہے۔

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٨١) ④ صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩١٣)

⑤ مسند أحمد (٦/ ٢٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٠٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٢١) صحيح ابن حبان (١٠/ ٤٨٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٥٦٢)

⑥ مسند أحمد (٤/ ١٥٠) مسند الحارث (٢/ ٦٥١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٥٦٢)

اس حدیث کی سند میں ابن لہیعہ ہے، وہ جب تصریحِ سماع کرے تو اس کی حدیث حسن ہوتی ہے۔[1] لہٰذا اس حدیث میں اس نے تصریح کی ہے، علاوہ ازیں اس کے شواہد اوپر گزر چکے ہیں۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ یوں ہیں: جو اللہ کی راہ میں مرابط ہو کر مرا تو اس کا وہ عملِ صالح، جو وہ کیا کرتا تھا، جاری رہتا ہے اور اس کو رزق دیا جاتا ہے اور وہ فتّان سے امن میں ہوتا ہے اور قیامت کے دن فزعِ اکبر (بڑی گھبراہٹ) سے امن میں ہوگا۔[2] (رواہ ابن ماجہ) سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جو مرا اور وہ مرابط تھا، وہ فتنۂ قبر سے بچ گیا اور بڑی گھبراہٹ سے امن میں ہوا، اس کو صبح و شام جنت سے رزق ملتا ہے، اس کے لیے قیامت تک کے لیے مرابطہ کا اجر لکھ دیا جاتا ہے۔[3] (رواہ أحمد) اُم الدرداء رضی اللہ عنہا کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ جس نے مسلمین کے ساحلوں میں سے کسی ساحل میں تین دن تک مرابطہ کیا، اس سے ایک سال کا رباط کافی ہے۔[4] (رواہ أحمد)

سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے منبر پر یہ مرفوع حدیث بیان کی کہ اللہ کی راہ میں پہرے داری کی ایک رات ان ہزار راتوں سے بہتر ہے، جن میں رات کو قیام اور دن کو صیام تھا۔[5] (رواہ أحمد) امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے یوں روایت کیا ہے کہ جس نے اللہ کی راہ میں ایک رات مرابطہ کیا، اس کے لیے ایک ہزار رات کے قیام و صیام کے برابر اجر ہے۔[6] سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے دوسری روایت اس طرح ہے کہ "رِبَاطُ يَوْمٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ يَوْمٍ فِيْمَا سِوَاهُ مِنَ الْمَنَازِلِ" امام ترمذی رحمہ اللہ نے بیان کیا: یہ حدیث حسن غریب ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے اس حدیث کے آخر میں اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: "فَلْيُرَابِطِ امْرُءٌ كَيْفَ شَاءَ، هَلْ بَلَّغْتُ؟ قَالُوْا: نَعَمْ، قَالَ: اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ"[7] "آدمی جیسے چاہے رباط کرے، کیا میں نے پہنچا دیا ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اے اللہ! گواہ ہو جا۔" سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا گزر شرحبیل بن سمط پر ہوا، وہ مرابطے میں تھا، ان پر اور ان کے ساتھیوں پر مرابطہ سخت گزرتا تھا، سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا: اے ابن سمط! کیا میں تجھے وہ حدیث نہ سناؤں، جو

---

[1] راجح قول میں "عبداللہ بن لہیعہ" ایک ضعیف راوی ہے۔

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٦٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٥٤٤)

[3] مسند أحمد (٢/ ٤٠٤) اس کی سند میں "ابن لہیعہ" ضعیف راوی ہے۔ البتہ گزشتہ روایتیں اس کی تایید کرتی ہیں۔

[4] مسند أحمد (٦/ ٣٦٢) اس کی سند میں "اسماعیل بن عیاش" متکلم فیہ راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ١/ ١٩٥)

[5] مسند أحمد (١/ ٦١) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ مصعب بن ثابت رحمہ اللہ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔ (ضعيف الجامع، رقم الحديث: ٢٧٠٤)

[6] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٦٦) اس کی سند میں انقطاع اور ضعف ہے۔ مصعب بن ثابت رحمہ اللہ کا سیدنا عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے سماع ثابت نہیں ہے، نیز سند میں "عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم" ضعیف راوی ہے۔

[7] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٦٧) مسند أحمد (١/ ٦٢) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣٣)

میں نے نبی اکرم ﷺ سے سنی ہے؟ کہا: ہاں سنائیں، کہا: نبی مکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں ایک دن کا رباط ایک ماہ کے صیام و قیام سے بہتر ہے، جو کوئی مرابطے میں مرا، وہ فتنۂ قبر سے بچ گیا، اس کا عمل قیامت تک بڑھتا رہتا ہے۔[1] (رواه الترمذي و تفرد به وقال حديث حسن)

اس حدیث کو مسلم اور نسائی نے بھی روایت کیا ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں: «رِبَاطُ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ خَيْرٌ مِنْ صِيَامِ شَهْرٍ وَقِيَامِهِ وَإِنْ مَاتَ جَرَى عَلَيْهِ الَّذِيْ كَانَ يَعْمَلُهُ وَأُجْرِيَ رِزْقُهُ وَأَمِنَ الْفَتَّانَ»[2] مسلم کا یہ سیاق اوپر بھی گزر چکا ہے۔ سیدنا اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں مسلمانوں کے پردوں کی نگہبانی کرنے میں رمضان کے علاوہ کسی اور مہینے میں جو اللہ سے اجر و ثواب کی اُمید رکھتے ہوئے ہو، وہ اللہ کے نزدیک اجر میں پورے سال کی عبادت سے، جس میں دن کو صیام اور رات کو قیام ہو، بہتر اور زیادہ بڑا ہے۔ پھر اگر اللہ اس کو صحیح سالم اپنے گھر والوں کی طرف پھیر دے گا تو اس پر ایک سال کی برائیاں نہیں لکھی جائیں گی اور نیکیاں لکھی جائیں گی اور قیامت کے دن تک اس پر رباط کا اجر لکھا جائے گا۔[3] (رواه ابن ماجه) مگر حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے، بلکہ اس وجہ سے منکر ہے کہ عمرو بن صبیح متہم ہے۔[4]

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ اللہ کی راہ میں ایک رات کا حرس (نگہبانی) کسی مرد کے اس کے گھر میں ہزار برس کے صیام و قیام سے بہتر ہے، جب کہ سال تین سو ساٹھ دن کا ہے اور دن ہزار برس کے برابر ہے۔[5] (رواه ابن ماجه) یہ حدیث بھی اس وجہ سے غریب ہے۔ سعید بن خالد کو ابو زرعہ رحمہ اللہ وغیرہ ائمہ نے ضعیف کہا ہے۔ امام عقیلی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "لَا يُتَابَعُ عَلٰى حَدِيْثِه" ابن حبان نے کہا: "لَا يَجُوْزُ الْاِحْتِجَاجُ بِهٖ" امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا کہ اس نے انس رضی اللہ عنہ سے احادیثِ موضوعہ روایت کی ہیں۔ سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے: "رَحِمَ اللّٰهُ حَارِسَ الْحَرَسِ" (رواه ابن ماجه) اس کی سند میں عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے درمیان انقطاع ہے۔[6] والله أعلم.

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٦٥) صحيح الترغيب والترهيب (٢/ ٣١)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩١٣) سنن النسائي، رقم الحديث (٣١٦٨)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٦٨) اس کی سند میں انقطاع اور ایک سے زیادہ راوی ضعیف ہیں۔ مکحول رحمہ اللہ نے سیدنا ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٨٣٦)

[4] تفسير ابن كثير (١/ ٥٨١)

[5] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٧٠) امام البانی رحمہ اللہ نے اس کو من گھڑت روایت کہا ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم: ١٢٣٤)

[6] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٦٩) تفسير ابن كثير (١/ ٥٨١-٥٨٢) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ نیز "صالح بن محمد ابی زائدہ" ضعیف راوی ہے۔ (السلسلة الضعيفة، رقم الحديث: ٣٦٤١)

اللہ کی راہ میں جاگنے والی آنکھ کی فضیلت:

سیدنا انس بن ابی مرثد رضی اللہ عنہما نے ایک رات گھوڑے پر سوار رہ کر ایک گھاٹی کی حراست کی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے پوچھا: تو رات کو اترا بھی تھا؟ کہا: نہیں صرف نماز اور قضائے حاجت کے لیے اترا تھا۔ فرمایا: «أَوْجَبْتَ فَلَا عَلَيْكَ أَنْ لَّا تَعْمَلَ بَعْدَهَا» [1] (رواه أبو داود والترمذي) ابوریحانہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث میں مروی ہے: «حُرِّمَتِ النَّارُ عَلٰى عَيْنٍ سَهِرَتْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ» [2] (رواه أحمد) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ دو آنکھیں ہیں، جن کو آگ نہ چھوئے گی: ایک وہ آنکھ جو اللہ کے ڈر سے روئی اور دوسری وہ آنکھ جو رات بھر اللہ کی راہ میں حراست کرتی رہی۔ [3] (رواه الترمذي وقال حسن غريب) سیدنا معاذ بن انس رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے، جس نے اپنی خوشی سے مسلمانوں کی حراست کی اور اس پر حاکم سے کوئی اُجرت نہ لی، وہ اپنی آنکھ سے آگ کو سوائے قسم پوری کرنے کے نہیں دیکھے گا، کیوں کہ اللہ کہتا ہے: ﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾ [مريم: ٧١] [4] (تفرد به أحمد)

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مرفوعاً مروی ہے: ہلاک ہو دنیا کا بندہ، درہم کا بندہ، لباس کا بندہ، اگر دیا گیا تو راضی، نہ دیا گیا تو ناخوش ہوا، یہ ہلاک اور برباد ہو گیا، اگر اس کو کانٹا لگ جائے نکالا نہ جائے۔ خوشی ہو اس بندے کو جس نے اللہ کی راہ میں اپنے گھوڑے کی باگ پکڑی، اس کا سر پراگندا اور دونوں پاؤں گرد آلود ہوئے، اگر حراست (چوکیداری) میں ہے تو حراست میں رہتا ہے، اگر ساقہ (لشکر کے اخیر میں) ہے تو ساقہ میں رہتا ہے، اگر کسی چیز کی اجازت طلب کرتا ہے تو اجازت نہیں دی جاتی، اگر سفارش کرتا ہے تو اس کی سفارش قبول نہیں ہوتی۔ [5] (رواه البخاري)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: "هٰذَا آخِرُ مَا تَيَسَّرَ إِيْرَادُهُ مِنَ الْأَحَادِيْثِ فِيْ هٰذَا الْمُقَامِ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ عَلٰى جَزِيْلِ الْإِنْعَامِ عَلٰى تَعَاقُبِ الْأَعْوَامِ وَالْأَيَّامِ". [6] خلاصۂ مرام یہ ٹھہرا کہ آیت میں مرابطہ سے دو معنی مراد ہیں: ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار، دوسرا اسلام کی سرحد کی حراست۔ مذکورہ آیتِ کریمہ سے دونوں معانی مراد لینا صحیح ہے، دونوں کاموں کا اجر بے حساب ہے۔ وللہ الحمد.

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٠١) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٧٨)

[2] مسند أحمد (٤/ ١٣٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٢٦٧٣)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٣٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤١١٢)

[4] مسند أحمد (٣/ ٤٣٧) اس کی سند میں "زبان بن فائد" ضعیف راوی ہے۔ (ضعيف الترغيب والترهيب: ١/ ١٩٧)

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٧٣٠) [6] تفسير ابن كثير (١/ ٥٨٣)

ہر حالت میں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم:

سیدنا ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ روم کے لوگ جمع ہوئے ہیں، ان سے ڈر لگتا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے جواب لکھا: "أَمَّا بَعْدُ! فَإِنَّهُ مَهْمَا يَنْزِلُ بِعَبْدٍ مُؤْمِنٍ مُنْزِلَةُ شِدَّةٍ يَجْعَلُ اللّٰهُ لَهُ بَعْدَهَا فَرَجًا وَإِنَّهُ لَنْ يَغْلِبَ عُسْرٌ يُسْرَيْنِ وَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾" [1] (رواہ ابن جریر) "بندہ مومن پر جتنے شدائد ٹوٹیں، اللہ ان کے بعد آسانی پیدا کر دیتا ہے، ایک تنگی دو آسانیوں پر غالب نہیں آ سکتی۔" پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ڈرو اللہ سے، یعنی اپنے سب کاموں اور حالوں میں، جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجتے ہوئے فرمایا تھا: «اِتَّقِ اللّٰهَ حَيْثُمَا كُنْتَ وَأَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ» [2] "ڈر اللہ سے جہاں کہیں تو ہے اور بدی کے بعد نیکی کر، وہ نیکی اس بدی کو مٹا دے گی اور لوگوں سے اچھے اخلاق کے ساتھ میل جول کر۔" پھر فرمایا: شاید تم مراد کو پہنچو، یعنی دنیا اور آخرت میں۔ محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ اس لفظ کی تفسیر میں یوں کہتے تھے: «اِتَّقُوْنِي فِيْمَا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ غَداً إِذَا لَقِيْتُمُوْنِي» [3] یعنی جو معاملہ میرے اور تمھارے درمیان میں ہے، اس میں تم مجھ سے ڈرتے رہو۔ شاید تم کو فلاح ہو، قیامت کے دن جب تم مجھ سے ملو۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا: "اِنْتَهٰى آخِرُ تَفْسِيْرِ سُوْرَةِ آلِ عِمْرَانَ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ، نَسْأَلُهُ الْمَوْتَ عَلَى الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ" آمین! یعنی ہم اللہ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ ہماری موت قرآن و حدیث پر ہو۔ [4] اے اللہ! ہم سے اس دعا کو قبول فرما۔

عمومی تفسیر:

فتح البیان میں ہے کہ آیت زیرِ تفسیر میں یہ فرمایا ہے کہ بعض اہلِ کتاب کو دین سے بھی کچھ واقفیت ہے، وہ دوسرے تمام اہلِ کتاب کی طرح فضیحتوں اور قباحتوں میں گرفتار نہیں ہیں۔ اللہ کی آیات میں تحریف یا تبدیلی کر کے دنیا مول نہیں لیتے۔ اس طائفۂ صالحہ اہلِ کتاب کو اجر ملے گا، یعنی دوبارہ۔ سریع الحساب کا یہ مطلب ہے کہ دنیا کے ایام میں سے ایک دن کے نصف میں ساری مخلوق کا حساب لے لے گا، ہر کسی کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا، کیوں کہ اللہ کا علم ہر چیز پر نافذ ہے، مراد یہ ہے کہ جس اجر کا وعدہ کیا گیا ہے، وہ بہت سرعت کے ساتھ ان کو وصول ہو جائے گا۔ آیتِ کریمہ: ﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا ﴾ یہ قول سجانہ: ﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ ﴾ سے دسویں آیت ہے، جس پر اس آیت کو ختم فرمایا ہے۔ اس لیے کہ یہ آیت ایسی نصیحتوں پر مشتمل ہے، جو دنیا اور آخرت کی بھلائی کے لیے ہیں۔

---

[1] تفسیر الطبري (۷/ ۵۰۳) مستدرك الحاكم (۲/ ۳۲۹) امام حاکم اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔
[2] مسند أحمد (۵/ ۲۳۶) صحيح الجامع، رقم الحديث (۹۷) [3] تفسير الطبري (۷/ ۵۱۰) [4] تفسير ابن كثير (۱/ ۵۸۴)

پھر طاعات اور شہوات پر صبر کرنے پر اُبھارا ہے۔ صبر نفس یا جی کو روک لینے کو کہتے ہیں۔ اس لفظِ عام کے طرح طرح کے معنی ہیں۔ بعض نے کہا: یہ صبر اللہ کی اطاعت پر ثابت قدم رہنے پر مخصوص ہے۔ کسی نے کہا: فرائض کو ادا کرنے پر۔ کسی نے کہا: تلاوتِ قرآن پر۔ کسی نے کہا: اللہ کے امر و نہی پر۔ کسی نے کہا: جہاد پر۔ کسی نے کہا: بلا (آزمایش) پر۔ کسی نے کہا: احکامِ کتاب وسنت پر۔ مگر اس کا مفہوم اس سے بھی وسیع تر ہے۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے صبر اور صبر وشکر کی اقسام کے بیان میں ایک مستقل کتاب ایک جلد میں لکھی ہے، جس میں آیات واحادیث اور آثارِ صحابہ وغیرہم تحریر کیے ہیں، اس کا نام "عُدَّةُ الصَّابِرِيْنَ ذَخِيْرَةُ الشَّاكِرِيْنَ" رکھا ہے۔ اس کی تلخیص سید محمد بن اسماعیل امیر یمنی رحمہ اللہ نے کی ہے۔ اس کا نام "اَلسَّيْفُ الْبَاتِرُ فِيْ يَمِيْنِ الصَّابِرِ وَالشَّاكِرِ" قرار دیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں اپنے مضمون میں، بلکہ اسلام میں بے مثل و بے مثال ہیں، ان کے ترجمے کا نام "إِدَامَةُ السُّكْرِ بِإِقَامَةِ الصَّبْرِ وَالشُّكْرِ" (نواب صاحب کی تالیف) رکھا گیا ہے۔ وللہ الحمد والمنة.

﴿ صَابِرُوْا ﴾ سے مراد مصابرۂ اعداء ہے، یعنی دشمنوں کے مقابلے میں صبر وثبات رکھنا اور منہ نہ موڑنا۔ یہی جمہور کا قول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم ان جنگ کی سختیوں پر صبر کر کے غالب آ جاؤ اور کمزوری نہ دکھاؤ کہ وہ تم سے صبر میں زیادہ ٹھہریں۔ مصابرہ کا ذکر صبر کے بعد اس لیے کیا کہ وہ صبر سے زیادہ سخت مشکل، کامل اور افضل ہے، یہ ویسی ہی بات ہے جیسے صلاۃِ وسطیٰ کا صلوات پر عطف کیا ہے کہ ﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ﴾ [البقرة: ٢٣٨] "اور تم سب نمازوں اور خاص طور پر درمیان والی نماز کی حفاظت کرو۔" کسی نے کہا: معنی یہ ہیں کہ تم نمازوں پر مصابرہ کرو، اپنی جانوں کو شہوات سے بچاؤ یا اس وعدے پر مصابرہ کرو، جو تم سے کیا گیا ہے اور نا اُمید نہ ہو، لیکن عربی معنی وہی قولِ اول ہے۔ سلف سے صبر کا صبر کی جملہ قسموں میں سے کسی قسم پر حصر اور قصر کرنا آیا ہے اور مصابرہ کا دوسری قسم پر قصر کرنا، لیکن اس کے ساتھ حجت قائم نہیں ہوسکتی۔ واجب یہ ہے کہ لغوی لحاظ سے جو سمجھا جاتا ہے، اسی کی طرف رجوع کیا جائے۔

مرابطہ سے مراد ثغور میں، یعنی دار السلام کی سرحدوں پر اقامت، یعنی گھوڑے باندھنا ہے، جس طرح دشمن پڑاؤ ڈالتے ہیں۔ جمہور مفسرین کا یہی قول ہے۔ بعض نے کہا کہ نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا ہے۔ مگر رباطِ لغوی وہی پہلا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے جو گھوڑا باندھنے کے علاوہ کو بھی رباط کا نام دیا ہے تو یہ اصل معنی کے خلاف نہیں ہے، کیوں کہ لفظِ رباط کا اطلاق دونوں معنوں پر ممکن ہے۔ خلیل نے کہا: رباط سرحدوں پر ملازمت کو اور نمازوں کی پابندی کو کہتے ہیں اور ائمۂ لغت کا بھی یہی قول ہے۔ امام خازن رحمہ اللہ نے کہا کہ کسی سرحد پر مقیم کوئی شخص جو دشمن کو مسلمان سے دور کرتا ہے، وہ مرابط ہے، گو اس کے پاس کوئی مرکوب (سواری) مربوط نہ ہو۔[1] رباط کی فضیلت میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں، ان میں اس بات کی تصریح ہے کہ رباط فی سبیل اللہ مراد ہے اور سبیل اللہ سے مراد جہاد ہے۔

[1] تفسير الخازن (١/ ٤٧١)

آیت کو اسی معنی پر محمول کرنا چاہیے، نبی اکرم ﷺ نے کسی لشکر کی حراست کا نام بھی رباط رکھا ہے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے حدیث میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ مرابط کا اجر کیا ہے؟ فرمایا: جس نے ایک رات حارس ہو کر مرابطہ کیا، یعنی مسلمانوں کی چوکیداری کی تو اس کو ان نمازیوں اور روزہ داروں کا اجر ملے گا، جن کو اس نے اپنے پیچھے چھوڑا، یعنی جن کی چوکیداری کی۔[1] (رواه الطبراني في الأوسط بسند جيد) یعنی وہ تو سرحد پر ہے اور مسلمان لوگ اپنے اپنے شہروں، قصبوں، گاؤں اور گھروں میں رہتے ہیں، ان سب کے نماز روزے کا اجر اس کو ملتا ہے، اس اجر کا حساب اللہ کے سوا کوئی معلوم نہیں کر سکتا۔ یہ اجر بالیقین بے حساب ٹھہرتا ہے، جس طرح فرمایا ہے: ﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ [الزمر: ١٠] ”بلاشبہ صبر کرنے والوں کو ان کا پورا پورا اجر بے حساب دیا جائے گا۔“ مرابطہ صبر و مصابرہ سے خالی نہیں ہوتا، بلکہ رباط کا کام سب کاموں سے زیادہ مشکل ہے کہ سب کو آرام دے کر اپنی جان کو ایک مشکل میں ڈالنا ہے۔ ہر وقت دشمن کی حملہ آوری اور دشمن کو پیچھے دھکیلنے کا منتظر رہنا اور ان کے مقابلے میں جمنا پڑتا ہے۔

فلاح یہ ہے کہ آدمی کی تمام مرادیں پوری ہو جائیں، کوئی مطلب حاصل ہونے سے نہ رہ جائے۔ ہر سختی، غم، تکلیف، حزن و ملال اور خوف سے نجات پائے۔ ان دس آیتوں کی فضیلت میں کئی حدیثیں آئی ہیں، جن میں سے کچھ اوپر گزر چکیں۔ صحیحین میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب نبی کریم ﷺ رات کو جاگتے تو آسمان کی طرف نظر کر کے ان کو پڑھتے۔[2] امام دارمی رحمہ اللہ نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جو کوئی کسی رات کو سورت آلِ عمران کی آخری آیات کو پڑھے گا تو اس کے لیے ساری رات کا قیام لکھا جائے گا۔[3] وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ أَوَّلاً وَّآخِراً وَّظَاهِراً وَّبَاطِناً.

سورت آلِ عمران کی تفسیر بروز جمعرات مورخہ ۷/ ذوالحجہ ۱۳۰۲ھ بوقت صبح سوا نو بجے مکمل ہوئی۔ اللہ پاک سے اُمید ہے کہ اپنے کرمِ عمیم و فضلِ کریم سے اس خدمت کو قبول فرمائے اور ترجمان اور کاتب و قاری کو آفاتِ حاضر و غائب، حال و استقبال سے بہ ہمہ وجوہ دنیا اور آخرت میں محفوظ رکھے۔

اَللّٰهُمَّ آمِيْنَ، ثُمَّ آمِيْنَ، وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَالسَّلَامُ، وَالصَّلَاةُ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ، خُصُوْصًا عَلٰى سَيِّدِهِمْ، وَآخِرِهِمْ، وَخَاتِمِهِمْ، مُحَمَّدٍ شَفِيْعِ الْمُذْنِبِيْنَ وَعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ أَجْمَعِيْنَ.

---

[1] المعجم الأوسط (٨/ ٩٠) اس کی سند میں ”حارث بن عمیر“ متکلم فیہ راوی ہے۔ مزید دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٤١٣٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٩٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٦٣)

[3] سنن الدارمي (٢/ ٥٤٤) فتح البيان (٢/ ٤٠٨۔ ٤١١) اس کی سند میں ”عبداللہ بن لہیعہ“ ضعیف راوی ہے۔